دربار اکبری

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
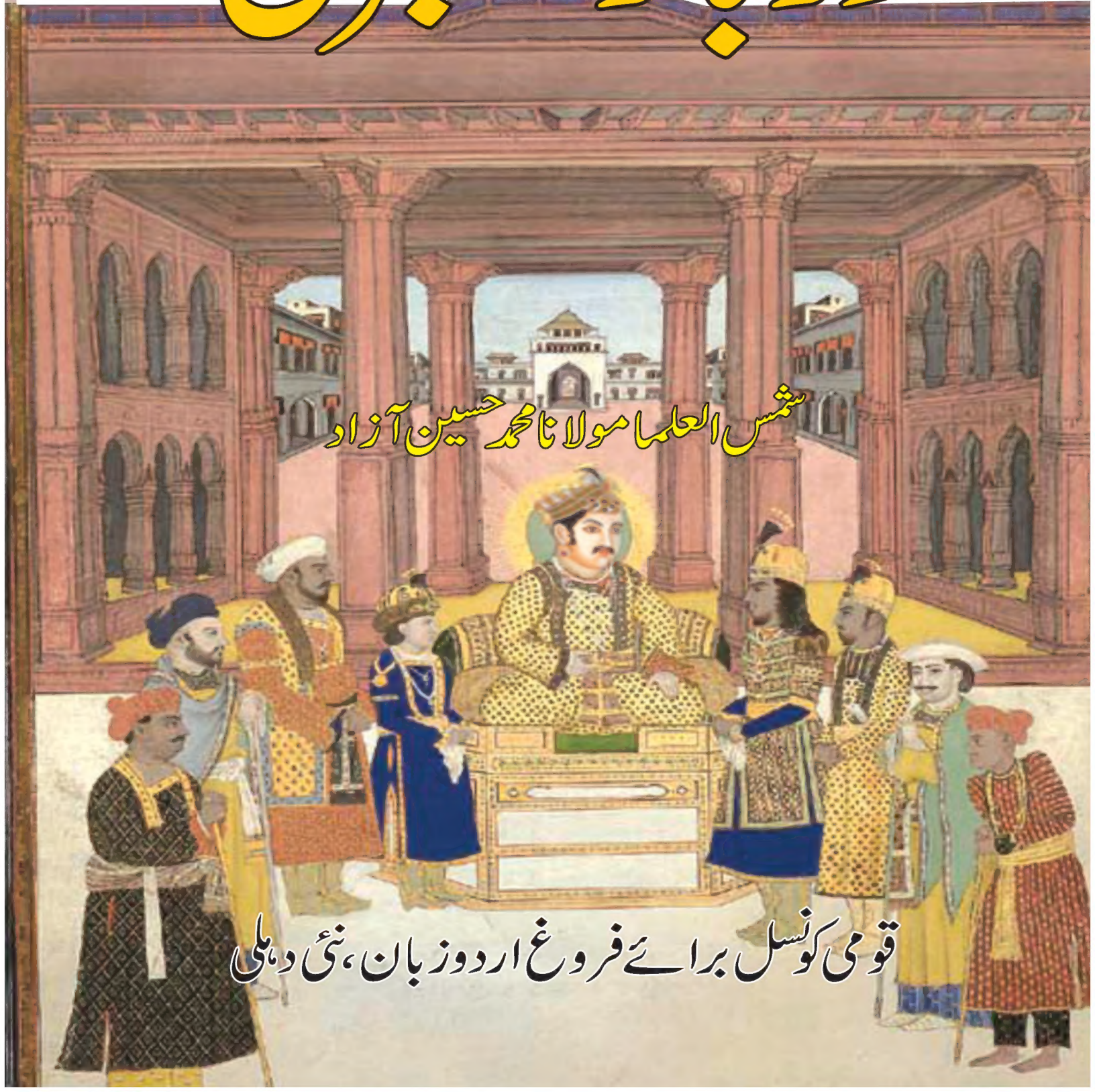
دربار اکبری

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت	:	2000
دوسری طباعت	:	2010
تعداد	:	550
قیمت	:	-/175 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	851

Darbar-e-Akbari
by
Shamsul Ulama Maulana Mohammad Hussain Azad

ISBN :978-81-7587-372-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025
فون نمبر: 49539000، فیکس 49539099
ای میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی 110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد

فہرست مضامین دربار اکبری و تتمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت قبلہ وکعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ایسی نہیں جس پر میرے جیسا ہیچمدان کچ مج بیان کسی مقدمہ لکھنے کی جرأت کرتا۔ لیکن کتاب ہذا کا پہلا ایڈیشن جو مطبع رفاہِ عام لاہور میں چھپا تھا (جس کے مالک و منیجر میر ممتاز علی صاحب ہیں) اُس کے آغاز میں منیجر صاحب موصوف نے ایک ایسا عجیب و غریب مُقدمہ تحریر کردیا جس کی وجہ سے نہ صرف مجھے اِس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرا ایڈیشن اپنے اہتمام سے کسی دوسرے مطبع میں چھپواؤں بلکہ منیجر صاحب موصوف کے تحریر کردہ مُقدمہ کی اصلی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے مجھے اِس امر کی جسارت کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا کہ کتاب ہذا کے ساتھ ایک مختصر مقدمہ شامل کر دوں۔

میر ممتاز علی صاحب نے پہلے ایڈیشن کے ساتھ جو مقدمہ لکھا ہے اُس میں تحریر کا انداز ایسا رکھا ہے کہ گویا دربارِ اکبری کا کوئی ایسا مسودہ مرقومۂ حضرت قبلہ مرحوم اُن کو دستیاب نہیں ہوا جو مسودہ سمجھا جانے کے قابل ہو۔ بلکہ ایک ٹوٹا پھوٹا۔ بے ربط بے ترتیب بے سروپا مجموعہ چند پرچوں اور پُرزوں اور دیگر کاغذات کا ایسی مُشکلات و مصائب طے کرنے کے بعد جو ہفتخوانِ رستم کی مُشکلات سے مُشابہ تھیں میر صاحب موصوف کے ہاتھ آیا۔ اور ایسی جستجوئیں اور تفتیشیں ان کاغذات کی بہم رسانی کے لئے اُن کو کرنی پڑیں جو بہت ہی قابلِ داد ہیں۔ سب سے زیادہ افسوسناک غلط بیانی میر صاحب کے لکھے ہوئے

مقدمہ میں یہ تھی کہ انہوں نے حضرت قبلہ مرحوم کی نسبت یہ تحریر کیا کہ "وہ یہ سُن کر کہ میں اُن کا مسودہ لینے کے درپے ہوں جوشِ جنوں میں مسودات کا ایک بستہ لیکر دریائے راوی پر پہنچے اُدہ پُل پر کھڑے ہو کر اُس کو دریا بُرد کر دیا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اُس میں دربار اکبری کا صاف شدہ مسوّدہ ہو گا"۔ اِس فرضی دریا بردگی کے قصّے پر (جس کا علم سوائے میر صاحب کے کسی اور شخص کو نہیں جو غالباً اُس وقت ہمراہ ہونگے) میر صاحب موصوف نے کمال اندوہ و قلق اور درد و سوز کے ساتھ یہ بھی ارقام فرمایا ہے "خدا جانے اس سخنور نے نظم و نثر کے کیا کیا موتی پروئے ہونگے جو ہماری بدقسمتی سے دریا میں غرق ہو گئے"۔ غرضکہ میر صاحب کے اِس بیان کے ساتھ جب اُن کے مزید ایسے بیانات کو شامل کیا جائے جن کا ماحصل یہ ہے کہ جو مسوّدہ شاگردوں کا صاف کیا ہوا تھا وہ غلطیوں کا مجموعہ تھا اور جو مسوّدہ مُصنّف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا وہ بیشمار چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر تھا جو علاوہ بہت کٹے ہوئے اور مشکوک و مُشتبہ ہونے کے پڑھے جانے کے بھی قابل نہ تھے اور پنسل سے لکھی ہوئی تحریریں قریبًا محو ہو چکی تھیں اور انہیں وجوہات سے میر صاحب کو مسودہ میں جا بجا تصرّفات کرنے پڑے (جس میں حذف ایزاد اور تبدیلی غرضکہ ہر قسم کے تصرّفات شامل ہیں) اور اَوراق کے اَوراق جو گم تھے اُن کی گم شدگی دیکھکر بقول میر صاحب "بجز اس کے اَور کیا چارہ ہو سکتا تھا کہ اِس حصہء ناقص کو میں خود لکھکر پُورا کروں" تو اِن بیانات کے مُطالعہ سے پڑھنے والے کے دل پر سوائے اِس کے اور کیا اثر پیدا ہو سکتا تھا کہ بحیثیتِ مجموعی کتاب دربار اکبری دراصل قریبًا میر صاحب موصوف ہی کی عرقریزی اور محنت کا نتیجہ ہے ورنہ حضرت قبلہ مرحوم کے صاف کردہ مسودات تو دریائے راوی میں ہی غرق ہو چکے تھے علاوہ بریں بقول میر صاحب موصوف ضمیمہ دربار اکبری تو تمام و کمال ہی میر صاحب موصوف کا اپنا لکھا ہوا ہے ✦

ایسے حالات میں دربار اکبری کی وقعت میں اسی قدر فرق آ جانے کا احتمال ہے جس قدر حضرت قبلہ مرحوم اور میر صاحب کی وقعت میں تفاوت ہے۔ اِس لئے اس امر کی سخت ضرورت محسُوس ہوئی کہ اصلی واقعات کا پبلک پر انکشاف ہو جائے حقیقت حال یوں ہے کہ جس وقت میر ممتاز علی صاحب نے مطبع رفاہِ عام کی

مشینیں ولایت سے منگوائیں قدرتی طور پر ان کو چھاپنے کے لئے کتابوں کی تلاش ہوئی چنانچہ اُنھوں نے مجھ سے بھی کتابوں کے چھپوانے کی درخواست کی۔ میں نے بغیر کسی قسم کے شک کے دربارِ اکبری اور سخندانِ فارس کے حصّۂ اول کا مسودہ میر صاحب کو دیدیا اور معاہدہ یہ ہوا کہ دونوں کتابوں کے خرچ چھپوائی و آمدنی فروخت میں میرا اور اُن کا نصف نصف حصّہ ہوگا۔ مسودوں کے لے جانے کے قریباً چھ مہینے کے بعد میر صاحب نے مجھے ایک طویل خط لکھا اُس میں بہت پیچ در پیچ شرائط دربارِ اکبری کے چھاپنے کی نسبت پیش کیں۔ جن کو میں نے منظور نہ کیا اور صاف لکھدیا کہ آپ دربارِ اکبری کا مسودہ واپس کر دیں۔ جب میر صاحب نے دیکھا کہ میں کسی طرح راضی نہیں ہوتا تو اُنھوں نے پھر وہی شرطِ سابقہ نصف نصف حصّہ خرچ و آمدنی کو منظور کر کے کتاب چھاپنی شروع کی۔ مقدمہ کے صفحۂ اوّل پر جو میر صاحب نے دربارِ اکبری کے مسودہ حاصل کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے یہ بالکل صحیح نہیں۔ وہ کبھی کتب خانۂ مُصنّف مرحوم میں داخل ہو کر کسی کتاب کو چھونے کا مجاز نہیں ہو سکتے تھے۔ صفحۂ ۲ پر جو میر صاحب نے مسودوں کا بستہ دریائے راوی میں ڈالنے کا ذکر کیا ہے یہ بھی درست نہیں۔ میں نے جس وقت حضرت قبلہ وکعبہ مرحوم کی طبیعت میں مجذوبیت کا اثر دیکھا تو فوراً تمام مسوّدے جواب تک چھپوا چکا ہوں کتب خانے میں سے خود نکال لئے۔ جو مسودہ میں نے میر صاحب کو دیا تھا وہ آخری مرتبہ صاف شدہ مسوّدہ تھا۔ لیکن چونکہ حضرت مرحوم کا قاعدہ تھا کہ ہر ایک مسوّدہ میں خواہ وہ کتنی ہی دفعہ دیکھا ہوا ہو ہمیشہ ترمیم کرتے رہتے تھے اِس لئے وہ جگہ جگہ سے کٹا ہوا ضرور تھا۔

حضرت مرحوم نے تمام حالات اعیانِ دربارِ اکبری کے علیحدہ علیحدہ کاغذوں میں ترتیب دیکر رکھ چھوڑے تھے۔ اور غالباً اِسی ترتیب سے اُن کو کتاب میں درج کرنا منظور تھا۔ اگرچہ مسوّدہ مذکور کٹا ہوا تھا اور کہیں کہیں چیپیاں بھی لگی ہوئی تھیں مگر وہ ایسی حالت میں تھا کہ ایک سمجھدار کاتب ایسے شخص کی نگرانی میں جو مُصنّف کی تحریر پڑھنے کا عادی ہو اچھی طرح سے نقل کر سکتا۔ چنانچہ سخندانِ فارس کا مسودہ جو میں نے ۱۹۰۷ء میں چھپوایا ہے بالکل ایسی ہی حالت میں تھا اور مجھے اُس کے چھپوانے میں کوئی دِقت نہیں پیش آئی ؂

صفحہ ۳ کے آخر میں جو میر صاحب نے لکھا ہے کہ بعض ناقص حصّوں کو میں نے خود لکھکر پُورا کیا ہے درست نہیں۔ تمام حالات بالکل مکمل تھے۔ اور مصنّف مرحوم اپنے مختلف احباب سے بارہا حالتِ صحت میں ذکر کر چکے تھے کہ مسودہ بالکل مکمل ہے صرف چھپوانے کی دیر ہے۔ مسودہ جوں کا توں میں نے مُقفّل کر رکھا تھا۔ کوئی کاغذ بھی اس کا ضائع نہیں ہوا۔ سنین کی صحت کی نسبت جو میر صاحب نے لکھا ہے سہو کتابت ہے اور اُس کا مضائقہ نہیں ہے صفحہ ۴ کے تیسرے پیرگراف میں میر صاحب نے جو لکھا ہے کہ میں نے علی قلی خاں شیبانی کی جگہ علی قلی خان سیستانی کر دیا ہے یہ تصحیح کو غلط کر دیا ہے۔ کیونکہ اصل میں علی قلی خان شیبانی درست ہے۔ علی قلی خاں شیبانی قبیلہ کا تھا جہاں جہاں کتابوں کے حوالے دئیے ہوئے ہیں وہاں اصل کتاب کے مضمون شاگردوں یا دوستوں کے نقل کئے ہوئے موجود ہیں۔ چنانچہ ایک خط حافظ ویران مرحوم کا اصل مسودہ میں رکھا ہے کہ میں منتخب التواریخ میں سے فلاں حصّہ نقل کروا کر بھیجتا ہوں اور وہ نقل مسودہ میں شامل تھی۔ صفحہ ۴ کے آخری فقرہ میں جو تتمّہ خود لکھنے کا ذکر میر صاحب نے کیا ہے یہ بھی صحیح نہیں +

چونکہ الحق یعلوا ولا یعلیٰ کا ارشاد بالکل صحیح ہے اِس لئے تائید غیبی یہ ہوئی کہ میر صاحب موصوف نے دربارِ اکبری چھاپنے کے بعد کتاب مذکور کا مسوّدہ جو میں نے اُن کو دیا تھا مجھے واپس کر دیا اور دیتے وقت وہ تتمّہ کا مسوّدہ دستخطی حضرت مرحوم بھی نکالنا بھول گئے جس کی نسبت اُنہوں نے ایسی دلیری سے لکھ دیا تھا کہ وہ قریباً تمام وکمال ہی اُن کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ تتمّہ کے اِس مسودے میں مجھے خداداد خاں گکنی سکندر خان اُزبک۔ مرزا شاہرُخ۔ تردی بیگ ترکستانی۔ قاضی نظام بدخشی ملا عالم کابلی۔ برہان نظام شاہ۔ حسین نظام الملک۔ اسمعیل نظام الملک ابراہیم برہان الملک۔ چاند بی بی۔ میر عبد اللطیف قزوینی۔ میر غیاث الدین علی خواجہ مظفر علی ترتبی۔ حکیم الملک گیلانی۔ شاہ ابوالمعانی۔ مرزا شرف الدین حسین۔ ابراہیم حسین۔ گل رخ بیگم۔ حکیم محمد مرزا۔ تورۂ چنگیزی۔ ملا شیری۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ۔ شیخ گدائی کنبوہ۔ ہیمو بقال۔ سادات بارہہ۔ سلیمہ سلطان بیگم۔ شمس الدین محمد اتکہ خاں۔ شہاب خاں۔ ناصر الملک ملا پیر محمد خاں۔

محمد سعید بہادر خاں۔ حسین قلی خان خانِ جہاں۔ اسمٰعیل قلی خاں۔ خواجہ امینا۔ خواجہ شاہ منصور آصف خاں۔ عبداللہ خاں ازبک۔ شاہ عارف حسینی۔ میاں عبداللہ نیازی سھرندی شیخ علائی۔ سلیمان کرانی۔ سید محمد میر عدل۔ رن تھنبور۔ نظام احمد بخشی۔ سید محمد جونپوری حکیم مصری۔ پیر روشنائی۔ خاندان سوری کے حالات مُصنّف کے اپنے قلم سے درست کئے ہوئے مل گئے۔ جو کتاب مطبوعہ میں حرف بحرف نقل کئے گئے ہیں۔ اصل کتاب میں مُصنّف نے جگہ جگہ تتمہ کا حوالہ دیا ہے یہی ایک بدیہی ثبوت اس امر کا ہے کہ مُصنّف نے تتمہ لکھ لیا تھا۔ مسوّدات مذکورہ بالا جس کا جی چاہے میرے پاس دیکھ سکتا ہے۔

صفحہ ۵ کے دوسرے پیرگراف میں میر صاحب نے تحریر کیا ہے کہ جو خیالات حضرت قبلہ مرحوم سے وہ سنا کرتے تھے اُن کو اپنے الفاظ میں لکھکر اُنھوں نے مقولہ آزاد ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ میر صاحب کے اصلی فقرات نقل کر دئے جاتے ہیں:۔

"مُصنّف کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی کسی واقعہ کے بیان میں اپنے تئیں بلفظ آزاد خطاب کر کے اپنے خیالات دلی ظاہر کیا کرتا ہے۔ مجھے چونکہ اپنے معزز اُستاد کے ہمراہ تقریباً پندرہ سال تک رہنے کا اتفاق ہوا تھا اِس لئے جہاں تک مجھے اس معیت سے اُن کے عادات و خیالات سے آگاہی ہو سکتی تھی اس کے لحاظ سے میں نے اُسی طرح بعض واقعات پر ان کے دلی خیالات ظاہر کئے ہیں اور چونکہ وہ انہیں کے خیالات ہیں۔ اس لئے میں نے وہاں آزاد کا لفظ ہی لکھنا مناسب جانا ہے۔ درحقیقت یہ کام کئی سال کا تھا جس کو میں نے چند ماہ میں ختم کیا"۔

اِس کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ جس کا دل چاہے وہ اصل مسوّدات دستخطی حضرت قبلہ مرحوم میرے پاس دیکھکر میر صاحب کے اِس بیان کی صحت کا خود اندازہ کر لے۔ اِس موقع پر اس لطیفہ کا ذکر کر دینا خالی از لُطف نہ ہوگا کہ صفحہ ۶۹۷ سطر ۹ میں یہ فقرات درج ہیں:۔ "آج سے پندرہ سولہ برس پہلے تک میں نے خود دیکھا کہ تورۂ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا ہے"۔ ان فقرات کو کم از کم اِس تتمہ میں ضرور حذف کر دینا چاہیے تھا جس کو میر صاحب تمام و کمال اپنی تحریر ظاہر کرتے ہیں۔

کیونکہ حضرت قبلہ مرحوم کا سفر بخارا کرنا تو سب کو معلوم ہے مگر جناب میر صاحب کو یقیناً خود اقبال کرنا پڑے گا وہ کبھی حدودِ ہندوستان سے آج تک باہر تشریف نہیں لے گئے اس سے بڑھکر ایک اور واقعہ میری نظر سے گذرا جو قابل ذکر ہے۔ یعنی بعض بعض حاشیے جو اصلی مسودات دستخطی حضرت قبلہ مرحوم میں موجود تھے اُن کو میر صاحب نے کتاب مطبوعہ میں بجنسہٖ نقل کرکے اُن کے نیچے اپنا نام یعنی ممتاز علی لکھدیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر صاحب کے اپنے نتائج طبع ہیں۔

اِن حالات کا اِنکشاف پبلک کی اطلاع کے لئے اشد ضروری تھا تاکہ اُن کو کتاب ہذا کی وقعت میں کوئی شُبہ پیدا نہ ہو۔ ورنہ منتخب مُبصّرانِ زبان اور چیدہ سخندان تو حضرت قبلہ مرحوم کی زبان و کلام اور اُن کے لطف بیان کو خود پہچان سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا شبلی سے مجھے ایک دفعہ پٹیالہ میں جناب آنریبل خلیفہ صاحب مرحوم کے مکان پر نیاز حاصل ہوا تو اُنہوں نے تعجب سے دریافت فرمایا کہ جو مضمون میر ممتاز علی نے مقدمہ دربارِ اکبری میں لکھا ہے کہ تتمہ ان کی تحریر ہے دُرست ہے؟ میں نے تمام حالات عرض کر دیئے۔ انہوں نے فرمایا کہ تتمہ کی عبارت پڑھکر مجھے پہلے ہی خیال ہوا تھا کہ یہ زبان مولوی صاحب کے سوا دوسرے شخص کی نہیں ہو سکتی اُمید ہے کہ جو جو لوگ زبان کے نبض شناس ہیں اُنہوں نے میر صاحب کے ان بیانات کی حقیقت اور وقعت کو پہلے ہی سمجھ لیا ہوگا لیکن جن صاحبان کو کوئی مغالطہ یا شکوک پیدا ہوئے ہوں اُن کو اب اِس امر کا عین الیقین ہو جانا چاہئے کہ دربارِ اکبری میں کوئی قابلِ تذکرہ تحریف یا تصرّف نہیں کیا گیا۔ بلکہ بحیثیت مجموعی یہ حضرت قبلہ مرحوم کی اصلی تصنیف اور اُن کے دستخطی مسوّدات کے مُطابق ہے۔

خاکسار
محمد ابراہیم
منصف امرتسر

مورخہ ۲ اگست ۱۹۱۰ء

دیباچہ

دہلی کے آخری تاجدار میرزا ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے وقت میں زوال و انحطاط کی جو صورت پیدا ہو گئی تھی، اس نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں عموماً فکر مند کر دیا تھا۔ ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے بھی ایک قصیدے میں بادشاہ سے خطاب کر کے کہا تھا ؎

ہوتے سیرت سے ہیں مردانِ دلاور ممتاز
ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

(سر) سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں مسلم سلاطین کے تواریخی نقوش کی عکاسی کی۔ پھر مغلیہ خاندان کے ایک جلیل القدر بادشاہ کی فتوحات کی شاندار داستان کو حیات تازہ عطا کرنے کے لیے "آئینِ اکبری" کی تصحیح کا کام کیا۔ اس قسم کے کاموں کا فائدہ یہ ہوا کہ نئی نسل کو اپنے ماضی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے جو بعد میں "شمس العلما" ہوئے، اُسی زمانے میں "ہمایوں نامہ" کا مطالعہ کیا۔ لکھتے ہیں:

"فقط ایک گلبدن بیگم ہمایوں کی بہن تھی کہ اُس نے ہمایوں نامہ لکھا تھا وہ نسخہ اب میرے پاس نہیں۔ دلّی میں بڑی کوشش سے بہم پہنچایا تھا۔ اُس کے پہلے ورق پر چند عورتوں کے حال اور بھی کسی نے لکھ دیے تھے۔ وہ بھی شاعرانہ طور سے اور شاعری کے سلسلے میں۔"

(مکتوبات آزاد، ص ۳۵)

آزاد نے "اکبر نامے" کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اُس کتاب سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ "دربارِ اکبری میں اُنھوں نے جگہ جگہ اُس کے بیانوں کو دوسری کتابوں کے مندرجات پر ترجیح دی ہے۔" تواریخ سے آزاد کو جو شغف پیدا ہو گیا تھا اُس کا اندازہ اُن کے ایک خط کے اِس

اقتباس سے بھی کیا جا سکتا ہے :

"یہ (چاند بی بی) بھی بڑی بالیاقت اور صاحب ہمت بی بی دکن میں ہوئی ہے۔ اِسے نادرۃ الزمانی کہتے تھے۔ آپ وہاں سے اِس کے حالات دریافت فرمائیں اور مجھے بھی عنایت کریں۔ انشاء اللہ کبھی کام آئیں گے۔ اِسی طرح مصالح (کذا) اکٹھا ہوا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے۔"

(مکتوب ص ۴۰)

صاحبانِ تصنیف و تالیف کا طریقہ یہی ہے۔ وہ اپنی دلچسپی کے موضوعات سے متعلق مسالہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب حالات ساز گار ہوتے ہیں اِس ذخیرہ کو اپنے طور پر مرتب کر کے کتاب پوری کر لیتے ہیں۔ اِس ذکر سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کسی تصنیف سے متعلق آغازِ کار کے زمانے کا تعین کرنا بہت مشکل کام ہے۔

آزاد نے "دربارِ اکبری" بڑے ذوق و شوق سے لکھی تھی۔ اُن کے اِس ذوق و شوق کی وجہیں کئی تھیں۔ ایک یہ بھی تھی کہ وہ سلطان جلال الدین محمد اکبر کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ :

"وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ پھر بھی اپنی نیک نامی کے کتابے ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں اُنھیں گھس گھس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں اُتنا ہی چمکتے ہیں۔ اگر جانشین بھی اُس رستے پر چلتے تو ہندوستان کے رنگا رنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے بلکہ وہی آئین ملک ملک کے لیے آئینہ ہوتے۔ اُس کے حالات بلکہ بات بات کے نکتے اوّل سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں۔"

(دربارِ اکبری ص ۱)

امکان ہے کہ آزاد نے یہ رائے "اکبر نامے" کے مطالعے کے بعد قایم کی ہو۔ اگر ایسا ہے تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ آزاد کی کتاب اُسی کا عکس ہے۔

جس زمانے میں آزاد نے "آبِ حیات" لکھنے کا منصوبہ بنایا، کم و بیش اُسی وقت اُنھوں نے "دربارِ اکبری" کے لکھنے کا بھی ارادہ کر لیا تھا۔ جن لوگوں کو "آبِ حیات" کے سلسلے میں خطوط لکھے تھے۔ اُن میں سے بعض سے "دربارِ اکبری" کے لیے بھی مواد فراہم کرنے کی درخواست

کی تھی۔ مثال کے طور پر مولوی محمد عظیم اللہ زمنی کے بارے میں اُن کا کہنا ہے:

"آبِ حیات، کی برکت سے بندہ آزاد کو بھی اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔" (دربارِ اکبری ص ۲۵۱)

اور زمنی نے "دربارِ اکبری" کے لیے بھی بعض اطلاعات فراہم کی تھیں۔ آزاد نے اعتراف کیا ہے کہ:

"اُنھوں نے شفقت فرما کر ریاست قدیم اور واقفیت خاندانی کی معلومات سے جونپور اور غازی پور زمنیہ کے بہت سے حالات عنایت کیے۔"

(ایضاً ص ۲۵۲)

مواد کے حصول کی کوششوں سے قطع نظر، معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۲ میں آزاد نہ صرف یہ کتاب لکھنے کا ارادہ مصمم کر چکے تھے بلکہ اُنھوں نے اِس کے نام کا تعین بھی کر لیا تھا۔ اِس سال کے ۱۵ اکتوبر کے ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

"خدا اِس 'دربار' سے فارغ کر دے تو آپ سے سرخرو ہوؤں۔ مجھے دل سے خیال ہے۔ آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں؟" (مکتوبات ص ۳۷)

"دربارِ اکبری" کا پہلا مسودہ ۱۸۸۳ میں مکمل ہو گیا تھا۔ آزاد کے ۱۰ اگست کے ایک خط میں اس کی کیفیت اِس طرح مذکور ہے:

"ایک نسخہ 'آبِ حیات'، طبع جدید بذریعہ عریضہ نیاز ارسال خدمت کیا ہے... 'دربارِ اکبری' کو لپیٹ رہا ہوں مگر دو ہی دن جم کر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا۔ خیر۔ میں نے ایک دن آرام دیا۔ تخفیف معلوم ہوئی۔ اب آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ خیر۔ کام خدا کے فضل سے ہو گیا...

اب جو لکھنا تھا وہ میں نے لکھ لیا اور ہر ایک حال مسلسل بھی ہو گیا۔ جو کام باقی ہے وہ فقط اِتنا ہے کہ کہیں کوئی فقرہ بڑھا دیا، کہیں دو کو ایک کر دیا۔

تصویروں کے باب میں اِتنا لکھا۔ جناب سید صاحب نے جواب بھی نہ دیا۔ میں نے آٹھ دس تصویریں بہم پہنچائی ہیں۔ جس طرح ہوگا اُنھیں سے اِس گڑیا کو سنوار کر حاضر کر دوں گا۔" (مکتوبات ص ۶۱ تا ۶۲)

"دربارِ اکبری" اپنی ابتدائی صورت میں لکھی جا چکی تھی لیکن "اِس گڑیا" کی آرائش و زیبائش

کا کام ابھی باقی تھا، اِس لیے اِسے منظرِ عام پر نہیں لایا جا سکتا تھا اور بقول سید جالب دہلوی اب بھی :

"لوگوں کو امید تھی کہ ... (آزاد) 'دربار اکبری' کو بڑی رونق و شان سے سجائیں گے اور اِس کے مینا بازار کی زمانۂ حال کے لوگوں کو سیر کرائیں گے ۔"
(دیباچہ مکتوبات ص ۲۹)

آزاد کے حالات بہت ساز گار نہیں رہ گئے تھے لیکن وہ پورے انہماک کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف تھے ۔ اُن کا کہنا تھا :

"اچھا مجھے پنشن بھی دے دیں گے تو قناعت کروں گا اور تصنیفات کو پورا کروں گا ۔ اپنے لختِ جگر بچّوں کو نیم جاں تڑپتا نہ چھوڑ و نگا چھپائی کا کام دس بارہ دن سے زیادہ نہیں رہا ۔ 'آبِ حیات' نے مجھے ہلاک کر دیا ۔ مجھ سے بے وقوفی ہوئی ہے ۔ دس مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ مہینے میں کیا ہے ۔ اللہ آسان کرے ۔"
(مکتوبات ص ۵۶ تا ۵۷)

اِس غیر معمولی مشقت کی وجہ یہی تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد 'دربار اکبری' کو مکمّل کر دیں لیکن کاموں کا سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہو رہا تھا ۔ ایک کے بعد ایک نیا کام سامنے آجاتا تھا ۔ یکم ستمبر ۱۸۸۸ کو آزاد نے لکھا تھا :

"میں نے 'سخندانِ فارس' کو نظرِ ثانی کر کے رکھ دیا ہے ۔ چاہا کہ اب 'دربار اکبری' کو سنبھالوں مگر مروّت اور حمیت نے اجازت نہ دی کیونکہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ اُن کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں ۔"
(مکتوبات ص ۸۰)

اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "دیوانِ ذوق" کی ترتیب کے بعد آزاد "دربار اکبری" کی طرف متوجہ ہونا چاہتے تھے لیکن غالباً وہ ایسا نہیں کر سکے ۔ دیوان کی ترتیب (۱۸۹۱) کے کوئی پندرہ سال کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو اُنھوں نے ذکر کیا تھا :

"یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ 'مآثر الامرا' اور 'سوانح اکبری' کسی زمانے میں دیکھی تھیں ۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں ۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا

پتا لگا تھا۔ چھ دن میں بھاگ گیا اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ "مآثر الامرا" بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے وہ "مآثر الامرا" سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے۔ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گیے اور اچھے مل گیے۔ سب سے زیادہ یہ کہ اب جو "دربار اکبری" کا مشاہدہ کرے گا یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو "مآثر" ہاتھ نہیں آئی۔

(مکتوبات ص ۳۱ تا ۳۲)

"مآثر الامرا" کے دستیاب ہو جانے پر آزاد کا خوش ہونا بجا تھا لیکن علم کا بحر ذخار ناپیدا کنار ہے۔ ساری کوششوں کے باوجود بعض مآخذ ایسے رہ جاتے ہیں جن تک صاحبان تصنیف کی رسائی نہیں ہوتی۔ آزاد بھی اس صورت حال سے مستثنا نہیں تھے۔ بہر نوع ان کی جستجو اور تگ و دو قابل رشک تھی کہ انھوں نے اپنے موضوع سے متعلق بیشتر معروف کتابیں فراہم کر لی تھیں۔ "دربار اکبری" کی سرسری ورق گردانی سے جن مآخذ کے نام سامنے آتے ہیں، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	کیفیت
۱۔	آئین اکبری (دفتر سوم اکبر نامہ)	شیخ ابوالفضل علامی	کشورداری و تاسیسات اکبر و احوال مشاہیر آں زماں
۲۔	اقبال نامۂ جہانگیری	محمد شریف مخاطب بہ معتمد خاں	احوال پادشاہان تیموری ــــ در سہ جلد
۳۔	اکبر نامہ	شیخ ابوالفضل علامی	در سہ دفتر ــــ دفتر اول تا ۱۷ جلوس اکبری دفتر دوم ۱۸ تا ۴۶ جلوس اکبری دفتر سوم۔ آئین اکبری
۴۔	اکبر نامہ (مثنوی)	شیخ فیضی ابن مبارک	
۵۔	انشائے فیضی عرف لطیفۂ فیاضی	مرتب: نورالدین محمد عبداللہ	

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	کیفیت
۶ ۔	تاریخ راجستھان	ٹاڈ	
۷ ۔	تاریخ رشیدی	مرزا حیدر دغلات کشمیری	تاریخ مغول کاشغر و مغولستان ۔ دو حصہ
۸ ۔	تاریخ شیر شاہی	عباس خاں بن شیخ علی شیروانی	یہ عباس خاں کی تصنیف "تحفہ اکبر شاہی" کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ کتاب اکبر کے حکم سے لکھی گئی تھی ۔ تین ابواب میں
۹ ۔	تاریخ فرشتہ = گلشن ابراہیمی	ملا محمد قاسم بن ہندو شاہ استرابادی معروف بہ فرشتہ	از دورۂ غزنویان تا ۱۰۱۵ھ ۔ در دو جلد
۱۰ ۔	تذکرہ ہفت اقلیم	ملا امین احمد رازی (زمانۂ تالیف ۹۹۶ھ تا ۱۰۰۲ھ)	تاریخ و جغرافیہ و ذکر بلاد ہفت اقلیم اور ۱۵۶۰ شاعروں عارفوں، امیروں اور بادشاہوں کا تذکرہ
۱۱ ۔	ترجمہ آئین اکبری (انگریزی)	بلاک مین (= بلاخمن)	
۱۲ ۔	توزک جہانگیری = جہانگیر نامہ	جہانگیر بادشاہ	سرگذشت خود از سال جلوس بہ بعد
۱۳ ۔	خلاصۃ التواریخ	سبحان سنگھ دھیر بٹالوی	از ابتدا تا وفات عالمگیر پادشاہ
۱۴ ۔	دیوان فیضی	شیخ فیضی بن مبارک	
۱۵ ۔	ذخیرۃ الخوانین	شیخ فرید بھکری	
۱۶ ۔	رقعات ابوالفضل	ابوالفضل بن مبارک	بقول آزاد یہ شیخ کی (پرائیویٹ) تحریریں ہیں
۱۷ ۔	زبدۃ التواریخ	نور الحق المشرقی الدہلوی البخاری ابن شیخ عبدالحق	معز الدین محمد بن سام تا دورۂ جہانگیر شاہ

[1] "دربار اکبری" میں "تاریخ زیدین" کا بھی ذکر ہے۔ وہ شاید یہی ہو؟

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	کیفیت
۱۸۔	سفینۂ خوشگو	بندرابن داس خوشگو	درسہ حصص
۱۹۔	سلیمان و بلقیس (مثنوی)	شیخ فیضی	
۲۰۔	سیر العارفین	شیخ گدای کنبو	مقالات وحالات مشائخ
۲۱۔	سیر المتاخرین	نواب غلام حسین خاں طباطبائی	از تیمور شاہ تا ۱۱۹۵ھ درسہ دفتر ــ کلکتہ سے ۱۲۴۸ھ میں چھپی
۲۲۔	شاہجہاں نامہ	ملا عبد الحمید لاہوری	عہد شاہجہانی کی تاریخ
۲۳۔	طبقات اکبری[1]	مولانا نظام الدین احمد بن محمد مقیم الہروی	دریک مقدمہ و نہ طبقہ (یعنی دہلی، دکن گجرات، بنگالہ، مالوہ، جونپور، سندھ، کشمیر، ملتان) ویک خاتمہ ــ تا سنہ الف
۲۴۔	عالمگیر نامہ	محمد کاظم بن منشی محمد امین قزوینی	تاریخ حکومت دہ سال اول عالمگیر بادشاہ
۲۵۔	فرہنگ جہانگیری	میر جمال الدین انجو	فرہنگ عربی و فارسی بہ زبان فارسی ــ جہانگیر بادشاہ کے نام معنون۔
۲۶۔	کشکول	ابو الفضل علامی	آزاد کا دعوا کہ اس کا ایک نسخہ انھوں نے دیکھا۔
۲۷۔	کلمات الشعرا	محمد افضل سرخوش[2]	۱۶۹ شاعروں کا تذکرہ
۲۸۔	مآثر الامرا	نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں و عبد الحیٔ	۱۵۰۰ء سے ۱۷۸۰ء تک کے کُل ۷۳۵ امرائے سلطنت کے حالات

[1] اس کتاب کا نولکشوری ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۷۵ء راقم کو جناب احسان آوارہ (باندہ) نے از راہِ علم نوازی عنایت کیا ہے۔

[2] "دربار اکبری" میں "تذکرۂ پرجوش" کا بھی حوالہ ہے ــ شاید وہ یہی ہو۔

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	کیفیت
۲۹۔	مآثر رحیمی	مرتب: ملا عبدالباقی	خانخاناں کے لیے کہے گئے قصیدوں کا مجموعہ۔ شاعر کا حال اور قصیدے کی تقریب وغیرہ کا بیان بھی
۳۰۔	مرکز ادوار (مثنوی)	شیخ فیضی بن مبارک	
۳۱۔	مکاتبات ابوالفضل = انشائے ابوالفضل	ابو الفضل بن مبارک مرتب: عبدالصمد بن افضل محمد	درسہ دفتر — دفتر اول: بادشاہ کی طرف سے مراسلے دفتر دوم: اپنے خطوط وغیرہ دفتر سوم: اپنی کتابوں کے دیباچے
۳۲۔	مکتوب شیخ عبدالحق محدث دہلوی	؟	
۳۳۔	منتخب التواریخ	ملا عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی	غزنویوں سے اکبر کے عہد تک کی تاریخ
۳۴۔	منتخب اللباب = تاریخ خانی خاں	محمد ہاشم مخاطب بہ ہاشم علی خاں وبعدہٗ خانی خان نظام الملک	امیر تیمور تا محمد شاہ بادشاہ در دو حصہ۔ یعنی "بر تاریخ فرشتہ" ۔ کلکتہ میں چھپی
۳۵۔	نفائس المآثر (یہ نام تاریخی ہے)	میر علاء الدین قزوینی کامی	
۳۶۔	نل دمن مثنوی	شیخ فیضی	
۳۷	ہفت کشور مثنوی	شیخ فیضی	

"دربارِ اکبری" میں ان چند کے علاوہ اور بھی کئی کتابوں کے ضمناً حوالے آتے ہیں بعض اقتباس اِس طرح ہیں:

"ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ آئی۔ اُس کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ اُس وقت تک ہندوستان کے بادشاہی دفتروں کے کاغذ ہندو ملازم ہندی اصول کے بموجب رکھتے تھے۔" (دربارِ اکبری ص ۳۶۱)

"ایک کتاب دیکھی جو زبان لاطینی (رومی) سے ترجمہ ہوئی تھی۔" (ایضاً ص ۶۸)

"ڈیلیٹ ایک ڈچ سیاح کا بیان"؛ (ایضاً ص ۴۸۵)

"خانی، رقعات عالمگیری اور مشہور حکایتوں اور روایتوں سے عالمگیر اور نواب سعادت علی خاں مرحوم کے حالات انھیں سنوایئے اور ان کے لطایف و حکایات سے کان بھرتے رہیے"۔ (ایضاً ص ۱۷)

ایک مقام پر آزاد نے یہ ذکر بھی کیا ہے کہ

"اکبری اور جہانگیری سندیں اُن کے پاس موجود ہیں۔ میں نے سیاحت بمبئی میں وہ کاغذات بچشم خود دیکھے ہیں"۔ (ایضاً ص ۶۱)

غرض اس کتاب کی تیاری میں آزاد نے کم و بیش ہر طرح کے مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

"دربار اکبری" میں سب سے زیادہ جس کتاب کا ذکر آیا ہے وہ ملا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" ہے۔ اس کی سرسری ورق گردانی سے بھی اندازہ ہو جائے گا کہ نصف سے زاید اوراق پر "منتخب التواریخ" کا ذکر موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد اِس کتاب کے مندرجات کو مختلف معروف کتابوں کے مقابلے میں لائق ترجیح سمجھتے تھے۔ ایک مقام پر انھوں نے تحریر کیا ہے کہ:

"جو میں نے لکھا ہے یہ ملاّ صاحب کا قول ہے اور یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ دکن کے فرشتہ کو پنجاب کی کیا خبر؟" (دربار اکبری ص ۱۸۶)

اسی طرح صفحہ ۰، وغیرہ پر بھی ہے۔ ایک سے زاید مقاموں پر آزاد نے بدایونی کے حالات میں اپنے معاملات کے عکس کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے مثلاً:

"اُن کی تاریخ اپنے مضمون و مقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ الماری کے سر پر تاج کی جگہ رکھی جائے ... باوجود اِن باتوں کے جو کم نصیبی اُن کی ترقی میں سنگِ راہ ہوئی وہ یہ تھی کہ زمانے کے مزاج سے اپنا مزاج نہ ملا سکتے تھے ...
قباحت یہ تھی کہ جس طرح طبیعت میں جوش تھا، اسی طرح زبان میں زور تھا۔
اِس واسطے ایسے موقع پر کسی دربار اور کسی جلسے میں بغیر بولے رہا نہ جاتا تھا۔
اِس عادت نے مجھ ناقابل کی طرح ان کے لیے بھی بہت سے دشمن بہم پہنچائے تھے"۔
(ایضاً ص ۴۲۰)

باوجود اس کے قاری کے ذہن میں بار بار یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ آزاد نے اپنی کتاب میں بدایونی

کی کتاب کا جواب پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقاموں پر یہ صورت زیادہ کھُل گئی ہے مثال کے طور پر:

"لطیفہ۔ ملاّ صاحب کے رونے کا مقام تو یہ ہے کہ ۹۹۸ھ کے جشن میں ....
میر عبدالحیٔ صدر جہاں مفتی کل ممالک ہندوستان نے ... جام طلب کر کے
نوش جاں فرمایا۔" (ایضاً ص ۷۲)

اسی طرح ہے کہ:

"ملاّ صاحب کو طرز قدما پسند ہے اِس لیے اُس زمانے کی شاعری پر طنز
کر کے کہتے ہیں ایسی شاعری جس کا زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا... اُس سے
توبۂ نصوح کرنی اچھی ہے۔" (ایضاً ص ۲۲۶)

بیان واقعات میں زیب داستان کے لیے کچھ کچھ بڑھا لینا معمولات میں سے ہے۔ "دربار اکبری" بھی اس معاملے میں کچھ مختلف نہیں ہے۔ خود آزاد کو بھی اِس بات کا بخوبی احساس تھا، چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"استغفر اللہ کدھر تھا اور کدھر آن پڑا، مگر باتوں کے مصالحہ بغیر تاریخی
حالات کا بھی مزہ نہیں آتا۔" (ایضاً ص ۵۹۹)

اور آزاد نے بوجوہ شعوری طور پر مختلف طریقوں سے کتاب کو مزیدار بنا دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اِسے محض تاریخی واقعات کا خشک مجموعہ نہیں رہنے دیا ہے۔ اکبر کی اصلاحات کی تائید میں انھوں نے اپنے وقت کی ایک دلچسپ صورت حال کا بیان کیا ہے:

"اِس ملک پنجاب میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ چار خاوند حاضر
ہیں۔ ہر شخص کے ساتھ ایک ملاّ صاحب منڈا ہوا سر، ناف تک ڈاڑھی، پاؤں
تک کرتہ، نیلا لنگ، ہلاس دانی ہاتھ میں، بہ حلف شرعی فرماتے ہیں کہ میں نے
بزبان خود نکاح پڑھا، تو چار پانچ مسلمان با ایمان گواہ کہ مجلس عام میں پڑھا
گیا اور ماں باپ نے پڑھوایا۔" (دربار۔ ص ۹۰ حاشیہ)

اللہ جانتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کتنے پیش آتے ہوں گے۔ اور کتنے آزاد کی زندہ دلی نے اختراع کیے ہوں گے۔ بہر نوع اتنی بات میں شبہ نہیں کہ ملاّ صاحب کی ہیئت کذائی کا یہ بیان مسلمانوں کے لیے نہایت افسوسناک ہے۔

"دربارِ اکبری" کو آزاد نے ایک مربوط و مسلسل کتاب کے طور پر نہیں لکھا تھا۔ اُنھوں نے مختلف اشخاص اور افراد کے حالات الگ الگ اور مختلف وقتوں میں لکھے تھے۔ ان متفرق اجزا کو مرتب کرنے کا کام اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے محمد ابراہیم منصف امرتسر نے کیا تھا۔ مرتب نے بھی اس بارے میں لکھا ہے:

"حضرت مرحوم نے تمام حالات اعیان دربارِ اکبری کے علاحدہ علاحدہ کاغذوں میں ترتیب دے کر رکھ چھوڑے تھے اور غالباً اُسی ترتیب سے اُن کو کتاب میں درج کرنا منظور تھا" (مقدمۂ دربار ص ۳)

مرتب کا خیال بطورِ مجموعی صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن بعض اجزا کے بارے میں صورتِ حال غالباً کچھ اور ہو سکتی تھی مثلاً عبدالرحیم خانخاناں کے حالات میں جو تمہید ہے، وہ اس بات کی زیادہ متقاضی ہے کہ اسے بیرم خاں کے ذکر سے ملحق کر دیا جائے۔

مکتوباتِ آزاد کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض حصوں کو لکھ لینے کے بعد آزاد نے اپنے قدرشناسوں کے پاس اُن کی رائے کے لیے بھیجا تھا۔ بخوبی امکان ہے کہ اُن رایوں کی روشنی میں آزاد نے کچھ ردوبدل بھی کی ہو۔ ایک خط کا اقتباس یہ ہے:

"دربارِ اکبری" کاتب سے بھی لکھواتا ہوں۔ آپ بھی لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے کچھ ہو جائے۔ اب خدا کے فضل سے کئی حال آپ کے سنانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ فیضی کے حال پر نظرِ ثانی کی تو مذہب کے سلسلے میں مجھے خیال آیا کہ دیکھیے آپ اور آپ کے بھائی صاحب اِسے سُن کر اور پڑھ کر کیا فرماتے ہیں۔ خدا وہ وقت دکھائے ؎

وصل اُن کا خدا نصیب کرے ۔۔۔ میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

(مکتوبات ص ۳۷ تا ۳۸)

اس میں شک نہیں کہ فکر و خیال کے آداب اور زبان و بیان کے اصول سے متعلق اپنی کتاب میں جا بجا آزاد نے بہت اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ مذہبی بحثوں کے بارے میں اصولوں کی حد تک تو اُن کا موقف یہی تھا کہ:

"تم اپنی فکر کرو۔ وہاں تمھارے اعمال سے سوال ہوگا۔ یہ نہ پوچھیں گے کہ اکبر کے فلاں امیر نے کیا کیا لکھا۔ اُس کا عقیدہ کیا تھا اور تم اُس کو کیسا جانتے تھے"
(دربار ص ۳۶۸)

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آزاد بھی آخر انسان ہی تھے اور انسان کے معمولات میں ہے کہ :

"اپنے پیارے اور پیار کرنے والے کی ہر بات پیاری ہوتی ہے"

قدرتی طور پر اپنے پیاروں کے تصور اور غیروں کی خوبیوں پر عموماً نگاہیں نہیں جمتیں۔ اکبر آزاد کو محبوب تھا۔ اُس کے حالات میں اس کی اور اس کے مقربوں کی شعوری اور غیر شعوری تائید و حمایت میں کوئی روایت سامنے آتی تو دل اُس کو نظر انداز کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اپنے اِس عمل کی کیفیت کا احساس آزاد کو رہا ہے چنانچہ ایک موقع پر انھوں نے اس کا اظہار اِس طرح کیا ہے :

"لوگ کہیں گے کہ آزاد نے 'دربار اکبری' لکھنے کا وعدہ کیا تھا اور شاہنامہ لکھنے لگا" (ایضاً ص ۳۵)

اس "شاہنامے" میں دوسرے بادشاہوں یا اکبری عہد کے "قبطیوں" کے بارے میں جو کچھ ہے اُس پر کسی کا ناک بھوں چڑھانا بیکار ہے۔ اِس باب میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ جس زمانے میں آزاد نے اِس کتاب کو مکمل کیا ہے، اُن پر جذب کی کیفیت طاری تھی اور اُس حال میں جو کچھ اُن کے قلم سے نکلا ہے، وہ فی الواقع اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے اور اُس میں آزاد خود اپنے احوال کا عکس دیکھتے تھے۔ لکھتے ہیں :

"خدا حاسدوں کا منہ کالا کرے جنھوں نے دونوں بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو روسیاہی کر دیا۔ آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بدا صالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے۔ پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ ہے اور خدا محفوظ رکھے ... الخ" (ایضا ص ۲۲۴)

آزاد نے اکبر کے مقابلے میں بعد کے بادشاہوں کے معاملات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"یہ یلغاریں بابری بلکہ تیموری و چنگیزی خون کے جوش تھے کہ اکبر پر ختم ہو گیے۔ اُس کے بعد کسی بادشاہ کے دماغ میں اُن باتوں کی بو نہ رہی۔ بنیے تھے کہ گدی پر بیٹھے تھے۔ اُن کی قسمتیں لڑتی تھیں۔ انھیں گویا خبر نہ تھی کہ ہمارے باپ دادا کون تھے اور انھوں نے کیونکر یہ قلعے، یہ ایوان، یہ تخت، یہ درجے تیار کیے تھے جن پر ہم چڑھے بیٹھے ہیں" (دربار ص ۲۷)

عام ہے کہ اپنے کی ترقی کے ذکر سے جی خوش ہوتا ہے اور اُس کی تکلیف کے بیان سے

دل تڑپ جاتا ہے۔ اصولی طور پر مورّخ کی ذمہ داریاں جو بھی ہوں لیکن اُس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ اصول اور آئین کی باتیں درست سہی لیکن وہ اپنے دل کو کہاں لے جائے؟ ایک جنگی معرکے کا بیان کرتے ہوئے ایک سپاہی سے آزاد نے جو سوال کیا ہے اور پھر قارئین کو جو نصیحت کی ہے اُس کی داد نہ دینا بھی ظلم ہے:

"اختیار الملک نے کہا: 'من سید بخاریم، مرابگذار'۔
سہراب بیگ نے کہا: 'تو اختیار الملک ہستی۔۔۔' یہ کہا اور جھٹ سرکاٹ لیا۔ لہو ٹپکتے سر کو دامن میں لے کر دوڑا۔ حضور میں نذر گزران کر انعام پایا۔ واہ آغا سہراب! اسی منہ سے کہو گے: 'فدایت شوم یا مولیٰ'۔ میرے دوستو! ایسے وقت پر خدا اور خدا کے پیاروں کا پاس رہے تو بات ہے۔ نہیں تو یہ باتیں ہی باتیں ہیں۔"

(دربار ص ۳۴)

میدانِ جنگ کی ہولناکیوں کے ذکر کے باوجود نیکیوں کی یہ تلقین بھی آزاد کا کارنامہ ہے۔ آزاد نے عام مورّخین کے عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ بُرا کرتے ہیں کہ (غیر مسلموں کے لیے) ملعون، کافر، اور سگ بیدین وغیرہ الفاظ سے زبان کو آلودہ کرتے ہیں۔" (ایضاً ص ۳۰۸)

بات بالکل صحیح ہے لیکن شاید مسلک کی گرمی میں، زبان پر اپنی حاکمانہ قدرت دکھانے کے لیے یا ممکن ہے دل کے جذبے، ایمان کے جوش اور بیان کے زور میں غیر مسلموں نہیں بلکہ اُن لوگوں کے واسطے جن کو دنیا والے مسلمان کہتے آئے ہیں اِس قسم کے بہ کثرت توصیفی کلمات کے استعمال سے خود مولانا محمد حسین آزاد نے اِسی "دربارِ اکبری" کو مزیّن اور آراستہ کیا ہے چنانچہ بعض ترکیبیں یہ ہیں:

بدنیت، سفلے، شیطان طینت، بے حیا بے شرم، مسجدوں کے بھوکے، جعلساز بزرگانِ عالم نما، بے لیاقت شیطان، نمکحرامی کا مصالح، روٹی توڑ اور شُہدے چٹ ملّانے، سردار مُردار وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے، اِس مقام پر اِتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "آبِ حیات" کی عبارت میں بلاغت کا وصف نمایاں اور زبان اس کی فارسی کے رنگ ڈھنگ سے قریب تر ہے۔ اِس کے برخلاف "دربارِ اکبری" کا طرزِ بیان واضح اور سلیس ہے اور اس کی زبان

پر ہندوستانی روزمرہ کا اثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ اِس تبدیلی میں کتاب کے موضوع کو بھی کم و بیش دخل ہو سکتا ہے اور خود آزاد کے مخصوص حالات کو بھی۔ اردو کے ایک عام قاری کے لیے "دربارِ اکبری" کی زبان سریع الفہم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ پُرکشش معلوم ہوتی ہے۔ محض نمونے کے طور پر دو اقتباس درج ذیل ہیں:

"نئی سلطنت کا بنانا اور اپنے حسب مطلب بنانا اور پُرانی جڑوں کو زمین کی تہ میں سے نکالنا' اُنھیں لوگوں کا کام تھا جو کر گئے۔ خوشامد کیا آسان بات ہے۔ پہلے کوئی کرنی تو سیکھی۔"

اور:

"خدا تر نوالہ دے خواہ سوکھا ٹکڑا، باپ کا ہاتھ بچّوں کے رزق کا چمچہ بلکہ اُن کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔"

"دربارِ اکبری" کی تصنیف کے کام کی سرپرستی سالار جنگ کر رہے تھے۔ ابھی کام کا سلسلہ جاری تھا کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ دو طالب علموں نے آکر اطلاع دی۔ اِس کا ذکر آزاد نے اِس طرح کیا ہے:

" 'دربارِ اکبری' درست کر رہا ہوں۔ اُن کے نام پر کر دوں گا۔ دونوں (طالب علم) خوش ہو گیے اور کہا کہ: 'ضرور کیجیے۔ یہ عمارت عظیم الشان ان کے نام پر یادگار ہو گی جو کبھی منہدم نہ ہو گی۔'

میں نے کہا:

'بلکہ دو تین اور بھی'

اب آپ کی خدمت میں عرض یہ ہے... پھر اسے سنبھالتا ہوں۔ خدا و مولیٰ اسد اللّٰہ الغالب سرانجام کو حد انجام پر پہنچانے والے ہیں مگر مشورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا وہی ڈڈیکیشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجا دوں یا اُسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثۂ جانکاہ پر عالم نے نالہ و زاری کے معمولی حق ادا کیے اور یادگار کے لیے تاریخیں اور نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ یہ کتاب اُن کے نام پر لکھتا ہوں کہ اُن دنوں زیرِ قلم تھی ع

چہ کند بینوا ہمیں دارد۔"

(مکتوبات ص ۵۲ تا ۵۳)

"دربار اکبری" آزاد کی زندگی میں چھپ نہیں سکی اِس لیے ڈیڈیکیشن کی آرزو حسرت بن کر دل ہی میں رہ گئی۔

مطبوعہ کتاب میں دوسری بڑی کمی یہ پیدا ہوگئی کہ اس کے لیے آزاد نے بہت کوشش سے جو تصویریں حاصل کی تھیں، اُن میں سے ایک بھی اِس میں شامل نہیں کی جاسکی۔ تصویروں سے متعلق آزاد کے بعض بیان یہ ہیں:

"آپ نے تصویروں کا کچھ بند و بست نہ فرمایا۔ مجھے اکبر کی ایک تصویر ہاتھ آئی کہ تین چار تُرک عورتیں بیٹھی ہیں اور دو تین برس کا بچہ بیچ میں کھیلتا پھرتا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ شمع روشن ہے۔ جھنجھنے وغیرہ سامنے پڑے ہیں۔ یہ اکبر کے ابتدائی حالات میں لگانی واجب ہے۔

ایک ایسی ہی پرانی تصویر اور ملاّ دو پیازہ کی ہاتھ آئی۔ بیربل کے ساتھ اُسے بھی لگانا واجب ہے، اگرچہ کتاب سے ملاّ دو پیازہ کی اصل معلوم نہیں ہوتی مگر مسخروں اور بھانڈوں سے اس کا شملہ دستار بیربل کی دُم میں مضبوط باندھا ہے۔

راجہ مان سنگھ کی تصویر بھی سندی ہے۔ سرکار الور سے منگائی ہے۔"
(مکتوبات ص ۵۹ تا ۶۰)

اور:

"میں نے بڑی کوشش سے چند تصویریں مہاراجہ جے پور کے پوتھی خانہ سے حاصل کیں۔ اُن میں جو اکبر کی تصویر ملی وہ سب سے زیادہ معتبر سمجھتا ہوں اور اُسی کی نقل سے اِس موقع کا تاج سر کرتا ہوں۔" (دربار ص ۱۴۴ تا ۱۴۵)

لیکن مولانا کے دل کا یہ ارمان بھی دل ہی میں رہ گیا اور نہایت محنت اور کوشش سے جمع کی گئی سب تصویریں بہ گمانِ غالب ضایع ہوگئیں۔

"دربار اکبری" کو سب سے پہلے مصنف کے ایک عزیز شاگرد مولوی میر ممتاز علی نے اپنے مطبع رفاہ عام لاہور میں اپنے مقدمہ کے ساتھ چھپوا کر شایع کیا تھا۔ اُس کے بعد مصنف کے صاحبزادے محمد ابراہیم مصنف امرتسر نے ۱۹۱۰ میں کتاب کو اس دعوے کے ساتھ چھپوایا کہ:

"بہ حیثیت مجموعی یہ حضرت قبلہ مرحوم کی اصلی تصنیف اور ان کے دستخطی

مسودات کے مطابق ہے۔"

محمد ابراہیم نے اپنے مقدمے میں مولوی ممتاز علی کے بعض بیانوں کی تردید کی ہے اور کتاب کے متن میں ترتیب وغیرہ کی جو خرابیاں تھیں ان کو درست کیا ہے لیکن اب بھی تتمہ کے بعض اجزا کے بارے میں خیال ہوتا ہے کہ شاید ان کی جگہ کوئی اور تھی۔

"دربار اکبری" اپنے زمانے کی مقبول تصانیف میں سے ہے۔ اس کتاب کے کم سے کم دو ایڈیشن اور بھی نکلے اور یہ دونوں ۱۹۱۰ کے مطبوعہ متن کی نقل تھے۔ ۱۹۳۷ میں محمد باقر گجرات گورنمنٹ کالج نے اس کتاب کو شیخ مبارک علی کی عالمگیر الکٹرک پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا ان میں سے کسی بھی ایڈیشن میں نہ تو تصویریں ہیں اور نہ وہ ڈڈیکیشن ہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ محمد باقر نے اتنا ضرور کیا ہے کہ بعض باتوں کے انتساب میں غلطی اور تکرار وغیرہ کی نشاندہی کر دی ہے مثال کے طور پر حکیم ہمام اور حکیم ابوالفتح کے منسوب بعض مقولوں کے لیے حاشیہ پر لکھا ہے:

"یہی مقولے صفحہ ۶۶۵ پر حکیم ابوالفتح کے نام سے لکھے ہیں۔ اُن کو میراث میں ملے ہوں گے ۱۲۔ محمد باقر" (دربار ص ۶۷۲)

"دربار اکبری" اب تقریباً نایاب ہو چلی ہے۔ اس لیے "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" نے فوری طور پر اس کے متن کو شائع کر دینے کا مثبت فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے کہ کونسل کے اس اقدام کی عام طور سے پذیرائی ہوگی۔ فقط۔

محمد انصار اللہ
۲/۱۱۷ سرسید روڈ
سرسید نگر، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

دوشنبہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۹ء

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

جلال الدین اکبر شہنشاہِ ہندوستان

امیر تیمور نے ہندوستان کو زورِ شمشیر سے فتح کیا مگر وہ ایک بادل آیا تھا کہ گرجا برسا اور دیکھتے دیکھتے کھل گیا۔ بابر اس کا پوتا[1] چوتھی پشت میں ہوتا تھا۔ سوا سو برس کے بعد آیا۔ اس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی کہ اسی رستے ملکِ عدم کو روانہ ہوا۔ ہمایوں اس کے بیٹے نے قصرِ سلطنت کی بنیاد کھودی اور کچھ اینٹیں بھی رکھیں مگر شیر شاہ کے اقبال نے اُسے دم نہ لینے دیا۔ اخیر عمر میں اس کی طرف پھر ہوائے اقبال کا جھوکا آیا تو عمر نے وفا نہ کی۔ یہاں تک کہ ۹۶۳ھ ہجری میں یہ بااقبال بیٹا جانشیں ہوا۔ تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ اس نے سلطنت کی عمارت کو انتہائے بلندی تک پہنچایا۔ اور بنیاد کو ایسا استوار کیا کہ پشتوں تک جنبش نہ ہوئی۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ پھر بھی اپنی نیک نامی کے کتابے ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں انہیں گھس گھس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں اتنا ہی چمکتے آتے ہیں۔ اگر جانشیں بھی اسی رستے پر چلتے تو ہندوستان کے رنگا رنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے۔ بلکہ وہی آئین ملک ملک کے لئے آئینہ ہوتے۔ اس کے حالات بلکہ بات بات کے نکتے اوّل سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں ؂

جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا۔ ایک دن ماں نے اس کی ضیافت کی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی۔ اور وہ دیکھتے ہی اس کے حسن و جمال کا عاشقِ شیدا ہو گیا۔ دریافت کیا تو

---

[1] اکبر ولد ہمایوں۔ ولد بابر۔ ولد عمر شیخ مرزا۔ ولد ابوسعید مرزا۔ ولد سلطان محمد میرزا۔ ولد میران شاہ۔ ولد امیر تیمور صاحبقران ؂

لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام ہے۔ ایک سید بزرگوار شیخ ژندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں۔ اور آپ کے بھائی مرزا ہندال کے استاد ہیں۔ یہ اُن کے خاندان کی بیٹی ہے۔ ہمایوں نے چاہا کہ اسے عقد میں لائے۔ ہندال نے کہا۔ مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے استاد کو ناگوار ہو۔ ہمایوں کا دل ایسا نہ آیا تھا کہ کسی کے سمجھائے سمجھ جاتا۔ آخر محل میں داخل کر لیا ؛

لیکن حضرتِ عشق نے شادی کی تھی۔ اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر جُدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ ابھی پنجاب میں ہے ابھی سندھ میں ہے۔ ابھی بیکانیر جیسلمیر کے ریگستان میں سرگرداں چلا جاتا ہے۔ پانی ڈھونڈھتا ہے تو منزلوں تک میسر نہیں۔ جودھپور کا رُخ ہے کہ ادھر سے اُمید کی آواز آئی ہے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اُمید نہ تھی دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔ ناچار پھر اُلٹے پاؤں پھر آتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں ہیں۔ مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہے کئی لڑائی کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اُٹھائی پڑیں۔ مگر اسے تعویذ کی طرح گلے سے لگائے پھرا۔ جب وہ جودھپور کے سفر میں تھے تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا۔ اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے۔ ایامِ ولادت بہت نزدیک تھے۔ اس لیے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا۔ اور آپ آگے پرانی لڑائی کو تازہ کیا۔ اسی عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک۔ اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ تارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اُٹھی۔ مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا! آفتاب ہو کر چمکے گا۔ اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے ؛

ترکوں میں رسم ہے کہ جب کوئی ایسی خوشخبری لاتا ہے تو اسے کچھ دیتے ہیں۔ ایک سفید پوش اشراف ہوگا تو اپنا چغہ ہی اُتار کر دے دیگا۔ امیر ہے تو اپنی دستگاہ کے بموجب خلعت اور گھوڑا۔ نقد و جنس جو جو کچھ ہو سکے گا دیگا۔ سب کی ضیافتیں کریگا۔ نوکروں کو انعام و اکرام سے خوش کریگا۔ ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مُشک نافہ ہے۔ اسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مُشک سب کو دے دیا کہ شگون خالی نہ جائے۔ اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجو۔ اس بچے کی شمیم اقبال مُشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔ ولادت کی تاریخ ہوئی ع شبِ یکشنبہ و پنج رجب است بسنہ ۹۴۹ ہجری ؛ بے سامان بچے کو جس طرح خدا نے تمام سامان ملک و دولت کے دئیے۔ اسی طرح ولادت کے وقت ستاروں کو بھی اسی نظام کے ساتھ ہر ایک برج میں واقع کیا کہ آج تک نجومی حیران ہوتے ہیں۔ ہمایوں خود ہیئت اور نجوم کا ماہر تھا۔ وہ اِس کے

زائچے کو اکثر دیکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کئی باتوں میں امیر تیمور سے بھی زیادہ مبارک ہے ◆

اکبر ابھی حمل میں تھا۔ اور میر شمس الدین محمد کی بی بی بھی حاملہ تھیں۔ بیگم نے اُن سے وعدہ کیا تھا۔ کہ میرے ہاں بچّہ ہوگا۔ تو تمہارا دود اُسے دونگی۔ اتفاق یہ کہ جب اکبر پیدا ہوا۔ تو اُن کے ہاں ابھی کچھ نہ ہوا تھا۔ بیگم نے پہلے آپ دودھ پلایا۔ پھر اُن کے دودھ نہ رہا تو بعض بعض اور بیبیاں بھی دودھ پلاتی رہیں چند روز کے بعد جب ان کے ہاں بچہ ہوا تو انہوں نے دودھ پلایا اور زیادہ تر انہیں کا دودھ پیا یہی سبب ہے کہ اکبر انہیں جیجی کہا کرتا تھا

اکبر میں بہت سی باتیں تھیں کہ دوربینی کی عینک اور دور اندیشی کی آنکھیں آگے دکھاتی تھیں۔ بہت سے کارنامے تھے کہ اس کی جرأت اور ہمت کے جوش انہیں سرانجام دیتے تھے۔ اکثر چغتائی مورخوں نے انہیں پیشین گوئی اور کرامات کے رنگ میں جلوہ دیا ہے۔ وہ لوگ اسکے وفاپرست نمک خوار تھے اور ایشیائی انشاپردازی کی اُن پر گرم مصالح۔ آزاد سب باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنی بات ہے کہ ایسے با اقبال اور نیک نیت لوگوں میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ عام لوگوں میں نہیں ہوتیں یہاں ان میں سے چند حکایتیں نقل کرتا ہوں اس سے یہ مطلب نہیں کہ انہیں سچ سمجھو۔ جو بات واقعی ہے اور دل کو لگتی ہے۔ خود معلوم ہو جاتی ہے۔ دکھانا یہ منظور ہے کہ اس زمانے میں ایسی ایسی باتیں بادشاہوں کی طرف منسوب کرتے اور فخر سمجھتے تھے ◆

جیجی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اکبر نے کئی دن دودھ نہ پیا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ جیجی نے جادو کر دیا ہے

ل اکبر کے طالع وقت میں ہند کے جوتشی اور یونان کے منجم اختلاف کرتے ہیں۔ ایک کہتے ہیں اسد ہے۔ ایک کہتے ہیں سنبلہ ہے۔ جب میر فتح اللہ شیرازی آئے تو انہیں دونوں زائچے دکھائے وہ ہیئت اور نجوم میں مہارت کلی رکھتے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر کہا کہ منجمان ہند بموجب تحقیق قدما کے فلک البروج کی حرکت کو نہیں مانتے۔ اہل یونان میں حکمائے متقدمین ورارسطو نے متحرک مانا ہے۔ ابرخس حکیم متحرک مانتا ہے مگر مقدار حرکت کچھ نہیں لکھتا۔ بطلیموس نے لکھا ہے کہ سو برس میں ایک درجہ حرکت کرتا ہے۔ ۳۶ ہزار سال میں دورہ تمام کرتا ہے۔ اکثر حکما کہتے ہیں کہ ۷۰ برس میں ایک درجہ ۲۵ ہزار دو سو برس میں دورہ پورا کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۶۴ برس میں ایک درجہ یعنی ۲۲ ہزار ۹ سو ۸۰ برس میں دورہ کرتا ہے۔ ان حسابوں سے اس وقت تک ۱۷ درجے کا فرق ہو گیا۔ کیونکہ ہندی رصد ۱۱۰۰ برس پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ ۱۱۰۰ کو ۶۴ پر تقسیم کیا تو ۱۷ نکلے پس معلوم ہوا کہ ۱۷ درجے کا فرق ہونا چاہیئے۔ غرض میر موصوف نے بھی رصد جدید کے بموجب اسد ہی طالع قرار دیا اور کہا کہ سنبلہ ۱۷ درجہ اپنی جگہ سے حرکت کر گیا ہوگا اور اسد طلوع ہو گیا ہوگا ◆ ہمایوں کو علم ہیئت میں مہارت کامل تھی۔ بیٹے کا زائچہ سامنے رکھ کر اکثر دیکھا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا۔ مصاحبان خاص کا بیان ہے بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ حجرے کا دروازہ بند کر دیتا۔ تالیاں بجا کر اچھلتا اور مارے خوشی کے چک پھیریاں لیا کرتا تھا۔ اور یہ تو اکثر کہا کرتا تھا کہ اس بچے کا زائچہ کئی باتوں میں امیر تیمور صاحبقران کے زائچے پر فائق ہے ◆

ل۲ میر شمس الدین محمد کا مفصل حال دیکھو تتمے میں۔

یہ چاہتی ہے کہ اور کوئی دودھ نہ پلائے تیجی کو اس بات کا بڑا رنج تھا۔ ایک دن اکیلی اکبر کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اور غم سے افسردہ تھی۔ بچہ چپکا اس کا مُنہ دیکھ رہا تھا۔ یکایک بولا کہ جیجی غم نہ کھاؤ۔ دودھ تمہارا ہی پیونگا اور خبردار اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا جیجی حیران ہوئی۔ اور ڈر کے مارے کسی سے نہ کہا*

جب اکبر بادشاہ ہوا تو ایک دن شکارگاہ میں شکار کھیلتے کھیلتے تھک کر درخت کے نیچے اُتر پڑا کہ آرام لے۔ اُس وقت فقط کوکہ یوسف محمد خاں پاس تھا۔ ایک بڑا اژدہا کہ جس کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا۔ نکلا۔ اور ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اکبر بے خطر جھپٹا۔ اُس کی دم پکڑ کر کھینچی۔ اور پٹخ پٹخ کر مار ڈالا۔ کوکہ حیران ہوا۔ اور اکبر یہ ماجرا ماں سے بیان کیا۔ اُس وقت جیجی نے وہ راز سربستہ بھی کھولا*

جب اکبر کی ماں حاملہ تھی۔ تو ایک دن بیٹھی سی رہی تھی۔ یکایک کچھ خیال آیا۔ سوئی سے پنڈلی کو گودا۔ اور اُس میں سرمہ بھرنے لگی۔ ہمایوں باہر سے آگیا۔ پوچھا۔ بیگم یہ کیا کرتی ہو؟ اُس نے کہا میرا جی چاہا کہ ایسا ہی گل میرے بیٹے کے پاؤں میں بھی ہو۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ اکبر پیدا ہوا تو اس کی پنڈلی میں بھی ویسا ہی سُرمئی نشان تھا*

ہمایوں سندھ کے ملک میں مدت تک ٹکراتا پھرتا رہا کہ شائد قسمت یاوری کرے! ور ایسی صورت بن جائے کہ پھر ہندوستان پر فوج کشی کرنے کا سامان بہم پہنچ جائے لیکن نہ تدبیر چلی نہ شمشیر۔ اسی عرصے میں بیرم خاں آن پہنچے۔ انہوں نے آکر سب حال سُنے اور صورت حال کو دیکھکر دربار میں گفتگو اور خلوت میں صلاحیں ہوئیں بیرم خاں نے کہا کہ ان بے مروتوں سے ہرگز اُمید نہیں۔ اور مروت کریں تو اس ریگستان میں کیا خاک ہے جو کچھ ہاتھ آئے۔ ہمایوں نے کہا۔ بہتر ہے کہ اب ہندوستان کو خیر باد کہیں اور ملک موروثی میں چلکر قسمت آزمائیں بیرم خاں نے کہا کہ اُس ملک سے بادشاہ مغفور نے کیا پایا جو حضور کو حاصل ہوگا۔ ایران کو چلیں تو قرین مصلحت ہے۔ وہ میرا اور میرے بزرگوں کا ملک ہے کیا شاہ کیا فقیر سب مہمان نواز ہیں غلام وہاں کے رسم و راہ سے واقف ہے! ور حضور کے خاندان عالی نے بھی وہاں سے ہمیشہ مبارک اور کامیابی کے شگون پائے ہیں*

ہمایوں نے ملک سندھ سے ڈیرے اُٹھائے ایران کا ارادہ فسخ نہ کیا تھا مگر یہ خیال تھا کہ جیسا سفر دُور کا ہے۔ ویسے ہی کامیابی کی اُمید بھی دُور دراز ہے۔ فی الحال بولان کی گھاٹی سے نکل کر قندھار کو دیکھنا چاہئے کہ قریب ہے۔ وہاں سے مشہد کا رستہ بھی روشن ہے۔ بلخ و بخارا کی راہ بھی جاری ہے عسکری مرزا اسوقت قندھار میں حکومت کر رہا ہے۔ میں اس قدر حادثے اُٹھا کر آیا ہوں عیال کا ساتھ ہے آخر بھائی ہے جتنا

۱؎ جس بچے کی ماں کا دودھ دیتے تھے۔ وہ بچہ شاہزادے یا امیرزادے کا کوکہ کہلاتا تھا۔ اُس کی اولاد اسکے رشتہ داروں کی طرح پلا کرتی تھی۔ وراُن کا حق سلطنت میں شریک ہوتا تھا بچہ مذکور کوکہ کلتاش خاں خطاب ملتا تھا۔ اکبر نے دودھ تو آٹھ دس بیبیوں کا پیا تھا مگر بڑی حقدار ان میں ماہم بیگم اور جیجی یعنی شمس الدین محمد خاں کی بیوی شمار ہوتی تھیں*

خون کب تک ٹھنڈا رہیگا کچھ بھی حق نہ سمجھا تو بھائی ترکانہ کہیں نہیں گئی۔ چند روز رہ کر اُس کا اور نمکحرامانِ قدیم کا رنگ دیکھوں گا ہوئے وفا نہ پاؤنگا تو جدھر منہ اُٹھیگا چلا جاؤں گا کہ خلق خدا ملک خدا۔

شہر بار بے شہر اور بادشاہ بے لشکر اِن خیالات میں غلطاں و پیچاں۔ غم غلط کرتا کوہ و دشت کو دیکھتا چلا جاتا تھا۔ ایک منزل میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ کسی نے آکر خبر دی کہ فلاں شخص کامران کا وکیل سندھ[1] جاتا ہے۔ شاہ حسین ارغون کی بیٹی سے کامران کے بیٹے کی نسبت کا پیام لیکر چلا ہے۔ اور اِس وقت قلعۂ سیوستی[2] میں اُترا ہوا ہے۔ ہمایوں نے ایک ملازم کے ہاتھ شقّہ بھیج کر اُسے بُلایا۔ وہ بے وفا قلعے کا استحکام کرکے بیٹھ رہا اور جواب میں کہلا بھیجا کہ اہلِ قلعہ مجھے آنے نہیں دیتے۔ ہمایوں کو رنج ہوا۔

اِسی عالم میں شالؔ کے قریب پہنچا مرزا عسکری کو بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ بے مروت بھائی نے خانہ برباد بھائی کی آمد سُن کر ایک سردار کو بھیج دیا تھا کہ حالات معلوم کرکے لکھتا رہے۔ اِدھر سے ہمایوں نے بھی دو ملازموں کو روانہ کیا تھا۔ وہ سردار مذکور کو رستے میں مل گئے۔ اُس نا اہل نے فوراً دونوں کو گرفتار کرکے قندہار کو روانہ کیا اور جو احوال معلوم ہوا وہ لکھ بھیجا۔ اِن میں سے ایک وفادار نے موقع پایا۔ وہ بھاگ کر پھر ہمایوں کے پاس آیا۔ اور جو کچھ وہاں سُنا تھا۔ اور دیکھکر قرینوں سے سمجھا تھا سب بیان کیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ حضور کے آنے کی خبر سن کر مرزا عسکری بہت گھبرا رہا ہے۔ قلعہ قندھار کی مورچہ بندی شروع کر دی ہے۔ بھائی کی بے مہری اور لوگوں کی بیحیائی اور بیوفائی دیکھکر ہمایوں کی اُمید ٹوٹ گئی اور مستنگ کی طرف باگیں پھیریں۔ پھر بھی ایک محبت نامہ مفصل لکھا جس کا القاب یہ تھا:۔

برادر بے مہر بے ارادت معلوم نمایند۔ اِس میں محبت اور اپنایت کے لہو کو بھی بہت گرمایا تھا۔ اور نصیحتوں اور نیک صلاحوں کے خریطے بھرے تھے۔ مگر کان کہاں جو سُنیں؟ اور دل کہاں جو مانے؟

یہ خط دیکھکر مرزا کے سر پر اور بھی شیطان چڑھا۔ رفیقوں کو لے کر چلا کہ بیخبر پہنچ کر ہمایوں کو قید کرلے۔ موقع نہ پائے تو کہے کہ استقبال کو آیا ہوں۔ غرض نور کا تڑکا تھا کہ سوار ہوا۔ اور پوچھا کہ ادھر دامنِ کوہ کا رستہ کون جانتا ہے۔ چی بہادر ایک اُزبک پہلے ہمایوں کے وفاداروں کا نوکر تھا۔ تباہی کے عالم میں مرزا عسکری کے پاس نوکری کرلی تھی۔ اُس وقت نمک کی تاثیر حمیت اُٹھی اور ہمایوں کی حالت نے اُس کے دل میں غائبانہ رحم پیدا کیا۔ اُس نے عرض کی۔ میں جانتا ہوں اور کئی دفعہ آیا گیا ہوں۔ مرزا نے کہا سچ کہتا ہے۔ ادھر اِس کی جاگیر تھی۔ اچھا آگے آگے چل اُسنے کہا میرا یابو کام نہیں

---

[1] یہ وہی مقام ہے جو آج کل سبی کے نام سے مشہور ہے۔

[2] یہ مقام قندھار سے گیارہ کوس دہرے ہے۔

دیا۔ مرزا نے ایک نوکر سے گھوڑا دلوا دیا۔ جی بہادر نے تھوڑی دُور آگے چل کر گھوڑا اُڑایا اور سیدھا
بیرم خاں کے خیمے میں آیا۔ کان میں کہا کہ مرزا آن پہنچا ہے۔ اب فرصت کا وقت نہیں۔ اور میں
قدرتی اتفاق سے اس طرح پہنچا ہوں۔ بیرم خاں اُسی وقت چُپ چاپ اُٹھ کر خیمے کے پیچھے سے
ہمایوں کے پاس آیا اور حال بیان کیا۔ سوا اِس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایران کا ارادہ مصمم کریں۔
تردی بیگ کے پاس آدمی بھیجا۔ کہ چند گھوڑے بھیج دو۔ اس نااہل بے مروت نے صاف جواب
دیا۔ ہمایوں کو خدا یاد آیا کہ بھائیوں کا یہ حال۔ نمک خواروں اور ہمراہیوں کا یہ حال۔ جودھپور کے رستے
کی بیوفائی اور بے حیائی بھی یاد آگئی۔ چاہا کہ اُسی وقت خود جائے اور اس کو حد کو پہنچائے بیرم خاں
نے عرض کی کہ وقت تنگ ہے۔ بات کی بھی گنجائش نہیں۔ آپ ان کافر نعمتوں کو قہر الٰہی کے
حوالے کریں۔ اور جلد سوار ہوں۔ اکبر اُس وقت پورا برس دن کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اُسے میر غزنوی[1] اور
خواجہ سرا وغیرہ اور ماہم انکہ کے سپرد کر کے یہیں چھوڑا۔ بیگم تو جان کے ساتھ تھیں۔ وفاداروں سے
کہا کہ مرزا کا خدا نگہبان ہے۔ ہم آگے چلتے ہیں بیگم کو کسی طرح تم ہم تک پہنچا دو۔ آپ مخلصانِ
جاں نثار کے ساتھ دشتِ غربت کو روانہ ہوا۔ پیچھے بیگم بھی آن ملیں۔ مورخ کہتے ہیں کہ اس شکستہ
حال قافلہ میں نوکر چاکر مل کر ۷۰ آدمی سے زیادہ نہ تھے۔ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ رات نے آنکھوں
کے آگے سیاہ پردہ تان دیا۔ خیال یہ تھا کہ ایسا نہ ہو بے مہر بھائی تعاقب کرے۔ بیرم خاں نے کہا
مرزا عسکری اگرچہ شہزادہ ہے۔ مگر پیسے کا غلام ہے۔ اسوقت خاطر جمع سے بیٹھا ہو گا۔ دو منشی
اِدھر اُدھر ہونگے اور اسباب و اجناس کی فہرست لکھوا رہا ہو گا۔ اگر ہم خدا پر توکل کر کے اِسوقت جا پڑیں
تو باندھ ہی لیں جب مرزا بیچ میں نہ رہا تو نوکر نمک خوار ہیں۔ سب حاضر ہو کر سلام کرینگے۔ بادشاہ نے
کہا کہ صلاح تو بہت ٹھیک ہے مگر ایک ارادہ کر لیا۔ اور دور دراز عرصہ سامنے ہے چلے ہی چلو۔

اب اِدھر کی سنو مرزا عسکری جب مستنگ کے پاس پہنچے۔ تو اپنے صدر اعظم کو بھیجا ہمایوں کو
جعلسازی کے پیغاموں سے باتوں میں لگائے۔ مگر مکاری کامیاب نہ ہوئی۔ ہمایوں روانہ ہو گیا تھا
ساتھ ہی ایک گروہ کثیر پہنچا۔ پھٹے پرانے خیمے کھڑے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے نوکر چاکر پڑے تھے۔
اُنہیں آکر گھیر لیا کہ کوئی آدمی اُردو سے نکلنے نہ پائے۔ پیچھے مرزا عسکری پہنچے۔ جی بہادر کا پہنچنا اور ہمایوں
کی روانگی کا حال صدر اعظم سے مفصل سنا۔ بے وارثے قافلے کو پڑا دیکھ کر اپنی بدنیتی پر بہت پچھتایا۔ تردی
بیگ سب کو لیکر سلام کو حاضر ہوئے مگر سب میں یہی نظر بند ہو گئے۔ میر غزنوی سے پوچھا کہ مرزا اکبرا

[1] یہ وہی میر غزنوی ہیں جو اکبر کی بادشاہت میں خان اعظم میر شمس الدین محمد اتکہ خاں ہوئے۔ دیکھو تتمہ

کہاں ہیں۔ غرض کی۔ گھر میں ہیں۔ چچا نے ایک اونٹ میوے کا بھتیجے کے لئے بھیجا۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ مرزا عسکری بیٹھے اور جو بات خانخاناں نے وہاں کی تھی اُس کی تصویر کھینچ گئی کہ ایک دو منشیوں کو لیکر اسباب ضبطی کی فہرست لکھوانے لگے۔ صبح کو سوار ہوئے۔ اور نقارہ بجاتے ہمایوں کے اُردو میں داخل ہو کر چھوٹے بڑے سب کو گرفتار کر لیا۔ تردی بیگ صندوق دار تھے کفایت شعاری کے انعام میں شکنجہ پر سوار کئے گئے۔ بہت آدمی ان کے ماتحت ہوئے۔ زرجو جمع کیا تھا۔ دام دام ادا کر دیا۔ اکثر بے گناہ مارے گئے۔ بہت باندھے گئے۔ سب لوٹے گئے۔ ہمایوں کا غصہ اتنی سزا ہرگز نہ دے سکتا جو مرزا عسکری کے ہاتھوں سے مل گئی ؎

بے رحم چچا ڈیوڑھی پر آیا کہ بھتیجے سے ملونگا۔ یہاں رات قیامت کی رات گزری تھی سب کے دل دھکڑ دھکڑ کرتے تھے۔ کہ ماں باپ اُس حال سے گئے۔ ہم ان پہاڑوں میں بے سر و سامان پڑے ہیں۔ بے مروت چچا ہے! اور معصوم بچے کی جان ہے۔ اللہ ہی نگہبان ہے میر غزنوی اور ماہم انکہ اکبر کو کندھے سے لگائے سامنے آئی۔ منافق چچا نے گود میں لے لیا۔ اور زہرخند ہنسی سے بول چال کر چاہا کہ بچہ ہنسے بولے۔ مگر اکبر کے لبوں پر تبسم بھی نہ آیا۔ چچا کا منہ دیکھا کیا۔ کینہ ور چچا نے مکدر ہو کر کہا۔ میدانم فرزند کیست۔ با ما چگونہ شگفتہ شود۔ مرزا عسکری کے گلے میں ایک انگوٹھی سُرخ ریشم کی ڈوری میں تھی۔ لال کچھا باہر نظر آتا تھا۔ اکبر نے اِس پر ہاتھ بڑھایا۔ بارے چچا نے اپنے گلے سے اُتار کر بھتیجے کے گلے میں ڈال دی۔ دل شکستہ ہوا خواہوں نے کہا۔ کیا عجب ہے خدا ایک دن اسی طرح سلطنت کی انگوٹھی اِس نونہال کی انگلی میں پہنا دے

غرض جو کچھ مرزا عسکری کے ہاتھ آیا۔ لوٹا گھسوٹا۔ اور اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔ قلعے کے اندر ایک بالاخانہ رہنے کو دیا۔ اور سلطان بیگم اپنی بی بی کے سپرد کیا۔ بیگم بڑی محبت و شفقت سے پیش آتی تھی۔ خدا کی شان دیکھو۔ باپ کے جانی دشمن۔ بیٹے کے حق میں ماں باپ ہو گئے۔ ماہم اور جیجی اندر اور میر غزنوی باہر خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ یا عنبر خواجہ سرا تھا کہ اکبری اقبال کے دور میں اعتماد خاں ہو کر بڑا صاحب اختیار ہوا ؎

ترکوں میں رسم ہے کہ بچہ جب پاؤں چلنے لگتا ہے۔ تو باپ دادا چچا وغیرہ میں سے جو بزرگ موجود ہو۔ وہ اپنے سر سے عمامہ اُتار کر بچے کو چلتے ہوئے مارتا ہے۔ اس طرح کہ بچہ گر پڑے اور اس کی بڑی خوشی سے شادی کرتے ہیں۔ جب اکبر سوا برس کا ہؤا۔ اور پاؤں چلنے لگا۔ تو ماہم نے مرزا عسکری سے کہا۔ کہ یہاں تم ہی اس کی باپ کی جگہ ہو۔ اگر یہ رسم ادا ہو جائے تو شفقت

بزرگانہ سے بعید نہ ہوگا۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ ماہم کا یہ کہنا اور مرزا عسکری کا عمامہ پھینکنا اور اپنا گرنا وہ ساری صورت حال مجھے اب تک یاد ہے۔ انہیں دنوں میں سر کے بال بڑھانے کو بابا حسن[1] ابدال کی درگاہ میں لے گئے تھے۔ کہ قندھار میں ہے۔ وہ بھی آج تک مجھے یاد ہے۔

جب ہمایوں ایران سے پھرا۔ اور افغانستان میں آمد آمد کا غل ہوا۔ تو مرزا عسکری اور کامران گھبرائے۔ آپس میں دونوں کے نامہ و پیام دوڑنے لگے۔ کامران نے لکھا کہ اکبر کو ہمارے پاس کابل میں بھیج دو۔ مرزا عسکری نے یہاں مشورت کی بعض سرداروں نے کہا بھائی اب پاس آ پہنچا ہے اعزاز و اکرام سے بھتیجے کو بھیج دو۔ اور اُسی کو عفو تقصیرات کا وسیلہ قرار دو۔ بعض نے کہا کہ اب صفائی کی گنجائش نہیں رہی۔ مرزا کامران ہی کا کہنا ماننا چاہیے۔ مرزا عسکری کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا۔ اکبر کو سب متعلقوں کے ساتھ کابل بھیج دیا۔

مرزا کامران نے اُنہیں خانزادہ بیگم اپنی پھوپھی کے گھر میں اُتروایا۔ اور ان کے کاروبار بھی اُنہیں کے سپرد کیے۔ دوسرے دن باغ شہر آرا میں دربار کیا۔ اور اکبر کو بھی دیکھنے کو بُلایا۔ اتفاقاً شب برات کا دن تھا۔ دربار خوب آراستہ کیا تھا۔ وہاں رسم ہے کہ بچے اُس دن چھوٹے چھوٹے نقاروں سے کھیلتے ہیں۔ مرزا ابراہیم اُس کے بیٹے کے لیے رنگین و نگارین نقارہ آیا۔ اس نے لے لیا اکبر بچہ تھا۔ کیا سمجھتا تھا۔ کہ میں کس حال میں ہوں اور یہ کیا وقت ہے۔ اس نے کہا کہ یہ نقارہ میں لونگا۔ مرزا کامران تو پُورے حیادار تھے! انہوں نے بھتیجے کی دلداری کا ذرا خیال نہ کیا کہا کہ اچھا۔ دونوں کُشتی لڑو۔ جو پچھاڑے اسی کا نقارہ۔ یہی خیال کیا ہوگا کہ میرا بیٹا اِس سے بڑا ہے۔ مار لیگا۔ یہ شرمندہ بھی ہوگا اور چوٹ بھی کھائیگا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں وہ نونہال اقبالمندان باتوں کو ذرا خیال میں نہ لایا۔ جھٹ لڑنے کو آگے بڑھا لپٹ کر گتھم گتھا ہو گیا۔ اور ایسا بے لاگ اُٹھا کر مارا کہ دربار سے غل اُٹھا۔ کامران کچھ شرمندہ ہوا۔ اور کچھ اپنے حال کو سوچ کر چُپ رہ گیا۔ کہ آثار اچھے نہیں ادھر والے باغ باغ ہو گئے۔ اور اندر اندر آپس میں کہا کہ اِسے کھیل نہ سمجھو۔ یہ باپ کا دمامہ دولت لیا ہے۔

جب ہمایوں نے کابل فتح کیا۔ تو اکبر دو برس دو مہینے آٹھ دن کا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں روشن کیں۔ اور خدا کا شکر بجا لایا۔ چند روز کے بعد تجویز ہوئی کہ ختنے کی رسم ادا کی جائے۔ بیگم وغیرہ حرم سرا کی بیبیاں قندھار میں تھیں وہ بھی آئیں اُس وقت عجب تماشا ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب ہمایوں وراُس کے ساتھ بیگم ایران کو گئے تھے۔ اسوقت اکبر کی کیا بساط تھی۔ دنوں اور مہینوں کا ہوگا۔ اتنی سی جان

[1] انہیں بابا حسن ابدالی کے نام سے راہ پشاور میں ایک منزل مشہور ہے۔

کیا جانے کہ ماں کون ہے۔ اب جو سواریاں آئیں تو ان سب کو لاکر محل میں بٹھایا۔ اکبر کو بھی لائے۔ اور کہا کہ جاؤ مرزا۔ اماں کی گود میں جا بیٹھو۔ بھولے بھالے بچّے نے پہلے تو بیچ میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر خواہ دانشِ خداداد کہو۔ خواہ دل کی کشش کہو۔ خواہ لہو کا جوش کہو۔ سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا ماں برسوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ گلے سے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس عمر میں اُس کی سمجھ اور پہچان پر سب کو بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں ؂

۹۵۴ھ میں جب کامران پھر باغی ہوا تو کابل کے اندر تھا۔ اور ہمایوں باہر گھیرے پڑا تھا۔ ایک دن دھاوے کا ارادہ تھا۔ باہر سے گولے برسانے شروع کئے۔ اکثر اشخاص کے گھر بار اور گھر والے اندر تھے۔ وہ خود ہمایوں کے لشکر میں شامل تھے۔ بے درد کامران نے اُن کے گھر لوٹ لئے۔ ننگ و ناموس برباد کئے۔ ان کے بچّوں کو مار مار کر فصیل پر سے پھنکوایا۔ ان کی عورتوں کی چھاتیاں باندھ باندھ کر لٹکایا۔ غضب یہ کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا۔ چولے پانچ برس کے معصوم بھتیجے کو وہاں بٹھا دیا۔ ماہم نے گود میں دبکا لیا۔ اور ادھر سے پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ کہ اگر گولا لگے تو بلا سے۔ پہلے میں پیچھے بچّہ۔ ہمایوں کے لشکر میں کسی کو اس حال کی خبر نہ تھی۔ یکایک توپ چلتے چلتے بند ہو گئی۔ کبھی مہتاب دکھائی تو رنجک چاٹ گئی کبھی گولا اُگل دیا۔ سنبل خاں میر آتش بڑا تیز نظر تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا تو سامنے آدمی بیٹھا معلوم ہوا۔ دریافت کیا تو یہ حقیقتِ حال معلوم ہوئی۔ آزاد۔ یہ کچھ بڑی بات نہیں جب اقبال رفیقِ حال ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے سا دو مجھے تو سردارِ عرب و عجم کا قول نہیں بھولتا۔ اجلك حافظك تیری اجل ہی محافظ ہے۔ جب تک اُس کا وقت نہیں آیا۔ تب تک کسی حربۂ ہلاکت کو تجھ پر اثر نہ کرنے دے گی۔ موت تو اُسے روکے گی اور کہے گی تو ابھی سے اُسے کیونکر ہلاک کرتا ہے۔ یہ تو فلاں وقت پر میرے حصّے میں آنے والا ہے ؂

جب ۹۶۱ھ ہجری میں ہمایوں نے ہندوستان کی طرف فتح کا نشان کھولا تو اقبال مند بیٹا ساتھ تھا اور ۱۲ برس آٹھ مہینے کی عمر تھی۔ ہمایوں نے لاہور میں مقام کیا۔ امرا کو آگے بڑھایا۔ افغانوں نے نواح جالندھر میں بڑی شکست اُٹھائی۔ سکندر سور نے خوانین افغان اور دلاور پٹھانوں کا اسّی ہزار انبوہ دار انبوہ لشکر جمع کیا اور سرہند پر جم کر سدِّ سکندر ہو گیا۔ بیرم خاں فوج لے کر آگے بڑھا۔ شہزادے کو سپہ سالار قرار دیا۔ اور مورچے باندھ کر لڑائی ڈالی۔ اسی عرصے میں ہمایوں بھی لاہور سے جا پہنچا۔ ان میدانوں میں اکبر نے ہمّت و جراُت کے خوب خوب نشان دکھائے اور آخر یہ معرکہ اُسی کے نام پر فتح ہوا۔ بیرم خاں نے کلّہ مینار[1] یادگار بنایا۔

---

[1] شاہانِ ایشیا کا قدیمی دستور ہے کہ جب لڑائی کا میدان مارتے ہیں تو مقامِ جنگ میں ایک بلند اور نمودار مقام پر بڑا سا گڑھا کھودتے ہیں۔ باغیوں کے سر کاٹ کر اس میں بھرتے ہیں اُس پر ایک بلند عمارت بشکلِ منار بناتے ہیں کہ فتح کی یادگار رہے اور دیکھنے والوں کو عبرت ہو اس کو کلّہ منار کہتے ہیں ؂

اور اس مقام کا نام سرمنزل رکھا۔ فتحیاب بادشاہ اور ظفریاب شہزادہ کامیابی کے نشان لہراتے دلی میں داخل ہوئے۔ آپ وہاں بیٹھے۔ امرا کو اطرافِ ممالک میں ملک گیری کے لئے روانہ کیا۔ سکندر سور ملن کوٹ[1] کے قلعوں کو امن کا گنبد سمجھ کر پہاڑ کے دامنوں میں دبک بیٹھا تھا اور وقت کا منتظر تھا کہ جب ہوائے اقبال آئے۔ ابر کی طرح پہاڑ سے اُٹھے۔ اور پنجاب پر چھا جائے۔ ہمایوں نے شاہ ابوالمعالی کو صوبہ پنجاب دیا۔ اور چند امرائے جنگ آزمودہ کو ساتھ کیا کہ فوجیں لیکر ہمراہ ہوں۔ وہ جب آئے تو سکندر فوارع شاہی کی ٹکر نہ اُٹھا سکا۔ اس لئے پہاڑوں میں گھس گیا۔ شاہ ابوالمعالی لاہور میں آئے۔ کہ قدیم الایام سے شاہ نشین شہر ہے۔ یہاں شاہی فرمانروائی کی شان دکھائی۔ جو امرا مدد کو آئے تھے۔ یا پہلے سے پنجاب میں تھے اُن کے رتبے اور علاقے خاص بادشاہ کے دئے ہوئے تھے۔ شاہ ابوالمعالی کے دماغ میں شاہی کی ہوا بھری ہوئی تھی۔ اُن کی جاگیروں کو چھوڑا توڑا۔ بلکہ پرگنات خالصہ میں تصرف کیا اور خزانے میں بھی ہاتھ ڈالا۔ یہ شکایتیں دربار میں پہنچ ہی رہی تھیں کہ سکندر نے بھی زور پکڑنا شروع کیا۔ اس وقت ہمایوں کو بندوبست مناسب کرنا واجب ہوا۔ چنانچہ ملکِ پنجاب اکبر کے نام کر دیا اور بیرم خاں کو اُس کا اتالیق کر کے اُدھر بڑھایا۔

جب اکبر آیا تو شاہ ابوالمعالی نے سلطان پور[2] کنار بیاس تک پیشوائی کی۔ اکبر نے بھی باپ کی آنکھ کا لحاظ کر کے بیٹھنے کی اجازت دی مگر شاہ جب اپنے ڈیروں میں گئے۔ تو شکایت سے لبریز گئے۔ اور اکبر کو کہلا بھیجا۔ کہ جو عنایت بادشاہ مجھ پر فرماتے ہیں سب کو معلوم ہے۔ آپ کو بھی یاد ہوگا کہ جوئے شاہی کے شکار میں مجھے ساتھ کھانے کو بٹھایا۔ اور تم کو اُلش بھیجا۔ اور ایسا اکثر ہوا ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ آپ نے میرے بیٹھنے کو نمد تکیہ الگ بچھوایا۔ اور دسترخوان بھی الگ تجویز کیا۔ اکبر کی بارہ تیرہ برس کی عمر تھی۔ مگر رہا نہ گیا اور کہا تعجب ہے۔ میر کو ابتک نسبتوں کی کیفیت کا امتیاز نہیں۔ آئین سلطنت کا اور عالم ہے اور شفقت

---

[1] اب اسے سلطان پور ڈھیریاں کہتے ہیں ویران پڑا ہے اور کوسوں تک عمارتِ عالیشان کے کھنڈر چلے جاتے ہیں۔ کپڑے کے رنگ میں مشہور ہے۔ یہاں کی آب و ہوا میں قدرتی تاثیر ہے پرانی وضع کی چھینٹیں ابتک چھپتی ہیں۔ کوئی صاحب ہمت کاریگروں کی دستگیری کرے تو ایسا ہو تو اب بھی دستکاری کمانے کو حاضر ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں بھی اُس کے مصنف نے اس شہر کا حال اور آبادی کی رونق دکھائی ہے۔ مصنف مذکور عہد مذکور و عہد جہانگیری میں عادل شاہ کی طرف سے خود وکیل ہو کر آیا تھا۔ جہانگیر اس وقت لاہور میں تھا۔ اور شہر مذکور شاہراہ کے سر پر تھا۔ اور کثرت آبادی اور عماراتِ عالی سے گلزار ہو رہا تھا۔ ایک زمانے میں دولت خاں لودھی کا دارالحکومت تھا۔

[2] جوئے شاہی ہی مقام ہے جو راہ پشاور و کابل میں جلال آباد کہلاتا ہے۔ ہمایوں نے علاقہ مذکور بچپن ہی میں اکبر کے نام کر دیا تھا اہلِ تاریخ کہتے ہیں کہ اسی سال سے اس کی سرسبزی اور پیداوار میں ترقی ہونے لگی۔ جب اکبر بادشاہ ہوا تو اس کی آبادی اور تعمیر بڑھا کر جلال آباد نام رکھا تھا۔ کتب قدیمہ میں اس علاقہ کا نام ننگنہار لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

و محبت کا دستور کچھ اَور ہے۔ (شاہ کا حال دیکھو تتمہ میں) ❖

خانخاناں نے اکبر کو ساتھ لیا۔ اور دربائے لشکر کو پہاڑ پر چڑھا دیا۔ سکندر نے جب طوفان آتا دیکھا تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ لڑائی جاری تھی۔ بہادروں کی تلواریں لہو سے کارناموں کی تصویریں کھینچتی تھیں کہ برسات آگئی۔ پہاڑ میں یہ موسم بہت دق کرتا ہے۔ اکبر پیچھے ہٹ کر ہوشیارپور کے میدانوں میں اُتر آیا۔ اور اِدھر اُدھر شکار میں دل بہلانے لگا ❖

ہمایوں دلّی میں بیٹھا آرام اور مُلک کے انتظام میں مصروف تھا۔ کہ دفعۃً کتاب خانے کے کوٹھے پر سے گر پڑا۔ جاننے والے جان گئے کہ گھڑی ساعت کا مہمان ہے۔ نیم جاں کو اُٹھا کر محل میں لے گئے۔ اُسی وقت اکبر کو عرضی کی اور یہاں ظاہر کیا کہ چوٹ سخت آئی ہے اور ضعف زور پر ہے۔ اِس لئے باہر نہیں نکلتے خاص خاص مصاحب اندر جاتے تھے۔ اور کوئی سلام کو بھی نہ جانا تھا۔ باہر یہ صورت کہ کبھی دوا خانے سے دوا جاتی ہے۔ کبھی باورچی خانے سے مُرغ کا شوربا۔ دمبدم خبر آتی ہے کہ اب طبیعت بحال ہے۔ اور اِس وقت ذرا ضعف زیادہ ہے۔ اور وہ اندر ہی اندر بہشت میں پہنچ گئے ❖

حکمتِ عملی۔ دربار میں شکیبی شاعر تھا کہ قد و قامت بصورت شکل میں ہمایوں سے بہت مشابہ تھا۔ کئی دفعہ اسے بادشاہ کے کپڑے پہنا کر محل سرا کے کوٹھے پر سے اہلِ دربار کو دکھایا اور کہا کہ ابھی حضور کو باہر آنے کی طاقت نہیں۔ دیوان عام کے میدان سے مجرا کر کے رخصت ہو۔ جب اکبر تخت نشین ہوا اور سب طرف فرمان جاری ہو گئے۔ تب بادشاہ کے مرنے کا حال ظاہر کیا۔ سبب یہی تھا کہ اُس زمانے میں بغاوت اور بدعملی کا ہو جانا ایک بات تھی۔ خصوصاً ایسے موقع پر کہ سلطنت کے قدم بھی نہ جمے تھے۔ اور ہندوستان افغانوں کی کثرت سے افغانستان ہو رہا تھا ❖

اِدھر جس وقت ہرکارے نے آ کے خبر دی۔ اکبر کے ڈیرے اُس وقت بڑھانے کے مقام پر تھے۔ سپہ سالار نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ **کلانور** کو پھرا جواب علاقہ گورداس پور میں ہے ساتھ ہی نذر شیخ چولی ہمایوں کا مراسلہ لے کر پہنچا جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

۷ ربیع الاول کو سم مسجد کے کوٹھے سے کہ دولت خانے کے پاس ہے۔ اُترتے تھے۔ سیڑھیوں میں اذان کی آواز کان میں آئی۔ بہ مقتضائے ادب زینے میں بیٹھ گئے۔ موذن نے اذان کو پورا کیا تو اُٹھ کر اُتریں۔ اتفاقاً عصا کا سرا قبا کے دامن میں اٹکا۔ ایسا بے طور پاؤں پڑا کہ نیچے گر پڑے۔ پتھر کی سیڑھیاں تھیں کان کے نیچے گر کی ٹکر لگی۔ کچھ لہو کی بوندیں ٹپکیں۔ تھوڑی دیر بیہوشی رہی۔ ہوش بجا ہوئے تو ہم دولت خانہ میں گئے۔ الحمد للہ خیر ہے۔ اصلاً وہم کو دل میں راہ نہ دینا۔ فقط ❖

برابر ہی خبر پہنچی کہ ۱۵ کو ہلالے ہمایوں نے عالمِ قدس کو پرواز کی ✦

خانخاناں نے امرا کو جمع کر کے جلسہ کیا۔ اور بموجب اتفاق رائے کے جمعہ کے دن ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ ہجری نماز کے بعد تیموری تاج نے اکبری اقبال کے رنگ میں جلوہ دکھایا۔ اُس وقت اُس کی عمر شمسی حساب سے تیرہ برس نو مہینے کی اور قمری حساب سے ۱۴ برس کئی مہینے کی تھی۔ بموجب آئینِ چنگیزی و تیموری کے تمام رسمیں جشن شاہانہ کی ادا ہوئیں۔ بہار نے پھول برسائے۔ آسمان نے تارے اُتارے۔ اقبال نے خبرِ حسن کو سر پر سایہ کیا۔ اُمرا کے منصب بڑھے۔ خلعت انعام جاگیریں تقسیم ہوئیں۔ فرمان جاری کئے۔ اکبر بموجب باپ کی وصیت کے خانخاناں کی بہت عزت و عظمت کرتا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اُس کی جاں نثاریں جو سخت خطرناک معرکوں میں خصوصاً سفرِ ایران پر ظہور میں آئی تھیں وہ ہر وقت اُس کی سفارش کرتی تھیں چنانچہ اب اتالیقی و سپہ سالاری کے منصب پر وکیلِ مطلق کا عہدہ زیادہ کیا ✦

اس موقع پر کہ ہماؤں کا ہمائے روح دفعۃً پرواز کر گیا۔ اور اکبر کے سر پر ہمائے سلطنت نے سایہ ڈالا شاہ ابوالمعالی کی نیت بگڑی۔ خانخاناں جس کے دسترخوان پر ۲۰ ہزار شمشیری بہادر پلاؤ کی قابیں گھسیٹتیں۔ اس کے نزدیک شاہ کا پکڑ لینا کیا بڑی بات تھی۔ ذرا اشارہ کرتا خیمے میں گھس کر باندھ لاتے۔ مگر تلوار ضرور چلتی۔ خون بھی بہتے۔ اور یہاں ابھی معاملہ نازک تھا۔ لشکر میں ہل چل پڑ جاتی۔ خدا جانے نزدیک و دور کیا کیا ہوائیاں اُڑتیں۔ جو چپ چاپ گمنامی کے ٹیلوں میں جا بیٹھے تھے۔ پھر شیر بن بن کر نکل آتے۔ اس لئے سوچا اور بہت مناسب سوچا کہ حکمتِ عملی سے اُسے قابو میں کر لیں گے۔ کشت و خون سے کیا حاصل ✦

جب دربار تخت نشینی منعقد ہوا تھا۔ تو شاہ ابوالمعالی اِس میں شامل نہ ہوئے تھے اور پہلے بھی اُن کی طرف سے کھٹکا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اپنے خیمے میں بیٹھے فرزندی کے دعووں سے بلند پروازیاں کرتے ہیں اور خوشامدی ہم جنس اُنہیں آسمان پر اُڑاتے ہیں۔ بیرم خان نے اُمرا سے مشورت کی اور تیسرے دن دربار سے پیغام بھیجا کہ بعض مہماتِ سلطنت میں مصلحت درپیش ہے۔ ارکانِ دولت حاضر ہیں۔ بے تمہارے صلاح ناتمام ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے تشریف لانا مناسب ہے پھر حضرت سے رخصت ہو کر لاہور کو روانہ ہو جاؤ ✦

وہ غرور کی شراب میں بدمست تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا خیال باندھ رہا تھا۔ کہلا بھیجا کہ صاحب میں شاہ غفران پناہ کے غم میں ہوں۔ مجھے اِن باتوں کا ہوش نہیں میں نے ابھی سوگ بھی نہیں اُتارا۔ اور بالفرض اگر میں آیا تو نئے بادشاہ مراتب و اعزاز میں کس طرح پیش آئیں گے، نشست کہاں قرار پائی ہے

ؔ ہمایوں نے پہلے ۱۰ برس دوسری دفعہ ۱۰ مہینے سلطنت کی ✦

امرا مجھ سے کس طرح پیش آئیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔ طول طویل تقریریں اور حیلے حوالے کہلا بھیجے۔ خیر یہاں تو یہ مطلب تھا کہ ایک دفعہ وہ دربار تک آ جائیں۔ جو جو انہوں نے کہا۔ سب بے عذر منظور ہوا۔ اور وہ تشریف لائے اور بعض اُمورات سلطنت میں گفتگو ہوئی

اسی عرصے میں دسترخوان بچھا۔ شاہ صاحب نے سلاپچی پر ہاتھ بڑھائے۔ تولک خاں قوچین افسر توپ خانہ اُن دنوں خوب مُسنڈا بنا ہوا تھا۔ بے خبر پیچھے سے آیا اور شاہ کی مشکیں کس لیں۔ شاہ تڑپ کر اپنی تلوار کی طرف جھپٹے۔ جس سپاہی زادہ کے پاس تلوار رہتی تھی اُسے پہلے ہی کھسکا دیا تھا۔ غرض کہ شاہ قید ہو گئے۔ بیرم خاں کا ارادہ قتل کا تھا۔ مگر پہلا رحم اکبر کا جو ظاہر ہوا یہی تھا کہ اُس نے کہا جان کھونی کیا ضرورت۔ قید کر دو۔ چنانچہ پہلوان گُل گز کوتوال کے حوالے کیا۔ شاہ نے بڑی کرامات دکھائی۔ سب کی آنکھوں میں خاک ڈالی اور قید سے بھاگ گئے۔ پہلوان بچارا غیرت کا مارا زہر کھا کر مر گیا ؛

سال اوّل جلوس میں کل اشیائے سوداگری پر سے محصول کا بند کھول دیا۔ کئی برس تک سلطنت کے کاروبار اپنے ہاتھ میں نہیں لئے اس لئے پوری پوری تعمیل نہیں ہوئی مگر اس کی نیت نے جوہر دکھا دیا۔ جب اپنا کام آپ کرنے لگا۔ تو تجویز کو پورا کیا۔ اُس وقت بھی اہل کاروں نے سمجھایا کہ مالِ ہند ہے۔ اس کی یہ رقم ایک ولایت کا خراج ہے۔ مگر اس دریا دل نے ایک نہ سنی اور کہا جب خلق خدا کی جیب کتر کر توڑے بھرے تو اس خزانے پر بھی لعنت ہے ؛

اکبری لشکر سکندر کو دبائے پہاڑوں میں گھسا جاتا تھا۔ برسات کا موسم آ ہی گیا تھا۔ مینہ کی فوج بادلوں کے دگلے۔ اور شفق کی رنگا رنگ وردیاں پہن کر موجودات دینے آئی۔ انہوں نے غنیم کو تیوروں کے حوالے کیا اور آپ جالندھر میں آکر چھاؤنی ڈالی۔ مینہ کی بہاریں دیکھ رہے تھے اور غنیم کا رستہ روکے ہوئے تھے۔ کہ سر اٹھانے نہ پائے۔ اکبر بھی شکار کھیلتے تھے۔ نیزہ بازی۔ چوگان بازی۔ تیراندازی کرتے تھے۔ ہاتھی لڑاتے تھے۔ خان بابا سلطنت کے بندوبستوں میں تھے۔ جو یکایک خبر پہنچی کہ ہیموں بقال نے آگرہ لے کر دلی مار لی۔ اور تردی بیگ وہاں کا حاکم بھاگا چلا آتا ہے ؛

ہیموں بقال۔ اُس کی اصل و نسل اور ترقی کا مفصل حال تتمے میں دیکھو۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اُس نے افغانی اقبال کی آندھیوں میں ترقی کی پرواز کی تھی۔ جو سردار بادشاہی کے دعویدار۔ اور اُس کے بڑھانے اور دھاووں کے میدان چڑھانے والے تھے وہ آپس میں کٹ کر مر گئے۔ بنی بنائی فوج اور بادشاہی خزانے اُس کے قبضے میں آ گئے۔ ملک دل میں خیالات کی نسل پھیلنی شروع ہوئی اسی عرصے میں ہمایوں

کو مرگِ ناگہانی پیش آئی۔ ہیموں کے دماغ میں جو اُمید نے انڈے بچے دئے تھے اُنہوں نے سلطنت کے پروبال نکالے۔ سمجھا کہ ۱۴ برس کا لڑکا تخت پر ہے۔ وہ بھی سکندر سور کے ساتھ پہاڑوں میں اُلجھا ہوا ہے صاحبِ ہمت بقال نے میدانِ خیال میں اپنے حال کی موجودات لی۔ افغانوں کے انبوہِ بےحساب گرد نظر آئے۔ کئی بادشاہوں کی کمائی۔ خزانے اور سلطنت کے کارخانے ہاتھ کے نیچے معلوم ہوئے تجربے نے کان میں کہا کہ اب تک جدھر ہاتھ ڈالا ہے۔ پُورا پڑا ہے۔ بابر کے دن یہاں رہا ہمایوں کے رات یہاں رہا۔ اِس لڑکے کی بنیاد کیا ہے۔ غرض جس لشکر کو ایسے قدرتی موقع کی اُمید پہ تیار کر رہا تھا۔ اُسے اپنی ذاتی لیاقت سے ترتیب دے کر روانہ ہُوا۔ آگرے میں اکبر کی طرف سے سکندر خاں حاکم تھا۔ اُس کے ہوش غنیم کی آمد آمد ہی میں اڑ گئے۔ آگرے جیسا مقام۔ بداقبال سکندر کو دیکھو کہ بے جنگ قلعہ خالی کر کے بھاگا۔ اب ہیمو کب تھمتا تھا۔ دہائے چلا آیا۔ رستے میں ایک مقام پر دل شکستہ سکندر اُلٹ کر اڑا۔ مگر کئی ہزار سپاہیوں کو قتل قید اور دریا میں غرق کروایا اور پھر بھاگ نکلا۔ ہیموں کا حوصلہ اور زیادہ ہوا اور طوفان کی طرح دلی کا رُخ کیا۔ بڑے بڑے جتھے والے افغان۔ جنگی تجربہ کار اور جنگ کے بھاری سامان۔ ۵۰ ہزار فوج جرّار پٹھان اور راجپوت میواتی وغیرہ کی۔ ہزار ہاتھی۔ ۵۱ توپ قلعہ شکن۔ پانسو گھڑنال اور شترنال زنبورک ساتھ تھے۔ اِس دریا نے جگہ سے جنبش کی۔ اور جہاں جہاں چغتائی حاکم بیٹھے تھے۔ سب کو رولتا ہوا دلی پر آیا۔ اور خوش آیا کہ اُس وقت وہاں تردی بیگ حاکم تھا۔ جس کی ضعف تدبیر اور بےہمتی کے کارناموں کی اُسے بھی خبر تھی۔

تردی بیگ کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو ایک عرضی اکبر کو لکھی۔ اور امرائے بادشاہی جو نزدیک و دُور تھے اُنہیں خطوط روانہ کئے۔ کہ جلد حاضر ہو اور جنگ میں شامل ہو۔ باوجود اس کے آپ کچھ بندوبست نہ کیا۔ جب غنیم کے لشکر کی شان اور ساز و سامان کی خبریں دھوم دھام سے اُڑیں۔ تو مشورے کا جلسہ کر کے گفتگو شروع کی۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ قلعہ بند ہو کر بیٹھے رہو اور لشکرِ بادشاہی کا انتظار کرو۔ اس عرصے میں جب موقع پاؤ نکل کر شبخون مارو۔ اور ترکانہ حملے بھی کرتے رہو۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ پیچھے ہٹو اور بادشاہی لشکر کے ساتھ آکر مقابلہ کرو۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ علی قلی خاں بھی سنبھل سے آتا ہے اُس کا انتظار کرو کہ زبردست سپہ سالار ہے۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے یہاں تک کہ غنیم لڑائی کے پلّے پر آ گیا اور کوئی پہلو نہ رہا مگر یہ کہ نکلیں اور لڑ مریں۔

چنانچہ فوجیں لیکر بڑھے۔ اور تغلق[1] آباد پر میدان جنگ قرار پایا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اکبر کی اقبال

[1] تغلق آباد دہلی سے قریب سات کوس کے ہے۔

یہاں بھی کام کرگیا تھا۔ مگر خواہ تردی بیگ کی بے ہمتی نے۔ خواہ اُس کی قضا نے مارا ہوا میدان ہاتھ سے کھو دیا۔ خان زمان برق کے گھوڑے پر سوار آیا تھا مگر میرٹھ میں پہنچا تھا کہ یہاں کام تمام ہوگیا۔ اس لڑائی کا تماشا دیکھنے کے قابل ہے۔

جس وقت دونوں لشکر صفیں باندھ کر میدان میں جمے۔ تو آئین جنگ کے بموجب امرائے شاہی۔ آگا۔ پیچھا۔ دایاں۔ بایاں سنبھال کر کھڑے ہوئے۔ تردی بیگ قلب میں قائم ہوئے۔ مُلا پیر محمدؐ کہ لشکر بادشاہی سے ضروری احکام لے کر آئے تھے۔ پہلو میں جم گئے۔ ادھر ہیموں بھی لڑائی کا مشاق ہو گیا تھا اور پُرانے پُرانے جنگ آزمودہ افغان اُس کے ساتھ تھے۔ اُس نے بھی اپنے گرد فوج کا قلعہ باندھا۔ اور مقابل ہوا۔

لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے توپ و تفنگ کے گولوں نے لڑائی کے پیغام پہنچائے۔ نیزوں کی زبانیں جنبش میں آئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں لشکر شاہی کا ہراول اور داہنا ہاتھ آگے بڑھا۔ اور اس زور سے ٹکر ماری کہ اپنے سامنے کے حریفوں کو اُلٹ کر پھینک دیا۔ وہ گڑگانوے کی طرف بھاگے۔ اور یہ اُنہیں ریلتے دھکیلتے پیچھے ہوئے۔ ہیموں اپنے فدائیوں کی فوج اور تین سو ہاتھی کا حلقہ لئے کھڑا تھا کہ اسی کا اُسے بڑا گھمنڈ تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ اب ترک کیا کرتے ہیں۔ ادھر تردی بیگ بھی منتظر تھے کہ آدھا میدان تو مار لیا ہے۔ آگے کیا کرنا چاہیے۔ اس انتظار میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ اور جو فوج فتحیاب ہوئی تھی۔ وہ ملا مار کرتی ہوڈل پلول تک جا پہنچی۔ آخر تردی بیگ سوچ میں رہے اور جو اُنہیں کرنا چاہیئے تھا وہ اس نے کیا کہ اُن پر دھاوا کر دیا۔ اور بڑے پیچ سے کیا۔ جو فوج شاہی اس کی فوج کو مارتی ہوئی گئی تھی۔ اس کے گرد و پیش سوار دوڑا دیئے۔ اور کہا۔ کہتے چلے جاؤ کہ الور سے حاجی خاں افغان ہیموں کی مدد کو پہنچا۔ اور تردی بیگ کو بھگا دیا۔ مگر حاجی خاں بھی اسی رستے پھرا آتا ہے کیونکہ جانتا ہے۔ ترک دغاباز ہوتے ہیں۔ مبادا بھاگ کر پلٹ پڑیں۔

ادھر تو وہ جلکہ چلا۔ ادھر تردی بیگ پر حملہ کیا جو بے وقوف باوجود کامیابی کے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اور ہیموں اب حملہ نہ کرتا تو وہ احمق تھا۔ کہ حریف کی بے ہمتی کھلی نظر آتی تھی۔ اور آگا اور ایک بازو اُس کا صاف میدان۔ غضب یہ ہوا کہ تردی بیگ کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور ہزار غضب یہ کہ رفیقوں کی ہمّت نے بھی دغا کی۔ خصوصاً مُلاّ پیر محمد کہ حریف کی آمد کو دیکھتے ہی ایسے بھاگ نکلے۔ گویا۔ اسی ساعت کے منتظر تھے۔ لڑائی کا قاعدہ ہے کہ ایک کے پاؤں اکھڑے اور سب کے اُکھڑے۔ خدا جانے اصل معاملہ کیا ہو۔ کہتے ہیں کہ خانخاناں کی تردی بیگ سے کھٹکی ہوئی تھی۔ مُلاّ ان دلوں میں خانخاناں کے

رفیق خاص الخاص بنے ہوئے تھے اور اُس نے اسی غرض سے اِنہیں بھیجا تھا۔ خان خانان! اگر ایسا کیا تو حیف ہے تمہاری اُس دانائی اور ذہن کی رسائی پر جو ایسی باریکیوں کی تلاش میں خرچ ہوئی۔

فتحیاب حملہ آور جو ڈل پول سے سرداروں کے سر اور لوٹ کے مال باندھے پھرے تو پریشان خبریں سُنتے۔ حیران چلے آتے تھے۔ شام کو مقام پر پہنچے۔ تو دیکھتے ہیں کہ جہاں تردی بیگ کو چھوڑا تھا۔ وہاں حریف کا لشکر اُترا ہوا ہے۔ چپ رہ گئے کہ کیا ہوا۔ فتح کی تھی شکست بن گئی۔ چپ چاپ دلّی کے برابر سے آہستہ آہستہ نکل کر پنجاب کی طرف چلے۔

ادھر فتح یاب جب تغلق آباد تک پہنچ گیا تو اس سے کب رہا جاتا تھا۔ دوسرے ہی دن ہیموں دلّی میں داخل ہوئے۔ دلّی عجب مقام ہے! کون سا سر ہے کہ سوائے حکومت رکھے اور وہاں پہنچ کر تخت پر بیٹھنے کی ہوس نہ کرے۔ اُس ہمت والے نے فقط جشن اور راجہ مہاراجہ کے خطاب پر قناعت نہ کی بلکہ بکرماجیت کے خطاب کو نام کا تاج کیا۔ اور سچ ہے۔ دلّی جیتی۔ بکرماجیت کیوں نہ ہوں۔

دلّی لے کر اُس کا دل ایک سے ہزار ہو گیا تھا۔ تردی بیگ کی بے ہمتی کو آیندہ کی روئداد کا نمونہ سمجھا۔ اور سامنے میدان کھُلا نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ خان خاناں نوجوان بادشاہ کو لئے سکندر کے ساتھ پہاڑوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لئے دلّی میں ایک دم ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا۔ بڑھے گھمنڈ کے ساتھ پانی پت پر فوج روانہ کی۔

اکبر جالندھر میں چھاؤنی ڈالے مہینہ کے تماشے دیکھ رہا تھا۔ یکایک خبر پہنچی۔ کہ ہیموں بقال عادلی کا سپہ سالار امرائے شاہی کو سامنے سے ہٹاتا۔ منزلوں کے ورق اُلٹتا چلا آتا ہے۔ کہ آگرے سے سکندر خاں اُزبک بھاگا۔ ساتھ ہی سُنا کہ غنیم نے تردی بیگ کو توڑ کر دلّی بھی مار لی۔ ابھی باپ کا سایہ سر پر سے اُٹھا۔ ابھی یہ شکستِ عظیم پیش آئی۔ اس پر ایسے سخت غنیم سے سامنا! افسردہ ہو گیا۔ اور لشکر میں خبریں برابر پہنچ رہی ہیں۔ کہ فلاں امیر چلا آتا ہے۔ فلاں سردار بھی بھاگا آتا ہے۔ ساتھ ہی خبر آئی کہ علی قلی خاں میدان جنگ میں نہ پہنچ سکا تھا وہ جمنا پار تھا کہ دلّی کی مہم طے ہو گئی۔ دو تخت گاہیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور شیر شاہی معرکے یاد آ گئے۔ امرا نے آپس میں کہا کہ موقع بیڈھب آن پڑا ہے۔ بہتر ہے کہ کابل کو اُٹھ چلیں سال آئندہ میں سامان کر کے آئیں گے اور غنیم کو دفع کرینگے۔

خان خانان نے جب یہ رنگ دیکھا۔ تو خلوت میں اکبر سے سارا حال عرض کیا اور کہا کہ حضور کچھ فکر نہ کریں یہ بے مروّت بے ہمت جان کو عزیز کر کے ناحق حوصلہ ہارتے ہیں۔ آپ کے اقبال سے سب سرانجام و انتظام ہو جائیگا۔ فدوی جلسۂ مشورت کرتے اُنہیں بلاتا ہے فقط حضور کا دستِ اقبال

میری پشت پر چاہیئے۔ چنانچہ امرا بلائے گئے۔ اُنہوں نے وہی تقریریں ادا کیں۔ خان خاناں نے کہا۔
ایک برس کا ذکر ہے۔ جو شاہ جنت مکان کی رکاب میں ہم تم آئے۔ اور اس ملک کو سر سواری لے لیا
اس وقت لشکر۔ خزانہ۔ سامان۔ جس پہلو سے دیکھو پہلے سے زیادہ ہے۔ ہاں! کمی ہے تو یہ
ہے کہ وہ شاہ نہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر کرو اگرچہ ہمیں نظر نہیں آتا مگر اُس کا سایہ سر پر موجود ہے۔
یہ معاملہ کیا ہے؟ جو ہم ہمت ہاریں۔ کیا اس واسطے کہ اپنی جانیں پیاری ہیں۔ کیا اس واسطے کہ بادشاہ
ہمارا نوجوان لڑکا ہے؟ افسوس ہے ہمارے حال پر کہ جس کے بزرگوں کا ہم نے اور ہمارے باپ
دادا نے نمک کھایا ہے۔ ایسے نازک وقت میں اس سے جانیں عزیز کریں اور وہ ملک جس پر اس
کے باپ اور دادا نے تلواریں مار کر۔ ہزار جان جوکھوں اُٹھا کر قبضہ پایا تھا۔ اُسے مُفت غنیم کے حوالے
کر کے چلے جائیں۔ جبکہ ہمارے پاس کچھ سامان تھا اور سامنے دو پُشت کے دعویدار افغان تھے۔ وہ
تو کچھ نہ کر سکے۔ یہ ۱۴ سو برس کا مرا ہوا بکرماجیت آج کیا کر لے گا۔ برائے خدا ہمت نہ ہارو اور ذرا
خیال کرو۔ عزت و آبرو کو تو یہاں چھوڑا۔ جانیں لے کر نکل گئے تو منہ کس ملک میں دکھائیں گے۔ سب
کہیں گے کہ بادشاہ تو لڑکا تھا۔ تم کہنہ عمل۔ کہن سال سپاہیوں کو کیا ہوا تھا۔ مار نہ سکتے تھے تو مر ہی
گئے ہوتے۔

یہ تقریر سُن کر سب چُپ ہو گئے۔ اور اکبر نے امرائے دربار کی طرف دیکھ کر کہا کہ دُشمن سر پر آپہنچا
کابل بہت دُور ہے۔ اُڑ کر بھی جاؤ گے تو نہ پہنچ سکو گے۔ اور میرے دل کی بات تو یہ ہے کہ اب
ہندوستان کے ساتھ سر لگا ہوا ہے۔ جو ہو سو یہیں ہو۔ یا تخت یا تختہ۔ دیکھو خان بابا! شاہ مغفرت
پناہ نے بھی سب کاروبار کا اختیار تمہیں دیا تھا۔ میں تمہیں اپنے سر کی اور اُن کی روح کی قسم دے
کر کہتا ہوں۔ کہ جو مناسبِ وقت اور مصلحتِ دولت دیکھو۔ اُسی طرح کرو۔ دشمنوں کی کچھ پروا
نہ کرو۔ میں نے تمہیں اختیار دیا +

یہ سُن کر امرا چُپ ہو گئے۔ خان بابا نے فوراً تقریر کا رنگ بدلا۔ بڑی اولوالعزمی اور بلند نظری
سے سب کے دل بڑھائے۔ اور دوستانہ مصلحتوں کے ساتھ نشیب و فراز دکھا کر متفق کیا۔ امرائے
اطراف کو اور جو شکستہ حال دلی سے شکست کھا کر آئے تھے۔ ان کے نام دل دہی اور دلاسے کے
فرمان جاری کر کے لکھا کہ تم بہ اطمینان تھانیسر کے مقام میں آکر ٹھہرو۔ ہم خود لشکر منصور کو لئے آتے ہیں
غرض عیدِ قربان کی نماز جالندھر کی عیدگاہ میں پڑھی اور مُبارک باد لیکر پیش خیمہ دلی کی طرف روانہ ہوا

فال مبارک ۔ سلاطینِ سلف میں بہت سے شغل تھے کہ شوق ہائے شاہانہ سمجھے جاتے

تھے۔ اُن ہی میں مصوّری تھی۔ ہمایوں کو تصویر کا بہت شوق تھا۔ اکبر کو حکم دیا تھا کہ تم بھی سیکھا کرو۔ جب سکندر کی مہم فتح ہوچکی (ہیموں کی بغاوت کا ابھی ذکر فکر بھی نہیں تھا) اکبر ایک دن تصویر خانے میں بیٹھا تھا۔ مُرقّع کھُلے تھے۔ مصوّر حاضر تھے۔ ہر شخص اپنی دست کاری میں مصروف تھا۔ اکبر نے ایک تصویر کھینچی۔ کہ گویا ایک شخص کا سر۔ ہاتھ پاؤں الگ الگ کٹے پڑے ہیں۔ کسی نے عرض کی حضور یہ کس کی تصویر ہے؟ کہا ہیموں کی +

لیکن اِسے شہزادہ مزاجی کہتے ہیں۔ کہ جب جالندھر سے چلنے لگے۔ تو میر آتش نے چاہا۔ کہ عید کی مبارک بادی میں آتش بازی کی سیر دکھائے۔ انہوں نے اس میں یہ بھی فرمائش کی کہ ہیموں کی مورت بناؤ اور راون کی طرح آگ دے کر اُڑاؤ۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ اچھا۔

| مبارک بود فالِ فرخ زدن | نہ بر رُخ زدن بلکہ شہ رُخ زدن |

جب اقبال سامنے ہوتا ہے۔ تو وہی مُنہ سے نکلتا ہے جو ہونا ہوتا ہے! نہیں! یہی کہو کہ جو مُنہ سے نکلتا ہے۔ وہی ہوتا ہے +

خانِ خاناں کی لیاقت اور ہمّت کی تعریف میں زبانِ قلم قاصر ہے۔ مشرقی ہندوستان میں تو یہ تلاطم پڑا ہؤا تھا۔ اور سکندر سور جو کہ پہاڑوں میں رُکا بیٹھا تھا۔ دانا سپہ سالار نے اس کے لئے فوج کے بندوبست سے سدِّ سکندر باندھی۔ راجہ رام چند کانگڑے کا راجہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا دبدبہ دکھاکر پیغامِ سلام کئے۔ کہ حسبِ دلخواہ عہد نامہ لکھ کر حضور میں حاضر ہوگیا +

غرض دلاور سپہ سالار بادشاہ اور بادشاہی لشکر کو ہوا کے گھوڑوں پر اُڑاتا بجلی اور بادل کی کڑک دمک دکھاتا دلّی کو چلا۔ سرہند کے مقام پر دیکھا کہ بھاگے بھٹکے امیر بھی حاضر ہیں۔ اُن سے ملاقاتیں کرکے صلاح و مشورت کے ساتھ بندوبست شروع کئے۔ لیکن خود مختاری کی تلوار نے اس موقع پر ایسی کاٹ دکھائی۔ کہ تمام امرائے بابری میں کھلبلی پڑ گئی۔ پھر بھی کوئی دم نہ مار سکا بلکہ ہر شخص تھرّا کر اپنے اپنے کام پر متوجّہ ہوگیا +

آزاد۔ وہ تردی بیگ حاکم دلی کا قتل تھا۔ یہ ضرور ہے کہ دونوں امیروں کے دلوں میں عداوت کی پھانسیں کھٹک رہی تھیں مگر مورّخ یہ بھی کہتے ہیں کہ مصلحت یہی تھی جو تجربہ کار سپہ سالار اُس وقت کرگزرا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ قتل بالکل بے جا ہوتا تو بابری امیر (جن میں ایک ایک اُس کا برابر کا دعوے دار تھا) اسی طرح دم بخود نہ رہ جاتے۔ فوراً گڑ کھڑے ہوتے +

بادشاہ جواں سال تھانیسر کے مقام پر تھا جو سُنا کہ غلیم کا توپ خانہ بہ ہزار منچلے پٹھانوں کے

ساتھ پانی پت کے مقام پر آ گیا۔ خان خاناں نے تجربے اِستقلال کے ساتھ لشکر کے دو حصے کئے۔ ایک کو لیکر شکوہ شاہانہ کے ساتھ خود بادشاہ کی رکاب میں رہا۔ دوسرے میں چند دلاور اور جنگ آزمودہ امیر اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ رکھے۔ اُن پر علی قلی خاں شیبانی کو سپہ سالار کر کے دشمن کے مقابلے پر بطور ہراول روانہ کیا۔ اور اپنی فوج خاص بھی ساتھ کر دی۔ اُس جواں ہمت۔ اور پُرجوش افسر نے برق و باد کو پیچھے چھوڑا۔ کرنال پر جا کر مقام کیا۔ اور جاتے ہی ہاتھوں ہاتھ حریفوں سے آتش خانہ چھین لیا ✦

جب ہیموں نے سُنا کہ آتش خانہ اِس بے آبروئی کے ساتھ ہاتھ سے گیا تو دماغ رنجک کی طرح اُڑ گیا۔ دلی سے دھواں دھار ہو کر اُٹھا۔ بڑی بے پروائی سے پانی پت کے میدان پر آیا اور جتنی جنگی طاقت تھی حوصلے سے نکال کر میدان میں ڈال دی۔ علی قلی خاں کچھ خطر خاطر میں نہ لایا۔ خان خاناں سے مدد بھی نہ مانگی۔ جو فوج اپنے پاس تھی وہی لی اور آ کر حریف سے دست و گریبان ہو گیا۔ پانی پت کے میدان میں رن پڑا۔ اور ایسا بھاری رن پڑا کہ خدا جانے کب تک کتابوں میں یادگار رہے گا جس صبح کو یہ معرکہ ہوا۔ اکبری لشکر میں لڑائی کا کسی کو خیال نہ تھا۔ وہ خاطر جمع سے پچھلی رات رہے کرنال سے چلے اور کچھ دن چڑھا تھا جو ہنستے کھیلتے چند کوس زمین طے کر کے اُترپڑے رستے کی گرد چہروں سے نہ پونچھی تھی۔ اور میدانِ جنگ یہاں سے ۵ کوس آگے تھا۔ جو ایک سوار تیر کی رفتار پر پہنچا۔ اور خبر دی کہ غنیم سے مقابلہ ہو گیا۔ ۳۰ ہزار فوج اُس کی ہے۔ اکبری جاں نثار فقط ۱۰ ہزار ہیں خان زمان جرأت کر کے لڑ بیٹھا ہے۔ مگر میدان کا طور بے طور ہے ✦

خان خاناں نے پھر لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ اور اکبر خود اسلحہ جنگ سجنے لگا گر چہرے سے شگفتگی اور شوقِ جنگ ٹپکتا تھا۔ فکر یا پریشانی کا اثر بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ مصاحبوں کے ساتھ ہنستا ہوا سوار ہوا۔ ہر ایک امیر اپنی اپنی فوج کو لئے کھڑا تھا۔ اور خان خاناں گھوڑا مارے ایک ایک غول کو دیکھتا پھرتا تھا۔ اور سب کے دل بڑھاتا تھا۔ نقارچی کو اشارہ ہوا۔ اُدھر نقارے پر چوٹ پڑی اکبر نے رکاب کو جنبش دی اور دریائے لشکر بہاؤ میں آیا۔ تھوڑی دُور چل کر خدا جانے آدمی تھا یا فرشتہ سامنے سے گھوڑا مارے آیا۔ ایک شخص نے خبر دی کہ لڑائی فتح ہو گئی۔ کسی کو یقین نہ آیا۔ ابھی میدانِ جنگ کی سیاہی نمودار نہ ہوئی کہ فتح کے نقارے اُڑتے نظر آنے لگے۔ جو خبردار آتا تھا مبارک مبارک کہتا ہوا خاک پر گر پڑتا تھا۔ اب کون تھم سکتا تھا۔ پل کی پل میں گھوڑے اُڑا کر پہنچے ✦

اتنے میں ہیموں مجروح اور بدحال سامنے حاضر کیا گیا۔ وہ ایسا چُپ چاپ سر جھکائے کھڑا

تھا کہ نوجوان بادشاہ کو ترس آیا۔ کچھ پوچھا۔ اُس نے جواب نہ دیا۔ کون کہہ سکے کہ عالمِ حیرت میں تھا یا ندامت تھی۔ یا ڈر چھا گیا تھا اس لئے بولا نہ جاتا تھا۔ شیخ گدائی کنبوہ کہ خاندان میں مسند معرفت کے بیٹھنے والے۔ اور دربار میں صدر الصدور تھے۔ اُس وقت بولے "پہلا جہاد ہے حضور دستِ مبارک سے تلوار ماریں کہ جہاد اکبر ہو" بادشاہ نوجوان کو آفرین ہے۔ رحم کھا کر کہا کہ یہ تو آپ مرتا ہے اس کو کیا ماروں! پھر کہا میں تو اُسی دن کام تمام کر چکا۔ جس دن تصویر کھینچی تھی۔ مقامِ جنگ پر کلّہ منار عظیم الشان بنوا دیا اور دلّی کو روانہ ہوئے۔

ہیموں کی بی بی خزانے کے ہاتھی لے کر بھاگی۔ اکبری لشکر سے حسین خاں اور پیر محمد خاں فوج لیکر پیچھے دوڑے۔ وہ بیوہ بڑھیا کہاں بھاگتی؟ بجواڑے[1] کے جنگل پہاڑوں میں کوادہ گاؤں پر جا کر پکڑا۔ جو دولت تھی۔ بہت تو رستے کے گنواروں کے حصے کی تھی۔ باقی غازیوں کے ہاتھ آئی۔ وہ بھی اتنی تھی کہ اشرفیاں ڈھالوں میں بھر بھر کر بٹیں۔ جس رستے سے رانی گزری تھی۔ روپے اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں گرتی چلی گئی تھیں۔ برسوں تک مسافر رستے میں پایا کرتے تھے جنڈا کی شان وہی خزانے تھے جو شیر شاہ۔ سلیم شاہ۔ عدلی نے سالہا سال میں جمع کئے تھے۔ اور خدا جانے کن کن کلیجوں ہاتھ گھنگولے تھے۔ ایسے مال اسی طرح برباد ہوتے ہیں۔ ع بباد آمد و ہم بباد ے رود۔ خواجہ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر چہ دل کرد فراہم ہمہ اش دیدہ بباخت	اللہ اللہ کہ تبہ کرد و کہ اندوختہ بود

بیرم خانی دَور کا خاتمہ اور اکبر کی خود اختیاری

تقریباً ۴ برس تک اکبر کا یہ حال تھا۔ کہ شاہ شطرنج کی طرح مسند پر بیٹھا تھا۔ خان خاناں جس چال چاہتا تھا اُسی چال چلتا تھا۔ اور اُسے اِس بات کی کچھ پروا بھی نہ تھی۔ نیزہ بازی و چوگان بازی کرتا تھا باز باشے اڑاتا تھا۔ ہاتھی لڑاتا تھا۔ جاگیر۔ انعام موقوفی بحالی کل کاروبار سلطنت خان خاناں کے ہاتھ میں تھے۔ اس کے رشتہ دار ملازم اور متوسّل عمدہ زرخیز اور سرسبز جاگیریں پاتے تھے۔ سامان ولباس سے خوشحال نظر آتے تھے۔ بادشاہی نمکخوار جو باپ دادا کے عہد سے خدمتوں کے دعوے رکھتے تھے۔ اُن کی جاگیریں ویران۔ خود پریشان اور شکستہ حال تھے۔ بلکہ بادشاہ اپنے شوقوں کے لئے بھی خزانہ خالی پاتا تھا۔ اسی لئے کبھی کبھی تنگ ہوتا تھا۔ پندرہ سولہ برس کے لڑکے کی

---

[1] یہ وہ بجواڑہ نہیں جو ضلع ہوشیارپور پنجاب میں ہے۔ بلکہ ایک بجواڑہ بیانہ علاقہ آگرہ میں ہے اور یہاں وہی مراد ہے

کیا بساط ہوتی ہے۔ علاوہ بریں بچپن سے خان خاناں کی اتالیقی کے پیچھے رہا تھا۔ لوگ اُس کی شکایت کرتے تو چپ ہو رہتا تھا؛

خان خاناں کے اختیارات اور تجویزیں کچھ نئی نہ تھیں۔ ہمایوں کے عہد سے جاری چلی آتی تھیں مگر اُس وقت عرض معروض کے رستے سے ہوتی تھیں۔ اور بادشاہ کی زبان سے حکم کا لباس پہن کر نکلتی تھیں۔ البتہ اب وہ بلاواسطہ خان خاناں کے احکام تھے۔ دوسرے یہ کہ اوّل اوّل سلطنت ملک گیری کی محتاج تھی۔ قدم قدم پر مشکلوں کے دریا اور پہاڑ سامنے تھے۔ اور اُس کے سرانجام کا حوصلہ خان خاناں کے سوا ایک کو بھی نہ تھا۔ اب میدان صاف اور دریا پایاب نظر آنے لگے۔ اس لئے ہر شخص کو اچھی جاگیر اور عمدہ خدمت مانگنے کا مُنہ ہو گیا۔ اور اُس کا اور اُس کے متوسّلوں کا فائدہ آنکھوں میں کھٹکنے لگا؛

خان خاناں کی مخالفت میں کئی امیر تھے۔ مگر سب سے زیادہ ماہم انکہ اور اُس کا بیٹا آدہم خاں اور چند رشتہ دار تھے۔ کیا دربار۔ کیا محل۔ ہر جگہ دخیل تھے۔ اُن کا بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ اور واقعی تھا بھی۔ ماہم نے ماں کی جگہ بیٹھ کر اُسے پالا تھا۔ اور جب بے درد چچا نے معصوم بھتیجے کو توپ کے مہرے پر رکھا تھا تو وہی تھی جو اُسے گود میں لے کر بیٹھی تھی۔ اُس کا بیٹا ہر وقت پاس رہتا تھا۔ اندر وہ لگاتی بجھاتی رہتی تھی۔ اور باہر بیٹا اور اس کے متوسّل۔ اور حق تو یہ ہے کہ اس عورت کے تعلقے اور حوصلے نے مردوں کو مات کر دیا تھا۔ تمام امرائے دربار حد سے زیادہ اس کی عظمت کرتے تھے اور مادر مادر کہتے مُنہ سوکھتا تھا۔ وہ مہینوں تک جوڑ توڑ کرتی رہی۔ پُرانے خوانین و امرا کو اپنے ساتھ شامل کیا۔ تم خان خاناں کے حال میں دیکھنا! اس کا جھگڑا بھی مہینوں تک رہا۔ اس عرصے میں اور اُس کے بعد بھی جو کام خان خاناں دربار میں بیٹھکر کیا کرتا تھا۔ ملک داری کے معاملے امرا کے عہدے اور منصب جاگیر۔ موقوفی۔ بحالی کل کاروبار وہ اندر ہی اندر بیٹھے کرتی؛

قدرتِ الٰہی کا تماشا دیکھو۔ کہ سب دل کے ارمان دل ہی میں لے گئی۔ انّا اور انّا والوں نے سمجھا تھا کہ مکھی کو نکال کر پھینک دینگے اور گھونٹ گھونٹ پی کر ہم دودھ کے مزے لیں گے یعنی خانِ خاناں کو اُڑا کر اکبر کے پردے میں ہم ہندوستان کی بادشاہت کرینگے۔ وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ اکبر پردہ غیب سے اُن لیاقتوں کا مجموعہ بن کر نکلا تھا جو ہزاروں میں ایک بادشاہ کو نصیب ہوئی ہونگی۔ اُس نے چند روز میں ساری سلطنت کو انگوٹھی کے نگینے میں دھر لیا۔ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ اور دیکھتا کون؟ جو لوگ خان خاناں کی بربادی پر چھُریاں تیز کئے پھرتے تھے۔ برس دن کے اندر باہر اس طرح نابود ہو گئے

گویا قضا نے جھاڑ دیکر کوڑا پھینک دیا۔ (خان خاناں کا معاملہ ۹۶۷ھ میں فیصلہ ہوا)

کہنا یہ چاہیئے کہ ۹۶۷ھ سے اکبر بادشاہ ہوا۔ کیونکہ اب اُس نے خود اختیاری کے ساتھ ملک کے کاروبار سنبھالے۔ یہ وقت اکبر کے لیئے نہایت نازک موقع تھا اور مشکلیں اس کی چند در چند تھیں۔ (۱) وہ ایک بے علم اور بے تجربہ نوجوان تھا جس کی عمر ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی بچپن اُن چچاؤں کے پاس بسر ہوا جو اُس کے باپ کے نام کے دشمن تھے۔ لڑکپن کی حد میں آیا تو باز اڑاتا رہا گئے دوڑاتا رہا۔ پڑھنے سے دل کوسوں بھاگتا تھا (۲) لڑکپن کی حد سے نہ بڑھا تھا کہ بادشاہ ہو گیا۔ شکار کھیلتا تھا چیتے مارتا تھا۔ مست ہاتھیوں کو لڑاتا تھا۔ جنگلی دیوزادوں کو سدھاتا تھا۔ سلطنت کے کاروبار سب خان بابا کرتے تھے۔ یہ مُفت کے بادشاہ تھے (۳) ابھی سارا ہندوستان فتح بھی نہ ہوا تھا۔ پورب کا ملک شیر شاہی سرکشوں سے افغانستان ہو رہا تھا۔ اور ایک ایک راجہ بکرماجیت اور راجہ بھوج بنا ہوا تھا۔ سلطنت کا پہاڑ اُس کے سر پر آپڑا اور اُس نے ہاتھوں پر لیا (۴) بیرم خاں ایسا منتظم اور رعب داب والا امیر تھا کہ اُسی کی لیاقت تھی جس نے ہمایوں کا بگڑا ہوا کام بنایا اور صلاحیت کے رستے پر لایا۔ اُس کا دفعتہً دربار سے نکل جانا کچھ آسان بات نہ تھی خصوصاً وہ حالت کہ تمام ملک باغیوں سے بھڑوں کا چھتہ ہو رہا تھا (۵) سب سے زیادہ یہ کہ اُن امیروں پر حکم کرنا اور اُن سے کام لینا پڑا جن کی بے وفائی نے ہمایوں کو چھوٹے بھائیوں سے برباد کروا دیا۔ وہ دوغلے اور دو رُخے لوگ تھے۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ مشکل تر یہ کہ بیرم خاں کو نکال کر ہر ایک کا دماغ فرعون کا دارالخلافہ ہو گیا تھا۔ نوجوان شہزادہ کسی کی نگاہ میں جچتا نہ تھا۔ ہر شخص اپنے تئیں خود مختار سمجھتا تھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی ہمت اور حوصلے کو کہ ایک مشکل کو مشکل نہ سمجھا سخاوت کے ہاتھ سے ہر گرہ کو کھولا۔ جو نہ کھلی اُسے تیغ شجاعت سے کاٹا۔ اور نیک نیتی نے ہرارادے کو پورا اُتارا۔ اقبال کا یہ عالم تھا کہ فتح اور ظفر حکم کی منتظر رہتی تھی۔ جہاں جہاں لشکر جاتے تھے فتح یاب ہوتے تھے اکثر مہموں میں خود اس کڑک دمک سے یلغار کر کے گیا کہ کہنہ عمل سپاہی اور پُرانے پُرانے سپہ سالار حیران تھے ؞

اکبر کی پہلی یلغار

ادہم خاں پر

ملک مالوہ میں شیر شاہ کی طرف سے شجاعت خاں عرف شجاول خاں حکمرانی کرتا تھا۔ وہ ۱۲ برس ایک مہینے کی میعاد بسر کر کے دُنیا سے رخصت ہوا۔ باپ کی مسند پر بازید خاں عرف باز بہادر نے جلوس کیا

دو برس دو مہینے عیش و عشرت کے شکار کرتا رہا کہ دفعتہً اقبالِ اکبری کا شہباز ہوائے ملک گیری میں بلند پرواز ہوا۔ بیرم خاں نے اس مہم پر بہادر خاں۔ خان زماں کے بھائی کو بھیجا۔ انہیں دنوں میں اس کے اقبال نے رُخ بدلا۔ بہادر خاں مہم کو ناتمام چھوڑ کر طلب ہوا۔ بیرم خاں کی مہم کا فیصلہ کر کے اکبر نے ادھر کا قصد کیا۔ آدہم خان اور ناصر الملک پیر محمد خاں کے لوہے تیز ہو رہے تھے اُن ہی کو فوجیں دے کر روانہ کیا۔ بادشاہی لشکر فتح یاب ہوا۔ باز بہادر اس طرح اُڑ گیا جیسے آندھی کا کوا اُس کے گھر میں پُرانی سلطنت تھی اور دولت بے قیاس۔ دفینے۔ خزینے۔ توشہ خانے۔ جواہر خانے تمام عجائب و نفائس سے مالا مال ہو رہے تھے۔ کئی ہزار ہاتھی تھے۔ عربی و ایرانی گھوڑوں سے اصطبل بھرے ہوئے وغیرہ وغیرہ وہ عیش کا بندہ تھا۔ عشرت و نشاط۔ ناچ گانا۔ رات دن رنگ رلیوں میں گزارتا تھا۔ سیکڑوں کنچنیاں۔ کلاونت۔ گائک۔ نائک نوکر تھے۔ کئی سو گائنیں ڈومنیاں پاتریں حرم سرا میں داخل تھیں۔ بے قیاس نعمتیں جو ہاتھ آئیں تو ادہم خاں مست ہو گئے۔ کچھ ہاتھی ایک عرضداشت کے ساتھ بادشاہ کو بھیج دئے۔ اور آپ وہیں بیٹھ گئے۔ ملک میں سے علاقے بھی آپ ہی امرا کو تقسیم کر دیئے۔ پیر محمد خاں نے بھی بہت سمجھایا۔ مگر ہوش نہ آیا۔

آدہم خاں کے ماتھے پر ایک پاتر (کنچنی) نے جو کالک کا ٹیکہ دیا۔ ماں کے دودھ سے مُنہ دھوئینگے تو بھی نہ چھٹیگا۔ باز بہادر پشتوں سے فرمانروائی کرتا تھا۔ مدتوں سے سلطنت جمی ہوئی تھی۔ عیش کا بندہ تھا۔ اور آرام و بے فکری میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کا دربار اور حرم سرا دن رات راجہ اندر کا اکھاڑا تھا۔ اُنہیں میں ایک پاتر ایسی پری زاد تھی۔ جس کے حُسن کا باز بہادر دیوانہ بلکہ عالم میں فسانہ تھا۔ رُوپ متی اُس کا نام تھا۔ اُس حُسن و جمال پر لُطف یہ کہ لطیفہ گوئی۔ حاضر جوابی۔ شاعری۔ گانے بجانے میں بینظیر نہیں۔ بدر منیر تھی۔ اِن خوبیوں اور محبوبیوں کی دھوم سُن کر ادہم خاں بھی لٹو ہو گئے۔ اور پیام بھیجا۔ اُس نے بڑے سوگ اور بروگ کے ساتھ جواب دیا ”جاؤ خانہ بربادوں کو نہ ستاؤ۔ باز بہادر گیا۔ سب باتیں گئیں اب اس کام سے جی بیزار ہو گیا۔“ انہوں نے پھر کسی کو بھیجا۔ اُدھر بھی اس کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ دلاور۔ بہادر۔ سجیلا جوان ہے۔ سردار ہے۔ سردار زادہ ہے۔ اور انا کا بیٹا ہے تو اکبر کا ہے کسی اور کا تو نہیں۔ تمہارے حُسن کا چاند چمکتا رہے۔ باز گیا تو گیا۔ اُسے چکور بناؤ۔ عورت نے اچھے اچھے مردوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ جیسی صورت کی وضعدار تھی ویسی ہی طبیعت کی بھی وضع دار تھی۔ دل نے گوارا نہ کیا مگر سمجھ گئی کہ اس سے اِس طرح چھٹکارا نہ ہوگا۔ قبول کیا۔ اور دو تین دن بیچ میں ڈال کر وصل کا وعدہ کیا۔ جب وہ رات آئی تو سویرے سویرے

ہنسی خوشی بن سنور۔ پھول پہن عطر لگا۔ چھپر کھٹ میں گئی اور پاؤں پھیلا کر لیٹ رہی۔ دوپٹا تان لیا۔ محل والیوں نے جانا کہ رانی جی سوتی ہیں۔ ادہم خان اُدھر گھڑیاں گن رہے تھے۔ وعدے کا وقت نہ پہنچا تھا کہ جا پہنچے۔ اُسی وقت خلوت ہو گئی۔ لونڈیاں چیریاں یہ کہہ کر سب باہر چلی آئیں کہ رانی جی سکھ کرتی ہیں۔ یہ خوشی خوشی چھپر کھٹ میں داخل ہوئے کہ اُسے جگائیں۔ جاگے کون؟ وہ تو زہر کھا کر سوئی تھی۔ اور بات کے پیچھے جان کھوئی تھی۔

اکبر کو بھی خبر پہنچی۔ سمجھا کہ یہ انداز اچھے نہیں۔ چند جاں نثاروں کو ساتھ لیکر گھوڑے اُٹھائے۔ رستے میں کاکرون کا قلعہ ملا کہ ادہم خاں بھی اِس پر فوج کشی کر کے آیا چاہتا تھا۔ قلعہ دار اِدھر اُدھر کی خبرداری میں تھا۔ یکایک دیکھا کہ اِدھر سے بجلی آن گری۔ کُنجیاں لے کر حاضر ہوا۔ اکبر قلعے میں گیا جو کچھ حاضر تھا نوش فرمایا اور قلعہ دار کو خلعت دے کر منصب بڑھایا۔

پھر جو رکاب میں قدم رکھا تو اِس سناٹے سے گیا کہ ماہم نے بھی قاصد دوڑائے تھے مگر سب رستے ہی میں رہے۔ یہ دن رات مارا مار گئے۔ اور صبح کا وقت تھا کہ ادہم کے سر پر جا دھمکے اُسے خبر بھی نہ تھی فوج لے کر کاکرون پر چلا تھا۔ چند عزیز مصاحب ہنستے بولتے آگے آگے جاتے تھے اُنہوں نے جو یکایک اکبر کو سامنے سے آتے دیکھا۔ بے اختیار ہو کر گھوڑوں سے زمین پر گر پڑے اور آداب بجالائے ادہم خاں کو بادشاہ کے آنے کا سان گمان بھی نہ تھا۔ اس نے دُور سے دیکھا حیران ہوا کہ کون آتا ہے جسے دیکھکر میرے نوکر آداب بجالائے۔ گھوڑے کو ٹھکرا کر آپ آگے بڑھا۔ دیکھے تو آفتاب سامنے ہے۔ ہوش جاتے رہے۔ اُتر کر رکاب پر سر رکھدیا۔ قدم چومے۔ بادشاہ ٹھہر گئے۔ امرا اور خوانین قدیمی نمکخوار جو ادہم کے ساتھ آتے تھے۔ سب کے سلام لئے۔ ایک ایک کو پوچھکر سب کا دل خوش کیا اگرچہ ادہم ہی کے گھر میں جا کر اترے۔ مگر شگفتہ ہو کر بات نہ کی۔ گرد سفر سے آلودہ تھے۔ توشہ خانے کا صندوق پیچھے تھا۔ کپڑے نہ بدلے۔ ادہم نے لباس کے بُقچے حاضر کیے۔ منظور نہ فرمائے۔ ایک ایک امیر کے آگے روتا جھینکتا پھرا۔ خود بھی بہت ناک گھسنی کی۔ بارے دن بھر کے بعد عرض قبول ہوئی اور خطا معاف ہوئی۔

حرم سرا کی پُشت پر جو مکان تھا۔ رات کو اُس کے کوٹھے پر آرام کیا۔ اکثر جوان ادہم خاں کی سرشت میں بدی داخل تھی۔ بد گمانی نے اُس کے کان میں پھونکا کہ بادشاہ جو یہاں اُترے ہیں اِس سے میرے ننگ و ناموس پر نظر منظور ہے۔ سر شوری نے صلاح دی کہ جس وقت موقع پائیے ماں کے دودھ میں نمک گھولے اور حق نمک کو آگ میں ڈال کر بادشاہ کا کام تمام کر دے۔ نیک نیت بادشاہ کا ادھر خیال بھی نہ تھا۔ خیر جس کا خدا نگہبان ہو اُسے کون مار سکے۔ اُس بے ہمت کی بھی ہمت نہ پڑی۔

دوسرے ہی دن ماہم جا پہنچی۔ بیٹے کو بہت لعنت ملامت کی۔ بادشاہ کے سامنے بھی باتیں بنائیں۔ تمام ضبطی کے نفائس تحائف حضور میں حاضر کئے۔ اور بگڑی ہوئی بات پھر بنا لی ❖

بادشاہ نے یہاں چار دن مقام کیا۔ ملک کا بندوبست کرتے رہے۔ پانچویں دن روانہ ہوتے شہر سے نکل کر باہر ڈیروں میں اُترے۔ باز بہادر کی عورتوں میں سے کچھ عورتیں پسند آئی تھیں۔ وہ ساتھ لے لی تھیں۔ ان میں سے دو پر ادہم خاں کی نیت بگڑی ہوئی تھی۔ ماں کی لونڈیاں۔ مامائیں بادشاہ کی حرم سرا میں بھی خدمت کرتی تھیں۔ اُن کی معرفت دونوں پریوں کو اُڑا لیا۔ جانتا تھا کہ ہر شخص کوچ کے کاروبار اور اپنے اپنے حال میں گرفتار ہے۔ کون پوچھے گا۔ کون پیچھا کرے گا۔ اکبر کو جب خبر ہوئی تو سمجھ گیا۔ دل ہی دل میں دق ہوا۔ اسی وقت کوچ ملتوی کر دیا اور چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ وہ بھی اِدھر اُدھر سے جستجو کر کے پکڑ ہی لائے۔ ماہم نے سُنا۔ سمجھی کہ جب دونوں عورتیں سامنے آئیں۔ بھانڈا پھوٹ جائیگا۔ اور بیٹے کے ساتھ میرا بھی مُنہ کالا ہو گا۔ افسوس دونوں بے گناہوں کو اوپر ہی اوپر مروا ڈالا۔ کٹے ہوئے گلے کیا بولتے۔ اکبر پر بھی راز کھُل گیا تھا مگر لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور آگرے کو روانہ ہوا۔ اللہ اکبر۔ پہلے ایسا حوصلہ پیدا کرلے جب کوئی اکبر سا بادشاہ کہلائے۔ آگرے میں آئے اور چند روز کے بعد ادہم خاں کو بلا لیا۔ پیر محمد خاں کو علاقہ سپرد کیا۔ یہ اکبر کی پہلی یلغار تھی۔ کہ جس رستے کو شاہان سلف پورے ایک مہینے میں طے کرتے تھے۔ اس نے ہفتے بھر میں طے کیا ❖

دوسری یلغار

خان زمان پر

خان زماں علی قلی خان نے جونپور وغیرہ اضلاع مشرقی میں فتوحات عظیم حاصل کر کے بہت سے خزانے اور سلطنت کے سامان سمیٹے تھے۔ اور حضور میں نہ بھیجے تھے۔ شاہم بیگ کے مقدمے میں ابھی اس کی خطا معاف ہو چکی تھی۔ اولوالعزم بادشاہ ادہم خاں سے دلجمعی کر کے آگرے میں آیا۔ آتے ہی توسن ہمت پر زین رکھا۔ اور سُورج مغرب سے مشرق کو چلا ؎

یک جا قرار ہمت عالی نمے کند	گردش ضرورت است سپہر بلند را

بڈھے بڈھے امرا کو رکاب میں لیا۔ وہ خان زمان کو جانتا تھا۔ کہ مَن چلا بہادر ہے۔ اور غیرت والا ہے اہل دربار نے اُسے ناحق ناراض کر دیا ہے۔ شاید بگڑ بیٹھا۔ تو بہتر ہے۔ کہ تلوار درمیان نہ آئے۔ کہن سال نمک حلال بیچ میں آکر باتوں میں کام نکال لیں گے۔ چنانچہ کالپی کے رستے الہ آباد کا رُخ کیا اور

لہ مفصل حال دیکھو تتمہ میں ❖

اس کڑک دمک سے کرہ مانک پور جا کھڑا ہوا۔ کہ خان زماں اور بہادر خاں دونوں ہاتھ باندھ کر پاؤں میں آن پڑے وہاں سے بھی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ پھرے۔ بہکانے والوں نے اس کی طرف سے بہت کان بھرے تھے۔ مگر نیک نیت بادشاہ کا قول تھا کہ آدمی ایک نسخہ معجون دواخانہ الٰہی کا ہے مستی و ہوشیاری سے مرکب ہے۔ اسے بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ امرا ہرے بھرے درخت ہیں۔ ہمارے لگائے ہوئے ہیں۔ انہیں سرسبز کرنا چاہیئے۔ نہ کاٹنا انسان میں برگزیدہ صفت معافیٔ گناہ ہے۔ جو حضور میں چلا آئے اور ناکام پھر جائے۔ تو اُس پر حیف نہیں۔ ہم پر حیف ہے (دیکھو اکبر نامہ کہ اسی مقام پر شیخ ابوالفضل نے کیا لکھا ہے)۔

تیر آسمانی اور غیب کی نگہبانی

اکبر کی نیت اور علو ہمت کی باتیں حد تحریر سے باہر ہیں ۹۷۰ھ میں دلی پہنچے۔ شکار گاہ سے پھرتے ہوئے سلطان نظام الدین اولیا کی زیارت کو گئے۔ وہاں سے رخصت ہوئے۔ ماہم کے مدرسے کے پاس تھے۔ جو معلوم ہوا کہ کچھ شانے میں لگا۔ دیکھا تو تیر اک پوست مال تھا مگر پار نکل گیا تھا۔ دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ کسی نے مدرسے کے کوٹھے پر سے مارا ہے۔ ابھی تیر نہ نکلا تھا۔ کہ مجرم کو پکڑ لائے۔ دیکھا کہ فولاد حبشی مرزا شرف الدین حسین کا غلام ہے۔ آقا چند روز پہلے بغاوت کر کے بھاگا تھا۔ جب شاہ ابوالمعالی سے سازش ہوئی تو تین سو آدمی جنہیں اپنی جاں نثاری کا بھروسہ تھا اس کے ساتھ گئے تھے۔ آپ مکہ کا بہانہ کر کے بھاگا پھرتا تھا۔ ان میں سے یہ شب سیاہ اس کام کا بیڑا اٹھا کر آیا تھا۔ لوگوں نے چاہا۔ فولاد سنگ دل سے پوچھیں کہ یہ حرکت کس کے اشارے سے کی ہے؟ اکبر نے کہا نہ پوچھو۔ غلام روسیاہ خدا جانے کیا کہے۔ اور کن کن جاں نثاروں کی طرف سے شبہے ڈال دے۔ بات نہ کرنے دو اور کام تمام کر دو۔ دریادل بادشاہ کے چہرے پر کچھ اضطراب نہ ہوا اسی طرح گھوڑے پر سوار چلا آیا۔ اور قلعۂ دیں پناہ میں داخل ہوا۔ چند روز میں زخم اچھا ہو گیا۔ اور اسی ہفتے میں سنگھاسن پر بیٹھ کر آگرے کو روانہ ہوئے۔

عجیب اتفاق اکبر کے کتوں میں ایک زرد رنگ کا کتا تھا۔ نہایت خوبصورت۔ اسی واسطے مہوہ اس کا نام رکھا تھا۔ وہ آگرے میں تھا۔ جس دن یہاں تیر لگا۔ اسی دن سے مہوے نے راتب کھانا چھوڑ دیا تھا جب بادشاہ وہاں پہنچے۔ تو میر شکار نے حال عرض کیا۔ اکبر نے اُسے حضور میں منگایا۔ آتے ہی پاؤں میں لوٹ گیا۔ اور نہایت خوشی کی حالتیں دکھائیں۔ اپنے سامنے راتب

منگا کر دیا جب اس نے کھایا۔

یہ یلغاریں بابری بلکہ تیموری و چنگیزی خون کے جوش تھے کہ اکبر پر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کسی بادشاہ کے دماغ میں ان باتوں کی بو بھی نہ رہی۔ بیٹھے تھے کہ گدی پر بیٹھے تھے۔ ان کی قسمتیں لڑتی تھیں۔ اور امرا فوجیں لے کر مرتے پھرتے تھے۔ اس کا کیا سبب سمجھنا چاہیئے؟ ہندوستان کی آرام طلب خاک۔ اور باوجود گرمی کے سرد مہر ہوا اور بزدل پانی۔ روپے کی بہتات۔ سامانوں کی کثرت۔ یہاں جو ان کی اولاد ہوئی۔ ایک نئی مخلوق ہوئی انہیں گویا خبر نہ تھی۔ کہ ہمارے باپ دادا کون تھے۔ اور انہوں نے کیوں کر یہ قلعے۔ یہ ایوان۔ یہ تخت۔ یہ درجے تیار کئے تھے۔ جن پر ہم چڑھے بیٹھے ہیں۔ میرے دوستو! تمہارے ملک کے اہل خاندان جب اپنے تئیں شکوہ و شان کے سامانوں میں پاتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم خدا کے گھر سے ایسے ہی آئے ہیں۔ اور ایسے ہی رہیں گے۔ جس طرح ہم آنکھ ناک ہاتھ پاؤں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ سب چیزیں ہمارے ساتھ پیدا ہوئی ہیں۔ ہائے غافل بدنصیبو تمہیں خبر نہیں۔ کہ تمہارے بزرگوں نے پسینے کی جگہ خون بہا کر اس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو قابو کیا تھا اور اگر اَور کچھ نہیں کر سکتے تو جو قبضے میں ہے۔ اسے تو ہاتھ سے جانے نہ دو۔

تیسری یلغار گجرات پر

اکبر نے یلغاریں تو بہت کیں مگر عجیب یلغار وہ تھی۔ جب کہ احمد آباد گجرات میں خان اعظم اُسکا کوکہ گھر گیا۔ اور وہ شتر سوار فوج کو اڑا کر پہنچا۔ خدا جانے رفیقوں کے دلوں میں ریل کا زور بھر دیا تھا کہ تار برقی کی پھرتی۔ اس سمے کا تماشہ۔ ایک عالم ہوگا دیکھنے کے قابل **آزاد** اس حالت کا فوٹوگراف الفاظ وعبارت کے رنگ و روغن سے کیوں کر کھینچ کر دکھائے۔

اکبر ایک دن فتح پور میں دربار کر رہا تھا۔ اور اکبری نورتن سے سلطنت کا باغ آراستہ تھا۔ دفعتہً پرچہ لگا کہ حسین مرزا چغتائی شہزادہ ملک مالوہ میں باغی ہو گیا۔ اختیار الملک دکنی کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ ملکی باغیوں کی بے شمار جمعیت۔ اور حشری فوج جمع کی ہے۔ دور دور تک ملک مار لیا ہے۔ اور مرزا عزیز کو اس طرح قلعہ بند کیا ہے کہ نہ وہ اندر سے نکل سکے۔ نہ باہر سے کوئی جا سکے مرزا عزیز نے بھی گھبرا کر۔ ادھر اکبر کو عرضیاں۔ ادھر ماں کو خط لکھنے شروع کئے۔ اکبر اسی فکر میں داخل محل سرا ہوا۔ وہاں جی جی[1] نے رونا شروع کر دیا۔ کہ جس طرح ہو۔ میرے بچے کو صحیح سلامت دکھا دو۔ بادشاہ نے سمجھا۔ کہ سارا لشکر بھیر و بنگاہ سمیت ایسا جلدی کیوں کر جا سکے گا۔ اسی وقت محل سے باہر آیا۔ اور اقبال اپنے کام میں مصروف

[1] جس کا دودھ پیتے ہیں۔ اُسے ترکوں کے بچے جی جی کہا کرتے ہیں۔

ہوا۔ کئی ہزار کار آزمودہ اور من چلے بہادر روانہ کئے۔ اور کہہ دیا۔ کہ ہر چند ہم تم سے پہلے پہنچیں گے مگر جہاں تک ہو سکے تم بھی اُڑے ہی جاؤ۔ ساتھ ہی رستے کے حاکموں کو لکھا۔ کہ جیبتی کوتل سواریاں موجود ہوں۔ تیار کرلیں۔ اور اپنی اپنی انتخابی فوج سے سرراہ حاضر ہوں۔ خود تین سو جاں نثاروں سے (خافی خاں نے چار پانسو لکھا ہے) کہ تمام نامی سردار اور درباری منصب دار تھے۔ سانڈنیوں پر بیٹھ۔ کوتل گھوڑے۔ اور گھڑبہلیں لگا۔ نہ دن دیکھا نہ رات۔ جنگل اور پہاڑ کاٹتا چلا۔

غنیم کے تین سو سپاہی سرگنج سے پھرے ہوئے گجرات کو جاتے تھے۔ اکبر نے راجہ سالباہن۔ قادر قلی۔ رنجیت وغیرہ سرداروں کو کہ بال باندھے نشانے اُڑاتے تھے۔ آواز دی کہ لینا۔ اور نہ جانے دینا۔ یہ ہوا کی طرح گئے۔ اور اس صدمے سے حملہ کیا کہ خاک کی طرح اُڑا دیا۔

شگون مبارک۔ اسی عالم میں شکار بھی ہوتے جاتے تھے۔ ایک جگہ ناشتے کو اُترے کسی کے منہ سے نکلا۔ او ہو! کیا ہرن کی ڈار درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ آؤ شکار کھیلیں۔ ایک کالا ہرن سامنے نکلا۔ اس پر سمندر ٹانک چیتا چھوڑا۔ اور کہا اگر اس نے یہ کالا مار لیا۔ تو جانو کہ غنیم کو مار لیا۔ اقبال کا تماشا دیکھو۔ کہ مار ہی لیا۔ بس پل کے پل ٹھہرے اور روانہ۔

غرض ستائیس منزلوں کو لپیٹ (خافی خان نے لکھا ہے۔ کہ یہ منزلیں جنہیں شاہان سلف نے مہینوں میں طے کیا) نویں دن گجرات کے سامنے دریائے نربتی کے کنارے پر جا کھڑا ہوا۔ جن امرا کو پہلے روانہ کیا تھا۔ رستے میں ملتے جاتے تھے۔ شرمندہ ہوتے تھے۔ سلام کرتے تھے اور ساتھ ہو لیتے تھے۔ پھر بھی اکثر نہ ہو سکے۔ پیچھے پیچھے دوڑے آتے تھے۔

جب گجرات سامنے آیا تو موجودات لی۔ تین ہزار نامور۔ نشان شاہی کے نیچے مرنے مارنے کو کمربستہ تھے۔ اس وقت کسی نے تو کہا کہ جو جاں نثار پیچھے رہے ہیں۔ آیا چاہتے ہیں۔ اُن کا انتظار کرنا چاہیے کسی نے کہا شبخون مارنا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا۔ کہ انتظار بزدلی اور شبخون چوری ہے۔ سلاح خانے سے ہتیار بانٹ دئے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے فوج کی تقسیم کی۔ مرزا عبدالرحیم یعنی خان خاناں کا بیٹا سولہ برس کا نوجوان تھا۔ اسے سپہ سالاروں کی طرح قلب میں قرار دیا۔ خود سو سوار سے الگ رہے کہ جدھر مدد کی ضرورت ہو ادھر ہی پہنچیں۔

اقبال کی مبارک فال

بادشاہ جب خود سر پر رکھنے لگے۔ تو دیکھا کہ دُبلغہ[1] نہیں رستے میں دلبغہ آلمدار کو جو دیپ چند کو دیا تھا

[1] دبلغہ خود کے آگے کا طرف ماتھے پر چھجا لگاتے تھے کہ دھوپ اور چھوٹے موٹے صدموں سے بچاؤ رہے۔

کر لئے آؤ۔ وہ رستے میں اترتے چڑھتے کہیں رکھ کر بھول گیا۔ اس وقت جو مانگا تو وہ گھبرایا اور شرمندہ ہوا۔ فرمایا۔ اوہو! کیا خوب شگون ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ کہ سامنا صاف ہے بڑھو آگے +

خاصے کے گھوڑوں میں ایک باد رفتار تھا۔ سر سے پاؤں تک سفید براق۔ جیسے نور کی تصویر۔ اکبر نے اس کا نام نور بیضا رکھا تھا۔ جس وقت اس پر سوار ہوا۔ گھوڑا بیٹھ گیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہ ہوا۔ راجہ بھگوان داس امان سنگھ کے باپ نے آگے بڑھ کر کہا۔ حضور فتح مبارک۔ اکبر نے کہا۔ سلامت باشید۔ کیونکر؟ اُس نے کہا۔ اس رستے میں تین شگون برابر دیکھتا چلا آیا ہوں:-

(۱) ہمارے شاستر میں لکھا ہے کہ جب فوج مقابلے کو تیار ہو۔ اور سینا پتی کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے۔ تو فتح اسی کی ہو گی +

(۲) ہوا کا رُخ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ کہ کس طرح بدل گیا۔ بزرگوں نے لکھدیا ہے۔ کہ جب ایسی صورت ہو۔ سمجھ لیجئے کہ مہم اپنی ہے +

(۳) رستے میں دیکھتا آیا ہوں۔ کہ گدھ چیلیں۔ کوے برابر لشکر کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اسے بھی بزرگوں نے فتح کی نشانی لکھا ہے +

محبت کے نازونیاز

اکبر بادشاہ قوم کا ترک۔ مذہب کا مسلمان تھا۔ راجہ یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے۔ اتفاق اور اختلاف کے مقدمے تو ہزاروں تھے۔ مگر میں اُن میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں ذرا آپس کے برتاؤ دیکھو اور ان سے دلوں کے حال کا پتہ لگاؤ۔ اسی ہنگامے میں راجہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا)، اکبر کے برابر نکلا۔ اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت یہی ہے۔ زرہ وہیں رہ گئی۔ دردخواہ بادشاہ نے اسی وقت بکتر اتروایا۔ اور اپنے خاصے کی زرہ پہنوادی۔ وہ سلام کر کے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن (مالدیو راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا۔ کہ اس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے وہی بکتر اسے دیدیا۔

جے مل اپنے باپ (روپسی) کے سامنے گیا۔ اس نے پوچھا۔ بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سنایا۔ روپسی کی جودھپوریوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتر مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا ہے۔ اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے

اس وقت بادشاہ کو یاد آیا۔ کہ ان کی خاندانی کھٹک ہے۔ فرمایا۔ کہ خیر ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمہیں دے دی ہے کہ فتح کا تعویذ اور اقبال کا گنڈا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ روپسی کے دل نے نہ مانا۔ اور تو کچھ نہ ہو سکا۔ اسلحہ جنگ اتار کر پھینک دئے۔ اور کہا۔ خیر میں میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا۔ خیر ہمارے جاں نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان میں لڑیں۔ ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائینگے۔ راجہ بھگوانداس اسی وقت گھوڑا اڑا کر بے مل کے پاس گئے۔ اسے سمجھایا۔ بہت لعنت ملامت کی اور سمجھا بجھا کر دنیا کے رستے کا نشیب و فراز دکھایا۔ یہ بڈھا خاندان کا ستون تھا۔ اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے شرمندہ ہو کر پھر ہتیار سجے۔ راجہ بھگوان داس نے آکر عرض کی کہ حضور! روپسی نے بھنگ پی تھی۔ اس کی لہر نے ترنگ دکھائی تھی۔ اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر سن کر ہنسنے لگا۔ اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہو کر اڑ گیا۔

ایسے ایسے منتروں نے محبت کا طلسم باندھا تھا جو ہر دل پر نقش ہو گیا تھا۔ خاندان کی ریت رسوم۔ مبارک نامبارک بلکہ دین آئین۔ سب بطرف۔ اب جو اکبر کہے وہی ریت رسوم۔ جو اکبر کی خوشی وہی مبارک جو اکبر کہہ دے وہی دین آئین اور اس سے بڑے مطلب نکلتے تھے۔ کیونکہ اگر مذہب کے دلائل سے انہیں سمجھا کر کسی بات پر لانا چاہتے تو سر کٹواتے۔ اور راجپوت کی ذات قیامت تک اپنی بات سے نہ ٹلتی۔ اکبری آئین کا نام لیتے تو جان دینے کو بھی فخر سمجھتے تھے۔ غرض حکم ہوا کہ باگیں اٹھاؤ خان اعظم کے پاس آصف خاں کو بھیجا کہ ہم آپہنچے۔ تم اندر سے زور دے کر نکلو۔ اُس پر ایسا ڈر چھایا تھا کہ قاصد بھی پہنچے تھے۔ ماں نے بھی خط لکھے تھے۔ اسے بادشاہ کے آنے کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ یہی کہتا تھا۔ کہ دشمن غالب ہے۔ کیوں کر نکلوں۔ یہ امرائے اطراف میرا دل بڑھانے اور لڑانے کو ہوائیاں اڑاتے ہیں۔

احمد آباد تین کوس تھا۔ حکم ہوا کہ چند قراول آگے بڑھ کر اِدھر اُدھر بندوقیں سر کریں۔ ساتھ ہی نقارۂ اکبری پر چوٹ پڑی۔ اور گورکھے کی گرج سے گجرات گونج اٹھا۔ اُس وقت تک بھی غنیم کو اس یلغار کی خبر نہ تھی۔ بندوقوں کی کڑک اور ڈنکے کی آواز سے اُس کے لشکر میں کھلبلی پڑی۔ کسی نے جانا کہ دکن سے ہماری مدد آئی ہے[1]۔ کسی نے کہا۔ کہ کوئی بادشاہی سردار ہوگا۔ دور نزدیک سے خان اعظم کی کمک کو پہنچا ہے۔ حسین مرزا گھبرایا۔ خود گھوڑا مار کر نکلا۔ اور قراولی کرتا ہوا آیا۔ کہ دیکھوں کون آتا ہے۔ دریا کے کنارے پر آکھڑا ہوا۔ ابھی تو ترکا تڑکا تھا۔ سبحان قلی ترکمان (بیرم خانی جوان تھا) یہ بھی پار اتر کر میدان دیکھتا پھرتا تھا۔ حسین مرزا نے اسے آواز دی۔ بہت اور دریا کے پار یہ کس کا لشکر ہے۔ اور سر لشکر

[1] اہل دکن کا محاورہ تھا۔ ایک دوسرے کو بہادر کہہ کر بات کرتے تھے۔

کون ہے؟ اس نے کہا۔ لشکر بادشاہی اور شہنشاہ آپ سر لشکر۔ پوچھا کون شہنشاہ؟ وہ بولا اکبر شہنشاہ غازی۔ جلدی جا۔ ان ادبار زدہ گمراہوں کو راہ بتا کہ کسی طرف کو بھاگ جائیں۔ اور جانیں بچائیں۔ مرزا نے کہا۔ بہادر! ڈراتے ہو۔ چودھواں دن ہے۔ میرے جاسوسوں نے بادشاہ کو آگرے میں چھوڑا ہے۔ سبحان قلی نے قہقہہ مارا۔ مرزا نے کہا۔ اگر بادشاہ ہیں۔ تو وہ جنگی ہاتھیوں کا حلقہ کہاں ہے جو رکاب سے جدا نہیں ہوتا؟ اور بادشاہی لشکر کہاں ہے؟ سردار مذکور نے کہا۔ آج نواں دن ہے رکاب میں قدم رکھا ہے۔ رستے میں سانس نہیں لیا۔ ہاتھی کیا ہاتھ میں اٹھا لاتے؟ شیر جنگ۔ فیل شکار۔ بہادر جوان جو ساتھ ہیں۔ یہ ہاتھیوں سے کچھ کم ہیں؟ کس نیند سوتے ہو۔ اٹھو سر پر آفتاب آگیا ✦

یہ سنتے ہی مرزا موج کی طرح کنار دریا سے الٹا پھرا۔ اختیار الملک کو محاصرے پر چھوڑا۔ اور خود سات ہزار فوج لے کر چلا کہ طوفان کو روکے۔ ادھر بادشاہ کو انتظار تھا کہ خان اعظم اُدھر قلعے سے ہمت کر کے نکلے۔ تو ہم ادھر سے دھاوا کریں۔ مگر جب وہ دروازے سے سر بھی نہ نکال سکا۔ تو اکبر سے رہا نہ گیا۔ کشتی کا بھی انتظار نہ کیا۔ توکل بخدا گھوڑے دریا میں ڈال دئے۔ اقبال کی یاوری دیکھو کہ دریا پایاب تھا۔ لشکر اس پھرتی سے پار اُتر گیا۔ کہ جاسوس خبر لائے۔ غنیم کا لشکر ابھی کمر بندی میں ہے ✦

میدان میں جا کر پرے جمائے۔ اکبر ایک بلندی پر کھڑا میدان جنگ کا انداز دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں آصف خاں مرزا کوکہ کے پاس سے پھر کر آیا اور کہا کہ اُسے حضور کے آنے کی خبر بھی نہ تھی۔ میں نے قسمیں کھا کھا کر کہا ہے۔ جب یقین آیا ہے۔ اب لشکر تیار کر کے کھڑا ہوا ہے وہ ابھی پوری بات نہ کہہ چکا تھا۔ کہ درختوں میں سے غنیم نمودار ہوا۔ حسین مرزا جمعیت قلیل دیکھ کر خود پندرہ سو فدائی مغلوں کو لے کر سامنے آیا۔ اور بھائی اس کا بائیں پر گرا۔ ساتھ ہی گجراتی اور حبشی فوج بازوؤں پر آئی۔ ادھر سے بھی ترکی بہ ترکی کلہ بکلہ جواب ہونے لگے ✦

اکبر الگ کھڑا تھا۔ اور قدرت الٰہی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ہراول پر زور پڑا۔ اور طور بے طور ہوا ہے۔ راجہ بھگوان داس پہلو میں تھا۔ اس سے کہا کہ اپنی فوج تھوڑی ہے اور غنیم کا ہجوم بہت ہے۔ مگر تائید الٰہی پر اس سے بہت زیادہ بھروسا ہے۔ چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پنجے سے مشت کا صدمہ زبردست پڑتا ہے۔ اس فوج کی طرف چلو۔ جدھر سرخ جھنڈیاں نظر آتی ہیں حسین مرزا انہیں میں ہے۔ اسے مار لیا تو میدان مار لیا۔ یہ کہہ کر گھوڑوں

کو جگہ سے جنبش دی۔ حسین خاں ٹکریہ نے کہا کہ ہاں "دعاوے کا وقت ہے" بادشاہ نے آواز دی ۔ ابھی پلّہ دُور ہے ۔ تھوڑے ہو۔ جتنا پاس پہنچ کر دعا کرو گے ۔ تازہ دم پہنچو گے ۔ اور خوب زور سے حریف پر گرو گے ۔ مرزا بھی اپنے لشکر سے کٹ کر ایک دستے کے ساتھ ادھر آیا۔ وہ زور میں بھرا آتا تھا۔ مگر اکبر اطمینان اور دلاسے کے ساتھ فوج کو لئے جاتا تھا۔ اور گن گن کر قدم رکھتا تھا کہ پاس جا پہنچے ۔ راجہ باپا چارن نے کہا ہاں دعاوے کا وقت ہے۔ ساتھ ہی اکبر کی زبان سے نعرہ نکلا۔ اللہ اکبر۔

ان دنوں میں خواجہ معین الدین چشتی سے بہت اعتقاد تھا ۔ اور یا ہادی یا معین کا وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ للکار کر آواز دی ۔ کہ چل (سمرن) سورن بینداز ید ۔ آپ اور سب سوار یا ہادی یا معین کے نعرے مارتے جا پڑے ۔ مرزا نے جب سنا کہ اکبر اسی غول میں ہے۔ نام سنتے ہی ہوش اڑ گئے فوج بکھر گئی اور خود بے سرو پا بھاگا۔ رخسارے پر ایک زخم بھی آیا۔ گھوڑا مارے چلا جاتا تھا۔ جو تھور کی باڑ سامنے آئی ۔ گھوڑا جھجکا ۔ اس نے چاہا کہ اڑا جائے ۔ مگر نہ ہو سکا۔ اور بیچ میں پھنس گیا۔ گھوڑا ابھی ہمت کرتا تھا۔ وہ خود بھی حوصلہ کرتا تھا۔ مگر نکل نہ سکتا تھا۔ کہ اتنے میں گدا علی ترکمان خاصے کے سواروں میں سے پہنچا ۔ اور کہا ۔ آؤ میں تمھیں نکالوں ۔ وہ بھی عاجز ہو رہا تھا۔ جان حوالے کر دی۔ گدا علی اسے اپنے آگے سوار کر رہا تھا۔ خان کلاں (مرزا کوکہ کے چچا) کا ایک نوکر بھی جا پہنچا ۔ یہ لالچی بہادر بھی گدا علی کے ساتھ ہو لئے ۔ فوج پھیلی ہوئی تھی ۔ فتح یاب سپاہی بھگوڑوں کو مارتے باندھتے پھرتے تھے۔ سپہ سالار بادشاہ ۔ چند سرداروں اور جاں نثاروں کے بیچ میں کھڑا تھا۔ ہر شخص اپنی خدمتیں عرض کر رہا تھا ۔ وہ سن سن کر خوش ہوتا تھا کہ کم بخت حسین مرزا کو مشکیں بندھا سامنے حاضر کیا۔ بادشاہ کے آگے آکر دونوں میں جھگڑا ہونے لگا ۔ یہ کہتا تھا میں نے پکڑا ہے۔ وہ کہتا تھا میں نے فوج لطائف کے سپہ سالار ملک تسخر کے جبار لجہ بیر بر سور ما سپاہی بیٹھے ہوئے ۔ کبھی اکبر کے آگے۔ کبھی پیچھے ۔ خواہ مخواہ گھوڑا دوڑائے پھرتے تھے ۔ انہوں نے کہا۔ مرزا ! تم آپ بتا دو۔ تمھیں کس نے پکڑا ہے ۔ کم بخت مرزا نے کہا کہ مجھے کون پکڑ سکتا تھا ۔ حضور کے نمک نے پکڑا ہے ۔ لوگوں کے دلوں سے تصدیق کے سانس نکلے ۔ اکبر نے آسمان کو دیکھا ۔ اور سر کو جھکا لیا پھر کہا مشکیں کھول دو۔ آگے ہاتھ باندھو !

سزا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کے	تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

مرزا نے پانی پینے کو مانگا ۔ ایک شخص پانی لینے کو چلا ۔ فرحت خاں چیلے نے دوڑ کر مرزا بدنصیب کے سر پر ایک دو ہتڑ ماری اور کہا ۔ کہ ایسے نمک حرام کو پانی ؟ رحم دل بادشاہ کو ترس آیا ۔ اپنی چھاگل سے پانی پلوایا ۔ اور فرحت خاں سے کہا ۔ اب یہ کیا ضرور ہے ۔

نوجوان بادشاہ نے اس میدان میں بڑا ساکا کیا۔ اور وہ کیا کہ پرانے سپہ سالاروں سے بھی کہیں کہیں بن پڑتا ہے۔ بے شک اس کے ساتھ کہن سال ترک اور پرانے راجپوت سائے کی طرح لگے تھے۔ مگر اس کی ہمت اور حوصلے کی تعریف نہ کرنی بے انصافی میں داخل ہے۔ وہ سفید براق گھوڑے پر سوار تھا۔ اور عام سپاہیوں کی طرح تلواریں مارتا پھرتا تھا۔ ایک موقعہ پر کسی دشمن نے اس کے گھوڑے کے سر پر ایسی تلوار ماری۔ کہ چراغ پا ہو گیا۔ اکبر بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑ کر سنبھلا۔ اور حریف کو برچھا مارا۔ کہ زرہ کو توڑ کر پار ہو گیا۔ چاہتا تھا۔ کہ کھینچ کر پھر مارے۔ مگر پھل ٹوٹ کر زخم میں رہا۔ اور بھگوڑا بھاگ گیا۔ ایک نے آکر ران پر تلوار کا وار کیا۔ ہاتھ اوچھا پڑا تھا۔ خالی گیا اور بزدل گھوڑا بھگا کر نکل گیا۔ ایک نے آکر نیزہ مارا۔ چینہ بڈگوجر نے برچھا پھینک کر اسکا کام تمام کیا۔

اکبر چاروں طرف لڑتا پھرتا تھا۔ سرخ بدخشی لہو میں لال زخمی ہو کر گھبرایا ہوا قلب میں آیا اور اکبر کی شمشیرزنی اور اپنے زخمی ہونے کے احوال اس اضطراب کے ساتھ بیان کئے کہ لوگوں نے جانا بادشاہ مارا گیا۔ لشکر میں تلاطم پڑ گیا۔ اکبر کو بھی خبر ہوئی۔ فوراً فوج قلب کے برابر میں آیا۔ اور للکارنا شروع کیا کہ ہاں باگیں لئے ہوئے۔ ہاں قدم اٹھائے ہوئے۔ غنیم کے قدم اُکھڑ گئے ہیں ایک حملے میں فیصلہ ہے۔ اس کی آواز سن کر سب کی جان میں جان آئی اور دل قوی ہو گئے

ایک ایک کی جاں بازی اور جاں فشانی کے حال عرض ہو رہے تھے۔ سپاہی جو گرد و پیش حاضر تھے۔ دو سو کے قریب ہونگے کہ ایک پہاڑی کے نیچے سے غبار کی آندھی اٹھی۔ کسی نے کہا خان اعظم نکلا ہے۔ کسی نے کہا اور غنیم آیا۔ ایک سوار حکم شاہی کے ساتھ دوڑا اور آوانکی طرح پہاڑ سے پھرا۔ معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارے پر چوٹ لگانے سے جی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر فوج کو لے کر دل بڑھاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے جھپٹائے۔ اور تیراندازی شروع کی۔ اکبر نے پھر آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو۔ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں خراماں جاتا تھا اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس آتا تھا۔ جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹ کر جدا ہوا ہے۔ اور جنگل کا رخ کیا ہے وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا۔ متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندوستان میں دھاک بندھ گئی تھی۔ کہ اکبر نے تسخیر آفتاب

کا عمل پڑھا ہے۔ اب کوئی اُس پر فتح نہ پا سکے گا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور تباہی لشکر کی خبر سنتے ہی
اختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اس کا جیسے چیونٹیوں کی قطار۔ برابر
سے کترا کر نکل گیا۔ اس کا گھوڑا اگٹھوٹ چلا جاتا تھا۔ یہ کمبخت بھی تھور میں اُلجھا۔ اور خود زمین پر گرا۔
سہراب بیگ ترکمان بھی اس کے پیچھے گھوڑا ڈالے چلا جاتا تھا۔ دست و گریبان پہنچا اور تلوار کھینچ
کر کودا۔ اختیار الملک نے کہا۔ "اے جوان! تو ترکمان مے نمائی۔ و ترکماناں غلام مرتضےٰ علی و دوستدارانِ
او مے باشند۔ من سید بخاریم۔ مرا بگزار" سہراب بیگ نے کہا "اے دیوانہ! چوں بگزارم؟ تو اختیار الملک
ہستی۔ و ترا شناختہ دنبالت سرگرداں آمدہ ام"۔ یہ کہا اور جھٹ سر کاٹ لیا۔ پھر کر دیکھے تو کوئی اپنا گھوڑا
لے بھاگا۔ لہو ٹپکتے سر کو دامن میں لے کر دوڑا۔ خوشی خوشی آیا۔ اور حضور میں نذر گزران کر انعام پایا۔
واہ آغا سہراب! اسی مُنہ سے کہو گے۔ فدایت شوم یا مولٰے۔ بابی انت و امی یا مولٰے۔ میرے
دوستو! ایسے وقت پر خدا اور خدا کے پیاروں کا پاس رہے۔ تو بات ہے۔ نہیں تو یہ باتیں ہی باتیں ہیں۔

حسین خان کا حال میں نے الگ لکھا ہے۔ اس بہادر جاں نثار نے اس حملے میں اپنی جان کو
جان نہیں سمجھا۔ اور ایسا کچھ کیا۔ کہ بادشاہ دیکھ کر خوش ہو گیا۔ تحسین و آفرین کے طرّے اُسکے سر پہ
لٹکائے۔ خاصے کی تلواروں میں ایک تلوار تھی کہ اکبر نے اس کے گھاٹ اور کاٹ کے ساتھ مبارکی
اور دشمن کُشی دیکھ کر بلا کی خطاب دیا تھا۔ اس وقت وہی ہاتھ میں علم تھی۔ وہی انعام فرما کر جاں نثار کا دل
بڑھایا۔ تھوڑا دن باقی رہ گیا تھا۔ اور بادشاہ اختیار الملک کی طرف سے خاطر جمع کر کے آگے بڑھا چاہتے
تھے۔ کہ ایک اور فوج نمودار ہوئی۔ فتح یاب سپاہ پھر سنبھلی اور قریب تھا باگیں اُٹھا کر جا پڑیں کہ شیخ محمد
غزنوی (مرزا عزیز کوکہ کے بڑے چچا) فوج مذکور میں سے گھوڑا مار کر آگے آئے اور عرض کی کہ مرزا
کوکہ حاضر ہوتا ہے۔ سب کی خاطر جمع ہوئی۔ بادشاہ خوش ہوئے۔ اتنے میں وہ بھی صحیح و سلامت
آن پہنچے۔ اکبر نے گلے لگایا۔ ساتھیوں کے سلام لئے۔ قلعے میں گئے۔ میدان جنگ میں کلہ منار بنوانے کا حکم
دیا۔ اور دو دن کے بعد دار الخلافہ کو روانہ ہوئے۔ پاس پہنچے تو جو لوگ رکاب میں تھے سب کو دلہنی درگا
سے سجایا۔ وہی چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہاتھوں میں دیں۔ اور خود بھی اسی وردی کے ساتھ انکے کمان افسر ہو کر
شہر میں داخل ہوئے۔ امرا و شرفا و بزرگان شہر نکل کر استقبال کو آئے۔ فیضی نے غزل سنائی ؎

نسیم خوش دلی از فتح پور مے آید — کہ بادشاہ من از راہ دُور مے آید

یہ مبارک مہم اوّل سے آخر تک خوشی کے ساتھ ختم ہوئی۔ البتہ ایک غم نے اکبر کو رنج دیا۔ اور سخت
رنج دیا۔ وہ یہ کہ سیف خاں اس کا جاں نثار و وفادار کوکہ پہلے ہی حملے میں مُنہ پر دو زخم کھا کر سرخ رُو دنیا

سے گیا۔ سرنال کا میدان جہاں سے فساد اٹھا تھا۔ اس میں وہ نہ پہنچ سکا تھا۔ اس ندامت میں اپنی موت کی دُعا مانگا کرتا تھا۔ جب یہ دعا دا ہوا تو اسی نشے کے جوش میں خاص حسین مرزا اور اس کے ساتھیوں پر اکیلا جا پڑا۔ اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ وہ کہا کرتا تھا اور سچ کہتا تھا کہ مجھے حضور نے جان دی ہے +

عجیب اتفاق۔ اس کی ماں کے ہاں کئی دفعہ برابر بیٹیاں ہی ہوئیں۔ کابل کے مقام میں پھر حاملہ ہوئی۔ باپ نے اس کی ماں کو بہت دھمکایا۔ اور کہا۔ اب کے بیٹی ہوئی۔ تو تجھے چھوڑ دوں گا جب ولادت کے دن نزدیک ہوئے۔ تو بے بس بی بی مریم مکانی کے پاس آئی۔ حال بیان کیا۔ اور کہا کہ کیا کروں۔ اسقاط حمل کر دوں گی۔ بلا سے گھر سے بے گھر تو نہ ہوں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلی تو اکبر رستے میں کھیلتا ہوا ملا۔ اگرچہ بچہ تھا۔ مگر اس نے بھی پوچھا۔ کہ جی جی کیا ہے؟ افسردہ معلوم ہوتی ہو۔ اس بچاری کا سینہ درد سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے بھی کہہ دیا۔ اکبر نے کہا میری خاطر عزیز ہے۔ تو ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اور دیکھنا بیٹا ہی ہوگا۔ خدا کی قدرت سیف خاں پیدا ہوا۔ اس کے بعد زین خاں پیدا ہوا۔ مرتے وقت۔ اجمیری اجمیری اس کی زبان سے نکلا۔ شاید خواجہ اجمیر کا نام ورد زبان تھا۔ یا اکبر کو پکارتا تھا۔ کہ کمال عقیدت کے سبب سے اس درگاہ کے ساتھ اُسے نسبت خاص ہو گئی تھی۔ حسین خاں نے عرض کی۔ کہ میں اس کے گرنے کی خبر سنتے ہی گھوڑا مار کر پہنچا تھا۔ اس وقت تک حواس قائم تھے۔ میں نے فتح کی مبارک باد دے کر کہا کہ تم تو سرخرو چلتے ہو دیکھیں ہم بھی تمہارے ساتھ ہی آتے ہیں یا پیچھے رہنا پڑے +

عجیب تر یہ کہ لڑائی سے ایک دن پہلے اکبر چلتے چلتے اُتر پڑا اور سب کو لے کر دسترخوان پر بیٹھا۔ ایک ہزارہ بھی اس سواری میں ساتھ تھا۔ معلوم ہوا کہ شانہ بینی کے فن میں ماہر ہے (قوم مذکور میں شانہ بینی کی فال سے حال معلوم کرنا ورثہ قدیم ہے کہ اب تک چلا آتا ہے) اکبر نے پوچھا۔ "ملا فتح از کیست؟ کہا قربانت شوم۔ از ماست۔ مگر امیرے ازیں لشکر بلا گردان حضور مے شود۔" پیچھے معلوم ہوا کہ سیف خاں ہی تھا۔ دیکھو توزک جہانگیری صفحہ ۲۰

لوگ کہیں گے۔ کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا۔ اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ تو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جن سے شہنشاہ موصوف کے مذہب۔ اخلاق۔ عادات اور سلطنت کے دستور و آداب۔ اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔ خدا کرے کہ دوستوں کو پسند آئیں +

اکبر کے دین و اعتقاد کی ابتدا و انتہا

اس طرح کی فتوحات سے کہ جن پر کبھی سکندر کا اقبال اور کبھی رستم کی دلاوری قربان ہو۔ ہندوستان کے دل پر ملک گیری کا سکہ بٹھا دیا۔ اٹھارہ بیس برس تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادے مسلمان خوش اعتقاد ہوتے ہیں۔ اسی طرح احکام شرع کو ادب کے کانوں سے سُنتا تھا۔ اور صدق دل سے بجا لاتا تھا۔ جماعت سے نماز پڑھتا تھا۔ آپ اذان کہتا تھا مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا۔ علما و فضلا کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُن کے گھر جاتا تھا۔ بعض کے سامنے کبھی کبھی جوتیاں سیدھی کر کے رکھ دیتا تھا۔ مقدمات سلطنت شریعت کے فتوے سے فیصلہ ہوتے تھے۔ جا بجا قاضی و مفتی مقرر تھے۔ فقرا و مشائخ کے ساتھ کمال اعتقاد سے پیش آتا تھا۔ اور ان کے برکت انفاس سے اپنے کاروبار میں فیض حاصل کرتا تھا۔

اجمیر میں جہاں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ہے۔ سال بہ سال جاتا تھا۔ کوئی مہم یا مراد ہو۔ یا اتفاقاً پاس سے گذر ہو۔ نو برس کے بیچ میں بھی زیارت کرتا تھا۔ ایک منزل سے پیادہ ہوتا تھا۔ بعض منتیں ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پیادہ گیا۔ وہاں جا کر درگاہ میں طواف کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں روپے کے چڑھاوے اور نذریں چڑھاتا تھا۔ پہروں صدق دل سے مراقبے میں بیٹھتا تھا۔ اور دل کی مرادیں مانگتا تھا۔ فقرا اور اہل طریقت کے حلقے میں شامل ہوتا تھا۔ ان کی وعظ و نصیحت کی تقریریں گوش یقین سے سنتا تھا۔ قال اللہ و قال الرسول میں وقت گذارتا تھا۔ معرفت کی باتیں۔ علمی تذکرے۔ حکمی اور الٰہی مسئلے اور دینی تحقیقاتیں ہوتی تھیں۔ مشائخ و علما۔ فقرا و غربا کو نقد۔ جنس۔ زمینیں۔ جاگیریں دیتا تھا۔ جس وقت قوال معرفت کے نغمے گاتے تھے۔ تو روپے اور اشرفیاں مینہ کی طرح برستے تھے۔ اور ایک عالم ہوتا تھا۔ کہ در و دیوار پر حیرت چھا جاتی تھی۔ یا ہادی یا معین کے اسم دیں سے عنایت ہوتے تھے یہ وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ اور ہر شخص کو یہی ہدایت تھی۔ اُسے سمرن کہتا تھا۔ لڑائیوں میں جب دھاوا ہوتا۔ ایک نعرہ مار کر کہتا۔ ہاں سمرن بلند از ید۔ آپ بھی اور ساری فوج ہندو مسلمان یا ہادی یا معین للکارتے ہوئے دوڑ پڑتے۔ ادھر باگیں اٹھائیں۔ ادھر غنیم بھاگا اور میدان صاف۔ لڑائی فتح ✦

علما و مشائخ کا طلوعِ اقبال اُور قدرتی زوال

اس ۲۰ برس کے عرصے میں جو برابر فتوحات خداداد ہوئیں۔ اور عجیب عجیب طور سے ہوئیں تدبیریں تمام تقدیر کے مطابق پڑیں۔ اور جد هر ارادہ کیا۔ اقبال استقبال کو دوڑا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ چھ برس میں دُور دُور تک کے ملک زیرِ قلم ہو گئے۔ جس طرح سلطنت کا دائرہ پھیلا ویسا ہی اعتقاد بھی روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ پروردگار کی عظمت دل پر چھا گئی۔ ان نعمتوں کے شکرانے میں اور آئندہ فضل و کرم کی دعاؤں میں نیک نیت بادشاہ ہر وقت توجہ اور حضور قلب سے درگاہ الٰہی میں رجوع رکھتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی کے سبب سے اکثر فتح پور میں رہتا تھا۔ محلوں کے پہلو میں سب سے الگ پرانا سا حجرہ تھا۔ پاس ایک پتھر کی سل پڑی تھی۔ تاروں کی چھاؤں اکیلا وہاں جا بیٹھتا۔ نوروں کے تڑکے صبحوں کے سویرے۔ رحمت کے وقت مراقبوں میں خرچ ہوتے تھے۔ عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ وظیفے پڑھتا۔ اپنے خدا سے دعائیں مانگتا۔ اور نورِ سحر کے فیض دل پر لیتا۔ عام صحبت میں بھی اکثر خداشناسی معرفت۔ شریعت اور طریقت ہی کی باتیں ہوتی تھیں۔ رات کو علما و فضلا کے مجمع ہوتے تھے۔ اس میں بھی یہی باتیں۔ اور حدیث تفسیر۔ اس میں علمی مسائل کی تحقیقیں۔ اسی میں مباحثے بھی ہو جاتے تھے +

اس ذوق شوق نے یہاں تک جوش مارا کہ ۹۸۲ھ میں شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔ اور اُس کا نام عبادت خانہ رکھا۔ یہ اصل میں وہی حجرہ تھا جہاں شیخ عبداللہ[1] نیازی سرہندی کسی زمانے میں خلوت نشین تھے۔ اس کے چاروں طرف چار بڑے ایوان بنا کر بہت بڑھایا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد نئی خانقاہ یعنی شیخ الاسلام (شیخ سلیم چشتی) کی خانقاہ سے آکر یہاں دربار خاص ہوتا تھا۔ مشائخ وقت۔ علما و فضلا اور فقط چند مصاحب و مقرب درگاہ ہوتے۔ درباریوں میں اور کسی کو اجازت نہ تھی۔ خداشناسی اور حق پرستی کی ہدائتیں اور حکائتیں ہوتی تھیں۔ رات کو بھی جلسے ہوتے تھے۔ دل نہایت گداز اور سر تا پا فقر کی خاک راہ ہو گیا تھا۔ مگر علما کی جماعت ایک عجیب الخلقت فرقہ ہے۔ مباحثوں کے جھگڑے تو پیچھے ہو گئے۔ پہلے نشست ہی پر معرکے ہونے لگے۔ کہ وہ مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے۔ اور میں اس سے نیچے کیوں بیٹھوں۔ اس لئے اس کا یہ آئین باندھا کہ امرا جانب شرقی میں سادات جانب غربی میں۔ علما و حکما جنوبی میں۔ اہل طریقت شمالی میں بیٹھیں۔ دنیا کے لوگ طرفہ معجون ہیں عمارت مذکور کے پاس ہی انوپ[2] تلاؤ دولت سے لبریز تھا۔ لوگ آتے تھے۔ اور اس طرح روپے اشرفیاں لے جاتے تھے جیسے

[1] شیخ عبداللہ نیازی بھی پہلے شیخ سلیم چشتی کے مرید تھے۔ اُن کا حال دیکھو تتمہ میں [2] انوپ تلاؤ۔ دیکھو تتمہ +

گھاٹ سے پانی۔ ملّا شیری شاعر اس پر بھی خوش نہ ہوئے۔ چنانچہ اس ہیئت مجموعی پر ایک نہایت نمکین قطعہ نظم کیا جسکا ایک شعر یاد ہے:

دریں ایام دیدم جمع باموال قارونی　　عبادتہائے فرعونی عمارتہائے شدادی

ہر ایوان میں شب جمعہ کو بادشاہ آپ آتا تھا۔ وہاں کے اہل جلسہ سے باتیں کرتا تھا۔ اور تحقیقات مطالب سے معلومات کے ذخیرے بھرتا تھا۔ آرائش و زیبائش ان ایوانوں کو اپنے ہاتھ سے سجاتی تھی۔ گلدستے رکھتی تھی۔ عطر چھڑکتی تھی۔ پھول برساتی تھی۔ خوشبوئیاں جلاتی تھی۔ سخاوت روپوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں لئے حاضر تھی۔ کہ داد اور حساب نہ پوچھو۔ کیونکہ انہیں لوگوں کی اوٹ میں اہل حاجت بھی آن پہنچے تھے۔ گجرات کی لوٹ میں عمدہ عمدہ کتابیں اعتماد خاں گجراتی کے کتب خانے کی آئی تھیں۔ اور خزانہ عامرہ میں جمع تھیں۔ اُنکے نسخے بھی علما کو بٹتے تھے۔ جمال خاں قورچی نے ایک دن عرض کی کہ فدوی آگرے میں ایک دن شیخ ضیاء الدین ولد شیخ محمد غوث گوالیاری کی خدمت میں گیا تھا۔ ایسی مفلسی غالب ہوئی ہے۔ کہ میرے لئے کئی سیر چنے بھنائے تھے۔ کچھ آپ کھائے کچھ مجھے دئے۔ باقی خانقاہ میں فقرا اور مریدوں کے لئے بھیج دئے۔ یہ سن کر بادشاہ کے دل پُر درد پر اثر ہوا۔ انہیں بلا بھیجا۔ اور اسی عبادت خانے میں رہنے کو جگہ دی۔ اُن کے اوصاف بھی ملّا صاحب سے سُن لو۔ (دیکھو تتمہ)

افسوس یہ کہ مسجدوں کے بھوکوں کو جب تر نوالے ملے۔ اور حوصلے سے زیادہ عزتیں ہوئیں۔ تو گردنوں کی رگیں سخت تن گئیں۔ آپس میں جھگڑنے لگے۔ اور غل ہو کر شور سے شر اُٹھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا۔ کہ میں اپنی فضیلت کے ساتھ دوسرے کی جہالت دکھاؤں۔ دغابازیاں۔ اُن کی دھوکے بازیاں اور جھگڑے بادشاہ کو ناگوار ہوئے۔ ناچار حکم دیا۔ کہ جو نامعقول بے محل بات کرے اُسے اُٹھا دو۔ ملّا صاحب سے کہا۔ آج سے جس شخص کو دیکھو کہ نامعقول بات کہتا ہے۔ ہم سے کہدو ہم مجلس سے اُٹھا دینگے۔ آصف خاں برابر حاضر تھے۔ ملّا صاحب نے چپکے چپکے اُن سے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہتوں کو اُٹھنا پڑیگا۔ پوچھا یہ کیا کہتا ہے؟ جو انہوں نے کہا تھا۔ اُس نے کہدیا۔ سُن کر بڑے خوش ہوئے۔ بلکہ اور مصاحبوں سے بیان کیا۔ ملّا نے اپنی جنگ و جدل میں جو خود نمائی کی بیرقیں ہلائے تھے۔ ایک نمونہ اُس کا یہ ہے:۔

لطیفہ۔ حاجی ابراہیم سرہندی مباحثوں میں بڑے جھگڑالو اور مغالطوں میں چھلاوے کا تماشا تھے ایک دن چار ایوان کے جلسے میں مرزا مفلس سے کہا۔ کہ موسیٰ کیا صیغہ ہے۔ اور اُس کا ماخذ اشتقاق کیا؟ مرزا علوم عقلی کے سرمائے میں بہت مال دار تھے۔ مگر اس جواب میں مفلس ہی نکلے۔ شہر میں

[1] ملا شیری دیکھو تتمہ [2] ملا عبد القادر بدایونی مراد ہے [3] دیکھو تتمہ

چرچا ہو گیا۔ کہ حاجی نے مرزا کو لاجواب کر دیا۔ اور حاجی ہی بڑے فاضل ہیں۔ جاننے والے جانتے تھے۔ کہ یہ بھی تاثیر زمانہ کا ایک شعبدہ ہے۔ یہ رباعی مُلّا صاحب نے فرمائی :۔

زبہر فساد و جنگ بعضے مردم — کردند بکوے گمرہی خود را گم
در مدرسہ ہر علم کہ آموختہ اند — فی القابر یُضرُّہُم ولا ینفعہم

لطیفہ۔ تحصیل فوائد پر نظر کرکے بادشاہ خوش اعتقاد دل سے چاہتا تھا کہ یہ جلسے گرم رہیں چنانچہ ان ہی دنوں میں قاضی زادہ لشکر سے کہا۔ کہ تم رات کو بحث میں نہیں آتے ؟ عرض کی حضور آوں تو سہی لیکن حاجی وہاں مجھ سے پوچھیں۔ عیسے کیا صیغہ ہے۔ تو کیا جواب دوں۔ لطیفہ اُس کا بہت پسند آیا۔ غرض اختلاف رائے اور خود نمائی کی برکت سے عجب عجب مخالفتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اور ہر عالم کا یہ عالم تھا۔ کہ جو میں کہوں وہی آیت و حدیث مانو۔ جو ذرا چون و چرا کرے اس کے لئے کفر سے ادھر کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ دلیلیں سب کے پاس آیتوں اور روایتوں سے موجود بلکہ علمائے سلف کے جو فتوے اپنے مفید مطلب ہوں۔ وہ بھی آیت و حدیث سے کم درجے میں نہ تھے۔

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان والیٔ بدخشاں شاہ رخ اپنے پوتے کے ہاتھ سے بھاگ کر ادھر آئے۔ صاحب حال شخص تھے۔ مرید بھی کرتے تھے۔ اور معرفت میں خیالات بلند رکھتے تھے یہ بھی عبادت خانے میں آتے تھے۔ مشائخ و علما سے گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ اور ذکر قال اللہ و قال الرسول سے برکت حاصل کرتے تھے +

مُلّا صاحب دو برس پہلے داخل دربار ہوئے تھے۔ اُنہوں نے وہ کتابیں ساری پڑھی تھیں جنہیں لوگ پڑھ کر عالم و فاضل ہو جاتے ہیں۔ اور جو کچھ استادوں نے بتادیا تھا۔ وہ حرف بحرف یاد تھا۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اجتہاد کچھ اور شے ہے۔ وہ مرتبہ نہ حاصل تھا۔ مجتہد کا یہی کام نہیں کہ آیت یا حدیث یا کسی فقہ کی کتاب کے معنے بتا دے۔ کام اُس کا یہ ہے۔ کہ جہاں صراحتہً آیت یا حدیث موجود نہیں یا کسی طرح کا احتمال ہے۔ یا آیتیں یا حدیثیں بظاہر معنوں میں مختلف ہیں۔ یہ وہاں ذہن سلیم کی ہدایت سے استنباط کرکے فتوے دے۔ جہاں دشواری پیش آئے وہاں مصالح وقت کو مدنظر رکھ کر حکم لگائے۔ آیت و حدیث عین مصالح خلق اللہ ہیں۔ اُن کے کاموں کو بند کرنے والی یا اُن کو حد سے زیادہ تکلیف میں ڈالنے والی نہیں ہیں +

واہ رے اکبر تیری قیافہ شناسی۔ مُلّا صاحب کو دیکھتے ہی کہہ دیا۔ کہ حاجی ابراہیم کسی کو سانس نہیں

لینے دیتا۔ یہ اس کا کلہ توڑیگا۔ چنانچہ علم کا زور۔ طبیعت بے باک۔ جوانی کی اُمنگ۔ بادشاہ خود مدد کو پشت پر۔ اور بڈھوں کا اقبال بڈھا ہو چکا تھا۔ یہ حاجی سے بڑھکر شیخ صدر کو ٹکریں مارنے لگے۔

ان ہی دنوں میں شیخ ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ اس فضیلت کی جھولی میں دلائل کی کیا کمی تھی اور اس طبع خداداد کے سامنے کسی کی حقیقت کیا تھی۔ جس دلیل کو چاہا چٹکی میں اُڑا دیا۔ بڑی بات یہ تھی۔ کہ شیخ اور شیخ کے باپ نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھ سے برسوں تک زخم اُٹھائے تھے۔ جو عمروں میں بھرنے والے نہ تھے۔ علما میں خلاف و اختلاف کے رستے تو کھل ہی گئے تھے۔ چند روز میں یہ نوبت ہو گئی۔ کہ فروعی مسائل تو درکنار رہے۔ اصول عقاید میں بھی کلام ہونے لگے۔ اور ہر بات پر طرّہ یہ کہ دلیل لاؤ۔ اور اس کی وجہ کیا۔ رفتہ رفتہ غیر مذہب کے عالم بھی جلسوں میں شامل ہونے لگے۔ اور خیالات یہ ہوئے۔ کہ مذہب میں تقلید کچھ نہیں۔ ہر بات کو تحقیق کر کے اختیار کرنا چاہیئے ✦

حق یہ ہے۔ کہ نیک نیت بادشاہ سے جو کچھ ظہور میں آیا۔ مجبوری سے تھا۔ ۹۸۶ھ تک بھی مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ رات کو اکثر اوقات عبادت خانے میں علما و مشائخ کی صحبت میں گزرتے تھے۔ خصوصاً جمعہ کی راتیں۔ کہ رات بھر جاگتے تھے۔ اور مسائل دین کے اصول و فروع کی تحقیقیں کرتے تھے۔ اور علما کا یہ عالم تھا۔ کہ زبانوں کی تلواریں کھینچ کر پل پڑتے تھے کٹے مرتے تھے۔ اور آپس میں تکفیر و تضلیل کر کے ایک دوسرے کو فناہ کئے ڈالتے تھے۔ (ملّا صاحب کہتے ہیں) شیخ صدر اور مخدوم الملک کا یہ حال تھا۔ کہ ایک کا ہاتھ اور ایک کا گریبان۔ دونوں طرف کے روٹی توڑ اور شروے چٹ ملّانوں نے دو طرفہ دھڑے باندھ رکھے تھے۔ گویا فرعونی عہد تھا۔ سبطی و قبطی دونوں گروہ حاضر تھے۔ ایک عالم ایک کام کو حلال کہتا تھا۔ دوسرا اسی کو حرام ثابت کر دیتا تھا۔ بادشاہ انہیں اپنے عہد کا امام غزالی اور امام رازی سمجھے ہوئے تھا جب انکا یہ حال دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ابوالفضل و فیضی بھی آ گئے تھے۔ اور اُن کے بھی طرفدار دربار میں پیدا ہو گئے تھے یہ دمبدم اُکساتے تھے۔ اور بات بات میں ان کی بے اعتباری دکھاتے تھے ✦

آخر علمائے اسلام ہی کے ہاتھوں یہ خواری ہوئی۔ کہ اسلام اور عام مذہب یکساں ہو گئے۔ اس میں علما و مشائخ سب سے بڑھ کر بدنام ہوئے۔ پھر بھی بادشاہ اپنے دل سے حق مطلق کا طالب تھا۔ بلکہ ہر نقطے کی تحقیق اور ہر امر کی دریافت کا شوق رکھتا تھا۔ اس لئے ہر ایک مذہب کے عالموں

کو جمع کرتا تھا۔ اور حالات دریافت کرتا تھا۔ بے علم انسان تھا۔ مگر سمجھ والا تھا۔ کسی مذہب کا دعویدار اُسے اپنی طرف کھینچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ بھی ان سب کی سنتا تھا۔ اور اپنی من سمجھوتی کر لیتا تھا۔ اس کے پاک اعتقاد اور نیک نیت میں فرق نہ آیا تھا۔ جب ۹۸۴ھ میں داؤد افغان کا سر کٹ کر بنگالہ سے فساد کی جڑ اکھڑ گئی۔ تو وہ شکرانے کے لئے اجمیر میں گیا عین عرس کے دن پہنچا۔ بموجب اپنے معمول کے طواف کیا۔ زیارت کی۔ فاتحہ پڑھی۔ دعائیں مانگیں۔ دیر تک حضورِ قلب سے مراقبے میں بیٹھا رہا۔ حج کے لئے قافلہ جانے والا تھا۔ خرچ راہ میں ہزارہا آدمیوں کو روپے اور سامان سفر دیا۔ اور حکم عام دیا کہ جو چاہے حج کو جائے۔ خرچ راہ خزانے سے دو۔ سلطان خواجہ خاندان خواجگان میں سے ایک خواجہ با عظمت کو میر حاج مقرر کیا۔ چھ لاکھ روپے نقد۔ ۱۲ ہزار خلعت اور ہزاروں پیلے کے تحفے تحائف۔ جواہر شرفائے مکہ کے لئے دئے۔ کہ وہاں کے مستحق لوگوں کو دینا۔ یہ بھی حکم دیا۔ کہ مکے میں عظیم الشان مکان بنوا دینا۔ تاکہ حاجی مسافروں کو تکلیف نہ ہوا کرے جس وقت میر حاج قافلے کو لے کر روانہ ہوئے تو اس تمنا میں کہ میں خانہ خدا میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ نے خود وہی وضع بنائی جو حالت حج میں ہوتی ہے۔ بال قصر کئے۔ ایک چادر آدھی کا لنگ۔ آدھی کا جھرمٹ۔ ننگے سر ننگے پاؤں نہایت رجوع قلب اور عجز کے ساتھ حاضر ہوا۔ کچھ دور تک پیادہ پا ساتھ چلا۔ اور زبان سے اُسی طرح کہتا جاتا تھا۔ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ الخ (حاضر ہوا۔ میں حاضر ہوا اے واحدہٗ لاشریک میں حاضر ہوا) جس وقت بادشاہ نے یہ الفاظ اس حالت کے ساتھ کہے۔ عجب عالم ہوا خلق خدا کے دلوں کے آہ و نالے بلند ہوئے۔ قریب تھا کہ درختوں اور پتھروں سے بھی آواز آنے لگے۔ اس عالم میں سلطان خواجہ کا ہاتھ پکڑ کر شرعی الفاظ کہے۔ جن کے معنے یہ تھے کہ حج اور زیارت کے لئے ہم نے اپنی طرف سے تمہیں وکیل کیا۔ شعبان ۹۸۴ھ کو قافلہ روانہ ہوا۔ میر حاج چھ سال متواتر ان ہی سامانوں سے جاتے رہے۔ البتہ یہ بات پھر نہ ہوئی۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں۔ کہ بعض بھولے بھالے عالموں کے ساتھ اکثر غرض پرستوں نے ساجھا کر کے بادشاہ کو سمجھایا۔ کہ حضور کو بذاتِ خود ثواب حج حاصل کرنا چاہیئے اور حضور بھی تیار ہو گئے۔ لیکن جب حقیقت پرست دانشمندوں نے حج کی حقیقت اور اس کا راز اصلی بیان کیا تو اس ارادے سے باز رہے۔ اور بموجب بیان مذکورہ بالا کے میر حاج کے ساتھ قافلہ روانہ کیا۔ سلطان خواجہ مع تحائف شاہی اور اہل حج کے جہاز الٰہی میں بیٹھے کہ اکبر شاہی جہاز تھا۔ اور بیگمات جہاز سلیمی میں بیٹھیں کہ رومی سوداگروں کا تھا۔

۱؎ ۱۴ شعبان ۹۸۴ھ کو یہ قافلہ روانہ ہوا۔ قطب الدین خان کوکلتاش اور راجہ جگوتی داس۔ رانا کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ انہیں حکم ہوا کہ ہمراہ ہو کر کنارہ دریائے شور تک پہنچا دو۔ دیکھو عالمگیر نامہ۔

جلوۂ قدرت

علماء مشائخ کی بداقبالی کے اصلی اسباب

ایسے عالی حوصلہ شہنشاہ کے لیئے یہ حرکتیں علما کی ایسی نہ تھیں۔ جن پر وہ اس قدر بیزار ہو جاتا۔ اصل معاملہ ایک تفصیل پر منحصر ہے۔ جسے میں مختصر بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب سلطنت کا پھیلاؤ ایک طرف افغانستان سے لے کر گجرات دکن بلکہ سمندر کے کنارے تک پھیلا۔ دوسری طرف مشرق میں بنگلے سے آگے نکل گیا۔ اُدھر بھکر اور حد قندھار تک جا پہنچا۔ اور اٹھارہ بیس برس کی ملک گیری میں اس کی دلاوری نے دلوں پر سکہ بٹھا دیا۔ آمد کے رستے بھی خرچ سے بہت زیادہ کھل گئے۔ اور خزانوں کے ٹھکانے نہ رہے۔ ایسے آئین بند بادشاہ کو اس کی قانون بندی بھی واجب تھی۔ اس لیئے اُدھر متوجہ ہوا۔ سلطنت کا انتظام اب تک اس طرح تھا۔ کہ دیوانی فوجداری کل قاضیوں اور مفتیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور یہ اختیار اُنہیں شریعت اسلام نے دئے ہوئے تھے۔ جن کی بات پر کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ امرا پر ملک تقسیم تھا۔ وہ ہاشی بیتی سے لے کر ہزاری و پنجہزاری تک جو امیر منصب دار ہوتا تھا۔ اس کی فوج اور اخراجات کے لیئے ملک ملتا تھا۔ باقی خالصہ بادشاہی کہلاتا تھا۔

اکبر کے اقبال کو اس موقع پر دو کام درپیش تھے۔ پہلے چند با اختیاروں سے جگہ خالی کرنی دوسرے کارداں صاحب ایجاد اشخاص کا پیدا کرنا۔ پہلا کام کہ ظاہر میں فقط اپنے نوکروں کا موقوف کر دینا ہے۔ آج آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اُس وقت ایک کٹھن منزل تھا۔ کیونکہ قدامت نے اُن کے قدم گاڑ دیئے تھے۔ جس کا اگلے وقتوں میں ہلانا بھی محال تھا۔ اگرچہ لیاقت اُن کے لیئے بالکل سفارش نہ کرتی تھی۔ لیکن رحم اور حق شناسی جو ہر وقت اکبر کے ناصح مخفی تھے لُن کے ہونٹ برابر ہلے جاتے تھے۔ مضمون سفارش یہی کہ اُن کے باپ دادا تمہارے باپ دادا کی خدمت میں رہے۔ اُنھوں نے تمہاری خدمت کی ہے۔ یہ اب کسی کام کے نہیں رہے۔ اور اس گھر کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اُس زمانے میں خاص و عام اپنے خیالات پر ایسے جمے ہوئے تھے۔ کہ اُن کے نزدیک کسی پہلے دستور کا بدلنا (اگرچہ قلم کی تراش ہی کیوں نہ ہو) ایسا تھا۔ جیسے نماز روزہ کو بدل دیا۔ وہ لوگ اعتقاد کئے بیٹھے تھے۔ کہ جو کچھ بزرگوں

سے چلا آتا ہے ۔ عین آیت و حدیث ہے ۔ اس میں یہ بھی کہنے کی حاجت نہ تھی ۔ کہ جس نے یہ قاعدہ باندھا وہ کون تھا ۔ یہ بھی پوچھنا ضرور نہیں ۔ کہ مذہبی طور پر ہوا تھا ۔ یا عام کاروبار کے طور پر ۔ اُن کے دل پر نقش تھا ۔ کہ جو کچھ ہمارے بزرگوں سے چلا آتا ہے ۔ اُس کی برکت ہزاروں منافع کا چشمہ اور بے شمار برائیوں کے لئے مبارک سپر ہے ۔ جس میں ہماری عقل کام نہیں کر سکتی ۔ ایسے لوگوں سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ موجودہ باتوں پر غور کریں ۔ اور آگے عقل دوڑائیں ۔ کہ کیا صورت ہو ۔ جو حالت موجودہ سے زیادہ فائدہ مند اور باعث آسانی ہو ۔ یہ لوگ یا علما تھے ۔ کہ شریعت کے سلسلے میں کارروائی کر رہے تھے ۔ یا عام اہلکار اور اہل عمل تھے ۔ اکبر کے اقبال نے ان دونو مشکلوں کو آسان کر دیا ۔ علما کی مشکل تو اس طرح آسان ہوئی کہ تم سن چکے یعنی خدا پرستی اور حق جوئی کے جوش نے اسے علمائے دیندار کی طرف زیادہ متوجہ کیا ۔ اور یہ توجہ اس درجے کو پہنچی ۔ کہ انعام و اکرام اور قدردانی اُن کی حد سے گزر گئی ۔ حسد اس فرقے کا جوہر ذاتی ہے ۔ اُن میں جھگڑے اور فساد شروع ہوئے ۔ لڑائی میں انکی چلتی تلوار کیا ہے ۔ تکفیر اور لعنت ۔ اُس کی بوچھاڑ ہونے لگی ۔ آخر لڑتے لڑتے آپ ہی گر پڑے ۔ آپ ہی بے اعتبار ہو گئے ۔ صاحب تدبیر کو فکر و تردد کی ضرورت ہی نہ ہوئی ۔ آزاد ۔ وقت کی حالت دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ادبار کا موسم آگیا تھا ۔ ثواب کی نظر سے ایک [1] مدد پیش ہوتا تھا ۔ عذاب نکل آتا تھا ۔ مہم بنگالہ جو کئی برس جاری رہی تو معلوم ہوا ۔ کہ اکثر علما و مشائخ کے عیال فقر و فاقے سے تباہ ہیں ۔ خدا ترس بادشاہ کو رحم آیا ۔ حکم دیا کہ سب جمعہ کو جمع ہوں بعد نماز ہم آپ روپے بانٹیں گے ایک لاکھ مرد عورت کا انبوہ تھا ۔ میدان چوگان بازی میں جمع ہوئے ۔ فقرا کا ہجوم ۔ دلوں کی بے صبری ۔ احتیاج کی مجبوری ۔ کارداروں کی بے دردی یا بے پروائی ۔ اسّی بندے خدا کے پامال ہو کر جان سے گئے ۔ اور خدا جانے کتنے پس کر نیم جاں ہوئے ۔ گر گروں [2] سے اشرفیوں کی ہمیانیاں نکلیں ۔ بادشاہ رحم کا پتلا تھا ۔ جلد ترس آجاتا تھا ۔ نہایت افسوس کیا ۔ مگر اشرفیوں کو کیا کرے ۔ بدگمان اور بے اعتقاد بھی ہو گیا ۔

شیخ صدر کی مسند بھی اُلٹ چکی تھی ۔ اور بہت کچھ پردے کھل گئے تھے ۔ کئی دن کے بعد ۹۸۶ھ میں نئے صدر [1] کو حکم دیا ۔ کہ مسجدوں کے اماموں اور شہروں کے مشائخ وغیرہ کے لئے جو صدر سابق نے جاگیریں دی تھیں ۔ ہزاری سے پانصدی تک کو پڑتال کرو ۔ تحقیقات میں بہت سے جاگیر خوار

---

[1] ملا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ قاضی علی بغدادی ۔ ملا حسین واعظ کے پوتے تھے ۔ انہیں کارگزار دیکھ کر شیخ صدر کی چوٹ پر صدر نشین کیا تھا ۔ یہ بھی دربار الہی سے اپنے حق کو پہنچ گئے تھے ۔ ۹۹۵ھ میں کشمیر کے دیوان تھے ۔ وہاں لوگ جوڑ کے حساب سے رہزنوں و فتنہ پھیلاکر جمع سپاہ و رعیت کا ناک میں دم تھا ۔ غیرت زمانہ نے کان کاٹے ۔ اور کٹے ہوئے کان پر قلم رکھا ۔ گدھے پر چڑھا کر تشہیر کیا ۔ کہ عدم سفر میں بھی پیادہ نہ جائیں ملا صاحب نے سفر عنایت کیا ۔ چونکہ قاضی علی بغدادی حسرت یادگار ہا خود برد نمانوشتی قضا بنوشت سال تاریخ او کو منکر مرید

تحقیقت میں آ گئے۔ اور اس قربانی میں کسی کو دیا تو گویا گائے ہیں سے غدود۔ باقی ہضم۔ مسجدیں ویران۔ مدرسے کھنڈر۔ بزرگان و اکابر اور روشناس مشاہیر شہروں میں ذلیل ہو گئے۔ جلاوطن ہو گئے۔ تباہ ہو گئے۔ جو رہے۔ بدنام کرنے والے۔ آرام کے بندے۔ باپ دادا کی ہڈیاں بیچنے والے۔ جب محتاج ہوئے۔ تو دھنیوں جلاہوں سے بدتر ہو گئے۔ اور انہی میں مل گئے۔ بلکہ ہندوستان میں کسی فرقے کی اولاد ایسی ذلیل نہ تھی۔ جیسے شرفائے مشائخ کی۔ خدمتگاری و سائیسی بھی نہ ملتی تھی۔ کیونکہ وہ بھی نہ ہو سکتی تھی*

ان لوگوں سے بداعتقادی و بیزاری کا سبب ایک نہ تھا۔ بڑے بڑے پیچ تھے۔ اُن میں سے کھلی بات بنگالے کی بغاوت تھی۔ کہ بزرگان مذکور کی برکت سے اس طرح پھیل پڑی۔ جیسے بن میں آگ لگی۔ سبب اس کا یہ ہُوا۔ کہ بعض مشائخ معافی دار اور مسجدوں کے امام اپنی جاگیروں کے باب میں ناراض ہُوئے۔ ان کے دماغ پشتوں سے بلند چلے آتے تھے۔ اور اسلام کی سند سے سلطنت کو اپنی جاگیر سمجھے بیٹھے تھے۔ مشائخ عظام اور ائمہ مساجد نے (انہیں آج تم ایسی کنگال حالت میں دیکھتے ہو۔ اُن دنوں میں یہ لوگ بادشاہ کی حقیقت کیا سمجھتے تھے) وعظ کی مجلسوں میں ہدایت شروع کر دی۔ کہ بادشاہ وقت کے ایمان میں فرق آگیا۔ اور اُس کے عقائد درست نہیں ہیں اتفاق یہ کہ کئی امرائے فرمانروا دربار کے بعض احکام سے۔ اور اپنی تنخواہ لشکر۔ اور ملک کے حساب کتاب وغیرہ میں ناراض تھے۔ انہیں بہانہ ہاتھ آیا۔ دینی اور دنیاوی فرقے متفق ہو گئے۔ علماو۔ قاضیوں اور مفتیوں میں سے بھی جو ہو سکا۔ اُسے ملا لیا۔ چنانچہ ملا محمد یزدی قاضی القضاۃ جونپور تھے۔ اُنہوں نے فتوے دیا کہ بادشاہ وقت بد مذہب ہو گیا۔ اُس پر جہاد واجب ہے۔ جب یہ سندیں ہاتھ میں آئیں تو کئی جلیل القدر۔ عمروں کے جاں نثار۔ صاحب لشکر امیر۔ بنگالہ اور شرق رویہ ملکوں میں باغی ہو گئے۔ اور جہاں جہاں تھے تلواریں کھینچ کر نکل پڑے۔ وفادار امیر اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس آگ کے بجھانے کو دوڑے۔ بادشاہ نے آگرے سے خزانے اور فوجیں کمک پر بھیجیں مگر فساد روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ائمہ مساجد اور خانقاہوں کے مشائخ کہتے تھے۔ کہ بادشاہ نے ہماری معاش میں ہاتھ ڈالا۔ خدا نے اُس کے ملک میں ہاتھ ڈالا۔ اس پر آیتیں اور حدیثیں پڑھتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔

وہ اکبر بادشاہ تھا۔ اُسے ایک ایک بات کی خبر پہنچتی تھی۔ اور ہر بات کا تدارک کرنا واجب تھا۔ ملا محمد یزدی اور معز الملک وغیرہ کو ایک بہانے سے بلا بھیجا۔ جب وہ زیر آباد آگرہ سے اس کینارا

پہنچے۔ تو حکم بھیجا۔ کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریائے جمن کے رستے گوالیار پہنچا دو۔ محرمانِ سلطنت کا خیال نہ تھا۔ پیچھے حکم پہنچا کہ فیصلہ کر دو۔ پہرے داروں نے دونوں کو ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا۔ اور تھوڑی دور آگے جا کر چادر آب کا کفن دیا۔ اور گرداب کی گور میں دفن کر دیا۔ اور مشائخ مُلّاؤں کو بھی جن جن پہ شبہ تھا۔ ایک ایک کر کے عدم کے تہ خانے میں بھیج دیا۔ بہتیروں کو نقلِ مکان کے ساتھ پورب سے پچھم۔ اور دکھن سے اُتر میں پھینک دیا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ ان کا اثر بہت تیز و تند اور سخت پُر زور ہے۔ چنانچہ اس بداعتقادی کا چرچا مکّے مدینے اور روم اور بخارا و سمرقند تک پہنچا۔ عبداللہ خاں اُزبک نے رسم کتابت بند کر دی۔ مدّت کے بعد جو مراسلہ لکھا۔ تو اُس میں صاف لکھ دیا۔ کہ تم نے اسلام چھوڑا ہم نے تمہیں چھوڑا۔ اور اُدھر کا اکبر کو بڑا بچاؤ رہتا تھا۔ کیونکہ اُزبک کی بلا نے دادا کو وہاں سے نکالا تھا۔ اور اب بھی اُس کا کنارہ قندھار۔ کابل اور بدخشاں سے لگا ہوا تھا۔ باوجود ان تدبیروں کے بغاوت مذکور کئی برس میں دبی۔ کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ لاکھوں جانیں گئیں۔ ملک تباہ ہوئے۔

بہت سے قاضی مفتی علما و مشائخ عہدہ دار تھے۔ ان کی رشوت خواریوں اور فتنہ کاریوں نے تنگ کر دیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ شائد ان میں صاحب معرفت اور اہلِ دل بلکہ کشف و کرامات والے لوگ ہوں۔ ملک کی مصلحت نے حکم دیا کہ جو صاحب سلسلہ و مشائخ ہیں سب حاضر ہوں۔ اب دل میں ان لوگوں کی وہ عظمت نہ رہی۔ جو ابتدا میں تھی۔ چنانچہ ملازمت کے وقت نئے آئینوں کے بموجب انہیں بھی تسلیم و کورنش وغیرہ بجا لانی پڑی۔ پھر بھی ہر ایک کی جاگیر و وظیفہ کو خود دیکھتا تھا۔ خلوت و جلوت میں باتیں بھی کرتا۔ اُس کا مطلب یہ تھا۔ کہ شائد اس گروہ میں کوئی سوار نکلے اور اُس سے کچھ خدا کا رستہ معلوم ہو۔ مگر افسوس کہ وہ بات کے قابل بھی نہ تھے۔ اُن سے کیا معلوم ہوتا خیر۔ جو مناسب دیکھے۔ جاگیر و وظیفے دیئے۔ جسے سنتا کہ مرید کرتا ہے۔ حال و قال کا جلسہ جماتا ہے۔ اُسے لمبیں کا کہیں پھینک دیتا۔ ان لوگوں کا نام دُکاں دار رکھا تھا۔ اور سچ رکھا تھا ع

بدنام کنندہ نکونامے چند

بعض انہیں کی جاگیروں کے مقدّمے پیش رہتے تھے۔ کیونکہ یہی لوگ معافی دار بھی تھے۔

انقلاب زمانہ دیکھو! جتنے بڈّھے سن رسیدہ مشائخ تھے (واجب الرّحم و قابل ادب نظر آتے تھے) اُنہیں پر فتنہ و فساد کا خیال زیادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہی زیادہ ان صفتوں سے موصوف ہوتے تھے۔ اور انہی پر لوگ گرویدہ ہوتے تھے۔ آخر حکم ہوا کہ صوفیہ و مشائخ کے فرمانوں کی پڑتال ہندو دیوان کریں۔ کہ رعایت نہ کریں گے۔ پُرانے پرانے خاندانی مشائخ جلا وطن کئے گئے۔ گھروں میں چھپ رہے۔ گمنام

ہوئے تھے۔ بدحالی نے حال و قال سب بھلا دئے۔ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق		کہ یاراں فراموش کردند عشق	

اے خدا تیری شان - چوں آیم بر سر قہر۔ نہ خویش گزارم نہ بیگانہ۔ سوکھوں کے ساتھ گیلے۔ بُروں کے ساتھ اچھے سب جل گئے

علمائے با اختیار ہیں کہ ارکین دربار تھے۔ بعض اشخاص فی الحقیقت صاحب دل اور کریم النفس تھے۔ مثلاً میر سید محمد میر عدل کہ خالص اسلام کے باخبر عالم تھے۔ اور عالم بھی با عمل تھے۔ علوم دینیہ کی سب کتابیں پڑھے تھے۔ مگر جتنے الفاظ کتاب میں لکھے تھے۔ اُن سے بال بھر سرکنا کفر سمجھتے تھے۔ خاص سے لے کر عام تک سب ان کا ادب کرتے تھے۔ اور اکبر خود بھی لحاظ کرتا تھا۔ سلطنت کی مصلحتوں پر نظر کرکے انہیں دربار سے ٹالا۔ اور بھکر کا حاکم کرکے بھیج دیا۔ بے شک وہ ایسے نیک اور نیک نیت شخص تھے۔ کہ اُن کا دربار سے جانا برکت کا جانا تھا۔ مخدوم الملک اور شیخ صدر کے حال میں نے علیحدہ لکھے ہیں۔ تم پڑھوگے تو معلوم کروگے۔ مخدوم نے کئی بادشاہوں کے دور اس طرح بسر کئے تھے۔ کہ شریعت کے پردے میں دربار کے ایوان۔ امیروں کے دیوان بلکہ رعایا کے گھر گھر پر دھوآں دھار چھائے ہوئے تھے۔ شاہان با اقبال اُن کا منہ دیکھتے رہتے تھے۔ اور انہیں اپنے ساتھ موافق رکھنا مصالح ملکی کا جزو سمجھتے تھے۔ ان کے آگے یہ لڑکا بادشاہ کیا مال تھا۔ اللہ اللہ لڑکوں کے ہاتھوں بڑھاپے کی مٹی خراب ہوئی (ابوالفضل و فیضی کون تھے۔ ان کے آگے کے لڑکے ہی تھے)+

شیخ صدر کے اختیار اگرچہ بادشاہ نے خود بڑھائے تھے۔ مگر اُن کی کہن سالی اور جلالت خاندانی نے (کہ امام صاحب کی اولاد میں تھے) لوگوں کے دلوں میں بڑا اثر دوڑایا تھا۔ اور ابتدا میں انہی اوصاف کی سفارشوں نے دربار اکبری میں لاکر اس رتبہ عالی تک پہنچایا تھا۔ کہ ہندوستان میں ان سے پہلے یا پیچھے کسی کو نصیب نہ ہوا۔ علمائے عصر ان کے بچے کچے تھے۔ کہ قاضی و مفتی بن کر ملک ملک میں امیر و غریب کی گردن پر سوار تھے۔ شاہ باتدبیر نے ان دونوں کو مکے بھیج کر داخل ثواب کیا۔ اور بہتیرے علما تھے۔ انہیں اِدھر اُدھر ٹال دیا+

جو کچھ کیا مصلحت کی مجبوری سے کیا

عہد قدیم میں ہر سلطنت کو شریعت کے ساتھ ذاتی پیوند رہا ہے۔ اوّل اوّل سلطنت شریعت کے زور سے کھڑی ہوئی۔ پھر شریعت اس کے سائے میں بڑھتی گئی۔ مگر اس دربار کا رنگ کچھ اور ہونے لگا

اوّل تو سلطنت کی جڑ مضبوط ہو کر دُور تک پہنچ گئی تھی۔ دوسرے بادشاہ سمجھ گیا تھا کہ ہندوستان میں۔ اور توران و ایران کی حالت میں مشرق مغرب کا فرق ہے۔ وہاں بادشاہ اور رعایا کا ایک مذہب ہے۔ اس لیئے جو کچھ علمائے دین حکم دیں۔ اُسی پر سب کو ایمان لانا واجب ہوتا ہے خواہ کسی کی ذاتِ خاص یا ملکی امورات کے موافق ہو۔ خواہ مخالف۔ برخلاف اس کے ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے۔ ان کا مذہب۔ اور رسم و رواج اور معاملات کا جدا طور ہے۔ ملک گیری کے وقت جو باتیں ہو جائیں۔ وہ ہو جائیں۔ جب ملک داری منظور ہو۔ اور اس ملک میں رہنا ہو تو چاہیئے کہ جو کچھ کریں نہایت سوچ سمجھ کر اور اہل ملک کے مقاصد و اغراض کو مدنظر رکھکر کریں۔

تم جانتے ہو کہ صاحبِ عزم بادشاہ کے لیئے جس طرح ملک گیری کی تلوار میدان صاف کرتی ہے اسی طرح ملک داری کا قلم تلوار کے کھیت کو سبز کرتا ہے۔ اب وہ وقت تھا کہ تلوار بہت سا کام کر چکی تھی۔ اور قلم کی عرق ریزی کا وقت آیا تھا۔ علما نے شریعت کے اسناد سے خدائی زور پھیلا رکھے تھے۔ کہ نہ اُن کو کوئی دل برداشت کر سکتا تھا۔ نہ ملک کی مصلحت اس بنیاد پر بلند ہو سکتی تھی۔ بعض امرا بھی اکبر کی رائے سے متفق تھے۔ کیونکہ جانیں لڑا کر ملک لینا انہیں کا کام تھا۔ اور پھر ملک داری کر کے حکومت جمانا بھی انہیں کا ذمہ تھا۔ وہ اپنے کام کی مصلحتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ قاضی و مفتی لشکر سر پر حاکم شرع تھے۔ بعض مقدموں میں لالچ سے۔ بعض جگہ حماقت سے۔ کہیں بے خبری۔ کہیں بے پروائی سے۔ کہیں اپنے فتوے کا زور دکھانے کو امرا کی باتوں سے اختلاف کرتے تھے۔ اور انہیں کی پیش جاتی تھی۔ اس صورت میں امرا کو ان سے تنگ ہونا واجب تھا۔ دربار میں اب ایسے عالم بھی آگئے تھے۔ کہ قرابادین قدرت کے عجائب نسخے تھے۔ خوشامد اور حصول انعام کے لالچ نے انہیں ایسے ایسے مسائل بتا دیئے تھے۔ کہ بادشاہوں کے شوق مصلحت سے بھی بہت آگے نکل گئے تھے۔ اور نئی اصلاح و انتظام کے لیئے رستہ کھلا۔

ابوالفضل و فیضی کا ناحق نام بدنام ہے۔ کر گئے داڑھی والے پکڑے گئے مونچھوں والے۔ غازی خان بدخشی نے کہا۔ کہ بادشاہ کو سجدہ جائز ہے۔ علما نے کان کھڑے کیے۔ غل مچایا۔ گفتگو کے سلسلے پھیل کر اُلجھے۔ معترض مُلّاؤں کے جوش نہ دم لینے تھے۔ نہ لینے دیتے تھے۔ جواز کے طرف دار بڑی ملائمت سے اُنہیں روکتے اور اپنی بنیاد جمائے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ عہد سلف پر نظر کرو۔ اُمت ہائے قدیمہ کو دیکھو۔ وہ عموماً اپنے بزرگوں کے سامنے تحفہ عجز و نیاز سمجھ کر ادب سے پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔ ملائک کا سجدہ حضرت آدم کو کیسا تھا؟ ج ظاہر کہ تعظیمی۔ باپ اور بھائیوں کا سجدہ حضرت یوسف کو کیوں تھا۔ ج تحفہ ادب پیش کیا تھا۔ نہ کہ پرستش بندگی۔ بس وہی سجدہ یہ ہے پھر انکار کیوں؟ اور تکرار کیا؟

لطیفہ۔ مزہ اس پر یہ ہے۔ کہ ملّا عالم کابلی ہمیشہ افسوس کیا کرتے تھے۔ کہ ہائے سبجھے یہ نکتہ نہ سوجھا۔ حریف بازی لے گیا +

لطیفہ۔ حاجی ابراہیم سرہندی کے زعفرانی اور لال کپڑوں پر جو دھبہ لگا۔ دیکھو میر سید محمد میر عدل کے حال میں +

لطیفہ۔ بادشاہ نے کہا کہ مہر کا سجع اللہ اکبر کہیں تو کیسا ہو۔ باوجود اوصاف مذکورہ کے حاجی صاحب بولے۔ اس میں شبہ پڑتا ہے۔ اس لئے ولذکر اللہ اکبر ہو تو بہتر ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ شبہ نہیں وہم و وسوسہ ہے۔ بندہ ضعیف۔ محتاج۔ عاجز۔ خدائی کا دعوےٰ کیونکر کر سکتا ہے۔ ایک شاعرانہ مناسبت ہے اس مطلب کو اُدھر لے جانا کیا ضرور تھا۔ سب طرف سے اس کی تائید ہوئی اور یہی لکھا گیا +

غرض نوبت یہ ہوئی۔ کہ شریعت کے اکثر فتوے تجویزات ملکی سے ٹکرانے لگے۔ علما تو ہمیشہ سے زور ہی پر چڑھے چلے آتے تھے۔ وہ اڑنے لگے۔ اور بادشاہ بلکہ امرا بھی تنگ ہوئے۔ شیخ مبارک نے دربار میں کوئی منصب نہ لیا تھا۔ مگر برس میں ایک دو دفعہ کسی مبارک باد یا کچھ اور تقریب سے اکبر کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کی تعریف میں اوّل تو اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ کہ ابوالفضل و فیضی کے باپ تھے۔ اور جو فضل و کمال بیٹوں کو بہم پہنچا۔ اُسی مبارک باپ کی کرامات تھی۔ وہ جیسا علم و فضل میں ہمہ داں عالم تھا۔ ویسا ہی عقل و دانش کا پتلا تھا۔ اُس نے کئی سلطنتیں دیکھی تھیں۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ مگر دربار یا اہلِ دربار سے تعلق ہی نہ پیدا کیا۔ علمائے عہد درباروں اور سرکاروں میں دوڑتے پھرتے تھے۔ وہ اپنے گھر کے گوشہ میں علم کی دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اور ان شطرنج بازوں کی چالوں کو دُور سے دیکھ رہا تھا۔ کہ کہاں بڑھتے ہیں۔ اور کہاں چوکتے ہیں۔ اور بے غرض دیکھنے والا تھا۔ اس لئے چالیں اسے خوب سوجھتی تھیں۔ اس نے ان لوگوں کے تیرِ ستم بھی اتنے کھائے تھے۔ کہ دل چھلنی ہو رہا تھا۔ شیخ مبارک کی تجویز سے یہ صلاح ٹھیری۔ کہ چند عالموں کو شامل کر کے آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے ایک تحریر لکھی جائے۔ خلاصہ جس کا یہ کہ امام عادل کو جائز ہے۔ کہ اختلافی مسئلے میں اپنی رائے کے بموجب وہ جانب اختیار کرے۔ جو اس کے نزدیک مناسب وقت ہو۔ اور اُس کی تجویز کو علما و مجتہدین کی رائے پر ترجیح ہو سکتی ہے۔ مسوّدہ شیخ مبارک نے کیا۔ قاضی جلال الدین ملتانی۔ صدر جہاں مفتی کل ممالک ہندوستان خود شیخ موصوف۔ غازی خاں بدخشی نے اوّل دستخط کئے پھر اگرچہ مطلب تو جن سے تھا۔ انہیں سے تھا۔ مگر علما۔ فضلا۔ قاضی۔ مفتی۔ اور بڑے بڑے عمامہ بند جن کے فتووں کو لوگوں کے دلوں میں گہری تاثیریں تھیں۔ سب بلائے گئے اور مہریں ہو گئیں۔ اور ۹۸۷ھ میں علما کی مہم عظیم فتح ہوئی +

اس محضر کے بنتے ہی علمائے دولت پرست کے گھروں میں ماتم پڑ گئے۔ مسجدوں میں بیٹھے تھے تسبیحیں ہاتھ میں۔ منہ سے نکلتا تھا کہ بادشاہ کافر ہو گیا اور حق بجانب تھا۔ کہ سلطنت ہاتھ سے نکل گئی۔ اگلے وقتوں میں ایک حکمت عملی تھی کہ جن لوگوں کا کچھ لحاظ ہوتا تھا۔ اور ملک میں رکھنا مصلحت نہ ہوتا تھا۔ انہیں مکہ کو بھیج دیتے تھے۔ چنانچہ شیخ و مخدوم کو بھی ہدایت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم پر حج واجب نہیں۔ ہمارے پاس پیسہ کہاں ؟ غرض ریل دھکیل کر دونو کو روانہ کر ہی دیا۔ دیکھو دونو صاحبوں کے حال ؛

امام عادل کے لفظ پر بادشاہ کا خیال ہُوا کہ خلفائے راشدین اور اکثر سلاطین بلکہ امیر تیمور اور مرزا الغ بیگ گورگاں بھی برسر منبر جمعہ و جماعت میں خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ ہمیں بھی پڑھنا چاہیئے چنانچہ مسجد فتح پور میں جمعہ کے دن جماعت ہوئی۔ تو بادشاہ منبر پر گئے۔ لیکن عجب اتفاق ہُوا کہ تھر تھر کانپنے لگے۔ اور زبان سے کچھ نہ نکلا۔ آخر شیخ فیضی کے ۳ شعر پڑھ کر اُتر آئے۔ سو بھی اور کوئی برابر سے بتاتا گیا :-

خداوندے کہ مارا خسروی داد	دلِ دانا و بازوے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنموں کرد	بجز عدل از خیال ما بروں کرد
بود وصفش ز حدِ فہم برتر	تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

دوسرا کام۔ اہل عمل میں بھی دیوان اور منشی بڑے بڑے کارگزار امیر تھے۔ ان پُرانے پاپیوں نے بادشاہی دفتر کو اختیار کے بستونؔ میں باندھ رکھا تھا۔ ان کی دفتری لیاقت۔ پُرانی واقفیت اور حساب کتاب کی مہارت کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اور بادشاہ سمجھتا تھا کہ میں بے علم ہُوں۔ اس مہم کو بھی اسکے اقبال نے بڑے اسلوب سے سرانجام کیا۔ کوئی مر گیا۔ کسی کو گردش ایام نے پیچ میں ڈال کر مارا۔ ان کی جگہ بالیاقت۔ باکمال صاحب ایجاد لوگوں کو گھر کے گوشوں سے نکال کر۔ دُور دُور کے مُلکوں سے کھینچ کر دربار میں حاضر کر دیا۔ ٹوڈرمل۔ فیضی۔ حکیم ابو الفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی نظام الدین بخشی وغیرہ اشخاص تھے۔ ان میں ایک ایک شخص ہر فنی تھا۔ اور جس فن میں دیکھو بجائے خود ایسی دستگاہ رکھتا تھا۔ کہ گویا یک فنی تھا۔ یہ لوگ اس وقت کے ارسطو و افلاطون تھے۔ اگر اظہار فن کے موقع پاتے تو خدا جانے کیا کیا کچھ لکھ جاتے۔ مگر وقت نہ پایا۔ دفتر کی ترتیب و رحساب کتاب کا انتظام ان کے رتبۂ کمال کے لئے کمینہ کام تھا۔ دفتر مال اور اسکے حساب کتاب میں بھی ایسے تھے۔ کہ ایک ایک شخص کا نام گوشئہ کاغذ میں سوتی ہو کر نکلے۔ مگر ٹوڈرمل اسی کام میں تھا۔ اِس لئے پہلے اس کا نام لینا واجب ہے ؛

اِس وقت تک دفتر شاہی کہیں ہندی میں تھا۔ کہیں فارسی میں۔ کہیں مہاجنی بہی کھاتہ۔ کہیں ایرانی

لہ دیکھو خواجہ شاہ منصور۔ خواجہ امنا۔ مظفر خاں وغیرہ کے حال تتمہ میں ؛

ترتیب۔ اِس میں بھی پُرزے پُرزے کاغذ کے بے حساب تھے۔ سررشتہ و انتظام نہ تھا۔ یہ مجبوم عقلیں مِل کر بیٹھیں۔ کمیٹیاں کیں۔ گفتگوئیں ہوئیں۔ مال۔ دیوانی۔ فوجداری وغیرہ وغیرہ کے الگ الگ سررشتے باندھے۔ اور ہر ایک کو اصُول وضوابط کے رشتوں سے کس دیا کہ کل قلمرو اکبری میں ایک آئین اکبری جاری ہو۔ ہر بات میں جزوی جزوی نکتوں پر نظر کی گئی۔ جس کا پہلا نقطہ یہ تھا۔ کہ کل دفتروں میں ایک سنہ پر حساب کی بنیاد ہو۔ اور اسی کا نام سنہ فصلی ہو۔ مُلّا صاحب نے اِس بات پر بڑی داد دے داد کی ہے اور اسے بھی انہی فریادوں میں داخل کیا ہے جن سے اکبر کے دل میں تنفّر یا عداوت اسلام ثابت کرتے ہیں۔ لیکن معاملے کی اصلیت اُس فرمان کے مطالعے سے نکلتی ہے جو اِس باب میں جاری ہُوا۔ فرمانِ مذکور سے یہ بھی آئینہ ہوتا ہے کہ معاملاتِ سلطنت میں کیا کیا مشکلیں سدِ راہ تھیں۔ جس کے لئے بادشاہِ ملک پرور کو یہ قانون باندھنا واجب ہوا تھا۔ میں بھی فضول فقروں کو چھوڑ کر ترجمہ لکھتا ہوں۔ مگر احتیاط رکھی ہے کہ جو مطلب کے فقرے ہیں اُن کا مضمون نہ رہ جائے فرمان مذکور ابوالفضل کا لکھا ہُوا تھا۔ دیکھو تتمہ۔

بندوبست مالگزاری

مالگزاری اور مالیات کا انتظام حقیقت میں ابھی تک تخمین پر تھا۔ جن دیہات کا جو رقبہ تھا۔ اور جو اُسکی جمع تھی۔ وہی صدہا سال سے بندھی چلی آتی تھی۔ بہتیری باتیں منشیانِ دفتر کی زبان پر ہی تھیں سلطنتوں کے انقلابوں نے انتظام کا موقع نہ آنے دیا تھا۔ دفتر مال میں بڑی خرابی یہ تھی کہ ایک امیر کو ملک دیتے تھے۔ اہلِ دفتر اُسے ۱۰ ہزار کا کہتے تھے۔ وہ حقیقت میں پندرہ ہزار کا ہوتا تھا۔ پھر بھی جسے دیتے تھے وہ روتا تھا کہ ۵ ہزار کا بھی نہیں۔ تجویز ہُوئی کہ کل ممالک محروسہ کی **پیمائش** ہو جائے اور جمع تحقیقی قرار دی جائے۔ **جریب** رسی کی ہوتی تھی۔ اس سے تر و خشک میں فرق ہو جاتا تھا۔ اِس لئے بانس کے ٹوٹوں میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریبیں تیار ہُوئیں۔ رعایا کے فائدے کو مدِّنظر رکھ کر ۵ گز کی جگہ ۶۰ گز کا طول قرار دیا۔ تمام اراضی خشک و تر مع اقسام زمین ریگ میدان کوہستان بیابان۔ جنگل۔ شہر۔ دریا۔ نہر۔ جھیل۔ تالاو۔ کواں وغیرہ وغیرہ سب کو ناپ ڈالا۔ اور کوئی چیز باقی نہ چھوڑی۔ ذرہ ذرہ دفتر میں قلمبند کر لیا۔ یہ سمجھ لو کہ کاغذات مالگزاری میں جو جو تفصیلیں تم آج دیکھتے ہو۔ یہ اکبری عہد کی تحقیقیں ہیں کہ اب تک اُسی طرح چلی آتی ہیں۔ البتہ بعض اصلاحیں بھی ہُوئی ہیں۔ اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ✦

بعد پیمایش کے جس قدر زمین کا محصول ایک کروڑ تنکہ ہو۔ وہ ایک معتبر آدمی کو دی گئی۔ اس کا نام **کروری** ہُوا۔ اس پر کارکن **فوطہ دار** مقرر ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اقرار نامہ لکھا گیا کہ تین برس میں نامزروعہ کو بھی مزروعہ کردونگا۔ اور روپیہ خزانے میں داخل کرونگا وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے جزئیات اس تحریر میں داخل تھے ٭

سیکری گاؤں کو فتح پور شہر بنا کر مبارک سمجھا تھا۔ اور اسکی رونق اور آبادی و زیبائی اور اعزاز کا بڑا خیال تھا بلکہ چاہتا تھا کہ یہ دارالخلافہ ہو جائے۔ اسی مرکز سے چاروں طرف پیمائش شروع ہُوئی۔ پہلے موضع کا نام آدم پور۔ پھر شیث پور۔ ایوب پور وغیرہ وغیرہ ہوکر یہ ٹھیری کہ تمام موضع پیغمبروں کے نام پر ہو جائیں بنگ بہار۔ گجرات دکن۔ بدستور الگ رکھے گئے۔ اور اُس وقت تک کابل قندھار غزنین کشمیر۔ ٹھٹھہ۔ سواد بلیر۔ بجور۔ تیراہ۔ بنگش۔ سورٹھ۔ اڑیسہ فتح نہ ہُوئے تھے۔ باوجود اس کے ۱۸۲ عامل (کروری) مقرر ہُوئے ٭

جس طرح چاہا تھا اُس طرح یہ کام نہ چلا کیونکہ لوگ اس میں اپنا نقصان سمجھتے تھے۔ معافی دار جانتے تھے کہ ہمارے پاس زمین زیادہ ہے۔ اور اس کی آمدنی بھی زیادہ ہے۔ پیمائش کے بعد جس قدر زیادتی ہوگی کتر لینگے۔ جاگیردار یعنی امرا کو بھی یہی خیال تھا۔ انسان کی طبیعت کو خدا نے ایسا بنایا ہے کہ وہ کسی پابندی کے نیچے آنا گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے زمیندار بھی کچھ خوش تھے کچھ ناخوش۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی کام نہیں چل سکتا جب تک کہ کل اشخاص جن جن کا قدم اسمیں ہے سب خوش اور یکدل ہوکر کوشش نہ کریں۔ چہ جائیکہ نقصان سمجھ کر خارج ہوں افسوس یہ ہے کہ کروریوں نے آبادی پہ اتنی کوشش نہ کی جتنی تحصیل پر۔ کاشتکار اُن کے ظلم سے برباد ہوگئے۔ بال بچوں کو بیچ ڈالا۔ خانہ ویران ہوگئے۔ بھاگ گئے۔ کروری بدنیت و بدعمل کہاں بچ سکتے تھے ۳ برس جو کھایا سو کھایا۔ پھر جو کھایا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل کے شکنجے میں آکر اُگلنا پڑا۔ غرض وہ فائدہ منداور عمدہ بندوبست خلط ملط ہوکر سرایہ نقصان ہوگیا اور جو مطلب تھا وہ حاصل نہ ہُوا۔ شکریے کی جگہ جا بجا شکایتیں ہوئیں اور گھر گھر میں اسی کا رونا پڑا۔ عاملوں کی ہجویں قواعد آئین کے مضحکے ہُوئے۔ انھی میں سے جریب کے حق میں کسی مثنوی کا ایک شعر ہے ؎

در نظر عبرتِ مرد لبیب	مار دو سر بہ کہ طناب جریب

ملازمت اور نوکری

شرفا کے گزارے کیلئے اُن دنوں میں دو رستے تھے ایک مددمعاش دوسرے نوکری۔ مددمعاش

جاگیر تھی کہ علما و مشائخ اور ائمۂ مساجد کیلئے ہوتی تھی اس میں خدمت معاف تھی۔ نوکری میں خدمت بھی ہوتی تھی۔ یہ وہ باشی سے لیکر پنجہزاری تک جو ملازم ہوتے تھے سب اہل سیف ہوتے تھے ۔ دہ باشی کو ۱۰۔ بیستی کو ۲۰ وغیرہ وغیرہ سپاہی رکھنے ہوتے تھے ۔ اسی طرح دوبیستی۔ پنجہ باشی۔ سہ بیستی چار بیستی۔ یوز باشی وغیرہ وغیرہ پنجہزاری تک تنخواہ کی صورت یہ کہ حساب کے بموجب اتنی زمین کا قطعہ یا دیہہ یا دیہات یا علاقہ یا ملک مل جاتا تھا۔ اس کے محاصل سے اپنے ذمہ واجب کی فوج رکھیں ۔ اور اپنی حیثیت اور عزت امارت کو درست رکھیں۔ ایک بات اور سُن لو کہ یہاں اُس زمانے میں اور ایشیائی ملکوں میں اب بھی یہی دستور ہے کہ جتنا کسی کا سامان اور خرچ وافر۔ خصوصاً دسترخوان کا پھیلاؤ اور رفیقوں اور نوکروں کی جمعیت زیادہ ہوتی ہے۔ اُتنا ہی وہ شخص بالیاقت عالی ہمت اور صاحب خانوادہ سمجھا جاتا ہے ۔ اور اُتنا زیادہ اور جلد اُس کا منصب بڑھاتے ہیں ؂

ملازمان مذکور میں سے جس کو جیسی لیاقت دیکھتے تھے۔ ویسا کام اہل قلم میں بھی دیتے تھے۔ لڑائی کا موقع آتا تو جن جن کے نام تجویز میں آتے ۔ کیا اہل سیف کیا اہل قلم ان کے نام حکم پہنچتے۔ دہ باشی سے لیکر صدی دوصدی تک وغیرہ وغیرہ۔ کل منصب دار اپنے اپنے ذمے کی فوج ۔ پوشاک ہتیار اور سامانوں سے درست کرتے اور حاضر ہوتے ۔ حکم ہوتا تو آپ بھی ساتھ ہوتے ۔ نہیں تو اپنے آدمی لشکر میں شامل کر دیتے ؂

بدنیت منصبداروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ سپاہی تیار کرکے مہم پر جاتے ۔ جب پھر کر آتے تو چند آدمی اپنی ضرورت کے بموجب رکھ لیتے ۔ باقی موقوف۔ اُن کی تنخواہیں آپ ہضم۔ روپے سے بہاریں اُڑاتے۔ یا گھر بھرتے۔ جب پھر مہم پیش آتی اور یہ اس بھروسے پر بُلائے جاتے کہ آراستہ فوجیں جنگی سپاہی لے کر حاضر ہونگے۔ وہ کچھ اپنے دسترخوانوں کے پلاؤ۔ کچھ کنجڑے ۔ بھٹھیارے ۔ دھنئے جلاہے۔ کچھ جنگلی مغل۔ پٹھان۔ ترک۔ کہ ہزاروں بازاروں میں پھرتے تھے اور سراؤں میں پڑے رہتے تھے۔ اُن ہی کو پکڑ لاتے تھے۔ کچھ اپنے خدمتگار۔ کچھ سائیس۔ شاگرد پیشہ وغیرہ لیتے۔ گھسیاروں کو گھوڑے اور بھٹیاروں کو ٹٹوؤں پر بٹھاتے۔ کرائے کے ہتیار ۔ مانگے تانگے کے کپڑوں سے لفافہ چڑھاتے اور حاضر ہوتے۔ لیکن توپ تلوار کے منہ پر ان لوگوں سے کیا ہوتا تھا۔ عین لڑائی کیوقت بڑی خرابی ہوتی تھی ؂

ایشیا کے فرمانرواؤں کا عہد قدیم سے یہی آئین تھا۔ کیا ہندوستان کے راجہ مہاراجہ۔ کیا ایران توران کے بادشاہ۔ میں نے خود دیکھا افغانستان۔ بدخشان۔ سمرقند۔ بخارا وغیرہ وغیرہ ملکوں میں اب

تک بھی یہی آئین چلا آتا تھا۔ اُدھر کے ملکوں میں سب سے پہلے کابل میں یہ قانون بدلا۔ اور وجہ اسکی یہ ہوئی کہ جب امیر دوست محمد خاں نے احمد شاہ دُرانی کے خاندان کو نکال کر بے مزاحم حکم حاصل کیا تو افواج انگلشیہ شاہ شجاع کو اُس کا حق دلوانے گئیں۔ ادھر سے امیر بھی لشکر لیکر نکلا۔ تمام سردار صاحب فوج اسکے ساتھ۔ محمد شاہ خاں غلزئی۔ امین اللہ خاں لوگری۔ عبداللہ خاں اچکزئی۔ خاں شیریں خاں قزلباش وغیرہ وہ خوانین تھے کہ ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر نقارہ بجائیں تو تیس تیس چالیس چالیس ہزار آدمی فوراً جمع ہو جائیں۔ امیر سب قوم کو لیکر میدانِ جنگ میں آیا دونو لشکروں کے سپہسالار منتظر کہ کدھر سے لڑائی شروع ہو۔ دفعتہً ایک افغان سردار امیر کی طرف سے گھوڑا اُڑا کر چلا اس کی فوج اس کے پیچھے پیچھے۔ جیسے چیونٹیوں کی قطار۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ حملہ کرتا ہے۔ اُس نے آتے ہی شاہ کو سلام کیا اور قبضہ شمشیر نذر گزرانا۔ دوسرا آیا۔ تیسرا آیا۔ امیر صاحب دیکھتے ہیں تو گرد میدان صاف ہوتا جاتا ہے۔ ایک مصاحب سے پوچھا۔ فلاں سردار کجاست؟ صاحبا او رفت شاہ را سلام کرد۔ فلاں سردار کجاست؟ صاحبا او رفت بہ لشکر فرنگی۔ امیر حیران۔ اتنے میں ایک وفادار گھوڑا مار کر آیا۔ اے امیر صاحب کرامے پرسید۔ ہمہ لشکر نمک حرام شد۔ برابر سے ایک نے امیر کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھینچی اور کہا۔ ہاں۔ امیر صاحب چپے بینید ورق برگشت بیک کنار کشید خود را یہ سُن کر امیر صاحب نے بھی باگ پھیری۔ وہ آگے آگے۔ باقی پیچھے پیچھے۔ گھر چھوڑ کر نکل گئے۔ جب دولت انگلشیہ نے پھر تاج بخشی کر کے انہیں ملک عنایت کیا تو سمجھایا کہ اب امرا اور خوانین پر فوج کو نہ چھوڑنا اب فوج نوکر رکھنا۔ آپ تنخواہ دینا اور اپنے حکم میں فوج کو رکھنا۔ چونکہ نصیحت پا چکے تھے۔ جھٹ سمجھ گئے۔ جب کابل میں پہنچے تو بڑی حکمت عملی سے بندوبست کیا اور آہستہ آہستہ تمام خوانین اور سرکردگانِ افغانستان کو نیست و نابود کر دیا۔ جو رہے اُن کے بازو اس طرح توڑے کہ ہلنے کے قابل نہ رہے۔ دربار میں حاضر رہو۔ تنخواہ لفقد لو۔ گھروں میں بیٹھے تسبیحیں ہلایا کرو ع کجا بود اشہب کجا تاختم

آئینِ داغ

ہندوستان کے سلاطین سلف میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی کے عہد میں داغ کا ضابطہ نکلا تھا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ گیا تھا اور کہتا تھا کہ امرا کو اس طرح رکھنے میں خودسری کا زور پیدا ہوتا ہے جب ناراض ہونگے۔ مل کر بغاوت پر کھڑے ہو جائینگے۔ اور جسے چاہینگے بادشاہ بنا لینگے۔ چنانچہ فوج نوکر رکھی اور داغ کا قانون قائم کیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں جاگیریں ہو گئیں۔ شیر شاہ کے

عہد میں پھر داغ کا آئین تازہ ہُوا۔ مگر وہ مر گیا۔ داغ بھی مٹ گیا۔ اکبر جب ۹۸۱ھ میں پٹنے کی مہم پر گیا تو امرا کی فوجوں سے بہت تنگ ہوا کہ سپاہی بدحال اور سپاہ بے سامان تھی۔ شکایتیں پہلے سے بھی ہو رہی تھیں۔ جب پھر کر آئے تو شہباز خاں کنبو نے تحریک کی اور آئین مذکور پر عمل درآمد شروع ہُوا ؛

شاہ با تدبیر سمجھا کہ اگر اس حکم کی تعمیل دفعتہً عام کرینگے تو تمام امرا گھبرا اُٹھینگے کیونکہ پوری فوجیں کس کے پاس ہیں۔ ان کی آزردگی سے شاید کچھ قباحت رنگ نکالے۔ اس کے علاوہ تمام ملک میں یکبارگی نگہداشت شروع ہو جائیگی۔ اس میں اور خرابی ہوگی۔ مُلا ہے۔ سائیس۔ گھسیارے۔ بھٹیارے اور اُن کے ٹٹو جو ہاتھ آئینگے سب بھرتی ہو جائینگے۔ اس لئے قرار پایا کہ وہ باشی اور بیستی منصبداروں سے موجودات شروع ہو۔ اپنے اپنے سواروں کو لیکر چھاؤنی میں حاضر ہوں اور فہرست کے ساتھ پیش کریں۔ ہر ایک کا نام۔ وطن۔ عمر۔ قد و قامت۔ خط و خال۔ غرض تمام حلیہ لکھا جائے۔ موجودات کے وقت ہر نکتہ مطابق کرتے تھے اور فہرست پر نشان کرتے جاتے تھے اِس کو بھی داغ کہتے تھے۔ ساتھ اس کے گھوڑے پر لوہا گرم کرکے داغ لگاتے تھے اس عمل درآمد کا نام آئین داغ تھا۔ اُستاد مرحوم نے اِسی اصطلاح کا اشارہ کیا اور کیا خوب کہا ہے ؎

کہتی ہے ماہی بریاں کہ دبیرانِ قضا	داغ دیتے ہیں اُسے جس کو درم دیتے ہیں

جب درجہ مذکور کے ملازم جابجا داغ ہو گئے۔ تو صدی دو صدی وغیرہ کی نوبت آئی بلکہ آدمی سے بڑھکر منصبداروں کے اونٹ۔ ہاتھی۔ خچر۔ گدھے۔ بیل وغیرہ جو اُن کے کاروبار سے متعلق تھے سب داغ کے نیچے آگئے۔ یہ بھی ہو گئے تو ہزاری۔ دو ہزاری۔ پنجہزاری تک نوبت پہنچی کہ معراج مراتب امرا کی تھی حکم تھا کہ جو امیر داغ کی کسوٹی پر پُورا نہ اُترے اُس کا منصب گر جائے۔ اصل وہی تھی کہ کم اصل ہے جب ہی کم حوصلہ ہے۔ اس قابل نہیں کہ اس کے مصارف کو اتنا خرچ اور رات یہ منصب دیا جائے انکار داغ کی سزا میں بہت سے نامی امیر بنگالہ[1] بھیجے گئے۔ اور منعم خاں خان خاناں کو لکھا گیا کہ ان کی جاگیریں وہیں کر دو۔ باوجود اس نرمی و آہستگی کے منصبدار بہت گھبرائے مظفر خاں عتاب میں آئے۔ مرزا عزیز کوکلتاش ان کا لاڈلا امیر اور فندی سپہ سالار اتنا جھگڑا کہ دربار سے بند ہو گیا اور حکم ہو گیا کہ اپنے گھر میں بیٹھے نہ یہ کسی کے پاس جانے پائے نہ کوئی اس کے پاس آنے پائے ؛

---

[1] سلاطین چغتائیہ میں یہ آئین تھا کہ جس امیر پر خفا ہوتے تھے اُسے بنگالہ میں پھینک دیتے تھے۔ کچھ اس سبب سے کہ گرم ملک تھا اس پر ہوا مرطوب۔ بیمار ہو جاتے تھے۔ اور کچھ اس سبب سے کہ ولایتی لوگ اپنے مُلک سے دُوری اور بعد مسافت سے بہت گھبراتے تھے اور ناجنسی محض کے سبب سے اس ملک میں تنگ رہتے تھے ؛

داغ کی صورت (ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں) ابتدا میں گھوڑے کی گردن پر سیدھی طرف سین کا سرا (س) لوہے سے داغ دیتے تھے۔ پھر دو الف متقاطع بہ قائمہ ہو گئے مگر بہاروں سرے ذرا موٹے۔ یہ نشان سیدھی ران پر ہوتا تھا۔ پھر مدت تک چلّہ اُتری کمان (صـ) کی شکل رہی۔ پھر یہ بھی بدلا گیا۔ لوہے کے ہندسے بن گئے۔ یہ گھوڑے کے سیدھے پٹھے پر ہوتے تھے پہلی دفعہ ۱ دوسری دفعہ ۲ وغیرہ۔ پھر خاص طور کے ہندسے سرکار سے مل گئے۔ شہزادے۔ سلاطین سپہ سالار وغیرہ سب انہی سے نشان لگاتے تھے۔ اس میں یہ فائدہ ہوا کہ اگر کسی کا گھوڑا مر جاتا اور وہ کوئی گھوڑا داغ کے وقت حاضر کرتا تو بخشی فوج کہتا تھا کہ آج کی تاریخ سے حساب میں آئیگا۔ سوار کہتا تھا۔ میں نے اسی دن خرید لیا تھا۔ جس دن پہلا گھوڑا مرا تھا۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ سوار کرایہ کا گھوڑا لا کر دکھا دیتے تھے۔ کبھی پہلے گھوڑے کو بیچ کھاتے تھے۔ داغ کے وقت اس چہرے کا گھوڑا لا کر دکھا دیتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس داغ سے دغا کے رستے بند ہو گئے۔ داغ مکرر میں بھی داغ دوبارہ تیسری دفعہ تبارہ ❊

مُلا صاحب اس مقدمے کو بھی غصے کی وردی پہنا کر اپنی کتاب میں لائے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اگرچہ سب امرا ناراض ہوئے اور سزائیں بھی اٹھائیں لیکن آخر یہی آئین سب کو ماننا پڑا۔ اور غریب سپاہی کے طبق میں پھر بھی خاک ہی پڑی۔ اُدھر امرا نے اپنا آئین یہ باندھا کہ داغ کے وقت کچھ اصلی کچھ لقلقی وہی لفافے کی فوج لا کر دکھا دی اور منصب پورا کروا لیا۔ جاگیر پر جا کر سب رُخصت۔ وہ فرضی گھوڑے کیسے۔ اور کرائے کے ہتیار کہاں؟ پھر کام کا وقت ہوگا تو دیکھا جائیگا۔ مہم آن پڑی۔ تو فضیحت و رسوائی۔ جو اصلی سپاہی ہے اُسی کی تباہی ہے۔ دلاور۔ بہادر معرکے مارنے والے مارے مارے پھرتے ہیں۔ تلواریں مارنے والے بھوکوں مرتے ہیں۔ گھوڑا اتنی اُمید پر کون باندھے۔ کہ بادشاہ کو کبھی مہم پیش آئیگی تو کسی امیر کے نوکر ہو جائینگے۔ آج رکھیں تو کھلائیں کہاں سے۔ بیچتے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں لیتا۔ تلوار گرو رکھتے ہیں بنیا آٹا نہیں دیتا۔ اس بربادی کا نتیجہ یہ ہے کہ وقت پر ڈھونڈیں تو جسے سپاہی کہتے ہیں وہ انسان پیدا نہیں۔ اسی سلسلے میں مُلا صاحب عبارت آئندہ تمسخر کے رنگ میں لکھتے ہیں۔ مگر مجھ سے پُوچھو تو وہ غصہ بھی ناحق تھا اور یہ تمسخر بھی بے جا ہے۔ حق یہ ہے کہ اکبر نے اس کام کو دلی شوق اور بڑی کوشش سے جاری کیا تھا۔ کیونکہ وہ حقیقی اور تحقیقی بادشاہ مہمات و فتوحات کا عاشق تھا۔ آپ تلوار پکڑ کر لڑتا تھا۔ اور سپاہیانہ یلغاریں کرتا تھا۔ اس لئے بہادر سپاہی اور دیدار و جوان اُسے بہت پیارا تھا۔ چنانچہ جب آئین مذکور جاری کیا۔ تو بعض وقت خود بھی

دیوان خاص میں آن بیٹھتا تھا اور اس خیال سے کہ میرا سپاہی پھر بدلا نہ جائے اُس کا چہرہ لکھواتا تھا۔
پھر کپڑوں اور ہتھیاروں سمیت ترازو میں تلواتا تھا۔ حکم تھا کہ لکھ لو۔ یہ اڑھائی من سے کچھ زیادہ کا نکلا
وہ ساڑھے تین من سے کچھ کم ہے۔ پھر معلوم ہوتا تھا کہ ہتیار کرائے کے لئے تھے اور کپڑے مانگے کے
تھے۔ ہنسکر کہہ دیتا تھا کہ ہم بھی جانتے ہیں مگر انہیں کچھ دینا چاہیئے۔ سب کا گزارہ ہوتا ہے۔ سوار
دو اسپہ یک اسپہ تو عام بات تھی مگر پرورش کی نظر نے نیم اسپہ کا آئین نکالا۔ مثلاً اچھا سپاہی ہے
مگر گھوڑے کی طاقت نہیں رکھتا۔ حکم دیتا تھا کہ خیر دو مل کر ایک گھوڑا رکھیں۔ باری باری سے کام
دیں۔ ۶ روپے مہینہ گھوڑے کا۔ اُس میں بھی دو نو شریک یہ سب کچھ صحیح مگر اسے اقبال سمجھو خواہ نیک نیتی
کا پھل۔ کہ جہاں جہاں غنیم تھے خود بخود نیست و نابود ہوگئے۔ نہ فوج کشی کی نوبت آتی تھی۔ نہ سپاہی کی
ضرورت ہوتی تھی۔ اچھا ہوا منصبدار بھی داغ کے دُکھ سے بچ گئے۔ ملا صاحب اپنے جوش مذہب میں
خواہ مخواہ ہر بات کو بدی اور تعدی کا لباس پہناتے ہیں۔ اس میں کچھ شُبہ نہیں کہ وہ نیک نیت تھا اور
رعایا کو دل سے پیار کرتا تھا۔ سب کی آسائش کے لئے خالص نیت سے یہ اور صدہا ایسے ایسے آئین
باندھے تھے۔ البتہ اس سے لاچار تھا کہ بدنیت اہل کار عمل درآمد میں خرابی کرکے بھلائی کو بُرائی بنا دیتے
تھے۔ داغ سے بھی دغاباز نہ باز آئیں تو وہ کیا کرے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری ۱۰۰۶ھ میں ختم کی ہے
اُس میں لکھتے ہیں کہ سپاہ بادشاہی فرمانروایان زمیں خیز (راجگان وغیرہ) کی سپاہ مل کر ۴۴ لاکھ سے
زیادہ ہے۔ بہتوں کے لئے داغ اور چہرہ نویسی نے ماتھے روشن کیے ہیں۔ اکثر بہادروں نے شرافت
اطوار۔ اور اعتبار کے جوہر سے منتخب ہوکر حضوری رکاب میں عزت پائی ہے۔ یہ لوگ پہلے یکے کہلاتے
تھے اب **احدی** کا خطاب ملا (ملا صاحب کہتے ہیں کہ اس میں توحید الٰہی اکبرشاہی کا اشارہ
بھی تھا) بعض کو داغ سے معاف بھی رکھتے ہیں ⁂

تنخواہ ایرانی۔ تورانی کی ۲۵ روپے۔ ہندی ۲۰۔ خالصہ ۱۵۔ اس کو برآوردی کہتے تھے۔ جو
منصبدار خود سوار اور گھوڑے بہم نہ پہنچا سکتے اُنہیں برآوردی سوار دیئے جاتے تھے۔ دہ ہزاری
ہشت ہزاری۔ ہفت ہزاری منصب تینوں شہزادوں کے لئے خاص تھے۔ امرا میں انتہائے ترقی
پنجہزاری تھی۔ اور کم سے کم دہ باشی۔ منصبداروں کی تعداد ۶۶ تھی کہ اللہ کے عدد ہیں۔ بعض متفرقات
کے طور پر تھے کہ یاوری یا کمکی کہلاتے تھے۔ جو داغ دار ہوتے تھے اُن کی عزت زیادہ ہوتی۔ اکبر اس
بات سے بہت خوش ہوتا تھا کہ دیدار و سپاہی ہو اور خود اسپہ ہو۔ منصبداروں کا سلسلہ اس تفصیل
سے چلتا تھا۔ دہ باشی۔ بیستی۔ دو بیستی پنجاہی۔ سہ بیستی۔ چار بیستی۔ صدی وغیرہ وغیرہ انہیں

حسب تفصیل ذیل سامان رکھنے ہوتے تھے :-

منصبدار	عراقی	مجنس	ترکی	یابو	تازی	جنگلہ	ہاتھیوں کے پانچ نمبر تھے ۱	۲	۳	۴	۵	باربرداری اونٹ	گاؤ	گاڑی	ماہانہ درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم
دہ باشی	۰	۰	۲	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۰۰	۸۰	۷۵
بیستی	۰	۱	۱	۱	۲	۰	۰	۰	۰	۱	۰	یک	۰	یک	۱۲۵	۱۲۵	۱۱۵
دوبیستی	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۲	۰	۱	۲۲۳	۲۰۰	۱۸۵
پنجاہی	۱	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۱	۰	۲	۰	۲	۲۵۰	۲۴۰	۲۳۰
سہ بیستی	۱	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۱	۰	۲	۰	۲	۳۰۱	۲۸۵	۲۷۰
چہار بیستی	۲	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۲	۰	۲	۰	۳	۴۱۰	۳۸۰	۳۵۰
یوزباشی	۲	۲	۲	۲	۲	۰	۰	۱	۱	۱	۰	۲	۰	۵	۷۰۰	۶۰۰	۵۰۰
پنجہزاری	۳۴	۳۴	۶۸	۴۸	۷۶	۶۶	۲۰	۳۰	۲۰	۲۰	۱۰	۸۰	۲۰	۱۶۰	۳۴ ہزار	۲۹ ہزار	۲۸ ہزار

سوار اگر طاقت رکھتا ہو تو ایک گھوڑے سے زیادہ بھی رکھ سکتا تھا۔ انتہا ۲ گھوڑے تک اُن کے چارپائے کا نصف خرچ خزانے سے ملتا تھا۔ پھر تین گھوڑے سے زیادہ کی اجازت نہ رہی۔ یک اسپہ سے زیادہ کو ایک اونٹ یا بیل بھی باربرداری کے لئے رکھنا پڑتا تھا۔ گھوڑے کے لحاظ سے بھی سوار کی تنخواہ میں فرق ہوتا تھا چنانچہ۔

عراقی والے کو سہ
مجنس والے کو لعہ
ترکی عہ
یابو مہ
تازی لعہ
جنگلہ لعہ

پیادے کی تنخواہ لعہ سے عہ۔ مہ۔ سے تک ہوتی تھی اِن میں ۱۲ ہزار بندوقچی تھے کہ حاضر رکاب رہتے تھے۔ بندوقچی کی تنخواہ معہ۱۲آر۔ معہ۔ سے ۱۲آر تک ہوتی تھی ؎

آئین صرّاف

صرّافوں اور مہاجنوں کی سیہ کاری اب بھی عالم میں روشن ہے اُس وقت بھی شاہان سلف کے

سکوں پر جو جا ہتے تھے ٹپّا لگاتے تھے اور غریبوں کی ہڈیاں توڑتے تھے۔ حکم ہوا کہ پُرانے روپے جمع کر کے سب گلا ڈالو۔ ہماری قلمرو میں یک قلم ہمارا سکّہ چلے۔ اور نیا پُرانا ہر سنہ کا یکساں سمجھا جائے۔ جو گھس پس کر بہت کم ہو جائے اُس کے لئے آئین و قواعد قائم ہوئے۔ شہر شہر میں فرمان جاری ہو گئے قلیچ خاں کو انتظام سپرد ہوا کہ سب مچلکے لکھوالو۔ مگر یہ تو دلوں کے کھوٹے تھے۔ لکھ کر بھی باز نہ آئے۔ پکڑے آتے تھے باندھے جاتے تھے۔ ماریں کھاتے تھے۔ مارے بھی جاتے تھے اور اپنی کرتوتوں سے باز نہ آتے تھے۔

احکامِ عام بنام کارکنانِ ممالکِ محروسہ

جوں جوں اکبری سلطنت کا سکّہ بیٹھتا گیا اور سلطنت کی روشنی پھیلتی گئی۔ انتظام و احکام بھی پھیلتے گئے چنانچہ اُن میں سے ایک دستور العمل کا خلاصہ اور اکثر تاریخوں سے نکتہ نکتہ چن کر یکجا کرتا ہوں کہ شہزادوں امیروں حاکموں۔ عاملوں کے نام فرمان کا خلعت پہن کر جاری ہوئے تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ رعایا کے حال سے باخبر رہو۔ خلوت پسند نہ ہو کہ اس میں اکثر امور کی خبر نہ ہوگی جن کی تمہیں اطلاع واجب تھی بزرگانِ قوم سے بعزت پیش آؤ۔ شب بیداری کرو۔ صبح۔ شام۔ دوپہر۔ آدھی رات کو خدا کی طرف متوجہ ہو۔ کتبِ اخلاق۔ نصائح۔ تاریخ کو زیر نظر رکھو۔ مسکین اور گوشہ نشین لوگ جو آمد و رفت کا دروازہ بند کر بیٹھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ سلوک کرتے رہو کہ ضروریات سے تنگ نہ ہونے پائیں۔ اہل اللہ۔ نیک نیت۔ صاحبدلوں کی خدمت میں حاضر ہوا کرو۔ اور دُعا کے طلب گار رہو۔ مجرموں کے گناہوں پر بڑی غور کیا کرو کہ کس پر سزا واجب ہے کس سے چشم پوشی۔ کیوں کہ بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن سے کبھی ایسی خطائیں ہو جاتی ہیں کہ زبان پر لانا بھی مصلحت نہیں ہوتا۔

مخبروں کا بڑا خیال رکھو۔ جو کچھ کرو خود دریافت کر کے کرو۔ داد خواہوں کی عرض خود سُنو۔ ماتحت حاکموں کے بھروسے پر سب کام نہ چھوڑ دو۔ رعایا کو دلداری سے رکھو۔ زراعت کی فراوانی اور تعاوی اور دیہات کی آبادی میں بڑی کوشش رہے۔ ریزہ رعایا کے حال کی فرداً فرداً بڑی غور و پرداخت کرو۔ نذرانہ وغیرہ کچھ نہ لو۔ لوگوں کے گھروں میں سپاہی زبردستی نہ جا اُتریں۔ ملک کے کاروبار ہمیشہ مشورت سے کیا کرو۔ لوگوں کے دین و آئین سے کبھی معترض نہ ہو۔ دیکھو دُنیا چندروزہ ہے اس میں انسان نقصان گوارا نہیں کرتا۔ دین کے معاملے میں کب گوارا کرے گا۔ کچھ تو سمجھا ہی ہوگا۔ اگر وہ حق پر ہے . . . تو تم حق سے مخالفت کرتے ہو؟ اور اگر تم حق پر ہو تو وہ بچارا بیمار نادانانی ہے۔ رحم کرو اور دستگیری نہ کہ تعرّض و انکار۔ ہر مذہب کے نکوکاروں اور خیراندیشوں کو عزیز رکھو +

ترویجِ دانش اور کسبِ کمال میں بڑی کوشش کرو۔ اہلِ کمال کی قدردانی کرتے رہو کہ استعدادیں ضائع نہ ہو جائیں۔ قدیمی خاندانوں کی پرورش کا خیال رکھو۔ سپاہی کی ضروریات و لوازمات سے غافل نہ رہو۔ خود تیراندازی۔ تفنگ اندازی وغیرہ سپاہیانہ ورزشیں کرتے رہو۔ ہمیشہ شکار ہی میں نہ رہو۔ ہاں تفریح مشقِ سپاہ گری کی رعایت سے ہو۔

نیّرِ نور بخشِ عالم کے طلوع پر اور آدھی رات کو کہ حقیقت میں طلوع وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ نوبت بجا کرے جب نیّرِ اعظم بُرج سے بُرج میں جاوے تو توپیں اور بندوقیں سر ہوں کہ سب باخبر ہوں۔ اور شکرِ الٰہی بجا لائیں۔ کوتوال نہ ہو تو اس کے کاموں کو خود دیکھو اور سرانجام کرو۔ اس خدمت کو دیکھ کر شرماؤ نہیں عبادتِ الٰہی سمجھ کر بجا لاؤ کہ اُس کے بندوں کی خدمت ہے۔

کوتوال کو چاہیے کہ ہر شہر قصبہ گاؤں۔ گلی محلے۔ گھر گھر والے سب لکھ لے۔ ہر شخص آپس کی ضمانت و حفاظت میں رہے۔ ہر محلہ پر میرِ محلہ ہو۔ جاسوس بھی لگے رکھو کہ ہر جگہ کا حال رات دن پہنچاتے رہیں۔ شادی۔ غمی۔ نکاح۔ پیدائش ہر قسم کے واقعات کی خبر رکھو۔ کوچہ۔ بازار۔ پلوں اور گھاٹوں پر بھی آدمی رہیں۔ رستوں کا ایسا بندوبست رہے کہ کوئی بھاگے تو بے خبر نہ نکل جائے۔

چور آئے۔ آگ لگ جائے۔ کوئی مصیبت پڑے تو ہمسایہ فوراً مدد کرے۔ میرِ محلہ اور خبردار بھی فوراً اُٹھ دوڑیں۔ جان چھپا بیٹھیں تو مجرم۔ ہمسایہ۔ میرِ محلہ اور خبردار کی اطلاع بغیر کوئی سفر میں نہ جائے اور کوئی آ کر اترنے بھی نہ پائے۔ سوداگر۔ سپاہی۔ مسافر ہر قسم کے آدمی کو دیکھتے رہیں۔ جن کا کوئی ضامن نہ ہو اُن کو الگ سرا میں بساؤ۔ وہیں با اعتبار لوگ سرا بھی تجویز کریں۔ رؤسا و شرفائے محلہ بھی ان باتوں کے ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص کی آمد و خرچ پر نظر رکھو جس کا خرچ آمد سے زیادہ ہے ضرور دال میں کالا ہے۔ ان باتوں کو انتظام اور بہبودیٔ خلائق سمجھا کرو۔ روپیہ کھینچنے کی نیت سے نہ کرو۔

بازاروں میں دلال مقرر کر دو۔ جو خرید و فروخت ہو۔ میرِ محلہ کی و خبردارِ محلہ کی بے اطلاع نہ ہو۔ خریدنے اور بیچنے والے کا نام روزنامچہ میں درج ہو۔ جو چھپ چھپاتے لین دین کرے اُس پر جرمانہ۔ محلہ محلہ اور نواحِ شہر میں بھی رات کے لیے چوکیدار رکھو۔ اجنبی آدمی کو ہر وقت تاڑتے رہو۔ چور۔ جیب کترے اُچکے۔ اُٹھائی گیرے کا نام بھی نہ رہنے پائے۔ مجرم کو مال سمیت پیدا کرنا اُس کا ذمہ ہے۔ جو لاوارث مر جائے یا کہیں چلا جائے۔ اُس کے مال سے سرکاری قرضہ ہو تو پہلے وصول کرو۔ پھر وارثوں کو دے دو۔ وارث موجود نہ ہو تو امین کے سپرد کر دو اور دربار میں اطلاع لکھو۔ حق دار آ جائے تو وہ پائے۔ اس میں بھی نیک نیتی سے کام کرو۔ روم کا دستور یہاں نہ ہو جائے کہ جو آیا ضبط۔ مُلّا صاحب اس پر طُرّہ

لٹاتے ہیں کہ جب تک وارو غہ بیت المال کا خط نہیں ہوتا تب تک اُس کا مردہ بھی دفن نہیں ہوتا۔ اور قبرستان کہ شہر کے باہر بنا ہے۔ وہ بھی رو بہ مشرق۔ کہ غلطت آفتاب نہ جانے پائے +

شراب کے باب میں بڑی تاکید ہے۔ بو بھی نہ آنے پائے۔ پینے والا۔ بیچنے والا۔ کھینچنے والا سب مجرم۔ ایسی سزا دو کہ سب کی آنکھیں کھل جائیں۔ ہاں کوئی حکمت اور ہوش افزائی کے لئے کام میں لائے تو نہ بولو۔ نرخوں کی ارزانی میں بڑی کوشش رکھو۔ مالدار ذخیروں سے گھر نہ بھرنے پائیں +

عیدوں کے جشنوں کا لحاظ رہے۔ سب سے بڑی عید نوروز ہے کہ نیر نور بخش عالم برج حمل میں آتا ہے۔ یہ فروردین کی پہلی تاریخ ہے۔ دوسری عید ۱۹ اُسی مہینے کی۔ کہ شرف کا دن ہے۔ تیسری ۳۔ اُردی بہشت کی وغیرہ وغیرہ۔ شب نوروز اور شب شرف کو شب برات کی طرح چراغاں ہوں۔ اوّل شب نقارے بجیں۔ معمولی عیدیں بھی بدستور ہوا کریں اور ہر شہر میں شادیانے بجا کریں +

عورت بے ضرورت گھوڑے پر نہ چڑھے۔ دریاؤں اور نہروں پر مردوں اور عورتوں کے غسل کو اور پنہاریوں کے پانی بھرنے کو الگ الگ گھاٹ تیار ہوں۔ سوداگر بے حکم ملک سے گھوڑا نہ نکال لے جائے۔ ہندوستان کا بُردہ کہیں اور نہ جانے پائے۔ نرخ اشیا بادشاہی قیمت پر رہے +

بے اطلاع[1] کوئی شادی نہ ہوا کرے۔ عوام الناس کی شادی ہو تو دولھا دُلھن کو کوتوالی میں دکھا دو عورت ۱۲ برس مرد سے بڑی ہو تو مرد اس سے تعلق نہ کرے کہ باعث ضعف و ناتوانی ہے۔ لڑکا ۱۶ برس اور لڑکی ۱۴ برس سے پہلے نہ بیاہی جائے چچا اور ماموں وغیرہ کی بیٹی سے شادی نہ ہو کہ رغبت کم ہوتی ہے۔ اولاد ضعیف ہوگی۔ جو عورت بازاروں میں کھلم کھلا بے برقع۔ بے گھونگٹ پھرتی نظر آیا کرے یا ہمیشہ خاوند سے دنگہ فساد رکھے اُسے شیطان پورہ میں داخل کرو۔ ضرورت مجبور کرے تو اولاد کو گرو رکھ سکتے ہیں جب روپیہ ہاتھ آئے چھڑا لیں۔ ہندو کا لڑکا بچپن میں جبراً مسلمان ہو گیا ہو تو بڑا ہو کر جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ جو شخص جس دین میں چاہے چلا جائے کوئی روکنے نہ پائے۔ ہندنی عورت مسلمان کے گھر میں بیٹھ جائے تو وارثوں کے گھر پہنچا دو۔ مندر۔ شوالہ۔ آتش خانہ۔ گرجا جو چاہے بنائے روک

---

[1] ملا صاحب اس حکم پر بڑے خفا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اہلکاروں اور ملازموں کی بن آئی۔ لوگوں کے کام بند کر دیتے جب تک اپنی منہ بھرائی نہ لے لیتے۔ شادی نہیں ہونے دیتے۔ آزاد۔ ملا صاحب فرمانا سر آنکھوں پر مگر یہ بھی تو دیکھو کہ عوام میں شادی کے دعوے آج تک بھی کیسے اُلجھے ہوئے پیش آتے ہیں۔ باوجودیکہ ایسا چست اور درست انگریزی قانون ہے۔ پھر بھی اِس ملک پنجاب میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ چار خاوند حاضر ہیں مشہر منصف کے ساتھ ایک مُلا صاحب مُنڈا ہوا سر۔ ناف تک داڑھی۔ پاؤں تک کرتہ۔ نیلا لنگ۔ ہوس رانی ہاتھ میں۔ بلطف شرعی فرماتے ہیں کہ میں نے بزبان خود نکاح پڑھا تو ہم مسلمان بائیمان گواہ کہ مجلس عام میں پڑھا گیا ہے اور اس باپ نے پڑھوایا انکار کر بھی سوا۔ رجسٹری کے کچھ نہ بن آئی

ٹوک نہ ہو۔

اس کے علاوہ سینکڑوں ہزاروں احکام ملکی۔ مالی۔ داغ محلی تحصال۔ فرد فرد رعایا۔ واقعہ نویسی چوکی نویسی۔ بادشاہ کی تقسیم اوقات۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ جاگنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ وغیرہ وغیرہ تھے کہ آئین اکبری کا مجلد ضخیم اس سے آراستہ ہے کوئی بات آئین و قواعد و قانون سے بچی نہ تھی۔ ملا صاحب اُن کا بھی خاکا اُڑاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نئے ایجاد تھے۔ جو بات نئی معلوم ہوتی ہے اُس پر لوگوں کی نظر اٹکتی ہے۔ اس وقت بھی اہل دربار مل کر بیٹھے ہونگے تو ہنرور ان باتوں کے چرچے کرتے ہوں گے۔ اور چونکہ صاحب علم و صاحب کمال تھے اس لئے ایک ایک بات لطائف و ظرائف کے ساتھ نقل مجلس ہوتی ہوگی۔

لطیفہ۔ ایک دفعہ حکم ہوا کہ قلعہ لاہور میں دیوانِ عام کے سامنے چبوترہ ہے اس پر مختصر مسجد بنوا دو کہ بعض اشخاص بہ حالت حضوری کارِ ضروری میں مصروف ہوتے ہیں۔ نماز کا وقت ہو تو انہیں دور جانا نہ پڑے۔ یہاں سامنے نماز پڑھیں اور پھر حاضر ہو جائیں۔ حکیم مصری کے دہن ظرافت میں پانی بھر آیا اور فرمایا۔

شاہِ ما کرد مسجدے بنیاد	ایہا المومنوں مبارک باد
وندریں نیز مصلحت دارد	تا نماز ان گزار بشمارد

حکیم صاحب کی باتیں مصری کی ڈلیاں تھیں۔ جس قدر حال ان کا معلوم ہوا علیحدہ لکھا ہے تتمے کو پڑھ کر منہ میٹھا کرو۔

ہندؤں کے ساتھ اپنایت

اکبر اگرچہ ترک ماوراء النہری تھا۔ مگر اُس نے ہندوستان میں آکر جس طرح ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے اپنایت پیدا کی۔ وہ ایک صنعتِ کیمیائی ہے کہ کتابوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ اور یہ بھی ایک تمہید پر منحصر ہے۔ واضح ہو کہ جب ہمایوں ایران میں گیا اور شاہ طہماسپ سے ملاقات ہوئی تو ایک دن دونو بادشاہ شکار کو نکلے۔ کسی مقام پر تھک کر اُتر پڑے۔ شاہی فراش نے اُٹھتے ہی غالیچہ ڈال دیا۔ شاہ بیٹھ گئے۔ ہمایوں کے ایک زانو کے نیچے فرش نہ تھا۔ اس عرصے میں کہ شاہ اُٹھیں اور غالیچہ پکڑ کر بچھائیں۔ ہمایوں کے ایک جاں نثار نے جھٹ اپنے تبردان کا کارچوبی غلاف چھری سے چاک کیا اور اپنے بادشاہ کے نیچے بچھا دیا۔ شاہ طہماسپ کو یہ پھرتی اور ہوا خواہی اُس کی پسند آئی۔ اور کہا کہ برادر ہمایوں! تمہارے ساتھ ایسے ایسے جاں نثار نمک حلال تھے۔ اور پھر ملک ہاتھ سے اس طرح نکل گیا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ بھائیوں کے حسد اور عداوت نے کام خراب کر دیا

نمک خوار نوکر ایک آقا کے بیٹے سمجھ کر کبھی ادھر ہو جاتے تھے کبھی اُدھر۔ شاہ نے کہا کہ ملک کے لوگوں نے رفاقت نہ کی؟ ہمایوں نے کہا کہ کل رعایا غیر قوم غیر مذہب ہیں۔ اور خود ملک کے اصلی مالک ہیں۔ ان سے رفاقت ممکن نہیں۔ شاہ نے کہا کہ ہندوستان میں دو فرقے کے لوگ بہت ہیں ایک افغان۔ دوسرے راجپوت۔ خدا کی مدد شاملِ حال ہو اب کی دفعہ وہاں پہنچو تو افغانوں کو تجارت میں ڈال دو۔ اور راجپوتوں کو دلاسا و محبت کے ساتھ شریکِ حال کرو (دیکھو مآثر الامرا)۔

ہمایوں جب ہندوستان میں آیا تو اُسے اجل نے اماں نہ دی۔ اور اِس تدبیر کو عمل میں نہ لا سکا البتہ اکبر نے کیا۔ اور خوب طور سے کیا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ گیا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے۔ مجھے اس ملک میں خدا نے بادشاہ کر کے بھیجا ہے۔ ملک گیری اور تسخیر کی حالت میں ممکن ہے کہ ملک کو تلوار کے زور سے زیر کیا اور اہلِ ملک کو ویران کر دیا۔ ملک والوں کو دبا لیا۔ لیکن جب کہ میں اسی گھر میں رہنا اختیار کر دوں تو یہ ممکن نہیں کہ ان کے ملک کے کل فوائد اور آرام میں اور میرے اُمرا اُٹھائیں اور ملک والے ویران و پریشان رہیں اور پھر میں آرام سے بھی بیٹھ سکوں۔ اور یہ اُس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ اُنہیں بالکل فنا کر کے نیست و نابود کر دوں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرے باپ چچاؤں کے ہاتھ سے کیا گزری۔ چچاؤں کی اولاد اور اُنکے نمکخوار موجود ہیں۔ اور جو ہم قوم ترک اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ یہ ہمیشہ دو دھاری تلوار ہیں۔ جدھر فائدہ دیکھا اُدھر پھر گئے۔ غرض جب اُس نے ملک کو آپ سنبھالا تو ایسا ڈھنگ ڈالا جس میں خاص و عام اہلِ ہند یہ نہ سمجھیں کہ غیر قوم ترک۔ غیر مذہب مسلمان۔ کہیں سے آ کر ہم پر حاکم ہو گیا ہے۔ اِس لئے ملک کے فوائد و منافع پر کوئی بند نہ رکھا۔ اُس کی سلطنت ایک دریا تھا کہ جس کا کنارہ ہر جگہ سے گھاٹ تھا۔ آؤ۔ اور سیراب ہو جاؤ۔ دنیا میں کون ہے کہ جان رکھتا ہو اور دریا کے کنارے پر نہ آئے۔

جب ملک گیری نے بہت سے معرکے طے کر دیئے۔ اور رونق و زیبائی کو اس کے دربار سجانے کا موقع ملا۔ ہزاروں راجہ۔ مہاراجہ۔ ٹھاکر۔ سردار حاضر ہونے لگے۔ دربار اُن جواہر کی تیلیوں سے جگمگا اٹھا۔ عالی ہمت بادشاہ نے اُن کے اعزاز اور مدارج کا بڑا لحاظ رکھا۔ اخلاق کا پتلا تھا۔ ملنساری اس کی طبیعت میں داخل تھی۔ اُن سے اِس طرح پیش آیا کہ سب کو آئندہ کے لئے بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں بلکہ جو اُن کا متوسل ہو کر آیا۔ اُس سے اِس طرح پیش آیا کہ ایک عالم اُدھر کو جھک پڑا پنڈت کبیشر۔ گنی گنوان ہندوستان کے جو آئے اس طرح خوش نکلے کہ شاید اپنے راجاؤں کے دربار سے بھی اسی طرح نکلتے ہوں گے۔ ساتھ یہ بھی سب کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہ برتاؤ اس کا ہمارے پھسلانے کے لئے نہیں ہے۔ اِس کا مطلب یہی ہے کہ ہم کو اپنا کرے اور ہمارا ہو رہے

اور اس کی سخاوتیں اور دن رات کے کاروبار اور اپنایت کے برتاؤ اس خیال کی ہردم تصدیق کرتے تھے۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہمقوم اور غیر قوم کا فرق اصلا نہ رہا۔ سپہ داری اور ملک داری کے جلیل القدر عہدے ترکوں کے برابر ہندوؤں کو ملنے لگے[1]۔ دربار کی صف میں ایک ہندو ایک مسلمان دو مسلمان ایک ہندو برابر نظر آنے لگے[2]۔ راجپوتوں کی محبت اُن کی ہر بات کو بلکہ ریت رسوم اور لباس کو بھی اس کی آنکھوں میں خوشنما دکھانے لگی۔ چغے اور عمامے کو اتار کر جامہ اور کھڑکی دار پگڑی اختیار کر لی داڑھی کو رخصت کر دیا تخت و دیہیم کو چھوڑ کر سنگھاسن پر بیٹھنے اور ہاتھی پر چڑھنے لگا۔ فرش فروش سواریاں اور دربار کے سامان آرائش سب ہندوانے ہونے لگے۔ ہندو اور ہندوستانی لوگ بہ وقت خدمت گزاری میں حاضر۔ جب بادشاہ کا یہ رنگ ہوا تو ارکین و امرا ایرانی تورانی سب کا وہی لباس۔ دربار۔ اور زبان کی کھچڑی[3] اس کا لازمی سنگار ہو گیا۔ ترکوں کا دربار اندر سبھا کا تماشا تھا

نوروز کا جشن ایران و توران کی رسم قدیم ہے۔ مگر اس نے ہندوانی ریت رسوم کا رنگ دیکر اسے بھی ہندو بنایا۔ ہر سالگرہ پر جشن ہوتا تھا۔ شمسی بھی قمری بھی۔ ان میں تلا دان کرتے تھے۔ اناج، دھات وغیرہ میں تلتے تھے۔ برہمن بیٹھ کر ہون کرتے تھے اور سب کی گٹھریاں باندھ کے بیٹھیں دینے گھر کو چلے جاتے۔ دسہرہ کو آتے۔ اشیرباد دیتے۔ پوجا کرواتے۔ ماتھے پر ٹیکہ لگاتے۔ جواہر و مروارید سے مرصع راکھی ہاتھ میں باندھتے۔ بادشاہ ہاتھ پر باز بٹھاتے قلعے کے برجوں پر شراب رکھی جاتی۔ بادشاہ کے ساتھ اہل دربار بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔ اور پان کے بیڑوں نے سب کے منہ لال کر دیئے۔ گائے کا گوشت۔ لسن پیاز بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال ہو گئیں۔ صبح کو روز جمنا کے کنارے شرق رویہ کھڑکیوں میں بیٹھتے تھے کہ پہلے آفتاب کے درشن ہوں۔ ہندوستان کے لوگ صبح کو بادشاہ کے دیدار کو بہت مبارک سمجھتے ہیں۔ جو لوگ دریا پر اشنان کو آتے تھے۔ مرد عورتیں بچے ہزار در ہزار سامنے آتے تھے ڈنڈوتیں کرتے۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت کہتے اور خوش ہوتے۔ وہ اپنے بچوں سے زیادہ انہیں دیکھ کر خوش ہوتا۔ اور خوشی بھی بجا تھی جس کے دادا (بابر[4]) کو اپنی قوم (ترک) اس تباہی کے ساتھ اس کے موروثی ملک سے نکالے۔ اور پانچ چھ پشت کی بندگی پر خاک ڈالتے یہ غیر قوم غیر جنس ہو کر اس محبت سے پیش آئیں ان سے زیادہ عزیز کون ہوگا

---

[1] ذرا راجہ ٹوڈرمل کے حال میں دیکھو کہ جب راجہ موصوف کو کل ممالک ہند کی وزارت عظمیٰ کے اختیارات ملے تو لوگوں نے کیا [2] شکایت کی اور نیک نیت بادشاہ نے کیا جواب دیا [3] دیکھو علی قلی خاں کا حال کس کو مربیدہ کیونکر سمجھا گیا [4] دیکھو تتمہ شاہزادگان تیموریہ کا حال

اور وہ ان کے دیکھنے سے خوش نہ ہوگا تو کس سے ہوگا۔

اکبر نے سب کچھ کیا مگر راجپوتوں نے بھی جاں نثاری کو حد سے گزار دیا۔ سیکڑوں میں سے ایک بات ہے کہ جہانگیر نے بھی تزک میں لکھی ہے۔ اکبر نے رسوم ہند کو ابتدا میں فقط اس طرح اختیار کیا گویا غیر ملک کا تازہ میوہ ہے۔ یا نئے ملک کا نیا سنگار ہے۔ یا یہ کہ اپنے پیاروں اور پیار کرنیوالوں کی مہربات پیاری لگتی ہے۔ مگر ان باتوں نے اُسے مذہب کے عالم میں بدنام کر دیا اور بد مذہبی کا داغ اس طرح دامن پر لگایا کہ آج تک بے خبر اور بے درد مُلّا اس کی بدنامی کا سبق ویسا ہی پڑھے جاتے ہیں۔ اس مقام پر سبب اصلی کا نہ لکھنا اور داد گر بادشاہ پر ظلم کا جاری رکھنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا میرے دوستو! تم نے کچھ سمجھ لیا۔ اور آئندہ سمجھ گے کہ ان علمائے زر پرست کی سینہ سیاہی اور بد نفسی نے کس قدر جلد اُنہیں اور اُن کے ہاتھوں اسلام کو ذلیل و خوار کر دکھایا۔

ان نااہلوں کے کاروبار دیکھکر نیک نیت بادشاہ کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ حسد اور کینہ وری علمائے کتابی کا خاصہ ہے۔ اچھا، انہیں سلام کر دں اور جو بزرگ اہل باطن اور صاحبدل کہلاتے ہیں ان میں شاید اندر سے کچھ نکلے۔ چنانچہ اطرافِ ملک سے مشائخ نامدار بُلائے۔ ہر ایک سے الگ الگ خلوت رہی اور بہت باتیں اور حکایاتیں ہوئیں لیکن جس کو دیکھا خاکستری جامہ کے اندر خاک نہ تھا۔ مگر خوشامد۔ اور وہ خود دو چار بگھہ مٹی کا سائل تھا۔ افسوس وہ آرزو منداس بات کا کہ کوئی بات یا فقیرانہ کرامات یا راہِ خدا کا رستہ ان سے ملے۔ انہیں دیکھا تو خود اس سے مانگنے آتے تھے معجزہ کہاں۔ کرامات کجا۔ باقی رہے اخلاق۔ توکل۔ خوفِ الٰہی۔ دردمندی۔ سخاوت۔ ہمت۔ ظاہری باتیں۔ اس سے بھی پاک صاف پایا۔ انجام یہ ہوا کہ بدگمانی خدا بانے کہاں کہاں دوڑ گئی۔ ملا صاحب ایک بزرگؒ کا نام لکھ کر کہتے ہیں۔ فلاں نامی صاحبدل اور مشہور مشائخ تشریف لائے۔ بڑی تعظیم سے عبادتخانہ میں اُتارا انہوں نے نمازِ معکوس دکھائی اور سکھائی۔ اور بادشاہ کے ہاتھ بیچ بھی ڈالی۔ محل میں کوئی حرم حاملہ تھی۔ کہا کہ بیٹا ہوگا۔ وہاں بیٹی ہوئی۔ اور بہت سی خشک اور بے نمک اور بدمزہ حرکتیں کیں۔ کہ سوا افسوس کے کچھ زبانِ قلم پر نہیں آتا ؎

آں نہ صوفی گری و آزادیست	بلکہ کیدی گری و غلا جبیست
دزدی و راہ زنی بہتر ازیں	کفن از مردہ کنی بہتر ازیں

ایک شخصؒ حسبُ الطلب حاضر ہوئے۔ مگر اس طرح کہ تعمیل کی نظر سے حکم سنتے ہی خانقاہ سے

ؒ خلیفہ شیخ عبدالعزیز دہلوی کے تھے۔ اور سرہند کے رہنے والے تھے ؒ شیخ متھی افغان پنجاب سے تشریف لے گئے۔

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سواری ڈولا پیچھے آئی۔ خود فرمان کے ادب سے پچیس تیس منزل بادشاہی پیادوں کے ساتھ پیادہ آئے۔ فتحپور میں پہنچے۔ تو ایک بزرگ[1] کے گھر اُترے اور کہلا بھیجا کہ حکم کی تعمیل کی ہے مگر میری ملاقات کسی بادشاہ کو مبارک نہیں ہوئی۔ بادشاہ نے فوراً انعام و اکرام کے ساتھ حکم بھیجا کہ آپ کو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی۔ بہت اشخاص دُور ہی دُور سے کنارہ کش ہو گئے خدا جانے کچھ اندر تھا بھی یا نہیں +

ایک صاحبدل آئے۔ نہایت نامی اور عالی خاندان تھے۔ بادشاہ نے اُن کی کھڑے ہو کر تعظیم بھی کی۔ نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آیا۔ مگر جو کچھ پوچھا۔ انہوں نے کانوں کی طرف اشارہ کیا اور جواب دیا کہ اونچا سُنتا ہوں۔ علم۔ معرفت۔ طریقت۔ شریعت جس معاملہ میں پوچھتا تھا۔ انجان اور بھولی بھالی صورت بنا کر کہتے تھے "اونچا سُنتا ہوں" غرض وہ بھی رخصت ہوئے۔ جس کو دیکھا یہی معلوم ہوا۔ کہ خانقاہ یا مسجد میں بیٹھے ہیں۔ دوکانداری کر رہے ہیں۔ اندر لامکان سے

گر رے کعبہ میں کیا جو سر بت خانہ سے آگہ ہے		وہاں تو کوئی صورت بھی۔ یہاں اللہ ہی اللہ ہے	

بعضے شیطان طینتوں نے کہا۔ کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ اختلاف مذاہب جو سلف سے چلا آتا ہے۔ ان کا دفع کرنے والا آئیگا۔ اور سب کو ایک کر دے گا۔ وہ اب آپ پیدا ہوئے ہیں بعض نے کتب قدیم کے اشاروں سے ثابت کر دیا کہ سنہ ۹۹۰ھ میں اس کا ثبوت نکلتا ہے +

ایک عالم کعبۃ اللہ سے شریف مکہ کا رسالہ لیکر تشریف لائے۔ اس میں اتنی بات کو پھیلایا تھا کہ دنیا کی ۷ ہزار برس کی عمر ہے۔ وہ ہو چکی۔ اب حضرت امام مہدی کے ظہور کا وقت ہے۔ سو آپ ہیں۔ قاضی عبدالسمیع میانکالی قاضی القضاۃ تھے۔ ان کا خاندان تمام ماوراء النہر میں عظمت اور برکت سے نامور تھا۔ مگر یہاں یہ عالم تھا۔ کہ بازی لگا کر شطرنج کھیلنا وظیفہ تھا۔ جلسۂ مئیخواری ایک عالم تھا۔ جس کے آفریدگار وہ تھے۔ رشوت نذرانہ تھا جس کا لینا مثل ادائے نماز فرض عین تھا۔ مُنسکوں میں سود پر حسب الحکم لکھتے تھے۔ اور وصول کر لیتے تھے (حیلہ شرعی بھی ضرور چاہئے) قاسم خاں فوجی نے کچھ اشعار لکھ کر ان کے احوال و افعال کی تصویر کھینچی تھی۔ ایک شعر اس کا یاد ہے

	پیرے ز قبیلۂ معزز	ریشے چو گُل سفید یک گز	

نیک نیت بے علم بادشاہ طالب خیر اور جویائے حق تھا۔ ایسی ایسی باتوں نے اس کے عقل و ہوش پریشان کر دئے +

[1] شیخ جمال بختیاری

پوشیدہ مرقع اندریں خامے چند نارفتہ رہِ صدق وصفا گامے چند	بگرفتہ بہ طامات الف لامے چند بدنام کنندۂ نکو نامے چند	(لا الٰہ الا اللہ)

آتش پرست پارسی نوساری علاقۂ گجرات دکن سے آئے۔ وہ دین زر دشت کی کتابیں بھی لائے۔ ملکِ دل کا بادشاہ ان سے بہت خوش ہوکر ملا۔ شاہان کیانی کی رسم و رواج۔ آگ کی عظمت کے آئین۔ اور اس کی اصطلاحیں معلوم کیں۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ آتشکدہ محل کے پاس بنوایا۔ حکم تھا۔ ایک دم آگ بجھنے نہ پائے کہ آیات عظیمۂ الٰہی اور اس کے نوروں میں سے ایک نور ہے۔ ۲۵ سنہ جلوس میں بے تکلف آگ کو سجدہ کیا جب چراغ یا شمع روشن ہوتی مصاحبان مقربین تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اہتمام اس کا شیخ ابوالفضل کے سپرد ہؤا۔ **آزاد**۔ پارسیان مذکور کو نوساری میں چار سو بیگھہ زمین جاگیر دی۔ اب تک ان کے قبضے میں چلی آتی ہے۔ اکبری اور جہانگیری سندیں ان کے پاس موجود ہیں۔ میں نے سیاحت بمبئی میں وہ کاغذات بچشم خود دیکھے ہیں ٭

اہلِ فرنگ کا آنا اور اُن کی خاطرداری

اکبر اگرچہ علوم وفنون کی کتابیں نہ پڑھا تھا۔ مگر اہل علم سے زیادہ علوم وفنون اور شائستگی اور تہذیب کا عاشق تھا۔ اور ہمیشہ ایجاد و اختراع کے رستے ڈھونڈھتا تھا۔ اس کی دلی آرزو یہ تھی کہ جس طرح فتوحاتِ ملکی اور شجاعت وسخاوت میں نامور ہوں۔ اور میرا ملک قدرتی پیداوار اور زرخیزی میں باغ زرریز ہے۔ اسی طرح علوم وفنون میں نامور ہو۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ علم وکمال کے آفتاب نے یورپ میں صبح کی ہے۔ اس لئے اس ملک کے باکمالوں کی تلاش رکھتا تھا۔ یہ امر قانون قدرت میں داخل ہے۔ کہ جو ڈھونڈھیگا سو پائیگا۔ سامان اس کے خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں ان میں سے چند اتفاق لکھتا ہوں ٭

۹۷۹ھ میں ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کرکے قلعہ بندر سورت پر قبضہ کرلیا۔ بادشاہی لشکر نے جاکر گھیرا۔ اور خود اکبر بھی یلغار کرکے پہنچا۔ سوداگران فرنگ کے جہاز ان دنوں میں آتے جاتے رہتے تھے مرزا نے انہیں لکھا کہ اگر تم آؤ۔ اور اس وقت میں میری مدد کرو تو قلعہ تمہیں دیدونگا۔ وہ لوگ آئے۔ مگر بڑی حکمت سے آئے۔ یعنی بہت سے عجائب وغرائب تحفے مختلف ممالک کے ساتھ لیتے آئے جب لڑائی کے پلے پر پہنچے۔ تو دیکھا۔ کہ سامنے کا وزن بھاری ہے۔ مقابلہ میں کامیاب نہ ہوسکینگے جھٹ رنگ بدل کر ایلچی بن گئے۔ اور کہا کہ ہم تو اپنی سلطنت کی سفارت پر آئے ہیں۔ دربار میں پہنچ کر تحفے تحائف گزرانے۔ اور خلعت وانعام کے ساتھ مراسلہ کا جواب لیکر رخصت ہوئے ٭

اکبر کا بادلپسند طبیعت اپنے کام سے کبھی نچلی نہ رہتی تھی۔ جس طرح اب بمبئی اور کلکتہ ہے۔ اُن دنوں اکثر ... یورپ اور ایشیا کے جہازوں کے لئے گووا اور سورت بندرگاہ تھے۔ معرکہ مذکور کے کئی برس بعد اُس نے حاجی حبیب اللہ کاشی کو زرکثیر دیکر روانہ کیا۔ صنعتوں کے ماہر اور ہر فن کے مبصر ساتھ کئے کہ بندرگاہ گووا میں جاکر مقام کرو اور وہاں سے عجائب و نفائس دیار فرنگ کے لاؤ۔ اور جو صنعتگر اور دستکار ممالک مذکورہ کے وہاں سے آسکیں۔ انہیں بھی ساتھ لاؤ۔ وہ سنہ ۹۸۴ھ میں وہاں سے پھرے۔ تحائف و عجائب کے علاوہ جماعت کثیر اہل کمال کی ساتھ لائے۔ جس وقت شہر میں داخل ہوئے تو عجب نبات کی برات بن گئی۔ انبوہ کثیر جوان و پیر کا ساتھ تھا۔ بیچ میں بہت سے اہل فرنگ اپنا ملکی لباس پہنے۔ اور اپنے قانون موسیقی کے بموجب فرنگی باجے بجاتے شہر میں داخل اور دربار میں حاضر ہوئے۔ انہی کے نوادر و غرائب میں اوّل ارغنول (آرگن) ہندوستان میں آیا۔ وقت کے مورخ لکھتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس باجے کو دیکھ کر عقل حیران اور ہوش سرگردان ہے۔

دانایان مذکور نے دربار اکبری میں جو اعزاز پائے ہوں گے۔ بادبانوں نے اڑا کر یورپ کے ملک ملک میں پہنچائے ہوں گے۔ اور جابجا امیدوں کے دریا لہرائے ہوں گے کسی موج نے بندر ہگلی کے کنارے پر بھی ٹکر کھائی ہوگی۔ امرا کی کارگزاری جدھر بادشاہ کا شوق دیکھتی ہے۔ ادھر پسینہ ٹپکاتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۲۳ جلوس میں شیخ ابوالفضل اکبرنامہ میں سنہ ۹۸۶ھ لکھتے ہیں۔ کہ خان جہان حسین قلی خان نے کوچ بہار کے راجہ سے اطاعت نامہ اور تحائف و نفائس اس ملک کے لیکر دربار میں بھیجے تاب بارسو تاجر فرنگ بھی حاضر دربار ہؤا۔ اور باسو بارن تو بادشاہ کے حسن اخلاق اور اوصاف طبع دیکھکر حیران رہ گیا۔ اور اکبر نے بھی ان پر درستی عقل اور شائستگی حال کا صاد کیا۔

سنہ ۲۵ جلوس میں لکھتے ہیں۔ پادری فریبتون بندر گووا سے اتر کر حاضر دربار ہوئے۔ بہت سے عقلی اور نقلی مطالب سے آگاہ تھے۔ شہزادگان تیز ہوش کو اُن کا شاگرد کیا کہ یونانی کتابوں کے ترجمہ کا سامان فراہم اور ہر رنگ کی باتوں سے آگاہی حاصل ہو۔ پادری موصوف کے علاوہ ایک گروہ انبوہ فرنگی۔ ارمنی حبشی وغیرہ کا تھا۔ کہ ممالک مذکور کی عمدہ اجناس لایا تھا۔ بادشاہ دیر تک سیر دیکھتے رہے۔

سنہ ۔۔۔ میں پھر ایک قافلہ بندر مذکور سے آیا۔ اشیائے عجیب و اجناس غریب لایا۔ ان میں چند دانشور صاحب ریاضت مذہب نصاریٰ کے تھے۔ کہ پادری کہلاتے ہیں۔ نوازش بادشاہی سے کامیاب ہوئے۔ دیکھو اقبال نامہ سنہ ۳۰۔

ملا صاحب فرماتے ہیں کہ پاپا یعنی پادری آئے۔ ملک افرنجہ کے دانایان مرتاض کو پادھری کہتے ہیں۔

ہیں اور مجتہد کامل کو پایا۔ وہ مصلحت وقت کی رعایت سے احکام کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اور بادشاہ بھی اس کے حکم سے عدول نہیں کر سکتا۔ وہ انجیل لائے اور ثالث ثلثہ پر دلائل پیش کر کے نصرانیت کا اثبات کیا اور ملت عیسوی کو رواج دیا۔ ان کی بڑی خاطریں ہوئیں۔ بادشاہ اکثر دربار میں بلاتا تھا۔ اور دینی حالات اور دنیاوی معاملات میں گفتگوئیں سنتا تھا۔ ان سے توریت وانجیل کے ترجمے کرنے چاہے۔ اور کام بھی شروع ہوا مگر ناتمام رہا اور شاہزادہ مراد کو ان کا شاگرد بھی کیا (ایک اور جگہ کہتے ہیں) جب تک یہ لوگ رہے۔ ان کے حال پر بہت توجہ رہی۔ وہ اپنی عبادت کے وقت ناقوس بجاتے تھے۔ اور باجوں سے نغمہ سرائی کرتے تھے۔ اور بادشاہ سُنتا تھا۔ آزاد۔ معلوم نہیں۔ کہ جو زبان شاہزادے سیکھتے تھے وہ رومی تھی یا عبرانی تھی۔ ملا صاحب اگرچہ سند نہیں لکھتے مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد کی شاگردی کا تعلق بھی پادری فریبتون سے تھا۔ شاید وہ اپنی یونانی زبان سکھاتے ہونگے جس کا ابوالفضل کے بیان سے اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر ہماری کتابوں سے نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت کون کون سی کتابیں ان لوگوں کی معرفت ترجمہ ہوئیں۔ البتہ ایک کتاب میں نے خلیفہ سید محمد حسن صاحب کے کتب خانہ میں دیکھی۔ کہ زبان لاطینی (رومی) سے اسی عہد میں ترجمہ ہوئی تھی۔

ملا صاحب لکھتے ہیں۔ ایک موقع پر شیخ قطب الدین جالیسری کو کہ مجذوب خراباتی تھے۔ لوگوں نے پادریوں کے مقابلے میں مباحثے کے لئے پیش کیا۔ فقیر مذکور میدان مباحثہ میں جوش خروش سے صف آرا ہوئے۔ کہا کہ ایک بڑا ڈھیر آگ کا دہکاؤ۔ جس کو دعویٰ ہو میرے ساتھ آگ میں کود پڑے جو صحیح سلامت نکل آئے وہ حق پر ہے۔ آگ دہکا کر تیار کی۔ انہوں نے ایک پاپا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ہاں بسم اللہ۔ پاپاؤں نے کہا کہ یہ بات خلاف عقل ہے۔ اور اکبر کو بھی یہ حرکت ناگوار گزری آزاد۔ بے شک ایسی بات کہنی گویا اقرار ہے اس بات کا کہ ہمارے پاس دلیل عقلی نہیں۔ اور مخالف کا دل آزردہ کرنا نہ شریعت میں درست ہے نہ طریقت میں۔

تبت اور خطا کے لوگوں سے وہاں کے حالات سُنتا تھا۔ جین مت کے لوگوں سے بودھ دھرم کی کتابیں سُنا کرتا تھا۔ ہندوؤں میں بھی صدہا فرقے ہیں اور سیکڑوں ہی کتابیں ہیں۔ وہ سب کو سنتا تھا۔ اور ان پر گفتگوئیں کرتا تھا۔

لطیفہ۔ چند مسلمانوں بلکہ شیطانوں نے ایک فرقہ پیدا کیا کہ نماز روزہ وغیرہ عبادات وطاعات سب چھوڑ دے۔ ننگ رنگ شراب کباب کو شغل لازمی اختیار کیا۔ علما نے بلا کر ہدایت کی۔ کہ اعمال

ناشائستہ سے توبہ کرو۔ جواب دیا کہ پہلے توبہ کرلی ہے۔ جب یہ اختیار کیا ہے ●

انہیں دنوں میں اکثر سلسلوں کے مشائخ بھی حکومت سے اخراج کے لئے انتخاب ہوئے تھے۔ چنانچہ ان بے سلسلہ اور اُن باسلسلہ اشخاص کو ایک قندھاری کاروان کے سلسلے میں رواں کردیا۔ کارواں باشی کو کہا کہ انہیں وہاں چھوڑ آؤ۔ کاروان مذکور قندھار سے ولایتی گھوڑے لے آیا کہ کارآمد تھے۔ انہیں چھوڑ آیا کہ نکمے تھے۔ بلکہ کام بگاڑنے والے۔ جب زمانہ بدلتا ہے۔ تو ایسے ہی مبادلے کیا کرتا ہے۔ تین سو برس بعد استاد مرحوم نے اس انگوٹھی پر نگینہ جڑا ہے ؎

عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم	تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

خلاصہ مطالب مذکورۂ بالا کا یہ ہے۔ کہ مختلف اور متفرق معلومات کا ذخیرہ ایک ایسے بے تعلیم دماغ میں بھرا۔ جن پر ابتدا سے اب تک کبھی اصول و قواعد کا عکس بھی نہ پڑا تھا۔ سمجھ لو کہ اُس کے خیالات کا کیا حال ہوگا۔ اتنا ضرور ہے۔ کہ اس کی نیت بدی اور بدخواہی پر نہ تھی۔ اُسے یہ بھی خیال تھا۔ کہ کل مذہبوں کے بانی نیک نیتی سے لوگوں کو حق پرستی اور نیک راہ پر لایا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے اصول عقاید اور احکام و مسائل اپنے فہم اور اپنے عہد کے بموجب نیکی و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی بنیاد پر رکھے تھے۔ اُسے یہ بھی یقین تھا۔ کہ ہر مذہب میں حق پرست اور صاحب معرفت لوگ ہوئے ہیں۔ نیک نیت بادشاہ جو سب سے اعلےٰ رتبے کی بات سمجھتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ پروردگار سب العالمین ہے۔ اور قادر مطلق ہے۔ اگر سارا حق ایک ہی مذہب کے حجرے میں بند ہوتا۔ اور وُہی خدا کو پسند ہوتا تو اُسی کو دُنیا میں رکھتا۔ باقی سب کو نیست و نابود کر دیتا۔ لیکن جب ایسا نہ کیا تو معلوم ہؤا کہ اُس کا ایک مذہب نہیں۔ سب اسی کے مذہب ہیں۔ بادشاہ سایۂ خدا ہے۔ اُسے بھی یہی سمجھنا چاہیئے۔ کہ سب مذہب میرے ہیں۔ استاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہم کو کیا یاں راہ پر ہے کوئی یا گمراہ ہے،	اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے

اسی واسطے اُسے اس بات کا شوق نہ تھا کہ سارا جہان مسلمان ہوجائے۔ اور مسلمان کے سوا دوسرا آدمی نظر نہ آئے۔ چنانچہ اس کے دربار میں بہت سے مقدمے اس جھگڑے کے دائر ہوئے۔ بلکہ ایک مقدمے نے ایسا طول کھینچا۔ کہ شیخ صدر کی بنیاد اکھڑ گئی ؎

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا است	از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

ہندو ہر وقت پہلو سے لگے تھے۔ ان سے ہر ایک بات پوچھنے کا موقع تھا۔ وہ بھی مدتوں سے دعائیں کر رہے تھے۔ کہ کوئی پوچھنے والا پیدا ہو۔ شوق تحقیق کو ان کی طرف جھکنے کا زیادہ موقع ملا۔

طالب تحقیق بادشاہ پرکھوتم برہمن کو (ابتدا میں سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ لکھوایا کرتا تھا) بلاکر تحقیقاتیں کرتا تھا۔ ملّا صاحب فرماتے ہیں۔ ایک بالاخانہ خوابگاہ کہلاتا تھا۔ آپ اس کی کھڑکی میں بیٹھتے تھے۔ خلوت میں دیوی برہمن کو (جو مہابھارت کا ترجمہ کرواتا تھا) چارپائی پر بٹھاتے تھے۔ اور رسّیاں ڈال کر اوپر کھینچ لیتے تھے۔ وہ بیچ ہوا میں ہوتا تھا۔ کہ نہ زمین پر ہو نہ آسمان پر۔ اس سے آگ کے۔ سورج کے۔ اور ہر ایک ستارہ کے۔ اور ہر ایک دیوی۔ دیوتا۔ برہما۔ مہادیو۔ بشن۔ کرشن۔ رام۔ مہامائی وغیرہ کی پوجا کے طریقے اور ان کے منتر سیکھتے تھے۔ اور ان کے مسائل اور افسانوں کو بڑے شوق سے سنتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ان کی ساری کتابیں ترجمہ ہو جائیں ٭

مُلّا صاحب فرماتے ہیں۔ ۹۸۳ھ جلوس کے بعد زمانہ کا رنگ بالکل بدل گیا۔ کیونکہ بعض دیں فروش مُلّا بھی شامل ہو کر اُن کے ساتھ ہمداستان ہو گئے۔ نبوت میں کلام۔ وحی میں سکوت ہونے لگے۔ معجزے کرامت۔ جن۔ پری۔ ملائک جو آنکھ سے غائب اس کا انکار۔ قرآن کا تواتر۔ اس کا کلام الٰہی ہونا۔ سب باتوں کے لئے ثبوت طلب ٭

تناسخ پر رسالے لکھے گئے۔ اور قرار یہ پایا کہ اگر مرنے کے بعد ثواب یا عذاب ہے تو تناسخ ہی سے ہو سکتا ہے اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں۔ ایک فقرہ کتابوں میں لکھا چلا آتا ہے۔ **مامن مذھب الا و فیہ قدم راسخ للتناسخ** انتی بات کو بڑھا کر بہت سے پھیلا وے پھیلائے ارباب زمانہ اس قسم کے اشعار پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے ؎

درحقیقت بدست کورے چند	مصحفے ماند و کہنہ گورے چند
گور ہاکس سخن نئے گوید	ستر قراں کسے نئے جوید

لطیفہ۔ خان اعظم جب کعبۃ اللہ سے پھرے تو جہان کو دیکھ کر ذرا عقل آ گئی تھی۔ ڈاڑھی بڑھائی اور درگاہ اکبری میں چڑھائی ؎

اگر ایکے پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے	تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

سبحان اللہ۔ وہی خان اعظم جن سے ڈاڑھی کے طول پر کیا کیا طول کلام ہوئے۔ دیکھو خان موصوف کا حال ۹۹۰ھ میں ایک مہم پر سے فتحیاب آئے۔ بادشاہ خوشی خوشی باتیں کر رہے تھے۔ اسی کے سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے تناسخ کے لئے دلائل قطعی پیدا کئے ہیں یہ شیخ ابوالفضل تمہیں سمجھائینگے۔ تم قبول کرو گے۔ تسلیم کے سوا جواب کیا تھا! ایک بڑے[1] خاندانی مشائخ تھے۔ دیوی برہمن کو خوابگاہ پر جاتے ہوئے دیکھ کر انہیں بھی شوق

[1] ملا صاحب فرماتے ہیں شیخ تاج الدین ولد ذکریا اجودھنی دہلوی تھے۔ (اجودھن اب پاک پٹن کہلاتا ہے) اور اکثر اشخاص شیخ ذکریا موصوف کو تاج العارفین کہتے ہیں۔ یہ حضرت شیخ امان پانی پتی کے شاگرد تھے۔ شیخ امان پانی پتی وہ شخص تھے کہ لوائح پر شرح لکھی تھی۔ اور نزہت الارواح پر بھی موٹی شرح تحریر فرمائی تھی۔ اور تصوف میں ایسی ایسی یادگاریں چھوڑی تھیں کہ علم توحید کے دوسرے محی الدین عربی تھے ٭

پیدا ہوا اور مکر وحیلہ کی کمند پھینک کر خوابگاہ پر پہنچنے لگے۔ بہت مقاصد قرآن کے اور مطالب قرآن کے ملا کر ایک کر دئے۔ وحدت وجود کی بنیاد رکھ کر ہمہ اوست کا منارہ بلند کیا۔ اور فرعون کو بھی مومن ثابت کر کے کسی کو بھی ایمان سے محروم نہ رکھا۔ بلکہ منقوش خاطر کر دیا کہ مغفرت کی امید ہمیشہ خوف عذاب پر غالب ہے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ انسان کامل جو پہلے پیغمبر تھے وہ اب خلیفۃ الزمان ہے۔ اور وہی عین واجب ہے۔ کم سے کم اس کا پر تو تو ضرور ہے۔ پس قبلۂ مرادات اور کعبۂ حاجات وہی ہے۔ سجدہ اس کے لئے جائز ہے۔ کہ فلاں فلاں پیروں کو ان کے مرید کیا کرتے تھے۔ شیخ یعقوب کشمیری نے (کہ اپنی مشہور تصنیفوں سے مرشد اور مقتدائے وقت مشہور تھے) اس معاملہ میں بعض تمہیدیں عین القضات ہمدانی سے نقل کیں اور ایسی ایسی بہت سی گمراہیاں پھیلائیں ॰

ملّا صاحب خفا ہو کر کہتے ہیں۔ بیر بر نے یہ روشنی ڈالی۔ کہ آفتاب ذات الٰہی کا مظہر کامل ہے۔ سبزہ کا اگانا۔ غلّوں کا لانا۔ پھولوں کا کھلانا۔ پھلوں کا پھلانا۔ عالم کا اجالا۔ اہل عالم کی زندگی اس سے وابستہ ہے۔ اس لئے تعظیم اور عبادت کے لائق ہے۔ اس کے طلوع کی طرف رُخ کرنا چاہئے نہ کہ غروب کی طرف۔ اسی طرح آگ۔ پانی۔ پتھر اور پیپل کے ساتھ سب درخت مظاہر الٰہی ہو گئے۔ یہاں تک کہ گائے اور گوبر بھی مظاہر الٰہی ہوئے۔ ساتھ اس کے تلک اور جنیؤ کو بھی جلوہ دیا۔ مزا یہ کہ علما و فضلا اور مصاحبان خاص نے اس کی تقویت کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت آفتاب نیر اعظم۔ اور عطیہ بخش تمام عالم۔ اور مربّی بادشاہوں کا ہے۔ اور جو با اقبال بادشاہ ہوئے ہیں۔ وہ اس کی عظمت کو رواج دیتے رہے ہیں۔ اس قسم کی رسمیں ہمایوں کے عہد میں بھی جاری تھیں کیونکہ چنگیزی ترکوں کا تورہ تھا۔ وہ قدیم سے نوروز کو عید مناتے تھے۔ اور عوان یغما لگا کر لوٹتے لٹاتے تھے۔ اسلام میں بھی ہر بادشاہ نے کہیں کم کہیں زیادہ اسے عید کا دن سمجھا ہے۔ اور فی الحقیقت جس دن سے اکبر تخت پر بیٹھا تھا۔ اس مبارک دن کو عالم کی عید سمجھ کر جشن کرتا تھا۔ اس کے رنگ کے موافق سارا دربار رنگین ہوتا تھا۔ ہاں اب وہ ہندوستان میں تھا۔ اس لئے ہندوستان کی ریت رسمیں بھی برت لیتا تھا ॰

برہمنوں سے تسخیر آفتاب کا منتر سیکھا۔ کہ نکلتے وقت اور آدھی رات کو اُسے جپا کرتا تھا۔ دیپ چند راجہ مجھولہ نے ایک جلسہ میں کہا۔ کہ حضور اگر گائے خدا کے نزدیک واجب التعظیم نہ ہوتی تو قرآن میں سب سے پہلے اس کا سورہ کیوں ہوتا۔ اس کے گوشت کو حرام کر دیا۔ اور تاکید سے کہ دیا کہ جو

مار لیگا۔ مارا جائے گا۔ حکما طب کی کتابیں لے کر تائید کو حاضر ہوئے کہ اس کے گوشت سے ہزار رنگ کے مرض پیدا ہوتے ہیں۔ سردی اور دیر ہضم ہے۔ آزاد۔ مُلّا صاحب اس کی باتوں کو جس طرح چاہیں بدرنگ کر کے دکھائیں۔ وہ حقیقت میں اسلام کا منکر بھی نہ تھا۔ چنانچہ میر ابوتراب میر حاج ہو کر مکّہ کو گئے تھے۔ وہ ۹۸۶ھ میں پھر کر آئے۔ اور ایک ایسا بھاری پتھر لائے کہ ہاتھی سے بھی نہ اُٹھے۔ جب قریب پہنچے۔ تو لکھا کہ فیروز شاہ کے عہد میں قدم شریف آیا تھا حضور کے عہد مقدس میں فدوی یہ پتھر لایا ہے۔ اکبر سمجھ گیا تھا۔ کہ سید سادہ لوح نے سوداگری کی ہے۔ مگر اس لئے کہ خاص و عام میں اس بیچارے کی ہنسی نہ ہو۔ اور جو لوگ مجھے انکار نبوت کی تہمتیں لگاتے ہیں۔ ان کے دانت ٹوٹ جائیں۔ اس لئے حکم دیا کہ آداب الہیٰ کے ساتھ دربار آراستہ ہو۔ سید موصوف کو فرمان پہنچا کہ چار کوس پر توقف کرو۔ شہزادوں اور تمام امیروں کو لے کر پیشوائی کو گئے۔ دور سے پیادہ ہوئے۔ نہایت ادب اور عجز و نیاز سے خود اسے کندھا دیا۔ اور چند قدم چل کر فرمایا۔ کہ امرائے خوش اعتقاد اسی طرح دربار تک لائیں۔ اور پتھر میر ہی کے گھر پر رکھا جائے +

مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ ۹۸۸ھ میں قیامت آگئی اور یہ موقع وہ تھا کہ سب طرف سے خاطر جمع ہو گئی تھی۔ تجویز ہوئی کہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ کہا کریں۔ پھر بھی لوگوں کے شور شرابے کا خیال تھا۔ اس لئے کہتے تھے۔ کہ باہر نہیں۔ محل میں کہا کرو۔ عوام کالانعام کی زبانوں پر اللہ اکبر کے سوا وظیفہ نہ تھا۔ اکثر اشخاص سلام علیک کی جگہ اللہ اکبر۔ جواب میں جل جلالہ کہتے تھے۔ ہزاروں روپے اب تک موجود ہیں۔ جن کے دونوں طرف یہی سکہ منقوش ہے۔ گو کہ جاں نثار اور باوفا۔ بااعتبار گنے جاتے تھے۔ مگر صلاح ہوئی۔ کہ پہلے ان میں سے کوئی ابتدا کرے۔ چنانچہ قطب الدین خان کوکہ کو مذہب تقلیدی چھوڑنے کے لئے اشارہ ہوا۔ وہ سیدھا سپاہی تھا۔ اس نے خیر اندیشی و دلسوزی کے رنگ میں ظاہر کیا۔ کہ ولایتوں کے بادشاہ یعنی سلطان روم وغیرہ سن کر کیا کہیں گے۔ سب کا یہی دین ہے۔ خواہ تقلیدی ہے خواہ نہیں ہے۔ بادشاہ نے بگڑ کر کہا۔ ہاں! تو سلطان روم کی طرف سے غائبانہ لڑتا ہے۔ اپنے لئے جگہ پیدا کرتا ہے۔ کہ یہاں سے جائے تو وہاں عزت پائے۔ جا وہیں چلا جا۔ شہباز خان کمبو نے بھی تیز و تند سوال جواب کئے بیربر موقع تاک کر کچھ بولے۔ انہیں تو اس نے اس سختی سے دھمکایا کہ صحبت بدمزہ ہو گئی۔ اور امرا آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ بادشاہ نے شہباز خان کو خصوصاً اور اوروں کو عموماً کہا کیا بکتے ہو۔ تمہارے مُنہ پر گو میں جوتیاں بھر کر لگواؤں گا۔ مُلّا شیری نے اس عالم میں ایک قصیدہ کہا کہ اس کے

چند اشعار ان کے حال میں لکھے ہیں:۔

انہی دنوں میں قرار پایا کہ جو شخص دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہو۔ چاہئے کہ اخلاص چارگانہ رکھتا ہو ترک مال۔ ترک جان۔ ترک ناموس۔ ترک دین۔ ان میں سے جو چاروں رکھتا ہے وہ پورا ہے۔ ورنہ پون۔ آدھا۔ چوتھائی۔ جیسا ہوگا ویسا اُس کا اخلاص ہوگا۔ سب مخلص مرید درگاہ ہو گئے کہ ان کا دین دین الٰہی اکبر شاہی تھا۔ ہدایت اور ترویج مذہب اور تعلیم مسائل کے لئے خلیفہ بھی تھے ان میں سے خلیفہ اوّل شیخ ابوالفضل تھے۔ جو شخص دین الٰہی میں آتا تھا وہ اقرار نامہ لکھ کر دیتا تھا۔ اسکا انداز یہ تھا۔ منکہ فلاں ابن فلاں باشم۔ بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم۔ ابرا و تبرا نمودم۔ و در دین الٰہی اکبر شاہی درآمدم۔ و مراتب چہارگانہ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم ٭ اس دین میں بڑے بڑے عالیشان امیر اور صاحب ملک فرمانروا داخل ہوتے تھے۔ چنانچہ مرزا جانی حاکم ٹھٹھ بھی حلقۂ ارادت میں آیا خطوط مذکورہ ابوالفضل کے سپرد ہوتے تھے کہ جس جس کا جیسا اعتقاد ہو برابر ترتیب دے رکھو۔ شیخ موصوف مجتہد اور خلیفہ دین الٰہی کے تھے اس طریقے کا نام توحید الٰہی اکبر شاہی تھا۔

امرا میں سے جو اشخاص دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوئے ان کی تفصیل کتابوں کے انتخاب سے حسب ذیل معلوم ہوتی ہے:۔

۱۔ ابوالفضل خلیفہ
۲۔ فیضی ملک الشعرائے دربار
۳۔ شیخ مبارک ناگوری
۴۔ جعفر بیگ آصف خاں مورخ اور شاعر
۵۔ قاسم کابلی شاعر
۶۔ عبدالصمد مصوّر دربار اور شاعر
۷۔ اعظم خاں کوکہ سے آکر
۸۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی
۹۔ صوفی احمد
۱۰۔ صدر جہاں مفتی کل ممالک ہندوستان اور
۱۱، ۱۲ } ان کے دونو صاحبزادے
۱۳۔ میر شریف املی
۱۴۔ سلطان خواجہ صدر
۱۵۔ مرزا جانی حاکم ٹھٹھ
۱۶۔ نقی شوستری شاعر و دو صدی منصبدار
۱۷۔ شیخ زادہ گوسالہ بنارسی
۱۸۔ بیربر

اسی سلسلہ میں مُلا صاحب کہتے ہیں ایک دن جلسۂ مصاحبت میں کہا کہ آج کے زمانہ میں بڑا عقلمند کون ہے۔ بادشاہوں کو مستثنیٰ کرو اور بتاؤ حکیم ہمام نے کہا میں تو یہ کہتا ہوں

کر سب سے زیادہ میں عقلمند ہوں۔ ابوالفضل نے کہا۔ میرا باپ بڑا عقلمند ہے۔ اس قسم کے کلمات سے ہر شخص نے اپنی عقلمندی ظاہر کی ؟

اکبر کی ساری تاریخ میں یہ آئین آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ کہ باوجود ان سب باتوں کے اِس سال میں اُس نے صاف حکم دے دیا کہ ہندوؤں کا جزیہ معاف کیا جائے۔ اور یہ کئی کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی تھی ؟

معافی جزیہ

پہلے بھی بعض بعض بادشاہ ہندوؤں سے جزیہ لیتے رہے تھے۔ سلطنت کے انقلابوں میں کبھی موقوف ہوتا تھا۔ کبھی مقرر ہوجاتا تھا۔ جب اکبر کی سلطنت نے استقلال کپڑا تو ملاؤں نے پھر یاد دلایا چنانچہ مُلّا صاحب سنوں کے غلط ملط میں لکھتے ہیں" انہی دنوں میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو فرمایا کہ تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ لگاؤ۔ مگر پانی پر تحریر ہوا تھا۔ جھٹ ہٹ گیا " پھر ۹۸۷ھ میں چوٹ کرتے ہیں " تمغا یعنی محصول اور جزیہ کہ کئی کروڑ کی آمدنی تھی۔ اس سال میں موقوف کر دیا۔ اور تاکید کے ساتھ فرمان جاری ہوئے "۔ وہ اس تحریر سے لوگوں کے دلوں پر یہ پرتو ڈالتے ہیں کہ دین کی بے پروائی بلکہ اسلام کی دشمنی نے اس کے دل میں حرارت دینی کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اب حقیقت حال سنو کہ اول سنہ ۹ جلوس میں اکبر کو معافی جزیہ کا خیال آیا تھا۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ کچھ بے پروائی کچھ بے اختیاری حکم جاری نہ ہوا۔ سنہ ۹ جلوس میں پھر اس مقدمہ پر بحث ہوئی۔ علمائے دیندار کا زور پورا پورا تھا۔ اس لئے قیل و قال ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ شریعتِ اسلام کا حکم ہے ضرور لینا چاہیے چنانچہ کہیں اس پر عمل ہوا۔ کہیں نہ ہوا۔ ۹۸۳ھ ۲۵ جلوس میں بادشاہ صلاح اندیش پھر اس عزم پر مستقل ہوا۔ اور کہا کہ عہدِ سلف میں جو یہ امر تجویز کیا گیا تھا۔ سبب یہ تھا کہ ان لوگوں نے اپنے مخالفوں کے قتل اور غارت کو مصلحت سمجھا تھا۔ چنانچہ اس نظر سے کہ ظاہری انتظام قائم رہے۔ یعنی جو ہاتھ کے نیچے ہیں۔ وہ دبے رہیں۔ جو باہر ہیں اُن پر دباؤ پہنچے۔ اور اپنی ضروریات کے لئے سامان ہاتھ آئے کچھ روپیہ قرار دیا اور اس کا نام جزیہ رکھا۔ اب کہ ہماری خیر اندیشی اور کرم بخشی اور رحمت عام سے غیر مذہب اشخاص یک جہتان ہمدین کی طرح کمر باندھ کر رفاقت پر جان دیتے ہیں۔ اور خیر خواہی اور جانفشانی میں جاں نثاری کی حد سے گزر گئے ہیں۔ کیونکر ہو سکتا ہے اہلِ خلاف سمجھ کر انہیں بے عزت

ف غالباً ۹۸۳ھ ہوں ؟

اور قتل و غارت کیا جائے اور ان جاں نثاروں کو مخالف قیاس کیا جائے۔ ان لوگوں پر کہ جن کی پہلی نسلوں میں اور ہماری اصلوں میں عداوت چلی آتی تھی۔ دبے ہوئے خون جو خدا جانے کس طرح خاک پر گرے تھے مگر اب ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ انہیں دمبدم جگانا اور گرمانا کیا ضرور ہے اصل بات تو یہ ہے کہ بڑا سبب جو بیر لینے کے لئے یہ تھا کہ سلطنتوں کے منتظم اور معاون سامان اور اسباب دنیوی کے محتاج تھے۔ اس ذریعے سے معاش میں وسعت پیدا کرتے تھے۔ اب ہزاراں ہزار زرنقد خزانہ میں موجود ہے۔ بلکہ آستانۂ اقبال کے ایک ایک ملازم کو بے ضرورتی سے بڑھ کر فارغ البالی حاصل ہے۔ پھر منصف دانا کوڑی کوڑی چننے کے لئے کیوں نیت بگاڑے اور نہیں چاہئے کہ موہوم فائدہ کے لئے اقدِ نقصان پر تیار ہو بیٹھے۔ **آزاد**۔ اگرچہ دینے والوں کو پیسے آنے۔ یا کچھ روپے دینے پڑتے تھے۔ مگر فرمان جاری ہوتے ہی گھر گھر خبر پہنچ گئی۔ اور زبان زبان پر شکرانے جاری ہو گئے۔ ذرا سی بات نے دلوں اور جانوں کو مول لے لیا۔ یہ بات ہزاروں خزانے بہانے اور لاکھوں لونڈی یا غلام بنانے سے نہ حاصل ہوتی۔ ہاں مسجد نشین ملا نے جنھوں نے مسجدوں میں بیٹھ کر پیٹ پالے اور کتابوں کے لفظ یاد کر لئے تھے۔ ان کے کان میں آواز گئی کہ آتا ہوا روپیہ بند ہوا۔ جان تڑپ گئی ایمان لوٹ گئے ٭

لطیفہ۔ ایک جلسہ میں کوئی ملا نے صاحب بھی آ گئے۔ گفتگو یہ تھی۔ کہ مولویوں کو (سیاق) حساب میں لیاقت کم ہوتی ہے۔ ملا نے صاحب الجھ پڑے۔ ایک شخص نے کہا۔ اچھا بتاؤ۔ دو اور دو کے ملا کھرا کے بولے چار روٹیاں۔ پناہ بخدا۔ یہ مسجدوں کے فرمانروا۔ دن کا کھانا دوپہر ڈھلے۔ اور رات کا کھانا آدھی بجے کھاتے ہیں کہ شاید کوئی اچھی چیز آ جائے۔ اور اور اچھی چیز آ جائے۔ اور اس سے بھی اچھی چیز آ جائے۔ اور شاید کوئی بلانے ہی آ جائے۔ آدھی بجے رات کے گھڑیاں گنتے ہیں اور بیٹھے رہتے ہیں۔ ہوا سے کنڈی ہلی اور دروازہ کو دیکھنے لگے۔ کہ کوئی کچھ لایا۔ مسجد میں بلی کی آہٹ ہوئی اور چونکتے ہوئے کہ دیکھیں کیا آیا۔ اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا و عذاب الآخرۃ۔ ایسے لوگ مصالح سلطنت کو کیا سمجھیں۔ انہیں کیا خبر کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اس کا نمو کیا ہے ایک ایسے ہی مقام پر ابوالفضل نے کیا خوب لکھا ہے ؎

تو خود مے نشنوی بانگ دہل را		رموز سر سلطاں را چہ دانی
ترا از کاف کوفت ہم خبر نیست		خطا بتھانے ایماں را چہ دانی

پھر ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ابھی ۹۹۰ھ ہوئے تھے جو لوگوں نے ذہن نشین کیا تھا ہو چکے

مذہب اسلام کا دور ہو چکا۔ اب دین نیا ہوگا۔ چنانچہ دین الٰہی اکبر شاہی کو کہ احکام حکمت پر مشتمل تھا جلوہ دینا شروع کیا۔ اسی سنہ میں حکم دیا کہ سکوں میں سنہ الف منقوش ہو۔ اور تاریخ الفی تصنیف ہوئی۔ زمین بوسی کے نام سے سجدہ قائم ہوا کہ بادشاہوں کے لئے لازم ہے۔ شراب کا بند کھل گیا مگر اس میں بھی ایک آئین تھا کہ بقدر فائدہ ہو۔ بیماری میں حکیم بتائے تو پیو۔ اتنی نہ پیو کہ بدمستیاں کرتے پھرو اور ایسا ہو تو سزا بھی سخت تھی۔ دربار کے پاس ہی آبکاری کی دوکان تھی نرخ سرکار سے مقرر تھا جسے درکار ہوئی وہاں گیا۔ رجسٹر میں اپنا۔ باپ کا دادا کا نام۔ قومیت وغیرہ وغیرہ لکھوائی۔ اور لے آیا۔ مگر یار لوگ کسی گم نام کو بھیج دیتے تھے۔ فرضی نام لکھوا کر منگاتے تھے۔ اور شیر مادر کی طرح پیتے تھے۔ خواجہ خاتون دربان اس کا داروغہ تھا۔ یہ بھڑوا بھی اصل میں کلال ہی کی نسل تھا اس احتیاط پر بھی شور شرابے ہوتے تھے سر پھوٹتے تھے۔ دار القضا سے سخت سزائیں ملتی تھیں۔ مگر خاطر میں کون لاتا تھا۔

لطیفہ۔ لشکر خاں میر بخشی ایک دن شراب پی کر دربار میں آیا اور بدمستی کرنے لگا۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ گھوڑے کی دُم سے بندھوایا۔ اور لشکر خاں کو لشکر میں تشہیر کیا۔ سب نشے ہرن ہو گئے۔ ان ہی لشکر خاں کو عسکر خاں خطاب ہوا۔ لوگوں نے استر خاں بنا دیا (واہ چغر خاں)

لطیفہ۔ مُلّا صاحب کے رونے کا مقام تو یہ ہے کہ ۹۹۶ھ کے جشن میں دربارِ خاص تھا شراب کا دور چل رہا تھا۔ کہ میر عبد الحی صدر جہاں مفتی کل ممالک ہندوستان نے اپنے دلی شوق و ذوق سے جام طلب کر کے نوش جان فرمایا۔ اکبر نے مسکرا کر خواجہ حافظ کا شعر پڑھا ؎

در عہد بادشاہ خطا بخش جُرم پوش قاضی پیالہ کش شد و مفتی قرابہ نوش

حضرتِ صدر جہاں کا حال دیکھتے ہیں۔ یہی بزرگوار حکیم ہمام کے ساتھ عبد اللہ خاں ازبک کے دربار میں برسم سفارت بھیجے گئے تھے۔ اور مراسلت میں جو فقرے اُن کی شان میں نازل ہوئے تھے یہ ہیں۔ سیادت مآب۔ نقابت نصاب میر صدر جہاں از جملہ اعاظم سادات کبار داجلہ اتقیائے این دیار۔ زمانہ کی تاثیر کو دیکھو کہ اہل عالم کا کیا حال کر دیا تھا اور اکبر کی اس میں کیا خطا تھی سُبحان اللہ کسی استاد نے کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے ؎

عشقت خبر ز عالم بیہوشی آورد	اہلِ صلاح را بہ قدح نوشی آورد
یادِ تو اے نگار چہ معجون حکمت است	کز ہر چہ خواندہ ایم فراموشی آورد

بازاروں کے برآمدوں میں رنڈیاں اتنی نظر آنے لگیں کہ آسمان پر اتنے تارے بھی نہ ہونگے۔

خصوصاً دارالخلافہ ہیں۔ ان سب کو شہر کے باہر ایک جگہ آباد کیا۔ اور **شیطان پورہ** نام رکھا۔ اس کے لئے بھی آئین تھے۔ داروغہ۔ منشی۔ چوکیدار موجود۔ جو کسی رنڈی کے پاس آکر رہتا۔ یا گھر لے جاتا نام کتاب میں لکھوا جاتا۔ بے اس کے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ رنڈیاں نئی نوچی کو نہ بٹھا سکتی تھیں ہاں کوئی امیر چاہے۔ تو حضور میں اطلاع ہو۔ پھر لے جائے۔ پھر بھی اندر ہی اندر کام ہو جاتے تھے۔ پتہ لگ جاتا تو اُس رنڈی کو خود الگ بلاتے اور پوچھتے کہ یہ کام کس کا گزار کا تھا۔ وہ بتا بھی دیتی تھیں معلوم ہوتا تھا تو اس امیر کو خلوت میں بلا کر خوب لعنت ملامت کرتے۔ بلکہ بعضوں کو قید بھی کر دیا آپس میں بھی بڑے شور و شر ہوتے تھے۔ سر پھوٹتے تھے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹتے تھے۔ مگر تماشا کون تھا۔ ایک دفعہ یہاں بیربر جی کی بھی چوری پکڑی گئی۔ جاگیر پر بھاگ گئے۔

داڑھی جو مسلمانوں میں نورِ الٰہی کہلاتی ہے۔ بڑی خوار ہوئی۔ سبزۂ رخسار کی جڑ پتال سے ڈھونڈ کر نکالی۔ جہاں سے اُسے پانی پہنچتا ہے۔

لطیفہ۔ علما میں ایک مشائخ تھے۔ اور خاص حضرت شیخ مان پانی پتی کے بھتیجے تھے اپنے عم بزرگوار کے کتب خانہ میں سے ایک کرم خوردہ کتاب لے کر تشریف لائے۔ اس میں سے حدیث دکھائی کہ آنحضرت کی خدمت میں ایک صحابی تشریف لائے۔ بیٹا ساتھ تھا اُس کی داڑھی منڈی ہوئی تھی۔ آنحضرت نے دیکھ کر فرمایا کہ اہل بہشت کی ایسی ہی صورت ہوگی۔ بعض جعلساز فقیہوں نے کتب فقہ سے یہ فقرہ جواز کی سند میں نکالا کما یفعلہ بعض القضات بعصات کو ظالموں نے قضات پڑھ دکھایا۔ غرض تمام دربار منڈ کر صفاچٹ ہو گیا۔ اہلِ ایران و توران جن کی داڑھیوں کی خوبصورتی تصویر کا عالم دکھاتی تھی۔ اُن کے رخسارے میدان لق و دق نظر آنے لگے۔

مُلّا صاحب پھر چوٹ فرماتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ ۱۰ جانور ہیں جن کی صورت میں خدا نے ظہور کیا ہے۔ ایک ان میں سے سُؤر ہے۔ بادشاہ نے بھی اس کا خیال کیا اور زیر جھروکہ اور بعض مقامات میں جدھر یہ لوگ اشنان کو آتے تھے سُؤر پلوائے کُتّے کے فضائل میں یہ دلیل پیش ہوئی کہ اس میں ۱۰ خصلتیں ایسی ہیں کہ ایک بھی انسان میں ہو تو ولی ہو جائے۔ بعض مقربان درگاہ نے کہ خوش طبعی اور ہمہ دانی اور ملک الشعرائی سے ضرب المثل ہیں۔ چند کُتّے پالے۔ گود میں بٹھاتے تھے۔ دسترخوان پر ساتھ کھلاتے تھے۔ منہ چومتے تھے اور بعض مردود شاعر ہندی و عراقی فخر سے اُن کی زبانیں منہ میں لیتے تھے۔ سند کے لئے ایک صوفی شاعر کا یہ قول تھا ؎

	بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے رامم تو ئی	ہر کہ آید در نظر از دور پندارم تو ئی	

شیخ فیضی کے کتوں پر ملا صاحب ہمیشہ تاک باندھے بیٹھے ہیں جہاں موقع پاتے ہیں ایک پتھر کھینچ مارتے ہیں۔ دیکھو یہاں بھی منہ مارا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شکار کے ذوق شوق میں اکثر شاہان و امرا کتوں کا بھی شوق رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ ترکستان اور خراسان میں رسم عام ہے اکبر نے بھی کتے رکھے تھے۔ قاعدہ ہے کہ جس بات کا بادشاہ کو شوق ہوتا ہے۔ امرائے قربت پسند کو اس کا شوق واجب ہوتا ہے۔ اِس لیئے فیضی نے بھی رکھے ہونگے۔ ملا صاحب چاہتے ہیں ثابت کریں کہ وہ فرض مذہبی سمجھ کر کتے پالتا تھا۔

لطیفہ۔ مطلع مذکورۂ بالا کہ کر مجھے یاد آیا کہ شاعر نے جب یہ مطلع جلسۂ احباب میں پڑھا۔ اور کہا ع ہر کہ آید در نظر از دُور پندارم تو ئی۔
تو ایک شوخ طبع شخص نے کہا۔ آ نجا۔ اگر سگ بنظر آید؟ اُس نے کہا۔ پندارم تو ئی۔

جب زبانیں کھل جاتی ہیں اور خیالات کے میدان وسیع ہوجاتے ہیں تو ایک عقلی بات میں ہزار بے عقلی کی باتیں نکلنے لگتی ہیں چنانچہ ملا صاحب فرماتے ہیں اور بجا فرماتے ہیں۔ دربار میں تقریریں ہوتی تھیں کہ غسل جنابت کی کیا ضرورت ہے۔ اِس سے تو انسان اشرف المخلوقات کی بنیاد قائم ہوتی ہے جس سے اہلِ علم۔ صاحب فضل پاک خیال نیک بنیاد لوگ پیدا ہوتے ہیں اس سے آدمی ناپاک ہوجائے؟ اس کے کیا معنی بلکہ حق پوچھو تو غسل کر کے اس کی بنیاد رکھنی چاہیئے۔ اور یہ کیا بات ہے کہ اتنی سی چیز کے نکلنے میں غسل واجب ہوجائے۔ اس سے دس میں حصہ زیادہ کثافتیں دن بھر میں کئی کئی دفعہ نکل جائیں۔ اس پر کچھ بھی نہ ہو۔

کوئی کہتا تھا کہ شیر اور سؤر کا گوشت کھانا چاہیئے کہ بہادر جانور ہیں۔ کھانے والے کی طبیعت میں ضرور بہادری پیدا کرتا ہوگا۔

کوئی کہتا تھا کہ چچا اور ماموں کی اولاد کے ساتھ قرابت نہ کرنی چاہیئے کہ رغبت کم ہوتی ہے اِس واسطے اولاد ضعیف ہوگی۔ آزاد۔ دانایانِ فرنگ نے بھی لکھا ہے۔ انسان کی طبیعت میں داخل ہے کہ جس خون سے خود پیدا ہوا ہے اُسی خون کی نسل پر وہ شوق کا جوش اور رغبت کا ولولہ نہیں ہوتا جو غیر خون پر ہوتا ہے۔ دیکھو خچر میں گھوڑی سے زیادہ زور ہوتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ جب تک بیٹا ۱۶ برس کا اور بیٹی ۱۴ برس کی نہ ہوجائے۔ تب تک نکاح جائز نہیں۔ اولاد کمزور ہوگی۔

شادی

ابوالفضل آئینِ اکبری میں جو لکھتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کتخدائی میں نسلِ انسان کی بقا اور بزمِ دُنیا کی زیبائش اور ڈانواڈول دلوں کی بہرہ داری اور گھر کی آبادی ہے۔ اور بادشاہ نیک روزگار چھوٹے بڑوں کا پاسبان۔ اِس لئے شادی کے معاملے میں نسبت معنوی اور ذات کی ہمسری کو نہیں چھوڑتا۔ چھوٹی عمر دولہا دُلہن اُسے پسند نہیں عمدہ فائدہ نہیں۔ نقصان بڑا ہے۔ اکثر مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ گھر نہیں بستے۔ ہندوستان قبرستان ہے۔ بیاہی ہوئی عورت دوسرا خاوند کر نہیں سکتی تو کام مشکل ہوتا ہے۔ دولہا دُلہن اور دونوں کے ماں باپ کی خوشی لازم سمجھتا ہے قریب کے رشتہ داروں میں نامناسب سمجھتا ہے۔ اور جب دلیل میں ابتدائے عالم کا حال بیان کرتا ہے کہ دیکھو جڑواں لڑکی اس کے ساتھ کے لڑکے سے نہ بیاہی جاتی تھی تو معترض لوگوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں مہر کی زیادتی کو پسند نہیں کرتا۔ کہ جھوٹ اقرار کرنا پڑتا ہے۔ دیتا کون ہے۔ کہتا تھا کہ مہر کا بڑھانا پیوند کا توڑنا ہے ایک جورو سے زیادہ پسند نہیں کرتا کہ طبیعت کی پریشانی اور گھر کی ویرانی ہوتی ہے۔ بڈھے کو جوان نہ کرنی چاہیئے کہ بیحیائی ہے۔ دو آدمی بادیانت کم لالچ مقرر کئے تھے۔ ایک مردوں کی تحقیقات کرتا تھا۔ دوسرا عورتوں کی۔ توے بیگی کہلاتے تھے اور اکثر دونوں خدمتیں ایک ہی کے سپرد ہوتی تھیں۔ شکرانہ میں طرفین کو نذرانہ بھی دینا ہوتا تھا۔

پنجہزاری سے ہزاری تک	۱۰ اشرفی	ترکش بند سے دہ باشی تک اور	۴ روپے
ہزاری سے پانصدی تک	۴-۴ اشرفی	اور منصبدار	
پانصدی سے دوصدی تک	۲ اشرفی	متوسط اشخاص	یک روپیہ
دوصدی سے دوبیستی تک	۱ اشرفی	عام	یک دام

اب یہ عالم ہو گیا کہ امرائے دربار تو بالائے طاق رہے۔ وہی صدر جہاں مفتی الممالک تھے جنہوں نے جشنِ نوروزی میں بادۂ گلرنگ کا جام لیکر پیا۔ حریر اطلس کے کپڑے پہننے لگے۔ مُلّا صاحب نے ایک دن ان کا لباس دیکھکر پوچھا کہ کوئی روایت نظر سے گزری ہوگی؟ فرمایا ہاں جس شہر میں رواج ہو جائے۔ جائز ہے میں نے کہا شاید اس روایت پر بنیاد ہوگی کہ حکم سلطان سے عدول مکروہ ہے فرمایا اِسکے علاوہ بھی مُلّا مبارک ایک عالم تھے۔ ان کا بیٹا شیخ ابوالفضل کا شاگرد تھا۔ اُس نے بڑے تمسخر کے ساتھ ایک رسالہ لکھکر پیش کیا کہ نماز روزہ حج وغیرہ عبادتیں

سب بے حاصل۔ ذرا انصاف کرو جب عالموں کا یہ حال ہو تو بے علم بادشاہ کیا کرتے؟
مریم مکانی بادشاہ کی والدہ مر گئیں۔ امرائے دربار وغیرہ ۱۵ ہزار آدمیوں نے بادشاہ کے ساتھ بھدرہ کیا۔ اناؔ یعنی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خاں کی ماں مر گئی۔ اُس کا بڑا ادب تھا اور نہایت خاطر کرتے تھے۔ خود اور خانِ اعظم نے بھدرہ کیا۔ خبر پہنچی کہ لوگ بھی بھدرہ کروا رہے ہیں۔ کہلا بھیجا کہ اوروں کو کیا ضرور ہے۔ اتنی دیر میں بھی ۴ سو سر اور مُنہ صفا چٹ ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باتیں ایک کھیل تھیں۔ اور ہزاروں مسخراپن ہیں۔ یہ بھی ایک دل لگی سہی۔ اس میں دین و مذہب کا کیا علاقہ۔ مُلّا صاحب خواہ مخواہ خفا ہوتے ہیں۔ آپ نے جب اپن بجانی سیکھی تھی تو نماز کی طرح واجب سمجھ کر سیکھی تھی؟ ہرگز نہیں ایک دل بہلاوا تھا۔ ان لوگوں نے ایسی باتوں کو دربار کا مشغلہ سمجھ لیا تھا۔

اکبر کو اس بات کا لحاظ بھی ضرور تھا کہ یہ ملک ہندوستان ہے۔ ہندوؤں کو یہ خیال نہ ہو کہ ہم پر ایک متعصب مسلمان حکومت کر رہا ہے اس لئے سلطنت کے آئین اور مقدمات کے احکام میں بلکہ روزمرہ کاروبار میں اس مصلحت کی رعایت ضرور ہوتی ہوگی۔ اور ایسا ہی چاہیئے تھا۔ خوشامدیوں سے کوئی زمانہ خالی نہیں اسے بھی خوشامدیں کرکے بڑھاتے چڑھاتے ہونگے۔ اپنی بڑائی یا دانائی کی تعریف یا اس کا لحاظ کسے بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ وہ بھی ان باتوں سے خوش ہوتا تھا۔ اور اعتدال سے بڑھ بھی جاتا تھا۔ اور وہ تو بے علم بادشاہ تھا علما و مشائخ کے حالات سُن چکے؟

مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ تحریروں میں سنہ ہجری موقوف ہو گیا۔ سنہ الٰہی اکبرشاہی تحریر ہونے لگا۔ آفتاب کے حساب سے برس میں ۱۴ عیدیں ہونے لگیں۔ نوروز کی دھوم دھام عید رمضان و عید قربان سے بھی زیادہ ہونے لگی اسکی تفصیل مکمل توضیح سُن چکے مگر لطیفہ یہ ہے مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ بادشاہ حروف مختصہ عربی مثلاً ث ح ع ص ض ط وغیرہ جن میں امتیاز ضرور ہوتا ہے ان سے بھی گھبراتے تھے۔ **آزاد**۔ بزرگانِ عالم نما کو اکثر دیکھا ہوگا کہ باتوں میں بھی ع اور ح کو خواہ مخواہ حلق بلکہ پیٹ کے اندر سے نکالتے ہیں۔ خصوصاً جو ایک دفعہ حج بھی کر آئے ہوں۔ دربار میں ایسوں کی گفتگو پر اشارے ضرور ہوتے ہونگے۔ مُلّا صاحب اس پر خفا ہو کر فرماتے ہیں اگر عبداللہ کو ابداللہ اور احدی کو اہدی کہتے تھے تو بادشاہ خوش ہوتے تھے اور منشیان دفتر الٰہ آباد کو بھی الہ باس لکھتے تھے؟

آغاز اسلام میں جبکہ چاروں طرف فتوحات دین کی روشنی پھیلتی چلی جاتی تھی۔ ایران پر بھی فوج اسلام آئی ہوئی تھی۔ فارس کا ملک تسخیر ہوتا جاتا تھا۔ ہزاروں برس کی پُرانی سلطنت تباہ ہو رہی تھی۔ فردوسی نے اس حالت کو نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ چنانچہ خسرو کی ماں کی زبانی جو اشعار

لکھے ہیں۔ اُن میں سے دو شعر ہیں ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسیداست کار	
کہ تخت کیاں را کند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو	

ملّا صاحب فرماتے ہیں۔ان شعروں کو پڑھوا کر خوش ہوتے ہیں۔اور جو مسائل کہ اسلام میں عقاید قرار پا چکے ہیں۔ان کی تحقیقاتیں اور اُس پر ردّ و قدح ہوتی ہے۔عقلی دلائل سے گفتگو ہوتی ہے علمی مجلس ہوتی ہے۔اور مصاحبوں میں سے ۱۲ آدمی منتخب ہوتے ہیں۔حکم ہے۔کہ جو شخص چاہے۔سوال کرے اور ہر علم میں گفتگو ہو۔اگر کسی مسئلے پر مذہب کی رُو سے سوال ہو۔تو کہتے کہ اسے ملّاؤں سے پوچھو۔ہم سے وہ پوچھو۔جو عقل و حکمت سے متعلق ہو۔اگر کسی بزرگ کے کلام سے سند دیں۔تو صاف نامقبول کہ وہ کون تھا؟ وہ تو فلاں فلاں موقع پر خود ایسا تھا۔اور ایسا تھا اس نے خود فلاں مقام پر یوں کہا۔اور یوں کہا اور ایسا کیا۔ویسا کیا۔انہی باتوں کے جا بجا مدرسوں اور مسجدوں میں چرچے ہیں۔

۹۹۶ھ کے جشن میں عجب عجب آئین ایجاد ہوئے۔خود ماہ آبان میں اتوار کو پیدا ہوئے تھے۔ حکم ہوا کہ اتوار کو تمام قلمرو میں جانور ذبح نہ ہونے پائے۔آبان کے تمام مہینے میں اور جشن نوروز کے ۱۸ دن تک ذبح بند۔جو کرے سزا پائے۔جرمانہ بھرے۔گھر لُٹ جائے۔آپ خاص خاص دنوں میں گوشت کھانا چھوڑ دیا۔یہاں تک کہ کھانے کے دن برس میں ۶ مہینے بلکہ اس سے بھی کم رہ گئے۔ اور ارادہ ہوا کہ گوشت کھانا ہی چھوڑ دیں +

آفتاب کی عبادت کے وقت دن رات میں ۴ تھے۔صبح و شام۔دوپہر۔آدھی رات۔دوپہر کو اُس کی طرف مُنہ کرتے تھے۔اور نہایت رجوع قلب کے ساتھ ایک ہزار ایک نام کا وظیفہ پڑھتے تھے۔دونوں کان پکڑ کر چک پھیری لیتے تھے۔کانوں پر مکّے مارتے جاتے تھے اور کچھ حرکتیں اور بھی ایسی ہی کرتے تھے۔تلک بھی لگاتے تھے۔حکم ہوا کہ طلوع اور آدھی رات کو نقارہ بجا کرے۔چند روز بعد حکم ہوا۔کہ ایک عورت سے زیادہ نکاح نہ کرو۔ہاں۔جو رو بانجھ ہو تو مضائقہ نہیں۔جو عورت مایوس ہو جائے۔نکاح نہ کرے۔بیوہ نکاح چاہے تو کوئی نہ روکے۔ہندو عورتیں لڑکپن میں بیوہ ہو جاتی ہیں۔وہ اور جس عورت نے مرد سے کچھ کامیابی نہ پائی ہو۔اور بیوہ ہو گئی ہو وہ ستی نہ ہو۔ہندو اس پر اٹکنے چنانچہ گفتگوئیں ہوئیں۔اُن سے کہا کہ بہت خوب اگر یہ ہے تو رنڈوے مرد بھی ستی ہوا کریں۔ضدی لوگ سوچ میں گئے۔آخر اُن سے کہا کہ خیر اگر ایسی ہی ضد پر قائم ہو تو ستی نہ ہو۔مگر اتنا ضرور ہو کہ رنڈوا جورو

نہ کرے اس کے اقرار نامے لکھ دو۔ ہندوؤں کے تہواروں کے لئے بھی حکم ہوا اور فرمان جاری ہوئے
شروع سال بکرماجیت میں بھی تبدیلی چاہی تھی۔ مگر نہ چلی۔ پلواج وارا ذل کو علم نہ پڑھائیں۔ کہ سخت
خرابیاں کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مقدمے فیصل کرنے کے لئے برہمن مقرر ہوں۔ ان کے معاملے
قاضی مفتیوں کے ہاتھ میں نہ پڑیں۔ قسم کو دیکھا۔ کہ گاجر مولی کی طرح لوگ کھائے جاتے
ہیں۔ اس لئے حکم دیا کہ لوہا گرم کر کے رکھو۔ کھولتے تیل میں ہاتھ ڈلواؤ۔ جل جائے تو جھوٹا۔ یا وہ
غوطہ مارے دوسرا آدمی تیر پھینکے۔ اس عرصے میں سر نکال دے تو جھوٹا۔ مگر ایک دو برس بعد
ستی کا آئین نہایت شدت سے جاری ہوا۔ اور حکم ہوا۔ کہ اگر عورت خود ستی نہ ہو۔ تو پکڑ کر نہ جلاویں
مسلمانوں کو تاکید ہوئی۔ کہ بارہ برس تک ختنہ نہ کرو۔ پھر لڑکے کو اختیار ہے۔ چاہے کرے۔ چاہے
نہ کرے۔ جو قسائی کے ساتھ کھانا کھائے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالو۔ اس کے گھر والوں میں کوئی کھائے
تو انگلی کتر لو ✦

اس سال میں شہر کے باہر دو عالیشان محل بنوائے۔ خیر پورہ۔ دھرم پورہ۔ ایک میں فقرائے
اسلام کے لئے کھانا پکتا تھا۔ ایک میں ہنود کے لئے۔ شیخ ابوالفضل کے آدمیوں کا اہتمام تھا۔
جوگی غول کے غول آنے لگے۔ ان کے لئے ایک اور سرا بنی۔ اس کا نام جوگی پورہ رکھا۔ رات کو چند
خدمتگاروں کے ساتھ جاتے۔ خلوت میں باتیں کرتے تھے۔ اور ان کے عقائد مذہب۔ جوگ کے اسرار
و حقائق۔ اور عبادت و اشتغال کے طریقے۔ حرکات۔ سکنات بیٹھنا۔ اُٹھنا۔ سونا۔ جاگنا۔ کایا پلٹ وغیرہ
کے کرتب ان سے حاصل کئے بلکہ کیمیاگری بھی سیکھی۔ اور سونا لوگوں کو دکھایا۔ شورانزی کی رات کو
(جوگیوں کا بڑا میلہ ہوتا ہے) ان کے گرو اور مہنتوں کے ساتھ پرشاد کھائے۔ انہوں نے کہا۔ کہ اب
آپ کی عمر معمولی عمر سے سہ چند چہار چند ہو گئی ہے۔ تماشا یہ کہ حکمتیاں دربار نے بھی اس کی تائید کی
اور کہا کہ دَورِ قمر ہو چکا اس کے احکام بھی ہو چکے۔ اب دورِ زحل شروع ہوا۔ اس کا عمل اور اس کے
احکام جاری ہونگے۔ عمریں بھی بڑھ جائیں گی۔ اتنی بات تو کتابوں سے بھی ثابت ہے کہ اگلے وقتوں میں
سیکڑوں سے لے کر ہزار ہزار برس سے زیادہ جیتے تھے۔ اور ہندوؤں کی کتابوں میں تو آدمیوں کی
عمر ا- ۰ ا ہزار برس کی لکھی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں خطائیوں کے عابد لامہ ہیں۔ ان کی
دو دو سو برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عمر ہے۔ انہی کے خیال سے کھانے پینے کے باب میں اصلاحیں
اور گوشت کے کھانے میں کمی کر دی۔ عورت کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ بلکہ جو کچھ ہوا اس پر بھی
تاسف تھا۔ تالو پر سے بال منڈوا ڈالے۔ اِدھر اُدھر رہنے دئے۔ خیال یہ تھا کہ اہل صفا کی روح

کھوپری کے رستے نکلتی ہے یہی وہم و خیال کی آمد کا رستہ ہے۔ اس وقت ایسی آواز آتی ہے۔ جیسے بجلی کڑکی اور یہ ہو تو جانو کہ مرنے والا بڑا نیک تھا۔ اور نیک انجام ہوا۔ اور اب اس کی روح کسی بادشاہ عالمگیر جہاں تسخیر کے قالب میں جائیگی۔ (جیسے سنسکرت میں چکرورتی راجہ کہتے ہیں) اپنے طریق کا نام توحیدِ الٰہی رکھا۔ مریدانِ خاص جو گیوں کی اصطلاح کے بموجب چیلے کہلاتے تھے۔ پواج۔ اراذل۔ مکار۔ رکابی مذہب جو قلعۂ معلےٰ میں قدم رکھنے کے قابل نہ تھے۔ روز صبح کو آفتاب پرستی کے وقت زیر جھروکہ جمع ہوتے تھے۔ جب تک درشن نہ کرلیں۔ مسواک۔ کھانا۔ پینا اُن پر حرام تھا۔ رات کو ہر محتاج۔ مسکین۔ ہندو۔ مسلمان۔ رنگ رنگ کے آدمی۔ مرد۔ عورت۔ اچھے۔ اپاہج سب کو اجازت تھی۔ عجب ہنگامہ ہوتا تھا۔ جب سورج کے نام جپ چکتے تھے۔ پردہ سے نکل آتے تھے۔ یہ لوگ دیکھتے ہی سجدہ میں جھک جاتے تھے۔

ان میں بارہ بارہ آدمی کی ایک ایک ٹولی باندھی تھی۔ (دیکھو اس میں بھی آئین و قانون قائم ہے) کہ جماعت جماعت مرید ہوتی تھی۔ شجرہ کی جگہ اپنی تصویر دے دیتے تھے کہ اس کا پاس رکھنا اور زیر زیارت رکھنا باعث برکت و ترقی اقبال ہے۔ ایک[1] زریں اور مرصّع غلاف میں رکھتے تھے۔ اور اس سے سر کو تاجدار کرتے تھے۔ سلطان خواجہ میر حاج مریدانِ خاص الخاص میں سے تھا۔ ملا احمد ٹھٹوی نے سلطان الخوارج[۹۹۹] اس کے مرنے کی تاریخ کہی تھی۔ مگر ایک کی کسر رہی۔ خواجہ کی قبر بھی نئے ایجاد سے تصنیف ہوئی۔ چہرے کے سامنے ایک جالی رکھی تھی۔ کہ آفتاب گناہوں سے پاک کرنے والا ہے۔ روز صبح کو اس کی شعاع مُنہ پر پڑے۔ ہونٹوں کو آگ بھی دکھائی تھی۔ حکم تھا کہ قبر میں مریدوں کے سر مشرق کو پاؤں مغرب کو رہیں۔ خود بھی سونے میں اس کی پابندی کرتے تھے۔

برہمنوں نے حضور کے لئے بھی ۱۰۰۰ نام تراشے تھے۔ کہتے تھے کہ مایا کی لیلا ہے۔ بشن۔ کشن۔ رامچندر جی وغیرہ اوتار گزرے ہیں۔ اب اس رُوپ میں پرکاش کیا ہے۔ اشلوک بنا بنا کر پڑھتے تھے۔ پُرانے پُرانے کاغذوں پر لکھے دکھاتے تھے کہ پہ انم پنڈت لکھ کر رکھ گئے ہیں کہ ایک چکرورتی راجہ اس دیس میں ہوگا۔ براہمنوں کا آدر مان۔ گؤکی رکھیا کریگا۔ دنیا کو نیاؤ سے بسائیگا۔

---

[1] ملا صاحب نے چیلوں کے آئین کو یہ لباس پہنایا ہے۔ ابوالفضل نے ۹۹۱ھ کی تجویزوں میں لکھا ہے۔ کہ اس سنہ میں لونڈی غلاموں کی آزادی کا حکم ہوا۔ کیونکر خدا کے بندوں پر انسان کی بندگی کا داغ سخت بے ادبی ہے۔ مگر بادشاہی غلام جو حضوری منظور کریں۔ وہ چیلے کہلائیں ۹۸۵ھ تک ۱۲ ہزار یکہ جوان تھے۔ (باڈی گارڈ) چند روز کے بعد احدی الخطاب ہوا۔ پچھی لوگ چیلے ہوگئے۔ آزلو۔ ایسے آقا کی غلامی جان دیکر بھی ہاتھ آئے تو سستی ہے۔ جاتا کون تھا۔ آزلو ہو کر بھی چیلے کہلاتے تھے۔ عیش کرتے تھے۔ اور بہاریں اڑاتے تھے۔ جانیں دے کر خدمتیں بجا لاتے تھے۔ دلی میں جو چیلوں کا کوچہ مشہور ہے۔ وہاں کسی زمانہ میں سلاطین چغتائیہ کے اسی نسل کے غلام زلو رہتے تھے۔

مکند برہم چاری

اکبر کے سامنے ایک پرا چین پتر اپیش ہوا کہ الہ آباس میں مکند برہم چاری کے پاس تھا۔ جس نے اپنا سارا بدن کاٹ کاٹ کر ہون کر دیا تھا۔ وہ اپنے چیلوں کے لئے اشلوک لکھ کر رکھ گیا تھا۔ اُس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ ہم عنقریب ایک بادشاہ با اقبال ہو کر آئینگے۔ اُس وقت تم بھی حاضر ہونا۔ بہت سے برہمن بھی اُس پترے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اور عرض کی کہ جب سے آج تک مہاراج پر گیان دھیان جمائے بیٹھے ہیں حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں صرف تین چار مہینے کا فرق تھا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا۔ کہ برہمن کا ملکش مسلمان کے گھر میں جنم لینا عقل میں نہیں آتا۔ عرض کی۔ کہ کرنے والے نے تدبیر میں کوتاہی نہیں کی۔ مگر تقدیر کو کیا کرے کہ اُسے خبر نہ تھی۔ ہون کی جگہ کچھ ہڈیاں اور لوہا گڑا تھا۔ جو کچھ پیش آیا اس کا اثر ہے +

مسلمانوں نے کہا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ ہم ہندؤں سے پیچھے رہ جائیں۔ حاجی ابراہیم نے ایک گمنام۔ غیر مشہور۔ کرم خوردہ کتاب کہیں کی گڑی دبی نکالی۔ اس میں شیخ ابن عربی کے نام سے ایک عبارت منقول تھی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ امام مہدی کی بہت ساری بیبیاں ہوں گی۔ اور ڈاڑھی مُنڈی ہو گی۔ اور چند ایسی ایسی باتیں اور تھیں۔ مطلب یہ کہ وہ آپ ہی ہیں +

یکہ سپاہی تھے۔ انہی کا نام احدی رکھا تھا۔ اب مریدوں کا خطاب ہوا۔ اس اُمت کے باب میں خیال تھا۔ کہ یہ اصل احدی لوگ ہیں۔ کیونکہ عالم توحید میں پورا اخلاص رکھتے ہیں۔ کوئی وقت آن پڑیگا۔ تو دریائے آب اور طوفان آتش سے بھی مُنہ نہ پھیرینگے +

مُلّا صاحب جو چاہیں سو کہیں۔ میرے نزدیک نیک نیت بادشاہ کا کچھ قصور نہیں۔ جب اہل دین خود اپنے دین و ایمان کو لاکر سامنے نثار کریں تو فرمائیے وہ کیا کرے؟ چنانچہ ملا شیری پنجاب میں صدا لصدور رہتے تھے۔ وہی ملا شیری جنہوں نے بڑے جوش ایمان خروش یقین کے ساتھ بے دینی کی شکایت میں قطعہ کہا تھا۔ اب انہوں نے آفتاب کی تعریف میں ایک ہزار ایک قطعہ کہہ کر ہزار شعاع نام رکھا۔ اس سے بڑھ کر سُنئیے۔ **لطیفہ**۔ حضرت میر صدر جہاں کی پیاس بادۂ گلرنگ سے نہ بجھی۔ چنانچہ ۱۰۰۴ھ میں مع دو فرزند برخوردار مریدان خاص میں داخل ہوئے۔ ہاتھ چومے۔ قدم لئے کرامات کی نعمت لی۔ اور خاتمۂ تقریر پہ عرض کی۔ ریش مرا چہ حکم مے شود۔ فرمودند۔ باشند۔ بہے۔ ہیچ کیا ہے؟! پھر بھی آفرین ہے۔ اس حق شناس بادشاہ کو جب سجدۂ زمین بوس آئین دربار میں داخل ہوا تو ان بزرگوار کو

اس سے مستثنیٰ کیا۔ وہ خود اپنے دل میں شرماتا ہوگا۔ کہ مفتی شریعت ہیں مسند پیغمبر پر بیٹھے ہیں۔ ان کی مہر سے چار دانگ ہندوستان میں فتوے جاری ہوتا ہے۔ تخت کے سامنے ان کا سر جھکوانا مناسب نہیں۔ اس پر اُن کی یہ کرامتیں۔ واہ ویلا۔ واہ مصیبتا۔ کوئی مجھے بتاؤ کہ وہ امر کیا تھا۔ جو اکبر کو کرنا چاہئے تھا اور اُس نے نہ کیا۔ بے دین خود اپنے دینوں کو دنیا پر قربان کئے دیتے تھے۔ اس بیچارے کا کیا گناہ +

ایک فاضل اجل کو حکم دیا۔ کہ شاہنامے کو نثر میں لکھو۔ اُنہوں نے لکھنا شروع کیا۔ جہاں نام آجاتا۔ آفتاب کو عزشانہٗ اور جلتہ عظمتہ لکھتے تھے۔ جیسے خدا کے لئے +

حضرت شیخ کمال بیابانی

اکبر کو اس بات کا بڑا خیال رہا کہ کوئی شخص صاحب کرامات نظر آئے۔ مگر ایک بھی نہ ملا۔ ۹۹۶ھ میں چند شیطان اسی شہر لاہور میں ایک بڈھے شیطان کو لائے کہ حضرت شیخ کمال بیابانی ہیں۔ انہیں دریائے راوی پر بٹھا دیا۔ کرامات یہ کہ کنارہ پر کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہیں۔ اور پل کی پل میں ہوا کی طرح پانی پر سے گزر کر پار جا کھڑے ہوتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے تصدیق کی کہ ہم نے آپ دیکھ لیا ہے۔ اور سُن لیا۔ اُنہوں نے پار کھڑے ہو کر صاف آواز دی ہے۔ کہ میاں فلانے! بس اب تم گھر جاؤ۔ بادشاہ خود اُسے لے کر دریا کے کنارے گئے۔ اور چپکے سے یہ بھی کہا۔ کہ ہم ایسی چیزوں کے طلبگار ہیں اگر کوئی کرشمہ ہمیں دکھاؤ۔ تو مال مملکت جو کچھ ہے۔ سب تمہارا بلکہ ہم بھی تمہارے۔ وہ چپ دم بخود۔ جواب کیا دے؟ کچھ ہو تو کہے تب بادشاہ نے کہا کہ اچھا اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قلعہ کے برج پر سے۔ دریا میں ڈال دو۔ اگر کچھ ہے تو صحیح سلامت نکل آئے گا۔ نہیں تو جائے جہنم کو۔ یہ سُن کر ڈر گیا اور پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ یہ سب اس دوزخ کے لئے ہے۔ رموز تاریخ کے تاڑنے والے تاڑ گئے ہوں گے کہ اُس وقت دریائے راوی کی لہریں ثمن برج کے پاؤں میں لوٹتی تھیں۔ جو آج قلعے سے دو میل پرے ہٹ گیا ہے +

بات یہ تھی کہ وہ شخص لاہوری ہی تھا۔ اس کا ایک بیٹا ڈاڑھی مُنڈا بھی ساتھ تھا۔ باپ بیٹوں کی آواز بہت ملتی تھی۔ جس سے باپ کرامات دکھانے کا وعدہ کرتا۔ بیٹا بھی نام سُن لیتا۔ اور پُل یا کشتی پر چڑھ کر پار چلا جاتا۔ جب موقع وقت ہوتا تو باپ یہاں کنارے پر گفتگو کرتا۔

اِدھر اُدھر باتیں کرتا پھرتا۔ بیٹا سامنے سے دیکھتا رہتا۔ یہ لوگوں کو جُل دے کر کنارے سے نیچے اُترتا کہ وضو کر کے عمل پڑھتا ہوں۔ وہیں اِدھر اُدھر کراڑوں میں چھپ جاتا۔ بیٹا بدذات چند لحظہ بعد اُدھر سے آواز دیتا۔ میاں فلانے جاؤ گھر کو۔ ع

	آخرش گرگ زادہ گرگ شود	

یہ حال معلوم ہوا۔ تو بادشاہ بڑے خفا ہوئے۔ اور بھکر بھیج دیا۔ اُس نے وہاں بھی جال مارا۔ کہا کہ میں ابدال ہوں۔ جمعہ کی رات لوگوں کو دکھا دیا۔ سر الگ۔ ہاتھ پاؤں الگ ✦

خان خاناں اُن دنوں مہم بھکر پر تھے۔ دولت خاں اُن کا سپہ سالار (وکیل مطلق۔ اتالیق جو کہو سو بجا) اُس کا معتقد ہو گیا۔ علاوہ بھی افغان وحشی تھا۔ خود خان خاناں نے اس دانائی و فرزانگی زیرکی و فیلسوفی کے ساتھ غوطہ کھایا۔ اس غول بیابانی نے کہا۔ حضرت خضر سے آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔ دریائے اٹک کے کنارے پر ڈیرے پڑے تھے۔ خان خاناں خود آ کر کھڑے ہوئے۔ مصاحب اور رُفقا ساتھ۔ اُس دغاباز نے غوطہ مار کر سر نکالا۔ اور کہا کہ خضر علیہ السلام آپ کو دُعا فرماتے ہیں۔ خان خاناں کے ہاتھ میں ایک سونے کی گیند تھی کہا کہ ذرا گیند دیکھنے کو مانگتے ہیں۔ اُنہوں نے دے دی۔ اُس نے وہ گیند پانی میں ڈال کر ایک اور غوطہ مارا۔ غرض اَدل بَدل کر پیتل کی گیند ہاتھ میں دے دی۔ باتوں باتوں اور ہاتھوں ہاتھوں میں سونے کی گیند اُڑا لے گیا ✦

اکبر پر حالت طاری ہو

بادشاہ نیک نیت کو ایک دن عجب واقعہ پیش آیا۔ وہ پاک پٹن سے زیارت کرتا ہوا نندنہ کے علاقہ میں پہنچا اور دامن کوہ کے جانور گھیر کر شکار کھیلنے لگا۔ چار دن کے عرصہ میں بے حساب شکار مار کر گرا دئیے۔ حلقہ سمٹتے سمٹتے ملا چاہتا تھا۔ دفعتہً بادشاہ کا دل ایسا جوش و خروش میں آیا۔ کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ عجیب جذبے کا عالم ہوا۔ کسی کو معلوم نہ ہوا۔ کہ کیا دکھائی دیا تھا۔ اُسی وقت شکار بند کیا۔ جس درخت کے نیچے یہ حالت ہوئی تھی۔ وہاں زر کثیر فقیروں اور مسکینوں کو دیا۔ اس خلوۃ غیبی کی یادگار میں ایک عمارت عالیشان بنوانے کا اور باغ لگانے کا حکم دیا۔ وہیں بیٹھ کر سر کے بال منڈوائے اور جو مصاحب بہت مقرب تھے۔ خوشامد کے اُسترے سے خود بخود مُنڈ گئے اس حالت نے عجیب مغریب رنگ سے شہروں میں شہرت پھیلائی بلکہ زندگی کے باب میں رنگ برنگ

کی ہوائیاں اُڑیں۔ بعضے مقاموں میں بدعملی بھی ہوگئی۔ خیال مذکور کا اعتقاد ایسا دل پر چھایا۔ کہ اس دن سے شکار کھیلنا ہی چھوڑ دیا +

جہاز رانی کا شوق

ایشائی بادشاہوں کو دریائی ملک گیری کا خیال بالکل نہیں ہوا۔ اور راجگان ہند کا تو ذکر ہی نہ کرو۔ کہ پنڈتوں نے سفر دریا کو خلاف مذہب لکھ دیا تھا۔ اکبر کی طبیعت کو دیکھو۔ کہ باپ دادا کے ملک کو کبھی دریا سے تعلق نہ ہوا۔ خود ہندوستان ہی میں آکر آنکھیں کھولی تھیں۔ اور خشکی کے فساد دم نہ لینے دیتے تھے۔ باوجود اس کے دریا پر نظر لڑی ہوئی تھی۔ یہ شوق اسے دو سبب سے پیدا ہوا تھا۔ اوّل یہ کہ جو قافلے سوداگروں یا حاجیوں کے جاتے اور آتے تھے۔ ان پر ڈچ اور پرتگالی جہاز دریا میں آن گرتے تھے۔ لوٹتے تھے مارتے تھے۔ آدمیوں کو پکڑے جاتے تھے۔ بالکل صلاحیت سے پیش آتے تو یہ تھا کہ اندازہ سے بہت زیادہ محصول وصول کرتے اور تکلیف بھی دیتے تھے۔ بادشاہی لشکر کا ہاتھ وہاں بالکل نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے اکبر دق ہوتا تھا +

فیضی جب دکن کی سفارت پر گیا ہے اور وہاں سے رپورٹیں کر رہا ہے۔ ان میں روم اور ایران کی خبریں جہازی مسافروں کی زبانی اس خوبصورتی سے لکھتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر انہیں بڑے شوق سے سُن رہا ہے۔ ان تحریروں میں بعض جگہ راہ دریا کی بے انتظامی کا بھی اثر پایا جاتا ہے۔ اس خیال سے وہ بندرگاہوں پر بڑے شوق سے قبضہ کرتا تھا +

اُس وقت ادھر کراچی کی جگہ ٹھٹھہ اور دکن کی جانب میں بندر گووہ۔ کمبائت اور سورت کا نام بہت کتابوں میں آتا ہے۔ دریائے راوی بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ اکبر نے چاہا تھا کہ جہاز یہاں سے چھوٹے۔ اور ملتان کے نیچے سے نکال کر سکّر سے ٹھٹھے میں پہنچا دے۔ چنانچہ اسی لاہور کے باہر ایک جہاز کا بچہ تیار ہوا۔ جس نے مستول کے رنگ میں ۲۴ گز کا قد نکالا جب بادبانوں کے کپڑے پہنا کر روانہ کیا۔ تو بعض مقاموں پر پانی کی کمی سے رُک رُک گیا جب ۱۰۰۲ھ میں ایلچی ایران کو رخصت کر کے خود ایلچی روانہ کیا۔ تو حکم دیا۔ کہ لاہور سے براہ دریا لاہری بندر میں جا اُترو اور وہاں سے سوار ہو کر سرحد ایران میں داخل ہو +

وہ زمانہ اَور تھا۔ ہوا اَور تھی۔ پانی اور تھا۔ اس پر آئے دن کی لڑائیاں اور فساد اور سب امیروں کے سینہ میں اکبر کا دل بھی نہ تھا جو اپنے شوق سے اس کام کو پورا کرتے۔ اور دریا کو

ایسا بڑھاتے کہ جہازرانی کے قابل ہو جاتا۔ اس لئے کام آگے نہ چلا +

ملک موروثی کی یاد نہ بھولتی تھی !

اکبر کے درخت سلطنت نے ہندوستان میں جڑ پکڑی تھی۔ لیکن ملک موروثی یعنی سمرقند و بخارا کی ہوائیں ہمیشہ آتی تھیں۔ اور اس کے دل کو سبزۂ تر کی طرح لہراتی تھیں یہ داغ اس کے بلکہ اس سے لیکر عالمگیر تک کے دل پر ہر وقت تازہ تھا۔ کہ بابر ہمارے دادا کو اُزبک نے پانچ پُشت کی سلطنت سے محروم کر کے نکالا۔ اور ہمارا گھر دشمن کے قبضہ میں ہے لیکن عبداللہ خاں اُزبک بھی بڑا بہادر۔ صاحب عزم۔ با اقبال بادشاہ تھا۔ ہٹانا تو درکنار اس کے حملہ سے کابل اور بدخشان کے لالے پڑے رہتے تھے۔ والیٔ کاشغر کے نام ایک مراسلہ اکبر کا دفتر ابوالفضل میں ہے۔ اُسے تم پڑھوگے تو کہوگے کہ فی الحقیقت اکبر بادشاہ سلطنت کی شطرنج کا پورا شاطر تھا۔ ملک مذکور پر بھی اُس کا خاندانی دعوےٰ تھا۔ مگر کہاں کاشغر اور کہاں ہندوستان پھر بھی جب کشمیر پر تسلّط کر لیا تو بزرگوں کا وطن یاد آیا۔ تم جانتے ہو کہ شطرنج باز جب حریف کے کسی مہرہ کو مارنا چاہتا ہے یا حریف کے ایک مُہرے کو اپنے کسی مُہرے پر آتا دیکھتا ہے تو اُسی مُہرے سے سینہ بسینہ لڑ کر نہیں مار سکتا۔ اُسے واجب ہے کہ دائیں بائیں۔ دُور نزدیک تک کہیں کہیں کے مُہروں سے اپنے مُہرے کو زور اور حریف پر ضرب پہنچائے۔ اکبر دیکھتا تھا کہ میں اُزبک پر کابل کے سوا اور کہیں سے چوٹ نہیں کر سکتا۔ کشمیر کی طرف سے ایک رستہ بدخشان کا نکلا ہے۔ اور اس کا ملک ترکستان و تاتار کی طرف دُور دُور تک پھیل گیا ہے۔ اور پھیلا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھا شمشیر اُزبک کی چمک پر کاشغر خطا ختن سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا۔ اور اُزبک اسی فکر میں ہے کہ کب موقع پائے اور اُسے بھی نگل جائے +

اکبر نے اسی بنیاد پر والیٔ کاشغر سے قرابت قدیمی کا رشتہ ملا کر رستہ نکالا خط مذکور میں اگرچہ کھول کر نہیں لکھا۔ مگر پوچھتا ہے کہ حکومت خطا کا حال مدّت سے معلوم نہیں تم لکھو کہ وہاں کا حاکم کون ہے اُس کی کس سے مخالفت ہے۔ کس سے موافقت ہے۔ صاحب علم و فضل اور اہل دانش کون کون اشخاص ہیں۔ مسندِ ہدایت پر کون کون لوگ مشہور ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان کے عجائب و نفائس سے جو کچھ تمہیں مرغوب ہو۔ بے تکلف لکھو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اپنا معتبر فلاں شخص روانہ کرتے ہیں۔ اسے آگے کو چلتا کر دو۔ وغیرہ وغیرہ +

مصالح مملکت

جو قافلہ سال بسال حج کو جاتا تھا۔ اور اکبر اپنی طرف سے میر حاج مقرر کرکے ساتھ کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ ہزاروں روپے مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور مختلف روضوں اور درگاہوں کے مجاوروں کو بھیجتا تھا۔ کہ ہر جگہ تقسیم ہو جائیں۔ اور اُن میں بھی خاص خاص اشخاص کے لئے روپے اور تحفے الگ ہوتے تھے۔ کہ خفیہ دئے جاتے تھے۔ شرفائے مکہ میں سے خاص خاص لوگوں کو جو خفیہ روپے پہنچتے تھے۔ آخر کس غرض سے؟ یہ سلطان روم کے گھر میں سرنگ لگتی تھی۔ افسوس اُس وقت کے مورخوں نے خوشامد کے انبار باندھے۔ مگر ان باتوں کی پرواہ بھی نہ کی۔ نہ اُس وقت کے دفتر رہے۔ جن سے یہ نکتے کھلتے۔ نقد و جنس تو لاکھوں روپے جاتے تھے۔ ایک رقم جس کا شیخ عبدالنبی صدر سے یہاں آ کر مطالبہ ہوا ۷ ہزار کی تھی۔ اور کھلم کھلا جو کچھ جاتا تھا اُس کا کیا ٹھکانا ہے ✦

اکبر نے اولاد سعادتمند نہ پائی

با اقبال بادشاہ کی اولاد پر نظر کرتا ہوں۔ تو افسوس آتا ہے۔ کہ بڑھاپے میں ان سے دکھ بھی پائے۔ اور داغ بھی اُٹھائے۔ بلکہ اخیر عمر میں ایک بیٹا رہا اس کی طرف سے بھی دل آزردہ اور ناکام گیا۔ خدا نے اسے تین بیٹے دئے تھے۔ اگر صاحب توفیق ہوتے۔ تو دست و بازو دولت و اقبال کے ہوتے۔ اُس کی تمنا تھی کہ یہ نونہال میری ہی ہمت اور میرے ہی خیالات کی ہوائیں سرسبز و سرفراز ہوں۔ کوئی ملک مقبوضہ کو سنبھالے اور مفتوحہ کو بڑھائے۔ کوئی دکن کو صاف کرے۔ کوئی افغانستان کو پاک کرکے آگے بڑھے۔ اور اُزبک کے ہاتھ سے باپ دادا کا ملک چھڑائے۔ مگر وہ شرابی کبابی ایسی ہوس رانی اور عیش پرستی کے بندے ہوئے کہ کچھ بھی نہ ہوئے دو ہونہار باغ جوانی کے نونہال لہلہاتے گئے تیسرا جہانگیر رہا۔ سلطنت کے مورخ دولت کے نمکخوار تھے۔ ہزار طرح باتیں بنائیں۔ مگر بات یہی ہے۔ کہ اکبر جیسا باپ اس سے ناراض اور اس کے افعال سے بیزار گیا ✦

جہانگیر سب سے پہلے ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو پیدا ہوا۔ اور یہ راجہ بہارا مل کچھواہہ کا نواسہ تھا۔ یعنی راجہ بھگوانداس کا بھانجہ۔ مان سنگھ کی پھوپھی کا بیٹا ✦

مراد ۹۷۸ھ میں ۱۰ محرم کو فتحپور کے پہاڑوں میں پیدا ہوا تھا۔ اور اسی واسطے اکبر پیار سے اسے پہاڑی راجہ کہا کرتا تھا۔ مہم دکن پر سپہ سالار ہو کر گیا۔ شراب مدت سے گھلا رہی تھی۔ اور ایسی منہ لگی تھی۔ کہ چھٹ نہ سکتی تھی۔ وہاں جاکر اور بڑھ گئی۔ اور بیماری بھی حد سے زیادہ گزر گئی۔ آخر ۱۰۰۷ھ میں ۳۰ برس کی عمر میں مرا۔ اور نامراد و ناشاد جواں مرگ دنیا سے گیا۔ تاریخ ہوئی۔ ع

از گلشن اقبال نہالے گم شد

جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ سبزہ رنگ۔ باریک اندام۔ خوش قد۔ بلند بالا تھا۔ تمکین و وقار چہرہ سے نمودار تھا۔ اور سخاوت و مردانگی اطوار سے آشکار۔ باپ نے اس کے شکرانۂ ولادت میں بھی اجمیر کی درگاہ کے گرد طواف کیا۔ شہر کے گرد فصیل بنوائی۔ عمارات عالی اور شاہانہ محل بلند کر کے قلعہ مرتب کیا۔ اور امرا کو بھی حکم دیا۔ کہ اپنے اپنے حسب مراتب عمارتیں بنوائیں۔ تین برس میں طلسمات کا شہر ہو گیا۔

دانیال اسی سال اجمیر میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں جب حاملہ تھی۔ تو برکت کے لئے اجمیر میں ایک نیکمرد صالح مجاور درگاہ کے گھر میں اسے جگہ دی تھی۔ مجاور مذکور کا نام شیخ دانیال تھا۔ پیدا ہوا تو اس کی مناسبت سے اس کا بھی نام دانیال رکھا۔ یہ وہی ہونہار تھا۔ جس سے خان خاناں کی بیٹی بیاہی تھی۔ مراد کے بعد اسے مہم دکن پر بھیجا۔ خان خاناں کو بھی ساتھ کیا۔ پیچھے پیچھے آپ فوج لے کر گیا۔ کچھ ملک اس نے لیا۔ کچھ آپ فتح کیا۔ سب اس کو دیا۔ خاندیس کا نام دان دیس رکھا۔ کہ دانیال کا دیس ہے۔ اور دارالخلافہ کو پھر آیا۔ وہ جان بلد بھی شراب میں غرق ہوا۔ بدنصیب باپ کو خبریں پہنچیں۔ خان خاناں پر فرمان دوڑنے شروع ہوئے۔ وہ کیا کرے۔ سمجھایا۔ تاکید کی۔ نوکروں کو تنبیہ کی۔ کہ شراب کی بوند اندر نہ جانے پائے۔ اُسے لت لگ گئی تھی۔ نوکروں کی منت خوشامد کی۔ کہ خدا کے واسطے جس طرح ہو۔ کہیں سے لاؤ۔ اور کسی طرح پلاؤ۔ ؎

اے ذوق اتنا دختر رز کو نہ منہ لگا	چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جاہنار جوان کو بندوق کے شکار کا بھی بہت شوق تھا۔ ایک بندوق بہت عمدہ اور نہایت بے خطا تھی۔ اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اس کا نام رکھا تھا یکہ و جنازہ۔ یہ بیت آپ کہہ کر اس پر لکھوائی تھی۔ ؎

از شوق شکارِ تو شود جاں تر و تازہ	بر ہر کہ خورد تیرِ تو یکّہ و جنازہ

جن نوکروں و مصاحبوں سے بے تکلف تھا۔ اُنہیں کمال منّت و زاری سے کہا۔ ایک نادان خیرخواہ لالچ کا مارا اُسی بندوق کی نالی میں شراب بھر کرلے گیا۔ اُس میں میل اور دھوآں تھا ہوا تھا۔ کچھ تو وہ چھٹا۔ کچھ شراب نے لوہے کو کاٹا۔ خلاصہ یہ کہ پیتے ہی لوٹ پوٹ ہو کر موت کا شکار ہوگیا۔ یہ بھی خوبصورت اور سجیلا جوان تھا۔ اچھے ہاتھی اور اچھے گھوڑے کا عاشق تھا۔ لکن یہ تھا۔ کہ کسی امیر کے پاس سنے اور لے نہ لے۔ گانے کا شوقین تھا۔ کبھی کبھی آپ بھی ہندی دوہرے کہتا تھا۔ اور اچھے کہتا تھا۔ اس جوانمرگ نے ۳۳ برس کی عمر ۱۰۱۳ھ میں باپ کے جگر پر داغ دیا۔ اور سلیم کی جہانگیری کے لئے پاک صاف میدان چھوڑا۔ دیکھو تزک جہانگیری ؀

جہانگیر نے بھی شراب خواری میں کسر نہیں کی۔ اپنی سینہ صافی سے آپ تزک کے سنہ میں لکھتے ہیں۔ خورم (شاہجہان) کی ۲۴ برس کی عمر ہوئی اور کئی شادیاں ہوئیں۔ اب تک شراب سے لب آلودہ نہیں کئے تھے۔ میں نے کہا۔ کہ بابا۔ شراب تو وہ شے ہے۔ کہ بادشاہوں اور شاہزادوں نے پی ہے۔ تو بچوّں والا ہوگیا۔ اور اب تک شراب نہیں پی۔ آج تیرا تُلا کا جشن ہے۔ ہم تمہیں شراب پلاتے ہیں۔ اور اجازت دیتے ہیں۔ کہ روز ہائے جشن اور ایام نوروز اور بڑی بڑی مجلسوں میں شراب پیا کرو۔ لیکن اعتدال کی رعایت رکھو۔ کیونکہ اس قدر پینی کہ جس میں عقل جاتی رہے۔ داناؤں نے ناروا سمجھی ہے۔ چاہیئے کہ اس کے پینے سے فائدہ مدِنظر ہو۔ نہ کہ نقصان۔ بوعلی جسے تمام فلاسفہ و اطبّا میں بزرگ دُنیا سمجھتے ہیں۔ رباعی کہہ گیا ہے۔ رباعی

مے دشمن مست و دوست ہشیار است	اندک تریاق و بیش زہر مار است
از بسیارش مضرتے اندک نیست	در اندک او منفعتے بسیار است

غرض بڑی تاکید سے پلائی ؀

اپنا حال لکھتا ہے میں نے ۱۵ برس کی عمر تک شراب نہیں پی تھی۔ بچپن میں والدہ اور اناؤں نے بچوں کی دوا کی طرح کبھی والد بزرگوار سے عرق منگالیا۔ وہ بھی تولہ بھر گلاب یا پانی ملالیا۔ کھانسی کی دوا کہہ کر مجھے پلا دیا۔ ایک دفعہ والد بزرگوار کا لشکر اٹک کے کنارے پر پڑا ہوا تھا۔ میں شکار کو سوار ہوا۔ بہت پھرتا رہا۔ شام کو آیا تو تھکن معلوم ہوئی۔ استاشاہ قلی توپچی اپنے فن

میں بڑا صاحب کمال تھا۔ میرے عم بزرگوار مرزا حکیم کے نوکروں میں سے تھا۔ اس نے کہا ایک پیالی نوش جان فرمائیں۔ تو ساری ماندگی جاتی رہے۔ جوانی دیوانی تھی۔ ایسی باتوں پر دل مائل تھا۔ محمود آبدار سے کہا حکیم علی کے پاس جا۔ سرور کا شربت لے آ۔ حکیم نے ڈیڑھ پیالہ بھیج دیا۔ زرد بسنتی شیریں۔ سفید شیشہ میں۔ میں نے پیا۔ عجب کیفیت معلوم ہوئی۔ اس دن سے شراب شروع کی۔ اور روز بروز بڑھاتا رہا۔ یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ شراب انگوری کچھ معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ عرق شروع کیا۔ ۹ برس میں یہ عالم ہوا۔ کہ عرق دو آتشہ کے ۱۴ پیالے دن کو ۷ رات کو پیتا تھا۔ کل ۱۶ سیر اکبری ہوئی۔ اُن دنوں ایک مرغ کے کباب روٹی کے ساتھ اور مولیاں خوراک تھی۔ کوئی منع نہ کر سکتا تھا۔ نوبت یہ ہوئی کہ حالت خمار میں رعشہ کے مارے پیالہ ہاتھ میں نہ لے سکتا تھا۔ اور لوگ پلاتے تھے۔ حکیم ہمام حکیم ابوالفتح کا بھائی والد کے مقربان خاص میں تھا۔ اُسے بلا کر حال کہا۔ اُس نے کمال اخلاص اور نہایت دلسوزی سے بے حجابانہ کہا۔ صاحب عالم! جس طرح آپ عرق نوش جاں فرماتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ چھ مہینے میں یہ حال ہو جائیگا۔ کہ علاج پذیر نہ رہیگا۔ اس نے چونکہ خیر اندیشی سے عرض کیا تھا۔ اور جان بھی عزیز ہے۔ میں نے فلونیا کی عادت ڈالی۔ شراب گھٹاتا تھا۔ فلونیا بڑھاتا جاتا تھا۔ حکم دیا۔ کہ عرق شراب انگوری میں ملا کر دیا کرو۔ چنانچہ دو حصے شراب انگوری۔ ایک حصہ عرق دینے لگے۔ گھٹاتے گھٹاتے ۷ برس میں ۶ پیالے پر آ گیا۔ اب ۱۵ برس سے اسی طرح ہوں۔ نہ کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ رات کو پیا کرتا ہوں۔ مگر جمعرات کا دن مبارک ہے کہ میرا روز جلوس ہے۔ اور شب جمعہ متبرک رات ہے۔ اور اُس کے آگے بھی متبرک دن آتا ہے۔ اس لئے نہیں پیتا۔ جمعہ کا دن آخر ہوتا ہے۔ تو پیتا ہوں جی نہیں چاہتا۔ کہ وہ رات غفلت میں گزرے۔ اور منعم حقیقی کے شکر سے محروم رہوں جمعرات اور انوار کو گوشت نہیں کھاتا۔ انوار والد بزرگوار کی پیدائش کا دن ہے۔ وہ بھی اس دن کا بڑا ادب کرتے تھے۔ چند روز سے فلونیا کی جگہ افیون کر دی ہے۔ اب عمر ۴۶ برس ۴ مہینے شمسی پر پہنچی۔ ۴۷ برس ۹ مہینے قمری ہوئے۔ ۸ رتی ۵ گھڑی دن چڑھے۔ ۶ رتی پہر رات گئے کھاتا ہوں۔ **آزاد!** دیکھتے ہو سادہ لوح مسلمان آج حکومت اسلام اور عمل اسلام کہہ کر فدا ہوئے جاتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ وہ کیا اسلام تھے۔ اور کیا آئین اسلام تھے جس کو دیکھو شیر مادر کی طرح شراب پیئے جاتا ہے۔ ناموں کی فہرست لکھ کر اب کیوں انہیں بدنام کروں۔ اور ایک شراب کو کیا روئیے سُن چکے اور سُن لوگے کہ کیا کیا کچھ ہوتا تھا۔ ع غرض میں کیا کہوں۔ دنیا عجب تماشا ہے۔

اب شہزادوں کی سعادتمندی کے کارنامے سُنو کہ اکبر کو ملک دکن کی تسخیر کا شوق تھا۔ اُدھر کے حکّام و اُمرا کو پرچانا تھا جو آتے تھے۔ انہیں دلداری و خاطرداری سے رکھتا تھا۔ خود سفارتیں بھیجتا تھا۔ سنہ ھ میں معلوم ہوا کہ برہان الملک کے مرنے اور اُس کے نا اہل بیٹوں کی کشاکشی سے گھر بے چراغ اور ملک میں اندھیر پڑ گیا۔ امرائے دکن کی عرضیاں بھی دربار اکبری میں پہنچیں۔ کہ حضور اس طرف کا قصد فرمائیں۔ تو عقیدتمند خدمت کو حاضر ہیں۔ اکبر نے جلسۂ مشورۃ قائم کر کے اُدھر کا عزم مصمّم کیا۔ ملک کو اُمرا پر تقسیم کیا۔ ان کے عہدے بڑھائے۔ اس وقت تک دربار میں پنجہزاری منصب معراج مدارج تھا۔ اب شہزادوں کو وہ منصب عطا کیے۔ جو آج تک نہ سُنے تھے۔

بڑے شاہزادے یعنی سلیم (جو بادشاہ ہو کر جہانگیر ہوا) کو کہ ولیعہد دولت تھا۔ دوازدہ ہزاری (۲) مراد کو دہ ہزاری (۳) دانیال کو ہفت ہزاری۔

مراد کو سلطان روم کی چوٹ پر سلطان مراد بنا کر مہم دکن پر روانہ کیا۔ ناتجربہ کار شہزادہ اوّل سب کو بلند نظر نوجوان نظر آیا۔ مگر حقیقت میں پست ہمت اور کوتاہ عقل تھا۔ خانخاناں جیسے شخص کو اپنی عالی دماغی سے ایسا تنگ کیا۔ کہ وہ اپنی التجا کے ساتھ دربار میں واپس طلب ہوا۔ اور مراد دُنیا سے ناشاد گیا۔

اکبر نے ایک ہاتھ جگر کے داغ پر رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے سلطنت کو سنبھال رہا تھا۔ جو سنہ ھ میں خبر آئی کہ عبداللہ خاں اُذبک والیٔ ترکستان نے بیٹے کے ہاتھ سے قضا کا جام پیا اور ملک میں چھُری کٹاری کا بازار گرم ہے۔ اُس نے فوراً انتظام کا نقشہ بدلا۔ امرا کو لے کر بیٹھا۔ اور مشورۃ کی انجمن جمائی۔ صلاح یہی ٹھیری کہ پہلے دکن کا فیصلہ کر لینا واجب ہے۔ گھر کے اندر کا معاملہ ہے۔ اور کام بھی قریب الاختتام ہے۔ ادھر سے خاطر جمع کر کے اُدھر چلنا چاہیئے۔ چنانچہ دانیال کے نام پر مہم نامزد کی۔ اور مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو ساتھ کر کے خاندیس روانہ کیا۔

سلیم کو شہنشاہی خطاب اور بادشاہی لوازمات و اسباب دیکر ولیعہد قرار دیا۔ اجمیر کا صوبہ متبرک سمجھ کر اس کی جاگیر میں دیا۔ اور میواڑ (اودیپور) کی مہم پر نامزد کیا۔ راجہ مان سنگھ وغیرہ نامی امرا کو ساتھ کیا۔ تمن۔ توغ۔ علم۔ نقارہ۔ فراش خانہ وغیرہ تمام سامان سلطانی عنایت فرمائے۔ لاکھ اشرفی نقد دی۔ عماری دار ہاتھی سواری کو دیا۔ مان سنگھ کو بنگالہ کا صوبہ پھر عنایت فرمایا۔ اور حکم دیا کہ شہزادہ کی رکاب میں جاؤ۔ جگت سنگھ اپنے بڑے بیٹے کو۔ یا جسے مناسب سمجھو نیابت

بنگالہ پر ننھیج دو

دانیال کی شادی خان خاناں کی بیٹی سے کر دی ۔ ابوالفضل بھی مہم دکن پر گئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اور خان خاناں نے اکبر کو لکھا کہ حضور خود تشریف لائیں۔ تو یہ مشکل مہم ابھی آسان ہو جائے۔ اکبر کا اسپ ہمت کبھی کا محتاج نہ تھا۔ ایک اشارہ میں برہانپور پر جا پہنچا۔ اور آسیر کا محاصرہ کر لیا۔ خانخاناں دانیال کو لئے احمد نگر کو گھیرے پڑا تھا۔ کہ اکبر نے آسیر کا قلعہ بڑے زور شور سے فتح کیا۔ ادھر احمد نگر خانخاناں نے توڑا۔

۱۰۰۹ھ ۱۶۰۱ء ۔ اب ملک کے دروازے خود بخود کھلنے لگے۔ ابراہیم عادل شاہ کا ایلچی بیجاپور سے تحائف گراں بہا لے کر حاضر ہوا۔ تحریر و تقریر میں اشارہ تھا۔ کہ بیگم سلطان اس کی بیٹی کو حضور شہزادۂ دانیال کی ہمنشینی کے لئے قبول فرمائیں۔ اکبر یہ عالم دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ میر جمال الدین انجو کو اس کے لینے کے لئے بھیجا۔ بڈھے بادشاہ کا جوان اقبال ادائے خدمت میں طلسمات کا تماشا دکھا رہا تھا۔ جو خبر پہنچی کہ شاہزادہ ولیعہد رانا کی مہم کو چھوڑ کر بنگالہ کو چلا گیا۔

بات یہ تھی کہ اول تو وہ نوجوان عیش کا بندہ تھا۔ آپ اجمیر کے علاقہ میں شکار کھیل رہا تھا۔ امرا کو رانا پر روانہ کیا تھا۔ دوسرے وہ کوہستان ویران۔ گرم ملک۔ غنیم جان سے ہاتھ دھوئے ہوئے کبھی ادھر سے آن گرا۔ کبھی اُدھر سے شبخون مارا۔ بادشاہی فوج بڑے حوصلہ سے حملے کرتی تھی۔ اور روکتی تھی۔ رانا جب دبتا تھا۔ پہاڑوں میں بھاگ جاتا تھا۔ شہزادہ کے پاس بدنیت اور بداعمال مصاحب صحبت میں تھے۔ وہ ہر وقت دل کو اُچاٹ اور طبیعت کو آوارہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ بادشاہ اس وقت مہم دکن میں ہیں۔ اور منصوبہ عظیم پیش نظر ہے۔ مدتوں کی منزلیں اور مسافت درمیان ہے۔ آپ راجہ مان سنگھ کو اس کے علاقہ پر رخصت کر دیں اور آگرہ کی طرف نشان دولت بڑھا کر کوئی سیر حاصل اور سرسبز علاقہ زیر قلم کریں۔ یہ امر کچھ معیوب نہیں جو ہر ہمت اور غیرت سلطنت کی بات ہے۔

مورکھ شہزادہ ان کی باتوں میں آگیا۔ اور ارادہ کیا کہ پنجاب میں جا کر باغی بن بیٹھے۔ اتنے میں خبر آئی کہ بنگالہ میں بغاوت ہو گئی۔ اور راجہ کی فوج نے شکست کھائی۔ اس کی مراد بر آئی۔ راجہ کو اُدھر رخصت کیا۔ اور آپ مہم چھوڑ آگرہ کو روانہ ہوا[1]۔ یہاں آکر باہر ڈیرے ڈال دئیے قلعہ میں مریم مکانی (والدۂ اکبر) بھی موجود تھیں قلیج خاں پُرانا خدمتگزار اور نامی سپہ سالار قلعدار اور

---

[1] ابوالفضل کی دوراندیشی نے اکبر کو یہ سمجھایا۔ کہ جو کچھ ہوا مان سنگھ کے اغوا سے ہوا۔

تحویلدار تھا۔ اور کارسازی و منصوبہ بازی میں یکتا مشہور تھا۔ اس نے نکل کر بڑی خوشی اور شگفتہ روئی سے مبارکباد دی پیشکش اور نذرانہ شاہانہ گزران کر ایسی خیرخواہی کے ساتھ باتیں بنائیں۔ اور تدبیریں بتائیں۔ کہ شاہزادہ کے دل پر اپنی ہواخواہی پتھر کی لکیر کر دی۔ ہرچند نئے مصاحبوں نے کان میں کہا۔ کہ پُرانا پاپی بڑا متفنی ہے۔ اس کا قید کر لینا مصلحت ہے۔ یہ آخر شہزادہ تھا۔ نہ مانا۔ بلکہ رخصت کے وقت اُسے کہہ دیا کہ ہر طرف سے ہشیار رہنا۔ اور قلعہ کی خبرداری اور ملک کا بندوبست رکھنا۔

جہانگیر جمنا اُتر کر شکار کھیلنے لگا۔ مریم مکانی پر یہ راز کھل گیا تھا۔ اور وہ بیٹے سے زیادہ اسے چاہتی تھیں۔ انہوں نے بلا بھیجا۔ نہ آیا۔ ناچار خود سوار ہوئیں۔ یہ آنے کی خبر سن کر شکار کی طرح بھاگے۔ اور جھٹ کشتی پر بیٹھ کر الہ آباد کو روانہ ہوئے۔ دادی کہن سال افسردہ حال اپنا سا منہ لے کر چلی آئی۔ اُس نے الہ آباد پہنچ کر سب کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ الہ آباد آصف خاں میر جعفر کے سپرد تھا۔ اُس سے لے کر اپنی سرکار میں داخل کر لیا۔ بہار اودھ وغیرہ آس پاس کے صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ ہر جگہ اپنے حاکم مقرر کئے۔ وہ اکبری ملازم پرانے قدیم الخدمت ٹھوکریں کھاتے اِدھر آئے۔ بہار کا خزانہ ۳۰ لاکھ سے زیادہ تھا۔ اُس پر قبضہ کیا۔ صوبہ مذکور شیخ جیون اپنے کوکہ کو عنایت کیا۔ اور قطب الدین خاں خطاب دیا۔ تمام مصاحبوں کو منصب اور خانی و سلطانی کے خطاب دئے۔ جاگیریں دیں اور آپ بادشاہ بن گیا۔ ۱۰۱۰ھ

اکبر دکن کے کنارہ پر بیٹھا پورب پچھم کے خیال باندھ رہا تھا۔ یہ خبر پہنچی تو بہت گھبرایا۔ میر جمال الدین حسین کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ مہم کو امرا پر چھوڑا۔ اور آپ حسرت و افسوس کے ساتھ آگرہ کو روانہ ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اگر یہ ہلہلا چند روز اور نہ اُٹھتا۔ تو دکن کے بہت سے قلعدار خود کنجیاں لے لے کر حاضر ہو جاتے۔ اور دشوار مہمیں آسان طور سے طے ہو جاتیں۔ پھر ملک موروثی یعنی ترکستان پر خاطر جمع سے دھاوے مارتے۔ مگر مقدر مقدم ہے۔

نااہل و ناخلف بیٹے نے جو حرکتیں وہاں کیں۔ باپ کو حرف حرف خبر پہنچی۔ اب اسے محبت پدری کہو خواہ مصلحت ملکی سمجھو۔ باوجود ایسی بے اعتدالیوں کے باپ نے ایسی بات نہ کی جس سے بیٹا بھی باپ کی طرف سے ناامید ہو کر کھلم کھلا باغی ہو جاتا۔ بلکہ کمال محبت سے فرمان لکھا۔ اُس نے جواب میں ایسے زمین آسمان کے افسانے سنائے۔ گویا اُسکی کچھ خطا ہی نہیں۔ بُلا بھیجا۔ تو ٹال گیا۔ اور ہرگز نہ آیا۔ اکبر آخر باپ تھا۔ اور آخری وقت تھا۔ دانیال

بھی دُنیا سے جانے والا تھا۔ یہی ایک نظر آتا تھا۔ اور اسے بڑی منّتوں مرادوں سے پایا تھا۔ ایک اور فرمان لکھ کر محمد شریف ولد خواجہ عبدالصّمد شیریں قلم کے ہاتھ روانہ کیا۔ کہ وہ ان کا ہم سبق تھا۔ اور بچپن سے ساتھ کھیلا تھا۔ زبانی بھی بہت کچھ کہلا بھیجا۔ اور بڑی محبّت اور اشتیاق دیدار کے پیام بھیجے۔ بہت بہلایا پھسلایا۔ خدا جانے وہ منا یا نہ منا۔ باپ بچارا آپ ہی کہہ سن کر خوش ہو گیا۔ اور حکم بھیجا۔ کہ ملک بنگال اور اُڑیسہ تمہاری جاگیر ہے۔ اس کا انتظام کرو۔ مگر اُس نے حکم کی تعمیل نہ کی اور آلے بالے بتاتا رہا۔

سالنامہ میں پھر وہی روز سیاہ پیش آیا۔ الٰہ آباد میں بگڑ بیٹھے۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ ٹکسال میں سکہ لگوایا۔ روپے اشرفیاں مہاجنوں کے لین دین میں آگرہ اور دلّی پہنچائیں کہ باپ دیکھے اور جلے۔ اس کے پرانے وفاداروں اور قدیمی جاں نثاروں کو اپنا بدخواہ اور نمک حرام ٹھیرایا۔ کسی کو سخت قید۔ کوئی قتل۔ یہاں تک کہ شیخ ابوالفضل کے خون ناحق سے فارغ ہوئے۔ اب یا تو اکبر بُلاتا تھا۔ یہ آتے نہ تھے۔ یا مصاحبوں سے صلاح مشورہ کر کے تیس چالیس ہزار لشکر جرار کے ساتھ آگرہ کو چلے۔ رستے میں بہت سے امیروں کی جاگیریں لوٹتے آئے۔ اٹاوہ میں آصف خاں کی جاگیر تھی۔ وہاں پہنچ کر مقام کیا۔ آصف خاں دربار میں تھا۔ اس کے وکیل نے آقا کی طرف سے لعل گراں بہا نذر گزرانا۔ اور عرضی پیش کی (اکبر کے اشارے سے لکھی گئی تھی) اس پر بھی زر خطیر اُس کی جاگیر سے وصول کیا۔ جن امرا کی جاگیریں صوبۂ بہار میں تھیں۔ سب نالاں تھے۔ آصف بہت کہتے رہتے تھے۔ مگر سلیمان صلاح اندیش ایسے جواب دیتا تھا۔ جسے سُن کر محبت کے سینے سے دودھ بہنے لگتا تھا۔ امرا چپ تھے۔ مگر آپس میں کہتے تھے۔ کہ بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ دیکھئے اس بیحد شفقت کا انجام کیا ہوتا ہے۔

جب نوبت حد سے گذر گئی۔ اور وہ اٹاوہ سے بھی کوچ کر کے آگے بڑھا تو انتظام سلطنت میں خلل عظیم نظر آیا۔ اب اکبر کا بھی یہ حال ہوا۔ کہ یا تو بیٹے کے ملنے کی آرزو اور ذوق شوق کے خیالات سُنا سُنا کر خوش ہوتا تھا۔ یا اپنے اور اس کے معاملے کے انجام کو سوچنے لگا۔ فرمان لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ خلاصۂ فرمان۔ اگرچہ اشتیاق دیدار فرزند کامگار کا حد سے زیادہ ہے۔ بوڑھا باپ دیدار کا پیاسا ہے۔ لیکن پیارے بیٹے کا ملنے کو آنا۔ اور اس جاہ و جلال سے آنا دل محبّت منزل پر شاق اور ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اگر تجمّل اور خوشنمائی لشکر کی اور موجودات سپاہ کی منظور نظر ہے۔ تو مُجرا قبول ہو گیا۔ سب کو جاگیروں پر رخصت کر دو۔ اور معمول کے

موجب چھڑے چلے آؤ۔ باپ کی دکھتی آنکھوں کو روشن اور محروم دل کو خوش کرو۔ اگر لوگوں کی یا وہ گوئی سے کچھ وہم و وسواس تمہارے دل میں ہے جس کا ہمیں سان گمان بھی نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں الہ آباد کی طرف مراجعت کرو اور کسی قسم کے وسوسے کو دل میں راہ نہ دو۔ جب وہم کا نقش تمہارے دل سے دھویا جائیگا۔ اُس وقت ملازمت میں حاضر ہونا۔

اِس فرمان کو دیکھ کر جہانگیر بھی بہت شرمایا کیونکہ کوئی بیٹا باپ کے سلام کو اس کرّوفر سے نہیں گیا۔ اور ایسے اختیارات نہیں دکھلائے اور کسی بادشاہ نے بیٹے کی بے اعتدالیوں کا اِس قدر تحمل بھی نہیں کیا۔ چنانچہ وہیں ٹھہر گیا۔ اور عرضی لکھی۔ کہ غلام خانہ زاد کو سوا آرزوے ملازمت کے اور کچھ خیال نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب حکم حضور کا اس طرح پہنچا ہے اطاعت فرمان واجب جان کر چند روز اپنے خداوند و مرشد و قبلہ کی درگاہ سے جُدا رہنا ضرور ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ لکھا اور الہ آباد کو پھر گیا۔ اکبر کے حوصلے کو آفرین ہے کہ کل بنگالہ بیٹے کی جاگیر کر دیا۔ اور لکھ بھیجا کہ اپنے ہی آدمی تعینات کر دو۔ سفید و سیاہ کا تمہیں اختیار ہے۔ اور ہماری ناخوشی کا وسوسہ اور دغدغہ دل سے نکال ڈالو۔ بیٹے نے شکریہ کی عرضداشت لکھی اور خود اختیاری کے ساتھ اپنے ہاتھوں کے احکام وہاں جاری کر دئے۔

صحبت میں مصاحب اچھے نہ تھے۔ بے اعتدالیاں بڑھنے لگیں۔ اکبر پریشان رہتا تھا امرائے دربار میں نہ کسی کی عقل پر اعتماد تھا نہ دیانت کا اعتبار تھا۔ ناچار شیخ ابوالفضل کو دکن سے بلایا وہ اِس طرح مارے گئے۔ خیال کرنا چاہئیے کہ دل پر کیا صدمہ گزرا ہوگا۔ واہ رے اکبر زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ جب کچھ بن نہ آئی تو خدیجۃ الزمانی سلیمہ سلطان بیگم کو کہ دانائی کاردانی اور سخن سنجی و حُسن تقریر میں سحر آفرین تھیں۔ بیٹے کی تسلی اور دلاسے کے لئے روانہ کیا۔ خاصہ کے ہاتھیوں میں سے فتح لشکر ہاتھی۔ خلعت اور تحفے گراں بہا بھیجے۔ لطیف میوے من بھاتے کھانے۔ مٹھائیاں پوشاک و لباس کی اکثر چیزیں برابر چلی جاتی تھیں کہ کسی طرح بات بنی رہے اور ضدی لڑکا ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ وہ اکبر بادشاہ تھا۔ سمجھتا تھا کہ میں چراغِ سحری ہوں۔ اس وقت یہ تکرار بڑھی تو سلطنت کا عالم تہ و بالا ہو جائیگا۔

کارداں بیگم وہاں پہنچی۔ اپنی کاردانی سے وہ منتر پھونکے کہ مُرغِ وحشی دام میں آگیا۔ اور ایسا کچھ سمجھایا۔ کہ ہٹیلا لڑکا ساتھ چلا آیا۔ رستے میں سے پھر عرضی آئی کہ مریم مکانی مجھے لینے آئیں۔ اکبر نے جواب میں لکھا کہ مجھے تو اب اُن سے کہنے کا منہ نہیں۔ تم آپ ہی لکھو۔ خیر ایک

منزل آگرہ رہا تو مریم مکانی بھی گئیں۔ اپنے ہی گھر میں لاکر اُتارا۔ دیدار کا بھُوکا باپ وہاں آپ چلا گیا۔ بارے ایک ہاتھ مریم مکانی نے پکڑا۔ ایک سلیمہ سلطان بیگم نے۔ سامنے لا کے باپ کے قدموں پر ان کا سر رکھا۔ باپ کو اِس سے زیادہ اور دُنیا میں تھا کیا؟ اٹھاکر دیر تک سر چھاتی سے لگائے رہے اور رو دئے۔ اپنے سر سے دستار اُتار کر بیٹے کے سر پر رکھ دی۔ ولی عہدی کا خطاب تازہ کیا اور حکم دیا کہ شادیانے بجیں۔ جشن کیا۔ مبارکبادیں ہوئیں۔ رانا کی مہم پر پھر نامزد کیا اور امرا فوجیں دے کر ساتھ کئے۔

یہ یہاں سے روانہ ہوئے۔ اور فتحپور میں جاکر مقام کیا بعض سامانوں اور خزانوں کے پہنچنے میں دیر ہوئی۔ نازک مزاج پھر بگڑ گیا۔ اور لکھا کہ کفایت اندیش حضور کے سامان بھیجنے میں تامل کرتے ہیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اوقات ضائع ہوتی ہے۔ اِس مہم کے لئے لشکر وافر چاہیئے۔ رانا پہاڑوں میں گھس گیا ہے وہاں سے نکلتا نہیں۔ اِس لئے چاروں طرف سے فوج روانہ کرنی چاہیئے۔ اور ہر جگہ اتنی فوج ہو کہ جہاں مقابلہ ہو پڑے اس کا جواب دے سکے۔ اُمیدوار ہوں کہ فی الحال مجھے اجازت ہو کہ جاگیر پر جاؤں وہاں حسب دلخواہ خود کافی و وافی سامان سرانجام کرکے حکم کی تعمیل کر دوں گا۔ اکبر نے دیکھا کہ لڑکا پھر چلا۔ سوچ سمجھ کر اپنی بہن کو بھیجا۔ پھوپھی نے بھی جاکر بہتیرا سمجھایا۔ وہ کیا سمجھتا تھا۔ آخر باپ کو اجازت ہی دیتے بن آئی۔ یہ کوچ بہ کوچ نشانِ شاہانہ سے الہ آباد کو روانہ ہوئے۔ کوتہ اندیش امیروں نے اکبر کو اشارہ کیا کہ موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے (قید) اُس نے ٹال دیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ دوسرے ہی دن ایک پوستین سمورِ سفید کا بھیجا کہ ہمیں اس وقت بہت پسند آیا۔ جی چاہا کہ نورِ چشم اسے پہنے اور کچھ تحفے کشمیر کابل کے اور بھی ساتھ بھیجے۔ مطلب یہی تھا کہ اس کے دل میں شبہ نہ آئے۔ اس نے الہ آباد میں پہنچ کر پھر وہی اُکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی۔ جن امرا کو باپ نے پچاس برس کی محنت میں جانباز اور جاں نثار دلاور انتخاب تیار کیا تھا۔ اور اس کے بھی محرمِ راز تھے انہی کو برباد کرنے لگا۔ وہ اُٹھ اُٹھ کر دربار میں آنے لگے۔

خسرو اس کا بیٹا راجہ مان سنگھ کا بھانجا تھا۔ مگر بے عقل اور بدنیت تھا۔ وہ اپنے حال پر اکبر کی شفقت دیکھکر سمجھتا تھا کہ دادا مجھے ولیعہد کر دیگا۔ باپ کے ساتھ بے ادبی و بے باکی سے پیش آتا تھا۔ اور کبھی کبھی اکبر کی زبان سے بھی نکل گیا تھا کہ اِس باپ سے تو یہ لڑکا ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ایسی باتوں پر نظر کرکے وہ کوتہ اندیش لڑکا اور بھی لگاتا بجھاتا رہتا تھا

یہاں تک کہ اس کی ماں کو یہ حالات دیکھ کر تاب نہ رہی۔ کچھ تو جنون اُس کا موروثی مرض تھا کچھ ان باتوں کا غم و غصہ۔ بیٹے کو سمجھایا۔ وہ باز نہ آیا۔ آخر راجپوت رانی تھی افیم کھا کر مرگئی کہ اس کی ان حرکتوں سے میرے دُودھ پر حرف آئیگا ٭

انہی دنوں میں بادشاہی واقعہ نویس ایک لڑکے کو لیکر بھاگ گیا کہ نہایت صاحب جمال تھا۔ اور جہانگیر بھی اسے دربار میں دیکھکر خوش ہؤا کرتا تھا۔ حکم دیا کہ پکڑ لاؤ۔ وہ کئی منزل سے پکڑے آئے۔ اپنے سامنے دونوں کی زندہ کھال اتروا ڈالی۔ اکبر کو بھی دم دم کی خبر پہنچتی تھی۔ سُن کر تڑپ گیا اور کہا۔ اللہ اللہ شیخوجی ہم تو بکری کی کھال بھی اُترتے نہیں دیکھ سکتے۔ تم نے یہ سنگدلی کہاں سے سیکھی۔ شراب اس قدر پیتا تھا کہ نوکر چاکر ڈر کے مارے کونوں میں چھپ جاتے تھے۔ پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ جو حضوری سے مجبور تھے وہ نقش دیوار کھڑے رہتے تھے۔ وہ ایسی حرکتیں کرتا تھا جن کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوں ٭

ایسی ایسی باتیں سُن کر عاشق باپ سے نہ رہا گیا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ زیادہ تر شراب کی خانہ خرابی ہے۔ چاہا کہ خود جاؤں اور آپ سمجھا کرلے آؤں۔ کشتی پر سوار ہوا۔ ایک دن کشتی ریتے میں رکی رہی۔ دوسرے دن اور کشتی آئی۔ دو دن مینہ کا تار لگا رہا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ مریم مکانی کا بُرا حال ہے۔ مختصر یہ کہ پھر آئے اور ایسے وقت پُہنچے کہ لبوں پر دم تھا۔ ماں نے بیٹے کا آخری دیدار دیکھ کر ۱۰۱۲ھ میں دُنیا سے سفر کیا۔ اکبر کو بڑا رنج ہُوا۔ بھدرا کیا کہ چنگیز خانی تورہ اور ہندوستانی رسم کا حکم تھا۔ ۹۴ اسو نمک حلالوں نے ساتھ دیا۔ تھوڑی دُور سعادت مند بیٹے نے ماں کا تابوت سر پر اُٹھایا۔ تمام امرا کندھوں پر لے گئے اکبر تھوڑی دُور تک جاکر نہایت آزردہ ہؤا۔ پھر آیا اور تابوت کو دلی روانہ کیا کہ شوہر کے پہلو میں دفن ہو۔ الٰہ آباد میں خبر پہنچی تو یہ بھی کچھ سمجھے۔ اور روتے بسورتے باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عاشق باپ نے گلے لگایا بہت سمجھایا معلوم ہوا کہ کثرتِ شراب سے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ نوبت یہ ہوگئی تھی کہ فقط شراب کا نشہ بس نہ تھا۔ اس میں افیون گھول کر پیتے تھے جب ذرا سرور معلوم ہوتا تھا۔ اکبر نے حکم دیا کہ محل سے نکلنے نہ پائیں۔ مگر پھر کب تک۔ ناچار تفریحوں اور ترکیبوں سے طبیعت کی اصلاح کرتا تھا۔ اور حکمتِ عملی کے علاجوں سے دیوانہ کو قابو میں لاتا تھا۔ غائبانہ حاضرانہ شفقتیں کرکے پھسلاتا تھا کہ ہٹیلے لڑکے کی ضدوں میں تیموں کا نام نہ مٹ جائے اور فی الحقیقت

وہ ملک وتدبیر کا بادشاہ سچ سمجھا تھا۔

ابھی مراد کے آنسوؤں سے پلکیں نہ سوکھی تھیں کہ اکبر کو پھر جوان بیٹے کے غم میں رونا پڑا یعنی ۱۰۱۳ھ میں دانیال نے بھی اسی شراب کے پیچھے اپنی جانِ عزیز کو ضائع کیا اور سلیم کے لئے میدان خالی چھوڑ گیا۔ باپ کو اب سوا سلیم کے دین و دنیا میں کوئی نہ تھا۔ بیٹا اور اکلوتا بیٹا ع

داغِ فرزندے کند فرزندِ دیگر را عزیز۔

اسی عرصہ میں ایک دن بعض سلاطین[1] اور شہزادوں کی فرمائش سے صلاح ٹھہری کہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھیں۔ اکبر کا بھی قدیمی شوق تھا پھر جوانی کی اُمنگ آگئی۔ ولیعہد دولت کے پاس ایک بڑا بلند اور تناور ہاتھی تھا۔ اِسی لئے اس کا نام گرانبار رکھا تھا۔ وہ ہزاروں ہاتھیوں میں نمودار نظر آتا تھا۔ اور لڑائی میں ایسا بلونت تھا کہ ایک ہاتھی اس کی ٹکر نہ اُٹھا سکتا تھا۔ خسرو (شاہزادہ ولیعہد کے بیٹے) کے پاس ایسا ہی نامور اور دھبیں دھونکڑ ہاتھی تھا۔ اُس کا نام **آپ رُوپ** تھا دونوں کی لڑائی ٹھہری۔ خاصہ بادشاہی میں بھی ایک ایسا ہی جنگی ہاتھی تھا۔ اس کا نام **رن تھمن** تھا۔ تجویز ٹھہری کہ جوان دونوں میں سے دب جائے اُس کی مدد پر رن تھمن آئے۔ بادشاہ اور اکثر شہزادے جھروکوں میں بیٹھے۔ جہانگیر اور خسرو اجازت لیکر گھوڑے اڑاتے میدان میں آئے۔ ہاتھی آمنے سامنے ہوئے اور پہاڑ ٹکرانے لگے۔ اتفاقاً بیٹے (خسرو) کا ہاتھی بھاگا اور باپ کا (جہانگیرا) ہاتھی اُس کے پیچھے چلا۔ خاصہ کے فیلبان نے بموجب قرارداد کے رن تھمن کو آپ رُوپ کی مدد پر پہنچایا۔ جہانگیری نمک خواروں کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو۔ ہماری جیت ہار ہو جائے۔ اس لئے رن تھمن کو مدد سے روکا۔ چونکہ پہلے سے یہ بات ٹھہری ہوئی تھی۔ فیلبان نہ رُکا۔ جہانگیری نوکروں نے غل مچایا برچھیوں کے کوچے اور پتھر مارنے شروع کئے۔ یہانتک کہ فیلبان شاہی کی پیشانی پر پتھر لگا اور کچھ لہو بھی منہ پر بہا۔

خسرو ہمیشہ دادا کو باپ کی طرف سے اُکسایا کرتا تھا۔ اپنے ہاتھی کے بھاگنے سے کھسیانا ہو گیا۔ اور جب مدد بھی نہ پہنچ سکی تو دادا کے پاس آیا۔ بسورتی صورت بنا کر باپ کے نوکروں کی زیادتی اور فیلبانِ خاصہ کی مجروحی کا حال بُرے رنگ سے دکھایا۔ جہانگیر کے

---

[1] خاندانِ چغتائیہ کی اصطلاح میں بادشاہ اور ولیعہد کے سوا جو خاندان کے بھائی بند ہوں۔ سلاطین کہلاتے ہیں بلکہ مجازاً ایک کو بھی سلاطین کہہ دیتے ہیں۔ اگرچہ لفظاً جمع کا صیغہ ہے۔

نوکروں کا شور شرابا اور اپنے فیلبان کے منہ پر لہو بہتا ہوا سامنے سے اکبر نے بھی دیکھا تھا بہت برہم ہوا۔ خورمؒ (شاہجہان) کی ۱۴ برس کی عمر تھی اور دادا کی خدمت سے ایک دم جُدا نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی حاضر تھا۔ اکبر نے کہا۔ تم جاؤ اپنے شاہ بھائی (جہانگیر) سے کہو کہ شاہ بابا (اکبر) کہتے ہیں۔ دونو ہاتھی تمہارے۔ دونو فیلبان تمہارے۔ جانور کی طرفداری میں ہمارے ادب کا بھول جانا یہ کیا بات ہے۔

خورم اِس عمر میں بھی دانشمند اور نیک طبع تھا۔ ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا جس میں باپ اور دادا میں صفائی رہے۔ وہ گیا اور خوشی خوشی پھر آیا۔ عرض کی۔ شاہ بھائی کہتے ہیں۔ حضور کے سر مبارک کی قسم ہے کہ فدوی کو اِس بیہودہ حرکت کی ہرگز خبر نہیں اور غلام کبھی ایسی گستاخی گوارا نہیں کر سکتا۔ غرض باپ کی طرف سے اِس طرح تقریر کی کہ دادا خوش ہو گیا۔ اکبر اگرچہ جہانگیر کی حرکات ناشائستہ سے ناراض تھا اور اِس عالم میں کبھی خسرو کی تعریف بھی کر دیا کرتا تھا مگر سمجھتا تھا کہ یہ اس سے بھی نالائق ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ خسرو ایک دفعہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر نہ رہیگا کیونکہ اِس کا پلّہ بھاری ہے۔ یعنی مان سنگھ کا بھانجا ہے۔ تمام سردارانِ کچھواہہ ساتھ دیں گے۔ خان اعظمؒ کی بیٹی اِس سے بیاہی ہے۔ وہ بھی سلطنت کا رکنِ اعظم ہے۔ ان دونو کا ارادہ تھا کہ جہانگیر کو باغی قرار دے کر اندھا کر دیں اور قید رکھیں خسرو کے سر پر تاجِ اکبری رکھ دیں مگر دانا بادشاہ برسوں کی مُدت اور کوسوں کی مسافت کو سامنے دیکھتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جب اِس طرح بگڑے گی تو گھر ہی بگڑ جائیگا اِس لئے مصلحت یہی نظر آئی کہ سب کاروبار بدستور رہے اور جہانگیر ہی تخت نشین ہو۔ ان دنوں میں جو بڑے بڑے امیر تھے وہ اضلاع دور دست میں بھیجے ہوئے تھے۔ اِس لئے جہانگیر بہت ہراساں تھا۔ چنانچہ جب اکبر کی حالت غیر ہوئی تو اِس کے اشارے سے قلعہ سے نکل کر ایک مکان محفوظ میں جا بیٹھا۔ وہاں شیخ فریدبخشی وغیرہ پہنچے اور شیخ اپنے مکان میں لے گئے

۱؎ خورم سلیم یعنی جہانگیر کا بیٹا تھا۔ یہ راجہ اُدے سنگھ کی بیٹی۔ راجہ مالدیو فرمانروائے جودھپور کی پوتی کے شکم سے ۱۰۰۰ھ اسی شہر لاہور میں پیدا ہوا تھا اکبر نے اسے خود بیٹا کر لیا تھا۔ بہت پیار کرتا تھا اور ہر وقت دادا کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

۲؎ اس نے اکثر معرکوں میں دلاوری کے کارنامے دکھا کر جہانگیر سے مرتضیٰ خاں خطاب حاصل کیا۔ سید صحیح النسب تھا۔ کہتا تھا کہ میں صوری سید ہوں مگر حقیقت میں نقوی سید تھا یعنی حضرت جعفر تواب کی اولاد تھا جنہیں اکثر مصنف جعفر کذاب لکھتے ہیں اکبر کے عہد میں بھی بڑی جانفشانی اور نمک حلالی سے خدمتیں بجا لاتا رہا تھا یہاں تک کہ بخشیگری کے منصب تک پہنچا تھا۔

جب بیٹے کو کئی دن نہ دیکھا تو اکبر بھی سمجھ گیا اور اُسی عالم میں بُلایا گلے سے لگا کر بہت پیار کیا اور کہا کہ امرائے دربار کو یہیں بلا لو۔ پھر بیٹے سے کہا۔ اے فرزند! جی نہیں قبول کرتا کہ تجھ میں اور میرے ان دولتخواہوں میں بگاڑ ہو جنہوں نے برسوں میرے ساتھ یلغاروں و شکاروں میں محنتیں اٹھائیں اور تیغ و تفنگ کے منہ پر جان جوکھوں میں رہے۔ اور میرے جاہ و جلال اور ملک و دولت کی ترقی میں جانفشانی کرتے رہے۔ اتنے میں امرا بھی حاضر ہو گئے۔ سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اے میرے وفادارو۔ اے میرے عزیزو اگر بھولے سے بھی کوئی خطا تمہاری میں نے کی ہو تو معاف کرو۔ جہانگیر نے جب یہ بات سُنی تو باپ کے قدموں پر گرا اور زار زار رونے لگا۔ باپ نے سر اٹھا کر سینہ سے لگایا اور تلوار کی طرف اِشارہ کر کے کہا اسے کمر سے باندھو۔ اور میرے سامنے بادشاہ بنو۔ اور پھر کہا کہ خاندان کی عورتوں اور حرم سرا کی بیبیوں کی غور و پرداخت سے غافل نہ رہنا۔ اور قدیمی نمک خواروں اور میرے پرانے ہواخواہوں اور رفیقوں کو نہ بھولنا۔ سب کو رخصت کر دیا۔ اور مرض کو آرام ہؤا مگر وہ طبیعت نے سنبھالا لیا تھا۔ غرض جہانگیر پھر شیخ فرید کے گھر میں جا بیٹھا ؛

اکبر کی بیماری میں خورم اس کی خدمت میں حاضر تھا۔ اسے محبت دلی اور سعادتمندی کہو یا باپ کی اور اپنی مصلحت وقت سمجھو۔ اہل تاریخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ باپ (جہانگیر) محبتِ پدری کے سبب سے بُلا بھیجتا اور کہتا تھا کہ چلے آؤ۔ دشمنوں کے نرغے میں رہنا کیا ضرور ہے۔ وہ نہ آتا تھا اور کہلا بھیجتا تھا کہ شاہ بابا کا یہ حال ہے اِس عالم میں انہیں چھوڑ کر کس طرح چلا آؤں۔ جب تک جان میں جان ہے۔ شاہ بابا کی خدمت سے ہاتھ نہ اُٹھاؤنگا۔ یہاں تک کہ ماں بیقرار ہو کر آپ اُس کے لینے کو دوڑی گئی۔ اور بہت سمجھایا مگر وہ ہرگز اپنے ارادے سے نہ ٹلا۔ دادا کے پاس رہا اور باپ کو بھی دم دم کی خبریں پہنچاتا رہا ؛

اُس وقت اُس کا وہاں رہنا اور باہر نہ آنا ہی مصلحت ہؤا۔ خان اعظم اور مان سنگھ کے آدمی ہتھیار بند چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اگر وہ نکلتا تو فوراً پکڑا جاتا۔ جہانگیر ہاتھ آجاتا تو وہ بھی گرفتار ہو جاتا۔ جہانگیر نے اِن حالات کو خود بھی تورک میں لکھا ہے۔ اُسے بڑا خطر اس واقعہ کے سبب سے تھا جو شاہ طہماسپ کے بعد ایران میں گزرا تھا۔ جب شاہ کا اِنتقال ہوا تو سلطان حیدر اپنے امرا اور رفقا کی حمایت سے تخت نشین ہو گیا۔ پری جان خانم شاہ طہماسپ کی بہن پہلے سے سلطنت کے کاروبار اور اِنتظام مہمات میں دخل رکھتی تھی وہ اسکی تخت نشینی دل سے نہ

چاہتی تھی۔ اس نے شفقت کے پیام بھیج کر بھتیجے کو قلعہ میں بلایا۔ بھتیجا نفاق سے بے خبر۔ وہ بیخبر پھوپھی کے پاس گیا۔ اور جاتے ہی قید ہو گیا۔ قلعہ کے دروازے بند ہو گئے۔ اس کے رفقا نے جب سُنا تو اپنی اپنی فوجیں لے کر آئے اور قلعہ کو گھیر لیا۔ اندر والوں نے سلطان حیدر کو مار ڈالا اور اس کا سر کاٹ کر فصیل پر سے دکھایا اور کہا کہ جس کے لئے لڑتے ہو اس کا تو یہ حال ہے اب کس بھروسے پر مرتے ہو اور سر کو باہر پھینکدیا۔ جب ان لوگوں کو یہ حال معلوم ہوا تو دل شکستہ ہو کر پریشان ہو گئے اور شاہ اسمٰعیل ثانی تخت نشین ہو گیا۔ غرض مرتضیٰ خاں (شیخ فرید بخشی) جہانگیر کا بھی خیرخواہ تھا۔ اُس نے آکر بند و بست کیا۔ وہ بخشی بادشاہی تھا اور امرا اور افواج کی طبیعت میں اثرِ عظیم رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے سبب خان اعظم کے نوکروں میں بھی تفرقہ پڑ گیا۔ خسرو کا یہ عالم تھا کہ کئی برس سے ہزار روپیہ روز (۳ لاکھ ۶۰ ہزار سالانہ) ان لوگوں کو دے رہا تھا کہ وقت پر کام آتا۔ اخیر وقت میں بعض خیرخواہانِ سلطنت نے مشورہ کر کے یہی مناسب دیکھا کہ مان سنگھ کو بنگالہ کے صوبہ پر ٹالنا چاہئے۔ چنانچہ اُسی دن اکبر سے اجازت لی اور فوراً خلعت دے روانہ کر دیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اندر اندر مدت سے کھچڑی پک رہی تھی مصلحت اندیش بادشاہ نے اپنے علو حوصلہ سے گھر کا راز کھلنے نہ دیا تھا۔ اخیر میں جا کر یہ باتیں کھلیں۔ ملا صاحب تیرہ چودہ برس پہلے لکھتے ہیں (اُس وقت دانیال اور مراد بھی زندہ تھے) ایک دن بادشاہ کے پیٹ میں درد ہوا اور شدت اُس کی اس قدر ہوئی کہ بیقراری ضبط کی طاقت سے گذر گئی۔ اس وقت عالمِ اضطراب میں ایسی باتیں کرتے تھے جس سے بڑے شہزادے پر بدگمانی ہوتی تھی کہ شاید اُسی نے زہر دیا ہے۔ بار بار کہتے تھے۔ بابا شیخو جی! ساری سلطنت تمہاری تھی۔ ہماری جان کیوں لی۔ بلکہ حکیم ہمام جیسے معتمد پر بھی سازش کا شبہ ہوا۔ پیچھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت جہانگیر نے شاہزادہ مراد پر خفیہ پہرے بٹھا دیئے تھے۔ مگر جلد ہی صحت ہو گئی۔ پھر شاہزادہ مراد اور بیگمات نے بادشاہ سے سب حال عرض کیا۔

اواخر عمر میں اکبر کو فقرا اور اہلِ کمال کی تلاش تھی اور غرض اس سے یہ تھی کہ کوئی ترکیب ایسی ہو جس سے اپنی عمر زیادہ ہو جائے۔ اس نے سُنا۔ ملک خطا میں فقرا ہوتے ہیں کہ لامہ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ کاشغر اور خطا کو سفیر روانہ کئے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ صاحب ریاضت ہندوؤں میں بہت ہوتے ہیں۔ اور ان کے مختلف فرقوں میں سے جوگی لوگ حبسِ دم۔ کایا پلٹ

اور اس قسم کے شغل و عمل بہت رکھتے ہیں اس لئے اس فرقہ کے فقیروں کو بہت جمع کرتا تھا اور اُن کے ساتھ صحبت رکھتا تھا لیکن افسوس یہی ہے کہ موت کا علاج کچھ نہیں ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ دنیا کی ہر بات میں کلام کو جگہ ہے۔ لاکلام بات ہے تو یہی ہے کہ ایک دن جانا ہے۔ غرض ۱۱ جمادی الاوّل کو طبیعت علیل ہوئی حکیم علی اپنے جملہ اوصاف کے ساتھ فنِ طبابت میں ایسا صاحبِ کمال تھا کہ اُسی کو علاج کے لئے کہا۔ اس نے ۸ دن تک دفعِ مرض کو مزاج پر چھوڑا کہ شاید اپنے وقت پر طبیعت آپ دفع کرے لیکن بیماری بڑھتی ہی گئی۔ نویں دن علاج پر ہاتھ ڈالا دس دن تک دوا کی۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ بیماری بڑھتی جاتی تھی اور طاقت گھٹتی جاتی تھی ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی	مریضِ عشق پر رحمت خدا کی

باوجود اس کے اُس ہمت والے نے ہمت نہ ہاری۔ دربار میں آبیٹھتا تھا۔ حکیم نے اُنیسویں دن پھر علاج چھوڑ دیا۔ اس وقت تک جہانگیر پاس موجود تھا مگر جب طور بے طور دیکھا تو چپکے سے نکل کر شیخ فرید بخاری کے گھر میں چلا گیا کہ اُسے باپ کے نمک حلالوں میں اپنا بھی جاں نثار سمجھتا تھا۔ یہاں وقت کا منتظر بیٹھا تھا اور دو لتخواہ دم بدم خبر پہنچا رہے تھے کہ حضور! اب فضلِ الٰہی ہوتا ہے اور اب اقبال کا ستارہ طلوع ہوتا ہے (یعنی باپ مرتا ہے اور تم تخت نشین ہوتے ہو) افسوس افسوس۔ ع

دُنیا ہیچ است و کارِ دُنیا ہمہ ہیچ

اے غافل! کتنے دن کے لئے؟ اور کس اُمید پر؟ اور اس بات کا ذرا خیال نہیں کہ ۲۲ برس کے بعد مجھے بھی یہی دن آنے والا ہے۔ اور ذرا بھی شک نہیں کہ آنے والا ہے۔ آخر بدھ کے دن ۱۲ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ کو آگرے میں اکبر نے دُنیا سے انتقال کیا۔ ۶۴ برس کی عمر پائی ⁂

آزاد۔ ذرا اس دُنیا کے رنگ دیکھو! وہ کیا مبارک دن ہو گا! اور دلوں کی شگفتگی کا کیا عالم ہو گا جس میں کہنے والوں نے ولادت کی تاریخیں کہی تھیں۔ انہی میں سے ایک تاریخ ہے ع

شبِ یکشنبہ و پنج رجب است

لہ ایشیائی سلطنتوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ کے مرتے ہی بغاوت ہو جاتی ہے۔ سلطنت کے دعویدار مختلف امرا و ارکانِ سلطنت کو ملا لیتے ہیں ہزاروں واقعہ طلب لالچی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ دعویدارِ سلطنت کے کبھی کشت و خون سے کبھی سازش سے ایک دوسرے کو مروا ڈالتے ہیں ⁂

تاریخ کیا ہے! لطیفۂ غیبی ہے۔ سنہ۔ مہینا۔ دن۔ تاریخ۔ وقت سب موجود۔ ایسے بادشاہ کی تاریخ بھی ایسی ہی چاہیئے تھی اور اُس دن کی خوشی کا کیا کہنا کہ جمعہ ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو تخت پر بیٹھا۔ کسی نے نصرت اکبر۔ کسی نے کام بخش۔ خدا جانے کیا کیا تاریخیں کہی ہوں گی اللہ اللہ وہ گجرات کی یلغاریں وہ خان زماں کی لڑائیاں۔ وہ جشنوں کی بہاریں۔ اقبال کے نشان۔ خدائی کی شان ؎

ہمیشہ رہے نام اللہ کا	گیا حسن خوبان دلخواہ کا

کہاں وہ عالم! کہاں آج کا عالم! ذرا آنکھیں بند کرکے خیال کرو۔ اُس کا مُردہ ایک الگ مکان میں سفید چادر اوڑھے پڑا ہے۔ ایک مُلّا صاحب تسبیح ہلا رہے ہیں۔ چند حافظ قرآن شریف پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ خدمتگذار بیٹھے ہیں۔ نہلائینگے۔ کفنائینگے۔ بناویں دروازے سے چُپ چپاتے لے کر چلے جائینگے۔ دفنا کر چلے آئینگے ؎

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے	لائی حیات آئے۔ قضا لے چلی۔ چلے

وہی ارکان دولت جو اُس کی بدولت سونے روپے کے بادل اُڑاتے تھے۔ موتی رولتے تھے۔ جھولیاں بھر بھر لے جاتے تھے۔ اور گھروں پر لُٹاتے تھے۔ زرق برق پڑے پھرتے ہیں۔ نیا دربار سجاتے ہیں۔ نئے سنگار۔ نئے نقشے تراشتے ہیں۔ نئے بادشاہ کو نئی خدمتیں دکھائینگے بڑی بڑی ترقیاں پائینگے۔ جس کی جان گئی اُس کی پروا بھی نہیں۔ آصف خاں کو آفرین ہے۔ اُسی عالم میں ایک تاریخ تو کہہ دی ؎

گشت تاریخ فوت اکبر شاہ	فوت اکبر شد از قضائے اِلٰہ

اِس میں ایک زیادہ ہے۔ کسی نے تخرجہ خوب کیا ہے۔ ع

الف کشیدہ ملائک ز فوت اکبر شاہ

یعنی ملائک نے اس کے غم میں فقیری و قلندری اختیار کی۔ اس لئے ماتھے پر الف اللہ کا کھینچا۔ وہاں آسمان پر اُنھوں نے وہ الف کھینچا۔ یہاں اعداد میں سے الف کا ایک شاعر نے کھینچ لیا۔ ۱۰۱۴ پورے رہ گئے ✤

آزاد۔ الف کشیدن بمعنی قلندری اختیار کردن کے لئے فارسی میں کسی اُستاد کے کلام سے سند چاہیئے ✤

اور سکندرہ کے باغ میں کہ اکبرآباد سے کوس بھر ہے دفن کیا ✤

ایجاد ہائے اکبری

اگرچہ علوم نے اُس کی آنکھوں پر عینک نہ لگائی تھی۔ اور فنون نے دماغ پر دستکاری بھی خرچ نہ کی تھی۔ لیکن وہ ایجاد کا عاشق تھا۔ اور یہی فکر تھا کہ ہر بات میں نئی بات پیدا کیجئے۔ اہلِ علم اور اہلِ کمال گھر بیٹھے تنخواہیں اور جاگیریں کھا رہے تھے۔ بادشاہ کے شوق ان کے آئینہ ایجاد کو اُجالتے تھے۔ وہ نئی سے نئی بات نکالتے تھے۔ نام بادشاہ کا ہوتا تھا۔

شیر شکار اکبر ہاتھیوں کا شوقین تھا۔ ابتدا میں فیل شکاری کا شوق ہوا اور کہا کہ ہم خود ہاتھی پکڑینگے۔ اس میں بھی نئے نئے ایجاد نکالینگے۔ چنانچہ ۹۷۱ھ میں مالوہ پر فوج کشی کی تھی۔ گوالیار سے ہوتے ہوئے نرور کے جنگلوں میں گھس گئے۔ لشکر کو کئی فوجوں میں تقسیم کیا۔ ایک ایک فوج پر ایک ایک امیر کو فوجدار کیا۔ اور اپنے اپنے رُخ کو چلے۔ بہت سرگردانی کے بعد پہلے ایک ہتنی نظر آئی۔ اس کی طرف ہاتھی لگایا وہ بھاگی یہ پیچھے پیچھے دوڑے اور اتنا دوڑے گئے کہ وہ تھک کر ڈھیلی ہو گئی۔ داہنے بائیں جو دو ہاتھی لگے ہوئے تھے۔ ایک نے رستا پھینکا دوسرے نے لپک لیا اور دونوں طرف سے لٹکا کر اتنا ڈھیلا چھوڑا کہ ہتنی کی سونڈ کے نیچے ہو گیا پھر جو تانا تو گلے سے جا لگا۔ ایک فیلبان نے اپنا سرا دوسرے کی طرف پھینک دیا۔ اس نے لپک کر دونوں سروں میں گرہ دی یا بل دیا۔ اور اپنے ہاتھی کے گلے میں باندھ لیا۔ پھر جو ہاتھی کو دوڑایا تو ایسا دبائے چلا گیا کہ ہتنی ہانپ کر بے دم ہو گئی۔ ایک فیلبان اپنا ہاتھی برابر لے گیا۔ اور جھپٹ اس کی پشت پر جا بیٹھا۔ آہستہ آہستہ رستے پر لگایا۔ ہری ہری گھانس سامنے ڈالی۔ کچھ چاٹ دی۔ کچھ کھلایا۔ وہ بھوکی پیاسی تھی۔ جو کچھ ملا غنیمت معلوم ہوا۔ پھر جہاں لانا تھا لے آئے۔ مُلّانے کتابدار کا بیٹا بھی ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کھینچا تانی میں ہاتھیوں کی روندن میں آ گیا تھا۔ غنیمت ہوا کہ جان بچ گئی۔ گرتا پڑتا بھاگا۔

چلتے چلتے ایک کجلی بن میں جا نکلے۔ ایسا گھن کا بن تھا۔ کہ دن بھی شام ہی نظر آتا تھا۔ اقبال اکبری خدا جانے کہاں سے گھیر لایا تھا۔ کہ وہاں ۷۰ ہاتھی کا گلہ چرتا نظر آیا۔ بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اُسی وقت آدمی دوڑائے۔ تمام فوجوں کے ہاتھی جمع کر لئے۔ اور لشکر سے شکاری رسّے منگائے۔ اپنے ہاتھی پھیلا کر رستے روک لئے۔ اور بہت سے ہاتھیوں کو ان میں ملایا۔ پھر گھیر کر آہستہ آہستہ ایک کھلے جنگل میں لائے۔ چرکٹوں اور فیلبانوں کو ہزار آفرین کہ جنگلیوں کے

پاؤں میں رسّے ڈال کر درختوں سے باندھ دیا۔ بادشاہ اور ہمراہی وہیں اُتر پڑے جس جنگل میں کبھی آدمی کا قدم نہ پڑا ہوگا قدرت کا گلزار نظر آنے لگا۔ رات وہیں کاٹی۔ دوسرے دن عید تھی وہیں جشن منائے۔ گلے مل مل کر آپس میں مبارکبادیں دیں اور سوار ہوئے۔ ایک ایک جنگلی کو دو دو اکبری ہاتھیوں کے بیچ میں رسّوں سے جکڑ کر رواں کیا۔ حکمت عملی سے آہستہ آہستہ لیکر چلے۔ کئی دن کے بعد جہاں لشکر کو چھوڑ کر گئے تھے۔ آن شامل ہوئے۔ افسوس یہ ہے کہ جاتے ہوئے جبکہ ہاتھیوں کا حلقہ دریائے چنبل سے اُترتا تھا۔ للکنہ ہاتھی ڈوب گیا ؀

سنہ ۹۷۱ھ میں اکبر ملک مالوہ سے خاندیس کی سرحد پر دورہ کرکے آگرہ کی طرف پھرا۔ رستے میں قصبہ سیری پر ڈیرے ہوئے اور ہاتھیوں کا شکار ہونے لگا۔ ایک دن بڑا گلہ ہاتھیوں کا جنگل میں ملا۔ حکم دیا کہ بہادر سوار جنگل میں پھیل جائیں۔ گلہ پر گھیرا ڈال کر ایک طرف کا رستہ کھلا رکھیں اور بیچ میں رہ کر نقارے بجانے شروع کریں۔ چند فیلبانوں کو حکم دیا کہ اپنے سدھے سدھائے ہاتھیوں پر سوار ہو جاؤ۔ اور سیاہ شالیں اوڑھ کر ان کے پیٹ سے اِس طرح وصل ہو جاؤ کہ جنگلی ہاتھیوں کو ذرا نظر نہ آؤ۔ اور اُن کے آگے آگے ہو کر قلعہ سیری کی طرف لگائے چلو۔ سواروں کو سمجھا دیا کہ گھیرے نقارے بجاتے چلے آؤ۔ منصوبہ درست بیٹھا اور سارے ہاتھی قلعۂ مذکور میں فیل بند ہو گئے۔ فیلبان کوٹھوں اور دیواروں پر چڑھ گئے۔ بڑے بڑے رسّوں کی کمندیں اور پھاندیں ڈال کر سب کو باندھ لیا۔ ایک ہاتھی بڑا بلونت اور مستی میں بپھرا ہُوا تھا کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ حکم دیا کہ ہمارے کھانڈے رائے ہاتھی کو لیکر اس سے لڑاؤ۔ وہ بڑا تناور اور جنگی ہاتھی تھا۔ آتے ہی ریل دھکیل ہونے لگی۔ ایک پہر دونو پہاڑ ٹکرائے آخر جنگلی کے لشتے ڈھیلے ہو گئے۔ قریب تھا کہ کھانڈے رائے اُسے دبالے۔ حکم ہُوا کہ مُنہ پر مشعلیں جلا جلا کر مارو تا کہ اُس کا پیچھا چھوڑے بڑی مشکلوں سے دونو جُدا ہوئے۔ مگر جنگلی دیوزاد جب دھرے سے چھُٹا تو بھاگا اور قلعے کی دیوار ٹکروں اور ٹھوکروں سے توڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ یوسف خاں کوکلتاش (مرزا عزیز کوکہ کے بڑے بھائی) کو کئی ہاتھی اور ہاتھی بان دے کر اُس کے پیچھے بھیجا اور کہا کہ رن بھیرول ہاتھی کو (کہ حلقۂ خاصہ کا ہاتھی اور بدمستی اور زبردستی میں بدنام عالم تھا) جا کر اُلجھا دو۔ تھکا ہُوا ہے۔ ہاتھ آجائیگا۔ اس نے جا کر پھر لڑائی ڈالی۔ فیل بانوں نے رسّوں میں پھانس کر ایک درخت سے جکڑ دیا اور دو تین دن میں چارہ پر لگا کرلے آئے۔ چند روز تعلیم پا کر فیلہائے خاصہ میں داخل ہو گیا۔ اور گج پتی خطاب پایا ؀

گوئے آتشیں

چوگان بازی کا بہت شوق تھا۔ اکثر ہوتا تھا کہ کھیلتے کھیلتے شام ہو گئی۔ بازی ابھی تمام نہ ہوئی۔ اندھیرا ہو گیا گیند نہیں دکھائی دیتی۔ ناچار کھیل بند کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے ۹۷۴ھ میں گوئے آتشیں نکالی کہ اندھیرے میں شعلے کی طرح جاتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک قسم کی لکڑی کی تراشی تھی۔ اُوپر کچھ دوائیں مل دیتے تھے (فاس فورس ہوگا) جب ایک دفعہ اُسے آگ دیتے تھے تو چوگان کی چوٹ اور زمین پر جھٹنے یا لُڑھکنے سے بجھتی نہ تھی۔ واہ۔ رات کی بہار دِن سے بھی زیادہ ہو گئی۔

چار ایوان یا عبادت خانہ

۹۸۳ھ میں دولتخانۂ فتحپور میں تیار ہُوا۔ یہ گویا ایک کونسل (انجمن) عقلا۔ علما کی تھی کہ مسائل مذہبی۔ مہمات سلطنت مقدمات ملکی اس میں پیش ہوتے تھے۔ اور جو کتابی یا عقلی اختلاف ان میں ہوتے تھے وہ کھُل جاتے تھے۔ جس وقت اسے قرار دیا تھا۔ تو خالص نیک نیتی کے ساتھ یہی غرض رکھی تھی دوسرا ایجاد قدرتی پیدا ہو گیا کہ آپس کے رشک اور اختلاف باہمی کے سبب سے ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اس سے شریعت جو سلطنت کو دبائے ہُوئے تھی اس کا زور ٹوٹ گیا۔

تقسیم اوقات

۹۸۶ھ میں تقسیم اوقات کی ہدایت فرمائی۔ جب سو کے اُٹھیں تو سب کاموں سے ہاتھ روک کر باطن ہی کی طرح ظاہر کو بھی نیاز طلب کریں (عبادت میں مصروف ہوں) اور دل کو جان آفریں کی یاد سے روشنی دیں۔ اس ضروری وقت میں یہ بھی چاہیئے کہ نئی زندگی پائے۔ شروع وقت کو کسی اچھے کام سے سجائیں کہ سارا دن اچھی طرح گزرے۔ اس کام میں ۵ گھڑی سے کم خرچ نہ ہو (دو گھنٹے ہُوئے) اور اسے ابواب مقاصد کی کنجی سمجھے۔

بدن کا بھی تھوڑا سا خیال چاہیئے۔ اس کی خبر گیری اور لباس پر توجہ کرنی چاہیئے مگر اس میں ۳ گھڑی سے زیادہ نہ لگے۔

پھر دربارِ عام میں عدل کے دروازے کھول کر ستم رسیدوں کی خبر گیری کریں۔ گواہ اور قسم حیلہ گروں کی دست آویز ہے۔ اس پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ تقریروں کے اختلاف اور قیافوں کے اندازے اور نئی جستجوؤں سے اور بڑی بڑی حکمتوں سے مطلب کا کھوج لگانا چاہیئے۔ یہ کام ڈیڑھ پہر سے کم نہ ہوگا۔

دُنیا عالم تعلق ہے۔ تھوڑا کھانے پینے میں بھی مصروف ہونا ضرور ہے کہ کام اچھی طرح ہوسکے اس میں دو گھڑی سے زیادہ نہ لگائینگے ؛

پھر عدالت کی بارگاہ کو بلندی بخشینگے۔ جن بے زبانوں کے دل کا حال کوئی کہنے والا نہیں ان کی خبر لیں۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ۔ خچر وغیرہ کو ملاحظہ کریں۔ اس بے تکلف مخلوق کے کھانے کھلانے کی بھی خبر لینی واجب ہے۔ ۲ گھڑی اس کیلئے جدا کرنی چاہیئے ؛

پھر محلوں میں جایا کریں۔ اور جو پاکدامن بیبیاں وہاں حاضر ہوں ان کی عرض معروض سُنیں کہ مرد عورت برابر اور انصاف سب پر شامل رہے ؛

بدن ہڈیوں کی عمارت ہے۔ نیند پر اس کی بنیاد رکھی ہے۔ اس نیت سے کہ طاقت اور شکرانہ مل کر کارگذاری کریں اڑھائی پہر نیند کو دینے چاہئیں۔ ان ہدایتوں سے اہل شرف نے سعادت کا سرمایہ سمیٹا۔ اور سخت بیداری کا آئین ہاتھ آیا ؛

معافی جزیہ و محصول تمام احکام اکبری میں جو حکم سُنہری حرفوں سے لکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ۹۸۱ھ کے پس و پیش میں جزیہ اور چنگی کا محصول معاف کر دیا۔ جس کا محاصل کئی کروڑ روپیہ ہوتا تھا ؛

گُنگ محل گفتگو ہوتی کہ انسان کی طبعی اور مادری زبان کیا ہے؟ خدا کے ہاں سے کیا مذہب لے کر آتے ہیں؟ اور پہلے پہل کیا کلمہ ان کی زبان سے نکلتا ہے۔ ۹۸۸ھ میں اس کی تحقیق کے لئے شہر سے الگ ایک وسیع عمارت بنوائی۔ تقریباً ۲۰ بچے پیدا ہوتے ہی ماؤں سے لے لئے۔ اور وہاں لے جاکر رکھا۔ اتائیں۔ پالنے والی۔ خدمت گذار کیا عورتیں کیا مرد۔ سب گُونگے ہی رکھے کہ گفتگوے انسانی کی آواز تک کان میں نہ جائے آرام و آسائش کے سامان کمال فارغ البالی کے ساتھ موجود تھے۔ مقام کا نام **گُنگ محل** تھا۔ چند سال کے بعد آپ وہاں گئے۔ خدمتگاروں نے بچوں کو لاکر آگے چھوڑا۔ چھوٹے چھوٹے تھے۔ چلتے۔ پھرتے۔ کھیلتے۔ کودتے۔ بولتے بھی تھے مگر بات کا ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جانوروں کی طرح غائیں غائیں کرتے تھے۔ گُنگ محل میں پلے تھے۔ گُونگے نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔ الاسماء تنزل من السماء ؛

التزام دوازدہ سالہ اکبر کے کاروبار کے عمل درآمد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایجاد اسکے رفع قباحت یا باعث آسائش۔ یا فائدہ کی نظر

سے ہوتے تھے۔ بعض فقط مضامین شاعرانہ تھے۔ بعض اس خیال سے تھے کہ مختلف بادشاہوں سے خاص خاص باتیں یادگار ہیں۔ یہ بات ہماری بھی یادگار رہے۔ چنانچہ ۹۸۸ھ میں خیال آیا کہ ہمارے بزرگوں نے ۱۲ ۱۲ سال کا ایک ایک مجموعہ کر کے ہر سال کا ایک ایک نام رکھا ہے۔ آئین باندھنا چاہیئے کہ ہم اور ہمارے جاں نثار ہر سال میں اس کے مناسب حال ایک خاص کام التزام رکھیں :-

سچقائیل	چوہے کو نہ ستائیں (سچقان = موش)
اودئیل	گائے بیل کو پرورش اور کسانوں کو دان پُن کر کے مدد کریں (اود = گاؤ)
پارسن ئیل	نہ چیتے کو شکار کریں نہ چیتے سے شکار کریں (پارس = پلنگ)
توشقائیل	نہ خرگوش کھائیں نہ اُس کا شکار کریں (توشقان = خرگوش)
لوئی ئیل	مچھلی سے وہی معاملہ رہے (لوئی = مگرمچھ)
ییلائیل	سانپ کو نہ آزار دیں (ییلان = مار)
آیت ئیل	نہ گھوڑوں کو ذبح کریں نہ کھائیں۔ خیرات میں دیں (آت = گھوڑا)
قوی ئیل	بکری سے یہی سلوک رہے (قوی = بکری)
پچی ئیل	بندر کا شکار نہ کریں۔ جس کے پاس ہو۔ جنگل میں چھوڑ دے (پچی = بندر)
تخاقوئیل	مرغا نہ ماریں۔ نہ لڑائیں (تخاقو = مرغا)
ایت ئیل	کتّے کے شکار سے دل نہ بہلائیں اس وفادار کو آرام دیں خصوصاً بازاری کو (ایت = کُتا)
تنگوزئیل	سُؤر کو نہ ستائیں (تُنگُز = سُؤر)

چاند کے مہینوں میں امورات مفصلۂ ذیل کا لحاظ رکھیں :-

محرم	جاندار کو نہ ستاؤ
صفر	بندی آزاد کرو
ربیع الاول	۳۰ نیک محتاج شخصوں کو بخشش کرو
ربیع الثانی	غسل کر کے خوشحال ہو
جمادی الاول	لباس فاخرہ اور ابریشمیں کپڑے نہ پہنو
جمادی الثانی	چمڑا کام میں نہ لاؤ
رجب	۴۰ برس کی دستگاہ کے بموجب اپنے ہم سال کے لئے دستگیری کرو
شعبان	کسی پر سختی نہ کرو
رمضان	اپاہج کو کھلاؤ۔ پہناؤ
شوال	ہزار دفعہ نام الٰہی ورد کرو
ذیقعدہ	اول شب جاگتے رہو۔ اور چند غیر مذہب آدمیوں کو سلوک کر کے روز خوش کرتے رہو
ذالحجہ	آسائش خلق کے لئے عمارت بناؤ

مردم شماری ۹۸۹ھ میں حکم ہوا کہ تمام جاگیردار۔ عامل۔ شقدار وغیرہ وغیرہ سب ملک و قوم مردم شماری۔ نام بنام بہ قید پیشہ و حرفہ وغیرہ وغیرہ مرتب کریں۔

خیر پورہ۔ دھرم پورہ شہروں اور منزلوں میں جابجا دو دو مقام مقرر ہوئے کہ ہندو مسلمان وہاں کھانا کھائیں اور سامان آسائش سے آرام پائیں مسلمانوں کے لئے خیر پورہ۔ ہندوؤں کے لئے دھرم پورہ۔

شیطان پورہ ۹۹۰ھ میں آباد ہوا اُس کی سیر دیکھنی ہے تو دیکھو صفحہ ،،

زنانہ بازار جشن سالانہ کے درباروں کا انداز تم نے دیکھ لیا ہے۔ اُس کے بازاروں کا تماشا محلوں کی بیگمات کو بھی دکھایا۔ ۹۹۱ھ میں یہ آئین قرار پایا دیکھو صفحہ ۱۵۳

ترقی اجناس مختلف اشیاء جو مہمات سلطنت میں اجزائے ضروری بلکہ ہمیشہ کاروبار کے لازمی اوزار ہوتے ہیں وقت پر تیار نہیں ملتیں اس لئے ۹۹۰ھ میں حکم دیا کہ ایک ایک کی حفاظت اور ترقی اور عمدہ اقسام کا بہم پہنچانا ایک ایک امیر کے ذمہ ہو۔ اس سپردگی میں مناسبتِ حال بلکہ ظرافت کا گرم مصالح بھی چھڑکا۔ نمونہ کے طور پر چند نام اور نامداروں کے کام لکھتا ہوں۔

عبدالرحیم خانخاناں	گھوڑے کی نگہداشت
راجہ ٹوڈرمل	ہاتھی اور غلہ
مرزا یوسف خاں	خان اعظم کے بڑے بھائی کو اونٹ کی نگہداشت سپرد کی۔ شاید اس میں یہ اشارہ ہو کہ اس گھرانے کا ہر شخص عقل کا اونٹ ہے۔
شریف خاں	بھیڑ۔ بکری۔ اعظم خاں کے چچا تھے۔ بھیڑ بکری کیا بلکہ دُنیا کے جانور اس خاندان کی اُمت تھے۔
شیخ ابوالفضل	پشمینہ
نقیب خاں	کتابت
قاسم خاں میر بحر و میر بر	پھول پتی۔ جڑی بوٹی وغیرہ نباتات ان کے سپرد ہوئی۔ مطلب یہ کہ جنگل اور دریا کے سامان خوب بہم پہنچینگے۔ دونوں میں انہیں کی بادشاہی ہے۔
حکیم ابوالفتح	مسکرات۔ مطلب یہ کہ حکیم ہیں اسمیں بھی حکمتیں نکالیں۔

راجہ بیربر گائے بھینس۔ اس میں اشارہ تھا کہ گائے کی رکھیا تمہارا دھرم ہے اور بھینس اسکی بہن ہے۔ لطف یہ ہے کہ صورت دیکھو تو خود ایک جاموش اکبری ہے ؎

کشمیر میں کشتیوں کی عُمدہ تراشیں

۹۹۷ھ میں لشکر اور امرائے لشکر اور بیگمات سمیت گلگشت کشمیر کو گئے دریا اور تالابوں میں ۳۰ ہزار کشتی سے زیادہ چلی جاتی تھی۔ مگر بادشاہی نشست کے لائق ایک بھی نہ تھی بنگالے کی کشتیاں اور ان کے نشیمن اور مکانات اور بالا خانے اور کھڑکیوں کی عمدہ تراشیں دیکھی تھیں۔ ان کے نمونے پر ہزار کشتی چند روز میں تیار ہو گئی اور امرا نے بھی اس طرح پانی پر گھر بنائے۔ دریا پر ایک آباد شہر چلنے لگا ؎

جہاز

۱۰۰۳ھ میں دریائے راوی کے کنارے پر جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز الٰہی کا مستول تھا۔ ۲۹۳۶ بڑے بڑے شہتیر سال اور ناجو کے۔ ۸۴۴۸ من دو سیر لوہا خرچ ہوا ۲۴۰ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اُس میں کام کرتے تھے۔ جب تیار ہوا تو جہاز سلطنت کا ناخدا کنارے آکر کھڑا ہوا۔ جر ثقیل کے عجیب و غریب اوزار لگائے۔ ہزار آدمی نے ہاتھ پاؤں کا زور لگایا۔ ۱۰ دن میں بڑی مشکل سے پانی میں ڈال کر لاہری بندر کو روانہ کیا۔ جہاز کے بوجھ اور دریا کی کم آبی کے سبب سے جا بجا رُک گیا اور بڑی مشکل سے بندر مقصود تک پہنچا۔ اُس زمانہ میں ایسے روشن دماغ اور یہ سامان کہاں تھے جو دریا کا زور بڑھا کر گزرگاہ کو جہازرانی کے قابل کر لیتے اس لئے آمد و رفت جاری نہ ہوئی۔ اگر امرائے عہد اور اس کے جانشین بھی ویسے ہی ہوتے تو کام چل نکلتا ؎

۱۰۰۴ھ میں ایک اور جہاز تیار ہوا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھ کر جہاز کے بوجھ کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی ۱۵ ہزار من سے زیادہ بوجھ اُٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک آسان جا پہنچا اس کا مستول ۳۰ گز کا تھا ۱۶۳۳۳ روپے کی لاگت میں تیار ہوا تھا (دیکھو اکبرنامہ)

اکبر کی تحصیل علمی اور شوق علمی

سلاطین و امرا کے بچوں کے لئے ایشیائی ملکوں میں پڑھنے لکھنے کی عمر چھ سات برس سے زیادہ نہیں۔ جہاں گھوڑے پر چڑھنے لگے۔ چوگان بازی شروع ہوئی۔ پھر شکار ہونے لگے۔ شکار کھیلتے ہی کھل کھیلے۔ اب پڑھنا کیا اور لکھنا کیا۔ چند روز میں ملک و دولت کے شکار پہ گھوڑے

دوڑنے لگے ۔

اکبر جب ۴ برس ۴ مہینے ۴ دن کا ہؤا تو ہمایوں نے بیٹے کی بسم اللہ کی ۔ ملا عصام الدین ابراہیم کو آخوندی کا اعزاز ملا چند روز کے بعد سبق سُنا تو معلوم ہوا کہ اللہ اللہ ۔ ہمایوں نے جانا کہ اس مُلّانے توجہ نہیں دی ۔ لوگوں نے کہا کہ مُلّا کو کبوتر بازی کا بہت شوق ہے ۔ شاگرد کا دل بھی کبوتروں میں ہوائی ہو گیا ۔ ناچار مُلّا بایزید کو مقرر کیا ۔ مگر نتیجہ کچھ نہ حاصل ہوا ۔ ان دونوں کے ساتھ مولانا عبد القادر کا نام شامل کر کے قرعہ ڈالا ۔ اس میں مولانا کا نام نکلا ۔ چند روز وہ پڑھاتے رہے ۔ غرض جب تک کابل میں رہا اپنے دلی شوق سے شہ سواری ۔ شتر دوانی ۔ سگ تازی کبوتر بازی میں اُلجھا رہا ۔ ہندوستان میں آکر بھی وہی شوق رہے ۔ ملا پیر محمد ۔ بیرم خان خان خاناں کے وکیل تھے ۔ جس وقت حضور کی طبیعت حاضر ہوتی اور خیال آتا ۔ تو برائے نام ان کے سامنے بھی کتاب لے بیٹھتے ۔

۹۶۳ھ میں میر عبد اللطیف قزوینی سے دیوان حافظ وغیرہ پڑھنا شروع کیا ۹۸۶ھ میں علما کے جھگڑے سُن سُن کر زبانِ عربی کی بھی ہوس ہوئی ۔ اور صرف ہوائی شروع کی ۔ شیخ مبارک اُستاد ہوئے ۔ مگر اب بچپن کا مغز کہاں سے آئے ۔ خیر یہ بھی ایک ہوا تھی چند روز میں بدل گئی ایک لطیفہ اکثر اشخاص کی زبانی سُنا مگر کتاب میں نہیں دیکھا ۔ چونکہ مشہور ہے ۔ آمدِ سخن کے طور پر لکھا جاتا ہے ۔ ایک دن خلوت کا دربار ہوا ۔ اراکین خاص موجود ۔ ایلچی توران مراسلت گذرانتا ہے ۔ اُس نے ایک کاغذ پیش کر کے اکبر کی طرف بڑھایا کہ قبلۂ عالم ملاحظہ فرمایند فیضی نے اُس کے ہاتھ سے لے لیا کہ پڑھے ۔ وہ ایک انداز سے مُسکرایا ۔ اور نگاہوں سے طنز بے علمی کے اشارے ٹپکتے تھے فیضی فوراً بولے ۔ درحضرتِ ما سخن مگوئید ۔ مگر نشنیدید کہ پیغمبر ما صلوٰۃ اللہ علیہ سلم اُمّی بودہ ۔

ہندوستان کے مورخ کہ تمام دولت چغتائی کے نمک خوار تھے ۔ عجیب عبارتوں سے اسکی بے علمی کو جلوے دیتے ہیں ۔ کبھی کہتے ہیں ۔ حقیقت معنوی پر عالم صُورت کے علوم کا پردہ نہ ڈالا تھا ۔ کبھی کہتے ہیں پروردگار کو ثابت کرنا تھا ۔ کہ یہ برگزیدہ الٰہی بے تحصیل علوم ظاہری کے ہمارے فیوضات نامتناہی کا منبع ہے ۔ کبھی کہتے ہیں ۔ اس میں حکمتِ الٰہی یہ تھی کہ اہل علم پر روشن ہو جائے کہ اکبر بادشاہ خدا آگاہ کی عقل و دانش خداداد ہے ۔ بندہ سے حاصل کی ہوئی نہیں ہے ۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ تھا مگر علم کا مذاق بلکہ علوم و فنون کا شوق اور قدر دانی کا جوش جو اس کو تھا کوئی

عالم بادشاہ بھی ہو تو شائد اتنا ہو۔ ذرا عبادت خانہ چار ایوان کے جلسے یاد کرو۔ راتوں کو ہمیشہ کتابیں پڑھواتا تھا۔ اور سنتا تھا۔ علمی تحقیقیں تھیں۔ علمی باتیں تھیں۔ اور علمی چرچے تھے۔ کتب خانہ کئی جگہ تقسیم تھا۔ کچھ حرم سرا میں۔ کچھ باہر۔ اس میں دو قسمیں تھیں۔ کچھ قدر و قیمت۔ کچھ علوم و فنون نثر نظم۔ ہندی۔ فارسی کشمیری۔ عربی الگ الگ تھیں۔ اِسی انتظام سے سال بسال موجودات لی جاتی تھی۔ عربی کا نمبر سب سے اخیر تھا۔ اہل دانش وقت معمولی پر کتابیں سُناتے تھے۔ اور وہ بھی جس کتاب کو سنتا تھا۔ ایک صفحہ بھی نہ چھوڑتا تھا۔ پڑھتے پڑھتے جہاں پر ملتوی کرتے تھے۔ وہاں اپنے ہاتھ سے نشان کر دیتا تھا۔ اور جب کتاب ختم ہوتی تو پڑھنے والے کو بحساب صفحات جیب خاص سے انعام ملتا تھا ؏

مشہور کتابوں میں سے شائد ہی کوئی کتاب ہوگی جو اس کے سامنے نہ پڑھی گئی کوئی تاریخی سرگذشت۔ اکثر فقہی مسائل۔ علوم کے عمدہ مباحثے۔ فلسفہ و حکمت کے نکتے ایسے نہ تھے جن میں وہ خود بحث اور گفتگو نہ کر سکتا ہو۔ کتاب کے دوبارہ سُننے سے اکتاتا نہ تھا۔ بلکہ اور بھی دل لگا کر سنتا تھا۔ اور اس کے مطالب پر گفتگو کرتا تھا۔ اخلاق ناصری۔ کیمیاے سعادت سینکڑوں مسئلے فقہ کے اور اس میں اختلاف علمائے کے زبانی یاد تھے۔ تاریخی معلومات میں ایک جامع الاخبار کتاب بلکہ کتب خانہ تھا۔ ملا صاحب منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں حکایت سلطان شمس الدین التمش کے باب میں مشہور ہے کہ وہ ہنبر تھا۔ اور اصل اس کی یہ ہے کہ اُس نے ایک دفعہ کسی خوبصورت صاحب جمال لونڈی سے صحبت کرنی چاہی۔ کچھ نہ ہو سکا۔ اور چند دفعہ ایسا ہی ارادہ کیا مگر خالی گیا۔ ایک دن وہی لونڈی اس کے سر میں تیل مل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ کئی بوندیں سر پر ٹپکی ہیں۔ بادشاہ نے سر اُٹھا کر دیکھا اور رونے کا سبب پوچھا۔ بڑے اصرار سے بتایا کہ مجھے یاد ہے بچپن میں میرا ایک بھائی تھا اور آپ کی طرح اس کے بھی سر کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ اُسے یاد کر کے میرے آنسو نکل پڑے۔ جب تحقیق کیا کہ یہ تباہی زدہ کیونکر آئی تھی اور کہاں سے آئی تھی تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کی حقیقی بہن تھی۔ خدا نے اس نیک نیت بادشاہ کو اِس طرح گناہ سے بچایا۔ بعد اس کے ملا صاحب لکھتے ہیں کہ راقم اوراق کو خلیفۂ آفاق اکبر بادشاہ اکثر خلوت گاہ میں رات کو بلا لیتے تھے اور گفتگوئے زبانی سے اعزاز بڑھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فتحپور میں اور ایک دفعہ لاہور میں فرمایا کہ یہ نقل سلطان غیاث الدین بلبن کی ہے اور کچھ زیادہ نکتے بھی بیان فرمائے۔ قابوس نامہ۔ ملفوظات شیخ شرف الدین منیری حدیقہ حکیم

ثنائی مثنوی معنوی۔جام جم۔شاہنامہ خمسۂ نظامی۔کلیات امیر خسرو۔کلیات جامی۔دیوان خاقانی انوری وغیرہ وغیرہ اور ہر قوم کی تاریخیں اس کے سامنے بلاناغہ پڑھی جاتی تھیں۔اور گلستان بوستان سب سے زیادہ۔

ترجمہ کا سررشتہ خاص تھا۔مختلف زبان داں نوکر تھے سنسکرت۔یونانی۔عربی کی کتابیں فارسی اور بھاشا میں ترجمہ کرتے تھے۔جہاں یہ صاحب زبان بیٹھتے تھے اس مقام کا نام مکتب خانہ تھا۔زیچ جدید مرزا الغ بیگ کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی کے اہتمام سے ہوا کشن جوتشی۔گنگادھر مہیش مہانند بھی اس میں شامل تھے کہ سنسکرت سے مدد کرتے تھے۔

تفصیل کتابوں کی جو اکبر کی فرمائش سے یا اس کے عہد میں لکھی گئیں

کتابیں جو اس کی فرمائش سے تصنیف ہوئیں۔اب تک اہل نظر اُن میں سے مطالب کے پھول اور فوائد کے میوے چُن چُن کر دامن بھرتے ہیں اُستاد مرحوم نے کیا خوب فرمایا۔

روز اس گلشن رخسار سے لے جاتے ہیں	اپنے داماں نظر مردم بینا بھر کر

سنگھاسن بتیسی۔کی پتلیوں کو بادشاہ کی فرمائش سے ۹۸۲ھ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے فارسی کے کپڑے پہنائے اور نامۂ خرد افزا اس کا تاریخی نام ہوا۔

حیوٰۃ الحیوان۔عربی میں تھی۔اکبر پڑھوا کر اس کے معنی سنا کرتا تھا ۹۸۳ھ میں ابوالفضل سے فرمایا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ ہو چنانچہ شیخ مبارک نے لکھ دیا۔دیکھو اس کا حال۔

اتھربن بید۔۹۸۳ھ میں شیخ بھاون ایک برہمن دکن سے آکر اپنی خوشی سے مسلمان ہوا۔اور خواصوں میں داخل ہوا۔اُسے حکم ہوا کہ اس کا ترجمہ کرواؤ۔یہ چوتھا بید ہے۔فاضل بدایونی کو لکھنے کی خدمت سپرد ہوئی۔اکثر عبارتیں ایسی مشکل تھیں کہ معنی بیان نہ کر سکتا تھا۔انہوں نے عرض کی اول شیخ فیضی کو پھر حاجی ابراہیم کو یہ خدمت سپرد ہوئی۔مگر وہ بھی نہ لکھ سکے آخر ملتوی رہا۔ بلوک مین صاحب آئین اکبری کے ترجمے میں لکھتے ہیں۔ترجمہ ہو گیا تھا۔

کتاب الاحادیث ملا صاحب نے ثواب جہاد اور ثواب تیراندازی میں لکھی۔اور نام بھی تاریخی رکھا ۹۸۶ھ میں اکبر کو نذر گزرانی۔معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸۶ھ میں ملازمت سے پہلے اپنے شوق سے لکھی تھی۔ان کا قلم بھی نچلا نہ رہتا تھا۔آزاد کی طرح کچھ نہ کچھ کئے جاتے تھے لکھتے تھے۔ڈال رکھتے تھے۔

تاریخ الفی - ۹۹۰ھ میں فرمایا کہ ہزار سال پورے ہو گئے۔ کاغذوں میں سنہ الف لکھے جاتے ہیں۔ وقائع عالم کا ہزار سالہ حال لکھ کر اس کا نام تاریخ الفی رکھنا چاہئے تفصیل دیکھو عبدالقادر کا حال۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ دیباچہ میں نے لکھا۔

راماین - ۹۹۳ھ میں ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کرو۔ چند پنڈت ساتھ کئے ۹۹۷ھ میں ختم ہوئی۔ ضخامت ۱۲۰ جز ہوئی۔ کل کتاب کے ۲۵ ہزار اشلوک ہیں۔ فی اشلوک ۶۵ حرف۔ مہابھارت کو بھی انہی پنڈتوں نے ترجمہ کروایا تھا۔

جامع رشیدی - ۹۹۳ھ میں ملا عبدالقادر کو حکم ہوا کہ شیخ ابوالفضل کی صلاح سے اس کا خلاصہ کرو۔ وہ ایک مجلد ضخیم ہے۔

توزک بابری - کہ عقل عملی کا قانون ہے ۹۹۷ھ میں عبدالرحیم خان خانان نے حسب الحکم ترکی سے فارسی میں ترجمہ کر کے نذر گذرانی اور بہت پسند آئی۔

تاریخ کشمیر - راج ترنگنی کا ذکر آیا۔ وہ کشمیر کے عہد قدیم کی تاریخ زبان سنسکرت میں ہے۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی[1] ایک فاضل جامع معقول و منقول تھے۔ انہیں حکم دیا تھا کہ اس کا ترجمہ لے کر کشمیر کی تاریخ لکھو۔ تیار ہوئی تو عبارت پسند نہ آئی ۹۹۹ھ میں ملا صاحب کو حکم دیا کہ سلیس اور برجستہ عبارت میں لکھو۔ انہوں نے دو مہینے میں لکھ دی۔

معجم البلدان - ۹۹۹ھ میں حکیم ہمام نے کتاب مذکور کی بہت تعریف کی اور کہا کہ فوائد عجیب اور حکایات غریب پر مشتمل ہے ترجمہ ہو جائے تو خوب ہے۔ دو سو جز کی کتاب تھی دس بارہ شخص ایرانی و ہندوستانی جمع کئے۔ اور کتاب کے ٹکڑے کر کے بانٹ دی۔ چند روز میں تیار ہو گئی۔

نجات الرشید - ۹۹۹ھ میں خواجہ نظام الدین بخشی کی فرمائش سے ملا عبدالقادر نے لکھی نام تاریخی ہے۔

مہابھارت - سنہ الف میں ترجمہ شروع ہوا۔ بہت سے مصنف اور مترجم مصروف رہے تیار ہو کر باتصویر لکھی گئی اور مکرر لکھی گئی۔ رزمنامہ نام پایا۔ شیخ ابوالفضل نے اس پر دیباچہ لکھا۔ تقریباً دو جز ہوں گے۔

طبقات اکبر شاہی - سنہ الف تک لکھی گئی آگے نہ چلی۔

---

[1] یہ شاہ آباد علاقہ کشمیر میں ہے۔ سری نگر دارالحکومت سے ۳ منزل ادھر۔

سواطع الالہام۔ ۱۰۰۲ھ میں شیخ فیضی نے ایک تفسیر بے نقط لکھی ۵، جز ہیں۔ دیکھو فیضی کا حال۔

موارد الکلم۔ یہ بھی فیضی نے لکھی۔ بے نقط ہے۔

نلدمن۔ ۱۰۰۳ھ میں اکبر نے شیخ فیضی کو حکم دیا کہ پنج گنج نظامی پر پنج گنج لکھو۔ اُنہوں نے ۴ مہینے میں اوّل نل دمن کہہ کر گزرانی دیکھو فیضی کا حال۔

لیلاوتی۔ ایک حساب کی کتاب ہے فیضی نے سنسکرت سے فارسی کے قالب میں ڈھالی۔ دیکھو فیضی کا حال۔

بحرالاسمار۔ ۱۰۰۳ھ میں ایک ہندی افسانے کو ملا عبدالقادر بدایونی سے درست کروایا جس نے بحرالاسمار نام پایا۔ اصل ترجمہ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کے حکم سے ہوا تھا بڑی فربہ اور ضخیم کتاب ہے۔ اب نہیں ملتی۔

مرکز ادوار۔ خمسۂ مذکور میں سے یہ کتاب بھی فیضی نے لکھی تھی۔ مرنے کے بعد ایک بیاض میں متفرق اشعار مسودہ کے طور پر نکلے۔ ابوالفضل نے اُنہیں ترتیب دیکر صاف کیا۔ دیکھو فیضی کا حال۔

اکبر نامہ۔ ۴۰ برس کا حال اکبر کا ہے۔ اور آئینِ اکبری اس کا حصہ دوم۔ کل ابوالفضل نے لکھا۔ دیکھو ابوالفضل کا حال۔

عیار دانش۔ قصۂ کلیلہ و دمنہ ابوالفضل نے لکھا۔ دیکھو ابوالفضل کا حال۔

کشکول۔ شیخ ابوالفضل نے سیاحت نظر کے عالم میں جو جو کتابوں میں دیکھا اور پسند آیا۔ انتخاب کے طور پر لکھا۔ اسی مجموعہ کا نام کشکول ہے اکثر علمائے صاحبِ نظر کا قاعدہ ہے کہ جب مختلف کتابوں کی سیر کرتے ہیں تو ان میں سے یادداشتیں لکھتے جاتے ہیں۔ چنانچہ شیخ حرِ عاملی۔ شیخ بہاؤالدین۔ سید نعمت اللہ جزائری۔ شیخ یوسف بحرانی وغیرہ اکثر علما کے کشکول ہیں اور ایران میں چھپ گئے ہیں۔

تاجک۔ علمِ ہیئت میں ایک کتاب تھی۔ مکمل خاں گجراتی نے حسب الحکم اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

مہری ملبس۔ اس میں سری کرشن جی کا حال ہے۔ ملا شیری نے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا۔

جوتش۔ خان خاناں نے جوتش میں ایک مثنوی لکھی۔ ہر بیت میں ایک مصرع فارسی ایک سنسکرت

ثمرۃ الفلاسفہ۔ عبدالستار ابنِ قاسم کی تصنیف ہے۔ اکبری تاریخ میں شہرت کی سرخی اس کے

نام پر نہیں نظر آتی۔ مُصنّف خود دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں نے چھ مہینے کے عرصے میں زبان مذکور پادری جرونموشو پر سے حاصل کر لی۔ بول نہیں سکتا۔ مگر مطلب خاصہ نکال لیتا ہوں۔ چنانچہ اُدھر بادشاہ نے اس کتاب کے ترجمے کا حکم دیا۔ اِدھر کتاب تیار ہو گئی۔ مُصنّف مذکور اور اس کی کتاب ابوالفضل کے اُس فقرے کی تصدیق کرتے ہیں جو اُس نے پادری فریلتبون وغیرہ اہل فرنگ کے آنے کے ذکر میں لکھا ہے" یونانی کتابوں کے ترجمے کا سامان بہم پہنچا"۔ کتاب مذکور میں اوّل روما کی تاریخ قدیم کا مختصر بیان ہے۔ پھر مشاہیر اہل کمال کے حالات ہیں۔ اندازِ عبارت ایسا ہے کہ اگر دیباچہ نہ پڑھو تو تم جانو کہ ابوالفضل یا اُس کے شاگرد کا مسودہ ہے نظرثانی کی نوبت نہ پہنچی ہو گی۔ ۴۶ جلوسِ اکبری میں لکھی گئی ۱۰۱۱ھ ہوئے۔ یہ کتاب جناب سید محمد حسن صاحب وزیر پٹیالہ کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزری۔

خیر البیان۔ ایک کتاب پیر تاریکی نے لکھی۔ یہ وہی پیر ہے جس نے اپنا نام پیر روشنائی رکھا تھا۔ کوہستان پشاور میں جو وہابی پھیلے ہوئے ہیں وہ اُسی کی اُمّت چلے آتے ہیں۔ جو اِدھر اُدھر نئے پیدا ہوتے ہیں۔ اُنہیں میں جا ملتے ہیں۔

عماراتِ عہدِ اکبر شاہی

۹۶۲ھ میں جب ہمایوں ہندوستان پر آیا تو لاہور میں پہنچ کر آپ یہاں ٹھہرا اور اکبر کو باتالیقیِ خان خاناں آگے بڑھایا۔ سرہند کے مقام پر سکندر سور پٹھانوں کا ٹڈی دل لئے پڑا تھا خان خاناں نے جا کر میدان میں صف آرائی کی اور ہمایوں کو عرضی لکھی۔ وہ بھی جا پہنچا۔ لڑائی بڑے معرکے سے شروع ہوئی اور کئی دن تک جاری رہی۔ جو پہلو اکبر اور بیرم خاں کے سپرد تھا اُدھر سے خوب خوب کارنامے ہوئے اور جس دن شاہزادے کے دھاوے کا دن تھا اُسی دن معرکہ فتح ہوا چنانچہ اِس فتح کے تہنیت نامے اُس کے نام سے لکھے گئے۔ خان خاناں نے مقام مذکور کا نام سرمنزل رکھا کہ شاہزادہ کے نام کی پہلی فتح تھی اور ایک کلہ منار یادگار تعمیر کیا

۹۶۹ھ میں خان اعظم شمس الدین محمد خان اتکہ آگرہ میں شہید ہوئے۔ ان کا جنازہ دلّی بھجوایا اور اس پر مقبرہ بنوایا۔ اُسی تاریخ ادہم خاں اُن کے جرم قتل میں قتل ہوا۔ اُسے بھی اسی رستے روانہ کیا۔ اس کے چالیسویں کے دن ماہم بیگم اس کی ماں کہ اکبر کی انّا تھی بیٹے کے غم میں دُنیا سے کوچ کر گئی اس کا جنازہ بھی وہیں بھیجا کہ ماں بیٹے ساتھ رہیں اور اُن کی قبر پر

مقبرۂ عالیشان بنوایا۔ قطب صاحب کے پاس اب تک بھول بھلیاں مشہور ہے ؀
۹۶۳ھ سال اوّل جلوس میں ہیموں کی مہم فتح ہوئی۔ پانی پت کے میدان میں جہاں لڑائی ہوئی تھی کلہ منار بنایا دیکھو صفحہ ۹ ؀

نگر چین۔ شہر آگرہ سے ۳ کوس کے فاصلے پر کرائی ایک گاؤں تھا۔ اس دلکشا مقام کی سرسبزی اور سیرابی اکبر کو بہت پسند آئی۔ اکثر سیر و شکار کو وہیں آجاتے تھے۔ اور دل کو شگفتہ کرتے تھے ۹۷۱ھ میں خیال آیا کہ یہاں شہر آباد ہو۔ چند روز میں پھلے پھولے باغ۔ عالیشان عمارتیں۔ شاہانہ محل۔ پائین باغ۔ دلچسپ مکانات چوڑے بازار۔ اونچی اونچی دکانیں۔ بلند بالاخانے تیار ہو گئے۔ امرائے دربار اور ارکین سلطنت نے بھی اپنی اپنی وسنرس کے بموجب مکان حرم سرائیں۔ خانہ باغ تعمیر کئے۔ بادشاہ نے یہیں ایک میدان ہموار مرتب کیا تھا کہ اُس میں چوگان کھیلا کرتے تھے۔ وہ میدان چوگان بازی کہلاتا تھا۔ شہر مذکور اپنی بینظیر لطافتوں و عجیب و غریب ایجادوں کے ساتھ اس قدر جلد تیار ہوا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے (مُلّا صاحب کہتے ہیں) اور مٹا بھی ایسا جلد کہ دیکھتے دیکھتے نشان تک نہ رہا۔ میں نے خود آگرہ جا کر دیکھا اور لوگوں سے دریافت کیا۔ مقام مذکور اب شہر سے پانچ کوس سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت کی کتابوں میں جو شہر سے تین کوس فاصلہ لکھا ہے۔ اس سے اور وہاں کے کھنڈروں سے دریافت کر سکتے ہیں کہ جب شہر آگرہ کہاں تک آباد تھا۔ اور اب کتنا رہ گیا ہے ؀

مسجد و خانقاہ شیخ سلیم چشتی۔ اکبر کی ۲۷-۲۸ برس کی عمر ہو گئی تھی۔ اور اولاد نہ تھی ہوئی تو مر گئی۔ شیخ سلیم چشتی نے خبر دی کہ وارثِ تاج و تخت پیدا ہونے والا ہے۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں محل میں حمل کے آثار معلوم ہوئے۔ اس خیال سے کہ برکات الانفاس قریب تر ہو جائے۔ حرم مذکور کو شیخ کے گھر میں بھیج دیا۔ اور خود بھی وعدہ کے انتظار میں وہیں رہنے لگے۔ اسی عالم میں کہ ۹۷۷ھ تھے شیخ کی پہلی خانقاہ اور حویلی کے پاس کوہ سیکری پر ایک شاہانہ عمارت اور نئی خانقاہ اور نہایت عالیشان مسجد کی تعمیر شروع کی کہ کل سنگین ہے اور ایک پہاڑ ہے کہ پہاڑ پر دھرا ہے۔ مسافران عالم کہتے ہیں کہ ایسی عمارتیں عالم میں کم ہیں۔ تخمیناً ۵ برس میں تیار ہوئی۔ اس کا بلند دروازہ کسی بنئے نے بنوایا تھا۔

فتح پور سیکری۔ ۹۷۹ھ میں حکم ہوا کہ دیوان دولت اور شبستان حشمت کے لئے قصر ہائے عالی تعمیر ہوں اور تمام امرا درجۂ اعلیٰ سے لیکر ادنے تک سنگین اور گچکاری

کی عمارتوں سے محل اور مکان آراستہ کریں۔ سنگین اور چوڑے چوپڑ کے بازار۔ اوپر ہوا دار بالاخانے نیچے مدرسے خانقاہیں اور حمام گرم ہوں۔ شہر میں خانہ باغ۔ باہر باغ لگیں۔ شرفا و غربا ہر پیشے کے لوگ آباد ہو کر دلچسپ مکانوں اور دلکش دکانوں سے شہر کی آبادی بڑھائیں۔ گرد شہر کے پتھر اور چونے کی فصیل کا دائرہ کھینچیں۔ ۴ کوس کے فاصلے پر مریم مکانی کے محل اور باغ دلکشا تھا۔ بابر نے بھی رانا پر یہیں فتح پائی تھی۔ اکبر نے مبارک شگون سمجھ کر فتح آباد نام رکھا تھا پھر فتح پور مشہور ہو گیا اور بادشاہ کو بھی یہی منظور ہو گیا الاسماء تنزل من السماء۔ چاہا تھا کہ یہی دارالخلافہ ہو جائے۔ خدا نے نہ چاہا۔ ۹۸۵ھ میں حکم دیا کہ ٹکسال بھی یہیں جاری ہو۔ چنانچہ ۴ گوشہ روپے پہلے وہیں سے نکلے ؀

بنگالی محل۔ اور ایک اور محل اسی سنہ میں آگرہ میں تیار ہوا۔ قاسم ارسلان نے دونوں کی تاریخ کہی ہے

تمام شد دو عمارت بسانِ خلدِ بریں	بدورِ دولتِ صاحبقرانِ ہفت اقلیم
یکے بہ بلدۂ دارالخلافۂ آگرہ	دگر بہ خطۂ سیکری مقامِ شیخ سلیم
سپہر از پئے تاریخ ایں دو عالی قصر	رقم زدہ دو بہشت بریں بکلکِ قدیم

قلعہ اکبر آباد۔ آگرہ کو زیادہ تر سکندر لودی نے آباد کیا اور ایسا بڑھایا چڑھایا کہ اینٹ پتھر چونے سے قلعہ تیار کر کے دارالسلطنت بنا دیا۔ اس وقت دونوں طرف شہر آباد تھا۔ بیچ میں جمنا بہتی تھی۔ قلعہ شہر کے مشرق پر تھا۔ ۹۷۲ھ میں اکبر نے حکم دیا کہ قلعہ کو سنگین بنائیں اور سنگِ سرخ کی سلیں تراش کر لگائیں دو طرفہ گچ اور پتھر سے مستحکم عمارتیں بنیں۔ ملا صاحب فرماتے ہیں ۳ سیر غلہ سر جریب تمام ولایت پر لگا دیا۔ محصل پہنچے اور امرائے جاگیر دار کی معرفت وصول کر لائے ۵ برس میں تیار ہو گیا۔ عرض دیوار ۳۰ گز۔ ارتفاع ۶۰ گز۔ ۴ دروازے خندق عمیق پانی تک کہ ۱۰ گز پر نکل آیا تھا۔ تین چار ہزار آدمی کی مدد روز لگتی تھی۔ اب بھی طول میں جمنا کے کنارے تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ قلعہ بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا[1] **شیخ فیضی** نے دروازے کی تاریخ کہی: بنائے دربہشت

---

[1] بدایونی میں مدت تعمیر ۵ برس اور اکبرنامہ میں ۸ برس لکھتے ہیں اور مقدار عرض اور ارتفاع میں بھی فرق ہے خافی خاں لکھتے ہیں ۹۷۲ھ میں شروع اور ۹۸۰ھ میں تمام ہوا۔ ۳۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ انہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عوام میں یہ خیال ہے کہ اکبر کے عہد سے اس کا نام اکبر آباد ہوا۔ مگر مرزا امینا شاہجہاں نامہ میں لکھتا ہے کہ شاہجہان نے دادا کی محبت سے اکبر آباد نام رکھا۔ اس سے پہلے آگرہ ہی مشہور تھا ؀

پھر ملا صاحب کہتے ہیں قریب ۳۰ کروڑ کے لاگت ہے اور ہندوستان بھر کے رپے کو چھاتی پہ لئے بیٹھا ہے۔ کاریگر معمار۔ سنگتراش نزاکت کار۔ مصوّر جادو نگار۔ لُہار مزدور وغیرہ وغیرہ ہم ہزار آدمی کی مدد روز جاری تھی۔ دولتخانۂ خاص میں سنگتراشوں کی منبّت اور پچی کاری اور مصوّروں کی سحر نگاری نے آئندہ ایجاد کے لئے جگہ نہیں چھوڑی۔ اس لئے تاریخ ہُوئی۔ بنائے قلعہ شد بہر زر۔ اس کے عالیشان دروازے کے دونو طرف دو ہاتھی پتھر کے تراش کر کھڑے کئے تھے کہ آمنے سامنے سونڈیں ملاکر محراب بناتے تھے اور سب اُس کے نیچے سے آتے جاتے تھے۔ اس کا نام **ہتیا پول** تھا (پول بمعنی دروازہ) اسی پر نقارخانہ دربار تھا۔ مُلا شیری نے تاریخ کہی ؎

کلک شیری پئے تاریخ نوشت	بے مثال آمدہ دروازۂ فیل

اب نقارہ نہ رہا۔ صاحبِ نقارہ نہ رہے۔ نقارخانہ بے فائدہ چیز تھی۔ سرکار نے اُسے گراکر پتھر بیچ ڈالے۔ دروازہ باقی ہے۔ ہاتھی بھی نہ رہے۔ ہتیا پول کا نام باقی ہے۔ اور جامع مسجد اُس کے محاذی واقع ہُوئی ہے۔ فتح پور سیکری کے ہتیا پول میں ہاتھی موجود ہیں سُونڈیں ٹوٹ گئیں۔ افسوس محراب کا لطف نہ رہا ؁

ہمایوں کا مقبرہ۔ ۹۷۰ھ میں شہر دہلی میں دریائے جمن کے کنارے پر میرک مرزا غیاث کے اہتمام سے آٹھ نو برس کی محنت میں تیار ہوا۔ تمام سنگین۔ اِس کی گلتراشی اور منبّت کاری کے لئے پہاڑوں نے اپنے جگر کے ٹکڑے بھیجے۔ اور معماروں نے صنعتکاری کی جگہ جادوگری خرچ کی۔ اب تک دیکھنے والوں کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ مگر حیرت کی نگاہیں نہیں تھکتیں ؁

عمارات اجمیر۔ ۹۷۷ھ میں پہلے سلیم پیدا ہُوا۔ پھر مُراد پیدا ہوا۔ بادشاہ شکرانے اور منّت بڑھانے کو اجمیر گئے۔ شہر کے گرد قلعہ باندھا۔ امرا کو حکم ہُوا کہ تم بھی عالیشان عمارتیں بناؤ۔ سب تعمیل کرکے شکوہ اقبال کی شہ نشینوں میں بیٹھے اور آفرین بادشاہی طُرّۂ دستار ہوئی۔ شرقی جانب میں بادشاہی دولت خانے تھے تین برس میں سب عمارتیں تیار ہو گئیں ؁

کوکر تلاؤ کہ خسرو شیریں کار کی توجہ سے **شکر تلاؤ** ہو گیا۔ اس کا افسانہ سُننے کے قابل ہے۔ جب ۹۸۰ھ میں شاہزادۂ مراد کی ولادت کے شکرانے ادا کرکے اجمیر سے پھرے تو ناگور

؎ مُلا شیری کا حال دیکھو تتمہ میں ؁

کے رستے آئے اور اسی مقام پر ڈیرے ہُوئے۔ رعایائے شہر نے حاضر ہو کر عرض کی کہ خشک مُلک ہے اور خلق خدا کی گُزران دو تالابوں پر ہے۔ گیلانی تلاؤ شمس تلاؤ کو کرتلاؤ کہلاتا ہے۔ اور بند پڑا ہے بادشاہ نے اُس کی پیمائش کروا کر صفائی امرا پر تقسیم کی اور وہیں مقام کر دیا۔ چند روز میں صاف ہو کر کٹورے کی طرح چھلکنے لگا۔ اور شکر تلاؤ نام پایا۔ کوکر تلاؤ اس لئے کہتے تھے کہ کسی سوداگر کے پاس ایک وفادار کُتا تھا۔ اُسے بہت عزیز رکھتا تھا مگر کچھ ضرورت ایسی پڑی کہ ایک شخص کے پاس گرو رکھدیا۔ چند روز کے بعد اس پر خدا نے کرم کیا کہ دولتِ مال سے آسودہ حال ہو گیا اور اپنی وفا کی گٹھری لینے چلا۔ اتفاقاً کُتا بھی اپنی وفا کے جوش میں اس کی طرف چلا تھا۔ مقام مذکور پر ملاقات ہُوئی۔ کُتے نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور دُم ہلا کر اس کے پاؤں میں لوٹ گیا اور یہاں تک خوش ہُوا کہ دم نکل گیا۔ سوداگر جتنا محبت والا تھا اُس سے زیادہ ہمت والا تھا۔ یہاں پکا تلاؤ بنایا کہ آج تک اس کی ہمت اور کُتے کی محبت پر گواہی دیتا ہے ٭

چاہ و منارہ۔ اکبر نے عہد کیا تھا کہ ہر سال ایک دفعہ اجمیر میں زیارت کو حاضر ہُوا کرونگا۔ ۹۸۱ھ میں آگرہ سے وہاں تک ہر مِیل پر ایک کوآں اور ایک منارہ تعمیر کیا۔ اُس وقت تک جتنے ہرن شکار کئے تھے۔ ان کے سینگ جمع تھے۔ ہر منارہ پر لگا کر سراپا شاخ در شاخ کر دیا کہ یہ بھی یادگار رہے۔ مُلا صاحب اس کی تاریخ **میل شاخ** کہہ فرماتے ہیں۔ کاش کہ ان کی جگہ باغ یا سرا بنواتے کہ فائدہ بھی ہوتا۔ **آزاد** کہتا ہے۔ کاش مُلا صاحب کو دے دیتے۔ یونیورسٹی پنجاب ہوتی تو ڈپوٹیشن لے کر پہنچتی کہ ہمیں دے دو

ع عزازیل گوید نصیبے برم ٭

عبادتخانہ چار ایوان۔ ۹۸۲ھ میں بمقام فتح پور سیکری تعمیر ہُوا دیکھو صفحہ ۱۰۸ ٭

الہ آباد۔ پراگ پر گنگا جمنا دونوں بہنیں گلے ملتی ہیں۔ اُس پانی کے زور کا کیا کہنا جہاں دو محبت کے دریا ٹکر کھائیں۔ یہ ہندوؤں کے تیرتھ کا مقام ہے۔ ہمیشہ سے یہاں منّتیں ملتے ہیں اور تناسخ کے خیالات میں جانیں دیتے ہیں۔ ۹۸۱ھ میں اکبر پٹنے کی مہم پر جاتا تھا۔ مقام مذکور پر حکم دیا کہ ایک حصار عظیم الشان قلعۂ آگرہ کے نقشے پر تعمیر ہو۔ اور یہ ایجاد زیادہ ہو کہ چار قلعوں میں تقسیم ہو۔ ہر قلعے میں محل۔ مکانات۔ بالاخانے خوشنما طرزوں کے ساتھ مرتب ہوں۔ پہلا قلعہ وہاں ہو جہاں ٹھیک دونو دریاؤں کی ٹکر ہے۔ اس میں ۱۲ خانہ باغ ہوں

ہر باغ میں کئی کئی مکانات دلکشا۔ یہ خاص دولت خانۂ بادشاہی۔ (۲) میں بیگمات اور شاہزادے (۳) اقربائے سلطانی۔ ملازم اور اہل خدمت۔ خاص و عام۔ مہندسانِ تیز ہوش نے اُس کے نقشوں کی تراشیں پیدا کرنے میں ذہن لڑا کر کارنامے دکھلاتے اور ساتھ ہی ایک کوس طولانی۔ ۴۰ گز عریض۔ ۴۰ گز بلند بند مستحکم باندھ کر عمارتیں تیار کھڑی کر دیں۔ ۹۸۲ھ جلوس میں عمارت کا کام ختم ہوا تھا۔ پھر وہ الہ آباد سے الہ باس ہو گیا۔ ارادہ ہوا کہ اس میں دارالخلافہ قائم کریں۔ امرا نے بھی عمارات عالی تعمیر کیں۔ شہر کی آبادانی اور فراوانی زیادہ ہوئی۔ ٹکسال کا سکہ بیٹھا۔ شریف سرمدی کا شعر مقبول ہو کر منقوش ہوا ؎

ہمیشہ چوں زرِ خورشید و ماہ روشن باد	بہ شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

اسی عہد میں چوکی نویسی کا آئین مقرر ہوا تھا۔ چند معتبر منصبدار تھے کہ باری باری سے حاضر ہوتے تھے۔ روز مرہ ساعت بساعت کے احکام لکھتے رہتے تھے۔ وہ چوکی نویس کہلاتے تھے۔ امیر، منصبدار، احدی جو خدمت پر حاضر ہوتے تھے اُن کی یہ حاضری لکھتے تھے۔ جو سندیں اور چٹھیاں ان کی تنخواہوں کی خزانہ پر ہوتی تھیں اُنہی کی تصدیق سے ہوتی تھیں **محمد شریف** مذکور اور **محمد نفیس** بھی انہی میں تھے۔ ان کی لیاقت بھی بہت خوب تھی اور اکبر کی بھی نظر عنایت تھی۔ اس واسطے حاضر بھی زیادہ رہتے تھے۔ محمد شریف شیخ ابوالفضل کے جیسے کے بھی یار تھے۔ انشائے ابوالفضل کے دفتر دوم میں کئی خط ان کے نام ہیں اور مان سنگھ وغیرہ امرا کے خطوط میں ان کی سفارش بھی کی ہے۔ پھر تو مُلا صاحب کو اُن پہ خفا ہونا واجب ہوا۔ چنانچہ سلسلۂ تاریخ میں اس مقام پر فرماتے ہیں۔ ان کے باب میں کسی نے شعر بھی کہا ہے ؎

دو چوکی نویس اند ہرد و کثیف	یکے نا نفیس و دگر نا شریف

قلعۂ تارا گڑھ۔ اسی سال میں زیارت اجمیر کو گئے اور حضرت سید حسین خنگ سوار کی عمارات مزار اور فصیل کی تعمیر کی ۔

منوہر پور۔ شہر انبیر ۱ پر لشکر اُترا۔ معلوم ہوا کہ قریب تر یہاں سے **ملتھان** نام ایک شہر قدیم کے ویرانے پڑے ہیں اور خاک کے ٹیلے اس کی تاریخ سُنا رہے ہیں۔ اکبر نے جا کر

---

۱ شیخ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اسے عنبر سراد۔ ملا صاحب نے عنبر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں انبر کے پاس موضع ملتان پر پہنچے ہوئے معلوم ہوا کہ یہ شہر قدیم ہے۔ خدا جانے کب سے ویران پڑا ہے اس کی آبادی کا سرانجام کر کے وہاں سے اُٹھے۔

دیکھا۔ حکم دیا کہ فصیل دروازے باغ وغیرہ تیار ہوں۔ کام اُمرا کو تقسیم ہو گئے اور تعمیر میں بڑی تاکید کی۔ انتہا ہے کہ ۸ دن میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اور رعایا آباد ہو گئی۔ رائے منوہر ولد رائے لون کرن حاکم سانبھر کے نام پر منوہر لوپر اس کا نام رکھا۔ مُلا صاحب کہتے ہیں کنور مذکور پر بڑی نظر عنایت تھی۔ سلیم کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ شعر بھی خوب کہتا تھا اور اس میں توسنی تخلص کرتا تھا۔ جوان قابل اور ہر معاملہ میں مُنصف مزاج تھا۔ رائے مرزا منوہر کہلاتا تھا ●

قلعۂ اٹک۔ جب محمدؐ حکیم مرزا کی اخیر مہم فتح کر کے کابل سے پھرے تو اٹک کے گھاٹ پر مقام ہُوا۔ جاتے ہوئے تجویز ہو گئی تھی کہ یہاں جنگی قلعہ تعمیر ہو۔ سنہ ۹۹۰ھ ۱۴ خورداد دوپہر پر دو گھڑی بجے اپنے مبارک ہاتھ سے بُنیاد کی اینٹ رکھی۔ بنگالہ میں کٹک بنارس ہے اس کا نام اٹک بنارس رکھا۔ خواجہ شمس الدین خافی اُنہی دنوں میں بنگالہ سے آئے تھے۔ اُن کے اہتمام سے تعمیر ہوا۔ کنار اٹک پر جو دو پتھر جلالا۔ کمالا کہلاتے ہیں۔ اسی صاحب تاثیر بادشاہ نے خطاب دیا ہے۔ عجب برکت والے لوگ تھے۔ جو موج دل میں آئی۔ عالم کی زبان پر جاری ہو گئی ●

حوض حکیم علی۔ سنہ ۱۰۰۲ھ میں حکیم علی نے لاہور میں ایک حوض بنایا کہ پانی سے لبریز تھا۔ عرض و طول ۲۰×۲۰۔ گہرا ۱۳ گز۔ بیچ میں حجرۂ سنگین۔ اُس کی چھت پر بلند منارہ حجرہ۔ ے چاروں طرف ۲ پل۔ لُطف یہ تھا کہ حجرہ کے دروازے کھُلتے تھے اور پانی اندر نہ جاتا تھا۔ ۷ برس پہلے فتحپور میں ایک حکیم نے اسی کمال کا دعوےٰ کیا۔ یہی سب سامان بنوایا مگر بن نہ آیا۔ آخر کہیں غوطہ مار گیا۔ اس باکمال نے کہا اور کر دکھایا۔ میر حیدر معمائی نے تاریخ کہی حوض حکیم علی۔ بادشاہ بھی سیر کو آئے۔ سُنا کہ جو اندر جاتا ہے۔ رستہ ڈھونڈتا ہے۔ نہیں ملتا۔ دم گھُٹ کر گھبراتا ہے اور نکل آتا ہے۔ خُود کپڑے اُتار کر غوطہ مارا۔ اور اندر جا کر سارا حال معلوم کیا۔ ہوا خواہ بہت گھبرائے۔ جب نکلے تو سب کے دم میں دم آئے۔ جہانگیر نے سنہ ۱۰۲۶ھ میں لکھا ہے۔ آج آگرہ میں حکیم علی کے گھر اُس حوض کا تماشا دیکھنے گیا۔ جیسا والد کے وقت میں لاہور میں بنایا تھا۔ چند مصاحبوں کو ساتھ لے گیا کہ اُنھوں نے نہیں دیکھا تھا ۶×۶ ہے۔ پہلو میں ایک حجرہ ہے نہایت روشن۔ رستہ اسی حوض میں سے ہے۔ مگر پانی اس راہ سے اندر نہیں آتا۔ ۱۰۔ ۱۲۔ آدمی اس میں جلسہ جما کر بیٹھ سکتے ہیں ●

انوپ تلاؤ۔ سنہ ۹۸۶ھ میں فتحپور سے بھیرہ کی طرف شکار کو چلے۔ حکم دیا کہ تا تمام حوض

کو صاف کر کے ہر قسم کے سکّوں سے لبریز کر دو کہ ہم اعلےٰ سے ادنےٰ تک خلق اللہ کو اس کا فیض پہنچائینگے (ملا صاحب کہتے ہیں پیسوں سے بھروایا تھا) - طول عرض ۲۰ × ۲۰ - عمق دو قد آدم - سنگِ سُرخ کی عمارت تھی - چند روز کے بعد رستے میں راجہ ٹوڈرمل نے عرض کی کہ ۱۷ کروڑ بھر چکے ہیں مگر بھرا نہیں ہے - فرمایا کہ جب تک ہم پہنچیں لبالب کر دو - جس دن تیار ہوا - آپ کنارے پر آئے - شکر الٰہی بجا لائے - پہلے ایک اشرفی ایک روپیہ - ایک پیسا آپ اُٹھایا - اسی طرح امرائے دربار کو عنایت فرمایا - شیخ ابو الفضل لکھتے ہیں کہ راقم شکر فنامہ نے بھی کرم عام سے فیض خاص پایا - پھر مُٹھیاں بھر بھر کر دیں اور دامن بھر بھر کر لوگ لے گئے - اور ہر شخص نے برکت کا تعویذ بنا کر رکھا - جس گھر میں رہا اُس میں کبھی روپے کا توڑا نہ ہوا*

مُلا صاحب فرماتے ہیں - **شیخ منجھو قوال** صوفیانہ وضع رکھتا تھا **شیخ ادہن جونپوری** کے مریدوں میں سے تھا انہی دنوں میں حوض مذکور کے کنارے پر اُسے بُلایا - اُس کا گانا سُن کر بہت خوش ہوئے - تان سین اور اچھے اچھے گویّوں کو بُلا کر سُنوایا اور فرمایا کہ اس کیفیت کو تم میں سے ایک نہیں پہنچتا - پھر اس سے کہا - منجھو - جا سب نقدی تو ہی اُٹھا لے جا - اُس سے کیا اُٹھ سکتی تھی! عرض کی - حضور! یہ حکم دیں کہ جتنی غلام اُٹھا سکے اُتنی لے جائے - منظور فرمایا - غریب ہزار روپے کے قریب ٹکے باندھ لے گیا - ۳ برس میں اسی طرح لٹا کر حوض خالی کر دیا - مُلا صاحب کو بہت افسوس ہوا - **آزاد** - میں نے ایک پُرانی تصویر دیکھی - اکبر اِس تلاؤ کے کنارے پر بیٹھے ہیں - بیربل وغیرہ چند امرا حاضر ہیں - کچھ مرد - کچھ عورتیں - کچھ لڑکیاں پنہیاریوں کی طرح اس میں سے گھڑے بھر بھر کر لئے جاتے ہیں - اللہ اللہ جو سخاوت کی بہار دیکھنے والے ہیں انہیں یہ بھی ایک تماشا ہے - جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے - کہ ۳۶ × ۳۶ طول عرض ۴½ گز عمق تھا - ۳۴ کروڑ ۴۸ لاکھ ۴۶ ہزار دام = ۱۶ لاکھ ۷۹ ہزار ۴ سو روپے کی نقدی اس میں آئی تھی - روپے اور پیسے ملے ہوئے تھے - ضرورت اور احتیاج کے پیاسے مدتوں تک آتے اور دلوں کی پیاس بجھاتے رہے - تعجب یہ ہے کہ اُس میں کپور تلاؤ نام لکھا ہے*

اکبر کی شاعری اور طبعِ موزوں

وہ دربار قدرت سے اپنے ساتھ بہت سی نعمتیں لایا تھا۔ ان میں طبیعت بھی موزوں لایا تھا۔ اسی واسطے کبھی کبھی اشعار زبان سے نکل جاتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشعار جو اس کے نام پر کتابوں میں لکھے ہیں اُسی کے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ملک شاعری میں شہرت چاہتا تو شاعر ہزاروں تھے۔ جلدیں کی جلدیں تیار کر دیتے۔ لیکن جب یہی چند شعر اس کے نام پر لکھے ہیں تو اپنی ہی طبیعت کی اُمنگ ہے۔ جو کبھی کبھی موقع پر ٹپک پڑی ہے۔ شائد لفظ یا لفظوں میں کسی نے اصلاح بھی کر دی ہو۔ خیر طبیعت کا انداز دیکھ لو۔ مطلع

گریہ کردم زغمت موجبِ خوشحالی شد	ریختم خون دل از دیدہ دلم خالی شد

رُباعی

مے ناز کہ دل خوں شدہ؛ از دوریِ او	من یارِ غمم زدست مہجوریِ او
در آئینۂ چرخ نہ قوسِ قزح است	عکس است نمایاں شدہ از چوریِ او

قطعہ

دوشینہ بکوے مے فروشاں	پیمانۂ مے بزر خریدم !
اکنوں زخمار سر گرانم !	زر دادم و دردسر خریدم

مطلع

من بنگ نے خورم مے آرید پیالہ	من چنگ نے زنم نے آرید نالہ

۹۷ھ میں بہار کشمیر کی گلگشت کے لئے مع لشکر و امرائے لشکر تشریف لے گئے۔ اور بیگمات کو بھی ساتھ لیا کہ باغ قدرت کا تماشا دیکھ کر سب خوش ہوں۔ آپ امرائے خاص اور مصاحبوں کو لے کر آگے بڑھ گئے تھے۔ شہر سری نگر میں پہنچ کر خیال آیا کہ مریم مکانی کے دولت خیز قدم بھی ساتھ ہوں تو نہایت مبارک بات ہے۔ شیخ کو حکم ہوا کہ عرضداشت لکھو وہ تحریر میں مصروف تھے۔ خود فرمایا۔ اور یہ بھی عرضداشت میں درج ہو سہ

حاجی بسوے کعبہ رود از برائے حج
یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

عہد اکبر کے عجیب واقعات

مقام بکسر میں راوت ٹیکا نام موضع مذکور کا مقدم تھا۔ کسی دشمن نے قابو پاکر اُسے مار ڈالا۔ مقتول نے دو زخم کھائے تھے۔ ایک پیٹھ پر۔ دوسرا کان کے نیچے۔ چند روز کے بعد اُس کے رشتہ دار کے گھر بچہ پیدا ہُوا کہ یہی دو زخم اُس کے موجود تھے۔ لوگوں میں چرچا ہُوا۔ اور جب وہ بڑا ہُوا تو اُس نے بھی یہی کہا۔ بلکہ اکثر اُس کی باتیں ایسے ایسے نشان و مقام کے پتے سے بتائیں کہ سب حیران ہوئے۔ معاملہ اکبر تک پہنچا۔ یہ ایسی تحقیقات کے عاشق تھے۔ اُسے بُلا کر حالات پوچھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکبر نے بھی اُس کا دوبارہ جنم لینا تسلیم کیا۔ مگر اکبرنامہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کہا۔ اگر زخم لگے تھے۔ تو راوت کے جسم پر لگے تھے۔ جان پر نہ تھے اس جسم میں آئی ہے تو جان آئی ہے۔ پھر زخموں کا اس بدن پر ظاہر ہونا چہ معنی دارد۔ اس پر اپنی والدہ کا حال بیان کیا۔ دیکھو صفحہ ۳

ایک اندھے کو لائے کہ جو کچھ بات اُس سے کہتے تھے۔ وہ بغل میں ہاتھ دیکر جواب دیتا تھا۔ اور بغل سے شعر پڑھتا تھا۔ مشق اور ورزش سے یہ بات بہم پہنچائی تھی:

نواح اکبر آباد میں ایک بغاوت کے دبانے کو فوج بادشاہی گئی۔ وہاں لڑائی ہوئی۔ لشکر بادشاہی میں دو بھائی تھے۔ قوم کھتری۔ اکبر آباد کے رہنے والے کہ جڑواں پیدا ہوئے تھے! اور باہم بالکل مشابہ تھے۔ ایک اُن میں سے کام آیا۔ اور چونکہ لڑائی جاری تھی۔ دوسرا وہاں موجود رہا۔ مقتول کی لاش گھر آئی۔ دونو بھائیوں کی بیبیاں اُس کے ساتھ ستی ہونے کو تیار ہوئیں۔ یہ کہتی تھی میرا شوہر ہے۔ وہ کہتی تھی میرا ہے۔ مقدمہ کوتوال کے پاس اور وہاں سے دربار میں پہنچا۔ بڑے بھائی کی بی بی کہ جس کا خاوند چند ساعت پہلے پیدا ہوا تھا۔ آگے بڑھی۔ اور عرض کی۔ حضور میرے والی کا ۱۰ برس کا بیٹا مر گیا تھا۔ اور اُسے فرزند کے مرنے کا بڑا غم ہُوا تھا۔ اس لاش کا سینہ چیر کر دیکھئے۔ اگر اُس کے جگر میں داغ یا سوراخ ہو تو جانئے کہ وہی ہے نہیں ہے تو وہ نہیں ہے۔ اُسی وقت جراح حاضر ہوئے۔ چھاتی چاک کر کے دیکھا تو زخم تیر کی طرح سوراخ موجود تھا۔ سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اکبر نے کہا کہ تُو اتم سچی ہو۔ اور جلنے اور نہ جلنے کا تمہیں اختیار ہے ؎

ایک شخص کو لوگ لائے کہ اُس میں مرد عورت دونو کی علامتیں موجود تھیں۔ ملّا صاحب

لکھتے ہیں کہ اُسے مکتب خانہ کے پاس لاکر بٹھایا تھا۔ یہیں ہم کتب علمی ترجمہ کیا کرتے تھے۔ جس وقت چرچا ہُوا تو میں بھی گیا۔ وہ ایک حلال خور تھا۔ چادر اوڑھے گھونگھٹ نکالے شرمندہ صورت کچھ منہ سے نہ بولتا تھا۔ حضرت ہن دیکھے قدرت الٰہی کے قائل ہو کر چلے آئے۔

۹۹۰ھ میں ایک آدمی کو لائے کہ نہ اُس کے کان تھے۔ نہ کانوں کے چھید تھے۔ رخسارے اور تمام کنپٹیاں صفاً صفا۔ مگر ہر بات برابر سُنتا تھا۔

ایک شیر خوار بچے کا سر اعتدال بدن سے زیادہ بڑھنے لگا۔ اکبر کو اطلاع ہُوئی اُس نے بلا کر دیکھا اور کہا کہ چمڑے کی چست ٹوپی بناؤ اور اسے پہناؤ۔ رات دن ایک لمحہ سر سے نہ اُتارو ایسا ہی کیا۔ چند روز میں بڑھاؤ تھم گیا۔

۰۰ھ میں جب اکبر آسیر کی مہم پر خود لشکر لے کر چلا۔ فوج نربدا سے عبور کر رہی تھی۔ ہاتھیوں کا حلقہ کہ سواری کا جزوِ اعظم تھا۔ دریا اُترا۔ فیلبانوں نے دیکھا کہ خاصہ کے ہاتھی کی زنجیر سونے کی ہو گئی۔ داروغۂ فیلخانہ کو خبر کی۔ اُس نے خود جا کر دیکھا۔ بادشاہ کو خبر ہُوئی۔ زنجیر منگا کر ملاحظہ کی۔ چاشنی لی۔ ہر طرح درست۔ گفتگو کے بعد یہ مضمون نکلا کہ دریا میں کسی مقام پر سنگ پارس ہوگا۔ اِس خیال سے ہاتھیوں کو پھر اُسی گھاٹ اور اسی رستے پر کئی بار وار اور پار لے گئے کچھ بھی نہ ہُوا۔

مُلّا صاحب ۹۶۳ھ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے خان زماں کی اخیر مہم کے لئے نشان فتح بلند کئے۔ میں حسین خاں کے ساتھ ہمسفر تھا۔ وہ ہراول ہو کر تعمیل فرمان کے لئے روانہ ہُوا۔ میں شمس آباد میں رہ گیا۔ عجائبات سے یہ بات معلوم ہُوئی کہ ہمارے پہنچنے سے کئی دن پہلے رات کے وقت ایک دھوبی کا ننھا بچہ چبوترہ پر سوتا تھا۔ غفلت میں کروٹ لی پانی میں جا پڑا۔ دریا کا بہاؤ اسے دس کوس تک صحیح سلامت لے گیا اور بھوجپور پر جا کر کنارے سے لگا دیا۔ وہاں کسی دھوبی نے دیکھ کر نکالا وہ انہی کا بھائی بند تھا۔ اس نے پہچانا۔ صبح اُنکو ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔

خصائل و عادات اور تقسیم اوقات

اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا کبوتروں میں اُڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کُتّے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے۔ گھوڑے بھگانے اور باز اُڑانے لگے۔

نوجوانی تاج شاہانی لے کر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر و شکار اور شراب وکباب کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خداترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوعِ جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نمازگذار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالبِ علمی کی تحقیقات اور اہلِ علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اِس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا۔ اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری شکاری بھی برابر جاری تھی۔ مگر وہ علم کا عاشق علم وحکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سُننے کو وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اِس کے لئے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ اِن کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کام کو سنبھالا۔ اِس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئینِ سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا۔ ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے اور صلاح اور اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا اور اِس کا نام مجلسِ کنگاش تھا۔

شام کو تھوڑی دیر آرام لے کر علما وحکما کے جلسہ میں آتا تھا۔ یہاں مذہب کی خصوصیت نہ تھی۔ ہر طریق اور ہر قوم کے صاحبِ علم جمع ہوتے تھے ان کے مباحثے سُن کر معلومات کے خزانے کو آباد کرتا تھا۔ اس کے عہد میں عمدہ اور مفید اور عالی رُتبے کی کتابیں تصنیف ہوئیں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جو عرضیاں حکام وعمال نے بھیجی تھیں اُنہیں سُنتا تھا اور ہر نکتے پر خود حکم مناسب لکھواتا تھا۔ آدھی رات کو یادِ الٰہی میں مصروف ہوتا۔ بعد اس کے شبستانِ راحت میں غروب ہوتا تھا کہ جسم وجان کو خواب کی خوراک دے لیکن بہت کم سوتا تھا بلکہ اکثر رات بھر جاگتا تھا۔ اُس کی نیند عموماً ۳ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ صبح سے پہلے اس کا دل روشن ہوتا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہوتا۔ نہا دھو کر بیٹھتا۔ دو گھنٹے یادِ خدا کرتا اور انوارِ سحر سے دل کو روشنی دیتا۔ آفتاب کے ساتھ دربار میں طلوع ہوتا تھا۔ اہالی موالی بھی اندھیرے

منہ حاضر ہوتے تھے۔ اُن کی عرض معروض سُنتا تھا۔ بے زبان غمخوار نہ دُکھ کی شکایت کر سکتے نہ کسی آرام کی درخواست۔ اس لئے خود اُٹھ کر جاتا اور ان کی عرضیاں صورتِ حال سے پڑھتا اصطبل اور فیلخانہ شترخانہ۔ آہوخانہ وغیرہ وغیرہ جانوروں کو اوّل۔ بعد اُن کے اور کارخانوں کو دیکھتا تھا۔ اقسام صنعتگری کی کارگاہوں کا ملاحظہ کرتا تھا۔ ہر باب میں عمدہ ایجاد کرتا تھا اور دلپذیر اصلاحیں دیتا تھا۔ اہلِ کمال کے ایجادوں کی قدر مقدار سے زیادہ کرتا تھا۔ اور ہر فن میں اِس توجہ سے شوق دکھاتا تھا کہ گویا اسی فن کا فریفتہ ہے۔ توپ بندوق وغیرہ آلاتِ جنگ کی صنعت اور فنونِ دستکاری میں دستگاہ رکھتا تھا۔

گھوڑے اور ہاتھی کا عاشق تھا۔ جہاں سنتا تھا لے لیتا تھا۔ شیر۔ چیتے۔ گینڈے۔ بیل گائیں بارہ سنگے۔ ہرن وغیرہ وغیرہ ہزاروں جانور بڑی محبت سے پالے اور سدھائے تھے۔ جانوروں کے لڑانے کا بڑا شوق تھا۔ مست ہاتھی۔ شیر اور ہاتھی۔ ارنے بھینسے۔ گینڈے۔ ہرن لڑاتا تھا۔ چیتوں سے ہرن شکار کرتا تھا۔ باز۔ بہری۔ جُرّے۔ باشے اڑاتا تھا۔ اور یہ دل کے بہلاؤ ہر سفر میں ساتھ رہتے تھے۔ ہاتھی گھوڑے۔ چیتے وغیرہ جانوروں میں بعضے بہت پیارے تھے اُن کے پیارے پیارے نام رکھے تھے۔ جن سے اس کی طبیعت کی موزونی اور ذہن کی مناسبت جھلکتی تھی۔ شکار کا دیوانہ تھا۔ شیر کو شمشیر سے مارتا تھا۔ ہاتھی کو زور سے زیر کرتا تھا۔ خود صاحب قوت تھا اور سخت محنت برداشت کر سکتا تھا جتنی جفاکشی کرتا تھا اُتنا ہی خوش ہوتا تھا۔ شکار کھیلتا ہوا بیس بیس کوس پیدل نکل جاتا تھا۔ آگرہ اور فتحپور سیکری سے اجمیر تک کہ ۱۰ منزل ہے اور ہر منزل ۱۲ کوس کی۔ کئی دفعہ پیادہ زیارت کو گیا۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ ایک بار جرأت و جوانی کے جوش میں متھرا سے پیادہ پا شکار کھیلتا ہوا چلا۔ آگرہ اٹھارہ کوس ہے تیسرے پہر جا پہنچا۔ اس دن دو تین آدمیوں کے سوا کوئی ساتھ نہیں نبھ سکا۔ گجرات کے دھاوے کا تماشہ دیکھ ہی چکے ہو۔ دریا میں کبھی گھوڑا ڈال کر کبھی ہاتھی پر کبھی آپ پیر کر پار اُتر جاتا تھا۔ ہاتھیوں کی سواری اور اُن کے لڑانے میں عجیب و غریب کرتب دکھاتا تھا۔ دیکھو صفحہ ۱۰۶ و ۱۳۸۔ غرض مصیبت کا اٹھانا اور جان جوکھوں میں پڑنا اُسے مزا دیتا تھا۔ خطر کی حالت میں اُس پر کبھی اضطراب نہ معلوم ہوتا تھا۔ باوجود اِس جوانمردی و دلیری کے غصّے کا نام نہ تھا اور ہمیشہ شگفتہ اور شاد نظر آتا تھا۔

باوجود اِس دولت و حشمت اور خدائی جاہ و جلال کے نمائش کا خیال نہ تھا۔ اکثر

تخت کے آگے فرش پر ہو بیٹھتا۔ سیدھا سادہ مزاج رکھتا۔ سب سے بے تکلف باتیں کرتا تھا۔ رعیت کی دادخواہی کو سنتا تھا اور فریاد رسی کرتا تھا۔ ان سے خلق و محبت کے ساتھ بولتا تھا اور نہایت دردخواہی سے حال پوچھتا اور جواب دیتا تھا۔ غریبوں کی خاطرداری بہت کرتا تھا۔ جہانتک ہوسکتا ان کی دل شکنی گوارا نہ کرسکتا تھا۔ ان کے غریبانہ نذرانوں کو امیروں کے پیشکشوں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اسکی باتیں سن کر یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا اپنے تیئں کم ترین مخلوقات شمار کرتا ہے۔ اس کی حرکات سے غدا پر توکل معلوم ہوتا تھا۔ اسکی رعایا اُس کے ساتھ دل سے محبت رکھتی تھی۔ ساتھ ہی سب کے دلوں پر اس کی ہیبت اور دہشت بھی چھائی ہوئی تھی۔

دشمنوں کے دلوں میں اس کے دلیرانہ دھاووں اور فتوحات کے کارناموں نے بڑا رعب ڈالا تھا۔ باوجود اس کے خواہ مخواہ لڑائی کا شوق نہ تھا۔ لڑائی کے معرکوں اور جنگ کے میدانوں میں دل اور جان تک کھپا دیتا تھا مگر ہمیشہ فہم و فراست سے کام لیتا تھا۔ دل میں ہمیشہ صلح مدنظر رکھتا تھا۔ جب حریف اطاعت کے رستے پر آتا۔ فوراً عذر قبول اور ملک بحال۔ جب مہم ختم ہوتی دارالسلطنت پھر کر آتا اور آبادانی و فراوانی کے شغلوں میں مصروف ہوتا۔ بنیاد سلطنت اس پر رکھی تھی کہ جہاں تک ہوسکے ملک کی خوشحالی اور لوگوں کی فارغ البالی میں خلل نہ آئے۔ سب آسودہ حال رہیں۔ فنچ صاحب اُس عہد میں ملکہ الزبتھ کے دربار سے سفیر ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے جو حالات مشاہدہ کر کے لکھے ہیں ان مطالب کا آئینہ ہیں۔

خدا ترسی اور رحم و شفقت اس کے خمیر میں رچی ہوئی تھی۔ کسی کا دکھ دیکھ نہ سکتا تھا۔ گوشت بہت کم کھاتا تھا۔ جس تاریخ پیدا ہوا تھا۔ اس دن اور اس سے چند روز پہلے اور پیچھے بالکل نہ کھاتا تھا اور حکم تھا کہ ان دنوں کل ممالک محروسہ میں ذبح نہ ہو۔ جہاں ہوتا تھا چوری چھپے سے ہوتا تھا۔ پھر اس مہینے میں اور اس سے پہلے اور پیچھے ترک کر دیا۔ پھر جتنے برس عمر کے تھے اتنے دن پہلے اور پیچھے چھوڑ دیا۔

علی مرتضےٰ شیرِ خدا کا قول ہے کہ سینے کو حیوانات کا گورستان نہ بناؤ۔ یہ خزانہ اسرار الٰہی کا ہے۔ یہی مضمون ادا کرتا تھا اور کہتا تھا۔ گوشت آخر درخت میں نہیں لگتا۔ زمین سے نہیں اُگتا جاندار کے بدن سے کٹ کر جدا ہوتا ہے۔ اُسے کیسا دکھ ہوتا ہوگا اگر انسان ہیں تو ہمیں بھی درد آنا چاہیئے۔ ہزاروں نعمتیں خدا نے دی ہیں۔ کھاؤ پیو اور مزے لو۔ ذرا سے چٹخارے کے لئے کہ پل بھر سے زیادہ نہیں رہتا جان کا ضائع کرنا بڑی بے عقلی و بیرحمی

کہتا تھا کہ شکار نکموں کا کام ہے اور جلادی کی مشق ہے۔ ناخدا ترسوں نے خدا کی جانوں کا مارنا تماشا ٹھہرایا ہے۔ بے گناہ بے زبانوں کی جان لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ پیاری صورتیں اور موہنی مورتیں خاص اس کی صنعتگری ہے اس کا مٹانا سخت سنگدلی اور اور شقاوت ہے ؎

چہ خوش گفت فردوسیٔ پاک زاد	کہ رحمت براں تربت پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است	کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

خاص دن اور بھی تھے کہ ان میں گوشت مطلق نہ کھاتا تھا وسط عمر میں حساب کیا گیا تھا۔ تو ان دنوں کا مجموعہ ۳ مہینے ہوتے تھے رفتہ رفتہ برس میں چھ مہینے ہو گئے آخر عمر میں یہاں تک کہتا تھا کہ جی چاہتا ہے کہ گوشت کھانا ہی چھوڑ دیجئے۔ وہ کم خوراک تھا۔ اکثر ایک وقت کھانا کھاتا تھا اور جتنا کم کھاتا تھا اُس سے بہت زیادہ محنت اُٹھاتا تھا۔ عورت سے بھی کنارہ کش ہو گیا تھا۔ بلکہ جو کچھ ہوا اُس کے ضائع ہونے کا افسوس کرتا تھا۔

آدابِ کورنش

شاہانِ دانش آرا نے اپنی اپنی رسائی کے بموجب ادائے آداب کے آئین رکھے تھے۔ کسی ملک میں سر جھکاتے تھے۔ کہیں سینہ پر ہاتھ بھی رکھتے تھے۔ کہیں دو زانو بیٹھ کر جھکتے تھے (ترکوں کا آئین آداب تھا) اور اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اکبر نے یہ آئین قرار دیا کہ ادب پرست دولتخواہ سامنے آکر آہستگی سے بیٹھے۔ سیدھے ہاتھ کو مٹھی کر کے پشت دست کو زمین پر ٹیکے اور آہستگی سے سیدھا اُٹھے۔ دست راست سے تالو کو پکڑ کر اتنا جھکے کہ دُہرا ہو جائے اور ایک خوشنما انداز سے داہنی طرف کو جھوک دیتا ہوا اُٹھے۔ اسی کو کورنش کہتے تھے۔ اس کے معنے یہ تھے کہ محسوس اور معقول زندگی اسی پر منحصر ہے۔ اسے دست نیاز پر رکھ کر نذر کرتا ہے۔ خود فرمان پذیری پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور جان و تن سپرد حضور کرتا ہے اس کو تسلیم بھی کہتے تھے۔

اکبر نے خود بیان کیا کہ وہ عالم طفولیت میں ایک دن ہمایوں کے پاس آکر بیٹھا۔ مہر پدری نے اپنے سر سے تاج اُتار کر نورچشم کے سر پہ رکھدیا۔ تاجِ دولت فراخ تھا۔ پیشانی پر درست کر کے اور گدی کی طرف بڑھا کے رکھ دیا۔ عقل و آداب اتالیق ساتھ آئے تھے۔

اُن کے اشارے سے اُٹھاکر آداب بجالائے۔ دستِ راست کی مٹھی کو پُشت کی طرف سے زمین پر ٹیکا اور سینہ و گردن کو سیدھا کر کے آہستگی سے اُٹھاکر مبارک تاج آنکھوں پر پردہ نہ ہو جائے۔ یا کان پر نہ ڈھلک جائے۔ کھڑے ہو کر پیرا اور کلغی کو بچاکر تالو پر ہاتھ رکھا کہ شگون سعادت گر نہ پڑے اور جتنا جُھک سکتا تھا جھک کر آداب بجالایا۔ بچپن کے عالم میں یہ جُھک کر اُٹھنا بھی ایک خوشنما انداز ہوا۔ باپ کو پیارے فرزند کا ادائے آداب بہت اچھا معلوم ہوا۔ حکم دیا کہ کورنش و تسلیم اسی طرز پر ادا ہوا کرے ٭

اکبر کے وقت میں ملازمت۔ رخصت۔ عطائے جاگیر۔ عنایتِ منصب۔ انعام خلعت ہاتھی اور گھوڑا مرحمت ہوتا تھا تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تسلیمیں ادا کرتے ہوئے پاس آکر نذر دیتے تھے۔ اور عنایتوں پر ایک۔ بندگانِ باارادت جنہیں جلوت میں بھی بار ملتے تھے جب بیٹھنے کی اجازت پاتے تھے تو سجدۂ نیاز کرتے تھے حکم تھا کہ دل میں سجدۂ الٰہی کی نیت رہے۔ کج فہم۔ ظاہر بیں اسے مردم پرستی سمجھتے تھے اس واسطے ایسی سعادت کے لئے عام اجازت نہ تھی۔ دربارِ عام میں بندگانِ خاص کو بھی حکم نہ تھا۔ کوئی باارادت اس طرح جبہ نورانی کرنا چاہتا تو بادشاہ خفا ہوتا۔

جہانگیر کے وقت میں کسی بات کی پروا نہ تھی یہی رسم عموماً جاری رہی ٭

شاہجہان کے عہد میں پہلا حکم یہی جاری ہوا کہ سجدہ موقوف ہو۔ ذاتِ الٰہی کے سوا دوسرے کے لئے روا نہیں۔ مہابت خان سپہ سالار نے کہا کہ بادشاہ کے سلام میں اور عام اہلِ دولت کے سلام میں کچھ امتیاز واجب ہے۔ سجدہ کی جگہ زمین بوس ہو تو مناسب ہے کہ خادم و مخدوم اور بادشاہ و رعیت کا سررشتہ باقاعدہ رہے۔ قرار پایا کہ اہلِ آداب دونو ہاتھ زمین پر ٹیک کر اپنے پُشتِ دست کو بوسہ دیا کریں۔ اہلِ احتیاط نے کہا کہ اس میں بھی سجدہ کی صُورت نکلتی ہے۔ سال دہم جلوس میں یہ بھی موقوف ہوا۔ اس کی جگہ چوتھی تسلیم اور بڑھا دی سادات۔ علما۔ مشائخ ملازمت کے وقت سلام شرعی ادا کرتے تھے۔ اور رخصت کے وقت فاتحہ پڑھکر دعا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیمی دستور ترکستان کا ہے کیونکہ وہاں بھی یہی رسم ہے بلکہ عموماً ہر صحبت اور ہر ملاقات میں یہی عمل درآمد عام تام ہے ٭

لطائف اقبال

دُنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ جب دولت و اقبال کسی کی طرف جُھک جاتے ہیں تو عالمِ طلسمات کو مات کر دیتے ہیں۔ جو چاہے وہی ہو۔ جو مُنہ سے نکل جائے وہی ہو۔ اکبر کی فرمانروائی میں ایسی باتوں کا ظہور بہت نظر آتا ہے۔ مہمات سلطنت اور فتوحات ملکی کے علاوہ اسکے تہور اور ہمت و جرأت کے معاملے کل تائیدِ اقبال کا اثر تھے۔ اکثر معاملات میں جو کچھ اُس نے اِبتدا میں کہہ دیا اُسی انتہا پر خاتمہ ہوا۔ اگر اس کی فہرست لکھوں تو بہت طولانی ہو چند باتیں بطورِ تمثیل لکھتا ہوں ؛

۳۲ سنہ جلوس میں اکبر نے قاضی نوراللہ شستری کو محالات کشمیر کی جمع بندی کے لئے بھیجا۔ یہ باوجود کمال علم و فضل کے نہایت دقیقہ رس اور دیانت دار شخص تھے عاملانِ کشمیری کو ڈر ہوا کہ ہمارے پیچ کھل جائینگے۔ اُنہوں نے باہم مشورت کی۔ بادشاہ بھی لاہور سے اسی طرف جانے والے تھے۔ مرزا یوسف خاں صوبہ دار کشمیر استقبال کو اِدھر آیا۔ مرزا یادگار اس کا رشتہ دار نائب رہا۔ کشمیریوں نے سازش کر کے اُسے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ اور کہا کہ رستے دشوار۔ ملک ٹھنڈا سامانِ جنگ بہت کچھ موجود ہے۔ کشمیر ایسی جگہ نہیں کہ ہندوستان کا لشکر آئے اور سر سواری اسے مار لے۔ وہ بھی انکی باتوں میں آگیا اور خود سر ہو کر تاجِ شاہی سر پر رکھا۔

دربار میں ان باتوں کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ اکبر نے لاہور سے کوچ کیا۔ اور دریائے راوی سے اُترتے ہوئے کسی مصاحب سے پوچھا کہ یہ بیت شاعر نے کونسے گنجے کے حق میں کہی تھی ؎

کلاہِ خسروی و تاجِ شاہی	بہر کل کے رسد حاشا و کلا

تماشا یہ ہوا کہ مرزا یادگار سر سے گنجہ نکلا

لشکر دریائے چناب کے کنارے پہنچا تھا کہ اِس فساد کی خبر پہنچی۔ اکبر کی زبان سے نکلا ؎

ولد الزنا ست حاسد منم آنکہ طالع حسن	ولد الزنا کش آمد چو ستارۂ یمانی

لطف یہ ہے کہ یادگار نقرہ نامی ایک کنچنی کے پیٹ سے تھا جس کے نطفے کی بھی تحقیق نہ تھی۔ اکبر نے یہ بھی کہا کہ ایں لولی بچہ مجبور برآمدن سہیل کشتہ خواہد شد۔ شیخ ابوالفضل نے دیوانِ حافظ میں فال دیکھی۔ یہ شعر نکلا ؎

آں خوش خبر کجاست کزیں فتح مژدہ داد | تا جاں فشانمش چو زر و سیم در قدم

عجیب بات یہ کہ جب یادگار کا خطبہ پڑھا گیا تو اسے ایسی تھرتھری چڑھی جیسے بخار چڑھا اور مہر کن سکہ کی مہر کھودنے لگا۔ فولاد کی کنی اس کی آنکھ میں جا پڑی۔ آنکھ بیکار ہو گئی۔ اکبر نے یہ بھی کہا کہ دیکھنا جو لوگ اس کی بغاوت میں شامل ہیں انہی میں سے کوئی شخص ہو گا۔ کہ اس کا گنجہ سر کاٹ لائیگا۔ خدا کی قدرت کہ انجام کا اسی طرح وقوع میں آیا۔

دُنیا میں کوئی شغل اور کوئی شوق ایسا نہ تھا جس کے یہ عاشق نہ ہوں۔ اس عشقبازی سے کبوتر چھُٹ جاتے تو سخت دشوار ہی تھی۔ انواع و اقسام کے کبوتر شہر شہر ملک و لایتوں سے منگائے تھے۔ عبداللہ خاں اُزبک کو لکھا اس نے کبوتران گرہ باز اور ان کے کبوتر باز ملکِ توران سے بھیجے۔ یہاں اُن کی بڑی قدر ہوئی۔ مرزا عبدالرحیم خانخانان کو انہی دنوں میں فرمان لکھا ہے۔ اس میں بھی مضامین رنگین کے بہت کبوتر اُڑائے ہیں اور ایک ایک کبوتر کا نام بنام حال لکھا ہے۔ آئینِ اکبری میں جہاں اور کارخانوں کے آئین و ضوابط لکھے ہیں۔ اس کے بھی لکھے ہیں۔ اور ایک کبوتر نامہ بھی لکھا گیا۔ شیخ ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ ایک دن کبوتر اُڑ رہے تھے۔ وہ بازیاں کرتے تھے۔ آپ تماشا دیکھتے تھے کہ ایک خاصہ کے کبوتر پر بہری گری۔ انہوں نے للکار کر آواز دی خبردار۔ بہری جھپٹا مارتے مارتے رُک کر ہٹ گئی۔ اس کا قاعدہ ہے کہ اگر کبوتر کنوٹ کر کے نکل جاتا ہے تو چکر مارتی ہے اور پھر آتی ہے۔ بار بار جھپٹے مارتی ہے اور آخر لے جاتی ہے مگر وہ پھر نہ آئی۔

اکبر کی شجاعتِ ذاتی اور بے حد دلاوری

یہ بات راجگانِ ہند کے اُصولِ سلطنت میں داخل تھی کہ راج کا فرمانروا اکثر خطرناک اور جان جوکھوں کے کام کر کے خاص و عام کے دلوں میں ایک تاثیر پھیلائے جس سے وہ سمجھیں کہ بے شک تائیدِ غیبی اس کے ساتھ ہے اور اقبال اس طرح مددگار ہے کہ ہم میں سے یہ بات کسی کو نصیب نہیں۔ اور اسی واسطے اس کی عظمت خدا کی عظمت اور اس کی اطاعت اطاعت الٰہی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اور یہی بات ہے کہ ہندو راجہ کو بھگوان کا اوتار اور مُسلمان ظل اللہ (سایۂ خدا) کہتے ہیں۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھ گیا تھا۔ تیموری و چنگیزی لہو کی گرمی سے ہمت۔ جرأت۔ جذبہ و جوش اور شوقِ ملک گیری جو اس کے لہو

میں باقی تھا وہ خیالات کو اور بھی گرماتا رہتا تھا۔ بلکہ یہ جوش یا بابر کی طبیعت میں تھا یا اس میں کہ جب دریا کے کنارے پر پہنچتا تھا خواہ مخواہ گھوڑا پانی میں ڈال دیتا تھا۔ جب وہ اس طرح دریا اُترے تو نمک حلالوں میں کون ہے کہ جاں نثاری کا دعوےٰ رکھے اور اس سے آگے نہ ہو جائے۔ ہمایوں راحت پسند تھا۔ کہیں ایسا ہی بوجھ پڑا ہے جب وہ اس طرح جان پر کھیلا ہے۔ یلغاریں کر کے مہمیں کرنی۔ ہمت کے گھوڑے پر چڑھ کر آپ تلوار مارنی۔ قلعوں کے محاصرے کرنے۔ سرنگیں لگانی۔ ادنےٰ سپاہیوں کی طرح مورچے مورچے پر آپ پھرنا اکبر ہی کا کام تھا۔ اس کے بعد جو ہوئے عیش و آرام کے بندے تھے۔ بندگان خدا سے عبادت وصول کرنے والے دربار بادشاہی کے رکھوالے اور پیٹ کے ماروں کے سر کٹوانے والے بنئے مہاجن تھے کہ باپ دادا کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ یا پیرزادے کہ بزرگوں کی ہڈیاں بیچتے ہیں اور آرام سے زندگی کرتے ہیں۔ اکبر جب تک کابل میں تھا تو اونٹ سے بڑا کوئی جانور نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے اسی پر چڑھتا تھا۔ دوڑاتا تھا لڑاتا تھا۔ کبھی کتوں سے کبھی تیر و کمان سے شکار کھیلتا تھا۔ اور نشانے لگاتا تھا۔ باز باشے اُڑاتا تھا +

جب ہمایوں ایران سے ہندوستان کو پھرا اور کابل میں آرام سے بیٹھا۔ تو اکبر کی عُمر پانچ برس سے کچھ زیادہ ہو گی۔ یہ بھی چچا کی قید سے چھٹا۔ اور سیر و شکار جو شاہزادوں کے شغل ہیں اُن میں دل خوش کرنے لگا۔ ایک دن کتے لے کر شکار کو گیا۔ کوہستان کا ملک ہے ایک پہاڑ میں ہرن خرگوش وغیرہ شکار کے جانور بہت تھے۔ چاروں طرف نوکروں کو جما دیا کہ رستہ روکے کھڑے رہو۔ کوئی جانور نکلنے نہ پائے۔ اسے لڑکا سمجھ کر نوکروں نے بے پروائی کی ایک طرف سے جانور نکل گئے۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ الٹا پھرا اور جن نوکروں نے غفلت کی تھی۔ انہیں رسوائی کے ساتھ تمام اردو میں تشہیر کیا (پھرایا) ہمایوں سُن کر خوش ہوا۔ اور کہا شکر خدا کہ ابھی سے اس نونہال کی طبیعت میں سیاستِ شاہانہ اور ایجاد آئین کے اصول ہیں +

جب ۹۶۲ھ میں ہمایوں نے اکبر کو صوبہ پنجاب کا انتظام سپرد کر کے دلی سے روانہ کیا تو سرہند کے مقام میں حصار فیروزہ کی فوج آ کر شامل ہوئی اُن میں اُستاد عزیز سیستانی بھی تھا۔ اُسے توپ اور بندوق کے کام میں کمال تھا۔ اور بادشاہ سے رومی خان کا خطاب[1] حاصل کیا

---

[1] اس عہد میں اکثر توپ انداز روم سے آتے تھے اسی واسطے بادشاہوں کے دربار سے رومی خاں خطاب پایا کرتے۔ توپ و تفنگ کے کاروبار ممالک یورپ سے اول دکن میں آئے پھر ہندوستان میں پھیلے +

تھا وہ بھی کبر کے سلام کو آیا۔ اپنی نشانہ بازی اور تفنگ اندازی کے کمال اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر بھی شوق ہو گیا۔ شکار کا عشق تو پہلے ہی تھا۔ یہ اس کا جُزوِ اعظم ہوا۔ چند روز میں ایسا مشاق ہو گیا۔ کہ بڑے بڑے گُل چلے اُستاد کان پکڑنے لگے ؛

چیتوں کا شوق

جس طرح ہندوستان میں چیتوں سے شکار کھیلتے ہیں۔ ایران و ترکستان میں اس کا رواج نہیں۔ جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر آیا۔ اکبر ساتھ تھا بارہ برس کی عمر تھی۔ سرہند کے مقام پر سکندر خان افغان انبوہ در انبوہ افغانوں کی فوج کو لئے پڑا تھا۔ جنگِ عظیم ہُوئی اور ہزاروں کا کھیت پڑا۔ افغان بھاگے۔ خزانے ہزار در ہزار اور اموال بے شمار فوج بادشاہی کے ہاتھ آئے۔ ولی بیگ ذوالقدر (بیرم خاں کا بہنوئی حسین قلی خاں خان جہاں کا باپ) سکندر کے چیتا خانے میں سے ایک چیتا لایا۔ اس کا نام فتح باز تھا۔ دوندو اس کا چیتا بان تھا۔ دوندو نے اپنے کرتب اور چیتے کے ہنر اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر عاشق ہو گیا۔ اور اسی دن سے چیتوں کا شوق ہُوا۔ سیکڑوں چیتے جمع کئے۔ ایسے سدھے ہُوئے تھے کہ اشاروں پر کام دیتے تھے۔ اور دیکھنے والے حیران رہتے تھے۔ کمخواب و مخمل کی جھولیں اوڑھے۔ گلے میں سونے کی زنجیریں۔ آنکھوں پر زردوزی چشمے چڑھے۔ بہلوں میں سوار چلتے تھے۔ بیلوں کا سنگار بھی اُن سے کچھ کم نہ تھا۔ سُنہری روپہلی سنگوٹیاں چڑھی۔ زردوزی تاج سر پر۔ زرّیں و زرتار جھولیں جھم جھم کرتی۔ غرض کہ عجب بہار کا عالم تھا ؛

ایک دفعہ سفر پنجاب میں چلے جاتے تھے کہ ایک ہرن نمودار ہُوا۔ حکم ہوا کہ اس پر چیتا چھوڑو۔ چھوڑا۔ ہرن بھاگا۔ ایک گڑھا بیچ میں آگیا۔ ہرن نے چاروں تُپلیاں جھاڑ کر جست کی اور صاف اُڑ گیا۔ چیتا بھی ساتھ ہی اُڑا۔ اور ہوا میں جا دبوچا۔ جیسے کبوتر اور شہباز۔ عجب طرح سے اُوپر تلے گتھ مُتھ ہوتے ہوئے گرے۔ سواری کا انبوہ تھا۔ دلوں سے واہ وا کا ولولہ نکلا۔ عمدہ عمدہ چیتے آتے تھے۔ اُن میں سے انتخاب ہوتے تھے اور اعلےٰ سے اعلےٰ خاصہ میں داخل ہوتے تھے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ان کی تعداد کبھی ہزار تک نہ پہنچی۔ جب ایک دو کی کسر رہتی کچھ نہ کچھ عارضہ ایسا ہوتا تھا کہ چند چیتے مر جاتے تھے۔ سب حیران تھے۔ اور اکبر بھی ہمیشہ متعجب رہتا تھا ؛

ہاتھی

ہاتھی کا بڑا شوق تھا۔ اور یہ شوق فقط شاہوں اور شہزادوں کا شوق نہ تھا۔ ہاتھیوں کے سبب سے اکثر مہمیں قائم ہو گئیں۔ جن میں لاکھوں کروڑوں روپے صرف ہوئے اور ہزاروں سر کٹ گئے۔ خود ہاتھی پر بہت خوب بیٹھتا تھا۔ سرشور۔ مست۔ آدم کُش ہاتھی کہ بڑے بڑے مہاوت اُن کے پاس جاتے ہوئے ڈریں۔ وہ بے لاگ جاتا۔ برابر گیا۔ کبھی دانت۔ کبھی کان پکڑا اور گردن پر نظر آیا۔ ہاتھی سے ہاتھی پر اُچھل جاتا تھا۔ اور اس کی گردن پر بیٹھ کر بے تکلف ہنستا۔ کھیلتا۔ لڑاتا۔ بھگاتا۔ گدی۔ جھول کچھ نہیں۔ فقط کلاوہ میں پاؤں ہے اور گردن پر جما ہوا ہے۔ کبھی درخت پر بیٹھ جاتا۔ جب ہاتھی برابر آیا۔ جھٹ اُچھلا اور گردن یا پُشت پر۔ پھر وہ بہتیری جُھرجُھریاں لیتا ہے۔ سر دُھنتا ہے۔ کان پھٹ پھٹاتا ہے۔ یہ کب ہلتے ہیں ؎

ایک دفعہ اس کا پیارا ہاتھی مستی کے عالم میں چھٹا اور فیلخانہ سے نکل کر بازاروں میں تباہی کرنے لگا۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ اکبر سُنتے ہی قلعہ سے نکلا اور پتا لیتا ہوا چلا کہ کدھر ہے۔ ایک بازار میں پہنچ کر غُل سُنا کہ وہ سامنے سے آتا ہے۔ اور خلقت خدا کی بھاگی چلی آتی ہے۔ یہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اور اس کے چھجے پر آکر کھڑا ہوا۔ جونہی ہاتھی برابر آیا جھٹ لپک کر اس کی گردن پر۔ دیکھنے والے بے اختیار چلّائے۔ آہا ہا۔ پھر کیا تھا۔ دیو قابو میں آگیا۔ یہ باتیں چودہ پندرہ برس کی عمر کی ہیں ؎

لکنہ ہاتھی بدمستی و بدخوئی میں بدنام عالم تھا۔ ایک دن (دہلی میں) اس پر سوار ہوا۔ اور ایک جنگجو خونریز اسی کے جوڑ کا ہاتھی منگا کر میدان میں لڑانے لگا۔ لکنہ نے بھگا دیا۔ اور بھاگتے کے پیچھے دوڑا۔ ایک تو مست دوسرے فتحیابی کا جوش۔ لکنہ اپنے حریف کے پیچھے دوڑا جاتا تھا۔ ایک تنگ اور گہرے گڑھے میں پاؤں جا پڑا۔ پاؤں بھی ایک ستون کا ستون تھا۔ مستی کی جھونجھل میں پھر پھر کر جو حملے کئے تو بُھنبھیہ بھی پٹھے پر سے گر پڑا۔ اکبر اوّل سنبھلا۔ اخیر کو اُس کے آسن بھی گردن سے اُکھڑے۔ مگر پاؤں کلاوہ میں اٹکا رہ گیا۔ جاں نثار نمک حلال گھبرا گئے۔ اور عجب غلغلہ پڑ گیا۔ یہ اُس پر سے اُترے اور جب ہاتھی نے اپنا پاؤں باہر نکال لیا تو پھر اُسی پر سوار ہو کر ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔ خانخاناں زندہ تھے۔ اُنھوں نے صدقے اُتارے۔ روپے اشرفیاں نثار کیں۔ اور خدا جانے کیا کیا کچھ کیا ؎

خاصہ کے ہاتھیوں میں ایک ہاتھی کا ہوائی نام تھا کہ بد ہوائی اور شرارت میں بارود کا ڈھیر تھا۔ ایک موقع پر کہ وہ مست ہو رہا تھا۔ میدان چوگان بازی میں اُسے منگایا۔ آپ سوار ہوئے۔ اِدھر اُدھر دوڑاتے پھرے۔ بٹھایا اُٹھایا سلام کروایا۔ رن باگھ ایک اور ہاتھی تھا اُسکی بدمستی اور سرشوری کا بھی بڑا غُل تھا۔ اُسے بھی وہیں طلب فرمایا۔ اور آپ ہوائی کو لے کر سامنے ہوئے۔ ہواخواہوں کے دل بیقرار ہو گئے۔ جب دونو دیو ٹکر مارتے تھے پہاڑ ٹکراتے تھے۔ اور دریا جھکولے کھاتے تھے۔ آپ شیر کی طرح اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی سر پر تھے اور کبھی پشت پر۔ جاں نثاروں میں کوئی بول نہ سکتا تھا۔ آخر اتکہ خاں کو بُلا کر لائے کہ سب کا بزرگ تھا۔ بڈھا بچارہ ہانپتا کانپتا دوڑا آیا۔ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دادخواہوں کی طرح سر ننگا کر لیا پاس گیا اور مظلوم فریادیوں کی طرح دونو ہاتھ اُٹھا کر چیخیں مارنے لگا۔ شاہم! برائے خدا بگذرید للہ بر حال مردم رحم آرید۔ بادشاہم! جانِ بندگاں مے رود۔ چاروں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔ اکبر کی نظر اتکہ خاں پر پڑی۔ اسی عالم میں آواز دی۔ چرا بیقراری مے کنید۔ اگر شما آرام نہ نشینید ما خود را از پشت فیل مے اندازیم۔ وہ محبت کا مارا ہٹ گیا۔ آخر رن باگھ بھاگا۔ اور ہوائی آگ بگولا ہو کر پیچھے پڑا۔ دونو ہاتھی آگا دیکھتے تھے نہ پیچھا۔ گڑھا نہ ٹیلا۔ جو سامنے آتا لانگھتے پھلانگتے چلے جاتے تھے۔ جمنا کا پُل سامنے آیا۔ اس کی بھی پروا نہ کی۔ دو پہاڑوں کا بوجھ کشتیاں دبتی تھیں اور اُچھلتی تھیں۔ خلقت کناروں پر جمع تھی اور دلوں کا عجب عالم تھا۔ جاں نثار دریا میں کُود پڑے۔ پُل کے دونو طرف تیرتے چلے جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے ہاتھی پار ہوئے۔ بارے رن باگھ ذرا تھما۔ ہوائی کے زور شور بھی ڈھیلے پڑے اس وقت سب کے دل ٹھکانے ہوئے جہانگیر نے اس سرگذشت کو اپنی توزوک میں درج کر کے اِتنا زیادہ لکھا ہے "میرے والد نے مجھ سے خود فرمایا کہ ایک دن ہوائی پر سوار ہو کر میں نے ایسی حالت بنائی۔ گویا نشے میں ہوں پھر یہی سارا ماجرا تحریر کیا۔ اور اکبر کی زبانی یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر میں چاہتا تو ہوائی کو ذرا سے اشارے میں روک لیتا مگر اوّل سرخوشی کا عالم ظاہر کر چکا تھا۔ اس لئے پُل پر آ کر سنبھلنا مناسب نہ سمجھا کہ لوگ کہینگے بناوٹ تھی۔ یا یہ سمجھینگے کہ سرخوشی تو تھی مگر پُل اور دریا دیکھ کر نشے ہرن ہو گئے اور ایسی باتیں بادشاہوں کے باب میں نازیبا ہیں" ÷

اکثر شیر ببر شکارگاہوں یا عالم سفر میں اس کے سامنے آئے۔ اور اُس نے تنہا مارے۔ کبھی تیر۔ کبھی تفنگ۔ کبھی تلوار سے۔ بلکہ اکثر آواز دے دی ہے کہ خبردار کوئی اور آگے نہ بڑھے ÷

ایک دن فوج کی موجودات لے رہا تھا۔ دو راجپوت نوکری کے لئے سامنے آئے۔ اکبر کی زبان سے نکلا۔ کچھ بہادری دکھاؤ گے؟ اُن میں سے ایک نے اپنی برچھی کی بوڑی اُتار کر پھینک دی اور دوسرے کی برچھی کی بھال اُس پر چڑھائی۔ تلواریں سونت لیں۔ برچھی کی انیاں سینوں پر لیں اور گھوڑوں کو ایڑیں لگائیں۔ بے خبر گھوڑے چمک کر آگے بڑھے۔ دونو بہادر چھد کر بیچ میں آن ملے۔ اس نے اُس کے تلوار کا ہاتھ مارا۔ اُس نے اُس کے۔ دونو وہیں کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ اور دیکھنے والے حیران رہ گئے ؛

اکبر کو بھی جوش آیا مگر کسی کو اپنے سامنے رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ حکم دیا کہ تلوار کا قبضہ دیوار میں خوب مضبوط گاڑ دو۔ پھل باہر نکلا رہے۔ پھر تلوار کی نوک پر سینہ رکھ کر چاہتا تھا کہ آگے کو حملہ کرے۔ مان سنگھ دوڑ کر لپٹ گیا۔ اکبر بڑے جھنجھلائے۔ اُسے اُٹھا کر زمین پہ دے مارا۔ کہ جوش خداداد کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ انگوٹھے کی گھائی میں زخم بھی آ گیا تھا۔ مظفر سلطان نے زخمی ہاتھ مروڑ کر مان سنگھ کو چھڑایا۔ اس کشتم کشتا میں زخم زیادہ ہو گیا تھا۔ مگر علاج سے جلد اچھا ہو گیا ؛

ان ہی دنوں میں ایک دفعہ کسی خلاف طبع بات پر غصے ہو کر سواری کو گھوڑا مانگا۔ اور حکم دیا کہ سائیس خدمتگار کوئی ساتھ نہ رہے۔ خاصہ کے گھوڑوں میں ایک سُرنگ گھوڑا تھا ایرانی۔ کہ خضر خواجہ خاں نے پیش کیا تھا (خالو تھے) گھوڑا نہایت خوبصورت اور خوش ادا تھا مگر جیسا ان اوصاف میں بے نظیر تھا۔ ویسا ہی سرکش سرشور اور شریر تھا۔ چھٹ جاتا تھا تو کسی کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ کوئی چابکسوار اس پر سواری کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ بادشاہ خود ہی اُس پر سوار ہوتے تھے۔ اس دن غصے میں بھرے ہوئے تھے اُسی پر سوار ہو کر نکل گئے۔ رستے میں خدا جانے کیا خیال آیا کہ اُتر پڑے اور درگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے۔ گھوڑا اپنی عادت کے بموجب بھاگا۔ اور خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ یہ اپنے عالم میں غرق۔ اُس کا خیال بھی نہیں۔ جب حالت سے ہوش میں آئے تو دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہاں! نہ کوئی اہل خدمت پاس نہ اور گھوڑا ساتھ۔ کھڑے سوچ رہے تھے۔ اتنے میں دیکھتے ہیں۔ وہی وفادار گھوڑا سامنے سے دوڑا چلا آتا ہے۔ پاس آیا اور سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کوئی کہتا ہے کہ خانہ زاد حاضر ہے۔ سوار ہو جائیے۔ اکبر بھی حیران رہ گیا۔ اور سوار ہو کر لشکر میں آیا ؛

اگرچہ بادشاہوں کو ہر ملک میں اور ہر وقت میں جان کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مگر ایشیائی ملکوں میں جہاں شخصی سلطنت کا سکہ چلتا ہے۔ وہاں زیادہ تر خطر ہوتا ہے۔ خصوصاً اگلے وقتوں میں کہ

نہ سلطنت کا کوئی اصُول یا قانون تھا۔ نہ لوگوں کے خیالات کا کوئی قاعدہ تھا۔ باوجود اس کے اکبر کسی بات کی پروانہ کرتا تھا۔ اُسے ملک کے حال سے باخبر رہنے اور لوگوں کو آرام و آسائش سے رکھنے کا بڑا خیال تھا۔ ہمیشہ اسی فکر میں لگا رہتا تھا۔

ابوالفضل سے خود ایک دن بیان کیا کہ ایک رات آگرہ کے باہر چھڑیوں کا میلہ تھا۔ میں بھیس بدل کر وہاں گیا کہ دیکھوں لوگ کس حال میں ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں۔ ایک بازاری سا آدمی تھا۔ اس نے مجھے پہچان کر اپنے ساتھیوں سے کہا دیکھنا بادشاہ جاتا ہے۔ وہ برابر ہی تھا میں نے بھی سُن لیا۔ جھٹ آنکھ کو بھینگا کر کے مُنہ ٹیڑھا کر لیا۔ اور اسی طرح بے پروائی سے چلا گیا ان میں سے ایک نے بڑھ کر دیکھا اور غور کر کے کہا۔ وہ نہیں۔ بھلا اکبر بادشاہ کہاں! اس کی وہ صورت کہاں! یہ تو کوئی بڑھوا ہے۔ اور بھینگا بھی ہے۔ میں آہستہ آہستہ اُس بھیڑ سے نکلا۔ اور اپنے تکلف کو برطرف کر کے قلعہ کی راہ لی۔

اژدہا مارنے کا حال آگے آئیگا۔

اکبر نے اپنے غنیموں پر بڑے زور شور کی یلغاریں اور جان جوکھوں کے ساتھ دھاوے کئے۔ اور تھوڑی جمعیت سے ہزاروں کے لشکر گرد باد کر دیئے لیکن ایک دھاوا اُس نے ایسے موقع پر کیا جس کا اس سلسلہ میں لکھنا بھی ناموزوں نہیں ہے۔ موٹہ راجہ کی بیٹی راجہ جیمل سے بیاہی تھی۔ وہ جاں نثار اکبر کا مزاج شناس تھا۔ ۹۹۱ھ میں کسی کار ضروری کے لئے اُسے بنگالہ بھیجا تھا۔ حکم کا بندہ گھوڑے کی ڈاک پر بیٹھ کر دوڑا۔ تقدیر کی بات کہ جوسا کے گھاٹ پر تھکن نے بٹھایا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں لٹا کر بستر مرگ پر سُلا دیا بادشاہ کو خبر ہوئی۔ سُن کر بہت افسوس ہوا۔ محل میں آنے تو معلوم ہوا کہ اُس کا بیٹا اور چند اور جاہل راجپوت اپنی جہالت کے زور سے رانی کو زبردستی ستی کرتے ہیں۔ خدا ترس بادشاہ کو ترس آیا اور تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھا کہ ممکن ہے کسی اور امیر کو بھیج دُوں۔ مگر اُس کے سینے میں اپنا دل اور دل میں یہ درد کیونکر ڈال دوں۔ فوراً گھوڑے پر بیٹھا اور ہوا کے پر لگا کر اُڑا۔ اکبر بادشاہ کا دفعتہً تختگاہ سے غائب ہو جانا آسان بات نہ تھی۔ شہر میں شور اور عالم میں شورش مچ گئی۔ جابجا ہتھیار بندی ہونے لگی۔ اس دوڑا دوڑ میں امرا اور اہل خدمت میں سے کون ساتھ نبھ سکے؟ چند جاں نثار اور کئی خدمتگار رکاب میں رہے اور دفعتہً محل واردات پر جا کر کھڑے ہوئے۔ اکبر کو شہر کے قریب کسی جگہ ٹھیرایا۔ راجہ جگناتھ اور راجہ رائسال گھوڑے مار کر آگے بڑھ گئے تھے

انہوں نے جا کر خبر دی کہ مہابلی آگئے۔ ضدی جاہلوں کو روکا اور حضور میں لا کر حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ اپنے کئے پر پشیمان ہیں۔ اس لئے جان بخشی کی لیکن حکم دیا کہ چند روز ادبخانۂ زندان میں رہیں۔ رانی کی جان کے ساتھ اُن کی بھی جان بچ گئی۔ اُسی دن وہاں سے پھرا۔ جب فتح پور میں پہنچا تو سب کے دم میں دم آیا ؏

۹۷۴ھ میں تیغ آفتاب مشرق پر چمک رہی تھی۔ اکبر خان زماں کی مہم میں مصروف تھا۔ محمد حکیم مرزا کو بد صلاح مصاحبوں نے صلاح بتائی کہ آپ بھی آخر ہمایوں بادشاہ کے بیٹے ہیں اور ملک کے وارث ہیں پنجاب تک ملک آپ کا رہے۔ وہ بھولا بھالا سادہ شہزادہ اُن کے کہنے میں آکر لاہور میں آگیا۔ اکبر نے ادھر کی حرارت کو عفو تقصیر کے شربت اور نذرانہ جرمانہ کی سکنجبین سے فرو کیا۔ امرا کو فوجیں دے کر ادھر بھیجا اور فوراً سمند ہمت پر سوار ہوا۔ محمد حکیم آمد آمد کی ہوا میں اُڑ کر کابل پہنچے۔ اکبر نے لاہور میں آکر مقام کیا اور شکار قمرغہ کا حکم دیا۔ سردار منصبدار قراول اور شکاری دوڑے اور جلد حکم کی تعمیل کی ؏

قمرغہ۔ یہ ایران و توران کے بادشاہوں کا قدیمی شوق تھا۔ ایک فراخ جنگل کے گرد بڑے بڑے لکڑوں کی دیوار سے احاطہ باندھتے تھے۔ کہیں ٹیلوں کی قدرتی قطاروں سے۔ کہیں بنائی ہوئی دیواروں سے مدد لیتے تھے۔ تیس تیس چالیس چالیس کوس سے جانوروں کو گھیر کر لاتے تھے۔ رنگ برنگ کے جانور درندے چرندے۔ پرندے اُن میں آجاتے تھے اور نکاس کے رستے بالکل بند کر دیتے تھے۔ بیچ میں کئی بلند مقام بادشاہ اور شہزادوں کے بیٹھنے کے لئے بناتے تھے۔ پہلے بادشاہ سوار ہو کر خود شکار مارتا تھا۔ پھر شہزادے۔ پھر اجازت ہوجاتی تھی خاص خاص امیر بھی شامل ہوجاتے تھے۔ روز بروز دائرے کو سکیڑتے اور جانوروں کو سمیٹتے لاتے تھے۔ اخیر دن جبکہ تھوڑی جگہ میں جانوروں کی بھنات ہوجاتی تھی۔ تو اُن کی دھکا پیل اور ریل دھکیل۔ گھبراہٹ اور اضطراب سے بولانا اور دوڑنا۔ چلانا۔ بھاگنا۔ کودنا۔ تڑا رے بھرنا۔ اُچھلنا اور گر پڑنا شکار بازوں کو طرفہ تماشا اور اہل درد کے دلوں کا عجب عالم ہوتا تھا۔ اسی کو شکار قمرغہ اور شکار جرگہ بھی کہتے تھے۔ اس موقع پر ۴۰ کوس کے دورے سے جانور گھیر کر لائے اور لاہور سے ۵ کوس پر شکار مذکور کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے اور نیک شگون نظر آئے۔ یہاں کی صید افگنی سے دل خوش کر کے کابل کے شکار پر گھوڑے اُٹھائے۔ راوی کے کنارے پر آکر اپنے لباس اور ترکیوں تازیوں کے منہ سے لگامیں اُتار ڈالیں۔ خود امرا و

مصاحبوں سمیت دریا سے پیر کر پار ہوئے۔ اقبال اکبری کی دستگیری سے سب صحیح سلامت اُتر گئے۔ اِلّا خوشخبر خاں کہ جس طرح خوشخبری کے لانے میں پیش قدم تھا۔ یہاں پیش روی کرکے کنارۂ عدم پر جانکلا۔ اس عجیب شکارگاہ کی ایک پُرانی تصویر ہاتھ آئی۔ ناظرین کے معائنہ کے لئے آئینہ دکھاتا ہُوں ❖

سواری کی سیر

سلطنت کی شکوہ اور دولت وحشمت کے انبوہ۔ جشن سالگرہ اور جشن جلوس پر بہار دکھاتے تھے۔ بارگاہ جلال آراستہ۔ تخت مرصع زریں وسیمیں چبوترے پر جلوہ گر۔ تاج اقبال میں ہما کا پر۔ چتر جواہر نگار سر پر۔ زربفت کا شامیانہ موتیوں کے جھالر۔ سونے روپے کے استادلی پرنتا۔ ابریشمیں قالینوں کے فرش۔ در و دیوار پر شالہائے کشمیری۔ مخملہائے رومی۔ اطلسہائے چینی لہراتے۔ امرا دست بستہ دو طرفہ حاضر۔ چوبدار۔ خاص بردار اہتمام کرتے پھرتے ہیں ان کے زرق برق لباس۔ سونے روپے کے نیزوں اور عصاؤں پر باناتی اور سقرلاطی غلاف طلسمات کی پتلیاں تھیں خدمت کرتی پھرتی تھیں۔ شادی و مبارکبادی کی چہل پہل اور عیش و عشرت کی ریل پیل ہوتی تھی ❖

بارگاہ کے دو تو طرف شہزادوں اور امیروں کے خیمے۔ باہر دو نو طرف سواروں اور پیادوں کی قطار۔ بادشاہ دو منزلی راوٹی (جھروکے) میں آبیٹھتے۔ اس کا زردوزی خیمہ۔ سایۂ اقبال کا شامیانہ۔ شہزادے۔ امرا۔ سلاطین آتے۔ انہیں خلعت و انعام ملتے۔ منصب بڑھتے۔ روپے اشرفیاں سونے چاندی کے پھول اولوں کی طرح برستے۔ یکایک حکم ہوتا کہ ہاں لوٹ لو۔ فراشوں اور خواصوں نے منوں بادلا اور مقیش کتر کر جھولیوں میں بھر لیا ہے اور صندلیوں پر چڑھ کر اُڑا رہے ہیں۔ نقارخانے میں نوبت جھڑ رہی ہے۔ ہندوستانی۔ عربی۔ ایرانی۔ تورانی۔ فرنگی باجے بجتے ہیں۔ غرض گھماگھمی تھی اور ناز و نعمت کے لئے صلائے عام تھا ❖

اب دولہا کے سامنے سے عروس دولت کی برات گذرتی ہے۔ نشان کا ہاتھی آگے۔ اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار۔ پھر ماہی مراتب اور اور نشانوں کے ہاتھی۔ جنگی ہاتھیوں پہ فولادی پاکھریں۔ پیشانیوں پر ڈھالیں۔ بعض کی مستکوں پہ دیوزادی نقش و نگار۔ بعض کے چہروں پر گینڈوں۔ ارنے بھینسوں اور شیروں کی کھالیں کلّوں سمیت چڑھی ہوئی۔ ہیبت ناک صورت

ڈراونی مورت۔ سونڈوں میں گرز۔ برچھیاں تلواریں لئے۔ سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سو سو کوس کے دم۔ گردن کھچی۔ سینے تنے۔ جیسے لقا کبوتر۔ پھر گھوڑوں کی قطاریں عربی۔ ایرانی ترکی ہندوستانی آراستہ پیراستہ ساز و یراق میں غرق۔ چالاکی میں برق۔ اُچھلتے۔ مچلتے کھیلتے کودتے۔ شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے۔ پھر شیر۔ پلنگ۔ چیتے۔ گینڈے بہتیرے جنگل کے جانور سدھے سدھائے شائستہ۔ چیتوں کے چھکڑوں پر نقش و نگار۔ گل گلزار۔ آنکھوں پر زر دوزی غلاف وہ اور ان کے بیل کشمیری شالیں۔ مخمل و زربفت کی جھولیں اوڑھے۔ بیلوں کے سرُوں پر کلغیاں اور تاج۔ سینگ مصوروں کی قلمکاری سے قلمدان کشمیر۔ پاؤں میں جھانجن۔ گلے میں گھنگرو۔ چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے۔ شکاری کہتے کہ شیر سے مُنہ نہ پھرائیں۔ شکار کی بو پر پتال سے پتا نکال لائیں ؎

پھر خاصے کے ہاتھی آتے۔ ان کی زرق و برق کا عالم اللہ اللہ۔ آنکھوں کو چکا چوندی آتی تھی۔ یہ خاص الخاص چاہتیے تھے اُن کی جھلابور جھُولیں۔ موتی اور جواہر ٹنکے۔ زیوروں میں لدے پھندے۔ قوی ہیکل سینوں پر سونے کی ہیکلیں لٹکتی۔ سونے چاندی کی زنجیریں سونڈوں میں ہلاتے۔ جھُومتے جھامتے۔ خوش مستیاں کرتے چلے جاتے تھے ؎

سواروں کے دستے پیادوں کے قشون (پلٹنیں) سپاہ ترک کے ترکی و تاتاری لباس وہی جنگ کے سلاح۔ ہندوستانی فوجوں کا اپنا اپنا بانا۔ کیسری دگلے۔ سورما راجپوت ہتیاروں میں اوپچی بنے۔ دکھنیوں کے دکھنی سامان۔ توپخانے آتشخانے اُن کی فرنگی و رومی وردیاں سب اپنے اپنے باجے بجاتے۔ رجپوت شہنائیوں میں کرکے گاتے۔ اپنے نشان لہراتے چلے جاتے تھے۔ امرا و سردار اپنی اپنی سپاہ کو انتظام سے لئے جاتے تھے۔ جب سامنے پہنچتے۔ سلامی بجا لاتے۔ دمامے پر ڈنکا پڑتا۔ سینوں میں دِل ہِل جاتے۔ اِس میں حکمت یہ تھی۔ کہ فوج اور لوازمات فوج اور ہر شے کی موجودات ہوجائے۔ کوتاہی ہو تو پُوری ہو جائے۔ قباحت ہو تو اصلاح میں آئے۔ ایجاد مناسب اپنی جگہ پائے ؎

اکبر کی تصویر

اکبر کی تصویریں جابجا موجود ہیں مگر چونکہ سب میں اختلاف ہے اسلئے کسی پر اعتبار نہیں میں نے بڑی کوشش سے چند تصویریں مہاراجہ جے پور کے پوتھی خانہ سے حاصل کیں۔ اُن میں

جو اکبر کی تصویر ملی ۔ وہ سب سے زیادہ معتبر سمجھتا ہوں ۔ اور اُسی کی نقل سے اس مرقع کا تاج سر کرتا ہوں ۔ لیکن یہاں اُس تصویر کو جلوہ دیتا ہوں جو کہ جہانگیر نے اپنی توزک میں عبارت الفاظ سے کھینچی ہے ۔ حلیہ مبارک اُن کا یہ تھا کہ بلند بالا ۔ میانہ قد ۔ گندمی رنگ ۔ آنکھیں اور بھوئیں سیاہ ۔ گورہ پن نے صورت کو خنک نہیں کیا تھا ۔ نمکینی زیادہ تھی ۔ شیر اندام ۔ سینہ کشادہ چھاتا اُبھرا ہوا ۔ دست و بازو لمبے ۔ بائیں نتھنے پر ایک مسا آدھے چنے کے برابر ۔ جو لوگ علم قیافہ میں مہارت رکھتے تھے ۔ اسے بڑی دولت و اقبال کا نشان سمجھتے تھے ۔ آواز بلند تھی ۔ گفتگو میں لذت اور قدرتی نمکینی تھی ۔ اور سج دھج میں عام لوگوں کو ان سے کچھ مناسبت نہ تھی ۔ شکوہ خداداد اُن کے صورت حال سے نمودار تھی ۔

سفر میں بارگاہ کا کیا نقشہ تھا

جب دورہ کا سفر یا شکار کا لطف منظور نظر ہوتا تھا تو مختصر لشکر اور ضروری شکوہ سلطنت کے اسباب ساتھ لئے جاتے تھے ۔ لیکن چار دانگ ہندوستان کا شہنشاہ ۲۴ لاکھ سپہ کا سپہ سالار اس کا اختصار بھی ایک عالم کا پھیلاؤ تھا ۔ آئین اکبری میں جو کچھ لکھا ہے ۔ آج کے لوگوں کو مبالغہ نظر آتا ہے ۔ مگر یورپ کے سیاح جو اُس وقت یہاں آئے ۔ ان کے بیان سے بھی حالات مذکورہ کی تصدیق ہوتی ہے ۔ بارگاہ کی شان و شکوہ کاغذی سجاوٹ میں کب آسکتی ہے ۔ شکار میں اور پاس کے سفر میں جو انتظام ہوتا تھا ۔ اس کا نقشہ کھینچتا ہوں ۔ **گلال بار** ۔ یہ چوبی سراپردہ خرگاہ کی وضع کا ہوتا تھا ۔ تسموں سے مضبوطی کی جاتی تھی ۔ سُرخ مخمل ۔ بانات ۔ قالینوں سے سجاتے تھے ۔ گرد عمدہ احاطہ ایک قلعہ تھا ۔ اس میں مضبوط دروازہ ۔ قفل کنجی سے کھلتا تھا ۔ سو گز سے سو گز یا زیادہ ۔ حضور کا ایجاد ہے ۔

اس کے شرقی کنارے پر **بارگاہ** ۔ بیچ کے استادوں پر دو کڑیاں ۔ ۵۴ کمروں میں تقسیم ۔ ہر ایک کا ۲۴ گز طول ۔ ۱۴ گز عرض ۔ ۱۰ ہزار آدمی پر سایہ ڈالتی تھی ۔ ہزار پھرتیلے فراش ایک ہفتے میں سجاتے تھے ۔ چرخیاں ۔ پہیئے وغیرہ جر ثقیل کے اوزار زور لگاتے تھے ۔ لوہے کی چادریں اسے مضبوط کرتی تھیں ۔ فقط سادی بارگاہ جس میں مخمل زربافت ۔ کمخواب ۔ زربفت کچھ نہ لگائیں ۱۰ ہزار کی لاگت میں کھڑی ہوتی تھی اور کبھی اس سے بھی زیادہ بوجھ دیتی تھی ۔

بیچ بیچ میں **راوٹی** ۱۰ ستونوں پر کھڑی ہوتی تھی ۔ ستون تھوڑے تھوڑے زمین میں

گڑے ہوئے۔ سب باہم برابر مگر دو اُونچے۔ ان پر ایک کڑی۔ اوپر اور نیچے واسہ مضبوطی کرتا تھا۔ اس پر کئی کڑیاں۔ ان پر لوہے کی چادریں کہ نرماوگی انہیں وصل کرتی تھی۔ دیواریں اور چھتیں نرسلوں اور بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئیں۔ دروازے دو یا ایک۔ نیچے کے واسہ کے برابر چبوترہ۔ اندر زربفت و مخمل سجاتے تھے۔ باہر بانات سلطانی۔ ابریشمیں نواڑیں اُس کی کمر مضبوط کرتی تھیں گرد اور سراپردے +

اس سے ملا ہوا ایک چوبیں محل دو منزلہ ۱۸ استون اسے سر پر لئے کھڑے رہتے تھے چھ چھ گز بلند۔ چھت تختہ پوش۔ اُس پر چوگزے ستون۔ نرماوگیوں سے وصل ہوکر بالاخانہ سجاتے تھے۔ اندر باہر اُسی طرح سے سنگار کرتے تھے۔ لڑائیوں میں اس کا پہلو شبستانِ اقبال سے ملا رہتا تھا۔ اسی میں عبادت الٰہی کرتے تھے۔ یہ پاک مکان ایک صاحبدل تھا۔ ادھر کا رُخ خلوتخانۂ وحدت پر۔ ادھر کا نگارخانہ کثرت پر۔ آفتاب کی عظمت بھی اسی پر بیٹھ کر ہوتی تھی۔ پھر اول حرم سرا کی بیبیاں دولتِ دیدار حاصل کرتی تھیں۔ پھر باہر والے حاضر ہوکر سعادت کے ذخیرے سمیٹتے تھے۔ دوروں کے سفر میں ملازمت بھی یہیں ہوتی تھی۔ اس کا نام دوآشیانہ منزل تھا اور اسی کو جھروکہ بھی کہتے تھے +

زمیں دوز طرح طرح کے انداز پر ہوتے تھے۔ ایک کڑی بیچ میں یا دو۔ بیچ میں پردے ڈال کر الگ الگ گھر کر دیتے تھے +

عجائبی ۹ شامیانے چار چار ستونوں پر ملا کر کھڑے کرتے تھے۔ ۵ چوگوشے۔ ۴ مخروطی۔ اور یک لخت بھی ہوتے تھے۔ ایک ایک کڑی بیچ میں +

منڈل ۵ شامیانے ملے ہوئے چار چار ستونوں پر تانتے تھے۔ کبھی گرد کے چار کو لٹکا دیتے تھے تو خلوتخانہ ہوجاتا تھا۔ کبھی ایک طرف کبھی چاروں طرفیں کھول کر جی خوش کرتے تھے +

اٹھ کھنبہ ۱۷ شامیانے جدا اور ملے ہوئے سجاتے تھے۔ آٹھ آٹھ ستونوں پر +

خرگاہ۔ شیخ ابوالفضل کہتے ہیں مختلف وضع کی ہوتی ہیں یک دری اور دو دری۔ بندہ آزاد کہتا ہے۔ اب تک بھی تمام ترکستان میں صحرانشینوں کے گھر یہی ہیں۔ بید وغیرہ لچکدار درختوں کی موٹی اور پتلی پتلی ٹہنیاں سکھاتے ہیں۔ اور چھوٹی بڑی موقع موقع سے کاٹ کر ایک مدور ٹٹی کھڑی کرتے ہیں۔ بلند قدِ آدم۔ اس پر ویسی ہی موزوں اور متناسب لکڑیوں سے بنگلہ چھاتے ہیں۔ اوپر موٹے موٹے صاف۔ عمدہ اور خوشرنگ نمدے منڈھتے ہیں۔ اندر بھی دیواروں پر

گلکاری کے نمدے اور قالین سجاتے ہیں اور اُن کی پٹیوں سے حاشیے چڑھاتے ہیں۔ یہ سب انہی کی دستکاری ہوتی ہے۔ چوٹی پر گز بھر مدوّر روشندان کھلا رکھتے ہیں۔ اس پر ایک نمدہ ڈال دیتے ہیں۔ برف پڑنے لگی تو یہ نمدہ پھیلا رہا۔ ورنہ کھلا رکھتے ہیں۔ جب چاہا لکڑی سے کونا اُلٹ دیا۔ لطف یہ ہے۔ کہ اس میں لوہا بالکل نہیں لگاتے۔ لکڑیاں آپس میں پھنس جاتی ہیں۔ جب چاہا کھول ڈالا۔ گٹھے باندھے۔ اونٹ۔ گھوڑوں۔ گدھوں پر لادا اور چل کھڑے ہوئے ؛

حرم سرا۔ بارگاہ کے باہر موزوں مناسب ۲۴ چوبین راوٹیاں ۱۰ گز طول ۶ گز عرض۔ بیچ میں قناتوں کی دیواریں۔ اس میں بیگمات اترتی تھیں۔ کئی خیمے اور خرگاہ اَور کھڑے ہوتے تھے۔ اس میں خواصیں اترتی تھیں۔ آگے سائبان زردوزی۔ زربفتی مخملی بہار دیتے تھے۔

اس سے ملا ہُوا سراپردہ گلیمی کھڑا کرتے تھے۔ یہ ایسا دل بادل تھا کہ اس کے اندر کئی خیمے اور لگاتے تھے۔ اُردو بیگنیاں اور عورتیں ان میں رہتی تھیں ؛

اِس کے باہر دولتخانہ خاص تک سوگز عرض کا ایک صحن سجاتے تھے کہ مہتابی کہلاتا تھا۔ اس کے دونو طرف بھی پہلی طرح سراچہ سماں باندھتا تھا۔ دو دو گز پر چھہ گزی چوب کھڑی گز بھر زمین میں گڑی۔ سروں پر برنجی قبّے۔ اسے اندر باہر ۲ طنابیں تانے رہتی تھیں۔ چوکیدار برابر برابر پہرے پر حاضر۔ اس خوشی خانہ کے بیچ میں ایک صفہ (چبوترہ) اُس پر چار چوبہ شامیانہ اِس پر رات کو جلوس فرماتے تھے۔ خاصانِ درگاہ کے سوا کسی کو اجازت نہ تھی

گلال بار سے ملا ہوا ۶۰ گز قطر کا دائرہ کھینچتے تھے۔ ۱۲ حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ گلال بار کا دروازہ ادھر نکالتے تھے۔ ۱۲ شامیانہ ۱۲ گزے اس پر سائبانی کرتے تھے اور قناتیں انہیں خوشنما تراش سے تقسیم کرتی تھیں۔ اس خلوتخانہ کی اِکّی خانہ کہتے تھے ؛

مناسب انداز سے ہر مقام پر ایک صحت خانہ ہوتا تھا۔ یہ پائخانہ کو خطاب عطا ہوا تھا اِس سے ملا ہوا ایک گلیمی پردہ سرا ۱۵۰ گز مربع۔ اِس کی چوبیں بھی اسی طرح قبّوں سے تاجدار بیچ میں بارگاہ وسیع۔ ہزار فراش اسے سجاتے تھے۔ ۲، کمروں میں تقسیم اور ۱۵ گز کا تہتیر اِس کے اوپر قلندری کھڑی کرتے تھے۔ خیمے کی وضع ہوتی تھی۔ اوپر موجامہ وغیرہ اس کے ۵۰ شامیانے ۱۲ گزے دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ یہ دولتخانہ خاص تھا۔ اس کا دروازہ بھی زنجیر قفل کنجی سے محفوظ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے امیر سپہ سالار بخشی بے اجازت نہ جا سکتے تھے۔ ہر مہینے اِس بارگاہ کو نیا سنگار ملتا تھا۔ اندر باہر رنگین نقشی بوقلموں فرش اور

پردے چمن کھلا دیتے تھے۔ اس کے گرد ۱۵۰ گز کے فاصلے پر طنابیں کھنچتی تھیں۔ تین تین گز پر ایک ایک چوب کھڑی ہوئی۔ جابجا پاسبان ہشیار۔ یہ دیوانخانہ عام کہلاتا تھا۔ ہر جگہ پہرہ دار۔ اخیر میں جاکر ۱۲ طناب کے فاصلے پر ایک طناب ۶۰ گز کی نقارخانہ ❊

اس میدان کے بیچ میں اکاس دیا روشن ہوتا تھا۔ اکاس دئے کئی ہوتے تھے۔ ایک یہاں اور ایک سراپردہ کے آگے کھڑا کرتے تھے۔ ۴۰ گز کا طولانی ستون ہوتا تھا۔ اُسے ۱۶ طنابیں تانے کھڑی رہتی تھیں۔ دور تک روشنی دکھاتا تھا۔ اور بھولے بھٹکے وفاداروں کو اندھیرے میں دردولت کا رستہ بتاتا تھا۔ اور اس کے دائیں بائیں کا حساب لگاکر اور امرا کے خیموں کے پتے لگا لیتے تھے ❊

۱۰۰ ہاتھی ۵۰۰ اونٹ ۴۰۰ چھکڑے ۱۰۰ کہار ۵۰۰ منصبدار اور احدی۔ ہزار فراش ایرانی وتورانی وہندوستانی۔ ۵۰۰ بیلدار۔ ۱۰۰ سقے۔ ۵۰ نجار۔ بہت سے خیمہ دوز۔ مشعلچی۔ ۳۰ چرم دوز۔ ۱۵۰ حلال خور (خاکروب کو خطاب عطا ہوا تھا) اس آباد شہر کے ساتھ چلتے تھے۔ پیادے کا مہینہ ۲ روپے سے ۳ روپے تک تھا ❊

۱۵۰۰ کے ہموار خوشنما قطعہ زمین پر بارگاہ خاص کا سامان پھیلتا تھا۔ ۳۰ گز گول فاصلہ دے کر دائیں بائیں پیچھے پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ پشت پر بیچوں بیچ میں سو گز کے فاصلے پر مریم مکانی۔ گلبدن بیگم اور اَور بیگمات اور شاہزادہ دانیال۔ دائیں پر شاہزادہ سلطان سلیم (جہانگیر)۔ بائیں پر شاہ مراد۔ پھر ذرا بڑھ کر توشہ خانہ۔ آبدارخانہ۔ خوشبوخانہ وغیرہ تمام کارخانے ہر گوشے پر خوشنما چوک۔ پھر اپنے اپنے رُتبے سے اُمرا دونوں طرف غرض لشکر اقبال اور بارگاہ جلال ایک چلتا ہوا شہر تھا۔ جہاں جاکر اترتا تھا عیش وعشرت کا میلا ہوتا تھا جنگل میں منگل ہوجاتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ میل تک دوطرفہ بازار لگ جاتے تھے۔ سارا لاؤلشکر اور سامان مذکور ایک طلسمات کا شہر آباد ہوجاتا تھا اور گلال بار بیچ میں قلعہ نظر آتا تھا ❊

شکوہِ سلطنت

جب دربار آراستہ ہوتا تھا۔ بادشاہ با اقبال اورنگ سلطنت پر جلوہ گر ہوتا تھا۔ اورنگ ہشت پہلو موزوں اور خوشنما تخت تھا۔ گنگا جمنی یعنی سونے چاندی کے عنصروں سے ڈھلا ہوا۔ دریا نے دل۔ پہاڑ نے جگر نکال کر پیشکش کیا۔ لوگ سمجھے کہ الماس۔ لعل۔ یاقوت

اور موتیوں سے مرصع ہے ؎

بائستے انجم از پئے ترصیع تاج و تخت	نازم فروتنی کہ جواہر قرار یافت

سر پر چتر زرکار و زرتار جواہر نگار۔ جھالروں میں مروارید و جواہرات جھلمل جھلمل کرتے۔ سواری کے وقت ، چتر سے کم نہ ہوتے تھے۔ کوتل ہاتھیوں پر چلتے تھے۔

سایہ بان۔ بیضوی تراش۔ گز بھر بلند۔ دستہ چتر کے برابر۔ اور اُسی طرح زربفت اور مخمل زرباف سے سنگارتے تھے۔ جواہرات اور مروارید ٹکے ہوئے۔ چالاک خاص بردار رکاب کے برابر لئے چلتے تھے۔ دھوپ ہو تو سایہ کر لیتے تھے۔ اور اسے آفتاب گیر بھی کہتے تھے۔

کوکبہ۔ چند سونے کے گولے صیقل اور جلا سے مبارک ستاروں کی طرح دغدغاتے پیشگاہ دربار میں آویزاں ہوتے تھے۔ اور یہ چاروں بادشاہ کے سوا کوئی شاہزادہ یا امیر نہ رکھ سکتا تھا۔

علم۔ سواری کے وقت لشکر کے ساتھ کم سے کم ۵ علم ہوتے تھے۔ ان پر بانات کے غلاف رہتے تھے۔ میدان جنگ میں کھل کر ہوا میں لہراتے تھے۔

چتر توغ۔ ایک قسم کا علم تھا مگر علم سے چھوٹا۔ کئی **قطاس** کے گچھے اس پر طرّہ (قطاس سراگائے یعنی پہاڑی گائے کی دُم)۔

تمن توغ۔ اسے بھی چتر توغ ہی سمجھو۔ اُس سے ذرا اونچا ہوتا تھا۔ یہ دونو رتبے میں اونچے تھے اور شہزادوں کے لئے خاص تھے۔

جھنڈہ۔ وہی علم۔ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے کا الگ ہوتا تھا۔ بڑا معرکہ ہو تو تعداد بڑھا دیتے تھے۔ نقارے کے ساتھ الگ ہوتا تھا۔

گورکہ۔ عربی میں دمامہ کہتے ہیں۔ ایک نقارخانہ میں کم و بیش ۱۸ جوڑیاں ہوتی تھیں۔

نقارہ۔ کم و بیش ۲۰ جوڑیاں۔

دہل۔ کئی ہوتے تھے۔ کم سے کم ۴ بجتے تھے۔

کرنا۔ سونے چاندی اور پیتل وغیرہ سے ڈھالتے تھے۔ چار سے کم نہ بجتی تھیں۔

سرنا۔ ایرانی و ہندوستانی کم سے کم ۹ نغمہ سرائی کرتی تھیں۔ **نفیر**۔ ایرانی و ہندوستانی فرنگی ہر قسم کی کئی نفیریاں نغمہ ریزی کرتی تھیں **سینگ** گائے کے سینگ کی وضع پر تانبے کا سینگ ڈھال لیتے تھے۔ اور دو بجتے تھے۔ **سنج** (جھانج) تین جوڑیاں بجتی تھیں۔

پہلے ۴ گھڑی رات رہے۔ اور ۴ گھڑی دن رہے نوبت بجا کرتی تھی۔ اکبری عہد میں

ایک آدھی ڈھلے بجنے لگی کہ آفتاب چڑھاؤ کے درجہ میں قدم رکھتا ہے۔ دوسری طلوع کے وقت ٭

جشنِ نوروزی

نوروز ایک عالم افروز دن ہے کہ ایشیا کے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اسے عید مانتے ہیں۔ اور بالفرض کوئی بھی نہ مانے تو بھی موسم بہار ایک قدرتی جوش ہے۔ کہ اپنے وقت پر خودبخود ہر دل میں ذوق شوق پیدا کرتا ہے۔ یہ امر کچھ انسان یا حیوان پر منحصر نہیں بلکہ اُس کا اثر ہر شے میں جان ڈال دیتا ہے۔ انتہا ہے کہ مٹی میں سرسبزی اور سبزی میں گلکاری کرتا ہے۔ بس اسی کا نام عید ہے۔ **ترکِ چنگیزی** کہ کچھ مذہب نہ رکھتے تھے۔ اور جاہل محض تھے۔ باوجود اس کے ادنٰے صاحب مقدور سے لے کر امرا و بادشاہ تک اس دن گھروں کو سجاتے تھے **خوان یغما** لگاتے تھے۔ سب مل کر لوٹتے لٹاتے تھے۔ اور اسے سال بھر کے لئے مبارک شگون سمجھتے تھے۔ **ایرانی** پہلے بھی مانتے تھے۔ زرتشت نے آکر اُس پر مذہبی سکّہ لگایا۔ کیونکہ اس کے خیالات کے بموجب آفتاب سب سے روشن دلیل خداشناسی اور حق جوئی کی ہے۔ **ہندو** بھی اس خیال میں اُن سے متفق ہیں خصوصاً اس جہت سے کہ ان کے بعض مہاراجگان جلیل القدر کے جلوس اور اکثر بڑی بڑی کامیابیاں اسی دن ہوئی ہیں ٭

اکبر کو انہیں فرقوں سے تعلق تھا۔ اس لئے وہ بھی نوروز کے دن جشن شاہانہ کے سامان میں فصل بہار کی شان دکھاتا تھا۔ اور سلطنت کا نوروز مناتا تھا۔ چونکہ وہ ہندوستان میں تھا۔ اور ہندوؤں میں اسے رہنا سہنا اور گزارہ کرنا تھا۔ اس لئے ان کی ریت رسوم کی بھی بہت باتیں داخل کر لی تھیں۔ تمہیں یاد ہے؟ اس بے علم بادشاہ کو علمائے زرپرست نے ذہن نشین کر دیا تھا کہ سنہ ہزار میں ملک و ملّت بدل جائیگا اور اس کے صاحب فرمان آپ ہی ہوں گے۔ وہ اس خوشی میں ایسا بیقرار ہوا کہ جو باتیں سنہ الف پر کرنی تھیں۔ پہلے ہی کر گزرا۔ یہاں تک کہ ۹۹۰ھ میں ہی سنہ الف کا سکّہ لگا دیا۔ اور جشن نوروزی کی شان و شکوہ میں بھی عمدہ عمدہ ترقیاں اور فائدہ مند اصلاحوں سے جاہ و جلال کو جلوہ دیا۔ جشن کے قواعد و آئین نے سال بسال کی ترقیوں سے پرورش پائی مگر **آزاد** سب کو ایک جگہ سجاتا ہے کہ دلچسپ تماشا ہے ٭

دیوان عام و خاص کے گرد ۱۲۰ ایوان عالیشان تھے جن کی عمارت کو خوشنما اور بیش بہا پتھروں نے سنگین اور رنگین کیا تھا۔ ایک ایک ایوان ایک ایک امیر باتدبیر کو عنایت ہوا۔

کہ ہر عالی حوصلہ اسے آراستہ کرکے اپنی قابلیت اور علو ہمّت کا نمونہ دکھائے ۔ ایک طرف دولت خانۂ خاص تھا۔ وہ خدمتگاران خاص کے سپرد ہؤا کہ آئین بندی کریں سبھا منڈل کہ جلوہ گاہِ خاص تھا سجایا گیا اور تمام مکانات کے در و دیوار کو پرتگالی بانات رومی وکاشانی مخمل ۔بنارسی ندبغت وکمخواب ۔ پسیلے دوپٹے ۔تاش تمامی ۔گوٹے ٹھپے ۔پٹیک ۔مقیش کے خلعت پہنائے ۔کشمیر کی شالیں اُڑھائیں ۔ایران و ترکستان کی قالین پا انداز میں بچھا دئے ملک فرنگ اور چین اور ماچین کے رنگا رنگ پردے ۔نادر تصویریں عجیب و غریب آئینے سجائے شیشہ اور بلور کے کنول ۔مردنگ ۔قندیلیں ۔جھاڑ ۔فانوسیں ۔قمقمے لٹکائے ۔شامیانے تانے۔ آسمانی خیمے بلند کئے ۔مکانات کے صحنوں میں بہار نے آکر گلکاری کی اور کشمیر کے گلزاروں کو تراش کر فتحپور اور آگرہ میں رکھ دیا ۔ اسے مبالغہ نہ سمجھنا ۔جو اُس وقت ہؤا ۔ اس سے بہت کم ہے ۔یہ جو کہ آج آزاد لکھتا ہے ۔جب عالم ہی اور تھا ۔وہ اصل حال تھا ۔آج خواب و خیال ہے ۔ وہ وہ سامان جمع تھے کہ عقل دیکھتی تھی ۔اور حیران تھی •

اگلے وقتوں کے امرا کو بھی ہر قسم کی عجیب غریب اور عزیز الوجود چیزوں کا شوق ہوتا تھا ۔ اور جس قدر یہ سامان زیادہ ہوتا تھا ۔اُس سے اُن کے سلیقہ اور ہمّت و حوصلے کا اندازہ کیا جاتا تھا ۔ اگرچہ یہ اوصاف عموماً امیری کے لازمے تھے ۔مگر قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو بمقتضائے طبیعت خاص خاص قسم کی چیزوں کا یا مختلف صنائع و بدائع میں سے ایک دو کا دلی شوق ہوتا ہے بلکہ بعضوں کے عہدے اور منصب اشیائے خاص کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں چنانچہ خان خاناں اور خان اعظم کے ایوان ملک ملک کے صنائع و بدائع سے ایک کامل نمائش گاہ بنے ہوئے تھے ۔جن کے در و دیوار ۔فصل بہار کی چادر کو ہاتھوں پر پھیلائے کھڑے تھے اور ہر ستون ایک باغ کو بغل میں دبائے تھا ۔ اکثر امرا نے اسلحہ حرب کے عمدہ نمونے دکھائے تھے ۔کہ ہندوستان سے جمع کئے تھے ۔اور اَور ملکوں سے منگائے تھے ۔شاہ فتح اللہ نے اپنے ایوان میں علوم و فنون کا طلسم باندھ کر ہر بات میں نکتہ اور نکتہ میں باریکی پیدا کی تھی ۔ گھڑیاں اور گھنٹے چل رہے تھے ۔علم ہیئت کے آلات ۔کُرے ۔ رُبع مجیب اسطرلاب نظام فلکی کے نقشے ۔ اور ان کی مجسّم مورتوں میں سیّارے اور افلاک چکر مار رہے تھے ۔جر اثقال کی کلیں اپنا کام کر رہی تھیں ۔علم کیمیا اور علم نیرنجات کے شعبدے ساعت بساعت رنگ بدل رہے تھے •

دانایانِ فرنگ موجود تھے۔ بیلان (بیلون) کا خیمہ کھڑا تھا۔ ارغنونؔ (آرگن) کا صندوق رنگارنگ کی آوازیں سناتا تھا۔ ممالکِ روم و فرنگ کی عمدہ صنعتیں اور انوکھی دستکاریاں جادو کا کام اور اچنبھے کا تماشا تھیں۔ انہوں نے تھئیٹر کا ہی سماں باندھا تھا۔ جس وقت بادشاہ آکر بیٹھے۔ موسیقیٔ فرنگ نے مبارکباد کی نغمہ سرائی شروع کی۔ باجے بج رہے تھے۔ فرنگی ساعت بساعت رنگ برنگ کے برن بدل کر آتے تھے۔ اور غائب ہو جاتے تھے۔ پرستان کا عالم نظر آتا تھا ؎

ف۔ اکبر بادشاہ فقط ملک کا بادشاہ نہ تھا۔ ہر فن اور ہر کام کا بادشاہ تھا۔ ہمیشہ علوم و فنون کی پرورش اور ترقی کی فکر میں رہتا تھا۔ اس کی قدردانی نے دانایانِ فرنگ کو بندر گوہ سورت اور ہگلی سے بُلا کر اس طرح رخصت کیا۔ کہ یورپ کے ممالک مختلفہ سے لوگ اُٹھ اُٹھ کر دوڑے۔ اپنے اور ملک ملک کے صنائع و بدائع لاکر پیش کش کئے۔ اس موقع پر اُن سب کے نمونے سجائے گئے۔ اور ہندوستان کے صنعتگروں نے بھی اپنی دستکاریاں دکھا کر شاباش و آفرین کے پھُول سمیٹے ؎

نوروز سے لے کر ۱۸ دن تک ہر ایک امیر نے اپنے اپنے ایوان میں ضیافت کی حضور رونق افروز ہوئے اور بے تکلف اور دوستانہ ملاقات سے محبت و اتحاد کی بنیاد دلوں میں استوار کی۔ امرا نے اپنے رتبے کے موجب پیشکش گزرانی۔ اربابِ طرب اور اہلِ نشاط کے طوائف کشمیری۔ ایرانی۔ تورانی۔ ہندوستانی گوئیے۔ ڈوم۔ ڈھاڑی۔ میراثی۔ کلاونت۔ گائک نائک۔ سپروائی۔ ڈومنیاں۔ پاتر۔ کنچنیاں ہزار در ہزار جمع ہوئیں۔ دیوان خاص اور دیوان عام سے لے کر بازوؤں کے نقارخانوں تک جا بجا مقامات تقسیم ہو گئے تھے۔ جدھر دیکھو راجہ اندر کا اکھاڑا تھا ؎

جشن کی رِیت رسوم کی بھی سیر دیکھو۔ روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت سبھ لگن میں ایک سہاگن بی بی اپنے ہاتھ سے دال دلتی۔ اسے گنگا جل میں بھگوتی۔ پیٹھی پیس کر

---

[1] مُلّا صاحب ۹۸۸ھ میں لکھتے ہیں۔ ارغنوں باجا آیا۔ کہ عجائب مخلوقات سے ہے حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لایا تھا۔ بادشاہ محظوظ ہوئے اہلِ دربار کو بھی دکھایا۔ ایک بڑا صندوق تھا قدِ آدم۔ ایک فرنگی اندر بیٹھ کر تار بجاتا تھا۔ دو باہر بیٹھتے تھے۔ صندوق میں مور کے پر لگے تھے۔ اُن کی جڑوں پر اُنگلیاں مارتے تھے۔ کیا کیا آوازیں نکلتی تھیں! کہ رُوح پر اثر ہوتا تھا فرنگی دم بدم کبھی سُرخ کبھی زرد۔ بوقلموں ہو ہو کر نکلتے تھے۔ اور ساعت بساعت رنگ بدلتے تھے۔ عجب عالم تھا۔ اہلِ مجلس حیران تھے۔ کیفیت اُس کی ٹھیک ٹھیک ادا نہیں ہو سکتی ؎

رکھی جشن کی ساعت قریب آئی۔ بادشاہ اشنان کو گئے۔ رنگین جوڑا۔ ساعت اور ستاروں کے موافق حاضر۔ جامہ پہنا۔ کھڑکی دار پگڑی راجپوتی انداز سے باندھی۔ مکٹ سر پر رکھا۔ کچھ اپنا خاندانی کچھ ہندوانی گہنا پہنا۔ جوتشی اور نجومی اسطرلاب لگائے بیٹھے ہیں جشن کی ساعت آئی برہمن نے ماتھے پر ٹیکا لگایا۔ جواہر نگار کنگن ہاتھ میں باندھا۔ کولے دہک رہے ہیں۔ خوشبوئیاں تیار ہیں۔ اُدھر ہون ہونے لگا۔ چوکے میں کڑھائی چڑھی ہے۔ یہاں اس میں بڑا پڑا وہاں بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا۔ نقارۂ دولت پر چوٹ پڑی۔ نوبت خانہ میں نوبت بجنے لگی کہ گنبدِ گردوں گونج اُٹھا ؂

خوانوں اور کشتیوں پر زر نگار طورہ پوش پڑے۔ موتیوں کے جھالر لٹکتے۔ امرائے کھڑے ہیں۔ سونے روپے کے بادام پستے وغیرہ میوہ جات۔ روپے اشرفیاں۔ جواہر اس طرح نچھاور ہوئے جیسے اولے برستے ہیں۔ دربار ایک مرقع قدرت الٰہی کا تھا۔ راجوں کے راجہ مہاراجہ اور بڑے بڑے ٹھاکر کہ فلک سے سر نہ جھکائیں۔ ایرانی تورانی سردار کہ رستم و اسفندیار کو خاطر میں نہ لائیں۔ خود۔ زرہ۔ بکتر۔ چار آئینہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق۔ تصویر کا عالم کھڑے ہیں۔ خاص شہزادوں کے سوا کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اوّل شہزادوں نے پھر امرائے درجہ بدرجہ نذریں دیں۔ سلام گاہ پر گئے۔ وہاں سے تخت گاہ تک تین جگہ آداب و کورنش بجالائے جب چوتھا سجدہ کہ آداب زمین بوس کہلاتا تھا ادا کیا تو نقیب نے آواز دی کہ آداب بجالاؤ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔ مہابلی بادشاہ سلامت۔ ملک الشعرا نے سامنے آکر قصیدہ مبارکباد کا پڑھا۔ خلعت و انعام سے سربلند ہوا۔

برس میں دو دفعہ تُلادان ہوتا تھا (۱) نوروز۔ سونے کی ترازو کھڑی ہوتی۔ بادشاہ ۱۲ چیزوں میں تلتا تھا۔ سونا چاندی۔ ابریشم۔ خوشبوئیاں۔ لوہا۔ تانبا۔ جست۔ توتیا۔ گھی دودھ۔ چاول۔ ست نجا۔ (۲) جشن ولادت۔ قمری حساب سے ۵ رجب کو ہوتا تھا۔ اس میں چاندی قلعی کپڑا۔ ۱۲ میوے۔ شیرینی۔ تلوں کا تیل۔ سبزی سب کچھ برہمنوں اور عام فقیروں غریبوں کو بٹ جاتا تھا۔ اسی حساب سے شمسی تاریخ کو ؂

مینا بازار۔ زنانہ بازار

ترکستان میں دستور ہے کہ ہفتے میں دو دفعہ یا ایک دفعہ ہر شہر میں اور اکثر دیہات میں بازار

لگتے ہیں۔ اُس آبادی کے اور اکثر پانچ پانچ چھ چھ کوس سے آس پاس کے لوگ پچھلی رات سے گھروں سے نکلتے ہیں۔ دن نکلے مقام پر آکر جمع ہوتے ہیں عورتیں برقع سروں پر نقابیں مُنہ پر۔ ابریشم۔ سُوت۔ ٹوپیاں۔ رومال پھلکاری اپنی دستکاری۔ یا ضرورت کی ماری جو کچھ ہو بیچنے کو لاتی ہیں۔ مرد ہر قسم کے پیشہ ور اپنی اپنی جنس سے بازار کو گرم کرتے ہیں۔ مرغی اور انڈے سے لیکر گراں بہا گھوڑوں تک اور گزی گاڑھے سے لیکر قیمتی قالین تک۔ میوہ جات سے لیکر اقسام غلہ بھُس اور گھانس تک بیل گھی۔ مسگری۔ نجاری۔ لُہاری کے کام یہاں تک کہ مٹی کے باسن تک سب موجود ہوتے اور دوپہر میں سب بک جاتے ہیں۔ اکثر لین دین مبادلے میں ہوتے ہیں۔ بادشاہ نیک آئین نے اسے اصلاح و تہذیب کے ساتھ رونق دی۔ آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ ہر مہینے معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔ غالباً یہ امر آئین ہی داخل ہوگا۔ عمل اس پر کبھی کبھی ہوتا ہوگا ؂

جب جشن کے آداب و آئین شان و شکوہ میں اپنے خزانے خالی کر لیتے۔ اور آرائش اور زیبائش کی بھی ساری دستکاری خرچ ہو چکتی تو اُن ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل و شعور کے بازار تھے۔ زنانہ ہوجاتا۔ وہاں دُلہن کی بیگمات آتی تھیں کہ ذرا اُن کی آنکھیں کھلیں اور سلیقے کی آنکھوں میں سگھڑاپے کا سُرمہ لگائیں۔ امراء و شرفا کی بیبیوں کو بھی اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے۔ دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں۔ سوداگری اور سودا زیادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا۔ خواجہ سرا۔ قلماقنیاں۔ اُردہ بیگنیاں اسلحہ جنگ سجے۔ انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں۔ عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں۔ مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں اس کا نام **خوش روز** تھا ؂

نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا۔ اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہونگے۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ بیگم بہنیں۔ بیٹیاں پاس بیٹھتی تھیں۔ امرا کی بیبیاں آکر سلام کرتیں۔ نذریں دیتیں تحفے پیش کو سامنے حاضر کرتیں۔ ان کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں۔ اور حقیقت میں یہ بھی آئینِ سلطنت کا ایک جز تھا۔ کیونکہ یہی لوگ اجزائے سلطنت تھے۔ شطرنج کے مہروں کی طرح باہم تعلق رکھتے تھے۔ اور آپس میں ایک ایک کا زور ایک ایک کو پہنچ رہا تھا۔ ان کے باہمی محبت و عداوت۔ اتفاق و اختلاف اور ذاتی نفع و نقصان کے اثر بادشاہ کے

کار دبار تک پہنچے تھے[1]۔ ان کی نسبتوں کے معاملے خواہ اس جشن پر خواہ کسی اور موقع پر ایک مبارک
تماشا دکھاتے تھے۔ کبھی دو امیروں میں ایسا بگاڑ ہوتا تھا کہ دونوں یا ایک ان میں سے راضی
نہ ہوتا تھا اور بادشاہ چاہتے تھے کہ ان میں بگاڑ نہ رہے بلکہ اتحاد ہو جائے۔ اس کا یہی علاج
تھا کہ دونو گھر ایک ہو جائیں جب وہ کسی طرح نہ مانتے تو بادشاہ کہتے تھے کہ اچھا یہ لڑکا یا لڑکی
ہماری تمہیں اس سے کچھ کام نہیں وہ یا اس کی بی بی ناز خانہ زادی سے کہتے۔ حضور! لونڈی بھی اس
بچے سے دستبردار۔ آخر حضور ہی کے لئے پالا تھا۔ محنت بھرپائی۔ باپ کہتا۔ کرامات! بہت
مبارک۔ مگر خانہ زاد کو اب اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ غلام حق سے ادا ہوا۔ بادشاہ کہتے
بہت خوب ہم نے بھی وصول پایا۔ کبھی بیگم بیاہ کا ذمہ لے لیتیں۔ کبھی بادشاہ لے لیتے اور
شادی کا سرانجام اس طرح ہوتا کہ ماں باپ سے بھی نہ ہو سکتا۔

دُنیا کے معاملات سخت نازک ہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جس کے فوائد کے ساتھ نقصان
کا کھٹکا نہ لگا ہو۔ اسی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خاں کوکہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ
قابو ہی میں نہ رہا۔ غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ اکبر نے خود شادی کر دی لیکن قابل
عبرت وہ معاملہ ہے جو کہن سال بزرگوں سے سُنا ہے یعنی یہی مینا بازار لگا ہوا تھا۔ بیگمات پڑی پھرتی
تھیں۔ جیسے باغ میں قمریاں یا ہریاول میں ہرنیاں۔ جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا
ہوا چمن میں آنکلا۔ ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت
بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونو ہاتھ رکے ہوئے تھے وہیں ٹھیر گیا۔ سامنے سے ایک لڑکی آئی شہزادہ
نے کہا کہ تُوا ذرا ہمارے کبوتر تم لے لو ہم وہ پھول توڑ لیں۔ لڑکی نے دونو کبوتر لے لئے۔ شہزادہ
نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے۔ پھر کر آیا تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک

---

[1] عبدالرحیم خان خاناں کو دیکھا کہ ان باپ لڑکا ہے اور بیرم خاں کا بیٹا ہے بعض امرا ایسے بار میں ہیں جن کے دلوں میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ چنانچہ شمس الدین محمد خاں اتکہ کی پوتی یعنی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ کی بہن سے اُس کی شادی کر دی اب بھلا مرزا عزیز کوکہ کب چاہیگا کہ عبدالرحیم کو کچھ صدمہ پہنچے اور بہن کا گھر برباد ہو۔ اور عبدالرحیم جس کے گھر میں اتکہ کی بیٹی خان اعظم کی بہن ہے۔ اس کے دل میں وہ خیال کب باقی رہ سکتا ہے کہ اُس کا باپ میرے باپ پر تلوار کھینچ کر سامنے ہوا تھا۔ اور لشکرِ خونریز کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ خان خاناں کی بیٹی سے دانیال نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔ قلیچ خاں کہ سپہ سالار تھا اور ۴ ہزاری منصب رکھتا تھا۔ اُس کی بیٹی سے مراد کی شادی کر دی۔ سلیم (جہانگیر) سے مان سنگھ کی بہن بیاہی تھی اور اس کے بیٹے خسرو سے خان اعظم کی بیٹی کی شادی کی تھی وغیرہ وغیرہ مصلحت اس میں یہی تھی کہ ہر شاہزادہ اور امیر کو اس طرح آپس میں مسلسل اور وابستہ کر دیں کہ ایک کا زور دوسرے کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

کبوتر ہے۔ پوچھا دُوسرا کبوتر کیا ہوا؟ عرض کی۔ صاحبِ عالم! وہ تو اُڑ گیا۔ پوچھا۔ ہیں! کیونکر اُڑ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی کہ حضور یُوں اُڑ گیا۔ اگرچہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گر گیا مگر شہزادے کا دل اِس انداز پر لوٹ گیا۔ پوچھا تمھارا کیا نام ہے؟ عرض کی مہرالنسا خانم پُوچھا تمھارے باپ کا کیا نام ہے؟ عرض کی مرزا غیاث۔ حضور کا ناظم بیوتات ہے۔ کہا اور اُمرا کی لڑکیاں محل میں آیا کرتی ہیں۔ تم ہمارے ہاں نہیں آتیں؟ عرض کی میری اماں جان تو آتی ہیں۔ مجھے نہیں لاتیں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلا کرتیں۔ آج بھی بڑی منتوں سے یہاں لائی ہیں۔ کہا تم ضرور آیا کرو۔ ہمارے ہاں بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے۔ کوئی غیر نہیں آتا۔

وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جہانگیر باہر آگیا۔ مگر دونوں کو خیال رہا۔ تقدیر کی بات ہے کہ پھر جو مرزا غیاث کی بی بی بیگم کے سلام کو محل میں جانے لگی تو بیٹی کے کہنے سے اُسے بھی ساتھ لے لیا بیگم نے دیکھا بچپن کی عمر۔ اس میں ادب قاعدے کا لحاظ۔ سلیقہ اور تمیز اُس کی بہت بھلی معلوم ہوئی باتیں میٹھی میٹھی پیاری پیاری لگیں بیگم نے بھی کہا اِسے تم ضرور لایا کرو۔ آہستہ آہستہ آمد و رفت زیادہ ہوئی شہزادے کا یہ عالم کہ جب وہ ماں کے پاس آئے تو وہاں موجود۔ وہ دادی کے سلام کو جائے تو یہ وہاں حاضر۔ کسی نہ کسی بہانے سے خواہ مخواہ اُس سے بولتا۔ بات چیت کرتا تو اُس کا طور ہی کچھ اور۔ نگاہوں کو دیکھو تو انداز ہی کچھ اور غرض بیگم تاڑ گئی اور خلوت میں بادشاہ سے عرض کی۔ اکبر نے کہا۔ مرزا غیاث کی بی بی کو سمجھا دو چند روز لڑکی کو یہاں نہ لائے۔ اور مرزا غیاث سے کہا کہ لڑکی کی شادی کر دو۔

جب خانخاناں بھکر کی مہم پر تھا تو طہماسپ قلی بیگ ایک بہادر نوجوان شریف زادہ ایران سے آیا تھا اور مہم مذکور میں کارنمایاں کر کے اُس کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ شریف نواز شرافت پرست اُسے ساتھ لایا تھا۔ اور حضور میں اُس کی خدمتیں عرض کر کے دربار میں داخل کیا تھا۔ اُس نے شجاعت اور دلاوری کے دربار سے شیر افگن خاں خطاب حاصل کیا تھا۔ بادشاہ نے اُس کے ساتھ نسبت ٹھیرا دی۔ اور جلدی ہی شادی کر دی۔ یہی شادی اُس جوان نامراد کی بربادی تھی۔ تدبیر میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے؟ انجام اُس کا یہ ہوا کہ جو نہ ہونا تھا سو ہوا۔ شیر افگن خاں موت کا شکار ہو کر جوانمرگ دُنیا سے گیا۔ مہرالنسا بیوہ ہوئی۔ چند روز کے بعد جہانگیری محلوں میں آ کر نورجہاں بیگم ہو گئی۔ افسوس نہ جہانگیر رہے نہ نورجہاں رہیں ناموں پر دھبا رہ گیا۔

بیرم خان خانِ خاناں

جس وقت شہنشاہ اکبر خود اختیار صاحب دربار ہوا اُس وقت یہ امیر ملک گیر دربار میں نہ تھا۔ لیکن اس میں کسی کو انکار نہیں کہ اکبر بلکہ ہمایوں کی بنیادِ سلطنت بھی اِس نے دوبارہ ہندوستان میں قائم کی۔ پھر بھی میں سوچتا تھا کہ اِسے دربارِ اکبری میں لاؤں یا نہ لاؤں۔ یکایک اُس کی جانفشاں خدمتیں اور بے خطا تدبیریں سفارش کو آئیں۔ ساتھ ہی شیرانہ حملے اور رُستمانہ کارنامے مدد کو آپہنچے۔ وہ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ اُسے لائے۔ دربارِ اکبری میں درجۂ اوّل پر جگہ دی اور نعرۂ شیرانہ کی آواز میں کہا۔ یہ وہی سپہ سالار ہے جو ایک ہاتھ پر نشان شاہی لئے تھا کہ خوش نصیبی اس کی جس کے پہلو میں چاہے۔ سایہ کر کے قائم ہو جائے۔ دُوسرے ہاتھ میں تدابیرِ وزارت کا ذخیرہ تھا کہ جس کی طرف چاہے نظامِ سلطنت کا رُخ پھیر دے۔ نیک نیتی کے ساتھ نیکو کاری اس کی مصاحب تھی اور اقبال خداداد مددگار تھا کہ وہ فیروزمند جس کام پر ہاتھ ڈالتا تھا پُورا پڑتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ تمام مورخوں کی زبانیں اس کی تعریفوں میں خشک ہوتی ہیں۔ اور کسی نے بُرائی کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔ مُلّا صاحب نے تاریخی حالات کے ذیل میں بہت جگہ اِس کے ذکر کئے ہیں۔ آخر کتاب میں شعرا کے ساتھ بھی شامل کیا ہے وہاں ایک سنجیدہ اور مختصر عبارت میں اس کا برگزیدہ حال لکھا ہے۔ جس سے بہتر کوئی کیفیت خان خاناں کے خصائل و اطوار کی۔ اور سند اُس کے اوصاف کمالات کی نہیں ہو سکتی ہیں بعینہٖ اُس کا ترجمہ لکھتا ہُوں دیکھنے والے دیکھیں گے کہ یہ اجمالی الفاظ اس کے تفصیلی حالات سے کیسی مطابقت کھاتے ہیں۔ اور سمجھیں گے کہ مُلّا صاحب بھی حقیقت شناسی میں کِس رتبہ کے شخص تھے عبارتِ مذکورہ کا ترجمہ یہ ہے:-

وہ مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں تھا۔ رموزِ دانش۔ سخاوت۔ راستی حسنِ خلق۔ نیاز و خاکساری میں سب سے سبقت لے گیا تھا۔ ابتدائے حال میں بابر بادشاہ کی خدمت میں۔ بیچ میں ہمایوں بادشاہ کے حضور میں رہ کر بڑھا چڑھا اور خانخاناں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ پھر اکبر نے وقت بوقت القاب میں ترقیاں دیں۔ نہایت فقیر دوست۔ صاحبِ حال اور نیک اندیش تھا۔ ہندوستان جو دوبارہ فتح بھی ہوا اور آباد بھی ہوا۔ یہ اسی کی کوشش اور بہادری اور حسنِ تدبیر کی برکت سے ہوا۔ دنیا کے فاضل اطراف و جوانب سے اسکی درگاہ کی طرف رُخ کرتے تھے۔ اور دریا مثال ہاتھ سے شاد ا

ہو کر جاتے تھے۔ اُس کی بارگاہ آسمانِ جاہ ارباب فضل و کمال کے لئے قبلہ تھی۔ اور زمانہ اس کے وجود شریف سے فخر کرتا تھا۔ اخیر عمر میں بسبب اہل نفاق کی عداوت کے بادشاہ کا دل اُس سے پھر گیا۔ اور وہاں تک نوبت پہنچی جس کا ذکر حالات سالانہ میں لکھا گیا ⁂

شیخ داؤد جہنی وال کے ذکر میں لکھتے ہیں :۔ درعہد بیرم خاں کہ بہترین عہدہا بود و ہند حکم عروس داشت جامع اوراق درآگرہ طالب علمی میکرد ⁂

محمد قاسم فرشتہ نے نسب نامہ کو زیادہ تفصیل دی ہے اور ہفت اقلیم میں اُس سے بھی زیادہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایران کے قراقوئنلو ترکمانوں میں بہارلو قبیلہ سے علی شکر بیگ ترکمان ایک سردار نامی گرامی خاندانِ تیموری سے وابستہ تھا۔ ولایت ہمدان۔ دینور۔ کردستان۔ اور اس کے متعلقات وغیرہ کا حاکم تھا۔ کتاب ہفت اقلیم اکبر کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے اس میں لکھا ہے۔ کہ اب تک وہ علاقہ قلمرو علی شکر مشہور ہے۔ علی شکر کی اولاد میں شیر علی بیگ ایک سردار تھا۔ جب سلطان حسین بایقرا کے بعد سلطنت برباد ہوئی تو شیر علی بیگ کابل کی طرف آیا۔ اور سیستان وغیرہ سے جمعیت پیدا کر کے شیراز پر چڑھ گیا۔ وہاں سے شکست کھا کر پھرا۔ پھر بھی ہمّت نہ ہارا۔ اِدھر اُدھر سے سامان سمیٹنے لگا۔ آخر بادشاہی لشکر آیا اور انجام کو شیر علی میدان میں قضا کا شکار ہو گیا۔ اُسکا بیٹا اور پوتا یار علی بیگ اور سیف علی بیگ پھر افغانستان میں آئے۔ یار علی بیگ بابر کی یاوری میں پہنچ کر غزنی کا حاکم ہو گیا مگر چند روز بعد مر گیا۔ سیف علی بیگ باپ کا قائم مقام ہوا مگر عمر نے وفا نہ کی یہ اس کا بیٹا۔ خرد سال با اقبال تھا جو بیرم خاں کے نام سے نامی ہوا۔ سیف علی بیگ کی موت نے عیال کے ایسے دل توڑ دئے کہ کچھ نہ کر سکے۔ چھوٹے سے بچّے کو لیکر بلخ میں چلے آئے۔ یہاں اِس کے خاندان کے کچھ لوگ رہتے تھے۔ چند روز ان میں رہا۔ کچھ پڑھا لکھا اور ذرا ہوش سنبھالا ⁂

جب بیرم خاں نوکری کے قابل ہوا۔ ہمایوں ان دنوں میں شہزادہ تھا۔ خدمت میں آکر نوکر ہوا۔ علوم معمولی سے تھوڑا تھوڑا بہرہ حاصل تھا۔ ملنساری حسنِ اخلاق۔ آدابِ محفل۔ طبع کی موزونی اور موسیقی میں بھی اچھّی آگاہی رکھتا تھا خلوت میں خود بھی گا تا بجاتا تھا۔ اِس لئے ہم عمر آقا کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا۔ ایک لڑائی میں اس سے ایسا کار نمایاں بن پڑا کہ دفعتہً شہرہ ہو گیا۔ اُس وقت ۱۶ برس کی عمر تھی۔ بابر بادشاہ نے بلا کر خود باتیں کر کے حال پوچھا اور چھوٹے سے بہادر کا بہت سا دل بڑھایا۔ وضع ہونہار پیشانی پر اقبال کے آثار دیکھکر قدر دانی کی اور کہا کہ شہزادہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا کرو۔ پھر اپنی خدمت میں لیا۔ سعادتمند لڑکا کارگزاری اور جاں نثاری کے بموجب ترقی پانے لگا۔ ہمایوں بادشاہ ہوا تو پھر اُسکی

حضوری میں رہنے لگا ۔

اس شفیق آقا اور وفادار نوکر کے حالات و معاملات دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں فقط محبت نہ تھی بلکہ ایک قدرتی اتحاد تھا۔ جس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ہمایوں دکن کی مہم میں جاںپانیر کے قلعہ کو گھیرے پڑا تھا۔ یہ قلعہ ایسی ڈھب جگہ پر تھا کہ ہاتھ آنا بہت مشکل تھا۔ بنانیوالوں نے ایسے ہی وقت کیلئے عمودی پہاڑوں کی چوٹی پر بنایا تھا۔ اور گرد اُس کے جنگل اور درختوں کا بن رکھا تھا۔ اُسوقت دشمن بہت سا کھانا دانا بھر کر خاطر جمع سے اندر بیٹھے رہے تھے ہمایوں قلعہ کو گھیرے باہر پڑا تھا عرصہ کے بعد پتہ لگا کہ ایک طرف سے جنگل کے لوگ رسد کی ضروری چیزیں لیکر آتے ہیں۔ قلعہ والے اُوپر سے رسّے ڈال کر کھینچ لیتے ہیں۔ ہمایوں نے بہت سی فولادی اور چوبی میخیں بنوائیں ایک رات اُسی چور راستہ کی طرف گیا۔ پہاڑ میں اور قلعہ کی دیوار میں گڑوا کر رسّے ڈلوائے۔ سیڑھیاں لگوائیں اور اَور طرف سے لڑائی شروع کی۔ قلعہ والے تو اُدھر جھکے۔ اِدھر سے پہلے ۳۹ بہادر جانوں پر کھیل کر رسّوں اور سیڑھیوں پر چڑھے جن میں چالیسواں دلاور خود بیرم خاں تھا۔ **لطیفہ**۔ اُس نے کمند کے پیچ میں عجیب لطیفہ سر کیا۔ ایک رسّی کی گرہ پر ہمایوں نے قدم رکھا کہ اوپر چڑھے۔ بیرم خاں نے کہا ٹھیرئیے ذرا میں اس پر زور دیکر دیکھوں رسّی مضبوط ہے۔ ہمایوں پیچھے ہٹا۔ اس نے جھٹ حلقہ میں پاؤں رکھا اور چار قدم مار کر دیوار قلعہ پر نظر آیا۔ غرض صبح ہوتے ہوتے تین سو جانباز اور پہنچ گئے اور خود بادشاہ بھی جا پہنچا صبح کا دروازہ ابھی بند تھا جو قلعہ فتح ہو کر کھل گیا ۔

۹۴۶ھ[1] میں جوسہ کے مقام پر شیر شاہ کی پہلی لڑائی میں بیرم خاں نے سب سے پہلے ہمت دکھائی اپنی فوج لیکر بڑھ گیا دشمن پر جا پڑا۔ حملہائے مردانہ اور چپقلشہائے ترکانہ سے غنیم کی صف کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اُس کے لشکر کو اُلٹ کر پھینک دیا۔ مگر امرائے ہمراہی کوتاہی کر گئے اِس لئے کامیاب نہ ہوا اور لڑائی نے طول کھینچا۔ انجام یہ ہوا کہ غنیم نے فتح پائی اور ہمایوں شکست کھا کر آگرہ بھاگ آیا یہ وفادار کبھی تلوار بن کر آقا کے آگے ہوا کبھی سپر بن کر پشت پہ رہا۔ دوسری لڑائی نواح قنوج میں ہوئی ہمایوں کی قسمت نے یہاں بھی وفا نہ کی بدحالی سے شکست کھائی۔ امرا اور فوج اسطرح پریشان ہوئی کہ ایک کو ایک کا ہوش نہ رہا۔ مارے گئے باندھے گئے۔ ڈوب گئے۔ بھاگ گئے۔ اور بیابان مرگ ہوئے سے

بیاباں مرگ ہے مجنوں خاک آلودہ تن کس کا	سٹے ہے سوزن خار مغیلاں تو کفن کس کا

انہی میں وہ جاں نثار بھی بھاگا اور سنبھل کی طرف جا نکلا۔ میاں عبدالوہاب رئیس سنبھل سے اِس کا

[1] دیکھو تاریخ شیر شاہی جو اکبر کے حکم سے لکھی گئی تھی ۔

پہلے کا اتحاد تھا انہوں نے اپنے گھر میں رکھا مگر ایسا نامی آدمی چھپے کہاں۔ اس لئے مترسین لکھنؤ کے راجہ کے پاس بھیج دیا کہ علاقۂ جنگل میں ہی چند روز تم رکھو مدت تک وہاں رہا۔ نصیر خاں حاکم سنبھل کو خبر ہوگئی۔ اُس نے مترسین کے پاس آدمی بھیجا۔ مترسین کی کیا تاب تھی کہ شیر شاہی امیر کے آدمیوں کو ٹال دے۔ ناچار بھیج دیا۔ نصیر خاں نے قتل کرنا چاہا یہاں مسندِ عالی عیسےٰ خاں کہ کہن سال امیر زادہ افغانوں کا تھا شیر شاہ کا بھیجا ہوا آیا تھا۔ اُس کی اور میاں عبدالوہاب کی سکندر لودی کے وقت سے دوستی تھی میاں نے عیسیٰ خاں سے کہا کہ نصیر خاں ظالم ایسے نامور اور عالی ہمت سردار کو قتل کرنا چاہتا ہے ہو سکے تو کچھ مدد کرو۔ میاں کا اور اُن کے خاندان کی بزرگی کا سب لحاظ کرتے تھے۔ عیسیٰ خاں گئے اور قید سے چھڑا کر اپنے گھر لے آئے۔

شیر شاہ نے عیسےٰ خاں کو ایک مہم پر بلا بھیجا یہ مالوہ کے رستہ میں جا کر ملے بیرم خاں کو ساتھ لیگئے تھے اُس کا بھی ذکر کیا۔ اُس نے مُنہ بنا کر پوچھا اب تک کہاں تھا۔ مسندِ عالی نے کہا شیخ مہن قتال کے ہاں پناہ لی تھی۔ شیر شاہ نے کہا بخشیدم۔ عیسیٰ خاں نے کہا خون تو ان کی خاطر سے بخشا اسپ و خلعت میری سفارش سے دیجئے اور ابوالقاسم گوالیار سے آیا ہے حکم دیجئے کہ اُس کے پاس اُترے شیر شاہ نے کہا قبول۔

شیر شاہ وقت پر لگاوٹ بھی ایسی کرتے تھے کہ پتھر کو مات کر دیتے تھے۔ بیرم خاں کی سرداری کی اب بھی ہوا بندھی ہوئی تھی شیر شاہ بھی جانتے تھے کہ صاحبِ جوہر ہے اور کام کا آدمی ہے۔ ایسے آدمیوں کے یہ خود تابعدار ہو جاتے تھے اور کام لیتے تھے چنانچہ جس وقت وہ سامنے آیا تو شیر شاہ کھڑے ہو کر گلے ملا اور دیر تک باتیں کیں۔ وفا اور اخلاص کے باب میں گفتگو تھی۔ شیر شاہ دیر تک دلجوئی کی غرض سے باتیں کرتا رہا اسی سلسلہ میں اس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا "ہر کہ اخلاص دارد خطا نمیکند"۔ خیر وہ جلسہ برخاست ہوا۔ شیر شاہ نے اُس منزل سے کوچ کیا۔ یہ اور ابوالقاسم بھاگے رستہ میں شیر شاہ کا ایلچی مالوہ گجرات سے آتا تھا۔ اور اُن کے بھاگنے کی خبر سُن چکا تھا مگر کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی دیکھکر شبہ ہوا۔ ابوالقاسم قد و قامت میں بلند بالا اور خوش اندام تھا جانا کہ یہی بیرم خاں ہے اسے پکڑ لیا۔ بیرم خاں کی نیک ذاتی و جوانمردی اور نیک نیتی پر ہزار آفرین ہے کہ خود آگے بڑھا اور کہا کہ اسے کیوں پکڑا ہے بیرم خاں تو میں ہوں۔ ابوالقاسم کو دس ہزار آفرین۔ کہا کہ یہ میرا غلام ہے مگر وفادار ہے۔ اپنی جان کو حقِ نمک پر فدا کرنا چاہتا ہے اُسے چھوڑ دو۔ خیر۔ بے قضا نہ کوئی مر سکے نہ بچ سکے وہ بیچارہ شیر شاہ کے سامنے آ کر مارا گیا۔ اور بیرم خاں موت کا مُنہ چڑا کر صاف نکل گئے۔ شیر شاہ کو بھی خبر ہوئی اس ماجرے کو سنکر افسوس کیا اور کہا جب اُس نے ہمارے جواب میں کہا تھا کہ چنیں است ہر کہ جوہرِ اخلاص دارد خطا نمیکند ہمیں اسی وقت کھٹکا تھا کہ

یہ اٹکنے والا نہیں۔ جب خدا نے پھر اپنی خدائی کی شان دکھائی اکبر کا زمانہ تھا اور وہ ہندوستان سے سفید و سیاہ کا مالک تھا تو ایک دن کسی مصاحب نے پوچھا کہ مسند عالی عیسےٰ خاں اُس وقت آپ سے کس طرح پیش آئے تھے۔ خان خاناں نے کہا جان انہوں نے بچائی تھی۔ وہ ادھر آئے نہیں اور تو کیا کروں اگر آئیں تو کم سے کم چندیری کا علاقہ نذر کروں۔ بیرم خاں وہاں سے گجرات پہنچا سلطان محمود سے ملا۔ وہ بھی بہت چاہتا تھا کہ میرے پاس رہے۔ اس سے حج کے بہانے رخصت لے کر بندر سورت میں آیا اور وہاں سے آقا پیارے کا پتا لیتا ہوا سندھ کی سرحد میں جا پہنچا۔ ہمایوں کا حال سُن ہی چکے ہو کہ قنوج کے میدان سے بھاگ کر آگرہ میں آیا۔ قسمت برگشتہ۔ بھائیوں کے دل میں دغا۔ امرائے دغاباز سب نے یہی کہا کہ اب یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ لاہور میں بیٹھکر صلاح ہوگی یہاں آکر کیا ہونا تھا۔ کچھ نہ ہوا۔ یہ ہوا کہ غنیم شیر ہوکر دبائے چلا آیا۔ ناکام بادشاہ نے جب دیکھا کہ دغاباز بھائی وقت ٹال رہے ہیں اور پھنسانے کی نیت ہے۔ اور غنیم ہندوستان پر چھاتا ہوا سلطان پور کنار بیاس تک آپہنچا ہے ناچار ہند کو خدا حافظ کہہ کر سندھ کا رُخ کیا اور ۳ برس تک وہاں قسمت آزماتا رہا۔ جب بیرم خاں وہاں پہنچا ہمایوں مقام جون کنارۂ دریائے سندھ پر ارغونیوں سے لڑتا تھا۔ روز معرکے ہو رہے تھے اگرچہ شکست دیتا تھا مگر رفیق مارے جاتے تھے جو بچے اُن سے وفا کی اُمید نہ تھی۔ خانخاناں جس دن پہنچا، محرم ۹۵۰ھ تھی۔ لڑائی ہو رہی تھی اس نے آتے ہی دُور سے یہ لطیفہ نذر کیا کہ ملازمت بھی نہ کی سیدھا میدان جنگ میں پہنچا اپنے ٹوٹے پھوٹے نوکروں اور خدمتگاروں کو ترتیب دیا اور ایک طرف سے موقع دیکھ کر حملے مردانہ اور نعرے شیرانہ شروع کر دئے۔ لوگ حیران ہوئے کہ یہ غیبی فرشتہ کون اور کہاں سے آیا۔ دیکھیں تو بیرم خاں ساری فوج خوشی کے مارے غل مچانے لگی۔ ہمایوں اُس وقت ایک بلندی سے دیکھ رہا تھا۔ حیران ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ چند نوکر پاس حاضر تھے ایک آدمی دوڑ کر آگے بڑھا اور خبر لایا کہ خانخاناں آپہنچا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ہمایوں ہندوستان کی کامیابی سے مایوس ہو کر چلنے کو تیار تھا مکلایا ہوا دل شگفتہ ہو گیا اور ایسے جاں نثار با اقبال کے آنے کو سب مبارک شگون سمجھے۔ جب حاضر ہوا تو ہمایوں نے اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ دونوں مل کر بیٹھے۔ مدتوں کی مصیبتیں تھیں اپنی اپنی کہانیاں سنائیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ یہ جگہ اُمید کا مقام نہیں ہمایوں نے کہا چلو جس خاک سے باپ دادا اٹھے تھے اُسی پر چلکر بیٹھیں بیرم خاں نے کہا کہ جس زمین سے حضور کے والد نے پھل نہ پایا حضور کیا لینگے۔ ایران کو چلئے وہ لوگ مہمان پرور اور مسافر نواز ہیں ملاحظہ فرمائیے کہ امیر تیمور جد اعلیٰ حضور کے تھے۔ ان کے ساتھ شاہ صفی نے کیا کچھ کیا۔ ان کی اولاد نے دو دفعہ آپ کے والد کو مدد دی۔ ملک ماوراء النہر پر قبضہ دلایا۔ تھمنا و تھمنا خدا کے اختیار ہے

رہا یا نہ رہا۔ اور ایران فردوسی اور قدوسی کے بزرگوں کا وطن ہے۔ وہاں کے کاروبار سے غلام خوب واقف ہے۔ ہمایوں کی بھی سمجھ میں آگیا اور ایران کا رُخ کیا۔

اس وقت بادشاہ اور امرائے ہمراہی کی حالت ایک لُٹے قافلہ کی تصویر تھی یا کاروانِ فاکی فہرست جس میں سب نوکر چاکر مل کر ۰۰ آدمی سے زیادہ نہ تھے لیکن جس کتاب میں دیکھا اول نمبر پہ بیرم خاں کا نام نظر آتا ہے اور حق پوچھو تو اس کے نام سے فہرست کی پیشانی کو چمکانا چاہیئے تھا۔ وہ رزم کا بہادر اور بزم کا مصاحب سایہ کی طرح پیارے آقا کے ساتھ تھا۔ جب کوئی شہر پاس آتا تو آگے جاتا اور اس خوبصورتی سے مطالب ادا کرتا کہ جا بجا شاہانہ شان سے استقبال اور نہایت دھوم دھام سے ضیافتیں ہوتی گئیں قزوین کے مقام سے شاہ کی خدمت میں نامہ لیکر پہنچا اور اس خوبی سے وکالت کا حق ادا کیا کہ شاہ مہماں نواز آبدیدہ ہوا بیرم خاں کی بھی بہت خاطر کی۔ اور بڑی عزت سے مہمانداری کی۔ جو مراسلہ جواب میں لکھا اس میں عزت و احترام کے ساتھ کمال شوق ظاہر کیا اور یہ شعر بھی لکھا ؎

ہمائے اوج سعادت بدام ما اُفتد	اگر ترا گذرے بر مقام ما اُفتد

جبتک ایران میں رہے وہ ہما کا سایہ ہمایوں کے ساتھ تھا ہر ایک کام اور پیغام اسی کے ذریعے سے طے ہوتا تھا بلکہ شاہ اکثر خود بُلا بھیجتا تھا کیونکہ عقل و دانش کے ساتھ اس کی مزہ مزہ کی باتیں اور حکایتیں اور شعر و سخن۔ لطائف و ظرائف سُن کر وہ بھی بہت خوش ہوتا تھا۔ شاہ یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ خاندانی سردار نمک حلالی اور وفاداری کا جوہر رکھتا ہے اسی واسطے طبل و علم کے ساتھ خانی کا خطاب عطا کیا تھا اور شکار جرگہ میں بھی جو رتبہ بھائی بند شہزادوں کا ہوتا ہے وہ بیرم خاں کا تھا۔

جب ہمایوں ایران سے فوج لیکر پھر ادھر آیا تو قندھار کو گھیرے پڑا تھا۔ بیرم خاں کو ایلچی کر کے کامران مرزا اپنے بھائی کے پاس کابل بھیجا کہ اُسے سمجھا کر راہ پر لائے۔ اور یہ نازک کام حقیقت میں اسی کے قابل تھا رستہ میں ہزارے کی قوم نے روکا اور سخت لڑائی ہوئی۔ بہادر نے ہزاروں کو مارا اور سیکڑوں کو باندھا اور بھگایا۔ میدان صاف کر کے کابل پہنچا۔ وہاں کامران سے ملا اور اس انداز سے مطلب ادا کئے کہ اسوقت اس کا پتھر دل بھی نرم ہوا۔ کامران سے کچھ کام نہ نکلا۔ البتہ اتنا فائدہ ہوا کہ بعض شہزادے اور اکثر سردار کچھ اس کی رفاقت میں اور کچھ اُسکی قید میں تھے سب سے جُدا جُدا ملا۔ ہمایوں کی طرف سے بعض کو تحفے دیئے بعض کو مراسلوں کے ساتھ بہت سے محبت کے پیام پہنچائے اور سب کے دلوں کو پرچا یا۔ کامران نے اتنا پردہ کیا کہ ڈیڑھ مہینے کے بعد خانزادہ بیگم بڑی پھوپھی کو بیرم خاں کے ساتھ مرزا عسکری کی طرف روانہ کیا کہ اسے سمجھائے۔ اور ہمایوں کو عذر معذرت کے ساتھ صلح کا پیغام بھیجا۔

جب ہمایوں نے قندھار فتح کیا تو جس طرح شاہ سے اقرار کر آیا تھا وہ علاقہ ایرانی سپہ سالار کے حوالے کر دیا اور آپ کابل کو چلا جسے کامران بھائی دبائے بیٹھا تھا۔ امرا نے کہا جاڑے کا موسم سر پر ہے۔ رستہ کڑا ہے عیال اور اسباب کا ساتھ لے چلنا مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ قندھار سے بداغ خاں کو رخصت کیا جائے۔ حرم بادشاہی بھی یہاں آرام پائینگے اور خانہ زادوں کے عیال بھی اُن کے سایہ میں رہینگے۔ ہمایوں کو بھی یہ صلاح پسند آئی اور بداغ خاں کو پیغام بھیجا۔ ایرانی فوج نے کہا کہ جب تک ہمارے شاہ کا حکم نہ آئے۔ ہم یہاں سے نہ جائیں گے۔ ہمایوں لشکر سمیت باہر پڑا تھا۔ ملک فانی اُسکی بے سامانی غرض سخت تکلیف میں تھے۔

امرا نے سپاہیانہ منصوبہ کھیلا۔ پہلے کئی دن ولایتی اور ہندی سپاہی بھیس بدل کر شہر میں جاتے رہے۔ گھاس اور لکڑیوں کی گٹھڑیوں میں ہتھیار پہنچاتے رہے۔ ایکدن صبح نور کے تڑکے گھاس کے اونٹ لدے ہوئے شہر کو جاتے تھے کئی سردار اپنے اپنے بہادر سپاہیوں کو ساتھ لئے اُنہیں کی آڑ میں دبکے دبکے شہر کے دروازہ پر جا پہنچے۔ یہ جانباز مختلف دروازوں سے گئے تھے چنانچہ گندگان دروازہ سے بیرم خاں نے بھی حملہ کیا تھا۔ پہرے والوں کو کاٹ کر ڈال دیا اور دم کے دم میں اس طرح پھیل گیا کہ ایرانی حیرانی میں آگئے۔ ہمایوں مع لشکر شہر میں داخل ہوا اور جاڑا آرام سے بسر کیا۔

لطیفہ یہ ہے کہ شاہ کو بھی خالی نہ چھوڑا۔ ہمایوں نے مراسلہ لکھا کہ بداغ خاں نے تعمیل احکام میں کوتاہی کی اور ہمراہی سے انکار کیا اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ اس سے ملک قندھار لیا جائے اور بیرم خاں کے سپرد کیا جائے کہ بیرم خاں دامن دولت سے وابستہ ہے۔ اور خاک ایران کا پُتلا ہے۔ یقین ہے کہ اب بھی ملک مذکور کو آپ دربار ایران سے متعلق سمجھینگے۔ خاص اس معرکہ میں بیرم خاں کی ہمت یا حسن تدبیر پر اہل نظر بہت سوچ کر رائے لگائیں کہ قابل تعریف ہے یا محل اعتراض۔ کیونکہ اسے جس درے سے اپنے آقا کی خدمت کیلئے جانفشانی کرنی واجب تھی۔ اسی طرح آقا کو یہ بھی سمجھانا واجب تھا کہ برف کا موسم گذر جائیگا۔ مگر بات رہ جائیگی۔ اور دربار ایران بلکہ ملک ایران اس معاملہ کو سُن کر کیا کہیگا۔ جس لشکر اور سر کی بدولت ہم کو یہ دن نصیب ہوئے۔ اُسی کو ہم تلوار سے کاٹیں اور اس فصل باران میں تلوار کی آنچ دکھا کر گھر سے نکالیں کب مناسب ہے۔ افسوس باوفا بیرم یہ اُس شاہ کی فوج اور سردار فوج ہے جس سے خلوت جلوت میں تم کیا کیا باتیں کرتے تھے اور اب اگر کوئی موقع آن پڑے تمہیں وہاں جانے کا منہ ہے یا نہیں بیرم خاں کے طرفدار ضرور کہینگے کہ وہ نوکر تھا۔ اور اس اکیلے آدمی کی رائے جلسہ مشورہ کو کیونکر دبا سکتی تھی۔ اسے یہ بھی خطر ہوگا کہ امرائے ماوراء النہری آقا کے دل میں میری طرف سے یہ شک نہ ڈالیں کہ بیرم خاں ایرانی ہے۔ ایرانیوں کی طرفداری کرتا ہے۔

دوسرے برس ہمایوں نے پھر کابل پہ فوج کشی کی اور فتح پائی۔ بیرم خاں کو قندھار کا حاکم کر کے چھوڑ آیا تھا

کابل کا فتحنامہ جو ہمایوں نے لکھا تو یہ شعر خود کہے اور اپنے ہاتھ سے اُس پر لکھے اور فتحنامے کو محبت نامہ بنا کر بیرم خاں کو بھیجا۔

مثنوی
شکر للہ کہ باز شاد ایم ۔۔۔ برخ یار دوست خند ایم ۔۔۔ دشمناں را بکام دل دیدیم ۔۔۔ میوہ باغ فتح را چیدیم
روز نوروز بیرم است امروز ۔۔۔ دلِ احباب بے غم است امروز ۔۔۔ شاد بادا ہمیشہ خاطر یار ۔۔۔ غم نگرد دیگر دیار و دیار
ہمہ اسباب عیش آمادہ است ۔۔۔ دل بفکرِ وصالت افتادہ است ۔۔۔ کہ جمالِ حبیب کے بینیم ۔۔۔ گل از باغ وصال کے چینیم
گوش خرم شود ز گفتارت ۔۔۔ دیدہ روشن شود ز دیدارت ۔۔۔ در حریم حضور شاد ہم ۔۔۔ بنشینیم خرم و بے غم
بعد ازاں فکر کار ہند کنیم ۔۔۔ عزم تسخیر ملک سند کنیم ۔۔۔ ہر درے بستہ کشادہ شود ۔۔۔ ہرچہ خواہیم ازاں زیادہ شود
آنچہ خواہیم از زمان و زمیں ۔۔۔ گوید آمین جبرئیل امیں ۔۔۔ یا الٰہی میسرم گرداں ۔۔۔ دو جہاں را مسخرم گرداں ؎

اور خط کے حاشیہ پر یہ رباعی لکھی۔ رباعی

اے آنکہ انیس خاطر محزونی ۔۔۔ چوں طبع لطیف خویش موزونی ۔۔۔ بے یاد توام نیست زمانے ہرگز ۔۔۔ آیا تو بیادِ من محزوں چونی

بیرم خاں نے اس کے جواب میں اس طرح عقیدت ظاہر کی۔ رباعی

اے آنکہ بذات سایۂ بیچونی ۔۔۔ از ہرچہ ترا وصف کنم افزونی ۔۔۔ چوں میدانی کہ بے تو چونم ہرگز ۔۔۔ چوں می پرسی کہ در فراقم چونی

بیرم خاں قندھار میں تھا وہاں کے انتظام کرتا تھا اور جو حکم پہنچتے تھے نہایت گرمجوشی اور عرقریزی سے تعمیل کرتا تھا باغیوں اور نمک حراموں کو کبھی مار کر بھگاتا تھا کبھی تابع کر کے دربار کو روانہ کرتا تھا۔

تاریخ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وطن کے امرا و شرفا نے بابر سے کیسی بیوفائی اور نمک حرامی کی تھی مگر اس کی مروت نے بے وفاؤں سے کبھی آنکھ نہ چرائی تھی۔ اُسی باپ کی آنکھ سے ہمایوں نے سرمۂ مروت کا نسخہ لیا تھا۔ اس لئے بخارا و سمرقند اور فرغانہ کے بہت لوگ آن موجود ہوئے تھے۔ اوّل تو قدیم الایام سے توران کی خاک ایران کی دشمن ہے۔ اس کے علاوہ تورانیوں کا مذہب بھی سنت جماعت ہے۔ ایرانی تمام شیعہ۔ غرض ۹۶۱ھ میں ہمایوں کو شبہ ڈالا کہ بیرم خاں قندھار میں خودسری کا ارادہ رکھتا ہے اور شاہ ایران سے سازش رکھتا ہے۔ صورت احوال کے سامان ایسے تھے کہ ہمایوں کی نظر میں اس شبہ کا سایہ یقین کا پُتلا بن گیا ؏ چوں مضامیں جمع گردد شاعری دشوار نیست۔ کابل کے جھگڑے ہزاروں اور افغانوں کی سرشوریاں۔ سب اُسی طرح چھوڑیں اور چند سواروں کے ساتھ گھوڑے مار کر خود قندھار پر جا کھڑا ہوا۔ بیرم خاں بڑا رمز شناس اور معاملہ فہم تھا اُس نے بدگویوں کی بدی اور ہمایوں کی بدگمانی پر ذرا دل میلا نہ کیا۔ اور اس عقیدت اور عجز و نیاز سے خدمت بجا لایا کہ خود بخود چغل خوروں کے مُنہ کالے ہو گئے۔ دو مہینے ہمایوں وہاں ٹھیرا۔ ہندوستان کی مہم سامنے تھی خاطر جمع سے کابل کو پھرا۔ بیرم خاں کو بھی حال معلوم ہو گیا تھا۔ چلتے ہوئے عرض کی۔ غلام کو حضور اپنی خدمت میں لے چلیں منعم خاں یا جس

جاں نثار کو مناسب سمجھیں یہاں چھوڑیں۔ ہمایوں بھی اُسکے جوہروں کو پرکھ چکا تھا اُسکے علاوہ قندھار ایک ایسے نازک موقع پر واقع ہوا تھا کہ ادھر ایران کا پہلو تھا اُدھر ترکان ازبک کا۔ ادھر سرکش افغانوں کا اسلئے وہاں سے اس کا سرکانا مصلحت نہ سمجھا۔ بیرم خاں نے عرض کی کہ اگر یہی مرضی ہے تو ایک اور سردار میری اعانت کو مرحمت ہو چنانچہ بہادر خاں علی قلیخاں شیبانی کے بھائی کو زمین داور کا حاکم کر کے چھوڑا۔

ایک دفعہ کسی ضرورت کے سبب سے بیرم خاں کابل میں حاضر ہوا۔ اتفاقاً عید رمضان کی دوسری تاریخ تھی ہمایوں بہت خوش ہوا۔ اور بیرم خاں کی خاطر سے باسی عید کو تازہ کر کے دوبارہ جشن شاہانہ کے ساتھ دربار کیا۔ دوبارہ نذریں گزریں اور سب کو خلعت اور انعام و اکرام دیئے۔ قبق اندازی اور چوگان بازی کے ہنگامے گرم ہوئے۔ بیرم خاں اکبر کو لیکر میدان میں آیا اسی ۱۰ برس کے لڑکے نے جاتے ہی کدو پر تیر مارا اور ایسا صاف اُڑایا کہ غل مچ گیا۔ بیرم خاں نے مبارکباد میں قصیدہ کہا مطلع

عقدِ قبق بود خدنگ تو از کجک	کرد از ہلال صورتِ پروین شہاب حک

اکبر کے عہد میں بھی کئی سال قندھار اس کے نام پر رہا شاہ محمد قندھاری اس کی طرف سے نائب تھا وہی انتظام کرتا تھا۔

ہمایوں نے آکر کابل کا انتظام کیا اور لشکر لیکر ہندوستان کو روانہ ہوا۔ بیرم خاں سے کب بیٹھا جاتا تھا قندھار سے برابر عرضیاں شروع کر دیں کہ اس مہم میں غلام خدمت سے محروم نہ رہے۔ ہمایوں نے فرمان طلب بھیجا۔ وہ اپنے پرانے پرانے کارآزمودہ دلاوروں کو لیکر دوڑا اور پشاور کے ڈیروں لشکر میں شامل ہوا۔ سپہسالاری کا خطاب ملا اور صوبہ قندھار جاگیر میں عنایت ہو کر ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ یہاں بھی امرا کی فہرست میں سب سے پہلے بیرم خاں کا نام نظر آتا ہے جس وقت پنجاب میں داخل ہوئے اِدھر اُدھر کے ضلعوں میں بڑے بڑے لشکر افغانوں کے پھیلے ہوئے تھے مگر ادبار آ چکا تھا کہ اُنہوں نے کچھ بھی ہمت نہ کی لاہور تک بے جنگ ہمایوں کے ہاتھ آیا۔ ہمایوں لاہور میں ٹھیرا اور امرا کو آگے روانہ کیا۔ افغان کہیں کہیں تھے۔ مگر جہاں تھے گھبرائے ہوئے تھے۔ اور آگے کو بھاگے جاتے تھے۔ جالندھر پر لشکر شاہی کا مقام تھا۔ خبر آئی کہ تھوڑی دُور آگے افغانوں کا انبوہ کثیر جمع ہو گیا ہے۔ خزانہ و مال بھی سب ساتھ ہے اور آگے کو جایا چاہتا ہے۔ تردی بیگ مال کے عاشق تھے۔ انہوں نے چاہا کہ بڑھ کر ہاتھ ماریں خان خاناں سپہسالار نے کہلا بھیجا کہ مصلحت نہیں بادشاہی جمعیت تھوڑی ہے غنیم کا انبوہ ہے اور خزانہ و مال اسکے پاس ہے مبادا کہ پلٹا پڑے اور مال کے لئے جان پر کھیل جائے اکثر امرا کی رائے خانخاناں کے ساتھ تھی۔ یہ اس نے نہ مانا اور چاہا کہ اپنی جمعیت کے ساتھ دشمن پر جا پڑے۔ دوستوں میں تلوار چل گئی۔ طرفین سے بادشاہ کو عرضیاں

گئیں وہاں سے ایک امیر فرمان لیکر آیا اپنوں کو آپس میں ملایا اور لشکر آگے روانہ ہوا ❖

ستلج پر آکر پھر اختلاف ہوا خبر لگی کہ ماچھی واڑہ کے مقام پر ۳۰ ہزار افغان ستلج پار پڑے ہیں خانخاناں اسی وقت اپنی فوج لیکر روانہ ہوا کسی کو خبر نہ کی اور مارا مار دریا پار اُتر گیا شام قریب تھی کہ دشمن کے قریب جا پہنچا۔ جاڑے کا موسم تھا خبردار نے خبر دی کہ افغان ایک آبادی کے پاس پڑے ہیں اور خیموں کے آگے لکڑیاں اور گھاس جلا جلا کر سینک رہے ہیں تاکہ جاگتے رہیں اور روشنی میں رات کی بھی حفاظت رہے۔ اس نے اور بھی غنیمت سمجھا۔ دشمن کی کثرت کا ذرا خیال نہ کیا ایک ہزار سوار سے کہ خاص جاں نثار تھے۔ گھوڑے اُٹھائے اور فوج دشمن کے پہلو پر جا کھڑا ہوا وہ بجواڑہ کے مقام میں پانی کے کنارے پر پڑے تھے سر اُٹھایا تو موت بھاگتی پر نظر آئی۔ گھبرا گئے۔ احمقوں نے جتنی لکڑیاں اور گھاس کے ڈھیر تھے سب میں بلکہ اُن کے ساتھ آبادی کے چھپروں میں بھی آگ لگا دی کہ خوب روشنی ہو جائیگی تو دشمن کو اچھی طرح دیکھیں گے ترکوں کو اور بھی موقع ہاتھ آیا خوب تاک تاک کر نشانے مارنے لگے۔ افغانوں کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ علی قلی خاں شیبانی کہ خانخاناں کی دستگیری سے ہمیشہ قوی بازو تھا سُنتے ہی دوڑا اور اور سرداروں کو خبر ہوئی وہ بھی اپنی اپنی فوجیں لیکر دوڑا دوڑ آن پہنچے۔ افغان بدحواس ہو گئے۔ لڑائی کا بہانہ کر کے سوار ہوئے خیمے ڈیرے اسباب اسی طرح چھوڑا۔ اور سیدھے دلّی کو بھاگ گئے۔ بیرم خاں نے فوراً خزانوں کا بندوبست کر لیا۔ جو عجائب و نفائس گھوڑے ہاتھی ہاتھ آئے عرضی کے ساتھ لاہور کو روانہ کئے۔ ہمایوں نے عہد کیا تھا کہ جب تک جئے گا۔ ہندوستان میں کسی بندے کو بردہ نہ سمجھیگا چنانچہ جو عورت لڑکا بالا کہ گرفتار ہوئے تھے سب کو چھوڑ دیا اور ترقی اقبال کی دُعائیں لیں اُس وقت ماچھی واڑے میں بڑی آبادی تھی۔ بیرم خاں آپ وہاں رہا اور سرداروں کو جا بجا افغانوں کے پیچھے روانہ کیا۔ دربار میں جب عرضی پیش ہوئی اور اجناس و اموال نظر سے گزرے سب خدمتیں مقبول ہوئیں اور القاب میں خانخاناں کے خطاب پر یار وفادار اور ہمدم غمگسار کے الفاظ بڑھائے۔ اُس کے نوکروں کے لئے کیا اشراف کیا پاجی۔ کیا ترک۔ کیا تاجیک سقہ۔ فراش باورچی ساربان تک سب کے نام بادشاہی دفتر میں داخل ہو گئے اور خانی و سلطانی کے خطابوں سے زمانہ میں نامدار ہوئے۔ اور سنبھل کی سرکار اس کی جاگیر لکھی گئی ❖

سکندر سور ۸۰ ہزار افغان کا لشکر جرار لئے سرہند پر پڑا تھا۔ اکبر بیرم خاں کے سایۂ اتالیقی میں اس پر فوج لیکر گیا۔ مہم مذکور بھی خوش اسلوبی سے طے ہوئی۔ اس کے فتحنامے اکبر کے نام سے جاری ہوئے۔ بارہ تیرہ برس کے لڑکے کو گھوڑا کُدانے کے سوا اور کیا آتا ہے مگر وہی بات ہے۔ اے بادصبا ایں ہمہ آوردۂ تست ❖

جب ہمایوں نے دلّی پر قبضہ کر لیا تو جشن شاہانہ ہوئے۔ امرا کو علاقے خلعت انعام واکرام ملے۔

سب انتظام خانخاناں کی تجویز اور اہتمام سے تھے۔ سرہند کا صوبہ اس کے نام پر ہوا کہ ابھی وہاں فتح عظیم حاصل کی تھی۔ سنبھل علی قلی خاں شیبانی کو ملا۔ پٹھان پنجاب کے پہاڑوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ۹۶۳ھ میں ان کی جڑ اُکھاڑنے کے لئے اکبر کو فوج دیکر بھیجا۔ اُس مہم کے بھی کل کاروبار خانخاناں کے ہاتھ میں دیئے۔ اتالیقی و سپہ سالاری کا عہدہ تھا۔ اور اکبر اُسے خان بابا کہتا تھا۔ ہونہار شہزادہ پہاڑوں میں دشمن شکاری کی مشق کرتا پھرتا تھا کہ دفعتہً ہمایوں کے مرنے کی خبر پہنچی۔ خانخاناں نے اُس خبر کو بڑی احتیاط سے چھپا رکھا۔ لشکر کے امرا کو نزدیک دُور سے جمع کر لیا۔ وہ سلطنت کے آئین و آداب سے خوب واقف تھا۔ شاہانہ دربار کیا۔ اور تاج شاہی اکبر کے سر پر رکھا۔ اکبر باپ کے عہد سے اس کی خدمتیں اور عظمتیں دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ برابر تین پشت کا خدمتگزار ہے۔ چنانچہ اتالیقی و سپہ سالاری پر وکیل مطلق کا منصب زیادہ کیا۔ عنایات و اختیارات کے علاوہ خطاب خان بابا القاب میں داخل کیا۔ اور خود زبان سے کہا کہ خان بابا! حکومت و امارت کے بندوبست۔ موقوفی و بحالی کے اختیار۔ سلطنت کے بدخواہوں اور خیرخواہوں کا باندھنا۔ مارنا۔ بخشنا۔ سب تمہیں اختیار ہے۔ کسی طرح کے وسواس کو دل میں راہ نہ دو۔ اور اسے اپنا ذمّہ سمجھو۔ یہ سب اس کے معمولی کام تھے۔ فرمان جاری کر دیئے اور سب کاروبار بدستور کارگر رہا۔ بعض سرداروں پر خودسری کا خیال تھا۔ ان میں سے ابوالمعالی تھے انہیں فوراً باندھ لیا۔ اس نازک کام کو اس خوبصورتی سے طے کر دینا خان خاناں ہی کا کام تھا۔

اکبر دربار و لشکر سمیت جالندھر میں تھا۔ جو خبر پہنچی کہ ہیموڈھوسر نے آگرہ لیکر دلّی مارلی۔ تردی بیگ حاکم وہاں کا بھاگا چلا آتا ہے۔ سب حیران رہ گئے۔ اور اکبر بھی بچپن کے سبب سے گھبرایا۔ وہ اسی امر میں جان گیا تھا کہ ہر ایک سردار کتنے کتنے پانی میں ہے۔ بیرم خاں سے کہا کہ خان بابا تمام ملکی و مالی کاروبار کا تمہیں اختیار ہے۔ جس طرح مناسب دیکھو کرو۔ میری اجازت پر نہ رکھو۔ تم عموے مہربان ہو۔ تمہیں والد بزرگوار کی رُوح مُبارک کی اور میرے سر کی قسم ہے کہ جو مناسب دیکھنا سو کرنا۔ دشمنوں کی کچھ پروا نہ کرنا۔ خان خاناں نے اسی وقت امرا کو بُلا کر مشورت کی۔ ہیمیوں کا لشکر لاکھ سے زیادہ سُنا گیا تھا۔ اور بادشاہی فوج ۲۰ ہزار تھی۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ دشمن کی طاقت اور اپنی حالت ظاہر ہے۔ ملک بیگانہ۔ اپنے تئیں ہاتھیوں سے کچلوانا اور چیل کوّوں کو گوشت کھلانا کونسی بہادری ہے؟ اس وقت مقابلہ مناسب نہیں کابل کو چلنا چاہیئے وہاں سے فوج لیکر آئینگے اور سال آئندہ میں افغانوں کا بخوبی علاج کرینگے۔

خانخاناں نے کہا کہ جس ملک کو دو دفعہ لاکھوں جانیں دیکر لیا۔ اس کو بے تلوار ہلائے چھوڑ جانا۔ ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔ بادشاہ تو ابھی بچہ ہے۔ اسے کوئی الزام نہ دیگا۔ اس کے باپ نے عزّتیں بڑھا کر ایران توران تک ہمارا نام روشن کیا۔ وہاں کے سلاطین و امرا کیا کہینگے اور سفید ڈاڑھیوں پر یہ روسیاہی کا وسمہ کیسا

زیب دیگا۔ اس وقت اکبر تلوار ٹیک کر بیٹھ گیا اور کہا خان بابا درست کہتے ہیں اب کہاں جانا اور کہاں آنا
بن مرے مارے ہندوستان نہیں چھوڑا جا سکتا یا تخت یا تختہ۔ بچہ کی اس تقریر سے بڈھوں کی خشک رگوں میں
جرأت کا خون سر سرایا۔ اور کوچ کا حکم ہو گیا۔ دلی کی طرف فتح کے نشان کھول دیئے۔ رستہ میں بھاگے بھٹکے
سردار اور سپاہی بھی آ کر ملنے شروع ہوئے۔ خانخاناں۔ فرزانگی۔ سخاوت۔ شجاعت کے لحاظ سے یکتا تھے مگر
جوہری زمانہ کی دکان میں ایک عجب رقم تھے کسی کو بھائی کسی کو بھتیجا بنا لیتے تھے۔ تردی بیگ کو بھی تقان تردی
کہا کرتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ دلوں سے دونو امیر آپس میں کھٹکے ہوئے تھے اور صورتیں درباروں کی معمولی
امر اتفاقی ہیں دونو ایک آقا کے نوکر تھے۔ خان خاناں کو اپنے بہت سے حقوق و اوصاف کے دعوے
تھے۔ اسے جو کچھ تھا قدامت کا دعوےٰ تھا۔ منصبوں کے رشک اور خدمتوں کی رقابت سے
دونو کے دل بھرے ہوئے تھے۔ اب ایسا موقع آیا کہ خان خاناں کا تیر تدبیر نشانے پر بیٹھا چنانچہ اسکی
بے ہمتی اور نمک حرامی کے حالات کیا نئے کیا پرانے حضور میں عرض کر دیتے تھے۔ جس سے کچھ قتل کی
بھی اجازت پائی جاتی تھی۔ اب جو وہ شکست کھا کر شکستہ حال شرمندہ صورت لشکر میں پہنچا تو انہوں نے
موقع غنیمت سمجھا۔ ان دلوں باہم شکر رنجی بھی تھی چنانچہ پہلے ملا پیر محمد نے جا کر وکالت کی کرامات دکھائی کہ
ان دنوں خان خاناں کے خیر خواہ خاص تھے۔ پھر شام کو خاں خاناں سیر کرتے ہوئے نکلے۔ پہلے آپ
اس کے خیمہ میں گئے پھر وہ ان کے خیمہ میں آیا بڑی گرمجوشی سے ملے۔ توقان بھائی کو بڑی تعظیم اور محبت
سے بٹھایا خود ضرورت کے بہانے دوسرے خیمہ میں گئے۔ نوکروں کو اشارہ کر دیا تھا۔ انہوں
نے بیچارے کا کام تمام کر دیا۔ اور کئی سرداروں کو قید کر لیا۔ اکبر تیرہ چودہ برس کا تھا شکرے کا شکار
کھیلنے گیا ہوا تھا۔ جب آیا تو خلوت میں ملا پیر محمد کو بھیجا۔ انہوں نے جا کر پھر اس سردار مردار کی طرف سے
اگلی پچھلی نمک حرامیوں کے نقش بٹھائے۔ اور یہ بھی عرض کی کہ فدوی خود تغلق آباد کے میدان میں دیکھ رہا
تھا اس کی بے ہمتی سے فتح کی ہوئی لڑائی شکست ہو گئی۔ خان خاناں نے عرض کی ہے کہ حضور دریائے
کرم ہیں فدوی کو خیال ہوا کہ اگر آپ نے آ کر اس کی خطا معاف کر دی پھر تدارک نہ ہو سکے گا مصلحت
وقت پر نظر کر کے غلام نے اسے مارا تو سخت گستاخی ہے۔ اور موقع نہایت نازک ہے اگر اس وقت
چشم پوشی کی تو سب کام بگڑ جائیگا۔ اور حضور کے بڑے بڑے ارادے ہیں نمک حرام ایسا کرینگے تو مہمات کا سرانجام
کیونکر ہوگا۔ اس لئے یہی مصلحت سمجھی۔ اگرچہ گستاخانہ جرأت ہے مگر اس وقت حضور معاف فرمائیں ؎

اکبر نے ملا کی بھی خاطر جمع کی اور جب خان خاناں نے حضوری کے وقت عرض کی تو اس وقت بھی
اسے گلے لگایا اور اس کی تجویز پر آفرین و تحسین کر کے فرمایا کہ میں تو مکرر کہہ چکا ہوں کہ اختیار تمہارا ہے

کسی کی پروا اور کسی کا لحاظ نہ کرو۔ اور حاسدوں اور خود مطلبوں کی ایک بات نہ سنو جو مناسب دیکھو وُہ کرو۔ ساتھ یہ مصرع پڑھا ؎ دوست گر دوست شود ہر دو جہاں دشمن گیر۔ باوجود اِس کے اکثر مورخ یہی لکھتے ہیں کہ اُس وقت اگر ایسا نہ ہوتا تو چغتائی امیر ہرگز قابو میں نہ آتے۔ اور وہی شیر شاہی شکست کا عالم پھر ہو جاتا۔ یہ انتظام دیکھ کر ایک ایک مغل سردار کہ اپنے تیئں کیکاؤس اور کیقباد سمجھے ہوئے تھا ہوشیار ہو گیا اور خود سری اور نفاق کا خیال بھلا کر سب ادائے خدمت پر متوجہ ہو گئے یہ سب کچھ ہوا۔ وہ اس وقت سب حریف دبک بھی گئے مگر دلوں میں زہر کے گھونٹ پی پی کر رہ گئے غرض پانی پت کے میدان میں ہیموں سے مقابلہ ہؤا۔ اور ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ اکبری سکہ کا نقش فتوحات کے تمغوں پر بیٹھ گیا۔ مگر اس معرکہ میں جتنی بیرم خاں کی ہمت اور تدبیر تھی اُس سے زیادہ علی قلی خاں کی شمشیر تھی۔ غرض ہیموں زخمی شکستہ بستہ اکبر کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ شیخ گدائی کنبوہ نے اکبر کو کہا کہ جہادِ اکبر کیجئے۔ ہمتِ اکبر نے گوارا نہ کیا آخر بیرم خاں نے بادشاہ کی مرضی دیکھ کر یہ شعر پڑھا ؎

چہ حاجت تیغ شاہی را بخون ہر کس آلودن	تو بنشیں و اشارت کن بچشمے یا بابروئے

اور بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ جھاڑا۔ پھر حضرتِ شیخ نے خود ایک ہاتھ پھینکا۔ مرے کو ماریں شاہ مدار اہل اللہ لوگ حال و قال کی مجلسوں کو رونق دینے والے تھے انہیں یہ ثواب کی نعمت کہاں ملتی ؎ اچھا ہؤا کہ دل کا یہ ارمان نکل گیا۔ آزاد۔ دیکھنا قسمت والے ایسے ہوتے ہیں جہادِ اکبر کا ثواب کیسا سستا ہاتھ آیا ہے۔ یہ سب تو درست۔ مگر خان خاناں! تمہارے لوہے کو زمانے نے مانا۔ کون تھا جو تمہاری بہادری تسلیم نہ کرتا۔ میدانِ جنگ میں مقابلہ ہو جاتا تو بھی تمہارے لئے بنئے بچارے کا مار لینا فخر نہ تھا۔ چہ جائیکہ اِس حالت میں نیمجاں مُردے کو مار کر اپنی دلاوری اور عالی ہمتی کے دامن پر کیوں داغ لگایا۔ ؎

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا	جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا	نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ خانخاناں نے اُسے زندہ کیوں نہ رکھا۔ منتظم آدمی تھا۔ رہتا تو بڑے بڑے کام کرتا۔ آزاد سب کہنے کی باتیں ہیں جب معرکہ کا وقت ہوتا ہے عقل چرخ میں آ جاتی ہے موقع نکل جاتا ہے تو صلاحیں بتاتے ہیں۔ انصاف شرط ہے۔ اس وقت کو تو دیکھو کہ کیا عالم تھا۔ شیر شاہ کا سایہ ابھی آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹا تھا۔ بلکہ افغانوں کے شور سے تمام کشورِ ہندوستان طوفانِ آتش ہو رہا تھا ایسے زبردست اور فتحیاب غنیم پر فتح پائی۔ گردابِ فنا سے کشتی نکل آئی۔ اور وہ بندھ کر سامنے حاضر ہؤا ہے دل کا جوش اس وقت کس کے قابو میں رہتا ہے اور کسے سوجھتا ہے کہ یہ رہے گا تو اس سے فلاں

کارخانہ کا انتظام خوب ہوگا۔ غرض فیروزی کے ساتھ دلی پہنچے۔ اور ادھر اُدھر فوجیں بھیج کر انتظام شروع کر دئیے۔ اکبر کی بادشاہی تھی اور بیرم خاں کی سربراہی۔ دوسرے کا دخل نہ تھا۔ شکار کو جانا۔ شکار گاہوں میں رہنا۔ محل میں کم جانا۔ اور جو کچھ ہو باجازت خان خاناں ⁂

اگرچہ امرائے دربار اور بابری سردار اُس کے بالیاقت اختیاروں کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ مگر کام ایسے پیچیدہ پیش آتے تھے کہ اُس کے سوا کوئی ہاتھ نہ ڈال سکتا تھا۔ سب کو اُس کے پیچھے پیچھے چلنا ہی پڑتا تھا اسی عرصہ میں کچھ جزوی جزوی باتوں پر بادشاہ اور وزیر میں اختلاف پڑا۔ اس پر یاروں کا چمکانا غضب خدا جانے نازک مزاج وزیر کئی دن تک سوار نہ ہوا۔ یا قدرتی بات ہوئی کہ کچھ بیمار رہا۔ اس لئے کئی دن حضور میں نہ گیا مرقع وہ کہ سنہ دوم جلوس میں سکندر کوہستانِ جالندھر میں محصور ہوا ہے۔ اکبری لشکر قلعہ مانکوٹ کو گھیرے ہوئے تھے۔ خانخاناں کے دُنبل نکلا تھا کہ سوار بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اکبر نے فتوحا اور لکھنہ ہاتھی سامنے منگائے۔ اور لڑائی کا تماشہ دیکھنے لگا۔ یہ بڑے دھاوے کے ہاتھی تھے۔ دیر تک آپس میں ریلتے دھکیلتے رہے اور لڑتے لڑتے بیرم خاں کے خیموں میں آن پڑے۔ تماشائیوں کا ہجوم۔ عوام کا شور و غوغا۔ بازار کی دُکانیں پامال ہوگئیں۔ اور ایسا غُل مچا کہ بیرم خاں گھبرا کر باہر نکل آیا ⁂

خان خاناں کو شمس الدین محمد خاں اتکہ کی طرف خیال ہوا کہ اُس نے کچھ بادشاہ کے کان بھرے ہونگے اور ہاتھی بھی بادشاہ کے اشارے سے اُدھر ہوئے گئے ہیں۔ تاہم اتکہ لیاقت کی پتلی اور بڑی حوصلے والی بی بی تھی۔ خان خاناں نے اُس کی زبانی کہلا بھیجا کہ اپنی دانست میں کوئی خطا خیال میں نہیں آتی کہ خانہ زاد سے ظہور میں آئی ہو پھر اس قدر بے اعتنائی کا سبب کیا ہے۔ اگر اِس خیر اندیش کی طرف سے کوئی بات خلاف واقع حضور تک پہنچی ہے تو ارشاد ہو کہ فدوی اِس کا عذر کرے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ فدوی کے خیمہ پر ہاتھی ہول دئے۔ اِسی عرض و معروض کے ساتھ ایک بی بی محل میں مریم مکانی کی خدمت میں پہنچی۔ ماہم نے جو حال تھا وہ خود ہی بیان کر دیا اور کہا کہ ہاتھی اتفاقاً اِدھر آن پڑے بلکہ قسمیہ کہا نہ کسی نے تمہاری طرف سے کہا ہے نہ حضور کو کچھ خیال ہے۔ لاہور میں پہنچے تو اتکہ خاں اپنے بیٹوں کو لیکر خان خاناں کے پاس آئے اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں نے خلوت یا جلوت میں ہرگز تمہارے باب میں حضور سے کچھ نہیں کہا۔ اور نہ کہوں گا۔ مورخ یہی کہتے ہیں کہ خان خاناں کی خاطر جمع اب بھی نہ ہوتی ⁂

اکبر کی دانائی کا نمونہ اِس عمر میں اتنی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمہ سلطان بیگم ہمایوں کی پھوپھی کی بیٹی بہن تھی۔ اور اپنے مرنے سے چند روز پہلے اِس کی نسبت بیرم خاں سے ٹھیرا دی تھی۔ اِس موقع پر

کہ ۹۶۴ھ اور سنہ ۲ جلوسی تھے اور لاہور سے آگرہ کو جاتے تھے جالندھر یادلی کے مقام میں اکبر نے اِس کا عقد کر دیا کہ اتحاد کا رشتہ اور مضبوط ہوگیا۔ بڑی دھوم دھام ہوئی۔ خان خانان نے بھی جشنِ شاہانہ کے سامان کئے۔ اکبر موجب اُس کی تمنا کے مع اُمرا کے خود اُس کے گھر گیا۔ خانخانان نے بادشاہی نثاروں اور لوگوں کے انعام و اکرام میں وہ دریا بہائے کہ جو سخاوت کی شہرتیں زبانوں پر نقش دہنوں میں آن پڑیں۔ اِس شادی میں بیگمات نے بڑی تاکید سے صلاح دی۔ مگر بخاری و ماوراء النہری ترک کہ اپنے تئیں امرا کہہ کہہ کر فخر کرتے تھے۔ اِس قرابت سے سخت ناراض ہوئے۔ اور کہا کہ ایرانی ترکمان اور وہ بھی نوکر۔ اُس کے گھر میں ہماری شہزادی جائے۔ یہ ہمیں زنہار گوارا نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ پیر محمد خان نے اِس آگ پر اور بھی تیل ٹپکایا۔ **آزاد** ایرانی تورانی کا بہانہ تھا۔ اور شیعہ سنی کا افسانہ۔ رشک وہی منصب اور اُس کے اختیارات کا تھا۔ آلِ تیمور اور آلِ بابر کی انہیں کیا پروا تھی۔ خود ملکِ امیاں کہ کے بابر کا چھ پشت کا ملک برباد کیا۔ ہندوستان میں آکر پوتے کے ایسے خیرخواہ بن گئے۔ اور بیرم خان بھی کچھ نیا امیر نہ تھا پشتوں کا امیرزادہ تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کی ننھیال کا خاندان تیموری سے رشتہ بھی تھا ✦

خواجہ عطار

خواجہ حسن مشہور بہ خواجہ زادہ چغانیاں

مرزا علاء الدین -- ان کی بی بی شاہ بیگم دخترِ محمود مرزا۔ ابن سلطان ابوسعید مرزا تھی۔ دخترِ مذکور چوتھی پشت میں علی شکر بیگ کی نواسی تھی کیونکہ علی شکر بیگ کی بیٹی شاہ بیگم شاہزادہ محمود مرزا سے منسوب تھی۔ اِس سابقہ رشتے کے خیال سے بابر نے اپنی بیٹی گلرنگ بیگم کو مرزا نورالدین سے منسوب کیا۔ علی شکر کون ؟ خان خانان کے جدِ سوئم۔ اِس سلسلے سے خدا جانے خانخانان کا خاندان تیموری سے کیا رشتہ ہوا۔ مگر ضرور کچھ نہ کچھ ہوا (دیکھو اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۸۰ اور مآثر الامرا میں بیرم خاں کا حال) ✦

مرزا نورالدین

گکھڑ کی قوم کو قدیم سے دعویٰ ہے کہ ہم نوشیرواں کی اولاد ہیں جہلم پار سے اٹک تک کی پہاڑیوں میں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے ہمیشہ کے سرشور تھے۔ اور حکومت کے دعوے رکھتے تھے اِس وقت بھی ایسے ایسے ہمت والے سردار اُن میں موجود تھے کہ شیر شاہ اُن کے ہاتھوں سے تھک گیا تھا۔ بابر اور ہمایوں کے معاملات میں بھی اُن کے اثر پہنچتے رہتے تھے ان دنوں میں سلطان آدم گکھڑ اور اس کے بھائی بڑے دعوے کے سردار تھے۔ اور ہمیشہ لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ خان خانان نے سلطان آدم کو حکمتِ عملی سے بلایا۔ وہ مخدوم الملک مُلّا عبداللہ سلطان پوری کی معرفت آیا۔ دربار میں پیش کیا اور خانخانان نے اُسے رسم

ہندوستان کے بموجب دستار بدل بھائی بنایا۔ ذرا اِس کے نمک داری کے انداز تو دیکھو ؎

خواجہ کلاں بیگ ایک پُرانا سردار بابر کے عہد کا تھا۔ اُس کا بیٹا مصاحب بیگ کہ شرارت اور فتنہ انگیزی میں بے اختیار تھا خانخاناں نے ایک مفسدانہ جُرم پہ اُسے مروا ڈالا۔ اِس میں بھی قتل کے بانی مُلّا پیر محمد تھے۔ مگر دُشمنوں کو تو بہانہ چاہیئے تھا۔ بدنامی کا شیشہ خانخاں کے سینے پر ٹوٹا۔ اور تمام امرائے شاہی میں غل مچ گیا بلکہ بادشاہ کو بھی اِس کے مرنے کا افسوس ہوا

ہمایوں اسے مصاحبِ منافق کہا کرتا تھا۔ اور اِس کی بد اعمالیوں سے نہایت تنگ تھا۔ جب کابل میں کامران سے لڑائیاں ہو رہی تھیں تو یہ نمک حرام ایک موقع پر ہمایوں کے پاس تھا اور کامران کی خیرخواہی کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اندر اندر اُسے پرچے بھی دوڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں ہمایوں کو زخمی کروا دیا۔ فوج نے شکست کھائی۔ انجام یہ ہوا کہ کابل ہاتھ سے نکل گیا۔ اکبر خُرد سال۔ بچہ بے رحم چچا کے پنجے میں پھنس گیا۔ اِس کا قاعدہ تھا کہ کبھی اِدھر ہوتا تھا کبھی اُدھر چلا جاتا تھا۔ اور یہ اس کا ادنیٰ کمال تھا ہمایوں ایک دفعہ نواحِ کابل میں کامران سے لڑ رہا تھا۔ اس موقع پہ یہ اور اس کا بھائی مبارز بیگ ہمایوں کے ساتھ تھے۔ ایک دن میدانِ جنگ میں کسی نے آ کر خبر دی کہ مبارز بیگ مارا گیا۔ ہمایوں نے بہت افسوس کیا اور کہا اُس کی جگہ مصاحب مارا جاتا۔ ہمایوں کے بعد اکبری دور ہوا تو شاہ ابوالمعالی جا بجا فساد کرتا پھرتا تھا یہ اُس کے مصاحب بن گئے۔ اور مدت تک اُس کے ساتھ خاک اڑاتے پھرے۔ خانزمان باغی ہو گیا تو اُس کے پاس جا موجود ہوئے بیٹے کو مہردار کروا دیا۔ آپ عہدہ دار بن گئے۔ چند در چند بندوبستوں کے بعد دِلّی میں آئے خانخاناں نے اِس کے باب میں اصلاحِ مزاج کی تدبیریں کی تھیں مگر ایک کارگر نہ ہوئی اور وہ راہ پر نہ آیا۔ اِن دنوں دارالخلافہ میں فساد کی تخم ریزی کرنے لگا۔ بیرم خاں نے قید کر لیا۔ اور تجویز کی کہ مکہ کو روانہ کر دے۔ مُلّا پیر محمد اِس وقت خانخاناں کے مصاحب تھے اور یہ خون کے عاشق تھے انہوں نے کہا قتل پھر بھی قیل و قال کے بعد یہ ٹھہری کہ ایک پُرزہ پر قتل ایک پر نجات لکھ کر مسند تکیہ کے نیچے رکھ دو پھر ایک پرچہ نکالو۔ وہی حکمِ غیب ہے۔ تقدیرِ الٰہی یہ کہ پیر کی کرامات سچی نکلی اور مصاحب گلی میں قتل ہوا۔ امرائے بادشاہی میں غل مچ گیا کہ قدیم الخدمتوں کی اولاد اور خاص خانہ زاد مارے جاتے ہیں کوئی نہیں پوچھتا تیموری خاندان کا آئین ہے کہ خاندانی نوکروں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ بادشاہ کو بھی اِس امر کا خیال ہوا ؎

مصاحب بیگ کی آگ ابھی ٹھنڈی نہ ہوئی تھی کہ ایک شعلہ اور اُٹھا۔ مُلّا پیر محمد اب بڑھتے بڑھتے امیرالامرا کے درجہ کو پہنچ کر وکیلِ مطلق ہو گئے تھے۔ سنہ ۳ جلوس میں بادشاہ مع لشکر دلّی سے آگرہ کو چلے خانخاناں اور پیر محمد خاں ایک دن صبح کے وقت شکار کھیلتے چلے جاتے تھے۔ خانخاناں نے اپنے

رکابداروں سے پوچھا کہ بھوک لگی ہے۔ ناشتے کے لئے رکاب خانہ میں کچھ موجود ہے؟ پیر محمد خاں بول اٹھے کہ اگر ذرا ٹھیر جائیے تو جو کچھ حاضر ہے وہ حاضر ہو۔ خان خاناں نوکروں سمیت ایک درخت کے نیچے اتر پڑا۔ دسترخوان بچھ گیا ۳ سو پیالی شربت کی اور ۲ سو غوریاں کھانے کی موجود تھیں خانخاناں کو تعجب ہوا منہ سے کچھ نہ کہا پر دل میں خیال رہا سہ گر تو بے جزی کاندریں مقام تڑا۔ چہ دشمنان حسود ند دوستانِ غیور اِس کے علاوہ چونکہ مُلا اب وکیلِ مُطلق تھا ہر وقت حضور میں حاضر رہتا تھا۔ سب کی عرضیاں اس کے ہاتھ پڑتی تھیں۔ تمام اُمرا اور اہلِ دربار بھی اِسی کے پاس حاضر ہوتے البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ کم حوصلہ مغرور۔ بیرحم اور کمینہ مزاج تھا۔ اہالی واشراف وہاں جاتے تھے اور ذلت اُٹھاتے تھے اِس پر بھی بہتوں کو بات نصیب نہ ہوتی تھی +

آگرہ پہنچ کر مُلا کچھ بیمار ہوئے خان خاناں خبر کو گئے۔ کوئی اُزبک غلام دروازہ پر تھا اُسے کیا خبر تھی کہ مُلا اصل میں کیا ہے۔ اور خان خاناں کا رُتبہ کیا ہے۔ اور دونوں میں قدیمی علاقہ کیا ہے وہ دن بھر میں بہت سے بڑے بڑوں کو روک دیا کرتا تھا۔ اپنی عادت کے بموجب انہیں بھی روکا اور کہا کہ جب تک دُعا پہنچے آپ ٹھیریں۔ جب بلائیں گے تب جائیے گا۔ مُلا آخر خان خاناں کا چالیس برس کا نوکر تھا تعجب پر تعجب ہوا۔ جزبز ہو کر رہ گیا اور زبان سے نکلا ع بلے خود کردہ را درماں نباشد لیکن یہ آنا بھی آخر خانخاناں کا آنا تھا۔ یا قیامت کا آنا تھا۔ مُلا سنتے ہی خود دوڑے آئے اور کہتے جاتے تھے معذور فرمائیے دربان آپ کو پہچانتا نہ تھا یہ بولے کہ بلکہ تم بھی! اِس پر بھی بیٹا کہ خانخاناں تو اندر گئے خانی ملازموں میں سے کوئی اندر نہ جا سکا فقط طاہر محمد سلطان۔ میر فراغت نے بڑی ہکاپل سے اپنے تئیں اندر پہنچایا۔ خان خاناں دم بھر بیٹھے اور گھر چلے آئے +

دو تین دن کے بعد خواجہ امینا[1] (جو اخیر میں خواجہ جہاں ہو گئے) اور میر عبداللہ بخشی کو مُلا کے پاس بھیجا اور کہا کہ تمہیں یاد ہو گا کتاب بغل میں مارے طالب العلمی اور نامرادی کی وضع سے تم قندھار میں آئے تھے ہم نے تم میں قابلیت دیکھی اور اخلاص کی صفتیں پائیں۔ اور کوئی کوئی خدمت بھی تم سے اچھی بن آئی چنانچہ بدترین درجہ فقر طالب علمی سے عرش المراتب خانی و سلطانی اور درجہ امیر الامرائی تک پہنچایا۔ مگر تمہارا حوصلہ دولت وجاہ کی گنجائش نہیں رکھتا۔ خطر ہے کہ کچھ ایسا فساد نہ اُٹھاؤ جس کا تدارک مشکل ہو جائے۔ ان مصلحتوں پر نظر کر کے چند روز یہ غرور کا اسباب تم سے الگ کر لیتے ہیں تا کہ بگڑا ہوا مزاج اور مغرور دماغ ٹھیک ہو جائے۔ مناسب ہے کہ علم و نقارہ اور اسباب حشمت سب سپرد کر دو۔ مُلا کی کیا مجال تھی جو دم مار سکے۔ وہ غرور کا مواد جس نے بہت سی انسان صورتوں کو بے عقل اور خبطی کر رکھا ہے۔ بلکہ انسانیت

[1] مفصل حالات کے لئے دیکھو صفحہ ۷۲۲

اور آدمیت کے رستے سے گرایا اور گرآتا ہے جنگل کے بھوتوں میں ملایا اور ملاتا ہے۔ اسی وقت سب جے الہ کر دیا۔ اور وہی مُلا پیر محمدؐ رہ گئے جو کہ تھے۔ پہلے قلعہ بیانہ کے قید خانہ میں بھیج دیا۔ مُلا نے ایک رسالہ خان خانان کے نام پر تصنیف کیا اُس میں فقط بُرہانِ تمانع کو طُول و تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ اور یہ ایک مشہور مُباحثہ علما میں ہے۔ گویا تفسیر ہے اِس آیت کی لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ اِس میں ایک لطیف اشارہ تھا اِس بات کا کہ میری غلط فہمی تھی جو آپ کی بارگاہ اقبال کے سامنے اپنا خیمہ لگاتا تھا۔ اور اب میں آپ پر ایمان لا کر توبہ کرتا ہوں یہ رسالہ بھی بھیجا اور بہت سے عذر و معذرت کے خط لکھے عجز و انکسار نے پہنچ کر شفاعت کی مگر قبول نہ ہوئی کہ بے وقت تھی۔ چند روز کے بعد براہِ گجرات مکہ کو روانہ کر دیا۔ اِس کی جگہ حاجی محمد سیستانی کو بادشاہ کا اُستاد اور وکیل مُطلق کر دیا۔ وہ بھی اپنا ہی دامنِ گرفتہ تھا۔ جب بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا کچھ نہ کہا مگر رنج ہوا*

شیخ گدائی کنبوہ شیخ جمالی کے بیٹے تھے اور مشائخوں میں داخل ہو گئے تھے جس وقت ہمایوں کی

* مُلا پیر محمد یہاں سے چلے۔ گجرات کے پاس ادھن پور میں پہنچ کر مقام کیا۔ وہاں فتح خاں بلوچ نے بہت خاطرداری کی یہاں سے ادہم وغیرہ اُمرا کے خط پہنچے کہ جہاں ہو وہیں ٹھیر جاؤ۔ اور انتظار کرو کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے یہ یہاں کو خبر ہوئی کہ مُلا وہاں بیٹھے ہیں۔ اُنھوں نے کئی سرداروں کو فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ مُلا ایک پہاڑ کی گھاٹی میں گھس کر اڑے اور دن بھر لڑے رات کو نکل گئے مع مال اسباب اُن کا سب بیرم خانی سپاہ کے ہاتھ آیا اہلکار دیکھتے تھے کہ پیٹ بس کی جائے۔ بادشاہ دیکھتے تھے اور شربت کے گھونٹ پیتے جاتے تھے۔ آزاد تماشہ دیکھنے والے ان باتوں کو سُنکر جو چاہیں باتیں بنائیں لیکن تم غور کرو ایک شخص پر کل سلطنت کا بوجھ ہے۔ دُرستی و خرابی کا ذمہ دار وہ ہے جب ارکانِ سلطنت ایسے گردن کش اور خود سر ہیں۔ اور بے قید رہیں تو وہ اُن سے سلطنت کا کام کیونکر چلا سکتا ہے حقیقت میں یہ لوگ اُس کے ہاتھ پاؤں ہیں جب ہاتھ پاؤں بجائے کام کرنے کے کام بگاڑنے والے ہوں تو اُسے واجب ہے کہ اور ہاتھ پاؤں پیدا کرے یا کام سے دست بردار ہو جائے سکم مجھے اب تک نہیں کھلا کہ شیخ گدائی کی ذات یا صفات میں کیا داغ تھا۔ ہر صاحبِ تاریخ اُن کے باب میں گول گول باتیں کرتا ہے گرکھول کر نہیں کہتا جو کچھ مال اُنہیں کا اور اُن کے خاندان کا لائق تماشوں سے معلوم ہوا ہے اُس کے لئے دیکھو تتمہ۔ خان خاناں نے جو اُنہیں صدارت کا منصب دیا بادشاہی فرمان میں جو اُن پر اعتراض کیا ہے خان خاناں نے ضرور کہا ہو گا کہ شیخ نے میرے ساتھ جو رفاقت کی تھی۔ شاہ جنت مکان کا ملازم سمجھ کر کی تھی۔ اور بادشاہی اُمید پر کی تھی ما سبب کچھ اُس کے ساتھ کیا گیا خدمتِ بادشاہی کا صلہ ہے۔ کوئی اپنا حقِ قرابت نہیں ہے۔ جو لوگ باپ دادا کا نام لیکر آج حاضرِ خدمت ہیں اُس وقت کہاں گئے تھے وہ مرتبوں کے ساتھ تھے یا جان بچائے تھے جنھوں نے رفاقت کی ان کا حق بہر صورت مقدم ہے! اور حضور حق شناسی قطع نظر کر کے دیکھیں آئینِ مملکت کیا فتویٰ دیتا ہے۔؟ ظاہر ہے کہ جو لوگ بُرے وقت میں رفاقت کرتے ہیں اگر بھلے وقت میں اُن سے سلوک نہ کیا جائے تو آئندہ کسی کو کیا اُمید ہو گی اور کس بھروسے پر کوئی رفاقت کرے گا مسجد نشین مُلا سے یا خود غرض لوگ جو چاہیں سو کہیں۔ یہ مسجد و مدرسہ کا خلیفہ ہیں کہ حضرت پیر صاحب کی اولاد ہیں یا مولوی صاحب کے بیٹے ہیں انہیں تو بے دو یہ مہماتِ سلطنت میں ذرا سی اونچ نیچ میں بات بگڑ جاتی ہے اور اُس سے ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ملک و مملکت تہ و بالا ہو جاتے ہیں اور ذرا ہی سی بات میں بن بھی جاتے ہیں۔ پھر کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ کیا تھا۔ آزاد جن مشائخ اور علما کو اونچا بٹھایا تھا۔ غور تو کرو۔ وہ کون تھے؟ وہی بزرگوار جن کا حال چند سال کے بعد کھل گیا۔ اگر ایسے لوگوں سے اونچا بٹھا دیا تو کیا کفر ہو گیا؟

سلطنت بگڑی اور خان خاناں پر وقت پڑا تو انہوں نے گجرات میں کچھ رفاقت کی تھی۔ اب انہیں صدارت کا منصب دیگر کل اکابر و مشائخ ہند سے اونچا بٹھایا۔ خود ان کے گھر جاتے تھے۔ بلکہ بادشاہ بھی کئی دفعہ گئے تھے اور اس پر لوگوں نے بہت چرچا کیا تھا اور کہتے تھے ع سگ نشیند بہ جائے گیلانی ؎

اب وہ وقت آیا کہ یا تو خان خاناں کی ہر تجویز عین تدبیر تھی۔ یا ہر بات نظروں میں کھٹکنے لگی اور حکموں پر ناراضیاں بلکہ شور و غل ہونے لگے۔ خیر وہ برائے نام وزیر تھا مگر عقل و تدبیر کا بادشاہ تھا۔ جب لوگوں کے چرچے سُنے اور بادشاہ کو بھی کھٹکتے دیکھا تو گوالیار کا علاقہ مدت سے خودسر تھا۔ بادشاہی فوج بھی گئی تھی۔ کچھ بندوبست نہ ہوسکا تھا۔ اب اُس نے بادشاہ سے کچھ مدد نہ لی۔ خاص اپنی ذاتی فوج سے گیا۔ اور اپنے جیب خرچ سے لشکر کشی کی۔ آپ جاکر قلعہ کے نیچے ڈیرے ڈال دیئے۔ مورچے باندھے اور حملہ ہائے شیرانہ اور شمشیر دلیرانہ سے قلعہ توڑا۔ اور ملک فتح کر دیا۔ بادشاہ بھی خوش ہو گئے اور اور لوگوں کی زبانیں بھی قلم ہو گئیں ؎

ملک مشرقی میں افغانوں نے ایسا سکہ بٹھایا تھا کہ کوئی امیر اُدھر جانے کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔ خان زماں کہ بیرم خان کا داہنا ہاتھ تھا۔ اور اس پر بھی دشمنوں کا دانت تھا۔ اُس نے اُدھر کی مہم کا ذمہ لیا اور ایسے ایسے کارنامے کئے کہ رستم کے نام کو پھر زندہ کر دیا ؎

چندیری اور کالپی کا بھی وہی حال تھا۔ خان خاناں نے اس پر بھی ہمت کی مگر امیروں نے بجائے مدد کے بدمددی کی۔ بنانے کے عوض کام خراب کیا غنیموں سے سازشیں کر لیں۔ اس لئے کامیاب نہ ہوا فوج ضائع ہوئی روپیہ برباد ہوا اور ناکام چلا آیا ؎

مالوہ کی مہم کا چرچا ہو رہا تھا۔ عرض کی۔ فدوی بذاتِ خود جائے گا۔ اور اپنے خرچ خاص سے اِس مہم کو سر کرے گا۔ چنانچہ خود لشکر لیکر گیا۔ امرائے دربار مدد کی جگہ بدخواہی پر کمربستہ ہو گئے۔ اطراف کے زمینداروں میں مشہور کیا کہ خان خاناں پر بادشاہ کا غضب ہے۔ اور بادشاہ کی طرف سے خفیہ حکم لکھ لکھ کر بھیجے کہ جہاں موقع پاؤ اس کا کام تمام کر دو اب اُن کا رُعب داب کیا رہا۔ اِس حالت میں اگر وہ کسی سردار یا زمیندار کو توڑ کر موافق کرے اور انعام یا اعزاز کے وعدے کرے تو کون مانتا ہے۔ انجام یہ ہوا کہ وہاں سے بھی ناکام پھرا ؎

بنگالہ کی مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ وہاں بھی دوغلے دغاباز دوستوں نے دونوں طرف مِل کر کام خراب کر دیئے بلکہ نیکنامی تو درکنار۔ پہلے الزاموں پر طُرّہ زیادہ ہوا کہ خان خاناں جہاں جاتا ہے جان بُوجھ کر کام خراب کرتا ہے بات وہی ہے کہ اقبال کا ذخیرہ ہو چکا جس کام پر ہاتھ ڈالتا تھا۔ بنا ہوا بگڑ جاتا تھا ؎

اللہ اللہ یا تو وہ عالم کہ جو بات ہے۔ پوچھو خان بابا سے۔ جو مقدمہ ہے۔ کہو خان خاناں سے سلطنت کے
سفید و سیاہ کا کُل اختیار۔ آفتابِ اقبال اِس اوج پر کہ جس سے اُونچا ہونا ممکن نہیں (مشکل یہ ہے کہ
اِس نقطہ پر پہنچ کر ٹھہرنے کا حکم نہیں) افسوس اب اُس کے ڈھلنے کا وقت آگیا۔ ظاہری صورتیں
یہ ہوئیں کہ بادشاہی ہاتھیوں میں ایک مست ہاتھی فیلبان کے قابو سے نکل گیا۔ اور بیرم خاں کے ہاتھی سے
جا لڑا۔ ہر چند بادشاہی فیلبان نے روکا مگر ایک تو ہاتھی اُس پہ مست نہ دب سکا۔ اور ایسی بے جگہ ٹکر ماری
(بیرم خاں کے ہاتھی کی انتڑیاں نکل پڑیں۔ خان بڑے خفا ہوئے اور فیلبانِ شاہی کو قتل کیا ؎

اِنہی دنوں میں ایک خاصہ کا ہاتھی مستی میں آکر جمنا میں اُتر گیا۔ اور بدمستیاں کرنے لگا۔ بیرم خاں بھی
کشتی میں سوار سیر کرتے پھرتے تھے کہ ہاتھی اپنی ہتیاائی کرنے لگے۔ اور ٹکر کو دریائی ہاتھی پر آیا۔ یہ حال دیکھ کر
کناروں سے غل اور دریا میں شور اٹھا۔ ملّاح بھی گھبرا گئے۔ ہاتھ پاؤں مارتے تھے اور دل ڈوبے جاتے تھے۔
خان پر عجب حالت گذری۔ بارے مہاوت نے ہاتھی کو دبالیا۔ اور بیرم خاں اس آفت سے بچ گئے اکبر کو خبر
پہنچی۔ مہاوت کو باندھ کر بھیج دیا مگر یہ بھی چال چوکے کہ اُسے بھی وہی سزا دی۔ اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ اور تھوڑا بھی ہوا
ہوگا۔ تو بڑھانے والے موجود تھے قطرہ کو دریا بنا دیا ہوگا۔ غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ بادشاہ کے خاصے کے ہاتھی امرا
کو تقسیم کر دیئے کہ اپنے اپنے طور پر انہیں تیار کرتے رہیں۔ اِس کا عذر یہی ہوگا۔ کہ نوجوان بادشاہ کے خیالات
اِنہی کے سبب سے پریشان ہوتے ہیں۔ نہ یہ ہونگے۔ نہ یہ خرابیاں ہونگی اور اِس کا ہر وقت کا مشغلہ یہی تھا۔ وہ
بہت گھبرایا اور دق ہوا ؎

خانخاناں کے دشمن تو بہتیرے تھے مگر ماہم بیگم ادھم خاں اِس کا بیٹا۔ شہاب خاں اِس کا رشتہ کا داماد
اور اکثر رشتہ دار ایسے تھے کہ اندر باہر ہر طرح کی عرض کا موقع ملتا تھا۔ اکبر اِن کا اور اِس کے لواحقوں کا حق
بھی بہت مانتا تھا۔ یہ علامہ بڑھیا ہر دم لگاتی بجھاتی رہتی تھی اور جو اُن میں سے موقع پاتا تھا۔ بات بات پر اُکساتا
تھا۔ کبھی کہتے تھے کہ یہ حضور کو بچہ سمجھتا ہے اور خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ کہتا ہے کہ میں نے تخت پر بٹھایا۔ جب
چاہوں اُٹھا دوں اور جب چاہوں بٹھا دوں۔ کبھی کہتے کہ شاہ ایران کے مراسلے اِسی کے پاس آتے
ہیں۔ اور اِس کی عرضیاں جاتی ہیں فلاں سوداگر کے ہاتھ تحائف بھیجے تھے ؎

دربار کی رقیب جانتے تھے کہ بابر اور ہمایوں کے وقت کے پرانے پرانے نمک خوار کہاں کہاں ہیں اور
کون اشخاص ہیں جن کے دل میں خان خاناں کی رقابت یا مخالفت کی آگ سلگ سکتی ہے۔ اُن کے پاس آدمی
بھیجے تمہیں یاد ہے شیخ محمد غوث گوالیاری کا دربار سے کیونکر سلسلہ ٹوٹا اور وہ اُن سب باتوں کو خانخاناں
کے اختیارات کا پھل سمجھے تھے۔ اُن کے پاس بھی خطوط بھیجے۔ اور مقدمات کے ایچ پیچ سے آگاہ کرکے

برکت انفاس کے طلبگار ہوئے۔ وہ مرشدِ کامل تھے۔ نیت خالص سے شریک ہوئے ؂

اگرچہ سلسلہ کلام پھیلتا جاتا ہے مگر اتنی بات کہے بغیر آزاد آگے نہیں چل سکتا کہ باوجود تمام اوصاف و کمالات، اور دانائی و فرزانگی کے بیرم خاں میں چند باتیں تھیں جو زیادہ تر اُس کی برہمی کا سبب ہوئیں۔ (۱) اول لعزم صاحب جرأت شخص تھا۔ جو مناسب تدبیر دیکھتا تھا۔ کر گذرتا تھا۔ اِس میں کسی کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ اور اس وقت تک زمانہ ایسا پایا تھا کہ سلطنت کی نازک حالتوں اور بھاری مہموں میں دوسرا شخص ہاتھ بھی نہ ڈال سکتا تھا۔ اب وہ وقت نکل گئے تھے۔ پہاڑ کٹ گئے تھے۔ دریا پایاب ہو گئے تھے کام ایسے پیش آتے تھے کہ اور بھی کر سکتے تھے۔ مگر یہ بھی جانتے تھے کہ خانخاناں کے ہوتے ہمارا چراغ نہ جل سکیگا۔ (۲) وہ اپنے اوپر کسی اور کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ پہلے وہ ایسے مقام میں تھا کہ اُس سے اوپر جانے کو رستہ بھی نہ تھا۔ اب سڑک صاف بن گئی تھی اور ہر شخص کے ہونٹ بادشاہ کے کان تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر بھی اس کے ہوتے بات کا پیش جانا مشکل تھا۔ (۳) عظیم الشان مہموں اور پیچیدہ معرکوں کے لئے ایسے بالیاقت شخصوں اور سامانوں کا تیار رکھنا واجب تھا۔ جن سے وہ اپنی برجستہ تدبیریں اور بلند ارادوں کو پورا کر سکے۔ اس کے لئے روپوں کی نہریں اور چشمے جاگیریں اور علاقے قابو میں ہونے چاہئیں اب تک وہ اس کے ہاتھ میں تھے۔ اب ان برادروں کو بھی قابض ہونے کی ہوس ہوئی۔ لیکن یہ خطر ضرور تھا۔ کہ اُس کے سامنے قدم جمنے مشکل ہونگے (۴) اُس کی سخاوت اور قدر دانی ہر وقت بالیاقت اشخاص کا مجمع اور بہادر سپاہیوں کا انبوہ اس قدر فراہم رکھتی تھی کہ نسبتیں ہزار ہاتھ اُس کے دستر خوان پر پڑتا تھا۔ اسی واسطے جس مہم پر چاہتا تھا فوراً ہاتھ ڈالدیتا تھا۔ اِس کی تدبیر کا ہاتھ ہر ملک و مملکت میں پہنچ سکتا تھا اور سخاوت اس کی رسائی کو بڑھاتی رہتی تھی۔ اِس لئے جو الزام لگتے وہ اس پر لگ سکتا تھا۔ (۵) اُسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ اکبر وہی بچہ ہے جو میری گود میں کھیلا ہے وہ یہاں پہنچتے کے لہو میں خود مختاری کی گرمی سرسرانے لگی تھی۔ اِس پر حریفوں کی اشتعال انگیز ہر وقت گرمائے جاتی تھی ؂

یہ سب کچھ تھا مگر جو جو خدمتیں اس نے عقیدت و اخلاص سے کی تھیں۔ ان کے نقش اکبر کے دل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی تھا کہ کسی کو نوکر نہ رکھ سکتا تھا کسی کو کچھ دے نہ سکتا تھا۔ خانخاناں کے متوسل اچھے اچھے علاقوں میں تعینات تھے۔ وہ باسامان اور خوش لباس نظر آتے تھے۔ جو خاص بادشاہی نوکر کہلاتے تھے۔ وہ ویران جاگیریں پاتے تھے اور ٹوٹے پھوٹے حال سے پھرتے تھے۔ بھانڈا یہاں سے پھوٹتا ہے کہ ۹۶۷ھ سنہ ۵ جلوس میں اکبر اور بیرم خاں مع اہل دربار

آگرہ میں تھے۔ مریم مکانی دِلّی ہی میں تھیں حریف ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اور ہر دم فساد کے منتر اُس پر دم کرتے چلے آتے تھے بیانہ کے مقام میں یہی ذکر ایک جلسہ میں چھڑا۔ مرزا شرف الدین اکبر کے بہنوئی بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے صاف کہدیا کہ اُس نے بندوبست کر لیا ہے۔ آپ کو تخت سے اُٹھا دے اور کامران کے بیٹے کو بٹھا دے۔ خود غرضوں کی صلاحیں مُطابق ہوئیں اور اکبر شکار کو اُٹھا۔ آگرہ سے جالیسر اور سکندرہ ہوتے ہوئے خورجہ ہو کر سرائے بگھل میں آن اُترے۔ ماہم نے رستہ میں دیکھا کہ اِس وقت بیرم خاں سے میدان خالی ہے۔ بسورتی صورت بنا کر اکبر کے سامنے آئی۔ اور کہا کہ بیگم کا ضعیفی اور ناطاقتی سے عجب حال ہے۔ کئی خط میرے پاس آئے ہیں۔ حضور کے دیکھنے کو ترستی ہیں۔ بادشاہ کو بھی اِس بات کا خیال ہو گیا۔ ادہم خاں اور اکثر رشتہ دار کہ صاحب رُتبہ امیر تھے۔ دِلّی ہی میں تھے اِسی عرصہ میں اُن کی عرضیاں پہنچیں۔ آخر لہو کا جوش تھا۔ بادشاہ کا دل کڑھ گیا۔ اور دِلّی کو چلے شہاب خاں پنجہزاری امیر تھا۔ اور ماہم کا رشتہ دار تھا۔ اِس کی بی بی پاپا آغا مریم مکانی کی رشتہ دار تھی اُس وقت وہی دِلّی کا حاکم تھا۔ دِلّی پچیس تیس کوس رہی ہو گی کہ وہ بڑھ کر استقبال کو پہنچا اور بہت سے نذرانے پیشکش گذرانے اور شہاب الدین احمد خاں گیا۔ بعد اس کے خلوت میں گیا۔ کانپتی ہانپتی صُورت بنا کر بولا کہ حضور کے قدم دیکھے۔ زہے طالع مگر اب جانثاروں کی جانوں کی خیر نہیں خانخاناں سمجھیگا کہ حضور کا دِلّی میں آنا ہمارے اِشارہ سے ہُوا ہے پس جو مُصاحب بیگ کا حال ہُوا سو ہمارا ہو گا۔ محل میں ماہم نے یہی رونا رویا بلکہ اُس کے اختیارات اور انجام کی قباحتیں دکھا کر تنکے کو پہاڑ کر دکھایا۔ اور کہا کہ اگر بیرم خاں ہے تو حضور کی سلطنت نہیں۔ اور سلطنت تو اب بھی وہی کرتا ہے سرِ دست تو یہی مشکل ہے کہ وہ کہیگا کہ آپ میری بے اجازت گئے۔ ان کی اشارت سے گئے۔ اتنی طاقت کس میں ہے کہ اُس کا مُقابلہ کر سکے یا اُس کے غصہ کو سنبھال سکے۔ اب شفقت شاہانہ یہی ہے کہ اجازت ہو جائے یہ قدیمی خانہ زاد خانۂ خدا کو چلے جائیں۔ وہاں غائبانہ دعاؤں سے خدمت بجا لائیں گے۔ اکبر نے کہا میں خان بابا کو تمہاری عفو تقصیر کے لئے لکھتا ہوں۔ چنانچہ نشقہ لکھا کہ ہم آپ مریم مکانی

لہ مرزا شرف الدین ایک کاشغری خواجہ زادے تھے۔ جب نئے تو ایسے گرد مسکین تھے کہ اکبر نے خانخاناں کی صلاح سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔ خانخاناں کے بعد باغی ہو گئے۔ وہ ملک کو تباہ کرتے پھرتے تھے اور اُمرا فوجیں لئے پھرتے تھے۔ خانخاناں ہی کا رعب و داب تھا کہ ایسوں کو دبا رکھا تھا۔ اِن سرکش گردنوں نے جو کچھ کیا اُس کی سزا پائی بعض کے حالات تتمے میں دیکھوگے۔ دیکھو صفحہ ۲۳۷ ٭ (۲) اہلِ تاریخ کہتے ہیں کہ بادشاہ آگرہ سے شکار کو نکلے تھے۔ رستے میں یہ کارسازیاں ہوئیں۔ ابوالفضل کہتے ہیں کہ اکبر نے اِن لوگوں کے ساتھ اندر اندر بندوبست کر لئے تھے شکار کا بہانہ کر کے دِلّی میں آئے اور خانخاناں کی مہم کو طے کیا ٭

کی عیادت کو یہاں آئے ہیں۔ اُن لوگوں کو اِس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ اِسی خیال سے اُن کے دِل بہت پریشان ہیں۔ تم ایک خط اپنی مہر و دستخط سے اِنہیں لکھ بھیجو کہ ان کی تشفی خاطر ہو جائے اور اطمینان سے ادائے خدمت میں مصروف رہیں وغیرہ وغیرہ۔ اتنی گنجائش دیکھتے ہی سب پھوٹ بہے۔ شکایتوں کے دفتر کھول دیئے۔ شہاب الدین احمد خاں نے اصلی اور وصلی کئی مقدمے اور مثلیں تیار رکھی تھیں۔ ان کے حالات عرض کئے۔ دو تین رفیق گواہی کے لئے تیار کر رکھے تھے۔ اُنہوں نے گواہیاں دیں۔ غرض اس کی بداندیشی اور بغاوت کے ارادے ایسے بادشاہ کے دل پر نقش کر دیئے کہ اُس کا دل پھر گیا۔ اور سوا اِس کے چارہ نہ دیکھا کہ اپنی حالت کو اُن کی صلاح و تدبیر کے حوالے کر دے۔

اِدھر خانخاناں کے پاس جب شقہ پہنچا اور ساتھ ہی ہوا خواہوں کے خطوط پہنچے کہ دربار کا رنگ بے رنگ ہے تو کچھ حیران ہوا۔ کچھ پریشان ہوا۔ کمال عجز و انکساری کے ساتھ عرضی لکھی اور قسمہائے شرعی کے ساتھ لکھا جس کا خلاصہ یہ کہ جو خانہ زاد اِس درگاہ کی خدمت و وفا و اخلاص سے کرتے ہیں غلام کے دل میں ہرگز اُن کی طرف سے بُرائی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ عرضی خواجہ امین الدین محمود کہ پھر خواجہ جہاں ہوئے اور حاجی محمد خاں سیستانی اور رسول محمد خاں اپنے معتبر سرداروں کے ہاتھ روانہ کی۔ اور کلام اللہ ساتھ بھیجا کہ قسموں کا وزن زیادہ ہو۔ یہاں کام حد سے گذر چکا تھا۔ تحریر کا اثر کچھ نہ ہوا۔ کلام مجید بالائے طاق اور عجز و نیاز کے امانت دار قید ہو گئے۔ شہاب الدین احمد خاں باہر و کیل مطلق ہو گئے ماہم اندر ہی اندر بیٹھی حکم احکام جاری کرنے لگی۔ اور مشہور کر دیا کہ خان خاناں حضور کی غضبی میں آیا بات منہ سے نکلتے ہی دُور پہنچ گئی۔ امرا اور ملازم دربار جو آگرہ میں خان خاناں کے پاس تھے۔ اُٹھ اُٹھ کر دلی کو دوڑے۔ دامن گرفتہ لوگ اپنے ہاتھ کے رکھے ہوئے نوکر الگ ہو ہو کر چلنے شروع ہوئے یہاں جو آتا ماہم اور شہاب الدین احمد خاں اُس کا منصب بڑھاتے۔ جاگیریں اور خدمتیں دلواتے۔

صوبجات اور اطراف و جوانب میں جو امرا تھے اُن کے نام احکام جاری کئے۔ شمس الدین خاں اتکہ کو بھیرہ علاقہ پنجاب میں حکم پہنچا کہ اپنے علاقہ کا بندوبست کرکے لاہور کو دیکھتے ہوئے جلد دلی میں حاضر حضور ہو۔ منعم خاں بھی احکام و ہدایات کے ساتھ کابل سے طلب ہوئے۔ یہ پُرانے سردار کہنہ عمل سپاہی تھے کہ ہمیشہ بیرم خاں کی آنکھیں دیکھتے رہے۔ ساتھ ہی شہر پناہ اور قلعہ دلی کی مرمت اور مورچہ بندی شروع کر دی۔ واہ رے بیرم تیری ہیبت ◆

یہاں خانخاناں نے اپنے مُصاحبوں سے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی اور چند اور شخصوں کی یہ رائے تھی کہ ابھی حریفوں کا پلہ بھاری نہیں ہوا۔ آپ یہاں سے جریدہ سوار ہوں۔ اور شب بشب فراز سمجھا کر

بادشاہ کو پھر قابو میں لائیں کہ فتنہ انگیزوں کو فساد کا موقع نہ ملے بعض کی رائے تھی کہ بہادر خاں کو فوج دیکر مالوہ پر بھیجا ہے۔ خود وہاں چلو اور ملک تسخیر کر کے بیٹھ جاؤ۔ پھر جیسا موقع ہوگا۔ دیکھا جائیگا۔ بعض کی صلاح تھی کہ خانزمان کے پاس چلو۔ پورب کا علاقہ افغانوں سے بھرا ہؤا ہے۔ صاف کرو اور چند روز وہاں بسر کرو ؛

خانخاناں ہر شخص کا بلکہ زمانے کا مزاج پہچانے ہوئے تھا۔ اُس نے کہا کہ اب حضور کا دِل مجھ سے پھر گیا۔ کسی طرح نبھنے کی نہیں۔ تمام عمر دولت خواہی میں گذاری۔ بڑھاپے میں بدخواہی کا داغ پیشانی پر لگانا ہمیشہ کے لئے منہ کالا کرنا ہے۔ اِن خیالوں کو بھول جاؤ۔ مجھے حج اور زیارات کا مدت سے شوق تھا۔ خدا نے خود سامان کر دیا ہے۔ ادھر کا ارادہ کرنا چاہیئے۔ امرا اور رُفقا جو ساتھ تھے انہیں خود دربار کو رخصت کر دیا۔ وہ سمجھا اور خوب سمجھا کہ یہ سب بادشاہی نوکر ہیں۔ انہوں نے اگرچہ مجھ سے بہت فائدے اٹھائے ہیں۔ بلکہ اکثر میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں لیکن اُدھر بادشاہ ہے۔ اگر میرے پاس رہے تو بھی عجب نہیں کہ اُدھر خبریں دے رہے ہوں یا دینے لگیں اور آخر کو اٹھ بھاگیں بہتر ہے کہ میں خود انہیں رخصت کر دوں۔ وہاں جا کر شائد کچھ اصلاح کی صورت نکالیں کیونکہ آخر مجھ سے نقصان نہیں پایا۔ پایا ہے تو فائدہ ہی پایا ہے۔ بیرم خاں نے خانزمان کے بھائی بہادر خاں کو فوج دیکر مالوہ کی مہم پر بھیجا تھا۔ دربار کا یہ حال دیکھ کر بلا بھیجا کہ اس کی ضروریات کی دربار سے کون خبر لیگا۔ دربار سے اس کے نام بھی حکم طلب پہنچا۔ اس میں کئی مطلب ہونگے۔ اول یہ کہ وہ دونوں بھائی خان خاناں کے دو بازو تھے مبادا کہ بے اختیار ہو کر اٹھ کھڑے ہوں دوسرے یہ کہ ذاتی فائدہ کی اُمید پر اِس سے پھریں اور اِدھر مڑیں۔ اگر نہ مڑیں تو منحرف تو نہ ہوں۔ مگر بہادر بچپن میں اکبر کے ساتھ کھیلا ہؤا تھا اور اکبر اُسے بھائی کہتا تھا اِس لئے ہر بات میں اِس سے بے تکلف تھا۔ غالباً اُن کے ڈھب کا نہ نکلا ہوگا اور خان خاناں کی طرف سے صفائی کے نقش بٹھاتا ہوگا۔ اِس لئے بہت جلد اُسے اٹاوہ کا حاکم کر کے مغرب سے مشرق میں پھینک دیا۔

شیخ گدائی وغیرہ رفقا نے صلاحیں دیں اور خان خاناں نے بھی چاہا تھا کہ آپ حضور میں حاضر ہو اور جو باتیں جرم و گناہ قرار دی گئی ہیں۔ انکی عذر معذرت کر کے صفائی کرے۔ بعد اِس کے رخصت ہو۔ یا جیسا وقت کا موقع دیکھے ویسا کرے۔ لیکن حریفوں نے وہ بھی نہ چلنے دی انہیں یہ ڈر ہؤا جب یہ اکبر کے سامنے آیا۔ اپنے مقاصد کو پُر اثر تقریر کے ساتھ اِس طرح ذہن نشین کریگا کہ جو نقش ہم نے اتنے دنوں میں جمائے ہیں۔ سب مٹ جائینگے اور بنی بنائی عمارت کو چند باتوں

میں ڈھا دے گا۔ اکبر کو یہ ڈرایا کہ وہ خود صاحبِ فوج و لشکر ہے۔ امرا سب اُس سے ملے ہوئے ہیں نمک حلالوں کی تعداد ابھی بہت کم ہے۔ اگر وہ یہاں آیا تو خدا جانے کیا صورت ہو۔ بادشاہ بھی لڑکا ہی تھا۔ ڈر گیا اور صاف لکھ بھیجا کہ ادھر آنے کا ارادہ نہ کرنا۔ ملازمت نہ ہوگی۔ اب تم حج کو جاؤ۔ پھر آؤ گے تو پہلے سے بھی زیادہ خدمت پاؤ گے۔ بڈھا خدمتگزار اپنے مصاحبوں کی طرف دیکھ کر رہ گیا کہ تم کیا کہتے تھے اور میں کیا کہتا تھا اور اب کیا کہتے ہو۔ غرض حج کا ارادہ مصمم کیا۔

اکبر کی خوبیوں کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ میر عبداللطیف قزوینی کہ اب ملا پیر محمد کی جگہ اُستاد تھے اور دیوانِ حافظ پڑھایا کرتے تھے۔ انہیں فہمائش کر کے بھیجا اور زبانی پیغام دیا کہ تمہارے حقوقِ خدمت اور اخلاص عقیدت عالم پر روشن ہیں۔ ابھی تک ہماری طبیعت سیر و شکار کی طرف مائل تھی کاروبار ملکی تم پر چھوڑ دیئے تھے۔ اب مرضی ہے کہ مہماتِ خلائق کو بذاتِ خود سرانجام فرمائیں تم مدت سے ترکِ دنیا کا ارادہ رکھتے ہو اور سفرِ حجاز کا شوق ہے۔ یہ نیک ارادہ مبارک ہو۔ پرگنات ہندوستان سے جو علاقہ پسند ہو وہ لکھو۔ تمہاری جاگیر ہو جائیگا۔ گماشتے تمہارے اس کا محاصل جہاں تم لکھو گے وہاں پہنچا دینگے۔ یہ پیغام بھیجا اور فوراً خود بھی اسی طرف کوچ کیا۔ چند امرا کو آگے بڑھا دیا کہ خانخاناں کو سرحد کے باہر نکال دو جب یہ لوگ قریب پہنچے تو اس نے انہیں لکھا کہ میں نے دُنیا کا بہت کچھ دیکھ لیا اور کر لیا۔ اب سب سے ہاتھ اُٹھا چکا۔ مُدت سے ارادہ تھا کہ خانۂ خدا اور روضہ ہائے مقدسہ پر جا کر بیٹھوں اور یادِ الٰہی میں مصروف ہوں۔ الحمد للہ کہ اب اس کا سلسلہ ہاتھ آیا ہے۔ اُس دریا دل نے سرو چشم کہکر قبول کیا اور بہت خوشی سے تعمیل کی۔ ناگور سے طوغ و علم نقارہ۔ فیلخانہ۔ تمام اسباب امیرانہ اور شوکتِ شاہانہ کا سامان حسین قلی بیگ اپنے بھانجے کے ساتھ روانہ کر دیا۔ جھجھر کے مقام میں پہنچا۔ اس کی عرضی جو مضامین نیاز اور صدق دل کی دعاؤں سے سجائی ہوئی تھی۔ درگاہ میں پڑھی گئی۔ اور حضور خوش ہو گئے۔ اب وہ وقت آیا کہ خانخاناں کے لشکر کی چھاؤنی پہچانی نہ جاتی تھی۔ جو رفیق دونوں وقت ایک قاب میں کھانے پر ہاتھ ڈالتے تھے بہت ان میں سے چلے گئے۔ انتہا ہے کہ شیخ گدائی بھی الگ ہو گئے۔ فقط چند رشتہ دار اور وفا کے بندے تھے۔ وہی ساتھ رہے۔ (ایک ان میں حسین خان افغان بھی تھے ان کا حال الگ لکھا جائیگا[1])

ابوالفضل اکبرنامہ میں کئی ورق کا ایک فرمان لکھتے ہیں کہ دربار سے اُس محروم العقمت کے نام جاری ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر بے درد بیخبر لوگ تو نمک حرامی کا جرم لگائینگے لیکن قابلِ اعتبار دو شخصوں

[1] دیکھو صفحہ ۷۰۶

کا حال ہوگا ۔ ایک وہ کہ جس نے اس کے جزوی جزوی حالات کو نظرِ انصاف سے دیکھا ہوگا وہ آئندہ ہمدردی اور رفاقت سے توبہ کرے گا دوسرے جس نے کسی ہونہار امیدوار کے ساتھ جانفشانی اور جانبازی کا حق ادا کیا ہوگا ۔ اُس کی آنکھوں میں خون اتر آئے گا بلکہ آتشِ غضب سے جگر جلیگا اور دھواں منہ سے نکلیگا ۔

فرمانِ مذکور میں اس کی تمام خدمتوں کو مٹایا ہے ۔ اُس کے اقربا کی جانفشانیوں کو خاک میں ملایا ہے اُس پر خود پروری ۔ خویش پروری اور ملازم پروری کے الزام لگائے ہیں ۔ اِس پر جُرم لگائے ہیں کہ پٹھان سرداروں کو بغاوت کی ترغیب دی ۔ خود فلاں فلاں طریقوں سے بغاوت کے منصوبے باندھے ۔ اُس میں علی قلی خاں اور بہادر خاں کو بھی لپیٹ لیا ہے ۔ بڑھاپے کی نمکحرامی و بیوفائی سے خبیث خیالات اور کثیف الفاظ اس کے حق میں صرف کرکے کاغذ کو سیاہ کیا ہے ان دردوں کو کون جانے ؟ بدنصیب بیرم خاں جانے یا جس ناکام کی بیرم خاں جیسی خدمتیں برباد ہوئی ہوں اس کا دل جانے خصوصاً جب یقین ہو کہ یہ ساری باتیں دشمن کر رہے ہیں ۔ اور گودوں کا پالا ہُوا آقا ان کے ہاتھوں میں کاٹ کی پتلی ہے ؏ یارب مباد کس را مخدوم بے عنایت ۔

کمظرف دشمن کسی طرح اِس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے ۔ اِس کے پیچھے چند امیروں کو فوج دے کر روانہ کیا تھا کہ جائیں اور سرحد ہندوستان سے نکالدیں جب وہ نزدیک پہنچے تو بیرم خاں نے انہیں لکھا کہ میں نے دنیا کا بہت کچھ دیکھ لیا اور اِس سلطنت میں سب کچھ کر لیا ۔ کوئی ہوس دل میں نہیں میں سب سے ہاتھ اُٹھا چکا ۔ مدت سے دل میں شوق تھا کہ خانۂ خدا اور روضہ ہائے مقدسہ کی ان آنکھوں سے زیارت کروں الحمدللہ کہ اب اس کا سلسلہ ہاتھ آیا ہے ۔ تم کیوں تکلیف کرتے ہو وہ پھر چلے آئے

مُلّا پیر محمد جس کو خان خاناں نے حج کو روانہ کر دیا تھا ۔ اُنہیں اُسی وقت حریفوں نے پیغام بھیجے تھے کہ یہاں گُل کھلنے والا ہے ۔ جہاں پہنچے ہو ۔ وہیں ٹھہر جانا ۔ وہ گجرات میں بلی کی طرح تاک لگائے بیٹھے تھے ۔ اب حریفوں کے پرچے پیام پہنچے کہ بڈھا شیر ادھ موا ہو گیا ۔ آؤ شکار کرو ۔ یہ سنتے ہی دوڑے جھجر کے مقام میں ہی ملازمت ہوئی ۔ یاروں نے علم نقارہ دلوا کر فوج کا سردار کیا کہ خانخاناں کے پیچھے پیچھے جائیں اور ہندوستان سے مکہ کو نکالدیں ۔ ادہم خاں ماہم کا بیٹا اور بڑے بڑے سرداران کے ساتھ ہوئے ۔ ادھر خان خاناں نے ناگور پہنچکر خبر پائی کہ مارواڑ کے راجہ مالدیو نے گجرات دکن کا رستہ روک رکھا ہے ۔ سلطنت کے نمک حلال سے اُسے صدمے پہنچے ہوئے تھے ۔ دُور اندیشی کرکے ناگور سے خیمہ کا رُخ پھیرا کہ بیکانیر سے ہوتا ہُوا پنجاب سے نکل کر قندھار کے رستے مشہدِ مقدس کی راہ لے مگر دربار سے

جو احکام جاری ہو رہے تھے اُنہیں دیکھکر دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا۔ حریفوں نے زمینداران اطراف کو لکھا کہ یہ زندہ نہ جانے پائے جہاں پاؤ کام تمام کر دو۔ ساتھ ہی ہوائی اڑائی کہ خانخاناں پنجاب کو بغاوت کے ارادے سے چلا ہے وہاں ہر قسم کے سامان آسانی سے بہم پہنچ سکتے ہیں ایسا دق ہوا کہ لئے بدل گئی۔ ان سفلوں کو کیا خاطر میں لاتا تھا صاف کہدیا کہ جن مفسدوں اور بدکرداروں نے حضور کو مجھ سے ناراض کیا ہے۔ اب انہیں شاد کر بادشاہ سے رخصت ہوکر حج کو جاؤنگا۔ فوج بھی جمع کرنی شروع کی۔ اور امرائے اطراف کو مضامین و حالات مذکورہ سے اطلاع دی۔ ناگور سے بیکانیر آیا۔ راجہ کلیان مل اس کا دوست تھا۔ اور حق پوچھو تو حریفوں کے سوا کون تھا جو اس کا دوست نہ تھا۔ وہاں اُس نے دھوم دھام کی ضیافتیں ہوئیں۔ کئی دن آرام لیا۔ اتنے میں خبر آئی کہ ملا پیر محمد تمہیں ہندوستان سے جلاوطن کرنے آتے ہیں۔ دل جل کر خاک ہوگیا۔ ملا کا اس طرح آنا کچھ چھوٹا سا زخم نہ تھا۔ مگر اُنہوں نے قناعت نہ کی۔ اس پر داغ بھی دیا۔ یعنی ناگور میں ٹھہر کر خانخانان کو ایک خط لکھا۔ اس میں طنز کی چنگاریاں تو بہت سی تھیں۔ مگر ایک شعر بھی درج تھا ؎

آمدہ در دل اساس عشق محکم ہمچناں
با غمت جان بلا فرسودہ ہمدم ہمچناں

خانخانان نے بھی ترکی کا جواب ترکی لکھا۔ مگر یہ فقرہ اس میں بہت برجستہ واقع ہوا تھا۔ آمدن مرداز امارسیدہ توقف کردن زنانہ۔ ہرچند جو تمہیں پہلے سے ہی کر رہا تھا اور اُس نے یہ فقرہ بھی لکھا۔ مگر مسجد کے ٹکڑے گدا کو ۴۰ برس نمک کھلا کر امیرالامرا بنایا تھا آج اُس سے یہ باتیں سُننی پڑیں۔ عجب صدمہ دل پر گذرا۔ چنانچہ اسی دل شکستگی کے عالم میں ایک عریضہ حضور میں لکھا جس کے کچھ فقرے ہاتھ آئے ہیں۔ وہ خون کے قطرے ہیں جو دل فگار سے ٹپکے ہیں۔ ان کا رنگ دکھلانا بھی واجب ہے:-

چون موجب اظہار و آرزوئے حاسداں حقوق خدمت دیرینہ بواسطۂ آں دودمان پامال نمک بحرامان نعمت در خدمت ولی نعمت گردیدہ۔ و معانداں در حلال دانستن خون رافضی فتوے دادہ اند۔ برائے محافظت جاں کہ در ہمہ مذہب واجب است مے خواہم بعد رفاقت خود را ازیں بلیہ نجات دہم۔ بدیں نیت (کہ باظہار اہل غرض اسباب بغی آمادہ میدانند) در خدمت آں خداوند (ہر چند نفس لامرا زادہ بیت اللہ باشد) آمدن کفر میدانم و بر عالمے ظاہر است کہ در خاندان ترکان نمک حرامی بظہور نیامدہ لہذا راہ مشہد اختیار نمودہ ام کہ بعد طواف روضۂ امام علیہ السلام و عتبات نجف اشرف و کربلائے معلی و خواندن فاتحہ در اں مکانہائے شریف برائے بقائے سلطنت و عمر آں ولی نعمت از سر نو احرام کعبۃ اللہ بندم۔ التماس آنست کہ اگر بندہ را در جرگہ نمک حراماں واجب القتل

میدانند۔ یکے از بندہ ہائے بے نام ونشاں راتعین فرمانید کہ سر بیرم بریدہ بر سناں جلوہ دہاں برائے تنبیہ وعبرت دیگر بدخواہانِ دولت بحضور بیارو دع گر قبول افتد زہے عز وشرف ۔ والا سردارئ فوج سوائے ملائے خارجی کہ از نمک پروردہ ہائے نمک بحرام واخراجیِ فدوی است بدیگر یکے از بندہ ہائے درگاہ والا مقرر شود ۔

اِس نازک موقع پر کہ بدنصیبی کا پیچ تھا اُس وفادار جاں نثار نے چاہا تھا کہ اپنی اور بادشاہ کی ناراضی کا پردہ رہ جائے اور عزت کی پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ملک سے نکل جائے مگر قسمت نے بڈھے کی داڑھی لونڈوں یا طفل مزاج بڈھوں کے ہاتھ میں دیدی تھی۔ بدنیت بداندیش نہ چاہتے تھے۔ کہ وہ سلامت جانے پائے غرض جب بات بگڑ جائے اور دل پھر جائیں تو الفاظ وعبارت کا زور کیا کر سکتا ہے۔ البتہ اتنا ہوا کہ جب بادشاہ نے یہ عرضی پڑھی تو آبدیدہ ہوئے اور دل کو رنج ہوا ملا پیر محمد کو بلا لیا اور آپ دلی کو پھرے۔ مگر بعضوں نے اکبر کو سمجھایا کہ خان خاناں پنجاب کو چلا ہے۔ اگر یہ پنجاب میں جا پہنچا اور وہاں بغاوت کی تو مشکل ہوگی۔ پنجاب ایسا ملک ہے کہ جسقدر فوج اور سامانِ فوج چاہیں ہر وقت بہم پہنچ سکتا ہے۔ کابل کو چلا گیا تو قندھار تک قبضہ کر لینا اُس کے آگے کچھ دشوار نہیں اور خود نہ کر سکا تو دربار ایران سے مدد لانی بھی اُسے آسان ہے ان مصلحتوں پر نظر کرکے فوج کی سرداری شمس الدین محمد خاں اتکہ کے نام کی اور پنجاب کو روانہ کیا۔ سچ پوچھو تو آگے جو کچھ ہوا۔ اکبر کے لڑکپن اور ناتجربہ کاری سے ہوا۔ سب مؤرخ بالاتفاق لکھتے ہیں کہ بیرم خاں کی نیت میں فساد نہ تھا۔ اگر اکبر شکار کھیلتا ہوا خود اُس کے خیمے پر جا کھڑا ہوتا تو وہ قدموں پر آہی پڑتا۔ بات بنی بنائی تھی یہانتک طُول نہ کھینچتا نوجوان بادشاہ کچھ بھی نہ کرتا تھا۔ جو کچھ تھے بڑھیا اور بڑھیا والوں کے کرتوت تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ اُسے آقا سے لڑا کر نمک حرامی کا داغ لگائیں۔ اُسے گھبرا کر بھاگڑ کی صورت میں دوڑائیں اور اگر مل کر اسی حالتِ موجودہ کے ساتھ پلٹ پڑا تو شکار ہمارا مارا ہوا ہے اِس غرض سے وہ آتش کے پرکالے نئی ہوائیاں اڑاتے تھے اور کبھی اس کے ارادوں کی کبھی اکبر کے حکموں کی رنگا رنگ پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے کہن سال سپہ سالار سنتا تھا پیچ وتاب کھاتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ اس بغاوت کے شوشہ سے وہ نیک نیت نیک رائے دنیا سے بے آس اہلِ دُنیا سے بیزار بیکانیر سے پنجاب کی حد میں داخل ہوا۔ امرائے احبا کو لکھا کہ میں حج کو جاتا تھا مگر سنتا ہوں کہ چند اشخاص نے خدا جانے کیا کیا کہکر مزاج اشرف بادشاہی کو میری طرف سے متغیر کر دیا ہے۔ خصوصاً ماہم آنکہ کا استقلال کے گھمنڈ کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں نے بیرم خاں کو نکالا۔ اب ہمت یہی چاہتی ہے کہ ایک دفعہ آکر بدکرداروں کو سزا دینی چاہیے پھر مٹے

سرے سے رخصت لیکر سفر مقدس پر متوجہ ہونا چاہئے ٭

اس نے اہل و عیال اور مرزا عبدالرحیم ۴ برس کے بیٹے کو جو بڑا ہو کر خانخاناں اور اکبری سپہ سالار ہؤا تھا۔ تمام نقد و جنس مال و دولت اور اسباب کے ساتھ بھٹنڈہ کے قلعہ میں چھوڑا شیر محمد دیوانہ اس کا خاص الخاص ملازم اور قدیم الخدمت اور ایسا باعتبار تھا کہ بیٹا کہلاتا تھا وہ بھٹنڈہ کا حاکم تھا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ جو اس وقت کے امرا اور سردار تھے سب اس کے عیال تھے۔ اس کے بھروسے پر خاطر جمع کرکے آپ دیپالپور کو روانہ ہؤا۔ دیوانہ نے مال و اسباب سب ضبط کرلیا اور آدمیوں کی بڑی بےعزتی کی۔ خانخاناں کو جب خبر پہنچی تو خواجہ مظفر علی اپنے دیوان کو اور درویش محمد ازبک کو بھیجا کہ شیر محمد دیوانہ کو سمجھائیں۔ دیوانہ کو کتے نے کاٹا تھا۔ وہ کب سمجھتا تھا ع اے عاقلاں کنارہ کہ دیوانہ مست شد۔ ان دونوں کو بھی مفسد ٹھہرایا اور قید کرکے حضور میں بھیجدیا ٭

خانخاناں کا مطلب ان انتظاموں سے یہ تھا۔ کہ جو کچھ میرا مال و متاع ہے۔ دوستوں کے پاس رہے کہ ضرورت کے وقت مجھے مل جائے گا۔ میرے پاس ہو تو خدا جانے کیا اتفاق ہے۔ دشمنوں اور لٹیروں کے ہاتھ تو نہ آئے۔ میرے کام نہ آئے میرے دوستوں کے کام آئے۔ انہی دوستوں نے وہ نوبت پہنچائی۔ یہ رنج کچھ تھوڑا نہ تھا۔ اس پر عیال کا قید ہونا۔ اور دشمنوں کے ہاتھ میں جانا۔ غرض نہایت دق ہؤا۔ اور زمانہ کا یہ حال تھا۔ کہ اگر کسی سے مصلحت بھی چاہتا۔ تو وہاں سے مایوسی کی خاک آنکھوں میں پڑتی تھی اور وہ وہ باتیں پیش آتی تھیں۔ جن کا عشر عشیر بھی تحریر میں نہیں آسکتا۔ حیران پریشان۔ غیرت و غصہ میں بھرا ہؤا تھاڑہ کے گھاٹ سے ستلج اترا۔ اور جالندھر پر آیا ٭

دربار دہلی میں بعض کی رائے ہوئی کہ بادشاہ خود جائیں۔ بعض نے کہا کہ فوج جائے۔ اکبر نے کہا۔ دونوں رایوں کو جمع کرنا چاہئے۔ آگے فوج جائے۔ پیچھے ہم ہوں۔ چنانچہ شمس الدین محمد خان اتکہ بھیرہ سے پہنچ لئے تھے۔ انہیں فوج دیکر آگے بھیجا۔ اتکہ خان بھی کوئی جنگ آزمودہ سپہ سالار نہ تھا۔ سلطنت کے کاروبار دیکھے تھے۔ مگر برتے نہ تھے۔ البتہ نیک طبع۔ متحمل مزاج۔ سن رسیدہ شخص تھا۔ اہل دربار نے انہی کو غنیمت سمجھا ٭

بیرم خان کو اول خیال یہ تھا کہ اتکہ خان پرانا رفیق ہے۔ وہ اس آگ کو بجھائیگا۔ مگر خانخانان کا منصب ملتا نظر آتا تھا۔ وہ بھی آتے ہی ہمدمان حضور میں داخل ہوگئے۔ اور خوشی خوشی فوج لیکر روانہ ہوئے۔ ماہم کی عقل کا کیا کہنا ہے۔ صاف پہلو بچالیا۔ اور بیٹے کو کسی بہانہ سے دلی میں چھوڑ دیا ٭

خانخاناں جالندھر پر قبضہ کر رہا تھا کہ خان اعظم ستلج اتر آئے۔ اور گناچور کے میدان پر ڈیرے ڈالدئے۔ خانخاناں کے لئے اس وقت تو دو ہی پہلو تھے۔ یا لڑنا اور مرنا۔ یا دشمنوں کے ہاتھوں قید ہونا اور مشکیں بندھوا کر دربار میں کھڑے ہونا۔ خیر۔ وہ خان اعظم کو سمجھتا کیا تھا جالندھر کو چھوڑ کر پلٹا۔

اب مقابلہ تو پھر ہوگا۔ مگر پہلے اتنی بات کہنی ضرور ہے کہ خانخاناں نے اپنے آقا پر تلوار کھینچی بہت بُرا کیا۔ لیکن ذرا چھاتی پر ہاتھ رکھکر دیکھو۔ جو جو خیال اور رنج و ملال اس وقت اس کے مایوس دل پر چھائے ہوئے تھے۔ اُن پر نظر نہ کرنی بھی بے انصافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جو خدمتیں اس نے بابر اور ہمایوں سے لیکر اس وقت تک کی تھیں۔ وہ ضرور اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں گی آقا کی وفاداری کا نباہنا۔ اودھ کے جنگلوں میں چھپنا۔ گجرات کے دشتوں میں پھرنا۔ شیر شاہ کے دربار میں پکڑے جانا اور ان نازک وقتوں کی دشواریاں سب اسے یاد ہوں گی۔ ایران کا سفر اور قدم قدم کی کٹھن منزلیں اور شاہ کی درباداریاں بھی پیش نظر ہوں گی۔ اسے یہ بھی خیال ہوگا۔ کہ کیسی جان بازی اور جان جوکھوں سے ان مہموں کو اس نے سرانجام دیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ جو گروہ مقابل میں نظر آتا ہے۔ اُن میں اکثر وہ بڈھے دکھائی دیتے ہیں۔ جو ان وقتوں میں اس کے منہ کو تکتے تھے۔ اور ہاتھوں کو دیکھتے تھے۔ یا کل کے لڑکے ہیں کہ جنہوں نے ایک بڑھیا کی بدولت نوجوان بادشاہ کو پھسلا رکھا ہے۔ یہ باتیں دیکھ کر اسے ضرور خیال ہوا ہوگا۔ کہ جو ہو سو ہو ان سفلوں اور نااہلوں کو جنہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ تماشا تو دکھا دو کہ حقیقت انکی بادشاہ کو بھی معلوم ہو جائے۔

پرگنہ دگدار[1] نواح گناچور میں کہ جنوب مشرق جالندھر پر تھا دونوں چھاونیوں کے دھوئیں طرفین کو دکھائی دینے لگے۔ بڈھے سپہ سالار نے پہاڑ اور لکھی جنگل کو پشت پر رکھکر ڈیرے ڈالدئے اور فوج کے دو حصے کئے۔ ولی بیگ ذوالقدر۔ شاہ قلی محرم۔ حسین خان ٹکریہ وغیرہ کو فوجیں دیکر آگے بڑھایا دوسرے حصے کے چاروں پرے باندھ کر آپ بیچ میں قائم ہوا۔ اس کے رفیق تعداد میں تھوڑے تھے۔ مگر مروت اور مردانگی کے جوش نے ان کی کمی کو بہت بڑھا دیا تھا۔ ہزاروں دلاوروں نے اس کی قدردانی کے ہاتھ سے فیض پائے تھے۔ ان سب کا مول یہ گنتی کے آدمی تھے جو رفاقت کے نام پر جان قربان کرنے نکلے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بڈھا جوان مرد ہے۔ اور مرد کا ساتھ

[1] طبقات میں صاحب لکھتے ہیں کہ کنور پھلور۔ گوناچور کے جنوب مغرب میں تھا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ یہ لڑائی ماچھی واڑہ کے باہر ہوئی۔ جو میں نے لکھا ہے یہ تو [illegible]احب کا قول ہے اور یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ دکن کے فرشتہ کو پنجاب کی کیا خبر۔

مرد بھی دیتا ہے۔ وہ اس غصہ میں آگ ہو رہے تھے کہ مقابل میں وہ لوگ تھے۔ جنہیں بوالہوسی نے مرد بنایا ہے۔ جب تلوار مارنے کے وقت تھے۔ تو کچھ نہ کر سکے۔ اب میدان صاف ہے تو نوجوان بادشاہ کو پھسلا کر چاہتے ہیں۔ کہ بڈھے خانہ زاد کی محنتیں برباد کریں۔ سو وہ بھی ایک بڑھیا کے بھروسے پر۔ وہ نہ ہو تو اتنا بھی نہیں۔ ادھر بڈھے سید یعنی خان اعظم نے بھی فوجوں کی تقسیم کر کے صفیں باندھیں۔ قرآن سامنے لا کر سب سے عہد و پیمان لئے۔ بادشاہی عنایتوں کا امیدوار کیا۔ سو اتنی ہی اس بیچارے کی کرامات تھی ❊

جب وقت سامنا ہوا تو بیرم خانی فوج نہایت جوش و خروش سے لیکن بالکل بے باکی اور بے پروائی سے آگے بڑھی کہ آؤ۔ دیکھیں تو سہی تم ہو کیا چیز۔ جب قریب پہنچے تو یکدلی نے ان کی جانوں کو ٹھوکر مار اس طرح فوج بادشاہی پر دے مارا گویا بیرم کے گوشت کا ایک مچا تھا کہ اچھل کر جنت کی تلواروں میں جا پڑا۔ جو مرنے تھے مرے۔ جو بچے۔ آپس ہی ہنستے کھیلتے اور دشمنوں کو جلاتے جھلکاتے پھرے ❊

کیا تڑپتا دل مضطر کا عجب لگتا ہے	کہ جب اچھلے ہے ترے سینہ سے جا لگتا ہے

بارے۔ ان کے دلوں میں ارمان ہوگا کہ اس وقت نوجوان بادشاہ آئے۔ اور باتیں بنانے والوں کی بگڑی حالت دیکھے ع ببایں کہ از کہ شکستی و با کہ پیوستی۔ خان اعظم ہٹے۔ مگر اپنے رفیقوں سمیت کنارہ ہو کر ایک ٹیلہ کی آڑ میں تھم گئے ❊

پرانے فتحیاب نے جب میدان کا نقشہ حسب مراد دیکھا تو ہنس کر اپنی فوج کو جنبش دی۔ ہاتھیوں کی صف کو آگے بڑھایا جن کے بیچ میں فتح کا نشان۔ اس کا تخت رواں ہاتھی تھا۔ اور اس پر وہ آپ سوار تھا۔ یہ فوج سیلاب کی طرح اتکہ خان پر چلی۔ یہاں تک تمام مورخ بیرم خاں کے ساتھ ہیں۔ آگے ان میں پھوٹ پڑتی ہے۔ اکبری اور جہانگیری عہد کے مصنف کوئی مردانہ کوئی زنانہ ہو کر کہتے ہیں کہ اخیر میں بیرم خاں نے شکست کھائی۔ خافی خاں کہتے ہیں کہ ان مصنفوں نے رعایت سے بات کو چھپایا ہے ورنہ شکست اتکہ خان پر پڑی۔ اور بادشاہی لشکر پریشان ہو گیا۔ بادشاہ خود بھی لودیانہ سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اب خواہ شکست کے سبب سے خواہ اس لحاظ سے کہ ولی نعمت کے سامنے کھڑے ہو کر اسے لڑنا منظور نہ تھا۔ بیرم خاں اپنے لشکر کو لیکر لکھی جنگل کی طرف پیچھے ہٹا ❊

منعم خاں کابل سے بلائے ہوئے آئے تھے۔ لودیانہ کی منزل پر آداب بجالائے۔ کئی سردار ساتھ تھے۔ ان میں تردی بیگ کا بھانجا مقیم بیگ بھی موجود تھا۔ اس کی ملازمت ہوئی۔ دیکھو! لوگ کیسے

کیسے مصالح کہاں کہاں سے سمیٹ کر لاتے ہیں۔ ملا صاحب فرماتے ہیں منعم خاں کو خانخاناں کا خطاب اور وکیل مطلق کا عہدہ ملا۔ دخل الولی وخرج الولی کا نکتہ کھل گیا۔ اکثر اُمرا کو اپنی اپنی حیثیت بموجب منصب اور انعام دئے۔ اسی منزل میں قیدی اور زخمی ملاحظہ سے گذرے۔ جو لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے۔ نامی سرداروں میں ولی بیگ ذوالقدر خانخاناں کا بہنوئی حسین قلی خاں کا باپ تھا۔ کرگنوں کے کھیت میں زخمی پڑا پایا تھا۔ یہ بھی ترکمان تھا۔ اسمعیل قلی خاں حسین قلی خاں کا بڑا بھائی تھا۔ حسین خاں ٹکریہ کی آنکھ پر زخم آیا تھا کہ اس کے جمال شجاعت پر چشم زخم ہوا تھا۔ ولی بیگ بہت زخمی تھا چنانچہ زنداں میں زندگانی کی قید سے چھُٹ گیا۔ اس کا سر کاٹ کر ممالک مشرقی میں بھیجا کہ شہر بشہر تشہیر ہو ✦

مشہور یہ تھا کہ ولی بیگ ذوالقدر خانخاناں کو زیادہ تر برہم کرتا ہے۔ پورب میں خانزماں اور بہادر خاں تھے کہ بیرم خانی ذیلدار کہلاتے تھے۔ اور اس کا سر بھیجنے سے حریفوں کا یہی مطلب ہوگا کہ دیکھو تمہارے حمایتیوں کا یہ حال ہے۔ لے جانے والا بھی چوبدار چھوٹی امت کا آدمی تھا۔ او. حریفوں کا آدمی تھا کہ دربار کے فتحیاب تھے۔ خدا جانے اس نے کیا کہا ہوگا اور کس طرح پیش آیا ہوگا بہادر خاں کو برداشت کہاں۔ رنج نے اس کی آتش غضب کو بھڑکایا اور اس نے چوبدار کو مروا ڈالا۔ یہ گستاخی اس کے حق میں بہت خرابی پیدا کرتی مگر اس کے مصاحبوں اور دوستوں نے اسے پاگل بنا دیا۔ چند روز ایک مکان میں بند رکھا اور حکیم علاج کرتے رہے۔ اور جھوٹ شہرت انہوں نے بھی نہیں دی۔ یار پرستی اور وفاداری بھی تو ایک مرض ہے۔ اہل دربار نے بھی اس فتنہ پر پردہ ہی رکھنا مصلحت سمجھا اور ٹال گئے کیونکہ وہ دونوں بھائی میدان جنگ میں طوفان آتش تھے۔ چند سال بعد ان سے بھی کسر نکالی ✦

اتکہ خاں بھی دربار میں پہنچے۔ اکبر نے خلعت وانعام سے اُمرا کے دل بڑھائے لشکر کو ماچھی واڑہ پر چھوڑا اور آپ لاہور پہنچے۔ کہ دار السلطنت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ واقعہ طلب لوگ اٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں خاص وعام کو اقبال کی تصویر دکھا کر تشفی دی۔ اور پھر لشکر میں پہنچے۔ دامن کوہ میں بیاس کے کنارہ پر تلواڑہ اُن دنوں مضبوط مقام تھا۔ اور راجہ گنیش وہاں راج کرتا تھا۔ خانخاناں پیچھے ہٹ کر وہاں آیا۔ راجہ نے بہت خاطر کی اور سب سامانوں کا ذمہ لیا۔ اُسی کے میدان میں لڑائی جاری ہوئی پرانا سپہ سالار تجویز وتدبیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ چاہتا تو چٹیل میدان میں سے لشکر اگا دیتا۔ پہاڑ کو اسی لئے پشت پر رکھا تھا کہ مقابلہ پر بادشاہ کا نام ہے۔ اگر پیچھے ہٹنا پڑے تو پھیلنے کو بڑے بڑے ٹھکانے

تھے۔ غرض لڑائی برابر جاری تھی۔ اس کی فوج مورچوں سے نکلتی تھی اور لشکر بادشاہی سے لڑتی تھی۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ ایک موقع پر لڑائی ہو رہی تھی۔ اکبری لشکر میں سے سلطان حسین جلائر کہ نہایت سجیلا جوان اور دلاوز اور دیدارو امیرزادہ تھا۔ میدان میں زخمی ہو کر گرا۔ بیرم خانی جوان اس کا سر کاٹ کر مبارکباد کہتے لائے۔ اور خانخاناں کے سامنے ڈالدیا۔ دیکھکر افسوس کیا۔ رومال آنکھوں پر رکھکر رونے لگا اور کہا۔ سو لعنت ہے اس زندگی پر۔ میری شامت نفس سے ایسے ایسے جوان ضائع ہوتے ہیں! باوجودیکہ پہاڑ کے راجہ اور رانا برابر چلے آتے تھے۔ فوج اور ہر طرح کے سامان سے مدد دیتے تھے۔ اور آیندہ کے لئے وعدے کرتے تھے مگر اس نیک نیت نے ایک کی نہ سنی انجام کا خیال کر کے آخرت کا رستہ صاف کر لیا۔ اسی وقت جمال خاں اپنے غلام کو حضور میں بھیجا۔ کہ اجازت ہو فدوی حاضر ہوا چاہتا ہے۔ ادھر سے مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری فوراً چند سرداروں کو لیکر روانہ ہوئے کہ دلجوئی کریں اور لے آئیں۔ ابھی لڑائی جاری تھی۔ وکیل دونوں طرف سے آتے اور جاتے تھے۔ خدا جانے تکرار کس بات پر تھی۔ منعم خاں سے نہ رہا گیا۔ چند امرا و مقربان بارگاہ کے ساتھ بے تحاشا خانخاناں کے پاس چلا گیا۔ کہن سال سردار تھے۔ کہنہ عمل سپاہی تھے قدیمی ملاقاتیں تھیں۔ مدتوں ایک جگہ رنج و راحت کے شریک رہے تھے۔ دیر تک دل کے درد کہتے رہے۔ ایک نے دوسرے کی بات کی داد دی۔ منعم خاں کی باتوں سے اسے یقین آیا کہ جو کچھ پیام آئے ہیں۔ واقعی ہیں۔ فقط سخن سازی نہیں ہے۔ غرض خانخاناں چلنے کو تیار ہوا۔ جب وہ کھڑا ہوا بابا زنبور اور شاہ قلی محرم دامن پکڑ کر رونے لگے۔ کہ ایسا نہو جان جائے۔ یا عزت پر حرف آئے۔ منعم خاں نے کہا اگر زیادہ ڈر ہے تو ہمیں یرغمال میں یہاں رہنے دو۔ خیر یہ پرانی محبت کی شوخیاں تھیں۔ ان لوگوں سے کہا کہ تم نہ چلو۔ انہیں جانے دو اگر انہوں نے اعزاز و اکرام پایا تو تم بھی چلے آنا ورنہ نہ آنا۔ اس بات کو انہوں نے مانا اور وہیں رہ گئے۔ اور رفیقوں نے بھی روکا۔ پہاڑ کے راجہ اور رانا مرنے مارنے کے عہد و پیماں باندھے موجود تھے۔ وہ بھی کہتے رہے اور امداد فوج اور سامان جنگ کی تیاریاں دکھاتے رہے۔ مگر وہ نیکی کا پتلا اپنے نیک ارادہ سے نہ ٹلا۔ اور سوار ہو کر چلا۔ جو فوج اس کے مقابلے پر دامن کوہ میں پڑی تھی۔ اس میں ہزاروں ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ امرائے شاہی جو یہاں سے گئے ہیں انہیں بیرم خاں نے پکڑ رکھا ہے۔ کوئی کہتا تھا ہرگز نہ آئیگا وقت ٹالتا ہے اور سامان بہم پہنچاتا ہے۔ پہاڑ کے راجہ مدد کو آئے ہیں۔ کوئی کہتا تھا پہاڑ کے رستے علی قلی خاں[1] شاہ قلی محرم[2]

---

[1] یاد کرو یہ وہی شاہ قلی محرم ہیں جو میدان جنگ سے ہیموں کا ہاتھی کر ہیمو سمیت پکڑ کر لے آئے تھے۔ خانخاناں نے اسے بچہ سا پالا تھا۔ محرم ترکوں میں ایک دربار کی عہدہ ہے ؎

آتے ہیں۔ کوئی کہتا تھا۔ صلح کا پیچ مارا ہے۔ رات کو شبخون ماریگا۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ جریدہ لشکر میں داخل ہو گیا۔ تمام فوج نے خوشی کا غل مچایا۔ اور نقاروں نے دور دور خبر پہنچائی۔ کچھ میل فاصلہ پر حاجی پور دامن کوہ میں بادشاہ کے خیمے تھے۔ سنتے ہی حکم دیا کہ تمام امرائے دربار استقبال کو جائیں۔ اور قدیمی عزت و احترام سے لائیں۔ ہر شخص جاتا تھا۔ سلام کرتا تھا پیچھے ہو لیتا تھا۔ وہ شاہ نشان سپہ سالار جس کی سواری کا غل نقارہ کی آواز کوسوں تک جاتی تھی۔ اس وقت چپ چاپ۔ سکوت کا عالم تھا۔ گھوڑا تک نہ ہنہناتا تھا۔ وہ آگے آگے خاموش چلا آتا تھا۔ اس کا گورا گورا چہرہ اس پر سفید ڈاڑھی۔ ایک نور کا پتلا تھا کہ گھوڑے پر دھرا تھا۔ چہرے پر مایوسی برستی تھی۔ اور نگاہوں سے ندامت ٹپکتی تھی۔ تمام انبوہ چپ چاپ پیچھے تھا۔ سناٹے کا سماں بندھا تھا۔ جب بادشاہی خیمہ کا کلس نظر آیا تو گھوڑے سے اتر پڑا۔ ترک جس طرح گنہگار کو بادشاہ کے حضور میں لاتے ہیں۔ اُس نے آپ بکتر سے تلوار کھول کر گلے میں ڈالی۔ پٹکے سے اپنے ہاتھ باندھے۔ عمامہ سر سے اُتار کر گلے میں لپیٹا۔ اور آگے بڑھا خیمہ کے پاس پہنچا۔ تو خبر سُنکر اکبر بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ لب فرش تک آیا۔ خانخاناں نے دوڑ کر سر پاؤں پر رکھ دیا۔ اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ بادشاہ بھی اس کی گودوں میں کھیل کر پلا تھا۔ آنسو نکل پڑے۔ اٹھا کر گلے سے لگایا اور اس کی قدیمی جگہ یعنی دست راست پر پہلو میں بٹھایا۔ آپ اس کے ہاتھ کھولے۔ دستار سر پر رکھی۔ خانخاناں نے کہا۔ آرزو تھی کہ حضور کی نمک حلالی میں جان کو قربان کروں۔ اور شمشیر بند بھائی جنازہ کا ساتھ دیں۔ حیف کہ تمام عمر کی جانفشانی اور جاں نثاری خاک میں مل گئی۔ اور خدا جانے ابھی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہی شکر ہے۔ کہ اخیر وقت میں حضور کے قدم دیکھنے نصیب ہو گئے۔ یہ سن کر دشمنوں کے پتھر دل بھی پانی ہو گئے۔ دیر تک تمام دربار مرقع تصویر کی طرح خاموش رہا۔ کوئی دم نہ مار سکتا تھا ❖

ایک ساعت کے بعد اکبر نے کہا۔ کہ خان بابا اب صورتیں تین ہیں۔ جس میں تمہاری خوشی ہو۔ کہدو (۱) حکومت کو جی چاہتا ہے تو چندیری و کالپی کا ضلع لے لو۔ وہاں جاؤ اور بادشاہی کرو (۲) مصاحبت پسند ہے۔ تو میرے پاس رہو۔ جو عزت و توقیر تمہاری تھی اس میں فرق نہ آئیگا۔ (۳) حج کا ارادہ ہو تو بسم اللہ۔ روانگی کا سامان خاطر خواہ ہو جائیگا۔ چندیری تمہاری ہو چکی۔ محاصل تمہارے گماشتے جہاں کہو گے پہنچا دیا کریں گے۔ خانخاناں نے عرض کی کہ قواعد اخلاص و اعتقاد میں اب تک کسی طرح کا قصور اور فتور نہیں آیا۔ یہ سارا تردد فقط اس لئے تھا۔ کہ حضور میں پہنچ کر رنج و ملال کی

بنیاد کو آپ دھوؤں۔ الحمد للہ جو آرزو تھی پوری ہو گئی۔ اب عمر آخر ہوئی۔ کوئی ہوس باقی نہیں تمنا ہے تو یہی ہے کہ آستانۂ الٰہی پر جا پڑوں۔ اور حضور کی عمر و دولت کی دعا کیا کروں۔ اور یہ معاملہ جو پیش آیا۔ اس سے بھی مطلب فقط یہ تھا کہ فتنہ انگیزوں نے جو اوپر سے اوپر مجھے باغی بنا دیا تھا۔ اس شبہ کو خود حضور میں پہنچ کر رفع کر دوں۔ غرض حج کی بات قائم ہو گئی۔ حضور نے خلعت خاص اور خاصہ کا گھوڑا عنایت کیا۔ منعم خاں دربار سے اپنے خیمے میں لے گیا۔ خیمے ڈیرے اسباب خزانے سے لیکر باورچی خانہ تک جو تھا سب حوالہ کر کے آپ نکل آیا۔ بادشاہ نے پانچہزار روپیہ نقد اور بہت کچھ اسباب دیا۔ ماہم اور ماہم والوں کے سوا کوئی شخص نہ تھا۔ جس کے دل میں اس کی محبت نہ ہو۔ اپنے اپنے منصب کے بموجب نقد و جنس جمع کیا۔ کہ ترکوں کی رسم تھی۔ اور اسے چندوغ کہتے ہیں چنانچہ ناگور کے رستہ گجرات دکن کو روانہ ہوا۔ حاجی محمد خاں سیستانی ۳ ہزاری امیر کہ اُنکا مصاحب اور قدیمی رفیق تھا۔ بادشاہ نے اسے فوج دیکر رستہ کی حفاظت کے لئے ساتھ کیا۔

رستہ میں ایک دن کسی بن میں سے گذر ہوا۔ پگڑی کا کنارہ کسی ٹہنی میں اس طرح اُلجھا کہ پگڑی گر پڑی۔ لوگ اسے بُرا شگون سمجھتے ہیں۔ اس کے چہرے پر بھی ملال معلوم ہوا۔ حاجی محمد خاں سیستانی نے خواجہ حافظ کا شعر پڑھا۔

در بیاباں چوں بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم	سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

یہ سنکر وہ ملال خوشی کا خیال ہو گیا۔ پٹن گجرات میں پہنچا۔ یہیں سے گجرات کی سرحد شروع ہوتی ہے عہد قدیم میں اسے نہروالہ کہتے تھے۔ موسیٰ خاں فولادی وہاں کا حاکم۔ اور حاجی خاں الوری بڑی تعظیم سے پیش آیا۔ اور دھوم سے ضیافتیں کیں۔ اس سفر میں کچھ کام تو تھا نہیں۔ کیونکہ کاروبار کی عمر تمام ہو لی تھی۔ اس لئے جہاں خانخاناں جاتا تھا۔ دریا۔ باغ۔ عمارت کی سیر کر کے دل بہلاتا تھا۔

سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی۔ اس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی۔ وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی۔ وہ خانخانان کے بیٹے مرزا عبد الرحیم کو بہت چاہتی تھی۔ اور وہ لڑکا بھی اس سے بہت ہلا ہوا تھا اور خانخانان اپنے فرزند یعنی مرزا عبد الرحیم سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا اور مبارک خاں لوحانی (اور ماش) ایک دن شام کے وقت سہس لنگ[1] وہاں کے تلاؤ میں نواڑے پر بیٹھا پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے وقت کشتی سے نماز کے لئے اُترا

---

[1] وہاں کی مشہور سیرگاہ تھی۔ سہس ہندی میں ہزار کو کہتے ہیں اور لنگ گھر۔ اس تالاب کے گرد ہزار مندر تھے۔ شام جب اس کے گنبدوں پر دھوپ ہوتی تھی تو ان کی روشنی۔ اور کلسوں کی چمک کا پانی میں عکس۔ اور کناروں کا سبزہ عجب بہار دیتا تھا۔ اور جب چراغ جلے۔ ان میں روشنی ہوتی تھی۔ اس کے عکس جو پانی میں پڑتے تھے تو سارا تلاؤ جگمگ جگمگ کرتا تھا۔

مبارک خاں لوہانی ... تیس چالیس افغانوں کو لیکر سامنے آیا۔ ظاہر یہ کیا کہ ہم ملاقات کو آئے ہیں۔ بیرم خاں نے مروت و اخلاص سے پاس بُلالیا۔ اس نامبارک نے مصافحہ کے بہانے پاس آکر پشت پر ایک خنجر مارا کہ سینہ کے پار نکل آیا۔ ایک اور ظالم نے سر پر تلوار ماری۔ کہ کام تمام ہوگیا اس وقت کلمۂ اللہ اکبر زبان سے نکلا۔ غرض جس شربت شہادت کی وہ خدا سے التجا مانگتا تھا اور دعائے سحری میں التجا کیا کرتا تھا۔ اور مردان خدا سے تمنا کیا کرتا تھا۔ خدا نے اسے نصیب کیا۔ لوگوں نے نامبارک سے پوچھا کہ کیا سبب تھا جو یہ غضب کیا کہا کہ ماچھی واڑہ کی لڑائی میں ہمارا باپ مارا گیا تھا۔ ہم نے اسکا بدلہ لیا۔[1] نوکر چاکر یہ حال دیکھکر تتر بتر ہوگئے۔ اللہ اللہ کبھی وہ دولت وصولت اور کجا یہ حالت کہ اسکی لاش سے خون پڑا بہتا تھا اور کوئی نہ تھا کہ آکر خبر بھی لے۔ اس بیکس کے کپڑے تک اُتار لیئے گئے۔ آب رحمت ہو ہوا پر کہ خاک کی چادر اُڑھاکر پردہ کیا۔ آخر وہیں کے فقرا و مساکین نے شیخ حسام الدین کے مقبرہ میں کہ مشایخ کبار میں مشہور تھے۔ اور سلطان الاولیا کے خلفا میں تھے۔ دفن کر دیا۔ قاسم ارسلاں نے تاریخ کہی۔ ماثر میں لکھا ہے کہ ایک رات اسے خواب میں یہ تاریخ معلوم ہوئی تھی ؎

بیرم بہ طواف کعبہ چوں بست احرام	در راہ شد از شہادتش کار تمام
در واقعہ ہاتفے پئے تاریخش	گفتہ کہ شہید شد محمد بیرام

لاش دلی میں لاکر دفن کی۔ حسین قلی خاں خان جہاں نے ۹۸۵ھ میں مشہد مقدس میں پہنچائی۔

لاوارث قافلہ پر جو مصیبت گذری۔ عبدالرحیم خانخاناں کے حال میں پڑھو۔

عبرت۔ خدا کی شان دیکھو! جن جن لوگوں نے اس کی برائی میں اپنی بھلائی سمجھی تھی۔ ایک برس کے پس و پیش میں دنیا سے گئے۔ اور ناکام و بدنام ہوگئے۔ سب سے پہلے میر شمس الدین محمد خان اتکہ۔ اور گھنٹہ بھر نہ گذرا کادہم خاں۔ ۴۰ دن نہ ہوئے تھے کہ ماہم۔ دوسرے ہی برس پیر محمد خاں۔

خرابی خانخاناں کا اصلی سبب۔ اس مہم کا سبب خواہ بیرم خاں کی سینہ زوری کہو۔ خواہ یہ کہو کہ اس کے زبردست اختیارات اور احکام کی امرا کو برداشت نہ ہوئی۔ خواہ یہ سمجھو کہ اکبر کی طبیعت میں خود حکمرانی کا جوش پیدا ہوگیا تھا۔ ان باتوں میں سے کوئی بھی ہو۔ خواہ سب کی سب ہوں۔ حق پوچھو تو سب کے دلوں میں فتنہ لگانے والی وہی مردانی عورت تھی۔ جو مردوں کو چالاکی اور مردانگی کا سبق پڑھاتی تھی یعنی ماہم اتکہ۔ وہ اور اس کا بیٹا یہ چاہتے تھے۔ کہ سارے دربار کو نگل جائیں میر شمس الدین محمد خاں اتکہ جس کے نام پر مہم مذکور کی فتح لکھی گئی۔ انہوں نے جب خاتمہ مہم کے بعد دیکھا کہ ساری محنت برباد گئی۔ اور ماہم والے سلطنت کے مالک بن گئے۔ تو اکبر کو ایک عرضی لکھی۔ باوجودیکہ اپنی شرافت اور متانت

[1] دیکھو صفحہ ۵۶۰۔ [2] دیکھو صفحہ ۹۱۔ دودھ پلانے والی کو اتکہ کہتے تھے ۱۲

کے جوہر کی ہر حرف میں رعایت رکھی ہے۔ پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے داغ داغ ہو رہے ہیں۔ عرضی مذکور اکبرنامہ میں درج ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ ان کے حال میں لکھا ہے۔ اس سے بہت سی رمزیں ہم مذکور۔ اور ماہم کی کینہ وری کی عیاں ہونگی دیکھو[1] اس کا حال ॰

بیرم خاں کا مذہب (ملا صاحب فرماتے ہیں) اس کا دل پُر گداز تھا۔ اکابر اور مشایخ کے کلام پر بہت اعتقاد رکھتا تھا۔ ذرا سی معرفت کے نکتہ پر آنسو بھر لاتا تھا۔ صحبت میں ہمیشہ قال اللہ و قال الرسول کا ذکر تھا۔ اور خود باخبر انسان تھا ॰

حکایت۔ سیکری میں کسی فقیر گوشہ نشین سے ملنے گیا۔ اہل جلسہ میں سے ایک شخص نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کے کیا معنی ہیں۔ انہوں نے تفسیر نہ پڑھی تھی چپکے بیٹھے رہے۔ خانخاناں نے کہا تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ بِالْقَنَاعَةِ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِالسُّؤَالِ۔ لیکن عقیدہ تفصیل کی طرف مایل تھا۔ حافظ محمد امین جو خاص بادشاہی اور خاندانی خطیب تھے اُن سے کہا کرتا تھا کہ جناب علی مرتضٰے کے القاب میں چند کلمے اور اصحابوں سے زیادہ پڑھا کرو ॰

تباہی سے پہلے ایک علم اور پرچم مرصع مشہد مقدس میں چڑھانے کو تیار کیا تھا۔ اس پر کروڑ روپیہ لاگت آئی تھی اور قاسم ارسلان نے علم امام ہشتم اس کی تاریخ کہی تھی۔ پرچم پر مولوی جامی کی یہ غزل بھی لکھی تھی ॰

سلام علیٰ آل طٰہٰ و یٰس	سلام علیٰ آل خیر النبیین
سلام علیٰ روضۃ حل فیہا	امام یباھی بہ الملک والدین
امام بحق شاہِ مطلق کہ آمد	حریم درش قبلہ گاہ سلاطین
شہ کاخ عرفان گل باغ احسان	دُرِ درج امکان مہِ برج تمکین
علی ابن موسےٰ رضا کز خدایش	رضا شد لقب چوں رضا بودش آئین

یہ علم بھی ضبطی میں گیا۔ اور خیر خواہان دولت نے خزانہ میں داخل کیا ॰

اخلاق۔ کل مورخ نئے اور پرانے بیرم کے حق میں سوا تعریف کے کچھ نہیں لکھتے۔ فاضل بداؤنی تو کسی سے نہیں چوکتے وہ بھی جہاں اس کا ذکر کرتے ہیں خوبی اور شگفتگی کے ساتھ لکھتے ہیں پھر بھی خالی تو نہ چھوڑنا چاہیئے تھا۔ جس سال میں اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے۔ وہاں کہتا ہے۔ اس سال میں خان خاناں نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل دست بُرد تر کانہ میں اُڑا کر اپنے نام سے مشہور کی۔ صلہ میں ۶۰ ہزار روپیہ نقد دیکر پوچھا۔ آرزو پوری ہوئی۔ اس نے کہا پوری تو جب ہو کہ پوری ہو لینی آرزو

[1] دیکھو صفحہ ۱۶۵

جب پوری ہو کر لاکھ روپے کی رقم پوری ہو) یہ لطیفہ بہت پسند آیا۔ ۴۰ ہزار بڑھا کر پورے لاکھ کر دیئے
خدا جانے کیا ساعت تھی۔ چند ہی روز میں غزل کا مضمون اور ادبار کا اثر ظاہر ہو گیا **غزل**

من کیستم عنان دل از دست دادۂ	وز دست دل براہ غم از پا فتادۂ
دیوانہ وار در کمر کوہ گشتۂ	بے اختیار سر بگریباں نہادۂ
گاہے چو شمع ز آتش دل در گرفتہ	گر چوں فتیلہ با دل آتش فتادۂ
بیرم ز فکر اندک و بسیار فارغیم	ہرگز نہ گفتہ ایم کے یا زیادہ

آزاد۔ دیکھو ملا صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا وہاں سے سخاوت کا چشمہ نکلا۔ یہ ہی نیت کا پھل ہے؟

(نمبر ۲۔ سخاوت) رام داس لکھنوی سلیم شاہی زمانہ کا گویا تھا کہ موسیقی میں دوسرا تان سین کہلاتا تھا وہ اس کے دربار میں آیا اور گایا۔ خزانہ میں اس وقت کچھ نہ تھا۔ اس پر لاکھ روپیہ دیا۔ اس کا گانا بہت پسند تھا۔ چنانچہ خلوۃ اور جلوۃ میں محرم اور ہمدم تھا۔ جب وہ گاتا تھا تو خان خاناں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ ایک جلسہ میں نقد جنس جو اسباب موجود تھا سب دیدیا اور آپ الگ اُٹھ گیا ◆

(نمبر ۳۔ سخاوت) جبار خاں ایک سردار افغان امیروں میں سے باقی تھا۔ علم طوغ اور نقارہ سے اس کی سواری چلتی تھی۔ (ملا صاحب کیا مزہ سے لکھتے ہیں) اخیر عمر میں سپاہگری چھوڑ کر تھوڑی سی مدد معاش پر بیٹھ رہا تھا کہ زہد اور عبادت کی برکت سے قناعت کی دولت پائی تھی۔ اس نے قصیدہ کہہ کر سنایا۔ خان خاناں نے لاکھ روپیہ دیکر کل سرکار سرہند کا امین کر دیا ◆

چوں مہرۂ نگیں سما شد بزیر آب	پرگار خاتمش بزمیں داد لعل ناب

خواجہ کلاں بیگ کا لطیفہ ٹھیک ہوا کہ سخن فہمی عالم بالا ہم معلوم شد۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اسکی ہمت عالی کی نظر میں لک بھی لگ (خس۔ تنکا) تھا۔ نہ یہ گھاس پھوس کہ پانی پر سوار نظر آتے ہیں ◆

(نمبر ۴۔ اور ایک لطیفہ) میر علاء الدولہ اپنے تذکرہ میں فہمی قزوینی کے حال میں لکھتے ہیں کہ خاندان وزارت سے تھا۔ لیکن بے قید اور تکلفات سے آزاد رہتا تھا۔ رنگ سُرخ اور آنکھیں کیری تھیں۔ ایک جلسہ میں بیرم خاں نے اُسے دیکھ کر کہا۔ مرزا۔ خرمہرہ چرا بر روئے دوختہ۔ مرزا نے کہا برائے چشم زخم۔ خان خاناں بہت خوش ہوئے۔ ہزار روپے۔ خلعت۔ گھوڑا اور ایک لاکھ کی جاگیر عنایت کی۔ فہمی اکبر کی تعریف میں اکثر قصاید کہا کرتا تھا۔ ایک قصیدہ کے دو شعر تذکرۂ مذکور سے مجھے پہنچے ؎

منم ہمیشہ ثنا خواں کہ بادشاہ سلامت	دعا ہمے کنم از جاں کہ بادشاہ سلامت

بریں کتابۂ نیلی رواق کاتب قدرت	خطے نوشتہ زافشاں کہ بادشاہ سلامت

(نمبر ۵- سخاوت) ۳۰۰ ہزار شریف شمشیرزن اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتا تھا- اور ۲۵- امیر بالیاقت صاحب تدبیر اس کے ملازم تھے کہ برکت خدمت سے پنج ہزاری منصب اور صاحب طبل و علم ہوئے- دیکھو ماثر ؁

غیرت مردانہ- جب میدان جنگ کے لئے ہتھیار سجنے لگتا تو دستار کا سرا ہاتھ میں اُٹھاتا اور کہتا- الٰہی یا فتح یا شہادت- بدھ کے دن معمول تھا کہ ہمیشہ شہادت کی نیت سے حجامت اور غسل کیا کرتا تھا- مآثر الامرا ؁

علو حوصلہ- اس آفتاب کا اقبال عین اوج پر تھا- دربار لگا ہوا تھا- ایک سید سادہ لوح کسی بات پر خوش ہوئے- کھڑے ہو کر کہا- نواب کی حصول شہادت کیلئے سب فاتحہ پڑھیں اور دُعا کریں سب اہل دربار سید صاحب کا مُنہ دیکھنے لگے- اس عالی حوصلہ نے مسکرا کر کہا جناب سید! بایں اضطراب غمخواری مکنید- شہادت عین تمنا است مگر نہ بایں زودی- دیکھو اقبال نامہ اور مآثر الامرا- انہی کتابوں میں ہے کہ ہمیشہ بدھ کے دن خط بنواتا تھا غسل کرتا تھا- اس نیت سے کہ میں شہادت کیلئے مستعد اور مہیا رہوں- ہمیشہ اس نعمت کیلئے دُعا کرتا رہتا تھا اور اہل اللہ سے دُعا چاہتا تھا ؁

نقل- ایک شب دربار خاص میں ہمایوں بادشاہ بیرم خاں سے کچھ کہہ رہے تھے- رات زیادہ گئی تھی- نیند کے مارے بیرم خاں کی آنکھیں بند ہونے لگیں- بادشاہ کی بھی نگاہ پڑ گئی- فرمایا بیرم! من بشما میگویم- شما خواب میکنید- بیرم نے کہا- قربانت شوم از بزرگان شنیدہ ام کہ درسہ مقام حفاظت سہ چیز واجب است- درحضرت بادشاہان حفظ چشم- درخدمت درویشان نگہداری دل- درپیش علما پاسبانی زبان- در ذات حضور صفات سہ گانہ جمع مے بینم- فکرے کنم کدام کدام شاں را نگہدارم- اس جواب سے بادشاہ بہت خوش ہوئے (مآثر الامرا)

آزاد- اس برگزیدہ انسان کے کل حالات پڑھ کر صاحب نظر صاف کہدینگے کہ اس کا مذہب شیعہ ہوگا- لیکن اس کہنے سے کیا حاصل- ہمیں چاہیئے کہ اس کی چال ڈھال دیکھیں- اور گذرگاہ دُنیا میں آپ چلنا سیکھیں- اس عالی حوصلہ دریا دل نے دوست و دشمن کے انبوہ میں کس ملنساری اور سلامت روی سے اور بے تعصبی اور خوش اعتدالی سے گذارہ کیا ہوگا- وہ شاہانہ اختیار رکھتا تھا- کل سلطنت کے کاروبار اس کے ہاتھ میں تھے- اور شیعہ

سُنی جن کے شمار ہزاروں اور لاکھوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ سب کی غرضیں اور اُمیدیں اس کے دامن کھینچتی تھیں۔ باوجود اس کے کیسا دونوں فرقوں کو دونوں ہاتھوں پر برابر لئے گیا کہ مورخاں وقت میں کوئی اُس کے تشیع کا ثبوت تک نہ کر سکا۔ ملا صاحب جیسے نظر باز نے بہت تاڑا تو یہ کہا کہ تفضیل پر مائل تھا۔ اہل اسلام میں ایک فرقہ وہ ہے کہ خلافت میں حضرت علی کو چوتھے درجہ میں رکھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ فضائل واوصاف میں پہلے تینوں خلفا سے افضل تھے۔ جن سنت جماعت لوگوں کو اُس سے کام پڑتا اُن پر اس قدر اخلاق اور سخاوت مبذول کرتا تھا کہ امرائے اہل سنت نہ کرتے تھے۔ دیکھو مخدوم الملک کا حال ۔

تصنیف

ہر تذکرہ و تاریخ میں لکھتے ہیں کہ شعر کا نکتہ شناس تھا اور خود بھی خوب کہتا تھا ماثرالامرا[1] میں ہے کہ اُستادوں کے شعروں میں ایسی اصلاحیں کیں کہ اہل سخن نے انہیں تسلیم کیا۔ ان سب کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اور اس کا نام دخلیہ رکھا تھا۔ فارسی اور ترکی زبان میں تمام کمال دیوان لکھے اور قصاید بلیغ نظم کئے۔ ملا صاحب اکبر کے زمانہ میں لکھتے ہیں کہ آج کل اس کے دیوان زبانوں اور ہاتھوں پر رواں ہیں۔ محوی شاعر کے حال میں لکھا ہے۔ کہ اس کی یہ رباعی بیرم خاں کے دیوان میں لوح دیباچہ پر درج ہے ؎

از کون و مکاں نخست آثار نبود	کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود
آمد چو ہمیں دو حرف مفتاح وجود	شد مطلع دیباچہ دیوان شہود

افسوس کا دن آج ہے۔ جس میں اس کی ایک غزل بھی پوری نہیں ملتی۔ تاریخوں اور تذکروں میں متفرق اشعار ہیں۔ ہفت اقلیم ملا امین رازی میں ایک قصیدے کے بھی بہت سے شعر لکھے ہیں۔ جس کا مطلع ہے ؎

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسراو	اگر غلام علی نیست خاک بر سراو

[1] صفحہ ۳۱۳

امیرالامرا خان زماں علی قلی خاں شیبانی

علی قلی خاں اور اس کے بھائی بہادر خاں[1] نے خاک سیستان سے اُٹھ کر رستم کا نام روشن کر دیا ملا صاحب سچ کہتے ہیں جس بہادری اور بے جگری سے اُنہوں نے تلواریں ماریں۔ لکھتے ہوئے قلم کا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ یہ شاہ نشان سپہ سالار دولت اکبری میں بڑے بڑے کارنامے دکھاتے اور خدا جانے ملک کو کہاں سے کہاں پہنچاتے۔ حاسدوں کی نا اتفاقی اور کینہ وری ان کی جانفشانیوں اور جانبازیوں کو دیکھ نہ سکی۔ آزاد میں اس معاملے میں انہیں اعتراض سے پاک نہیں رکھ سکتا۔ وہ آخر دربار میں سب کو جانتے تھے۔ اور سب کچھ جانتے تھے۔ خصوصاً بیرم خاں کی بربادی اور جانفشانی دیکھ کر چاہیئے تھا کہ ہشیار ہو جاتے اور قدم قدم پر سوچ سمجھ کر پاؤں رکھتے۔ افسوس کہ پھر بھی نہ سمجھے اور وہ جانبازیاں جن سے دربار دلاوری میں رستم و اسفندیار کے برابر جگہ پاتے۔ سب اپنی بربادی میں خرچ کیں۔ یہاں تک کہ نمک حرامی کا داغ لیکر دنیا سے گئے ؂

حیدر سلطان ان کا باپ قوم کا ازبک تھا۔ اور شیبانی[2] خاں کے خاندان میں سے تھا۔ اُس[3] نے ایک اصفہانی عورت سے شادی کی تھی۔ شاہ طہماسپ نے جو فوج ہمایوں کے ساتھ کی اس میں بہت سے سردار با اعتبار تھے۔ اُنھی میں حیدر سلطان اور اس کے دونوں بیٹے بھی تھے۔ قندھار کے حملوں میں باپ بیٹے ہمت مردانہ کے جوہر دکھاتے رہے۔ ایران کا لشکر رخصت ہوا تو حیدر سلطان ہمایوں کے ساتھ رہا۔ بلکہ ایسی خصوصیت حاصل کی کہ ایرانی سپہ سالار اس کی معرفت حاضر ہو کر رخصت ہوا اور خطاداروں کی خطا اس کی سفارش سے معاف ہوئی ؂

اس کی خدمتوں نے ہمایوں کے دل میں ایسا گھر کیا تھا کہ اس وقت قندھار کے سوا کچھ پاس نہ تھا۔ پھر بھی شال کا علاقہ اس کی جاگیر میں دیا تھا۔ بادشاہ ابھی اسی طرف تھا کہ لشکر میں وبا پڑی اس میں حیدر سلطان نے قضا کی۔ چند روز بعد ہمایوں نے کابل کی طرف علم کا پرچم کھولا۔ شہر آدھ کوس رہا تو مقام کیا۔ اُمرا کی تقسیم اور فوج کی ترتیب کی۔ دونوں بھائیوں کو خلعت دیکر سوگ سے نکالا اور بہت دلاسا دیا۔ علی قلی خاں اس وقت بکاول بیگی (کھانا کھلانے کا داروغہ تھا) جب کامران طالیقان پر

---

[1] بہادر خاں کے حالات کیلئے دیکھو صفحہ ۵۰۷ ؎

[2] وہی شیبانی خاں جس نے بابر کو ملک فرغانہ سے نکالا بلکہ تیمور کا نام ترکستان سے مٹایا ؂

[3] یہ قول فرشتہ و خافی خاں وغیرہ کا ہے مگر بعض مورخ کہتے ہیں کہ جام پر قزلباش اور ازبک میں سخت لڑائی ہوئی۔ اسیں حیدر سلطان قزلباشوں کی شمول سے سرفرد ہوا اور انہی میں سکونت اختیار کر کے ایک اصفہانی عورت سے شادی کر لی ؂

قلعہ بند ہو کر ہمایوں سے لڑ رہا تھا۔ روز جنگ کے میدان گرم ہوتے تھے۔ دونوں بھائی دلوں میں دلاوری کے جوش۔ اور فوجیں رکاب میں لئے تلواریں مارتے پھرتے تھے۔ اسمیں علی قلی خاں کے لباس نوجوانی کو زخموں سے گلرنگ کیا۔ ہندوستان پر ہمایوں نے فوج کشی کی۔ اس میں بھی دونوں بھائی شمشیر دودم کی طرح میدان میں چلتے تھے۔ اور دشمنوں کو کاٹتے تھے ٭

ہمایوں نے لاہور میں آکر دم لیا۔ ہر چند پشاور سے یہاں تک افغان ایک میدان بھی نہ لڑے مگر انکے مختلف سردار جا بجا جمعیتوں کے انبوہ لئے دیکھ رہے تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ خبر لگی کہ ایک سردار دیپالپور[1] پر فوج فراہم کر رہا ہے۔ بادشاہ نے چند امرا کو سپاہ و سامان دے کے روانہ کیا۔ اور شاہ ابو المعالی کو سپہ سالار کیا۔ وہاں مقابلہ ہوا اور افغانوں نے میدان جنگ میں حد سے بڑھ کر حوصلہ دکھایا۔ شاہ ملک حسن کے سپہ سالار تھے لیکن وہاں نگاہوں کی تلواریں تانکے خنجر نہیں چلتے۔ فوج کا میدان میں لڑانا اور خود شمشیر کا جوہر دکھانا اور بات ہے۔ جب میدان کارزار گرم ہوا تو ایک جگہ افغانوں نے شاہ کو گھیر لیا۔ سیستانی شیر اپنے رفیقوں کے ساتھ دھاڑتا اور للکارتا پہنچا۔ اور وہ ہاتھ مارے کہ میدان مار لیا بلکہ شہرت و ناموری کا نشان یہیں سے ہاتھ آیا۔ ستلج پار کی لڑائی میں جو خانخاناں کی فوج نے میدان مارا یہ سایہ کی طرح پیچھے پیچھے فوج لئے پہنچے ٭

لشکر بادشاہی میں ایک آوارہ گمنام۔ بے سروپا سپاہی قنبر نام تھا۔ اور اپنی سادہ مزاجی کے سبب سے **قنبر دیوانہ** مشہور تھا۔ لیکن کھانے کھلانے والا تھا۔ اس لئے جہاں کھڑا ہوتا تھا کچھ نہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ جب ہمایوں نے سرہند پر فتح پائی تو وہ لشکر سے جدا ہو کر لوٹتا مارتا چلا گیا۔ گاؤں اور قصبوں پر گرتا تھا۔ جو پاتا تھا لوٹتا تھا اور لوگوں کو دیتا تھا۔ خدائی لشکر ساتھ ہوتا جاتا تھا۔ قنبر دیوانہ تھا مگر اپنے کام کا ہوشیار تھا۔ کچھ کچھ قیمتی چیزیں ہاتھی گھوڑے جو ہاتھ آتے۔ عرائض بندگی کیساتھ حضور میں پہنچاتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سنبھل میں جا پہنچا۔ ایک نامی افغان بہادر سردار وہاں کا حاکم تھا اس نے مقابلہ کیا۔ تقدیر کی بات ہے کہ باوجود جمعیت و سامان کے بے جنگ ویران ہو گیا ٭

جب قنبر نے جمعیت امیرانہ بہم پہنچائی۔ تو دماغ میں خیالات شاہانہ سمائے کہ میں مالک ملک اور صاحب تاج ہو گیا۔ یہ **دیوانہ** عجب مزے کی باتیں کرتا تھا۔ اس کا دسترخوان وسیع تھا۔ اچھے کھانے پکواتا تھا۔ سب کو بٹھاتا اور کہتا "بخورید مال مال خدا۔ جان جان خدا۔ قنبر دیوانہ بکاول خدا۔ ہاں بخورید" اس کا دل دسترخوان سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ اس سخاوت نے

---

[1] دیپالپور لاہور سے جنوب مغرب کی جانب واقع ہے ٭

یہاں تک جوش خروش دکھایا کہ کئی دفعہ گھر کا گھر لٹا دیا۔ آپ باہر نکل کر کھڑا ہوا اور کہا مال خدائیست بان بندہائے خدا بیائید۔ بگیرید۔ بردارید۔ و نگزارید" انسان کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ ترقی کے وقت جب اونچا ہوتا ہے۔ تو خیالات اس سے بھی بہت اونچے ہو جاتے ہیں ؎

جتنے نشے ہیں یاں روش نشۂ شراب	ہو جاتے بدمزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ادب آداب بھول گیا۔ اور حقیقت میں یاد ہی کب کئے تھے جو بھولتا۔ ایک لشکری آدمی بلکہ صحرائی جانور تھا۔ بہرحال جو لوگ اس کی رکاب میں جانفشانیاں کرتے تھے۔ انہیں آپ ہی بادشاہی خطاب دینے لگا۔ آپ ہی علم و نقارے بخشنے لگا۔ انہی بھولی بھالی باتوں میں یہ بھی ضرور تھا کہ رعایا کیساتھ بعض بعض بے اعتدالیاں کرتا تھا۔ جب آدمی کا ستارہ بہت چمکتا ہے۔ تو اس پر نگاہ بھی زیادہ پڑنے لگتی ہے لوگوں نے حضور میں ایک ایک بات چن کر پہنچائی۔ بادشاہ نے **علی قلی خاں کو خاں زمان کا** خطاب دیکر روانہ کیا کہ سنبھل قنبر سے لے لو۔ بداؤں اس کے پاس رہے۔ اسے بھی خبر پہنچی اور ساتھ ہی علی قلی خاں کا وکیل پہنچا کہ فرمان آیا ہے۔ چل کر تعمیل کر۔ وہ کب خاطر میں لاتا تھا۔ جاہل سپاہی تھا سنبھل کو سنبھر کہتا تھا۔ دربار میں بیٹھتا اور کہتا۔ سنبھر۔ قنبر۔ سنبھر و علی قلی خاں چہ؟ مثل ہماں است کہ دہ کسے درختان کسے۔ علی قلی خاں کو کیا واسطہ۔ ملک میں نے مارا کہ تو نے؟ خان نے پہنچ کر بداؤں کے پاس لشکر ڈالا اور اُسے بلا بھیجا۔ قنبر کب آتے تھے یہ کہتے تھے کہ تو میرے پاس کیوں نہیں آتا۔ تو بادشاہی بندہ ہے تو میں بھی حضرت کا غلام ہوں۔ مجھے بادشاہ کیساتھ تجھ سے زیادہ قرب ہے اپنے سر کی طرف انگلی اُٹھاتا اور کہتا کہ یہ سر تاج شاہی سمیت پیدا ہوا ہے۔ خان نے فہمایش کے لئے اپنے معتبر بھیجے انہیں قید کر لیا۔ بھلا خان زماں اس پاگل کو کیا خاطر میں لاتا تھا۔ آگے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دیوانہ نے یہ بُرا کیا کہ ان دنوں میں رعایا کو زیادہ تر ناراض کرنے لگا۔ کسی کا مال لے لیا۔ کسی کے عیال لے لئے۔ لوگوں کی بے اعتباری کے سبب سے رات کو آپ مورچے مورچے پر قلعداری کا اہتمام کرتا پھرتا تھا۔

باوجود اس دیوانہ پن کے سیانا بھی ایسا تھا۔ کہ ایک دفعہ آدھی رات کو پھرتے پھرتے ایک بنئے کے گھر میں پہنچا جھک کر زمین سے کان لگائے۔ چند قدم آگے پیچھے بڑھ کر ہٹ کر پھر دیکھا پھر پہلی جگہ آکر بیلداروں کو آواز دی اور کہا کہ ہاں۔ آہٹ معلوم ہوتی ہے۔ یہیں کھودو۔ دیکھا تو وہیں نقب کا سر نکلا کہ علی قلی خاں باہر سے سرنگ لگا رہا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قلعہ خدا جانے کن وقتوں کا بنا ہوا تھا۔ باہر والوں نے جس طرف سے سرنگ لگائی۔ فصیل میں سال کے شہتیر

اور لوہے کی سلاخیں پائی تھیں۔ بنانے والے نے آثار بھی پانی تک پہنچا دیا تھا۔ خانزماں کو کسی حکمت عملی سے پتا لگ گیا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں سے اندر سُرنگ جا سکتی تھی ؀

بہرحال اگر قنبر تاڑ نہ جاتا تو اسی دن علی قلی خاں کی فوج سُرنگ کی راہ سر توڑ اندر چلی آتی۔ خان بھی یہ دیر کی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خیر شہر کے لوگ اس سے تنگ تھے۔ خان کے معتبر جو قلعے میں قید تھے۔ اُنہوں نے اندر اندر شہر کے لوگوں کو ملا لیا۔ جب رعایا پھر گئی۔ پھر کیا ٹھکانا! باہر والوں کو پیغام بھیجا کہ رات کو اس برج پر فلانے وقت اُس مورچے سے حملہ کرو۔ ہم کمندیں ڈال کر اور زینے لگا کر چڑھا لینگے۔ شیخ حبیب اللہ وہاں کے رؤسائے سرگروہ میں سے تھے اور شیخ سلیم چشتی کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ وہ خود اس معاملے میں شریک تھے۔ چنانچہ رات کے وقت شیخ زادہ کے برج کی طرف سے چڑھا ہی لیا اور ایک طرف آگ بھی لگا دی۔ شب اپنی سیاہ چادر تلے سوتی تھی اور دُنیا غافل پڑی تھی۔ قنبر سیاہ بخت نے وقت کو غنیمت سمجھا اور ایک کالا کمبل اوڑھ کر بھاگ گیا۔ مگر اسی دن علی قلی خاں کے شکاری خرگوش کی طرح جنگل سے پکڑ لائے۔ بامروت سپہ سالار نے ہرچند کہا کہ فرمان شاہی کی بے ادبی کی ہے۔ توبہ اور معذرت کر۔ دیوانہ کس کی سنتا تھا کہا کہ معذرت چہ معنی دارد۔ آخر جان کھوئی اور مدت تک اس کی قبر درگاہ بنکر شہر بداؤں کو روشن کرتی رہی۔ لوگ پھول چڑھاتے اور مُرادیں پاتے تھے۔ علی قلی خاں نے اس کا سر کاٹ کر عرضی کے ساتھ دربار میں بھیجدیا۔ رحمدل بادشاہ (ہمایوں) کو یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ناراضی کیساتھ فرمان لکھا کہ جب وہ اظہار بندگی کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ معذرت کو حضور میں حاضر ہو تو پھر یہاں تک کیوں نوبت پہنچائی۔ اور جب گرفتار ہو کر آیا تو قتل کیوں کیا ؀

انہیں دنوں میں ہمایوں کے ہمائے حیات نے پرواز کی۔ اقبال چتر نما اور اکبر کے سر پر قربان ہوا۔ ہیمو ڈھوسر افغانوں کے گھر کا نمک خوار ممالک مشرقی میں حق نمک ادا کرتے کرتے بہت قوت پکڑ گیا تھا۔ اور روز بروز زوروں پر چڑھتا جاتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ۱۳ برس کا شہزادہ بادشاہ ہندوستان ہوا ہے تو فوج لیکر چلا۔ بڑے بڑے امرائے افغان اور جنگ کے بے شمار سامان لئے طوفان کی طرح پنجاب پر آیا تغلق آباد پر تردی بیگ کو شکست دی۔ دلّی میں جس کا تخت بادشاہوں کی ہوس کا تاج ہے۔ جشن شاہانہ کیا۔ اور دلّی جیت کر بکرماجیت بن گیا ؀

شادی خاں ایک پُرانا افغان شیر شاہی پٹھانوں میں سے ادھر کے علاقے دبائے ہوئے تھا خان زماں اس سے لڑ رہا تھا۔ جب ہیموں کا غلغلہ اٹھا تو بہادر نے مناسب سمجھا کہ پُرانے

خاک تودہ پر تیراندازی کرنے سے بہتر ہے کہ نئے دشمن پر جاکر تلوار کے جوہر دکھاؤں۔ اِس لئے اُدھر کا مُعاملہ ملتوی کر کے دِلّی کا رُخ کیا۔ مگر لڑائی کے وقت تک میدان میں نہ پہنچ سکا میرٹھ میں تھا کہ سُنا۔ اُمرا بھاگے۔ یہ دِلّی سے اُوپر اُوپر جمنا پار ہوا اور کرنال سے ہوتا ہوا پنجاب ہی کی طرف چلا۔ دِلّی کے بھگوڑے سرہند میں جمع ہو رہے تھے۔ یہ بھی انہیں میں شامل ہوا۔ اکبر آئے سب کی ملازمت ہوئی۔ تردی بیگ باہر سے باہر ہی مر چکے تھے۔ اکبر نے عنایت و مرحمت بلکہ انعام واکرام سے شکستہ دلوں کی مرہم پٹی کی۔ یہ سب خانخاناں کی تدبیریں تھیں ٭

رستہ میں خبر پہنچی کہ ہیموں دلّی سے چلا۔ خان خاناں نے لشکر کے دو حصّے کئے۔ پہلے حصّے کے لئے چند جنگ آزمودہ امیروں کو انتخاب کیا۔ خانزماں کے سر پر امیرالامرائی کلگی تھی۔ اُس پر سپہ سالاری کا چتر لگایا۔ سکندر وغیرہ امرا کو ساتھ کیا۔ اپنی بھی فوج ساتھ کی اور اسے ہراول کر کے آگے رواں کیا۔ دوسری فوج کو اکبر کی رکاب میں لیا۔ اور شکوہ شاہانہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلا۔ پیش قدم سپہ سالار اگرچہ نوجوان تھا مگر فنونِ جنگ میں قدرتی لیاقت رکھتا تھا۔ میدان کا اندازہ دیکھنا تھا۔ فوج کا بڑھانا۔ لڑنا۔ موقع وقت کا سمجھنا۔ حریف کے حملہ کا سنبھالنا۔ عین موقع پر خود دھاوے سے نہ چوکنا وغیرہ وغیرہ۔ غرض ان مقدموں میں اُسے ایک استعداد خداداد تھی کہ جس انجام کو سوچ کر ہاتھ ڈالتا تھا۔ وہی شکار پکڑ لاتا تھا ادھر ہیموں کو اِس انتظام کی خبر پہنچی۔ خاطر میں نہ لایا۔ دلّی مار کر دل بہت بڑھ گیا تھا۔ ترکی کا جواب ترکی دیا۔ افغانوں کے دو عالیجاہ سردار انتخاب کئے کہ اُن دنوں میدانِ جنگ میں چلتی تلوار بنے ہوئے تھے۔ اُنہیں ۲۰ ہزار فوج دی اور توپخانہ کہ دریائے آتش کا دہانہ تھا ساتھ روانہ کیا کہ پانی پت پر جاکر ٹھیرو۔ ہم بھی آتے ہیں ٭

نوجوان سپہ سالار کے دل میں دلاوری کی اُمنگ بھری ہوئی کہ اُس بکرماجیت سے مقابلہ ہے جس کے سامنے سے پُرانا سپاہی اور نامور سپہ دار بھاگ نکلا۔ اور جوان بخت نوجوان تخت پر بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے اتنے میں سُنا کہ حریف کا توپخانہ پانی پت پر آگیا۔ چند سرداروں کو آگے بھیجا کہ جاکر چھینا جھپٹ کریں اُنہوں نے پہنچ کر لکھا کہ غنیم کا وزن بہت بھاری ہے سیستانی شیر خود جھپٹا اور اِس صدمے سے جاکر ٹکراکہ ٹھنڈے لوہے سے گرم لوہے کو دبالیا اور ہاتھوں ہاتھ توپخانہ چھین لیا۔ صدہا گھوڑے ہاتھی شیروں کے ہاتھ آئے ٭

ہیموں کو توپخانہ ہی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ جب یہ خبر سُنی تو ایسا جھنجھلا کر اُٹھا جیسے دال میں بگھار لگا اور سارا لشکر لیکر روانہ ہوا۔ ۳۰ ہزار جوشن پوش - ۱۵۰۰ سو ہاتھی جن میں پانسو جنگی فیل مست اُن کے چہروں کو

لہ باچیت کے گھاٹ اُترا ہوگا ٭

کالے پیلے رنگ پھیر کر ہیبت ناک بنایا تھا۔ اور سروں پر ڈراؤنے جانوروں کی کھالیں ڈالی تھیں لوہے کی پاکھریں پیٹ پر پڑی مشکوں پر ڈھالیں۔ گردچھریاں کٹاریں کھڑی۔ سونڈوں میں زنجیریں اور تلواریں ہلاتے۔ ہر ہاتھی پر ایک ایک سورما سپاہی۔ اور مفت مہاوت بٹھایا تھا کہ دیوزاد لڑائی کے وقت خاطر خواہ کام دیں۔ ادھر بادشاہی فوج میں کل ۱۰ ہزار کی جمعیت تھی جن میں ۵ ہزار جنگی دلاور تھے۔

سیستانی رستم نے جب حریف کی آمد آمد سنی تو جاسوس دوڑائے لیکن بادشاہ کے آنے یا لکھ بھیجنے کا کچھ خیال نہ کیا۔ فوج کو تیاری کا حکم سنایا اور اُمرا کو جمع کر کے مجلسِ مشورت آراستہ کی میدانِ جنگ کے پہلو تقسیم کیے۔ پہلے یہی خبر آئی تھی کہ ہیموں پیچھے آتا ہے۔ شادی خاں سپہ سالاری کرتا ہوا فوج کو لاتا ہے دفعتہً پرچہ لگا کہ ہیموں خود ہی ساتھ آیا ہے پانی پت ایک پڑاؤ آگے بڑھکر گھروندہ پر مورچے باندھے ہیں۔ خانزمان کا آگے بڑھنے کا ارادہ تھا۔ مگر تھم گیا۔ اور شہر سے ہٹ کر مقابلے پر لشکر جمایا۔ چاروں پہلو اُمرا پر تقسیم کر کے فوجوں کا قلعہ باندھا۔ بیچ میں آپ اقبال کا نشان علم کیا۔ ایک بڑا سا چتر تیار کیا اُسے اپنے سر پر لگایا۔ اور سپہ سالاری کی شان بڑھا کر قلب میں جا کھڑا ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی اور میدانِ کارزار گرم ہوا۔ طرفین کے بہادر بڑھ بڑھ کر تلواریں مارنے لگے۔ خانزمانی جاں نثار بے جگر ہو کر حملے کرتے تھے۔ اور تلوار کی آنچ پر اپنی جان کو دے مارتے تھے۔ مگر باوجود اسکے کامیاب نہ ہو سکتے۔ دھاوا کرتے تھے اور بکھر جاتے تھے کیونکہ کم تھے۔ لیکن سیستانی شیر کا جوش سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ کسی طرح باز نہ آتے تھے۔ لڑتے تھے مرتے تھے اور شیروں کی طرح پھر پھر کر جا پڑتے تھے۔

ہیموں ہوائی[1] ہاتھی پر سوار قلب لشکر کو سنبھالے کھڑا تھا۔ اور فوج کو لڑا رہا تھا۔ آخر میدان کا اندازہ دیکھکر اُس نے ہاتھی ہول دئے۔ کالے پہاڑوں نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور کالی گھٹا کی طرح آئے اکبری نمکخوار خاطر میں نہ لائے۔ بھاگے مگر ہوش و حواس سے کالے پانی کے سیلاب کو رستہ دیا۔ اور لڑتے بھڑتے ہٹتے چلے گئے۔ لڑائی کے وقت لشکر کا رُخ اور دریا کا بہاؤ ایک حکم رکھتا ہے جدھر کو پھر گیا پھر گیا غنیم کے ہاتھیوں کی صف بادشاہی فوج کے ایک پہلو کو ریلتی ہوئی لے گئی۔ خانزمان اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اور سپہ سالاری کی دُوربین سے چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ اُسنے دیکھا کہ سیاہ آندھی جو سامنے سے اُٹھی برابر کو نکل گئی۔ اب ہیموں قلب لشکر کو لئے کھڑا ہے یکبارگی فوج کو للکار کر حملہ کیا۔ حریف ہاتھیوں کے حلقے میں تھا۔ اور گرد بہادر افغانوں کا غول تھا۔ اُس نے پھر بھی حلقے ہی کو ریلا۔ ترک تیروں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے بڑھے۔ اُدھر سے ہاتھی تلواریں سونڈوں میں پھراتے اور زنجیریں جھلاتے آگے آئے اسوقت علی قلی خاں کے آگے بیرم خانی جوان جانفشانی کر رہے تھے جن میں حسین قلی خاں اُس کا بھانجا سپہ سالار تھا

[1] ہیموں کے ہاتھی کا نام ہوائی تھا۔

اور شاہ قلی محرم وغیرہ مصاحب سردار تھے۔ سچ یہ ہے کہ بڑا ساکھا کیا۔ اور ہاتھیوں کے حملے کو حوصلے اور ہمت سے روکا وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے۔ اور جب دیکھا کہ گھوڑے ہاتھیوں سے بدکتے ہیں تو کود پڑے اور تلواریں کھینچ کر صفوں میں گھس گئے۔ اُنھوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے سیاہ دیوزادوں کے مُنہ پھیر دئے اور کالے پہاڑوں کو خاک تو دہ سا بنا دیا عجب گھمسان کا رن پڑا ہیموں کی بہادری تعریف کے قابل ہے۔ وہ تراز و باٹ کا اُٹھانے والا۔ دال چپاتی کا کھانے والا۔ ہودے کے بیچ میں ننگے سر کھڑا تھا: فوج کا دل بڑھاتا تھا۔ اور فتح کا منتر جو کسی گیانی گنوان یا پنڈت بدیادان نے بتایا تھا جپے جاتا تھا فتح شکست خدا کے اختیار ہے۔ سپاہ کا ستھراؤ ہو گیا۔ شادی خاں افغان اُس کے سرداروں کی ناک تھا کٹ کر خاک پر گر پڑا۔ فوج اناج کے دانوں کی طرح کھنڈ گئی۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری ہاتھی پر سوار۔ چاروں طرف پھرتا تھا۔ سرداروں کے نام لے لے کر پکارتا تھا۔ کہ سمیٹ کر پھر جمع کر لے اتنے میں ایک قضا کا تیر اسکی بھیگی آنکھ میں ایسا لگا کہ باہر نکل گیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے تیر کھینچکر نکالا۔ اور آنکھ پر رومال باندھ لیا۔ مگر زخم سے ایسا بیقرار اور بیحواس ہوا کہ ہودے میں گر پڑا۔ یہ دیکھکر اُسکے ہواخواہوں کے جی چھوٹ گئے۔ سب تتر بتر ہو گئے۔ اکبر کے اقبال اور خانزماں کی تلوار پر اس مہم کا فتح نامہ لکھا گیا۔ ہیموں کی گرفتاری اور قتل کی کیفیت دیکھو صفحہ ۱۲۳۔ اس کے صلے میں سرکار سنبھل اور میانِ دوآب کا علاقہ اس کی جاگیر ہو گیا۔ اور خود امیر الامرا خانزمان ہوئے بلکہ حق پوچھو تو (بقول بلوک مین صاحب) خانزمان نے ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیاد رکھنے میں بیرم خاں سے دوسرا نمبر حاصل کیا۔ سنبھل کی سرحد سے تمام جانب مشرق میں افغان چھائے ہوئے تھے۔ رکن خاں روحانی ایک پُرانا پٹھان اُن کا سردار تھا۔ خان زمان فوج لیکر چڑھا۔ لکھنؤ تک تمام شمالی ملک صاف کر دیا۔ اور ان ملکوں میں ایسا لڑا کہ ایک ایک میدان اس کا کارنامہ تھا دفترِ روزگار پر۔ اکبر قلعۂ مانکوٹ کا محاصرہ کئے پڑا تھا کہ حسن خاں بچگوتی نے سرکارِ سنبھل پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس فساد کی خبر سُن کر یا اکبر ادھر آئیگا یا خانزمان جو آگے بڑھا جاتا ہے وہ اس طرف الجھیگا۔ خانزماں لکھنؤ کے مقام میں تھا کہ حسن خاں ۲۰ ہزار آدمی سے آیا۔ اور خانزمان کے پاس کل تین چار ہزار فوج افغان دریا سے سرِ ہی اُتر آئے۔ بہادر خاں کی فوج نے گھاٹ پر روکا۔ خانزماں کھانا کھاتا تھا۔ خبر آئی کہ غنیم آن پہنچا۔ یہ ہنسکر کہتے ہیں کہ ایک بازی شطرنج تو کھیل لو۔ مزے سے بیٹھے ہیں اور چالیں چل رہے ہیں۔ پھر خبردار نے خبر دی کہ غنیم نے ہماری فوج کو ہٹا دیا۔ آواز دی کہ ہتیار لانا۔ بیٹھے بیٹھے ہتیار سجے۔ جب خیمے ڈیرے لٹنے لگے اور لشکر میں بھاگڑ پڑ گئی تب بہادر خاں سے کہا کہ اب تم جاؤ

وہ آگے گیا۔ دیکھے تو دشمن دست و گریبان ہے۔ جاتے ہی چھُری کٹاری ہوگیا۔ پھر آپ گھوڑے سے
ہاتھی کہ رکاب میں تھے لیکر چلا۔ نقارہ پر چوٹ مار کر جو گھوڑے اُٹھائے تو اس کڑک دمک سے پہنچا
غنیم کے قدم اُٹھ گئے اور ہوش اُڑ گئے۔ اُن کے انبوہ کو گٹھری کر کے پھینک دیا۔ افغان اس طرح
مارے جاتے تھے۔ جیسے گلہ ہائے گوسپند۔ سات کوس تک فرش کرتا چلا گیا۔ کشتے کٹے پڑے تھے۔
اور زخمی لوٹتے تھے۔ سنبدلیا اور دل سنگار اس لڑائی کے ہاتھیوں میں ہاتھ آئے تھے۔ سنہ ۹۶۷ھ
میں جونپور پر قبضہ کر کے سکندر عدلی کا قائم مقام ہوگیا ۔

سنہ ۳ جلوس میں ہی اس کے باغ عیش میں نحوست کے کوے نے گھونسلا بنایا۔ تم پہلے سُن چکے
ہو اس کا باپ اُزبک تھا اور اس لئے قومی حماقتوں کا بھی ظہور ضرور تھا۔ احمق نے شاہم بیگ ایک
خوبصورت خوش ادا نوجوان کو نوکر رکھ لیا کہ پہلے ہمایوں بادشاہ کے پیش خدمتوں میں تھا۔ فتحیاب حدود
لکھنؤ میں تھا۔ اور شاہم بھی اُس کے پاس تھا جس طرح امرائے دنیا کا دستور ہے ہنستے کھیلتے عیش
کرتے تھے۔ اور سرکاری خدمتیں بھی اس طرح بجالاتے تھے کہ ترقی منصب کے ساتھ تحسین و آفرین
کے خلعت حاصل کرتے تھے اور دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے ۔

اگرچہ وہ شیبانی خاں کی نسل میں تھا اور اس کا باپ خاص اُزبک تھا لیکن ماں ایرانی تھی۔ اور
اُس نے ایران میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے مذہب شیعہ تھا۔ قابل افسوس یہ بات ہے کہ اسکی دلاوری
اور تیزی طبع نے اُسے حد سے زیادہ بے باک کر دیا تھا۔ اس کی صحبتوں میں خواہ خلوت ہو خواہ جلوت
بد کلام اور بے لگام جہلا جمع ہوتے تھے۔ اُن سے کھُلم کھُلا بے تہذیب گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ کہ جو کسی طرح
مناسب نہ تھیں۔ اہل سنت جن کا دورہ اس وقت آفتاب کا دورہ تھا۔ لہو کے گھونٹ پیتے تھے لیکن اکبر کے دل
پر اس کی خدمتیں نقش پر نقش بٹھاتی تھیں۔ اور دونوں بھائی خانخاناں کے دونوں ہاتھ تھے اس لئے کوئی بول نہ سکتا تھا[1]

---

[1] عجب زمانہ تھا۔ شاہ قلی محرم ایک بہادر اور نامی امیر تھے۔ انہی دنوں میں انہوں نے بھی عاشق مزاجی کے میدان میں جولانی
دکھائی قبول خاں ایک مقبول نوجوان کہ رقص میں مور اور آواز میں کوئل تھا۔ اس پر شاہ قلی دیوانے تھے۔ اکبر باوجودیکہ ترک تھا مگر
اتفاق ہے کہ اس شوق سے نفرت تھی جب سُنا تو قبول خاں کو بلا کر پہرے میں دیدیا۔ امیر مذکور کو بڑا رنج ہوا۔ گھر کو آگ
لگا دی۔ اور جوگیوں کی جون بدل کر جنگل میں جا بیٹھے۔ خان خاناں کے دلدادہ تھے۔ خان خاناں نے ان کی دلداری کے لئے
ایک غزل بھی کہی اور جوگی جی کو جا کر سُنائی۔ ادھر انہیں سمجھایا۔ ادھر حضور میں عرض کی اور جوگی سے امیر بنا کر پھر دربار میں
داخل کیا۔ کیا کہوں۔ سمرقند و بخارا میں جو تماشے اس شوق کے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں مگر
قانون وقت قلم کو جنبش نہیں کرنے دیتا۔ یہ وہی شاہ قلی محرم ہیں جو ہیمو کا ہاتھی گھیر لائے تھے اور انہی چار امیروں میں سے
ایک ہیں جنہوں نے بیرم خاں کی رفاقت سے بُرے وقت میں بھی منہ نہ موڑا تھا۔ بادشاہی خدمتیں بھی ہمیشہ جانفشانی سے
بجالاتے رہے۔ محرم اب بھی ترکستان میں معتبر اور معزز عہدہ اہلِ دربار کا ہے ۔

غنیم کے لشکر میں سے ایک شخص بھاگا۔ اور مُلّا پیر محمد کے پاس آکر کہا کہ آپ کی پناہ میں، یا مجھوں اب شرم آپ کے ہاتھ ہے۔ مُلّا صاحب نے سفارش کرنی چاہی۔ مگر جانتے تھے کہ وہ ایک بے پرواہ سینہ زور آدمی ہے۔ اِس لئے اُدھر کچھ سِلسلہ نہ ہلایا۔ مذہبی حالات سُن سُن کر یہ بھی آگ بگولا ہو رہے تھے۔ اعلےٰ اُس کی عیاشی کے معاملات کو بڑی آب و تاب سے حضور میں عرض کیا۔ اور ایسا چمکایا کہ نوجوان بادشاہ خِلافِ عادت آپے سے باہر ہو گیا۔ پھر بھی خان خاناں موجود تھے۔ اُنہوں نے اِدھر جلتی آگ پر تقریروں کے چھینٹے دئے۔ اُدھر خانزمان کی طرف پرچے اڑائے۔ اپنے معتبر دوڑائے۔ تم سے ملا بھیجا۔ اپنے اُوپر جو حریف اندر اندر وار کر رہے تھے اُن کے نشیب و فراز سمجھائے اور رخصت کر دیا۔ اسوقت آگ دب گئی۔

سنہ جلوس میں حکم پہنچا کہ شاہم کو بھیج دو یا نکال دو اور خود لکھنؤ کو چھوڑ کر جونپور پر فوج کشی کرو کہ افغانوں کے سردار وہاں جمع ہیں تمہاری جاگیر اور امرا کو عنایت ہوئی یہ مہم جونپور میں تمہاری کمک ہو نگے۔ امرائے مذکور جو فوجیں جرار لیکر روانہ ہوئے اُنہیں حکم ہوا کہ اگر خانزماں فرمان کی تعمیل کرے تو کمک کرو ورنہ کالپی وغیرہ کے حاکموں کو ساتھ لے کر اُسے صاف کر دو۔ خان زماں سُن کر حیران رہ گیا کہ ذرا سی بات جس پر اِس قدر قہر و عتاب وُہ اپنے حریفوں کو خوب جانتا تھا۔ سمجھا کہ نوجوان شہزادہ بادشاہ ہو گیا ہے بد اندیشوں نے پیچ مارا۔ شاہم کو روانہ دربار نہ کیا۔ کہ مبادا جان سے مارا جائے۔ لیکن اپنے علاقے سے نکال دیا۔ برج علی اپنے معتبر ملازم اور مُصاحب کو حضور میں بھیجا کہ مخالفوں نے جو اُلٹے نقش بٹھائے ہیں اُنہیں عجز و انکسار کے ہاتھ جوڑ کر اچھی طرح مٹائے۔ بادشاہ دِلّی میں تھے۔ قلعہ فیروز آباد میں اُترے ہوئے تھے کمبخت برج علی جب حضور میں پہنچا تو پہلے مُلّا پیر محمد سے مِلنا واجب تھا کہ وکیل مُطلق ہو گئے تھے۔ مُلّا قلعے کے بُرج پر اُترے ہوئے تھے۔ بُرج علی سیدھا بُرج پر چڑھ گیا۔ اور خلاص و نیاز کے پیغام پہنچائے اُن کا دماغ بُرج آتشبازی کی طرح اُڑا جاتا تھا۔ بڑے خفا ہوئے۔ وہ بھی آخر جان نثار و نمک حلال کا وکیل تھا۔ شاید کچھ جواب دیا ہوگا۔ ایسے جامے سے باہر ہوئے کہ حکم دیا۔ باندھکر ڈال دو۔ اور مار کر تھیلا کر دو۔ اِس پر بھی دل کا بخار نہ نکلا۔ کہا کہ بُرج پر سے گرا دو۔ اُسی وقت گرایا گیا۔ اور دم کے دم میں جسم کی عمارت زمین سے ہموار ہو گئی۔ قسائی پیر محمد نے قہقہہ مار کر کہا۔ آج نام کا اثر پورا ہوا۔ خانزمان نے شاہم کا تو پھر نام بھی نہ لیا۔ مگر بُرج علی کی جان اور اپنی بے عزتی کا سخت رنج ہوا خصوصًا اس سبب سے جو رقیبوں نے جوڑ مارا وہ چل گیا۔ اور اس کی بات بھی بادشاہ تک نہ پہنچی۔ خان خاناں موجود نہ تھے۔ انکو ابھی خبر نہ ہوئی تھی کہ اور ہی اور یہ کام تمام ہو گیا۔ پھر سُنا تو سوا افسوس کے کیا ہو سکتا تھا۔ اور حقیقت میں انہیں خان خاناں کی بنیادیں بھی نکل رہی تھیں۔ چند ہی روز میں بادشاہ نے آگرہ کو کوچ کیا۔ رستے

میں خانخاناں اور پیر محمد خاں کی بگڑی اور ایک کے بعد ایک پر آفت آئی ؛

اگرچہ دربار کے رنگ بدرنگ ہو رہے تھے مگر دریادل سپہ سالاران نااہلوں کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ خانزماں اور خانخاناں کی صلاح ہوئی کہ ان کی زبانیں تلواروں سے کاٹنی چاہئیں چنانچہ ایک طرف خانخاناں نے فتوحات پر کمر باندھی۔ دوسری طرف خانزماں نے نشان کھولا کہ آبِ تیغ سے داغ بدنامی کو دھوئے۔ کوڑیہ افغان نے آپ ہی سلطان بہادر اپنا خطاب رکھا۔ بنگالہ میں اپنا سکہ و خطبہ جاری کر دیا۔ خانزماں جونپور میں تھا۔ کہ وہ تیس چالیس ہزار سوار سے چڑھ آیا۔ یہ اس وقت بھی دسترخوان پر تھے کہ اس نے آن لیا۔ جب خدمتگاروں نے ڈیرے اور اپنے سراپردے لٹوالئے۔ تو خاطر جمع سے اُٹھے۔ اور رفیقوں اور جاں نثاروں کو لیکر چلے بلکہ حریف اُنکے ڈیرے میں پہنچا تو دسترخوان اسی طرح بچھا پایا۔ جنہوں یہ باہر نکل کر سوار ہوئے۔ نقارہ بجا کر اِدھر اُدھر گھوڑا مارا۔ نقارہ کی آواز سنتے ہی گھستے ہوئے کمک حق ادا کیے۔ ان گنتی کے سواروں سے جو تلوار لیکر پلٹے تو افغانوں کے دھوئیں اُڑا دئیے بہادر خاں نے اس مہم میں وہ بہادری دکھائی کہ رستم و اسفندیار کے نام کو مٹا دیا۔ جو افغان بہادری کے دعوؤں سے ہزار ہزار سوار کے وزن میں تُلتے تھے۔ اُنہیں کاٹ کاٹ کر خاکِ ہلاک پر ڈال دیا۔ انکی فوج میدانِ جنگ میں کم رہی تھی۔ لوٹ کے لالچ پر سب خیموں میں گھس گئے تھے۔ توشہ دان بھر رہے تھے اور گٹھریاں باندھ رہے تھے۔ جس وقت نقارہ بجا۔ اور ترک تلواریں لیکر پل پڑے۔ وہ اس طرح بھاگے جیسے چھتے سے مکھیاں اڑیں۔ ایک نے پلٹ کر تلوار نہ کھینچی۔ خزانے اور مال خانے سامان جنگ بلکہ سامانِ سلطنت گھوڑے ہاتھی سب چھوڑ گئے اور اتنی لوٹ ہاتھ آئی کہ پھر فوج کو بھی ہوش نہ رہی میرات کے مُفسد کہ سرشوری کے بانے باندھے بیٹھے تھے اور ہزاروں سرکش پٹھان دہلی و آگرہ کو گھڑ دوڑ کے میدان بنائے پھرتے تھے۔ جن کی گردن کی رگیں کبھی عمر بھر سے ڈھیلی نہ ہوتی تھیں۔ اسنے سب آبِ شمشیر سے ٹھیک کر دیا۔ ان خدمتوں کا اتنا اثر ہوا کہ پھر چاروں طرف سے اسکی واہ واہ ہونے لگی بادشاہ بھی خوش ہو گئے۔ بدگویوں کی زبانیں قلم ہو گئیں۔ اور حاسدوں کے منہ دوات کی طرح کھلے رہ گئے ؛

اکبر جو چند روز بیرم خاں کی مہم میں مصروف رہا تو ممالک مشرقی کے افغانوں نے فرصت کو غنیمت سمجھا اور سمٹ کر اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا کہ ادھر کے علاقہ میں جو کچھ ہے خانزماں ہے۔ اسے اُڑا دیں تو میدان صاف ہے۔ عدلی افغان کا بیٹا کہ قلعہ چنار کا مالک ہو کر بہت سر چڑھ چکا تھا اسے شیر خاں بنا کر نکالا۔ وہ بڑی جمعیت اور دعوے کے ساتھ لشکر لیکر آیا۔ خانزماں جونپور میں تھا۔ اگرچہ وہ خود دلشکستہ تھا اور خانخاناں کی تباہی نے اسکی کمر توڑ دی تھی۔ لیکن سنتے ہی تمام امرائے اطراف کو جمع کر لیا۔ اور چاہا

کہ غنیم کو روکے لیکن اُدھر کا پلّہ بھاری پایا۔ کہ ۲۰ ہزار سوار۔ ۵۰ ہزار پیادے۔ پانسو ہاتھی اُسکے ساتھ تھے۔ خانزماں نے چڑھکر جانا مناسب سمجھا۔ غنیم اور بھی شیر ہو کر آیا۔ اور دریائے گودی پر آن پڑا جسکے کنارے پر جونپور آباد ہے۔ خانزماں اندر اندر تیاری کرتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ وہ تیسرے دن دریا اترا اور تکبّر کے گھمنڈ سے بڑھا۔ خود چند سرداروں کے ساتھ فوج سے موج مارتا ہوا پٹھانوں کو لئے سلطان حسین شرقی کی مسجد کی طرف آیا۔ اور چند نامور سرداروں کے زور سے داہنے کو دبایا کہ لعل دروازہ پر حملہ کریں کئی تلوے افغانوں نے بائیں پر ڈالا کہ شیخ پھول کے بند کا مورچہ توڑیں اکبری دلاور بھی آگے بڑھے اور لڑائی شروع ہوئی ؛

میدانِ جنگ میں خانزمان کا پہلا اصول قواعد غنیم کے حملے کا سنبھالنا تھا۔ اُسے دائیں بائیں اِدھر اُدھر کے سرداروں پر ڈالتا تھا۔ اور آپ بڑے ہوش و حواس سے مستعد کھڑا رہتا تھا جب دیکھتا کہ حریف کا زور ہو چکا۔ تب تازہ دم آپ اُس پر حملہ کرتا تھا اور اسطرح ٹوٹ کر گرتا تھا کہ امان نہ دیتا تھا اور دشمن کے دُھوئیں اُڑا دیتا تھا۔ چنانچہ یہ بازی بھی اسی چال سے جیتا۔ حریف ایسے لشکرِ کثیر اور جمِ غفیر اور سامانِ وافر کو برباد کر کے ناکام بھاگا۔ اور ہاتھی گھوڑے جواہر نفائس لاکھوں روپے کے خزانے اور مال خانزمان کو گھر بیٹھے دے گیا۔ خدا دے تو بندہ اِس کا مزہ کیوں نہ لے اُنہوں نے امرا کو با تمام سپاہ کو انعام بے شمار دیا۔ آپ سامانِ عیش و آرام درست کر کے بہاریں اُڑائیں۔ یہ ضرور ہے کہ جو کچھ اِس مہم میں ہاتھ آیا اس کی فہرست حضور میں نہ عرض کی۔ اور یہ دوسری فتح تھی جو جونپور میں ؛

خانزماں پر اکبر کی پہلی یلغار

چغلخوروں کی طبیعت بندر کی خصلت کا چھاپا ہے۔ ان سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ کوئی نہ کوئی شے نوچنے کریدنے کے لئے ضرور چاہئے۔ فتوحات مذکورہ کی خبریں سُنکر پھر بادشاہ کو بھکانا شروع کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اکبر ہاتھیوں کا عاشق ہے اِس لئے خزانوں اور عجائب و نفائس کے بیانوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اِس لڑائی میں خانزماں کو وہ وہ ہاتھی ہاتھ آئے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور جھومتے ہیں چنانچہ جب بادشاہ ادہم خاں کا بندوبست کر کے مالوہ سے پھرے تو آتے ہی پھر توسنِ ہمت پر سوار ہوئے منعم خاں و خواجہ جہاں وغیرہ امرائے قدیم کو ساتھ لیا۔ اور کالپی کے رستے یکایک کڑہ مانکپور پر جا اُترے دونوں بھائیوں کو بھی خبر ہو گئی تھی۔ وہ بھی جونپور سے یلغار کئے چلے آتے تھے کنارۂ گنگا مقام کڑہ پر سجدۂ بندگی میں جھک کر سربلند ہوئے۔ جان مال سب حاضر کر دیئے۔ ہاتھیوں پر سارا جھگڑا اُٹھا تھا۔ اُنہوں نے بہت سے مست ہاتھی لُوٹ کے۔ بلکہ اپنے فیلخانہ کے بھی نذر گزرانے۔ ان میں سے دلسنکان۔ پلتہ

دلیل۔ سُبد لیا۔ جگموہن بادشاہ کو ایسے پسند آئے۔ کہ حلقۂ خاصہ میں داخل ہوئے۔ اکبر عفو و کرم کا دریا تھا۔ اس کے علاوہ بہادر خاں کے ساتھ کھیلا ہوا تھا۔ اِسلئے اسے بھائی کہا کرتا تھا۔ خانزمان کی دلاوری اور جاں نثاریوں نے اسے اپنا عاشق بنا رکھا تھا۔ اِس لئے دونوں بھائیوں کی طرف سے دل میں گھر تھا۔ ہنسی خوشی ملا۔ اعزاز و اکرام بڑھائے۔ خلعت پہنائے۔ زین زرّیں اور سازِ مرصّع کے ساتھ گھوڑوں پر چڑھا کر رخصت کیا۔ چغلخوروں کو بڑے بھروسے تھے۔ مگر جو جو باتیں اُنہوں نے کان میں پھونکی تھیں۔ ان کا ذکر زبان تک نہ آیا۔ اِس صلح کی تاریخیں بھی شاعروں نے کہیں ایک مجھے بھی پسند ہے

ھ	منہی اقبال دریں کہنہ دیر		غلغلہ انداخت کہ صلح خیر

دونوں بھائی ملک گیری کے میدان میں کارنامے دکھاتے تھے۔ اور ملک داری کے معاملہ میں پانی پر سنگین نقش جماتے تھے۔ مگر دربار کی طرف سے بے دلی اور آزردگی اُٹھاتے تھے۔ اکبر جیسے بادشاہ کو ایسے جاں بازوں کی قدردانی واجب تھی اور جانباز بھی قدیم الخدمت۔ چنانچہ ۹۷۱ھ میں ملّا عبداللہ سلطان پوری۔ مولانا علاءالدین لاری۔ شہاب الدین احمد خاں اور وزیر خاں کو بھیجا کہ انہیں سمجھاؤ اور نصیحت کرو۔ توبہ کراؤ اور کہو کہ ناامید نہ ہو نا رحمتِ بادشاہی کا دریا تمہارے واسطے لہریں مار رہا ہے ؁

فتح خاں اور حسن خاں افغان لشکرِ کثیر افغانوں کا لے کر قلعۂ رہتاس سے گھٹا کی طرح اُٹھے اور سلیم شاہ کے بیٹے کو بادشاہ بنا کر مہم کا منصوبہ جمایا۔ ولایتِ بہار کو تسخیر کیا اور بجلیوں کی طرح ادھر اُدھر کوندنے لگے۔ بعض علاقے خانزمان کے بھی دبا لئے۔ دونوں بھائیوں نے ابراہیم خاں اُزبک اور مجنوں خاں قاقشال کو آگے بڑھایا مگر دیکھا کہ افغانوں کا ٹڈی دل زور میں بھرا آتا ہے میدان میں مقابلہ نہ ہو سکیگا۔ اِس لئے دریائے سون کے کنارے اندر باری پر قلعے کو دمدموں اور مورچوں سے استحکام دیا تھا۔ اور مقابلے کو تیار بیٹھا تھا۔ ایک دن ارکانِ بادشاہی بیٹھے گفتگو کر رہے تھے جو غنیم آن پہنچا اور آتے ہی خانزمان کی فوج کو پیٹتا پیٹتا شہر کی طرف آیا۔ خانزمان کا لشکر بھاگا اور افغان خیموں ڈیروں کو بلکہ آس پاس کے گھروں کو لوٹنے لگے۔ یہ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور سوار ہو کر نکلا۔ جو ہمراہی ساتھ رہ سکے اُنہیں لیکر دیوارِ قلعہ کے نیچے آیا۔ ایک پہلو میں کھڑا قدرتِ الٰہی کا تماشہ دیکھتا ہے۔ اور لطیفۂ غیبی کا منتظر ہے کہ حسن خاں تبنی کو دیکھتا ہے۔ بخت بلند نام ہاتھی پر سوار چلا آتا ہے۔ یہ فوج لیکر سامنے ہوا اور حملے کے لئے آواز دی۔ دشمن کی فوج بہت تھی۔ حملہ کی ضرب کمزور پڑی اور فوج کھنڈ گئی۔ یہ چند آدمیوں کے ساتھ مرنے پر مصمم ہو کر بُرج کی طرف دوڑا۔ توپ تیار دھری تھی۔ غنیم ہاتھی پر سوار ہنسیا ہی کرتا چلا آتا

تھا۔ خانزماں نے اپنے ہاتھ سے شست باندھ کر جھٹ توپ داغ دی خدا کی شان گولہ جو توپ سے نکلا قضا کا گولہ تھا۔ ہاتھی اس طرح اُلٹ کر گرا جیسے بُرج گرا۔ اُسکے گرتے ہی پٹھانوں کے اوسان خطا ہوئے ۔

جب بیرم خاں نے بہادر خاں کو مالوہ کی مہم پر بھیجا تھا تو کوہ پارا نام ہاتھی دیا تھا۔ وہ دیوست کہیں اسی طرف زنجیروں سے جکڑا کھڑا تھا اور بدمستی کر رہا تھا۔ افغانی بہادروں کو اسکے کرتوتوں کی خبر نہ تھی۔ آتے ہی زنجیریں کھول دیں کر چڑھ کر قبضہ کریں۔ وہ ابھی زنجیروں سے نہ نکلا تھا کہ قابو سے نکل گیا۔ ایک فیلبان کو وہیں چیر ڈالا اور زنجیر کو چکراتا اس طرح چلا گویا آندھی اور بھونچال ساتھ ہی لئے۔ لشکر میں قیامت مچ گئی غنیم نے جانا کہ خانزماں نے گھات سے نکل کر پہلو مارا۔ جو پٹھان لوٹ پر پڑے ہوئے تھے۔ بدحواس ہو کر بھاگے۔ خان زماں کی فوج اس امدادِ الٰہی کو دیکھ کر پلٹی اور افغانوں کے پیچھے دوڑی۔ مارے۔ باندھے۔ لاکھوں روپیہ کے مال اور اسباب گراں بہا۔ نامی ہاتھی۔ عمدہ گھوڑے اور بے شمار عجائب و نفائس ہاتھ آئے اس نے اس خداداد فتح کے شکرانے میں بادشاہ کے لئے تحائف خسروانہ بھیجے اور امرا کو گراں بہا خلعتوں سے گرانبار کر دیا ۔

دُوسری فوج کشی

خانزماں کا گھوڑا ہوائے اقبال میں اُڑا جاتا تھا کہ پھر نحوست کی ٹھوکر لگی۔ اسمیں کچھ کلام نہیں کہ دشمن ہر وقت دونوں بھائیوں کے درپے تھے مگر وہ بھی کچھ اپنے نشۂ دلاوری سے۔ کچھ غفلت عیاشی سے دُشمنوں کو چغلخوری کے لئے موقع دیتے تھے۔ شکایتیں پیش ہوئیں کہ لڑائیوں میں جو خزانے اور اشیائے عجیب و نفیس ہاتھ آئی ہیں۔ سب لئے بیٹھا ہے بھیجا کچھ نہیں۔ ان میں صف شکن اور کوہ پارہ دو ہاتھیوں کی ایسی تعریف کی کہ اکبر سُن کر مست ہو گئے۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ جب خان زماں اور بہادر خاں کے جلسوں میں حریفوں کی دراندازیوں کے ذکر آتے تھے تو وہ انہیں خاطر میں بھی نہ لاتے ہونگے۔ فتوحات کی مستی اور اقبال کے نشے میں اپنے کارناموں کو خاندان کے فخر سے چمکاتے تھے۔ اور حریفوں کے خاکے اُڑاتے تھے۔ حریف ان باتوں کو اکبر کے سامنے ایسے پیرائے میں ادا کرتے تھے۔ جس سے کنایوں کے نشتر بادشاہ کی طرف چُبھتے تھے اور اُسے بغاوت کے شُبہے پڑتے تھے۔ یہ شُبہے اس سے زیادہ تر خطرناک نظر آتے ہونگے کہ اس کی رکاب میں ۳۰ ہزار جرار لشکر ایرانی تورانی افغان راجپوت کا تھا کہ جدھر خود گھوڑا اُٹھاتا تھا۔ آندھی اور بھونچال ساتھ آتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض صحبتوں میں اکبر کی زبان پر یہ بات آئی کہ شیبانی خاں کے خاندان پر یہ کیا ناز کیا کرتے ہیں۔ جانتے نہیں کہ اُس کی بدولت فردوس مکانی

نے کیا کیا مصیبتیں اُٹھائیں اور آزار پائے۔ میں اُزبک کا تخم ہندوستان میں نہ چھوڑوں گا۔ بدترین اتفاقات یہ کہ انہی دنوں میں عبداللہ خاں اُزبک وغیرہ کئی سرداروں سے برابر بداعمالیاں ظہور میں آئیں وہ بھی جب دربار کی طرف سے مایوس ہوئے خانزماں کے پاس پہنچے اور سب نے مل کر بغاوت کی ؛

باغیوں نے ملک ابغاوت کی تقسیم اس نقشے پر کی کہ سکندر خاں اُزبک اور ابراہیم خاں (خانزماں کا ماموں) لکھنؤ میں رہیں خانزماں بہادر خاں دونوں بھائی کڑہ مانکپور میں قائم ہوں۔ جب یہ خبریں مشہور ہوئیں اور بدنظروں نے صورت حال کو دُور دُور سے دیکھا تو اِدھر اُدھر سے جمع ہو کر خان زماں پر آئے کہ وہی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ اور حقیقت میں جو کچھ تھا وہی تھا۔ نمک حلالی کے سوداگروں میں مجنوں خاں اور باقی خاں قاقشال جمعیت اور جتھے والے لوگ تھے جو بہادری اور جانفشانی دکھا کر چاہتے تھے کہ بدنصیب خانزماں کی دولپشت کی محنت مٹائیں اور اپنے نقش بادشاہ کے دل پر بٹھائیں۔ وہ ان کی کیا حقیقت سمجھتا تھا۔ مار مار کر بھگا دیا۔ مجنوں خاں بھاگ بھی نہ سکے۔ مانکپور میں گھر گئے۔ اُنکے رفیق محمد امین دیوانہ پکڑے گئے۔ دربار شاہی میں ابھی آصف خاں صاف اور جرم بغاوت سے پاک تھے۔ وہ مجنوں خاں کی مدد کو آئے۔ محاصرہ سے نکالا۔ اپنے خزانے کھول دیئے۔ سپاہ کی کمر بندھوائی۔ مجنوں خاں کو بھی بہت سا روپیہ دیا۔ انہی کی بدولت اُس نے پھر پر و بال درست کئے اور دونوں مل کر خان زماں کے سامنے بیٹھ گئے۔ دربار کی طرف عرضیاں پرچے دوڑائے۔ رونے اُڑائے۔ بڈھے باقی خاں نے اپنی عرضی میں ایک شعر بھی لکھا۔ مطلب یہ تھا کہ حضور خود آئیں اور بہت جلد آئیں ؎

اے شہ سوار معرکہ آرائے روز رزم	از دست رفتہ معرکہ پا در رکاب کن

اکبر مالوہ کی یلغار مار کر آیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر سمجھا کہ معرکہ بے ڈھب ہے فوراً منعم خاں کو روانہ کیا کہ فوج لیکر قنوج کے گھاٹ اُتر جاؤ۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مقابلہ کس سے ہے اور یہ جو لوگ آگ لگاتے ہیں اور سپہ سالاری کا دم بھرتے ہیں اُن کا وزن کیا ہے۔ چنانچہ کئی دن تک خود لشکر کشی کے سامانوں میں صبح سے شام تک غرق رہا۔ آس پاس کے اُمرا اور فوج کو فراہم کیا۔ جو موجود تھے۔ انھیں پورا سپاہی بنایا۔ اس لشکر میں ۱۰ہزار فقط ہاتھی تھے۔ باقی تم آپ سمجھ لو۔ باوجود اسکے شکار کی شہرت دی اور نہایت پھرتی کیساتھ روانہ ہوئے۔ یہانتک کہ جو مختصر جمعیت خاص اپنی رکاب میں تھی وہ قابل شمار بھی نہ تھی ؛

منعم خاں کہ ہراول ہو کر روانہ ہوا تھا۔ ابھی قنوج میں تھا کہ اکبر بھی جا پہنچے۔ مگر وہ کہن سال عجب سلیم الطبع صُلح جو سردار تھا۔ وہ بے شک بادشاہ کا نمک حلال جاں نثار تھا۔ مگر مقدمے کی تہ کو سمجھا ہوا تھا اُسے کسی طرح منظور نہ تھا کہ لڑائی ہو۔ اور خدمتگذار موروثی اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مفت برباد ہو۔ چنانچہ

اس وقت خانزماں محمد آباد میں بیخبر بیٹھا تھا۔ اگر یہ گھوڑے اُٹھا کر جا پڑتا تو وہ آسان گرفتار ہو جاتا۔ منعم خاں نے ادھر تو اُسے ہشیار کر دیا۔ ادھر لشکر کو روک تھام سے لے چلا کہ ابھی سامان ناتمام ہے سارے لوازمات جنگ فراہم کر کے چلنا چاہیئے۔ اس عرصے میں خانزماں کہیں کے کہیں پہنچے۔ باوجود ان باتوں کے اسکی طرف سے کئی سرداروں کو پیغام سلام کر کے توڑ لیا تھا۔ انہیں حضور میں پیش کر کے خطائیں معاف کروائیں۔ بادشاہ نے اُسے وہیں چھوڑا اور یلغار کر کے لکھنؤ پہنچے۔ سکندر خاں پیچھے ہٹتا لو رہا گا بھاگ جونپور پہنچا کہ سب مل کر بچاؤ کی صورت نکالیں۔ بادشاہ بھی ان کے منصوبے مُرتاڑ گئے۔ اُنھوں نے بھی اُدھر ہی کا رُخ کیا۔ اور منعم خاں کو حکم بھیجا کہ لشکر کو لیکر جونپور کیطرف چلو۔ خانزماں آخر پُرانے سپاہی تھے۔ یہ بھی بادشاہ کو سامنے سے آتے دیکھ کر متفرق رہنا مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ آصف خاں و مجنوں خاں کا مقابلہ چھوڑا اور جونپور پہنچے۔ رفیقوں سے جا کر حال بیان کیا۔ اُنھوں نے جب سُنا کہ بادشاہ ادھر آتے ہیں۔ سب اکٹھے ہو کر عیال سمیت جونپور سے نکلے۔ اور پیچھے ہٹ کر دریا پار اُتر گئے ؛

اکبر اگرچہ بادشاہ تھا۔ مگر وقت پر اس طرح کے جوڑ توڑ مارتا تھا جیسے عمدہ اہلکار اور پُرانے سپہ سالار اسے معلوم تھا کہ خان زماں نے امداد راجگانِ بنگالہ سے موافقت کرلی۔ راجہ اُڑیسہ جو مشرقی راجاؤں میں سپاہ و سامان کے باب میں نامور ہے سلیمان کرارانی اُس کے ملک پر کئی دفعہ گیا ہے اور قابو نہیں پایا مہا پاتر بھاٹ کہ سلیم شاہ کے مصاحبوں سے تھا اور فنِ موسیقی اور ہندی شاعری میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا اسے اور حسن خاں خزانچی کو راجہ اڑلیسہ کے پاس بھیجا اور فرمان لکھا سلیمان کرارانی علی قلی خاں کی مدد کو آتے تو تم آکر اُس کے ملک کو تہ و بالا کر دینا۔ راجہ نے آئی ہوئی مراد کو ادب کے سر پہ لیا اور بہت سے ہاتھی اور نفیس تحفے اس ملک کے بھیج کر اطاعت منظور کی۔ تلیچ خاں کو رہتاس پر راہی کیا کہ فتح خاں تبتی افغان شیر خانی کو معافی تقصیرات سے مطمئن کرے اور کہے کہ جب خانزماں لشکر شاہی کی طرف متوجہ ہو تو رہتاس سے اُتر کر اس کے ملک میں بغاوت برپا کرے۔ اس نے پہلی دفعہ اطاعت کے وعدے کر کے فیل بخت بلند کو تحائف پیشکش سے گرانبار کیا۔ اب دوبارہ پھر بھیجا۔ اس نے وعدۂ وعید میں تلیچ خاں کو رکھا۔ اسے جب قرائن سے حال معلوم ہوا تو رخصت ہو کر ناکام واپس آیا ؛

اکبر خود جونپور میں جا پہنچے۔ آصف خاں جنہوں نے نمک حلال بن کر مجنوں خاں کو قلعہ بندی سے نکالا تھا پانچ ہزار سوار سے حضور میں حاضر ہوئے۔ انہیں سپہ سالاری ملی کہ باغیوں پر فوج لیکر جاؤ۔ ساتھ ہی بعض امرا کو سرداران افغان اور راجگان اطراف کے پاس بھیجا کہ اگر خان زماں بھاگ کر تمہارے علاقے

میں آئے۔ تورک لو۔ چنانچہ حاجی محمد خاں سیستانی۔ بیرم خانی بڑھوں میں سے باقی تھا۔ اُسے سلیمان کرارانی کے پاس بھیجا تھا۔ کہ کل بنگالہ کا حاکم تھا۔ اور پُرانے افغانوں میں سے وہی کھرچن رہ گیا تھا۔ خانزماں کئی برس سے یہاں تھا اور اس عرصے میں بڑی رسائی سے اُس ملک میں کارروائی کی تھی سلیمان کرارانی کی اُس سے بڑی رفاقت تھی۔ اُس نے جھٹ حاجی محمد خاں کو پکڑ کر خانزماں کے پاس بھیج دیا۔ وہ اوّل تو ہموطن سیستانی۔ دوسرے بیرم خانی پُرانا رفیق۔ جب بُڈھے کہن سال کو جوان دولت جوان اقبال کے سامنے لائے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت ہنسے۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گلے ملے۔ بیٹھ کر صلاحیں ہوئیں بُڈھے نے تجویز نکالی کہ دل میں نمک حرامی یا دغا نہیں۔ کسی غیر بادشاہ سے معاملہ نہیں۔ تم یہیں حاضر رہو۔ ماں کو میرے ساتھ روانہ کردو۔ وہ محل میں جائینگی۔ بیگم کی معرفت عرض کرینگی۔ ماہم بھی موجود ہوں بگڑی بات بن جائیگی۔ دشمنوں کی کچھ پیش نہ جائیگی۔

اب ذرا خیال کرو۔ اکبر تو جونپور میں ہیں آصف خاں اور مجنوں خاں خانزماں کے سامنے کڑہ مانک پور میں فوجیں لیے پڑے ہیں۔ درباری نمک حراموں نے آصف خاں کو پیغام بھیجا کہ رانی درگاوتی کے خزانوں کا حساب سمجھانا ہوگا۔ کہدو! دوستوں کو کیا کھلاؤ گے؟ اور چوراگڈھ کے مال میں سے کیا تحفے دلواؤ گے اُسے کھٹکا تو پہلے بھی تھا۔ اب گھبرا گیا۔ لوگوں نے اُسے یہ بھی شُبہ ڈالا کہ یہ خان زماں کے مقابلے پر بھیجنا۔ فقط تمہارا سر کٹوانا ہے۔ آخر ایک دن سوچ سمجھ کر آدھی رات کے وقت اُس نے خیمے ڈیرے اُکھیڑے اور میدان سے اُٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ وزیر خاں اُس کا بھائی اور سرداران ہمراہی بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے سُنتے ہی اسکی جگہ تو منعم خاں کو بھیجا کہ مورچہ قائم رہے اور شجاعت خاں کو اسکے پیچھے دوڑایا شجاعت خاں مانکپور پر پہنچکر چاہتے تھے کہ دریا اُتریں۔ آصف خاں تھوڑی دُور بڑھا تھا جو خبر پائی کہ مقیم بیگ پیچھے آتا ہے۔ جاتے جاتے پلٹ پڑا۔ اور دن بھر اس طرح جان توڑ کر لڑا کہ مقیم بیگ کا شجاعت خانی خطاب خاک میں مل گیا۔ آصف رات کو اپنی جمعیت اور سامان سمیت فتح کا ڈنکا بجاتا چلا گیا۔ صبح کو انہیں خبر ہوئی دریا اُتر کر اپنی شجاعت کے روئے سیاہ کو دھویا اور پیچھے پیچھے دوڑے ترک تھے مگر ترکوں کا قول بھول گئے تھے کہ جو حریف کمان بھر نکل گیا۔ تیروں کے پٹے نکل گیا۔ میر جیسے گئے ویسے ہی دربار میں آن حاضر ہو گئے۔

خانزماں عرصۂ جنگ کا پکا شطرنج باز تھا۔ منعم خاں ابھی اس کے مقابلے پر نہ پہنچا تھا جو اس نے دیکھا کہ بادشاہ بھی ادھر ہی چلے آتے۔ اودھ کا علاقہ خالی ہے۔ اپنے بھائی بہادر خاں کو سپہ سالار کر کے اودھ کو فوج روانہ کی۔ اور سکندر خاں کو اس کی فوج سمیت ساتھ کیا کہ جاؤ اور اُدھر کی طرف

ملک میں بدعملی پھیلاؤ۔ بادشاہ نے سُنتے ہی چند کہنہ عمل ہزاروں کو فوجیں دیکر ادھر کی طرف روانہ کیا۔ میر معز الملک مشہدی کو ان کا سردار مقرر کیا۔ مگر یہ خلعت ان کے قد پر کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ انہیں حکم یہ دیا کہ بہادر کو روک لو۔ بھلا ان سے بہادر کب رُکتا تھا*

ادھر منعم خاں خانزماں کے مقابل پہنچے۔ دونوں قدیمی یار اور دلی دوست تھے۔ پیغام سلام ہوئے۔ بی بی سرو قد ایک پراتم بڑھیا۔ بابر بادشاہ کے محلوں کا تبرک باقی تھیں۔ انہیں منعم خاں کی حرم سرا میں بھیجا۔ با ہر چند معتبر اور کارداں اشخاص بھیجے۔ حاجی محمد خاں بھی جا کر شامل ہوئے۔ انھیں دنوں میں یہ بھی ہوائی اُڑی تھی کہ چند اکبری جانباز اس تاک میں ہیں کہ موقع پا کر خانزماں اور بہادر خاں کا کام تمام کر دیں اس لئے علی قلی خاں کو آنے میں تامل ہوا۔ آخر یہ ٹھیری کہ بوسہ بہ پیغام سے کام نہیں چلتا۔ خانزماں اور منعم خاں مل کر گفتگو کریں اور بات قرار پا جائے۔ باوجود شہرت مذکور کے اس بات کو علی قلی خاں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ دونوں کی فوجیں دریائے جوسا کے کناروں پر آکر کھڑی ہوئیں۔ اُدھر سے خانزماں۔ شہر یار گل۔ سلطان محمد میر آب آہوئے حرم اپنے غلام کو لیکر کشتی میں سوار ہوئے۔ ادھر سے منعم خاں خانخاناں مرزا غیاث الدین علی۔ بایزید بیگ میر خاں غلام۔ سلطان محمد قبق (کدو) کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر چلے۔ سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ فوج در فوج اور صف در صف ہزاروں آدمی تھے۔ وار پار گنگا کے کناروں پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ مزا ہے جو پانی میں بجلیاں چمکتی نظر آئیں۔ غرض بیچ دریا میں ملاقات ہوئی۔ دل میں جوش سینہ صاف تھا۔ خانزماں سامنے سے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ ہنسے اور ترکی میں کہا۔ کفت لیق سلام علیکم۔ جوں ہی کشتی برابر آئی۔ بے باک دلاور کود کر خانخاناں کی کشتی میں آگئے۔ جُھک کر گلے ملے۔ اور بیٹھے۔ پہلے خدمت فروشیاں کیں۔ پھر رفیقوں کے ظلم و ستم۔ بادشاہ کی بے پروائی۔ اپنی بے یاری و بے مددگاری پر روئے۔ خانخاناں عمر میں بھی بڑے تھے۔ کچھ داد دیتے رہے۔ کچھ سمجھاتے رہے۔ آخر یہ ٹھیری کہ ابراہیم خاں ازبک ہم سب کا بزرگ ہے اور خزانہ اور اجناس گراں بہا اور ہاتھی جو کہ ہر جگہ فساد کی جڑ ہیں۔ لیکر جائیں۔ ماں حرم میں جا کر عفو تقصیر کی دُعا کرے۔ اور تم میری طرف سے حضور میں یہ عرض کر دو کہ اس رو سیاہ سے بہت گناہ ہوئے ہیں۔ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ہاں چند جانفشانی اور جاں نثاری کی خدمتیں بجا لا کر اس سیاہی کو دھو لوں۔ اُس وقت خود حاضر ہونگا*

دوسرے دن منعم خاں چند امرا کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر خانزماں کے خیموں میں گئے۔ اُس نے آداب بزرگانہ کے ساتھ پیشوائی کی جشن شاہانہ کا سامان کیا۔ دھوم دھام سے مہمانداری کی۔ خواجہ

غیاث الدین وہی پیغام لیکر دربار میں گئے۔ وہاں سے خواجہ جہاں۔ کہ مہمات سلطنت انکے ہاتھوں پر طے ہوتے تھے۔ خانزماں کی تسلی خاطر کے لئے آئے منعم خاں نے کہا کہ اب کچھ بات نہیں رہی۔ خانزماں کے ڈیرے پر چل کر گفتگو ہو جائے۔ خواجہ جہاں نے کہا کہ وہ بے باک ہے۔ اور مزاج کا تیز ہے۔ اور وہ پہلے بھی مجھ سے خوش نہیں۔ مبادا کوئی بات ایسی ہو جائے کہ پیچھے افسوس کرنا پڑے۔ جب منعم خاں نے بہت اطمینان دیا تو کہا کہ اچھا اس سے کوئی آدمی یرغمال میں لیلو۔ خانخاناں نے یہی کہلا بھیجا۔ وہ دل کا دریا تھا۔ اس نے فوراً ابراہیم خاں ازبک اپنے ماموں کو بھیج دیا۔ غرض منعم خاں اور صدر جہاں خان زماں کے لشکر میں گئے۔ سب نشیب و فراز دیکھ کر بندوبست پختہ ہوئے۔ دوسرے دن صدر جہاں کا بھی ڈر نکل گیا۔ پھر گئے اور ابراہیم خاں ازبک کے ڈیرے پر بیٹھ کر باتیں ہوئیں۔ مجنون خاں قاقشال وغیرہ سرداروں کو بھی خان زماں سے گلے ملوایا۔ خانزماں کے دربار میں چلنے پر بہت گفتگوئیں ہوئیں۔ اُس نے نہ مانا اور کہا کہ ابراہیم خاں ہم سب کا بزرگ ہے۔ اور ریش سفید ہے۔ باہریہ۔ اندر والدہ جائے۔ اور فی الحال خطا معاف ہو جائے۔ پھر آبدیدہ ہو کر کہا کہ مجھ سے سخت گناہ اور کمال روسیاہی ظہور میں آئی ہے۔ سامنے نہیں جاتا خدمت لائقہ بجالاؤنگا۔ اور سیاہی کو دھوؤنگا جبھی حاضر دربار ہونگا ۔

دوسرے دن یہ امراتمام اجناس گراں بہا اور اچھے اچھے ہاتھی۔ جنمیں بال سُندر اور اچپلہ وغیرہ بھی تھے لیکر دربار کو روانہ ہوئے۔ خانخاناں نے چادر کی جگہ تیغ و کفن ابراہیم خاں کے گلے میں ڈالا۔ وہ سرننگا پاؤں ننگے طورۂ چنگیز خانی کے بموجب بائیں طرف سے سامنے لاکر کھڑا کیا۔ اور دونوں ہاتھ اُٹھاکر عرض کی بیچ خواہی بداز خواہی بکش برائے برائے تست۔ خان خاناں نے عفو تقصیر کی دُعائیں کیں۔ خواجہ جہاں آمین آمین کہتے گئے۔ اکبر نے کہا کہ خاں خاناں تمہاری خاطر عزیز ہے۔ ہم نے ان کے گناہ سے درگزر کی مگر دیکھئے کہ یہ راہ عقیدت پر رہتے ہیں یا نہیں۔ خاں خاناں نے دوبارہ عرض کی کہ انکی جاگیر کے باب میں کیا حکم ہے۔ فرمایا تقصیریں معاف کر دیں تو جاگیریں کیا حقیقت ہیں۔ تمہاری خاطر سے وہ بھی بحال کیں۔ شرط یہ ہے کہ جب تک لشکر اقبال ہمارا ان حدود میں ہے۔ خانزماں دریا پار رہے جب ہم دارالخلافہ میں پہنچیں۔ تو اس کے وکیل حاضر ہو کر دیوان اعلےٰ سے سندیں ترتیب کروالیں۔ اور انکے بموجب عمل کریں۔ خانخاناں شکر کے سجدے بجالایا۔ اور پھر کھڑے ہو کر کہا۔ دولت کے قدیم الخدمت ہونہار جوانوں کی جانیں حضور کے عفو و کرم سے بچ گئیں یہ کام کرنیوالے ہیں اور کام انکے دکھائینگے۔ حکم ہوا کہ ابراہیم خاں کے گلے سے تیغ و کفن اتاریں۔ بادشاہ حرم سرا میں گئے تو وہ

لہ دیکھو خواجہ امتاد دیکھو صفحہ ۲۲۲۔

غرض وہ سامنے آئی جس کا سانس فقط بیٹوں کی آس پر چلتا تھا۔ قدموں پر گر پڑی۔ ہزاروں دعائیں دیں۔ بیٹوں کی نااہلیاں بھی کہتی جاتی تھی۔ عفو قصور کی سفارشیں بھی کرتی جاتی تھی۔ روتی تھی اور دعائیں دیتی تھی۔ اسکی حالت دیکھ کر اکبر کو رحم آیا جو کچھ دربار میں کہہ کر آیا تھا۔ سمجھایا اور بہت دلاسا دیا۔ خانِ ماں کو باہر سے خانخاناں نے لکھا۔ اندر سے ماں نے بیٹوں کو خوشخبری دی۔ اور لکھا کہ کوہ پارہ اور صف شکن وغیرہ ہاتھی اور تحفے تحائف جلد روانہ کر دو۔ ان کی خاطر جمع ہوئی اور سب چیزیں بڑے تجمل کے ساتھ بھیجدیں ۔

امرائے شاہی اور بہادر خاں کی لڑائی

ادھر تو یہ طے ہوئی۔ اب اُدھر کا حال سُنو۔ یہ تو تم سُن چکے کہ بہادر اور سکندر خاں کو خانزماں نے ادھ کیطرف بھیج دیا تھا۔ کہ ملک میں خرابی کر کے خاک اُڑاؤ۔ بہادر نے جاتے ہی خیر آباد پر قبضہ کر لیا اور ملک میں پھیل گیا۔ یہ بھی دیکھ چکے کہ ادھر سے انکے روکنے کیلئے اکبر نے میر معزّ الملک وغیرہ امرا کو فوج دیکر بھیجا اب ذرا تماشا دیکھو۔ دربار میں تو یہ معاملے ہو رہے ہیں وہاں جب بادشاہی لشکر پاس پہنچا تو بہادر خاں جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ معزّ الملک کے پاس وکیل بھیجا حرم سرا میں اُس کی بہن کے پاس عورتیں بھیجیں اور یہ پیغام دیا کہ خانزماں کی منعم خاں کے ذریعے سے عرض و معروض ہو رہی ہے۔ ہمارے لئے تم درگاہ بادشاہی میں سفارش کرو۔ کہ خطائیں معاف ہو جائیں۔ فی الحال ہاتھی وغیرہ جو کچھ ہیں وکیل لے جائیگا۔ جب ہم خطاؤں سے پاک اور تقصیریں معاف ہو جائینگی تو خود حاضر دربار ہونگے ۔

معزّ الملک مصرِ غرور کا فرعون اور شداد بنا ہوا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ جو میں ہوں سو ہے کون! آسمان پر چڑھ گیا اور کہا نمک حرامو! تم آب تیغ کے سوا پاک نہیں ہو سکتے۔ تمہارے داغ کو میں آب شمشیر سے دھوؤنگا اتنے میں لشکر خاں میر بخشی (بادشاہ نے عسکر خاں خطاب دیا۔ لوگوں نے استر خاں بنا دیا) اور راجہ ٹوڈرمل جا پہنچے کہ صلح یا جنگ جو کچھ مناسب سمجھیں فیصلہ کر دیں۔ بہادر خاں پھر بادشاہی لشکر کے کنارے پر آیا معزّ الملک کو بلایا۔ اور سمجھایا کہ بھائی والدہ اور ابراہیم خاں کو درگاہ میں بھیجا چاہتے ہیں۔ بلکہ ابتک بھیجدیا ہوگا اور عفو تقصیر کی اُمید قوی ہے۔ جب تک وہاں سے جواب مل جائے۔ تب تک ہم بھی تلوار پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ تم بھی اس عرصے میں صبر کرو۔ معزّ الملک تو آگ تھے۔ راجہ رنجک پہنچے۔ جوں جوں بہادر اور سکندر دبتے ہوتے تھے۔ یہ آگ بگولا ہوئے جاتے تھے۔ اور سوا حرف سخت کے کچھ کہتے ہی نہ تھے وہ بھی آخر بہادر خاں تھے۔ جب کام بھرے تو ناچار مرتا کیا نہ کرتا! اپنے لشکر میں جا کر کام کی فکر میں لگے ساتھ

وقت ضرورت چو نماند گریز	دست بگیرد سر شمشیر تیز

نواحِ خیر آباد میں فوج تیار کر کے سامنے ہوئے۔ اُدھر سے معز الملک بادشاہی لشکر کو لیکر بڑے گھمنڈ سے آگے بڑھے۔ بہادر خاں اگرچہ اس موقع پر بہت دل شکستہ اور پریشان تھا۔ مگر وہ سینے میں شیر کا دل اور ہاتھی کا کلیجہ لیکر پیدا ہوا تھا۔ فوج جما کر سامنے ہوا۔ دھاوا اِدھر اُدھر سے برابر ہوا اور دونو لشکر اس صدمے سے ٹکرائے جیسے دو پہاڑوں نے ٹکر کھائی۔ میدان میں محشر برپا ہو گیا۔ بادشاہی فوج نے سکندر کو ایسا ریلا کہ بھاگا۔ پشت پر ایک جھیل تھی۔ کود پھاند کر پار اتر گیا۔ بہت ڈوبے۔ بہت مارے گئے۔ اور امرائے شاہی اپنی اپنی فوجوں کو لیکر سب اُنہیں کے پیچھے دوڑے۔ سکندر تو بھاگا مگر بہادر خاں سدِ سکندر ہو کر کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا کہ معز الملک تھوڑی سی فوج کے ساتھ سامنے ہے۔ باز کی طرح جھپٹ کر گرا۔ معز الملک نہ ان کے بہادر تھے نہ کہ میدان کے۔ بہادر نے پہلے ہی حملے میں الٹ کر پھینک دیا۔ شاہ بداغ خاں جمے تھے۔ انہیں گھوڑے نے پھینکا۔ بیٹے نے دور کیا کہ اُٹھائے۔ نہ ہو سکا۔ اپنی جان لیکر نکل گیا۔ باپ اذبکوں کے حوالے کر گیا۔

ٹوڈرمل اور لشکر خاں مدد کیلئے جدا رہے تھے۔ شام تک الگ الگ لڑتے رہے۔ رات کو سیاہ چادر کے پردے میں وہ بھی سرک گئے۔ قنوج میں پہنچے۔ اور بھاگے بھٹکے بھی آ کر جمع ہوئے۔ بادشاہ کو عرضی لکھی اس میں حریفوں کے ظلم و ستم کو بڑی آب و تاب سے ادا کیا۔ التجا یہ کہ ایسے نمک حراموں کو قرار واقعی سزا دینی چاہیئے۔ حق یہ ہے کہ معز الملک کی تلخ مزاجی اور کج اخلاقی۔ اور ٹوڈرمل کی سختیوں نے امرائے ہمراہی کو بہت جلا رکھا تھا۔ وہ بھی وقت پر جان بوجھ کر پہلو دے گئے۔ ورنہ رسوائی کی نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ پرانے پرانے جانباز جنمیں حسین خاں بھی شامل تھے۔ میدان سے ٹلنے والے نہ تھے۔ مرنے اور مٹنے والے تھے۔

دربار میں ابراہیم خاں تیغ و کفن اُتار کر خلعت دربار پہن چکے تھے۔ علی قلی خاں کے وکیل بھی نقد و جنس تحفہ تحائف۔ کوہ پارہ اور صف شکن روانہ دربار کر چکے تھے کہ یہ عرضی پہنچی۔ بادشاہ نے کہا خیر اب تو ہم خانخاناں کی خاطر سے خانزماں کے اور اسکے ساتھ اوروں کے گناہ بھی بخش چکے۔ معز الملک اور ٹوڈرمل چپ چپاتے چلے آئے۔ اور رفاق پیشہ مدت تک آداب و کورنش سے محروم رہے۔ لشکر خاں بخشی گری سے معزول خواجہ جہان سے مہر کلاں کہ مہر مقدس کہلاتی تھی چھن گئی۔ اور سفر حجاز کو رخصت کیا۔

کم بخت خانزماں پر نحوست کی چیل نے پھر جھپٹا مارا۔ بادشاہ اس مہم سے فارغ ہو کر چنار گڈھ کا قلعہ دیکھنے گئے (اسے قلعہ نہ سمجھنا۔ جنگل کا جنگل بلکہ کوہستان ہے کہ فصیل کے حلقے میں گھرا ہوا ہے) وہاں شکار کھیلے۔ ہاتھی پکڑے۔ اسمیں دیر لگی۔ ملک مذکور کئی برس سے خانزماں کی حکومت میں رہ چکا تھا۔ یا تو بے انتظامی اسکی نہ دیکھ سکا۔ یا بادشاہی اہلکاروں کی بدعملی نہ برداشت کر سکا۔ غرض گنگا اُتر کر جونپور۔ غازی پور وغیرہ کا انتظام شروع کر دیا اس ارادہ پر کچھ سکندر خاں اذبک نے اُکسایا تھا۔ کچھ اُسکے دل میں

آصف خاں کا معاملہ بھی سُن لو۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ اس نے مجنون خاں کو خانزماں کی قید سے چھڑایا اور دونو فوج لیکر خانزماں کے مقابل ہو گئے۔ جب اہل دربار کے لالچ نے اسے بھی میدان وفاداری سے دھکیل کر نکال دیا۔ تو وہ جونا گڈھ میں جا بیٹھا۔ اب جو خانزماں کی مہم سے بادشاہ کی خاطر جمع ہوئی تو مہدی قاسم خان کو اُسکی گوشمالی کے لئے بھیجا۔ حسین خاں وغیرہ چند امرائے نامی کو حکم دیا۔ کہ فوجیں لیکر اُسکے ساتھ ہوں۔ آصف کو ہرگز اپنے سلیمان سے لڑنا منظور نہ تھا۔ درگاہ شاہی میں عفو تقصیر کی عرضی لکھی۔ مگر دعا قبول نہ ہوئی۔ ناچار خانزماں کو خط لکھا۔ اور آپ بھی جلد جا پہنچا خانزماں کے زخم دل ابھی ہرے پڑے تھے۔ جب ملا تو نہایت غرور اور بے پروائی سے ملا۔ آصف خاں دل میں پچھتایا۔ کہ ہائے یہاں کیوں آیا۔ ادھر سے جب مہدی خاں پہنچے۔ تو میدان صاف دیکھ کر جونا گڈھ پر قبضہ کر لیا۔ اور آصف خاں کو خانزماں کے ساتھ دیکھ کر پہلو بچالیا ✦

یہاں خانزماں آپ تو فرما نفرما بن کر بیٹھے۔ آصف خاں کو کہا کہ پورب میں جا کر پٹھانوں سے لڑو بہادر خاں کو اسکے ساتھ کیا۔ وزیر خاں آصف خاں کے بھائی کو اپنے پاس رکھا۔ گویا دونوں کو نظربند کر لیا۔ اور نگاہ اُن کی دولت پر۔ وہ بھی مطلب تاڑ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے اندر اندر پیچ دوڑا کر صلاح موافق کی۔ یہ اِدھر سے بھاگا۔ وہ اُدھر سے۔ کہ دونوں مل کر مانک پور پر آجائیں۔ بہادر خاں آصف کے پیچھے دوڑا۔ جونپور اور مانکپور کے بیچ میں سخت لڑائی ہوئی۔ آخر آصف خاں پکڑے گئے۔ بہادر خاں اُسے ہاتھی کی عماری میں ڈال کر روانہ ہوئے۔ ادھر وزیر خاں جونپور سے آتا تھا خبر سنتے ہی دوڑا۔ بہادر خاں کے آدمی تھوڑے تھے۔ اور تھکے ہوئے تھے۔ جو کچھ تھے لوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے حملے کو روک نہ سکا۔ بھاگ نکلا اور لوگوں سے کہا کہ عماری میں آصف کا فیصلہ کر دیں۔ وزیر خاں پیش دستی کر کے جا پہنچا۔ اور بھائی کو نکال لے گیا۔ پھر بھی آصف کی انگلیاں کٹیں اور ناک پر زخم آیا۔ انجام یہ ہوا کہ پہلے وزیر خاں حاضر حضور ہوا۔ پھر آصف خاں کی خطا معاف ہو گئی ✦

میر مرتضیٰ شریفی۔ میر سید شریف جرجانی کی اولاد میں تھے۔ اُن کی تحقیقات و تصنیفات نے انہیں علم کے دربار سے فخر نوع بشر ثانی عقل بادی عشر کا خطاب دلوایا تھا۔ یہ نہایت مقدس اور صاحب فضل و کمال تھے۔ ملا صاحب سال آئندہ کے حال میں لکھتے ہیں۔ کہ دلی میں فوت ہوئے۔ اور امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے ہمسایہ میں دفن ہوئے۔ قاضیوں نے اور شیخ الاسلام نے حضور میں عرض کی کہ امیر خسرو ہندی ہیں اور سُنی۔ میر مرتضیٰ ایرانی ہیں اور رافضی۔ کچھ شک نہیں کہ اُنہیں اس ہمسائے سے تکلیف ہو گی۔ حکم دیا کہ وہاں سے نکال کر اور جگہ دفن کر دو۔ سبحان اللہ۔ زمانہ کا اور خیالات کا انقلاب دیکھو

دعویٰ بھی ہوگا کہ آخر ملک حضور کا مال ہے۔ میں بھی حضور کا مال ہوں۔ قدیمی جاں نثار ہوں۔ اور انتظام ہی کرتا ہوں۔ تباہ تو نہیں کرتا۔ یاروں نے بادشاہ کو پھر چمکا دیا۔ کہ دیکھئے حضور کے حکم کو خاطر میں نہیں لاتا انہوں نے فوراً اشرف خاں میر منشی کو بھیجا کہ جونپور میں جاکر انتظام کرلو۔ خانزماں کی بڑھیا ماں کو قلعہ میں لاکر قید کردو۔ یہاں مظفر خاں کو لشکر اور چھاؤنی کا انتظام سپرد کیا۔ آپ یلغار کرکے خانزماں کی طرف دوڑے اور سر سوار غازی پور میں جا پہنچے۔ وہ اودھ کے کنارے پر تھا۔ اور بے فکر کاروبار میں معروف تھا۔ دفعۃً بادشاہ کی آمد آمد کا غل سُنا۔ خزانہ و مال کی کشتیاں بھری چھوڑیں اور آپ پہاڑوں میں گھس گیا ؁

ادھر بہادر خاں اپنے بہادر دلاوروں کو جونپور پر لیکر آیا۔ کمندیں ڈال کر قلعے میں کود گیا۔ ماں کو نکالا۔ اور میر منشی صاحب کو مضمون کی طرح باندھا اور لے گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ لشکر بادشاہی پر گر کر مظفر کو ظفر کی گردان پڑھائے۔ مگر سنا کہ بادشاہ اودھ سے پھرے آتے ہیں۔ اس لئے پھر سکندر رمیست دریا پلہ اتر گیا۔ خانزماں نے اپنے معتبر یعنی میرزا میرک رضوی کے ساتھ ماں کو پھر خانخاناں کے پاس بھیجا۔ معافی کے دروازہ کی زنجیر ہلائی۔ اور عجز و نیاز کے ہاتھوں سے قدم لئے۔ جو عرضی لکھی اس میں یہ شعر بھی تھا ؎

بدیں امید ہائے شاخ در شاخ	کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

خانخاناں صلاح و اصلاح کے ٹھیکہ دار تھے۔ انہوں نے میر عبداللطیف قزوینی۔ مخدوم الملک۔ شیخ عبدالنبی صدر کو بھی ساتھ شامل کیا۔ سب کو ساتھ لیکر حضور میں حاضر ہوا۔ انہوں نے حال عرض کیا۔ آخر قدیمی نمک پروردہ اور خدمت گزار تھے۔ اگلی پچھلی جاں نثاریوں نے شفاعت کی۔ اکبر نے کہا خطا معاف جاگیر بحال مگر حضور میں آکر حاضر رہیں۔ یہ حکم لیکر روانہ ہوئے۔ جب لشکر کے پاس پہنچے۔ تو خانزماں استقبال کو آیا۔ بڑی تعظیم و تکریم سے لے گیا۔ ضیافتیں کھلائیں۔ جواب میں عرض کیا کہ حضور بدولت و اقبال دارالخلافہ کو تشریف لے جائیں۔ دو تین منزل آگے بڑھکر دونوں غلام حاضر حضور ہوتے ہیں۔ برسوں سے یہاں ملک داری اور ملک گیری کر رہے ہیں۔ حساب کتاب کا فیصلہ کو دیں۔ بزرگان مذکور کو بڑے اعزاز و احترام سے رخصت کیا۔ بہت سے تحائف دئے۔ انہوں نے پھر جاکر حضور میں عرض کی۔ یہ بھی قبول ہوئی اور عہد و پیمان کو قسموں کی زنجیروں سے مضبوط کیا۔ بادشاہ دارالخلافہ میں داخل ہوگئے ؁

آزاد۔ تدبیر کے بندے ضرور کہینگے کہ حاضر باشی دربار کا مورچہ بہت خوب ہاتھ آیا تھا۔ سپاہی تھے اہلکار نہ تھے اس لئے چال چوکے۔ یا یہ کہو کہ دور رہنے میں جو آزاد حکومت کا مزا پڑ گیا تھا۔ اس نے جونپور مانک پور سے الگ نہ ہونے دیا۔ ورنہ موقع یہ تھا کہ جس بادشاہ کے حکموں سے وہ انہیں خراب کر رہے تھے اب یہ پہلو میں بیٹھنے اور اُسی کی تلوار سے حریفوں کے ناک کان کاٹتے ؁

چند ہی روز بعد یہ عالم ہوا کہ علمائے سینہ زور میں سے ایک نہ رہا۔ اکبری دربار کا رنگ ہی اور ہوگیا۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام وغیرہ وغیرہ صدہا ایرانی تھے۔ اور سلطنت کے کاروبار تھے۔ جو لوگ ایک زمانے میں دب کر نہایت سختی اٹھاتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد زمانہ ضرور انہیں اٹھا کر بلند کرتا ہے

اکبر یہاں اس جھگڑے میں تھا۔ جو خبر پہنچی کہ کابل میں فساد عظیم برپا ہوا۔ اور مرزا حکیم فوج لیکر کابل سے پنجاب کی طرف آتا ہے۔ سُن کر بہت تردد ہوا۔ امرائے پنجاب اس کے سینے پر خاطر خواہ ٹکر مار کر ہٹا سکتے تھے۔ مگر اکبر کو بڑا خیال یہ تھا۔ کہ اگر وہ ادھر سے بھاگا اور ہماری طرف سے مایوس ہوا تو ایسا نہ ہو کہ بخارا میں اُزبک کے پاس چلا جائے۔ اس میں خاندان کی بدنامی بھی ہے۔ اور یہ قباحت بھی ہے کہ اگر ازبک اسے ساتھ لیکر ادھر رخ کرے۔ اور کہے کہ ہم فقط حقدار کو حق دلوانے آئے ہیں۔ تو قندھار کابل۔ بدخشاں کا لے لینا اُسے سہل ہے۔ اس لئے تمام امرائے پنجاب کو لکھا کہ کوئی حکیم مرزا کا مقابلہ نہ کرے۔ جہاں تک آئے آنے دو۔ مطلب یہ کہ شکار ایسے موقع پر آجائے۔ جہاں سے بآسانی ہاتھ آجائے ادھر خانزماں سے عفو تقصیر پر فیصلہ کرکے آگرہ کی طرف ہٹا۔ حکیم مرزا کا حال دیکھو تتمہ کے حالات میں اور یہ بھی دیکھو کہ اس کی بغاوت نے کتنی دُور جاکر گل کھلایا ہے)

خانزماں نے جب سُنا کہ حکیم مرزا پنجاب پر آتا ہے۔ تو بہت خوش ہوا۔ اس واقعہ کو اپنے حق میں تائید آسمانی سمجھا اور کہا ع

خدا شرے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد

جونپور میں اُس کے نام کا خطبہ پڑھا اور عرضی لکھی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم ہزار نمک خوار موروثی حضور کے حکم کا منتظر بیٹھا ہے۔ آپ جلد تشریف لائیں۔ غزالی مشہدی خانزماں کے حضور میں ایک شاعر باکمال تھا اس نے سکّہ کا سجع بھی کہہ دیا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم	وارث ملک است محمد حکیم

اتنی بات پر صبر نہ کیا جہاں جہاں امرائے بادشاہی تھے۔ فوجیں بھیج کر انہیں گھیر لیا۔ ابراہیم حسین مرزا وغیرہ کو لکھا کہ تم بھی اُٹھ کھڑے ہو یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ اور خود فوج لے کر قنوج پر آیا ؛

اکبر کا اقبال تو سکندر کے اقبال سے شرط باندھے ہوئے تھا۔ پنجاب اور کابل کی مہم کا فیصلہ اس آسانی سے ہوگیا کہ خیال میں بھی نہ تھا۔ چند روز پنجاب میں شکار کھیلتا رہا۔ ایک دن شکارگاہ میں وزیر خاں آصف خاں کا بھائی آیا۔ اور بھائی کی طرف سے بہت عذر معذرت کی۔ اکبر نے اس کی خطا معاف کرکے پھر پنجہزاری کی خدمت دی ؛

تیسری فوج کشی

مہم کابل کی تحقیقات سے اکبر کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ یہ منصوبہ خانزماں کا پورا پڑتا تو تمام ہندوستان ایک آتشبازی کا میدان ہو جاتا۔ اس صورت میں واجب ہے کہ ان دونو بھائیوں کا پورا تدارک کیا جائے چنانچہ آصف خاں وزیر خاں کو حکم دیا کہ جاؤ اور کڑہ مانکپور کا ایسا کڑا انتظام رکھو کہ خانزماں اور بہادر خاں جنبش نہ کر سکیں۔ ۱۲ رمضان ۹۷۴ھ کو لاہور سے کوچ کیا۔ اور خود بھی جھٹ پٹ یلغار کر کے آگرہ پہنچا جنگ آزمودہ امیروں کو فوجوں کے ساتھ روانہ کیا۔ ہراول حسین خاں کے نام پر ہوئی۔ اس کی سخاوت اسے سدا مفلس رکھتی تھی۔ اب جو ستواس کا صدمہ اٹھا کر آیا تھا تو بہت شکستہ حال ہو رہا تھا معلوم ہوا کہ شمس آباد اپنے علاقے پر گیا ہوا ہے۔ اس لئے قیاخاں گنگ ہراول ہوا۔ ۲۶ شوال کو آگرہ سے نکلا سکیٹ مشرق آگرہ میں خبر لگی کہ خانزماں نے قنوج سے ڈیرے اٹھائے اور رائے بریلی کو چلا جاتا ہے۔ محمد قلی برلاس اور ٹوڈرمل کو ۶ ہزار فوج دیکر سکندر خاں ازبک کے روکنے کو بھیجا۔ اور آپ مانکپور کو مڑے اور چاروں طرف تیاری اور خبرداری کے فرمان بھیج دئے۔ رائے بریلی میں پہنچ کر سنا کہ خانزماں نے سلطان مرزا کی اولاد سے سازش کر لی ہے مالوہ کو جاتا ہے کہ ادھر کے علاقے فتح کرے اور کچھ نہ ہو تو شاہان دکن کی پناہ میں جا بیٹھے ؛

علی قلی خاں کو یہ خیال تھا کہ جن جھگڑوں میں میں نے اکبر کو ڈالا ہے۔ ان کا برسوں میں فیصلہ ہو گا چنانچہ ایک قلعے پر کسی بادشاہی سردار کو گھیرے پڑا تھا۔ خبر پہنچی کہ اکبر آگرہ میں آن پہنچے۔ اور تمہاری طرف کو نشان لشکر لہراتا چلا آتا ہے۔ ہنس کر یہ شعر پڑھا ؎

سمند تند زیں لعل او خورشید را ماند	کہ از مشرق بمغرب رفت یک شب در میاں ماند

پھر بھی وہ ہمت کا پہاڑ اور تدبیر کا دریا تھا۔ شیر گڈھ (قنوج) سے مانک پور کو چلا کہ بہادر خاں بھی وہیں تھا۔ یہ کسی اور سردار کو گھیرے پڑا تھا۔ دونو بھائی گنگا کے کنارے کنارے چل کر سنگروڑ (مانک پور اور الہ آباد کے بیچ میں ہے شاید نواب گنج کہلاتا ہے) کے پاس پل باندھ کر گنگا اتر گئے۔ اکبر نے جب یہ خبریں سنیں۔ تو یلغار کر کے چلا مگر رستے دو تھے۔ ایک عام شاہ راہ کہ طولانی تھا۔ دوسرا نزدیک تھا۔ مگر بیچ میں پانی نہ ملتا تھا۔ لوگوں نے حال عرض کیا۔ اور شاہ کو شاہ راہ پر چلنے کی صلاح دی۔ بلند نظر بادشاہ نے کہا۔ کہ جو ہو سو ہو۔ جلد پہنچنا چاہئے۔ توکل بخدا ادھر ہی سے روانہ ہوا۔ اقبال کا زور دیکھو کہ رستے میں مینہ برسا ہوا تھا جا بجا تلاؤ کے تلاؤ بھرے ملے۔ اور فوج اس آرام سے گئی کہ آدمی یا جانور کسی کو تکلیف نہ ہوئی ؛

غرض شب و روز مارا مار چلا گیا۔ رات کا وقت تھا کہ گنگا کے کنارے پر پہنچا۔ جسکے پار کڑہ مانک پور

آباد ہے۔ کشتی ناؤ کچھ نہ تھی۔ سب کی صلاح یہی تھی کہ یہاں ٹھیر کر امرا کا انتظار کریں خاطر خواہ سامان سے آگے بڑھنا چاہئے کہ علی قلی خاں کا سامنا ہے۔ مگر اکبر نے ایک نہ سُنی۔ بال سُندر پر سوار تھا۔ آپ آگے بڑھا اور دریا میں ہاتھی ڈال دیا۔ خدا کی قدرت اقبال کا زور۔ گھاٹ بھی ایسا مل گیا۔ کہ دریا پایاب تھا گنگا جیسا دریا اور ہاتھی کو کہیں تیرنا نہ پڑا۔ غرض بہت سے نامی اور جنگی ہاتھی ساتھ تھے اور فقط سو سواروں کے ساتھ پار ہوا۔ اور پچھلی رات چپ چاپ گنگا کے کنارے پر سو کر گذار دی خانزماں کے لشکر میں بہت تھوڑا فاصلہ تھا۔ کہ نواب گنج سے پھر کر کڑہ کو دریا کے داہنے کنارے پرگنہ سنگروڑ میں آگیا تھا۔ صبح ہوئی۔ تو علی قلی خاں کی فوج کے سر پر تھا۔ اس وقت آصف خاں بھی مسلح اور تیار فوج لئے آن پہنچا مجنون خاں اور آصف خاں دمبدم خانزماں اور اس کے لشکر کی خبریں اکبر کو پہنچا رہے تھے۔ اور حکم یہ تھا کہ پہر میں دو دفعہ قاصد بھیجو۔ اور احتیاط رکھو کہ خانزماں کو خبر نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نکل جائے۔ علی قلی خاں اور بہادر خاں کو بادشاہ کے اس طرح پہنچنے کا سان گمان بھی نہ تھا۔ یہاں تمام رات ناچ گانا تھا اور شراب عشرت کا دور تھا۔ رنڈیاں چھم چھم ناچتی ہیں اور کہتی ہیں بشکن بشکن۔ مست محفل خماری آنکھیں کھولتے اور کہتے ہاں۔ بشکن بشکن کہ مبارک شگونیست بشکستیم دشمن را ع

زدیم بر صف رنداں و ہرچہ بادا باد

غرض رات نے صبح کی کروٹ لی۔ ستارہ نے آنکھ ماری۔ اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے۔ بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جاکر بہ آواز بلند چلایا کہ مستو! بیخبرو! کچھ خبر بھی ہے! بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہنچے اور دریا بھی اتر لئے۔ اُس وقت خانزماں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنون خاں قاقشال کو بھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پروا نہ کی۔ خبر دینے والا بھی کوئی بادشاہی ہوا خواہ تھا۔ چونکہ فوج بادشاہی بہت کم تھی۔ یعنی تین چار ہزار فوج امرا کی تھی۔ پانسو سوار بادشاہ کے ہمراہ آئے تھے۔ پیچھے پانسو ہاتھی بھی آن پہنچے تھے۔ بہرحال اکثر سردار نہ چاہتے تھے کہ اس میدان میں تلوار چل جائے۔ اُس شخص کا مطلب یہ تھا۔ کہ بادشاہ کے آنے کی خبر سُن کر خانزماں بھاگ جائے۔ غرض نور کا تڑکا تھا۔ کہ بادشاہی نقارہ پر چوٹ پڑی۔ یہ آواز سُن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کا بندوبست کرنے لگے۔

سنہ ۹۷۴ھ نو بجے پیر کا دن۔ عید قربان کی پہلی تاریخ تھی۔ سنکرواں[1] (سنگرواں) علاقہ الہ آباد پر

[1] بلاک مین صاحب کہتے ہیں سکروال کو اس فتح کے سبب سے اب تک فتح پور کہتے ہیں ایک چھوٹا سا گاؤں کڑہ کے جنوب مشرق میں ہے ۱۰ - ۱۱ میل پر۔ اور دریا سے بہت دور نہیں۔

مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونو بھائی شیر ببر کی طرح آئے اور اپنے اپنے پرے جما کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں خان زماں قائم ہؤا۔ ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھ کر فوج کے پرے باندھے۔ پہلے ہی بادشاہی فوج سے بابا خاں قاقشال ہراول کی فوج لے کر آگے بڑھا اور دشمن کی طرف سے جو ہراول اس کے سامنے آیا اُسے ایسا دبا کر ریلا کہ وہ علی قلی خاں کی فوج میں جا پڑا۔ بہادر خاں دیکھ کر جھپٹا۔ اور اس صدمے سے آکر گرا کہ بابا خاں کو اٹھا کر مجنون خاں کی فوج پر دے مارا۔ اور باوجودیکہ اپنی فوج بے ترتیب ہو رہی تھی۔ دونو کو اُلٹا پلٹتا آگے بڑھا۔ دم کے دم میں صفوں کو تہ و بالا کر دیا۔ ادھر اُدھر چاروں طرف لشکر میں قیامت برپا ہوئی۔ اور ساتھ ہی قلب کا رُخ کیا۔ کہ اکبر امرا کے غول میں وہیں موجود تھا۔ بڑے بڑے سردار اور بہادر جاں نثار آگے تھے۔ انہوں نے سینہ سپر ہو کر سامنا رد کا مگر کھلبلی پڑ گئی۔

بادشاہ بال سندر ہاتھی پر سوار تھے۔ اور مرزا عزیز کوکہ خواصی میں بیٹھے تھے۔ ان کا خاندان گرد و پیش جما ہؤا تھا۔ اکبر نے دیکھا۔ کہ میدان کا رنگ بدلا۔ بنظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہؤا ۔ اور بہادروں کو للکارا۔ اب دونوں بھائیوں نے پہچانا کہ ضرور بادشاہ اس لشکر میں ہے۔ کیونکہ سرداروں میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو اس کے سامنے اس طرح جم کر ٹھہرے۔ اور بندوبست سے جابجا مدد پہنچائے۔ ساتھ ہی ہاتھیوں کا حلقہ نظر آیا۔ اب انہوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا۔ اور جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہو گئے۔ کیونکہ بادشاہ کا مقابلہ ایک غور طلب امر تھا۔ اسے وہ بھی نہ چاہتے تھے۔ ان بدنصیبوں نے بھی خوب لاگ ڈانٹ سے لڑائی جاری کر رکھی تھی۔ مگر نمک کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب رکھتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گر پڑا اور وہ پیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ سب کو بدحواس دیکھکر خود آگے بڑھا اور فوجداروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی صف کو علی قلی خاں کی فوج پر ریل دو کہ بہادر خاں کو ادھر متوجہ ہونا پڑے۔ دونوں لشکر تہ و بالا ہو رہے تھے علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا۔ اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ دونو بھائیوں پر کیا گذری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم ہوئی اور کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

بات یہ ہوئی کہ ادھر سے پہلے ہیرانند ہاتھی علی قلی خاں کی فوج پر جھکا۔ اُدھر سے مقابلے میں رودیانہ ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلہ کی ٹکر ماری کہ رودیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے تیر کی طرح علی قلی خاں کے لگا۔ دلاور بڑی بے پرواہی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا۔ اور ایسا بیڈھب لگا کہ ہرگز سنبھل نہ سکا۔ گرا اور سوار کو بھی لیکر گرا۔ ہمراہیوں نے دوسرا گھوڑا سامنے کیا۔ اتنے عرصے میں کہ ذرہ

سوار ہو ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہؤا بلا کی طرح اس پر پہنچا۔ خانزماں نے آواز دی فوجدار ہاتھی کو روکنا۔ میں سپہ سالار ہوں۔ زندہ حضور میں لے جا۔ بہت انعام پائے گا۔ اس کم بخت نے نہ سنا۔ ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خانزماں جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اُڑتے تھے۔ اسے ہاتھی روند کر ہوا کی طرح اور طرف نکل گیا۔ اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا۔ اللہ اللہ جس بہادر کو فتح و اقبال ہوا کے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے۔ جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر لٹاتے تھے۔ وہ خاک پر پڑا دم توڑتا تھا۔ جوانی سرہانے کھڑی سر پیٹتی تھی۔ اور دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ ہاں خانزماں! یہ یہاں کا معمولی قانون ہے۔ تم نے ہزاروں کو خاک و خون میں لٹا دیا۔ آؤ بھائی اب تمہاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمہیں سونا ہو گا۔

سرلشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہو گیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر اُدھر کمک دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں نظر بہادر بہادر خاں کو اپنے آگے گھوڑے پر سوار کر کے لایا۔ اور حضور میں پیش کیا۔ اکبر نے پوچھا بہادرا چونی؟ کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا۔ اس نے کہا۔ الحمد للہ علیٰ کل حال۔ بادشاہ کا دل بھر آیا بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا۔ پھر کہا بہادر۔ مالشما چہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر بر روئے ماکشیدید۔ وہ شرمندہ شرمسار سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارے خجالت کے کچھ جواب نہ دے سکا۔ کہا تو یہ کہا کہ الحمد للہ علیٰ کل حال کہ در آخر عمر دیدار حضرت بادشاہ کہ ماحی گناہان است نصیب شد۔ آفرین ہے اکبر کے حوصلے کو۔ گنہ بخش کا لفظ سنتے ہی آنکھیں نیچے کر لیں۔ اور کہا۔ بحفاظت نگہدارید۔ اس نے پانی مانگا۔ اپنی چھاگل میں سے پانی دیا۔

اس وقت تک کچھ خبر نہ تھی۔ کہ علی قلی خاں کا کیا حال ہؤا۔ دولت خواہوں نے سمجھا کہ ایسے شیر بھائی کا قید ہونا علی قلی خاں نہ دیکھ سکیگا۔ قیامت برپا کریگا۔ اپنی جان پر کھیلیگا۔ گر اسے چھڑا لے جائیگا۔ اس لئے کوئی کہتا ہے بے اطلاع۔ کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کنبو نے بے نظیر بہادر کا نقش صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ مگر ملا صاحب کہتے ہیں کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے۔

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔ نمک حرام پکڑے آتے تھے۔ اور مارے جاتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال خانزماں کا تھا۔ جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے۔ اتنے میں بابو فوجدار[1] پکڑا آیا۔ اس نے عرض کی کہ میں دیکھتا تھا۔ حضور کے ایکدنت ہاتھی نے اسے مارا ہے۔ ہاتھی اور مہاوت کے پتے بھی بتائے بہت سے ہاتھی دکھائے۔ چنانچہ اُس نے نین سکھ ہاتھی کو پہچانا اور حقیقت میں اس کے ایک دانت تھا۔

اکبر ابتک شبہ ہی میں تھا۔ حکم دیا۔ کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے۔ انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لئے اشرفی۔ ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ ہائے کمبخت ہندوستانیو! تمہارے سر کٹ کر بھی سستے ہی

[1] فوجدار فیلبان کو کہتے ہیں۔

رہے ؛ لشکر کے لوگ بے سرو پا اُٹھ دوڑے۔ گودیں بھر بھر کر سر لاتے تھے۔ اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے۔ ہر سر کو دیکھتے تھے۔ دکھاتے تھے۔ اور پہچانتے تھے۔ افسوس انہی سروں میں سے خانزماں کا سر بھی ملا کہ ادبار کا سر ہو گیا۔ سبحان اللہ۔ جس سر سے فتح کا نشان جدا نہ ہوتا تھا۔ جس سے اقبال کا خود اترتا نہ تھا۔ جس چہرے کو کامیابیوں کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی۔ اُس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں۔ نحوست نے خاک ڈالی تھی۔ کون پہچانے ؛ سب کو تردد تھا۔ **ارزانی مل** اس کا خاص اور معتبر دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا۔ بلایا اور دکھا کر پوچھا۔ اس نے سر کو اُٹھا لیا۔ اپنے سر پہ پڑے مارا اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ خواجہ دولت کہ پہلے اس کے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا۔ وہاں سے آکر حضور میں ملازم اور پھر دولت خاں ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا اور کہا مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان بائیں طرف سے کھایا کرتا تھا۔ اس لئے ادھر کے دانت رنگین ہو گئے تھے۔ دیکھا تو ایسا ہی تھا ✦

اُس بد نصیب پر وہاں یہ گذری تھی۔ کہ نین سُکھ تو روند کر چلا گیا۔ وہ نیم جاں پڑا دم توڑتا تھا۔ کوئی گمنام چھاؤنی کا چکر یا وہاں جا نکلا۔ اور مغل کو سسکتے دیکھ کر سر کاٹ لیا۔ اتنے میں ایک بادشاہی چیلا پہنچا۔ اس نے اس سے چھین لیا۔ اور دھکے دیکر دھتکار دیا۔ آپ آکر اشرفی انعام لے لی۔ ہائے زمانے کی گردش دیکھتے ہو! یہ اسی سیستانی رستم ثانی کا سر ہے۔ اس پر کتے لڑ رہے ہیں۔ الٰہی کتوں کا شکار نہ کروائے۔ شکار بھی کروائے تو شیر ہی کا کروائے۔ نہیں نہیں۔ تیرے ہاں کیا کمی ہے۔ شیر کا پنجہ سلامت ہو۔ اور دنیا کے کتوں پر شیر رکھیو ✦

جب اکبر کو یقین ہوا کہ خانزماں کا بھی کام تمام ہوا۔ تو گھوڑے سے اُتر کر خاک پر پیشانی کو رکھ دیا اور سجدۂ شکر بجالایا۔ تمام اہل تاریخ اس مہم کے خاتمے پر عبارتوں کا زور دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ فتح کارنامہائے جہاں ستانی سے تھی۔ کہ فقط تائید حضرت ذوالجلال۔ اور تقویت دولت و اقبال سے ظہور میں آئی وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ گرمی بشدت تھی۔ مگر اسی دن بادشاہ الٰہ آباد میں چلے آئے۔ خانزماں ؛ بل بے تری ہیبت اور واہ رے تیرا دبدبہ۔ مرد ہو تو ایسا ہو۔ آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ ہاں اس بات کا افسوس ہے۔ کہ خاتمہ اچھا نہ ہوا۔ تو اس سے بھی زیادہ تباہی و بدحالی سے مرتا۔ تیری لاش اس سے بھی سوا خراب و خوار ہوتی مگر آقا کی جاں نثاری میں ہوتی تو آب زر سے لکھی جاتی۔ خدا حاسدوں کا منہ کالا کرے جنہوں نے دونوں بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو روسیاہی کر دیا۔ **آزاد** بھی ایسے ہی بے لیاقت بد اصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے۔ پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ ہے اور خدا محفوظ رکھے۔ یہ نااہل تو دکھ نہیں کر سکتے۔ لوروں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر

لاتے ہیں اور مورچے باندھتے ہیں - موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں - خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا اپنے تئیں خدا کے اور اُنہیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اُن کے اعمال ہی اُن سے سمجھ لیتے ہیں ؎

کہ روزگار ترا جا کر بست کینہ گذار	تو بد کنندۂ خود را بروزگار گذار

اتفاق - خواجہ نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ میں ان دنوں آگرہ میں تھا۔ ادھر تو مقابلے ہو رہے تھے - ادھر لوگ رات دن نئی نئی ہوائیاں اُڑا رہے تھے - اور یونہیں افیمیوں کا تو کام ہی ہے - ایک دن دو چار دوست بیٹھے ہوئے تھے - جی میں آیا کہ لاؤ ہم بھی ایک پھلجھڑی چھوڑیں مضمون یہ تراشا کہ خانزمان اور بہادر خاں مارے گئے - بادشاہ نے اُن کے سر کٹوا کر بھیجے ہیں - دارالخلافہ کو چلے آتے ہیں - چند شخصوں سے ذکر کیا - شہر میں ہی چرچا فوراً پھیل ہو گیا - خدا کی قدرت کہ تیسرے دن اُن کے سر آگرہ میں پہنچ گئے - اور وہاں سے دلی اور لاہور ہوتے ہوئے کابل پہنچے ملا صاحب لکھتے ہیں کہ میں بھی اس تجویز میں شامل تھا ؎

چو اختر در گذشت آں خال شد راست	بسا فالے کہ از بازیچہ برخاست

جن کو اُن سے فائدے تھے اُنہوں نے پُر درد اور غمناک تاریخیں کہیں ؎

بنیاد فلک سراسر از پا افتاد	چوں خانِ جہاں ازیں جہاں رفت بباد
فریاد ز دستِ فلکِ بے بنیاد	تاریخ وفاتش از خرد جستم گفت

دوسری طرف والوں نے کہا - فتح اکبر مبارک - ایک تاریخ کا مصرع ہے - ع

قتل دو نمک حرام بے دیں

اور اس میں ایک کی کمی ہے قاسم ارسلان نے کہی تھی - لفظ اخیر کو دیکھنا - وہی مذہب کا اشارہ ہے آزاد کہتا ہے کہ شیعہ بیرم خاں بھی تھے - اُن کے لئے ہر شاعر اور ہر مورخ نے سوا تعریف کے زبان نہیں ہلائی - یہ انعام ہے اُسی بد زبانی کا کہ غیر مذہب کے لئے جو مُنہ میں آتا تھا کہہ اُٹھتے تھے - ایک شخص سے محبت رکھنی کچھ اَور شے ہے اور بد کلامی اور بے تہذیبی کچھ اَور شے ہے - اچھا جیسا تم نے کہا تھا ویسا سن لو اُستاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے	بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے

بُرج علی بچارا اس طرح سے کیوں گرا - اسی بُنیاد پر اپنے سر پر آسمان کیوں ٹوٹتا - اسی بُنیاد پر - خیر آزاد کو ان جھگڑوں سے کیا غرض ہے بات میں بات نکل آئی تھی کہہ دی ؎

وگر غافل شدی افسوس افسوس	اگر دریافتی بر دانشت بوس

بے لاگ تاریخ تو یہ ہوئی ہے - کہ - دو خون شدہ - مگر اِس کی بُنیاد یہ ہوئی کہ پانچ برس پہلے جب انکہ خاں کو ادہم خاں نے مارا - اور مارا گیا - تو کہنے والوں نے کہا تھا کہ - دو خون شد ب یہ دونو مارے گئے ۹۶۹ھ = ۵ - ملا صاحب نے کہا - دو خوں شدہ

خانزماں سخی تھا - عالی ہمّت تھا - اور امیرانہ مزاج رکھتا تھا - فکر کا تیز اور مزاج کا ذکی تھا علما و شعرا اور اہلِ کمال کا بڑا قدرداں تھا - شہر زمانیہ اِسی کا آباد کیا ہوا شہر ہے - اور ریلوے کا سٹیشن بھی ہے - ۷ کوس غازی پور سے ہے - عزالی مشہدی اپنی بداعمالی و بداطواری کے سبب سے وطن کو بھاگ گیا - اور پھر کر دکن میں آیا - وہاں تنگ تھا - خانزماں نے ہزار روپیہ خرچ بھیجا اور بُلا بھیجا - ساتھ اس کے رباعی لکھی - دیکھنا ہزار کا اشارہ کس خوبصورتی سے کیا ہے ؎

اے عزالی بحقِ شاہِ نجف | کہ سوئے بندگانِ بیچوں آئی
چونکہ بے قدر بودہ آنجا | سرِ خود را بگیر و بیروں آئی

الفتی یزدی کہ شاعر تھا اور علومِ ریاضی میں صاحبِ کمال تھا - خانزماں کے پاس نہایت خوشحالی کے ساتھ رہتا تھا - وُہ آپ بھی شعر کہتا تھا کہ - عاشق مزاجی کا مصالح ہے سلطان تخلص کرتا تھا اور شعر و شاعری کے جلسے رکھتا تھا - جب خانزماں نے غزل کہی جس کا مطلع ذیل میں لکھا جاتا ہے تو اِدھر کے اضلاع میں بہت شاعروں نے اِس پر غزلیں کہیں ؎

خان زمان	باریک چو موئیست میانے کہ تو داری	گویا سرِ آں موست دہانے کہ تو داری
کسی اور صاحب طبع نے کہا	گفتم کہ گمانیست دہانے کہ تو داری	گفتا کہ یقین است گمانے کہ تو داری
دیکھنا و ہاں تک کیا ہی کہا	سرچشمۂ خضر است دہانے کہ تو داری	ماہیست دراں چشمہ زبانے کہ تو داری

مُلّا صاحب کو طرزِ قدما پسند ہے اِس لئے اُس زمانے کی شاعری پر طنز کرکے کہتے ہیں ایسی شاعری جس کا زمانہ جاہلیت میں رواج تھا اور اب غنیمت معلوم ہوتی ہے - ان دنوں میں اس سے توبۂ نصوح کرنی اچھی ہے - خانزمان کے چند شعر لکھکر اس کا مذاقِ طبع دکھاتا ہوں :-

لہٗ
فغان و نالہ بسانِ جرس مکن اے دِل | زجورِ یار شکایت بکس مکن اے دل

ولہٗ
صبا بحضرتِ جاناں بآں زماں کہ توانی | نیاز مندیِ من عرض کن چناں کہ توانی

ولہٗ
دلبرے دارم کہ رویش چوں گل و سنبل است | سُنبلِ پُرچین او افتادہ بر روئے گل است

ولہٗ
جانا! نبود مثلِ تو جانانۂ دیگر | مانندِ من دل شدہ دیوانۂ دیگر
اے مغبچہ از دست تو پیمانہ نہ نوشم | مامست الستیم ز پیمانۂ دیگر

شعرائے عصر کے سلسلے میں جو مُلّا صاحب نے سلطان سبکلی کا حال لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ قندھار کے علاقہ میں سبکل ایک گاؤں ہے۔ سلطان وہاں کا رہنے والا تھا۔ لوگ اُسے چھپکلی کہتے تھے۔ وہ شہ ملّا تھا اور کہتا تھا کہ کیا کروں لوگوں نے کیسا کثیف اور مردار نام رکھ دیا ہے خانزمان کا تخلص بھی سلطان تھا اُس نے سبکلی کو خلعت گراں بہا کے ساتھ ہزار روپیہ بھیجا اور کہا کہ مُلّا یہ تخلص ہماری خاطر سے چھوڑ دو۔ اُس نے وہ ہدیہ پھیر دیا اور کہا کہ واہ میرے باپ نے سُلطان محمد میرا نام رکھا ہے۔ میں اِس تخلص کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ میں تم سے برسوں پہلے اس تخلص سے شعر کہتا رہا اور شہرت تمام حاصل کی ہے۔ خانزمان نے مُلّا کو سمجھایا۔ آخر کہا کہ نہیں چھوڑتے تو ہاتھی کے پاؤں میں کچلوا تا ہوں اور غصہ ہو کر ہاتھی بھی منگا لیا اُس نے کہا نہے سعادت کہ شہادت نصیب ہو۔ جب خانزمان نے بہت دھمکایا تو مولینا علاؤالدین لاری خان زماں کے اُستاد موجود تھے اُنہوں نے کہا کہ مولینا جامی کی ایک غزل اگر فی البدیہہ جواب کہدے تو معاف کر دو ورنہ کہہ سکے تو تمہیں اختیار ہے دیوان موجود تھا۔ یہ مطلع نکلا۔

دل خطت را رقمِ صنع الٰہی دانست	بر سرِ سادہ رُخاں حجتِ شاہی دانست

محمد سلطان نے اُسی وقت غزل لکھی اس کا مطلع ہے۔

ہر کہ دل را صدف سرِ الٰہی دانست	قیمتِ گوہرِ خود را بکماہی دانست

باوجودیکہ کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی خانزماں بہت خوش ہوا تحسین و آفرین کی اور اس سے چند در چند زیادہ انعام دیکر اعزاز سے رخصت کیا۔ پھر سُلطان وہاں نہ رہ سکا۔ خانزماں سے رخصت بھی نہ ہوا اور نکل گیا۔ (مُلّا صاحب کہتے ہیں) حق یہ ہے کہ بے مروتی اُسی کی تھی۔ خانزمان جیسا امیر اس انسانیت کے ساتھ تخلص مانگے اور وہ ایسے بزرگوں سے قیل و قال کرے مناسب نہ تھا۔

آزاد۔ مُلّا صاحب لاگ کہنے والے ہیں۔ شاہ و وزیر پیر و مُرید کسی سے چوکتے نہیں اور مذہب کی کھٹک سے دونوں بھائیوں سے خفا بھی ہیں۔ تاریخ قتل میں نمکحرام بھی کہا۔ بے دین بھی کہا۔ پھر بھی جہاں خانزمان اور بہادر خاں کا ذکر آیا ہے ان کے کارنامے بیان کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے ہیں اور باغ باغ ہوتے ہیں۔ اور جہاں بغاوت کا ذکر کیا ہے وہاں بھی حاسدوں کی فتنہ پردازی کا اشارہ ضرور کیا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ان کے اوصاف ذاتی نیکی فیض رسانی۔ کمال کی قدر دانی۔ دلاوری شمشیر زنی۔ میں نے خوب دیکھا وصف اصلی میں ایک پرزور تاثیر ہے۔ خواہ اپنا ہو خواہ بیگانہ۔ طبیعت اپنے حق کو اس کے مُنہ میں سے اس طرح کھینچ کر نکالتی ہے جیسے سُنار جنتری میں سے تار نکالتا ہے۔

بہادر خاں بھی موزوں طبیعت تھا۔ ملّا۔ آصفی کی زمین میں اس کی غزل کا مطلع ہے ؎

آصفی

برماشبِ غم کار بسے تنگ گرفتہ | کو صبح کہ آئینۂ ما زنگ گرفتہ

بہادر

آں شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ | گویا بمن خستہ رہِ جنگ[۱] گرفتہ

بنشستہ مہِ من بہ سرِ مسندِ خوبی | شاہیست کہ جا بر سرِ اورنگ گرفتہ

از نالۂ دمے بس نکند بے تو بہادر | زنبیاں کہ نئے غم زتو در چنگ گرفتہ

یہ لکھ کر (ملّا صاحب فرماتے ہیں) ان کا اتنا ہی بہت ہے کلام الملوک ملوک الکلام۔ اس کا اصلی نام محمد سعید خاں تھا۔ ہمایوں کے عہد میں بیرم خاں کی مصلحت سے زمینداور کا حاکم رہا۔ اکبری عہد میں خطا معاف ہوئی بیرم خاں کا دور تھا ملتان کا حاکم ہوگیا۔ سنہ ۲ جلوس میں مانکوٹ کی مہم میں بلایا گیا۔ نام کی بہادری کو کام کی بہادری سے ثابت کیا۔ پھر ملتان گیا اور بلوچوں کی مہم ماری۔ سنہ ۳ جلوس میں مالوہ کی مہم پر گیا۔ بیرم خاں کی مہم میں اہل دربار نے اُسے لیا اور وکیل مطلق کر دیا۔ چند ہی روز کے بعد اٹاوہ کا حاکم کر کے بھیجدیا جس پھرتی کے ساتھ اس نے اپنے بھائی کے کارناموں میں حصہ لیا اس کا تماشا بھی دیکھ چکے۔ اخیر وقت کا حال بھی دیکھ لیا کہ شہباز خاں کمبو کی بے دردی سے کبوتر کی طرح شکار ہوگیا۔ اٹاوہ میں تھے جب ولی بیگ ذوالقدر کا سر بادشاہی فوجیں لیکر پہنچا۔ اُنہوں نے اُسے مروا ڈالا۔ خیر خواہوں نے اس خیال سے کہ مبادا بادشاہ کے دل پر ملال آئے اُنہیں دیوانہ بنا دیا۔ اور اس بہانہ سے بلا ٹل گئی ؎

۱؎ جنگی آدمی تھا شعر میں بھی جنگ ہے ؎

منعم خاں خانخاناں

اِس نامور سپہ سالار اور پنج ہزاری امیر کا سلسلہ کسی خاندانِ امارت سے نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات اُس سے بھی زیادہ فخر کی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ذات سے خاندانِ امارت کا بانی ہُوا اور امرائے اکبری میں وہ رُتبہ پیدا کیا کہ ۹۶۷ھ میں جو عبداللہ خاں اُزبک فرمانروائے ترکستان کیطرف سے سفارت آئی۔ اِس میں خاص منعم خاں کے نام سے علیحدہ تحائف کی فہرست تھی۔ وہ قوم کا ترک اور اس کا اصلی نام منعم بیگ تھا۔ بزرگوں کا حال فقط اتنا معلوم ہے کہ باپ کا نام بیرم بیگ تھا۔ ہمایوں کی خدمت سے منعم خاں ہو کر اُن کا اور فضیل بیگ اُن کے بھائی کا نام بھی سلسلۂ تاریخ میں مسلسل ہوا۔ مگر ابتدائی حال میں فقط اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی عمدہ نوکر ہے۔ اور جو حکم آقا دیتا ہے۔ اُسے پُورا کرتا ہے۔ اکثر شاہی معرکوں میں ساتھ تھا۔ تباہی کی حالت میں شریکِ حال تھا۔ وہ مصیبت کا سفر جو سندھ سے جودھ پور تک ہوا۔ اس میں اور اس کی واپسی میں شاملِ ادبار تھا جب اکبر تخت نشین ہوا تو منعم خاں کی عمر ۵۰ برس سے زیادہ تھی۔ اِس عرصے میں جو اُس نے ترقی نہ کی اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ مزاج دُور اندیش احتیاط کا پابند تھا۔ اور آگے بڑھنے میں ہمیشہ حکم کا محتاج تھا۔ سلاطینِ سلف کے زمانے ملک گیری، شمشیرزنی اور ہمت کے عہد تھے۔ ان میں وہی شخص ترقی کر سکتا تھا۔ جو ہمت حوصلہ اور دلاوری رکھتا ہو۔ اور اُس کی سخاوت رفیقوں کا مجمع اس کے گرد رکھتی ہو۔ ہر کام میں بڑھکر قدم رکھے اور آگے نکلکر تلوار مارے۔ وہ بھی ان اوصاف کا استعمال خوب جانتا تھا۔ مگر جو کچھ کرتا تھا۔ اپنی جیب سے پوچھ کر اور آقا سے اجازت لیکر کرتا تھا۔ اکثر باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عزت کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ وہاں قدم نہ رکھتا تھا۔ جہاں سے اُٹھانا پڑے کسی کے تنزل میں ترقی نہ چاہتا تھا۔ اور تنازع کے مقام میں نہ ٹھہرتا تھا۔ یاد کرو جب بدگویوں کی چغلخوری سے ہمایوں کابل سے یلغار کر کے قندھار پر گئے۔ تو بیرم خاں نے خود چاہا۔ کہ منعم خاں کو اس کی جگہ قندھار میں چھوڑیں لیکن جس طرح ہمایوں نے نہ مانا۔ اُسی طرح منعم خاں نے بھی منظور نہ کیا ٭

کسی کے وقت میں رفاقت کرنی بڑے مردوں کا کام ہے۔ جبکہ ہمایوں سندھ میں شاہ حسین ارغون کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اور لشکرِ ادبار اور فوجِ بدنصیبی کے سوا کوئی اس کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ افسوس اُس وقت منعم خاں نے بھی ایک بدنامی کا داغ پیشانی پر اُٹھایا۔ لشکر کے لوگ بھاگ بھاگ کر جانے لگے۔ خبر لگی۔ کہ منعم خاں کا بھائی یقیناً اور منعم خاں بھی بھاگنے پر تیار ہیں۔ ہمایوں نے قید کر لیا۔ افسوس کہ یہ شک بہت جلد یقین بن گیا۔ اور منعم خاں بھی بھاگ گئے۔ اِس عرصے میں بیرم خاں آن پہنچے۔ بادشاہ کو ایران لے گئے

اِدھر سے پھرے۔ تو افغانستان میں یہ بھی پھر آن ملے۔ خیر صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو وہ بھی بھولا نہیں کہلاتا ؂

یہ علو حوصلہ اس کا قابل تعریف ہے کہ چغل خوروں کی بدگوئی نے ہمایوں کو بدگمان کیا۔ اُس نے چاہا کہ قندھار بیرم خاں سے لیکر منعم خاں کے سپرد کردیں منعم خاں نے خود انکار کیا اور کہا کہ ہندوستان کی مہم سامنے ہے۔ اِس وقت حکام اور احکام کا الٹ پلٹ کرنا مناسب مصلحت نہیں ہے ؂

سنہ ۹۶۱ھ میں ہمایوں افغانستان کا بندوبست کر رہا تھا۔ بیرم خاں قندھار کا حاکم تھا۔ اکبر کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ ہمایوں نے منعم خاں کو اکبر کا اتالیق مقرر کیا۔ اس نے شکریے میں جشن شاہانہ ترتیب دیا۔ معہ اہل دربار بادشاہ کی ضیافت کی اور پیش کش ہائے شائستہ نذر گذرانے جیسی اُس وقت بادشاہی تھی ویسا ہی جشن شاہانہ ہوگا ویسے ہی پیش کش ہونگے ؂

اسی سنہ میں ہمایوں ہندوستان پر فوج لیکر چلا۔ محمد حکیم مرزا ایک برس کا بچہ تھا۔ اِس ستارہ کو ماہ چوچک بیگم اس کی ماں کے دامن میں لٹا کر کابل کی حکومت اس کے نام کی بیگمات کو بھی یہیں چھوڑا۔ اور کل کاروبار کا انتظام منعم خاں کے سپرد کیا ؂

جب اکبر تخت نشین ہوا۔ تو شاہ ابو المعالی کا بھائی میر ہاشم ادھر تھا کہمرد ضحاک غوربند اسکی جاگیر تھے۔ یہاں شاہ نے بدنیتی کے آثار دکھلائے۔ اِس باتدبیر سردار نے وہاں میر ہاشم کو لطائف الحیل سے بلا کر قید کر لیا۔ اُدھر بادشاہ خوش ہوگئے۔ ادھر اپنے پہلو سے کانٹا نکل گیا۔ تمام افغانستان تھا اور یہ تھے حکومت کے نقارے بجاتے پھرتے تھے ؂

جب ہمایوں ہندوستان کو چلا تھا۔ تو بدخشان کا ملک مرزا سلیمان کو دے آیا تھا۔ اور ابراہیم مرزا اِس کے بیٹے سے بخشی بیگم اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی جب یہاں ہمایوں مر گیا۔ تو مرزا سلیمان اور اس کی بیگم کی نیت بگڑی بیگم ہمایوں کے پرسے کا بہانہ کر کے کابل میں آئی وہ نام کو حرم بیگم تھی لیکن اپنے طنطنے سے سلیمان بلکہ سارے خاندان کو جورو بنا کر ولی نعمت بیگم کا لقب پیدا کیا تھا۔ ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ سُنا۔ کابل میں دیکھا کہ منعم خاں ہیں یا بیگمات ہیں سب حالات معلوم کر کے گئی پھر ادھر سے مرزا سلیمان فوج لیکر آئے۔ مرزا ابراہیم اپنے بیٹے کو ساتھ لائے کہ اس سے ہمایوں کی بیٹی منسوب تھی غرض مرزا نے آکر کابل کو گھیر لیا منعم خاں نے آمد آمد کی خبر سنتے ہی اکبر کو عرضی کی اور خندق فصیل کی مرمت کر کے قلعہ بند ہو بیٹھا بمقتضائے احتیاط لڑائی میدان میں ڈالی۔ ادھر سے اطمینان کا فرمان گیا۔ بدخشی حملے کرتے تھے۔ اندر والے توپ و تفنگ سے جواب دیتے اتفاقاً بیگمات کے لینے کو اکبر نے چند امیر کچھ فوج کیساتھ بھیجے تھے۔ یہ ابھی اٹک بھی نہ اترے تھے وہاں خبر

مشہور ہو گئی کہ ہندوستان سے مدد آ گئی۔ اس زمانہ میں علمائے شریعت بڑے کام نکلتے تھے۔ مرزا سلیمان گھبرا گیا۔ اس نے قاضی نظام بدخشی کو قاضی خان بنایا تھا۔ بہت سے پیغام سلام سمجھا کر منعم خاں کے پاس بھیجا۔ قاضی صاحب کے پاس مطالب و دلائل کا سرمایہ بس سے زیادہ نہ تھا کہ مرزا سلیمان بڑا دیندار۔ پرہیزگار۔ خدا پرست درویش ہے۔ طریقت و شریعت کی برکتوں سے فیض یافتہ ہے وہ بھی خاندانی ہو۔ کیا ضرور ہے بہتر ہے کہ اس کی اطاعت اختیار کرو اور ملک سپرد کر دو۔ لڑائی کی قباحتیں بندگانِ خدا کی خونریزی اور خونریزی کے گناہ دکھا کر بہشت و دوزخ کے نقشے کھینچ دیے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْساً فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعاً۔

منعم خاں بھی پرانے بڈھے تھے۔ انہوں نے باتوں کے جواب باتوں ہی سے دیے۔ اور باوجود بے سامانی اور تنگدستی کے مہمانداریوں اور ضیافتوں اور دعوتوں میں اس قدر جمعیت اور سامان کے دبدبے دکھائے کہ قاضی خاں کی آنکھیں کھل گئیں اور اصلیت حال اصلا نہ کھلی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سامان قلعہ داری کافی و وافی ہے ذخیرے برسوں کیلئے بھرے پڑے ہیں لیکن جو باتیں آپ نے فرمائیں۔ انہی خیالوں سے اب تک اندر بیٹھا ہوں۔ ورنہ جنگِ میدان میں کلہ شکن جواب دیتا۔ احتیاط کا سررشتہ ہاتھ سے دینا سپاہی کا کام نہیں دربار سے بھی کمک روانہ ہوئی ہے۔ اور پیچھے سامان برابر چلا آتا ہے۔ لیکن آپ بھی مرزا کو سمجھائیں۔ کہ ابھی تو ہمایوں بادشاہ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ ان کی عنایتوں کو خیال کرو۔ کفرانِ نعمت کا داغ نہ اٹھاؤ۔ محاصرہ اٹھاؤ۔ اہل عالم کیا کہینگے۔ قاضی صاحب ناامید ہو کر صلح کی طرف جھکے۔ منعم خاں بھی مصلحتاً راضی ہو گئے۔ مگر ابھی کام رواں نہ تھا۔ پہلے شرط یہ کی۔ کہ مرزا کے نام کا خطبہ پڑھا جاوے۔ دوسرے ہماری سرحد بڑھائی جائے۔ منعم خاں نے برائے نام ایک گمنام مسجد میں چند آدمی جمع کروا کر خطبہ پڑھوا دیا۔ مرزا سلیمان اسی دن محاصرہ اٹھا کر چلے گئے۔ نئے علاقے میں نیا معتبر چھوڑ گئے مگر وہ ابھی بدخشاں میں نہ پہنچے تھے کہ ان کا معتبر ایک ناک دو کان سلامت لیکر پہنچ گیا۔ غرض منعم خاں نے فقط حکمت عملی کے زور سے کابل کو بربادی سے بچا لیا۔

افسوس جب بڈھے شیر نے (منعم خاں) دور تک میدان صاف دیکھا۔ تو پہلے حملے میں گھر کی بلی کو شکار کیا۔ دولت بابری کے خدمت گذاروں میں خواجہ جلال الدین محمود ایک مصاحب دربار تھے۔ مگر انکی خوش طبعی کو بیہودہ گوئی نے بدمزہ کر دیا تھا۔ باوجود اس کے خود تیز طبع۔ آتش دماغ۔ بڑا فخر اس بات کا تھا۔ کہ ہم شاہ قلی ہیں اس گھمنڈ کی سختیوں اور تمسخر کی تیزیوں نے تمام اہل دربار کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ خصوصاً منعم خاں کہ جگر کو ٹکڑہ ہو رہا تھا۔ اور دربار کا حال بھی معلوم تھا۔ کہ بیرم خاں ناراض ہے۔ ہمایوں کے وقت میں منعم خاں کو اتنی طاقت کہاں تھی جو خواجہ سے انتقام لیتے مگر اب کابل میں حاکم با اختیار ہوئے۔ اور جھاڑو گھر کے مالک ہو گئے کچھ آپ سمٹے کچھ فتنہ سازوں نے کمر بندھوائی۔ خواجہ غزنی کے حاکم تھے۔ خان نے انہیں عہد و پیمان کر کے غزنی سے بلایا اور قید کر لیا۔ اسی عالم میں چند نشتر اُن کی آنکھ میں لگوائے اور سمجھے کہ بینائی سے معذور ہو گئے۔ انہیں تو اس

خیال میں کچھ پرواہ نہ رہی۔ خواجہ بڑے کرامات والے تھے۔ کوئی دم چراتا ہے وہ آنکھیں چرا گئے
تھے۔ چند روز کے بعد جلال الدین اپنے بھائی کے پاس بھاگ گئے۔ کہ شکستہ کے رستے سے قلات اور کہ ٹھٹے
سے ہو کر دربارِ اکبری میں جا پہنچے منعم خاں نے سنتے ہی آدمی دوڑائے۔ پھر بیچارے کو پکڑوا منگایا۔ بظاہر
قید کیا۔ چند روز کے بعد اندر ہی اندر کام تمام کر دیا۔ ایسے سلیم الطبع آدمی سے خونِ ناحق ہونا (وہ بھی اس
بے عزتی و بے مروتی سے) کمال افسوس کا مقام ہے ٭

جب دربار میں بیرم خاں کی بربادی کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔ تو اہلِ مشورہ نے اکبر سے کہا کہ جو
پرانے پرانے نمک خوار دور و نزدیک ہیں انہیں اس مہم میں شامل کرنا ضرور ہے۔ چنانچہ منعم خاں کو
بھی کابل سے بلایا تھا۔ اُس نے وہاں غنی خاں اپنے بیٹے کو چھوڑا۔ اور چنیز لدھیانے
کے مقام میں اکبر کو سلام کیا۔ اکبر اُس وقت خانخاناں کے تعاقب میں تھا۔ شمس الدین محمد خاں اتکہ آگے
آگے تھے حضور سے خانخاناں کے خطاب کے ساتھ وکالت کا منصب حاصل کیا۔ لیکن اس کی نیک نیتی کا ثبوت
اِس روئداد سے ہو سکتا ہے جو بیرم خاں کے حال میں لکھی گئی کہ جب لڑائی کے بعد بیرم خاں سے
پیغام سلام ہونے لگے۔ تو کس بے تابی سے اُس کے پاس دوڑا چلا گیا ٭

جب خان خاناں کا قصہ فیصل ہو گیا تو منعم خاں خان خاناں تھے اکبر مہم سے فارغ ہو کر آگرہ میں گئے
بیرم خاں کا عالیشان محل جس کے پاؤں میں دریا کا پانی لوٹ لوٹ کر لہریں مارتا تھا منعم خاں کو انعام
فرمایا۔ اُسے خیال تھا کہ خان خاناں کا عہدہ اور کل اختیارات مجھے ملینگے لیکن پانسا پلٹ گیا۔ اکبر
کی آنکھیں کھلنے لگی تھیں وہ سلطنت کے کاروبار اپنی رائے پر کرنے لگا۔ ماہم سے وکالت کے کاروبار
چھن گئے۔ میر اتکہ وکیل مطلق ہو گئے۔ ماہم اور ماہم والوں کو بھی سخت ناگوار ہوا۔ ادہم خاں ماہم کے بیٹے کے دل میں
آگ لگی ہوئی تھی منعم خاں نے اُسے بھڑکایا۔ اور شہاب خاں نے تیل ڈالا۔ نوجوان بھڑک اُٹھا۔ کوتہ اندیش نے
بر سرِ دیوان جلسہ امرا میں آ کر میر اتکہ کو قتل کیا لیکن جب وہ قصاص میں قتل ہوا تو جو جو اِس فتنہ پردازی میں شریک
تھے۔ اُنہیں سخت خطرہ ہوا۔ شہاب خاں کا رنگ زرد ہو گیا منعم خاں بھی گھبرائے۔ اور شمہ جلوس تھے
کر بھاگ گئے۔ اکبر نے اشرف خاں میر منشی کو بھیجا وہ فہمائش سے مطمئن کر کے لے آئے مگر چند روز کے بعد قاسم
خاں میر بحر کے ساتھ پھر آگرہ سے بھاگ گئے۔ دو تین آدمی ساتھ لئے۔ لوسہ کے گھاٹ پر کشتی کی سیر کا بہانہ کیا
وہاں جا کر مغرب کی نماز پڑھی اور رستے سے کٹ کر الگ ہوئے کابل کا ارادہ کیا۔ رستے سے ہو کر بجواڑہ میں آئے علاقہ
ہوشیار پور میں آ کر کوہ کا دامن پکڑا۔ پہاڑوں پر چڑھتے۔ اور کھڈوں میں اُترتے قسمت کی مصیبت بھرتے سروت
علاقہ میانِ دوآب میں جا پہنچے۔ کہ میر محمد منشی کی جاگیر تھا جنگل میں اُترے ہوئے تھے۔ وہاں کا شقدار قاآ علی

اسپ خلاب سیستانی گشت کرتا ہوا اُدھر آنکلا۔ وہ انہیں پہچانتا نہ تھا۔ مگر وضع سے معلوم کیا کہ امرا ہیں کہیں رُوپوش بھاگے جاتے ہیں۔ اُسی وقت علاقے کو پھرا۔ چند سپاہی اور کچھ گاؤں کے زمیندار ساتھ لیکر گیا اور انہیں گرفتار کرکے لے آیا۔ سیّد محمود بارہا اور عالی ہمّت اور سردار عالیشان لشکرِ اکبری کے تھے۔ اِس علاقے میں اُن کی جاگیر تھی۔ کسی سبب سے اس نواح میں تھے۔ انہیں خبر گئی۔ کہ دو شخص امرائے بادشاہی سے نظر آتے ہیں۔ اِدھر سے جاتے ہیں۔ اور آثار و اطوار سے خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ دیکھنے گئے۔ یہ کون صاحب ہیں یہ آٹھ پہر کے ساتھ رہنے سہنے والے۔ انہوں نے پہچانا۔ بڑے تپاک سے ملاقاتیں ہوئیں۔ موقع کو غنیمت سمجھا اپنے گھر لائے تعظیم و تکریم سے رکھا۔ مہمانداری کے حق ادا کئے۔ اور اعزاز و اکرام سے اپنے فرزندوں اور بھائی بندوں کے ساتھ خود لے کر حضور میں حاضر ہوئے ✤

یہاں لوگوں نے اکبر کو بہت کچھ لگایا بجھایا تھا۔ بلکہ یہ بھی اشارہ کیا تھا۔ کہ اس کا گھر ضبط کرنا چاہئے۔ اکبر نے کہا کہ فقط وہم سے منعم خاں نے ایسا کیا ہے۔ وہ نہ جائیگا۔ اور اگر گیا بھی۔ تو کہاں گیا؟ کابل ہمارا ہی ملک ہے۔ کوئی اُن کے گھر کے گرد پھٹکنے نہ پائے۔ وہ بندۂ قدیم الخدمت اِس خاندان کا ہے۔ ہم اُس کا سب اسباب وہیں بھجوا دیں گے۔ جب یہ آئے تو سب کے منہ بند ہو گئے۔ بادشاہ نے بہت دلجوئی کی۔ اور وہی مرحمت اس کے حال پر مبذول فرمائی جو کچھ چاہئے تھی۔ وکالت کا منصب اور خانخاناں کا خطاب بحال رکھا ✤

۹۷۰ھ میں منعم خاں نے ایک ہمّت دلاورانہ کی اور افسوس کہ اسی جگہ ٹھوکر کھائی۔ مجمل تمہید اس کی یہ ہے کہ وہ یہاں تھا۔ اور غنی خاں اُس کا بیٹا کابل میں قائم مقام تھا۔ اس نااہل لڑکے نے وہاں رعایا کو اپنی سختی سے اُمرا کو نااہلی سے ایسا تنگ کیا کہ حکیم مرزا کی ماں چوچک بیگم بھی دق ہو گئی۔ فضیل بیگ منعم خاں کا بھائی آنکھیں[1] نہ رکھتا تھا۔ مگر فتنہ و فساد کی تاک میں سرتاپا آنکھیں تھا۔ وہ بھی نااہل بھتیجے کی خودسری سے تنگ تھا۔ اس نے اور اہل خدمت نے بیگم کو بھڑکایا۔ اس کی اور ابوالفتح اس کے بیٹے کی صلاحوں سے نوبت یہ ہوئی۔ کہ ایک دن غنی خاں فالیز کی سیر سے پھر کر آیا۔ لوگوں نے شہر کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ کئی دروازوں پر دوڑا آخر دیکھا کہ ہمّت کا موقع نہیں۔ اب قید کا وقت ہے۔ اِس لئے کابل سے ہاتھ اٹھا کر ہندوستان کی طرف پاؤں بڑھایا۔ وہاں فضیل بیگ کو بیگم نے مرزا کا اتالیق کر دیا۔ اندھے سے سوا بے ایمانی کے کیا ہوتا تھا اُس نے اچھی اچھی جاگیریں آپ لیں اور اپنے وابستوں کو دیں۔ بُری بُری مرزا کے متعلقین کو دیں۔ ابوالفتح بیٹا تحریر وغیرہ کے کام کرتا تھا۔ یہ عقل کا اندھا تھا۔ باپ خود غرضی۔ بد اعمالی۔ شراب خوری کے حاشیے چڑھاتا تھا۔ لوگ پہلے سے بھی زیادہ تنگ ہو گئے۔ آخر ابوالفتح بد زبانی کی بدولت بزم و غا میں مارے گئے

[1] جب ہمایوں کے بھائیوں نے بغاوت کی تو منعم خاں ہمایوں کے ساتھ تھا فضیل بیگ کامران کے ہاتھ آگیا۔ وہ مردم آزادی کا مشتاق تھا۔ اُسنے فضیل کو اندھا کر دیا ✤

سرکشی کرنے سے پرہیز کیا۔ اندھا بھاگا مگر پکڑا آیا۔ اور آتے ہی بیٹے کے پاس پہنچا۔ اب ولی بیگ کابل کے صاحب اختیار ہوئے۔ یہ پورے ولی تھے۔ انہوں نے اکبر کو بھی لڑکا سمجھا۔ اور خود ہی بادشاہی کی ہوا میں اڑنے لگے۔ وہاں کے شور و شر دیکھ کر اکبر کو یہاں تک خطر ہوا کہ کابل ہاتھ سے نکل نہ جائے منعم خاں کچھ خوبیِ آب و ہوا سے کچھ جسمانی آسائشوں کی طفیل سے کچھ آزادانہ حکمرانی کے مزے سے ہمیشہ کابل کی آرزو رکھتا تھا۔ اس لئے اکبر نے حکیم مرزا کی اتالیقی اور حکومتِ کابل اُس کے نام پر کرکے اُدھر روانہ کیا اور کئی امیر اُسکی مدد کیلئے فوج دیکر ساتھ کئے۔ منعم خاں کابل کے نام پر جان دیتے رہتے تھے کابلیوں کی سرشوری و سینہ زوری کو ذرا خاطر میں نہ لاتے۔ دولت حضوری کی بھی قدر نہ سمجھے حکم ہوتے ہی روانہ ہوگئے اور کوچ بکوچ منزلیں لپیٹ کر جلال آباد کے قریب جا پہنچے۔ امرا کا اور فوج کمک کا بھی انتظار نہ کیا

بیگم اور اُس کے مشورہ کاروں کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو خیال کیا کہ منعم خاں کے بیٹے نے یہاں بہت ذلت اٹھائی ہے۔ بھائی بھتیجے اُس خواری سے مارے گئے ہیں۔ خدا جانے آکر کس کس سے کیا سلوک کرے اس لئے باسامان جمعیت بہم پہنچائی۔ اہل فساد نے مرزا کو بھی فوج کے ساتھ لیا۔ اور مقابلے پر آئے پہلو یہ سوچا کہ اگر ہم نے فتح پائی۔ تو سبحان اللہ اور شکست پائی تو یہاں نہ رہینگے۔ بادشاہ کے پاس چلے جائینگے غرض بیگم نے ایک سردار کو فوج دے کر آگے بڑھایا۔ کہ قلعہ جلال آباد کا استحکام کرے۔ منعم خاں کو جب یہ خبر پہنچی تو ایک جنگ آزمودہ سردار کو اُس کے روکنے کیلئے بھیجا۔ وہ اس عرصے میں قلعے کا بندوبست کر چکا تھا اس نے جلال آباد کے میدان میں لڑائی ڈال دی۔ اتنے میں خبر لگی۔ کہ بیگم اور مرزا بھی آن پہنچے:

منعم خاں سنتے ہی جوش و خروش سے بڑھے مگر اپنی سلامت روی کی چال نہ چھوڑتے تھے جبار بردی ایک سردار بابر کے عہد کا تھا۔ کہ اب لباس فقیری میں بسر کرتا تھا۔ وہ بھی سوائے کابل میں منعم خاں کے ساتھ اڑا جاتا تھا۔ اُسے بھیجا۔ کہ مرزا سے جاکر گفتگو کرے۔ کشت و خون کی نوبت نہ پہنچے۔ باتوں میں کام نکل آئے اور یہ منتشر نہ چلے۔ تو لڑائی کل پر ڈالے آج ملتوی رکھے کہ ستارہ[1] سامنے ہے۔ فوج ہراول میں شمر بیگ[2] نے گھوڑا دوڑائے آیا اور کہا کہ تعلیم بہت کم ہے۔ ایسی حالت میں لڑائی کل پر نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو وہ ہراساں ہو کر نکل جائے اور بات بڑھ جائے منعم خاں اور حیدر محمد خاں دونوں کابل کے عاشق تھے اور سپاہگری پر مغرور۔ رکابی فوج کی ہمت اور اپنے حوصلے پر گھوڑے بڑھانے چلے گئے۔ اور چار باغ کے پاس خواجہ رستم کی منزل پر میدان جنگ قائم ہوا۔ خان خاناں جب اپنے اصول سے باہر قدم رکھتے تھے جبھی خطا پاتے تھے۔ انکا

---

۱ ترکوں میں مشہور ہے کہ یلدوز ایک ستارہ ہے۔ لڑائی کے میدان جس فریق کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کی شکست ہوتی ہے:

۲ یکہ ایک قسم کے انتخابی اور بہادر سواروں کا رسالہ ہوتا تھا کہ اسے یکہ سواروں کا رسالہ کہتے تھے۔ اکبر کے عہد خوش اعتقادی آئین الٰہی کو قیدیں لگا کر یکہ کو احدی کہنے لگے۔ اس میں توحید خاص کا اشارہ تھا:

سردار جو ہراول بنکر گیا تھا۔ مارا گیا۔ اور ایسا سخت کشت و خون ہؤا کہ فوج برباد ہوگئی۔ اور انہوں نے شکست کھائی بہت ہمراہی کابلیوں سے جا ملے۔ نقد جنس ۲۰ لاکھ کا خزانہ اور توشہ خانہ سب کابلی لٹیروں کو دے کر آپ بحال تباہ وہاں سے بھاگے۔ اور غنیمت ہؤا کہ وہ لوٹ پر گر پڑے ورنہ خود بھی شکار ہو جاتے ؛

منعم خاں بیہوش۔ بدحواس پر جھڑے دُم نُچے پشاور میں پہنچے۔ مُدّت تک تڑپتے رہے۔ آخر اکبر کو سارا حال لکھا۔ اور عرض کی کہ بندۂ منعم نے نعمت حضوری اور رحمت بادشاہی کی قدر نہ جانی۔ اُس بداعمالی کی یہی سزا تھی۔ اب مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ حکم ہو تو مکّے کو چلا جائے۔ گناہوں سے پاک ہوگا۔ جب حضور میں حاضر ہونے کے قابل ہوگا۔ یہ التجا قبول نہیں۔ تو کچھ جاگیر سرکار پنجاب میں مرحمت ہو جائے کہ صورت حال درست کر کے شرف زمین بوس حاصل کروں ؛

منعم خاں کچھ مارے ڈر کے کچھ مارے شرم کے پشاور میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ اٹک اتر کر گکھڑوں کے علاقے میں چلا آیا۔ سلطان آدم گکھڑ بڑی آدمیت اور حوصلے سے پیش آیا۔ اور شان کے لائق مہمانداری کی حیران بیٹھا تھا کہ کیا کرے۔ نہ چلنے کو رستہ نہ بیٹھنے کو جگہ نہ دکھانے کو منہ۔ بارے اکبر نے اپنے قدیم الخدمت ملازم کو بڑی تسلی اور دلاسے کے ساتھ جواب لکھا۔ کہ کچھ خیال نہ کرو تمہاری جاگیر سابق بحال ہے اپنے ملازم بدستور علاقوں پر بھیج دو۔ آپ چلے آؤ۔ عنایات الطاف اسقدر ہونگے کہ سب نقصان پورے ہو جائینگے۔ اور یہ رنج کا مقام نہیں۔ عالم سپاہگری میں اکثر ایسی صورتیں پیش آتی ہیں۔ انشاء اللہ جو حرج ہوئے ہیں۔ سب کا تدارک ہو جائیگا۔ منعم خاں کی خاطر جمع ہوئی۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ اور جلد آگرہ کے قلعہ دار ہو گئے۔ اور کئی سال تک خدمت انہی کے نام پر رہی ؛

۹۷۳ھ میں جب کہ اکبر نے علی قلیخاں سیستانی پر فوج کشی کی۔ تو چند روز پہلے منعم خاں کو فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ اور اُس نے اپنی سلامت روی اور دونو طرف کی دلسوزی و خیراندیشی سے کار نمایاں کئے کہ بادشاہ بھی خوش ہوگئے۔ اگرچہ آگ لگانے والے بہت تھے لیکن اُس کی کوشش اسی میں عرق ریزی کر رہی تھی کہ سلطنت کا قدیم الخدمت برباد نہ ہو۔ آخر نیک نیتی کامیاب ہوئی اور مہم کا خاتمہ صلح و صفائی پر ہؤا۔ دشمنوں نے اُس کی طرف سے بادشاہ کو شبہے بھی ڈالے۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا ؛

۹۷۴ھ میں جب خانزمان اور بہادر خاں کے خون سے خاک رنگین ہوئی۔ اور مشرقی فساد کا خاتمہ ہوا۔ تو منعم خاں کو دارالخلافہ آگرہ میں چھوڑ گئے تھے۔ اِسے بُلا بھیجا۔ بڑھاپے میں اقبال کا ستارہ طلوع ہوا تمام علاقہ علی قلیخاں کا۔ تمام جونپور۔ بنارس۔ غازی پور۔ چنار گڈھ۔ زمانیہ سے لیکر دریائے جوسا کے گھاٹ تک عطا فرمایا۔ اور خلعتِ شاہانہ اور گھوڑا دے کر رخصت کیا۔ وہ بڑے حوصلہ اور تدبیر کے ساتھ وہاں

حکومت کرتا رہا۔ اور سلیمان کرارانی اور لودی وغیرہ افغانوں کے سردار جو ملک بنگالہ اور اضلاع شرقی میں افغانوں کے عہد سے حاکم مستقل اور صاحب لشکر تھے۔ انہیں بھی کچھ صلح اور کچھ جنگ کے سامان دکھا کر دباتا رہا۔ اور حق پوچھو۔ تو یہی آخری تین برس اس کی عمر دراز کا نچوڑ تھے۔ جسے خانخاناں کے خطاب سے اسکے نام کو ملاح کر سکتے ہیں۔ اور یہی بنگالہ کی مہم ہے جس کی بدولت وہ دربارِ اکبری میں آنے کے قابل ہوا ہے۔ اور سلیمان سے عہدنامہ کر کے اکبر کا سکہ خطبہ جاری کر دیا۔

اکبر چتوڑ کی مہم پر تھا۔ خانخاناں کو خبر پہنچی کہ زمانیہ پر جو اسد اللہ خاں نمک خوار بادشاہی حکومت کر رہا ہے اُس نے سلیمان کرارانی کے پاس آدمی بھیجا ہے۔ کہ تم اس علاقے پر قبضہ کر لو۔ خانخاناں نے فوراً فہمائش کیلئے معتبر بھیجے۔ وہ بھی سمجھ گیا۔ اور قاسم موشکی خان خاناں کے گماشتے کو علاقہ سپرد کر کے خدمت میں حاضر ہوا افغانوں کا لشکر جو قبضہ کرنے آیا تھا۔ ناکام پھر گیا۔

سلیمان کا وزیر لودی تھا۔ کہ دریائے سون تک وکیل مطلق کے اختیار سے کام کرتا تھا۔ اس نے جب اکبری فتوحات پے در پے دیکھیں۔ اور خانخاناں کو سلیم الطبع صلح جو سنجیدہ مزاج پایا تو دوستی کے رنگ جمائے تاکہ ملکِ سلیمان آسیب میں نہ آئے۔ چنانچہ نامہ و پیام اور دوستی کی بنیاد ڈالی۔ مخالف ان پر عماریں چننے لگے۔ چتوڑ کے محاصرہ نے طول کھینچا۔ سرنگوں کے اڑنے میں فوج بادشاہی بہت برباد ہوئی۔ سلیمان کے خیالات بدلے۔ یہ خبریں سن کر اپنے آصف کے ذریعے سے منعم خاں کو بلا بھیجا۔ کہ محبت سے ملاقات کرکے بنیادِ اتحاد کو محکم کریں۔ خیرخواہوں نے احتیاط پر نظر کر کے روکا۔ مگر نیک نیت دلاور بے تکلف چلا گیا۔ ساتھ چند امرا اور فوج میں کل تین سو آدمی ہونگے۔ لودی لینے آیا۔ بایزید سلیمان کا بڑا بیٹا کئی منزل پیشوائی کو آیا۔ جب تین پانچ چھ کوس رہا تو خود استقبال کو آیا۔ بڑے اعزاز و احترام سے ملا۔ پہلے خانخاناں نے جشن کر کے اسے بلایا۔ دوسرے دن اُسنے مہمانی سلیمانی کر کے انہیں بلایا بڑے اعزاز و احترام کئے۔ گراں بہا تحفے پیشکش کئے۔ مسجدوں میں اکبری خطبہ پڑھا گیا۔ سکّے نے سنہری مہری لباس پہنا۔

سلیمان کے دربار میں دو صاحب بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ اکبر تو مہم میں مصروف ہے ادھر جو کچھ ہے منعم خاں ہے۔ اُسے مارلیں تو یہاں سے وہاں تک ملک خالی ہے۔ لودھی کو بھی خبر ہو گئی۔ وہی اصل صلح و صفائی کا سفیر تھا۔ اس نے سمجھایا کہ ایسا نہ چاہیے۔ مہمان بلا کر دغا کرو گے۔ تو خاص و عام ہمیں کیا کہینگے۔ اور اکبر جیسے بااقبال بادشاہ سے بگاڑنا خلاف مصلحت ہے۔ یہ خانخاناں نہ ہو گا اور خانخاناں بنا کر بھیج دیگا۔ ان گنتی کے آدمیوں کو مار کر ہمارے ہاتھ کیا آئیگا۔ اور ہمارے سر پر خود دشمن قوی موجود ہیں جن کے روکنے کے لئے ہم نے یہ سدِّ سکندر اُٹھائی ہے۔ اسے آپ گرانا عقل دُور اندیش کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہتا تھا۔ مگر افغان غل مچائے جاتے تھے۔ منعم خاں کو بھی خبر پہنچی

اُس نے لودی کو بُلا کر صلاح کی لشکر کو وہیں چھوڑا۔ اور چند آدمیوں کے ساتھ وہاں سے اُڑ نکلے۔ جب بڑھیا پری شیشے سے نکل گئی۔ تو دیوزادوں کو خبر ہوئی۔ اپنی بدنیتی پر پچھتائے۔ جلسے بیٹھے۔ صلاحیں ہوئیں۔ آخر بایزید اور لودھی جریدہ خانِ خاناں کے پاس آئے۔ اور اعزاز و احترام کے مراتب طے کر کے چلے گئے۔ خانخاناں گنگا اُتر کر تین منزل آئے تھے۔ جو چتوڑ کا فتحنامہ پہنچا۔ پھر تو ان کا ایک زور دہ چند ہو گیا۔ لیکن ان کی سلامت روی نے سلیمان کو مطمئن کر رکھا تھا۔ وہ اپنے حریفوں کے پیچھے پڑا۔ اور سب کو دغا و جفا سے فنا کر دیا۔ مگر چند ہی روز میں خود لقمۂ فنا ہو گیا ۔

جب کہ داؤد ملکِ سلیمان پر قابض ہوا۔ اور تخت پر بیٹھا۔ باپ کا ایک خیال دماغ میں نہ رہا۔ تاجِ شاہی سر پر رکھا۔ بادشاہی کی ہوا میں اُڑنے لگا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ سکہ جاری کیا۔ اکبر کو عرضی تک بھی نہ لکھی۔ اور جو دربارِ اکبری کیلئے آئینِ عمل میں لاتے تھے۔ سب بھول گیا ۔

اکبر گجرات کو مار کر قلعہ سورت پر تھے۔ کہ یہ خبریں پہنچیں۔ منعم خاں کو حکم پہنچا کہ داؤد کو درست کرو یا ملکِ بہار فوراً فتح کر لو۔ سپہ سالار لشکرِ جرّار لیکر گیا۔ اور داؤد کو ایسا دبایا کہ اُسنے لودھی اُن کے قدیم دوست کو بیچ میں ڈالکر دو لاکھ روپیہ نقد اور بہت سی اشیائے گراں بہا پیشکش گذرانیں یہ جنگ کے نقارے بجاتے گئے تھے صلح کے شادیانے گاتے چلے آئے ۔

اکبر جب بندر سورت کا قلعہ فتح کر کے پھرا۔ تو ہمت میں جوانی کا جوش و خروش۔ اقبال کا سمندر طوفان اُٹھا رہا تھا۔ فتوحات موجوں کی طرح ٹکراتی تھیں۔ ٹوڈرمل کو منعم خاں کے پاس بھیجا۔ کہ خود جاکر ملک اور اہلِ ملک کی حالت دیکھو۔ اور اُن کے ارادوں پر غور کرو۔ منعم خاں سے بھی دریافت کرو کہ اس صورت حال کو دیکھ کر تمہاری کیا رائے ہے۔ وہ گیا اور جلد واپس آیا اور جو حالات معلوم کئے تھے سب بیان کئے یہاں فوراً منعم خاں کے نام آغازِ جنگ اور اُمرا کیلئے روانگی بنگالہ کے فرمان جاری ہوئے ۔

داؤد کی بدنصیبی سے اُس کے منافق سرداروں کے ساتھ اس قدر جلد بگاڑ ہوا جس کی امید نہ تھی پیچ تو ہمیشہ سے چلتے تھے۔ اب چند ہاتھیوں پر داؤد کو لودی سے لڑا دیا۔ لودی نے ایسے ہی فتنوں کے لیئے اِدھر راہ نکال رکھی تھی۔ منعم خاں سے مدد مانگی۔ انہوں نے فوراً چند سردار اور ایک فوج معقول روانہ کی۔ چند روز کے بعد اُن کی تحریریں آئیں۔ کہ وہ تو داؤد سے مل گیا۔ اور ہمیں رخصت کر دیا۔ خانِ خاناں بڑھاپے کے گریباں میں گردن جھکائے سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اور کرنا کیا چاہیئے۔ ساتھ ہی اُن کے مخبر خبر لائے کہ لودی کو داؤد نے مروا ڈالا۔ یہ ایسے ہی موقع کی تاک میں تھے۔ فوج کشی کرنے میں تھا تو

سی کا کھٹکا تھا۔ فوراً لشکر لے کر پٹنہ اور حاجی پور آئے۔ اب نوجوان کی آنکھیں کھلیں۔ اور لودی کی یاد آئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

اسپِ دولت بزیرِ رانِ تو بود ۔۔۔ چوں تو کم تاختی کسے چہ کند
مہرۂ عیش بر مرادِ تو بود ۔۔۔ بیک بد باختی کسے چہ کند

فصیل اور قلعۂ پٹنہ کی مرمت شروع کر دی۔ یہاں غلطی یہ کھائی۔ کہ تلوار میان سے نہیں نکلی۔ گولی بندوق میں نہیں پڑی۔ اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ خانخاناں نے محاصرہ ڈالا۔ اور بادشاہ کو عرضی کی کہ اس ملک میں لڑائی بے سامانِ دریائی کے نہیں ہو سکتی۔ ادھر سے جھٹ جنگی کشتیاں جنگِ دریائی کے سامان اور رسدِ فراواں سے بھر کر روانہ ہوئیں۔ سپہ سالار خود بھی قدرت سے تیاری کر رہا تھا۔ اور ادھر ادھر فوجیں دوڑائیں مگر نہایت احتیاط سے کام کرتا تھا۔ جہاں کچھ بھی خطرہ دیکھتا تھا۔ جرأت نہ کرتا تھا ذرا پہلو بچا جاتا تھا۔ روپیہ کی بھی کفایت کرتا تھا۔ ہاں سامانِ جنگ اور رسد وغیرہ کی ضرورت دیکھتا تو لاکھوں لٹاتا تھا۔ چنانچہ گورکھپور فتح کیا۔ افغانوں کا یہ حال تھا۔ کہ ایک جگہ سے پریشان ہو کر بھاگتے تھے۔ دوسری جگہ اس سے زیادہ جمعیت اور استقلال کے ساتھ جم جاتے تھے۔ وہ سرداروں کو فوج دیکر مقابلے پر بھیجتا تھا اور وقت پر خود بھی پہنچتا تھا مگر ساتھ ہی اپنے کی ناک میں رہتا تھا۔

پٹنہ کے محاصرہ نے طول کھینچا۔ خان خاناں نے عرضی کی۔ کہ اگرچہ لڑائی جاری ہے۔ اور جاں نثار حق نمک ادا کر رہے ہیں مگر برسات نزدیک ہے۔ جتنا جلد فیصلہ ہو اتنا ہی مناسب ہے۔ اور جب تک حضور نہ آئیں یہ آرزو نہ بر آئیگی۔ بادشاہ نے اسی وقت ٹوڈرمل کو روانہ کیا۔ اور مہماتِ اطراف کا بندوبست کر کے حکم دیا کہ لشکر تیار ہو۔ اور اس سفر کی مسافت دریا میں طے ہو۔ لشکر آگرہ سے خشکی کے رستے روانہ ہوا۔ اور آپ معہ بیگمات اور شہزادہائے کامگار اور امرائے باوقار کشتیوں پر سوار ہوئے۔ بادشاہ جوان اقبال جوان ارکانِ دولت جوان ابوالفضل فیضی ملا صاحب ابھی دنوں دربار میں پہنچے تھے فتح و اقبال اختار کے منتظر۔ عجب شان و شکوہ سے چلے۔ دریائے عیش کا دریا بہا جاتا تھا۔ اس سواری کا تماشہ دیکھنا ہو تو ملا صاحب کے حال میں دیکھو۔ کہ اکبر بلکہ خاندانِ چغتائی میں کسی کو ایسا موقع نصیب ہوا ہو گا۔

منعم خاں ہر طرف تدبیر کے گھوڑے دوڑاتے تھے اور افغانوں کو ہلاتے تھے۔ جو قابو میں نہ آتے تھے انہیں دباتے تھے۔ اُن کے لشکر کو بڑی مصیبت پڑتی۔ مگر حسین خاں بنی جو ادھر سے آکر ملا تھا۔ اس سے یہ نکتہ ہاتھ آیا۔ کہ برسات میں دریا بہت چڑھیگا۔ اس لئے پن پن کا بند توڑ دینا چاہئے۔ کہ پانی گنگا میں جا گرے۔ یہ بند استاد نے اسی غرض سے باندھا تھا۔ کہ پانی قلعے کے گرد آجائے غنیم آئے تو یہاں تھم

نہ سکے۔ پٹنہ میں حاجی پور سے رسد برابر پہنچ رہی تھی۔ چاہا کہ پہلے حاجی پور کو فتح کر لیں۔ مگر فوج ایسی وافر نہ تھی۔ اِس لئے ارادہ رہ گیا۔

داؤد نے بھی بند کی حفاظت کے لئے بڑی احتیاط سے فوج رکھی تھی۔ مگر مجنوں خاں رات کی سیاہ چادر اوڑھ کر اس پھرتی سے کام کر آیا کہ غنیم کے مستوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ شرم کے مارے ایسے بھاگے کہ داؤد کے پاس تک نہ جا سکے۔ آوارہ و سرگرداں گھوڑا گھاٹ پہنچے۔

بادشاہ منزل بمنزل خشکی و تری کی سیر کرتے۔ شکار کھیلتے چلے جاتے تھے۔ ایک دن داس پور پر کنار گنگا پر منزل تھی۔ کہ اعتماد خاں خواجہ سرا لشکرگاہ سے پہنچا۔ لڑائی کا حال عرض کیا۔ اور اس کے بیان سے غنیم کا نہایت زور ظاہر ہوا۔ میر عبدالکریم اصفہانی کو بلا کر سوال کیا۔ اُنہوں نے حساب کر کے کہا ؎

بزودی اکبر از بخت ہمایوں	بَرد ملک از کفِ داؤد بیروں

بلکہ جب بادشاہ فتح پور سے آگرہ میں آ کر سامان روانگی کر رہے تھے۔ اُسی وقت میر نے یہ حکم لگایا تھا ؎

اگرچہ باشد لشکرت جرّار بے حد و شمار   لیک باشد فتح و نصرت در قدومِ شہریار

شیر پور پر ٹوڈرمل بھی حاضر ہوئے۔ اور ہر مورچے کا حال مفصل بیان کیا۔ منعم خاں کی طرف سے حضور کے باب میں عرض کی۔ فرمایا دو کوس سے زیادہ استقبال نہ کریں۔ کہ محاصرے کا مدار انہی پر ہے۔ سب امرا اپنے اپنے مورچے پر قائم رہیں۔ ٹوڈرمل رات ہی رات رخصت ہوئے۔ یہ سفر دو مہینے دس دن میں ختم ہوا۔ کوئی نقصان ایسا نہیں ہوا۔ کہ قابل تحریر ہو۔ البتہ چند کشتیاں طوفان گرداب میں آ کر تاسے کی طرح بیٹھ گئیں۔ جب بادشاہ چھاؤنی کے سامنے پہنچے۔ تو خانخاناں نے بہت سی کشتیاں اور نواڑے سامان آرائش کے ساتھ جنگی آتش بازی سے سجائیں خود استقبال کو چلا۔ توپخانوں پر گولہ انداز قواعد اور انتظام کیساتھ بیٹھے۔ رنگ رنگ کی برقیں لہرانی بڑی شکوہ و شان سے آیا۔ اور رکاب کو بوسہ دیا۔ حکم ہوا تمام توپوں کو مہتاب دکھا دو۔ توپخانے بھی اس زناٹے سے سلامی اتاری۔ کہ زمین میں بھونچال آ گیا۔ اور کوسوں تک دریا دھواں دھار ہو گیا۔ نقاروں کا غل۔ دماموں کی گرج۔ کرنا کی کڑک۔ قلعے والے حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ کہ قیامت آ گئی۔ چھاؤنی بیچ پہاڑی پر تھی۔ کہ دریا سے اسطرف ہے۔ بادشاہ منعم خاں ہی کے ڈیروں میں آئے۔ اُس نے بڑی طمطراق سے آرائش کی تھی۔ سونے کے طبق جواہر اور موتیوں سے بھر کر کھڑا ہوا۔ لپ بھر بھر کر نچھاور کرتا تھا اور کہتا تھا ؎

کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آسماں رسید	کہ سایہ بر سرش افگند چوں تو سلطانے

تفیس تحائف۔ گراں بہا جواہر نذر گذرانے۔ کہ حد و حساب سے باہر تھے پُرانے پُرانے امیر۔ خدمتگار باری نئے نئے نوجوان جاں نثارِ اکبری کہ مہینوں ہوئے خدمت سے محروم تھے۔ سینوں میں جوشِ وفا۔ دلوں میں شوق۔ منہ میں دُعا۔ بچوں کی طرح دوڑے آئے۔ جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے۔ اور دل شوقِ بندگی کے مارے قدموں میں لوٹے جاتے تھے ؎

کیا تڑپتا دلِ مضطر کا بھلا لگتا ہے	جب اُچھلتا ہے تو کمبخت سینے سے جا لگتا ہے

اکبر ایک ایک کو دیکھتا تھا۔ نام لے لے کر حال پوچھتا تھا۔ اور نگاہیں کہتی تھیں کہ دل میں وہی محبت لہراتی ہے۔ جو ماں کے سینے سے دُودھ بن کر پیارے بچوں کے منہ میں ٹپکتی ہے۔ غرض سب اپنے اپنے خیموں اور مورچوں کو رخصت ہوئے ؂

دوسرے دن خود بادشاہ سوار ہوئے۔ اور مورچوں پر پھر کر قلعے کا ڈھنگ اور لڑائی کا رنگ دیکھا یہی صلاح ہوئی۔ کہ پہلے حاجی پور کا فیصلہ کیا جائے پھر پٹنہ کا فتح کر لینا آسان ہے۔ چنانچہ خانِ عالم کو چند سرداروں کے ساتھ تعینات کیا۔ خانخاناں نے ایک ایلچی داؤد کے پاس بھیجا تھا۔ اور بہت سی نصیحتیں و صیتیں کہلا بھیجی تھیں جنکا خلاصہ یہ ہے کہ خان فرزند ابھی تک اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اپنی صورتِ حال کو دیکھو۔ اکبری اقبال کو سمجھو۔ اتنی جانیں برباد ہوں بہتر ہے کہ اور خون نہ ہوں مال و ناموس خلائق پر رحم کرو۔ جوانی اور سرخوشی کی بھی حد ہوتی ہے۔ بہت کچھ ہو چکا۔ اب بس کرو کہ عالم کی تباہی حد سے گذر چکی ہے۔ اس دولتِ خداداد کے دامن سے اپنی گردنیں کیوں نہیں باندھتے کہ سب مصیبتیں پوری ہو جائیں۔ لڑکا سرتا تھا۔ اس نے بہت سوچ سوچ کر ایلچی کو رخصت کیا۔ اور اپنا معتبر ساتھ کیا۔ چنانچہ وہ بھی اسی دن حاضرِ حضور ہوا۔ خلاصہ جواب یہ کہ حاشا و کلّا سرداری کا بار اپنے سر پر لینے کی خوشی نہیں مجھے لودی نے اس بلا میں ڈالا۔ اور وہ اس کی سزا کو پہنچا۔ اب عقیدتِ بادشاہی میرے دل پر چھا گئی ہے۔ جتنی جگہ جس جگہ ملے قناعت اور سرمایہ سعادت ہے۔ خورد سالی اور مستیِ جوانی میں یہ حرکت ہو گئی۔ کہ منہ نہیں دکھا سکتا۔ اور جب تک کوئی خاطر خواہ خدمت کر کے سرخرو نہ ہوں۔ حاضر نہیں ہوا جاتا ؂

بادشاہ سمجھ گئے۔ کہ لڑکا چالاک ہے اور نیت درست نہیں۔ ایلچی سے کہا کہ اگر داؤد صدقِ دل عقیدت رکھتا ہے تو ابھی چلا آئے۔ یہاں انتقام کا کبھی خیال نہیں ہوا۔ اگر نہیں آتا تو تین صورتیں ہیں (۱) یا تو وہ اُدھر سے آئے ہم اِدھر سے آتے ہیں ایک اُدھر کا سردار اِدھر آ جائے۔ اور ایک اِدھر کا سوار اُدھر جائے دونوں لشکروں کو روکے رہیں کہ کوئی ادھر ادھر باہر نہ جانے پائے۔ ہم دونوں بخت آزمائی کے میدان میں کھڑے ہوں۔ اور جس طرح سے وہ کہے قسمت کے ہاتھوں سے لڑائی کا فیصلہ کر لیں (۲) یہ نہیں تو

ایک سردار جس کی قوت اور دلاوری پر اُسے پورا بھروسا ہو۔ اُدھر سے۔ اور ایک اِدھر سے نکلے۔ جو فتح پائے اُس کے لشکر کی فتح (۳) اگر اس فوج میں ایسا کوئی نہ ہو۔ تو ایک ہاتھی ادھر کالو اور ایک اُدھر کالو اور لڑا دو۔ جس کا ہاتھی جیتے اُس کی فتح۔ وہ ایک بات پر بھی راضی نہ ہوا۔ بادشاہ نے ۳ ہزار سوار جرّار عین طوفان آب میں کشتیوں پر سوار کئے۔ قلعہ گیری کے اسباب نبورک۔ رہکلے۔ بان۔ جزائل۔ توپ تفنگ عجیب و غریب جہازے اور بہت سا میگزین دیا۔ اور یہ سب سامان اس دھوم دھام اور آرائش و نمائش سے رُوم و فرنگ کے باجوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ کہ کان گونجتے تھے اور دل سینوں میں جوش مارتے تھے۔ بادشاہ خود پہاڑی پر چڑھ گئے اور دُوربین لگائی۔ میدان جنگ گرم تھا۔ اکبری بہادر قلعہ شکن حملے کر رہے تھے۔ اور قلعہ والے جواب دے رہے تھے۔ قلعے کی توپوں کے گولے اس زور سے آتے تھے۔ کہ تین کوس پر سراپردہ تھا۔ بیچ میں دریا بہتا تھا اور وہ سروں پر سے جاتے تھے۔ جاں نثاروں نے سُن لیا تھا۔ کہ جوہر شناس ہمارا چشمِ دُوربیں سے دیکھ رہا ہے۔ اس طرح جان توڑ کر دھاوے کرتے تھے۔ کہ بس ہو۔ تو گولا بنیں اور قلعے میں جا پڑیں۔ یہاں سے لشکروں کے ریلے دکھائی دیتے تھے۔ آدمی نہ پہچانے جاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ چڑھاؤ کے مقابل سے پانی کا سینہ توڑ کر کشتیوں کو لے جانا سخت محنت اور دیر چاہتا تھا۔ مگر پُرانے پُرانے ملاحوں نے خان عالم کی رہنمائی کی۔ بڑے بڑے دلاور سردار۔ سورما سپاہی چُن کر کشتیوں پر سوار کئے۔ کچھ دن باقی تھا۔ کہ ملاحوں نے چڑھاؤ کے سینے پر کشتیوں کو چڑھانا شروع کیا۔ پانی کی چادر اوڑھ لی اور مُنہ پر دریا کا پاٹ لپیٹا۔ راتوں رات ایک ایسی نہر میں لے گئے کہ عین حاجی پور کے نیچے آکر گرتی تھی۔ پچھلی رات باقی تھی کہ بیڑا یہاں سے چھوٹا۔ صبح ہوتے جس غل سے قلعہ والے اُٹھے۔ وہ شور قیامت تھا۔ سب گرداب حیرت میں ڈوب گئے۔ کہ اتنی فوج کدھر سے آئی اور کیونکر آئی۔ انہوں نے بھی گھبرا کر کشتیاں تیار کیں۔ اور مقابلے پر پہنچے کہ طوفان کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ پہلے تیروں اور بندوقوں نے پانی پر آگ برسائی۔ لڑائی بہت زور پر تھی۔ اور فی الحقیقت اس سے زیادہ جان لڑانے کا وقت کونسا ہوگا۔

عصر کا وقت تھا۔ کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھاؤ پر آیا۔ بہت سے بہادر انتخاب کئے۔ کہ کشتیوں پر سوار ہو کر جائیں اور میدان جنگ کی خبر لائیں۔ قلعہ والوں نے دیکھ کر اُوپر سے گولے برسانے شروع کئے۔ اور اٹھارہ کشتیاں ان کے روکنے کو بھیجیں۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی۔ دیکھ گئے تھے۔ کہ بادشاہ ہمارا دیکھ رہا ہے۔ دریا کے دُھوئیں اُڑاتے اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گزر گئے۔ حریف دیکھتے رہ گئے پھر بھی چڑھاؤ کی چھاتی توڑ کر جانا کچھ آسان نہ تھا۔ اور کمک کو غنیم نے دریا میں روک رکھا تھا۔ دُور ہی سے

مقامِ جنگ پر گولے مارنے شروع کئے۔ ان کے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا۔ اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں۔ اب کمک کے ملاح پہلو کاٹ کر چلے۔ اگرچہ قلعے سے گولے پڑنے شروع ہوئے۔ مگر یہ بھاگا بھاگ ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے۔ اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑا کہ تیر کی طرح سیدھی معرکۂ جنگ پر آئیں بادشاہی فوج کناروں پر اُتری ہوئی تھی اور سینہ بہ سینہ لڑائی ہو رہی تھی۔ افغانی سرداروں نے کوچہ بندی کر کے بھی لڑائی ڈالی۔ مگر تقدیر سے کون لڑ سکے۔ خلاصہ یہ کہ حاجی پور فتح ہو گیا۔ اور بادشاہی فوج قلعے پر قابض ہو گئی ❊

اس فتح سے داؤد کا لوہا ٹھنڈا ہو گیا۔ باوجودیکہ بیس ہزار سوار جرار اور جنگی ہاتھی مست بے شمار اور توپ خانۂ آتش بار ساتھ تھا۔ رات ہی کو کشتی میں بیٹھا اور پٹنہ سے نکل کر لوگر کو بھاگ گیا۔ سر ہر بنگالی جس کی صلاح سے لودھی کو مار کر بکرماجیت خطاب پایا تھا۔ اُس نے کشتیوں میں خزانہ ڈالا اور پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ گوجر خاں کرارانی جس کا رکن الدولہ خطاب تھا۔ جو کچھ اُٹھا سکا اُٹھایا۔ وہ ہاتھیوں کو آگے ڈال کر خشکی کے رستے بھاگ گیا۔ ہزاروں آدمی کی بھیڑ دریا میں کود کود پڑی اور طوفان اجل کے ایک جھکولے میں ادھر سے اُدھر پہنچی۔ ہزار در ہزار آدمی گھبرا گھبرا کر برجوں اور فصیلوں پر چڑھ گئے۔ اور وہاں سے کود کر گہری خندق کا بھراؤ ہو گئے۔ بہتیرے کوچہ و بازار میں ہاتھی گھوڑوں کے نیچے پامال ہو گئے۔ ویران طیران جب ریلے پن پن پر پہنچے تو گوجر خاں نے ہاتھیوں کو آگے ڈالا اور پُل سے اُتر گیا۔ بھیڑ کا یہ عالم تھا۔ کہ پُل بھی بوجھ نہ اُٹھا سکا۔ آخر ٹوٹ گیا۔ بہتیرے نامی گرامی افغان تھے۔ کہ اسباب اور ہتھیار پھینک ننگے پانی میں گرے اور گردابِ اجل میں چکر مار کر بیٹھ گئے۔ سر تک نہ نکالا۔ پچھلا پہر تھا کہ خانخاناں نے آکر خبر دی۔ بہادر بادشاہ اُسی وقت تلوار پکڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ خانخاناں نے عرض کی۔ کہ صبح کو حضور اقبال کا قدم شہر میں رکھیں کہ خبر بھی تحقیق ہو جائے اور اختیار کی باگ بھی ہاتھ میں رہے اکبر شجاع آفتاب کے ساتھ دہلی دروازے کے رستے پٹنہ میں داخل ہوا۔ اور نظرِ عبرت سے داؤد کے محلوں کو دیکھا۔ تاریخ ہوئی۔ فتح بلادِ پٹنہ۔ مگر دوسرا نگینہ نگین سلیمان ہے۔ ع

کہ مُلکِ سلیماں زداؤد رفت

خلوت کے چمن میں حکم ہوا۔ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ بنگالہ کے لئے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں مُلکِ مقبوضہ کا بندوبست ہو۔ جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو۔ اڑ جائیں اور چھڑی کٹاری ہو جائیں کہ یہی بہار ہے۔ فتح کے گلچین اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی ہانک سچی ہے۔ ساتھ ہی خانخاناں نے

التجا کی۔ اس واسطے اُسی کو مہم سپرد ہوئی۔ چنانچہ دس[ہ] ہزار لشکر خونخوار۔ امرا۔ بیگ اور بیگچے۔ سب کمک کے لئے ساتھ دئیے۔ اور سپہ سالاری منعم خاں کے نام پر قرار پائی۔ نوارے۔ کشتیاں اور آتش خانے جو ساتھ آئے تھے۔ سب عطا ہوئے۔ بہار کا ملک اسکی جاگیر ہوا۔ بعد اسکے جاں نثاروں اور وفاداروں کو جاگیریں اور انعام خلعت خطاب ہر ایک کی خدمت درجے کے لائق دیکر آپ دریا کے رستے آئے تھے۔ اُسی رستے شادیانے بجاتے فتح کے بادبان اُڑاتے خوشی کی لہریں بہاتے دار الخلافہ کو روانہ ہوئے ✦

سالہا سال سے وہ ملک افغانستان ہو رہا تھا۔ داؤد سراسیمہ ہو کر بنگالہ کے رُخ بھاگا۔ خانخاناں اور ٹوڈرمل چھاؤنی ڈال کر ٹانڈہ میں بیٹھے۔ ٹانڈہ گور کے مقابل میں گنگا کے داہنے کنارے پر ہے اور بنگالہ کا مرکز ہے۔ اِدھر اُدھر سرداروں کو پھیلا دیا وہ جا بجا لڑتے تھے۔ افغان شکستیں کھاتے تھے۔ مضبوط اور مستحکم مقاموں کو چھوڑتے تھے اور جنگلوں میں گھس جاتے تھے۔ پہاڑوں پر چڑھ جاتے تھے۔ ایک جگہ سے بھاگ جاتے تھے۔ دوسری جگہ جم جاتے تھے۔ کہیں بھاگتے تھے۔ کہیں بھگاتے تھے۔ چنانچہ اوّل سورج گڈھ فتح ہوا۔ پھر مُنگیر مارا۔ ساتھ ہی بھاگل پور۔ اور پھر کھل گاؤں لیا۔ گڑھی باوجود قدرتی استحکام کے بے جنگ ہاتھ آئی۔ وہ ملکِ بنگالہ کا دروازہ ہے۔ اُس کے ایک پہلو کو پہاڑ نے دوسرے کو پانی نے مضبوط کیا ہے۔ انہوں نے دو طرف سے دبا کر ایسا تنگ کیا کہ بے جنگ ہاتھ آگیا۔ خانخاناں کی جاگیر پہلے بہار میں تھی اب بنگالہ میں کر دی۔ اُس نے خواجہ شاہ منصور اپنے دیوان کو وہاں بھیجدیا خبر آئی کہ داؤد ٹانڈہ پہنچا ہے۔ وہاں بیٹھے گا۔ اور ادھر کے مقامات کا استحکام کر رہا ہے۔ محمد قلی خاں برلاس کو کہ پُرانا امیر اور کہنہ عمل سپاہی تھا۔ فوج دیکر ادھر روانہ کیا۔ اور آپ ٹانڈہ میں بیٹھ کر ملک کے بندوبست میں مصروف ہوا کہ مرکز ملک کا تھا ✦

افغانوں کو جو خرابی نصیب ہوئی فقط آپس کی پھوٹ سے ہوئی۔ لودی کو داؤد نے مروا ڈالا تھا اور گوجر سے بگاڑ تھا۔ ایک موقع ایسا پڑا کہ اتفاق کے فائدے کو دونوں نے سمجھا۔ اور آپس میں صفائی ہو گئی صلاح یہ ٹھیری کہ دونوں مل جائیں اور فوجیں ملا کر لشکر شاہی سے مقابلہ کریں۔ شائد نصیبہ یاوری کرے داؤد نے کٹک بنارس کو مضبوط کر کے اہل و عیال کو وہاں چھوڑا۔ اور دونوں سردار لشکر خونخوار درست کر کے مقابلہ کو چلے ✦

خانخاناں سُنتے ہی ٹانڈہ سے روانہ ہوا۔ اور ٹوڈرمل کے لشکر کے ساتھ شامل ہو کر کٹک بنارس کا رُخ کیا۔ رستے میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ افغانوں کو شیر شاہ کا پڑھایا ہوا سبق یاد تھا۔ لشکر کے گرد خندق کھود کر قلعہ باندھ لیا۔ اس طرح کئی دن تک لڑائی جاری رہی۔ طرفین کے بہادر نکلتے تھے۔ افغان

[ہ] ماثر الامرا میں ۲۰ ہزار لشکر ہے ✦

حمیت مردانہ کرتے تھے۔ ترک ترکتاز دکھاتے تھے۔ لڑائی کی انتہا نظر نہ آتی تھی۔ دونوں حریف تنگ ہو گئے۔ ایک دن میدان میں صفیں جما کر فیصلہ کے لئے آمادہ ہوئے۔ ہاتھی بنگالہ کی ہری گھاسیں کھا کر افغانوں سے سوا مست ہو رہے تھے۔ پہلے وہی بڑھے۔ خانخاناں بھی اکبری امرا کو دائیں بائیں اور پس و پیش جمائے بیچ میں آپ کھڑا تھا۔ لیکن ستارہ اُس دن سامنے تھا۔ اور اُنہیں پہلے ستارہ آنکھیں دکھا چکا تھا۔ اس لئے لڑائی کا ارادہ نہ تھا حکم دیا کہ آج حریف کے حملے کو دُور دُور سے سنبھالو۔ ہاتھیوں کو توپوں اور زنبوروں سے روکو۔ آگ کی مار خدا کی پناہ۔ حریف کے کئی نامی ہاتھی آگے بڑھے تھے اُلٹے ہی پھر گئے۔ اور اکثر اُڑ گئے۔ بہت سے نامور افغان اُن پر سوار ہو گئے۔ گوجر خاں داؤد کی فوج پیش قدم کا سردار تھا۔ وہ حملہ کر کے ہراول پر آیا۔ خان عالم سردار ہراول نوجوان سردار تھا۔ اُس کی جرأت دیکھ کر نہ رہ سکا اور حملہ کیا۔ لیکن دلاوری کے جوش میں بہت تیزی کر گیا اُس کی فوج بندوقیں خالی کرتی چلی جاتی تھی۔ خانخاناں روک تھام کے انتظام میں تھے۔ یہ حال دیکھ کر آدمی بھیجا کہ فوج کو روکو۔ یہاں اُس کے دلاور غنیم پر جا پڑے تھے۔ بڈھے سپہ سالار نے جھنجھلا کر پھر سوار دوڑایا اور بتاکید کہلا بھیجا کہ کیا لڑکپن کرتے ہو۔ جلد فوج کو پھیر لاؤ۔ وہاں لڑائی دست و گریبان ہو گئی تھی۔ اور صورت یہ تھی کہ گوجر خاں نے بہت سے ہاتھیوں کو سامنے رکھ کر حملہ کیا تھا۔ سراگائے کی دُمیں، چیتوں، شیروں اور پہاڑی بکروں کی کھالیں جن کے چہروں پر سینگ اور دانت تک بھی موجود تھے۔ ہاتھیوں کے چہروں پر چڑھائے تھے۔ ترکوں کے گھوڑوں نے نہ یہ صورتیں دیکھی تھیں نہ یہ بھیانک آوازیں سُنی تھیں۔ بدک بدک کر بھاگے اور کسی طرح نہ تھم سکے۔ فوج ہراول ہٹ کر اور سمٹ کر مقدمہ لشکر میں جا گھسی۔ سردار ہراول (خان عالم) ثابت قدمی سے کھڑا رہا مگر ایسا گرا کہ قیامت ہی کو اُٹھیگا۔ کیونکہ حریف کا ہاتھی آیا اور اُسے پامال کر گیا۔ افغانوں نے خوشی کا شور و فغان کیا اور گوجر خاں نے اُنہیں لیکر اِس زور سے حملہ کیا کہ سامنے کی فوج کو رولتا ہوا قلب میں جا پڑا ؎

یہاں خود خانخاناں امرائے عالیشان کو لئے کھڑا تھا۔ بڈھوں نے جوانوں کو بہت سنبھالا۔ مگر سنبھلے کون؟ گوجر مارا مار بگ ٹُٹ چلا آتا تھا۔ سیدھا آیا اور اتفاق یہ کہ خانخاناں ہی سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ بے وفا پلاؤ خور بھاگ گئے۔ اور گوجر نے برابر آ کر کئی ہاتھ تلوار کے مارے۔ یہاں خان خاناں کمر میں دیکھتے ہیں تو تلوار بھی نہیں۔ غلام جو تلوار لئے رہتا تھا۔ خدا جانے کہاں کا کہاں جا پڑا۔ کوڑا ہاتھ میں تھا وہ تلواریں مارتا تھا۔ یہ کوڑے سے پیش آتے تھے۔ سر و گردن اور بازو پر بھی زخم کھائے۔ اور زخم بھی کاری کھائے۔ اچھے ہونے پر بھی کہا کرتا تھا۔ کہ سر کا زخم اچھا ہو گیا ہے۔ مگر بینائی بگڑ گئی۔ گردن کا

گھاؤ بھر گیا ہے۔ مگر مُڑ کر نہیں دیکھ سکتا۔ کندھے کے زخم نے ہاتھ نکما کر دیا۔ اچھی طرح سر تک نہیں جا سکتا۔ باوجود اس کے پھرنے کا خیال تک نہ تھا۔ کئی امرا رفاقت میں تھے وہ بھی زخمی ہو گئے۔ اس عرصے میں حریف کے ہاتھی بھی آ پہنچے۔ اور خانخاناں کا گھوڑا ہاتھیوں سے بدکنے لگا۔ رو کا مگر بے قابو ہو گیا۔ آخر ٹھوکر بھی کھائی۔ کچھ نمک حلال نوکروں نے باگ پکڑ کر کھینچی کہ ٹھیرنیکا موقع نہیں۔ اس بچارہ کو فکر یہ کہ میں سپہ سالار ہو کر بھاگونگا۔ تو سفید ڈاڑھی لیکر کسے مُنہ دکھاؤنگا۔ خیر اُس وقت اُنکی دردخواہی غنیمت ہوئی۔ اس طرح بھاگے گویا فوج والوں کو فراہم کرنے گئے ہیں۔ گھوڑا دوڑائے تین چار کوس بھاگے گئے۔ اور افغان بھی اُردوے بادشاہی تک دُبائے چلے آئے۔ تمام خیمے اور سارا بازار لُٹ گیا۔ مگر بادشاہی سردار کہ بھاگ کر چاروں طرف کھنڈ گئے تھے۔ کچھ دُور جا کر ہوش میں آئے پھر پلٹے اور افغان جو مارا مار چیونٹیوں کی قطار چلے جاتے تھے۔ اُن کے دونوں طرف لپٹ گئے۔ برابر تیروں سے چھیدتے چلے جاتے تھے۔ اور اس لمبے تاتنے کی گنڈیریاں کترتے جاتے تھے۔ نوبت یہ ہوئی کہ اپنے بیگانے کسی میں سکت نہ رہی۔ اور افغان خود تھک کر رہ گئے۔ گوجر ہٹھانوں کو ہلکارتا اور للکارتا تھا کہ مارلو مارلو۔ خانجہاں کو تو مار لیا ہے۔ اب تردد کیا ہے۔ باوجود اس کے مصاحب جو برابر میں تھے۔ اُن سے کہتا تھا کہ فتح ہو گئی مگر دل کا کنول نہیں کھلتا تھا۔ کہ اتنے میں اسے مددغیبی کہو خواہ اکبری اقبال سمجھو کہ کسی کمان سے ایک تیر چلا جو گوجر خاں کی جان کے لئے قضا کا تیر تھا اُس نے فتحیاب بہادر کو گھوڑے سے گرا دیا۔ ساتھیوں نے سر پر سردار نہ دیکھا تو بے سروپا بھاگے۔ یا تو افغان مارا مار چلے جاتے تھے یا خود مرنے لگے۔ اُس اُلٹ پلٹ میں خان خاناں کو ذرا سی فرصت نصیب ہوئی تو ٹھیر کر سوچنے لگا کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اور کیا کرنا چاہیئے؟ اتنے میں اُس کا نشانچی بھی نشان لئے آن پہنچا۔ ساتھ ہی غل ہوا کہ گوجر خاں مارا گیا۔ خانخاناں نے گھوڑا پھیرا۔ اور ادھر اُدھر جو ولاور تھے۔ وہ بھی اکٹھے ہو گئے۔ جو افغان تیر کے تلے پہ نظر آیا اُسے پرونا شروع کیا۔

قلب پر جو گزری سو گزری۔ مگر لشکر بادشاہی میں ٹوڈرمل اپنے لشکر کو لئے دائیں پہ کھڑے تھے۔ اور شاہم خاں جلائر بائیں پر۔ یہاں خان عالم کے ساتھ خانخاناں کے بھی مرنے کی اُڑ گئی تھی۔ لشکر کے دل اُڑے جاتے تھے۔ اور یہ رنگ جمائے جاتے تھے۔ ادھر گوجر کی کامیابی دیکھ کر داؤد کا دل بڑھ گیا۔ اور فوج کو جنبش دی۔ تاکہ دائیں سے دھکا دیکر گوجر سے جا ملے۔ راجہ اور شاہم نے جب یہ طور دیکھا تو اس طرح کھڑے ہونا اپنا بھی مناسب نہ دیکھا گھوڑے اُٹھائے اور توکل بخدا افغانوں کے دائیں بائیں پر جا گرے۔ جس وقت ٹوڈرمل اور داؤد میں لڑائی ترازو ہو رہی تھی۔ سادات بارہہ کے سردار حریف کے

دائیں بازو پر ٹوٹ پڑے۔ اور اسے برباد کر کے اپنے دائیں کی مدد کو پہنچے۔ یہ حملہ اس زور کا ہوا۔ کہ غنیم کے دونوں بازوؤں کو توڑ کر قلب میں پھینک دیا۔ جہاں داؤد سپہ سالاری کا چتر چمکا رہا تھا۔ اُسکے جنگی اور نامی ہاتھی صف باندھے کھڑے تھے اُنہیں ترکوں نے تیروں سے چھلنی کر دیا۔ اور اُس کی جمعیت میں ہل چل پڑ گئی۔ اتنے میں نقارہ کی آواز آئی۔ اور خان خاناں کا علم کہ فتح کا نمودار نمونہ تھا۔ دُور سے آشکارا ہُوا۔ امرا اور افواج شاہی کے گئے ہُوئے ہوش ٹھکانے آگئے۔ داؤد کو جب خبر پہنچی کہ گوجر خاں مارا گیا ہے۔ رہے سہے حواس بھی اُڑ گئے اور لشکر کے قدم اُٹھ گئے۔ تمام اسباب اور سامان اور بڑے بڑے دل بادل ہاتھی برباد کر کے سیدھا کٹک بنارس کو بھاگ گیا۔

خانخاناں نے خدا کی درگاہ میں شکر کے سجدے کئے کہ بگڑی بات کا بنانے والا وہی ہے۔ ٹوڈرمل کو کئی سرداروں کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ کیا۔ اور خود اُسی منزل میں مقام کر کے زخمیوں کے اور اپنے علاج میں مصروف ہُوا۔ ہزاروں افغان تتر بتر ہو گئے۔ سرداروں کو پھیلا دیا اور تاکید کی کہ ایک کو جانے نہ دیں۔ میدان جنگ میں ان کے سروں سے ۸ کلہ منار بلند کئے کہ فتح کی خبر آسمان تک پہنچائیں۔

داؤد کٹک[1] بنارس میں پہنچ کر قلعے کے استحکام میں مصروف ہُوا۔ مفسد پھر فراہم ہو کر اُس کیساتھ ہو گئے۔ یہ بھی گفتگو ہُوئی۔ کہ جو شکست پڑی بعض بے احتیاطیوں سے پڑی ہے۔ اب کے بند و بست سے کام کرنا چاہیئے۔ اُس نے دل میں ٹھان لی۔ کہ مرجانا ہے۔ یہاں سے بھاگنا نہیں۔ لیکن خان خاناں کو گھر میں مہم پیش آئی۔ اوّل تو مدّت سے بادشاہی لشکر سفر میں خانہ برباد پھرتا تھا۔ دوسرے بنگالہ کی بیماری اور مرطوب ہوا سے تنگ تھے۔ اِس لئے سپاہی سے لیکر سردار تک سب گھبرا گئے۔ راجہ ٹوڈرمل نے ہر چند تسلّی اور دلاسے کے منتر پھونکے۔ اور دلاوری کے نسخوں سے مردھی بنایا۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا خانخاناں کو سب حال لکھا اور کہلا بھیجا کہ تمہارے آئے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اقبال شہنشاہی سے کام بن چکا ہے۔ لیکن کام چوروں کی بے ہمتی سے پھر مشکل ہو جائیگا۔ ان لوگوں سے کچھ اُمید نہیں خانخاناں کے زخم ابھی ہرے تھے۔ سنگھاسن پر بیٹھ کر روانہ ہوا۔ سامنے جا کر ڈیرے ڈال دیئے۔ لالچ کے بھوکوں کو روپے اشرفی سے پرچایا۔ غیرت والوں کو اونچ نیچ دکھا کر سمجھایا۔ اور وہیں بنا الصلح خیر کا ختم شروع کیا۔ غنیم کو بھی بے سامانی اور سرگردانی نے تنگ کر دیا تھا۔ پیغام سلام دوڑنے لگے۔ کئی دن وکیلوں کی آمد و رفت اور گفتگوؤں کی ردّ و بدل ہُوئی۔ یہاں بھی امرا کے ساتھ مشورے ہوتے رہے۔ اکثر امرا راضی تھے۔ کہ جلد فیصلہ ہو اور صحیح سلامت گھروں کو پھریں۔ ہاں ٹوڈرمل نہ مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غنیم کی جڑ اُکھڑ گئی۔

---

[1] مآثر الامرا میں کٹک اُڑیسہ لکھا ہے۔

ہے۔ خرگوش کی طرح چاروں طرف بھاگا پھرتا ہے۔ اب اس کا پیچھا چھوڑنا نہ چاہیئے۔ داؤد حیران کہ قلعہ داری کا سامان نہیں۔ میدان جنگ کی طاقت نہیں۔ بھاگنے کا رستہ نہیں۔ ساتھ ہی خبر آئی کہ جو فوج بادشاہی گھوڑا گھاٹ پر گئی تھی۔ وہ بھی فتح کرکے گھوڑوں پر سوار ہو گئی۔ اس خبر سے داؤد کی زرہ ڈھیلی ہوئی۔ ناچار جھکا۔ بڈھے سرداروں کو بھیجا۔ وہ خان خاناں اور امرائے بادشاہی کے پاس آئے۔ یہ خود ہی تیار بیٹھے تھے۔ پھر بھی تمام امرائے بادشاہی کو جمع کرکے جلسہ مشورہ جمایا۔ سب نے اتفاق کیا۔ مگر راجہ ٹوڈرمل ناراض تھے۔ لیکن غالب رائے کا صلح پر تھا۔ راجہ نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر کثرت رائے کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ اور چند شرطوں پر صلح ٹھیری۔ داؤد ایسے اضطراب میں تھا کہ جو کچھ کہا گیا چار ناچار قبول کیا اور احسانمند ہو کر قبول کیا ؛

خانخاناں نے بڑے توزک و احتشام سے جشن جمشیدی ترتیب دیا۔ لشکر کے باہر ایک بڑا اور بلند چبوترہ تیار کرا کر سراپردہ شاہانہ قائم کیا۔ بہت دُور تک سڑک کی داغ بیل ڈالی۔ دونوں طرف صفیں باندھ کر بادشاہی فوجیں بڑے جاہ و تجمل سے کھڑی ہوئیں۔ اندر سراپردہ کے بہادر سپاہی خلعت زریں اور لباس فاخرہ پہنے۔ دائیں بائیں اور پس و پیش کھڑے۔ امرا اور سردار کمال جاہ و حشم سے اپنے اپنے رتبے پر قائم۔ دو امیر داؤد کو لینے گئے اور وہ افغان بچہ۔ نوجوان رعنا اور صاحب جمال زیبا تھا۔ بڑی کرّ و فرّ سے بزرگانِ افغان کو ساتھ لے کر آیا۔ اور اُردوے خان خاناں کے بیچ میں ہو کر دربار میں داخل ہُوا۔ سپہ سالار کہن سال گرمجوشی کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آیا۔ مگر جس طرح بزرگ خوردوں سے۔ آدھی دُور تک سراپردہ میں استقبال کیا۔ داؤد نے بیٹھتے ہی تلوار کمر سے کھول کر خانخاناں کے سامنے دھر دی اور کہا۔ چوں بمثل شما عزیزاں زخمے و آزارے رسد من از سپاہگری بیزارم۔ حالا داخل دُعاگویانِ درگاہ شدم۔ خانخاناں نے تلوار اُٹھا کر اپنے نوکر کو دیدی اُس کا ہاتھ پکڑ ابرابر تکئے سے لگا کر بٹھایا۔ بزرگانہ اور مشفقانہ طور سے مزاج پُرسی اور باتیں کرنے لگا۔ دسترخوان آیا۔ انواع و اقسام کے کھانے۔ رنگا رنگ کے شربت۔ مزے مزے کی مٹھائیاں چُنی گئیں خانخاناں خود ایک ایک چیز پر اُس کی صُلح کرتا تھا۔ میووں کی تشتریاں اور مربّوں کی پیالیاں آگے بڑھاتا تھا۔ نورچشم! بابا جان اور فرزند کہہ کر باتیں کرتا تھا۔ دسترخوان اُٹھا۔ پان کھائے۔ میر منشی قلمدان لیکر حاضر ہُوا۔ عہدنامہ لکھا گیا۔ خانخاناں نے خلعت گراں بہا اور شمشیر مرصّع جس کے قبضہ اور ساز میں جواہرات گراں بہا جڑے ہُوئے تھے۔ خزانہ شاہی سے منگا کر دی۔ اور کہا حالا ما کمر شما را بنوکری بادشاہ مے بندیم۔ اُسے جس وقت تلوار باندھنے کو پیش کی۔ تو اُس نے آگرہ کی طرف مُنہ کیا

ا ۔ جھک جھک کر تسلیم و آداب بجا لایا۔ خانخاناں نے کہا۔ شما طریقۂ دولت خواہی اختیار کردہ اید۔ این شمشیر از جانب شہنشاہ بر بندید۔ و ولایت بنگالہ را چنانچہ التماس خواہم کرد۔ موافق آں فرمان عالیشان خواہد آمد۔ اُس نے تلوار کا قبضہ آنکھوں سے لگایا اور بارگاہ خلافت کی طرف رُخ کر کے سجدۂ تسلیم کیا یعنی نوکران حضور میں داخل ہوتا ہوں۔ غرض بہت سے تکلف بجا لا کر اور بہت سے نفائس اور عجائب تحفے دیکر اور لیکر اُسے رخصت کیا۔ اور یہ دربار بڑی گرمی اور شگفتگی سے برخاست ہوا ۞

یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے۔ کہ ایسا عالیشان دربار آراستہ ہوا اور وہی بات کا پورا ٹوڈرمل تھا کہ اس میں شامل نہ ہوا بلکہ صلحنامہ پر بھی مہر نہ کی۔ سپہ سالار اس مہم کو طے کر کے گور میں آیا۔ مصلحت اس میں یہ تھی۔ کہ گھوڑا گھاٹ جو ان بھڑوں کا چھتہ تھا۔ وہ یہاں سے پاس ہے۔ بادشاہی چھاؤنی چھاتی پر دیکھ کر افغان خود دب جائینگے۔ گور عہد قدیم میں دار الخلافہ تھا۔ اور اب بھی اپنی دلکشائی و سرسبزی سے آنکھوں میں کھبا ہوا ہے۔ اس کا نادر قلعہ اور بے نظیر عمارتیں گرتی چلی جاتی ہیں۔ سب نئی ہو کر اُٹھ کھڑی ہونگی ۞

(مُلّا صاحب لکھتے ہیں) خانخاناں ان جھگڑوں سے فارغ ہو کر عین برسات کے دنوں میں ٹانڈہ کو چھوڑ کر گور میں آیا۔ وہ بھی خوب جانتا تھا۔ کہ ٹانڈہ کی آب و ہوا معتدل اور صحت بخش ہے۔ گور کی ہوا خراب۔ پانی بدبو اور کمزور ہے مگر ؏

صید را چوں اجل آید سوئے صیاد رود

امرا نے بھی کہا مگر اُس کے خیال میں نہ آیا۔ اور ارادہ یہ کہ گور کو نئے سرے سے آباد کیجئے۔ تمام امرا اور اہل لشکر کو حکم دیا۔ کہ یہیں چلے آؤ۔ افسوس کہ گور آباد نہ ہوا۔ البتہ گور یں بہت سی آباد ہو گئیں۔ بہت سے امرا اور سپاہی کہ میدان مردی میں تلواریں مارتے تھے۔ بستر مرگ پر عورتوں کیطرح پڑے پڑے مر گئے۔[1] عجیب عجیب مرض۔ انوکھی بیماریاں جن کے نام جاننے بھی مشکل ہیں۔ بے چاروں کے گلوگیر ہوئیں۔ فوج در فوج بندے خدا کے روز آپس میں رخصت ہوتے تھے اور جان دیتے تھے۔ ہزاروں کا لشکر گیا تھا۔ شاید سو آدمی جیتے گھر پھرے ہونگے۔ نوبت یہ ہوئی کہ زندے مُردوں کے دفن سے عاجز ہو گئے۔ جو مرتا پانی میں بہا دیتے۔ ہر دم اور ہر ساعت خانخاناں کو خبریں پہنچتی تھیں۔ ابھی وہ امیر مر گیا۔ ابھی وہ امیر سرد ہو گیا۔ پھر بھی سمجھتا نہ تھا۔ بڑھاپے میں مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی نازک مزاجی کے سبب سے کوئی کُھلم کُھلا جتا بھی نہ سکتا تھا۔ کہ یہاں سے نکل جانا مصلحت ہے،

---

[1] حاجی محمد خاں سیستانی۔ بیرم خانی۔ اور خان ذمانی بڈھے۔ اشرف خاں میر منشی قدیمی بھی انہی میں رخصت ہوئے ۞

اتفاق یہ کہ اتنی مدّت ایک دُوہی شخص تھا۔ کہ بیمار نہ ہوا۔ دفعتہً خبر لگی کہ جنید افغان نے صوبہ بہار میں بغاوت کی
انہیں پھر گور سے نکلنے کو بہانہ ملا۔ اور تو سب اُدھر روانہ ہوئے۔ ٹانڈہ میں آکر جس کی ہوا لوگ اچھی سمجھتے تھے
ان کی طبیعت علیل ہو گئی۔ دس دن بیمار رہے۔ گیارھویں دن روانہ ہو گئے۔ اسی ۸۰ برس سے زیادہ عمر تھی۔
۹۸۳ھ میں موت کے فرشتے نے پکارا۔ خدا جانے مالک کو جا کر حساب سمجھایا یا رضوان کو۔ وہ جاہ و جلال
عزّ و کمال۔ خواب تھا یا کہ خیال۔ وارث کوئی نہ تھا۔ برسوں کی جمع کی ہوئی کمائی کا بادشاہی خزانچیوں نے
آکر میزان مستوفی ملا لیا۔ غالباً اس کی کفایت شعاری سے خفا ہو کر مُلّا صاحب نے یہ فقرے فرمائے
ہیں۔ کچھ اور گناہ تو نہیں معلوم ہوتا۔ خیر یہ مرنے کے بعد اُس غریب کو جو چاہیں سو فرمائیں۔ ان کی زبان
اور قلم سے کون بچا ہے۔ اور ایک بات یہ بھی ہے۔ کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ آج سینکڑوں
برس کی بات ہے۔ ہمارا قیاس آج ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ اصلیت پر کیونکر پہنچ سکتا ہے

منعم خاں کے اخلاق و عادات

اکثر معاملات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے مزاج میں رفاقت کا جوش بہت
تھا۔ اور دل اُس کا دوستوں کی دردمندی سے بہت جلد اثر پذیر ہوتا تھا۔

تمہیں یاد ہے۔ بیرم خاں کا حال۔ کہ لڑتے لڑتے دفعتہً اُس کے خیالات خلوص عقیدت پر
مائل ہوئے۔ اور اکبر کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے پیغام بھیجا۔ یہاں حریفوں نے اکبر کے دل میں
پھر شک شبہے ڈالے۔ اُدھر اُسے بھی خطر تھا۔ گفتگو نے وکیلوں کی آمد و رفت میں طول کھینچا۔ ملا صاحب
فرماتے ہیں۔ ہنوز معرکہ جنگ برپا بود و آمد و رفت وکیلاں بود کہ منعم خاں باعدد وے بے تحاشا در انجا
رفت و خانخاناں را آورد۔ یہ اس کی صفائی دل کا جوش اور نیّت کی نیکی تھی۔ ورنہ خانخاناں کا منصب اور
خطاب بھی اُسے مل چکا تھا۔ اُس کے دل میں رقابت کے خیال اور منصب چھن جانے کا خطر پڑ جاتا
تو عجب نہ تھا۔

علی قلی خاں کے معرکے یاد کرو۔ کس کس طرح اس کی معافی تقصیرات میں کوششیں کرتا رہا۔ اور
بار بار کرتا رہا۔ پہلی ہی معافی پر ٹوڈرمل نے عرضی لکھی۔ کہ بہادر خاں بھائی خان زماں کا اپنی حرکت سے باز
نہیں آتا۔ بادشاہ نے عرضی سن کر کہا کہ منعم خاں کی خاطر سے ہم اس کی خطا معاف کر چکے ہیں لکھ دو کہ تو میں لئے
چلے آئیں۔ خان زماں دوبارہ بگڑا اور منعم خاں سے ملتجی ہوا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ اب میری عرض کی
گنجائش نہیں۔ اُسے بھی لکھا اور شیخ عبد النبی صدر میر مرتضٰے شریفی۔ ملا عبد اللہ سلطانپوری کی وساطت
سے پھر حضور میں عرض کی۔ آپ دست بستہ آنکھیں بند۔ سر جھکائے کھڑا التماس کرتا۔ آخر گناہ معاف ہی کروایا

وہ جانتا تھا کہ بعض امرائے حسد پیشہ کی چالاکی نے ان دونوں بھائیوں کو بلاے ادبار میں گرفتار کیا ہے۔ یہ اور وہ پُرانے جاں نثار سلطنت کے تھے۔ اس لئے بیچ میں بھی خان زمان کو اکثر دربار کی ایسی باتوں کی خبریں اور تدارک کی صلاحیں دیتا رہتا تھا جس میں حریفوں کے صدمے سے بچ کر سعادت مندی کی راہ پر آجائے کہ نمک حرام نہ کہلائے چغل خوروں نے عرض بھی کی کہ منعم خاں اس سے ملا ہوا ہے۔ وہ اپنی نیک نیتی سے ایک قدم بھی نہ ہٹا ؛

تمہیں یاد ہوگا کہ بیرم خاں کی مہم درپیش تھی۔ جو منعم خاں کابل سے بُلایا ہوا آیا۔ اور لدھیانے کے مقام پر حاضر دربار ہوا۔ اُس نے مقیم خاں کو بھی پیش کیا۔ کہ تردی بیگ کا بھانجا تھا اور ایسے موقع پر اس کا پیش کرنا گویا منارۂ ترقی پر اٹھا کر پھینک دینا تھا۔ وہ تو تردی بیگ کا بھانجا تھا جب دربار میں تبہ ہم زبانی حاصل ہوا اور شجاعت خاں خطاب ہوگیا۔ تو ایک دن دربار خلوت میں منعم خاں کو ایسے الفاظ کہے کہ تورۂ ترکانہ اور دربار شاہانہ کے خلاف تھے۔ اکبر خفا ہوا منعم خاں ان دنوں بنگالہ میں تھے شجاعت خاں کو اُس کے پاس بھجوا دیا یعنی اس نے تمہارے حق میں یہ یہ کہا ہے۔ تم ہی اس سے سمجھ لو۔ آفرین ہے منعم خاں کے حوصلے کو کہ بڑی عزت اور توقیر سے پیش آیا۔ اس کی دلجوئی و خاطرداری کی۔ اور لائق حال جاگیر اپنے پاس تجویز کر دی۔ وہ بھی بلند نظر امیرزادہ تھا۔ نہ رہنے کو راضی ہوا نہ جاگیر قبول کی خانخاناں نے یہ بھی قبول کیا۔ حضور میں اس کی معافی کے لئے عرض داشت لکھی اور سامان سواری کیساتھ رخصت کیا ؛

انہیں احکام نجوم اور تاثیر شگون وغیرہ کا بھی خیال ضرور رہتا تھا۔ یاد کرو کابل میں جب اسکے بھائی بندوں کا فساد ہوا اور یہ یہاں سے گئے قلعۂ اٹک پر معرکہ ہوا اُس دن اُنھوں نے لڑائی کو روکنا چاہا۔ کہ منحوس ستارہ سامنے ہے۔ گوجر خاں کی لڑائی جس میں خود زخمی ہوئے وہاں بھی جام میں یہی شربت تھا۔ لطف یہ کہ دونوں جگہ پینا پڑا ؎

جو کہ قسمت میں لکھا ہے جان ہو دیگا وہی
پھر عبث کا ہے کو طالع آزمائی کیجئے

اگرچہ ہمدردی اور رحم و کرم اُن کے اصلی مصاحب تھے۔ مگر خواجہ جلال الدین محمود کیساتھ کابل میں جو سلوک کیا۔ نہایت بدنما داغ اُس کے دامن نیک نامی پر رہا ؛

اضلاع مشرقی میں اُس نے مسجدیں اور عالیشان عمارتیں اپنی عالی ہمتی کی یادگار چھوڑی ہیں جونپور میں بھی کئی عمارتیں تھیں۔ مگر ۹۸۱ھ میں دریائے گومتی پر پُل باندھا ہے۔ وہ اب تک جوں کا توں موجود ہے تین سو برس گزر چکے زمانے کے صدمے اور دریا کے چڑھاؤ ایک کنکر کو جنبش نہیں دے سکتے اس کی طرز عمارت اور تراش کی خوبیاں ہندوستان کی قدیمی تعمیروں کی شان و شکوہ بڑھاتی ہیں۔ اور

سیاحانِ عالم سے داد لیتی ہیں۔ یہی پُل ہے جسے لوگ کہتے ہیں۔ کہ اُن کے غلام کا نام فہیم تھا۔ اور پُل مذکور بھی اُسی فہیم غلام کے اہتمام سے بنا تھا۔ بہر حال پُلِ مذکور کی جانب مشرق حمام کے پاس ایک محراب پر یہ اشعار کندہ ہیں ؎

خان خاناں خانِ منعم اقتدار	بستہ ایں پُل را بہ توفیقِ کریم
نام او منعم از آں آمد کہ ہست	بر خلائق ہم کریم و ہم رحیم
از صراط المستقیمش ظاہر است	شاہ را ہے سوئے جنات النعیم
رہ تبار بخشش بری گمرا نگنی!	نقطِ بد را از صراطِ مستقیم

منعم خاں جس طرح آپ اپنے خاندان کے بانی تھے۔ اسی طرح اپنی ذات پر خاتمہ کر گئے! اولاد میں فقط غنی خاں ایک بیٹا تھا۔ مگر جیسا باپ لائق تھا۔ ویسا ہی وہ ناخلف نالائق ہوا۔ بالیاقت باپ اُسے پاس بھی نہ رکھ سکا۔ کابل کے مفسدے کے بعد چند روز خراب و خوار۔ پھر دکن کو چلا گیا۔ وہاں ابراہیم عادل شاہ کی سرکار میں نوکر ہو گیا۔ پھر خدا جانے کیا ہو گیا۔ دیکھو مآثر الامرا۔

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار	اگر وقتِ ولادت مار زایند
از آں بہتر بہ نزدیکِ خردمند	کہ فرزندانِ ناہموار زایند

ملا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جونپور کے علاقے میں جھک مارتا پھرتا تھا۔ اسی عالم میں زندگی کی رسوائی سے مخلصی پائی۔

بزرگانِ قدیم کی عمدہ یادگار مولوی عظیم اللہ صاحب رغمی۔ یک عاشقِ فضل و کمال غازی پور زمینہ میں رئیس خاندانی ہیں۔ اُن کے والد بن علوم و فنون خصوصاً شعر و سخن کے شیفتہ و شیدا تھے۔ اور اسی ذوق و شوق میں خصوصاً شیخ امام بخش ناسخ کی محبت کے سبب سے ہمیشہ گھر چھوڑ کر لکھنؤ جاتے تھے۔ اور مہینوں وہیں رہتے تھے۔ مولانا رغمی سلمہم اللہ کا پانچ برس کا سن تھا۔ اُسی عمر سے یہ والد کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ عالم طفولیت سے شیخ مرحوم کی خدمت میں رہے! اور سالہا سال فیضِ حضوری سے بہرہ یاب ہوئے۔ انہی سے شعر کی اصلاح لی۔ بلکہ رغمی تخلص بھی انہی نے عنایت فرمایا۔ کہ تاریخ تلمذ پر مشتمل ہے۔ رغمی موصوف اُردو فارسی میں صاحب تصنیفات ہیں۔ اور نظم و نثر میں مجلدات ضخیم مرتب کی ہیں۔ چونکہ سرکار انگریزی میں بھی عمدہ اور با اعتبار عہدوں کا سر انجام کر کے پنشن پائی ہے۔ اس لئے علاقہ مذکور میں تاریخی اور جغرافی حالات کی تحقیقات کامل رکھتے ہیں۔ آب حیات کی برکت سے بندہ آزاد کو بھی اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ انہوں نے شفقت فرما کر ریاست قدیم اور

واقفیت خاندانی کی معلومات سے جونپور اور غازی پور زمینہ کے بہت سے حالات عنایت کئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اکبر بادشاہ ۹۸۱ھ میں یہاں آئے۔ اور جس مقام پر پل مذکور ہے۔ یہیں کھڑے ہو کر تعمیر کی فرمائش فرمائی۔ خانخاناں نے معماروں کو بلا کر کہا۔ انہوں نے عرض کی یہاں پانی بہت گہرا ہے اور ہمیشہ رہتا ہے۔ ابراہیم لودھی نے بھی ارادہ کیا تھا اُس وقت یہاں سے آدھ کوس جانب مشرق بدیع منزل کے پاس جگہ تجویز ہوئی تھی۔ کہ گرمی میں وہاں پانی کم ہو جاتا ہے۔ خانخاناں نے کہا۔ بادشاہ نے اسی مقام کو پسند کیا ہے۔ کہ قریب قلعہ ہے بہتر ہے۔ کہ یہیں پل بنے چنانچہ انہوں نے اوّل دکن کی جانب میں نہایت مستحکم اور عالیشان پانچ محراب کا ایک پل بنایا۔ اُس کی تاریخ بھی کسی شخص نے کہی تھی۔ اگرچہ اب عبور زمانہ سے حروف مٹ گئے ہیں مگر مولوی صاحب موصوف نے اُسی نظرِ عنایت سے جو آزاد کے حال پر مبذول ہے۔ پڑھ کر سب نکالے اور یہ قطعہ تحریر فرمایا ؎

مقامے ساخت سلطان السلاطین	سرشتہ آب و خاکش از مسرت
بعشرت کامران باد اکہ آمد!	درِ او قبلۂ ارباب حاجت
الٰہی تا قیامت باد معمور	ازیں بانی بنائے عمر و دولت
چو از پیرِ خرد تاریخ آں جُستت	حکیم پُر خرد گفتا بہ عشرت

خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خان

تمام تاریخیں اور تذکرے خان اعظم کی عظمت امیرانہ اور شجاعت رستمانہ اور لیاقت اور قابلیت کی تعریفوں سے مرصع ہیں لیکن اس قسم کے حالات کم ہیں جن سے یہ نگینہ اسکی انگوٹھی پر ٹھیک آ جائیں ہاں اکبر کے ہم سن تھے۔ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی عنایتوں اور شفقتوں نے رتبے اور قدر و منزلت بہت بڑھائی تھی بلکہ ان کی سپاہیانہ طبیعت اور بادشاہ کی ناز برداریوں نے لاڈلے بچوں کی طرح ضدی اور بدمزاج کر دیا تھا خیر میں حالات دیکھتا ہوں۔ ناظرین ان سے آپ ہی نتیجے نکال لینگے اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ جو کچھ ہیں۔ نہایت دلکش اور دلچسپ ہیں +

اس کے والد[1] میر شمس الدین محمد خاں تھے۔ کہ اکبری عہد میں خان اعظم و اتکہ خاں کہلاتے تھے + اکبر ابھی پیدا نہ ہوا تھا جو بادشاہ بیگم نے میرزا عزیز کی ماں سے کہہ دیا تھا کہ میرے ہاں لڑکا ہوگا۔ تو تم سے تم دودھ پلانا۔ اکبر پیدا ہوا۔ ان کے ہاں ابھی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اس عرصہ میں اور بیبیاں اور بعض خواصیں دودھ پلاتی رہیں۔ پھر ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے دودھ پلایا۔ اور زیادہ تر انہی نے یہ خدمت ادا کی۔ جب ہمایوں ہندوستان سے بالکل مایوس ہوا۔ اور راہ قندھار سے ایران کو روانہ ہوا۔ تو ان میاں بیوی کو اکبر کے پاس چھوڑ گیا۔ خدا کے آسرے پر دونو دکھ بھرتے رہے یہاں تک کہ ہمایوں وہاں سے پھر کر آیا۔ کابل کو فتح کیا۔ اور اکبر کے اقبال کے ساتھ انکا ستارہ بھی نحوست سے نکلا۔ اکبر ان کے سبب سے انکے سارے خاندان کی رعایت بدرجۂ غایت کرتا تھا اور عزت کے مدارج پر جگہ دیتا تھا۔ یہ بھی ہمیشہ خطرناک موقع پر جاں نثاری کا قدم آگے رکھتے تھے۔ اکبر خان اعظم کی ماں کو جی جی کہتا تھا۔ اور بڑا ادب بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا۔ (حالات آئندہ سے واضح ہوگا)

۹۶۹ھ میں خان اعظم شمس الدین محمد خان اتکہ شہید ہوئے تو اکبر نے مرزا عزیز کی کہ چھوٹے بیٹے تھے بہت دلداری کی۔ تمام خاندان کو تسلی دی۔ چند روز کے بعد خان اعظم خطاب دیا۔ مگر ہمیشہ پیار سے مرزا عزیز اور مرزا کو کہ کہتا تھا۔ ہر وقت مصاحبت میں رہتے تھے جب ہاتھی پر سوار ہوتے تھے تو اکثر انہی کو خواصی میں بٹھاتے تھے۔ ان کی گستاخی اور بے اعتدالی کو بھائی بیٹوں کا ناز سمجھتے تھے خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جب اس پر غصہ آتا ہے تو دیکھتا ہوں کہ میرے اور اسکے بیچ میں دودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ میں چپ رہ جاتا ہوں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر میرا عزیز مجھ پر تلوار بھی کھینچ کر آئے تو جبتک

[1] دیکھو تتمہ میں صفحہ ۷۴۱

یہ وار نہ کرے میرا ہاتھ اس پر نہ اُٹھیگا۔ خان اعظم کو بھی اس بات کا بڑا ناز تھا۔ کہ ہم اکبر بادشاہ کے عزیز بلکہ بھائی ہیں۔ اخبار قربت انکے اس قدر دُور دُور پہنچے تھے۔ کہ ۹۷۸ھ میں جو عبداللہ خاں اُذبک کی طرف سے سفارت آئی اس میں تحائف سلطنت کے ساتھ انکے اور منعم خاں خانخاناں کے نام علیحدہ علیحدہ تحائف آئے۔ آزاد - باوجود ان محبتوں کے یہ سمجھنا کہ اکبر کسی کے حال سے غافل تھا۔ جب محمد حکیم مرزا کابل سے بغاوت کر کے آیا تھا اور بعد اسکے ۹۸۲ھ میں حتی پٹنہ کی مہم میں اسے خبریں پہنچی تھیں کہ اتکہ خیل یک رُخ نہیں۔ اور یہ آئین سلطنت تھا کہ جب ایک حاکم مدت تک ایک مقام پر رہتا تھا۔ تو اس کی جاگیر تبدیل کر دیتے تھے۔ چنانچہ ۹۸۵ھ میں تمام اتکہ خیل کو پنجاب سے بلا لیا۔ پنجاب حسین قلی خاں کو مل گیا۔ مرزا عزیز ہمیشہ حضور ہی میں رہتے تھے۔ اس لئے دیپالپور اُن کی جاگیر میں بدستور رہا۔ اَوروں کو چند روز کے بعد سنبھل۔ قنوج وغیرہ کے علاقے مل گئے +

دیپالپور کا علاقہ خاص انکی جاگیر تھا۔ ۹۷۸ھ میں بادشاہ پاک پٹن سے زیارت کر کے ادھر آئے انہوں نے عرض کی کہ لشکر شاہی مدت سے برابر تکلیف سفر اُٹھا رہا ہے۔ چند روز حضور یہاں آرام فرمائیں۔ بادشاہ نے کئی مقام کئے اور مع شہزادوں اور امرائے دربار انکے گھر گئے۔ خان اعظم نے ضیافتوں کی اور مہمانداریوں میں بڑی عالی ہمتی دکھائی۔ رخصت کے دن گرانبہا نذرانے پیشکش گزرانے عربی اور ایرانی گھوڑے جن پر سونے روپے کے زین۔ کوہ پیکر ہاتھی نقرئی اور طلائی زنجیریں سونڈھوں میں جھلاتے مخمل زربفت کی جھولیں سونے چاندی کے انکس۔ موتی۔ جواہرات گراں بہا سے مرصع کرسیاں پلنگ۔ سونے چاندی کی چوکیاں سیکڑوں باسن طلائی و نقرئی۔ جواہرات قیمتی بڑے عجائب اجناس ملکِ فرنگ۔ روم۔ خطا۔ یزد کے نفائس تحائف خارج از حد و قیاس حاضر کئے۔ شہزادوں اور بیگماتوں کو لباس اور زیور ہائے گراں مایہ پیش کئے۔ تمام ارکان دولت اور ارکین سلطنت۔ کل ارباب منصب اہل فضل اہل کمال جو ملازم رکاب تھے۔ بلکہ تمام لشکر کو خوان انعام سے فیض پہنچائے اور سخاوت کے دریا میں پانی کی جگہ دودھ کے طوفان اُٹھائے۔ اسکے نمک خوار ظفر حسین کو دیکھنا کیا نے کی تاریخ کہی ہے ع

مہمان عزیز اند شہ و شہزادہ

آزاد - ہاں - بادشاہ کا دودھ بھائی ایسا ہی دریا دل ہونا چاہیئے۔ ملا صاحب نے اس ضیافت میں فقط اتنا لکھا ہے: "ایسی ضیافت کی کہ کم کسی نے کی ہوگی" خود سمجھ لو کہ اتنا ہی کچھ کیا ہوگا۔ جو حضرت کا قلم اتنا رسا ہے۔ آزاد - اکبر اگرچہ ناخواندہ بادشاہ تھا۔ مگر ملکداری اور ملک گیری کے علم میں ماہر کامل تھا۔ وہ اپنے امیرزادوں کو اس طرح حکمرانی کشورستانی کی تعلیم کرتا تھا جیسے کوئی کامل مولوی اپنے

شاگردوں کو کتاب کے سبق یاد کرواتے تھے۔ ان میں سے ٹوڈرمل خانخاناں۔ مان سنگھ۔ خان اعظم با استعداد شاگرد نکلے +

۹۷۹ھ میں جو صوبہ گجرات فتح کیا تھا۔ انہیں جاگیر میں عنایت ہوا۔ کہ انتظام کرو۔ لیکن اکبر تو ادھر آیا۔ وہاں محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا نے فولاد خاں دکنی اور بر شور افغان وغیرہ سے موافقت کرکے لشکر فراہم کیا اور مقام پٹن پر آکر ڈیرے ڈال دئے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ حسین مرزا کی جرأت و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے معرکوں میں دلاوران زمانہ کے حوصلے سے بڑھکر قدم مارتا تھا۔ خان اعظم نے امرائے شاہی کو اطراف سے جمع کیا۔ بعض امرائے اکبری جو حسب الحکم اپنی خدمتوں پر جانے تھے خود دوڑکر آئے اور شامل ہوئے غرض لشکر آراستہ ہو کر باہر نکلا۔ غنیم بھی اُدھر سے اپنی جمعیت سنبھال کر آگے بڑھا۔ جب پلہ جنگ پر پہنچے۔ تو طرفین نے اپنے اپنے لشکروں کے پرے باندھکر بازی شطرنج کی طرح ایک دوسرے کو قوی پشت کیا۔ اتنے میں خبر لگی۔ کہ غنیم کا ارادہ ہے پیچھے سے حملہ کرے۔ انہوں نے چند امرا کو الگ کرکے فوج دی۔ اور اُس کے بندوبست سے خاطر جمع کی +

جب خان اعظم نے میدان میں آکر فوج کو قائم کیا۔ تو غنیم نے لشکر شاہی کی جمعیت اور سرداروں کا بندوبست دیکھکر لڑائی کو ٹالنا چاہا اور صلح کا پیغام دیکر ایک سردار کو بھیجا۔ امرائے شاہی صلح پر راضی ہوگئے۔ مگر ایک امیر گھوڑا مار کر خان اعظم کے پاس پہنچا اور کہا کہ زنہار صلح منظور نہ فرمائیے کہ دغا ہے جب آپ کی فوجیں اپنے اپنے مقاموں پر چلی جائینگی۔ یہ پھر سر اُٹھائینگے۔ خان اعظم نے اسکی دُور اندیشی پر تحسین کی۔ اور غنیم کو جواب میں کہلا بھیجا۔ کہ صلح منظور ہے لیکن تمہاری نیت صاف ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ کہ ہم تمہارے مقام پر آن اُتریں۔ اُنہوں نے یہ بات نہ مانی +

خان اعظم نے فوج کو آگے بڑھایا۔ غنیم کی دائیں فوج نے بائیں پر حملہ کیا اور اس کڑک دمک سے آیا۔ کہ خان کی فوج کا بازو اُکھڑ گیا۔ قطب الدین قدیم الخدمت سردار تھا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کیساتھ وہیں گڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آفرین ہے ہمت مردانہ پر کہ جب غنیم کے ہاتھی نے حملہ کیا۔ تو بڑھکر اُسکی مستک پر ایک ایسا ہاتھ تلوار کا مارا کہ مستک کا پیٹ کھول دیا۔ تعجب یہ کہ فوج ہراول پر زور پڑا تو وہ بھی مقابلہ میں ٹھیر نہ سکی۔ اور آگے کی فوج بھی درہم برہم ہو کر پیچھے ہٹی۔ بھاگنے والے بھاگتے بھی تھے۔ لڑتے بھی تھے۔ حریف اُن کے پیچھے گھوڑے مارے چلے جاتے تھے +

خان اعظم قطب کو لئے کھڑا تھا۔ اور تقدیر الٰہی کا منتظر تھا۔ اتنے میں پانسو سوار کا پرا اُس پر بھی آیا۔ مگر ٹکر کھا کر پیچھے ہٹا۔ غنیم نے جب دیکھا کہ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اور دائیں میں اتنی طاقت نہیں کہ بائیں کی مدد کو آئے۔ بادشاہی سردار دُور سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ تو وہ مطمئن ہو کر ٹھیرا کہ اب کیا کرنا چاہیے

اس عرصہ میں فوج اس کی لوٹ پر گر پڑی لیکن بائیں فوج میں قطب الدین خاں پر سخت بنی ہوئی تھی۔ خان اعظم اپنی فوج کو لیکر ادھر پہنچا اور اس کے بہادر گھوڑے اٹھاکر باز کی طرح جا پڑے غنیم کی فوج اُدھر سے تتر بتر ہو گئی کیونکہ اور فوجوں کے لوگ کچھ تو بھاگتوں کے پیچھے بھاگے جاتے تھے۔ کچھ لوٹ پر گرے ہوئے تھے۔ سرداروں سے نہ ہو سکا کہ پھیلاؤ کو پھر سمیٹ لیں یہ اقبال اکبری کا طلسمات تھا کہ شکست سے فتح ہو گئی اور بگڑی ہوئی بات بن گئی۔ خان اعظم اپنی فوج لیکر ایک بلندی پر آن کھڑا ہوا +

اتنے میں غل ہوا کہ مرزا پھر اُدھر پلٹے۔ خان اعظم کی فوج بھی سنبھل کر کھڑی ہوئی۔ غنیم سے اوّل غلطی ہوئی کہ اُس نے بھاگتوں کا پیچھا کیا۔ جیسا پہلے حملے میں کامیاب ہوا تھا ساتھ ہی خان اعظم پر آتا تو میدان مار لیا تھا۔ یا جس طرح باگیں اُٹھاکر گیا تھا اُسی طرح سیدھا شہر گجرات میں جا داخل ہوتا تو خان اعظم کو اور بھی مشکل ہوتی +

اب جو دوبارہ اُس کے غبار لشکر نے نشان دکھایا تو اُدھر سب سنبھل گئے تھے۔ کچھ بھاگے ہوئے پلٹ کر پھرے تھے۔ وہ بھی آن ملے۔ ایک امیر نے کہا۔ کہ بس یہی موقع حملہ کا ہے۔ خان اعظم چاہتا تھا کہ باگ اُٹھائے۔ جو ایک سردار نے کہا اتنے امیر موجود ہیں سپہ سالار کو حملہ پر جانا کہاں کا آئین ہے ابھی حملہ کی نوبت نہ آئی تھی کہ معلوم ہوا غنیم خود ہی ہٹا۔ اور فوج اُسکی گھونگٹ کھا کر میدان سے نکل گئی دشمن کی فوج میں ایک مست ہاتھی تھا۔ کہ اُس کا فیلبان تیر قضا کا شکار ہوا تھا۔ وہ شتر بے مہار اپنے بیگانہ سب کو روندتا اور کھندلتا پھرتا تھا۔ جدھر نقارہ کی آواز سنتا اُدھری دوڑتا لشکر بادشاہی میں جو فتح کے نقارے جا بجا بجنے لگے وہ بولا گیا۔ خان اعظم نے حکم بھیج کر نقارے موقوف کر دئیے اور دیوانہ دیو کو گھیر کر گرفتار کیا +

خان اعظم فتح کے نشان لہراتا گجرات میں داخل ہوا۔ مگر غنیم کا پیچھا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر فوج لیکر چلا جب یہ خبر دربار میں پہنچی اکبر کو بڑی خوشی ہوئی سا ایک میر کے ہاتھ آفرین کا فرمان بھیج کر انہیں بلا بھیجا یہ سن کر پھولے نہ سمائے۔ اور مارے خوشی کے بے سرو پا دربار کی طرف دوڑے +

۹۸۰ھ میں ایسے ڈھب مصیبت کے پھندے میں پڑ گئے تھے اگر اکبر کی تلوار اور ہمت کی پھرتی مدد نہ کرتی۔ تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ خان اعظم گجرات میں بیٹھے تھے کبھی شاہانہ حکومت کے کبھی امیرانہ سخاوت کے مزے لیتے تھے کہ وہی محمد حسین مرزا اختیار الملک دکنی کے ساتھ مل گیا۔ دکن کے کئی سردار اور بھی آن ملے۔ اور تمام احمد نگر وغیرہ کی اطراف پر پھیل گئے انجام یہ ہوا کہ خان اعظم بھاگ کر احمد آباد میں گھس بیٹھے۔ اور اسی کو غنیمت سمجھا۔ کہ شہر تو ہاتھ میں ہے۔ غنیم ۱۴ ہزار لشکر جمع کر کے گجرات پر آیا اور خان اعظم کو ایسا محاصرہ میں دبوچ لیا کہ تڑپ نہ سکے +

ایک دن فاضل خاں فوج لیکر خانپور دروازہ سے نکلے اور لڑنے لگے۔ غنیم ایسے اُمنڈ کر آئے۔ کہ سب کو سمیٹ کر قلعہ میں گھسیڑ دیا۔ فاضل خاں سخت زخمی ہوئے اور غنیمت سمجھو کہ جان لے کر بھاگے۔ سلطان خواجہ گھوڑے سے گر کر خندق میں جا پڑے۔ فصیل پر سے رسّا ڈالا۔ ٹوکرا لٹکایا۔ جب نکلے۔ سب کے جی چھوٹ گئے۔ اور کہہ دیا۔ کہ اس غنیم کا مقابلہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ عرضیاں اور خطوط دوڑانے شروع کئے۔ یہی عرائض کی تحریر تھی اور یہی پیام کی تقریر کہ اگر حضور تشریف لائیں تو جانیں بچینگی۔ ورنہ کام تمام ہے۔ محل میں جی جی آئی تھی۔ اور روتی تھی۔ کہ واری میرے بچے کو جا کر بچاؤ۔ اکبر عمدہ عمدہ سرداروں اور سپاہیوں کو لیکر سوار ہوا۔ اور اس طرح گیا کہ ۲۷ دن کا راستہ ۷ دن میں لپیٹ کر ساتویں دن گجرات سے تین کوس پر دم لیا۔ فیضی نے جو سکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ لکھنا چاہا تھا۔ اُس میں اس معرکہ کا خوب سماں باندھا ہے ؎

بہ یک ہفتہ تا احمد آباد رفت	تو گوئی کہ بر مرکبِ آباد رفت
یلاں بر شتر ترکش اندر کمر	شتر چوں شتر مرغ در زیر بر

لڑائی کا بیان ہفت خوان رستم کی داستان ہے۔ اکبر کے حال میں دیکھ لو۔

علاء الدولہ نے تذکرہ میں لکھا ہے۔ کہ جب اکبر نے گجرات فتح کی تو شاہزادہ سلیم کی وکالت اور نیابت کے ساتھ دو کروڑ ساٹھ لاکھ کا علوفہ کر کے دار الملک احمد آباد سے پایہ تخت گجرات میں ممتاز کیا۔ اُس دن ایک تقریب خاص کے سبب سے میں بھی حاضر تھا اور میں مرزا کا ملازم بھی تھا۔ شب برات کی د، تاریخ تھی۔ میں نے اُسی وقت تاریخ کہی ع

گفتا کہ بہ شب برات داد ندہد ۔

دوسرے سال فتوحات بنگالہ کے شکرانے میں بادشاہ فتح پور سے اجمیر گئے۔ دو بڑے بڑے نقارے جو لوٹ میں آئے تھے۔ وہاں نذر چڑھائے۔ خان اعظم پہلے سے اشتیاق حضوری میں عرضیاں دوڑا رہے تھے۔ یلغار کر کے احمد آباد سے پہنچے۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ اُٹھے اور چند قدم بڑھ کر گلے لگایا۔

۹۸۲ھ میں مرزا سلیمان کی آمد آمد تھی۔ اور ضیافت کے وہ سامان ہوئے تھے۔ کہ جس سے جشن جمشید کی شان شکوہ گرد تھی۔ انہیں حکم پہنچا کہ تم بھی حاضر دربار رہو تاکہ زمرۂ امرا میں پیش ہو۔ خان اعظم ڈاک بٹھا کر فتح پور میں حاضر ہوئے۔

نکتہ۔ اکبر ہندوستان کے لوگوں کو عمدہ عہدے اور بااعتبار رتبے بہت دینے لگا تھا۔ اور اسکے کئی سبب تھے کچھ تو اس لئے کہ اُسکے باپ اور دادا نے ہمیشہ بخارا اور سمرقند کے لوگوں سے خطا پائی تھی۔ اور اس سے بھی اکثر ترکوں نے بغاوت کی تھی۔ کچھ اس سبب سے کہ یہاں کے لوگ۔ صاحب علم۔ بالیاقت۔ باتدبیر اپنے ملک کے حال سے باخبر ہوتے تھے۔ اور اطاعت بھی صدق

دل سے کرتے تھے کچھ اس سبب سے کہ ان کا حق تھا اس لئے اس سے فائدہ اٹھانا بھی پہلے ان کا حق تھا۔ بہرحال ترک اس بات سے جلتے تھے۔ اور اکثر طرح طرح سے بدنام کرتے کبھی کہتے تھے بدمذہب ہوگیا۔ کبھی یہی کہتے تھے کہ بزرگوں کے خدمتگاروں اور حق داروں کے حق بھول گیا۔ اس موقع پر کہ مرزا سلیمان آنے والا تھا۔ بادشاہ باتدبیر نے اسے یہ بات دکھانی مصلحت سمجھی کہ دیکھو جو لوگ باوفا اور جاں نثار ہیں میں انکو اور انکی اولاد کو کتنا بڑھاتا ہوں اور کس قدر عزیز رکھتا ہوں۔ اور مرزا عزیز کو دیکھئے کس رتبۂ عالی پر پہنچایا ہے۔ کہ میری انگہ کا لڑکا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت سے قدیم الخدمت اور کہنہ عمل اہل سیف و اہل قلم موجود تھے انہیں پیش کیا۔

انہی دنوں میں داغ کا آئین جاری ہوا تھا۔ امرا کو یہ قانون ناگوار تھا۔ بادشاہ نے مرزا عزیز کو اپنا سمجھ کر فرمایا کہ پہلے خان اعظم اپنے لشکر کی موجودات دے گا۔ ہٹیلے نواب کی آنکھوں پر ان دنوں جوش جوانی نے پردہ ڈالا تھا۔ ایک میاں باؤلے اوپر سے پی بھنگ۔ ہمیشہ کے لاڈلے تھے۔ یہ اپنی ہٹ پر آکر اڑ گئے اور نئے قانون کی قباحتیں صاف صاف کہنی شروع کیں۔ بادشاہ نے کچھ فہمائش کی۔ اور ارکان دولت نے تائید میں تقریریں کیں۔ یہ جواب میں کس سے رکتے تھے۔ بادشاہ نے تنگ آکر کہا۔ کہ ہمارے سامنے نہ آؤ کئی دن کے بعد آگرہ بھیج دیا۔ کہ اپنے باغ میں رہیں اور آمد و رفت کا دروازہ بند۔ نہ یہ کہیں جائیں۔ نہ کوئی انکے پاس آئے۔ باغ مذکور کا نام باغ جہاں آرا تھا۔ کہ خود ذوق و شوق کی نہروں سے سرسبز کیا تھا۔

سنہ ۹۸۳ھ میں بادشاہ کو خود خیال آیا۔ اور تقصیر معاف کر کے پھر صوبۂ گجرات میں رخصت کرنا چاہا۔ یہ تو پورے ضدی تھے۔ نہ مانا۔ بادشاہ نے پھر کہلا بھیجا کہ وہ ملک سلاطین عالی جاہ کا تخت گاہ ہے۔ اس نعمت اور حضور کی عنایت کا شکرانہ بجالاؤ اور جاؤ۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ میں نے سپاہ گری چھوڑ دی۔ میرا نام اہل دعا کے لشکر میں رہنے دیجئے۔ قطب الدین خاں انکے حقیقی چچا کو بھیجا۔ کہن سال بڈھے نے بہت سے نشیب و فراز دکھلا کر سمجھایا ماں نے بھی کہا جھنجھلائی اور خفا بھی ہوئی۔ مگر یہ کس کی سنتے تھے۔ ادھر مرزا خاں کی قسمت زور کر رہی تھی اور خان ناکام ہونا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھیج دیا۔ وہ شکرانہ بجالایا۔ اور سجدے کرتا ہوا روانہ ہوا۔ ان کی خطا تو ہر وقت معاف تھی۔ مگر یہ کہو سنہ ۹۸۶ھ میں انہوں نے بھی معافی خطا کو منظور کیا۔

سنہ ۹۸۷ھ میں مرزا پر سے بڑی کل بل ٹلی۔ بادشاہ خلوت میں تھے۔ دفعتہ دولت خانہ اقبال سے غوغائے عظیم کی آوازیں بلند ہوئیں معلوم ہوا کہ مرزا کوکہ زخمی ہوئے حقیقت حال یہ تھی کہ بھوپت چوہان اٹاوہ کا راجہ باغی ہو کر ملک بنگالہ میں چلا گیا تھا۔ بنگالہ تسخیر ہوگیا تو وہ پھر اپنے علاقہ میں آیا اور رعیت کو پرچاتے۔ جنگلوں اور رہزنوں کو دبانے لگا۔ حکام بادشاہی نے اسے دبایا اور دربار میں عرضی کی حکم ہوا کہ ملک مذکور مرزا کی جاگیر ہے بھیجا کر اس کا بندوبست کریں۔ وہ بھاگ کر راجہ ٹوڈرمل اور بیربر کے پاس آیا۔ اور تیرم بخشی کا دستہ نکالا مرزا کو یہ حال

معلوم ہوا حضور میں عرض کی۔ حکم ہوا کہ شیخ ابراہیم۔ شیخ سلیم چشتی کے خلیفہ اُسے بُلائیں۔ اور حال دریافت کریں۔ وہ ظاہر میں بندگی اور دل سے مرزا کی گھات میں تھا۔ راجپوتوں کی جمعیت سے لشکر میں آیا۔ اور شیخ سے کہا۔ کہ مرزا مجھے اپنی پناہ میں لیں اور جرم بخشی کا ذمہ لیکر حضور میں لے چلیں۔ ورنہ میں اپنی جان کھو دونگا۔ شیخ اُسے اور مرزا کو لیکر حضور میں حاضر ہوئے۔ آئین تھا کہ بارگاہ میں بے اجازت کسی کو ہتھیار بند نہ آنے دیتے تھے۔ اس کی کمر میں جمدھر تھا۔ ایک پہرہ والے نے جمدھر پر ہاتھ رکھا۔ وہ بدگمان ہوا۔ اور جھٹ جمدھر کھینچ لیا۔ مرزا نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے انہیں زخمی کیا۔ پالکی میں پڑ کر گھر گئے۔ دُوسرے دن حضور نے جا کر آنسو پونچھے اور دم دلاسوں کی مرہم پٹی چڑھائی ؛

۹۸۵ھ میں پھر نوست آئی۔ اُسکی کہانی بھی سُننے کے قابل ہے۔ ان کا دیوان کچھ روپیہ کھا گیا تھا۔ انہوں نے اُسے طالب اپنے غلام کے سپرد کیا۔ کہ روپیہ وصول کرے۔ اُس نے دیوان جی کو باندھ کر لٹکا دیا چوبکاری شروع کر دی اور ایسا مارا کہ مار ہی ڈالا۔ دیوان کا باپ روتا پیٹتا حضور میں حاضر ہوا۔ بڈھے کی حالت دیکھ کر بادشاہ کو بہت رنج ہُوا۔ قاضی لشکر کو حکم ہوا کہ تحقیقات کرے۔ خان اعظم نے کہا کہ غلام کو میں نے سزا دیدی۔ میرا مقدمہ حضور قاضی کے ہاتھ میں نہ ڈالیں۔ اس میں میری بے عزتی ہے۔ بادشاہ نے یہ عرض منظور نہ کی۔ یہ خفا ہو کر پھر گھر جا بیٹھے۔ کئی مہینے کے بعد بادشاہ نے خطا معاف کی ۹۸۸ھ میں بنگالہ میں فساد ہوا۔ مظفر خاں سپہ سالار مارا گیا تو ان کو پنجہزاری منصب عنایت کیا۔ ابھی تک خان اعظم انکے باپ کا خطاب بھی امانت رکھا تھا۔ وہ عنایت فرما کر راجہ ٹوڈرمل کی جگہ بنگالہ کی مہم پر سپہ سالار کر دیا۔ کئی امیر کہنہ عمل سپاہی اور پرانے تیغ زن فوجوں سمیت ساتھ کئے۔ انہیں بھی بھاری بھاری خلعت اور عمدہ گھوڑے دیکر اعزاز بڑھایا۔ مشرقی امرا کے نام فرمان جاری ہوئے۔ کہ یہ آتے ہیں۔ سب اُن کی اطاعت کرنا اور حکم سے باہر نہ ہونا

منعم خاں خان خاناں اور حسین قلی خاں خانجہاں اُس ملک میں برسوں تک رہے تلواروں نے خون اور تدبیروں نے پسینے بہلئے۔ مگر ملک مذکور کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ایک طرف تو افغان جو اپنا ملک سمجھتے تھے۔ جا بجا فساد کرتے تھے۔ دوسری طرف بادشاہی امرا جو نمک حرام ہو رہے تھے۔ وُہ کبھی آپ کبھی افغانوں کے ساتھ مل کر مار دھاڑ کرتے پھرتے تھے خان اعظم فوجیں بھیج کر اُن کا بندوبست کرتے تھے۔ اُن پر بس نہ چلتا تھا امرائے ہمراہی پر خفا ہوتے تھے۔ بہت غصے ہوتے تو ایک چھاؤنی چھوڑ دوسری چھاؤنی میں چلے جاتے تھے امرا بہت چاہتے تھے۔ کہ انہیں خوش رکھیں۔ مگر وُہ خوش ہی نہ ہوتے تھے۔ ٹوڈرمل بھی ساتھ تھے۔ کمر باندھے پھرتے تھے۔ کبھی ادھر۔ کبھی اُدھر۔ ایک برس سے زیادہ یہ دو برس تک اُدھر رہے۔ اور رات دن انہیں میں غلطاں و پیچاں بٹتے رہے۔ امارت بھی خرچ کی۔ روپیہ دیکر بھی باغیوں کو پرچایا۔ پر اس ملک کے معاملے ایسے نہ

تھے کہ پاک و صاف ہو جائیں۔ سنہ ۹۹۰ھ میں جب بادشاہ کابل کی مہم فتح کر کے فتح پور میں آئے۔ تو سنہ ۹۹۱ھ کے جشن میں آ کر شامل دربار ہوئے۔ اور وہاں بغاوت ہو گئی۔ اور بنگالہ سے لیکر حاجی پور تک باغیوں نے لے لیا خان اعظم مہم بنگالہ کے لئے دوبارہ خلعت اور فوج لیکر روانہ ہوئے۔ اور اس کا بندوبست کیا۔ سنہ ۹۹۲ھ میں عرضی کی کہ اس کی ہوا مجھے موافق نہیں۔ چند روز اور رہا تو زندگی میں شبہ ہے۔ بادشاہ نے بلا لیا ؛

اکبر کا دل مدت سے دکن کی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ سنہ ۹۹۳ھ میں ادھر کے اضلاع سے ملک مذکور میں فتنہ و فساد کی خبریں آئیں میر مرتضےٰ اور خداوند خاں امرائے دکن برار سے احمد نگر پر چڑھ گئے۔ کہ نظام الملک کا پایہ تخت تھا وہاں سے شکست کھا کر راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے پاس آئے۔ کہ اکبر کے پاس جاتے ہیں۔ مرتضےٰ نظام شاہ نے راجہ علی خاں کے پاس آدمی بھیجے۔ کہ فہمائش کر کے روک لو۔ وہ روانہ ہو گئے تھے۔ اس لئے آدمی بھیجے کہ تو ہیں کو روکیں۔ وہ نہ رکے اور نوبت تلوار و تفنگ کی پہنچی۔ انجام یہ کہ انہیں لوٹ کھسوٹ کر ذخیرہ وافر جمع کیا۔ اور وہ آگرہ پہنچے۔ راجہ علی خاں بڑا دوراندیش اور صاحب حکمت تھا۔ خیال ہوا کہ بہادر اکبر کو یہ امر ناگوار نہ گذرا ہو وہ جانتا تھا کہ اکبر ہاتھی کا عاشق ہے۔ ۵۰ ہاتھی بیٹے کے ہاتھ روانۂ دربار کئے۔ بزم نوروزی میں اُس نے اور بہت سے نفائس اور اسباب و اجناس پیشکش گذرانے۔ ساتھ ہی تسخیر دکن کے رستے دکھائے۔ خانخاناں تو احمد آباد میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ تمام امرا اور سرداروں کے نام فرمان جاری ہوئے۔ چند امرا کو ادھر روانہ کیا۔ اور خان اعظم کو فرزندی کا خطاب اور سپہ سالار قرار دے کر حکم دیا کہ برار لیتے ہوئے احمد نگر کو مار لو۔ انہوں نے ہنڈیا میں جا کر مقام کیا۔ اور فوج بھیج کر سانول گڈھ پر قبضہ کیا۔ ناہر راؤ اطاعت میں حاضر ہوا۔ اور راجہ بھی کمر بستہ خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اور ملک گیری کا ہنگامہ گرم ہوا۔ بادشاہ نے ملک مالوہ کے عمدہ عمدہ مقام پیارے کوکہ کی جاگیر کر دیئے۔ جب امرا کو اُن کی ہمراہی کے فرمان پہنچے تو سب فراہم ہوئے۔ تقدیر کے اتفاق سے نااتفاقی کی آندھی اُٹھی اور اندھیرا پھیلنا شروع ہوا۔ سپہ سالار پر بدگمانی غالب آئی اور ایسا گھبرایا کہ انتظام کا رشتہ تباہ ہو گیا۔ ماہم بیگم کی نشانی شہاب الدین احمد خاں موجود تھے۔ اُن کی صورت دیکھ کر باپ کا خون آنکھ میں اُتر آیا۔ خان اعظم اکثر صحبتوں میں اُس بڈھے کہن سال کو ذلیل کرنے لگے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی کو بادشاہ نے اصلاح و تدبیر کے لئے ساتھ کر دیا تھا۔ کہ یہ ادھر کے ملک اور ملک داروں سے واقف تھے۔ اور اُن کی تدبیروں کو وہاں کے لوگوں میں بڑا اثر تھا۔ یہ نفاق کے حرفوں کو مٹاتے تھے۔ کینہ وری کی آگ کو دباتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو یہ موقع آپس کی عداوت کا نہیں ہے۔ مہم خراب ہو جائے گی۔ ہاپ سب کا اکبر بادشاہ ہے اُس کی بات میں فرق آئے گا۔ ملک ملک میں رسوائی ہو گی۔ خان اعظم اُن سے بھی خفا ہو گئے۔ باوجودیکہ شاہ فتح اللہ استاد بھی تھے۔ مگر رقیب کا خیر خواہ سمجھا کر بزرگی کو طاق پر رکھا۔ خود خان اعظم اور اُن کے مصاحب

میر مجلس تمسخر اور تضحیک سے شاہ موصوف کو آزردہ کرنے لگے۔ شاہ تدبیر کے ارسطو اور عقل کے افلاطون تھے۔ لطائف الحیل سے ان باتوں کو ٹالتے اور وقت گزارتے تھے۔ اور شہاب الدین احمد خاں بڈھے سردار کی تو اس قدر خواری ہوئی کہ وہ خفا ہو کر فوج سمیت رائسین و اجین اپنے علاقے کو اٹھ گیا۔ انہوں نے بجائے دلداری اور دلجوئی کے اس پہ جرم قائم کیا۔ کہ میں ایک تو بادشاہ کا بھائی دوسرے سپہ سالار میری اجازت بغیر جانا چہ معنی دارد۔ فوج لیکر اُس کے پیچھے دوڑے۔ تولک خاں قوچین کہ شجاعت اور ہمت میں نظیر نہ رکھتا تھا اور دست راست کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اُسے بھی کچھ تہمت لگائی اور غافل قید کر دیا۔ دشمن دل میں ڈر رہا تھا کہ خدا جانے بادشاہی لشکر کب اور کن کن پہلوؤں سے حملہ کر بیٹھے جب اُس نے دیکھا کہ دیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر خبریں پہنچیں کہ امرا اپنے ہی گھر میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ تو وہ شیر ہو گیا۔ چند امرا کے ساتھ ۲۰ ہزار فوج کی جس میں محمد تقی کو سپہ سالار کیا۔ وہ مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ مرزا محمد تقی خود راجہ علی خاں کے پاس گئے۔ بعض دکنی سردار جو ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے وہ بھی بدہوا ہو گئے۔ قریب تھا کہ سلطنت کی نوبت رسوائی تک پہنچے۔ میر فتح اللہ پھر بیچ میں آکر آپس کی مصالحت اور غنیم کی مصالحت میں آکر شامل ہو گئے۔ یہی غنیمت ہوا کہ پردہ رہ گیا۔

راجہ علی خاں حاکم خاندیس دکن کے حصوں کا سردار اور مالک شمشیر تھا۔ وہ خان اعظم کی رفاقت کو مستعد ہو گیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر اُس نے بھی موقع پایا۔ برار اور احمد نگر کے امرا اور اُن کی فوجوں کو ساتھ لے کر چلا۔ مرزا عزیز نے یہ سن کر ادھر سے شاہ فتح اللہ کو بھیجا کہ فہمائش کریں۔ وہ دکن کے جنگلوں کا شیر تھا۔ اب کس کی سنتا تھا۔ سیدھا آیا۔ شاہ فتح اللہ وہاں سے ناکام پھرے۔ اور آزردہ اور بیزار ہو کر خان خاناں کے پاس گجرات چلے گئے۔ راجہ علی خاں کی آمد آمد دیکھ کر خان اعظم گھبرا گئے۔ امرا کو مشورہ کے لئے جمع کیا۔ جو آدمی دوست و دشمن کو نہ پہچانے اور موقع کو نہ سمجھے۔ اُن کے لئے مشورہ کیا؟ اور صلاح کون دے؟ کئی دن مقام ہنڈیا میں آمنے سامنے پڑے رہے۔ مقابلے کی طاقت نہ پائی۔ رفیقوں پہ اعتبار نہ ہوا۔ ایک شب چھپ چھپاتے کسی گمنام رستہ سے نکل ملک برار کا رخ کیا۔ ایلچ پور اُس کا پایہ تخت تھا۔ اُس کا اور جس شہر کو پایا لوٹ کھسوٹ کر ستیاناس کر دیا۔ اور دولت بے قیاس سمیٹی۔ ہتھیا راؤ ادھر کا راجہ ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ کذب رستوں میں رہنمائی کرتا آتا تھا۔ راہ میں اُس پہ خیال ہوا کہ یہ غنیم سے ملا ہوا ہے۔ وہ بدگمانی کی تلوار سے غصے کی درگاہ میں قربانی ہوا۔

ایلچ پور میں پہنچ کر بعض امرا کی صلاح ہوئی کہ اسی طرح باگیں اٹھائے چلے چلو۔ احمد نگر تک دم نہ لو۔ کہ دار الملک دکن کا ہے۔ بعضوں نے کہا کہ یہیں ڈیرے ڈال دو۔ اور جو ملک لیا ہے۔ اس کا انتظام کرو۔ انہیں کسی کی بات پہ بھروسہ نہ تھا۔ یہاں بھی نہ ٹھہرے۔ اور نہ دربار کا رخ کیا۔ غنیم سوچتا رہ گیا کہ دانشمند سپہ سالار سپہ

لئے ہوئے ملک کو چھوڑ کر چلا گیا۔ خدا جانے اس میں کیا پیچ کھیلا ہے۔ یہاں اندر کچھ بھی نہ تھا۔ وہ جریدہ اُن کے پیچھے دوڑا ✦

اس رستے میں عجب حالت گذری۔ قدم اُٹھائے چلے جاتے تھے۔ بھدّے ہاتھی اور بھاری بھاری بوجھ رہے جاتے تھے۔ اُنہیں کوچے کاٹ کاٹ کر ڈالتے جاتے تھے۔ کہ ہاتھی دشمن کے ہاتھ آئیں۔ تو اُن کے کام کے نہ ہوں۔ دشمن کو راہ میں ہنڈیا شہر ملا کہ بادشاہی علاقہ تھا۔ ایلچ پور کے بدلے میں اُسے لوٹ مار کر ٹھیکرا کر دیا۔ غنیم کی چنداول (لشکر کے پچھلے حصّہ) سے لڑائی ہوتی چلی آتی تھی رستے میں آرام لینے کی مہلت نہ ملی۔ ایک موقع پر تھم کر لڑائی ہوئی۔ اُس میں بھی جنگ ہنسائی ہوئی۔ غرض ہزار جان کندن سے ندربار کی مد میں لشکر کو چھوڑا اور آپ احمد آباد کی طرف چلے۔ یہ اس خیال خام میں گئے تھے۔ کہ خانخاناں میرا بہنوئی ہے۔ اُس سے مدد لاؤں گا اور غنیم کو مار کر تباہ کر دوں گا۔ خانخاناں بھی دربار اکبری کی ایک اعلےٰ رقم تھے۔ وہ فوراً محمود آباد کی منزل میں نظام الدین احمد کے ڈیروں میں آ کر ملے۔ کہ بڑودہ کو جاتے تھے۔ اُنکی گرمجوشی اور تپاک اور اختلاط کا کیا بیان ہو سکے۔ دن کو مشورے رہے اور یہ ٹھہری کہ اس وقت احمد آباد چلے چلو۔ بہن بھی وہیں ہیں۔ اُن سے ملو پھر مل کر دکن پر چلو۔ چنانچہ دونو اِدھر گئے۔ نظام الدین احمد امرا اور افواج ہمراہی کو لئے بڑودہ کو روانہ ہوئے۔ بڑودہ میں پھر دونو خان آئے۔ خان اعظم تو پھر آگے بڑھ گئے۔ کہ جب تک خان خاناں لشکر لے کر احمد آباد سے آئیں میں لشکر ندربار کو تیار کرتا ہوں۔ خان خاناں پھر احمد آباد گئے۔ اور نظام الدین احمد کو لکھا کہ جب تک میں نہ آؤں۔ بڑودہ سے نہ بڑھنا چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں فوج آراستہ کو لیکر پہنچے اور بھڑوچ کو چلے۔ وہاں پہنچے تھے جو خان اعظم کے خط آئے۔ کہ اب تو برسات آ گئی۔ اس سال لڑائی موقوف رکھنی چاہیئے۔ سال آئندہ میں سب مل کر چلینگے۔ راجہ علی خاں اور دکنی سوار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یہ سب کو گالیاں دیتے ندربار سے دربار میں آن حاضر ہوئے ✦

۹۹۵ھ میں صلاح ہوئی۔ کہ دودھ میں مٹھاس ملاؤ تو اور بھی مزہ دیگا۔ خان اعظم کی بیٹی سے شاہزادہ مراد کی شادی ہو جائے۔ شاہزادہ اُس وقت ۱۸ برس کا تھا۔ مریم مکانی یعنی اکبر کی والدہ کے گھر میں یہ شادی رچی۔ خان اعظم کی عظمت بڑھاتی تھی۔ بادشاہ خود برات لیکر گئے اور دھوم دھام سے دلہن بیاہ لائے۔ ۹۹۶ھ میں لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اور مرزا رستم نام رکھا ✦

۹۹۷ھ میں احمد آباد گجرات خانخاناں سے لیکر پھر انہیں دیا۔ یہ کہتے تھے کہ مالوہ کا ملک اچھا ہے میں تو وہ لوں گا۔ وہ اکبر بادشاہ تھا۔ خدا جانے اُس نے اپنی تجویز میں اور کیا کیا مصلحتیں مدِ نظر رکھی تھیں۔ مشورہ کے لئے جلسہ بٹھایا۔ الحمد للہ صلاح بھی ایسی ٹھہر گئی جس میں ان کی مند پوری ہوئی۔ بیسازوسامان گئے کام ہوا

۹۹۹ھ میں خان اعظم نے ایسا میدان مارا کہ کسی فتحیاب سے پیچھے نہ رہا۔ جام سرسال اُس ولایت کے اعلےٰ حکمرانوں میں سے تھا۔ اور ہمیشہ فسادوں کی تاک میں رہتا تھا۔ اُس نے مظفر گجراتی کو پیرمرد بنا کر نکالا سورٹھ کا حاکم دولت خاں اور راجہ کنگار کچھ کا حاکم بھی شامل ہُوا۔ ۲۰ ہزار کا بلوہ باندھ کر لڑنے کو آئے۔ خان اعظم نے اِدھر اُدھر خطوط لکھے کوئی مدد کو نہ آیا۔ اِس ہمت والے نے دل نہ ہارا اور جس طرح ہوسکا جمعیت کی صورت پیدا کر کے نکلا۔ غنیم نے بڑے حوصلے سے فوجوں کو بڑھایا۔ خان اعظم نے چند سرداروں کو فوج دیکر آگے روانہ کر دیا۔ ان سے کوتہ اندیشی یہ ہوئی۔ کہ غنیم کے ساتھ صلح کی گفتگوئیں کیں۔ اُن کے دماغ اور بھی بلند ہو گئے۔ اور جنگ کے نقارے بجاتے آگے بڑھے۔ جلدی سپہ سالار کو غصہ آیا۔ باوجودیکہ ۱۰ ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی اور غنیم کے ساتھ ۳۰ ہزار فوج تھی۔ یہ سامنے ڈٹ گیا۔ اور لشکر کو سات فوجوں میں تقسیم کیا۔ قلب میں اپنا فرزند خورم چاروں طرف امرائے شاہی اپنی اپنی فوجوں سے قلعہ باندھ کر کھڑے ہوئے۔ اور اُنہیں اور سپاہ کی مدد سے قوی پشت کیا۔ انور اپنے بیٹے کو چھ سو سواروں سے الگ کیا۔ اور خود بہت سے سورما سپاہیوں کی جمعیت میں چار سو سوار لیکر کھڑے ہوئے کہ جدھر وقت پڑے فوراً پہنچیں۔ اُدھر سے مظفر نے میدان میں فوجیں قائم کیں۔ کہ یکایک مینہ برسنا شروع ہُوا۔ اور بارش کا تار لگ گیا۔ جس انداز سے لڑائی شروع ہوئی تھی۔ وہ ملتوی ہو گیا۔ اور طرفین سے ترکانہ حملے ہوتے رہے غنیم بلندی پہ تھا۔ یہ نیچے تھے۔ بڑی دقتیں پیش آئیں۔ مشکل یہ ہوئی کہ ادھر رسد بند ہو گئی۔ دو دفعہ شبخون بھی لے گئے۔ مگر ناکام پھرے:

جب تکلیفیں حد سے گذر گئیں تو خانِ اعظم نے اُس میدان میں فوج کو لڑانا مناسب نہ سمجھا۔ چار کوس کوچ کر کے جام کے علاقے میں گھس گیا۔ یہاں مینہ نے ذرا امان دی جنگل نے جانوروں کے لئے گھاس دی۔ لوٹ مار نے غلّہ کی رسد پہنچائی۔ مظفر کو ناچار اُدھر کو دوڑنا پڑا۔ اور دریا کو بیچ میں ڈال کر ڈیرے ڈال دیئے۔ بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ طُولِ مدت کے سبب سے غنیم کی سپاہ کو بال بچوں کے فکر ہوئے۔ لشکر کو چھوڑ ادھر بھاگنے لگے۔ مگر مظفر کہاں سُنتا تھا۔ جس حال میں تھا قائم رہا۔ فوجوں میں روز چھینا جھپٹی ہو جاتی تھی۔ مگر ایک دن میدان ہوا اور میدان بھی وہ ہوا کہ فیصلہ ہی ہو گیا:

دونو سپہدار اپنی اپنی سپاہ کو لیکر نکلے۔ اور قلعے باندھ کر سامنے ہوئے اوّل خان اعظم کے بائیں کی فوج پیش قدمی کر کے بڑھی۔ اور ایسی بڑھی۔ کہ ہراول سے بھی آگے نکل گئی۔ اور پل کے پل میں غنیم کی فوج سے چھُری کٹاری ہو گئے۔ سرداروں نے خود بڑھ کر تلواریں ماریں۔ اور ایسے لڑے کہ مر گئے۔ افسوس یہ کہ جو فوجیں خان اعظم نے مدد کو رکھی تھیں وہ پہلو بچا کر پیچھے آگئیں۔ اور دشمن اُن کا پیچھا کرتا ڈیروں تک

دولت خاں فرمانروائے ملک سورٹھ امین خاں غوری کا بیٹا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میں سلاطین غور کی اولاد ہوں۔

چلا آیا۔ اُسے وہاں پہنچ کر چاہیئے تھا۔ کہ چھاپا مارتا۔ اُس نے کٹہریاں باندھنی شروع کر دیں۔ البتہ ہراول ہراول سے خوب ٹکرایا۔ اور باقی فوجیں بھی بڑھ بڑھ کر دست و گریبان ہو گئیں۔ لشکر غنیم کے راجپوت گھوڑوں سے کود پڑے۔ اور کمر پٹکے آپس میں باندھ باندھ کر سدِ سکندر کی طرح ڈٹ گئے۔ کام تیر تفنگ سے گزر گیا۔ اور دست بدست معاملہ آ پڑا۔ قریب تھا کہ لشکر شاہی کا حال بدحال ہو جائے۔ اتنے میں آگے کی فوج نے بڑھکر غنیم کے بائیں کو اُلٹ دیا۔ خان اعظم خضر وقت کھڑا تھا جھٹ لشکر کو للکارا۔ اور گھوڑے اُٹھائے اُسے خدائی اقبال کہنا چاہیئے۔ کہ ادھر اُس نے باگ لی۔ اُدھر دشمن کے قدم اُکھڑے۔ مظفر اور جام بے ہوش بدحواس بھاگے۔ اُس کے کئی سردار دو ہزار بہادروں کے ساتھ میدان میں کھیت رہے۔ تھوڑی دیر میں سامنا صاف ہو گیا۔ نقد و جنس۔ توپخانہ۔ ہاتھی۔ سامان امارت اور اسباب جاہ و حشمت جس قدر فوج شاہی کے ہاتھ آیا۔ اُس کا حساب نہیں۔ اکبری لشکر کے سو بہادروں نے جانیں عزت پر قربان کیں۔ اور پانسو نے زخموں سے چہرہ گلرنگ کیا۔ شیخ فیضی نے فتوحاتِ عزیزی تاریخ کہی ؎

خان اعظم سخاوت کے شہزادہ تھے۔ اور کیوں نہ ہوں؟ بادشاہ کے بھائی تھے۔ امرائے لشکر کو خلعت ہاتھی، گھوڑے۔ نقد و جنس بے حساب دیئے۔ انشا پرداز بھی اچھے تھے۔ بادشاہ کو اپنی لڑائی کا نامۂ خوب بنا بنا کر لکھا۔ وہاں بھی اندر محلوں میں باہر درباروں میں بڑی مبارکبادیں ہوئیں۔ خان اعظم کے سردار غنیموں کے پیچھے دوڑے۔ خورم فرزند فوج لے کر مظفر کا پتا لیتا چلا۔ رستے میں بعض قلعوں کو فتح کرنا چاہا۔ مگر امرائے ہمراہی کی سستی سے کام کی درستی نہ ہوئی۔ خان اعظم نے بھی اس وقت فوج کا بڑھانا اور ملک کا پھیلانا مصلحت نہ سمجھا۔ ہاتھ پاؤں ساتھ نہ دیں تو دل کیا کرے۔ امرا اور فوجوں نے اپنے اپنے علاقوں میں آرام لیا ؎

۱۰۰۱ھ میں خبر لگی کہ دولت خاں جو جام کی لڑائی میں تیر کھا کر بھاگا تھا۔ تیر اجل کا نشانہ ہوا۔ خان اعظم لشکر آراستہ کر کے نکلا۔ اور جونا گڈھ کی تسخیر پہ کمر باندھی۔ کہ ملک سورٹھ کا حاکم نشین شہر تھا۔ پہلا شگون یہ ہوا کہ جام کے بیٹے اُس ملک کے چند سرداروں کے ساتھ آکر لشکر میں شامل ہو گئے۔ ساتھ ہی کو کہ بنگلور سومنات اور ۱۶ بندر بے جنگ قبضہ میں آ گئے۔ قلعہ جوناگڈھ کی مضبوطی فولاد کیساتھ شرط باندھے کھڑی تھی۔ خان اعظم نے توکل بخدا محاصرہ ڈالا معلوم ہو گیا تھا کہ کاٹھی لوگ قلعے میں رسد پہنچاتے ہیں۔ ایک سردار کو بھیج کر ان کا بندوبست کیا۔ اقبال اکبری کا زور دیکھو۔ کہ اُسی دن قلعے کے میگزین میں آگ لگ گئی۔ غنیم نے اگرچہ نقصان سخت اُٹھایا۔ مگر حوصلہ دلانہ ٹوٹا۔ قلعے والے اور بھی گرم ہوئے۔ سو توپ پر فتیلہ پڑتا تھا۔ اور ہر ہر ڈیڑھ من کا گولہ گرتا تھا۔ پرتگالی توپچی نے گول اندازی میں ایسی جان لڑائی کہ

گولی کی طرح حوصلہ سے نکل پڑا۔ اور خندق میں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ خان اعظم نے بھی سامنے ایک پہاڑی ڈھونڈھ کر نکالی۔ اس پر توپیں چڑھائیں۔ اور قلعے پر گولے اتارنے شروع کر دئے۔ قلعے میں بھونچال اور قلعہ والوں میں تلاطم مچ گیا۔ خلاصہ یہ کہ قلعہ والے تنگ ہو گئے۔ آخر میاں خاں اور تاج خاں پسران دولت خاں نے کنجیاں حوالہ کر دیں۔ اور پچاس سردار صاحب نشان و لشکر آکر حاضر ہوئے۔ خان اعظم نے ان کی بڑی دلداری کی۔ بھاری خلعت۔ بلند منصب اور بڑی بڑی جاگیریں دیکر خوش کیا۔ خود بھی بہت خوشی کے جشن کئے۔ ہاں جو بادشاہ کے بھائی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور خوش کیوں نہ ہوں اب تو سومنات قبضے میں آیا۔ محمود غزنوی ہو گئے۔ اور حق بھی یہ ہے۔ کہ بڑا کام کیا۔ اکبری سلطنت کا پاٹ سمندر کے گھاٹ تک پہنچا دیا۔ یہ کچھ تھوڑی خوشی کا مقام نہیں۔ اکبر کو بھی اس بات کی بڑی آرزو تھی۔ کیونکہ اُسے دریائی طاقت کے بڑھانے کا دل سے خیال تھا ✦

اب خان اعظم سمجھا کہ جب تک مظفر ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ فساد فرو نہ ہوگا۔ اس نے کئی سردار نامی فوجیں دیکر روانہ کئے۔ اور انور اپنے بیٹے کو ساتھ کیا۔ مظفر نے ملک ہار کے راجہ کے پاس پناہ لی تھی۔ کہ **دوارکا** کا منہ وہیں ہے۔ راجہ بھی اس کی مدد پر کمر بستہ ہوا۔ یہ فوجیں اس طرح سر توڑ پہنچیں۔ کہ دوارکا بے جنگ ہاتھ آگیا راجہ نے مظفر کو اہل و عیال سمیت ایک جزیرے میں بھیج دیا تھا۔ جب اُنھوں نے راجہ کو دبایا۔ تو وہ بھی اُس کے پیچھے بھاگا۔ انھوں نے گھوڑا اٹھا کر رستے میں جالیا۔ وہ پلٹ کر اڑا۔ اور خوب جان توڑ کر لڑا۔ دریا کے کنارے تھے۔ زمین کہیں بلند۔ کہیں گہری۔ جگہ ناہموار۔ سوار کا گذارہ نہ تھا۔ اکبری بہادروں نے گھوڑے چھوڑ دئے۔ اور خوب تلواریں ماریں۔ راجہ اور اُس کی فوج نے بھی کمی نہیں کی۔ شام تک تلوار کی آنچ سے میدان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ مگر قضا سے کون لڑے۔ گلے پر چھوٹا سا تیر کھا کر راجہ کی گلو خلاصی ہوئی۔ مگر مظفر گڑھوں میں گرتا پڑتا نکل کر کچھ میں پہنچا۔ وہاں کے راجہ نے چھپا رکھا۔ اور مشہور ہوا کہ دریا میں ڈوب گیا ✦

خان اعظم کو جب خبر پہنچی۔ تو عبداللہ اپنے بیٹے کو اور فوج دیکر کچھ کو روانہ کیا۔ جام یہ خبر سُن کر گھبرایا بال بچوں کو لیکر دوڑا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ تہمت یا بدگمانی میرے خانۂ دولت کو برباد کر دے۔ عبداللہ سے رستے ہی میں آکر ملا۔ اور بنیاد اخلاص کو مستحکم کیا۔ کچھ کے راجہ نے بھی وکیل بھیجے۔ بہت سا عجز و انکسار کیا اور کہا کہ بیٹے کو حاضر دربار اور مظفر کی تلاش کرتا ہوں۔ یہ روئداد خان اعظم کے پاس جوناگڈھ میں پہنچی۔ اُس نے لکھا۔ کہ اگر صدق دل سے دولت خواہی بادشاہی اختیار کی ہے۔ تو مظفر کو ہمارے حوالہ کر دو۔ اُس نے پھر لمبی لمبی تقریریں ایچ پیچ کے جملوں میں ملفوف کرکے بھیجیں۔ خان اعظم نے کہا۔ کہ فقروں سے

کام نہیں چلتا۔ غنیم کو میرے حوالے کرو۔ نہیں تو برباد کرونگا۔ اور ملک تمہارا جام کے دامن میں ڈال دونگا۔ راجہ کا مطلب اس طول میں فقط وقت گذارنا تھا۔ کہ شاید کوئی اور نکاس کا پہلو نکل آئے۔ جب سب رستے بند پائے۔ تو کہا موربی کا ضلع قدیم سے میرے علاقے میں تھا۔ وہ مجھے دیدو۔ اور جگہ بتا دیتا ہوں۔ تم جا کر گرفتار کر لو۔ خان اعظم نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ چند سوار ادھر سے روانہ ہوئے۔ جام کے آدمی ساتھ گئے۔ مظفر بے خبر بیٹھا تھا۔ اُس سے کہا۔ کہ فلاں سردار تمہاری ملاقات کو آیا ہے۔ وہ بے تکلف نکل آیا۔ خان اعظم کے سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر کر پکڑ لیا۔ خوشی کا جوش کہتا تھا۔ کہ ابھی لے اڑیں۔ اور مصلحت کہتی تھی۔ کہ اگر رستے میں اُس کے جان نثار آکر جانوں پر کھیل جائیں تو کیا ہو۔ بہرحال اندھیرے کے پردے کا انتظار کیا۔ اور راتوں رات خان اعظم کی طرف لے کر دوڑے۔ مظفر صبح ہوتے نماز کے بہانے اُترا۔ اور طہارت وضو کے لئے ایک درخت کے پیچھے گیا۔ جب دیر تک نہ آیا۔ تو انہوں نے آواز دی۔ وہاں سے جواب بھی نہ آیا۔ آخر جا کر دیکھا۔ بکرا سا ذبح کیا پڑا تھا۔ اُسے بھی اسی روز سیاہ کا خیال تھا۔ اس لئے حجامت کے لوازمات پاس رکھا کرتا تھا۔ کہ اُس میں استرا بھی لگا رہے۔ آج کام آیا۔ سر کٹ کر خان اعظم کے پاس آیا۔ اُس نے روانۂ دربار کر دیا۔ کہ فساد کی جڑ کٹ گئی ✦

سنہ ۱۰۰۱ھ میں خان اعظم سے وہ کام ہوا۔ کہ تمام اہل تاریخ اس کی تعریفوں کے وظیفے پڑھتے ہیں۔ اور ملا صاحب نے تو اس کی دینداری پر اپنی انشا پردازی کے سہرے چڑھائے ہیں۔ مگر تھوڑی سی تمہید بغیر اس معاملے کا مزا نہ آئیگا۔ یہ تو تم نے بار بار سُن لیا۔ کہ اکبر نے انہیں فرزندی کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور اپنی خدمت میں رکھکر تربیت کیا تھا۔ جیسا عزیز اس کا نام تھا۔ ویسا ہی اُسے عزیز رکھتے تھے اور تمام ارکان دولت میں عزت دیتے تھے۔ اپنی خواصی میں بٹھاتے تھے۔ اور خاص خاص موقع پر اُسے ضرور یاد کرتے تھے۔ لیکن اس کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ کہ ہمیشہ جاہل اور کوتہ اندیش۔ بلکہ ضدی اور لاڈلے بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھتا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ اکبر اُس کی گستاخیوں کا بھی کچھ خیال نہ کرتا تھا۔ بلکہ خود اُسے مناتا تھا۔ اور عنایت و انعام سے خوش کرتا تھا۔ ایک پیچ یہ بھی تھا۔ کہ خان اعظم شیخ ابوالفضل کو اکبر کی عقل کی کنجی سمجھتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا۔ کہ شیخ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو احکام اس کی خلاف مرضی دربار سے پہنچتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ شیخ کی فطرت ہے۔ اُس کا بیباکانہ مزاج اور سپاہیانہ طبیعت اپنی آزردگی کو چھپا نہ سکتے تھے صاف صاف ظاہر بھی کر دیتے تھے ✦

خان اعظم سپاہی زادہ تھا۔ اور خود سپاہی تھا۔ ایسے لوگوں کو مذہب کی پاسداری ہوتی ہے۔ تو تحت تعصب کے ساتھ ہوتی ہے۔ دربار میں تحقیقات مذاہب اور اصلاح اسلام کی تدبیریں جاری تھیں۔ اس اصلاح میں ڈاڑھیوں پر ایسی وبا آئی تھی۔ کہ اکثر امرا بلکہ علمانے ڈاڑھیاں منڈوا ڈالی تھیں۔ ڈاڑھی کی جڑ کو ڈھونڈھ کر پتال سے نکالا تھا۔ ملا صاحب نے تاریخ کہی تھی۔ جس کا مصرع مقصود ہے ع

| بگفتار ریشہا برباد دادہ مفسدے چندنے |

انہی دنوں میں وہ بنگالہ سے فتح پور میں آیا ہوا تھا۔ یہاں ہر وقت یہی چرچے رہتے تھے۔ اُس کے سامنے کسی مسئلے میں بحث ہونے لگی۔ ضدی سپاہی کو اس وقت مذہب کی ضد آگئی۔ اُس نے بھی گفتگو شروع کی۔ وہاں علما و فضلا کے خاکے اُڑ جاتے تھے۔ یہ تو کیا حقیقت تھے۔ انہوں نے بہت زورِ طبیعت اور مبلغ استعداد دکھایا ہوگا۔ تو مولانا روم کی مثنوی یا حدیقہ حکیم سنائیؒ کے شعر سند میں پڑھے ہوں گے۔ وہاں یہ سپر کیا کام آتی تھی۔ غرض سپاہی بگڑا بخار تو پہلے ہی سے دل میں بھرے تھے۔ نوبت یہ ہوئی کہ بادشاہ کے سامنے ہی شیخ کو اور بیربر کو آگے دھر لیا۔ اگرچہ تعزیہ عام بے دین اور بد اعتقادوں کے باب میں کرتے تھے۔ مگر بات کا رخ انہی دونوں کی طرف تھا۔ خیر وہ جلسہ انہی تلخ باتوں میں طے ہو گیا۔

اس کے علاوہ بادشاہ نے آئین باندھا تھا۔ کہ امرائے سرحدی کو ایک مدت مقررہ کے بعد موجودت دینے کو حاضر ہونا چاہیئے۔ خان اعظم کے نام فرمان طلب گیا۔ قدیمی لاڈلے تھے متواتر فرمان گئے۔ نہ آئے اکبر کے احکام۔ ابوالفضل کی انشا پردازی۔ رنگا رنگ کے مضامین دست بستہ حاضر تھے۔ خدا جانے کیا کیا لکھا۔ مگر انشا پردازی کا ایک جادو نہ چلا۔ ان کی ڈاڑھی بہت لمبی تھی۔ اور اس کے باب میں تقریریں اور تحریریں ہو چکی تھیں۔ مآثر الامرا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک دفعہ یہ بھی لکھا گیا۔ ظاہراً پشم ریش شما گرانی میکند کہ ایں ہمہ تعلل در آمدن دارند۔ جام کی لڑائی پر قرار پایا تھا۔ کہ منت مانو یہ مہم فتح ہو جائیگی تو ڈاڑھی درگاہ اکبری میں چڑھاؤں گا۔ جب مہم فتح ہوئی۔ تو ادھر سے تقاضے شروع ہوئے۔ اس نے جواب میں ڈاڑھی سے بھی لمبی عرضی لکھی اور سخت لکھی۔ یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ مگر وہ حاضر دربار نہ ہوا تھا۔ سیکڑوں مقدمات مالی و ملکی تھے۔ دربار سے اکثر احکام اور نیز کچھ اُس کے خلاف مقصد کچھ خلاف طبع گئے۔ خدا جانے وہ شیخ کی فطرت تھی۔ یا خان کی بدگمانی تھی۔ اس کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سیدھا سپاہی صاف صاف آزردگی اور نہایت آشفتگی ظاہر کرتا تھا۔ ان میں کبھی کبھی یہ بھی لکھتا تھا کہ میں نے دنیا چھوڑ دی۔ حج کو چلا جاؤنگا غرض اب اکبر کو خبر نویس کی تحریر سے اور بعض امرا کے عرائض سے بھی معلوم ہوا کہ اُس نے بیٹے سے

مصمم ارادہ کر لیا۔ بادشاہ نے فرمان لکھے۔ اور بڑھیا ماں نے برابر خطوط لکھے۔ کہ خبردار خبردار ایسا ارادہ نہ کرنا مگر وہ کب سننے والا تھا۔ جو کرنا تھا۔ وہی کر گزرا ؛

ملا صاحب نے مرزا کوکہ کے حج کو جانے کا حال لکھ کر اکبر کی بدمذہبی کے اشاروں سے عجب بدنما عکس دلوں پہ ڈالا ہے۔ اُسے پڑھ کر مجھے بھی خیال تھا۔ کہ وہ خوش اعتقاد امیر فقط جوش دینداری سے ہندوستان چھوڑ کر نکل گیا۔ پھر مدت دراز میں جب بہت سی کتابیں نظر سے گذریں تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہ تھا جہاں اَور بچوں کی سی ضدیں تھیں۔ وہاں یہ بھی ایک بات تھی مثلاً یہ کہ فرمانوں کی پشت پر جہاں میری مہر ہوتی تھی۔ وہاں قلیج خاں کی مہر کیوں ہوتی ہے اور جو کام میں کرتا تھا وہ قلیج خاں اور ٹوڈرمل کیوں کرتے ہیں چنانچہ ابوالفضل کے دفتر دوم میں ایک بڑا طولانی مراسلہ ہے۔ کہ شیخ موصوف نے خان اعظم کے نام لکھا ہے۔ اول ڈیڑھ بلکہ دو صفحے میں بہت سی حکمت اخلاق اور فلسفہ واشراق سے تمہیدیں پھیلائی ہیں بعد اسکے جو کچھ لکھتے ہیں۔ اس کا ترجمہ کرتا ہوں اور جس قدر کہ ممکن ہے۔ مطابقت الفاظ کے ساتھ لکھتا ہوں مراسلہ مذکور اگرچہ ظاہر میں شیخ کی طرف سے ہے۔ مگر حقیقت میں بادشاہ کے املاء سے لکھا ہے اور اسکے علاوہ بھی کئی خط ہیں۔ جن سے دلداری اور دلجوئی کے دود اور شربت ٹپکتے ہیں۔ غرض شیخ مراسلہ مذکور میں لکھتے ہیں جو کچھ میں سمجھتا ہوں۔ اسکے لکھنے سے پہلے سرگذشت واقعی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرۃ العین شمس الدین احمد نے نامۂ والا شکوہ (تمہارے لڑکے نے تمہارا خط) عرض اقدس میں پہنچایا۔ چونکہ حضرت مقام وفور عنایت و عطوفت میں تھے۔ یکبارگی حیران رہ گئے۔ اگرچہ پہلے ہمیشہ خلوتوں میں تمہارے اخلاص قدیمی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی کوتہ اندیش حرف نامناسب تم سے منسوب کرتا تھا۔ تو اس قدر مہربانی ظاہر فرماتے تھے۔ کہ وہ تنگ حوصلہ شرمندہ ہو جاتا تھا۔ ہمیشہ تمہارے خشکی دماغ[1] کے دنوں میں خلوت اور دربار میں نہایت توجہ ظاہر ہوتی تھی خصوصاً ان دنوں میں کہ اخلاص دولت کی (میری) رفاقت اور توجہ شہنشاہی کی برکت سے تم رحمت الٰہی کے منظور نظر ہو کر خدمات لائقہ سے کامیاب ہوئے۔ کیا جام کی فتح۔ کیا جوناگڈھ کی۔ کیا تنو مظفر وغیرہ کا گرفتار کرنا۔ کیا کہوں۔ کہ حضرت کیسے تمہارے مشتاق ہوئے ہیں۔ دن رات تمہاری یاد میں گزرتی ہے۔ ہمیشہ اس بات کے طلبگار رہے ہیں۔ کہ کب وہ دن ہو گا۔ کہ اپنے سامنے نہیں مراحم خسروانہ سے مالامال کریں ؛

جو کچھ تم نے والدۂ مقدسہ اور فرزندان عزیز کو لکھا تھا۔ اس سے ایسا شوق آستان بوسی ظاہر ہوتا تھا۔

---

[1] خشکی دماغ کے لفظ کو دیکھو۔ اور مورخوں نے بھی قید سابقہ کے ذکر میں یہی لفظ استعمال کیا ہے معلوم ہوتا ہے اس وقت جو دربار میں آپنے یاوہ گوئی کی تھی تو نظربند ہوئے تھے اس حرکت ناشائستہ کا نام خشکی دماغ رکھا گیا تھا اور قید کا حکم اس پردے میں تھا کہ علاج معالجہ ہوتا ہے ؛

کہ اس نوروز عالم افروز میں اپنے تئیں پہنچاؤ گے۔ نوروز نہیں۔ تو شرفِ آفتاب میں تو خواہ مخواہ پہنچو گے
دفعۃً ایک شخص نے عرض کی۔ کہ تم سرانجام خدمت کو ناتمام چھوڑ کر اس خیال سے خود جزیرے کو
چلے گئے۔ کہ اسے تسخیر کرو گے۔ حضور کو تعجب ہوا۔ اس خیر خواہ جمہور سے مجھ سے، پوچھا۔ میں نے
عرض کی۔ کہ ایسی باتیں دشمن کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ وہاں کچھ دغدغہ ہوگا۔ خود ملازمت حضور میں آنے
والے ہیں۔ گئے ہونگے تو اس لئے گئے ہونگے کہ جا کر خرخشہ صاف کر دیں۔ اور خاطر جمع سے حضور میں آئیں
خلوص عقیدت میں فتور واقع ہو؟ یہ کب ہو سکتا ہے۔ حضور نے پسند فرمایا۔ اور کہنے والا شرمندہ ہو گیا۔ اب
کہ حضرت حد سے زیادہ تم پر متوجہ ہیں۔ اور اس سبب سے کہ عنایت روز افزوں حضور کی تمہارے باب میں
جلوۂ ظہور دے رہی ہے۔ کوتاہ حوصلہ ناتوان ہیں پیچ و تاب میں ہیں۔ اتفاقاً کشن داس تمہارا وکیل پہنچا
اور جو خط تم نے مجھے لکھا تھا۔ مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی حضور کے دستِ اقدس میں دیا۔ حسب الحکم قرۃ العین شمس الدین
نے مضمون عرض کیا۔ سن کر بہت تعجب ہوا۔ کمترین سے فرمایا دیکھو ہماری عنایت کس درجہ پر ہے۔ اور عزیز
اب بھی اس طرح لکھتا ہے۔ جہاں اس کی مہر ہوتی تھی۔ پہلے یہاں مظفر خاں راجہ ٹوڈرمل اور اور لوگ
مہر کرتے تھے۔ یہ گلہ تھا۔ تو اس وقت کرنا چاہئے تھا۔ اگرچہ وہاں بھی گلہ کرتے ہیں۔ تو اس قوتِ بازوئے
سلطنت کے تمہارے حق میں ہماری بے عنایتی کی دلیل نہیں ہو سکتی تھی۔ بات فقط یہ ہے۔ کہ گھر کے کام
آخر کسی سے لینے چاہئیں۔ جس کو یہ خدمتیں سپرد ہوں۔ ایک مقام پر مہر کرنی اسی خدمت کا جزو ہے۔ اعظم خاں
گھر میں ہو۔ اور اس خدمت پر متوجہ ہو۔ تو اوّل اور اولیٰ۔ وہ جس طرح امیر الامرا ہے۔ امیر معاملہ بھی ہوگا۔
یہ سب اس کے تابع ہوں گے۔ یہ بدگمانی تمہاری خاطرِ اقدس کو ذرا ناگوار ہوئی۔ خیر خواہانِ بزم مقدس نے بھی
مناسب موقع باتیں عرض کرکے بہت اچھی طرح اس کا تدارک کر دیا۔ قرۃ العین کو جو تم نے لکھا تھا۔ اور جو
واقعہ تم نے دیکھا تھا۔ اور فتوحات مذکورہ کو اس کا نتیجہ سمجھا تھا۔ اس کا ذکر کر دیا۔ جو نذر تم نے بھیجی تھی۔ وہ
خیال شہنشاہی کی اور جو کچھ تمہارے مخلصوں نے کہا تھا۔ اس کی بھی مؤید ہوئی۔

پھر لمبی تقریروں میں تقریباً دو صفحہ حکمت اخلاق کے طور پر لکھتے ہیں۔ اور مختلف طبقات انسان کی
تفصیل و تقسیم کرکے کہتے ہیں۔ قلیچ خاں کا شکوہ بیجا ہے۔ تم اور طبقہ سے وہ اور گروہ سے۔ باوجود اسکے منصب
حالت اور اعتبار میں تمہارے پاسنگ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ تم کو کہ تمہاری فرزندی کی نسبت۔ ساتھ
اس کے خاص الخاص۔ بادشاہی توجہیں تمہارے لئے تمام۔ بارہا زبان گوہر فشاں پر فرزند کا لفظ تمہارے لئے
آتا ہے۔ اس سے قطع نظر جو خدماتِ شائستہ تم سے اور تمہارے خاندان سے ہوئیں۔ زمانے کے کونسے امیر کو
یہ رتبہ ہے۔ کہ اس مجموعے میں تمہارے ساتھ برابری کر سکے۔ پھر تمہیں کب زیبا ہے۔ کہ اس کا نام اپنے

پدر بزرگوار کے برابر لاکر شکوہ کرو۔ اور مرزا اور راجہ کا نام لیکر اپنے برابر کردو۔ ہاں یہ غصے کی رنگ آمیزیاں ہیں۔ مگر غضب ہے۔ کہ تم جیسے بزرگ کے پاس غصے کو راہ ہو۔ اور اس سے ایسے دب جاؤ ✦

اگر کنارہ کشی سبب مذکور سے بجا ہے۔ تو آخر پہلے بھی یہی حال تھا۔ (کہ تم سے پہلے اور لوگ اس عہدے پر کام کرتے پس تم نے ان کی جگہ کام کرنا کیونکر گوارا کر لیا تھا) اور بات تو وہی ہے جو کہ زبان شہنشاہی پر گذری ہے۔ عزیز من مجلسوں میں کیسے کیسے آدمی کیسے آدمیوں کی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر غصے ہو کر گلہ کرو۔ تو وہاں بھی کرو۔ کہ کیسا آدمی کیسے آدمی کی جگہ بیٹھ گیا ہے۔ مہر تو ایک نام کا نقش ہے۔ کہ دوسرے نقش کی جگہ ہو گیا۔ دیکھو تو سہی۔ اس میں اور اُس میں کہاں سے کہاں تک فرق ہے[1] ✦

پھر ایک ڈیڑھ صفحہ کا طول کلام کرکے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔ چونکہ تم دولت خواہ حقیقی اس درگاہ کے ہو۔ اس لئے میں نے اتنا طول کلام کیا۔ اب دو کلموں پر اختصار کرتا ہوں۔ کہ تم کسی چیز کے پابند نہ ہو۔ آستان بوسی کا ارادہ کرو۔ اور اپنے تئیں حضور میں پہنچاؤ۔ کہ یہاں خورمی۔ خوشحالی۔ کامرانی کے سوا کچھ اَور نہ ہوگا۔ ظاہر اتو یہی ہے۔ کہ چل لئے ہو گے۔ تم بزرگ زمانہ ہو۔ اگر خاطر روشن ادھر مائل ہو۔ تو اور باتیں کہوں۔ کہ دین و دنیا میں کام آئیں۔ ورنہ خیراندیشی دائم تو قائم ہے۔ کہ دادار جہاں آفریں نے دل کو عطا کی۔ دل نے ہاتھ کے حوالہ کی۔ اس نے قلم کو دی۔ قلم نے کاغذ پر لکھ دی۔ خدا تمہیں اور تمہیں ان باتوں سے محفوظ رکھے۔ جو کہ باید و شاید نہیں ✦

اُس نے بھی جواب میں ان کی موچھیں پکڑ پکڑ کر خوب ہلائی ہیں۔ ایک پرانے مجموعہ میں سے اُسکی اصل عرضداشت کی نقل میرے ہاتھ آئی۔ تتمہ میں درج ہے ✦

ایک عرضداشت عین روانگی کے وقت لکھی ہے۔ اُس میں اور مطالب بھی مندرج ہیں۔ اس مطلب کے متعلق جو فقرے ہیں۔ ان کا ترجمہ لکھتا ہوں "بدخواہان دین و دولت نے آپ کو راہِ راست سے ہٹا کر بدعاقبتی کے رستے میں بدنام کر دیا ہے۔ اور نہیں جانتے۔ کہ کون سے بادشاہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آیا کلام اللہ جیسا قرآن آپ کے لئے نازل ہوا ہے۔ یا شق القمر جیسا معجزہ آپ سے ہوا ہے؟ چار یار باصفا جیسے اصحاب آپ کے ہیں؟ کہ آپ اپنے تئیں اس بدنامی سے متہم کرتے ہیں۔ بہ نسبت ان خیرخواہوں کے جو حقیقت میں بدخواہ ہیں۔ عزیز کوکہ فدویت رکھتا ہے۔ اور قصد بیت اللہ کرتا ہے۔ اس ارادہ سے کہ وہاں بیٹھ کر آپ کے لئے راہِ راست پر آنے کی دُعا کریگا۔ اُمیدوار ہے کہ اس گنہگار کی دُعا قاضی الحاجات کی درگاہ میں قبول ہو کر اثر بخشیگی۔ اور وہ آپ کو راہ راست پر لائیگا ✦

ان دنوں اُس کے حسن تدبیر اور آب شمشیر سے دریائے شور کے کنارے تک اکبری عملداری پہنچ گئی

[1] دیکھو صفحہ ۸۰۰ ✦

تھی اور بندر رسیدہ بندر حلقۂ حکومت میں آگئے تھے۔ جوں جوں بادشاہ لطف و محبت کے فرمان لکھتے گئے۔ اس کا وہم بڑھتا گیا۔ خدا جانے کیا سمجھا۔ کہ ہرگز آنا مناسب نہ دیکھا۔ اُس نے وہاں کے لوگوں میں یہ ظاہر کیا۔ کہ بندر دیو کو دیکھنے جاتا ہوں۔ فقط چند غمگسار مصاحبوں سے راز کھولا۔ اور کسی سے ذکر نہ کیا اول بندر بجور پر پہنچا۔ یہ مقام سمندر کے کنارے تھا۔ اس میں بڑا وسیع اور سنگین قلعہ تھا۔ اور گھر بھی اکثر سنگین ہی تھے۔ یہاں سے بنگلور آیا۔ اور وہاں کے لوگوں سے کہا۔ کہ بندر دیو کو دبانے جاتا ہوں۔ امرائے شاہی کو رخصت کر کے اُن کی جاگیروں پر بھیج دیا۔ حکام بندر سے اقرار نامے لے لئے۔ کہ آپ کی بے اجازت سوداگرانِ ملک غیر کو لنگرگاہِ دیو میں نہ آنے دیں گے۔ مطلب اس سے یہ تھا۔ کہ پرتگالی قوم پرسا کو دبائے اور دھمکائے رکھے۔ اُس کا رعب وداب ایسا پھیل رہا تھا۔ کہ وہ دب گئے۔ اور خاطر خواہ شرطوں پر اقرار نامے لکھ دیئے۔ مرزا نے کئی جہاز بادشاہی بنوائے تھے۔ ان میں ایک کا نام جہاز الٰہی تھا۔ یہ بھی اقرار ہو گیا۔ کہ جہاز الٰہی آدھا دیو بندر میں بھرینگے۔ باقی آدھے کو جہاں کپتان جہاز چاہے بھرے۔ خرچ اس کا کہ ۱۰ ہزار محمودی ہوتا تھا۔ ان سے طلب نہ کرے۔ جہاز جہاں چاہے جائے۔ کوئی روک نہ سکے۔ جام اور بہار ادھر کے با اقتدار حاکم تھے۔ انہیں اسی دھوکہ میں رکھا۔ کہ ہم براہ سمندر بندر سندھ پہنچینگے۔ وہاں سے ملتان کے رستے دربار حضور میں جاکر آداب بجالائیں گے۔ تمہیں رفاقت کرنی ہو گی۔ اس عرصے میں کنارہ کنارہ منزل بمنزل چلا جاتا تھا۔ کہ پرتگالیوں کا عہدنامہ بھی دستخط ہو کر آگیا۔ سومنات کے گھاٹ پر پہنچ کر بخشی بادشاہی وغیرہ اشخاص کو قید کر لیا۔ کہ مبادا فوج کو سمجھا کر متفق کرلیں اور مجھے روکیں ؀

سومنات کے پاس بندر بلاور میں پہنچ کر جہاز الٰہی پر سوار ہوا۔ خورم۔ انور۔ عبد الرسول۔ عبد اللطیف مرتضیٰ قلی۔ عبد القوی چھ بیٹوں کو اور چھ بیٹیوں اور اہل حرم۔ نوکر چاکر۔ لونڈی غلاموں کو اس میں بٹھایا۔ ملازم بھی سو سے زیادہ ساتھ لئے۔ نقد و جنس سے جو کچھ ساتھ لے سکا۔ وہ بھی لیا۔ کھانے پینے لٹے کے لئے کافی ذخیرہ بھرا۔ اور ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دیا ؀

جس وقت وہ خیمہ سے نکل کر جہاز کی طرف چلا۔ ایک عالم تھا۔ جس کے مشاہدے سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں دریائے شوق لہراتے تھے۔ تمام لشکر اور فوجیں آراستہ کھڑی تھیں جب وہ لشکر کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ نقاروں پہ ڈنکے پڑے۔ پلٹنوں اور رسالوں نے سلامی دی۔ ترم اور طنبور۔ ساز فرنگی۔ عربی۔ ہندی باجے بجنے لگے۔ جو سپاہی ہمیشہ لڑائیوں اور پردیس کے دکھوں سردی گرمی کے دنوں میں اس کے شریک حال۔ اور احسانوں اور انعاموں سے مالا مال رہتے تھے۔

---

[1] دیکھو! کہاں سے کہاں تک سمندر کا کنارہ قبضے میں آگیا ہے ؀

غم سے لبریز کھڑے تھے۔ جن لوگوں کو قید کیا تھا۔ چھوڑ دیا۔ اور معذرت کر کے خطا معاف کروائی۔ سب سے دُعا کی درخواست کی۔ اور لمبے لمبے ہاتھوں سے سلام کرتا ہوا جہاز میں جا بیٹھا۔ ناخدا سے کہا۔ کہ خانۂ خدا کے رُخ پر بادبان کھول دو۔ ملا صاحب نے تاریخ کہی ؎

بجانب آستان شد خان اعظم	ولے در زعم شہنشاہ کج رفت
چو پرسیدم ز دل تاریخ سالش	بگفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

نازبردار بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو ناگوار بھی ہوا۔ اور رنج بھی ہوا۔ دل کے خیالات عجیب و غریب فقروں میں زبان سے ٹپکے۔ اور کہا کہ مرزا عزیز کو میں ایسا چاہتا ہوں۔ کہ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر آتا۔ تو میں ضبط کرتا۔ وہ زخمی کر لیتا۔ تب ہاتھ ہلاتا۔ افسوس اس کم فرصت نے محبت کی قدر نہ جانی اور سفر کر بیٹھا۔ خدا کرے کامیاب مقصد ہو۔ اور خیر و خوشی سے پھر آئے۔ میں یہود اور نصاریٰ اور غیروں سے بھی اپنائیت کے رستے میں ہوں۔ وہ تو پروردگار کے رستے پر جاتا ہے۔ اُس سے کیونکر مخالفت کا خیال ہو سکتا ہے۔ محمد عزیز سے ایسی محبت ہے کہ وہ مجھ سے ٹیڑھا بھی چلے۔ تو میں سیدھا ہی چلونگا۔ اُس کی برائی نہ چاہوں گا۔ بڑا خیال یہ ہے۔ کہ اگر رنج دُوری میں ماں کا کام تمام ہوگا۔ تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ کاش اب بھی کئے پر پچھتائے اور پھر آئے۔ ابھی غم و غصہ کے عالم میں اکبر نے کہا کہ چند روز ہوئے۔ جی جی میرے پاس آئیں۔ ایک کٹورہ پانی کا میرے سر پہ وار کر پیا۔ اور کہا۔ الٰہی بہ خویشتن برگرفتم۔ میں نے حال پوچھا۔ کہا۔ آج رات کو میں نے ایک ایسا ہی خواب دیکھا ہے۔ مجھے بھی اس بات کا خیال تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے قالب میں بیٹے کو دیکھا تھا۔ اور جیجی تو مارے غم کے مرنے کے قریب ہوگئی بادشہ نے بہت دلجوئی اور دلداری کی ۔ شمسی[1] شمس الدین اس کے بڑے بیٹے نے بچپن سے حضور میں پرورش پائی تھی۔ اُسے ہزاری منصب دیا۔ شادمان کو پانصدی کر دیا۔ آباد جاگیریں دیں اور ادھر ملک جو خالی پڑا تھا۔ اُس کی حکومت مراد کے نام کر کے بندوبست کر دیا۔

خانِ اعظم جو یہاں سے گئے تھے۔ تو دماغ میں یہ دعویٰ بھرے تھے۔ کہ ہم اکبر بادشاہ کے بھائی ہیں۔ اُس کا جلال و جاہ لوگوں سے پیغمبری بلکہ خدائی کے اقرار لیتا ہے۔ اور میں ایسا دیندار حق پرست ہوں کہ اُس کی درگاہ کو چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ مگر وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ ذوالجلال والاکرام کا دربار تھا۔ وہاں انہیں کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ انہوں نے سخاوت کو مدد پر بلایا۔ وہ ہزاروں اور لاکھوں سے حاضر ہوئی لیکن اس دروازے پر ایسے ایسے بہت مینہ برس جاتے تھے۔ شریف مکہ اور وہاں کے خدام و علما خاطر

[1] اکبر اسے شمسی کہا کرتا تھا۔ یہی نام مشہور ہو گیا تھا۔ دیکھنا۔ اس میں بھی وہی اشارہ ہے سورج والا۔

میں بھی نہ لائے۔ بلکہ بے دماغی اور تلخ مزاجی اُن کی مصاحب وہاں بھی ساتھ تھی۔ اور بچوں کی سی ضدیں ہر وقت موجود تھیں۔ ان رفیقوں کی بدولت شرمائے۔ مکے سے بہت تکلیفیں اٹھائیں غرض اصلی خدا کے گھر میں گزارہ نہ ہوسکا نقلی خدا کا گھر پھر غنیمت نظر آیا۔ باوجود اسکے مکہ معظمہ و مدینۂ منورہ میں حجرے خرید کر وقف کیے کہ حاجی اور زائر آکر رہا کریں۔ مدینۂ منورہ کے خرچ ہر سالہ کی بر آورد بنا کر پچاس برس کا مصارف وہاں کے شرفا کو دیا۔ اور رخصت ہوئے۔ سفر کی عمر کوتاہ۔ یہاں لوگ سمجھے بیٹھے تھے کہ آپ ہرگز نہ آئینگے:

سنہ ۱۰۰۲ھ میں یکایک خبر آئی کہ خان اعظم آگئے۔ اور گجرات میں پہنچ گئے۔ اب حضور میں چلے آتے ہیں بادشاہ پھول کی طرح کھل گئے۔ فرمان کے ساتھ گراں بہا خلعت اور بہت سے عمدہ گھوڑے روانہ کیے۔ محل میں بڑی خوشیاں ہوئیں۔ اُن سے بھی رہا کہاں جاتا تھا۔ گجرات سے عبد اللہ کو ساتھ لیا۔ بندر ملاول کے رستے جو بیسویں دن لاہور میں آن حاضر ہوئے۔ خورم کو کہہ دیا۔ کہ تم سارے قافلہ کو لیکر منزل بمنزل آؤ۔ حضور میں آکر زمین پر سر رکھ دیا۔ اکبر نے اُٹھایا۔ مرزا عزیز مرزا عزیز کہتے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہتے تھے خوب بھینچ کر گلے لگایا۔ جی جی کو ڈیوں بُلا بھیجا۔ بڑھیا بیچاری سے چلا نہ جاتا تھا۔ بیٹے کی جُدائی میں جان لب ہو رہی تھی۔ تھرتھراتی سامنے آئی۔ خوشی کے مارے زار زار روتی تھی۔ وہ اس بیقراری سے دوڑ کر لپٹی کہ دیکھنے والے بھی رونے لگے۔ بادشاہ کے آنسو جاری تھے۔ اور حیران دیکھ رہے تھے۔ خان اعظم نے خدا سے دیکھ کر دعا قبول کرائی ہوگی۔ پنجہزاری منصب خان اعظم خطاب پھر عنایت کیا۔ اور کہا گجرات پنجاب۔ بہار جہاں چاہو جاگیر لو انہیں بہار پسند آیا۔ بیٹوں کو بھی منصب اور جاگیریں عطا ہوئیں:

نام	منصب	نام	منصب
شمس الدین	ہزاری	عبد اللہ	۴ صدی
خورم	ہشت صدی	عبد اللطیف	۲ صدی
انور	شش صدی	مرتضیٰ قلی	صد و پنجاہی
شادمان	پانصدی	عبد القوی	صد و پنجاہی

اب انہیں بھی خوب نصیحت ہوگئی تھی آتے ہی خاص مریدوں کے سلسلے میں داخل ہوگئے حضور میں سجدہ ادا کیا۔ ڈاڑھی درگاہ میں چڑھائی۔ اور جو جو لوازم خوش اعتقادی کے تھے سب بجا لائے۔ پھر تو صحبت درہم نہ بانی میں پیش تھے۔ حاجی پور۔ غازی پور جاگیر مل گیا۔ دین الٰہی کے اصول کی علامی سے تعلیم پانے لگے۔ خاقانی نے کیا خوب کہا ہے:

دریں تعلیم شد عمرم ہنوز ابجد ہمی خوانم	ندانم کے سبق آموز خواہم شد بدلیوانش

سنہ ۱۰۰۳ھ میں ایسے بڑھے اور چڑھے کہ وکیل مطلق ہوکر سب سے اونچے ہوگئے چند روز بعد مہر اُذک (مہر انگشتری) اور پھر مہر توزوک (مہر دربار ی) بھی انہی کو سپرد ہوگئی۔ اس کا دو انچ قطر کا دائرہ تھا۔ گرد ہمایوں سے لیکر امیر تیمور تک سلسلہ چغتائیہ کا دور تھا۔ بیچ میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا نام روشن تھا۔ مہر مذکور

فرامین عطا ہوئے۔ مناصب جاگیر اور مہمات ملک داری کے عظیم الشان فرمانوں پر اعزاز و اعتبار بڑھاتی تھی یہ اُس وقت کی صنعت گری کا عمدہ نمونہ تھا۔ جیسے تاریخی کتابوں میں مُلا علی احمد کا کارنامہ صنعت کہکر ذکر کیا ہے میں نے کئی فرمانوں میں دیکھی ہے۔ اور حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے ؛

لطیفہ ۔ شاہجہان بادشاہ نے ابو طالب حکیم اپنے ملک الشعرا کو مہرداری کی خدمت عطا کرنی چاہی اُس نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

چو مہر تو دارم چہ حاجت بہ مہرم	مرا مہرداری بہ از مُہرداری

حکم ہوا کہ سلطنت کے حکم احکام سپرد ہفتے میں دو دن سردیوان بیٹھا کریں۔ دیوان بخشی مستوفی تمام اہل عمل ان کی ہدایات کے موجب کام کیا کریں ؛

۱۰۰۹ھ میں جب خود بادشاہ نے قلعہ آسیر کا محاصرہ کیا۔ یہ ساتھ تھے۔ مورچوں پر جاتے تھے۔ اطراف کو دیکھتے تھے۔ اور حملہ کے بیچ قرار دینے میں ابوالفضل کے ساتھ عقل لڑاتے تھے حملے کے دن انہوں نے اور اُن کی فوج کی پیش قدمی نے خوب کام کیا ؛

۱۰۰۸ھ میں دیں جی جی کا انتقال ہوگیا۔ جو بچپن میں انہیں کندھے سے لگائے پھرتی تھی۔ بادشاہ نے بہت غم کیا چند قدم اس کے جنازے کو کندھا دیا۔ اور چار ابرو کی صفائی کی کہ آئین چنگیزی تھا۔ خان اعظم اور انکے رشتہ داروں نے بھی صفائی میں ساتھ دیا۔ اگرچہ حکم دیا تھا کہ اس رسم میں ہماری رفاقت ضرور نہیں۔ مگر اتنے حکم پہنچنے میں کئی ہزار ڈاڑھیوں کی صفائیاں ہوگئی تھیں ؛

۱۰۱۱ھ میں ہفت ہزاری شش ہزار سوار کا منصب عطا ہوا اور خسرو ولد جہانگیر سے اُن کی بیٹی منسوب ہوئی۔ سامان ساچق کہ ایک شاہانہ سواری تھی۔ اُس کا اندازہ اس سے قیاس کرنا چاہیئے کہ جہاں آرائش کے ہزاروں سامان گراں بہا تھے۔ وہاں ایک لاکھ روپیہ نقد تھا۔ امرائے دربار ساچق لیکر انکے گھر گئے۔ اسی سنہ میں شمس الدین خاں انکے بیٹے کو دوہزاری منصب دیکر گجرات بھیجدیا ؛

۱۰۱۳ھ میں شادمان اور عبداللہ کو ہزاری منصب عطا ہوئے۔ انور ان دونوں سے بڑا تھا مگر بڑا ہی شرابی تھا اس لئے منبر میں سب سے پیچھے پڑا تھا۔ اب ذرا ہوش میں آیا۔ اکبری دربار میں ان کے پوتوں کے لئے بہانہ ہی چاہیئے تھا۔ وہ بھی ہزاری ہوگیا ؛

۱۰۱۴ھ میں نحوست کا سیارہ سیاہ چادر اوڑھکر سامنے آیا۔ اکبر بیمار ہوا اور اُس کی حالت نے نااُمیدی کے آثار دکھائے۔ تو انہوں نے اور مان سنگھ نے بعض رازداروں کی معرفت اُسکا مافی الضمیر دریافت کیا کہ حکم ہو تو خسرو کی ولیعہدی کی رسمیں ادا کردی جائیں۔ وہ حقیقت میں جہانگیر سے محبت نہیں عشق

رکھتا تھا۔ یا یہ کہو۔ کہ اُس دُوراندیش۔ معاملہ فہم۔ تجربہ کار بادشاہ نے سمجھا۔ کہ اِس وقت نئی بُنیاد ڈال کر یہ عمارت اُٹھانی برف کے ستونوں پر گنبد قائم کرنا ہے۔ انکے ارادے تاڑ گیا۔ اور حکم دیا کہ مان سنگھ اسی وقت بنگالہ (اپنی جاگیر) کو روانہ ہو جائے۔ اور وہاں جا کر اس اس طرح بند وبست کرے۔ مآثر میں ہے۔ کہ جہانگیر اکبر کے اشارے سے شہر میں ایک محفوظ مکان میں جا بیٹھا تھا چنانچہ شیخ فرید بخشی اور بعض اور دولت خواہ جا پہنچے! اور شیخ اُسے اپنے گھر لے گئے۔

خان اعظم نے جب سُنا کہ راجہ مان سنگھ جاتے ہیں خسرو کو بھی ساتھ لئے جاتے ہیں۔ تو اُسی وقت اپنے قبائل کو راجہ کے گھر بھیج دیا۔ اور کہلا بھیجا۔ کہ اب میرا بھی یہاں رہنا مناسب نہیں مگر کیا کروں خزانوں اور اجناس خانوں کے لئے بغیر چارہ نہیں اور بار بردار ہے نہیں راجہ نے کہا۔ دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔ کہ اِس وقت میں تم سے جُدا نہ ہوں۔ مگر مجھ سے خود سامان نہیں سنبھل سکتا ناچار خان اعظم قلعے میں رہ گئے آخر اکبر کا انتقال ہوا۔ اور جس بادشاہ کو کبھی دولہا بنا کر جشن کے تخت پر بٹھاتے تھے۔ کبھی خواصی میں بیٹھ کر میدان جنگ میں لاتے تھے۔ اُس کے جنازے کو کندھا دیا ؛

جہانگیر تخت نشین ہوا۔ امرا نے حاضر دربار ہو کر مبارکباد کی نذریں دیں۔ نئے بادشاہ نے کمال مرحمت سے خان اعظم کی عظمت بڑھائی۔ اور کہا کہ جاگیر پر نہ جاؤ۔ میرے پاس ہی رہو غالباً اُس سے یہ مطلب ہو گا۔ کہ دربار سے دُور ہو گا۔ تو بغاوت کے سامان ہتیا کرنے کو میدان فراخ پائیگا۔ آخر خسرو باغی ہوا اور جہانگیر کے دل پر نقش ہو گیا۔ کہ اسی کے لڑکے کا کیا حوصلہ تھا۔ یہ جُرأت اسے خان اعظم کی پشت گرمی سے ہی ہوئی ہے جب اُس کی مہم سے فارغ ہوا تو یہ عتاب و خطاب میں آئے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ خان اعظم کو خسرو کی بادشاہت کا بڑا ارمان تھا۔ وہ اس آرزو میں ایسا آپے سے باہر تھا کہ اپنے رازداروں کو کہا کرتا تھا۔ کاش ایک کان میں کوئی کہے۔ کہ خسرو بادشاہ ہو گیا۔ اور دوسرے کان میں حضرت عزرائیل موت کا پیغام دیدیں۔ مجھے مرنے کا افسوس نہ ہو گا۔ مگر ایک دفعہ اُس کی بادشاہت کی خبر سُن لوں ؛

غرض اب یہ نوبت ہُوئی۔ کہ دربار میں جاتے تھے۔ تو کپڑوں کے نیچے کفن پہن کر جاتے تھے۔ کہ دیکھئے زندہ پھروں یا نہ پھروں۔ بڑا عیب اُس میں یہ تھا۔ کہ گفتگو میں سخت بیباک تھا۔ اُس کی زبان اُسکے قابو میں نہ تھی جو مُنہ میں آتا تھا۔ صاف کہہ بیٹھتا تھا۔ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھتا۔ اس امر نے جہانگیر کو تنگ[1] اور اکثر اہل دربار کو اُس کا دشمن کر دیا تھا چنانچہ اسی جوش غضب کے دنوں میں جہانگیر نے امرائے خاص کو ٹھیرا لیا جلوت میں

---

[1] مآثر الامرا میں ہے۔ کہ ایک شب امیر الامرا سے سخت کلامی کی۔ بادشاہ نے اُٹھ کر مشورہ کا جلسہ کیا۔ امیر الامرا نے کہا کہ کشتن او توقف نیخواہد۔ مہابت خاں نے کہا من مرد کنگاش دخلے نیست مہا ہیم شمشیر مردہی دارم۔ بکمراو میزنم۔ اگر دو حصہ نکند دست مرا ببرند ؛

لے گئے۔ اور خان اعظم کا مقدمہ جلسۂ مشورت میں ڈالا۔ جب گفتگوئیں ہونے لگیں۔ تو امیر الامرا نے کہا کہ اس کے فنا کر دینے میں دیر کیا لگتی ہے۔ بادشاہ کی مرضی دیکھ کر مہابت خاں بولا کہ میں تو سپاہی آدمی ہوں۔ مجھے صلاح مشورہ نہیں آتا۔ سرو تی رکھتا ہوں۔ کمر کا ہاتھ مارتا ہوں۔ دو ٹکڑے نہ کر دے تو میرے دونو ہاتھ قلم۔ خان جہاں (غالباً خان اعظم کا خیر خواہ تھا یا عموماً نیک نیت تھا) نے کہا۔ حضور میں تو اس کے طالع کو دیکھتا ہوں۔ اور حیران ہوتا ہوں۔ ایک جہان خانہ زاد کی نظر گزرا۔ جہاں دیکھا حضور کا نام روشن نظر آیا۔ اور وہیں خان اعظم کا نام بھی موجود۔ قتل کرنا اس کا کچھ مشکل نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ظاہر کوئی خطا معلوم نہیں ہوتی۔ مگر اسے حضور نے مارا۔ تو تمام عالم میں وُہی مظلوم مشہور ہوگا۔ جہانگیر اس پر ذرا دھیما ہوا۔ اتنے میں سلیمہ سلطان بیگم پردے کے پیچھے سے پکار کر بولیں۔ حضور! محل کی بیگمات اُس کی سفارش کو آئی ہیں۔ حضور آئیں۔ تو آئیں ورنہ سب باہر نکل پڑیں گی۔[1] بادشاہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے حرم میں چلے گئے۔ وہاں سب نے مل کر ایسا سمجھایا کہ خطا معاف ہو گئی۔ خان اعظم نے افیم تک بھی نکھائی تھی۔ بادشاہ نے خاصہ کی گولیاں (اپنے کھانے والی گولیاں) دیں۔ اور رخصت کیا۔ یہ آگ تو دب گئی۔ مگر چند ہی روز بعد۔ خواجہ ابو الحسن تربتی نے خاص اُس کے ہاتھ کا لکھا ایک خط مدت سے لگا رکھا تھا۔ اب پیش کیا۔ اُس کا حال جس طرح جہانگیر نے خود اپنی توزک میں لکھا ہے۔ ترجمہ لکھتا ہوں۔ میرا یقین کہتا تھا۔ کہ خسرو اُس کا داماد ہے۔ اور وہ ناخلف میرا دشمن ہے۔ اُس کے سبب سے میری ذات سے خان اعظم کے دل میں ضرور نفاق ہے۔ اب اُس ایک خط سے معلوم ہوا۔ کہ خبث طبعی کو اُس نے کسی وقت بھی جانے نہیں دیا۔ بلکہ میرے والد بزرگوار سے بھی جاری رکھا تھا۔ مجمل یہ ہے کہ ایک موقع پر اُس نے ایک خط راجہ علی خاں کو لکھا تھا۔ اوّل سے آخر تک بدی اور بد پسندی اور ایسے مضمون کہ کوئی دشمن کے لئے بھی نہیں لکھتا۔ اور کسی کی طرف نسبت نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ حضرت عرش آشیانی جیسے بادشاہ اور صاحب قدردان کے حق میں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تحریر برہان پور میں راجہ علی خاں کے دفتر خانہ میں سے ہاتھ آئی۔ اُسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر بعض خیالات کا۔ اور اُس کی ماں کے دودھ کا ملاحظہ نہ ہوتا۔ تو بجا ہوتا۔ کہ اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرتا۔ بہرحال بُلایا۔ اور اسکے ہاتھ میں وہ نوشتہ دیکر کہا کہ سب کے سامنے بہ آواز بلند پڑھے۔ مجھے گمان تھا۔ کہ اُسے دیکھکر اُس کی جان نکل جائیگی۔ انتہا ئے بے شرمی اور بے حیائی ہے۔ کہ اس طرح پڑھنے لگا۔ گویا اس کا لکھا ہی نہیں کسی اور کا لکھا ہوا پڑھوایا ہے۔ وہ پڑھ رہا ہے۔ حاضران مجلس بہشت آئین۔ بندہائے اکبری و جہانگیری۔ جس نے وہ تحریر دیکھی اور سُنی لعنت و نفریں

[1] حضرت۔ ہر بیگمہا بجہت شفاعت میرزا کوکہ در محل جمع شدہ اند۔ اگر تشریف آرند بہتر والا بہ سے آیند۔

کرنے لگے۔ اُس سے پُوچھا۔ کہ قطع نظر ان نفاقوں کے جو مجھ سے کیئے اور اپنے اعتقاد ناقص میں اُن کے لئے کچھ وجہیں بھی قرار دی تھیں۔ والد بزرگوار نے کہ تجھ کو اور تیرے خاندان کو خاک راہ سے اٹھا کر اس رتبۂ اعلےٰ تک پہنچایا۔ کہ اس درجے پہ پہنچے (جس پر ہم جنس اور ہم رتبہ لوگ رشک کرتے ہیں) بات کیا ہوئی تھی؟ کہ دشمنان و مخالفان دولت کو ایسی باتیں لکھیں۔ اور اپنے تئیں حرامخوروں اور بدنصیبوں میں جگہ دی۔ سچ ہے۔ سرشت اصلی اور پیدائش طبعی کو کیا کرے۔ جب تیری طبیعت نے آب نفاق سے پرورش پائی ہو۔ تو ان باتوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ مجھ سے کیا تھا اُس سے میں درگزرا۔ اور جو منصب تھا۔ پھر اُسی پر سرفراز کیا۔ گمان تھا۔ کہ تیرا نفاق خاص میرے ہی ساتھ ہوگا۔ اب جو یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ اپنے مربّی اور خداے مجازی سے بھی اس درجے پر تھا۔ تو تجھے تیرے اعمال اور تیرے مذہب کے حوالے کیا۔ یہ باتیں سُن کر چپ رہ گیا۔ ایسی روسیاہی کے جواب میں کہے کیا؟ جاگیر کی موقوفی کا حکم دیا اور جو کچھ اس ناشکرے نے کیا تھا۔ اگرچہ اُسمیں عفو اور درگزر کی گنجائش نہ تھی۔ مگر بعضے لحاظوں کی رعایت کر کے درگزر کی۔ (مؤرخ کہتے ہیں کہ نظر بند بھی رہے)

۱۰۱۷ھ جلوس میں خسرو کے ہاں بیٹا (خان اعظم کا نواسہ) پیدا ہُوا۔ بادشاہ نے بلند اختر نام رکھا۔ خان اعظم کو گجرات عنایت ہُوا۔ اور حکم ہُوا کہ وہ حاضر دربار رہے۔ جہانگیر قلی خاں اُس کا بڑا بیٹا جا کر ملک کا کاروبار کرے۔

۱۰۱۸ھ جلوس میں اُسے داور بخش یعنی خسرو کے بیٹے کا اتالیق کیا۔ اسی سنہ میں امراے جلیل القدر دکن پر بھیجے گئے۔ اور مہم بگڑ گئی۔ معلوم ہوا کہ سبب اس خرابی کا آپس کا نفاق اور بے اتفاقی خان خاناں کی تھی۔ جس لئے خان اعظم کو چند امرا اور منصبداروں کے ساتھ فوج دے کر کمک کے لئے بھیجا۔ دس ہزار سوار دو ہزار احدی۔ کل بارہ ہزار۔ تیس لاکھ روپیہ خرچ خزانہ۔ کئی حلقے ہاتھیوں کے ساتھ کئے۔ خلعت فاخرہ۔ کمر شمشیر مرصع۔ گھوڑا اور فیل خاصہ اور پانچ لاکھ روپیہ امداد کے طور پر عنایت ہوا۔ اسی سنہ میں خورم پسر خان اعظم کو جوناگڈھ کی حکومت دیکر بھیجا تھا۔ اُسے کامل خاں خطاب مِلا۔

۱۰۲۲ھ میں خان اعظم کے بیٹے کو شادمان خاں خطاب دیکر ایک ہزاری ہفت صدی ذات پانسو سوار کے ساتھ علم مرحمت ہُوا۔

خان اعظم کا ستارہ جو ابھی نحوست کے گھر سے نکلا۔ اسی سنہ میں پھر رجعت کھا کر اُلٹا گرا۔ وہ برہان پور میں آرام سے بیٹھا امارت کی بہاریں لوٹ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ اودے پور پر مہم کیا چاہتے ہیں۔ بڈھے سپہ سالار کو بہادری اور دلاوری کا جوش آیا۔ عرضی کی۔ حضور کو یاد ہوگا۔ دربار اکبری میں جب مہم رانا کا

ذکر آتا تھا۔ تو فدوی عرض کیا کرتا تھا۔ آرزو ہے کہ یہ مہم ہو۔ اور فدوی جاں نثار ہو۔ بندگان حضور پر یہ بھی روشن ہے۔ کہ یہ مہم وہ ہے جس میں فدوی مارا بھی جائے۔ تو شہید راہ خدا ہے۔ فتح یاب ہوا۔ تو غازی ہونے میں کیا کلام ہے۔ اس جاں نثاری سے جہانگیر بہت خوش ہوا۔ اور لشکر مدد توپخانے نقد خزانے وغیرہ وغیرہ جو کچھ درخواست کی سرانجام ہوگیا۔ یہ روانہ ہوئے۔ اودے پور کے کوہستان میں جا کر مہم شروع ہوئی وہاں سے عرضی کی۔ کہ جب تک نشان اقبال ادھر کی ہوا میں نہ لہرائیگا کھلنا اس عقدے کا دشوار ہے جہانگیر اُٹھے۔ یہاں تک کہ دائرہ اجمیر میں جا اُترے۔ شاہزادہ خورم (شاہجہان) کو دو ہزار سوار خوش اسپ امرائے کہنہ عمل اور بہت سے سامان ضروری دیکر آگے روانہ کیا۔ یہ سب وہاں پہنچے اور کاروبار جاری ہوا:

آزاد کلیہ قاعدہ ہے کہ باپ کے باتدبیر جاں نثار بیٹے کے عہد میں۔ بے عقل۔ سینہ زور۔ بلکہ شور گنے جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ دادا کے وقت کے۔ اور وہ بھی خان اعظم۔ ان کی اور شاہزادوں کی لڑکے نے مطابقت نہ کھائی۔ کام بگڑنے لگے۔ اُدھر شاہزادہ کی عرضیاں آئیں۔ ادھر خبر نویسوں کے پرچے پہنچے۔ اور امرائے لشکر کی تحریروں سے اُن کی تائید ہوئی۔ سب سے زیادہ ان کی اپنی بدمزاجی اور بد دماغی ع

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

غرض بادشاہ کے دل پر نقش ہوگیا۔ کہ فساد خان اعظم کی طرف سے ہے۔ یہ خیال اتنا ہی رہتا تو بھی بڑی بات نہ تھی بہت ہوتا۔ تو بلا کر ان کے علاقے پر بھیج دیتے۔ بڑا اختلاف اُن کا وہ رشتہ تھا۔ کہ خسرو کے خسر تھے اور وہ جُرم بغاوت میں خود معتوب تھا۔ چنانچہ شاہزادہ خورم نے صاف لکھا۔ کہ خان اعظم اُسی رعایت سے مہم کو برباد کیا چاہتا ہے اسکا یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بست الست بادشاہ نے فوراً مہابت خاں کو روانہ کیا اور حکم دیا کہ خان اعظم کو اپنے ساتھ لیکر آؤ۔ وہ گیا۔ اور خان کو عبداللہ اُس کے بیٹے سمیت حاضر دربار کیا آصف خاں کے سپرد ہوئے کہ قلعۂ گوالیار میں قیدیوں کی طرح محبوس رکھو۔ بلکہ چند روز پہلے خسرو کے لئے ماں بہنوں کی منت وزاری سے اجازت ہوگئی تھی۔ کہ حضور میں آیا کرے۔ اب اُسے بھی حکم ہوا کہ بدستور آنا جانا بند:

اللہ شکر خورہ کو شکر ہی دیتا ہے۔ آصف خاں نے حضور میں عرض کی کہ خان اعظم قید خانہ میں مجھ پر عمل پڑھتا ہے۔ ترک حیوانات۔ خلوت۔ عورتوں سے علیحدگی وغیرہ وغیرہ عمل مذکور کے لئے شرط ہے۔ وہ اسے خود حاصل ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام خانہ داری کے لوازمات اور آسائش کے سامان وہیں بھیج دو۔ اور دسترخوان پر بھی سب طرح کے کھانے۔ امیرانہ نعمتیں۔ یہاں تک کہ مرغ مرغابی۔ تیتر کے کباب لگانے لگے۔ خان اعظم کہتا تھا۔ کہ مجھے عمل کا سامان گمان بھی نہ تھا۔ خدا جانے اُدھر ہی ادھر یہ معاملہ کیونکر ہوگیا۔

کچھ عرصہ کے بعد خسر تو چھٹ گئے۔ خسرو اُسی طرح قید رہے۔ مگر رہائی کے وقت اقرارنامہ لکھوالیا۔ کہ

سے پُوچھے بات نہ کرونگا۔ بادشاہ جدروپ گسائیں سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے تھے اُسکی فقیرانہ اور حکیمانہ باتیں سُن کر محظوظ ہوتے تھے۔ بلکہ اُس کی فرمایش کو ٹالتے نہ تھے۔ خان اعظم اُن کے پاس گئے۔ اور بڑے عجز و انکسار کے ساتھ التجا کی۔ چنانچہ ایک دن جو جہانگیر گسائیں کے پاس گئے تو اُس نے عارفانہ اور صوفیانہ تقریروں میں مطلب ادا کیا۔ اُس کا اثر پُورا ہُوا۔ آکر حکم دیا۔ کہ خسرو بدستور دربار میں حاضر ہوا کرے۔ افسوس یہ کہ اخیر عمر میں مرتے مرتے خان اعظم نے ایک بیٹی کے رنڈاپے کا داغ اٹھایا یعنی سنہ ۱۰۳۱ھ میں خسرو مر گیا۔ شاہجہان مہم دکن پر رخصت ہوا تھا۔ وُہ آکر باپ سے اس بدنصیب بھائی کی سفارش کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر جہانگیر نے اُسے کہا۔ میں دیکھتا ہوں خسرو ہمیشہ آزردہ اور مکدّر رہتا ہے۔ اور کسی طرح اس کا دل شگفتہ نہیں ہوتا۔ اُسے تم اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ اور جس طرح مناسب سمجھو حفاظت میں رکھو۔ وہ دکن میں بھائی کے ساتھ تھا۔ کہ دفعتہ درد قولنج اُٹھا اور مر گیا۔ بعض مؤرخ یہ بھی کہتے ہیں۔ رات کو اچھا بھلا سویا۔ صبح دیکھو تو فرش پر مقتول پڑا ہے ؎

سنہ ۱۰۳۲ھ جلوس اٹھارویں داور بخش خسرو کے بیٹے کو صوبہ گجرات عنایت ہوا۔ انہیں بھی ساتھ رخصت کیا ؎

سنہ ۱۰۳۳ھ جلوس انیس میں بدمزاجی اور خوش مزاجی نفاق و اتفاق کے جھگڑے تمام ہوئے بیماری باتیں زندگی کے ساتھ ہیں۔ مر گئے کچھ بھی نہیں۔ احمد آباد گجرات میں خان اعظم نے دُنیا سے انتقال کیا۔ جنازہ کو دلی میں لائے سلطان مشائخ کے ہمسایہ میں انکہ خاں سوتے تھے۔ انکے پہلو میں بیٹے کو لٹا کر اماں زمین کے سپرد کر دیا ؎

خان اعظم کی ہمت۔ شجاعت۔ سخاوت۔ لیاقت کی تعریفوں میں تمام تاریخوں اور تذکروں کی ایک زبان ہے میں اوّل اس باب میں جہانگیر بادشاہ کا کلام لکھتا ہوں۔ توزک میں کہتے ہیں۔ میرے اور میرے والد بزرگوار نے اُسکی ماں کے دود کا خیال کر کے اُسے سب اُمرا سے بڑھا دیا تھا۔ اور اُس سے اور اُسکی اولاد کی طرف سے عجیب عجیب باتوں کی برداشت کرتے تھے۔ علم سیر و فن تاریخ میں اُسے کامل یادداشت تھی۔ تحریر اور تقریر میں بے نظیر تھا۔ نستعلیق خوب لکھتا تھا۔ مُلّا باقر ولد مُلا میر علی کا شاگرد تھا۔ یہ بات بالاتفاق ہے۔ کہ ارباب استعداد اسکے قطعے کو اساتذہ مشہور کی تحریر سے کم درجہ نہ دیتے تھے۔ مدعا نویسی میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا۔ مگر عربیت سے عاری تھا۔ لطیفہ گوئی میں بے مثل تھا۔ شعر بھی اچھا کہتا تھا۔ یہ رُباعی اُس کے واردات حال سے ہے ؎

عشق آمد و از جنوں بر و مندم کرد	وارستہ ز صحبت خرد مندم کرد
آزاد ز بندِ دین و دانش گشتم	تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

جو کچھ حالات بیان ہوئے۔ سمجھنے والا اُس سے نتیجے نکال سکتا ہے۔ مگر مآثر الامرا وغیرہ تاریخوں سے صاف صاف ثابت ہے۔ کہ اُس کی خود پسندی۔ خود رائی۔ بلند نظری بلکہ اوروں کی بداندیشی حد سے گذری ہوئی تھی۔ اور اکبر کی دلداری اور ناز برداری نے ان قباحتوں کو پرورش کیا تھا۔ جس کے حق میں جو چاہتا تھا کہہ بیٹھتا

تھا کسی انسان یا مقام یا انجام کا ہرگز لحاظ نہ کرتا تھا۔ اسی واسطے یہ بات زباں زد تھی۔ کہ اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں آخر اقرار نامہ لیا گیا۔ کہ جب تک تم سے بات نہ پوچھیں۔ تم نہ بولو ۞

لطیفہ۔ ایک دن جہانگیر نے جہاں قلی (ان کے بیٹے) سے کہا۔ کہ ضامن پدر مے شوی؟ اُس نے کہا۔ عدہ امر مگر زبان ۞

سلاطین چغتائیہ کا آئین تھا کہ جب کوئی امیر حکم بادشاہی لیکر دوسرے امیر کے پاس جاتا تھا۔ تو وہ اُس کا استقبال کر کے بڑی تعظیم سے ملتا تھا جس وقت وہ اولے پیام کرتا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر بموجب قواعد مقررہ کے کورنش و تسلیم بجالاتا تھا۔ خصوصاً جبکہ خبر کسی ترقی یا عنایت و مرحمت کی ہوتی تھی۔ تو زیادہ تر شکرانے کرتا تھا۔ بہت سی دُعائیں دیتا تھا۔ اور جو امیر آتے تھے انہیں تحائف نقد و جنس ساتھ کر کے رخصت کرتا تھا ۞

جب جہانگیر نے اُن کی خطا معاف کی۔ اور پنج ہزاری منصب پر بحال کرنے لگا۔ تو دربار میں بلایا شاہجہان سے کہا۔ کہ بابا (شاہجہان کو بابا۔ یا بابا خورم کہا کرتا تھا) مجھے یاد ہے کہ تمہارے دادا نے جب انہیں دو ہزاری منصب عنایت فرمایا۔ تو شیخ فرید بخشی اور راجہ رام داس کو بھیجا۔ کہ جا کر منصب کی مبارکباد دو جب وہ پہنچے۔ تو یہ حمام میں تھے۔ وہ ڈیوڑھی پر بیٹھے رہے۔ ایک پہر کے بعد یہ نکلے۔ دیوان خانہ میں آ کر بیٹھے اور انہیں سامنے بلایا۔ مبارکباد لی بیٹھے بیٹھے سر پہ ہاتھ رکھا (یہ آداب و کورنش ہوا) اور کہا تو یہ کہا۔ اب اس کے لئے اور فوج رکھنی پڑی۔ اُن کا خیال بھی نہ کیا اور رخصت کر دیا۔ بابا مجھے شرم آتی ہے۔ کہ بجائی منصب پر مرزا کو کہ کھڑے ہو کر تسلیم بجالائے۔ خیر تم اُس کی طرف سے کھڑے ہو کر آداب بجالاؤ۔

استعداد علمی تحصیل علمی اُن کی عالمانہ تھی۔ لیکن درباری اور مصاحبت میں بے نظیر تھی بہت لیک لطیفہ تھی۔ فارسی کے فصیح انشا پرداز اور عمدہ مطلب نگار تھے رباعی بھی تحصیل نہ کی تھی مگر کہا کرتے تھے۔ دیکھو ہی وانا رہیم ۞

لطیفہ۔ اُن کا قول تھا۔ کہ جب کسی معاملے میں کوئی مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور اُسی بنا پر کارروائی کی صورت سوچنے لگتا ہوں جب وہ کہتا ہے۔ نواب صاحب آپ خلاف نہ سمجھیں۔ میں سچ کہتا ہوں تب مجھے شبہ پیدا ہوتا ہے جب وہ قسم کھاتا ہے۔ تو یقین ہو جاتا ہے کہ جھوٹا ہے ۞

مصاحبت اور علم مجلس میں بے نظیر تھے۔ اور مزے کی باتیں کرتے تھے ۞

لطیفہ۔ فرمایا کرتے تھے۔ کہ امیر کے لئے چار بیبیاں چاہئیں۔ مصاحبت اور باتوں چیتوں کے لئے ایرانی۔ خانہ سامانی کے لئے خراسانی۔ سیج کے لئے ہندوستانی۔ چوتھی ترکانی۔ اُسے ہر وقت مارتے دھاڑتے رہیں کہ اور بیبیاں ڈرتی رہیں ۞

چند فقرے آزاد کو ایسے لکھے پڑے کہ خان اعظم کی روح سے شرماتا ہے۔ لیکن مورخ کا کام ہر بات کا لکھنا ہے

اس لئے مآثرالامرا کے ورق کو اپنی برأت کا گواہ پیش کر کے لکھتا ہے۔ کہ وہ خبث و نفاق۔ سخت مزاجی و بدکلامی میں سرآمد عہد تھے۔ اور تند غضب تھے۔ جب کوئی عامل ان کی سرکار میں معزول ہو کر آتا تھا۔ مستوفی اُن کا روپیہ طلب کرتا۔ اگر دیدیا تو دے دیا ورنہ اتنا مارتا کہ مرجاتا۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ مار کھا کر بچ نکلتا تو پھر کوئی مزاحمت ہی نہ تھی۔ لاکھ روپیہ ہی کیوں نہ ہو ❊

کوئی برس نہ گزرتا تھا۔ کہ اُن کے غصّے کا اُسترا ایک دو دفعہ اپنے ہندو منشیوں کے سر اور مُنہ صاف نہ کرتا ہو۔ **رائے درگاداس** ان کے خاص دیوان تھے۔ ایک دفع پر اور منشیوں نے گنگا اشنان کی رُخصت لی۔ نواب اُس وقت کچھ خوشی کے دم میں تھے۔ کہا کہ دیوان جی تم ہر برس اشنان کو نہیں جاتے اُس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ میرا اشنان تو حضور کے قدموں میں ہو جاتا ہے۔ وہاں بعد رانہ ہوا یہاں گیا بھیجے گئے۔ وہ قانون منسوخ کر دیا ❊

نماز کے مقید نہ تھے۔ مگر مذہب کا تعصب بہت تھا ❊

اُن کی طبیعت میں زمانہ سازی ذرا نہ تھی۔ نورجہاں کی وہ اوج موج رہی! اور اُسکی بدولت اعتمادالدولہ اور آصف جاہ کے دربار میں بھی ایک عالم کی رجوع تھی۔ مگر یہی نہ گئے۔ بلکہ نورجہاں کے دروازے تک بھی قدم نہ اُٹھا۔ برخلاف خانخاناں کے، وہ ضرورت کے وقت **رائے گوردھن** اعتمادالدولہ کے دیوان کے گھر پر بھی جا موجود ہوتے تھے ❊

خان اعظم کے بیٹے جہانگیری عہد میں باعزّت و احترام رہے ❊

سب سے بڑا شمس الدین	جہانگیر قلی خطاب تھا۔ اور تین ہزاری کے رتبے تک پہنچا ❊
شادماں	شادماں خاں ہوتے ❊
خورم	اکبر کے عہد میں جوناگڈھ پر تھا۔ گجرات میں باپ کیساتھ تھا۔ جہانگیری عہد میں **کامل خاں** خطاب پایا۔ رانائے اودے پور کی مہم میں شاہجہاں کیساتھ تھا ❊
مرزا عبداللہ	جہانگیر نے **سردار خاں** خطاب دیا۔ جب کوکہ گوالیار کے قلعے میں قید ہوتے تو یہ بھی ساتھ تھے ❊
مرزا انور	زین خاں کوکہ کی بیٹی اس سے منسوب تھی یہ سب تین ہزاری اور دو ہزاری کے رتبے کو پہنچے ❊

خان اعظم کے حالات سے اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک جاہل مزاج مسلمان خواہ تُرا سپاہی یا ضدی امیرزادہ تھا۔ بعض باتیں ایسی بھی ہو جاتی تھیں جن سے اُسے لوگ احمق کہتے تھے۔ نقلیں جو اس باب میں مشہور ہیں وہ کتابی نہیں ہیں ۔ اس لئے درج کتاب نہیں کرتا۔ اتنا ضرور ہے کہ سادگی کہو۔ کم فہمی نام رکھو۔ غرض یہ صفت

اُس خاندان کے لہو میں داخل تھا۔ ان کے چچا میر محمد خاں اتکہ خاں اور خان کلاں کہلاتے تھے۔ اکبر نے کمال خاں گکھڑ کے ساتھ کیا۔ کہ اُس کے بھائی بندوں نے سرشوری کر کے اُسے نکال دیا ہے۔ تم فوج لیکر جاؤ۔ اور اُس کا حق دلوادو۔ چند امیر صاحب فوج اور بھی ساتھ تھے۔ بادشاہی سرداروں نے جاکر پہاڑوں کو ہلا ڈالا۔ آدم خاں گکھڑ کمال خاں کا چچا قید ہوا۔ لشکر خاں اس کا بیٹا کشمیر کو بھاگ گیا۔ اور پکڑا آیا مگر دونوں اپنی موت سے مر گئے۔ امرائے شاہی نے ملک کمال خاں کو سپرد کر دیا اور آگرہ میں آکر حضور کو سلام کیا۔ خان کلاں سب سے آگے تھے۔ بادشاہ نے اُن کی سلامی لینے کے واسطے دربار عالی ترتیب دیا۔ خانِ موصوف نے اپنی ساری بہادری کا زور لگا کر ایک قصیدہ بھی کہا۔ اُس دن امرا۔ فضلا۔ شعرا وغیرہ اکابر سلطنت کے لئے حاضر ہونے کا حکم تھا۔ خان نے کہا کہ ایسے دربار پُر بہار پر میرا قصیدہ پڑھا جائے تو بڑی بہار ہے۔ بادشاہ کو بھی اس گھرانے کا بڑھانا منظور تھا۔ بلکہ اسی واسطے یہ دربار کیا تھا۔ غرض تمام جلسہ مرتب و مکمل، آراستہ اور بادشاہ بھی دل و جان سے کان لگائے۔ کہ دیکھیں خان کلاں کیا کہتے ہیں اور انہیں بھی بڑے انعام کی اُمید۔ غرض پہلا ہی مصرع پڑھا

بحمد اللہ کہ دیگر آدم فتح گکھر کردہ

لوگ تو انہیں پہلے سے جانتے تھے۔ آپس میں نگاہیں لڑیں۔ اور دلوں میں گدگدیاں ہوئیں کہ دیکھئے آگے کیا کہتے ہیں۔ اتنے میں عبد الملک خاں ان کا داماد آن پہنچا۔ اور آگے بڑھ کر بولا۔ خانم دیگر آدمیم بخوانید۔ کہ نامردان دیگر ہم در رکاب شما بودند۔ اتنا کہنا تھا کہ ایک قہقہہ اُڑا اور ہنسی کے مارے سب لوٹ گئے۔ خان کلاں نے دستار زمین پر دے ماری۔ اور کہا۔ بادشاہوں۔ واواز دست این مردک ناقابل کہ بند شفقت مرا ضائع ساخت ؛

عبد الملک خاں کی حقیقت بھی سن لو۔ اپنا سجع آپ کہا تھا اور مہر درباری کے نگینے پر کھدوا کر اپنے تئیں رسوا کیا تھا

عبد راچوں بر ملک افزوں کنی ۔ پس الف لامے درو اندر دوں کنی

مُلا شیری شاعر ہندی نے اُن کی تعریف میں قصیدہ کہا تھا۔ کہ تمام دو رُخے مضامین سے رنگین تھا۔ ایک شعر اُسی کا مُلا صاحب نے لکھ دیا ہے ؎

اگر گنوار بیاید مقابلِ تو گریز
کہ صاحبی و مقابل نے شوی بہ گنوار

حسین خاں ٹکریہ

یہ سردار نورتن کے سلسلے میں آنے کے قابل[1] نہیں مگر اپنے اسلام اور دینداری میں اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا جن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کے سیدھے سادھے مسلمانوں کے کیا طور و طریقے تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ ملّا صاحب کے حالات اور خیالات کو اس سے بڑا تعلق ہے۔ جہاں اسکا ذکر آتا ہے۔ بڑی محبت سے لکھتے ہیں۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بہادر افغان اوّل بیرم خاں خانخاناں کا نوکر ہوا۔ اور اسی وقت سے ہمایوں کے ساتھ تھا۔ جب کہ اس نے ایران سے آکر قندھار کا محاصرہ کیا۔ اور فتح پائی۔ شجاعت ہر معرکے میں اسے بے جگر کرکے آگے بڑھاتی رہی۔ اور جانفشانی اس کے درجے بڑھاتی رہی مہدی قاسم خاں ایک معزز سردار تھا۔ وہ اس کا ماموں تھا۔ اور اس کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی تھی ✤

یہ اکبر کے عہد میں بھی با اعتبار رہا۔ جبکہ سکندر سور کو اکبری لشکر نے دباتے دباتے جالندھر کے پہاڑوں میں گھسیڑ دیا۔ اور پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ تو سکندر قلعہ مان کوٹ میں جا بیٹھا۔ امراء روز لڑتے تھے اور جوہر دکھاتے تھے اس بہادر نے ان لڑائیوں میں وہ کام کئے۔ کہ رستم ہوتا تو داد دیتا۔ حسن خاں اس کے بھائی نے بڑھ کر قدم مارا۔ کہ جان کو نام پر قربان کیا۔ حسین خاں نے وہ وہ تلواریں ماریں۔ کہ اِدھر سے اکبر اور اُدھر سے سکندر دونوں دیکھتے تھے اور عش عش کرتے تھے اور روز بروز بادشاہ زرخیز علاقے اس کی جاگیر میں دیتے تھے ان حملوں میں حسن خاں ان کا بھائی جانبازبہادروں میں سرخرو ہو کر دُنیا سے گیا۔ بادشاہ جب ۹۶۵ھ میں لڑائی کے بعد ہندوستان کو چلے تو اُسے صوبہ پنجاب عنایت کیا ✤

لطیفہ۔ جب یہ حاکم لاہور تھے۔ تو ایک لمبی ڈاڑھی والا مرد معقول ان کے دربار میں آیا۔ یہ جامۂ سلام تعظیم کو کھڑے ہوگئے۔ مزاج پرسی سے معلوم ہوا۔ کہ وہ تو ہندو ہے۔ اُس دن سے حکم دیا۔ کہ جو ہندو ہوں وہ کندھے کے پاس ایک رنگین کپڑے کا ٹکڑا لگوایا کریں۔ لاہور بھی ایک عجیب چیز ہے یہاں کے لوگوں نے ٹکریہ نام رکھ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اب پیوند کو ٹاکی کہتے ہیں اُس وقت اسے ٹکڑی کہتے تھے ✤

۹۶۶ھ میں اندری سے آگرہ میں آتے۔ اور چند سرداران نامی کے ساتھ فوجیں لے کر رنتھنبور پر گئے۔ مقام سوپر پر میدان ہوا۔ بہادر پٹھان دھاوے کا شیر تھا ایسے متواتر حملے کئے۔ کہ رائے سرجن رانا قلعے میں گھس گیا یہ اُسے دبا رہا تھا۔ کہ خانخاناں کے ساتھ زمانے نے دغا کی۔ اور عالم کا نقشہ بدلتا نظر آیا۔ جن لوگوں کے رنگ جمتے جاتے تھے۔ ان کی اُن کی پہلے سے لاگیں چلی آتی تھیں (صادق محمد خاں وغیرہ) اس لئے دل شکستہ

[1] مصنف کی ترتیب کیمطابق اُن کے حالات تتمہ میں درج ہونے چاہیئے تھے۔ دیکھو صفحہ ۴۴۳۔

ہو گیا۔ اور مہم کو نا تمام چھوڑ کر گوالیا میں آیا۔ مالوے کا ارادہ تھا۔ کہ خانخاناں نے آگرہ سے خط لکھا اور بلا بھیجا
بُرے وقت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بڑے بڑے سردار اس کے دامن گرفتہ کہلاتے تھے پچیس اُن میں سے
پنجہزاری تھے۔ باقی کا شمار تم سمجھو۔ ان میں سے فقط چھ امیر تھے جنہوں نے جان اور مال کو بات پر قربان کر کے
خانخاناں کا ساتھ دیا۔ اور ان میں سے ایک حسین خاں تھے۔ ایک شاہ قلی خاں محرم ٭

جب گناچور کے میدان میں خانخاناں کا اتکہ خاں کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ تو وفاداروں نے خوب خوب جوہر دکھائے۔ چار دلاور سردار میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرے۔ اور بادشاہی فوج کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ انہی میں خان مذکور تھا۔ ایک زخم اس کی آنکھ پر آیا۔ کہ زخم نہ تھا۔ جمالِ دلاوری کے لئے چشم زخم تھا۔ مہدی قاسم خاں اور اس کا بیٹا دربار میں با اعتبار تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ بھی حسین خاں کے جوہرِ وفا سے خوب واقف تھا اسی واسطے عزیز رکھتا تھا۔ ساتھ اس کے اپنے بدنیت مصاحبوں سے واقف تھا۔ چنانچہ حسین خاں کو اُس کے سالے کے حوالے کر دیا۔ اسمیں ضرور یہ غرض تھی۔ کہ بداندیشوں کی بدی سے محفوظ رہے۔

جب اچھا ہوا تو خدمتیں بجالانے لگا۔ چند روز کے بعد پتیالی[1] کا علاقہ ملا۔ کہ امیر خسرو کی ولادت گاہ ہے ٭

۹۷۴ھ میں مہدی قاسم خاں حج کو چلے۔ حسین خاں اس کے بھانجے بھی تھے۔ داماد بھی۔ حسنِ اعتقاد سے پہنچانے کو سمندر کے کنارے تک ساتھ گیا۔ پھرے ہوئے آتا تھا۔ جو دیکھا کہ ابراہیم حسین مرزا وغیرہ شہزادگانِ تیموری نے اُدھر کے شہروں اور جنگلوں میں آفت برپا کر رکھی ہے۔ ایک مقام پر غل ہوا۔ کہ شہزادہ مذکور فوج لئے لوٹتا مارتا چلا آتا ہے۔ یہ بالکل بے سر و سامان تھے۔ مقرب خاں ایک دکنی سردار کے ساتھ ستواس میں پناہ لی۔ قلعے میں ذخیرہ نہ تھا۔ گھوڑے اونٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ سب کاٹ کر کھا گئے۔ مقرب خاں کی کہیں سے مدد نہ پہنچی۔ ابراہیم مرزا ہر چند پیام بھیجتا تھا۔ قلعہ والوں کے سر پر شجاعت کھیل رہی تھی۔ کسی طرح صلح پر راضی نہ ہوتے تھے۔ اُدھر مقرب خاں کا باپ اور بھائی ہنڈیہ میں گھرا ہوا تھا۔ مرزا کی فوج نے ہنڈیہ کو توڑ ڈالا۔ اور بڈھے کا سر کاٹ کر بھیج دیا۔ مرزا نے اسے نیزے پر چڑھا کر مقرب خاں کو دکھایا۔ اہل قلعہ کو کہا کہ مقرب خاں کے اہل و عیال کا یہ حال ہوا۔ تم کس بھروسے پر لڑتے ہو۔ ہنڈیہ کے ٹھیکرے تو یہ موجود ہیں۔ مقرب خاں نے مجبور ہو کر شہر حوالے کر دیا۔ اور خود بھی جا کر سلام کیا۔ حسین خاں کو بھی قول و قرار دیکر امان دی اور قسم کھا کر باہر نکالا۔ یہ یکہ بہادرانہ بات کا پورا تھا۔ ہرگز نہ گیا۔ اور سامنے نہ گیا۔ کہ اپنے بادشاہ کے باغی کو سلام کرنا پڑیگا۔ اُس نے بہت کہا کہ میری رفاقت اختیار کرو۔ یہ ان سے کب ہو سکتا تھا۔ آخر اجازت دی کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ اکبر کو سب خبریں پہنچ گئی تھیں جب دربار میں آیا۔ خان زماں کی مہم درپیش تھی۔ اور قدر دانی و دلداری کے بازار گرم تھے۔ بہت عنایت کی۔ قلعہ بندی کی مصیبت نے کمال مفلس و بدحال کر دیا تھا۔ ۹۷۵ھ میں ۳ ہزاری منصب اور شمس آباد کا علاقہ بھی ملا۔

[1] دریائے گنگا کے کنارے تھا ٭

مگر سخاوت کی بدانتظامی اسے تنگدست ہی رکھتی تھی۔ وہ یہاں علاقے کا انتظام اور اپنی فوج کی درستی میں مصروف تھا۔ کہ اکبر نے خان زماں پر فوج کشی کی۔ اور یہ اُس کی تیسری دفعہ تھی۔ جس میں اکبر کا ارادہ تھا۔ کہ اب کی دفعہ ان کا فیصلہ ہی کر دے۔ اس فوج کشی میں جس قدر پھرتی تھی۔ اس سے زیادہ سنگینی اور استحکام تھا۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں اوّل لشکر کی ہراول اس کے نام ہوئی تھی۔ مگر چونکہ وہ ستواس سے قلعہ بندی اُٹھا کر آیا تھا۔ اور مفلس اور پریشان حال ہو رہا تھا۔ اس لئے دیر ہوئی۔ بادشاہ نے اس کی جگہ قیا خاں گنگ کو ہراول کیا۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں میں ان دنوں اس کے ساتھ تھا۔ شمس آباد میں ٹھیر گیا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا ؀

آزاد۔ اس مہم میں حسین خاں کے شامل نہ ہونے کا سبب یہی ہے۔ جو مُلّا صاحب نے کہا۔ لیکن یہ بھی عجب نہیں کہ وہ اور علی قلی خاں وغیرہ سب بیرم خانی اُمّت تھے۔ حسین خاں یکرُخہ سپاہی تھا۔ اور یہ جانتا تھا۔ کہ منافقان حسد پیشہ نے خواہ مخواہ اسے باغی کروایا ہے۔ اس لئے نہ چاہا۔ کہ اس مہم میں شامل ہو اور دوست کے منہ پر بے تقصیر تلوار کھینچے۔ اور دیکھنا وہ اس کی کسی لڑائی میں شامل نہیں ہوا ؀

میر معز الملک کی ہمراہی میں بہادر خاں کی لڑائی میں شامل تھے۔ محمد امین دیوانہ کہ وہ بھی خاص بیرم خاں کا پالا ہوا۔ ہراول کا سردار تھا۔ اور حسین خاں بھی اپنی فوج میں موجود تھے۔ مُلّا صاحب یہاں لکھتے ہیں بہت سے بہادر اس معرکے میں موجود تھے۔ مگر معز الملک کی بدمزاجی اور لارل ٹوڈرمل کے روکھے پن سے بیزار تھے۔ اُنہوں نے لڑائی میں تن نہ دیا۔ ورنہ سرمیدان خواری نہ ہوتی ؀

سنہ ۹۷۴ھ میں لکھنؤ کا علاقہ اس کی جاگیر میں تھا۔ کہ مہدی قاسم خاں ان کا خسر حج سے پھرا۔ بادشاہ نے لکھنؤ اس کی جاگیر میں دیدیا۔ حسین خاں اس علاقے کا اپنی جاگیر سے نکلنا نہ چاہتا تھا۔ ان کی مرضی یہ تھی کہ مہدی قاسم خاں خود بادشاہ سے کہیں اور لینے سے انکار کریں۔ اُس نے لے لیا۔ یہ بہت خفا ہوئے۔ اور آیہ ہذا فراق بینی و بینک پڑھا۔ اس طرح کہ قیامت پر دیدار جا پڑے۔ باوجودیکہ مہدی قاسم خاں کی بیٹی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس پر اس کے باپ کے جلانے کو اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کر لیا۔ اُسے پٹیالی میں رکھا۔ اور قاسم خاں کی بیٹی کو خیر آباد واس کے بھائیوں میں بھیجدیا۔ نوکری سے بیزار ہو گیا۔ اور کہا کہ اب خدا کی نوکری کرینگے۔ اور جہاد کر کے دین خدا کی خدمت بجا لائینگے ؀

کہیں سن لیا تھا۔ کہ اودھ کے علاقے سے کوہ شوالک میں داخل ہوں۔ تو ایسے مندر اور شوالے ملتے ہیں۔ کہ تمام سونے چاندی کی اینٹوں سے چُنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ لشکر تیار کر کے دامن کوہ میں داخل ہوا پہاڑیوں نے اپنے معمولی پیچ کھیلے۔ گاؤں چھوڑ دیئے۔ اور تھوڑی بہت مار پیٹ کے بعد اونچے اونچے پہاڑوں میں گھس گئے۔ حسین خاں بڑھتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ جہاں سلطان محمود کا بھانجا پیر محمد شہید ہوا تھا

اور شہیدوں کا مقبرہ موجود تھا۔ اُس نے شہیدوں کی پاک روحوں پر فاتحہ پڑھی۔ قبریں مسمار پڑی تھیں ان کا چبوترہ باندھا۔ آگے بڑھا۔ دُور تک نکل گیا۔ مقام جزائل پرجا پہنچا اور وہاں تک گیا۔ کہ جہاں **اجمیر دارالخلافہ** ان کا دو دن کی راہ رہ گیا۔

یہاں سونے چاندی کی کان ابریشم مشک اور تمام عجائب و نفائس و لائق تبت کے ہوتے ہیں۔ اس سرزمین کی قدرتی تاثیر ہے۔ نقارہ کی دمک لوگوں کے غل اور گھوڑوں کے ہنہنانے سے برف پڑنے لگتی ہے۔ چنانچہ یہی آفت برسنی شروع ہوئی۔ گھاس کے پتے تک نایاب ہو گئے۔ رسد کا رستہ بند تھا بھوک کے مارے لوگوں کے حواس جاتے رہے۔ حسین خاں دلاور کا دل اپنی جگہ بدستور قائم تھا۔ اُس نے لوگوں کے دل بہت بڑھائے۔ جواہرات اور خزانوں کے لالچ دیئے۔ سونے چاندی کی اینٹوں کی بھی کہانیاں سُنائیں۔ مگر سپاہی دل ہار چکے تھے۔ کسی نے قدم نہ اُٹھایا۔ اور اُسکے گھوڑے کی باگ پکڑ کر زبردستی کھینچ لائے۔ پھرتے ہوئے پہاڑیوں نے رستہ روکا۔ چاروں طرف سے اُمنڈ آئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کھڑے ہوئے۔ اور تیر برسانے شروع کئے۔ ان تیروں پر زہریلی ہڈیوں کی پیکان چڑھی تھی۔ پتھروں کی بارش تو ان کے نزدیک کچھ بات ہی نہ تھی۔ بڑے بڑے بہادر سورما شہید ہو گئے۔ جو جیتے پھرے وہ زخمی تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ مہینے بعد زہر کی تاثیر سے وہ مر بھی گئے۔

حسین خاں پھر دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر کو بھی افسوس ہوا۔ مگر اس نے عرض کی۔ مجھے کانت گولہ کا علاقہ جاگیر ملے کہ دامن کوہ ہے۔ میں اُن سے انتقام لئے بغیر نہ چھوڑونگا۔ درخواست منظور ہوئی۔ اُس نے بھی کئی دفعہ پہاڑ کے دامن کو ہلا ہلا دیا۔ مگر اندر نہ جا سکا۔ اور اپنے پُرانے پُرانے سپاہی جو پہلی دفعہ بچا کر لایا تھا۔ انہیں اب کی دفعہ موت کا زہر آب پلایا۔ پہاڑ کا پانی ایسا لگا کہ بن لڑے مر گئے۔

۹۸۰ھ میں کہ اکبر خانِ اعظم کی مدد کے لئے خود یلغار کر کے گیا تھا۔ میدان جنگ کی تصویر تم دیکھ چکے ہو رستم و اسفندیار کے معرکے آنکھوں میں پھر جاتے تھے۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ حسین خاں اس موقع پر پیش قدم تھا اور اکبر شمشیر زنی دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اُسی وقت بلوایا اور شمشیر خاصہ کہ جسے کاٹ اور گھاٹ کی خوبی سے اور جوہر دشمن کشی سے ہلاکی خطاب دیا تھا۔ انعام فرمائی۔

ابراہیم حسین مرزا لُوٹتا مارتا ہندوستان کی طرف آیا۔ کہ اکبر گجرات میں ہے ادھر میدان خالی ہے شاید کچھ بات بن جائے۔ حسین خاں کی جاگیر اُس وقت کانت گولہ ہی تھی۔ پٹیالی اور بداؤں کے سرکش دبانے آئے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ابراہیم کے آنے سے بھونچال آ گیا۔ مخدوم الملک اور راجہ بہار امل فتح پور میں وکیل مطلق تھے۔ دفعتہً ان کا خط حسین خاں کے پاس پہنچا۔ کہ ابراہیم دو جگہ شکست کھا کر دلی کی طرف میں پہنچا ہے اور یہ پایۂ تخت کا مقام ہے کہ خالی پڑا ہے۔ اُس فرزند کو چاہیئے۔ کہ جلد اپنے تئیں وہاں

پہنچائے۔ یہ ایسے معرکوں کے عاشق تھے خط دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رستے میں خبر لگی کہ راجہ اودیر جو ابتدائی جلوس اکبری سے ہمیشہ نواحی آگرہ میں رہزنی اور فساد کرتا رہتا ہے۔ اور قزاق بنا پھرتا ہے۔ اور بڑے نامی امیروں کے ساتھ سخت معرکے مار کے اچھے اچھے بہادروں کو ضائع کر چکا ہے۔ اس وقت فلاں جنگل میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ رمضان کی ۱۵ تھی۔ حسین خاں اور اُس کے لشکر کے لوگ روزے سے تھے اور بے خبر چلے جاتے تھے۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ کہ یکایک بندوق کی آواز آئی۔ اور فوراً لڑائی شروع ہو گئی راجہ اودیر نے جنگل کے گواروں کو ساتھ لیا تھا۔ درختوں پر تختے باندھ رکھے تھے۔ ڈاکو ان پر مزے سے بیٹھ گئے۔ اور جنگل پہاڑوں کو تیر و تفنگ کے منہ پر دھر لیا۔

لڑائی کے شروع ہوتے ہی حسین خاں کے زانو کے نیچے گولی لگی۔ ران میں دوڑ گئی۔ اور گھوڑے کی زین پر جا کر نشان دیا۔ اُسے ضعف آ گیا۔ چاہتا تھا کہ گرے مگر بہادری نے سنبھالا۔ مُلّا عبدالقادر بھی ساتھ تھے لکھتے ہیں۔ کہ میں نے پانی چھڑکا آس پاس کے لوگوں نے جانا روزہ کا ضعف ہے۔ میں نے باگ پکڑ کر چاہا کہ کسی درخت کی اوٹ میں لے جاؤں۔ آنکھ کھولی۔ خلاف عادت چیں بجبیں ہو کر مجھے دیکھا اور جھنجلا کر کہا کہ باگ پکڑنے کا کیا موقع ہے۔ بس اُتر پڑو۔ اُسے وہیں چھوڑ کر سب اُتر پڑے۔ ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی اور طرفین سے اتنے آدمی مارے گئے۔ کہ وہم بھی ان کے شمار میں عاجز ہے۔ شام کے قریب اس قلیل جماعت کے حال پر خدا نے رحم کیا۔ فتح کی ہوا چلی۔ اور مخالف اس طرح سامنے سے چلنے شروع ہوئے۔ جیسے بکریوں کے ریوڑ چلے جاتے ہیں۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں حرکت نہ رہی تھی۔ جنگل میں دوست دشمن غٹ پٹ ہو گئے۔ باہم پہچانتے تھے۔ اور ضعف کے مارے ایک کا ہاتھ ایک پر نہ اُٹھتا تھا۔ بعض مقبول اور مستقبل بندوں نے جہاد کا بھی ثواب لیا اور روزہ بھی رکھا۔ برخلاف فقیر کے کہ جب بے طاقت ہونے لگا۔ تو گھونٹ پانی بہم پہنچا کر گلا تر کیا۔ بعضے بیچاروں نے بے آبی سے جان دی۔ اچھے یار تھے کہ اچھی شہادت کو پہنچے۔

بڈھا سردار حسین خاں فتح پا کر کانت گولہ کو گیا۔ کہ سامان درست کرے اور علاقے کا بندوبست کرے۔ اتنے میں سُنا کہ حسین مرزا نواحی لکھنؤ میں سنبھل سے ۱۵ کوس پہنچے۔ سنتے ہی پالکی میں پڑ کر چل کھڑا ہوا مرزا بانس بریلی کو کترا گیا۔ اور وہ یلغار کر کے دوڑا۔ مرزا کو خان کی بہادری کا حال خوب معلوم تھا۔ لکھنؤ کے نواحی میں فقط سات کوس کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو خدا جانے۔ قسمت کا پاسا کس پہلو پڑتا۔ مگر جو حالت اس وقت حسین خاں کی اور لشکر کی تھی اس کے لحاظ سے مرزا نے غلطی کی جو نہ آن پڑا۔ اور بچ کر نکل گیا۔ حق یہ ہے کہ اُس کی دھاک کام کر گئی۔

حسین خاں سنبھل پر گیا۔ آدھی رات تھی۔ نقارے کی آواز پہنچی۔ پُرانے پُرانے سردار انبوہ لشکر لئے موجود

تھے جاتا کہ مرزا آن پہنچا۔ سب قلعے کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہے۔ اور مارے رعب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے آخر قلعے کے نیچے کھڑے ہوکر آواز دی کہ حسین خاں ہے تمہاری مدد کو آیا ہے۔ اُسوقت خاطر جمع ہوئی تو پیشوائی کو نکلے۔ دوسرے دن سب امرا کو جمع کرکے مشورت کی۔ سب کی رائے یہ تھی۔ کہ گنگا کے کنارے پر اہار کے قلعے میں اہار امرا بھی لشکر لئے بیٹھے ہیں۔ اُن کے ساتھ چل کر ملنا چاہیئے۔ اور جو صلاح ہو سو عمل میں آئے۔ حسین خاں نے کہا۔ بارک اللہ مرزا کہ یہ دُور دست ملک اور گنتی کے سوار دہیں یہانتک آن پہنچا۔ تمہارے پاس اضعاف مضاعف لشکر اور بیس تیس سردار پرانے سپاہی اور اسنبھل کے قلعے میں ہیں۔ اُدھر وہ قلعہ اہار والے سردار ہیں۔ کہ جمعیت بے شمار لیکر چوہے کی بلوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اب دو باتوں کا موقع ہے یا تو تم گنگا پار اُتر جاؤ۔ اہار والے پرانے بہادروں کو بھی ساتھ لو۔ اور مرزا کا رستہ روکو کہ پار نہ اُتر سکے۔ اور میں پیچھے سے آتا ہوں۔ جو کرے سو خدا۔ یا میں جھٹ پٹ پار اُتر جاتا ہوں۔ تم پیچھے سے دباؤ۔ کہ شہنشاہی دولت خواہی کا حق یہی ہے۔ اس پر ان میں سے ایک راضی نہ ہوا۔ ناچار جو سوار ساتھ تھے۔ انہیں کو لیکر بھاگا بھاگ اہار پر پہنچا۔ انہیں بھی باہر نکالنا چاہا۔ جب نکلے تو بہت ملامت کی اور جمع کرکے کہا کہ غنیم ولایت کے بیچ میں آن پڑا ہے۔ اور یہاں بدحواسی کا یہ عالم ہے۔ گویا لشکر میں خرگوش آگیا۔ اگر جلد جنبش کرتے ہو تو کچھ کام ہو جائیگا۔ زندہ ہاتھ آئیگا اور فتح تمہارے نام ہوگی۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمیں تو دلی کی حفاظت کا حکم تھا۔ ہم وہاں سے سمیٹتے ہوئے یہانتک لے آتے۔ خواہ مخواہ مقابلہ کیا ضرور ہے۔ خدا جانے انجام کیا ہو ⁂

ادھر مرزا امروہہ کو لوٹتا ہوا چوپالہ کے گھاٹ سے گنگا پار ہوا۔ اور لاہور کا رستہ پکڑا۔ حسین خاں مرزا پر دولت خواہی ثابت کرکے اُن سے جدا ہوا۔ اور گڑھ مکتیسر پر اس طرح جھپٹ کر آیا کہ حریف سے دست و گریبان ہو جائے۔ امرا میں سے جنہوں نے ساتھ دیا ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ تھا۔ پیچھے اہار والے امیروں کے بھی خط آئے کہ ذرا ہمارا انتظار کرنا کہ ۹ سے گیارہ اچھے ہیں۔ مرزا کے سامنے میدان خالی تھا۔ جیسے خالی شطرنج میں رُخ پھرتا ہے۔ اسی طرح مرزا پھرتا تھا۔ اور آباد شہروں کو لوٹتا مارتا چلا جاتا تھا۔ پائل نواح انبالہ میں فحش و فضیحت بندگان بیگناہ کے عیال کی حد سے گزر گئی۔ غرض حسین خاں پیچھے پیچھے دبائے چلا آتا تھا۔ اور اسکے پیچھے پیچھے امرا تھے۔ سرہند میں آکر سب رہ گئے۔ حسین خاں ہی لپٹا چلا آیا۔ اور سوار اسکے رفاقت میں سو سے زیادہ نہ تھے لودیانہ میں خبر پائی کہ لاہور والوں نے دروازے بند کر لئے۔ اور مرزا شیر گڑھ اور دیپالپور کو گیا ⁂

حسین قلی خاں بیرم خاں کا بھانجا۔ کانگڑہ کو گھیرے پڑا تھا اس نے مرزا کی آمد آمد سنتے ہی پہاڑیوں سے صلح کا ڈھنگ ڈالا۔ اُنہوں نے منظور کیا۔ بہت سے نقد و جنس جن میں پانچ من سونا تھا نعلبہا میں لیا۔ اور عہد کر لیا کہ سکہ خطبہ بادشاہی جاری رہیگا۔ چند نامی سردار اُس کے ساتھ تھے۔ جن میں راجہ بیربر بھی شامل تھے۔

سب کو لیکر سیل کی طرح پہاڑ سے اُترا۔ حسین خاں سُنتے ہی تڑپ گیا۔ اور قسم کھائی کہ جب تک حسین قلیخاں سے نہ جا لڑوں روٹی حرام ہے۔ یہ دیوانگی کہ ہزار درجہ ان ناقلوں کی عقلوں پر شرف رکھتی ہے۔ اُسے اُڑائے لئے جاتی تھی۔ جھنی دال علاقہ شیرگڈھ میں پہنچ کر شیخ داؤد جھنی وال سے کہ بڑے خدا رسیدہ فقیر تھے ملاقات کی کھانا آیا تو اُنہوں نے عذر بیان کیا۔ اُنہوں نے کہا۔ آزردنِ دلِ دوستاں جہل است و کفارہ یمین سہل۔ اِس خوش اعتقاد نے تعمیل حکم سعادت سمجھ کر اُسی وقت غلام آزاد کیا اور کھانا کھایا ۔

فاضل بداؤنی بھی اِس یلغار میں ساتھ تھے۔ کہتے ہیں کہ رات کو وہیں رہے۔ اور کل رسد کا سامان شیخ کے ہاں سے ملا۔ میں لاہور سے تیسرے دن وہاں پہنچا اور حضرت کی حضوری میں وہ کچھ آنکھوں سے دیکھا کہ خیال میں بھی نہ تھا۔ چاہا تھا کہ دُنیا کے کاروبار چھوڑ کر اُن کی جاروب کشی کیا کروں۔ مگر حکم ہوا کہ فی الحال ہندوستان جانا چاہئے۔ رخصت ہو کر بحالِ خراب و دلِ پریشاں کہ خدا کسی کو نصیب نہ کرے رخصت ہوا چلتے وقت نالہاے بے اختیار دل سے نکلے ؎

دلِ بے اُمید صدائے کہ در تو برسد	نالہا کرد دریں کوہ کہ فرہاد نہ کرد

حضرت کو خبر ہوئی۔ باوجودیکہ تین دن سے زیادہ کسی کو حکم نہ تھا۔ مجھے چوتھے دن بھی رکھا۔ بہت سے فیض پہنچائے اور ایسی ایسی باتیں کہیں کہ اب تک دل مزے لیتا ہے ؎

مہجورم سوئے وطن زدردِ دلِ بے اختیار	نالہ دارم کہ پنداری بہ غربت مہجورم

حسین قلی خان مرزا سے چھُری کٹاری ہوا جاتا تھا۔ حسین خاں اُس کے پیچھے تھا۔ تلنبہ ایک منزل رہا تھا۔ حسین قلیخاں کو خط لکھا کہ چار سو کوس یلغار مار کر یہاں تک آیا ہوں۔ اگر اِس فتح میں مجھکو بھی شریک کرو اور ایک دن لڑائی میں دیر کرو تو آثارِ محبت سے دُور نہ ہوگا۔ وہ بھی آخر بیرم خاں کا بھانجا تھا۔ یہ سُنتے ہی تا ہرا خوش باشد کہا۔ اور گھوڑے کو ایک قمچی اور کرگیا۔ اُسی دن مارا مار تلنبے کے میدان میں جہاں سے ملتان ۴۰ کوس رہتا ہے تلواریں کھینچ کر جا پڑا۔ مرزا کو اُس کے آنے کی خبر بھی نہ تھی۔ شکار کو گیا تھا۔ فوج کچھ کوچ کی تیاری میں تھی۔ بعضے بے سامان پریشان تھے۔ جنگ میدان کی لڑائی کا انتظام بھی نہ ہو سکا مرزا کا چھوٹا بھائی پیش دستی کرکے حسین قلی خان کی فوج پر آن پڑا۔ زمین کی ناہمواری سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا نوجوان لڑکا پکڑا گیا۔ مرزا اتنے میں شکار سے پھرے۔ اتنے میں کام ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ہرچند سپاہیانہ کوشش کیں اور مردانہ حملے کئے۔ کچھ نہ ہو سکا۔ آخر بھاگ نکلا۔ فتح کے دوسرے دن حسین خاں پہنچے۔ حسین قلی خاں نے میدانِ جنگ دکھایا۔ اور ہر ایک کی جانفشانی کا حال بیان کیا۔ حسین خاں نے کہا کہ غنیم جیتا نکل گیا ہے نہیں تعاقب کرنا چاہئے تھا۔ کہ جیتا پکڑ لیتے۔ کام ابھی ناتمام ہے۔ اُس نے کہا کہ نگر کوٹ یلغار کرکے آیا

ہوں لشکر نے وہاں بڑی بڑی محنتیں اُٹھائیں۔ اب ان میں طاقت نہیں رہی۔ یہی بڑی فتح تھی۔ حالا
نوبت یاران دیگر سست حسین خاں نے اِس اُمید پر کہ شاید اُس کی بھی نوبت آجائے اور ہمت پانسو کوس کی
یلغار کی بھول جائے۔ اُس سے رخصت ہو کر چلا۔ تھکے ماندے آدمیوں کو ہاتھی اور نقارہ سمیت لاہور بھیج دیا۔
اور آپ مرزا بیچارہ کے پیچھے چلا۔ جہاں بیاس اور ستلج ملتے ہیں۔ وہاں مرزا بدنصیب پر جنگل کے ڈاکوؤں نے
شبخون مارا۔ ایک تیر اُس کی گُدّی میں ایسا لگا کہ منہ میں نکل آیا۔ جب حال بہت بدحال ہوا۔ تو اس لچیں
بدلا ساتھی ساتھ چھوڑ چھوڑ کر الگ ہوئے۔ اور جدھر گئے مارے گئے۔ مرزا نے دو تین قدیمی غلاموں کے ساتھ
فقیرانہ لباس کیا اور شیخ ذکریا نام ایک گوشہ نشین کے پاس پناہ لی۔ وہ مُرشدِ کامل تھے۔ ظاہر میں رحم کا مرہم
دکھایا اندر اندر سعید خاں حاکم ملتان کو خبر دی۔ اس نے جھٹ اپنے غلام کو بھیجا۔ وہ قید کر کے لے گیا۔ حسین خاں
اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ گرفتاری کی خبر سنتے ہی ملتان پہنچے۔ سعید خاں سے ملے۔ اس نے کہا کہ مرزا سے
بھی ملو۔ حسین خاں نے کہا کہ ملاقات کے وقت اگر تسلیم بجالاؤں تو شہنشاہی کے اخلاص کے خلاف ہے
اور نہیں کرتا تو مرزا دل میں کہے گا کہ اِس راہ زن کو دیکھو۔ جب سنتو اس کے محاصرے میں ہم نے امان دیکر
چھوڑا تو کس کس طرح کی تسلیمیں کی تھیں۔ آج ہم اِس بدحالی میں ہیں تو پرواہ بھی نہیں کرتا۔ مرزا نے یہ
بے تکلفانہ بات سُن کر کہا کہ کیسے بے تسلیم ہی ملے۔ کہ ہم نے معاف کیا۔ مگر وہ جب گیا تو تسلیم بجالایا۔
مرزا افسوس کر کے کہتا ہے کہ میں سرکشی اور جنگ کا خیال نہ تھا جب جان پر بن گئی تو سر لے کر ملکِ بیگانہ میں
نکل آئے یہاں بھی نہ چھوڑا۔ قسمت میں تو یہ ذلت پہنچنی تھی۔ کاش تیرے سامنے سے بھاگتے کہ ہم جنس تھا۔ تجھ ہی
کو کچھ فائدہ ہوتا۔ حسین قلیخان کہ دین و مذہب سے بیگانہ ہے۔ اُس سے شکست کھانے کا افسوس ہے ؛

حسین خاں وہاں سے کانت گولہ یعنی اپنی جاگیر پر گئے۔ وہاں سے ادھر تو حسین خاں اُدھر حسین قلیخاں
دربار میں پہنچے۔ مسعود حسین مرزا کی آنکھوں میں ٹانکے لگائے۔ باقیوں میں سے ہر ایک کے رتبے کے بموجب
کسی کے مُنہ پر گدھے کی۔ کسی پر سور کی۔ کسی پر کُتّے کی۔ کسی پر بیل کی کھال سب چہروں اور سینگوں سمیت چڑھائیں
اور عجب مسخرا پن کے ساتھ دربار میں حاضر کیا۔ تین سو آدمی کے قریب تھے۔ مرزا کے ساتھیوں میں سے
تخمیناً سو آدمی تھے۔ کہ دھڑلے کے بہادر تھے۔ اور خانی اور بہادری کے خطاب رکھتے تھے۔ حسین قلی خاں سبکو
پناہ دیکر جاگیر پر لے گئے۔ وہاں خبر پائی کہ حضور میں ان کی خبر پہنچ گئی ہے۔ اس لئے سب کو رخصت کر دیا
آخر بیرم خاں کا بھانجا تھا۔ جب مفصل حال لڑائی کا بیان کیا تو ان لوگوں کے نام بھی لئے مگر کہا کہ قیدیوں کے باب
میں حضور سے قتل کا گناہ نہیں ہے۔ فدوی نے سب حضور کے صدقے میں چھوڑ دئے۔ اکبر نے بھی کچھ نہ کہا
اور حسین خاں سے بھی کچھ نہ پوچھا۔ حسین قلی خاں کو اُس کی نیک نیتی کا پھل ملا۔ کہ خان جہاں کا خطاب ملا ؛

۹۸۲ھ میں جبکہ پٹنہ پر مہم تھی۔ اور اکبر کو دل سے اس مہم میں اہتمام تھا منعم خاں خانخاناں کی سپہ سالاری تھی۔ بھوج پور کے علاقے میں بادشاہ دورہ کرتے پھرتے تھے۔ قاسم علی خاں کو بھیجا کہ بچشم جا کر معرکہ جنگ دیکھے اور ہر ایک جانفشانی کا حال عرض کرے۔ وہ واپس آیا اور سب حال بیان کیا حسین خاں کا حال پوچھا تو اُس نے کہا کہ چک خاں اس کا بھائی تو حق الخدمت بجا لا رہا ہے۔ مگر حسین خاں کانت گولہ سے اودھ میں آ کر لوٹتا پھرتا ہے۔ بادشاہ نہایت خفا ہوئے۔ اور انجام اس کا یہ ہوا کہ جب کچھ عرصہ بعد دورہ کرتے ہوئے دلی میں پہنچے۔ تو حسین خاں بھی پٹیالی اور بھونگاؤں میں آیا ہوا تھا۔ ملازمت کو حاضر ہوا معلوم ہوا کہ مجرا بند ہے۔ اور شہباز خاں کو حکم ہے کہ طناب دولتخانہ کی حد سے باہر نکال دو۔ اس قدیمی نمکخوار کو نہایت رنج ہوا سپاہی تھی اونٹ گھوڑے جو کچھ سامان امارت کا تھا سب لٹا دیا کچھ ہمایوں کے روضے کے مجاوروں کو دیا کچھ مدرسہ اور خانقاہوں کے غریبوں کو دیا اور کفنی گلے میں ڈال فقیر ہو گیا کہ اُسی نے مجھے لا کر رکھا تھا۔ وہی میرا قدردان تھا۔ اب میرا کوئی نہیں اُس کی قبر پر چھاؤنی ڈال کر دھگا۔ جب یہ خبر حضور میں پہنچی تو مہربان ہوئے شال خاصہ عنایت ہوئی اور ترکش خاص کا تیر پروانگی کے لئے دیا۔ کانت گولہ اور پٹیالی کی ایک کروڑ بیس لاکھ دام کی جاگیر ہوئی تھی حکم دیا کہ بدستور سابق مقرر رہے۔ اور کروڑی مداخلت نہ کرے۔ جب سوار داغ و محلہ پر حاضر کریگا تو باقی جاگیر تنخواہ کے لائق پائیگا۔ وہ لوٹ کھسوٹ سے ۱۰ سوار بھی نہ رکھ سکتا تھا۔ بسبب ضرورت فرقہ الود کرکے جاگیر پر پہنچا۔

۹۸۳ھ میں فاضل بداؤنی لکھتے ہیں حسین خاں کہ سپاہی پیشہ بہادروں میں سے تھا اس کے ساتھ معنوی علاقے کے ساتھ میرا رابطہ عظیم و قدیم تھا۔ اور خالصاً للہ محبت تھی۔ داغ و محلہ کی خدمت سپاہی کی گردن توڑنے والی اور لذتوں کو خاک میں ملانے والی ہے۔ آخر وہ بھی نہ کر سکا۔ چنانچہ ظاہری دلوانگی اور باطنی فرزانگی کے ساتھ جاگیر سے روانہ ہوا۔ رفیقان خاص کی جماعت جو طوفان آتش اور سیلاب بلا سے منہ توڑنے والی نہ تھی اور کسی طرح اس کی رفاقت نہ چھوڑ سکتی تھی۔ انہیں ساتھ لیا اور علاقوں کے زمیندار جنہوں نے جاگیرداروں کو خواب تک میں بھی نہیں دیکھا تھا انہیں پامال کرتا ہوا کوہ شمالی کا رخ کیا جس کا مدت العمر سے عاشق تھا سونے چاندی کی کانیں وہاں کی سامنے تھیں۔ اور اس وسیع دل میں نقرئی اور طلائی مندروں کا شوق تھا کہ جن میں عاذ بت سماتا تھا

بسنت پور ایک نہایت بلند اور مشہور جگہ ہے یہ تو وہاں پہنچا۔ یہاں جو زمیندار و کروڑی اس کے سامنے چوہے کے بلوں میں چھپ رہے تھے۔ انہوں نے اب مشہور کیا کہ حسین خاں باغی ہو گیا۔ اور یہی عرضیاں حضور میں بھی پہنچیں حضرت شہنشاہی نے بعض امراء سے دریافت کیا۔ زمانے کی وفاداری کو دیکھ کر جو لوگ قرابت قریبی رکھتے

تھے۔ اُنھوں نے کلمۂ حق سے پہلو بچایا اور کہا تو اور جو کچھ بولے بُرے ہی بولے۔

غرض یہاں تو اپنے بیگانگی عزرج کر رہے تھے۔ وہاں اس نے بسنت پور جا گھیرا اور بے قاعدہ محاصرہ ڈالا۔ بہت سے کار آزمودہ رفیق کام آئے اور خود شانہ کے نیچے کاری زخم کھایا ناچار ناکام وہاں سے پھرا۔ اور کشتی سوار دریائے گنگا کے رستے گڈھ مکتیسر میں پہنچا کہ تیاری جا کر اہل و عیال میں رہے اور علاج کرے مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ منعم خاں کے پاس چلا تھا کہ وہ حضور کا قدیمی بندہ خدمت گزار اور میرا یار ہے اسکے ذریعے سے خطا معاف کراؤنگا۔ صادق محمد خاں پھُرتی کر کے جا پہنچا اور قصبہ بار ہر پر جا پکڑا۔ جو کچھ متن میں ہے یہ مُلّا صاحب اُن کے نمک حلال دوست کی تحریر ہے۔ ابوالفضل اکبرنامے میں لکھتے ہیں کہ حسین خاں ملک لوٹتے پھرتے تھے۔ بادشاہ سن کر دوبارہ ناراض ہوئے۔ اور ایک سوار کو سادات بارہہ اور سادات امروہہ کی جمعیت سے روانہ کیا۔ وہ کچھ خوابِ مستی سے ہوش میں آیا کچھ زخم سے دل شکستہ ہو رہا تھا۔ بہر حال ہدایت کے رستے پر آیا۔ جراؤ باش ساتھ تھے۔ وہ فوج بادشاہی کی خبر سنتے ہی بھاگ گئے۔ خان نے ارادہ کیا کہ بجا منعم خاں خان خاناں اپنے قدیمی دوست سے ملے۔ اور اُسکی معرفت درگاہ میں توبہ کرے۔ گڈھ مکتیسر کے گھاٹ سے سوار ہو کر چلا تھا۔ کہ بارہہ کے مقام پر گرفتار ہوا۔

صادق محمد خاں ایک امیر تھا کہ فتح ہند سے بلکہ جنگِ قندھار سے نزاکت مزاج اور تعصبِ مذہب کے سبب حسین خاں کا اس کے ساتھ بگاڑ تھا۔ بموجب بادشاہ کے حکم کے اُس کے ہاں لاکر اُتارا اور شیخ بھنا طبیب بھی فتحپور سے علاج کے لئے آیا۔ دیکھکر حضور میں عرض کی زخم خطرناک ہے۔ حکیم عین الملک کو بھیجا۔ مجھے اُس سے پہلا سابقہ تھا۔ ساتھ ہی رخصت لیکر میں آیا۔ ملاقات کی۔ ایام گرما کی حسرت اور قدیمی محبتیں اور اندنول کی باتیں یاد آئیں۔ آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ آنسو بھر آئے اور دیر تک باتیں کچھ کچھ کہتے رہے۔

ہر جا من و او بجملہ ہم باز رسیدیم　　از بیم بد اندیش لبِ خویش گزیدیم
بے واسطۂ گوش و لب از راہِ دل و چشم　　بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

اتنے میں بادشاہی جراح پٹی بدلنے آئے۔ بالشت بھر سلائی چلی گئی زور سے کریدتے تھے۔ زخمیں زخم کہتا ہے وہ مردانہ پیش کر تورش کی طرح پیئے جاتا تھا تیوری پر بل نہ لاتا تھا۔ بے تکلف مسکراتا تھا اور باتیں کئے جاتا تھا۔

رویم شگفتہ از سخنِ تلخ مردم است　　زہر است در دہان و دلم در تبسم است

افسوس کہ دیدار قیامتی اور رخصت واپسیں تھی جب ہم فتحپور پہنچے تو تین چار دن بعد سُنا کہ اول اسہال ہوا پھر انتقال ہو گیا۔ جس سخی نے عالم عالم خزانے مستحقوں کو بخش دیئے اس کے پاس کچھ نہ تھا کہ دفن و کفن میں لگائیں خواجہ محمد یحییٰ نقشبندی کوئی بزرگ اس زمانے میں بڑے پیر مشہور تھے انہوں نے بڑی عزت و احترام سے مسکن غریباں میں پہنچایا۔

در خاک چگونہ خفتہ بتوانم دید	آنرا کہ مرا ز خاک برداشتہ بود

وہاں سے پٹیالی میں لاکر اُس گنج الٰہی کو زیرِ خاک کیا کہ وہیں اُس کے رشتہ دار دفن تھے۔ ملا صاحب نے گنج بخشی سے تاریخ نکالی ۹۸۳ھ۔ فاضل بداؤنی لکھتے ہیں۔ کہ جب اس کی وفات کی خبر پہنچی تو میر عدل اس دن بھکر کو روانہ ہوتے تھے۔ میں انہیں رخصت کرنے گیا اور یہ حال بیان کیا۔ زار زار روئے اور کہا کہ جو دُنیا میں رہے تو اس طرح رہے جیسے حسین خاں رہا ؎

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود	ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

اتفاق یہ کہ میر مرحوم سے بھی وہی ملاقات یادگار رہی۔ انہوں نے خود بھی کہا کہ سب یار چلے گئے دیکھئے پھر تمہیں ہم دیکھ سکیں یا نہیں۔ عجب بات مُنہ سے نکلی تھی کہ وہی ہوا ؎

تا دریں گلہ گوسفندے ہست	نہ نشیند اجل ز قصابی

فاضل مذکور نے اس سپاہی زادہ افغان کی دینداری۔ سخاوت اور بہادری کی اتنی تعریفیں لکھی ہیں کہ ان وصفوں کے ساتھ اگر پیغمبر نہیں تو اصحاب سے کسی طرح کم نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں جن دنوں لکھنؤ میں حاکم مستقل تھے تو ثقہ لوگوں سے سُنا گیا کہ دُنیا کی نعمتیں موجود تھیں مگر وہ جو کی روٹی کھاتے تھے فقط اس خیال سے کہ آنحضرت نے یہ مزے کے کھانے نہیں کھائے۔ میں کیونکر کھاؤں۔ پلنگ اور نرم بچھونوں پر نہ سوتے تھے۔ کہ حضرت نے اس طرح آرام نہیں فرمایا میں کیونکر ان آراموں سے لطف اُٹھاؤں۔ ہزاروں مسجدوں و مقبروں کی تعمیر اور ترمیم کروائی۔

کثرت علما و سادات و مشائخ اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ اسلئے سفر میں چارپائی پر نہ سوتا تھا تہجد کی نماز کبھی قضا نہیں کی۔ لاکھوں اور کروڑوں کی جاگیر کا مالک بنے میں اس کے خاصے کا ایک گھوڑے سے زیادہ نہ تھا۔ کبھی ایسا مستحق آجاتا تھا کہ وہ بھی لے جاتا تھا۔ اکثر سفر خود مقام میں پیادہ ہی رہ جاتا تھا۔ نوکر غلام اپنے گھوڑے کس کرلے آتے تھے۔ کسی شاعر نے قصیدہ کہا تھا۔ اس میں یہ مصرع بھی تھا اور واقعی سچ تھا ؎

خان مفلس غلام باسامان

قسم کھائی تھی کہ روپیہ جمع نہ کرونگا۔ کہتا تھا۔ جو روپیہ میرے پاس آتا ہے جب تک خرچ نہیں کر لیتا پہلو میں تیر سا کھٹکتا ہے۔ روپیہ علاقے پر سے آنے نہ پاتا تھا۔ وہیں چٹھیاں پہنچ جاتی تھیں اور لوگ لیجاتے تھے نذر مان رکھی تھی۔ کہ جو غلام ملک میں آئے پہلے ہی دن آزاد ہے۔ شیخ خیرآبادی اس زمانے میں ایک بزرگ گرامی تھے۔ وہ ایک دن کفایت شعاری کے فواید اور روپیہ کے جمع کرنے کے لیے نصیحت کرنے لگے جھنجھلاتے ہوکر جواب دیا۔ پیغمبر صاحب نے کبھی ایسا کیا ہے۔ حضرت امید تو یہ تھی۔ کہ اگر ہم پر حرص و ہوا غالب ہو تو آپ نصیحت کریں۔ نہ کہ دنیا کے اسباب کو ہماری نگاہوں میں جلوہ دیں ؎

فاضل مذکور کہتے ہیں۔ کہ وہ قوی ہیکل قد و قامت کی شان و شوکت سے بڑا دیدار و جوان تھا۔ میں ہمیشہ میدانِ جنگ میں اُس کے ساتھ نہیں رہا۔ مگر کبھی کبھی جو جنگلوں میں لڑائیاں ہوئیں تو موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے جو بہادری اس میں پائی۔ پہلوانوں کے نام افسانوں ہی میں دیکھی جاتی ہے۔ شاید اِن میں ہو تو ہو۔ جب لڑائی کے ہتیار سجتا تھا تو دُعا کرتا تھا الٰہی یا شہادت یا فتح۔ بعض شخصوں نے کہا کہ پہلے فتح کیوں نہیں مانگتے۔ جواب دیا کہ عزیزانِ گزشتہ کے دیکھنے کی تمنّا مخدومان موجود کے دیدار سے زیادہ ہے۔ سخی ایسا تھا کہ اگر جہان کے خزانے اور روئے زمین کی سلطنت اسے مِل جاتی۔ پھر بھی وہ پہلے ہی دن قرضدار نظر آتا۔

کبھی ایسا اِتفاق ہوتا تھا چالیس چالیس پچاس پچاس ایرانی مجنس ترکی گھوڑے سوداگر لائے ہیں فقط اِتنا کہہ کر کہ نودانی و غدا قیمت ہو گئی اور ایک ہی جلسے میں سب بانٹ دئے۔ اور جن کو نہیں پہنچے ان سے باخلاق تمام عذر کیا۔ میری پہلی ملاقات آگرہ میں ہوئی۔ پانسو روپے اور ایک ایرانی گھوڑا کہ اُسی وقت لیا تھا مجھے دیدیا۔

شاہ ہر روزم ندید و بے سخن صد لطف کرد	شاہ بزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد
کیا نہ کیجئے ع	ہر کرا ہر چہ ہست میگویند

جب مرا تو ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ قرض نکلا۔ چونکہ قرض خواہوں سے نیکی اور نیک معاملگی کرتا رہا تھا سب آئے۔ خوشی خوشی تمسک پھاڑے اور مغفرت کی دعائیں دیکر چلے گئے جسطرح اوروں کے وارثوں سے جھگڑے ہوتے ہیں اس کے بیٹوں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

مجھ سے ان کی تعریف کا حق کب ادا ہو سکتا ہے۔ مگر اِس لئے کہ نوجوانی عمر کی۔ بہار کا موسم ہوتا ہے۔ وہ اُسکی خدمت میں گزرا اور اُس کے التفات کی بدولت میری حالت نے بہت اچھی پرورش پائی۔ کہ شہرِ زمانہ اور انگشت نمائے جہانیان ہوا۔ اُسی کی تقریب سے یہ توفیق پائی کہ بندگانِ خدا کو علم و آگاہی کے فوائد پہنچا سکتا ہوں اس لئے اپنے دفتر میں بعض وصف اسکے کہے کہ ہزار میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑے ہیں افسوس ہے اسوقت پر کہ بڑھاپے کی خواری اور نحوست کی سرگردانی کا موسم ہے! اسی طرح کے خیالات سے کئی صفحے سیاہ کرکے کہتے ہیں۔ کہ ہم نے آپس میں عہدِ قدیم کو استحکام دیا تھا۔ خدا سے اُمید ہے کہ میرا اس کا حشر بھی ساتھ ہی ہو۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔ اللہ کے نزدیک یہ کچھ بڑی بات نہیں۔

ابو الفضل نے انہیں تین ہزاری کی فہرست میں لکھا ہے۔ اُن کا بیٹا یوسف خاں جہانگیر کے دربار میں امیر تھا۔ اُس نے مرزا عزیز کوکہ کے ساتھ دکن میں بڑی شجاعت دکھائی۔ وہ سنہ جہانگیری میں شاہزادہ پرویز کی مدد پر گیا تھا۔ یوسف خاں کا بیٹا عزت خاں تھا وہ شاہجہان کی سلطنت میں حقِ خدمت ادا کرتا تھا۔

مہیش داس راجہ بیربر

اِن کا نام اکبر کے ساتھ اِسی طرح آتا ہے۔ جیسے سکندر کے ساتھ ارسطو کا نام۔ لیکن جب اُن کی شہرت کو دیکھ کر حالات پر نظر کرو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقبال ارسطو سے بہت زیادہ لائے تھے۔ اصل کو دیکھو تو بھاٹ تھے۔ علم و فضل کو خود ہی سمجھ لو کہ بھاٹ کیا اور اُس کے علم و فضل کی بساط کیا۔ کتاب تو بالاتفاق رہی۔ آج تک ایسا اشلوک نہیں دیکھا۔ جو گنوان پنڈتوں کی سبھا میں فخر کی آواز سے پڑھا جائے ایک دُہرا نہ سنا کہ دوستوں میں دُہرایا جائے۔ لیاقت کو دیکھو تو ٹوڈرمل کُجا اور یہ کُجا۔ مہمات اور فتوحات کو دیکھو تو کسی میدان میں قبضہ کو نہیں چھوا۔ اُس پر یہ عالم ہے۔ کہ سارے اکبری نورتن میں ایک دانہ بھی اُن کے قدر و قربت سے لگا نہیں کھاتا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ اصلی نام مہیش داس تھا اور قوم برہمن اکثر کہتے ہیں۔ کہ بھاٹ تھے۔ برہیہ تخلص کرتے تھے۔ مُلا صاحب بھاٹ کے ساتھ برہمداس نام لکھتے ہیں۔ کالپی وطن تھا۔ اوّل رام چند ربھٹ کی سرکار میں نوکر تھے جس طرح اور بھاٹ شہروں میں پھرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی پھرا کرتے تھے۔ اور اسی طرح کے کبت کہا کرتے تھے۔

ابتدائے جلوس میں کہیں اکبر سے مل گئے تھے۔ قسمت کی بات تھی۔ خدا جانے کیا بات بادشاہ کو بھا گئی۔ باتوں ہی باتوں میں کچھ سے کچھ ہو گئے۔

بیشک قربت اور مصاحبت کی حیثیت سے کوئی عالیجاہ امیر اور جلیل القدر سردار اُن کے رُتبہ کو نہیں پہنچتا۔ لیکن تاریخ سلطنت کے سلسلہ میں جو تعلق اُنہیں ہے۔ وہ نہایت تھوڑا نظر آتا ہے۔

(ذرا دیکھنا۔ مُلا صاحب اُن کا حال کس طرح لکھتے ہیں) ۹۸۰ھ میں نگر کوٹ حسین قلی خاں کی تلوار پر فتح ہوا۔ شرح اِس قصہ کی مجملاً یہ ہے۔ کہ بادشاہ کو لڑکپن سے برہمنوں بھاٹوں اور اقسام طوائف ہنود کی طرف میلانِ خاطر اور التفات خاص تھا۔ اوائل جلوس میں ایک برہمن بھاٹ منگتا برہم داس نام کالپی کا رہنے والا کہ ہنود کے گن گانے اُس کا پیشہ تھا۔ لیکن بڑا مُتر تا۔ اور سیانا تھا۔ اُس نے ملازمت میں آکر تقرب و ہم زبانی کی بدولت مزاج میں دخل پیدا کیا۔ اور ترقی کرتے کرتے منصب عالی کو پہنچ کر یہ عالم ہوا۔ ع

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

اوّل کب رائے (کوی کبت کہنے والا۔ کب رائے۔ کبت کہنے والوں کا راجہ گویا ملک الشعرا) پھر راجہ بیربر خطاب ہوا۔

بنیاد اس مہم کی یہ تھی کہ بادشاہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر کانگڑہ کی فتح کا حکم دیا۔ اور راجہ بیربر بنا کر ملکِ مذکور اِن کے نام کر دیا۔ حسین قلی خاں کو فرمان بھیجا۔ کہ کانگڑہ پر قبضہ کر کے راجہ بیربر کی جاگیر کردو مصلحت اِس میں یہی ہوگی۔ کہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ برہمن کا نام درمیان رہے حسین قلی خان نے امرائے پنجاب کو جمع کیا۔ لشکرا ور توپخانے فراہم کئے۔ قلعہ کشائی اور پہاڑ کی چڑھائی کے سامان ساتھ لئے۔ راجہ جی کو نشان کا ہاتھی بنا کر آگے رکھا اور روانہ ہوا۔ سپہ سالار جس عرق ریزی سے گھاٹیوں میں اترا اور چڑھائی پہ چڑھا۔ اس کے بیان میں مورخوں کے قلم لنگڑے ہوتے ہیں۔ غرض کہیں لڑائی کہیں رسائی سے کانگڑہ پر جا پہنچا۔ **آزاد**۔ ایسی محنت اور جانکاہی کے مقاموں میں راجہ جی کیا کرتے ہوں گے؟ چلاتے اور غل مچاتے ہونگے۔ سخر اپن کے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہونگے قلیوں اور مزدوروں کو گالیاں دیتے ہونگے۔ اور ہنسی ہنسی میں کام نکالتے ہونگے۔ کانگڑہ کا محاصرہ بڑی سختی کے ساتھ ہوا۔ اِس فوج میں کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی شامل تھے۔ دھاوے کے جوش میں جو سختیاں ہوئیں۔ اِس میں راجہ جی بہت بدنام ہوئے چونکہ پنجاب پر ابراہیم مرزا باغی ہو کر چڑھ آیا تھا۔ اِس لئے حسین قلیخان نے صلح کر کے محاصرہ اُٹھایا۔ راجہ کانگڑہ نے بھی غنیمت سمجھا۔ اِس لئے جو شرطیں پیش کیں۔ خوشی سے منظور کیں۔ چوتھی شرط پر سپہ سالار نے کہا کہ حضور سے یہ ولایت راجہ بیربر کو مرحمت ہوئی تھی۔ اُن کے لئے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی منظور ہوا اور جو کچھ ہوا۔ اتنا ہوا جس میں ترازو کی تول فقط پانچ مَن سونا بوزن اکبری رکھا گیا۔ اور ہزاروں روپیہ کے عجائب و نفائس بادشاہ کے لئے۔ بیربر جی کو اور جھگڑوں سے کیا غرض تھی۔ اپنی دکشنا لے لی اور گھوڑے پر چڑھ کر ہوا ہوئے۔ اکبر گجرات احمد آباد کی طرف مارا مار کوچ کو تیار تھا اُسے سلام کیا اور اسپیں دَنیتے لشکر میں شامل ہو گئے۔

آواخر سنہ ۹۹۱ھ میں راجہ بیربر نے ضیافت کے لئے عرض کیا۔ اور بادشاہ منظور فرما کر اُن کے گھر گئے۔ وہی چیزیں جو کبھی کبھی عنایت کی تھیں۔ حاضر کیں۔ نقد کو نثار کیا۔ باقی پیشکش کر دیا۔ اور منہ جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

آزاد۔ صورت حال اور ہوگی۔ عجب نہیں کہ اہلِ دربار اور اہلِ خلوت نے اُن پر تقاضے شروع کئے ہوں۔ کہ سب امرا حضور کی ضیافت کرتے ہیں۔ تم کیوں نہیں کرتے ہو۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ

او ر لڑائیوں پر جاتے تھے۔ ملک مارتے تھے۔ حکومتیں کرتے تھے۔ دولتیں کماتے تھے۔ انعام و اکرام بھی پاتے تھے۔ وہ بادشاہ کی ضیافتیں کرتے تھے۔ تو شاہانہ جاہ و جلال سے گھر سجاتے تھے۔ جس کی ادنےٰ بات یہ کہ سوا لاکھ روپیہ کا چبوترہ باندھتے تھے۔ مخمل و زربفت و کمخواب راہ میں پا انداز بچھاتے تھے۔ جب قریب پہنچتے تھے۔ تو سونے چاندی کے پھول برساتے تھے۔ دروازے پر پہنچتے تھے۔ تو موتی طبق کے طبق نچھاور کرتے تھے۔ لاکھوں روپے کے تحائف جنمیں لعل جواہر۔ شالیں۔ مخمل ہائے زربفت۔ بیش بہا۔ لونڈیاں حسین۔ غلام صاحب جمال۔ ہاتھی گھوڑے کہاں تک تفصیل لکھوں خلاصہ یہ کہ جو کماتے تھے سو لٹاتے تھے۔ راجہ بیربر کے لئے یہ رستے بند تھے۔ اُنہوں نے منہ سے کچھ نکہا۔ جو کچھ اُنہوں نے دیا تھا۔ وہی ان کے سامنے رکھکر کھڑے ہو گئے۔ مگر وہ منہ ملنے والے نہ تھے۔ کچھ نہ کچھ کہا بھی ہو گا۔ وہ تو حاضر جوابی کی پھلجھڑی تھے۔ آزاد ہوتا تو اتنا ضرور کہتا۔ کہ عطائے شما بہ لقائے شما۔ ع

ہرچہ ز ایشاں میرسد آخر بدیشاں میرسد

بیربر دربار سے لے کر محل تک ہر جگہ ہر وقت رمے ہوئے تھے۔ اور اپنی دانائی اور مزاج شناسی کی حکمت سے ہر بات پر حسب مراد حکم حاصل کرتے تھے۔ اسی واسطے راجہ اور مہاراجہ امراء و خوانین لاکھوں روپے کے تحفے بھیجتے تھے۔ بادشاہ بھی اکثر راجاؤں کے پاس انہیں سفیر کر کے بھیجتے تھے۔ یہ نہایت زیرک اور دانا تھے۔ کچھ تو قومی قربت سے کچھ منصب سفارت سے کچھ اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے وہاں بھی جا کر گھل مل جاتے تھے۔ اور وہ کام نکال لاتے تھے۔ کہ لشکروں سے نہ نکلتے تھے ۹۸۰ھ میں بادشاہ نے رائے لون کرن کے ساتھ راجہ ڈونگر پور کے پاس بھیجا۔ راجہ اپنی بیٹی کو حرم سرائے اکبری میں داخل کیا چاہتا تھا۔ مگر بعض باتوں سے رُکا ہوا تھا۔ اُنہوں نے جاتے ہی ایسا منتر مارا۔ کہ سب سوچ بچار بھلا دیئے۔ ہنستے کھیلتے مبارک سلامت کرتے سواری لے آئے ؎

۹۹۱ھ میں زین خاں کوکہ کے ساتھ راجہ رام چند کے دربار میں گئے۔ بیر بھدر اُس کا بیٹا آنے میں اندیشہ کرتا تھا۔ انہوں نے اُسے بھی باتوں میں لبھا لیا۔ اسی طرح وغیرہ وغیرہ ؎

اسی سنہ میں راجہ بیربر پر سے بڑی کل بل ٹلی۔ اکبر نگر چین کے میدان میں چوگان بازی کر رہے تھے۔ راجہ جی کو گھوڑے نے پھینک دیا۔ خدا جانے صدمہ سے بیہوش ہو گئے۔ یا مسخرا پن سے دم چرا گئے۔ پکارا۔ پکارا۔ بڑی محبت سے سر سہلایا۔ اور اٹھوا کر گھر بھجوایا ؎

اسی سنہ میں ایک دن میدان چوگان بازی میں بادشاہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہ اور تماشا ہو گیا۔ دل چاچرہ ہاتھی سرشوری اور بدمزاجی میں مشہور تھا کہ یکایک پیادوں پر

دوڑ پڑا۔ وہ بھاگے دل چاچیر اُن کے پیچھے بھاگا جاتا تھا۔ کہ بیر بر سامنے آگئے۔ انہیں چھوڑ کر ان پر جھپٹا۔ راجہ جی میں بھاگنے کے اوسان بھی نہ رہے۔ بدن کے لدھڑ۔ عجب عالم ہوا اور ا بنوہ خلائق میں غل اُٹھا۔ اکبر گھوڑا مار کر خود بیچ میں آگئے۔ راجہ جی لڑگرتے پڑتے۔ ہانپتے کانپتے بھاگ گئے۔ ہاتھی چند قدم بادشاہ کے پیچھے آکر تھم گیا۔ واہ رے اکبر تیرا اقبال!

سواد اور باجوڑ کا علاقہ ایک وسیع ملک پشاور کے مغرب میں ہے۔ اُس کی خاک ہندوستان کی طرح زرخیز اور بارآور ہے۔ اور آب ہوا کا اعتدال اور موسم کی سردی اس پر اضافہ۔ شمال میں سلسلہ ہندوکش۔ مغرب میں کوہ سلیمان کا زنجیرہ۔ جنوب میں خیبر کی پہاڑیاں ہیں۔ کہ دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں یہ علاقہ بھی ایک حصہ افغانستان کا ہے۔ یہاں کے تناور اور دلاور افغان یُزدُرانی کہلاتے ہیں ملک کی حالت نے انہیں سرشور اور سینہ زور بنا کر اپنی قوموں میں ممتاز کیا ہے۔ اور ہندوکش کی برفانی چوٹیوں تک چڑھا دیا ہے۔ علاقہ مذکور میں تیس تیس چالیس چالیس میل کے میدان یا وادیاں ہیں اور ہر میدان میں سے پہاڑوں کو چیر کر درے نکلتے ہیں۔ یہ اور میدانوں اور وادیوں سے ملتے ہیں۔ کہ ہوا کی لطافت۔ زمین کی سبزی۔ پانی کی روانی میں کشمیر کو جواب دیتی ہیں یہ وادیاں یا تو دروں پر ختم ہوتی ہیں۔ جن کے گرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ یا گھنے گھنے جنگلوں میں جا کر غائب ہو جاتی ہیں۔ ایسا ملک حملہ آوروں کے لئے سخت دشوار گزار ہوتا ہے۔ مگر وہاں کے لوگوں کے لئے کچھ بات ہی نہیں۔ چڑھائی اُترائی کے مشاق ہیں۔ رستے جانتے ہیں۔ جھٹ ایک وادی سے دوسری وادی میں جا نکلتے ہیں۔ کہ جہاں ناواقف آدمی دنوں بلکہ ہفتوں تک پہاڑوں میں ٹکراتا پھرے۔

اگرچہ وہاں کے افغان سرشوری اور راہزنی کو اپنا جوہر قومی سمجھتے ہیں لیکن ایک حکمتی شخص نے پیری کا پردہ تان کر اپنا نام پیر روشنائی رکھا اور خیلہائے مذکورہ سے بہت جاہلوں کو فراہم کر لیا۔ کوہستان مذکور جس کا ایک ایک قطعہ قدرتی قلعہ ہے۔ ان کے لئے پناہ ہو گیا۔ وہ کنار اٹک سے لیکر پشاور اور کابل تک رستہ مارتے تھے۔ اور لوٹ مار سے آبادیوں کو ویران کرتے تھے۔ بادشاہی حاکم فوجیں لے کر دوڑتے تو وہ سینہ زوری سے سرتوڑ مقابلہ کرتے۔ اور دبتے تو اپنے پہاڑوں میں گھس جاتے۔ ادھر یہ لوگ پھرے۔ ادھر سے وہ پھر نکلے اور پیچھا مار کر فتح کو شکست کر دیا۔ ۹۹۳ھ میں اکبر نے چاہا کہ اُن کی سخت گردنوں کو توڑ ڈالے۔ اور ملک کا پورا بندوبست کرے۔ زین خاں کوکلتاش کو چند اُمرا کے ساتھ فوجیں دے کر روانہ کیا۔ وہ لشکر شاہی اور سامان کوہ کشائی اور رسد کے رستے کر کے ملک میں داخل ہوا۔ پہلے باجوڑ پر ہاتھ ڈالا۔

میرے دوستو! یہ کوہستان ایسا بے ڈھنگا ہے۔ کہ جن لوگوں نے اُدھر کے سفر کئے ہیں وہی وہاں کی مشکلوں کو جانتے ہیں۔ ناواقفوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب پہاڑ میں داخل ہوتے ہیں تو پہلے زمین تھوڑی تھوڑی چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھر دُور سے ابر سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے سامنے دائیں سے بائیں تک برابر چھایا ہوا ہے۔ اور اُٹھتا چلا آتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی قطاریں نمودار ہوتی ہیں اُن کے بیچ میں سے گھُس کر آگے بڑھے۔ تو اُن سے اُونچی اُونچی پہاڑیاں شروع ہوئیں۔ ایک قطار کو لانگھا۔ تھوڑی دُور چڑھتا ہوا میدان اور پھر وہی قطار آگئی۔ یا تو دو پہاڑ بیچ میں سے پھٹے ہوئے ہیں۔ (دَرہ) اِن کے بیچ میں سے نِکلنا پڑتا ہے۔ یا کسی پہاڑ کی کمر پر سے چڑھتے ہوئے اوپر ہو کر پار اُتر گئے۔ چڑھائی اور اُترائی ہیں۔ اور پہاڑ کی دھاروں پر۔ دونو طرف گہرے گہرے گڑھے نظر آتے ہیں۔ کہ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں بہکا اور گیا۔ پھر تحت الثریٰ سے وَرے ٹھکانا نہیں۔ کہیں میدان آیا۔ کہیں کوس دو کوس جس طرح چڑھے تھے۔ اُسی طرح اُترنا پڑا۔ کہیں برابر چڑھتے گئے۔ رستے میں جا بجا دائیں بائیں درے آتے ہیں۔ کہیں اور طرف کو رستہ جاتا ہے۔ اور اُن دروں کے اندر کوسوں تک برابر خلقِ خدا پڑی بستی ہے۔ جن کا کسی کو حال معلوم نہیں۔ کہیں دو پہاڑیوں کے بیچ میں کوسوں تک گلی گلی چلے جاتے ہیں۔ غرض سرا بالا (چڑھائی) سرا شیب (اُترائی) کمر کوہ (چڑھائی کے بیچ میں جو پہاڑ کے پہلو بہ پہلو راہ ہو) گریبانِ کوہ (پہاڑ میں شگاف ہو) تنگی کوہ (دو پہاڑ کے بیچ میں جو گلی جاتی ہو) تیزی کوہ (پہاڑ کی دھار پر جو رستہ چلتا ہو) دامن کوہ (پہاڑ کے آتا سکا میدان) اِن الفاظ کے معنے وہاں جا کر کھل سکتے ہیں۔ گھر میں بیٹھے تصور کریں تو سمجھ میں نہیں آسکتے۔

یہ تمام پہاڑ بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے درختوں سے چھائے ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں پانی کے چشمے اوپر سے اُترتے ہیں۔ زمین پر کہیں مہین مہین اور کہیں نہر ہو کر بہتے ہیں۔ کہیں دو پہاڑیوں کے بیچ میں ہو کر بہتے ہیں۔ کہ پُل یا کشتی بغیر پار اُترنا مشکل ہے اور چونکہ پانی بلندی سے گرتا آتا ہے۔ اور پتھروں میں ٹکراتا ہوا بہتا ہے۔ اس لئے اس زور سے جاتا ہے۔ کہ پایاب گزرنا ممکن نہیں۔ گھوڑا ہمت کرے۔ تو پتھروں پر سے پاؤں پھسلتے ہیں ایسے بے ڈھنگے رستوں میں اور تمام دائیں بائیں دروں میں اور دامانِ کوہستان میں افغان آباد ہوتے ہیں۔ دُنبوں اور اُونٹوں کی پشم کے کمل۔ نمدے۔ شطرنجیاں اور ٹاٹ بُنتے ہیں ان کی چھوٹی چھوٹی تمبوٹیاں کھڑی کر لیتے ہیں۔ دامنِ کوہ میں کوٹھے کوٹھریاں ڈال لیتے ہیں۔ وہیں کھیتی کرتے ہیں۔ جنگلوں کے سیب

یہی۔ ناشپاتی اور انگور اُن کے قدرتی باغ ہیں۔ وہی کھاتے ہیں اور مزے سے جیتے ہیں۔ جب کوئی بیرونی دشمن حملہ کرتا ہے۔ تو سامنے ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر نقارہ بجاتے ہیں۔ جہاں جہاں تک آواز پہنچی۔ ہر شخص کو پہنچنا واجب ہے۔ دو دو تین تین وقت کا کھانا۔ کچھ روٹیاں پیٹھ اُٹے گھر سے باندھے۔ ہتھیار لگائے اور آن موجود ہوئے۔ جب وہ ٹڈی دل سامنے پہاڑیوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے تو بادشاہی لشکر جو میدان کے لڑنے والے ہیں۔ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں اور جب خیال آتا ہے۔ کہ کتنے اور کیسے پہاڑ ہم طے کر کے یہاں تک آئے ہیں پیچھے تو وہ رہے۔ اور آگے یہ بلا۔ نہ زمین کے نہ آسمان کے۔ اُس وقت خدا یاد آتا ہے۔

جس وقت مقابلہ ہوتا ہے۔ تو افغان نہایت بہادری سے لڑتے ہیں۔ جب دھاوا کرتے ہیں تو توپوں پر آن پڑتے ہیں۔ لیکن بادشاہی لشکروں کے سامنے تھم نہیں سکتے۔ جب دبتے ہیں تو پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور دائیں بائیں کے دروں میں گھس جاتے ہیں۔ وہ قوی ہیکل اور طاقت مند ہوتے ہیں۔ ویس کے لوگوں کو فقط اونچی زمین پر چڑھنا ہی ایک مصیبت نظر آتی ہے۔ اُن کا یہ عالم ہے کہ سر میں یا دل و جگر میں گولی یا تیر لگ گیا تو گر پڑے۔ بازو ران ہاتھ پاؤں میں لگے تو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ بندر کی طرح درختوں میں گھستے۔ پہاڑوں پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس عالم میں گولی لگی۔ بہت ہوا تو ہاتھ مارا۔ ذرا کھجا لیا۔ جیسے بھڑ نے ڈنک مارا۔ بلکہ مچھر نے کاٹا۔

بڑی مشکل جو بادشاہی لشکروں کو پیش آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جتنا آگے بڑھتے ہیں۔ نادان جانتے ہیں۔ کہ میدان سامنے کھلا۔ اور حقیقت میں موت کے منہ میں گھستے جاتے ہیں۔ وہ افغان جو سامنے ہٹ کر آگے بھاگ گئے تھے یا دائیں بائیں دروں میں گھس گئے تھے۔ پہاڑیوں کے پیچھے جا کر اوپر چڑھ آتے ہیں۔ اور دروں کے اندر کی مخلوق بھی آن پہنچتی ہے۔ اُوپر سے گولیاں اور تیر برساتے ہیں۔ ورنہ پتھر۔ اور حقیقت تو یہ ہے۔ کہ ایسے موقع پر جہاں فوج سمجھ چکی تھی۔ کہ میدان صاف کر کے آگے بڑھے ہیں اُن کا فقط غل مچانا کافی ہوتا ہے۔ اور سامنے کی لڑائی تو کہیں گئی ہی نہیں وہ میدان تو ہر وقت طیار ہے جیتا گھر میں آٹا بندھا ہے۔ لڑ رہے ہیں۔ ہو چکا۔ گھروں کو بھاگ گئے۔ کچھ رہ گئے۔ کچھ اور کھانا باندھ لائے کچھ اور نئے آن شامل ہوئے۔ غرض بادشاہی لشکر جتنا آگے بڑھے۔ اور پچھلی مسافت زیادہ ہو اتنا ہی گھر کا رستہ بند ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ بند ہوا تو سمجھ لو کہ خبر بند۔ رسد بند۔ گویا سب کام بند۔

زین خان نے لڑائی کی شطرنج بہت اسلوب سے پھیلائی۔ اور بادشاہ کو لکھا کہ لشکر اقبال کے بڑھنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ افغانوں کے بڈھے بڈھے سردار چادریں گلے میں ڈال کر عفو تقصیر کیلئے حاضر

ہو گئے ہیں۔ لیکن جو مقامات قابلِ احتیاط ہیں۔ اُن کے لئے اور لشکر مرحمت ہونا چاہیئے۔ اس وقت بیربر کا جہاز عمر کی مرادوں کی ہوا میں بھرا چلا جاتا تھا۔ دفعتہً گرداب میں ڈوبا۔ دربار میں امر تجویز طلب تھا کہ کس امیر کو بھیجنا چاہیئے۔ جو ایسے کڈھب رستوں میں لشکر کو لے جائے اور پیچیدہ صورتوں کو جو وہاں پیش آئیں۔ سلیقہ کے ساتھ سنبھالے۔ ابوالفضل نے درخواست کی کہ فدوی کو اجازت ہو۔ بیربر نے کہا۔ غلام۔ بادشاہ نے قرعہ ڈالا۔ موت کے فرشتے نے بیربر کا نام سامنے دکھایا۔ اُسکے چٹکلوں اور لطیفوں سے بادشاہ بہت خوش ہوتے تھے۔ اور ایک دم بھی جدائی گوارا نہ تھی۔ لیکن خدا جانے کسی جوتشی نے کہہ دیا یا خود ہی خیال آگیا کہ یہ مہم بیربر کے نام فتح ہوگی۔ ہرچند جی نہ چاہتا تھا۔ مگر مجبوراً اجازت دی۔ اور حکم دیا کہ خاصہ کا توپخانہ بھی ساتھ چاہیئے۔ انداز محبت خیال کرو کہ جب رخصت ہونے لگا۔ تو اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیربر جلدی آنا۔ جس دن روانہ ہوا۔ شکار سے پھرتے ہوئے خود اس کے خیموں میں گئے۔ اور بہت سی نشیب و فراز کی باتیں سمجھائیں۔ یہ فوج وافی اور سامان کافی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ڈوک کی منزل میں پہنچے تو سامنے ایک تنگی تھی۔ افغان دونو طرف پہاڑوں پر چڑھ کھڑے ہوئے۔ بیربر تو دُور سے کھڑے غل مچاتے رہے۔ مگر اور امرا زور دے کر بڑھے پہاڑ کے جنگلی بے سروپا وحشی ہوتے ہیں۔ اُن کی حقیقت کیا ہے۔ مگر اُنہوں نے اس شدت سے اور سختی سے فوج شاہی کا سامنا کیا کہ اگرچہ بہت سے افغان مارے گئے۔ مگر بادشاہی فوج بھی بہت سی بھاری چوٹیں کھا کر ہٹی اور چونکہ دن کم رہ گیا تھا۔ واجب ہوا کہ دشت کو اُلٹے پھر آئیں ۔

بادشاہ بھی سمجھتے تھے۔ کہ مسخرے بھاٹ سے کیا ہونا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد حکیم ابوالفتح کو بھی فوج دے کر روانہ کیا تھا۔ کہ دشت میں پہنچ کر وہاں کی فوج کو لینا۔ اور کوہ ملکند کی گھاٹی سے نکل کر زین خاں کے لشکر میں جا ملنا۔ زین خاں اگرچہ ہندوستان کی ہوا میں سرسبز ہوا تھا۔ لیکن سپاہی زادہ تھا۔ اُس کے باپ دادا اُسی خاک سے اُٹھے تھے۔ اور اُسی خاک میں تلواریں مارتے اور کھلتے دنیا سے گئے تھے۔ وہ جب ملک باجوڑ میں پہنچا تو جاتے ہی چاروں طرف لڑائی پھیلا دی۔ ایسے دھاوے کئے۔ کہ پہاڑ میں بھونچال ڈال دیا۔ ہزاروں افغان قتل کئے۔ اور قبیلے کے قبیلے گھیر لئے۔ بال بچے قید کر لئے۔ اور ایسا تنگ کیا کہ اُنکے ملک و سردار طنابیں گلے میں ڈال ڈال کر آئے کہ اطاعت کیلئے حاضر ہو گئے ہیں ۔

زین خاں اب ولایت سواد کی طرف متوجہ ہوا۔ افغان سامنے کے ٹیلوں اور پہاڑیوں سے ٹڈیوں کی طرح اُمنڈ کر دوڑے۔ اور گولیاں اور پتھر اولوں کی طرح برسانے شروع کئے۔ ہراول کو ہٹنا پڑا مگر مقدمہ کی فوج نے ہمت کی کہ ڈھالیں مُنہ پر لیں۔ اور تلواریں سونت لیں۔ غرض جس طرح ہوا تنگی سے

نکل گئی۔ انہیں دیکھ کر اوروں کے دلوں میں بھی ہمت کا جوش سرسرایا۔ غرض کہ جس طرح ہوا فوج اوپر چڑھ گئی۔ اور افغان بھاگ کر سامنے کے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ زین خاں اوپر جا کر پھیلا۔ چکدرہ میں چھاؤنی ڈال کر گرد مورچے تیار کئے۔ اور قلعہ باندھ لیا۔ چونکہ چکدرہ ولایت مذکور کا بیچوں بیچ مقام ہے۔ اور یہاں سے ہر طرف زور پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے سامنے کراکر کا پہاڑ اور بنیر کا علاقہ رہ گیا باقی سب ضلع قبضہ میں آگیا۔

اسی عرصہ میں راجہ بیربر اور حکیم بھی آگے پیچھے پہنچے۔ اگرچہ راجہ کی اور زین خاں کی پہلے سے چشمک تھی۔ لیکن جب اِن کے آنے کی خبر پہنچی تو حوصلہ سپہ سالاری کو کام میں لایا۔ استقبال کرکے آیا۔ اور رستے ہی میں ان سے آکر ملا۔ صفائی اور گرمجوشی سے باتیں کیں۔ پھر آگے بڑھ گیا اور لشکر کے عبور اور انتظام راہ میں مصروف رہا۔ وہ دن بھر کھڑا رہا۔ تمام فوجوں اور بھیر اور باربرداریوں کو اُن برف پوش پہاڑوں سے اتارا اور آپ وہیں اتر پڑا۔ رات اُسی جگہ گذاری کہ پٹھان پیچھے نہ آن پڑیں حکیم فوج لے کر پہلے قلعہ چکدرہ پر دوڑ گئے۔ صبح کو قلعہ پر سب شامل ہوئے۔ کوکلتاش نے وہاں جشن کیا۔ اِن لوگوں کو اپنا مہمان قرار دے کر بہت خاطرداری کی۔ اور مہمانی کے بڑے بڑے سامان کر کے اپنے خیموں پر بلایا۔ کہ تجویزوں پر اتفاق رائے ہو جائے۔ اس مقام پر راجہ پھوٹ بہے۔ بہت سی شکائتیں کیں۔ اور کہا کہ بادشاہی توپخانہ ہمارے ساتھ ہے۔ بندگانِ دولت کو چاہیئے تھا۔ کہ اس کے گرد آکر جمع ہوتے اور یہاں صلاح مشورہ کی گفتگو ہوتی۔

اگرچہ مناسب یہ تھا کہ کوکلتاش کی سپہ سالاری کے لحاظ سے راجہ بیربر توپخانہ اُس کے حوالے کر دیتے اور سب اسکے پاس جمع ہوتے۔ لیکن پھر بھی زین خاں بے تکلف چلا آیا۔ اور سب سردار بھی اس کے ساتھ چلے آئے۔ البتہ ناگوار گذرا۔ بدترین اتفاق یہ کہ حکیم اور راجہ کی بھی صفائی نہ تھی۔ یہاں حکیم اور راجہ میں گفتگو بڑھ گئی اور راجہ نے گالیوں تک نوبت پہنچا دی۔ کوکلتاش کے حوصلہ کو آفرین ہے۔ کہ بھڑکتی آگ کو دبایا اور صلاحیت و صفائی کے ساتھ صحبت طے ہو گئی۔ لیکن تینوں سرداروں میں اختلاف ہی رہا۔ بلکہ روز بروز عداوت اور نفاق بڑھتا گیا۔ ایک کی بات کو ایک نہ مانتا تھا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا۔ کہ جو میں کہوں سب اسی طرح کریں۔

زین خاں سپاہی زادہ تھا۔ سپاہی کی ہڈی تھا۔ خود بچپن سے لڑائیوں ہی میں جوانی تک پہنچا تھا۔ وہ اس ملک کے حال سے بھی واقف تھا۔ اور جانتا تھا کہ ادھر کے لوگوں سے کیوں کر میدان جیت سکتے ہیں۔ حکیم نہایت دانشمند تھا۔ مگر دربار کا دلاور تھا۔ نہ کہ ایسے کڈھب پہاڑوں کا اور

پہاڑی وحشیوں کا۔ تدبیریں خوب نکالتا تھا۔ مگر دُور دُور سے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ کہنے اور برتنے میں بڑا فرق ہے۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی خیال تھا۔ کہ میں بادشاہ کا مصاحبِ خاص ہُوں۔ وہ تو میری صلاح بغیر کام نہیں کرتے۔ یہ ایسے کیا ہیں۔ بیربر جس دن سے لشکر میں شامل ہُوئے تھے جنگلوں اور پہاڑوں کو دیکھ دیکھ کر گھبراتے تھے۔ ہر وقت بدمزاج رہتے تھے۔ اور اپنے مصاحبوں سے کہتے تھے۔ حکیم کی ہمراہی اور کوکہ کی کوہ تراشی دیکھیے۔ کہاں پہنچاتی ہے۔ رستے میں بھی جب ملاقات ہوجاتی تو بُرا بھلا کہتے اور لڑتے۔ آزاد اِس کے دو سبب تھے اوّل تو یہ کہ وہ محلوں کے شیر تھے۔ نہ مردِ شمشیر۔ دوسرے بادشاہ کے لاڈلے تھے۔ انہیں یہ دعوٰے تھا کہ ہم اُس جگہ پہنچ سکتے ہیں جہاں کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ ہمیں ان کی مزاج میں وہ دخل ہے کہ ٹھیری ٹھیرائی صلاح توڑ دیں۔ زین خاں کیا مال ہے اور حکیم کی کیا حقیقت ہے۔ غرض خود پسندیوں نے مہم کو بگاڑ دیا۔

زین خاں کی رائے یہ تھی۔ کہ میری فوج مدت سے لڑ رہی ہے۔ تمہاری فوج میں سے کچھ چکدرہ کی چھاؤنی میں رہے اور اطراف کا بندوبست کرتی رہے۔ کچھ میرے ساتھ شامل ہو کر آگے بڑھے یا تم میں سے جس کا جی چاہے آگے بڑھے۔ راجہ اور حکیم دونوں میں سے ایک بھی اس بات پر راضی نہ ہُوئے اُنھوں نے کہا حضور کا حکم یہ ہے کہ انہیں لُوٹ مار کر برباد کر دو۔ ملک کی تسخیر اور قبضہ مدنظر نہیں ہے ہم سب ایک لشکر ہو کر مارتے دھاڑتے اِدھر سے آئے ہیں۔ دوسری طرف سے نکل کر حضور کی خدمت میں جا حاضر ہوں۔ زین خاں نے کہا۔ کس محنت و مشقت سے یہ ملک ہاتھ آیا ہے حیف ہے۔ کہ مُفت چھوڑ دیں۔ اچھا اگر کچھ بھی نہیں کرتے تو یہی کرو کہ جس رستے آئے ہو۔ اُسی رستے پھر کر چلو کہ انتظام پختہ ہو جائے۔

راجہ تو اپنے گھمنڈ میں تھے۔ انھوں نے ایک نہ سُنی۔ اور دوسرے دن اپنے ہی رستہ روانہ ہُوئے۔ ناچار زین خاں بھی اور اور سردار لشکر بھی فوج اور سامان ترتیب دے کر پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اور دن بھر میں پانچ کوس پہاڑ کاٹا۔ دوسرے دن کے لئے قرار پایا کہ رستہ سخت ہے۔ تنگ تنگ گھاٹیاں اور بڑا پہاڑ سامنے ہے۔ اور تیز چڑھائی ہے۔ باربرداری۔ بہیر۔ بنگاہ سب ہی کا گذرنا ہے۔ اس لئے آدھ کوس پر جا کر منزل کریں۔ دوسرے دن سویرے سے سوار ہوں۔ کہ آرام سے برف پوش پہاڑ کو پامال کرتے ہُوئے سب اُتر جائیں۔ اور خاطر جمع سے منزل پر اُتریں یہی سب کی صلاح ٹھیری تھی۔ کہ تمام امرا کو چٹھیاں بٹ گئیں۔

نور کے تڑکے دریائے لشکر نے جنبش کی۔ ہراول کی فوج نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر نشان کا پھریرا دکھایا تھا کہ افغان نمودار ہُوئے۔ اور دفعتہً او پر پہنچے۔ دائیں بائیں سے ہجوم کیا۔ خیر بہادروں میں ایسا

ہی ہوتا ہے۔ بادشاہی لشکر نے مقابلہ کیا۔ اور انہیں مارتے ہٹاتے آگے بڑھ گئے۔ جب مقام مقررہ پر پہنچے تو ہراول اور اُس کے ساتھ جو پیچھے ڈیرے والے تھے۔ انہوں نے منزل کر دی ؀

قسمت کی گردش دیکھو! بیربر کو کسی نے خبر دی تھی کہ یہاں افغانوں کی طرف سے شبخون کا ڈر ہے۔ چار کوس آگے نکل چلو گے تو پھر کچھ خطر نہیں یہ منزل پر نہ اُترے آگے بڑھتے چلے گئے۔ دل میں سمجھے کہ دن بہتیرا ہے۔ چار کوس چلنا کیا مشکل ہے۔ اب وہاں پہنچکر بے غم ہو جائیں گے۔ آگے میدان آ جائیگا پھر کچھ پرواہ نہیں۔ اور امرا آپ ہی آ رہینگے۔ چلو آگے ہی بڑھ چلو۔ لیکن انہوں نے آگرہ اور سیکری کا رستہ دیکھا تھا۔ وہ پہاڑ کب دیکھے تھے۔ اور اُن کی منزلیں کہاں کاٹی تھیں۔ جو لوگ پادشاہی سواری کے ساتھ ڈولے۔ پالکیوں۔ تام جاموں میں پھرے۔ انہیں کیا خبر کہ یہ معاملہ کیا ہے اور شبخون کا موقع کیا ہے۔ اور شبخون ماریں بھی تو پہاڑی کر کیا لینگے۔ مگر یہ سمجھنا بھی تو جنگی ہی لوگوں کا کام ہے نہ بھانڈوں کا۔ وہ سمجھے کہ جو کچھ ہے۔ یہی چار کوس کا معاملہ ہے۔ آخر تین جنگی لشکر آگے پیچھے چلے ؀

آزاد۔ میرے دوستو! وہ ملک تو دنیا ہی نئی ہے۔ کیونکر لکھوں کہ تمہارے تصور میں تصویر کھینچوں یہ عالم ہے کہ چاروں طرف پہاڑ۔ درختوں کا بن۔ گھاٹی ایسی تنگ کہ دو تین آدمی بمشکل چل سکیں۔ رستہ ایسا کہ پتھروں کی اُتار چڑھاؤ پر ایک لکیر سی پڑی ہے۔ اُسی کو سڑک سمجھ لو۔ گھوڑوں ہی کا دل ہے۔ اور انہیں کے قدم ہیں۔ کہ چلے جاتے ہیں کبھی داہنے پر۔ کبھی بائیں پر۔ کہیں دو نو طرف کھڈ ہیں کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہوا۔ لڑ کا اور گیا۔ یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ نفسی نفسی پڑی ہوتی ہے۔ ایک بھائی لڑ کا جاتا ہے۔ دوسرا بھائی دیکھتا ہے اور آگے ہی قدم اُٹھاتا جاتا ہے۔ کیا ذکر جو سنبھالنے کا خیال آئے۔ چلتے چلتے ذرا کھُلا آسمان اور کھُلا میدان آیا تو سامنے ایک دیوار پہاڑوں کی معلوم ہوئی جس کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ خیال آتا ہے۔ کہ اس سے گذر جائیں گے۔ تو مشکل آسان ہو جائیگی۔ دن بھر کی منزل مار کر اوپر پہنچے۔ وہاں جا کر کچھ میدان آیا۔ اور دُور دُور چوٹیاں دکھائی دیں۔ اُتر کر ایک اور گھاٹی میں جا پڑے کہ پھر وہی آسمانی دیواریں موجود۔ وہ پہاڑ چھاتی پر غم کا پہاڑ ہو جاتے ہیں۔ الٰہی کیونکر یہ کوہ غم کٹے۔ دل کہتا ہے کہ بس مر لئے یہیں۔ بعض موقع پر ایک جانب کو ذرا چھوٹے چھوٹے ٹیلے نمودار ہوتے ہیں۔ مسافر کا دل تازہ ہو جاتا ہے۔ کہ بس اب ان میں سے نکل کر میدان میں چلے جائینگے۔ مگر اُن سے آگے بڑھ کر ایک میدان آیا۔ کئی کوس بڑھ کر پھر ایک درہ میں گھسنا پڑا۔ چشموں کی چادریں گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آدھ کوس کوس بھر کے بعد پھر وہی اندھیرا۔ مشرق مغرب تک کا پتہ نہیں۔ یہ کسے معلوم ہو کہ دن چڑھا ہے یا ڈھل رہا ہے۔ اور آبادی کا تو ذکر ہی نہ کرو ؀

غرض بیربر تو اسی بھلاوے میں آگے بڑھ گئے کہ ہمت کر کے نکل جاوینگے۔ تو آج ہی سب کا خاتمہ ہو جائیگا۔ پیچھے والے آپ ہی چلے آویں گے۔ مگر یہ آنا دربار یا عیدگاہ سے گھر آنا تو نہ تھا۔ جو لوگ اُتر پڑے تھے۔ اور کچھ خیمے لگا چکے تھے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ راجہ بیربر کی سواری چلی۔ اور وہ آگے جاتے ہیں سمجھے کہ یہیں حکم غلط پہنچا یا رائے پلٹ گئی۔ سب کے ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ جو ابھی آکر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دوڑ پڑے۔ اور جو ڈیرے لگا چکے تھے۔ یا لگاتے تھے۔ وہ گھبرا گئے۔ کہ ان سب کو سمیٹیں اُدر بغل میں مار کر بھاگ چلیں۔ آخر خیمے گرا دیئے۔ کچھ لپیٹے اور کچھ باندھے اور پیچھے پیچھے بھاگے ہندوستان کے رہنے والے لوگ پہاڑوں سے اور رات اور دن کی مار مار۔ ہر وقت کے خوف و خطر سے تنگ ہو ہی رہے تھے۔ یہ حالت دیکھکر جو خاطر جمع سے چلے آتے تھے اُن میں بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور بے تحاشا آگے کو بھاگے۔ افغانوں کے آدمی بھی اُنہیں میں ملے جُلے آتے تھے۔ اور دائیں بائیں پہاڑوں پر لاگے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے جو چل چل دیکھی۔ لوٹنا شروع کر دیا۔

اگر لشکر شاہی کے لوگ ہوش و حواس درست رکھتے۔ یا بیربر کو خدا توفیق دیتا کہ وہیں باگ روک کر کھڑا ہو جاتا تو اُن لٹیروں کو مار لینا اور ہٹا دینا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ مگر لاڈلے راجہ کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ اتنا بڑا لشکر ہے۔ نکل ہی آئیں گے۔ جو مر جائیں سو مر جائیں تم تو چلو۔ لشکر جو کوسوں کی قطار میں دریا کی طرح چڑھاؤ میں چلا آتا تھا۔ ایک تلاطم میں پڑ گیا۔ افغانوں کا یہ عالم تھا۔ کہ لوٹ مار باندھ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ رستہ کڈھب۔ گھاٹیاں تنگ۔ بُرا حال ہوا۔ زین خاں بیچارہ خوب خوب اُڑا۔ آگے بڑھکر اور پیچھے والوں کو سنبھال کر جان لڑائی۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ مقام بے موقع۔ بیل خچریں اونٹ لدے پھندے لوٹ لے گئے۔ آدمی بھی بے شمار ضائع ہوئے اور جو اُن کے ہاتھ آئے پکڑ کر لے گئے۔ غرض لڑتے مرتے مارتے چھ کوس آئے۔

دوسرے دن **زین خاں** نے مقام کیا کہ لوگ ٹوٹے پھوٹے کی مرہم پٹی کریں۔ اور ٹھیر کر ذرا دم لیں۔ آپ راجہ بیربر کے ڈیرے گیا۔ اور اُمرا کو جمع کر کے مشورہ کا جلسہ کیا۔ اکثر اہل لشکر ہندوستانی ہی تھے ملک اور ملک کی حالت سے گھبرا گئے تھے۔ کثرت رائے یہی ہوئی کہ نکل چلو۔ اُس نے کہا کہ آگے پہاڑ اور ٹیلے بیڈھب ہیں۔ لشکر والوں کے دل ٹوٹ گئے ہیں۔ افغان دلیر ہو کر پہاڑوں پر اُمنڈ آئے ہیں لکڑی چارہ پانی دانہ بہت ملتا ہے۔ میری صلاح یہی ہے۔ کہ چند روز قیام کریں۔ اور اپنی حیثیت درست کر کے ہاتھیوں کو ایسی گوشمالی دیں۔ کہ اُن کے بگڑے ہوئے دماغ درست ہو جائیں۔ اور یہ صلاح نہ ہو تو اُن کے بھائی بند عیال مال مویشی بھی ہمارے قبضہ میں ہیں۔ وہ پیغام سلام کریں گے اور اطاعت کر کے

عفو تقصیر چاہینگے۔ قیدی اُن کے حوالے کر کے خاطر جمع کے ساتھ یہاں سے چلینگے۔ یہ صلاح بھی پسند نہو۔ تو حضور میں سب عرضِ حال لکھ کر بھیجیں اور کمک منگائیں۔ اُدھر سے فوج آکر پہاڑوں کو روک لے۔ ہم اِدھر سے متوجہ ہوں۔ لیکن یہ ہندوستانی وال خور جنہوں نے گھر کی ماما چختڑیاں کھائیں پہاڑ ان سے کب کٹتے۔ ایک بات پر بھی صلاح نہ ٹھیری مطلب وہی کہ یہاں سے نکل چلو۔ اور گھر چلکر توری پھلکے اڑاؤ۔

غرض دُوسرے دن کمالِ اضطراب اور بے سر و سامانی میں خیمے ڈیرے اُکھیڑ روانہ ہوئے بہیر بنگاہ ہمیشہ پیچھے ہوتی ہے۔ اور افغانوں کا قاعدہ ہے۔ کہ اُنہی پر گرا کرتے ہیں اس لئے زین خاں آپ چنداول ہوا۔ منزل سے اُٹھتے ہی لڑائی شروع ہوئی۔ افغانوں کا یہ عالم کہ سامنے پہاڑوں پر سے اُمنڈے آتے ہیں۔ کھنڈوں۔ گھاٹیوں اور ماریچوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دفعتہً نکل کھڑے ہوتے ہیں ہندوستانی چیخیں مارتے ہیں۔ اور ایک ایک پر گرے پڑتے ہیں جہاں گھاٹی یا درہ آتا۔ وہاں قیامت آجاتی۔ آدمی اور جانور۔ زندہ اور مردہ کوئی نہ دیکھتا تھا۔ پامال کئے چلے جاتے تھے۔ سنبھالنے اور اٹھانے کا تو کیا ذکر۔ سردار اور سپاہی کوئی پوچھتا نہ تھا۔ زین خاں بیچارہ جا بجا دوڑتا تھا۔ اور سپر کی طرح جان آگے دھرے دیتا تھا۔ کہ لوگ آسانی سے گذر جائیں۔

جب شام ہوئی تو افغانوں کی ہمت بڑھی۔ اِدھر ان کے دل ٹوٹ گئے۔ وہ چاروں طرف سے اُمنڈ کر گرے۔ اور تیراندازی و سنگ باری کرنے لگے۔ بادشاہی لشکر اور بہیر میں ایک کہرام مچگیا پہاڑ تہ و بالا ہو گیا۔ رستہ ایسا تنگ تھا۔ کہ دو سوار بھی برابر چل نہ سکتے تھے۔ اور اندھیرا ہو گیا افغانوں نے بھی موقع پایا۔ آگے پیچھے اور نیچے سے گولی تیر پتھر برسانے شروع کئے۔ ہاتھی۔ گھوڑے آدمی اونٹ۔ گائے۔ بیل ایک پر ایک گرتا تھا۔ قیامت کا نمونہ تھا۔ اُس دن بہت آدمی ضائع ہوئے۔ رات ہو گئی۔ زین خاں نے مارے غیرت کے چاہا۔ کہ ایک جگہ اُڑ کر راہِ اخلاص میں جان قربان کر دے۔ ایک سردار آیا۔ اور باگ پکڑ کر اُس انبوہ میں سے نکالا۔ گھاٹیوں میں اتنے آدمی گھوڑے۔ ہاتھی پڑے تھے۔ کہ رستہ بند ہو گیا تھا۔ ناچار گھوڑا چھوڑ کر پیادہ ہوا۔ اور بے راہ ایک پہاڑی پر چڑھکر بھاگا۔ ہزار دشواری سے منزل پر جان پہنچائی۔ لوگ بھی گھبراہٹ میں کہیں کے کہیں جا پڑے بعضے سلامت پہنچے بعض قید ہو گئے۔ حکیم ابوالفتح بڑی جان کندن سے منزل پر پہنچے۔ مگر افسوس یہ کہ راجہ بیربر کا پتہ نہ لگا۔ اور وہ کیا ہزاروں آدمی جانوں سے گئے۔ جن میں اکثر بادشاہ شناس اور درباری منصبدار تھے۔ اور قیدیوں کی تو گنتی کہاں۔ غرض ایسی شکستِ فاحش ہوئی کہ تمام اکبری سلطنت

میں کبھی اس خرابی کے ساتھ فوج نہیں بھاگی۔ چالیس پچاس ہزار میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ زین خان اور حکیم ابو الفتح لٹے کمال بدحالی کے ساتھ اٹک میں آکر دم لیا۔ پٹھانوں کو اتنی لوٹ ہاتھ آئی کہ سات پُشت تک بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اِس خبر کے سُننے سے خصوصاً راجہ بیربر کے مرنے سے کہ مصاحبانِ بزم وانس اور محرمانِ انجمن قدس میں سے تھا۔ خاطرِ قدسی پر اِس قدر بارِ غم ہوا کہ گویا ابتدائے جلوس سے آج تک نہ ہُوا تھا۔ دو رات دن معمولی سُرور نہ کیا۔ بلکہ کھانا تک نہ کھایا۔ مریم مکانی نے بہت سمجھایا۔ بندگانِ عقیدت کیش نے نالہ وزاری کی تو طبیعت کو مجبور کر کے کھانے پینے پر متوجہ ہوئے زین خاں اور حکیم وغیرہ سلام سے محروم کئے گئے۔ لاش کی بڑی تلاش رہی مگر افسوس کہ وہ بھی نہ پائی۔ مُلا صاحب اس بات پر بہت خفا ہیں۔ کہ اس کا رنج کیوں کیا۔ لکھتے ہیں اور کن شوخیوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جو لوگ سلام سے محروم ہوئے تھے انکی خطا معاف ہوگئی۔ اور چونکہ بیربر جیسے مصاحب کو آپس کے نفاق میں برباد کیا (اور نفاق تو ثابت تھا) اِسلئے چندروز نظر سے مردود اور کورنش سے محروم رہے۔ پھر وہی درجہ تھا بلکہ اُس سے بھی بڑھ گئے کسی امیر کے مرنے کا ایسا رنج نہیں کیا۔ جیسا بیربر کا کیا (کہتے تھے) افسوس اُس کی لاش کو گھاٹی میں سے نکال نہ سکے۔ اُسے آگ تو ملجاتی پھر آپ ہی تسلی دیتے تھے۔ خیر وہ ساری قیدوں سے آزاد۔ پاک اور الگ تھا۔ نیرِ اعظم کی روشنی اُس کے پاک کرنے کو کافی ہے۔ اور پاک کرنے کی تو اُسے حاجت بھی نہ تھی ✦

آزاد۔ لوگ جانتے تھے۔ کہ بیربل آٹھ پہر بادشاہ کے دل کا بہلاوا ہے۔ اب جو اس کے مرنے سے ایسا بیتاب و بیقرار دیکھا تو رنگا رنگ کی خبر لانے لگے۔ کوئی جاتری آتا اور کہتا کہ میں جوالاجی سے آتا ہوں۔ جوگیوں کے ایک غول میں بیربر چلا جاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ سنیاسیوں کے ساتھ بیٹھا کنکھا باچ رہا تھا۔ بادشاہ کے دل کی بیقراری ہر بات کی تصدیق کرتی تھی۔ خود کہتے تھے کہ وہ علائق دنیا سے الگ تھا اور عزت والا تھا۔ تعجب کیا ہے شکست کی شرمندگی سے فقیر ہو کر نکل گیا ہو درباری احمق اِن خیالات کو اور پھیلاتے تھے۔ اور ان پر حاشیے چڑھاتے تھے ✦

لاہور میں روز نئی ہوائی اُڑتی تھی۔ آخر یہاں تک ہوا کہ بادشاہ نے ایک آدمی کانگڑہ بھیجا کہ بیربر کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا ڈھکوسلا اور بادشاہ کا اُس پر یقین ایسا مشہور ہوا کہ جابجا چرچا ہوگیا۔ یہاں تک کہ کالنجر اس کی جاگیر تھا۔ وہاں کے منشیوں کی عرضیاں آئیں کہ یہاں تھا۔ ایک برہمن اسے پہلے سے خوب جانتا تھا۔ اُس نے تیل ملنے میں خط و خال پہچانے اور یہاں ضرور ہے مگر کہیں چُھپا ہوا ہے حضور سے فوراً کروڑی کے نام فرمان جاری ہُوا۔ اِس احمق

نے ایک غریب مسافر کو حماقت سے یا ظرافت سے بیربر بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اب جو فرمان پہنچا۔ اور تحقیق
کیا تو سمجھا کہ دربار میں سخت ندامت ہو گی۔ بلکہ نوکری کا خطر ہے اُس نے حجام کو تو بھیج دیا اور بے گناہ
مسافر کو مفت مار ڈالا۔ جواب میں عرضی کر دی کہ یہاں تھا تو سہی مگر قضا نے سعادتِ پابوس سے
محروم رکھا۔ دربار میں دوبارہ ماتم پُرسی ہوئی۔ پھر مرنے کی سوگواریاں ہوئیں کروڑی اَور اَور نوکر
وہاں کے اِس جرم میں طلب ہوئے کہ حضور کو کیوں نہ خبر کی۔ قید ہے۔ شکنجہ سزائیں آئے ہزاروں
روپیہ جرمانہ بھرے۔ آخر چھٹ گئے۔ واہ مرنے کا بھی مسخرا پن رہا۔ اور لوگوں کی جانوں کو مفت عذاب میں ڈالا۔

اگرچہ بیربر کا منصب دو ہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن عنایت اس قدر تھی۔ کہ ہزاروں اور لاکھوں
کے جواہر۔ برس بلکہ مہینوں میں عطا ہو جاتے **صاحب السیف والقلم** خطاب میں داخل تھا۔ مراسلوں
اور فرمانوں میں قلم آٹھ آٹھ سطریں سیاہ کر لیتا تھا۔ جب ان کا نام صفحہ پر ٹپکتا تھا۔ ان کے مرنے کی
خبر خود امرائے عالیشان کو لکھ لکھ کر بھیجی۔ چنانچہ عبدالرحیم خان خاناں کے نام ایک چھ صفحے کا طولانی
فرمان لکھا ہے۔ ابوالفضل کے پہلے دفتر میں موجود ہے۔ اکبر اُسے ایسا محرمِ راز سمجھتا تھا۔ کہ کسی طرح
کا پردہ نہ تھا۔ اِنتہا ہے۔ کہ آرام کے وقت حرم سرا کے اندر بھی بُلا لیتے تھے۔ اور حق پوچھو تو ان
کے چٹکلوں اور چہلوں کا وہی وقت تھا کہ خلوۃ خاص اور مقام بے تکلف ہوتا تھا۔

بیربر دینِ الٰہی اکبر شاہی میں داخل تھے۔ اور مُرید باخلاص تھے۔ اور مراتب چہار گانہ کی منزلوں
میں سب سے آگے دوڑے جاتے تھے۔ مُلّا صاحب اِن سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ بُرا کرتے
ہیں کہ **ملعون۔ کافر** اور **سگِ بے دین** وغیرہ الفاظ سے زبان آلودہ کرتے ہیں یہ ضرور ہے
کہ بیربر جی ہنسی میں اسلام اور اسلام والوں کو بھی جو چاہتے تھے سو کہہ جاتے تھے مسلمان امیروں
کو یہ بات ناگوار ہوتی ہو گی۔ چنانچہ شہباز خاں کمبوہ چار ہزاری منصبدار جو اکثر مہموں میں سپہ سالار بھی ہوا۔
(شہر اللہ نام تھا لاہوری تھے) اُس نے بھی ایک موقع دربار خاص میں اُنہیں ایسا بُرا بھلا کہا کہ بادشاہ
کی طبیعت بے لُطف ہو گئی۔ اور خود بیربر کے طرفدار ہو گئے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ بیربر ہی بادشاہ
کو عقائد ہنود کی طرف زیادہ تر کھینچتا ہے۔

صفحہ ۷۷ میں تم نے دیکھ لیا۔ کہ بادشاہ نے شیطان پورہ آباد کیا تھا۔ لیکن خفیہ دریافت کرتے
رہتے تھے اور بڑی احتیاط تھی۔ کہ امرا میں سے کوئی وہاں نہ جائے ایک دفعہ خبر دینے والے نے خبر دی
کہ بیربر جی کا دامن بھی وہاں سے ناپاک ہوا۔ جانتے تھے کہ بادشاہ اِس جرم سے بہت ناراض ہوتے
ہیں سیہ کوڑہ گمنام پُورا اپنی جاگیر میں چلے گئے تھے۔ اِن کے خبرداروں نے بھی انہیں خبر دی۔ کہ بھانڈا

پھوٹ گیا ہے۔ یہ سُنکر بہت گھبرائے۔ اور کہا میں تو اب جوگی ہو کر نکل جاؤنگا۔ جب بادشاہ کو خبر ہوئی تو دلجوئی اور خاطرداری کے فرمان لکھے اور بلالیا ؎

بیربر کے مرنے پر اکبر کی اِس قدر بیقراری اور یادگاری دیکھکر لوگ تعجب کرتے ہیں۔ کہ ایسے عالم فاضل تجربہ کار بہادر سردار دلاور ارکان دربار موجود تھے۔ اور اکثر ان میں سے اِن کے سامنے ہی مرے تھے یہ کیا سبب کہ بیربر کے برابر کسی کے مرنیکا رنج نہیں ہوا۔ یہ امر کچھ زیادہ غور طلب نہیں ظاہر ہے کہ ہر ایک امیر اپنے کام اور کرتب کا صاحب کمال تھا۔ اور ہر ایک کام کے لئے خاص خاص موقع ہوتا تھا مثلاً علما و فضلا کا جلسہ ہو۔ علمی تحقیقاتیں ہوں شعر و شاعری ہو۔ وہاں خواہ مخواہ۔ فیضی ابوالفضل۔ شاہ فتح اللہ۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام یاد آئینگے۔ بیربر ایسے تھے کہ کچھ جانیں خواہ نہ جانیں سمجھیں نہ سمجھیں دخل در معقولات کرنے کو موجود تھے۔ مذاہب تقلیدی تو اعتراضوں کے زیرمشق بن رہے تھے۔ کتاب اور سند سے کچھ بحث ہی نہ تھی۔ کیا ہندو کیا مسلمان۔ زیر تحقیقات تھے اُس لئے اِس معاملے میں وہ۔ تیر پیدا کیا تھا کہ وہ اور ابوالفضل وغیرہ دین الٰہی اکبرشاہی کے خلیفہ تھے جب منقولات کا یہ حال ہو تو معقولات کا کیا کہنا ہے۔ اُس میں تو جس کا چاہیں خاکہ اُڑائیں اور جسے چاہیں مسخرا بنائیں ؎

ملکی انتظام اور دفتر کے بندوبست ہوں تو راجہ ٹوڈرمل اور علمائے مذکور یاد آئینگے۔ بیربر اگرچہ ان کاغذوں کے کیڑے نہ تھے۔ مگر ایک عجیب رقم تھے۔ کچھ تیزی فکر کچھ مسخراپن سے وہاں بھی جو عقل میں آتا تھا کہتے تھے۔ بلکہ زبانی جمع خرچ سے سب میزان مستوفی ملا دیتے تھے۔ اور جب موقع دیکھتے تو مناسب وقت کوئی دوہرہ۔ کوئی کبت۔ کوئی لطیفہ کا گلدستہ بھی تیار کر کے سرمجلس حاضر کرتے تھے۔ مہمات ملکی ہوں تو وہاں بھی حاضر۔ بے تلوار جنگ کرتے تھے۔ اور بے توپ توپخانے اُڑاتے تھے سواری شکاری کے وقت کبھی کوئی امرا میں سے پھنس جاتا تھا تو ساتھ ہو لیتا تھا۔ ورنہ اُن کا کیا کام تھا۔ یہ سپاہی بن کر سیر و شکار کے وقت بھی آگے آگے ہو جاتے۔ اور باتوں کے نون مرچ سے وہیں کباب تیار کر کے کھلاتے۔ لیکن شیر چیتے کی بو پاتے تو ایک ہاتھی کے ہودہ میں چھپ جاتے۔ تفریح کی صحبت ناچ رنگ کے تماشے یا اور اِس قسم کی غلوتیں ہوں تو راجہ اندر بھی تھے۔ وہاں ان کے سوا دوسرے کو دخل کب ہو سکتا ہے۔ ان مجلسوں کا سنگار کہو۔ باتوں کا گرم مصالح کہو۔ جو کچھ بجا ہے پھر خیال کرو کہ ہر دم اُن کا غم اور ہر لحظہ وہ یاد نہ آتے تو کون یاد آتا؎

بڑا افسوس یہ ہے۔ کہ اکبر نے ان کے لئے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ مگر اکبر کے لئے انھوں نے کوئی یادگار

چھوڑی سنسکرت کے اشلوک تو درکنار۔ بھاٹ کا ایک دُھرا بھی ایسا نہیں جسے دل کی اُمنگ کسی موقع پر بول اٹھا کرے۔ ہاں اکثر لطیفے ہیں۔ کہ متھرا کے چوبوں و مندروں کے مہنتوں کی زبان پر ہیں جب مفت کی رسوئیوں سے پیٹ پھلا کر چت لیٹ جاتے ہیں تو پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں ڈکاریں لیتے ہیں اور کہتے ہیں واہ بیربر جی واہ کیا اکبر بادشاہ کو غلام بنایا تھا بعضے کہتے ہیں۔ کہ اگلی جون میں بیربر راجہ تھے۔ اور اکبر اُن کے داس تھے اور پھر ایک لطیفہ کہتے ہیں۔ اور کروٹیں لے لے کر گھڑیوں تعریفیں کرتے رہتے ہیں بڑے بڑے مبنوں بلکہ پُرانے پُرانے منشیوں کو بھی یہ لطیفے تاریخ دانی اور علم مجلس کا سرمایہ ہوتے ہیں۔

میں نے چاہا تھا کہ کچھ تصنیف نہیں ملتی تو خاتمۂ احوال میں چند رنگین اور نمکین چٹکلے ہی لکھوں مگر بہت کم لطیفے ایسے ملے۔ جن میں عالمانہ یا شاعرانہ کسی طرح کا لطف ہو۔ پُرانی پُرانی بیاضیں بڑی تلاش سے پیدا کیں اور جہاں لطائفِ بیربل کا نام سُنا۔ وہیں کوشش کا ہاتھ پہنچایا۔ لیکن جب پڑھنے لگا۔ تو تہذیب نے ورق میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

ایک پہیلی اِن کی مدت سے یاد ہے وہ ہی لکھی جاتی ہے۔ باتوں کا صراف اس سے بھی اُن کی لیاقت اور متانت کا کھوٹا کھرا پرکھیگا۔

مال پوا

کبھی ہیں عرق سواد میں میٹھا۔ بن بیلن وہ بیلا ہے۔ کہیں بیربل سنیں اکبر۔ یہ بھی ایک پہیلا ہے

آزاد سے پوچھو تو سید انشا کے مال پوے اس سے کہیں مزے کے ہیں! غزل کے تین شعر یاد ہیں۔

یہ اب حسن پر اپنے گھمنڈ کرتے ہیں گرو جی چیلوں کو اپنے پسند کرتے ہیں	کہ اپنے شیش محل ہی میں ڈنڈ کرتے ہیں شراب ان کو کہیں مت پلائیو انشا	کھلا کے مال پوے زر تراتے موہن بھوج کہ وہ تو مست ہوئے مجلس کو بھنڈ کرتے ہیں

اُن کے ایک بیٹے کا نام ہرم رائے تھا۔ درباری اور راجاؤں کی مدارات وغیرہ میں خدمات بادشاہی بجالاتا تھا۔ بڑے بیٹے کا نام لالہ تھا۔ وہ بھی حاضر دربار رہتا تھا سنہ۱۰۱۰ھ میں استعفا دیا۔ اور کہا کہ مہابلی اب بھگوان کی یاد کیا کرونگا۔ بادشاہ نے بہت خوش ہو کر عرضی منظور کی۔ وہ حقیقت میں ترقی نہ ہونے سے ناراض تھا۔ اور بادشاہ نے عیاشی کے سبب سے اُس کی ترقی مناسب نہ دیکھی تھی۔ غرض یہاں سے رخصت ہو کر گیا اور الہ آباد میں ولیعہد کی نوکری کر لی۔ ابوالفضل کہتے ہیں۔ کہ تند خوئی اور خودکامی سے فضولخرچ ہے اور تمنا و طلب کو بڑھائے جاتا ہے پیش نہیں جاتی۔ حماقت میں جا پڑا اور اِدھر کا خیال باندھا۔ وہ بات بھی نہ بن پڑی۔ خدیو عالم نے رخصت فرما کر اس کے مرض کا علاج کیا۔

راجہ بیربر جی کی تصویر دیکھکر تعجب آتا ہے کہ ایسا بھدا آدمی اتنا زیرک اور دانا کیونکر تھا جسکی تیزی فہم کی سب مدح تعریف کرتے ہیں۔

مخدوم الملک مُلّا عبداللہ سُلطانپوری

فرقۂ انصار سے تھے۔ اور بزرگ اُن کے ملتان سے سلطان پور میں آکر آباد ہوئے تھے عربیت
اور فقہ وغیرہ علوم و فنون جو کہ علمائے اسلام کے لئے لوازمات سے ہیں۔ اُن میں یگانہ تھے۔ مآثر الامرا
میں ہے۔ کہ مولینا عبد القادر سرہندی سے کسب کمال کیا تھا۔ خاص و عام کے دلوں پر اُن کی عظمت
ابر کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اور ہر بات آیت اور حدیث کا حکم رکھتی تھی۔ اس خیال سے جو بادشاہ وقت
ہوتا تھا۔ زیادہ تر اُن کا لحاظ رکھتا تھا۔ ہمایوں عموماً علما کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آتا تھا۔
مگر ان کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُس سے مخدوم الملک و شیخ الاسلام خطاب لیا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ
شیخ الاسلام شیر شاہ نے بنایا تھا۔ اُس نیک نیت بادشاہ کے کاروبار سلطنت میں اعتبار و اعتماد کے ساتھ
ایک خصوصیت خاص رکھتے تھے جب ہمایوں تباہ ہو کر ایران کی طرف گیا۔ تو اُن کی بزرگی اور اقتدار کے اثر
شیر شاہی سلطنت کو برکتیں پہنچانے لگے راجہ پُورن مل رائسین اور چندیری کا راجہ انہی کے عہد و پیمان
کے اعتبار پر حاضر دربار ہوا۔ اور آتے ہی شیر شاہ کی دولت و صولت کا شکار ہوا۔ اس کے عہد میں
بھی باعزاز رہے۔ سلیم شاہ کے عہد میں اس سے بھی زیادہ ترقی کی اور انتہا درجہ کا زور پیدا کیا۔ چنانچہ
شیخ علائی کے حال میں بھی کچھ کچھ لکھا گیا۔ انہوں نے اُن کے اور اُن کے پیر کے قتل میں کوشش
کا حق ادا کیا۔ اور انجام کو شیخ علائی مظلوم انہی کے فتووں کی اسناد لیکر بہشت میں پہنچے ؂

اُسی عہد میں موضع جھنی علاقۂ لاہور میں شیخ داؤد جھنی وال ایک بزرگ مشائخ صاحب معرفت
تھے کہ عبادت و ریاضت اور زہد و پارسائی نے مریدوں کے انبوہ سے اُن کی خانقاہ آباد کی تھی
اور دُور دُور تک خاص و عام ان کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ قوت ربانی اور نسبت
استغنائی سے فقر کے سلسلوں کو ایسا رواج دیا تھا۔ کہ جس کا غلغلہ نفخ صُور تک خاموش نہ ہوگا۔ جن دنوں
مُلّا عبداللہ سلطانپوری نے کہ مخدوم الملک کہلاتے ہیں۔ سعی و کوشش کی کہ اہل اللہ کے استیصال پر باندھی
اور کئی اکابروں کے قتل کا باعث ہوئے۔ تو گوالیار سے سلیم شاہ کا فرمان طلب بھیجکر بلوایا۔ وہ ایک دو
خادموں کو لیکر جریدہ روانہ ہوئے۔ اور شہر کے باہر مخدوم الملک سے ملاقات ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ شیخ
نے پوچھا کہ فقرائے بےتعلق کے طلب کا کیا سبب ہے۔ مخدوم الملک نے کہا کہ میں نے سُنا ہے تمہارے
مرید ذکر کے وقت یا داؤد یا داؤد کہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ سننے میں شبہ ہوا ہوگا۔ یا ودود

کہتے ہونگے اِس تقریب سے ایک دن یا ایک شب رہ کر ان سے مواعظ اور نصائح بلند اور معارف اور حقائقِ ارجمند بیان کئے کہ مخدوم الملک کے دل پر بھی اثر ہوا۔ اور انہیں عزت سے رخصت کر دیا۔

مُلّا صاحب کا دل بھی اِن کی شدّتوں سے پکا پھوڑا ہو رہا ہے۔ جہاں ذرا سا رخنہ پاتے ہیں پھوٹ بہتے ہیں۔ چنانچہ زمرۂ فقرا میں لکھتے ہیں۔ جب **شاہ عارف حسینی** احمد آباد گجرات سے پھر کر آئے تو لاہور میں مقام کیا۔ بہت لوگ کمالات پر گرویدہ ہوئے انہوں نے بعض جلسوں میں گجرات کے زمستانی میوے منگا کر لاہور میں لوگوں کو کھلائے۔ پنجاب کے علما جن کے ستون مخدوم الملک تھے۔ انہیں لپٹ گئے گناہ یہ قرار دیا کہ آخر یہ میوے اَوروں کے باغوں کے ہیں۔ اور انہوں نے بے اجازت ان میں تصرف کیا ہے۔ اس لئے اِن کا تصرف حرام اور کھانے والوں کا کھانا حرام ہے۔ وہ تنگ ہو کر کشمیر چلے گئے سلیم شاہ اگرچہ مخدوم الملک کا نہایت ادب کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جو رخصت کرنے کو لب فرش تک آیا تو جوتیاں سیدھی کر کے ان کے سامنے رکھیں۔ مگر یہ سب باتیں اس مطلب برآری کے لئے تھیں کہ جانتا تھا۔ عوام کے دلوں میں ان کی باتوں کا اثر ہے اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ سفر پنجاب میں مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھا تھا کہ مخدوم تشریف لائے۔ دُور سے دیکھ کر بولا ہیچ میدانید کہ ایں کہ می آید؟ ایک مصاحب نے عرض کی بفرمایند سلیم شاہ نے کہا بابر بادشاہ را پنج پسر بود چہار پسر از ہندوستان رفتند یکے ماندہ۔ مصاحب نے پوچھا۔ آں کیست کہا۔ ایں مُلّا کہ می آید بسر مست خالی نے کہا تقریب نگاہداشتن ایں چنیں مفتن چیست؟ سلیم شاہ نے کہا۔ چہ تواں کرد۔ بہتر ازو نمی یابم اور جب مُلّا عبداللہ پہنچے۔ تو ان کو تخت پر بٹھایا۔ ایک تسبیحِ مروارید۔ کہ اسی وقت پیشکش میں گذری تھی وہ دی۔ کہ ۲۰ ہزار کی تھی۔

سلیم شاہ کے دل پر مخدوم کے باب میں جو ہمایوں کے طرفداری کے نقش تھے اُسے فقط بدگمانی نہ سمجھنا کیونکہ جب ہمایوں فتحیابی کے نشان گاڑتا ہوا کابل میں آن پہنچا تو لاہور میں بھی خبر مشہور ہوئی جابجی پراچہ ان دنوں میں یہاں ایک سوداگر تھا۔ کابل میں اُس کی آمد و رفت تھی۔ مخدوم نے احتیاطاً خط نہ لکھا۔ مگر اس کی معرفت ایک جوڑی موزوں کی اور ایک قمچی بطور تحفہ بھیجی۔ اس کے یہ معنی تھے۔ کہ میدان صاف ہے۔ موزے پہن کر گھوڑے پر چڑھ جاؤ۔ اور گھوڑے کو قمچی کرو۔ آزاد میں سوچتا ہوں کہ اپنے حریفوں کے شان و شکوہ اور شاہانہ اقتدار دیکھ کر شیخ مبارک کیا کہتا ہوگا؟ جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ جب باکمال لوگ نارسائی اور بے قدری کے گڑھوں میں پڑ جاتے ہیں۔ اور کم قدر لوگ بخت اور نصیب کی یاوری سے اوجِ کمال پر پہنچتے ہیں۔ تو گرنے والوں کے دلوں پر سخت چوٹیں لگتی ہیں اس حالت میں کبھی تو وہ

اپنے کمال علمی کو دولت بے زوال اور غیروں کے اتفاقی اقبال کو دودھ کا اُبال کہ کر جی خوش کر لیتے ہیں کبھی گوشہ نشینی کے ملک بے خطر کی تعریفیں کر کے دل بہلا لیتے ہیں۔ کبھی بادشاہوں کی خدمت کو بند غلامی کہکر اپنی آزاد حالت کو بادشاہت سے بھی اونچا مرتبہ دیدیتے ہیں۔ بے شک افراط علم اور کمال کا نشہ انسان کے خیالات کو بلند اور طبیعت میں آزادی اور بے پروائی پیدا کرتا ہے اور جاہ و جلال کے فخروں کو بہت ناچیز کر کے دکھاتا ہے۔ مگر دُنیا بُرا مقام ہے اور اہل دنیا بُرے لوگ ہیں یہ ظاہر پرست حکومت کے بندے اور دولت کی امت ہیں۔ اور مشکل یہ ہے۔ کہ انہی لوگوں میں گذارہ کرنا ہے۔ انکے طمطراق ظاہری پر شیخ مبارک کا عدو حوصلہ نہیں دیتا ہوگا۔ لیکن جو ذلتیں اور مصیبتیں اور جان کے خطر پیش آتے تھے۔ ان میں خدا ہی دکھائی دیتا ہوگا۔ آزادی کی خیالی باتوں سے موجود مصیبتوں کے زخم۔ اور محسوس تکلیفوں کے داغ راحت و آرام کے پھول نہیں بن جاتے ◆

جب ہمایوں نے پھر آکر ہندوستان پر قبضہ کیا۔ تو مخدوم صاحب ہی خاص الخاص تھے۔ اور مختار کُل لیکن اکبر کے آغاز سلطنت میں مخدوم صاحب پر عجب نحوست آئی جب اکبر نے ہیموں پر فوج کشی کی تو سکندر خاں افغان اپنی قومی جمعیت کے ساتھ پہاڑوں میں دبکا بیٹھا تھا۔ یہ خبر سنکر نکلا۔ اور ملک میں پھیل کر علاقہ سے روپیہ تحصیل کرنے لگا۔ حاجی محمد خاں سیستانی حاکم لاہور تھا۔ اسے معلوم ہُوا کہ سکندر انہی کے اشارہ پر باہر نکلا ہے۔ مخدوم صاحب کی پُرزری اور مالداری بھی مشہور تھی۔ حاجی نے روپیہ نچوڑنے کے لئے موقع پایا۔ انہیں کئی شخصوں کے ساتھ پکڑ کر شکنجے میں کس دیا۔ بلکہ مخدوم صاحب کو آدھا زمین میں گاڑ دیا۔ اور جو گنج قارون انہوں نے سالہا سال میں دفینہ کیا تھا۔ دم میں کھینچ لیا۔ خانخاناں نام کو تو ترک سپاہی تھا۔ مگر تدبیر سلطنت کا ارسطو تھا۔ اس نے سنا تو بہت خفا ہُوا۔ اور جب فتح کے بعد بادشاہ کے ساتھ پھر لاہور میں آیا۔ تو حاجی کے وکیل کو مخدوم صاحب کے گھر بھیجا کہ عذر تقصیر بجا لائے۔ اور انہیں لاکھ بیگھہ کی جاگیر علاقہ مان کوٹ میں دی۔ چند روز میں پہلے سے بھی زیادہ اختیارات کر دئے۔ کیونکہ بادشاہ لڑکا ناتجربہ کار تھا۔ اور ایسے اشخاص کی تالیف قلوب مصلحت وقت تھی۔ بڑے بڑے معاملے سلطنت کے ان کی معرفت سرانجام پاتے تھے ◆

آدم خاں گکھڑ پنڈی اور جہلم کے علاقے کا اولوالعزم سردار تھا۔ وہ انہی کی معرفت حضور میں آیا۔ خانخاناں کی تدابیر سلطنت کا عقل کل تھا۔ اس نے آدم خاں سے بھائی بندی کا صیغہ پڑھا۔ اور پگڑی بدل بھائی ہوئے۔ جب خانخاناں کی اور اکبر کی بگڑی اور انجام کو خانخاناں نے حضور میں رجوع کا پیغام بھیجا اور اس کے لینے کو یہ اور منعم خاں گئے۔ خان زماں کی عذر تقصیرات میں انہی کی شفاعت کام کرتی

تھی مگر جب اکبر کو خود سلطنت کے سنبھالنے کی ہوس ہوئی۔ تو اس نے آئینِ مملکت کا انداز بدلا۔ اور دلداری اور ملنساری پر ملک داری کی بنیاد رکھی۔ اس کے خیالات انہیں ناگوار معلوم ہونے لگے۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ انہوں نے بڈھے بڈھے بادشاہوں کو ہاتھوں میں کھلایا تھا جب نوجوان لڑکے کو تخت پر دیکھا ہوگا۔ تو یہ بھی بڑھتے بڑھتے حد اعتدال سے بڑھ گئے ہوں گے۔ اس عرصے میں فیضی اور ابوالفضل پر خدا کا فضل ہوا۔ پہلے بڑا بھائی ملک الشعرا ہوگیا۔ پھر چھوٹے نے میر منشی ہو کر مصاحبت خاص کا رتبہ پایا۔ شیخ مبارک پر جو مصیبتیں مخدوم کے ہاتھوں سے گذری تھیں۔ بیٹوں کو بھولی نہ تھیں۔ انہوں نے ان کے تدارک کے فکر کر کے اکبر کے کان بھرنے شروع کئے۔ اور اکبر کے خیالات بھی پیدا ہونے شروع ہوئے ✦

فاضل بداؤنی لکھتے ہیں۔ کہ اکبر ہر شب جمعہ کو علما و فضلا و سادات و مشایخ کو بلاتا تھا۔ اور خود بھی اجلسے میں شامل ہو کر علوم و فنون کے تذکرے سنا کرتا تھا وغیرہ[1] وغیرہ۔ اسی جگہ لکھتے ہیں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری کو بے عزت کرنے کے لئے بلاتے تھے۔ اور حاجی ابراہیم و شیخ ابوالفضل کہ نیا آیا تھا۔ اور اب نئے مذہب کا مجتہد بلکہ مرشد برحق اور داعی مطلق تھا۔ اس کے ساتھ چند اور نو علموں کو مباحثے پر چھوڑ دیتے تھے۔ اس کی ہر بات میں شک و شبہے پیدا کرتے تھے۔ اس میں بعض امرائے مقرب بھی بادشاہ کے اشارے سے کاوش اور کاہش میں تراوش کرنے لگے۔ کبھی کبھی ٹپکتے تھے۔ تو عجیب و غریب نقلیں مخدوم سے روایت کرتے تھے۔ اور بڑھاپے میں یہ آیت اس پر ٹھیک صادق آئی وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ (یعنی تم میں سے ذلیل عمر کی طرف دھکیلے جائینگے) چنانچہ ایک شب خان جہاں نے عرض کی۔ کہ مخدوم الملک نے فتویٰ دیا ہے کہ ان دنوں حج کو جانا فرض نہیں بلکہ گناہ ہے۔ بادشاہ نے سبب پوچھا۔ بیان کیا کہ خشکی سے جائیں تو رافضیوں کے ملک سے گزرنا پڑتا ہے۔ تری کی راہ جائیں۔ تو فرنگیوں سے معاملہ پڑتا ہے۔ وہ بھی ذلت ہے۔ جہاز کے عہدنامے پر حضرت مریم اور حضرت عیسےٰ کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں اور یہ بت پرستی ہے پس دونو طرح ناجائز ہے ✦

ایک حیلہ شرعی نکال رکھا تھا۔ یعنے ہر سال کے اخیر پر تمام روپیہ بی بی کو ہبہ کر دیتا تھا اور سال کے اندر پھیر واپس لے لیتا تھا۔ کہ زکوٰۃ سے بچ جائیں اور اس کے علاوہ اکثر حیلے معلوم ہوئے کہ بنی اسرائیل کے حیلے بھی ان کے آگے شرمندہ ہیں۔ غرض اس طرح کی رذالت خباثت جہالت مکاری دنیاداری و ستمگاری کی باتیں کہ شہروں کے مشایخ و فقرائے خصوصاً ائمہ و اہل استحقاق سے بے حد و حساب کی

---

[1] دیکھو فاضل بداؤنی کا حال صفحہ ۱۱۴ ✦

تھیں۔ ایک ایک ظاہر ہوئی۔ اور یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَائِرُ کا راز دلوں پر کھل گیا ؎
دربار کے لوگ بہت سی باتیں کہ اُس کی ذلت اور اہانت اور مذمت پر مشتمل تھیں۔ بیان کرتے تھے اور جب پوچھا کہ بر شما حج فرض شدہ ؟ تو جواب دیا کہ نے ؎

ملا صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ ابوالفضل بادشاہ کے اشارے سے بموجب مصرع مشہور ع

کہ یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ

صدر اور قاضی اور حکیم الملک اور مخدوم الملک کے ساتھ دلیرانہ لپٹتا تھا۔ اور اعتقادیات میں مباحثے کرتا تھا۔ بلکہ اُن کی بے عزتی میں ذرا بھی کسر نہ رکھتا تھا۔ اور بادشاہ کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ستر بہتر بڈھوں نے آصف خاں میر بخشی کی معرفت خفیہ پیغام بھیجا۔ کہ کیوں خواہ مخواہ ہم سے اُلجھتے ہو۔ (چرا با مادر افتی۔ واہ ملا صاحب!) اس نے کہا ہم ایک شخص کے نوکر ہیں۔ بینگنوں کے نوکر نہیں ؎

یہ اشارہ اس مشہور لطیفے کی طرف تھا۔ کہ کوئی بادشاہ کھانا کھا رہا تھا۔ بینگن بہت مزا دئے فرمایا کہ وزیر بینگن بہت خوب ترکاری ہے۔ وزیر نے لطف ولذت اور طب وحکمت بلکہ نقل حدیث سے بھی اُس کی تعریفیں کیں۔ پھر ایک موقع پر بادشاہ نے کہا کہ وزیر بینگن تو بُری ترکاری ہے۔ وزیر نے پہلے سے زیادہ ہجو کردی۔ بادشاہ نے کہا کہ اُس دن تو تم نے اس قدر تعریف کر دی۔ اور آج ایسی ہجو کرتے ہو۔ یہ کیا بات ہے۔ اُس نے عرض کی کہ خانہ زاد حضور کا نوکر ہے۔ بینگنوں کا نوکر نہیں۔ فدوی تو حضور کے کلام کی تائید کرے گا ؎

پھر ایک جگہ ملا صاحب فرماتے ہیں۔ بڑی خرابی یہ ہوئی۔ کہ مخدوم اور شیخ صدر کی بگڑ گئی مخدوم الملک نے ایک رسالہ لکھا کہ شیخ عبدالنبی نے خضر خاں شروانی کو پیغمبر صاحب کے بُرا کہنے کی تہمت لگا کر اور میر حبش کو رفض کے الزام میں ناحق مار ڈالا۔ اور اس کے پیچھے نماز بھی جایز نہیں کہ باپ نے عاق کر رکھا ہے۔ اور اسے بواسیر خونی بھی ہے۔ شیخ موصوف نے انہیں بے علمی اور گمراہی کے الزام لگانے شروع کئے۔ مُلّانوں کے دو گروہ دورویہ سبطی اور قبطی ہو گئے۔ نئے نئے مسئلوں میں جھگڑنے لگے۔ انجام اس لڑائی کا یہ ہوا۔ کہ دونو گر پڑے۔ یعنے بادشاہ دونو سے بے اعتقاد ہو گیا۔ بلکہ سنی شیعہ حنفی تو بالائے طاق رہے۔ اصل اصول میں خلل پڑ گئے۔ اور ان کی بداعتقادی میں اصل اعتقاد کچھ کا کچھ ہو گیا۔ تقلیدی مذہب کو بے عقل سمجھ کر تحقیق شروع ہو گئی۔ زمانے کا رنگ بدل گیا۔ یا تو یہ شیخ مبارک سے بلکہ ہر شخص سے بات بات پر سند طلب کرتے تھے۔ اور اُس پہ رد وقدح کرتے تھے۔ یا اب ان سے دلیلیں طلب ہوتی تھیں اور کچھ کہتے تھے۔ تو اس میں ہزار رخنے نکلتے تھے ؎

مخدوم الملک کے دماغ میں ابھی تک پرانی ہوا بھری ہوئی تھی۔ انہیں بجائے خود یہ دعوے تھے کہ جیسے ہم بادشاہ اسلام کہینگے۔ وہی تخت اسلام پر قائم رہ سکیگا۔ جو بادشاہ ہم سے پھر جائے گا۔ اُس سے خدائی پھر جائیگی۔ اس عرصے میں دربارشاہی کے عالموں نے محضر تیار کر لیا کہ بادشاہ عادل مجتہد وقت اور امام عصر ہے اور مسائل اختلافی میں وہ اپنی صوابدید پر ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دے سکتا ہے۔ غرض تو انہیں دونوں سے تھی۔ مگر برائے نام سب علما طلب ہوئے۔ کہن سال بزرگوں نے جبراً قہراً مہریں کر دیں مگر بہت بُرا معلوم ہؤا۔ مخدوم نے فتوے دیا کہ ہندوستان ملک کفر ہوگیا۔ یہاں رہنا جائز نہیں۔ اور خود مسجد میں رہنا اختیار کیا۔ اور اکبر کو کبھی کہتے شیعہ ہوگیا ہے۔ کبھی ہندو۔ کبھی نصارےٰ وغیرہ وغیرہ ✦

یہاں زمانے کا مزاج آب و ہوا کے ساتھ بدل چکا تھا۔ ان کے نسخے نے کچھ اثر نہ کیا۔ اور بادشاہ نے کہا کیا مسجد میرے ملک میں نہیں؟ یہ کیا لچر باتیں ہیں۔ آخر ۹۸۷ھ میں جس طرح ہوا دونو صاحبوں کو مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔ اور کہ دیا کہ بے حکم وہاں سے نہ آئیں۔ احمد کہ بمکتب نمیرود ولے برندش۔ مآثر الامرا میں ہے کہ شیخ ابن حجر مکی ان دنوں زندہ تھے۔ چونکہ مذہب کی سنگینی میں دونو صاحبوں کے خیالات ہم وزن تھے۔ اس لئے بڑی یکدلی اور محبت سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ وہیں رہتے تھے۔ یہ مسافر تھے۔ اس لئے قافلہ میں آئے۔ اور انہیں لے گئے۔ باوجودیکہ موسم نہ تھا۔ مگر لطف رسائی اور زور آشنائی سے کعبے کا دروازہ کھلوا کر مخدوم صاحب کو زیارت کروائی ✦

آزاد۔ جناب مخدوم اور شیخ ممدوح بلحاظ اعتقادات کے ایک سے ایک بھاری ہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ مخدوم صاحب کی تصنیفات نے شہرت و اعتبار کا درجہ نہیں پایا۔ اور اسی سبب سے نایاب ہیں۔ شیخ ابن حجر مکی کی کتابیں مستند اور مشہور ہیں۔ ہاں تقریب بادشاہی اور دربار کی رسائی سے مخالفان مذہب کی سزا و ایذا کے لئے جو اختیارات اور موقعے مخدوم صاحب نے پائے۔ وہ کسی کو کب نصیب ہوئے ہیں۔ مخدوم صاحب نے شیعوں کو قتل۔ قید اور خاکِ ناکامی سے ہمیشہ دبائے رکھا۔ مگر ان کی تردید میں کوئی خاص تصنیف نہیں لکھی۔ شیخ صاحب کی صواعق محرقہ اب بھی بجلی کی طرح دور دور سے چمک کر سنی بھائیوں کی آنکھوں کو روشنی دکھاتی ہے۔ مگر شیعہ بھائی بھی رد و قدح کے لئے سنگ چقماق لئے تیار ہیں۔ چنانچہ قاضی نور اللہ نے نسخہ صوارم مہرقہ اس کا جواب لکھا۔ افسوس لڑنا اور جھگڑنا اور باہم تفرقے ڈالنا جہلا کا کام ہے۔ علما کو چاہئے تھا۔ کہ ان کی حرارت جہالت کو بتاشیر علم کی ٹھنڈائی سے بجھاتے۔ قسمت کی گردش دیکھو کہ وہی لوگ دیا سلائیوں کے بکس کا غذوں میں لپیٹ کر رکھ گئے ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ۔۔۔ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ملہ دیکھو اکبر کا حال محضر کی نقل صفحہ ۱۵۳ پر درج ہے ۱۲ ✦

مآثر الامرا میں ہے۔ کہ افغانوں کا تمام زمانہ اور ہمایوں اور اکبر کی نصف سلطنت میں مخدوم صاحب معزز معتبر اور ہوشیاری۔ متانت رائے۔ تجربات امور اور جمع اموال سے شہرت رکھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر ہندوستان کے مزے یاد آتے تھے۔ اور کچھ نہ ہوسکتا تھا۔ مگر یہ کہ محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھکر اکبر کو کافر بناتے تھے۔ جو حکومتوں کے مزے یہاں اڑائے تھے۔ ایسے نہ تھے کہ آسانی سے بھول جاتے۔ تڑپتے تھے اور مجبور وہیں پڑے تھے۔ آخر اس بوجھ کو نہ مکے کی زمین اُٹھا سکی نہ مدینے کی جہاں کے تھے وہیں پھینکے گئے۔ شعر

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند	کہ بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی
بہ زمین چو سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد	کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

ملا صاحب اگرچہ مخدوم صاحب اور شیخ صدر دونوں سے خفا تھے۔ مگر بادشاہ پر ان سے بہت زیادہ خفا تھے۔ اس مقام تک انہیں کیا خبر تھی۔ کہ دونوں بزرگوں کا انجام کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں۔ بادشاہ نے ۹۸۶ھ میں خواجہ محمد یحییٰ کو کہ حضرت خواجہ احرار قدس اللہ روحہ کے پوتوں میں تھے۔ میر حاج قرار دے کر ۴ لاکھ روپے حوالہ کئے۔ اور شوال کے مہینے میں اجمیر سے روانہ کیا۔ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو جنہوں نے آپسمیں لڑجھگڑ کر اگلوں اور پچھلوں سے بھی بے اعتقاد کردیا تھا۔ اور دین حق سے پھرنے کا سبب یہی تھے۔ اس قافلے کے ساتھ مکے کو خارج کردیا۔ کہ اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا (دو ٹکرائینگے تو دونو گرینگے) چنانچہ دوسرے برس مقصد کو پہنچے۔ اور انجام کار کہ اسی کا اعتبار ہے۔ عارضی آلائش سے پاک ہوگئے۔ اور ایمان بچالے گئے۔ ہم نے اپنا کام آخر کیا۔ تاریخ ہوئی کہ ھُوَ عِزُّ قَوْمٍ وَلَّوا (اس قوم کا معزز ہے جو گمراہ ہوگئی) مآثر الامرا میں ہے کہ باوجود اس حالت اور رستے کی رفاقت کے شیخ وصدر کیا راہ میں کیا مقامات متبرکہ میں صاف نہ ہوئے۔ مخالفت قائم رہی ✦

ظاہری سبب یہ ہوا کہ محمد حکیم مرزا حاکم کابل سوتیلا بھائی اکبر کا باغی ہوکر پنجاب پر آیا۔ ادھر خان زمان نے ملک مشرقی میں بغاوت کی۔ قاعدہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بڑی ہوکر جلد دور پہنچ جاتی ہیں۔ یہ خبر مکے تک بھی پہنچی۔ مکے تک خبر پہنچنے میں یہاں انتظام ہوگیا۔ مگر دونوں صاحبوں نے خبر سنتے ہی موقع غنیمت سمجھا۔ سوچے کہ اکبر پر بے دینی کا الزام لگاکر اور فتووں کے کارتوسوں سے زور دیکر حکیم مرزا کو قائم مقام کردیں۔ تو پھر سلطنت ہاتھ میں ہے۔ گلبدن بیگم سلیمہ سلطان بیگم اکبر کی پھوپھیاں وغیرہ بیگمات بھی حج سے پھر کر آئی تھیں۔ انہیں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اور گجرات دکن میں پہنچ کر ٹھیرے۔ کہ حال معلوم کریں۔ یہاں حکیم مرزا کا معاملہ پہلے ہی طے ہوچکا تھا۔ اکبری اختیاروں کو دیکھ کر بہت ڈرے بیگمات سے سفارش کروائی۔ اکبر کے کان میں ان کے کلمات طیبات اول سے آخر تک حرف بحرف پہنچ رہے تھے۔ مہمات ملکی اور مصالح سلطنت میں عورتوں کی سفارش کا کیا کام۔ حاکموں کو حکم پہنچے۔ کہ نظربند رکھیں۔ اور آہستگی مسلسل

کر کے روانہ کر دیں۔ مخدوم صاحب کیفیت حال سن کر بے حال ہو گئے۔ اور ابھی روانہ دربار نہ ہوئے تھے۔ کہ ملک عدم کی روانگی کے لئے اجل کا حکم پہنچا۔ ۹۹۰ھ میں بمقام احمد آباد دنیا سے انتقال کیا۔ مآثر الامرا میں ہے۔ کہ بادشاہ کے حکم سے کسی نے زہر دے دیا۔ اگر یہ سچ ہے تو ہاتھوں کا کیا اپنے سامنے آ گیا جس فساد مملکت کا خطرہ دکھا کر انہوں نے شیخ علائی کو مارا تھا۔ اسی مصلحت ملکی میں مارے گئے۔ جنازہ احمد آباد سے جالندھر میں آیا۔ اور خاک سے روپوش ہوا۔

ان کے املاک اور مکانات لاہور میں تھے۔ اور گھر میں بڑی بڑی قبریں تھیں جن کے لمبے لمبے طول عرض بزرگان مرحوم کی مقدار بزرگی ظاہر کرتے تھے۔ ان پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے۔ اور دن ہی سے چراغ جل جاتے تھے۔ ہر وقت تازے پھول پڑے رہتے تھے یہاں پھول پتے لگانے والوں نے پتے لگائے اور کہا کہ حضور یہ مزار دکھاوے کے بہانے ہیں حقیقت میں دفینے اور خزانے ہیں کہ خلق خدا کے گلے کاٹ کاٹ کر جمع کئے ہیں (ملا صاحب فرماتے ہیں) قاضی علی فتح پور سے لاہور میں آیا۔ اور اتنے خزینے اور دفینے نکلے۔ کہ وہم کی کنجی بھی ان کے قفلوں کو نہ کھول سکے۔ اُس کے گورخانے میں سے چند صندوق نکلے۔ کہ ان میں سونے کی اینٹیں چنی ہوئی تھیں۔ مُردوں کے بہانے سے دفن کئے تھے۔ شکنجے میں کسے گئے۔ تین کروڑ روپے دم نقد نکلے۔ اور جو مال لوگوں کے پاس گئے یا رہ گئے وہ عالم الغیب کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ یہ ساری اینٹیں کتابوں سمیت کہ اُنہیں بھی اینٹیں ہی سمجھنا چاہیئے۔ سب اکبری خزانے میں داخل ہو گئیں۔ بیٹے اُس کے چند روز قید شکنجے میں رہے۔ اور آخر بلی کی ٹکیا کو محتاج ہو گئے۔

فاضل بداؤنی نے جو مضامین مذکورہ بالا کے بعد اُن کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ تنزیہ الانبیا اور شمائل نبوی ان کی عالمانہ تصنیفات ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے۔ ملائے موصوف ترویج شریعت میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ اور متعصب سُنی تھے۔ بہت سے بے دین اور رافضی ان کی سعی سے اس ٹھکانے لگے۔ جو کہ اُن کے لئے تیار ہوا تھا (یعنی جہنم)

فاضل موصوف نے ان سے اپنی ملاقات کا حال جو لکھا ہے۔ بعینہ ترجمہ اس کا لکھتا ہوں۔ جس سال اکبر نے گجرات فتح کی تھی۔ مخدوم الملک کالت کی خدمت پر تھے۔ اور عین جاہ و جلال میں تھے میں پنجاب سے پھرتا ہوا وہاں پہنچا۔ ابو الفضل دربار میں ابھی نوکر نہ ہوئے تھے۔ حاجی سلطان تھانیسری اور ہم سب ملکر گئے۔ کہ شیخ کی باتیں سُنیں۔ آپ فتح پور سیکری کے دیوان خاص میں بیٹھے تھے۔ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر سامنے دھرا تھا۔ اور کہہ رہے تھے کہ مقتدایان ولایت چہ خرابی ہا در دین کردہ اند۔ اور یہ شعر اسمیں سے پڑھا۔ شعر

ہمیں بس بود حق نمائی او	اگر گردند شک در خدائی او

اور کہا کہ اواز رفض ہم گذرانیدہ کار را بجائے دیگر رسانیدہ کہ حلول باشد۔ قرار دادہ ام کہ این جلد المجھول شیعہ بسوزم۔ میں گوشہ ہائے گمنام سے نکل کر آیا تھا۔ مخدوم موصوف کے حالات اور اختیارات کی خبر نہ تھی۔ پہلی ہی ملاقات تھی۔ میں نے کہا کہ یہ تو اُس شعر کا ترجمہ ہے جو امام شافعی کی طرف منسوب ہے ؎

لو ان المرتضی ابدی محلۃ	لصار الناس طرا سجد الہ
کفی فی فضل مولینا علی	وقوع الشک فیہ انہ اللہ

مخدوم نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا کہ یہ کس سے منقول ہے۔ میں نے کہا شرح دیوان امیر سے فرمایا۔ شارح دیوان کہ قاضی میر حسین میبذی ہے۔ وہ بھی متہم بہ رفض ہے۔ میں نے کہا کہ خیر یہ اور بحث نکلی شیخ ابوالفضل اور حاجی سلطان بار بار مُنہ پر ہاتھ رکھ رکھ کر اشارے سے مجھے منع کرتے تھے۔ پھر بھی میں نے اتنا کہا کہ بعض معتبر لوگوں سے سُنا ہے کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں ان کے بیٹے سید میرک شاہ کا ہے یا کسی اور کا ہے۔ اسی واسطے اس کی عبارت پہلے دو دفتروں سے نہیں ملتی۔ کہ نہایت شاعرانہ ہے۔ مخدوم نے نہیں جواب دیا کہ بالائے من در دفتر دوم نیز چیزہا یافتہ ام۔ کہ دلالت صریح بر بدعت و فساد اعتقاد دارد۔ و براں حواشی نوشتہ ام وغیرہ وغیرہ۔ شیخ ابوالفضل برابر بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ کو زور سے ملتے تھے۔ کہ چپکے رہو۔ آخر مخدوم نے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ ان کی کچھ تعریف تو کرو۔ لوگوں نے مجملاً حال بیان کیا۔ بارے صحبت خیر و عافیت سے ختم ہوئی۔ وہاں سے نکل کر یاروں نے کہا کہ شکر کرو آج بڑی بلا ٹلی۔ کہ وہ تمہارے حال سے متعرض نہ ہوئے۔ نہیں تو کون تھا کہ بچا سکے۔ وہ ابوالفضل کو ابتدا میں دیکھ دیکھ کر اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے۔ چہ خلل ہا کہ وردین ازیں نخیزد۔ غرض کہ مخدوم موصوف ۹۹۰ھ میں فوت ہوئے اور شیخ مبارک نے اپنی آنکھوں سے ایسے سخت دشمن کی تباہی دیکھ لی۔ اور بڑی بات یہ ہوئی کہ اپنے لڑکوں کے ہاتھ سے دیکھی۔ خدا کی شان ہے اکثر دیکھا جاتا ہے۔ کہ جن لوگوں کی زمانہ مساعدت کرتا ہے۔ اور جاہ و جلال اور اقبال کے عالم میں وہ کسی پر جبر کرتے ہیں انجام کو اُسی کے ہاتھوں یا اس کی اولاد کے ہاتھوں اُس سے بدتر حالت اُن پر گذر جاتی ہے۔ خدا ہم کو اختیار کے وقت عاقبت بینی کی عینک عطا کرے۔

بعض تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ کشف الغمہ عصمت الانبیا۔ منہاج الدین سیر نبوی میں ان کی تصنیفات سے تھیں۔ مآثر الامرا میں منہاج الدین اور حاشیہ شرح ملا لکھا ہے ⁂

اُن کا بیٹا حاجی عبدالکریم باپ کے بعد لاہور میں آیا۔ اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری کیا۔ آخر ۱۰۴۵ھ میں وہ بھی باپ کے پاس پہنچا۔ خاک کا قالب لاہور میں نویں کوٹ کے پاس دفن ہوا۔ کہ وہیں بیت الضیاء کا باغ تعمیر ہوا۔ شیخ یحییٰ۔ اللہ نور۔ عبدالحق اعلیٰ حضور بھی اُنکے بیٹے تھے۔ شیخ بدایونی افسوس کر کے کہتے ہیں کہ شیخ یحییٰ باپ کے بعد حرکات مکروہ کا نمونہ ہوا ⁂

شیخ عبد النبیؒ صدر

شیخ عبد النبیؒ ولد شیخ احمد بن شیخ عبد القدوس اصل وطن اندری۔ علاقہ گنگو اور خاندان مشائخ میں مامور تھا۔ ابتدا میں دل عبادت وریاضت کی طرف بہت مائل تھا۔ ایک پہر کامل حبس دم کے ساتھ ذکر میں مصروف رہتے تھے۔ کئی دفعہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گئے۔ وہاں علم حدیث حاصل کیا۔ اول سلسلہ چشتیہ میں تھے۔ آبا و اجداد کی محفل حال و قال میں غنا اور سماع بھی تھا۔ انہوں نے وہاں سے آکر ناجائز سمجھا۔ اور محدثین کا طریقہ اختیار کیا۔ تقوےٰ۔ پرہیزگاری۔ طہارت۔ پاکیزگی اور عبادت ظاہری میں مشغول رہتے تھے۔ اور درس و تدریس وعظ و نصیحت میں بشدت سرگرم تھے۔ اکبر کو اپنی سلطنت میں تقریباً ۲۰ برس تک مسائل اسلام کی پابندی اور علمائے اسلام کی عظمت کا بڑا خیال رہا۔ ۹۷۱ھ میں مظفر خاں وزیر کل تھا اسی کی سفارش سے انہیں صدر الصدور کر دیا ۔

فاضل بداؤنی کہتے ہیں۔ کہ عالم عالم اوقاف و انعامات اور وظائف با استحقاق بخشے۔ اور اس قدر کہ اگر تمام بادشاہان ہند کی بخششوں کو ایک پلے میں رکھیں۔ اور اس عہد کے انعام کو ایک پلہ میں۔ تو بھی یہی جھکتا رہیگا۔ یہاں تک کہ بتدریج رفتہ رفتہ پلہ اصلی پر آن ٹھیرا۔ اور قضیہ بالعکس ہو گیا ۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ مخدوم الملک کا ستارہ غروب پر تھا۔ اور شیخ صدر طلوع پر تھے۔ تعظیم و احترام کا یہ حال تھا۔ کہ کبھی کبھی علم حدیث کے سُننے کو بادشاہ خود ان کے گھر جاتے تھے۔ ایک دفعہ جوتے اِن کے سامنے اُٹھا کر رکھے۔ شاہزادہ سلیم کو حجرۂ تعلیم میں داخل کیا کہ مولانا جامی کی چہل حدیث کا سبق لیا کرے شیخ کی ترغیب اور برکات صحبت سے خود بھی احکام شرعی کی پابندی میں حد سے گذر گئے تھے۔ آپ اذان دیتے تھے۔ اور امامت کرتے تھے۔ اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے تھے ۔

عالم شباب میں جشن سالگرہ کی تقریب پر لباس زعفرانی پہن کر محلسرا سے باہر آئے۔ شیخ موصوف نے منع کیا۔ اور شدت تاکید کو اس جوش و خروش سے ظاہر کیا۔ کہ عصا کا سرا بادشاہ کے جامہ کو لگا۔ مگر انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ حرم سرا میں چلے آئے اور ماں سے شکایت کی۔ ماں نے کہا۔ تم جانے دو۔ یہ کچھ رنج کا مقام نہیں باعث نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائیگا۔ کہ ایک پیر مفلوک نے ایسے بادشاہ عالی جاہ کو عصا مارا اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کر کے برداشت کر گیا[1]

---

[1] مآثر الامرا میں ہے کہ کپڑوں پر زعفران کے چھینٹے دیئے ہوئے تھے ۔

سلاطین سلف کے عہد میں مسجدوں کے امام بادشاہ کی طرف سے ہوا کرتے تھے۔ اور وہ سب صاحب خاندان عالم فاضل متقی پرہیزگار ہوتے تھے۔ سلطنت سے اُن کے لئے جاگیریں مقرر ہوتی تھیں چنانچہ انہیں دنوں میں حکم ہوا کہ تمام ممالک محروسہ کے امام جب تک اپنی مدد معاش اور جاگیر کے فرمان پر صدر الصدور کی تصدیق اور دستخط نہ حاصل کرلیں۔ تب تک کروڑی اور تحصیلدار اُس کی آمدنی انہیں مجرا نہ دیں۔ یہ بااستحقاق لوگ انتہائے ممالک مشرقی سے لے کر سرحد سندھ تک سب صدر کے حضور میں پہنچے۔ جس کا کوئی قوی حامی امرا میں سے ہوگیا یا مقربان شاہی میں سے کسی کی سفارش ہاتھ آگئی۔ اس کا کام بن گیا۔ جن کو یہ وسیلہ میسر نہ ہوا۔ وہ شیخ عبدالرسول اور شیخ کے وکیلوں سے لے کر فراشوں دربانوں سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھی بھاری بھاری رشوتیں دیتے تھے۔ اور جو ایسا کرتے تھے وہ گرداب سے ناؤ نکال لے جاتے تھے۔ جن بدنصیبوں کو یہ موقع ہاتھ نہ آتا تھا۔ وہ ٹکڑیاں کھاتے تھے۔ اور پامال ہوتے تھے۔ بہت سے نامراد اس بھیڑ اور انبوہ میں لوؤں کے مارے مر مر گئے۔ بادشاہ کو بھی خبر پہنچی۔ مگر اقبال زور پر تھا۔ صدر عالی کے قدر کی تعظیم اور علو شان سے مُنہ پہ نہ لا سکے ٭

شیخ جب مسند جاہ و جلال پر بیٹھتے تھے۔ تو دربار کے بڑے بڑے عالیشان امرا اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر شیخ کے دیوان خانہ میں شفاعت اور سفارش کے طور پر لاتے تھے۔ شیخ بدمزاجی سے پیش آتے تھے۔ اور کسی کی تعظیم بھی کم کرتے تھے۔ بڑے مبالغوں سے اور بڑی عجز و زاری سے ہدایہ اور عالمانہ کتابوں کے پڑھانے والوں کو سو بیگھہ یا کچھ کم زیادہ زمین ملتی تھی۔ اِس سے زیادہ ہوتی تو سالہا سال کی مقبوضہ زمین بھی کاٹ لیتے تھے۔ اور عوام گمنام۔ ذلیل و خوار یہاں تک کہ ہندوؤں کو بھی اپنی مرضی سے دیتے تھے اِس طرح علم و علما کی قیمت روز بروز گھٹتی گئی ٭

عین دیوان میں دوپہر کے بعد جب کرسی غرور پر بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ تو آب مستعمل کی چھینٹیں تمام سر اور مُنہ پر اور امرائے کبار اور مقربان بلند رتبہ کے کپڑوں پر پڑتی تھیں۔ اور وہ کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ غرض کے بندے اخلق خدا کی کارسازی کے لئے برداشت کرتے تھے۔ اور خوشامد اور لگاوٹ سے جس طرح شیخ چاہتے تھے سلوک بھی کرتے تھے۔ لیکن پھر جب وقت آیا۔ تو جو کچھ نگلا تھا۔ سب اُگلوا لیا۔ کسی بادشاہ کے زمانہ میں کسی صدر کو یہ تسلط اور تصرف اور استقلال حاصل نہیں ہوا۔ اور بات تو یہ ہے۔ کہ اس کے بعد خاندان مغلیہ میں دین کے زور اور مذہبی اختیارات کے ساتھ صدر کا عہدہ ہی عدم میں آگیا۔ پھر صدر الصدور رہا نہ وہ اختیارات ہوئے ٭

چند ہی روز گذرے تھے۔ کہ آفتاب ڈھلنے لگا۔ فیضی ابوالفضل بھی دربار میں آن پہنچے تھے سنہ ۹۸۵ھ میں یہ حکایتیں شکایتوں کی سُرخیوں میں بادشاہ کے کان تک پہنچیں۔ ان کا اثر کچھ زیادہ نہ ہوا۔ مگر یہ حکم ہوا کہ

جن کی معافی پانسو بیگھے سے زیادہ ہو۔ وہ خود حضور میں فرمان لے کر حاضر ہوں۔ اور اس میں بہت سی کارسازیاں کھلیں۔ چندروز کے بعد ہر صوبہ ایک ایک امیر کے سپرد ہو گیا۔ چنانچہ پنجاب مخدوم الملک کے حصے میں آیا۔ یہیں سے دونو کے دلوں میں غبار پیدا ہوئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں خاک اُڑنے لگی بادشاہ کی مرضی پاکر شیخ ابوالفضل سر دربار مسائل میں مناظرے اور مباحثے کرنے لگے۔ ایک دن دسترخوان پر بادشاہ امرا کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ شیخ صدر نے مزعفر کے قاب میں ہاتھ ڈالا۔ شیخ ابوالفضل نے اُسے زعفران کا چھینٹا دے کر کہا کہ اگر زعفران نجس یا حرام ہے۔ تو اس کا کھانا کیوں کر حلال ہو سکتا ہے؟ مسئلہ شرعی ہے۔ کہ تین دن تک حرام کا اثر باقی رہتا ہے۔ اگر حلال ہے۔ تو وہ اعتراض اور احتساب کیا تھا۔ ہر صحبت میں اس قسم کے مسائل پر نوک جھوک ہو جاتی تھی ٭

ایک دن جلسۂ امرا میں اکبر نے کہا کہ تعداد نکاح کی کہاں تک جائز ہے۔ جوانی میں تو کچھ اس باب کا خیال نہ تھا جتنے ہو گئے۔ ہو گئے۔ اب کیا کرنا چاہئے۔ ہر شخص کچھ کچھ عرض کرتا تھا۔ اکبر نے کہا کہ ایک دن شیخ صدر کہتے تھے کہ بعض کے نزدیک نو تک بیبیاں جائز ہیں۔ بعض اشخاص بولے کہ ہاں ابن ابی لیلےٰ کی یہی رائے ہے۔ کیونکہ ظاہر آیت کے لفظ یہی ہیں۔ فانکحوا ما طاب لکم مثنیٰ وثلاث ورباع یعنی نو۔ اور بعضوں نے دو دو تین تین چار چار کے معنوں کا خیال کیا وہ ۱۸ بھی کہتے ہیں۔ مگر ان روایتوں کو ترجیح نہیں۔ اسی وقت شیخ سے پچھوا بھیجا۔ انہوں نے وہی جواب دیا کہ میں نے اختلاف علما کا بیان کیا تھا فتوےٰ نہیں دیا تھا۔ یہ بات بادشاہ کو بُری لگی۔ اور کہا اگر یہ بات ہے۔ تو شیخ نے ہم سے نفاق برتا جب کچھ اور کہا اور اب کچھ اور کہتے ہیں۔ اور اس بات کو دل میں رکھا ٭

جب یہ باتیں ہونے لگیں۔ اور بادشاہ کا مزاج لوگوں نے پھرا دیکھا۔ تو زمانے کے لوگ جو وقت کے منتظر بیٹھے تھے۔ بات بات میں گل کترنے لگے۔ یا تو یہ عالم تھا کہ محدثی کا نقارہ بجتا تھا۔ کیونکہ مدینہ منورہ سے حدیث کا فیض لیکر آئے ہیں۔ اور امامت ان کا حق کہ امام اعظم کی اولاد میں۔ یا اب یہ حال ہوا کہ مرزا عزیز کوکہ نے کہا۔ حدیث الحزم سوء الظن کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ جائے مہمل اور زلئے مجمہ سے ہے۔ شیخ نے شہزادہ کو حائے مجمہ اور رائے مہملہ سے پڑھا دیا ہے۔ جس کو علم حدیث پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اُسکا یہ حال ہے۔ آپ نے اس کا رتبہ اس حد تک پہنچا دیا۔ اب لے ابوالفضل اور فیضی کا اقبال سمجھو۔ خواہ مخدوم اور صدر کا ادبار کہو۔ بڑی قباحت یہ ہوئی۔ کہ دونو کی آپس میں بگڑ گئی۔ اور جن جن مسئلوں اور فتووں میں افراط وتفریط ہوئی تھی۔ ان میں ایک دوسرے کا پردہ فاش کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میر حبش کا قتل رفض کے جرم میں اور خضر خاں شروانی کا قتل اس جرم میں کہ پیغمبر صاحب کی جناب میں بے ادبی کی۔ تہمت بے اصل تھا۔ تی

عرصے میں میر مقیم اصفہانی اور میر یعقوب حسین خاں حاکم کشمیر کی طرف سے تحائف پیشکش لے کر آئے۔ یہاں یہ چرچا ہوا کہ کشمیر میں جو سنی شیعہ کے فساد میں ایک شیعہ قتل ہوا تھا۔ اور اُس کے عوض میں سنی مفتی مواخذہ میں آکر قید اور قتل ہوئے۔ اس کا باعث میر مقیم تھا۔ شیخ صدر نے اس جرم کے انتقام میں میر مقیم اور میر یعقوب دونو کو قتل کیا۔ کہ شیعہ تھے۔ اب لوگوں نے کہا کہ یہ بھی خون ناحق ہوئے۔ ان مقدموں کے علاوہ بھی دونو جلیل القدر عالم نئے نئے مسئلوں پر جھگڑے پیدا کرتے تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ بادشاہ دونو سے بے اعتقاد ہو گیا۔ فیضی و ابوالفضل کو اس قسم کے موقع غنیمت ہوتے ہونگے۔ وہ ضرور شیعوں کو زور دیتے ہوں گے اور بادشاہ کو برسر رحم لاتے ہوں گے اور انہی باتوں سے رفض کی تہمت میں آکر مفت کا داغ کھاتے ہوں گے۔

ملا صاحب کہتے ہیں۔ رہی سہی بات یہاں سے بگڑی کہ انہی دنوں میں متھرا کے قاضی نے شیخ صدر کے پاس استغاثہ کیا کہ مسجد کے مصالح پر ایک سرشور اور مالدار برہمن نے قبضہ کر کے شوالہ بنا لیا اور جب روکا تو اس نے پیغمبر صاحب کی شان میں بے ادبی کی۔ اور مسلمانوں کی بھی بہت اہانت کی۔ شیخ نے طلبی کا حکم بھیجا وہ نہ آیا۔ نوبت اکبر تک پہنچی۔ چنانچہ بیربل اور ابوالفضل جا کر اپنی رسائی اور اعتبار کے ذمے پر لے آئے۔ ابوالفضل نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا عرض کیا اور کہا کہ بے ادبی بے شک اس سے ہوئی۔ علما کے دو فریق ہو گئے بعض نے قتل پر بعض نے جرمانہ اور تشہیر کا فتویٰ دیا۔ اور باتوں کا طول کلام دور تک پہنچا۔ شیخ صدر بادشاہ سے قتل کی اجازت مانگتے تھے۔ مگر وہ صاف حکم نہ دیتے تھے۔ اتنا کہ کر ٹال دیتے تھے کہ احکام شرعی تمہارے متعلق ہیں۔ ہم سے کیا پوچھتے ہو۔ برہمن مدت تک قید رہا۔ محلوں میں رانیوں نے بھی سفارشیں کیں۔ مگر شیخ صدر کا بھی کچھ نہ کچھ خیال تھا۔ آخر جب شیخ نے بہت تکرار سے پوچھا۔ تو کہا کہ بات وہی ہے کہ جو میں کہ چکا ہوں۔ جو مناسب جانو وہ کرو۔ شیخ نے گھر پہنچتے ہی قتل کا حکم دیدیا۔

جب یہ خبر اکبر کو پہنچی تو بہت خفا ہوا۔ اندر سے رانیوں نے اور باہر سے راجا مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان ملانوں کو حضور نے اتنا سر پر چڑھایا ہے کہ اب آپ کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے۔ اور اپنی حکومت و جلال دکھانے کے لئے لوگوں کو بے حکم قتل کر ڈالتے ہیں۔ ایسی ایسی باتوں سے اس قدر کان بھرے کہ بادشاہ کو تاب نہ رہی اور جو مادہ مدت سے غلیظ ہو رہا تھا۔ یکبارگی پھوٹ بہا۔ رات کو انوپ تلاؤ کے دربار میں آکر پھر اس مقدمہ کا حال بیان کیا۔ فتنہ انگیز اکسانے والوں سے اور نوخیز مفتیوں سے مسئلہ کی تحقیق کرتے تھے۔ ایک کہتا تھا۔ بھلا رد و قدح کے جواب و سوال کس نے کئے ہونگے۔ دوسرا کہتا تھا۔ شیخ سے تعجب ہے۔ وہ تو اپنے تئیں امام اعظم کی اولاد کہتے ہیں اور ان کا فتویٰ ہے کہ کفار مطیع اسلام پیغمبر کی شان میں بے ادبی کرے تو عہد شکنی اور ابراء ذمہ نہیں ہوتا۔ فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے۔ شیخ نے اپنے جد کی مخالفت کیوں فرمائی۔

له ان سے فیضی اور ابوالفضل مراد ہوں گے۔

فاضل بدایونی لکھتے ہیں۔ یکبارگی دور سے مجھ پر نظر پڑی میری طرف متوجہ ہو کر اور نام لے کر آگے بلایا۔ اور کہا کہ آگے آؤ۔ میں سامنے گیا۔ پوچھا کہ تو نے بھی سُنا ہے کہ اگر ۹۹ روایتیں مقتضی قتل ہوں۔ اور ایک روایت موجب رہائی ہو۔ تو مفتی کو چاہیئے۔ کہ روایت اخیر کو ترجیح دے۔ میں نے عرض کی حقیقت میں جو حضرت نے فرمایا۔ اسی طرح ہے۔ اور مسئلہ ہے ان الحدود والعقوبات تندرء بالشبہات اس کے معنی فارسی میں ادا کئے۔ افسوس کے ساتھ پوچھا۔ شیخ کو اس مسئلہ کی خبر نہ تھی؟ کہ اس برہمن بیچارے کو مار ڈالا۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا البتہ شیخ عالم ہے۔ باوجود اس روایت کے جو دیدہ و دانستہ قتل کا حکم دیا۔ ظاہر یہی ہے کہ کوئی مصلحت ہوگی۔ فرمایا وہ مصلحت کیا ہے۔ میں نے کہا یہی کہ فتنہ کا دروازہ بند ہو۔ اور عوام میں جرأت کا مادہ نہ رہے۔ ساتھ شفائے قاضی عیاض کی روایت نظر میں تھی وہ بیان کی۔ بعض خبیثوں نے کہا۔ کہ قاضی ایاز تو مالکی ہے۔ اس کی بات حنفی ملکوں میں سند نہیں ہے۔ بادشاہ نے مجھ سے کہا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا اگرچہ مالکی ہے لیکن اگر مفتی محقق سیاست پر نظر کرکے اس کے فتوے پر عمل کرے۔ تو شرعاً جائز ہے۔ اس باب میں بہت قیل و قال ہوئی۔ بادشاہ کو لوگ دیکھتے تھے۔ کہ شیر کی طرح مونچھیں کھڑی تھیں۔ اور پیچھے سے مجھے منع کر رہے تھے کہ نہ بولو۔ یکبار بگڑ کر فرمایا۔ کیا نامعقول باتیں کرتے ہو۔ فوراً تسلیم بجالا کر پیچھے ہٹا اپنی ذیل میں آن کھڑا ہوا۔ اور اس دن سے مجلس مباحثہ اور ایسی جرأت سے کنارہ کرکے گوشہ اختیار کیا۔ کبھی کبھی دور سے کورنش کر لیتا تھا۔ شیخ عبدالنبی کا کام روز بروز تنزل پانے لگا اور آہستہ آہستہ کدورت بڑھتی گئی۔ دل پھرتا گیا۔ اوروں کو ترجیح ہونے لگی۔ اور نئے پرانے اختیار ہاتھ سے نکلنے لگے۔ دربار میں بالکل جانا چھوڑ دیا۔ شیخ مبارک بھی تاک میں لگے ہی رہتے تھے۔ انہی دنوں میں کسی مبارکباد کے لئے آگرہ سے فتح پور میں پہنچے۔ ملازمت کے وقت بادشاہ نے یہ سارا ماجرا سنایا۔ انہوں نے کہا کہ آپ خود مجتہد اور اپنے زمانہ کے امام ہیں۔ شرعی اور ملکی احکام کے اجرا میں ان کی ضرورت کیا ہے۔ کہ سوا شہرت بے اصل کے علم سے کچھ بہرہ نہیں رکھتے۔ بادشاہ نے کہا جب تم ہمارے استاد ہو۔ اور سبق تم سے پڑھا ہو۔ تو ان ملاّؤں کی منت سے مخلصی کیوں نہیں دیتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی بنیاد پر محضر اجتہاد تیار ہوا۔ کہ جس کی تفصیل شیخ مبارک کے حال میں نقل کی گئی ہے۔

شیخ صدر اپنی مسجد میں بیٹھے۔ اور بادشاہ اور اہل دربار کو بے دینی اور بدمذہبی سے بدنام کرنے لگے مخدوم الملک سے ان کی بگڑی ہوئی تھی۔ بُرا وقت دیکھا۔ تو دونو ہمدرد مل گئے۔ ہر شخص سے کہتے تھے۔ کہ جبراً مہریں کروائیں۔ ورنہ یہ امامت کیا ہے اور عدالت کیا ہے۔ آخر مخدوم الملک کے ساتھ ہی انہیں بھی حج کو روانہ کر دیا۔ اور حکم دیا کہ وہیں عبادت الٰہی میں مصروف رہیں بے حکم نہ آئیں بیگمات نے سفارش اور

شفاعت کی مگر قبول نہ ہوئی۔ کیونکہ روز نئی شکایتیں پہنچتی تھیں۔ اور ان سے بغاوت کے خطر پیدا ہوتے تھے۔
شیخ نے آخر حق رفاقت ادا کیا کہ ٹھکانے لگا دیا۔

کہ کنارے تو تجھے گور کے پہنچاتا ہے!	یہ مجھ عشق کے دریا کے تلاطم کا سلوک

لیکن اب بھی ظاہری عزت کو قائم رکھا۔ چنانچہ ایک فرمان شرفائے مکہ کے نام لکھا۔ اور اکثر تحائف ہندوستان کے اور بہت سا زرنقد روانہ کیا کہ شرفائے موصوف اشخاص خاص کو دیں۔ یہ وہاں پہنچے۔ تو نئی دنیا نظر آئی۔ ان کے فضل و کرامت کو مکہ اور مدینہ میں کیا وزن ہو سکتا تھا۔ ان کے علم و فضل کو علمائے عرب کب خاطر میں لاتے تھے۔ اور خاطر میں کیا لاتے مسائل علمی تو بالائے طاق بڈھے بیچاروں کے منہ سے ان کے سامنے پوری بات بھی نہ نکلتی تھی۔ ساتھ اس کے جب ہندوستان کے جاہ و جلال اور حکومتوں کے مزے یاد آتے ہوں گے۔ تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہوں گے۔ اور کچھ بس نہ چلتا تھا۔ اکبر اور اس کے خیرخواہوں کو اس طرح بدنام کرتے تھے۔ کہ ادھر روم اُدھر بخارا تک آواز پہنچتی تھی۔

۹۸۹ھ میں پھر بادشاہ نے اہل حج کا قافلہ روانہ کیا۔ بادشاہی میر حاج ساتھ گیا۔ شرفائے مکہ کے نام لکھا اور اس میں یہ بھی درج کیا۔ کہ ہم نے شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کے ہاتھ زرنقد اور اکثر تحائف ہندوستان کے روانہ کئے تھے۔ ہر فرقہ اور مقام کے لوگوں کے لئے رقمیں تھیں۔ کہ بموجب فہرست کے دیدینا وہاں بحصہ رسدی ہر شخص کو تقسیم ہو۔ اور فہرست سے الگ بھی کچھ روپیہ دیا تھا۔ کہ بعض بعض اشخاص کو خفیہ طور پر دینا۔ اور اس میں کسی اور کا حق نہیں۔ یہ خاص انہیں اشخاص کا حصہ ہے۔ اور یہ رقم فہرست میں نہ لکھی تھی۔ شیخ صدر کو یہ بھی حکم تھا کہ جو عجیب و نفیس چیزیں اُدھر کے ملکوں میں ملیں وہ لے لینا اور اس مد کے لئے جو رقم دی گئی تھی۔ اگر کافی نہ ہو۔ تو جو رقم خفیہ دینے کو دی ہے۔ اس میں سے روپیہ لے لینا۔ پس یہ لکھیئے۔ کہ آپ کو انہوں نے کتنا روپیہ پہنچایا۔ یہ بھی سنا گیا ہے۔ کہ بعض بدعمل شریروں نے فضائل مآب کمالات اکتساب شیخ معین الدین ہاشمی شیرازی کے باب میں حسد و عداوت سے تہمت لگائی ہے اور اس کی ایذا و اہانت کے درپے ہوئے ہیں۔ اور مشہور کیا ہے۔ کہ فاضل موصوف نے ہمارے نام پر کوئی رسالہ لکھا ہے اس میں بعض باتیں ملت برحق اور شریعت پاک کے مخالف درج کی ہیں نعوذ باللہ من شرور انفسہم اس کی تصنیفات سے کوئی شے۔ کہ خلاف معقول و منقول ہو۔ ہرگز ہرگز سماعت اشرف تک نہیں پہنچی۔ اور جب سے فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ کوئی امر تقوے و پرہیزگاری اور اطاعت شرع مصطفوی کے سوا نہیں دیکھا گیا۔ ان شریروں بدکاروں حاسدوں شیطانوں کو تنبیہ کرو اور سزا دو۔ اور فاضل مذکور کو ان فتنہ پردازوں اور مفسدوں کے ظلم سے چھڑاؤ اور تعجب اُن لوگوں سے ہے۔ کہ ایسے طوفان شیطان جنہیں

بے عقل بچے بھی یقین نہ کریں۔ وہ سُن کر کس طرح مان گئے۔ اور شیخ معین الدین جیسے شخص کے درپے آزار ہو گئے۔ ایسے لوگوں کو مقامات متبرکہ سے نکال کر پھر نہ آنے دو۔

قسمت کی گردش دیکھو۔ کہ انہیں بھی مخدوم الملک کے ساتھ ہندوستان کو پھرنا مصلحت معلوم ہوا ؎

گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے | تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

اے حضرات! خانہ خدا میں پہنچ لئے۔ جب ایک دفعہ ہندوستان کا مُنہ کالا کر چکے۔ تو پھرنا کیا تھا۔ مرزا بیدل نے کیا خوب کہا ہے ؎

رفتن و نا آمدن باید ز آب آموختن | خانہ ویرانی بہ عالم از حباب آموختن

مگر روئے طمع سیاہ قسمت کا لکھا پورا ہونا تھا۔ وہ کھینچ کر لایا۔ اور خانہ خدا سے اس طرح بھاگے۔ جیسے قیدی کالے پانی سے بھاگتا ہے۔ سبب وہی تھا۔ کہ چند مہینے پہلے یہاں ممالک شرقی میں امرا نے بغاوتیں کی تھیں۔ انہیں کے سلسلے میں محمد حکیم مرزا کابل سے چڑھ کر پنجاب پر آیا۔ اور لاہور کے میدان میں آن پڑا۔ یہ خبریں وہاں بھی پہنچیں۔ بڑھاپا تھا۔ مگر بجھے ہوئے ذوق و شوق کے کوئلے چمک اٹھے۔ یہ بھی اور مخدوم جی بھی سمجھے کہ حکیم مرزا ہمایوں کا بیٹا ہے۔ یہ وہ بندوبست کریگا۔ کچھ ہم دینداری کے زور لگائیں گے۔ اکبر کو بیدین کرکے اکھاڑ پھینکیں گے۔ نوجوان لڑکا بادشاہ ہوگا۔ یہ پرانی جڑیں بھی پھر ہری ہو جائیں گی۔ اس کی شاہی ہوگی۔ ہماری خدائی ہوگی ؎

دنیا فراخ است اے پسر تو گوشۂ ما گوشۂ | ہم چوں ملخ اے کشتہ شہ تو خوشۂ ما خوشۂ

یہاں دربار میں انتظام کی چلتی ہوئی کلیں تیار ہو گئی تھیں۔ انہیں مہینے بلکہ برس لگے یہاں دونوں کے اندر سب بندوبست ہو گئے۔ ان غریبوں کو ہندوستان کی ہوس کھینچ کر لائی تھی۔ افسوس کہ اخیر وقت میں خراب ہوئے۔ اُس وقت کمبایت اُتاری کا بندر تھا۔ احمد آباد گجرات میں آئے۔ تو معلوم ہوا کہ سبحان اللہ وہاں سے لے کر ہندوستان پنجاب کابل تک ایک میدان ہے۔ اور سونے چاندی کا دریا ہے۔ کہ امڈا آتا ہے یا باغ ہے کہ لہلہاتا ہے۔ مخدوم تو وہیں جاں بحق ہوئے ؎

شب فراق میں آخر تڑپ کے مر گئے ہم | بھلا ہوا کہ نہ دیکھی سحر جدائی کی

شیخ صدر فتح پور کے دربار میں آ کر حاضر ہوئے۔ یہاں عالم ہی اور تھا۔ پیر کہن سال نے جب دیکھا تو عقل حیران اور مُنہ کھلا رہ گیا۔ کہ الٰہی یہ وہی ہندوستان ہے۔ یہ وہی دربار ہے جس میں شاہانہ دین دار کے جلوس تھے۔ اب دو ستون جو ایوان سلطنت کو اٹھائے کھڑے ہیں۔ وہی فضل و فیضی ہیں مبارک کے بیٹے۔ جو گوشۂ مسجد میں بیٹھا طالب علموں کو پڑھاتا تھا۔ سو بھی پکار کر نہیں۔ چھپکے چھپکے۔ اے پروردگار

، تیری شان - اے پروردگار تیری قدرت ع

	کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی	

یہاں بھی پہنچانے والوں نے خبریں پہنچا دی تھیں۔ اکبر کی بیدینی اور بداعتقادی کے باب میں جو جو باتیں ان کی برکت سے مکہ اور مدینہ میں مشہور ہوئی تھیں۔ حرف بحرف بلکہ حاشیہ چڑھ کر آئی تھیں اکبر آگ بگولا ہو رہا تھا۔ جب گفتگو ہوئی تو ادھر کہن سال کی پرانی عادتیں خدا جانے کیا کہہ دیا۔ یہاں اب خدائی کے دعوے شعر

الٰہی دیکھئے صحبت برار ہو کیونکر	زباں دراز ہوں میں اور بدزباں صیاد

خود بادشاہ نے انہیں کچھ سخت الفاظ کہے (الٰہی تیری امان) یہ وہی شیخ صدر ہیں۔ جن کے گھر میں خود حصول سعادت کے لئے جاتے تھے۔ جس ہاتھ سے جوتی ان کے سامنے رکھی۔ آج وہی ہاتھ تھا۔ کہ اس عالم کہن سال کے منہ پر زور کا مکا ہو کر پڑا۔ اس وقت اس بیچارے نے اتنا کہا کہ بکارد چرا نمے زنی ✦

جب مکہ کو بھیجا تھا تو اہل قافلہ کے خرچ اور وہاں کے علما و شرفا کے لئے ستر ہزار روپیہ بھی دیا تھا۔ ٹوڈرمل کو حکم ہوا۔ کہ حساب سمجھ لو۔ اور تحقیقات کے لئے شیخ ابوالفضل کے سپرد کر دیا۔ دفترخانہ کی کچہری میں جس طرح اور کروڑی قید تھے۔ اسی طرح یہ بھی قید تھے۔ اور وقت پر حاضر ہوتے تھے۔ شان الٰہی! جن مکانوں میں وہ خود دربار کرتے تھے۔ اور امرا اور علما حاضر ہوتے تھے۔ کوئی پوچھتا نہ تھا۔ آج وہاں خود جواب دہی میں گرفتار تھے۔ غرض مدت تک یہی حال تھا۔ اور شیخ ابوالفضل کی حوالات میں تھے۔ ایک دن سنا کہ رات کو گلا گھونٹ کر مروا ڈالا[1]۔ اور یہ بھی بادشاہ کا اشارہ لے کر کیا تھا۔ دوسرے دن عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ اور مناروں کے میدان میں لاش پڑی تھی۔ ملا صاحب کس قدر خفا تھے۔ اس مرحوم کا دم نکل گیا اور ان کا غصہ نہ نکل چکا۔ ترحم اور مغفرت تو درکنار فرماتے ہیں ✦

شبے او را خفہ کردند وبحق واصل شد۔ در روز دیگر درمیان منارہا تا نماز دیگر افتادہ بود ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار و شیخ کنبی تاریخ یافتند

گرچہ ایں شیخ کالنبی گفتند	کالنبی نیست شیخ ماکنبی ست

یہ شعر اکثر اشخاص اُن کی شان میں پڑھا کرتے تھے (کنب - بھنگ) اور (بحق واصل شد) کے لفظ کو دیکھو اس میں کیا کام کر گئے۔ چاہو یہ سمجھ لو۔ کہ ذات حق کے ساتھ وصل ہو گئے۔ چاہو یہ کہو کہ امر حق کو پہنچ گئے ✦

---

[1] معتمد خاں نے اقبال نامہ میں صاف لکھ دیا ہے۔ کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے اشارہ سے مروا ڈالا ✦

شیخ مبارک اللہ

عرف شیخ مبارک

زمانے میں دستور ہے۔ کہ بیٹے کا پتا باپ کے نام سے روشن ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بڑا مبارک باپ ہے جو خود کمال سے صاحب برکت ہو۔ اور بیٹوں کی ناموری اس کے نام کو زیادہ تر روشن کرے۔ یعنی کہا جائے کہ یہ وہی شیخ مبارک ہے۔ جو فیضی اور ابوالفضل کا باپ تھا۔ وہ علوم عقلی میں حکیم الٰہی اور علوم نقلی میں صاحب اجتہاد تھا۔ اور شیخ اس کا خاندانی لقب تھا۔ وہ نام کا مبارک تھا مگر مقدر ایسا منحوس لایا تھا۔ کہ اہل حسد کی عداوت سے دو ثلث اپنی زندگی کے یعنی ۶۳ برس اس مصیبت میں کاٹنے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ حریف ہمیشہ فوجیں باندھ باندھ کر اس پر حملے کرتے رہے۔ اور وہ ہمت کا پورا۔ تسبیح ہاتھ میں عصا آگے رکھے بیٹھا تھا سبق پڑھاتا تھا یا کتاب دیکھتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ دیکھیں تمہارے حملے مارتے ہیں۔ کہ ہمارا تحمل۔ باوجود فضائل و کمالات کے جب اُس کی مصیبت دیکھی جاتی ہے۔ اور بعد اُس کے بیٹوں کی قابلیت و اقبال کے ساتھ اُس جاہ جلال پر نظر کی جاتی ہے تو ایک داستان قابل عبرت معلوم ہوتی ہے ✣

مختلف نوشتوں اور کتابوں سے ان کے نہایت جزوی جزوی حالات معلوم ہوئے۔ میں بھی جہاں تک ممکن ہوگا۔ چھوٹے سے چھوٹا نکتہ نہ چھوڑونگا۔ اور اہل نظر کو دکھاؤنگا۔ کہ ان باکمالوں کی کوئی بات ایسی نہیں۔ جو غور کے قابل نہ ہو۔ چاہا تھا کہ اس مقام پر ان کے نسب نامہ کو قلم انداز کردوں۔ مگر ان جبتوں اور دستاروں میں بھی ایسے پیچیدہ راز نظر آتے ہیں جنہیں کھولے بغیر آگے نہیں چلا جاتا۔ ناظرین عنقریب معلوم کریں گے کہ ان کے کمال نے زمانے کو کس قدر ان کی مخالفت پر مسلح کیا تھا۔ زیادہ تر دشمن ان کے ہم پیشہ بھائی یعنی علما و فضلا تھے تاریخیں لکھتے ہیں کہ لوگوں کو ان کے نسب میں کچھ طعن تھا۔ چنانچہ بیٹوں کے ایک خط کے جواب میں شیخ مبارک نے دشمنوں کی تہمت کو دھویا ہے۔ اور انہیں تسلی دی ہے۔ بیٹوں کا خط نہیں ہاتھ آیا ✣

خط شیخ مبارک بنام ابوالفضل فیضی

بابائے من۔ از فضلائے ایں عہد کہ ہمہ جو فروش و گندم نما اند و دیں را بدنیا فروختہ تہمت آں بر ما بستہ اند از گفتہ حرف آنہا نباید رنجید۔ و از انکہ از طرف سنجی بت ما گفتگو دارند۔ دل پریشان نباید نمود۔ در ایامے کہ والد من تفویض و ودیعت حیات نمود۔ من بحد تمیز نہ رسیدہ بودم۔ والدۂ من مرا در سایۂ عواطف یکے از سادات

ذوے الاحترام درکمال عسرت پرورش مے داد۔ لود رتربیت من ازطرف درس علمی ودیگر تادیب کمال سعی بکارمے برد ازانکہ پدرم مراحسب فرمودۂ بزرگے مسوم بہ مبارک ساختہ بود۔ روزے یکے ازہمسایہ ہائے مسند پیشۂ آں سید والانژاد کہ غمخواری وتیمارداری مابکیساں می نمود مادرم رابکلمات درشت رنجانیدہ مرا بعدہ بخابت مطعون نمود۔ والدہ ام گریہ کناں نزد آں سید والا مقام کہ از نسب وحسب پدرم اطلاع داشت ۔ رفتہ نالش تعدی اونمود۔ وآں سید او را زجر و توبیخ تمام نمود۔ الحال الحمدللہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ ماوشمارا ازفضل بے پایان خویش در سایۂ لطف وکرم بادشاہ عادل باذل فخر زمین وزمن بدیں رتبہ وپایہ رسانیدہ کہ فضلائے عصر از راہ ہم چشمی حسدے وارند و رشک مے برند۔ الیٰ آخرہٖ ۔

اس خط کے انداز سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لوگ انہیں لونڈی بچہ یاغلام بچہ کہتے ہونگے ۔کیونکہ مبارک اکثر غلاموں کانام ہوتاہے۔ابوالفضل نے اکبرنامہ کے خاتمے میں اپنا نسب نامہ اس طوالت سے لکھاہے ۔ کہ میں حیران تھا۔ اس طول کاسبب کیا ہوگا۔جب یہ رقعہ نظرسے گذرا توسمجھا کہ وہ دل کا بخار بے اس تفصیل کے نہیں نکل سکتا تھا۔

خلاصۂ تحریر ابوالفضل آئین اکبری کے خاتمے میں

اگرچہ خاندان کی نسب سرائی کرنی ایسی ہے۔ جیسے کوئی کمال درجہ کامفلس بزرگوں کی ہڈیاں لیکر سوداگری کرے۔ یاناوانی کی جنس کو بازار میں ڈالے۔ اپنے عیب کو نہ دیکھے اورغیروں کے ہنر پر آپ فخر کرے دل نہ چاہتاتھا کہ کچھ لکھوں اوربےحاصل افسانہ سناؤں۔ دنیامیں اس سلسلے کا پابند کسی منزل کو نہیں پہنچتا ۔اور صورت کے چشمے سے معنی کاباغ ہرا نہیں ہوتا ؎

چو ناداناں نہ دربند پدر باش	پدر بگذار و فرزند ہنر باش
چو دود از روشنی نبود نشاں مند	چہ حاصل زانکہ آتش راست فرزند

زمانے کے محاورے میں نسب۔تخمہ۔نژاد۔ذات وغیرہ اسی کو کہتے ہیں۔ اور اُسے بلند اورپست درجوں میں پابند کرتے ہیں۔ہشیار دل آگاہ جانتا ہے۔کہ ان درجوں کے معنے یہ ہیں۔ کہ باپ داوا کاسلسلہ جوبرابر چلا آتاہے۔گویا اس لڑی کے دانوں میں سے ایک کو لے لیا۔ اورجو ان میں ظاہری امارت یاحقیقت شناسی میں بڑا ہوا اورکسی نام یالقب یاسکونت کے سبب سے مشہور ہوگیا۔ اس کوباپ داداکہہ کرفخر کرنے لگے۔عام لوگ سب کو آدم صفی اللہ کی اولاد کہتے ہیں۔سمجھ والے لوگ ان قصہ خوانوں کی باتوں پر دل لگاکر اُدھرخیال نہیں کرتے۔ اور فاصلے کی دوری دیکھ کر بیچ کی فصلوں کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔جو بیدار دل سعادت کو چُن لیتے ہیں۔ وُہ ان کہانیوں کو خواب راحت کاسامان کیوں سمجھیں۔ اوران کمالوں پرتکیہ کرکے تلاش حقیقت سے کیوں باز رہیں ۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی	کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

قسمت کا لکھا کہ مجھے ایسے ہی صورت پرستوں اور رسم کے بندوں میں ڈال دیا۔ اور ایسے گروہ میں ملا دیا جو کہ خاندان کے فخر کو کمال سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ناچار کچھ وہ بھی لکھ دیتا ہوں۔ اور ویسے لوگوں کے لئے بھی دسترخوان لگا دیتا ہوں۔ بزرگان کرام کا شمار ایک لمبی کہانی ہے۔ مگر زندگی کے دم بڑے قیمتی ہیں۔ ان نالائق باتوں کے عوض میں انہیں کیونکر بیچوں۔ خیر یہی سمجھ لو۔ کہ کچھ ان میں سے علوم رسمی میں۔ کچھ لباس امیری میں۔ کچھ دنیاداری میں۔ کچھ خلوت اور گوشہ نشینی میں زندگی بسر کر گئے۔ مدت تک یمن کی زمین ان بیدار دلوں کا وطن تھا۔ شیخ موسیٰ پانچویں پشت میں میرے دادا تھے۔ انہیں ابتدائے حال میں خلق سے وحشت ہوئی۔ گھر اور گھرانے کو چھوڑ کر غربت اختیار کی۔ علم و عمل کو رفاقت میں لیا اور معمورۂ جہان کو عبرت کے قدموں سے طے کیا۔ نویں صدی میں علاقہ سندھ قصبۂ ریل میں پہنچ کر گوشہ نشین ہوئے۔ اور خدا پرستان حقیقت کیش سے دوستی کا پیوند کر کے خانہ داری اختیار کی۔ ریل ایک دلچسپ آبادی علاقہ سیوستان میں ہے۔ شیخ موسیٰ اگرچہ جنگل سے شہر میں آئے۔ مگر دنیا کے تعلقوں میں پابند نہ ہوئے آگاہی کا سجادہ بچھا تھا۔ اور بے بدل زندگی کو نقش بوقلموں کی اصلاح میں صرف کرتے تھے۔ بیٹے پوتے ہوئے۔ وہ بھی انہیں کے عمل درآمد کو آئین سمجھتے تھے۔ دسویں صدی کے شروع میں شیخ خضر کو آرزو ہوئی کہ ہند کے اولیاء کو بھی دیکھیں۔ اور دریائے عرب کی سیر کر کے اپنے بزرگوں کی نسل سے ملاقات کریں۔ بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ ہند میں آئے۔ ناگور[1] میں پہنچے (یہاں کئی بزرگوں کا نام لکھ کر کہتے ہیں) ان سے صورت و معنی کا فیض پایا۔ اور انہی بزرگوں کے ایما سے مسافرت کے ارادہ کو سکونت سے بدل کر لوگوں کی ہدایت میں مصروف ہوئے۔ پہلے کئی بچے مر گئے تھے۔ ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک نے ملک معنی سے آ کر عالم وجود میں ہستی کی چادر کندھے پر ڈالی۔ اس لئے مبارک اللہ نام رکھا۔ کہ اللہ مبارک کرے۔ چار برس کی عمر تھی کہ بزرگوں کی قوت تاثیر سے عقل و آگاہی کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی۔ ۹ برس کی عمر میں سرمایۂ کمال بہم پہنچایا۔ ۱۴ برس کی عمر میں علوم رسمی حاصل کر لئے۔ اور ہر ایک علم میں ایک ایک متن یاد کر لیا۔ اگرچہ عنایت ایزدی ان کی قافلہ سالار تھی۔ بہت بزرگوں کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ مگر شیخ عطن کے پاس زیادہ تر رہتے تھے۔ اور ان کی تعلیم سے دل کی پیاس اور زیادہ ہوتی تھی ۔

شیخ عطن ترک نژاد تھے۔ ۱۲۰ برس کی عمر پائی۔ سکندر لودھی کے زمانہ میں ناگور کو وطن اختیار کیا اور شیخ سالار ناگوری سے خداشناسی کی آنکھیں روشن کیں۔ ایران توران اور دور دور کے ملکوں سے عقل و آگاہی کا سرمایہ لائے تھے۔

---

[1] ناگور اجمیر کے شمال مغرب میں ہے ۔

اس عرصہ میں شیخ خضر کو پھر سندھ کا خیال ہؤا۔ کہ چند رشتہ دار وہاں ہیں انہیں جاکر لے آئیں۔ لیکن یہ سفر انہیں آخرت کا سفر ہؤا۔ یہاں ناگور میں بڑا قحط پڑا اور ساتھ ہی وبا آئی۔ کہ آدمی آدمی کو نہ پہچانتا تھا۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ آئے۔ اس آفت میں شیخ مبارک اور ان کی والدہ رہ گئیں۔ باقی سب مر گئے۔ شیخ مبارک کے دل میں تحصیل علم اور جہاں گردی کا شوق جوش مار رہا تھا۔ مگر والدہ اجازت نہ دیتی تھی۔ اور خود سری طبیعت میں نہ تھی۔ وہیں اصلاح طبیعت میں مصروف رہے۔ اور تحصیل علوم اور کسب فنون نہایت کاوش اور کاہش سے کرتے رہے۔ فن تاریخ اور عام احوالات سے ایسی آگاہی حاصل کی جس کی بدولت عالم میں مشہور ہوگئے۔ چند روز کے بعد خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت میں پہنچے۔ کہ وہ ان دنوں نوشدارو حقیقت کی جستجو میں سیاحی کرتے ہندوستان میں آنکلے تھے۔ اُن سے تلاش الٰہی کا رستہ معلوم کیا۔ اور بہت سے فیض معنوی حاصل کئے۔

نوٹ۔ خواجہ احرار نے ۱۴۰ برس کی عمر پائی۔ بڑی بڑی سیاحیاں کیں اور ۴۰ برس ختا و ختن کے ملکوں میں بسر کئے۔ وہ شیخ مبارک پر نہایت شفقت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات و ملفوظات میں جہاں درویشے پرسید و در ویشے گفت آتا ہے۔ اس سے شیخ مبارک ہی مراد ہیں۔ خواجہ احرار ۲۰ جنوری ۱۴۹۰ء کو سمرقند میں فوت ہوئے۔ ان کا نام حضرت اہل اللہ میں خواجہ خواجگان مشہور رہے۔

اس عرصے میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ دل کی وحشت دوبالا ہوئی دریائے اسود کا رُخ کیا۔ ارادہ تھا۔ کہ کرۂ زمین کا دورہ کریں۔ اور فرقہ فرقہ اشخاص سے ملاقات کر کے فیض کمال حاصل کریں۔ احمد آباد گجرات میں پہنچے۔ وہ شہر اپنی شہرت کے بموجب اہل کمال کی جمعیت سے آراستہ تھا۔ اور ہر طرح کی تکمیل کا سامان موجود تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ سید احمد گیسو دراز کی درگاہ سے فیض برکت کے چشمے بہتے ہیں۔ اور وُہ ان کے ہم وطن بھی تھے۔ غرض یہاں سفر کی خورجین کندھے سے ڈال دی۔ علما و فضلاء سے ملاقات ہوئی تحصیل میں تدریس کا سلسلہ جاری ہؤا۔ چاروں اماموں کی کتابیں اصولاً و فروعاً حاصل کیں اور ایسی کوششیں کیں۔ کہ ہر ایک میں اجتہاد کا مرتبہ پیدا ہوگیا۔ اگرچہ اپنے بزرگوں کی پیروی کر کے حنفی طریقہ رکھا۔ مگر عمل میں ہمیشہ انتہائی درجہ کی احتیاط کرتے رہے۔ بڑا خیال اس بات کا تھا کہ جو کچھ نفس سرکش کو مشکل معلوم ہو وہی ہو۔ اسی عرصے میں علم ظاہری سے علم معنوی کی طرف گذر ہؤا۔ بہت سی کتابیں تصوف اور علم اشراق کی دیکھیں۔ بہتیری تصنیفیں منطق اور الٰہیات کی پڑھیں۔ خصوصاً حقایق شیخ محی الدین عربی اور شیخ ابن فارض اور شیخ صدر الدین قونوی اور بہت سے اہل حال اور اہل قال کی تصنیفات نظر سے گذریں۔ نئے نئے نکتے حل ہوئے اور عجب عجب پردے دل پر سے اُلٹے۔

پروردگار کی بڑی نعمتوں سے ایک نعمت یہ ملی کہ خطیب ابوالفضل گازرونی کی ملازمت حاصل

ہوئی۔ انہوں نے قدر دانی اور آدم شناسی کی آنکھوں سے دیکھا۔ اور بیٹا کو لیا۔ بہت سا معقولات کا سرمایہ دیا۔ اور ہزاروں باریکیاں۔ تجرید۔ شفا۔ اشارات۔ تذکرہ اور مجسطی کی کھولیں۔ اس صحبت میں حکمت کے بستاں سرانے اور ہی طراوت دکھائی۔ اور بینش و بصیرت کا چشمہ رواں ہوگیا۔ خطیب دانشمند کو شاہان گجرات کی کشش و کوشش نے شیراز سے کھینچا تھا۔ چنانچہ انہی کی برکت نے اُس ملک میں علم و حکمت کا خزانہ کھولا۔ اور دانش و دانائی کو نئی روشنی دی۔ انہوں نے انبوہ در انبوہ زمانے کے دانشوروں کو دیکھا تھا۔ اور ان سے بہت کچھ پایا تھا۔ مگر علوم حقیقی و فنون عقلی میں مولانا جلال الدین دوانی کے شاگرد تھے۔

شیخ مبارک نے وہاں اور عالموں اور خدا رسیدہ بزرگوں کی خدمت سے بھی سعادتوں کے خزانے بھرے۔ اور تصوف کے کئی سلسلوں کی سند لی۔ شیخ عمر ٹھٹوی کی خدمت سے بڑا نور حاصل کیا۔ اور سلسلۂ کبرویہ کا چراغ روشن ہوا۔ شیخ یوسف مجذوب ایک مست آگاہ دل ولی کامل تھے۔ ان کی خدمت میں جانے لگے۔ اور خیال اس بات پر جما کہ علمی معلومات کو دل سے دھوکر علوم حقیقی کا خیال باندھیں اور دریائے شور کا سفر کریں۔ شیخ موصوف نے فرمایا کہ دریا کے سفر کا دروازہ تمہارے لئے بند ہوا ہے۔ آگرہ میں جاکر بیٹھو۔ اور وہاں مقصد نہ حاصل ہو تو ایران و توران کا سفر کرو۔ جہاں حکم ہو وہاں بیٹھ جاؤ اور اپنی حالت پر علم ظاہری کی چادر کا پردہ کرلو (کہ تنگ ظرفوں کے دل حقایق معنوی کی برداشت نہیں رکھتے)۔

۶ محرم ۹۵۰ھ کو آگرہ میں آکر اُترے کہ ہمت کی چڑھائی کی پہلی منزل تھی۔ شیخ علاؤ الدین مجذوب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس شہر اقبال میں بیٹھو۔ اور سفر کا خاتمہ کرو۔ ایسی بشارتیں دیں کہ وہاں سے قدم اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ شہر کے مقابل دریائے جمنا کے اُس پار کنارہ پر چار باغ[1] کی بستی تھی۔ وہاں میر رفیع الدین صفوی چشتی انجوی[2] کے ہمسائے میں اُترے۔ اور ایک قریشی گھرانے میں کہ علم و عمل سے آراستہ تھا۔ شادی کی۔ سید موصوف محلّے کے رئیس تھے۔ ان کے رہنے کو غنیمت سمجھے۔ آشنائی ہوئی تھی۔ دوستی ہوگئی۔ گرمجوشی اور شگفتگی سے ربط ہوگیا۔ وہ صاحب دولت اور صاحب دستگاہ تھے۔ انہوں نے اپنے رنگ میں ملانا چاہا۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اور توکل کے آستانہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اندر حق شناسی کے شغل تھے۔ باہر درس و تدریس۔

جب ۹۵۴ھ میں سید موصوف کا انتقال ہوگیا۔ تو شیخ مبارک نے پھر گوشۂ عزلت سنبھالا۔ بڑا شغل و شش کا یہی تھا کہ باطن کو دھوتے رہتے تھے۔ اور ظاہر کو پاک رکھتے تھے۔ بیٹے نیاز کارساز حقیقی کی طرف

[1] پہلے اسے چار باغ کہتے تھے۔ پھر ہشت بہشت ہوا۔ بابر نے نئی بنیاد ڈال کر زر افشاں کہلوایا۔ اب رام باغ کہلاتا ہے [2] انجو شیراز میں واقع ہے ۱۲

کیا۔ اور علوم و فنون کے درس میں دل بہلانے لگے۔ اوروں کی گفتگوؤں کو اپنے حال کا پردہ کرلیا۔ خواہش کی زبان کاٹ ڈالی۔ معتقدوں میں سے کوئی با احتیاط آدمی اخلاص سے نذر لاتا۔ تو ضرورت کے قابل لے لیتے۔ باقی لوگوں سے معذرت کرکے پھیر دیتے اور ہمت کے ہاتھ اس سے آلودہ نہ کرتے۔ ۹۵۴ھ ۱۵۴۷ء ۴۳ برس کی عمر میں فیضی اور ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء ۴۷ برس کی عمر میں ابوالفضل یہیں پیدا ہوئے ؛

چند روز میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک اسی چشمے پر آنے لگے۔ اور داناؤں اور دانشوروں کا گھاٹ ہوگیا۔ بعضے حسد کے مارے سازشیں کرنے لگے۔ بعضے محبت سے ملے اور رفیق خلوت ہوگئے۔ شیخ مبارک کو نہ اس کا رنج تھا۔ نہ اس کی خوشی تھی۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ نے اور بعض اور لوگوں نے چاہا۔ کہ یہ خزانہ شاہی سے کچھ لیں اور جاگیر مقرر ہو جائے۔ ہمت بلند تھی۔ نظر نہ جھکی۔ اس سے ترقی کا رتبہ اور بڑھا۔ پرہیزگاری اور احتیاط کا یہ عالم کہ بازار میں کہیں گانا ہوتا۔ تو قدم اٹھا کر جلد نکل جاتے۔ چلتے تو دامن اور پائجامہ اونچا کرکے چلتے تھے۔ کہ نجس نہ ہو جائے۔ کوئی محفل میں نیچا پاجامہ پہن کر آتا تو جتنا زیادہ ہوتا پھڑوا ڈالتے۔ لال کپڑا پہنے دیکھتے تو اتروا ڈالتے۔ ظاہر پرست اور بوالہوس بنتے اور گھبراتے۔ انہیں مباحثوں کے جھگڑے اور دکانداری کی بھیڑ بھاڑ بڑھانی منظور نہ تھی۔ ہاں حق کے اظہار اور بدکاروں کی ملامت میں ذرا تخفیف نہ کرتے تھے۔ جو بد کہتے انہیں پر چاہتے نہ تھے ؛

چند عالم اس عہد کے خصوصاً جو کہ فضیلت اور پارسائی کے دعووں سے سلطنت میں دخیل تھے وہ شیخ مبارک سے سخت عداوت رکھتے تھے **مخدوم الملک** ملا عبداللہ سلطانپوری ہمایوں۔ شیر شاہ سلیم شاہ کے درباروں میں شریعت کے مالک بنے ہوئے تھے **شیخ عبدالنبی** مشایخ واجب التعظیم میں سے تھے ان کے کلاموں کی لوگوں کے دلوں میں تاثیر تھی۔ کیونکہ درباری زور کے ساتھ اپنے درس و تدریس مسجدوں کی امامت۔ خانقاہوں کی نشست اور مجلسوں کے وعظوں سے دلوں کو دبوچ رکھا تھا۔ چاہتے تو احکام سلطنت پر مخالفت شرع کا فتویٰ لگا کر خاص و عام میں ولولہ ڈال دیتے تھے۔ ان کی معرفت اکثر مقاصد بادشاہی رعایا سے آسان نکل آتے تھے۔ ان مصلحتوں پر نظر کرکے بادشاہ وقت بھی ان کی خاطرداری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ مقدمات سے بڑھ کر احکام سلطنت تک انہی کے فتووں پر منحصر تھے۔ جب یہ لوگ بادشاہوں کی محفل سے اٹھتے تھے۔ تو بڑے بڑے ارکان سلطنت اور اکثر خود بادشاہ لب فرش تک پہنچانے آتے تھے۔ بعض موقع پر خود بادشاہ ان کے سامنے جوتیاں سیدھی کرکے رکھ دیتے تھے ؛

شیخ مبارک کیا معلومات کتابی۔ کیا تحریر و تقریر میں۔ ان لوگوں کے بس کا نہ تھا۔ ایسے عالم کے خیالات کو بھی سمجھ لو کہ کیسے ہونگے۔ وہ ضرور ان بزرگوں کو خاطر میں نہ لاتا ہوگا۔ مولوی ملا نے دسترخوانوں کی مکھیاں ہوتے

ہیں۔ عام علما بیان مسائل اور فتاووں میں ملّائے مخدوم اور شیخ صدر کا منہ دیکھتے ہوں گے۔ شیخ مبارک پروا بھی نہ کرتا ہوگا اور سچ بھی ہے۔ جس کا علم دلیل ہر وقت حق پرستوں کا دائرہ گرد رکھتا ہو۔ اور خود دنیا کی دولت اور جاہ و منصب کی ہوس نہ رکھتا ہو اسے کیا ضرورت ہے۔ کہ جس گردن کو خدا نے سیدھا پیدا کیا۔ اُسے اوروں کے سامنے جھکائے۔ اور وہ رائے جسے قدرت سے آزادی کی سند ملی ہے۔ اُسے دنیا کے لالچ کے لئے نااہلوں کے ہاتھ بیچ ڈالے۔

جب کسی غریب مُلّا یا مشایخ پر مخدوم یا صدر کوئی سخت گرفت کرتے تو وہ بیچارہ شیخ کے پاس آتا تھا۔ شیخ کی شوخ طبیعت کو یہ شوق تھا۔ مسجد ہی میں بیٹھے بیٹھے ایک نکتہ ایسا بتا دیتے تھے کہ جب وہ جاکر جواب پیش کرتا تھا۔ تو حریف کبھی فقہ کی بغل جھانکتے تھے۔ کبھی حدیث کا پہلو ٹٹولتے تھے مگر جواب نہ پاتے تھے ایسی ایسی باتوں سے رقیب ہمیشہ اس کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اور رنگارنگ کی تہمتوں سے طوفان اٹھاتے تھے۔ چنانچہ ابتدا میں مہدویت کی تہمت لگائی۔ اصلیت اس کی فقط اتنی تھی۔ کہ شیرشاہ کے عہد میں شیخ علائی مہدوی ایک فاضل تھا۔ وہ جس طرح علم و فضل میں صاحب کمال تھا۔ اسی طرح پرہیزگاری میں حد سے گذرا ہوا تھا۔ اور حدت طبع نے اس کی سحربیانی کو آتش زبانی کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ یہ نہیں ثابت ہوتا۔ کہ شیخ مبارک اس کے معتقد یا مُرید تھے۔ لیکن خواہ اس سبب سے کہ طبیعت بھی ہمجنس طبیعت کی عاشق ہوتی ہے۔ اور ہم جنس طبیعتوں میں مقناطیسی کشش ہے۔ خواہ اس سبب سے کہ مخدوم الملک ان کے قدیمی رقیب اُس کے دشمن ہوگئے تھے۔ غرض تیز طبع پرہیزگاروں میں محبت اور صحبت کا سلسلہ ضرور تھا۔ اور شیخ مبارک اکثر جلسوں اور معرکوں پر اس کی رفاقت میں شامل ہوتے تھے۔ جو بات اس کی حق ہوتی تھی۔ بےخطر تصدیق کرتے تھے۔ بااقتدار دشمنوں کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ بلکہ جب اپنے جلسوں میں بیٹھتے تو حریفوں پر لطیفوں کے پھول پھینکتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ شیخ علائی بچارے مارے گئے۔ اور شیخ مبارک مفت بدنام ہوگئے۔

پہلے ہمایوں اور پھر شیرشاہ و سلیم شاہ کے وقت میں افغانی دور تھا۔ اس میں آئے دن کے تغیرات سے ملک کا حال بھی پریشان تھا۔ اور علمائے مذکور کا زور بھی زیادہ تھا۔ اس لئے شیخ مبارک عقل و دانش کا چراغ گوشہ میں بیٹھ کر روشن کرتے تھے۔ اور حقیقت کے نکتے چپکے چپکے کہتے تھے۔ جب ہمایوں پھر آیا۔ تو شیخ نے بےخطر ہو کر مدرسے کو رونق دی۔ اس کے ساتھ ایران و ترکستان کے دانا و دانش پسند لوگ آئے۔ ان سے علوم کا زیادہ چرچا پھیلا۔ ان کا مدرسہ بھی چمکا۔ اسی عرصے میں زمانے کی نظر لگی۔ ہمایوں مرگیا۔ ہیمو نے بغاوت کی علمی صحبتوں کی رونق جاتی رہی۔ بہت لوگ گھروں میں بیٹھ گئے۔ کچھ شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

شیخ کو اس قدر شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ کہ ہیمو نے بھی بعض صلاح مشوروں میں ان سے پیغام سلام کئے بلکہ شیخ کی سفارش پر اکثر اشخاص کی جاں بخشی اور مخلصی بھی کر دی۔ مگر یہ اس سے پیچھے نہیں ساتھ ہی قحط پڑا کہ تباہی عام خلقت پر عموماً اور خاص لوگوں کے لئے خصوصاً ارزاں ہو گئی۔ گھر اور گھرانے فنا ہو گئے ویرانی کا یہ عالم ہؤا کہ شہر میں گنتی کے گھروں کے سوا کچھ نہ رہا۔ شیخ کے گھر میں ان دنوں زن و مرد ۴۰ آدمی تھے لیکن اس بے پروائی سے گزران کرتے تھے کہ کوئی کہتا تھا کیمیا گر ہیں۔ کوئی جانتا تھا جادوگر ہیں۔ بعضے دن فقط سیر بھر اناج آتا تھا۔ اسے مٹی کی ہانڈی میں اُبالتے تھے۔ وہی آب جوش بانٹ کھاتے تھے۔ اور ایسے آسودہ نظر آتے تھے۔ گویا اس گھر میں روزی کا کچھ خیال ہی نہیں۔ عبادت کے سوا ذکر نہ تھا۔ اور شغل کتاب کے سوا فکر نہ تھا۔ اس وقت فیضی آٹھویں برس میں اور ابوالفضل پانچویں برس میں تھے۔ وہ اس عالم میں ایسے خوش رہتے تھے۔ کہ لوگ دنیا کی نعمتیں کھا کر نہ خوش ہوتے ہوں گے اور باپ ان سے زیادہ۔ کیونکہ وہ ہر طرح ان کی خوبیوں کا سرچشمہ تھا۔

جب اکبری دور شروع ہؤا۔ عالم میں امن ہؤا۔ شیخ کا مدرسہ پھر گرم ہؤا۔ اور علوم نقلی و عقلی کی درس و تدریس ایسی چمکی۔ کہ شیخ کے نام پر علم و کمال کے طلبگار ملک ملک سے آنے لگے۔ درباری عالموں کو آتش حسد نے پھر بھڑکایا۔ پرانے علم فروشوں کو اپنی فکر پڑی اور نوجوان بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے

دنیا جہاں احتیاجوں کا مینہ برستا ہے بہت بُری جگہ ہے۔ جس وقت کہ شیخ عبدالنبی صدر اہل حاجت کے لئے درگاہ تھا۔ اور ائمہ مساجد اور علما و مشایخ کو جاگیروں کے اسناد اُن سے ملتے تھے۔ شیخ مبارک دنیا کے صدموں سے لڑتے لڑتے تھک گیا۔ اس پر عیال کا انبوہ ساتھ تھا

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی | دنیا میں گرانبار ہے اولاد غضب ہے!

گذارہ کا رستہ ڈھونڈھنے لگا۔ کہ کسی طرح دن بسر کرے۔ وہ یہ بھی سمجھا ہوگا۔ کہ ان عالم نما زہد فروشوں میں میرا سرمایہ کس سے کم ہے۔ جو میں اپنا حصہ نہ مانگوں کہ میرا حق ہے۔ چنانچہ علم کے لحاظ سے دور نزدیک سمجھ کر شیخ صدر کے پاس گیا۔ پھر بھی اپنی آزادی کا پہلو بچایا۔ فیضی کو ساتھ لیتا گیا۔ اور عریضہ میں لکھا کہ سو بیگھہ زمین مدد معاش کے طور پر اس کے نام ہو جائے۔ شیخ صدر خدائی اختیار و نکے صدر نشین تھے۔ وہاں فقط عرضی داخل دفتر نہ ہوئی۔ بلکہ بڑی بے نیازی اور کراہت کے ساتھ جواب ملا کہ یہ رافضی مہدوی ہے نکال دو۔ عذاب کے فرشتے دوڑے اور فوراً اٹھا دیا۔ اللہ اللہ پیر کہن سال۔ کوہ کمال۔ دریائے دانش۔ دل پر کیا گذری ہوگی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر رہ گیا ہوگا اور آنے پر پچھتایا ہوگا۔ مگر زمانے نے کہا ہوگا نہ گھبرانا ہمارا مزاج خود ان معجونوں کی برداشت نہیں رکھتا۔ یہ پرانے برج تمہارے نوجوانوں کی گھڑ دوڑ

میں ڈھائے جائینگے اور جلد ڈھائے جائینگے ✦

علمائے مذکور نے ایک موقع پر چند اہل بدعت تشیع اور بدمذہبی کے جرم میں پکڑے۔ بعض کو قید کیا بعض کو جان سے مار ڈالا۔ ابوالفضل کہتے ہیں بعض بدگوہر میرے والد کو شیعہ سمجھ کر بُرا کہنے لگے اور نہ سمجھے کہ کسی مذہب کے اصول و فروع کو جاننا اور شے ہے اور ماننا اور شے ہے۔ خاص مقدمہ یہ ہوا کہ ایک سیّد عراق (ایران) کا رہنے والا یگانۂ زمانہ تھا وہ ایک مسجد میں امام تھا اور علم کے ساتھ عمل کا پابند تھا۔ علمائے وقت اس سے بھی کھٹکتے تھے۔ مگر اکبر کی توجہ ہر بات پر تھی۔ اس لئے کچھ صدمہ نہ پہنچا سکتے تھے۔ ایک دن دربار میں مسئلہ پیش کیا کہ میر کی پیش نمازی درست نہیں۔ یہ عراقی ہیں۔ اور حنفی مذہب کی ایک روایت ہے کہ اہل عراق کی گواہی معتبر نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جس کی گواہی معتبر نہیں اسکی امامت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔ امامت کے جانے سے سید کا گذارہ مشکل ہو گیا۔ وہ شیخ سے اتحاد برادرانہ رکھتا تھا۔ ان سے درد دل بیان کیا۔ انہوں نے بہت سی ہوش افزا تقریریں سنا کر اس کی خاطر جمع کی اور ردِّ جواب پر دلیری دے کر سمجھایا کہ یہ لوگ روایت کے معنے نہیں سمجھتے۔ جو سند لائے ہیں اس میں عراق سے عراق عجم مراد نہیں۔ عراق عرب مراد ہے۔ امام صاحب (امام ابوحنیفہ) کے وقت میں عراق عجم کا یہ حال کہاں تھا۔ جواب ہے۔ کتابوں میں فلاں فلاں مقام پر اس کی توضیح ہے۔ اور یہ سمجھنے کہ کسی مقام کے آدمی ہوں۔ سب یکساں نہیں ہیں۔ ایک اشرف اشراف ہیں۔ وہ حکما و علما و سادات ہیں۔ دوسرے اشراف۔ ان سے امرا اور زمیندار وغیرہ مراد ہیں تیسرے اوساط۔ ان سے اہل حرفہ اور اہل بازار مراد ہیں۔ چوتھے ادنےٰ اور رواج کہ وہ ان سے بھی نیچے ہیں۔ مقدمات میں ہر ایک کے لئے سزا کے بھی چار درجے رکھے ہیں۔ نیکی بدی کا موقع ہو تو اس آئین کی رعایت کیوں نہ ہو۔ اور بات درست ہے۔ اگر ہر مجرم کو برابر ہی گوشمالی دیں۔ تو شاہ راہ عدالت سے انحراف ہو۔ یہ سُن کر سید خوش ہو گئے اور تحریر حضور میں گذرانی۔ دشمن دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مگر سمجھ گئے۔ کہ اس آگ کی دیا سلائی کہاں سے آئی۔ اس قسم کی تائیدیں اور امدادیں کئی دفعہ کھلم کھلا بھی ہوئیں۔ (شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں) مسئلۂ مذکور جاہلوں میں شورش کا سرمایہ ہو گیا۔ سبحان اللہ گروہا گروہ خلائق کا اتفاق ہے۔ کہ کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں ایک نہ ایک بات کی کسر نہ ہو۔ اور ایسا بھی کوئی مذہب نہیں کہ سرتاپا باطل ہی ہو۔ اس صورت میں اگر ایک ماہر شخص اپنے مذہب کے برخلاف کسی غیر مذہب کے مسئلہ کو اچھا کہے تو اس کی باریکی پر غور نہیں کرتے۔ دشمنی پر تیار ہو جاتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شیخ مبارک کو مہدویت کے ساتھ تشیع کی بھی تہمت لگ گئی ✦

(ملا صاحب لکھتے ہیں) میں جس زمانہ میں شیخ مبارک سے پڑھتا تھا تو ایک فتوے شیخ کا لکھا ہوا لے کر میاں حاتم سنبھلی کے پاس گیا وہ بھی اُس زمانہ میں فاضل مسلّم الثبوت تھے۔ اور فقہ میں امام اعظم ثانی کہلاتے

تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ کہ شیخ کی مولویت کیسی ہے۔ میں نے ان کی علائی اور پارسائی اور فقر و مجاہدات و ریاضیات اور امر معروف اور نہی منکر کا حال جو کچھ جانتا تھا۔ بیان کیا۔ کہ شیخ اس زمانہ میں نہایت احتیاط کے ساتھ پابند تھے۔ میاں نے کہا کہ درست ہے۔ میں نے بھی بہت تعریف سنی ہے۔ مگر کہتے ہیں۔ کہ مہدویہ طریقہ رکھتے ہیں؟ یہ بات کس طرح ہے؟ میں نے کہا کہ میر سید محمد کی ولایت اور بزرگی تو مانتے ہیں۔ مگر مہدویت نہیں مانتے۔ میاں نے فرمایا کہ میر کے کمالات میں کسے کلام ہے ۛ

وہاں میر سید محمد میر عدل بھی بیٹھے تھے۔ میری گفتگو سُن کر وہ بھی متوجہ ہوئے۔ اور پوچھا کہ نہیں لوگ مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ نیکیوں کی تاکید اور بُرائیوں سے بشدت منع کرتے ہیں۔ پھر پوچھا میاں عبدالحی خراسانی (کہ چند روز صدر بھی کہلاتے تھے) ایک دن خانخاناں کے سامنے شیخ کی مذمت کر رہے تھے۔ تم جانتے ہو اس کا کیا سبب ہوگا؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ ایک دن شیخ مبارک نے انہیں رقعہ لکھا تھا۔ اس میں بہت باتیں نصیحت کی تھیں۔ از انجملہ یہ بھی تھا کہ تم مسجد میں نماز جماعت میں کیوں نہیں شامل ہوتے۔ میاں عبدالحی نے بُرا مانا۔ اور جماعت کی تاکید سے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ مجھے رافضی کہا ہے۔ میر عدل موصوف بولے۔ یہ استدلال تو ایسا ہے۔ کہ کوئی کسی کو کہے تم نماز جماعت نہیں پڑھتے۔ اور جو نماز جماعت نہ پڑھے وہ رافضی ہے۔ تو تم بھی رافضی ہو۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اس شخص کا کبریٰ مسلّم نہیں ہے اسی طرح یہ مقدمہ کہ شیخ امر معروف کرتا ہے۔ اور جو امر معروف کرتا ہے۔ وہ مہدوی ہے۔ یہ بھی نامسلّم ہے غرض معلوم ہوتا ہے۔ ان کے باب میں اس قسم کے چرچے خاص و عام میں رہتے تھے ۛ

اہل تجربہ جانتے ہیں۔ کہ دنیا کے لوگ جب حریف پر غلبہ دشوار دیکھتے ہیں۔ تو اپنے مددگاروں اور طرفداروں کی جمعیت بڑھانے کے لئے مخالفت مذہب کا الزام اس کے گلے باندھ دیتے ہیں۔ کیونکہ عوام الناس اس نام سے بہت جلد جوش میں آجاتے ہیں۔ اور اس بہانہ سے حریف کے خراب کرنے کو مفت کا لشکر ہاتھ آجاتا ہے۔ پس عجب نہیں۔ کہ جب علمائے مذکور نے شیخ مبارک کے فضل و کمال کو اپنے بس کا نہ دیکھا تو رنگ رنگ کے پہلوؤں سے بدنام کیا۔ سلیم شاہ کے عہد میں مہدویوں کی طرف سے بغاوت کا خطر تھا۔ اس وقت مہدویت کی علت لگائی۔ اکبر کے اوائل عہد میں ترکانِ بخارا کا ہجوم تھا۔ وہ ایرانی مذہب کے سخت دشمن تھے۔ اسکے وقت میں رافضی رافضی کہہ کر بدنام کر دیا۔ کہ وار پورا پڑے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ شیخ مبارک صاحب اجتہاد تھا۔ اور مزاج کا آزاد تھا۔ جس مسئلہ میں اُس کی رائے شیعوں کی طرف مائل ہوتی ہوگی۔ صاف بول اُٹھتا ہوگا ۛ

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمایوں کے عہد میں بہت ایرانی ہندوستان میں آگئے تھے۔ مگر تقیہ

کے پردہ میں بستے تھے۔ مذہب ظاہر نہ کرتے تھے۔ اور اکثر اُن میں صاحب اقتدار بھی ہوگئے تھے یہ بھی طبعی امر ہے کہ جب ہمارے دشمن کا کوئی حریف باقبال پیدا ہوتا ہے۔ تو اُسے اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ فائدہ و بیفائدہ اس سے مل کر دل خوش ہوتا ہے اور زبان خود بخود اُس کی ہمداستانی پر حرکت کرتی ہے۔ مُلّائے مخدوم اور شیخ صدر کے جو سلوک شیعوں سے تھے۔ وہ ان کے حال میں معلوم ہوں گے۔ شیخ مبارک ضرور شیعوں سے ملتا ہوگا۔ اور گفتگوؤں میں انکا ہمداستان ہوتا ہوگا ؎ ع

شیخ تیری ضد سے چھوڑوں دین و ایماں تو سہی

خیر یہ کچھ ایسی ملامت کی بھی بات نہیں۔ آخر وہ انسان تھا۔ فرشتہ تو نہ تھا ؏

یہ بھی قاعدہ ہے۔ کہ جب انسان اپنے مقابل میں دشمنوں کو نہایت قوی دیکھتا ہے۔ اور انکی عداوت کے تدارک اپنی طاقت سے باہر پاتا ہے تو ایسے بااقتدار لوگوں سے رشتہ ملاتا ہے۔ جو دشمنوں سے پھٹے ہوئے ہوں۔ اور بُرے وقت میں اس کے کام آئیں۔ اس کے حریفوں کو دیکھو۔ کیسے زبردست اختیارات رکھتے تھے۔ اور انہیں کس بیدردی سے اس بیچارے کے حق میں خرچ کرتے تھے۔ جو عالم سنت جماعت تھے۔ اُن سے اس غریب کو اصلاً توقع نہ تھی۔ عزت اور ننگ و ناموس کسے عزیز نہیں جان عزیز کسے پیاری نہیں۔ وہ اگر غیروں سے نہ ملتا۔ تو کیا کرتا۔ اور اُن کی اوٹ میں جان نہ بچاتا تو کہاں جاتا۔ میں نے ابوالفضل و فیضی کے حال میں شیعہ و سُنی کے معاملہ پر صلح و صلاحیت کے چند خیال لکھے ہیں۔ کہ شاید دونو تلواروں کی تیز باں کچھ گلاوٹ پر آئیں۔ لیکن عجیب منحوس ساعت تھی جس وقت شیعہ و سنی کا فساد پڑا تھا۔ ۱۲سو برس گذرے۔ اور طرفین نے ہزاروں صدمے اٹھائے۔ اور اہل صلاحیت نے بھی بہتیرے ہی زور لگائے۔ مگر دونوں میں سے ایک بھی رستہ پر نہ آیا ؏

(خلاصہ تحریر۔ ابوالفضل) اہل حسد ہر وقت جوش میں اُبلتے پھرتے۔ اور فساد کے چھینٹوں پر فتنہ کی جھڑیں آندی رہتی تھیں۔ لیکن جب اکبری سلطنت کے نور پھیلنے لگے۔ تو ۹۶۷ھ میں شیخ مبارک کے مدرسہ پر دانش و داد کا علم بلند ہوا۔ بزرگان روزگار نے شاگردی میں قدم جمائے۔ رجوع خلائق کے ہنگامے گرم ہوئے۔ اہل حسد گھبرائے کہ اگر نمونہ اُن اوصاف کا شاہ جوہر طلب تک پہنچا اور دلنشیں ہوگیا۔ تو ہمارے پرانے اعتباروں کی کب آبرو رہیگی اور انجام اسکا کس رسوائی تک پہنچیگا چنانچہ شیخ اپنے بڑھاپے اور علم و فضل کے سرِ شد میں اور بیٹے جوشِ علم و جوانی کے نشے میں بیخبر بیٹھے تھے۔ کہ دشمنوں نے ایک سازش کی۔ اور اس کے سبب سے شیخ کو ایسی خطرناک مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔ کہ دل امان امان کرتا ہے۔ شیخ ابوالفضل نے کچھ تفصیل خود اکبرنامہ کے خاتمہ میں لکھی ہے جس عبارت میں اس جادو بیان نے افسونگری کی ہے۔

اس کا خلاصہ میں لانا محال ہے جہاں تک قلم میں طاقت ہے کوشش تو کرتا ہوں چنانچہ کہتے ہیں :-

علمائے حسد پیشہ بادشاہی دربار میں مکر و فریب کی جنس کو سوداگری میں لگاکر فتنہ اور فساد اٹھاتے تھے۔ مگر نیک اشخاص موجود تھے۔ نیکی کے پانی سے آگ بجھا دیتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی زمانہ میں راستی پیشہ سچے ملنسار الگ ہو گئے تھے۔ شیطانوں اور فتنہ پردازوں نے قابو پائے۔ مقربان درگاہ کا سرگروہ عداوت پر کمر باندھ کر تیار ہوا (مخدوم مراد ہے یا صدر) پدر بزرگوار ایک دوست الٰہی کے گھر گئے تھے اور میں ساتھ تھا۔ کہ وہ مغرور متکبر فروش وہاں آیا۔ اور مسئلے بگھارنے لگا۔ مجھے جوانی کے نشہ میں عقل کی مستی چڑھی ہوئی تھی۔ آنکھ کھول کر مدرسہ ہی دیکھا تھا۔ بازار معاملات کی طرف قدم بھی نہ اٹھایا تھا۔ اس کی بیہودہ بکواس پر قدرت نے میری زبان کھولی۔ میں نے بات کی نوبت وہاں تک پہنچائی۔ کہ وہ شرماکر اٹھ گیا۔ اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اسی وقت سے احمقانہ انتقام کی فکر میں پڑا۔ جو فتنہ گر ہار کر بیٹھ رہے۔ انہیں جاکر پھر بھڑکا دیا۔

والد بزرگوار ان کی دغابازیوں سے نچنت اور میں علم کے نشوں میں چور۔ دنیا پرست بیدینوں نے عقلمند دغولیوں کی طرح حق گزاری اور دین آرائی کے رنگ میں جلسے جمائے۔ چند لالچیوں کے دلوں پر شبخون مارکر اکثروں کو گوشہ نیستی میں بھیج دیا۔ اور بندوبست کرنے لگے۔ ایک دو رخا مکار۔ دوغلا دغاباز پیدا کیا۔ کہ روباہ بازی سے والد کی دانش نگاہ میں نیک بن کر گھسا ہوا تھا۔ اور اندر سے ادھر یک دل دو قالب تھا۔ دشمنوں نے اسے ایک پٹی پڑھاکر اور بیہوشی کا منتر سکھاکر آدھی رات کو بھیجا۔ وہ شعبدہ باز نیرنگ ساز اندھیری رات میں منہ بسورتا آنکھوں میں آنسو۔ بڑے بھائی (فیضی) کے حجرہ میں پہنچا۔ اور طلسمات کے ڈھکوسلے سناکر بھائی بیچارے کو گھبرا دیا۔ اسے دغا فریب کی کیا خبر۔ بہکاوے میں نہ آتا تو کیا کرتا۔ کہا یہ کہ بزرگان زمانہ مدت سے آپ کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اور کھوٹے ناشکروں کو شرم آتی نہیں آج انہوں نے قابو پاکر بلوہ کیا ہے۔ کچھ علما مدعی کھڑے ہوئے ہیں۔ چند عمامہ بند گواہ ہوئے ہیں۔ اور جو طوفان باندھے ہیں۔ ان کے لئے حیلے حوالے تیار کئے ہیں سب جانتے ہیں۔ کہ ان شخصوں کو بارگاہ مقدس میں کیسا درجۂ اعتبار ہے۔ اپنی گرم بازاری کے لئے کیسے کیسے سرفرازوں کو اکھیڑ کر پھینکدیا۔ اور کیا کیا ستم کئے ہیں۔ میرا ایک دوست ان کی رازگاہ میں ہے۔ اس نے اس آدھی رات میں آکر مجھے خبر دی ہے۔ میں بیقرار ہوکر ادھر دوڑا۔ ایسا نہ ہو کہ تدارک کا وقت ہاتھ سے جاتا رہے۔ صلاح یہ ہے۔ کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ شیخ کو ابھی کہیں لے جاکر چھپا دو۔ جب تک دوست جمع ہوکر حقیقت حال بادشاہ تک نہ پہنچائیں سب چھپے رہیں۔ بھائی سیدھا سادھا نیک ذات اسے وہم زیادہ ہوا۔ بے اوسان شیخ کی خلوت گاہ میں آیا۔

اور حال بیان کیا۔ شیخ نے فرمایا کہ دشمن تو غالب ہو رہے ہیں۔ مگر خدا موجود ہے۔ بادشاہ عادل سر پر ہے علمائے ہفت کشور موجود ہیں۔ اگرچہ بے دیانت اور بدینوں کو حسد کی بدمستی نے بیچین کیا ہے۔ تو اصلیت بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ دریافت کا دروازہ بند نہیں ہو گیا۔ اور یہ بھی سمجھ لو۔ اگر تقدیر الٰہی میں ہمارا آزار نہیں لکھا تو سارے دشمن اُمنڈ آئیں۔ بال بیکا نہ کر سکینگے۔ اور دغا کا ایک داؤں نہ چلیگا۔ ہاں خدا کی مرضی یہی ہے۔ تو خیر۔ ہم نے بھی اس خاک تودہ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ہنستے کھیلتے نقد زندگی حوالے کر دیتے ہیں ✣

قسمت کی گردش نے عقل لے لی تھی غم و غصہ سپرد کر دیا تھا فیضی حقیقت طرازی کو افسانہ سرائی اور خوشی کے اُبھار کو سوگواری سمجھے۔ چھری پر ہاتھ ڈال کر کہا۔ کہ دنیا کے معاملے اور ہیں۔ اور تصوف کی داستان اور شے ہے۔ اگر آپ نہیں چلتے تو میں اپنا کام تمام کرتا ہوں۔ پھر آپ جانئے۔ میں تو روز بد نہ دیکھوں۔ یہ سن کر باپ کی محبت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پیر نورانی کے جگانے سے میں بھی جاگا۔ مجبوراً اسی اندھیری رات میں تینوں پیادہ پا نکلے۔ نہ کوئی راہبر۔ نہ پاؤں میں طاقت۔ پدر بزرگوار چپ نیرنگئ زمانہ کا تماشہ دیکھیں۔ میں اور بھائی جانتے تھے۔ کہ زمانہ کے کاروبار اور دنیا کے معاملوں میں ہم سے سوا نادان کون ہوگا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ کہ جائیں تو کہاں جائیں۔ جس کا وہ نام لیتے میں نہ مانتا۔ جسے میں کہتا وہ اعتراض کرتے۔ عقل حیران کہ کیا کیجئے (ابو الفضل اس عالم میں کہتے ہیں) ؎

دشمناں دست کیں بر آوردند ۔۔۔ دوستے مہرباں نمے یابیم
یک جہاں آدمی ہمے یابیم ۔۔۔ مردمے درمیاں نمے یابیم
ہم بدشمن دروں گریزم ازانکہ ۔۔۔ یاری از دوستاں نمے یابیم

میں ابھی نوجوان ناتجربہ کار صبح ولادت کا منہ نہار۔ خاکی بازار کا دوالیہ۔ معاملات دنیا کے خواب و خیال سے خبر تک نہیں۔ بڑے بھائی ایک شخص کو صاحب حقیقت سمجھے ہوئے تھے۔ وہیں پہنچے۔ آسودہ دلوں کو دیکھ کر اس کا دل ٹھکانے نہ رہا۔ گھر سے نکل کر پچھتایا۔ ہکا بکا رہ گیا۔ مگر مجبور۔ دم لینے کو جگہ بتائی۔ اُس ویرانہ میں گئے۔ تو اس کے دل سے سوا پریشان۔ عجب حالت گذری۔ اور غضب غم و اندوہ چھایا۔ بڑے بھائی پھر بھی مجھ ہی پر جھنجھلانے لگے۔ کہ زیادہ عقل نے زیادہ خراب کیا۔ باوجود کمی تجربہ کے ہم ٹھیک سوچے تھے۔ اب کیا علاج اور فکر کا رستہ کیا ہے۔ اور کہاں ہو کہ ذرا بیٹھ کر آرام کا سانس تو لیں۔ میں نے کہا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اپنے کھنڈلے کو پھر چلو۔ گفتگو آن پڑے تو مجھے وکیل کر دو۔ یہ جو ارباب زمانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی چادریں اُتار لونگا۔ اور بند کام کُھل جائیگا۔ والد نے کہا آفرین ہے۔ میں بھی

اسی کے ساتھ ہوں۔ بھائی پھر بگڑے اور کہا تجھے ان معاملوں کی خبر نہیں۔ ان لوگوں کی مکاری اور چھل بَتّوں کو تو کیا جانے۔ اب گھر کو چھوڑو۔ اور رستہ کی بات کہو۔ اگرچہ میں نے تجربہ کے جنگل نہیں پاٹے تھے۔ اور نفع نقصان کا مزہ نہیں اُٹھایا تھا۔ مگر خدا نے دل میں ڈالی۔ میں نے کہا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ اگر کوئی آسمانی بلا نہ آن پڑے۔ تو فلاں شخص رفاقت کرے۔ ہاں کوئی سخت موقع آن پڑے۔ تو تھمنا بھی مشکل ہے۔ رات کا وقت اور وقت تنگ۔ دل پریشان۔ خیر ادھر ہی قدم اٹھائے۔ پاؤں میں آبلے۔ دلدل اور ریتی کے میدان۔۔ چلے جاتے تھے۔ مگر توبہ توبہ کرتے جاتے کہ کیا وقت ہے۔ توکل کی رسی مٹھی سے نکلی ہوئی۔ مایوسی کی راہ سامنے۔ ایک عالم اپنا تلاشی۔ قدم بھی مشکل سے اٹھتا تھا اور سانس سخت جانی ہی سے آتا تھا۔ عجب حالت تھی۔ رات ہے تو خطرناک۔ کل ہے تو روز قیامت۔ بدذاتوں کا سامنا۔ غرض صبح ہوتے اسں کے دروازے پر پہنچے۔ وہ گرم جوشی سے ملا۔ اچھے خلوت خانہ میں اتارا۔ غمہائے گوناگوں ذرا الگ ہوئے۔ دو دن نچنت گذرے اور کچھ خاطر جمع سے بیٹھے۔ گر بیٹھنا کہاں خبر آئی کہ آخر حسد کے جلو تروں نے شرم کا پردہ پھاڑ کر دل کے پھپھولے پھوڑے۔ پکے دغولیوں کی چال چلے ہیں۔ جس رات ہم گھر سے نکلے۔ صبح کو عرض معروض کرکے بادشاہ کو بھی بدمزہ کیا اُنھوں نے حکم دیا۔ کہ ملکی اور مالی کام تو بے تمہاری صلاح کے چلتے نہیں۔ یہ تو خاص دین و آئین کی بات ہے۔ اس کا سرانجام تمہارا کام ہے۔ محکمۂ عدالت میں بُلاؤ۔ جو شریعت فتویٰ دے۔ اور بزرگانِ زمانہ قرار دیں وہ کرو۔ انہوں نے جھٹ بادشاہی چوبداروں کو ملکار کر بھیج دیا۔ کہ پکڑ لاؤ۔ حال انہیں ہی معلوم تھا ڈھونڈھ بھال میں بہت عرق ریزی کی۔ کچھ بدذات شیطان ساتھ کر دئے تھے۔ گھر میں نہ پایا۔ تو جھوٹ بات کو سچ بناکر گھر کو گھیر لیا۔ پہرے بٹھادئے۔ اور شیخ ابو الخیر (چھوٹے بھائی) ناسمجھ لڑکے کو گھر میں پایا۔ اسی کو پکڑ کر لے گئے۔ ہماری روپوشی کے افسانے کو بڑی آب و تاب سے عرض کیا۔ اور اُسے اپنی باتوں کی تائید سمجھے۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ بادشاہ نے سن کر خود فرمایا۔ کہ شیخ کی عادت ہے۔ سیر کو نکل جاتا ہے۔ اب بھی کہیں گیا ہوگا۔ ایک درویش گوشہ نشین۔ ریاضت کیش۔ دانش اندیش پر اتنی سخت گیری کیوں! اور بیفائدہ اُلجھنا کس لئے؟ اس بچہ کو ناحق لے آئے۔ اور گھر پر پہرے کیوں بٹھادئے؟ اسی وقت بھائی کو چھوڑ دیا۔ اور پہرے بھی اُٹھ آئے۔ گھر پر امن و امان کی ہوا چلی۔ ابھی نحوست رستہ میں تھی اور وہم غالب تھا۔ روز اُلٹی سلٹی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ پھر چھپنا ہی مصلحت سمجھے۔

اب کمینے بدذات شرمائے۔ مگر سوچے کہ اس وقت یہ آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ ان کا کام تمام کردینا چاہیئے۔ دو تین سینہ سیاہ بھیجو۔ کہ جہاں پائیں فیصلہ کردیں انہیں ڈر یہ ہوا تھا۔ کہ مبادا بادشاہ کے

الفاظ سُن کر حضور میں آموجود ہوں۔ اور دین و داد کے دربار کو عقل کے اُجالے سے روشن کردیں۔ اس لئے بادشاہ کے جواب کو چھپایا۔ وہشت اور وحشت کی ہوائیاں اُڑا کر بھولے بھالے دوست اور زمانہ ساز یاروں کو ڈرا دیا۔ رنگ برنگ کے بانے باندھے۔ ان کا یہ عالم ہوا۔ کہ اندیشہ ہائے دور دراز میں ہمت افزا دل بہم امداد خیالی سے بھی بھاگنے لگے۔ ایک ہفتہ گذرا تو صاحب خانہ نے گھبرا کر آنکھیں پھیریں۔ اور اُس کے نوکروں نے بھی فرش مروت کو اُلٹ دیا۔ وہموں کی سلوٹوں میں ہماری عقل بھی دب گئی۔ خیال یہ ہوا کہ دربار والی خبر جو سنی تھی۔ شاید جھوٹ ہو۔ اور بادشاہ خود متلاشی ہوں۔ وقت بُرا ہے۔ زمانہ پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مبادا یہ گھر والا ہی پکڑوا دے۔ عجب غم و اندوہ دل پر چھایا اور بڑا اندیشہ ہوا۔ مَیں نے کہا اتنا تو میں جانتا ہوں۔ کہ دربار والی خبر ضرور صحیح ہے۔ نہیں تو بھائی کو کیوں چھوڑا۔ اور پھر گھر سے کیوں اُٹھے۔ امن و امان کے زمانہ میں ہزاروں ہوائیاں اُڑاتے تھے۔ اور اچھے اچھے اشراف کمر باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب تو دُنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ گھر والا اگر ڈر اُٹھا۔ تو عجب کیا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ اُسے ہمارا پکڑوانا ہوتا۔ تو ظاہرداری کو نہ بدلتا۔ اور اس میں دیر کیوں کرتا۔ ہاں یہ ہے۔ کہ بہت سے شیطانوں نے اسے بُولا دیا ہے اور نوکروں کو گھبرا دیا ہے۔ کہ ہم تلخی و بدخوئی دیکھ کر نکل جائیں اور اس کا پیچھا چھوڑ دیں ❖

ہوش و حواس ٹھکانے کر کے پھر صلاح سوچنے لگے۔ روز مصیبت کو دیکھا تو کل کی رات سے بھی سوا اندھیرا تھا۔ بُرا وقت سامنے آیا۔ پہلے جان پہچان نکالنے اور حال کی رَ ۔ئے لگانے پر مجھے سب نے آفرین کی۔ اور آئندہ کے لئے ستون مشورت قرار دیا۔ خو ، د سالی سے قطع نظر کر کے عہد کیا۔ کہ اب اس کے خلاف رائے نہ کرینگے۔ شام ہوئی تو اس ویرانے سے نکلے۔ دل ہزار پارہ۔ دماغ شوریدہ سینہ زخم اندوز خاطر گرانبار اندوہ رفیق خیال میں نہیں۔ پاؤں میں زور نہیں۔ پناہ کا ٹھکانہ نہیں۔ زمانہ میں امن و امان نہیں۔ ایک قصبہ نظر آیا۔ اس بُھوت نگر اندھیر پورے میں بجلی سی چمکی۔ اور چہرۂ نشاط کا رنگ نکھرا۔ (ایک شاگرد کا گھر معلوم ہوا) دل خوش ہو گئے۔ وہاں جا کر ذرا آرام کا سانس لیا۔ ہر چند گھر اس کے دل سے سوا تنگ اور دن پہلی رات سے بھی اندھیرا تھا۔ مگر ذرا دم لیا اور بے ٹھکانے سرگردانی سے ٹھکانے ہوئے۔ گوشہ میں فکر دوڑنے لگے اور عقلیں سوچ میں لمبے لمبے قدم مارنے لگیں ❖

جب آرام کی جگہ اور اطمینان کا منہ کسی طرف نظر نہ آیا۔ تو میں نے جواب کی عبارت اس طرح سجائی کہ یہ اچھے اچھے دوست اور پرانے پرانے شاگرد و خوش اعتقاد مریدوں کا حال چند ہی روز میں روشن ہو گیا۔ اب صلاح وقت ہے کہ یہ شہر و بال خانہ عقل اور گزندگاہ کمال ہے۔ یہاں سے نکل چلیے ان دوستوں دربے استقلال آشناؤں سے جلد کنارے ہوں۔ خوب دیکھ لیا۔ ان کی وفاداری کا قدم ہوا پر ہے

اور پائداری کی بنیاد موج دریا پر۔ اور شہر کو چلو۔ کہیں خلوت کا گوشہ ملے۔ کوئی انجان خوش سعادت اپنی پناہ میں لے۔ وہاں سے بادشاہ کا حال معلوم ہو۔ مہر و قہر کا اندازہ ٹٹولیں۔ گنجائش ہو تو نیک اندیش الفت طرازوں سے پیام سلام ہوں۔ زمانہ کا رنگ ولو دیکھیں۔ وقت مدد کرے اور بخت یاری دے تو اچھا نہیں تو میدان عالم تنگ نہیں پیدا ہوا۔ پرندہ تک کے لئے گھونسلہ اور شاخ ہے۔ اسی منحوس شہر پر قیامت کے قبالے نہیں لکھے۔ ایک اور امیر دربار سے اپنے علاقہ کو رخصت ہوا ہے اور آبادی کے پاس اترا ہے۔ اسی کے روزنامۂ احوال میں کچھ نور کی سطریں نظر آتی ہیں۔ سب سے ہاتھ اٹھاؤ۔ اور اس کی پناہ میں چلو۔ مقام بھی بے نشان ہے۔ شاید ذرا آرام ملے۔ اگرچہ دنیاداروں کی آشنائی کا بھروسہ نہیں۔ مگر اتنا تو ہے۔ کہ ان فتنہ پردازوں سے اس کا لگاؤ نہیں ٭

بڑے بھائی بھیس بدل کر اس کے پاس پہنچے۔ وہ سن کر بہت خوش ہوا اور ہمارے آنے کو غنیمت سمجھا۔ خوف و خطر کا زور تھا۔ اس لئے بھائی کئی ترک ولاوروں کو ساتھ لیتے آئے۔ کہ بدذات ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ رستہ میں کوئی آفت پیش نہ آئے۔ اندھیری رات مایوسی کی چادر اوڑھے پڑی تھی۔ کہ وہ دل آگاہ پھر کو آیا۔ اور آرام کی خوشخبری اور آسودگی کا پیام لایا۔ اسی وقت بھیس بدل کر روانہ ہوئے۔ اور رستے سے الگ الگ اس کے ڈیرہ میں داخل ہوئے۔ اس نے نہایت اطمینان اور عجب خوشی ظاہر کی۔ آسائش نے مژدۂ سعادت سنایا۔ دن آرام سے گذرا۔ زمانہ کے فتنہ و فساد سے خاطرجمع بیٹھے تھے۔ کہ یکایک جو پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے بھی سخت تر بلا آسمان سے برس پڑی یعنی امیر مذکور کے لئے دربار سے پھر طلب آئی لوگوں نے جس شرارت سے پہلے احمق کو بدحواس کیا تھا۔ اس بھولے بھالے کو بھی بولا دیا۔ اس نے آشنائی کا ورق ایسا دفعتہ الٹ دیا۔ کہ رات ہی کو وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک اور دوست کے گھر آئے۔ اس نے تو پیر نورانی کے آنے کو ورود مبارک سمجھا۔ مگر ہمسایہ میں ایک بدذات فتنہ پرداز تھا۔ اس لئے بہت گھبرایا۔ اور حیرت نے باؤلا بنا دیا۔ جب لوگ سو گئے۔ تو یہاں سے بھی نکلے۔ اور بے ٹھکانے نکلے۔ ہر چند فکر دوڑائے اور دل ٹھکانے کر کے ذہن لڑائے۔ کوئی جگہ سمجھ میں نہ آئی۔ ناچار دل ڈانواڈول خاطر غم آلود۔ اسی امیر کے ڈیروں میں پھر آئے۔ عجب تر یہ کہ وہاں کے لوگوں کو ہمارے نکلنے کی خبر بھی نہ تھی خیر بے آس۔ بے سہارے تھوڑی دیر حواس جمع کر کے بیٹھے۔ بڑے بھائی کی رائے ہوئی۔ کہ عقل کی رہنمائی نہ تھی۔ وہم کی سرگردانی تھی۔ جو یہاں سے نکلے تھے۔ ہر چند میں نے کہا۔ کہ اس کی حالت کا رنگ بدلنا اور نوکروں کا آنکھ پھیرنا صاف دلیل ہے۔ مگر اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ امیر مذکور کی بدمزگی بڑھتی جاتی تھی۔ مگر کچھ ہو بھی نہ سکتا تھا جب اس اوچھے تنگ ظرف دیوانہ مزاج نے دیکھا۔ کہ یہ قباحت

کو نہیں سمجھتے۔ اور خیمہ سے نہیں نکلتے۔ تو روز روشن سنبات کی نہ صلاح کوچ کر گیا۔ پیسے کے بندے (نوکر چاکر) آئے خیمہ اکھاڑ روانہ ہوئے۔ ہم تینوں میدان خاک پر بیٹھے رہ گئے۔ عجب حالت ہوئی۔ نہ جانے کو راہ نہ ٹھیرنے کو جگہ۔ پاس اسپ فروشی کا بازار لگا تھا۔ نہ کوئی پردہ نہ کچھ اوٹ۔ چار طرف یا تو دو رُخے آشنا اور دشمنان صد رنگ تھے۔ یا ناواقف کرخت پیشانی یا بدعہد بے وفا دوڑتے پھرتے تھے۔ ہم دشت بے پناہ میں خاک بیچارگی پر بیٹھے۔ حال بدحال صورت پراگندہ۔ زمانہ ڈراؤنا۔ غم واندوہ کے لمبے لمبے کوچوں میں خیالات ڈانواڈول پھرنے لگے ؂

اب اُٹھنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ ناچار چلے۔ بد اندیشوں کی بھیڑ میں بیچوں بیچ سے ہو کر نکلے۔ حفاظت الٰہی نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اسی پر توکل کیا۔ اُس خطرگاہ سے باہر آئے۔ اب ہمراہی و ہمسازی کی عمارت کو دریابرد کیا۔ بیگانوں کی ملامت اور آشناؤں کی صاحب سلامت کو سلام کرکے ایک باغچہ میں پہنچے۔ یہ چھوٹی سی جگہ بڑی پناہ کا گھر معلوم ہوا۔ گئے ہوش ٹھکانے آئے۔ اور عجب قوت حاصل ہوئی۔ مگر معلوم ہوا۔ ادھر بھوتوں کا گزر ہے (جاسوس) اور انہوں نے پھرتے پھرتے تھک کر یہیں کہیں دم لیا ہے۔ الٰہی پناہ۔ دل پارہ پارہ۔ حالت پریشان وہاں سے بھی نکلے۔ غرض جہاں جاتے تھے۔ بلائے ناگہانی ہی نظر آتی تھی۔ دم لیتے تھے۔ اور بھاگ نکلتے۔ گھبراہٹ کی دوڑا دوڑ اور اندھوں کی بھاگا بھاگ تھی۔ اس عالم میں ایک باغبان ملا۔ اس نے پہچان لیا۔ ہم گھبرا گئے۔ اور ایک سناٹے کا عالم ہو گیا۔ قریب تھا کہ دم نکل جائے۔ مگر اُس سعادت مند نے بڑی تسلی دی۔ اپنے گھر لایا۔ بیٹھ کر غمخواری کی۔ اگرچہ بھائی کا اب بھی ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ مگر میرا دل خوش ہوتا تھا۔ اور خوشی بڑھتی جاتی تھی۔ اس کی خوشامد سے دوستی کے ورق پڑھ رہا تھا۔ اور پیر نورانی کے خیالات خدا سے لَو لگائے سجادۂ معرفت پر ٹہل رہے تھے۔ اور نیرنگئے تقدیر کا تماشا دیکھتے تھے۔ کچھ رات گئے پھر باغ والا آیا۔ اور شکایت کرنے لگا۔ کہ مجھ جیسے مخلص معتقد کے ہوتے اس شورش گاہ میں آپ کہاں رہے؟ اور مجھ سے کنارہ کیوں کیا! فی الحقیقت یہ بیچارہ جتنا نیک تھا۔ میرے قیاس میں اتنا نہ تلا تھا۔ ذرا دل شگفتہ ہوا میں نے کہا دیکھتے ہو۔ طوفان آیا ہوا ہے۔ یہی خیال ہوا۔ کہ ایسا نہ ہو دوستوں کو ہمارے سبب سے دشمنوں کا آزار پہنچے۔ وہ بھی ذرا خوش ہوا۔ اور کہا اگر میرا گھنڈ لا پسند نہیں تو اَور جگہ نکالتا ہوں۔ نچنت ہو کر وہاں بیٹھو۔ ہم نے منظور کیا۔ وہاں جا اُترے اور جیسا جی چاہتا تھا۔ ویسی ہی خلوت پائی گھر والوں کی بھی خاطر جمع ہوئی۔ کہ جیتے تو ہیں۔ ایک مہینے سے زیادہ اس آرامخانہ میں رہے۔ یہاں سے آشنایان باانصاف اور دوستان بااخلاص کو خط لکھے۔ ہر شخص کو خبر ہوئی۔ اور تدبیریں کرنے لگا

ادھر بھائی نے ہمت کی کمر باندھی۔ پہلے آگرہ اور وہاں سے فتح پور پہنچے کہ اُدھر کے مُعلّے میں جو دوست تدبیروں میں دلسوزی کر رہے ہیں اُنہیں اور گرمائیں۔ ایکدن صبح کا وقت تھا کہ محبت کا پُتلا دوراندیش بھائی ہزاروں غم و اندوہ کو رفاقت میں لئے پہنچا زمانۂ سنگدل کا پیام لایا کہ بزرگان دربار میں سے ایک شخص نے شیاطین کی افسانہ سازی کا حال سُن کر مارے غصہ کے نیاز مندی اور آداب کے نقاب مُنہ سے اُلٹ دیئے تُند اور سخت تقریر سے عرض کیا کہ حضور! کیا آخری دور تمام ہوتا ہے؟ قیامت آگئی؟ حضور کی بادشاہی میں بدکار بد دماغوں کو فراغتیں ہیں اور نیک مردوں کو سرگردانی۔ یہ کیا قانون چل رہا ہے۔ اور کیسی خدا کی ناشکری کی ہے۔ بادشاہ نے نیک نیتی پر رحم کرکے فرمایا کس کا ذکر کرتے ہو؟ اور کس شخص سے تمہاری مراد ہے؟ خواب دیکھا ہے یا دماغ عقل پریشان ہو رہا ہے۔ جب اُس نے نام لیا تو حضرت اُسکی کج فہمی پر بگڑے۔ اور کہا کہ اکابران زمانہ نے اُس کی دل آزاری اور جان کھونے پہ کمر باندھ کر فتوے تیار کئے ہیں مجھے ایکدم چین نہیں لینے دیتے اور میں جانتا ہوں کہ آج شیخ وہاں موجود ہے (صاف ہمارے مقام کا نام لے دیا) مگر جان کر انجان بنتا ہوں۔ کسی کو کچھ کسی کو کچھ کہہ کر ٹال دیتا ہوں۔ تجھے خبر نہیں۔ یوں ہی اُبلا پڑتا ہے اور حد سے بڑھا جاتا ہے۔ صبح آدمی بھیجکر شیخ کو حاضر کرو اور علما کا ہنگامہ جمع ہو۔ بڑے بھائی نے یہ شورش سنتے ہی راتوں رات یلغار کرکے اپنے تئیں ہمارے پاس پہنچایا ✦

ہم نے پھر وہی بھیس بدلا۔ کسی کو خبر نہ کی اور (آگرہ کو) چل کھڑے ہوئے۔ مگر ایسی پریشانی ہوئی کہ تمام ایام نحوست میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ کھل گیا تھا۔ کہ لوگ کہاں تک ساتھ ہیں۔ اور دادگر شہریار سے گیا گیا کہا ہے۔ اور غیب دان کو کتنی خبر ہے۔ لیکن پریشانی نے سخت بولا دیا کہ خدا جانے وقت پراُونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ پہلے موت کے مُنہ سے بھاگے جاتے تھے۔ اب موت کے مُنہ میں چلنے لگے۔ اندھیری رات آوارگی کا رستہ۔ چپ چاپ سناٹے کے عالم میں چلے جاتے تھے۔ کہ آفتاب نے دُنیا کو نورستان کیا اب یہ عالم کہ بدگوہر اندھیریوں کا ہجوم۔ شہر کا رستہ۔ بدذات جاسوسوں کا ہنگامہ یار و یاور کوئی نہیں اُترنے کو جگہ نہیں۔ زبان فصیح لڑکھڑائی جاتی ہے۔ زبان شگافتہ ترسل بیچارہ کیا لکھ سکے۔ گھبرائے بولائے۔ ایک ویران کھنڈر میں گھس گئے۔ شہر کے شور و شر اور دشمنوں کی نظر سے ذرا آسودہ ہوئے۔ بادشاہ عالم کی نوازش کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ سب کی رائے ہوئی کہ گھوڑوں کا سامان کریں۔ اور یہاں سے فتح پور سیکری کو چلیں۔ وہاں فلانے شخص سے قدیمی صداقت کا سلسلہ ہے۔ اُنہیں کے گھر جا بیٹھیں۔ شاید کہ یہ غونما تھم جائے۔ اور بادشاہ عنایت فرمائیں۔ پھر دیکھ لینگے ✦

غرض معقول لوگوں کی طرح سامان کرکے رات کو روانہ ہوئے۔ وہ حاسدوں کے خیالات سے بھی اندھیرے

اور بکواسیوں کے افسانہ سے کہیں لمبے تھے۔ چلے جاتے تھے۔ راہبر کی بیوقوفی اور کجروی میں بھٹکتے بھٹکتے صبح ہوتی تھی۔ کہ اُس اندھیر خانہ میں پہنچے۔ وہ نادان جگہ سے تو نہ پھسلا مگر ایسے ڈراونے ڈھکوسلے سنائے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتے۔ مہربانی کے رنگ میں کہا کہ اب وقت گذر گیا۔ اور بادشاہ کا مزاج تم سے برہم ہو گیا پہلے آجاتے تو کچھ صدمہ نہ پہنچتا۔ مشکل کام آسانی سے بن جاتا۔ پاس ہی ایک گاؤں ہے۔ جب تک بادشاہ نوازش پر مائل ہوں۔ وہاں چند روز بسر کرو۔ گاڑی پر بٹھایا اور روانہ کر دیا۔

مصیبت در مصیبت پیش آئی۔ وہاں پہنچے تو جس زمیندار کی اُمید پر بھیجا تھا وہ گھر میں نہ تھا۔ اس اُجاڑ نگری میں جا اُترے۔ مگر بیجا۔ وہاں کے داروغہ کو کوئی کاغذ پڑھوانا تھا۔ اُس نے پیشانی سے دانائی کے آثار معلوم کر کے بُلا بھیجا۔ وقت تنگ تھا۔ ہم نے انکار کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا۔ کہ یہ گاؤں تو ایک سنگدل بدمغز کا ہے۔ اُنھوں نے بیوقوفی کی کہ یہاں بھیجا۔ ہزار بیقراری اور غم و اندوہ کے ساتھ جانوں کو وہاں سے نکالا۔ ایک نجان سا رہبر ساتھ تھا۔ بھولتے بھٹکتے آگرہ کے پاس ایک گاؤں میں آکر اُترے کہ وہاں ایک گھر میں آشنائی کی بُو آتی تھی۔ اس دن کے راہ رستے لپیٹ سپیٹ کر تیس کوس راہ چلے۔ وہ بھلا مانس بڑی مروتوں سے پیش آیا۔ مگر معلوم ہوا کہ ایک جھگڑالو جعلساز کی زمین وہاں ہے اور کبھی کبھی ادھر بھی آن نکلتا ہے۔ آدھی رات تھی کہ اندوہناک دلوں کو لے کر یہاں سے بھی بھاگے۔ صبح ہوتے شہر میں پہنچے۔ ایک دوست کے گھر میں امن کا گوشہ پایا۔ نامرادی کا خاکدان۔ فراموشی کی خوابگاہ۔ نااہل کا جھوت نگر۔ کم ظرفی کا کنج پژدہ تھا۔ ذرا آرام سے دم لیا۔ دم بھر نہ گذرا تھا۔ کہ اس بے مروت خدا آزار۔ خود مطلب نے یہ پھُلجھڑی چھوڑی۔ کہ ہمسایہ میں ایک فتنہ کار بدروزگار رہتا ہے نئی بلا نظر آئی۔ اور عجب مصیبت نے شکل دکھائی۔ پاؤں دوڑا دوڑ سے۔ سر راتوں کے سفر سے کان گھڑیالوں سے۔ آنکھیں بیخوابی سے فرسودہ ہو گئی تھیں عجیب درد و غم دل پر چھایا۔ اور رنج کا پہاڑ چھاتی پر آن پڑا۔ سب کے فکر سوچ بچار میں لگ گئے۔ صاحبخانہ ادھر اُدھر جگہ ڈھونڈتا پھرے دو دن عجب کشاکش میں بسر ہوئے۔ ہر سانس یہی کہتا تھا کہ دم آخر ہوں۔

پیر نورانی کو ایک سعادتمند کا خیال آیا۔ اور صاحبخانہ نے بڑی جستجو سے اس کا گھر نکالا۔ اتنی بات بھی ہزاروں سلامتی کے شادیانے تھے۔ اُسی وقت اس کی خلوتگاہ میں پہنچے۔ اُس کی شگفتہ روی اور کشادہ پیشانی سے دل خوش ہو گیا۔ اُمیدوں کے گلبن پر کامیابی کی نسیم لہرانے لگی۔ اور چہرۂ حال پر اور ہی شگفتگی آئی۔ اگرچہ مرید تھا۔ مگر سعادت کے ذخیرے بھرے ہوئے تھے۔ گمنامی میں نیک نامی سے جیتا تھا۔ کم مائیگی میں امیری سے رہتا تھا۔ تنگدستی میں دریا دلی کرتا تھا۔ بڑھاپے میں

جوانی کا چہرہ چمکاتا تھا۔ اس کے ہاں خلوت گاہ پسندیدہ ہاتھ آئی۔ تدبیریں ہٹنے لگیں اور پھر خطوط بازی شروع ہوئی۔ اس آرام آباد میں دو مہینے ٹھیرے۔ بارے مقصود کا دروازہ کھلا۔ خیر اندیش حق طلب مدد کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کاروانِ اقبال منزل یا وری کرنے کو بیٹھ گئے۔ اول تو میل ملاپ کی میٹھی میٹھی باتوں سے فتنہ ساز۔ حیلہ پرداز اور کھوٹے بداعمالوں کو پرچایا۔ اور پتھروں کو موم کیا۔ پھر شیخ کے کمالات اور نیکیاں اور خوبیاں ایک خوبصورتی کے ساتھ حضور تک پہنچائیں۔ اورنگ نشینِ اقبال نے دُور بینی اور قدر شناسی کی رُو سے جواب دیئے۔ کہ محبت سے لبریز تھے۔ بزرگی اور مردمی کے رستہ سے بُلا بھیجا۔ میرا تو اُن دنوں تعلق دُنیا کی طرف سر جھکتا ہی نہ تھا۔ پیر نورانی بڑے بھائی کو ساتھ لے کر دربار ہمایوں میں گئے۔ رنگا رنگ کی نوازشوں سے رتبے بڑھے۔ یہ دیکھتے ہی ناشکروں میں سناٹا ہوا۔ بھڑوں کا چھتا چپ چاپ ہو گیا۔ اور عالم کا تلاطم تھم گیا۔ درس کا ہنگامہ گرم ہوا۔ خلوت گاہِ تقدس کی آئین بندی ہوئی۔ نیک مردوں کے قانون زمانہ نے جاری کئے۔ (ابوالفضل اُس عالم میں کہتے ہیں) ؎

اے شب نہ کنی آں ہمہ پر خاش کہ دوش	رازِ دلِ من چناں مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم	ہاں اے شب وصل آں چناں باش کہ دوش

حضرت دہلی کے شوقِ طواف نے پیر نورانی کا دامن کھینچا۔ مجھے چند شاگردوں کے ساتھ لے گئے۔ جب سے آگرہ میں آ کر بیٹھے تھے۔ اس گوشۂ نورانی میں عالم معنی پر اس قدر خیال جما تھا۔ کہ عالم صورت پر نگاہ کی نوبت نہ آتی تھی۔ یکبارگی عالم سفلی کے مطالعہ نے دل کا گریبان پکڑا۔ اور ہمت کا دامن پھیلایا کہ رفتۂ خاکی کے علاوہ میرے ساتھ پیوند معنی تھا۔ مجھے کہا کرتے تھے۔ کہ خاندان کی ابوالآبائی تیرے نام رہی۔ مجھ سے راز کی گٹھری کھولی کہ آج مجھے جانماز پر نیند آ گئی۔ کچھ جاگتا تھا۔ کچھ سوتا تھا۔ انوار سحری میں خواجہ قطب الدین اور شیخ نظام الدین اولیا خواب میں آئے۔ بہت سے بزرگ جمع ہوئے۔ وہاں بزم مصالحت آراستہ ہوئی۔ اب عذر خواہی کے لئے اُن کے مزاروں پر چلنا مناسب ہے۔ کہ چند روز اس سرزمین میں اُن کے طور پر مصروف رہیں۔ والد مرحوم اپنے بزرگوں کے طریقہ کے بموجب مسائل ظاہری کی بہت حفاظت کرتے تھے۔ طنبور و ترانہ اصلاً سنتے تھے۔ حال قال جو صوفیوں میں عام ہے۔ پسند نہ کرتے تھے۔ اس رنگ کے لوگوں کو مطعون کرتے تھے۔ خود بہت پرہیز کرتے تھے۔ اور سخت ممانعت فرماتے تھے۔ اور دوستوں کو روکتے تھے۔ ان بزرگوں نے اس رات اس یزداں پرست کا دل لبھا لیا۔ (یہ بھی سب کچھ سُننے لگے) بہت سے بزرگ اس گلزار زمین (دہلی) میں پڑے سوتے تھے ان کی خاک پر گذر ہوا۔ دل پر نور کے طبقے کھل گئے اور فیض پہنچے۔ اگر اس سرگذشت کی تفصیل لکھوں۔

تو دنیا کے لوگ کہانی سمجھینگے۔ اور بد گمانی سے گنہگار کرینگے۔ یہاں تک کہ مجھے بھی زاویۂ تجرد سے بارگاہ تعلق میں لے گئے۔ دولت کا دروازہ کھولا۔ اعزاز کا مرتبہ بلند ہوا۔ اور حرص کے متوالے حسد کے لوٹے مارے لوگ دیکھ کر بولا گئے۔ میرے دل کو درد لو اُن کے حال پر رحم آیا۔ اور خدا سے عہد کیا کہ ان اندھوں کی زیاں کاریوں کا خیال دل سے بھلا دوں۔ بلکہ اس کے عوض میں نیکی کے سوا کچھ خیال نہ کروں۔ توفیق الٰہی کی مدد سے اِس خیال میں غالب رہا۔ مجھے عجیب خوشی اور سب کو اَور ہی طاقت حاصل ہوئی۔ اُن کی بلند پروازیاں تو دیکھ لیں۔ اب مُلا صاحب کی بھی دو دو باتیں سُن لو۔ کہ اِتنے اونچے سے کس طرح نیچے پھینکتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ✦

جن دنوں میر حبش وغیرہ اہل بدعت (شیعہ) گرفتار اور قتل ہوئے۔ ان دنوں شیخ عبد النبی صدر اور مخدوم الملک وغیرہ تمام علمائے متفق اللفظ و المعنے ہو کر عرض کی۔ کہ شیخ مبارک مہدی بھی ہے۔ اور اہل بدعت (شیعہ) بھی ہے۔ گمراہ ہے اور گمراہ کرتا ہے۔ غرض برائے نام اجازت لے کر درپے ہوتے کہ بالکل رفع دفع کر کے کام تمام کر دیں۔ محتسب کو بھیجا کہ شیخ کو گرفتار کر کے حاضر کرے۔ شیخ بچوں سمیت روپوش ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس لئے اُس کی مسجد کا ممبر ہی توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم چشتی ان دنوں جاہ و جلال کے اوج پر تھے۔ شیخ مبارک نے اول اُن سے التجا کر کے شفاعت چاہی شیخ نے بعض خلفا کے ہاتھ کچھ خرچ اور پیغام بھیجا کہ یہاں سے تمہارا نکل جانا مصلحت ہے۔ گجرات چلے جاؤ۔ اُنہوں نے نا اُمید ہو کر مرزا عزیز کوکہ سے توسل نکالا۔ اس نے ان کی مُلائی اور درویشی کی تعریف کی۔ لڑکوں کی فضیلت کا حال بھی عرض کیا اور کہا کہ مرد متوکل ہے۔ کوئی زمین حضور کے انعام کی نہیں کھاتا ایسے فقیر کو کیا ستانا؟ غرض مخلصی ہو گئی۔ گھر آئے اور ویران مسجد کو آباد کیا ✦

شیخ مبارک کا نصیبہ نحوست سے نکاح کئے بیٹھا تھا۔ ۶۳ برس کی عمر میں مبارکی آئی اور اُنہیں دیکھ کر مسکرائی یعنے ۹۷۴ھ میں شاعری کی سفارش سے فیضی دربار میں پہنچے ۹۸۱ھ میں ابوالفضل جا کر میر منشی ہو گئے۔ اور جس عمر میں لوگ ستر بہتر کہلاتے ہیں۔ پیر نورانی جوانی کا سینہ اُبھار کر اپنی مسجد میں چہل قدمی کرنے لگے ✦

اب اقبال و ادبار کی کشتی دیکھو۔ کہ جوان عقلوں نے حریفوں کی بوڑھی تدبیروں کو کیونکر پچھاڑا۔ اُدھر تو ابوالفضل اور فیضی کی لیاقتیں انہیں ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھا رہی تھیں۔ اور مصلحت اُنہیں وہ رستے دکھاتی تھی۔ کہ اکبر بلکہ زمانہ کے دل پر اُن کی دانائی کے نقش بیٹھ رہے تھے۔ اِدھر شیخ الاسلام (مخدوم الملک) اور شیخ صدر سے ایسی باتیں ہونے لگیں جن سے خود بخود ہوا بگڑ گئی۔ اکبر کی قدر دانی

اور جوہر شناسی سے دربار میں بہت عالم ہندوستان ایران و توران کے آکر جمع ہو گئے۔ چار ایوان کا عبادتخانہ علم کا اکھاڑا تھا۔ راتوں کو علمی جلسے ہُوا کرتے۔ اکبر خود آکر شامل ہوتا۔ علمی مسائل پیش ہوتے تھے اور دلائل کی کسوٹی پر کسے جاتے تھے۔ جو جو ایذائیں اُن بزرگوں کے ہاتھوں باپ نے عمر بھر سہی تھیں اور انہوں نے بچپن میں دیکھی تھیں۔ وہ بھولی نہ تھیں۔ اس لئے ہمیشہ گھات میں لگے رہتے تھے۔ اور حریفوں کی شکست کے لئے ہر مسئلہ میں دلائل فلسفی اور خیالات عقلی سے خلط بحث کر دیتے تھے۔ بوڑھوں کی بوڑھی عقل اور بوڑھی تہذیب کو جوانوں کی جوان عقل اور جوان تہذیب دبائے لیتی تھی! اور بے اوتاں بڈھوں کا ہاتھ پکڑے ایسے رستوں پر لئے آجاتی تھی۔ جس سے خود گر گر پڑتے تھے۔

اسے شیخ مبارک کی دُور اندیشی کہو۔ خواہ علو ہمت سمجھو۔ یہ بڑی دانائی کی۔ کہ باوجود بیٹوں کے علو اقتدار اور کمال جاہ و جلال کے آپ دربار کی کوئی خدمت نہ لی۔ مگر عقل کے پُتلے تھے۔ کبھی کبھی صلاح مشورے کے لئے۔ کبھی کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے۔ اور اکبر کو خود بھی علمی مباحثوں کے سُننے کا شوق تھا۔ غرض کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا کرتے تھے۔ کہ اکبر جہاں ہوتا وہیں خود شیخ مبارک کو بُلایا کرتا تھا۔ پیر نورانی نہایت شگفتہ بیان اور خوش صحبت تھا۔ اس کی رنگین طبیعت دربار میں بھی خوشبو اور خوش رنگ پھُول برسایا کرتی تھی۔ بادشاہ بھی اس کی باتیں سُن کر خوش ہوتا تھا۔ شیخ کسی فتح عظیم یا شادی یا عید وغیرہ کی مبارکباد پر ضرور آتے تھے۔ اور تہنیت کی رسم ادا کر کے رُخصت ہوتے تھے۔

جب ۹۸۱ھ میں اکبر گجرات فتح کر کے آئے تو بموجب رسم قدیم کے تمام عمائد اور رؤسا اور مشائخ و علما مبارکباد کو حاضر ہوئے۔ شیخ مبارک بھی آئے۔ اور ظرافت زبان کی قینچی نے یہ پھُول کترے۔ سب لوگ حضور کو مبارکباد دینے آئے ہیں۔ مگر عالم غیب سے میرے دل پر یہ مضمون ٹپکا رہے ہیں کہ حضور چاہیئے ہمیں مبارکباد دیں۔ کیونکہ خداوند عالم نے ہمیں دوبارہ سعادت عظمےٰ عطا فرمائی یعنے حضور کا جوہر مُقدّس۔ حضور نے ایک ملک مارا تو حقیقت کیا ہے۔ اگرچہ بڑھاپے کا ناز تھا۔ مگر یہ انداز اکبر کو بہت پسند آیا۔ اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ اور اکثر اس نکتہ کو یاد کیا کرتے تھے۔

نقیب خاں خلوت کی صحبت میں تاریخی اور علمی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اکثر حیوٰۃ الحیوان بھی پڑھی جاتی تھی۔ اُس کی عبارت عربی تھی۔ معنے سمجھانے پڑتے تھے۔ اس لئے ابوالفضل کو حکم دیا اور شیخ مبارک نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ کہ اب بھی موجود ہے۔

اکبر کو علمی تحقیقاتوں کا شوق تھا۔ اور اس کے لئے زبان عربی کا جاننا ضروری ہے۔ اس لئے خیال ہُوا کہ عربی زبان حاصل کرے۔ لڑکوں نے کہا ہو گا کہ ہمارے شیخ کو جو پڑھانے کا ڈھب ہے۔ وہ ان

مسجدی مُلّانوں میں سے کسی کو نصیب نہیں۔ باتوں باتوں میں کتابیں دل میں اُتار دیتے ہیں۔ شیخ مبارک بُلائے گئے۔ فیضی انہیں ساتھ لے کر حاضر ہوئے اور صرف ہوائی شروع کی۔ اس صحبت میں فیضی نے یہ بھی عرض کی۔ کہ شیخ ما تکلف اصلاً ندارد۔ اکبر نے کہا آئینِ تکلفاتؔ را ہمہ بر شما گذاشتہ اند چند روز کے بعد ہجوم تعلقات سے وہ شوق جاتا رہا۔ اور شیخ کا آنا وہی اتفاقی تقریبوں پر رہ گیا۔ کبھی کبھی آتے اور حکمت۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ نقل۔ حکایات۔ غرض اپنی شگفتہ بیانی سے بادشاہ کو خوش کر جاتے ۔

شیخ کو علم موسیقی میں مہارت تھی۔ ایک دفعہ بادشاہ سے اس امر میں گفتگو آئی۔ بادشاہ نے کہا کہ اس فن کا جو سامان ہم نے بہم پہنچایا ہے۔ تمہیں دکھائینگے۔ چنانچہ شیخ منجھو اور تانسین وغیرہ چند کلاونتوں کو بلا بھیجا کہ شیخ کے گھر جا کر اپنا کمال دکھائیں۔ شیخ نے سب کو سُنا۔ اور تانسین سے کہا۔ شنیدم تو ہم چیزے میتوانی گفت۔ آخر سب کو سُن کر کہا۔ کہ جانوروں کی طرح کچھ جائیں جائیں کرتا ہے۔ اس کے حریفوں کا چلتا حربہ یہی تھا۔ کہ شریعت کے زور اور فتووں کی فوج سے سب کو دبا لیا کرتے تھے۔ اور جسے چاہتے تھے۔ کافر بنا کر رسوا و خوار کرتے تھے۔ بادشاہ وقت کو بغاوتِ عام کے خطر پیدا کر کے ڈرایا کرتے تھے۔ احکام اسلام کو ہر مسلمان سر آنکھوں پر لیتا ہے۔ لیکن بعض موقع پر پرہیز و ناگوار بھی ہوتا ہے خصوصاً بادشاہ اور اُس کی ملکی مصلحتیں۔ کہ ان کے نازک موقع کسی پابندی کو سہار نہیں سکتے۔ اکبر دل میں دق ہوتا تھا۔ مگر جس طرح ہوتا انہیں سے گذارہ کرتا تھا۔ حیران تھا کہ کیا کرے۔ جن دنوں شیخ صدر نے ایک متھرا کے برہمن کو شوالہ اور مسجد کے مقدمہ میں قتل کیا۔ اُنہی دنوں میں شیخ مبارک بھی کسی مبارکبادی کی تقریب سے حضور میں آئے۔ ان سے بھی اکبر نے بعض بعض مسئلے بیان کئے۔ اور اہل اجتہاد کے سبب سے جو جو دقتیں پیش آتی تھیں وہ بھی بیان کیں۔ شیخ مبارک نے کہا۔ کہ بادشاہ عادل خود مجتہد ہے۔ مسئلہ اختلافی میں بمناسبتِ وقت جو حضور مصلحت دیکھیں۔ حکم فرمائیں۔ ان لوگوں نے شہرتِ بے اصل سے ہوّا باندھ رکھی ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو ان سے پوچھنے کی حاجت کیا ہے اکبر نے کہا کہ ہرگاہ شما اُستادِ ما باشید و سبق پیش شما خواندہ باشیم۔ چرا مارا از منتِ ایں ملّایاں خلاص نمے سازید۔ آخر سب جزئیات و کلیات پر نظر کر کے تجویز ٹھہری کہ ایک تحریر آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے لکھی جائے۔ جس کا خلاصہ یہ کہ امام عادل کو جائز ہے۔ کہ اختلافی مسئلہ میں اپنی رائے کے بموجب وہ جانب اختیار کرے جو اُس کے نزدیک مناسبِ وقت ہو۔ اور علما و مجتہدین کی رائے پر اُس کی

---

[1] اس سے یہ مطلب ہوگا کہ جو آداب و تعظیم کے الفاظ اور قواعد دربار میں مقرر ہو گئے تھے۔ اگر شیخ بجا نہ لائے تو بادشاہ کو ناگوار نہ گذرے۔ اور شیخ جس طرح اپنے جلسۂ احباب میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہ کے سامنے بھی باتیں کرتے ہیں ۔

رائے کو ترجیح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مسودہ اس کا خود شیخ مبارک نے کیا۔ اگرچہ اصل مطلب انہی چند اشخاص سے تھا۔ جو احکام اور مہمات سلطنت میں سنگ راہ ہوا کرتے تھے۔ مگر علما و فضلا۔ قاضی القضات۔ مفتی اور بڑے بڑے عالم جن کے فتووں کو مہمات خلائق میں بڑی بڑی تاثیریں تھیں۔ سب بلائے گئے۔ کہ اس پر مہریں کر دیں۔ زمانہ کے انقلاب کو دیکھو! آج شیخ مبارک صدر محفل میں بیٹھے تھے۔ حریف اُن کے طلب ہوئے تھے۔ عوام الناس کی صف میں آکر بیٹھ گئے۔ اور جبراً قہراً مہریں کرکے چلے گئے۔ محضر مذکور کی بعینہٖ نقل یہ ہے ٭

نقل محضر

مقصود از تشئید این مبانی و تمہید این معانی آنکہ۔ چون ہندوستان صنت عن الحدثان بمیامن معدلت سلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن و امان و دائرہ عدل و احسان شدہ۔ طوائف انام از خواص و عام خصوصاً علمائے عرفان شعار و فضلائے دقائق آثار کہ ہادیان بادیہ نجات و سالکان مسالک اوتوا العلم درجات اند از عرب و عجم رو بدین دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہور علمائے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوی معقول و منقول اند۔ و بدین و دیانت و صیانت اتصاف دارند۔ بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیہ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیمۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذالک من الشواہد العقلیہ والدلائل النقلیہ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عند اللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علے العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً اعدل و اعلم و اعقل باللہ اند۔ بنا برین اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن صائب و فکر ثاقب خود یک جانب را از اختلافات بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بر آن جانب حکم فرمایند متفق علیہ میشود و اتباع آن بر عموم برایا و کافہ رعایا لازم و متحتم است و ایضاً اگر بموجب رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیان بودہ باشد عمل بر آن نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالفت آن موجب سخط اخروی و خسران دینی و دنیوی ست و این مسطور صدق و فور حسبۃً للہ و اظہاراً لاجرائے حقوق الاسلام بمحضر علمائے دین و فقہائے مہتدین تحریر یافت و کان ذالک فی شہر رجب سنہ ۹۸۷ھ سبع و ثمانین و تسعمائۃ ٭

فاضل بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اگرچہ عالمان مذکور میں سے یہ صورت کسی کو گوارا نہ تھی۔ مگر دربار میں بلائے گئے۔ اور بُری طرح لائے گئے۔ جبراً قہراً دستخط کرنے پڑے۔ عوام الناس میں لاکر بٹھا دیا۔ کسی نے تعظیم بھی نہ دی۔ اور شیخ مبارک نے کہ اعلم علمائے زمان تھا خوشی خوشی دستخط کرکے اتنا زیادہ لکھا۔ کہ ایں امریست کہ من بجان و دل خواہاں و از سالہائے باز منتظر آں بودم۔ پھر شیخ صدر اور مُلائے مخدوم کا جو حال ہوُا۔ اُن کے حالات میں معلوم ہوگا۔ دیکھو اور خدا سے پناہ مانگو۔

مُلا صاحب علما کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ شیخ مبارک زمانہ کے علمائے کبار میں سے ہے۔ اور صلاح و تقوے میں ابنائے زمان اور خلائق دوران سے ممتاز۔ اُس کے حالات عجیب و غریب ہیں چنانچہ ابتدا میں ریاضت اور بہت مجاہدہ کیا۔ امر معروف اور نہی منکر میں اس قدر کوشش تھی کہ اگر اُس کی مجلس وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی یا اطلس یا لال موزے یا سُرخ زرد کپڑے پہن کر آتا تو اُسی وقت اُتروا دیتا تھا۔ ازار ذرا ایڑیوں کے نیچے ہوتی تو اُتنی پھڑوا ڈالتا۔ راہ چلتے کہیں گانے کی آواز آتی تو بڑھ کر نکل جاتا۔ آخر حال میں ایسا گانے کا عاشق ہوُا کہ ایک دم بغیر آواز یا گیت یا راگ یا ساز کے آرام نہ تھا۔ غرض مختلف رستوں کا چلنے والا تھا اور انواع و اقسام کے رنگ بدلتا تھا۔ افغانوں کے عہد میں شیخ علائی کی صحبت میں تھا۔ اوائل عہد اکبری میں نقشبندیہ کا زور تھا۔ تو اس سلسلہ سے لڑی ملا دی تھی۔ چند روز مشائخ ہمدانیہ میں شامل ہوگیا۔ اخیر دنوں میں دربار پر ایرانی چھا گئے تھے تو اُن کے رنگ میں باتیں کرتا تھا۔ اِسی طرح اور سمجھ لوگو یا تَکَلَّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِهِم پر اُس کا عمل تھا بہرحال ہمیشہ علوم دینیہ کا درس کہتا شعر۔ مُعما اور فنون اور تمام فضائل پر حاوی تھا۔ برخلاف علمائے ہند کے خاص علم تصوف کو خوب کہتا تھا اور سمجھتا تھا۔ شاطبی علم قرأت میں نوک زبان پر تھی۔ اور اس طرح اس کا سبق پڑھاتا تھا کہ جو حق ہے۔ قرآن مجید دس قرأتوں سے یاد کیا تھا۔ بادشاہوں کے دربار میں کبھی نہ گیا۔ باوجود ان سب باتوں کے نہایت خوش صحبت تھا۔ نقل و حکایات اور واقعات دلچسپ کے بیان سے صحبت اور درس کو گلزار کر دیتا تھا۔ کہ احباب کا اس کے جلسہ کو اور شاگردوں کا سبق چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اخیر عمر میں آنکھوں سے معذور ہوگیا تھا۔ اور درس و تدریس بھی چھوڑ دی تھی۔ مگر علم الہیات کی تصنیف چلی جاتی تھی۔ اس عالم میں ایک تفسیر شروع کی۔ وہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں اس قدر مبسوط اور مفصل ہوئی کہ جسے امام فخرالدین رازی کی تفسیر کا ہم پلہ سمجھنا چاہیئے۔ اور مطالب مضامین بھی انواع و اقسام کی تحقیقوں کے ساتھ درج تھے منبع نفائس العلوم اس کا نام رکھا۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ اسکے دیباچہ میں ایسے ایسے مطلب لکھے

ہیں۔ کہ اُن سے دعوئے مجددی اور نئی صدی کی بُو آتی ہے اور جو تجدید تھی وہ تو معلوم ہی ہے (یعنی دین الٰہی اکبر شاہی) جن دنوں میں تفسیر مذکور تمام کی ہے۔ ابن فارض کا قصیدۂ تائیہ کہ سات سو شعر کا ہے۔ اور قصیدۂ بردہ اور قصیدۂ کعب ابن زہیر اور اور بزرگوں کے قصائد وظائف کے طور پر حفظ پڑھا کرتا تھا یہاں تک کہ ۱۷ ذی القعدت ۱۰۰۱ھ کو اس جہان سے گذر گیا۔ اُس کا معاملہ خدا کے حوالے۔ باوجود اِس کے کوئی مُلّا اِس جامعیت کے ساتھ آج تک نظر نہیں آیا۔ مگر حیف ہے کہ حُبِّ دُنیا اور جاہ و حشمت کی نحوست سے فقر کے لباس میں دین اسلام کے ساتھ کہیں ملاپ رکھا۔ آگرہ میں آغاز جوانی میں مَیں نے بھی کئی برس اُس کی ملازمت میں سبق پڑھے تھے۔ اَلحقّ صاحب حق عظیم ہے۔ مگر بعض امور دُنیا داری اور بے دینی کے سبب سے اور اس لئے کہ مال و جاہ اور زمانہ سازی اور مکر و فریب اور تغیر مذہب و ملت میں ڈوب گیا۔ جو سابقہ تھا اصلا نہ رہا۔ قل انّا او ایاکم لعلیٰ ھُدًی اَو فی ضلال مبین کہدے کہ تم اور ہم راہ پر ہیں یا گمراہ ہیں (کون جانتا ہے) عوام الناس کی بات ہے۔ کہ ایک بیٹا باپ پر لعنت کرتا تھا رفتہ رفتہ قدم آگے بڑھایا وغیرہ وغیرہ آگے جو کچھ مُلّا صاحب نے لکھدیا ہے مَیں لکھنا جائز نہیں سمجھتا۔ مُلّا صاحب کی سینہ زوریاں دیکھو۔ بھلا بیٹیا ماں یا باپ کو کہہ سکتا ہے۔ کہ جاؤ ہمارا تمہارا سابقہ نہ رہا؟ اور اُس کے کہنے سے ماں باپ کے حقوق سارے اُڑ جائینگے؟ کبھی نہیں جب نہیں تو اُستاد کے حق کیونکر مٹ سکتے ہیں اچھا جو معلومات۔ قابلیت اور فہم و ادراک کی استعداد اُس کی تعلیم سے حاصل ہوئی ہے۔ سب کی ایک پوٹلی باندھ کر اُس کے حوالہ کردو۔ اور آپ جیسے اول روز گھر سے اُس کے پاس آئے تھے۔ ویسے ہی کورے رہ جاؤ۔ پھر ہم بھی کہہ دینگے۔ کہ آپ کا تعلق اُس سے کچھ نہ رہا۔ اور جب یہ نہیں ہو سکتا تو تمہارے دو حرف کہہ دینے سے کب چھٹکارا ہو سکتا ہے؟

شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں نے کیا خطا کی۔ برسوں لکھایا پڑھایا۔ ایسا عالم بنایا کہ علمائے وقت سے کلمہ بکلمہ گفتگوئیں کر کے سب کی گردنیں دبانے لگے۔ اس عالم میں بھی جب کوئی مصیبت آئی تو فوراً سینہ سپر ہو کر مدد کو حاضر ہو گئے۔ اس پر اُن کا یہ حال ہے۔ کہ جہاں نام یاد آجاتا ہے۔ ایک ایک الزام لگا جاتے ہیں۔ اپنی تاریخ میں علمائے عصر کی شکایت کرتے کرتے کہتے ہیں۔ شیخ مبارک نے طلوت بادشاہی میں بیربر سے کہا۔ کہ جس طرح تمہارے ہاں کتابوں میں تحریفیں ہیں اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہیں۔ قابل اعتبار نہیں رہیں۔ اگر حق پوچھو تو اس بیچارے نے کیا جھوٹ کہا۔ مگر اُس کی قسمت اور دل کی باتیں اس سے ہزار من سنگین و وزنی ہوتی ہیں۔ اُنہیں اُن کی حماقت یا ظرافت میں ڈال کر ٹال دیتے ہیں۔ اِن کے مُنہ سے بات نکلی اور کفر ہو

ابوالفضل خود لکھتے ہیں۔ رایاتِ اقبال (لشکر اکبری) لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اور مصالح ملکی کے سبب سے ٹھیرنا پڑا تھا۔ اس پیر حقیقت (والد ماجد) کی جدائی سے دل بیقرار تھا۔ سال جلوس ۳۴ھ ۹۹۵ھ تھے۔ میں نے التجا کی کہ یہیں تشریف لیئے۔ صورت و معنی کے واقف حال (والد موصوف) نے عرض قبول کی۔ ۲۰ رجب کو تشریف لائے۔ یہاں گوشۂ وحدت میں خوشی کو افزائش دیتے تھے۔ اب سب کام چھوڑ دیئے تھے۔ حال کا روزنامچہ لکھ کر نفس ابوالبدائع کی زینت میں وقت گذارتے تھے۔ علوم ظاہری پر توجہ کم ہوتی تھی۔ ذات و صفات پروردگار میں گفتگو فرماتے تھے۔ اور عبرت کا سرمایہ لیتے تھے۔ دریائے آزادی کے کنارہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور بے نیازی کا دامن پکڑے تھے۔ کہ مزاج قدسی اعتدال بدنی سے متغیر ہوا۔ ایسی بیماری اکثر ہوتی تھی۔ وفعتہً سفر واپسیں کی آگاہی ہوئی۔ مجھ بےحواس کو بلایا اور ہوش افزا باتیں زبان سے نکلیں۔ رخصت کے لوادمات ظاہر ہونے لگے۔ ہمیشہ پردہ میں باتیں ہوتی تھیں۔ میرے دل کا (جس پر اسرار قدرت کے صاحب حوصلہ ہونے کا بھروسا تھا) یہ عالم ہوا کہ خونِ جگر کے گھونٹ گلے سے اترنے لگے۔ بڑی بیقراری سے کچھ اپنے تئیں سنبھالا۔ اور اسی پیشوائے ملکِ تقدس نے زورِ معنوی لگایا جب تھما۔ سات دن بعد کہاں آگاہی اور عین حضوری میں ۱۷ ذیقعد ۱۰۰۱ھ تھی کہ ریاض قدس کو ٹہلتے چلتے گئے۔ ملک شناسائی کا سورج چھپ گیا۔ عقل ایزدشناس کی آنکھ جاتی رہی۔ دانائی کی کمر خم ہوگئی۔ دانش کا وقت آخیر ہوگیا۔ مشتری نے چادر سر سے پھینک دی عطارد نے قلم توڑ ڈالا ؎

رفت آنکہ فیلسوف جہاں بود بردلش	درہائے آسمان معانی کشودہ بود
بے او یتیم و مردہ دل اند اقربائے او	کو آدم قبیلہ و عیسٰے دودہ بود

ملا صاحب نے شیخ کامل تاریخ کہی۔ شیخ فیضی نے فخر الکمل اور اسی شہر لاہور میں امانت رکھا۔

لطیفہ۔ ملائے موصوف اس واقعہ کی کیفیت ادا فرماتے ہیں۔ اسی سال میں، ۱۷ ذیقعد کو شیخ مبارک دانا دنیا سے گذر گئے۔ بیٹوں نے ماتم میں سر و ابرو کو منڈا کر ڈاڑھی مونچھ سے جا ملایا۔ اس بار ضرب کی تاریخ شریعت جدید ہوئی ✽

شیخ ابوالفضل خود اکبرنامہ کے ۱۰۰۱ھ میں لکھتے ہیں بادشاہ لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اس نگارنامہ کا مینا کار (بندہ ابوالفضل) فضل آباد میں۔ پدر گرامی اور مادر بزرگوار کی خوابگاہ پر گیا۔ فرمایا تھا۔ اس لئے دونو برگزیدگان الٰہی کے نعش آگرہ کو روانہ کئے۔ وہاں اپنے پرانے ٹھکانے میں آرام کیا ✽

---

۵ دیکھو آئین اکبری کا خاتمہ۔ اکبرنامہ میں لکھتے ہیں۔ کہ گردن میں ایک پھوڑا نکلا تھا۔ ۱۱ دن میں کام تمام ہو گیا ✽

شیخ مرحوم نے آٹھ بیٹے چھوڑے۔ ابو الفضل نے اکبر نامہ کے خاتمہ میں خدا کی ۲۳ عنائتیں اپنے حال پر لکھی ہیں ان میں سے چو بیسویں یہ کہ بھائی دانش آموز۔ سعادت گزیں۔ رضاجو۔ نیکو کار عطا کئے دیکھنا ایک ایک کو کس کس سانچے میں ڈھالتے ہیں ؎

(۱) بڑے بھائی کا حال کیا لکھوں۔ باوجود ایسے کمالات ظاہری و باطنی کے میری خوشی بغیر بڑھ کر قدم نہ اُٹھاتا تھا۔ اپنے تئیں میری رضا کا وقف کر کے تسلیم میں ثابت قدم رہتا تھا۔ اپنی تصانیف میں مجھے وہ کچھ کہا ہے۔ جس کا شکریہ میری طاقت سے باہر ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ فخریہ میں فرمایا ہے ؎

جائیکہ از بلندی و پستی سخن رود	از آسماں بلند تر۔ از خاک کمترم
باایں چنیں پدر کہ نوشتم مکارمش	در فضل مفتخر زگرامی برادرم
بُرہان علم و فضل ابو الفضل کز دمش	دارد زمانہ مغز معانی معطرم
صد سالہ رہ میان من و اوست در کمال	در عمر گر از و دو سہ سالے فزون ترم
در چشم باغباں نشود قد راو بلند	گر از درختِ گل گذرد شاخ عرعرم

اس کی (فیضی بھائی کی) ولادت ۹۵۴ھ میں ہوئی تھی۔ تعریف کس زبان سے لکھوں۔ اسی کتاب میں کچھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ آتشکدہ کو آب بیان سے بجھایا ہے۔ سیلاب کا بند توڑا ہے۔ اور بے صبری کا مرد میدان بنا ہوں۔ اس کی تصنیفات گویائی اور بینائی کے تراز و اور مرغان نغمہ سرا کا مرغزار ہیں۔ وہی اُس کی تعریف کرینگے۔ اور کمال کی خبر دیں گے۔ خصائل و عادات کی یاد دلائینگے ؎

(۲) شیخ ابو الفضل نے اپنی تصویر کو جس رنگ میں نکالا ہے۔ اُن کے ہی حال میں دکھاؤنگا اس محراب میں نہ سجے گی ؎

(۳) شیخ ابو البرکات۔ اس کی ولادت ۱۷ شوال ۹۶۰ھ میں ہوئی۔ علم و آگاہی کا اعلیٰ ذخیرہ نہیں جمع کیا۔ پھر بھی بڑا حصہ پایا۔ معاملہ دانی۔ شمشیر آرائی۔ کار شناسی میں پیش قدم گنا جاتا ہے۔ نیک ذاتی۔ درویش پرستی اور خیر عام میں سب سے بڑھا ہوا ہے ؎

(۴) شیخ ابو الخیر ۲۲ جمادی الاول ۹۶۷ھ کو پیدا ہوا۔ اخلاق کی بزرگیاں اور اشرافوں کی خوبیاں اس کی خوے ستودہ ہے۔ زمانہ کے مزاج کو خوب پہچانتا ہے اور زبان کو اس طرح قابو میں رکھتا ہے۔ جس طرح اور اعضا کو (کم سخن ہے) شیخ ابو الفضل کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں سب بھائیوں میں ان سے تعلق خاص تھا۔ ان کی سرکار کے کاغذات اسی بھائی کے حوالے تھے۔

کتب خانہ بھی اسی کے سپرد تھا۔ اکثر احباب کے خطوط میں فرمائشوں اور ضروری کاموں کا شیخ ابوالخیر پر حوالہ دیتے ہیں ٭

(۵) شیخ ابوالمکارم۔ پیر کی رات ۲۳ شوال ۹۷۶ھ کو پیدا ہوا۔ ذرا جنون میں آجاتا تھا۔ پدر بزرگوار زور باطن سے پکڑ کر راستی کے رستہ پر لاتے تھے۔ معقول و منقول اُسی دانائے رموز نفس و آفاق کے سامنے ادا کئے۔ حکمائے سلف کے پُرانے تذکرے کچھ کچھ میر فتح اللہ شیرازی کی شاگردی میں پڑھے۔ دل میں رستہ ہے امید ہے۔ کہ ساحل مقصود پر کامیاب ہوگا ٭

(۶) شیخ ابوتراب۔ ۲۲ ذی الحجہ ۹۸۸ھ کو پیدا ہوا۔ اس کی ماں اور ہے۔ مگر سعادت کی خورجین بھر کر لایا ہے۔ اور کسب کمالات میں مشغول ہے ٭

(۷) شیخ ابوحامد۔ ۲ ربیع الآخر ۱۰۰۲ھ پیر کو پیدا ہوا
(۸) شیخ ابوراشد۔ پیر غرہ جمادی الاولے کو اسی سنہ میں پیدا ہوا
} یہ دونوں لونڈی کے پیٹ سے تھے۔ لیکن اسالت کے آثار پیشانی پر چمکتے ہیں۔ پیر نورانی نے ان کے آنے کی خبر دی تھی۔ نام بھی رکھ دیئے تھے۔ ان کے ظہور سے پہلے اسباب سفر باندھا۔ خدا سے امید ہے۔ کہ ان کے انفاس گرامی کی برکت سے دولت خوش نصیبی کے ساتھ ہمنشین ہوں۔ کہ رنگ رنگ کی نیکیاں جمع ہوں۔ بڑے بھائی (فیضی) نے تو ہستی کا اسباب باندھا اور عالم کو غم میں ڈالا۔ امید ہے کہ اور پہلے پھولے نونہالوں کو خوشی۔ کامرانی اور سعادت دو جہانی کے ساتھ خدا عمر دراز کرے اور صورت ذہنی۔ دینی اور دنیاوی نیکیوں سے سربلندی دے ٭

مختلف تاریخوں سے جو جا بجا پتے لگے ہیں۔ تو چار بیٹیاں بھی شمار میں آتی ہیں ٭

ان میں سے ایک عفیفہ کے حال میں مُلا صاحب ۹۹۹ھ میں فرماتے ہیں ان دنوں میں خداوند خان دکنی رافضی کہ شیخ ابوالفضل کی بہن حسب الحکم اُس کے نکاح میں آئی تھی ولایت گجرات میں قصبہ کری جاگیر پاکر وہیں دوزخ کے ٹھکانے پہنچا۔ دوسری کی شادی میر حسام الدین سے ہوئی۔ یہ غازیخاں بدخشی کے بیٹے تھے۔ باپ کے بعد ہزاری منصب نصیب ہوا۔ اور دکن بھیجے گئے۔ خان خاناں کا دربار دریائے قدرت تھا۔ دُنیا موتی رولتی تھی۔ ان سے تو دو پشت کی آشنائی تھی۔ یہ بھی غوطے لگانے لگے۔ مگر عین شباب میں محبت آلہی کا جذبہ ہوا۔ خانخاناں سے کہا کہ ترک دنیا کا ارادہ دل پر چھا گیا ہے۔ درخواست کروں گا تو منظور نہ ہوگی۔ میں دیوانہ ہوجاتا ہوں۔ آپ حضور میں لکھ کر مجھے دلی بھیج دیجئے۔ کہ جو عمر باقی ہے۔ سلطان المشائخ کے مزار پر بیٹھ کر گزار دوں۔ خانخاناں نے منتیں کرکے روکا کہ یہ

دیوانگی ہزار فرزانگی سے فضل ہے۔ مگر ملتوی رکھنی چاہیئے۔ نہ مانا۔ دوسرے دن کپڑے پھاڑ کر پھینک دیئے بھبھوت ملی بدن کو ملی اور کوچہ و بازار میں پھرنے لگے۔ بادشاہ کو عرضی ہوئی۔ وہاں سے دلی کی رخصت حاصل ہو گئی۔ ۳۰ برس کمال زہد اور پرہیزگاری سے وہیں گذار دیئے۔ علم سے بہرِ کامل رکھتے تھے۔ مگر سب کو آب فراموشی سے دھو کر تلاوت قرآن مجید اور ذکر آلہی میں مصروف ہو گئے۔ شاہ باقی باللہ جن کا وطن سمرقند اور ولادت کابل میں ہوئی تھی۔ اور مزار اب بھی قدم شریف کے رستہ کو آباد کرتا ہے۔ اُس وقت زندہ تھے چنانچہ ان سے ہدایت حاصل کی ۱۰۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ پاک دامن بی بی نے شوہر کے اشارہ سے تمام زر و زیور فقراو مساکین کو بانٹ کر آلائش دنیا سے دامن پاک کیا تھا۔ جب تک جیتی رہی۔ ۱۲ ہزار روپے سال خانقاہ کے خرچ کے لئے بھیجتی رہی۔ تیسری راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے بیٹے سے بیاہی۔ اُس کا بیٹا صفدر خاں ۲ جلوس میں ہزاری منصب دار ہوا۔ چوتھی۔ لاڈلی بیگم۔ اس کی شادی اعتقاد الدولہ اسلام خاں شیخ علاء الدین چشتی سے ہوئی تھی۔ کہ شیخ سلیم چشتی کے پوتے تھے۔ اور حسن اخلاق اور خصائل مرضیہ کے سبب سے خاندان کی برکت تھے۔ جہانگیر تخت نشین ہوا تو انہیں اسلام خاں خطاب پنجہزاری منصب اور بہار کا صوبہ عنایت ہوا کہ کوکلتاش کا رشتہ ملا ہوا تھا۔ ۳ جلوس میں بنگالہ بھی مرحمت ہوا۔ باوجودیکہ اکبر کے عہد میں ملک مذکور پر لاکھوں آدمیوں کے خون بہے تھے۔ پھر بھی پٹھانوں کی کھرچن کناروں میں لگی پڑی تھی۔ انہیں عثمان خاں قتلو لوہانی کا بیٹا تھا۔ کہ اب تک اس کی جڑ نہ اکھڑی تھی۔ شیخ نے خونریز لڑائیوں سے اس کا استیصال کیا۔ چنانچہ ۷ جلوس میں شش ہزاری منصب سے اعزاز پایا۔ اور ۱۰۲۲ھ میں دنیا سے کوچ کر کے فتحپور سیکری میں کہ بزرگوں کا مدفن تھا۔ خواب آرام کیا۔

ان کی سخاوت و دریا دلی کے حالات دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ اپنے دسترخوان خاص کے علاوہ ایک ہزار طبق طعام اور اس کے لوازمات ملازموں کیلئے ہوتے تھے۔ گراں بہا زیور اور قیمتی کپڑوں کے خوان نوکر لئے کھڑے رہتے۔ جس کی قسمت ہوتی تھی انعام دیتے تھے۔ جھروکہ درشن دیوان عام۔ دیوان خاص وغیرہ مکانات دربار کہ لوازم سلاطین ہیں۔ انہوں نے بھی آراستہ کئے تھے۔ ہاتھی بھی اُسی طرح لڑاتے تھے۔ باوجودیکہ نہایت متقی پرہیزگار تھے کسی قسم کا نشہ یا امر ممنوع عمل میں نہ لاتے تھے۔ لیکن کل بنگالہ کی کنچنیاں نوکر تھیں۔ اسّی ہزار روپیہ مہینہ جس کا ۹ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ سال ہوا فقط ان کی تنخواہ کی رقم تھی۔ باوجود اس کے اپنے لباس میں ذرا تکلف نہ کرتے تھے۔ دستار کے نیچے موٹے کپڑے کی ٹوپی اور قبا کے نیچے ویسا ہی کرتا پہنے رہتے تھے۔ دسترخوان پر ان کے سامنے پہلے مکئی اور باجرے کی روٹی۔ ساگ کی بھجیا اور مُشکی چاولوں کا خشکہ آتا تھا۔ لیکن ہمت و سخاوت میں حاتم کو مات کرتے

تھے۔ جب بنگالہ میں تھے۔ تو ۱۲۰۰ ہاتھی اپنے منصبداروں اور ملازموں کو دیئے ۲۰ ہزار سوار و پیادے فرقہ شیخ زادہ سے نوکر تھے۔ اکرام خاں ہوشنگ بیٹا لاڈلی بیگم سے تھا۔ یہ دکن میں تعینات تھا پھر اسیر کا تعلقہ مل گیا۔ شیر خان تنور کی بیٹی اس سے بیاہی تھی۔ مزاج موافق نہ آیا۔ اسکے بھائی بہن کو لے گئے۔ حقیقت میں بد مزاج اور ظالم طبع تھا۔ شاہجہان کے عہد میں کسی سبب سے معزول ہو کر دو ہزاری کے منصب سے گرا۔ نقدی مقرر ہو گئی۔ فتح پور سیکری میں دادا کی قبر کے متولی ہو کر بیٹھ گئے ❊

آگرہ میں اکبر کے روضہ سے کوس بھر مشرق کو ایک مقبرہ ہے۔ کہ لاڈلی کا روضہ کہلاتا ہے۔ وہاں کے کہن سال لوگ کہتے ہیں۔ کہ پہلے اس کے گرد بڑا احاطہ اور عالیشان دروازہ تھا۔ اندر کئی قبریں تھیں مگر کتابہ کسی پر نہ تھا۔ ایک پر تعویذ سنگ مرمر کا تھا۔ گرد فتح پور کے سنگ سرخ کی دیوار تھی۔ بیل صاحب مفتاح التاریخ میں کہتے ہیں۔ کہ شیخ مبارک۔ فیضی اور ابو الفضل یہیں دفن ہیں۔ لیکن ابو الفضل نے خود آئین اکبری میں لکھا ہے۔ کہ بابر بادشاہ نے جرجمنا کے اُس پار چار باغ یادگار آباد کیا ہے۔ اس شگرف نامہ کا نقاش وہیں پیدا ہوا ہے۔ والد اور بڑا بھائی وہاں سوتے ہیں۔ شیخ علاء الدین مجذوب میر رفیع الدین صفوی اور بہت سے کار آگاہ بھی وہیں آرام کرتے ہیں۔ خیر مردہ بدست زندہ ہے۔ وہاں سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا ہوگا۔ اب پتا نہیں لگتا۔ کہ بوسیدہ ہڈیاں کب منتقل ہوئیں اور کس نے کیں ہاں عالیشان دروازہ کا کتابہ بہ آواز بلند پکارتا ہے کہ شیخ مبارک یہاں ہیں ❊

بسم اللہ الرحمن الرحیم وبہ ثقتی

هذه الروضة للعالم الربانی والعارف الصمدانی جامع العلوم شیخ مبارک قدس سرہ قد وقف بنیانه بحر العلوم شیخ ابو الفضل سلمہ اللہ تعالیٰ فی ظل دولة الملک العادل یطلبه المجد والاقبال والکرم جلال الدین والدنیا اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ظلال سلطنتہ باهتمام حضرت ابی البرکات فی سنة اربع والف

لطیفہ۔ سبحان اللہ یا پیر نورانی ۹۰ برس کی عمر۔ وہ وہ اوصاف کمالات۔ آنکھوں سے معذور ماشاء اللہ اتنے بیٹے بیٹیاں۔ اور ان کے بھی بیٹے بیٹیاں۔ اس پر تمہاری ہمت۔ چلتے چلتے کرامات چھوڑ گئے۔ اور ایک نہیں دو دو ❊

ابوالفیض فیضی فیاضی

۹۵۴ھ میں جبکہ ہندوستان کی سلطنت سلیم شاہ کی سلامتی میں متفکر تھی۔ شیخ مبارک شہر آگرہ میں چار باغ کے پاس رہتے تھے۔ کہ نہال امید میں پہلا پھول کھلا۔ اقبال پکارا کہ مراد کا پھل لائے گا۔ کامیاب ہوگا۔ اور کامیابی پھیلائیگا۔ ابوالفیض اس کا نام ہے۔ معصوم بچہ باپ کی نحوست کے سایہ میں پلا۔ وہ افلاس کی خشک سالی اُٹھاتا۔ عداوت اعدا کے کانٹے کھاتا جوانی کی بہار کو پہنچا۔ لیکن ایک لحاظ سے ان دنوں کو بھی اقبال کے دن سمجھو کہ عمر کے ساتھ اس کی فضیلت اور کمالات بھی جوان ہوتے گئے۔ اس کی مصیبتوں کی داستان اس کے باپ کے حال میں سُن چکے۔ اور اکثر دلچسپ حالات ابوالفضل کے بیان میں دیکھو گے۔ اس نے علم و فضل کا سرمایہ باپ سے پایا۔ اور علوم عقلی و نقلی جو ایشیا میں مروج تھے ان میں مہارت حاصل کی۔ مگر فن شعر میں جو کمال دکھایا وہی ثابت کرتا ہے۔ کہ فیضی کا دل و دماغ فیضان قدرت سے شاداب تھا۔ اور ملک الشعرا اپنی شاعری ساتھ لیکر آیا تھا۔ باپ اگرچہ شاعر نہ تھا۔ لیکن ہمہ دان فاضل تھا بیٹے کے کلام کو دیکھتا تھا۔ اُسے نکتہ نکتہ سے آگاہ کرتا تھا۔ زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا تھا۔ اور اُس سے رموز سخن کے سرچشمے کھولتا تھا۔ فن طب کو حاصل کیا۔ مگر اس سے فائدہ فقط اتنا لیا کہ بندگان خدا کو معالجہ سے فیض پہنچاتا تھا۔ اور کچھ اُجرت نہ لیتا تھا جب ہاتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگا۔ جب خدا نے دستگاہ بڑھائی اور فرصت نے تنگی کی تو رفاہ کی نظر سے ایک شفاخانہ بنوادیا ۔

ان باپ بیٹوں کے حال قادر مطلق کی قدرت نمائی کا ایک عمدہ نمونہ ہیں۔ جبکہ دشمنوں کا اخیر حملہ ان پر طوفان نوح کی طرح گذر گیا۔ اور وہ صحیح و سلامت نکلے۔ تو خدا کا شکر بجالائے۔ اس میں اکبر کی نیک اندیش نیت کا حال بھی معلوم ہوا۔ اور زمانہ کا رنگ دربار کی حالت کیساتھ بدلتا نظر آیا۔ بڈھا فاضل اپنے لُٹے گھر اور گری ہوئی مسجد میں آکر بیٹھا۔ ٹوٹے پھوٹے ممبر پر چراغ رکھ کر درس و تدریس کا دروازہ کھول دیا۔ اور تعلیم ہدایت کے جلسے پھر گرم کئے۔ وہ دیکھتا تھا کہ بادشاہ فضل و کمال کا طالب ہے۔ اور اہل دانش اور با تدبیر لوگوں کو ڈھونڈتا ہے۔ جو اشخاص اس سلسلہ میں نامزد ہوتے ہیں دربار میں پہنچ کر معزز مقام پاتے ہیں اس کا کمال اپنے بازوئے پرواز کو دیکھتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ مگر آفرین ہے غیور ہمت اور بے نیاز دل کو کہ امرا کے دروازوں کی طرف نہ جھکتا تھا ۔

شیخ فیضی جس کا آئے دن کے صدموں نے قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ اب اُسکی طبیعت بھی ذرا کھلنے لگی تھی شاخِ طبع سے جو پھول جھڑتے تھے اُن کی مہک میدان عالم میں پھیل کر دربار تک پہنچنے لگی۔ ۹۷۵ھ میں بادشاہی لشکر نے چتوڑ پر علم اُٹھائے تھے۔ جو کسی تقریب سے دربار میں اس کا ذکر ہوا۔ کمال کے جوہری کو جواہر کے شوق نے ایسا بیقرار کیا کہ فوراً طلب فرمایا۔ دشمن بھی لگے ہی ہوئے تھے۔ انھوں نے اس حُسنِ طلب کو طلبی عتاب کے پیرایہ میں ظاہر کیا۔ اور حاکم آگرہ کے نام لکھا کہ فوراً گھر سے بلاؤ اور سواروں کے ساتھ روانہ کرو۔ کچھ رات گئی تھی۔ کہ چند ترکوں نے آکر گھر پر غل مچایا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ہم بادشاہ کے شوق کا گلدستہ لینے آئے ہیں۔ یا مجرم کے پکڑنے کو آئے ہیں۔ دشمنوں نے بہادرانِ شاہی کو بہکا دیا تھا۔ کہ شیخ بیٹے کو چھپائے رکھیگا۔ اور حیلے حوالے کریگا۔ ڈراوے اور دھمکاوے کے بغیر نہ دیگا۔ اتفاقاً فیضی باغ میں سیر کو گئے تھے۔ اور اہل حسد کا سارا مطلب یہ تھا۔ کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے۔ کچھ نہ ہو تو شیخ اور اُس کے عیال تھوڑی دیر پریشانی و سرگردانی میں تو رہیں۔ شیخ کو خبر ہوئی اُس نے بے تکلف کہ دیا کہ گھر میں نہیں سپاہی اُزبک بے عقل نہ خود کسی کی سمجھیں نہ کوئی اُن کی سمجھے۔ اس پر بادشاہی حکم اور شیطانوں کا دل میں وسوسہ ڈالا ہُوا قریب تھا کہ خناسوں کا وسواس سچ کا رُوپ بدل کر فتنہ برپا کردے کہ اتنے میں فیضی بھی آن پہنچے۔ بیچیارے شرم شرمندہ ہو گئے۔ آمدنی کے رستے بند تھے۔ سفر کا سامان کہاں! بڑے شاگردوں اور اہل ارادت کی سعی سے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اور رات ہی کو فیضی روانہ ہوئے۔ گھر اور گھرانے کے لوگ غم میں ڈوب گئے۔ کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ کئی دن کے بعد خبر پہنچی۔ کہ خسرو آفاق نے غریب نوازی فرمائی ہے۔ کچھ خطر کا مقام نہیں ہے۔ فیضی بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے۔ تو حضور جس بارگاہ میں تھے۔ اُس کے گرد جالی کا کٹہرا تھا انہیں باہر کھڑا کیا۔ یہ سمجھے کہ اس طرح کلام کا مزہ نہ آئیگا اُسی وقت قطعہ پڑھا۔ قطعہ

بادشاہا در درون پنجرہ ام	از سر لطف خود مرا جادہ	زانکہ من طوطیِ شکر خایم	جائے طوطی درون پنجرہ بہ

اکبر اِس حاضر کلامی سے بہت خوش ہوا اور پاس آنے کی اجازت دی۔ جو قصیدہ اول دربار میں پڑھا اُس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی	رسید ہیچ سعادت کشادہ پیشانی

تین کم دو سو شعر ہیں۔ اور ہر شعر سے کمال شاعری کے ساتھ فضیلت اور فلسفہ حکمت کے فوارے جاری ہیں۔ اور چونکہ رستے میں کہا ہے۔ اور موقع وقت سامنے ہے۔ اس لئے اکثر مناسب حال مضمون نہایت خوبصورتی سے ادا ہوئے ہیں چنانچہ بادشاہی سواروں کے پہنچنے پر جو گھر میں گھبراہٹ پڑی اور اپنی طبیعت

کو جو اضطراب ہوا ہے۔ اس وقت کی پریشانی اور بیقراری کی حالتیں عجیب عجیب ڈھنگ سے دکھائی ہیں اور جہاں موقع پایا ہے۔ دشمنوں کے مُنہ میں بھی تھوڑی تھوڑی خاک بھردی ہے ؎

ازاں زماں چہ نویسم کہ بود بے آرام	سفینۂ دلم از موج خیز طوفانی
گہے چو وہم سراسیمہ کز کدام دلیل	برم ظنون و شکوک از علوم ایقانی
چرا بود متخالف رسوم اسلامی	چرا بود متشابہ حروف فرقانی
زبان کشیدہ بدار القضائے عجب و ریا	شہود کذب ز دعوے گران ایمانی
اگر حقیقت اسلام در جہاں اینست	ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

وہ بلند خیال شاعر کہ ایک شگفتہ مزاج عالم تھا۔ اپنی شگفتہ بیانی اور دانش خداداد اور فراخ دانی کی بدولت نہایت کم عرصہ میں درجہ مصاحبت تک پہنچ گیا۔ اور چند ہی روز میں ایسا ہوگیا۔ کہ مقام ہو۔ یا سفر کسی عالم میں بادشاہ کو اس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس نے اعلیٰ درجہ کا اعتبار پیدا کیا۔ ابوالفضل بھی دربار میں بلائے گئے۔ اور یہ عالم ہوا۔ کہ مہمات سلطنت میں کوئی بات بغیر ان کی صلاح کے نہ ہوتی تھی۔ فیضی نے کوئی ملکی ومالی خدمت نہیں لی۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ادھر ہاتھ ڈالتا۔ تو پہلے شاعری سے ہاتھ اُٹھاتا۔ لیکن ملک ومال کے جزوی جزوی معاملے اس کی صلاح پر منحصر تھے ✦

ایک پُرانی کتاب میرے ہاتھ آئی اس کے دیباچہ سے معلوم ہوا۔ کہ اس وقت تک ہندوستان کے بادشاہی دفتروں کے کاغذ ہندو ملازم ہندی اصول کے بموجب لکھتے تھے۔ ولایتی ہوتے تھے۔ تو اپنے طور پر لکھتے تھے۔ اور اس سے دفاتر شاہی میں عجب خلط ملط ہو رہا تھا۔ اکبر کے حکم سے ٹوڈرمل۔ فیضی میر فتح اللہ شیرازی۔ نظام الدین بخشی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام مل کر بیٹھے اور کاغذات دفتر کیلئے قواعد و ضوابط باندھے اسی کے ضمن میں حساب کے قواعد بھی لکھے گئے۔ کہ سب محاسب ایک طور پر عملدرآمد کریں اور تحریروں میں اختلاف نہ ہو ✦

جو شاہزادہ پڑھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اکبر اس کی استادی سے فیضی کو اعزاز دیتا تھا۔ کہ تعلیم و تربیت کرو۔ چنانچہ سلیم۔ مراد۔ دانیال سب اس کے شاگرد تھے۔ اور اسے بھی اس امر کا بڑا فخر تھا۔ اپنی ہر تحریر میں دو باتوں کا شکر درگاہ الٰہی میں بجالاتا ہے۔ اول یہ کہ درگاہ شہنشاہی میں قربت ہوئی۔ دوسرے شاہزادوں کی استادی سے اعزاز پایا۔ مگر بار بار ہزار عجز و انکسار سے کہتا ہے۔ کہ ان کے دل روشن پر سب کچھ روشن ہے۔ مجھے آتا کیا ہے۔ جو انہیں سکھاؤں۔ میں اُن سے آپ آداب اقبال کا سبق لیتا ہوں ✦

نظر غور سے دیکھو ان کے اور ان کے حریفوں کی معرکہ آرائی کے انداز اور آئین جنگ بالکل ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ حریف کہتے تھے۔ کہ سلطنت شریعت کے تابع ہے۔ ہم صاحب شریعت ہیں اس واسطے صاحب سلطنت کو واجب ہے۔ کہ جو کچھ کرے ہماری اجازت بغیر نہ کرے۔ اور جب تک ہمارا فتویٰ ہاتھ میں نہ ہو۔ تب تک سلطنت کو ایک قدم بڑھانا یا ہٹانا جایز نہیں۔ اس کے مقابل میں ان کا دستور العمل یہ تھا۔ کہ صاحب سلطنت خدا کا نائب ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے۔ عین مصلحت ہے۔ اور جو مصلحت ملکی ہے۔ وہی شریعت ہے۔ ہم کو ہر حال میں اس کا اتباع اور اطاعت واجب ہے۔ جو وہ سمجھتا ہے ہم نہیں سمجھتے۔ جو وہ حکم کرے اسکا بجالانا ہمارا فرض ہے۔ نہ کہ اسکا حکم ہمارے فتویٰ کا محتاج ہے +

آزاد - آج کل کے روشن دماغ کہتے ہیں۔ کہ دونو بھائی حد سے زیادہ خوشامدی تھے۔ درست ہے۔ ان لوگوں کے سامنے بجلی چمکتی ہے۔ مگر پیچھے بالکل اندھیرا ہے۔ انہیں کیا خبر ہے۔ کہ موقع وقت کیا تھا اور ان کا میدان کیسے پرانے پُرزور اور جنگ آزمودہ دشمنوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی آئین جنگ اور یہی توپ و تفنگ تھے جنہوں نے ایسے حریفوں پر فتحیاب کیا۔ ایک امن امان کی حکومت ہے۔ جیسے محل تصویر اس میں بیٹھ کر جو چاہیں باتیں بنائیں۔ نئی سلطنت کا بنانا اور اپنے حسب مطلب بنانا اور پرانی جڑوں کو زمین کی تہ میں سے نکالنا انہیں لوگوں کا کام تھا جو کر گئے خوشامد کیا آسان بات ہے۔ پہلے کوئی کرنی تو سیکھے۔ سنہ ۹۹۰ھ میں آگرہ۔ کالپی۔ کالنجر کی تحقیقات معانی کیلئے صدرالصدور کی مسند پر بیٹھے +

سلاطین چغتائیہ میں **ملک الشعرا** کا خطاب سب سے اول غزالی شہیدی کو ملا ہے۔ اس کے بعد شیخ فیضی کو ملا۔ یہ خطاب بھی اس نے اپنی درخواست سے نہ لیا تھا۔ اس کو اعلےٰ درجہ کی قربت اور اقتدار حاصل تھا۔ مگر اُس نے کسی منصب یا حکومت کی ہوس نہ کی۔ ملک سخن کی حکمرانی خدا سے لایا تھا۔ اسی پر قانع رہا اور یہ کچھ تھوڑی نعمت تو نہیں تھی۔ اکبرنامہ میں شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے۔ کہ سنہ ۹۹۶ھ میں یہ خطاب ہوا اتفاق یہ کہ دو تین ہی دن پہلے شگفتگی طبع نے ایک قصیدہ کے اشعار میں رنگ دکھایا ؎

آں روز کہ فیض عام کردند	مارا ملک الکلام کردند
تا کار سخن تمام کردند	از بہر صعود فکرت ما
مارا بہ تمام در ربودند	
آرائش ہفت بام کردند	

اکبر اُس کو اور اُس کے مرصع کلام کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ بلکہ اُس کی بات بات کو خلعت اور دربار کا سنگار جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں بھائی ہر خدمت کو ایسی سنجیدگی اور خوبصورتی سے بجا لاتے ہیں کہ جو اس کے لئے مناسب ہے۔ اُس سے بھی بہتر درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ اور ہر کام کو جانفشانی اور

دلی عرقریزی سے بجالاتے ہیں۔ اس واسطے انہیں اپنی ذات سے وابستہ سمجھتا تھا۔ اور بہت خاطرداری اور دلداری سے کام لیتا تھا۔ فیضی کو کچھ فرمائش کی تھی۔ یہ حضور میں کھڑے لکھ رہے تھے۔ اکبر چُپ تھا اور ان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ بیربر بھی بڑے مُنہ چڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کچھ بات کی۔ اکبر نے آنکھ سے منع کیا۔ اور کہا حرف مزنید شیخ جیو چیزے مینویسد۔ اس فقرے سے اور وقت اخیر کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اُنہیں شیخ جیو (شیخ جی) کہا کرتا تھا ۔

اکبر کو آرزو تھی۔ کہ کل ہندوستان میرے زیر قلم ہو۔ اور سلاطین دکن ہمیشہ آزاد رہا چاہتے تھے۔ اور اکثر آزاد رہتے تھے۔ چنانچہ کے انداز حکومت بھی کچھ اَور تھے۔ اہل دکن کو پسند نہ تھے۔ اور وہ اسطرح کی اطاعت کو بڑی بیعزتی سمجھتے تھے کہ سکہ خطبہ۔ بحالی برطرفی۔ تبدیلی عطیہ ضبطی وغیرہ میں کسی کے حکم کے تابع ہوں۔ اُن کی صورت حال ایسی تھی۔ کہ ان باتوں کو اکبر کھلم کھلا کہہ بھی نہ سکتا تھا چنانچہ کبھی نامہ و پیام بھیجتا تھا کبھی انہیں آپس میں لڑوا دیتا تھا۔ کبھی حدود دکن پر کسی امیر کو بھیج کر خود ہی لڑائی ڈال دیتا تھا۔ انہی میں بُرہان الملک فرمانروائے احمد نگر تھا۔ کہ اپنے ملک سے تباہ ہو کر دربار اکبری میں حاضر ہُؤا۔ چند روز یہاں رہا۔ انھوں نے روپے اور سامان سے مدد کی۔ اور راجی علی خاں حاکم خاندیس کو بھی فرمان سفارشی لکھا۔ چنانچہ اس کی یاوری سے اپنے ملک پر قابض ہُؤا۔ مگر جب حکومت حاصل ہوئی۔ تو جو انہیں امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ اب ارادہ ہُؤا کہ فوج کشی کریں۔ لیکن یہ بھی اُن کا آئین تھا۔ کہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا۔ دوستی اور محبت کے نام سے کام نکالتے تھے۔ چونکہ وہاں کے حاکم شاہانہ زور رکھتے تھے۔ اور سکہ خطبہ بھی اپنے نام کا رکھتے تھے۔ اس لئے ۹۹۹ھ میں ایک ایک امیر دانا کو ہر ایک کے پاس بھیجا۔ راجی علی خان حاکم خاندیس کی سفارت شیخ کے سپرد ہوئی۔ بُرہان الملک کی فہمائش امین الدین کے نام ہوئی۔ شیخ ابوالفضل کی تجویز سے یہ قرار پایا۔ کہ راجی علی خاں کے کام سے فارغ ہو کر شیخ فیضی اور امین الدین بُرہان الملک کے پاس جائیں۔ اور حقیقت میں راجی علی خاں مُلک دکن کی کنجی تھا۔ اور امارت موروثی عمر کی درازی عقل و تدبیر۔ دولت وافر جمعیت سپاہ نے اس کی کوشش کو ملک مذکور میں بڑی تاثیر دے رکھی تھی۔ مَیں نے فیضی کی وہ عرضداشتیں دیکھیں۔ جو اُس نے وہاں پہنچ کر اکبر کو لکھی تھیں۔ ان سے رسوم زمانہ کے قانون اور اکبری دربار کے بہت سے آئین و آداب روشن ہوتے ہیں۔ اور ان آداب و آئین کا باندھنے والا کون تھا یہی آئین بندسے کہ ارسطو و اسکندر کو آئینہ گری سکھاتے تھے۔ عرایض مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس خدمت سے جو اعتبار اور اعزاز کا عالی منصب تھا ہرگز خوش نہ تھا۔ وہ اپنے آقا کی حضوری کا عاشق تھا۔ چنانچہ حرف حرف سے افسوس جدائی اور اشتیاق مجرائی ٹپکتا ہے ۔

عرضی ایک رپورٹ ہے۔ جو اصل مقام اور رستہ کے جزوی جزوی حالات سے اطلاع دیتی ہے میں یہاں صرف اُس صورت حال کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ کہ کس طرح راجی علی خان کو فرمان شاہنشاہی دیا۔ اور خلعت پہنایا اور خان مذکور کس طرح پیش آیا۔ فیضی لکھتے ہیں:۔

فدوی نے خیمے اور سراپردے اُس شان سے ترتیب دئے تھے جیسے بندگان درگاہ عالم پناہ کیلئے شایاں ہوتے ہیں۔ سراپردوں کے دو درجے کئے تھے۔ دوسرے درجے میں تخت عالی سجایا تھا۔ تمام زربفت لپیٹ دیا تھا۔ اوپر مخمل زربافت کا شامیانہ تانا تھا تخت پر شمشیر بادشاہی خلعت خاصہ اور فرمان عالی رکھا تھا امرائے موجودہ تخت کے گرد باآداب شائستہ ترتیب سے کھڑے تھے۔ انعامی گھوڑے بھی آئین مناسب کے ساتھ سامنے تھے۔ راجی علی خاں اپنے ارکین اور وکلائے حکام دکن کو ساتھ لئے اُن آداب وقواعد کے ساتھ آیا۔ جوکہ بندگی اور دولتخواہی کے لئے لازم ہیں۔ دُور سے پیادہ ہؤا۔ جو سراپردہ پہلے درجہ میں تھا۔ اس میں بڑے ادب سے داخل ہؤا۔ اور اپنے ہمراہیوں کو لئے آگے بڑھا۔ دوسرے سراپردہ میں پہنچا۔ دور سے تخت عالی دکھائی دیا تسلیم بجالایا اور ننگے پاؤں ہؤا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ کہا گیا یہاں ٹھہر جاؤ اور تین تسلیمیں بجالاؤ نہایت آداب سے تین تسلیمیں ادا کیں اور وہیں ٹھہر رہا۔ تب بندہ نے فرمان معلےٰ کو دونوں ہاتھوں پہ لے کر اُسے ذرا آگے بُلایا اور کہا کہ بندگان عالی حضرت ظل الٰہی نے کمال عنایت اور بندہ نوازی سے تمہیں دو فرمان بھیجے ہیں۔ ایک یہ ہے۔ اس نے فرمان کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ ادب سے سر پر رکھا اور پھر تین تسلیمیں ادا کیں بعد ازاں میں نے کہا کہ دوسرا فرمان میں ہوں۔ پھر تسلیم بجالایا۔ تب میں نے کہا کہ حضور نے خلعت خاصہ عنایت فرمایا ہے تسلیم بجالایا اور پہنا۔ اسی طرح تلوار کے لئے تسلیم کی جب حضور کے حرف عنایت کا نام آتا تھا۔ تسلیمیں بجالاتا تھا۔ پھر اس نے کہا برسوں ہوئے آرزو ہے کہ بیٹھ کر تم سے باتیں کروں۔ یہ فقرہ اُس نے کمال شوق سے کہا تھا۔ اس لئے میں نے کہا بیٹھئے۔ ادب سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ بندہ نے مناسب وقت حکمت آمیز حقیقت آئین مطالب بیان کئے۔ کہ جو اس کے قیام سعادت کی رہنمائی کریں۔ ان سب کا خلاصہ اوصاف الطاف اور جاہ وجلال بندگان حضور کے تھے۔ اُس نے عرض کی حضرت کا بندۂ دولتخواہ ہوں۔ اُنہی کا بنایا ہؤا ہوں۔ اُنہی کا نظر یافتہ ہوں حضرت کی خوشی چاہتا ہوں۔ اور عنایت کا اُمیدوار ہوں۔ میں نے کہا حضرت کی عنایت تم پر بہت ہے۔ تمہیں اپنوں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور بندۂ خاص سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ دلیل اس کی کیا ہوگی۔ کہ مجھ جیسے غلام خاص کو تمہارے پاس بھیجا۔ متواتر تسلیمیں بجالایا۔ اور خوش ہؤا۔ اس عرصہ میں دو دفعہ اُٹھنے کو اشارہ کیا گیا۔ اس نے کہا۔ اس صحبت سے سیری نہیں ہوتی جی چاہتا ہے شام تک بیٹھا رہوں۔ چار پانچ گھڑی بیٹھا۔ خاتمہ مجلس پہ پان اور خوشبو حاضر ہوئی۔ مجھ سے کہا تم اپنے ہاتھ سے دو۔ میں نے کئی بیڑے اپنے ہاتھ سے دئے بڑی تعظیموں سے لئے۔

پھر کہا گیا کہ بندگان حضرت کے دوام دولت کے لئے فاتحہ پڑھو۔ نہایت ادب سے فاتحہ پڑھی پھر کمال تواضع سے لب فرش کے پاس تخت کے سامنے کھڑا ہوا۔ بادشاہی گھوڑے حاضر تھے۔ باگ ڈور کو چوم کر کندھے پر رکھ لیا اور تسلیم کی۔ شاہزادۂ عالمیان کے گھوڑوں کی باگ ڈوروں کو بھی کندھے پر رکھ کر تسلیم کی۔ شاہزادۂ عالمیان شاہ مراد کا گھوڑا سامنے لائے۔ تو اس کی باگ ڈور گلے میں لپیٹ کر تسلیمیں کیں اور رخصت ہوا۔ بندہ کے آدمی گن رہے تھے کُل پچیس تسلیمیں کیں۔ بہت کشادہ پیشانی تھا۔ اور خوش تھا پہلی تسلیم پر مجھ سے کہا فرمائیے تو حضرت کے لئے ہزار سجدے کروں۔ میں نے اپنی جان حضرت پر فدا کر دی ہے۔ فدوی نے کہا تمہارے اخلاص و ارادت کے لئے تو یہی شایاں ہے۔ مگر سجدہ کے لئے حضرت کا حکم نہیں۔ خاصان درگاہ اپنے جوش اخلاص کے مارے سجدہ میں سر جھکا دیتے ہیں۔ تو حضرت منع فرماتے ہیں۔ کہ یہ درگاہ خدا ہی کے واسطے ہے ◆

ایک برس ۸ مہینے ۱۴ دن میں دونوں سفارتوں کا سرانجام کرکے سنہ ١٠٠١ھ میں حضور میں حاضر ہوئے تعجب یہ کہ برہان الملک پر ان کا جادو نہ چلا۔ بلکہ جو پیشکش بھیجے وہ بھی مناسب حال نہ تھے۔ راجہ علیخاں تجربہ کار بڈھے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ درجہ کے تحائف و نفائس عریضہ کے ساتھ بھیجے۔ اور بہت سے عجز و انکسار کے مضمون ادا کئے۔ یہاں تک کہ شاہانہ چیزوں کے ساتھ بیٹی بھی سلیم کے لئے بھیج دی۔ یہاں آکر پھر وہی مصاحبت وہی گرمجوشیاں وہی درباداریاں۔ شاعری پھول برساتی تھی۔ غور تصنیف کان سے جواہر نکالتی تھی۔ مگر اس سفر سے آکر زندگی کا طور کچھ اور ہو گیا تھا۔ اکثر خاموش رہتے تھے۔ اُسی عالم میں بادشاہ کی تحریک سے خمسہ پر پھر ہاتھ ڈالا تفسیر وغیرہ کتابیں بھی اخیر ہی میں نکالیں۔ اُنہیں دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ کرتے کیا تھے؟ آٹھ پہر کے دن رات کے تو یہ کام نہیں ◆

سنہ ١٠٠٣ھ کے اخیر میں طبیعت بے لطف ہوئی ضیق النفس یعنی دمہ تنگ کرنے لگا۔ ۴ مہینے پہلے دق ہوکر یہ رباعی زبان سے نکلی۔ رباعی

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد	مُرغِ دلم از قفس بدآہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درو میگنجید	تانیم نفس برآورم تنگی کرد

اخیر میں سب سے دل اُٹھالیا تھا۔ اور مرض بھی کئی جمع ہو گئے تھے۔ دو دن بالکل چپ رہے۔ شاہ دانش نواز خود خبر کو آئے۔ پکارا تو آنکھ کھولی۔ آداب بجالائے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ دیکھ کر رہ گئے۔ ہائے افسوس اس موقع پر حکم بادشاہی کا زور کیا چل سکتا تھا۔ اُنہوں نے بھی رنج کھایا۔ اور آنسو پی کر چلے گئے۔ بادشاہ اسی دن شکار کو سوار ہوئے۔ آخرت کے مسافر نے بھائی سے کہا۔ تم حضور سے چار دن کی رخصت لے لو چوتھے دن خود روانہ ہوگئے۔ ۱۰ صفر ١٠٠٤ھ تھی جو فضل و کمال کے گھر سے نالۂ ماتم کا شور اُٹھا۔ شعر و سخن نے

نوحہ خوانی کی کہ لفظوں کا صراف اور معنی کا مرصع کار مرگیا۔ بیماری کی حالت میں یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

گر ہمہ عالم بہم آید بجنگ	بر نشود پائے یکے مور لنگ

مرنے کا وقت ایسا نازک ہوتا ہے کہ ہر شخص کا دل پگھل جاتا ہے۔ مگر حق تو یہ ہے۔ کہ ملا صاحب بڑے بہادر ہیں۔ دیکھو اس کے مرنے کی حالت کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔ میں باحتیاط ترجمہ کرتا ہوں۔ محاورہ میں فرق رہ جائے تو اہل ذوق معاف فرمائیں۔ ۱۰ صفر کو ملک الشعرا فیضی اس عالم سے گذر گیا۔ چھ مہینے تک ایسے مرضوں کی شدت اٹھائی کہ ضد ایک دوسرے کی تھے۔ ضیق النفس۔ استسقا اور ہاتھ پاؤں کا ورم۔ خونی قے نے طول کھینچا۔ مسلمانوں کے جلانے کو کتوں سے گھلا ملا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جانکندن کی سختی میں بھی کتے کی آواز نکلتی تھی۔ الحاد و شرائع اور دین اسلام کے انکار میں بڑا تعصب رکھتا تھا۔ اس لئے اس وقت بھی دین کے مقدمہ میں ایک متقی پرہیزگار صاحب علم سے لا یعنی۔ بیہودہ کفر کی باتیں کہتا تھا۔ کہ اُس کے عادات میں داخل تھیں۔ شاید اس سے اپنی ذات بابرکات مراد ہے۔ پہلے بھی ان باتوں پر اصرار رکھتا تھا۔ اُس وقت بھی کہتا رہا۔ یہاں تک کہ اپنے ٹھکانے پہنچا۔ تاریخ وے فلسفی و شیعی و طبعی دہری۔ ایک اور ہوئی قاعدہ الحاد شکست (کئی تاریخیں اور ایسی ہی ناموزوں کہی ہیں کہاں تک لکھوں پھر لکھتے ہیں۔) "آدھی رات تھی اور وہ حالت نزع میں تھا۔ کہ بادشاہ خود آئے۔ بیہوش تھا محبت سے اس کا سر پکڑ کر اُٹھایا۔ اور کئی دفعہ پکار پکار کر کہا۔ شیخ جیو۔ ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں۔ تم بولتے کیوں نہیں۔ بیہوش تھا۔ صدا ندا کچھ نہ تھی دوبارہ پوچھا تو پگڑی زمین پر دے ماری۔ آخر شیخ ابوالفضل کو تسلی دیکر چلے گئے۔ ساتھ ہی خبر پہنچی کہ اس نے اپنے تئیں حوالہ کر دیا (مر گیا) اتنا کہکر بھی ملا صاحب کا دل خالی نہ ہوا۔ خاتمۂ کتاب میں شعرا کی ذیل میں پھر لکھتے ہیں۔ فنون جزئیہ میں مثلاً شعر معما عروض قافیہ تاریخ لغت طب خط انشا میں اپنا عدیل زمانے میں نہ رکھتا تھا۔ اوائل میں تخلص مشہور سے شعر کہے۔ آخر میں چھوٹے بھائی کے خطاب کی مناسبت میں کہ اُس کو علامی لکھتے ہیں شان نہ جانے کو فیاضی اختیار کیا۔ مگر مبارک نہ ہوا۔ ایک دو مہینے میں رخت زندگی باندھ کر گنٹھڑ کے گنٹھڑ حسرت ہمراہ لیگیا۔ سفاہت اور سفلہ پن کا موجد۔ غرور گھمنڈ اور کینہ کا مخترع۔ نفاق خباثت ریا۔ حب جاہ۔ نمود اور شیخی کا مجموعہ تھا۔ اہل اسلام کے عناد و عداوت کی وادی میں اور اصل اصول دین کے طعن میں صحابہ کرام اور تابعین کی مذمت میں اور اگلے پچھلے متقدمین متاخرین مشایخ کے باب میں کہ مر گئے اور زندہ ہیں بے اختیار اور بے دھڑک بے ادبی کرتا تھا۔ سارے علما صلحا و فضلا کے باب میں خفیہ اور ظاہر رات اور دن یہی حال تھا۔ کل یہود و نصاریٰ ہنود اور مجوس اس سے ہزار درجہ بہتر جہ جائے نظامیہ اور صباحیہ۔ تمام حرام چیزوں کو دین محمدی کی ضد سے مُباح جانتا تھا۔ اور فرائض کو حرام۔ جو بدنامی سو

دریاؤں کے پانی سے دھوئی جائیگی۔ اس کے دعوے کو تفسیر بے نقط عین حالت مستی اور جنابت میں لکھا کرتا تھا۔ کتے ادھر اُدھر سے پامال کرتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی انکار اور گھمنڈ کے ساتھ اصلی قرارگاہ کو بھاگ گیا۔ اور ایسی حالت سے گیا کہ خدا دکھائے دشمن کو۔

جس وقت بادشاہ عیادت کو گئے تو کُتے کی آواز سنی اُن کے سامنے بھونکتا۔ اور یہ بات خود سر دربار بیان فرمائی۔ منہ سُوج گیا تھا۔ اور ہونٹ سیاہ ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا کہ اتنی سیاہی ہونٹوں پر کیسی ہے۔ شیخ نے مسّی ملی ہے۔ اس نے کہا خون کا اثر ہے۔ قے کرتے کرتے سیاہ ہو گئے ہیں۔ بے شک جو مذمت اور طعن حضرت خاتم المرسلین کی شان میں کرتا تھا۔ اُس کے مقابل میں یہ باتیں پھر بھی بہت کم تھیں۔ رنگ رنگ کی تاریخیں مذمت آمیز لوگوں نے نکالی ہیں۔ ملا صاحب یہاں جو تاریخیں موذی الفاظ میں لکھ کر پھر اس کی رُوح کو ایذا دیتے ہیں۔ ہاں صاحب جو اسکے اور اس کے باپ بھائی کے حقوق آپ پر ہیں وہ ادا نہیں ہوئے۔ کچھ اور دُھواں دل میں باقی ہو۔ وہ بھی نکال لیجئے۔ عجیب وہ بیچارہ جیتا تھا۔ اُس وقت بھی تمہارے بگڑنے پر نہ بگڑا بلکہ مصیبت میں کام ہی آتا تھا۔ اب مر گیا ہے جو چاہو سو کہہ لو۔

یہ کیا کہا مجھے اودھر زباں بہت اچھا	سنا لے اور بھی دو گالیاں بہت اچھا

پھر ملا صاحب لکھتے ہیں۔ بے شک چالیس برس تک شعر کہتا رہا مگر سب بے نمک استخوان بندی خاصی مگر بے مغز اور سراپا بے مزہ۔ وادی شطحیات و فخریات و کفریات میں مشہور سلیقہ رکھتا تھا۔ لیکن ذوق حقیقت و معرفت اور چاشنی رُوحانی و عرفانی اور قبول خاطر خدا نہ کرے۔ باوجودیکہ دیوان اور مثنوی میں ۲۰ ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ مگر اس کی بجھی ہوئی طبیعت کی طرح ایک بیت میں بھی شعلہ نہیں مطرودی اور مردودی کے سبب سے کسی نے اُس کے کلام کی ہوس نہ کی برخلاف اور ادنے شاعروں کے۔

شعرے کہ بود ز نکتہ سادہ	مانند ہمہ عمر یک سوادہ

اور عجب تر یہ ہے کہ ان چھوٹے موٹے ڈھکوسلوں کی نقل کرنے میں بڑی بڑی رقمیں تنخواہوں میں خرچ کیں اور لکھوا لکھوا کر دوست آشناؤں کو دُور و نزدیک بھیجے۔ کسی نے بھی دوبارہ نہ دیکھا۔

شعر تو مگر زحرمت ستر آمیخت	کز گوشہ خانہ میل بیروں نکند

یہاں شیخ فیضی کی وہ عرضی نقل کرتے ہیں۔ جو انہوں نے دکن سے ان کی سفارش میں بادشاہ کو لکھی ہے اور بعد اس کے پھر لکھتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ اس کی طرف سے وہ محبت و اخلاص اور اُس کے مقابلہ میں اس قدر مذمت اور درشتی۔ یہ کیا مروت و وفا کا آئین ہے خصوصًا مرنے کے بعد اس طرح کہنا عہد شکنوں میں

داخل ہونا۔ اور لاتذکروا موتٰکم الا بالخیر سے غافل ہونا ہے۔ یہ کیا زیبا ہے! ہم کہیں گے یہ درست مگر کیا کیجئے کہ حق دین اور اس کے عہد کی حفاظت سب حقوں سے بالاتر ہے۔ الحب للہ والبغض للہ قاعدہ مقررہ ہے مجھے چالیس برس کامل اس کی مصاحبت میں گزرے۔ مگر وضعیں اس کی جو بدلتی گئیں اور مزاج میں فساد آتا گیا اور حالتوں میں خلل پڑتا گیا۔ ان کے سبب سے رفتہ رفتہ (خصوصاً مرض موت میں) سب تعلق جاتا رہا۔ اب اُس کا حق کچھ نہ رہا اور صحبت بگڑ گئی۔ وہ ہم سے گئے ہم اُن سے گئے۔ باوجود ان سب باتوں کے ہم خدا کی درگاہ میں چلنے والے ہیں جہاں سب کا انصاف ہو جائیگا۔ الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین (ملا صاحب فرماتے ہیں) مال متروکہ میں سے چار ہزار چھ سو جلدیں نفیس صحیح کی ہوئی تھیں جنہیں بطریق مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ اکثر بخط مصنف یا عہد تصنیف کی تھیں سب سرکار بادشاہی میں داخل ہو گئیں۔ فہرست پیش ہوئی تو تین قسموں میں تقسیم کیں۔ **اعلےٰ** نظم۔ طب۔ نجوم۔ موسیقی **اوسط** حکمت۔ تصوف۔ ہیئت۔ ہندسہ **ادنےٰ** تفسیر۔ حدیث۔ فقہ اور باقی شرعیات ٭

"ان میں ایک سو ایک جلدیں نلدمن کی تھیں باقی کس شمار میں ہیں۔ مرنے سے چند روز پہلے بعض آشناؤں کے بہت کہنے سے چند بیتیں نعت اور معراج میں لکھ کر درج کر دی تھیں ٭

آزاد۔ ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ اب دونوں عالم آخرت میں ہیں۔ آپس میں سمجھ لیں گے۔ تم اپنی فکر کرو۔ وہاں تمہارے اعمال سے سوال ہوگا۔ یہ نہ پوچھینگے۔ کہ اکبر کے فلاں امیر نے کیا کیا لکھا۔ اس کا عقیدہ کیا تھا اور تم اس کو کیسا جانتے تھے اور جہانگیر کے فلاں نوکر کا کیا کیا معاملہ تھا اور تم اسے کیا جانتے ہو ؎

کیا کہینگے جو وہ پوچھیگا کیا کیا تم نے	اے ظفر ہم کو اگر خوف و خطر ہے تو یہی

اتنا تو پھر بھی کہونگا کہ نلدمن ہر کتب فروش کی دُکان میں ملتی ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ پونے دو سو شعر کی نعت مع کیفیت معراج اس نزاکت اور لطافت اور بلند پروازی کے ساتھ لکھی ہے۔ کہ انشا پردازی اس کے قلم کو سجدہ کرتی ہے۔ نعت کا مطلع ہی دیکھو جواب ہو سکتا ہے؟ ؎

آں مرکز دور بعثت جدول	گرداب پسین و موج اوّل

اب میں شیخ فیضی کی تصنیفات کی تفصیل اور ہر کتاب کی کیفیت حال لکھتا ہوں ٭

دیوان خود مرتب کیا اور دیباچہ لکھ کر لگایا تباشیر الصبح نام رکھا۔ جب ترتیب دیا تو ایک دوست کو اس کی خوشخبری لکھ کر دل خوش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ برس سے زیادہ کی کمائی ہے۔ نو ہزار بیت کا ہے۔ غزلیں سلیس اور شستہ فارسی زبان میں ہیں۔ استعاروں کے پیچوں سے بہت بچتے ہیں۔ اور لطف زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ جس پر انہیں قدرت کامل حاصل ہے۔ باوجود

اس کے اہل زبان کے حرف بحرف تابع ہیں۔ طبیعت جوش میں آتی ہے۔ مگر زبان حد اعتدال سے نہیں بڑھ جاتی اور اپنی طرف سے ایک نقطہ کا تصرف بھی نہیں کرتی۔ میں ضرور کہتا کہ سعدی کا انداز ہے۔ مگر وہ حُسن و عشق میں زیادہ ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ حکمت اور نفس ناطقہ کی حقیقت اور خودی میں۔ خداشناسی او شکوہ معانی اور فخریہ و بلند پروازی کی ہوا میں اُڑتے ہیں۔ کفر و الحاد کے دعووں میں بڑے زور دکھاتے ہیں حُسن و عشق میں نظم ایشیا کے اُستاد ہیں ان کا نام فقط عادت کے سبب سے زبان پر آجاتا ہے۔ وہ فاضل کامل ہیں اور زبان عربی کے ماہر کہیں کہیں ایک ایک مصرعہ یا آدھا آدھا مصرع عربی کا لگا جاتے ہیں تو عجب مزہ دیتا ہے۔

قصائد میں متقدمین کے قدم بقدم چلے ہیں۔ اور جو کچھ کہا ہے۔ نہایت برجستہ کہا ہے۔ غزلیں مع قصائد بیس ہزار شمار میں آتی ہیں اکبر کو جو اُن کا کلام پسند تھا۔ سبب اُس کا یہ تھا کہ اول تو عام فہم ہوتا تھا۔ صاف سمجھ میں آتا تھا۔ دوسرے اپنے آقا کی طبیعت کو سمجھ گئے تھے۔ اور حالات موجودہ کو دیکھتے رہتے تھے۔ وقت کو خوب پہچانتے تھے۔ اور طبیعت حاضر لائے تھے۔ حسب حال خوب لکھتے تھے۔ اور عین برمحل کہتے تھے۔ مطلب کو نہایت خوبصورتی اور برجستگی سے ادا کرتے تھے۔ دل لگتی اور من بھاتی بات ہوتی تھی۔ اکبر سُن کر خوش ہو جاتا تھا۔ اور سارا دربار اُچھل پڑتا تھا۔

اکبر احمد آباد گجرات وغیرہ کی مہمیں فتح کر کے پھرا تو تمام فوج پیچھے پیچھے۔ سب ہیں کی وردی دہیں کے ہتھیار تھے۔ اکبر خود سپہ سالاروں کی طرح ساتھ۔ وہی لباس وہی اسلحہ۔ وہی دکن کا چھوٹا سا برچھا کندھے پر رکھے آگے آگے چلا آتا تھا۔ فتحپور کے قریب پہنچا تو کئی کوس آگے امرا استقبال کو حاضر ہوئے۔ فیضی نے بڑھ کر غزل پڑھی (اکبر ان دنوں فتح پور سیکری میں بہت رہتا تھا) **مطلع**

نسیم خوشدلی از فتح پور مے آید	کہ بادشاہ من از راہ دور مے آید

۹۹۷ھ میں جب کشمیر کی مہم سے اطمینان ہُوا تو بادشاہ گلگشت کو پہنچے۔ موسم بہار سے دل شگفتہ ہوئے۔ فیضی نے جھٹ قصیدہ لکھا۔ **مطلع**

ہزار قافلۂ شوق میکند شب گیر	کہ بار عیش کشاید بخطۂ کشمیر

عرفی نے بھی کشمیر میں پہنچ کر بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے۔ مگر مضامین خیالیہ و بہاریہ میں بلند پروازی اور معنے آفرینی کی ہے۔ ان کا قصیدہ دیکھو تو تمام مضامین حالیہ کی تصویر ہے۔ جب دربار شاہ یا جلسۂ احباب میں پڑھا گیا ہوگا۔ لُٹا لُٹا دیا ہوگا۔ سفر کابل میں ڈکہ کی منزل پر اکبر گھوڑے سے گر پڑا۔ انہوں نے اس قطعہ سے آنسو پونچھے ؎

دوش از آسماں ضمیرم را	حالتے رفت کز تصور آں
گرہ غصہ بر جبیں اُستاد	

لرزہ در چرخ ہفتمیں اُفتاد
خاکم اندر دہن مگر کز رخش
نور خورشید بر زمیں اُفتاد
بلکہ روشن کند جہاں یکسر
دولت نکتہ آفریں اُفتاد

ہم بروے زحل غبار نشست
شاہ والا جلال الدین اُفتاد
چہ زیاں نور راز افتادن
بر زمیں نور چوں قریں اُفتاد
برخوردیا رب از فروغ نظر

ہم در ابروے زہرہ چیں اُفتاد
آسماں بانگ زد کہ غصہ مخور
نور را جوہر ایں چنیں اُفتاد
گفتم احسنت مکتۂ گفتی
ہر کرا دیدہ دوربیں اُفتاد

عالم افروز باد آں جوہر | کہ بہ خورشید دلنشیں اُفتاد

میر قریش ایلچی توران آنے والا تھا۔ تجویز ہوئی کہ ۳۱ سنہ کا جلوس جشن قریب ہے۔ اُسی میں اُس کی ملازمت ہو۔ دیوان خانۂ اٹک کی آئین بندی ہوئی۔ چنانچہ وہ حاضر ہوا۔ کشمیر فتح ہوا تھا۔ راجہ مان سنگھ بھی کوہستان سرحدی میں فرقۂ روشنائی کی مہم مار کر آئے تھے۔ ہزاروں افغان قتل اور ہزاروں قید کرکے لائے تھے۔ فوج کی حاضری اور اُن کی حضوری بڑے شان و شکوہ سے دکھائی۔ شیخ فیضی نے قصیدہ پڑھا ؎

فرخندہ باد یارب بر مملکت ستانی | از مبدءِ خلافت آغازِ قرن ثانی

انشائے فیضی جس کا حال ابھی بیان کرونگا۔ اس میں اکثر عرضداشتوں کی ذیل میں لکھتا ہے آج صبح کا عالم دیکھ کر حضور پُر نور کا خیال آیا۔ اور یہ غزل ہوئی۔ کہیں لکھتا ہے۔ باغ میں گیا تھا۔ فوارے چھٹ رہے تھے۔ حضور کی وہ تقریر یاد آئی اور یہ شعر آبدار ٹپکا وغیرہ وغیرہ ؎

خمسہ۔ ۹۹۳ھ میں حضور کا حکم ہوا کہ خمسۂ نظامی پر سب نے طبیعتیں آزمائی ہیں۔ تم بھی فکر کی رسائی دکھاؤ۔ قرار پایا کہ :-

مخزن اسرار پر	مرکز دوار	۳ ہزار بیت کی لکھو۔ موجود ہے۔
خسرو شیریں پر	سلیمان و بلقیس	۴ ہزار بیت ہوں۔ اسکے متفرق اشعار ملتے ہیں۔
لیلیٰ مجنوں پر	نل دمن	کہ ہندوستان کے پرانے فسانوں میں سے ہے۔ ۴ ہزار بیت میں ہو۔ ہر جگہ ملتی ہے ؎
ہفت پیکر پر	ہفت کشور	۵ ہزار بیت میں ہو۔ اس کا نام و نشان نہیں ؎
سکندرنامہ پر	اکبرنامہ	اُتنے ہی شعروں میں ہو۔ متفرق اشعار ہیں۔

پہلی کتاب اُسی دن شروع ہوئی۔ چند حروف بسم اللہ کی رموز میں ہوئے۔ اور اسی طرح نیرنگی نفس کیفیت سخن۔ قلم۔ آفرینش۔ دل۔ علم۔ نظر۔ تمیز۔ غرض جو کچھ کہا تھا بادشاہ نے سُنا اور فرمایا۔ یہ مرآۃ القلوب ہے۔ باقی کتابوں کے بھی مختلف مقامات لکھے۔ مگر سلطنت کے کاروبار تھے۔ مہمات مُلکی و

مالی کے ہجوم تھے۔ اس لئے تین نسخے ناتمام رہے ۱۰۰۳ھ میں اسے لاہور کے مقام میں ایک دن بادشاہ نے بلاکر پھر خمسہ کی تکمیل کے لئے تاکید فرمائی اور کہا کہ پہلے نل دمن تمام کرو۔ چنانچہ چار مہینے میں کتاب مذکور لکھی اور حقیقت یہ ہے کہ لطیف استعارے۔ رنگین تشبیہیں۔ بلند مضامین۔ نازک خیالات۔ فصیح زبان لفظوں کی عمدہ تراشیں اور دلکش ترکیبیں اداے مطلب کے انداز دیکھنے کے قابل ہیں۔ جس دن حضور میں لیگیا۔ شگون کے لئے ۵ اشرفیاں بھی اس پر رکھیں۔ دعائیہ زبان پر۔ چہرہ رنگ کامیابی سے شگفتہ۔ دل خوشی سے باغ باغ نذر گذرانی نے الحقیقت جس کے قلم سے یہ تاج مرصع ہو کر اکبری دربار میں گئے۔ اور اکبر جیسے بادشاہ کے سامنے تعمیل فرمائش کے رتبے میں پیش ہو۔ صبح مراد کی بہار اسی کے لہلہاتے دل میں دیکھنی چاہیئے۔ مَیں نے انشا میں کئی رقعے دیکھے ہیں۔ دوستو عجیب خوشی کے خیالات میں ختم کی خبریں دی ہیں۔

بکرماجیت کے زمانہ میں کالیداس نامی صاحب کمال شاعر گذرا ہے۔ اس نے تو کتابیں بطور افسانہ اس نزاکت و لطافت سے نظم کی ہیں۔ کہ جواب نہیں رکھتیں ان میں سے ایک نل دمن کی داستان ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ فیضی ہی جیسا صاحب کمال ہو جو ایسے طلسم کی تصویر فارسی میں اُتارے۔ یہ کتاب ہندوستان اور ہندوستان کے شاعروں کے لئے فخر کا سرمایہ ہے۔ افسانۂ مذکور کی خوش نصیبی ہے۔ کہ فارسی کا شاعر بھی ملا تو ایسا ہی ملا۔ اہل زبان پڑھتے ہیں تو وجد کرتے ہیں۔ حق پوچھو تو مثنوی مذکور کی لطافت و نزاکت کا بڑا سبب یہ ہے۔ کہ سنسکرت زبان میں جو معنی آفرینی کے لُطف تھے۔ فیضی انہیں خوب سمجھتا تھا۔ ساتھ اس کے فارسی پر پوری قدرت رکھتا تھا۔ وہ اس کے خیالات ادھر لایا اور اس طرح لایا کہ نزاکت اور لطافت اصل سے بڑھ گئی۔ اور فارسی میں ایک نئی بات نظر آئی۔ اس لئے سب کو بھائی ۞

مُلّا صاحب فرماتے ہیں"۔ اِن دنوں ملک الشعرا کو حکم فرمایا کہ پنج گنج لکھو۔ کم و بیش پانچ مہینے میں نل دمن لکھی۔ کہ عاشق و معشوق تھے۔ اور یہ قصہ اہل ہند میں مشہور ہے۔ چار ہزار دو سو شعر سے کچھ زیادہ ہیں۔ نسخہ مذکور معہ چند اشرفیوں کے نذر گزرانا۔ نہایت پسند آیا۔ حکم ہُوا کہ خوشنویس لکھے۔ اور مصوّر تصویریں کھینچے۔ اور نقیب خان رات کو جو کتابیں سُناتے ہیں۔ اُن میں یہ بھی داخل ہو۔ مطلع کتاب یہ ہے ع

اے در تگ و پوے تو ز آغاز	عنقاے نظر بلند پرواز

اور حق یہ ہے۔ کہ ایسی مثنوی اس تین سو برس میں خسرو شیریں کے بعد ہند میں شائد ہی کسی نے لکھی ہو ۞

آزاد۔ نعت کے جرم کی کیفیت ابھی سُن چکے۔ لُطف یہ ہے کہ باوجود بیان مذکور کے شعرا کے سلسلہ میں آپنے نشانۂ مہرکن کا حال لکھا ہے۔ پھر دینداری اور خوش اعتقادی و حُسن اخلاق وغیرہ کے اوصاف کے ساتھ اُس کے اشعار سے فیضی کی مٹی خراب کی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ کہ فیضی کو جس قصیدہ پر بڑا ناز ہے وُہ یہ ہے

شکر خدا کہ عشق بتاں ست رہبرم	در ملت برہمن و در دین آذرم

نشائی نے اس پر لکھا ہے ؏

شکر خدا کہ پیرو دین پیغمبرم	حُبّ رسول و آل رسول است رہبرم

نشائی نے نل دمن پر بھی کچھ اشعار لکھے تھے۔ باوجودیکہ حضرت کتاب مذکور کو خود پسند کا خلعت پہنا چکے تھے مگر اسے بھی رہ نہ سکے۔ نشائی نے جو خاکہ اُڑایا تھا۔ آپ نے اس میں سے پینتالیس شعر لکھ ہی دیئے۔ **مثنوی**

چند زنی لاف کہ در ساحری	سامریم سامریم سامری	ہر نفسم معجزۂ عیسویست
شعلۂ نور شجر موسویست	در سخنم نادرۂ روزگار	اہل سخن را منم آموزگار
ہر نفسم پردۂ جادو شکیب	ہر سخنم سحر ملائک فریب	خسرو ملک ہمہ دانی منم
عالم اقلیم معانی منم	جوہر ہر سلک سخندانیم	صیرفی نقد سخن رانیم
ایں منم امروز دریں داوری	شعلۂ آتش بزباں آوری	دعوئے ایجاد معانی مکن
شمع نہ چرب زبانی مکن	شعلہ سرشتا ز گہرے پاک	لاف مزن نیست چو در کیسہ خاک
طبع تو ہرچند درو ہوش زد	یک سخن تازہ نشد گوش زد	آنچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند
دُر کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند	خانہ کہ از نظم بیاراستی	آب و گلش از دگراں خواستی
سقف منقش کہ دریں خانہ است	رنگ وے از خانۂ بیگانہ است	طبع تو دارد روش باغباں
ساختہ باغے ز نہال کساں	سبزۂ آں باغ ز راغ دگر	ہر گل رعناش ز باغ دگر
غنچۂ آں گرچہ رواں پرور است	لیک نے خون جگر دیگر است	بید کہ بے میوہ سرے بر کشید
ہر کس ازاں دانہ مشجر کشید	تازگی آں نہ ز باران تست	از خوئے پیشانی یاران تست
چند پئے نقد کساں سوختن	چشم بمال دگراں دوختن	جمع مکن نقد سخن پروراں
کیسہ مکن پُر ز زر دیگراں	شربت بیگانہ فراموش کن	آب ز سرچشمۂ خود نوش کن
گر خضری آب حیات تو کو	ور شکری شاخ نبات تو کو	نخل صفت سر بفلک میبری
میوہ بجز خستہ نے آوری	سرو کہ بر چرخ بساید سرش	چاشنئے میوہ نباشد برش
بر سخن خویش تفاخر چراست	بر من دل خستہ تمسخر چراست	من اگر از شرم نگویم سخن
حمل بہ بیدانشئے من مکن	نے چو طلب سینہ پر از ختہ ام	ہیچ صدف پر دُر و لب بستہ ام
من اگر از بند کشایم زباں	لب بکشانید زباں آوراں	طعنہ چو ابلیس باآدم مزن
حالت من در نگرو دم مزن	سامریم من کہ بزور فسوں	لعبتے از سحر برآرم بروں

غلغلہ در زہرہ و ماہ افگنم | نسخۂ ہاروت بچاہ افگنم | این منم آں ساحر جادو مزاج
کز سخنم یافتہ جادو رواج | من کہ بجادو سخنی شہرہ ام | ہم فلک و ہم مہ و ہم زہرہ ام
سامریاں در گرو موئے من | بابلیاں در چہ جادوئے من | دولتِ ایں کار بکام من است
سکۂ ایں ملک بنامِ من است | از سخنم طرزِ سخن یادگیر | عار مکن دامنِ اُستاد گیر
ہر کہ باستاد ارادت برد | در دو جہاں گنج سعادت برد | یک سخن از نظم تو نبود درست
مضحکۂ اہل سخن نظم تست | گرچہ بروے تو نگوید کسے | عیب تو پیش تو بگوید کسے
لیک عقیبِ تو ملامت گراں | بر تو رسانند گراں تا گراں | شعرِ ترا گر بمیاں آورند
عیب تو یک یک بزباں آورند | شعر ترا پیش تو تحسیں کنند | در پس تو لعنت و نفریں کنند
نے تو بکس یار و نہ کس با تو یار | عیب تو بر تو نشود آشکار | وہ کہ یکے یار نداری دریغ
مونس و غم خوار نداری دریغ | تا بتو عیب تو نماید کہ چیست | وانچہ بجَیب تو کشاید کہ چیست

مرکز ادوار ۱۰۰۳ھ میں شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں۔ کہ اُن کے کلام کی تلاش و ترتیب کے حالت میں ایک بیاض نظر آئی کہ بہت شوریدہ لکھی ہوئی تھی۔ معلوم ہُوا کہ عالم بیماری میں اکثر زیر قلم رہتی تھی۔ اشعار کو دیکھا تو مرآۃ القلوب (مرکز ادوار) کے وزن میں تھے۔ پڑھی نہ جاتی تھی۔ اُن کے ہمنشینوں اور ہمزبانوں سے کہا۔ وہ مل کر بیٹھے اور نا امید ہو کر اُٹھے۔ آخر میں متوجہ ہُوا نور آگاہی اور دانش الٰہی سے پڑھ کر مطلب مطلب اور مضمون مضمون کے شعر الگ الگ لکھے۔ اور ترتیب دے کر داستان داستان نئی سُرخی کے نیچے لکھی۔ جس پریشاں نظم و نثر سے سخن آشنا مصاحبوں کا فکر نا امید ہو گیا تھا وہ مرتب ہو کر تیار ہو گئی۔ جب میں نے اپنے بھتیجے[۱] کو زندگی جاوید کا مژدہ سُنایا۔ مجھ پر شادمانی اور اس پر حیرانی چھا گئی۔ باقی تین کتابوں کے بھی کچھ اشعار اور بعض داستانیں لکھیں تھیں۔ چنانچہ کچھ کچھ ان میں سے اکبر نامہ میں درج ہیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ فارسی کا کل کلام نظم و نثر پچاس ہزار بیت اندازہ میں آیا ہے۔ ترتیب کے وقت یہ بھی معلوم ہُوا کہ پچاس ہزار اشعار اہل زمانہ کی طبیعتوں سے بلند دیکھ کر خود دریا برد کر دیئے تھے۔ بعض کتابوں میں ہے۔ کہ ۱۰۰۳ھ میں اسکی ترتیب تمام ہوئی۔

لیلاوتی۔ حساب کی کتاب سنسکرت میں تھی۔ اُس کے مُنہ سے ہندوستان کا اُبٹنا دھو کر فارس کا گلگونہ ملا۔ ذرا دیباچہ کی ابتدا دیکھنا کس انداز سے اُٹھے ہیں۔ **رباعی**

اول ز ثنائے بادشاہی گوئیم | وانگہ ز ستایش آلٰہی گوئیم | ایں عقدۂ معنی بقلم بکشائیم | دیں نکتۂ سربستہ کماہی گوئیم

۱ شاعر کے اشعار اس کے فرزند معنوی ہوتے ہیں۔ اسی نسبت سے انہیں اپنا بھتیجا کہا ہے۔ اور جب پریشان اشعار کو مرتب کر کے کتاب بنا دیا تو اسے زندگی جاوید حاصل ہو گئی۔

رسم است کہ چوں بدرگاہ بادشاہی مشرف شوند۔ نخست از مقربان بارگاہ توسل جویند۔ ایں جایگاہ صمدیت و مقرب بارگاہ احدیت حضرت بادشاہ حقیقت آگاہ است خلداللہ ملکہ وابقاہ ؎

خواہی کہ چو من راہِ ہدیٰ بشناسی	نشناختہ راہ راہ کج بشناسی
ایں سجدۂ نا قبول سود نہ دہد	اکبر بشناس تا خدا بشناسی

مہابھارت کا ترجمہ بادشاہ نے دیا کہ نثر درست کرو اور مناسب مقام پر نظم سے آرائش دو۔ دو پرب (فن) درست کئے تھے کہ اس سے زیادہ ضروری کام عنایت ہو گئے اور آرائش ناتمام رہی ؎

بھاگوت اور **اتھرون بید** کو بھی کہتے ہیں۔ کہ فارسی میں ترجمہ کیا مگر کتاب سے ثابت نہیں یہ بھی مشہور ہے کہ فیضی عالم نوجوانی میں بنارس پہنچا اور کسی بڑے گنوان پنڈت کیخدمت میں ہندو بن کر رہا۔ جب تحصیل کر چکا تو رخصت کیوقت راز کھولا اور عفو تقصیر چاہی اُس نے افسوس کیا۔ مگر اسکی ذہانت اور قابلیت سے بڑا خوش تھا۔ اسلئے عہد لییا۔ کہ **گایتری** کا منتر اور **چاروں بید** بھاشا یا فارسی میں نہ کرنا۔ اس کہانی کا بھی کتاب سے سُراغ نہیں ملتا۔

اساتذۂ سلف کی کتابوں سے جو عمدہ مقام پسند آیا۔ اُسے لکھتے گئے تھے۔ وہ ایک عجیب گلدستہ نظم و نثر کا شیشۂ عطر کا مجموعہ تھا۔ شیخ ابوالفضل نے اس پر دیباچہ لکھا تھا (دیکھو حال ابوالفضل)

انشائے فیضی ۱۰۲۵ھ میں نورالدین محمد عبداللہ خلف حکیم عین الملک نے ترتیب دی ہے۔ اور لطیفہ فیاضی اس کا نام رکھا ہے۔ باب اول میں عرضداشتیں ہیں۔ کہ اکثر سفارت دکن سے حضور بادشاہ میں عرض کی ہیں۔ عرضیاں بڑی غور طلب پورٹیں ہیں۔ کہ رموز سلطنت پر مشتمل ہیں۔ انکی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں بڑے بڑے نکتے سکھاتی ہیں اول عجز و انکسار کے انداز۔ اور مجھے اس میں جتانے کے قابل یہ امر ہے۔ کہ جب ہم ایشیا میں ہیں۔ اور ہمارے آقا کمال شوق سے آداب و تعظیم کے خریدار ہیں تو ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانے میں کیا عذر ہے۔ آقا کی خوشی بڑی گرانبہا شے ہے جب قیمت میں فقط چند لفظ یا فقرے خرچ کر کے ملے اور ہم نہ لے سکیں تو ہم سے زیادہ کم عقل یا کم نصیب کون ہوگا۔ ساتھ ہی یہ ہے۔ کہ فقط ایک خاکساری کا مضمون ہے۔ جسے وہ انشا پرداز معنی آفریں کس کس طرح رنگ بدل کر پیش کرتا ہے۔ اور مستعمل اور فرسودہ جنس کو کیسا خوش رنگ بنا بنا کر سامنے لاتا ہے۔ خدمت حضور سے جدائی کا رنج بھی بہت ہے۔ اسے کس کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ اور اسکے ضمن میں یہ بھی کہ ایسی با اعتبار اور با اعزاز خدمت میری طبع کو کہ عاشق حضور ہے وبال معلوم ہوتی ہے۔ بعد اسکے "اصل مطالب" پہلی عرضی میں اول رستہ کی حالت اپنی مملکت میں جس جس شہر سے گذرا ہے وہاں کی رُوداد۔ حاکم کی کیفیت کارروائی۔ اگر ضروری ہے تو ماتحتوں کی بھی خدمتگذاری۔ ملک دکن میں پہنچے تو سرزمین کی کیفیت۔ ملک کی حالت۔ ہر مقام میں پیداوار۔ پھول پھل کیا کیا ہیں۔ اور کیسے ہیں۔ اہل صنعت

کے منائع۔ علما۔ حکما۔ شعرا وغیرہ اہل کمال کے حالات اُن کی شاگردی کا سلسلہ کہ کن اُستادوں تک پہنچتا ہے ہر ایک کی لیاقت اخلاق۔ اطوار۔ ہر ایک کی اپنی رائے کہ کون پُرانی لکیر کا فقیر ہے۔ کون نئی روشنی سے اثر پذیر ہے۔ اور کون ان میں سے حضوری دربار کے قابل ہے۔

بعض لنگر گاہیں وہاں سے قریب ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جاتے ہی سب طرف اپنے آدمی پھیلا دیئے تھے۔ چنانچہ ہر عرضی میں لکھتے ہیں کہ میرا آدمی خبر لایا۔ فلاں تاریخ فرنگ کا جہاز اُترا۔ فلاں فلاں اشخاص روم کے ہیں۔ وہاں کے حالات یہ یہ معلوم ہوئے۔ فلاں جہاز آیا۔ بندر عباس سے فلاں فلاں اشخاص سوار ہوئے۔ ایران کے فلاں فلاں اشخاص ہیں۔ وہاں کے یہ یہ حالات ہیں۔ عبداللہ خاں اُزبک سے ہرات پر لڑائی ہوئی۔ یہ تفصیل ہے۔ اور یہ انجام ہوا۔ آئندہ یہ ارادہ ہے شاہ عباس نے تحائف تیار کئے ہیں۔ فلاں شخص کو ایلچی قرار دے کر حضور میں بھیجیگا۔ وہاں فلاں فلاں اشخاص عالم اور صاحب فضل و کمال ہیں۔

عرائض مذکورہ سے اکبر کی طبیعت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ کن کن باتوں سے خوش ہوتا تھا اور باوجود سامان شہنشاہی کے ان اہل علم اور اہل دانش کے ساتھ کس درجہ بے تکلف تھا۔ اور یہ کیسی لطافت سے اُسے خوش کرتے تھے۔ اور کس درجہ کی ظرافت لطافت ہوتی تھی جو اُس کے دل کو شگفتہ کرتی تھی۔ اِن لطیفوں میں تم کو ایک نکتہ معلوم ہوگا۔ جو کہ مصلحت ملکی اور قانون حکمت سے آگاہ کریگا۔ وہ کیا؟ کمبخت اور منحوس جھگڑا تشیع اور تسنن کا۔ تم دیکھ چکے کہ علما و امرائے دربار تمام بُخاری و سمرقندی تھے۔ اور کیسے زوروں پر چڑھے ہوئے تھے۔ مگر دیکھو گے اور سمجھ گے کہ انہوں نے اس معاملے کو کیسا خفیف کر دیا تھا کہ دل لگی کا مصالح ہو گیا تھا۔ یہ عرضیاں بہت طولانی ہیں میں ان میں سے ایک عرضی کی نقل لکھونگا۔ مگر اس میں سے بھی بعض مطالب کی عبارتیں چھوڑنی پڑینگی۔ کہ طبیعتوں کے ذوق کجھ نہ جائیں اُن سے یہاں کچھ تعلق نہیں ہے۔

ف - ان رقعوں میں جہاں شیخ ابوالفضل کا ذکر آیا ہے۔ تو اُنہیں نواب علامی۔ نواب اخوی۔ نواب اخوی علامی۔ کہیں اخوی شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں۔

تفسیر سواطع الالہام - ۱۰۰۲ھ میں یہ تفسیر لکھی کہ علم و فضل کیسا تھ زور طبع اور حدت فکر کا زمانہ ہے ۷۵ جزو کی کتاب تمام بے نقط قریب یکہزار بیت کے دیباچہ ہے۔ اُس میں اپنا۔ باپ کا۔ بھائیوں کا اور تحصیل علم کا حال ہے۔ بادشاہ کی تعریف اور قصیدہ لکھا ہے۔ ۹۹ فقرے کا خاتمہ ہے۔ کہ ادائے مطلب بھی ہے اور ہر فقرہ تاریخ اختتام ہے۔ فضلائے عصر نے اس پر تقریظیں لکھیں۔ شیخ یعقوب کشمیری صیرفی تخلص نے

زبان عربی میں لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے آغاز تصنیف کی تاریخ کہی۔ لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین
نظرثانی کرنے لگے تو خود اُس کی تاریخ احرار الثانی کہی۔ میر حیدر معمائی ایک فاضل کاشان سے
آئے تھے۔ انہوں نے سورۂ اخلاص میں سے تاریخ نکالی۔ مگر بے بسم اللہ۔ ملک الشعرا نے انہیں دس ہزار
روپے انعام دیئے۔ ملا صاحب نے بھی دو تاریخیں اور ایک تقریظ لکھی۔ مگر منتخب التواریخ میں جو بے نقط
سنائی ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تفسیر مذکور میں مولانا جمال [1] نے بہت اصلاح کی ہے اور
درست کر دی ہے۔ خیر یہ جو چاہیں فرمائیں۔ فیضی کو اس نعمتِ الٰہی کی بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے انشا میں
کئی خط احباب علما کے نام ہیں۔ لکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ پھولا نہیں سماتا۔ ان فقروں سے خوشی برستی
ہے۔ ایک خط میں لکھتا ہے۔ دسویں تاریخ ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ کو میری تفسیر ختم ہوئی۔ لوگ تقریظیں [2] اور
تاریخیں کہہ رہے ہیں۔ سید محمد شامی ایک بزرگ احمدنگر میں ہیں۔ انہوں نے بھی لکھی ہے تم نے خود دیکھی
ہوگی۔ مولانا ملک قمی نے اس کے باب میں رباعیاں کہی ہیں تم نے سنا ہوگا۔ مولانا ظہوری نے قصیدہ
کہا ہے دیکھا ہوگا۔ یہاں بھی لوگوں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں۔ اس میں خمسہ کے انتظام کی خوشخبری
سناتا ہے۔ بعض خطوط میں موارد الکلم کی خبریں بھی دیتا ہے ؛

موارد الکلم۔ نصائح و مواعظ کی باتیں ہیں۔ کہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں لکھی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے
کہ تفسیر مذکور لکھ کر طبیعت میں زور۔ زبان میں قدرت۔ کلام میں روانی اور لفظوں کی بہتات پیدا ہوگئی تھی۔
کہ جس پہلو سے چاہتا تھا مطلب ادا کر دیتا تھا۔ اس لئے وہی آیات و احادیث و کلام حکما کے مضامین ہیں
جن کو بے نقط الفاظ میں ادا کیا ہے۔ **موارد الکلم سلک درر الحکم** تاریخی نام ہے ؛

ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ابتدا میں ایک رسالہ غیر منقوط بادشاہ ظل اللہ کے نام لکھا تھا۔ ملاحظہ کو
بھیجتا ہوں۔ مگر بازیچۂ اطفال عرب ہے۔ کار نامہ صنادید ادب نہیں۔ **آزاد**۔ یہ رسالہ اب نہیں ملتا ؛

شیخ حسن کالپی وال کے نام بہت خط ہیں۔ ایک میں لکھتے ہیں۔ جب آؤ تو **مقصد الشعرا** ضرور لیتے
آنا کہ تذکرہ کا اختتام اس پر منحصر ہے۔ اور اور کتابوں میں سے بھی جو ہو سکے۔ انتخاب فرمائیگا۔ جی چاہتا ہے
کہ اسکے دیباچہ میں آپکا نام بھی لکھوں۔ **آزاد**۔ تذکرہ مذکور بھی نہیں ملتا۔ خدا جانے تمام بھی ہوا تھا یا نہیں ؛

---

[1] لاہور میں ایک محلہ تھا۔ مولانا جمال الدین ان دنوں یہاں ایک فاضل کامل تھے۔ اسی محلہ میں رہتے تھے ؛

[2] مولانا کمال الدین شیرازی کے نام انشاء مذکور میں ایک خط ہے ؛

[3] فیضی تقریظ کی جگہ اپنی تحریر میں توقیع لکھتے ہیں ؛

ان کی تصنیفات کی تعداد بعض کتابوں میں ۱۰۱ لکھی ہے۔ مگر مجھے اس شمار میں کلام ہے +

مذہب۔ فیضی اور ابوالفضل کے مذہب کا معاملہ اُن کے باپ کی طرح گومگو رہا۔ مُلّا صاحب بدایونی نے جو لکھا تم نے دیکھ لیا۔ کوئی دہریہ کہتا ہے۔ کوئی آفتاب پرست بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اس کی تصنیفات کو دیکھو۔ مگر اول سے آخر تک دیکھو۔ وہ بلند آواز سے پکار رہی ہیں۔ کہ موحد کامل تھے۔ تب اس بدنامی نے کیونکر اشتہار پایا؟ ہاں ذرا غور سے خیال کرو۔ کہ اکبر کے آغاز سلطنت اور اس سے پہلے ہمایوں اور شیر شاہ تک کے عہد میں مخدوم اور ان کے خادموں کے اختیارات کیسے بڑھے ہوئے تھے۔ تم نے دیکھ لیا۔ اُن کی خود بینی اور خود پسندی اور روکھی سوکھی دینداری کے زور دوسرے کو دنیا میں دیکھ نہ سکتے تھے۔ اُن کا یہ دعوے بھی تم نے دیکھ لیا۔ کہ علم فقط علم دین ہے۔ جو ہم ہی جانتے ہیں۔ اور جو ہم جانتے ہیں۔ اور جو ہم کہتے ہیں۔ وہی درست ہے۔ اور جو اس میں قیل وقال کرے وہ کافر۔ فیضی اور ابوالفضل نے آپ دیکھ لیا تھا۔ اور باپ سے اچھی طرح سن لیا تھا کہ ان بے دلیل دعویداروں کے ہاتھ سے کس آفت و عذاب میں عمر بسر ہوئی۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ مخدوم و صدر نے قسمت کے زور سے ملک گیر بادشاہوں کے زمانے پائے تھے اور شمشیر زنی اور فوج کشی کے عہد دیکھے تھے۔ اب وہ زمانہ آیا کہ اکبر کو ملک گیری کم اور ملکداری کی زیادہ ضرورتیں پڑ رہی تھیں۔ انھیں یہ بھی یاد تھا۔ کہ جب ہمایوں ایران میں تھا۔ تو شاہ طہماسپ نے ہمدردی کی خلوتوں میں اس نے پوچھا۔ کہ سلطنت کی اس طرح خانہ بربادی کا کیا سبب ہوا؟ اس نے کہا بھائیوں کی نا اتفاقی۔ شاہ نے کہا۔ رعایا نے رفاقت نہ کی؟ ہمایوں نے کہا۔ کہ وہ غیر قوم اور غیر مذہب ہیں۔ شاہ نے کہا۔ اب کی دفعہ وہاں جاؤ۔ تو ان سے موافقت کر کے ایسی اپنایت پیدا کرو۔ کہ مخالفت کا نام درمیان نہ رہے۔ اکبر یہ بھی جانتا تھا۔ کہ مخدوم وغیرہ علما ہر رنگ کے پیچھے ہیں۔ ہمایوں کے عہد میں اسکے خاص الخاص تھے شیر شاہ ہوا اسی کے ہوگئے۔ سلیم شاہ ہوا اسی کے ہوگئے۔ اور لطف یہ کہ وہ سب بھی جانتے تھے۔ بلکہ خاص خلوتوں میں بیٹھ کر کہتے تھے۔ کہ اسے مخدوم نہ سمجھو۔ بابر کا پانچواں بیٹا ہند میں بیٹھا ہے۔ پھر بھی اس کی عظمت اور نذر و نیاز میں فرق نہ لاتے تھے۔ اکبر یہ بھی سمجھتا تھا۔ کہ ان عالموں نے بادشاہ اور امرائے بادشاہ کو ملک گیریوں کے لئے قربانی سمجھا ہے۔ ملکداری اور حکمرانی کے مزے احکام شریعت کی آڑ میں ان کا شکار ہیں۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ بے ان کے فتویٰ کے بادشاہ بادشاہ کو ایک پتّا ہلانے کا بھی اختیار نہیں ہے جبکہ بیگناہوں کو قتل کروا دیتے تھے۔ خاندانوں کو تباہ کروا دیتے تھے۔ وہ ٹُکر ٹُکر دیکھتا تھا۔ اور دم نہ مار سکتا تھا۔ اکبر یہ بھی سمجھتا تھا۔ کہ بابر میرے دادا کو فقط ہموطن امرا کی نمک حرامی نے خاندانی سلطنت سے محروم کیا۔ اور جو ادھر کے ترک ساتھ ہیں۔ خاص نمکحرامی کا مصالح ہیں۔ عین وقت پر دغا دینے والے ہیں۔ اکبر یہ بھی

دیکھ رہا تھا۔ کہ بہت ایرانی یا شیعہ میرے باپ کے ساتھ تھے۔ اور میرے ساتھ ہیں۔ وہ جاں نثاری کے میدان میں اپنی جانوں کو جان نہیں سمجھتے۔ باوجود اس کے انھیں دب کر اور اپنے مذہب کو چھپا کر رہنا پڑتا ہے امرائے ترک انھیں دیکھ نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سب علما حسد کے پتلے ہیں۔ آپس میں بھی ایک دوسرے کا روادار نہیں۔ روشن دماغ بادشاہ یہ سب حال دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ کیا کرے اور کس طرح پرانوں زوروں کو توڑے۔ اس نے ۹۸۳ھ میں ایک عالیشان مکان چار ایوان تیار کیا۔ اور عبادت خانہ قرار پایا۔ علما کا جلسہ ہوتا تھا۔ خود بھی شامل ہوتا تھا۔ ان سے تحقیق مسائل کرتا تھا آپس میں مباحثے کرواتا تھا۔ اور ان کے جھگڑوں پر کان لگاتا تھا۔ کہ شاید اختلافوں میں کوئی اتفاق مفید مطلب نکل آئے۔ فارغ التحصیل جوانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لیتا تھا۔ اور ان جلسوں میں شامل کرتا تھا۔ کہ اس زمانے کی آب و ہوا نے انھیں پالا ہے۔ جوان دماغ ہیں۔ جوان عقلیں ہیں۔ شاید مزاج زمانہ کے موافق رائے لائے ہوں۔ اور مصلحت زمانہ کے موجب تجویزیں سوچتے ہوں +

دربار کی یہ کیفیت تھی۔ اور زمانہ کا وہ حال تھا۔ کہ شیخ فیضی پہنچے۔ پھر ملائے بدایونی اور ساتھ ہی ابوالفضل بھی داخل دربار ہوئے۔ ان سب کی لیاقتیں ایک ہی تعلیم کا دودھ پی کر جوان ہوئی تھیں۔ تازے تازے علم طبیعتوں میں جوانی کے زور۔ ذہن تیز۔ فکر بلند۔ بادشاہ خود حمایت پر۔ اور سب جوان قریب العمر۔ ملا صاحب کا حال دیکھو۔ کہ سب سے پہلے منبر پر ان کی بہادری نے فتح پائی۔ بڈھے بڈھے عالموں سے زبان بزبان اور کلہ بکلہ مقابلے ہونے لگے۔ اور پرانی فضیلتیں جوانوں کی تقریروں سے اسطرح گرنی شروع ہوئیں۔ جیسے درخت سے پکے پھل گرتے ہیں۔ بے خبر لوگ شیخ مبارک۔ فیضی و ابوالفضل کو مخدوم صدر کے گرانے کا الزام دیتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے۔ کہ ان کا کچھ قصور نہ تھا۔ اب زمانے کا مزاج پلٹنے بوجھوں کا متحمل نہ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے نہ گرتے۔ تو خود بخود گرتے +

ان باپ بیٹوں کو جو دہریہ اور بدمذہبی کے الزام دیتے ہیں۔ یہ بھی تامل کا مقام ہے۔ مجتہد کا کام کیا ہے؟ اصل مسئلہ کی صورت حال بمصلحت مقام ہے۔ اور مناسبت وقت کا دیکھنا۔ دیکھو! شریعت کے اکثر احکام ایسے ملکوں کے لئے قرار دئیے گئے ہیں جہاں جمعیت کثیر اہل اسلام کی تھی۔ اور غیر مذہب کے لوگ جز ضعیف۔ صحرا نشین۔ بے سروپا خیال کرو۔ یہی احکام ایسے ملکوں میں کیونکر جاری کر سکتے ہیں جہاں جمعیت قلیل اہل اسلام کی ہو اور گذارہ کرنا ان لوگوں کے ساتھ ہو کہ جمعیت کثیر اور جمغفیر صاحب ملک اور صاحب شمشیر غیر قوم اور غیر مذاہب کے لوگ ہوں۔ اور ملک بھی انھیں لوگوں کو ہو۔ اچھا جاری کرتے ہو کر دو۔ بہت خوب سب کے سب شہید ہو جاؤ۔ مگر سمجھ لو کہ یہ شہید کیسے شہید ہونگے +

بھلا مقتضائے وقت کے بموجب احکام نہ ہوتے۔ تو قرآن میں آیتیں منسوخ کیوں ہوتیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو خدا کیوں فرماتا۔ یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعندہٗ ام الکتاب اکبر آخر ملک گیر اور ملک دار تجربہ کار بادشاہ تھا۔ وہ اپنے ملک کی مصلحت کو خوب سمجھتا تھا۔ اسی واسطے جب ان کے کسی فتوے کو خلاف مصلحت دیکھتا تھا۔ تو روکتا تھا۔ اور شریعت کی دلیل سے انکا جواب چاہتا تھا۔ علمائے مذکور پہلے عربی فقرے۔ اور علمی الفاظ بول کر اسے دبا لیتے تھے۔ اب اگر وہ بے اصول یا خلاف مصلحت گفتگو کرتے تھے۔ تو ابوالفضل وفیضی آیت یا حدیث سے کبھی علمائے سلف کے فتوے سے کبھی قیاس سے کبھی دلیل عقلی سے انھیں توڑ دیتے تھے۔ اور چونکہ بادشاہ کی رائے ان کی تائید پر ہوتی تھی علما دیکھتے رہ جاتے تھے۔

ملائے بدایونی تو کسی کا لحاظ کرنے والے نہیں جس کی بات بیجا سمجھتے ہیں۔ مونچھ پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں قاضی طوالیسی کے فتووں سے خفا ہو کر ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ شیخ ابوالفضل کی وہ بات ٹھیک ہے۔ کہ اگر امام اعظم در زمان ما مے بود فقہے دیگرے نوشت۔ حریفوں کا اور بس نہ چلتا تھا۔ ان پر اور ان کے باپ پر قدیم سے زبانیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب بھی رسوا کرتے تھے۔ کہ انھوں نے بادشاہ کو بدمذہب بنا دیا۔ ملا صاحب بھی رشک منصبی سے لبریز بیٹھے تھے۔ اگرچہ مخدوم اور شیخ صدر دونو سے بیزار تھے۔ مگر ان کے معاملوں میں بھی یہ بھی حریفوں کے ساتھ ہمداستان ہو جاتے تھے۔ یہ بات تو بدیہی ہے۔ کہ باپ اور دونوں بیٹے علوم عقلی اور نقلی میں اعلے درجہ کمال پہنچے ہوئے تھے۔ شیخ مبارک کی مہر فتووں پر لی جاتی تھی۔ لڑکوں کی جوانی نے ابھی یہ رتبہ انھیں نہ دیا ہو۔ لیکن اگر کسی مسئلہ میں یہ علمائے وقت سے اختلاف کریں۔ تو ایک مجتہد کی رائے کا دوسری رائے سے اختلاف ہے۔ جو ہمیشہ سے عام چلا آتا ہے۔ اور اس وقت بھی عام تھا مجتہد اگر اپنے استنباط میں خطا کرے۔ تو بھی مستحق ایک ثواب کا ہے نہ یہ کہ اسکی تکفیر کی جائے +

البتہ ان کی تصنیفات کو بھی دیکھنا ضرور ہے۔ شاید ان سے کچھ عقاید کا حال کھلے۔ شیخ مبارک کی کوئی تصنیف اس وقت ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ لیکن یہ تو ثابت ہے۔ کہ اسے سب مانتے ہیں۔ فیضی کی تفسیر سواطع الالہام اور موارد الکلام موجود ہے۔ کہیں اہل فن کے اصول سے بال بھر نہیں سرکا۔ تمام آیات واحادیث اور بزرگوں کے کلمات وطیبات کے مضامین ہیں ۔ زبانی باتوں میں ملا صاحب جو چاہیں۔ کہیں مگر نفس مطالب میں جب۔ نہ اب۔ کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بدینی وبدنفسی پر آ جاتے۔ تو جو چاہتے۔ لکھ جاتے انھیں ڈر کس کا تھا +

ابوالفضل کا کلام سبحان اللہ مطالب معرفت وحکمت میں اعلے درجۂ رفعت پر واقع ہوا ہے۔

دل میں کچھ ہوتا ہے جبھی زبان سے نکلتا ہے۔ ہانڈی میں جو ہوتا ہے۔ وہی ڈوئی میں آتا ہے۔ یہ خیالات ان پر اس طرح کیوں کر چھائے رہتے تھے۔؟ ان کی عبارتوں کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک نقطہ معرفت اور حکمت کا دریا بغل میں لئے بیٹھا ہے۔ اور یہ نہیں ہوتا جب تک کہ دل اور جان۔ حال و مقال سب ہی کے خیال پر وقف نہ کرے۔ اگر ان تحریروں کو فقط خیالات شاعرانہ اور عبارت آرائی اور انشا پردازی کہیں تو بھی ان کی جان پر ظلم ہے۔ بھلا شعر و سخن کے سامان میں انھیں انہی خیالات کے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ عالم خیال کے بادشاہ۔ ملک سخن کے خدا تھے۔ جن مضامین میں چاہتے۔ اپنے مطالب کو رنگ دیتے۔ اور خلق عالم سے واہ واہ لے لیتے۔

بڑا الزام ان پر یہ ہے۔ کہ اکبر کو خالص مسلمان نہ رہنے دیا۔ صلح کل اور نصاریٰ کے رنگ سے رنگ دیا۔ آپ دہریہ تھے اسے بھی دہریہ کر دیا۔ میرے دوستو۔ تین سو برس کی بات ہے۔ کیا خبر ہے۔ انہوں نے اُسے رنگ دیا۔ یا مطیع فرمان نوکر اپنے آقا کے مصالح ملکی میں رنگے گئے۔ مگر انھوں ہی نے رنگا۔ تو اس عقل رنگ آمیز کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جو حریف کہ فتاوے شریعت کے بہانوں سے ہر وقت قتل کے درپے رہتے تھے۔ ان سے جان بھی بچائی۔ اور فتح بھی پائی۔

وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں۔ خدا کا خود کیا مذہب ہے؟ ظاہر ہے۔ کہ دنیا کے لحاظ سے ایک مذہب نہیں ہے۔ ورنہ وہ کل عالم کی پرورش کیوں کرتا؟ اپنے فیض کو عام کیوں رکھتا۔ اور سب کو ترقی کیوں دیتا۔ ایک مذہب جو حق ہے وہی رکھتا۔ باقی سب فنا۔ جب یہ بات نہیں ہے۔ اور وہ رب العالمین ہے۔ تو بادشاہ اس کا سایہ ہے۔ اس کا مذہب بھی وہی ہونا چاہئے۔ اسے واجب ہے کہ جو درگاہِ آلہی سے ملا ہے۔ اسے سنبھالے۔ سب مذہبوں کی پرورش اور حفاظت و حمایت اور رعایت برابر کرے۔ اس طرح کہ گویا وہی اس کا مذہب ہے۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھا ہوا تھا۔ اور یہ لوگ سلطنت کے ہاتھ تھے۔ سلطنت کی زبان تھے۔ سلطنت کے دل و جان تھے۔ ان کا مذہب کوئی کیونکر قرار دے سکے۔ علمائے وقت کی دست درازی جو اپنے مخالف مذہبوں کو فنا اور برباد کئے ہوتی تھی۔ اگر یہ اس کے روکنے میں ساعی ہوئے۔ تو کیا برا کیا۔

درحیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں چراست	از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

رسم عام ہے۔ کہ اکثر تحریروں کے عنوان پر کوئی نام پروردگار کا لکھتے ہیں۔ بے شک وہاں فقط اللہ اکبر لکھا جاتا تھا۔ مگر تم ہی خیال کرو۔ فیضی و ابوالفضل جو ارسطو و افلاطون کے دماغ کو استخوان بے مغز سمجھیں ممکن ہے۔ کہ اکبر کو خدا سمجھے ہوں گے۔ خوش طبع رنگین خیال شاعر تھے۔ جہاں اور ہزاروں

لطیفے تھے۔ یہ بھی ایک لطیفہ تھا۔ یاروں کے جلسوں میں بیٹھتے ہونگے۔ تو آپ قہقہے اڑاتے ہونگے + تشیع کا الزام بھی انھیں لگاتے ہیں۔ لیکن جن باتوں سے لوگوں نے انھیں شیعہ سمجھا۔ وہ غور طلب ہیں۔ شیخ مبارک کے حال میں تم سُن چکے۔ اس کے دامن پر یہ داغ لگا یا گیا تھا۔ بیرم خاں کے حال میں تم پڑھ چکے۔ کہ ہمایوں سے بھی بخارائی اور ماوراءالنہری سرداراس مذہب کی بابت شکایت کرتے تھے۔ اکبر نے باپ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اور ساری داستانیں سنی تھیں۔ خود دیکھ رہا تھا۔ کہ شیعہ اہل علم یا اہل قلم ہیں۔ تو اعلیٰ درجۂ کمال پر ہیں۔ جنگی یا ملکی خدمتیں سپرد ہوتی ہیں۔ تو جانیں توڑ کر عرق ریزی کرتے ہیں۔ کیونکہ جانتے ہیں۔ چاروں طرف حریف تاک لگائے کھڑے ہیں۔ فیضی و فضل جب دربار میں آئے ہونگے۔ تو اور بھی شیعہ دربار میں موجود تھے۔ اس حالت میں کچھ اس سبب سے کہ انہوں نے خود علمائے اہل سنت کے ہاتھ سے دکھ اٹھائے تھے۔ اور انہوں نے امرائے دربار سے، اور آیندہ کے خطروں میں یہ اور شیعہ شریک تھے، انہوں نے انھیں غنیمت سمجھا ہوگا۔ انہوں نے انہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب کے کیڑے اور علم و فن کے پتلے اور حکیم ہمام۔ حکیم ابوالفتح۔ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ وغیرہ علوم و فنون کے دریا کی مچھلیاں تھیں جنس کو جنس نے ربط دیا ہوگا۔ ہر امر میں ایک دوسرے کی تائید کرتے ہونگے۔ ابوالفضل کے خطوط اس کے انشاؤں میں دیکھو۔ فیضی کے خطوط اس کے رقعات میں پڑھو۔ جو تحریریں ان کے نام ہیں۔ دل کی محبتیں کن کن الفاظ اور عبارتوں میں ٹپکتی ہیں۔ حکیم ابوالفتح اور میر فتح اللہ شیرازی مر گئے۔ تو فیضی نے ان کے مرثیے کہے۔ اور وہ کہے۔ کہ سبحان اللہ وصل علی۔ ابوالفضل نے اکبر نامے یا مراسلات میں جہاں ان کے مرنے کا ذکر لکھا۔ عبارت کی سطریں انبوہ ماتم نظر آتا ہے۔ کسی جلسہ میں شیعہ سنی کا مباحثہ ہوتا تھا۔ تو ظاہر ہے۔ کہ شیعہ اس زمانہ میں دب دب کر بولتے ہونگے۔ یہ دونو بھائی شیعوں کی تقریر کو قوت دیتے تھے۔ اسے خواہ خلق و مروت کی پاسداری کہو۔ خواہ مسافر پروری کہو۔ خواہ دل کا میلان سمجھ کر شیعہ کہو۔ اور بڑی بات تو وہی ہے۔ کہ اکبر کو خود اس بات کا خیال تھا کہ یہ فرقہ کم ہے۔ اور کمزور ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ زور آوروں کے ہاتھ سے کوئی سخت نقصان اٹھائے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ شیخ مبارک کا حال دیکھو۔ وہ خود اس تہمت میں گرفتار رہے۔ اکبر کی ابتدائی سلطنت میں کئی شیعہ قتل ہوئے۔ اور فتووں کے ساتھ قتل ہوئے۔ ان کے عہد میں جو قتل ہوئے۔ ان کی تجویز میں یہ بادشاہ کی رائے کی تائید کرتے رہے اس میں خواہ کوئی شیعہ سمجھے خواہ سنی کہے۔ خواہ دہریہ کہے۔ خواہ لامذہب سمجھے۔ مرزا جان جاناں مظہر کا ایک شعر جد مرحوم کی زبانی سنا تھا۔ دیوان میں نہیں دیکھا۔ کیا مزے سے حسن اعتقاد ظاہر کرتے ہیں ؎

ہوں تو سنی پر علی کا صدق دل سے ہوں غلام	خواہ ایرانی کہو۔ تم خواہ تورانی مجھے

مذہب کے معاملہ میں ایک میرا خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال کر کے دیکھو۔ اسلام ایک۔ خدا ایک۔ پیغمبر ایک۔ شیعہ اور سنی کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس کے واقعہ کو آج کچھ کم ۱۳ سو برس گذر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں۔ جنھوں نے لیا۔ حق لیا شیعہ بھائی کہتے ہیں۔ کہ نہیں حق اوروں کا تھا۔ ان کا دتھا۔ اگر پوچھیں کہ انہوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا؟ جواب یہی دینگے۔ کہ صبر کیا۔ اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے لیکر اس وقت دلوا سکتے ہو؟ نہیں لینے والے موجود ہیں؟ نہیں۔ طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں۔ اچھا جب یہ صورت ہے۔ تو آج ۱۳ سو برس کے بعد اس معاملہ کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں۔ تو صحبت کا مزہ جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں۔ تو بند ہو جائیں۔ دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائیں۔ دنیا جو مزرعۃ الآخرۃ ہے۔ اس کا وقت کارہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا الجھے۔ قوم کی اتحادی قوت لوٹ کر چند در چند گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور ہے۔ بہت خوب تم ہی حق پر سہی۔ لیکن انہوں نے سکوت اور صبر کیا۔ پس اگر ان کے ہو۔ تو تم بھی صبر اور سکوت ہی کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی اور بھٹیاریوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے؟ اور کیا انسانیت ہے؟ کیا تہذیب ہے؟ اور کیا حسن خلق ہے؟

۱۳ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینی جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے۔ اس میں خوبی کیا ہے۔ میرے دوستو! اول ایک ذرا سی بات تھی۔ خدا جانے کن کن لوگوں کے جوشش طبع اور کن کن سببوں سے تلواریں درمیان آکر لاکھوں خون بہہ گئے۔ خیر اب وہ خون خشک ہو گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی ان پر ڈالدی۔ ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنایت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے۔ اور دیکھو۔ اس تفرقہ کو تم زبانی باتیں نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کھڑے کرتے ہو۔ وہ خود سکوت کر گئے۔ تقدیری بات ہے۔ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا۔ سو نصیب ہوا۔ فرقہ کا تفرقہ ہو گیا۔ ایک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پورا زور تھا آدھا آدھا ہو گیا۔ اور دیکھو تم ۱۳ سو برس کے حق کے لئے آج جھگڑتے ہو؟ نہیں سمجھتے کہ ان جھگڑوں کے تازہ کرنے میں تمہاری تھوڑی جمعیت اور کس کس فرقہ میں ہزاروں حقداروں کے حق برباد ہوتے ہیں۔ بنے ہوئے کام بگڑتے ہیں۔ روزگار جاتے ہیں۔ روٹیوں سے محتاج ہو جاتے ہیں۔ آیندہ نسلیں لیاقت اور علم و فضل سے محروم رہی جاتی ہیں۔ میرے شیعہ بھائی اس کا جواب ضرور دینگے۔ کہ جوش محبت میں مخالفوں کے لئے حرف بد زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں فقط اتنی بات کا سمجھنا کافی ہے۔ کہ عجب جوش محبت ہے؟ جو دو لفظوں میں

ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور عجب دل ہے جو مصلحت کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے مقتداؤں نے جو بات نہ کی۔ ہم کریں۔ اور قوم میں فساد کا منارہ قائم کریں۔ یہ کیا اطاعت اور پیروی ہے +

محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے۔ ایک اتفاقی پسند ہے۔ تمہیں ایک شے بھلی لگتی ہے۔ دوسرے کو بھلی نہیں لگتی۔ اسی طرح بالعکس۔ کیا تم یہ چاہتے ہو۔ کہ جو چیز تمہیں بھاتی ہے۔ وہی سب کو بھائے؟ یہ بات کیونکر چل سکے گی۔ ابوالفضل ہی نے ایک جگہ کہا ہے۔ اور کیا خوب کہا ہے۔ کہ جو شخص تمہارے خلاف رستہ پر چلتا ہے یا حق پر ہے یا ناحق پر۔ اگر حق پر ہے۔ تو احسانمند ہو کر پیروی کرو۔ ناحق پہ ہے تو یا بیخبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے۔ بیخبر ہے تو اندھا ہے۔ واجب الرحم ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ دو۔ جان بوجھ کر چلتا ہے تو ڈر دو۔ اور خدا سے پناہ مانگو۔ غصہ کیا اور جھگڑنا کیا +

میرے باکمال دوستو۔ میں نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں۔ تو اپنا جتھا بڑھانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں فقط دشمنی ہی نہیں بڑھتی۔ بلکہ کیسا ہی بالیاقت حریف ہو۔ اس کی جمعیت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور ان شیطانوں کی جمعیت بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں۔ کہ بات تو نہیں سمجھتے۔ مذہب کا نام آیا۔ اور آپے سے باہر ہو گئے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام؟

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہ دنیا میں یکجا ہو گئے ہیں۔ رستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے۔ مل جل کر چلو گے۔ ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے چلو گے۔ ہمدردی سے کام بناتے چلو گے۔ تو ہنسے کھیلتے رستہ کٹ جائیگا۔ اگر ایسا نہ کرو گے۔ اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے۔ تو نقصان اٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف پاؤ گے۔ ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزہ کی زندگی خدا نے دی ہے۔ بدمزہ ہو جائے گی +

مذہب کے معاملہ میں انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے۔ ان میں بھی دو فرقے ہیں۔ اور ان میں سخت مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک۔ دو دوست ملکہ دو بھائی۔ بلکہ کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ اور ایک میز پہ کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا بولنا رہنا سہنا سب ایک جگہ مذہب کا ذکر بھی نہیں۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اٹھائیں۔ ایک ہی بگھی میں سوار ہوئے۔ باتیں چیتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک کا گرجا رستہ میں آیا۔ وہاں اتر پڑا۔ دوسرا بگھی میں بیٹھا اپنے گرجا کو چلا گیا۔ گرجا ہو چکا وہ بگھی میں سوار ہو کر آیا۔ رفیق کے گرجا پر آیا۔ اسے سوار کر لیا۔ گھر پہنچے۔ اس نے اپنی کتاب اپنی میز پر رکھ دی۔ اس نے اپنی میز پہ۔ پھر وہی ہنسنا بولنا۔ کاروبار۔ اسکا ذکر بھی نہیں۔ کہ تم کہاں گئے تھے

اور وہاں کیوں نہ گئے تھے۔ جہاں ہم گئے تھے *

آزاد! کہاں تھا۔ اور کہاں آن پڑا کجا ابوالفضل کا حال کجا سنی شیعہ کا جھگڑا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ملا صاحب کی برکت نے آخر تجھے بھی لپیٹ لیا۔

اصل بات یہ ہے۔ کہ ابوالفضل اور ملا صاحب ساتھ دربار میں آئے۔ دونوں کو برابر خدمتیں اور عہدے ملے۔ یہ بیتی کے عہدے کو خاطر میں نہ لائے۔ سپاہیانہ عہدہ کو اپنے علم و فضل کے لئے ہتک سمجھا۔ اسلئے اختیار نہ کیا۔ اس نے شکرانہ بندگانہ کے ساتھ منظور کیا۔ بادشاہ کو انکار ناگوار معلوم ہوا۔ مُلّا صاحب نے پرواہ نہ کی مباحثوں کی فتحیابی اور اپنے ترجمے کے کاغذوں کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے رہے۔ شیخ بچارہ اپنی بے وسیلہ حالت کو دیکھ کر سمجھ گیا۔ اور بچپن بلکہ دولتیت سے جو مکر دہات سہنے کی مشق ہو رہی تھی اسے یہاں بھی کام میں لایا۔ انجام یہ ہوا۔ کہ وہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔ ملا صاحب دیکھتے رہ گئے۔ وہ دونوں بھائی خدمتگذاری کی برکت سے مصاحب خاص ہو کر سلطنت کی زبان ہو گئے۔ یہ مسجدوں میں تکفیر کرتے پھرے گھر میں بیٹھ کر بڑھیوں کی طرح کوستے کاٹتے رہے بس اصلی سبب ان تحریروں کا وہی رنج ہم سبقی اور وہی رشک ہم مکتبی تھا۔ کہ سیاہی بن کر سفید کاغذ پر ٹپکتا تھا۔ اور بے اختیار گرتا تھا۔ ایک کتاب کے پڑھنے والے۔ ایک سبق کے یاد کرنے والے تم وزارت کی مسند پاؤ۔ مشیر شہنشاہ بن جاؤ۔ اور ہم وہی مُلّانے کے مُلّانے *

ذرا تصور کر کے دیکھو۔ مثلاً ملا صاحب اُن کے ہاں گئے۔ اور وہ راجہ مان سنگھ دیوان ٹوڈرمل وغیرہ ارکین سلطنت سے مصلحت اور مشورہ میں مصروف ہیں۔ ان کی دعا بھی قبول نہ ہوتی ہوگی۔ ان کا دربار لگا ہوتا ہوگا۔ ان کی وہاں تک رسائی بھی بمشکل ہوتی ہوگی۔ وہ جس وقت حکیم ابوالفتح حکیم ہمام میر فتح اللہ شیرازی سے بیٹھے باتیں کرتے ہونگے۔ وہ تمام رکن دربار۔ انھیں ان مسندوں پر جگہ بھی نہ ملتی ہوگی۔ اگر ان کے ساتھ یہ مباحثہ علمی میں دخل دیتے ہونگے۔ تو ان کا کلام وقعت و وقار نہ پاتا ہوگا۔ یہ زور دیتے ہونگے۔ تو آخر ان کے گھر کے شاگرد تھے۔ دونوں بھائی اسی طرح ہنس کر ٹال دیتے ہونگے جس طرح ایک عالی رتبہ خلیفہ اپنے مدرسہ کے طالب علم کو باتوں باتوں میں اڑا دیتا ہے۔ یہی باتیں دیا سلائی بن کر ان کے سینہ کو سلگاتی اور ہر وقت غصہ کے چراغ میں تیل اکساتی ہونگی۔ جس کے دھوئیں سے کتاب کے کاغذ سیاہ ہیں۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ انھوں نے فیضی کو اکثر جگہ ستم ظریفی کے القاب سے یاد کیا ہے *

میرے دوستو۔ ان کی بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں امرا اور سلاطین کے خاندانوں میں ہونے لگیں انتہا یہ کہ خود بادشاہ بھی ان کے گھر پر چلا آتا تھا۔ ملا صاحب کو یہ بات کہاں نصیب تھی *

اَخلاق وعادات

فیضی کی تصنیفات سے اور اُس کے اُن حالات سے جو اور مصنفوں اور مؤرخوں نے لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شگفتہ مزاج۔ خوش طبع۔ خندہ جبیں شخص ہوگا۔ ہمیشہ ہنستا بولتا رہتا ہوگا۔ شوخی اور ظرافت اس کے کلام پر پھول برساتی ہونگی۔ اور فکر و تردد۔ غم و غصہ کو کم پاس آنے دیتی ہونگی۔ یہ بات ابوالفضل کی وضع سے کچھ فرق رکھتی ہے۔ ان پر متانت اور وقار چھائے ہوئے ہیں۔ تم غور سے خیال کرو۔ ان کے اشعار کیسے شگفتہ ہیں۔ خطوط اور رقعوں کو دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بے تکلف بیٹھے ہنستے ہیں اور لکھتے جاتے ہیں ان میں جا بجا لطیفے اور چٹکلے چھوٹتے جاتے ہیں۔ مُلّا صاحب نے بھی کئی جگہ لکھا ہے کہ ایک جلسے میں فلاں شخص سے اور مجھ سے فلاں مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ اُس نے یہ کہا میں نے یہ کہا شیخ فیضی بھی موجود تھا۔ ستم ظریفی اس کی عادت ہی ہے۔ یہ بھی اسی کے ساتھ ہمداستان تھا۔ آزاد سچ ہے۔ مَیں نے بھی اکثر جلسوں کے حال میں خیال کیا۔ کہ بیشک شیخ فیضی ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ اور سخت بات کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے ؎

مُلّا صاحب اس وصف پر بھی جا بجا خاک ڈالتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ستم ظریفی اُس کی روش قدیمی تھی۔ گرمیٔ مجلس اور ہمزبانی کے لئے دوستوں کے اجتماع کا دل و جان سے طلبگار تھا۔ مگر سر کھلے ہوئے اور دل بجھے ہوئے رکھتا تھا۔ **مصرعہ**

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم!

شیخ فیضی سخی اور مہماں نواز تھے۔ آپ کا دیوان خانہ عُلما۔ شُعرا اور اہل کمال کے لئے ہوٹل تھا۔ اپنے بیگانے دوست دشمن سب کے لئے دروازہ کھُلا اور دسترخوان بچھا ملتا تھا۔ جو اہل کمال آتے تھے یہ انہیں اپنے گھر میں اُتارتے۔ خود بھی بہت سلوک کرتے تھے حضور میں پیش کرتے تھے۔ خدمتیں دلوا دیتے تھے یا جو قسمت کا ہوتا تھا انعام و اکرام مل جاتا تھا۔ عُرفی بھی جب آئے تھے تو پہلے انہی کے گھر میں مہمان رہے تھے۔ عہد مذکور کی کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ حُسنِ اخلاق لطفِ طبع شگفتگی مزاج مہارت فضل و کمال کے گلدستوں سے ان کا دیوان خانہ سجائے رکھتی تھی۔ ساتھ اس کے آسائش و آرام کے سامان بھی ایسے آراستہ کئے تھے۔ کہ گھڑی بھر کی جگہ خواہ مخواہ پہر بھر بیٹھنے کو دل چاہے۔ مُلّا یعقوب صیرفی کشمیری (جنھوں نے ان کی تفسیر بے نقط پر عربی میں تقریظ لکھی ہے) جب کشمیر چلے گئے۔ تو وہاں سے مُلّا صاحب کو کئی خط لکھے ہیں۔ ایک خط میں بہت سے مضامین شوقیہ لکھے ہیں۔ اور یہاں کی صحبتوں کو یاد کر کے

کہتے ہیں۔ نواب فیاضی کے خسخانۂ فیض میں دوپہر کی گرمی میں سنتیل پانی کے فرش پر کہ ہوائے کشمیر سے بھی سرد ہے۔ جب بیٹھو اور برفاب پیو اور ان کے نکات شریفہ اور مقالات لطیفہ سُنو تو اُمید ہے کہ مجھ اسیر محبت و حرمان کو بھی یاد کرو ؎

اے بزم وصل حاضر غائباں را دست گیر	زانکہ دست حاضراں از غائباں کوتاہ نیست

اب آزاد اپنے طول کلام کو مختصر کرتا ہے۔ اور ان کے کلام کا کچھ کچھ نمونہ دکھاتا ہے ؎

غزل

بادہ در جوش است و رنداں منتظر
ہر صراحی چشمہ۔ ہر ساقی خضر
ساقیا خذ ما صفا دع ما کدر
بندۂ ساقی شوم کز یک قدح
در خرابات مغاں بگذر کہ ہست
منکران عشق را ساز د مُقر
اے رفیق از من مشو غافل کہ ہست
عشق در فرہاد و مجنوں منحصر
گر دلم بشکست خوشحالم کہ دوست
مطمئن شد عند قلت منکسر
عشق نتوانست پوشیدن نغیر
شد ازاں مجنوں بعالم مشتہر
جام میخواہی بگو فیضی مدام
ہمچو حافظ ایہا الساقی ادر

ایضاً

ساقی جاں خیز کہ شد صبح عید
ضحک اللہ لصبح جدید
رقص کناں کعبہ بہ پہلوئے من
از چہ کنم بیہدہ منزل بعید
جان من و سلسلۂ زلف تو
علقت الروح بحبل الورید
چشم تو بس کردہ ز خونریز خلق
غمزہ بفریاد کہ ہل من مزید
گر تو نداری سر قربان من
میکشم از دست تو خود را شہید
بردم تیغ تو قضا کردہ نقش
انت حدید لک باس شدید
فیضی آزاد اسیر تو شد
اسعدک اللہ بعیش سعید

دیباچۂ مرکز ادوار

زمزمہ سنج نفس آتشیں
لخلخہ سائے دل آتش نشیں
عربدہ آموز نکتہائے مست
حوصلہ بخش جگر دل بدست
جوش صراحی طبرز دلباں
آب صبوحی قدح غبغباں
بادہ چکان لب آتش رخاں
آب دہ خندۂ گل پاسخاں
مہرہ کش تختۂ مینائے صبح
پنجہ کشائے ید بیضائے صبح
بتکدہ آرائے بتانِ بہار
تاب دہ معتکدۂ لالہ زار
نکتہ نگار لب نطق از بیاں

چشم‌شگاف رگ خشک از زبان
نکرده را بر سر کرسی نهاد
عجز بسر چشمهٔ او ردو سفید
دیده رمد سنج و جهان پر شعاع
درک یکے مفلس بازار او
جان سخن در کف کنهش قتیل
صفهٔ افلاک و قلم پائے مور
راه به تیغ اندرو بخواب گیر
جام نه و باده بسرشار در
قافلہ شد بہ چراغ دلیل
هردو دریں راه بدست تهی
شوق بجز بادچه سنجد بکیل
موجهٔ سیماب و فروغ سراب
دست و گریباں بخودم چوں کنم
بوکه زنم دست بدامان خویش
موج سخن جوہر تیغ من است
ساغر من شسته تراز نوبهار
اینکه بدر روم به سخن راه یافت
دور فلک بر خط اقلیم او
نشهٔ او جوہر بینش زدائے
خطبهٔ شاہی خط پیشانیش
نامر که مانند شهاں بر سرش
نظم جهان نسخهٔ آئین او
خلق سبکدل زگرانبارئیش
دادگر و زود رس و دیر گیر

ذرّه دریں دشت سرافراز او
هرچه دریں دائره پرسی نهاد
رفت ز اوصاف گریبان ز دست
عقل تهیدست و دکاں پر متاع
علم دریں قافله بیگانه ایست
چوں قلم در ره حرفش سبیل
نکته گراں جهل و دانش خراب
دست همه آتش و کشت آبگیر
قافله هاست نشاں بر نشاں
قافلهٔ یافت بوجدان سبیل
قافله را رفت بشرق نشاں
فرق بجز خاک چه نیرو ز میل
بحر سخن تشنهٔ تحمید تو
سر ز گریباں که برون چوں کنم
من که چو مے جوش سحر میزنم
بر دل دریا گهرم روشن ست
صیحهٔ صبحم ز نشاط دماغ
بال و پر از مدح شهنشاه یافت
ساغر او همت دانا پسند
نکتهٔ او جرعهٔ دانش فزائے
دست ده گنجهٔ بے ساحلاں
آمده طغرائے هو الاکبرش
خسرو خنداں دل فرخنده چهر
فتنه گراں خواب ز بیداریش
شاهد او معنی دانش نگار

ریگ رواں قافلهٔ راز او
معرفت از خاک درش ناامید
دُرد کشاں نیز ازو نیم مست
نطق یکے والهٔ گفتار او
عقل دریں سلسله دیوانه ایست
جلوهٔ خورشید سخن روز کور
قافله مستسقی و دریا سراب
غیر نه خانه و باغیار در
بادیه در بادیه محمل کشاں
رنگ نه پرکردهٔ روز بهی
تو سوے مغرب شده محمل کشاں
شوق تو مستسقی و معنی شراب
ریگ رواں سبحهٔ توحید تو
چاک زدم پردهٔ سامان خویش
موجهٔ بیچون نظر میزنم
بادهٔ من پخته تراز روزگار
شعله فگن بر سر مرغان باغ
جوہر گل گوہر دیهیم او
بادهٔ او پرتو عقل بلند
سرّ الٰهی دل ربا نیش
نرخ نه گوہر دریا دلاں
نقد خرد گوہر تسکین او
خندهٔ او عقده‌گشائے سپهر
شیر دل و شیرکش و شیرگیر
ساقی او همت دریا نثار

ہست دو منشور جہانبانیش
دور شہنشاہیٔ عالم ترا
با ہمہ نور سحرستان نو
عالمِ پیر از تو بعہد شباب
آنچہ بروں جُست ز مدہوشیم
قفلِ ملائک ز صفیر منست
زیں دمِ روشن کہ زدہ صبحگاہ
کلکِ من از مرغِ سحر خیز تر
آدم اینک ز شبستانِ غیب
عطسہ گرہ شد بدماغِ شراب
چشمہ بکاوم نفسِ تازہ را
تا جگر بحر کشم لخت لخت
نور ز خورشید برات آورم
نکتہ رہ آورد بیونان دہم
راہ سخن را بسخن بستہ ام
بر رخِ اندیشہ کند خار پشت
از کفِ ایں بادہ کہ آمد بجوش
فرق معانی بزمیں بوسیم

جوہر تیغ و خطِ پیشانیش
در ازل از مدح تو بشنید طرف
شب نتواں یافت بدوران تو
باز دل تنگ بہم بر زدم
روح قدس گفت بسر گوشیم
چرخ بسے گشت کہ تا بد شبے
آئینہ بستند براکلیل ما
ایں چمنِ تازہ کہ پروردہ ام
میکدہ در دست و گلستان بجیب
حکمتے از پردہ باز آورم
تا دل دریا برم آوازہ را
گرد ہدم دست نوائے بلند
از دم خضر آبِ حیات آورم
صد گل مہتاب بکلکم درست
ایں چہ طلسم ست کہ من بستہ ام
رشحۂ کلکم ز نشاطِ نعیم
آبلہ زد بر لب دریا خروش
بر در ہمت بہ تہی مائیگاں

اے دو جہاں عقل مسلم ترا
وہ قلم و نہ ورق و ہفت حرف
عمر ابد بے تو بدورِ شراب
آبلۂ چند بہ نشتر زدم
انجمن شوق ضمیرِ منست
از پس نہ قرن چو من کوکبے
حرف من از صبح دلاویز تر
شام و سحر خون جگر خوردہ ام
زیں دم کبرا کہ زدم سینہ تاب
مغز فلاطوں بگداز آورم
بر سر ساحل بکشم پائے سخت
در گلوے صاعقہ پیچم کمند
بر کفِ راہنموناں دہم
صد دُرِ نایاب بسلکم درست
خامۂ من جلوہ کناں بُد بہ مشت
مجمرہ آویخت ز جعدِ نسیم
فخر معالی بفلک گوشیم
گنج بہ بخشم ز سخن شائیگاں

من جسم دریا دل گرداب جوش | بادۂ من لنگر طوفان ہوش

در بیانِ ہنگامِ صبح خیزی از مبدأ فیاض فیض بر دل ریختن

صبح کہ نقد دو جہاں ریختند
شاہد او صبح سفیدہ نقاب
شاہدِ خلوت گل کثرت بدست
شام ابد سایۂ گیسوئے او

خلوتے از انجمن انگیختند
سوختہ یک شمع ہزاراں چراغ
آمدہ و بر رخِ امکاں نشست
پردہ ز رخسارہ برانداختہ

خلوت از انجمن آفتاب
خلوتے انداختہ نطع فراغ
صبح ازل شعشعۂ روئے او
آئینہ را برقع رو ساختہ

زلف تقلید بسرِ دوشِ او
حال تعین بہ بنا گوشِ او
یک وش جلوہ گران تا گران

یک نگہ و غمزہ جہاں در جہاں
ہم مژہ اندر مژہ ہنگامہ خیز
ہم نگہ اندر نگہ افسانہ ریز

خار چمن ساختہ از رنگ و بُو
ہفت قدح کرد پر از نہ سبو
غمزہ نظرگاہ صنم دستاں

بُتکدہ در بُتکدہ ہندوستاں
رو بر و شاہد برقع شگاف
کف بکف آئینہ مینا غلاف

چشمے و صد میکدہ مستی درو
بازی و صد بُتکدہ ہستی درو
مرحلہ در مرحلہ نظارہ زار

قافلہ در قافلہ آئینہ بار
برق رُخش آئینہ بگداختہ
آئینہ در آئینہ پرداختہ

شیشہ حلی بستہ ز دست نگار
نغمہ گلو بستہ بخون بہار
شعلہ بہ پیچیدہ بگلبانگ نے

شیشہ برقص آمدہ بر بوے مے
رفتہ و آیندہ بیک حال زر
عالم تفصیل با جمال در

تشنہ نگاہاں مژہ انگیختند
چوں مژہ ہا بر سر ہم ریختند
من بچنیں محفل ناکاستہ

بادل خود خلوتے آراستہ
خلوتے انگیختہ در انجمن
دل بمن و من بدل اندر سخن

نعرہ زناں سر بعبادت زدم
تا در معنی باشارت زدم
وحدتی از وحدت کثرت بری

بے خودی محو تماشا گری
نعل دریں بادیۂ واژوں زدم
بر قدم صبح شبیخوں زدوم

سبب نحافت تن و بانتہا رسیدن عمر

اے شدہ خورشید سر بام خویش
چند زنی پا بسر انجام خویش
شبنم گلبرگ تو دنفت سراب

تو شدہ نیلوفر ایں آفتاب
آئینہ بگذار دریں زنگبار
از نفس خویش مشو سنگسار

کفہ مہرا کہ سنگیت نیست
جامہ مپیرا کہ رنگیت نیست
خانہ میندا اے بگرد وجود

بر ورق آبکش ایں نقش بود
گرچہ دم سحر بیان من ست
حیرت من بند زبان من ست

در مقصود بکف آمدن باوجود کشایش دُنیا

شکر کہ جمازہ بمنزل رسید
زورق اندیشہ بہ ساحل رسید
گام نخست از قدم جست و جوست

منزل اوّل ز رہ آرزوست
گرم رواں چوں نشوم آہ زن
رہ ہمہ یک گام و دو صد راہزن

رہ بہ باندازۂ پائے من است
گر روم از دست سزائے من ست
خضر دریں بادیہ گم کرد راہ

نوح فرو رفت دریں موج گاہ
نیست مرا چوں برہ دل قدم
رفتہ ام ایں راہ بپائے قلم

دہ چہ کنم با قلم رہ گرائے
بادیۂ آتش چو بسینہ پائے
نادرہ طفلے بہ لعبت نام زد

عمرِ طبیعش ز ازل تا ابد
بر درِ ایں کعبۂ روحانیاں
ریختہ از بخیۂ کیمیا
از پئے ہنگامہ کشیدم زجیب
گوہرِ انصاف برو رونما
بشکنم ایں کلکِ حقیقت سرائے

جوشِ صنم خانۂ بالاست ایں
بر نہد اکلیل چو نصرانیاں
کردہ بیکدست سطرلابِ دل
لعبتے از پردہ نشینانِ غیب
از رُخِ ایں شاہدِ شیدائیاں
حرفِ جگر ریش و زباں سینہ جائے
مغز ز جوشِ تو پر آوازہ باد

غلغلِ ناقوسِ مسیحاست ایں
کاخِ تخنت از رصد کبریا
دستِ دگر عقدہ بہ پرویں گسل
غمزہ زناں چوں شود ابرو نما
تا چہ بہ بینند تماشائیاں
فیضی ازیں فیضِ دولت تازہ باد

مثنوی سلیمان و بلقیس

الٰہی پردۂ تقدیس بکشائے
زبانے دہ مرا قدوس گویاں
ہمہ ذرات در تقدیس و تہلیل
پری در شیشہ و دل دربند دارم
بتانِ ہند تسبیحم گسستند
نگینِ دل بدستِ اہرمن داد
چنانم از بلندی در دہ آواز
ز دوشِ جاں گزارم بارِ تن را
یکے الحانِ داؤدی کنم ساز
کنم زیں پردہ مغزِ خفتہ بیدار
اگر گویم تہی شُد لجۂ ژرف
کہ خواہم آسماں را بند بکشاد
ز شورِ طبعِ سحری تازہ انگیخت
کہ چوبِ خشکِ اِ شکر شکست
گراں نوے کہ جاں را رہبر آمد
سلیمانِ سخن را تخت بر باد

سلیمانِ مرا بلقیس بنمائے
حصارِ قدس را کنگر بلند است
مرا لب پر ز افسونِ عزازیل
بلائے ہست من کیں جانِ من نیست
بہر مویم دو صد زنار بستند
دلِ من با بتانِ آذری چند
کہ آید ہُد ہُد شوقم بہ پرواز
وزیں منزل نکوئیہلے والا
سلیماں را دہم زاں عالم آواز
گرہ شد ہفت دریا در گلویم
ز من باور کہ خواہد کرد ایں حرف
ز دیگ آرزو سرپوش برداشت
ز نوکِ خامہ بر کاغذ شکر ریخت
دگر رفتم کہ بگذارم مقابل
ازاں رو دزن باین دولت آمد
بمن آمد یکے تدبیر کردن

دریں بتخانہ ناقوس جویاں
بہر کنگر چہ سرہا در کمند است
چہ سازم با بتاں پیوند دارم
کہ دیوِ نفس در فرمانِ من نیست
دریں مشہد بغفلت ہر کہ تن داد
سلیمانے گرفتارِ پری چند
نشینم چارہ گر خلع بدن را
سبکرو خانہ گیرم راہِ بالا
بہ بندم ارغنونِ عشق را تار
کشائش نیست ممکن تا نگویم
بخواہم گنج را از دل بروں داد
الفِ چند از دل پر جوش برداشت
مگر ہندوستاں فردوس گشتست
شگافِ خامہ را با روزنِ دل
اگرچہ رفت ازیں دیوان بیداد
بافسوں دیو را زنجیر کردن

بہ تخت معنی از سرمایہ بستن
ز گنج خود بر و پیرایہ بستن
بیا فیضی کہ داد دل ستانیم
سلیماں را بہ تخت خود نشانیم

مناجات کردن بجناب باری عز اسمہ بکمال عجز و زاری

بنام آنکہ دل را نقد جاں داد
سخن را زندگی جاوداں داد
بجان ما ز و منت پذیریم
کہ گر صد رہ اجل آید نمیریم
زمیں را آں کرامت داد جودش
کہ افتد نہ سپہر اندر سجودش
رسد بند سپہر آفرینش
صفائح ساز اسطرلاب بینش
حلاوت بیز معجون معانی
ملاحت ریز ذوق نکتہ دانی
ورق سوز کتاب کج حرفاں
رقم شوے خیال فیلسوفاں
بہار انگیز باغ زندگانی
طراوت بخش ریحان جوانی
فسوں آموز چشم عشوہ سازاں
جنوں آمیز سیر عشقبازاں
جواہر سائے کحل چشم خونی
نمک افشان ناسور درونی
دعا گردان دشنام از زبانہا
ہلاہل را طبرزد ساز جانہا
زلال چشمہ ساز چشم پاکاں
نشاط سینۂ اندوہناکاں
در آتش افگن دراعۂ شید
در آب انداز آب و دانۂ صید
بذوقش سوبسو اطلس بدوشاں
بشوقش موبمو پشمینہ پوشاں
سخن سنج از ترازوے دل ما
سخن زو حرز بازوے دل ما
جہاں نم قطرۂ نیساں جودش
عدم گنجینۂ نقد وجودش
دراں نطعے کہ گسترد جلالش
ازاں گنجینۂ در صف نعالش
قضا در کارگاہش پیشکارے
قدر از قدرتش صنعت نگارے
ز عالم نسخہ بر داشت محمل
بنام آدمی کردش مسجل
ز صد نقش عجب کز آب و گل ساخت
مزاج آدمیت معتدل ساخت
زباں در کوے قدسش بینوائے
سخن با شہر علمش روستائے
خموشی ہیچ و قیل و قال ہیچ است
کہ کشف ایں جا چو استدلال ہیچ است
از و مشائیاں را در قدم خار
وز و اشراقیاں را سر بدیوار
کجا آمد زمیں اندیشۂ ذات
من و اندیشہ اش ہیہات ہیہات
تو جرات بیں کہ ہمت می‌زند جوش
بگیرد قطرۂ دریا در آغوش
خرد در جستجویش اشتلم کرد
برفت و خویش را در راہ گم کرد
حدیث آنجا کہ از یزداں عنایت
سپاس اندیشۂ ما ناسپاسیست
دریں بستاں زباں تابد درو گرد
خموشی را بحیرت پیشرو کرد
اگر فیضی دل مرتاض داری
سرے نامیدۂ فیاض داری
سخن را چند باشی محمل آرائے
بدست آویز عجز ایں جا بنہ پائے
ز من تا ذرہ باشد آں قدر فرق
کہ می‌ترسم ز یک شبنم شوم غرق
ازاں منبع کہ دریاے فتوحست
مرا نم قطرۂ طوفان نوحست
من آں مستم کہ خرد شم بیک جام

نہ زاں دریا کشان آتش آشام
کشیدہ صد ہزاراں چشمہ و جوے
بریناں باد ہر خواہش گوارا
یکے از صد قدح ناگشتہ سرمست
کہ گنجا نید دریا در سبویم
ہمیم آخر ازاں آلودہ طوفاں
بگفتار بلند و ہمت پست

گذشتند آں ہمہ مردان آزرم
ولیکن ہمچناں لب العطش گوے
بسے پرواز دیدم دیدہ سیر
یکے بینی بہ بوئے رفتہ از دست
چو شد فیض ازل را چارہ سازی
جگر بے آب و لب پر موج طوفاں
رفیق کاروان کعبہ جویاں

کہ طوفان خشک کے دنداز دم گرم
دریں درگہ نہان و آشکارا
تفاوت ہاست در مستان ایں دیر
ز فیض ابر احسانش چہ گویم
تن خود را زنم کردم نمازی
معاذ اللہ ازاں مشتے تہیدست
بتان حرم را لبیک گویاں

صد شکر کہ ایں نگار خانہ
ناموس ہزار بیکر است ایں
بس رنگ بر نو بہار بستم
از مغز معانی استخواں بند
بانگ قلم دریں شب تار
آغشتہ بخوں صد ترانہ
حرفش ز غراش دل نشانی
ویں نادرہ سر گذشت دریاب
رنگیں چمنے بشعلہ شستہ
زاں ساں کہ در آسماں ستارہ
یک صاعقہ از سحاب عشق است
از شعلہ تراش کردہ ام برف
اسرار معانیم نظر کن!
سیارۂ آسماں نقاب است
دادم بہ شب خیال سر گم
در دامن آسمانش دم دست
رو بہ نفس بساط روباں
از صبح ستارہ و زمن حرف

بگرفت نگار جاودانہ
ہر نکتہ بہ شعلہ ایست ہمدوش
گلہیں غنچہ ز خون نگار بستم
پیچیدہ بہ فلک سخن بیں
بس معنی خفتہ کرد بیدار
ہم کردہ جنوں مست ہشیار
معنے ز گداز ترجمانی
گل خندۂ آتشیں بہار است
جز بہر کباب در و نرستہ
ایں گل بہ بوستاں شمار است
یک شعشۂ آفتاب عشق است
افشاندہ ہزار دُر نایاب
زیں گنج بہ مفلساں خبر کن
گل کردہ بہار بے خزانم
زانو رصد و معانی انجم
خورشید گوست اندریں کار
کلکم ز نشاط پائے کوباں
ہر صبح دمے ز بیقراری

بت خانۂ ہند را دراست ایں
ہر نقطہ با نگرے ہم آغوش
گشتم بہ خیالے نکتہ پیوند
جان نو و قالب کہن بیں
در باب فسون ایں فسانہ
ہم ساختہ عشق خفتہ بیدار
از ہر چہ گذشت رو برو تاب
آبستن گل شرارہ بار است
رخشندہ معانی از عبارہ
از من بہ بہار یادگار است
آنم کہ بسحر کارئے ژرف
در دامن موج و جیب گرداب
ایں دودۂ شمع آفتاب است
افروخت چراغ بے دخانم
ہر صبح کہ از سخن شدم مست
من بودم و صبح ہر دو بیدار
میر یختنش خردہ کارئے ژرف
بر باد صبا زدم عماری

گرمی زدمے سحر گرفتم
من بودم و بادِ صبحگاہی
دست سخنم ز دل ملے بند
بستم بہ سخن طرازِ معنی
زیں پردۂ نو کہ دور بستم
در آتشِ خودشناہ کردم
زینساں بفنون نکتہ وری
آوردِ دلم ز دورِ دستش
نسخیست بہ خونِ دل طرازش
خونابہ بجوشد از دلِ سنگ
برگردم ازیں نوا در آفاق
زنار برہمنان نہ دیرہ
بحرے کہ رسید سر با وجش
خاک از نفسم گلاب دارد
ایں خط کہ دہم بنور مایہ
ہر نکتہ درو چو ناب در جوئے
آں گل کہ درو ہزار باغ است
افسردم و روئے باغ شستم
ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم
کیں نقش بروئے کار بستم
ایں گل کہ بہارئے تگرگ ست
کاقبال دو کون رونما داد
دارم بہ طرب دلے ہم آواز
گردید ز نہ آسماں سرِ وشم
برخیز کہ صبح بے نقاب ست

وز آتشِ فکر در گرفتم
دروازۂ صبح بر رخم باز
پائے قلم از جگر حنا بند
در فکر باتشیں نظارہ
بر صبح تراز نور بستم
ہر چند نظر بلند دست است
بشکست سخن بہ تنگ و رزی
دارم ز قلم بغیب راہے
لب نے یہ حقیقت از مجازش
در بادیہ گر کند ایں ساز
ناقوس کلیسہائے عشاق
فکرے کہ بود معانی انگیز
گرداب فلک بزیر موجش
مستانہ چو سر دہم فغاں را
از کلکِ من ست نیم مایہ
ہر نقش ازو گلیست بربار
آبش ز رطوبت دماغ ست
دارم ز کشاکش درونی
خون ست چکیدہ از دماغم
بر طاق نظر کشیدم ایں دیر
ہر برگ گلے ہزار برگ ست
چوں جلوہ دہم بتے چنیں را
چوں حجرۂ ارغنوں بصد ناز
کائے نکتہ سرائے بزم شاہی
بیدار نشیں چہ وقت خواب ست

ہر صبح ز فیض بادشاہی
کلکم ز شگاف پر تو انداز
گل کرد ز من بہار معنی
چوں شعلہ بر آتشم سوارہ
ہر صبح کہ ساز راہ کردم
ایں جا چو قدم نہاد پست است
ہر نکتہ کہ خانہ باب بستش
کوہے بہ نہفتہ زیر کاہے
بر کوہش اگر کند آہنگ
در ریگ رواں بر قصد آواز
پیچیدم ازیں دم سبک سیر
بحریست ز آبِ خود گہر ریز
آتش بہ دلم شراب دارد
آتشکدہ دم کنم مغاں را
ہر معنی ازو چو آب در جوے
ہر برگ ازو لبے بگفتار
مستانہ گلے ز خویش رستم
ہر مو بنوائے ارغنونی!
صد سحر فسوں بہ تار بستم
کو جلوۂ دیدۂ سبک سیر
ایں در کہ تو اندش بہا داد
فغفور کشد چراغ چیں را
چوں پنبہ نہد سحر بگوشم
کلکِ تو نوائے صبحگاہی
سرچشمۂ فیض جوش در جوش!

تو تشنہ جگر بہ خوابِ مدہوش
عمریست بزیر بار رنجم
یک جزر و مد از محیط راز است
بزمے ست جہاں بعیش پیوست
کلکم بنوائے ارغنونی
سازند سبوکشاں فسانہ
من بار بدم تو خسرو عہد
ترکیب طلسم مرا نسیم بین
تخت تو طراز جاوداں یافت
من بادہ مست کار ہوشم
صد جوشش زخم بجرم خونی
ایزد بدہا دوست کارم
کز ہند گل عراق برخاست

داری ز دل و زباں ترازو
تا گوہر بحر و کاں نسنجم
شاہنشاہا خرد پژوہا
دور تو شراب آسماں مست
زیں بزم کہ عشرت تو ساقیست
مطرب نہ بزم بر ترانہ
زیں نامہ کہ کردہ ام فلک سائے
دیں خدمت جاودانیم بیں
ایں نامہ کہ عشق بر زباں برد
عیبم نبود اگر بجوشم
از قافلہ ات سخن درائے
گر دادۂ ایزدی شمارم
پیراستہ ام معانی بکر

بر سنج گہر بزور بازو
ایں موج کہ جبہہ اش فراز است
دریا گہر از فلک شکوہا
من مطرب پردہ ہائے خونی
گر من بروم ترانہ باقی ست
امروز بایں نوائے چوں شہد
پیشم تو ستادہ ام بیک پائے
زیں پردہ کہ نسج آسماں یافت
طغرائے ترا بآسماں برد
با ایں تف آتشِ درونی
معذورم اگر کنی صدائے
صد بلبل مست نغمہ گر خاست
در گنجۂ طبع و دہلے فکر

زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود | فیضی رقم نگین من بود | اکنوں کہ شدم بعشق تام من | فیاضیم از محیط فیاض من

چو سلطان انجم ز خاور زمیں
ز مستی برآورد کف از دہاں
شہنشہ براورنگِ شاہنشہی
ز روے ادب ایستادہ بپا
بیکسو فقیہان عالی مقام
سطرلاب دانان اختر شناس
بیک سو ہژبران میدان کیں
چو طوطی شکر ریز و شکر شکن
کہ ناگہ یکے قاصد تیز گام
بصورت چو مردم بمعنی چو دیو
شہنشاہ را ایں سخن کارگر

برسم عرب گشت محمل نشیں
کشیدند از خط صبحش بہار
بسر تاج اقبالِ ظل اللہی
بیکسو وزیران دانش پذیر
حکایت کناں از حلال و حرام
بیکسو دبیران معجز رقم
کہ از ہم درانند گاوِ زمیں
ہمہ ملک و ملت ازو بانسق
رسانید از خان اعظم پیام
زیک چند با ہم برآمیختہ
برام آوری عزم یلغار کرد

کف انداز شد بختئ آسماں
کہ پیوند خود نگسلد از قطار
سلاطین مسند نشیں جابجا
بتدبیر بر عقل کل نکتہ گیر
بیکسو حکیمان فطرت اساس
دقائق شناسان لوح و قلم
بیک سو میان شیریں سخن
برونش بخلق درونش بحق
کہ گجراتیاں ند پر مکر و ریو
بسر فتنۂ نو برانگیختہ
نخستیں طلب کرد جمازہ را

در آفاق انگشت آوازه را　همه ساربانان کمربسته چست　بولیس قرین کرده نسبت درست
کشیدند چون کهکشان زنگ را　[illegible] بستند چون مهر و مه زنگ را　شتر چون فرشته سرشته ز نور
[illegible] اندک زمان رفته لب یار [illegible]　[illegible] خود [illegible] تعظیم کرده دوتا　کمربسته از بهر خدمت دوجا
[illegible]سیم بر سینه بنهاده دست　زراه ادب باد و زانو نشست

اندر بیان تعریف شتر گوید و سوار شدن اکبر شاه بر شتر

خدیو عجم شاه عالی تبار　چو شاه عرب بر شتر شد سوار　شتر زین سواری سرافراز شد
[illegible]　[illegible] ش چو نشه دست برد　زمام ارادت بدستش سپرد
بدون تاخت از آگره گر حرب　چو خورشید کز شرق تاز د بغرب　شتر مرکب مرکب انبیاست
سواری بر نسبت مصطفی است　شهنشه سوارئے جنازه کرد　ره و رسم پیغمبری تازه کرد
چو گلزار روئے زمیں ساختند　گل و خار باهم قرین ساختند　ز بلبل تماشائے آں سرو هوش
شتر نیز چوں ابر شد در خروش　نماندند هر دو ز خود هوشیار　یکے مست گل شد یکے مست خار
شتر هر زماں شورے انگیخته　چو دیوانه کف از دهاں ریخته　بزرگاں که عمرے شتر رانده اند
شتر را بسیرت ملک خوانده اند　صفات شتر گر بگیرم به پیش　دفاتر شود صد شتر بار بیش
چو درویش پوشیده بر تن گلیم　ریاضت کش و برد بار و سلیم　زکف داده سر رشتهٔ اختیار
زباغ جهاں گشته قانع بخار　قوی هیکلے از قدم تا بفرق　بدیدن چو ابر و برفتن چو برق
گماں کردن و تیز رو تر چو تیر　چو تیر و کماں در سفر ناگزیر　شتر را همیں سرفرازی پسند
کز و مقدم شاه شد سربلند　برا شتر چو آمد شه کامیاب　چو از کوه طالع شود آفتاب

بیان رفتن اکبر شاه در احمد آباد

چو شاه ولایت شتر پیش راند　بسرعت تر از فکرت خویش راند　شتابان بره ناقهٔ شاه بود
شتابنده چوں ناقة الله بود　بگردش شتر هاروان یک بیک　چو بر گرد کعبه گروه ملک
شترها بر آورد شور و شغب　فضائے عجم گشت پر از عرب　همه کوه کوهاں و صحرا نورد
هم از کوه و صحرا بر آورده گرد　عرق ریخته ز اشتراں چوں سطر　چو باران رحمت که ریزد زابر
جرس زیر گردن شترهائے شاه　تو گوئی که در برج قوس است ماه　چو اهل عرب از یمین و یسار

زاشتر سولداں ہزاراں ہزار
کتل کردہ اسپان تازی ہمہ
چو باراں کہ ریزد ز ابر سیاہ
زاسپانِ ابلق ہمہ منتخب
چو سیماب نگرفتہ یکجا قرار

یلاں بر شتر ترکش اندر کمر
پری وار در عین بازی ہمہ
دراں زردہائے ہلالی رکاب
شتابندہ چوں ابلق روز و شب
کبودش ز ابلق بہ انگیز تر

شتر چوں شتر مرغ در زیر پر
سیہ تازیاں چوں چکانندہ براہ
شدہ گرم چوں زردۂ آفتاب
ہمہ از لغرہا تیر سیماب وار
ز خنگ کبودش فلک تیز تر

شہنشہ شتاباں براہ سفر
چو عمر گرامی شتابندہ تر

بیان رسیدن اکبرشاہ در احمد آباد

بیک ہفتہ در احمد آباد رفت
کہ شاہ ولی را بود ملک ارض
در انجا یلان نبرد آزمائے
شتر گشت چوں عنکبوتی شتر
ہمہ شیر مردان روز مصاف
ہمہ سنگ جانان پولاد پوش

تو گوئی شہنشاہ کہ چوں باد رفت
بر ارباب کشف و کرامت جلیست
بماندند از ماندگی جا بجائے
ز خیل سپاہے کہ ہمراہ بود
ہمہ نیزہ بازان جوشن شگاف
ہمہ یکہ تازان چابک سوار

رساندند ارباب معنی بعرض
کر شہ را بحق رتبۂ عادلیست
یلاں چوں شتر ہا دواندند پر
ہمیں شست کس بلکہ پنجاہ بود
ہمہ جنگ جویان بیداد کوش
کہ خود را زدے ہر یکے بر ہزار

ہمہ پاکبازاں مُبرّا ز عیب
رسیدند ناگہ چو مردان غیب

جنگ بیان اکبرشاہ با سپاہ گجراتیاں

مخالف پے جنگ آمادہ بود
بمیدان آں ہر یکے شوخ و شنگ
یلاں بادپایاں برانگیختند
سراسر در آئینۂ ملک زنگ
ز گجراتیاں و مغل ہر کہ خفت
زمیں گشت سرسبز و بشگفت گل
ز گجراتیاں ریخت خوں ہا بجنگ
زمیں پر ز شنگرف و زنگار شد

میاں را بکیں بستہ استادہ بود
شہنشاہ رخش ظفر تیز کرد
بہم باد و آتش بر آمیختند
ہژبراں شمشیر کیں بر فراشت
زمیں زیر لعل و زمرد نہفت
مغل بسکہ پرکالہ پرکالہ شد
چو کلگوں مے از شیشۂ سبز رنگ
نہنگان دریائے کیں در خروش

سپاہش فزوں تر ز مور و ملخ
کمند جہاں گرد مہمیز کرد
دلیران گجراتیاں سبز رنگ
بصحرا ہمہ سبزہ و لالہ کاشت
فتادند گجراتیان و مغل
ہمہ دشت و صحرا پر از لالہ شد
دراں عرصہ از بسکہ پیکار شد
چو دریائے آب لعل و جود بجوش

پے جنگ پوشیدہ جوشن ہمہ
برآوردہ سرچوں نہنگاں ز آب
بہرسو درخشندہ زریں علم
چو بالائے خوباں بدل کردہ راہ
زبس رفتہ پیکاں بہ تنہا دروں

نہاں ہمچو آتش درآہن ہمہ
سناں ریختہ خصم چوں از ستیز
شب قبہ را شمع را و عدم
خدنگ دلیران ناوک فگن
رواں شد زہر قطرہ دریائے خوں
چو از چرخ گردندہ تیر نظر

بجوش دلیراں پُر از تف و تاب
قلم دار گردید شنگرف ریز
سنان دلیراں دراں قلب گاہ
بہ پرواز چوں مرغ روح از بدن
خدنگ دلیراں گذشت از سپہر

نقل عرضداشت فیضی بنام اکبر جو خاندیس سے لکھی!

ذرہ ہیچ تراز ہیچ فیضی اولاً روئے ارادت بجانب آں قبلہ مراد کہ ظاہر و باطنش نظرگاہ خداوند یست آوردہ اولائے سجدات اخلاص مینماید۔ بوضوے روحانی کہ دل را بچشمہ سار صدق وصفا بر و نشست و از غبار ریو و ریا شستن شہ آئین سالوسانِ صومعہ ظلمت کہ چند قطرہ آب ابر دست و روے ریزند و دل را بہزار کدورت و تیرگئے نفسانی بیامیزند و ایں را پاکی نام نہند۔ ثانیاً دعائے دوام عمر و دولت و ازدیاد عمر دل زندہ و باطن بیدار قصد میکند کہ زندگئے حقیقی ہمانست و پاکان آلہی بان زندہ اند و فنا را بگرد سرا پردہ عز تش راہ نیست و از دولت ہم دولت دوام آگاہی مراد میدارد۔ الحمد للہ کہ ہر دو عمر و زندگانی دہر دولت و کامرانی بہ آنحضرت حاصل است۔ اگرچہ امثال ایں دعاہا از مثل ایں نامراداں از ادب دور مینماید زیرا کہ برگزیدہ کہ تن و جان اشرفش پرورش یافتہ نظر خدائی است و آسمان و ستارہ را کہ بکار سازی او میگردانند و لقد ہیچ مقصودے نیست کہ در دامن دولت او نہ بستہ اند و ہمگی بار عالم عالمیان بر دوش ہمت او نہادند بدعائے مشتے خاک تہیدست چہ احتیاج دارد آما بندۂ بیچارہ چکند کہ منصب بندگی و دعاست و انایان ہر ملت سر بر زمین نیاز می نہند و پروردگار ازیں سجدہا بے نیاز است اگر بندہا عمر جاودانی بیابند و تمامی عمر در یک سجدہ بگذرانند حق سجود او بجا نیاوردہ باشند و بندہ در قصیدۂ توحید گفتہ ؎

سر بہ زمین درت بردن و برداشتن	نے بطریقت درست نے بہ حقیقت روا

و در غزلے میگوید ؎

در سجدۂ کہ سر نہ ز تن میشود جدا	در ملتِ وفا گنہش نام کردہ اند
یارب بسیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد	تحفۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

زہے شرمندگیٔ بندہ کہ نام سجدہ بدرگاہ او مے برم اما امید میدارم کہ یک سجدۂ بے سرہم در راہ آنحضرت بجا آورم۔ الحاصل بعد از جہاں جہاں نیاز و عالم عالم مدح و ثنا عرضہ داشت مینماید ۞

وقتے کہ بے سعادتی گریباں گیر بندہ شدہ از درگاہ عالی محروم ساخت ایام برسات بود در راہ بارانہائے فراواں شد و گل و لائے بے نہایت بود آہستہ آہستہ ایں راہ طے شدہ بواسطۂ نفس راست کردنِ چار واد اصلاح شکست و ریخت در شہرہائے بزرگ دو وسہ روز توقف درکار بود۔ دیگر از کاروبارِ حکام و گیر و دار عمال ممالک محروسہ کہ در اثنائے راہ بود بمبصرانہ و بے غرضانہ ملاحظہ کردہ لقارہ کناں گذشت۔ بعضے را مجمل عرضداشت مینماید ۞

بلوچے کہ بفوجداری مقرر شدہ نزدیک بہ تنگئے کوہ درمیان لدھیانہ و سرہند چسپیدہ است و زدانے کہ از کوہ فرود مے آیند دزدی دخول کردہ چیزے مے برند۔ باوہم حق نذرے میدہند۔ در آں حدود راہروان را لبوپش میکشند۔ حافظ رخنہ باوجود آں ہمہ پیر پیادست و پائے میزند و در مدد او میلتے ہست بذات خود امانت و دیانت دارد باغہا را بغایت دلکشا ساختہ میوۂ باغہائے او نان و جغرا لست۔ یک روز ہمراہ بندہ پیادہ بسیار گشت و گفت پیادہ مے گردم تا بدانند کہ ہنوز پیر و خرف نشدہ ام و در خدمت تقصیر نمیکنم۔ اہل سرہند از و آسودہ و رعایا خوش وقت اند و دعائے بندگان حضرت میکنند ۞

یعقوب بدخشی کروری تھانیسر خدمت فوجداری و عملداری تھانیسر و پرگنات ہڑدو لواجبی میتواند کرد و متعہد امینئ راہ میتواند شد۔ جرأت و تردد لوالغی از دست او مے آید ۞

قاسم کروریئے پانی پت نویسندہ قدیمی سرِ براہ است از راستی و دیانت از ممتازان توآمد بود۔ شائستہ آن ست کہ بدرگاہِ آسمان جاہ بودہ بخدمت کلی سرفراز باشد۔ رعایائے آنجا گفتہ کہ حکم عالی بردۂ عشر شدہ امیدوارم کہ عمل براں نماید۔ بموجب وعدہ کہ بایشاں کردہ بود عرضداشت مینماید ۞

حکیم عین الملک نقش دہلی دارد و در خدمتِ دفتۂ مقدسہ مقامات پیران دہلی و خدمت فقرا و حسن سلوک بمردم تقصیر نمیکند۔ و گوجران راہزن حاضر میباشند و متعہد بندہ اند کہ دزدی نشود پسرش عبد اللہ جوان رشید است ہموارہ در خدمت پادشاہی مے باشد۔ استاد یوسف مرد و دعہد در دہلی ست ریش را در طنبور سفید کردہ بود اکنون۔ لبش از ریش و دستش از ناخن سفید تر شدہ نیک محمد چوبانی مرد کار آمدنی است و مستعد دزد و خدمت است نمک الجلالی میخورد و شائستہ توجہ عالی است ۞

چوں بدار السلطنت فتحپور رسید اول بآستاں بوسی دولتخانہ سرفراز شدہ برائے سلامتی حضرت دعا کرد از حقیقت شہر چہ نویسد عمارت گلیں ہمہ داخل زمیں شدہ دیوارہائے سنگین الستادہ بآتشفا نہاد

خانہارا بعضے از دور و بعضے از نزدیک نظارہ کردہ عبرت گرفت۔ خصوصاً از خانۂ میر فتح اللہ شیرازی کہ بآبستن نہصد سالہا در ایام او رازادہ بود۔ دبدبہ آلہی بود کہ بحضرت کرامت فرمودہ بودند باتشخانہائے حکیم ابو الفتح نیز رسد او ہم یگانۂ آفاق بود ازیں تعریف چہ بالاتر اکنوں وجود برادر گرامیش غنیمت است شائستہ مجلس اشرف است۔ سکنۂ مواضع فتحپور و پرگنات آں حدود مثل شیخ ابراہیم مربے میطلبند۔ شیخ بایزید پسر شیخ احمد در قبیلہ خود براستی و درستی ذات و اکثر صفات انسانی نظیر ندارد و لائق ایں خدمت است۔ نیک بدآنحدود میداند و بہ اندک کس کار بسیار میتواند کرد۔ از نیکہ دیگرے بیاید باوتفاوت بسیار است و خویشان او ہم انتظام میابند و موجب معموری شہر است و مستعد تر است و روز در فتحپور باہہائے سینہ خراش چاہ درماندہ بود۔

آنگاہ بدار الخلافہ آگرہ کہ صد ہزار مصر بغداد فدائے آب و ہوائے او باد رسید۔ دید بغایت معمور و مرفہ از لطافت قلعۂ عالی کہ حصن حصین دولت و اقبال است چہ شرح دہد کہ حیرت افزائے جہاں نوردان تواند بود و از دریائے جون کہ بہ لب دب پائے قلعہ بوسیدہ میگذرد چہ نویسد کہ آبروئے ہفت اقلیم است ؎

بادے از آب نگارندہ تر ۔۔۔ آب دے از باد گوارندہ تر

از در و دیوار شہر شوق مے بارد و درہا چشم انتظار کشادہ و دیوارہا بہ تعظیم مقام عالی ایستادہ امید کہ مجدداً بفر قدوم حضرت کامیاب گردد اطوار شاہ قلیخاں و سلوک او بغایت پسندیدہ است شہر را برفاہیت نگاہ میدارد و ہنر خاں بندۂ با اخلاص بادشاہی ست وجود او دریں شہر لازم است۔ از احوال فقرا و مساکین شہر خبر میگیرد ایں دو کس از ترددو نظام الدین احمد بسیار مے گفتند کہ متمردان مواس را کہ مالگذاری نمے کردند و قلعہائے مضبوط و جاہائے قعب داشتہ تنبیہ کرد۔ الحق از اصیلان خانہ زاد کہ در پایۂ سریر دالا تربیت یافتہ اند بغایت رشید است سی سال است کہ بخدمات اقدام مینماید روز بروز کار او در بیش است و در اخلاص و دیانت و کاردانی و بیلاخنگی از مردم ممتاز است لائق آں شدہ کہ ہموارہ بر درگاہ عالی بودہ بر امور مالی و ملکی مطلع باشد و در نظر دیانت او خان خاناں و مرد احدی برابر است۔

چوں بدھولپور رسید سرائے دید از سنگ بغایت رفیع کہ صادق خاں ساختہ و متصل آں حمام گرمے مہیا شدہ و باغے دلکشا مشتمل بر عمارات دلکش۔ پسرش رشید آنجا بود۔ آں معمورہ را خوب نگاہ داشتہ و بر سر راہ بسیارے از بندہائے خدا فیض مے برند و آسائش مے یابند۔

میر قاصد گوالیر کردہ شد میر مرتضے و نذر خاں پسر خداوند خاں کہ جوہر شد از و پیداست پیش از بندہ یک روز رسیدہ بودند و یکے از احدیاں از اودھ کہ چانید آوردہ بود و بجاگیر جدید میرہ جمعیتے داشتند میر مرتضے

مرد کار آمدنی ست و تجربہ کار ست ۔

در قلعۂ نرور کشنداس میباشد و در اطمینت راہ آنچہ از دست او مے آید بجائے آرد اما کارا از اندازۂ او ست میر مصطفےٰ با متمردان نواحی سر بسر ہست ۔

تعریف ولایت مالوہ بہ کدام قلم نگارد آبہائے رواں دید کہ در ہر قدمے ازاں بایستے گذشت از ہمہ سو چشمہائے دلکشا چوں دلہائے پاکاں میجوشید ازیں رباعی کہ گفتہ بود بیاد آمد رباعی

زاہد بشگفت و گل تو پژمردہ ہنوز	شد باد رواں تو پائے افسردہ ہنوز
از تابش آفتاب در سینۂ سنگ	صد چشمہ بجوشید تو افسردہ ہنوز

زمینش ہمہ صالح زراعت بعضے ازاں قبیل کہ نیشکر بے آنکہ آب دہند میشود و سیراب بحدے کہ در ہیچ گز ی آب بر مے آید ہزار شکر کہ للطنۂ مخدوم عالی و موکب اقبال شاہزادۂ عالمیاں نزدیک رسیدہ کہ روح نباتی در قالب این گل زمین کہ گلشن مراد و گلزار عزتست در آید حق سبحانہ تعالیٰ قدوم ایشاں را بر کل ایں ممالک کہ بر سمت قطب جنوبی واقع شدہ مبارک گرداند و ایشاں را در نور آفتاب دولت آنحضرت چوں قطب ثابت و پائدار دارد ۔

سرونج شہریست کہ حکم بندر دارد و بلند خاں خواجہ سرا در ویرانی او تقصیر مے کند عمارتہائے کہ خویشان شہابخان و منصبداران و سائر مردم بتدریج ساختہ بودند چوبہائے او را کندہ فروختہ در و دیوارہم شکستہ اگرچہ از پیری دست و پایش میلرزد عنقریب است کہ دیوار گلبن بدلش از ہم ریزد اما دلش ہمچناں سنگین است ۔

در سجاولپور خواجہ امین خویش وزیر خاں برعایا سلوک خوب کردہ و تقاوی دادہ و پرگنہ معمور ساختہ و ہمہ چیز خود میرسد کارخانہائے پارچہ بافی ترتیب دادہ کہ چیرہ و فوطہ برائے حضرت مے بافند و دکان کاروانی وا کردہ از دست او بخیلے خدمت و سربراہی مے آید اگر خدمت سرونج بعہدۂ او باشد شہر معمور میشود قابل توجہ و تعمیر است ۔

لایق و فائق اجین بلکہ تمامی مالوہ محب علی است از دست او کارے آید ابراہیم قلی پسر اسمٰعیل خاں با جمعیت در اجین بود قاضی بابا مردے خوب ست ۔ باغچۂ نیشکرے دارد کہ قابل تعریف است در ہیچ جا باین لطافت نیشکر خوب نمے شود ۔

مندو دیدہ شد ویرانست عبرت افزا از بدایا یاب بود شتران و کارواں با اسباب گذشتہ اسمٰعیل قلی خاں ناظر آقا یوز باشی را در حد جاگیر خود نگاہداشتہ سابق نوکر خانخاناں بود مردیست لایق

خدمات بادشاہی و قابل ترقیات است درین راہ قاصدان راجی علیخان ہمیشہ با مکتوبات می آمدند چون بجاگیر او در آمد مردم مردم خوب منزل بمنزل میرسیدند و رسوم و آداب کہ میباشد بجا می آوردند کیفیت ملاقات او آن بود کہ معروض داشت۔ آوازہ فر قدوم موکب جہان نورد حضرت شاہزادہ عالمیان گوش ہوش اہل دیار ما بار کردہ است۔ راجی علیخان ہمیشہ میگوید سعادت این دیار است کہ شاہزادۂ عالمیان سایۂ دولت و اقبال بران می گسترند این سایہ بر سر من مستدام باد۔ حقیقت خدمتگاری و خیرخواہی من بحضرت ایشان روز بروز ظاہر خواہد شد و نتایج خدمات قدیم و جدید من بظہور خواہد پیوست و موجب سرفرازی من پروردگار عالم پناہ خواہد شد حالا در ساختگی پیشکش است کہ باعرضہ داشت مبارک قدوم شاہزادۂ عالمیان درین دو سہ روز روانہ سازد و جہیز لائق جہت دو صبیہ بر ساختگی میکند کہ بندہ ہمراہ گرفتہ روانہ درگاہ معلیٰ شود یکے را کہ از دست برائے شاہزادہ بزرگ ادام اللہ اقبالہ آنجا بیارد۔ دیگرے را کہ دختر پسر است بحضرت شاہزادۂ عالمیان مدظلہ العالی در مالوہ حسب الحکم رساند اگر بندگان حضرت نیز از روئے التفات در فرمانے کہ بحضرت شاہزادہ اصدار فرمائید اشارت بہ قبول این معنی فرمایند بندہ نوازیست مبادا حضرت شاہزادہ فرمایند کہ بما حکم نرسیدہ و در فرمان جہان مطاع قید نہ شدہ ملاحظہ دارد کہ باین تقریب کہ از اختراعات واہمہ است توقفے واقع شود واجب بود معروض داشت ٭

دو روز از رسیدن برہان پور گذشتہ بود کہ فرمان عالمیان مشتمل بر حکم رفتن بندہ پیش برہان نظام الملک شرف ورود یافت بمیداند کہ بندہ چہ بیطاقتی دارد کہ از درگاہ معلیٰ روز بروز دور تر میشود و روزگار انتظام ایام دوام ملازمت کہ در سی سال حاصل بود درین چند روز میخواہد بکشد بغیر از صبر چارہ نیست امید وار است کہ اگر مہلتے نصیب باشد عنقریب مراجعت نمودہ بآستان بوس عالی کہ متضمن سعادت جاودانی است کامیاب گردد۔ دریں راہ ہر جا درویشے شکستہ و مجذوبے شنید تنہا و پنہان ملازمت کرد ہرگاہ التماس دعا برائے حضرت نمود اکثرے ہمین گفتہ اند کہ آنحضرت را چہ احتیاج بدعائے ماست کار آن حضرت خدا ساختہ است باین وجہ او محتاجیم و فی الواقع امروز کدام آرزوست کہ آنحضرت را بوجہ کمال حاصل نباشد سایۂ عدالت آنحضرت بر مفارق عالم و عالمیان ابدی باد ٭

برہان پور و حوالئے او اندک جائے ست بغایت تنگ اکثرے بوستان ہر جا قطع زمینے بود مزروع شدہ از میوۂ انجیر خوب میشود و خربزہ فرنگی ہم بشاخ درخت بست بست و سی سی خوشہ جنبانست کم نیست و اقسام کیلہ کہ میتوان خورد فراوانست خربزۂ ہندوستانی ہم ہفتہ باشد کہ رسیدہ و ہوائے اینجا در دے ماہ الٰہی بر طورے گرم است کہ روز بجامہ یکتہی میباشد و شبہا بقبا اندک احتیاج میشود۔ آبہا خیلے تغیر کردہ از نزدیک شدن ایام نوروز و تصور دور بودن از درگاہ عالی باطن را بے آرام مے یابد۔ اما ازانجا کہ پرتو عنایت آن حضرت بر دوران و نزدیکان چون نور آفتاب عالم تاب یکسان مے تابد۔ فی الجملہ خود را تسلی میدہد و بتعقدیات ایزدی د

رضائے شاہنشاہی خوش وقت ست حق تعالےٰ آں حضرت را علے الدوام بر حاضر و غائب و قریب و بعید و فقیر و غنی سایہ گستر دارد ؎

یارب سرخیل کامیاباں باشی	فرماں دہِ آسماں خیاباں باشی
تا سایہ و آفتاب باشند بہم	در سایۂ آفتاب تاباں باشی

(۲) عرضداشت ۔ مشتے خاک سرگرداں فیضی بجمیع ذرات وجود ہزاراں ہزار تسلیم و سجود بتقدیم رسانیدہ بمسامع والائے عاکفان عالی حضرت شاہنشاہی ظل الٰہی ؎

شاہ جہاں پرور تسلیم بخش	تخت فرازندۂ دیہیم وتخش	طلعت او آئینۂ ذات حق
فکرت او حجت اثبات حق	قوت کونین بباز وئے او	گنج دو عالم بتر ازوئے او
او چو جم و جام نظر بر کفش	او چو سلیماں خرد آصفش	ہرچہ نہ از فکر بہ نزدش فسوں
ہرچہ نہ از عقل بہ نزدش جنوں	شیر شکارے کہ بہ بخت جواں	کردہ شکارے دل بے آہواں
شیر دل و شیرکش و شیر گیر	تیز رَو و زود رس و دیر گیر	از ورق غیب سبق یافتہ
	رتبہ ہمنامی حق یافتہ	

رباعی

شاہے کہ لوائے رفعتش دُور زدند	در انجمنش ترانۂ سور زدند
آں شب کہ فروغ او جہاں را بگرفت	انجم بہ نظارہ عطسۂ نور زدند

رباعی

شاہے کہ وجود او کمال است کمال	اندیشہ بوصف او محال است محال
ہرچند کہ اسم او جلال است جلال	ذاتش ہمہ مظہر جمال است جمال

ذرہ وار خاک کردار معروض میدارد ۔ ابتدائے عرض حال از تجلیات صبح صادق کہ زمان عشرت صبوحی کشان خلوت خانۂ نوروز ہنگام جوش و خروش زمزمہ سازان جلوہ گاہ حضور است مے نماید سحرہا چوں از خواب (کہ در محرومی فرشی کہ بحالت بحراں عارض شود و مرگ ناگہانی برابر میداند) سراسیمہ برمیخیزد بہ سفیدہ سحری کہ بہزاراں نور جلوہ گری میکند چشم حیرت مے کشاید بہ تصور آنکہ ایں آں سفیدۂ صبح دولت و بیاض سعادت است کہ آں حضرت در انتظار ظہور آں بادیدہ و دل بیدار بدولت می نشینند بعد بعد ازاں کہ خطوط شعاعے نیّر عالمتاب از مشرق بمشرق می پیوندد و از ہر خط مثل نور بدیدہ می کشند پیغام سرور بہ دل می رساند کہ ایں جہاں سرشتۂ نور است کہ باآں حضرت رابطہ صوری و معنوی دارد چوں طلوع

آں نور اعظم دنیر اکبر تمام وکمال میشود دیدہ را باآں نور الانوار آب و دل را باآں رَوح الارواح تاب میدہد و دوام بقا وسجدۂ لقائے آنحضرت را بہزاراں دعا و نیاز میخواہد این ذرہ راست در باب صبح صادق ؎

در یاب کہ صبح عیش رو بنمود است	خورشید در نور بدل بکشود است
بنگر بہ سفیدہ دم کہ پیشانی چرخ	در سجدۂ خورشید غبار آلود است

رباعی

بنگر بہ سفیدہ تازہ نہ گلشن ازو	گلچیناں را شگوفہ در دامن او
نے نے گردے ز لشکر خورشید ست	گردے کہ شود چشم جہاں روشن ازو

رباعی

ہر صبح دل فیض طلب می باید	دریوزۂ نور از دل شب می باید
ای ذرہ چرا بے سر و پا می گردی	در حضرت خورشید ادب می باید

رباعی

شد صبح جہاں روشنی از سر بگذشت	زینۂ سپہر زیب دیگر بگرفت
خورشید کراں تا بکراں نور افگند	سرتاسر عالم ہمہ در زر بگرفت

دیگر از احوال روز وشب چہ نویسد کہ بادیوار ہا ہمراز و بادر ہا ہم آواز ہست وشادمانی نسخہ ودان میداند کہ خطہائے خدمت ابوی واخوی از پایۂ سریر خلافت میرسد مشتمل بر صحت مزاج اقدس کہ چوں طبیعت بہار باعتدال سرشتہ اند وحرف سعادت جاودانی بر لوحۂ پیشانی بکلک ازلی نوشتہ وآنکہ در دار السلطنت بر تخت عزوجلال کہ مرکز دولت واقبال ست نشستہ انتظام عالم وعالمیان بہ قوانین عقل کامل واسالیب عدل شامل میفرمایند ومژدہ فتح ونوید نصرت از اطراف واکناف ممالک محروسہ میرسد۔ ازیں بشارت ہائے ربانی سجدہ ہائے شکر پروردگار بتقدیم میرساند واین نیم نفس باقی ماندہ را بہ ہمیں مژدہ ہائے دلاویز وابستہ میداند وچوں حالات ایں حدود مو بموے بر ضمیر انور کہ آئینۂ گیتی نمائے عقل کل میداند روشن است۔ بر ہماں اکتفا می نماید برہان نظام الملک ازخاک برداشتہائے آنحضرت وپروردہ نعمت آں دولت خانہ خود را میداند۔ چہار ماہ کامل ہست کہ بر سر جاگیر عادل خاں رفتہ از احمد نگر بمسافت ہفتاد وپنج کروہے نشستہ وبر کنار آب نہلوارہ کہ آبیست بزرگ و سرحدیست میاں جاگیر ہردو قلعہ گلبن ساختہ وعادل خاں ہنوز در قلعہ بیجا پور نشستہ ولشکر خود را باشاہزادہ ہزار سوار فرستاد وہر روز جمعے از طرفین برآمدہ جنگ میکنند وازجانبین جماعتے کشتہ میشود و دریں ایام باقرینہ کہ ثنوی برہان نظام الملک میشود در بیجاپور لفلاکت می بود وعادل خاں او را بداشتہ وپیش روِ لشکر خود کردہ گفت کہ تو

بحکومت میرسی و ازیں معنی فی الجملہ نگرانی راہ یافتہ و راجی علیخاں دو کس اعتمادی خود را پیش نمودہ احتمال دارد کہ
دریں ماہ گرگ آشتی فراریابد اما ہنوز اثرے پیدا نیست وقتے کہ از احمدنگر میرفت مبالغہ عظیم کردہ شد و بیطاقتی ہا
نمودہ شد بعجز تمام گفت کہ پیشکش تیار میشود بآنکہ نیمہ را رفتہ بود دو مرتبہ پیش او رسید و چندانکہ در حوصلہ گنجد
نصیحت ہائے روشن (کہ در حاجات و انش و قانون معاملہ پسند نماید) رہنمونی کردہ شد گفت ہنوز پیشکش تیار
نشدہ بے اختیار در شہر پر شورش کہ از فتنہ سازاں و اوباشاں لبالب است تکیہ بر اقبال آں حضرت کردہ توقف
نمود ہمیشہ خط مینویسد کہ شمارا معاملہ بآں درگاہ است ملاحظہ نمایند کہ مبادا ایں ہمہ اہمال و مکث بر خاطر اشرف گراں
آید جواب میدہد کہ دریں روزے رسیدہ با پیشکش ہائے لایق شمارا بدرگاہ عالم پناہ رواں مے سازم چوں
تربیت کردہ و نظر یافتہ حضرت است امیدوار است کہ ہمیشہ بر شاہزادہ سعادت سلوک نماید و سلوک او مقبول
درگاہ حضرت شود تا عاقبت او بخیر باشد ہمہ چیز بداں حضرت ظاہر است و ہمہ وقائق احوال نیز بر ضمیر اقدس پر تو
خواہد انداخت۔ احمدنگر را احمد بنا کردہ کہ پدر نظام الملک بحری است کہ جد ایں برہان است بایں طریق برہان بن
احمد و احمد قلعہ ساختہ از شہر چار پنج تیر پرتاب دور است و حاکم آنجا می نشیند و اطراف قلعہ میدان است و
شہر طولانی آباد شدہ و حصارے ندارد و از احمدنگر دو کروہی چشمہ ایست کہ آب را بطریق کاریز بہ شہر آوردہ و
تقسیم کردہ و در بعضے خانہائے بزرگاں جدول پوشیدہ از آں آب رسیدہ و حوضہاست کہ پر میشود و باقی مردم
بہ تمام و کمال شورابہائے چاہ میخورند و مولانا عبدالرحمن جامی از بوالعجبی ہائے عالم گفتہ اند ع

مستلزم ممات بود زہر و قیمتی است
سرمایۂ حیات بود آب و کم بہاست

در ایام جنوں مرتضے بیروں شہر صلابت خاں بنامش باغے ساختہ فرح بخش نام سرد بسیار دارد
عمارتے است درمیان حوض بندہ آں را ندیدہ و ہوائے ایں حدود چندانے گرم نیست در عین سرطان کہ
تیر ماہ الٰہی است شبہا احتیاج بلحاف میشود از میوہ ہائے خربزہ خود اصلا نیست۔ چیزے درشت ہمیزہ میشود
کہ مردم ایں جا میگفتند خربزہ است بندہ باور نکردہ از میوہ ہا انجیر ایں جا بد نیست و انگور فخرے و دیگر
اقسام ہم میشود اما فراواں نے۔ اناناس از اطراف بسیار می آرند ۔

امرت پھل و کیلہ فراواں است انبہ ایں جا بد نیست گل سرخ بغایت کم با وجود کمی کم بو ہم چنبہ و دیگر گلہائے
ہندوستان بسیار است درخت صندل در باغہا نشاں میدہند درخت فلفل بسیار است چند درخت انبہ ایں جا ست
کہ در دلو وحوت بر میدہد و از محترفہ زرگراں خوب و پارچہ باقاں بے بدل اند۔ از ہمہ چیز دکن پارچہ است کہ میتواں
گفت کاغذ و پارچہ خوب در دو جائے سازند و مے بافند یکے در پیٹن و دیگر در دولت آباد۔ پیش ازیں
چند سال دو بار ایں جا قتل عام شدہ و یک کس از مردم ولایت زندہ نماندہ و تا سہ روز می کشتند

مردم خوب از فضلا و تجار وغیر آں کہ دریں مدت جمع شدہ بودند بہ قتل رسیدند و خانہائے آنہا را بغارت بردند ویکبار دیگر بعد از آمدن برہان الملک تاراج عظیم بر سر غریباں شد و ہر کہ بر سرِ اسباب خود می ایستاد می کشتند و زخمی میکردند برادران شیخ منور ایں جا غارت زدہ و زخمی ہستند و از شرم بخانہ خود نمی تواند رفت و شیخ منور ایں جا امیدوار عنایت است و سوداگران افغان لاہوری تاراج زدہ بسیار می گردند و بعضی مردم و ملازماں عصمت قباب سلیمہ سلطان بیگم نیز غارت یافتہ ہستند اسبابے کہ بدست ایں طور اوباشاں افتادہ باشد چگونہ باز بدست می آید بیخانہ می گردند و سرگردانند ◆

دیگر ابراہیم عادل خاں حاکم بیجاپور بیست و دو سالہ است و برادر زادۂ علی عادل خاں عالی از جوہر سعادت نیست ارادت غائبانہ بحضرت دارد چوں دلاور حبشی تربیت کردۂ او تسنن دارد و ایں دلاور را بد کردہ اند حالا پیش نظام الملک ہست و محمد قلی قطب الملک تشیع دارد ◆

معمورہ ساختہ و عمارت پرداختہ بھاگ نگر نام بنام بھاگ متی کہ فاحشۂ کہنہ و معشوقۂ قدیم اوست حالا ولایت دکن از انچہ در جاگیر ایں دو سہ کس مقرر است وچہ از انچہ راجہا دارند و سلوک اینہا بایک دیگر مبصر اند باوجود چندیں موانع ملاحظہ کردہ شد اگر دمے چند دیگر مہلت باشد بحضور اشرف بہ تفصیل عرضہ داشت خواہد نمود و ایں ولایت را داخل ممالک محروسہ می شمارد و یک مرتبہ طنطنۂ قدوم اشرف و آوازۂ موکب عالی ایں حدود رسیدہ- ایں غزل بہ طریق حسب حال روئے نمود- چوں از دل اخلاص منزل برخاستہ امید بہ وقوع انجامد غزل

نسیم صبح مشک افشاں ز گرد راہ می آید	مگر از موکب اقبال اکبر شاہ می آید
شبستان سعادت را ز نقل و مے لبالب کن	کہ شہ در بوستان و شمع در خرگاہ می آید
مغنی جلجلہائے ارغنوں را قفل بر در نہ	کہ در گوشہ صدائے کوس اکبر شاہ می آید
بہ عہد سایۂ دولت جہاں گو بادشاہی کن	کہ بال افشاں ہمائے چتر ظل اللہ می آید
اگر غم ور غم شادی نمیرد جائے آں دارد	نشاط دوستاں بر دشمناں جانکاہ می آید
منجم بر سعادتہائے روز افزوں کواکب را	بشارت دہ کہ بر اوج ثریا ماہ می آید
بہ ہمت فتح عالم کن کہ در میداں سر ایلاں	ز صد لشکر بیاید آنچہ از یک آہ می آید
دعا را می برم تا آسماں بر دست و ایں باشد	کہ از دست دعا گویاں دولت خواہ می آید
دم صبح سعادت میدہد غافل مشو فیضی	کہ فیض صبح گاہی بر دل آگاہ می آید
خموشی را بلند آوازہ کن ایں جا کہ از حیرت	عیادت نیک میخیزد نفس کوتاہ می آید

حضرتا برہمزدگی ضمیر و آشفتگی دماغ نہ آنچناں سراسیمہ دارد کہ سر و سامان سخن آرائے و برگ ورق آرائے

اندیشہ بپایے ماندہ باشد دلیل ایں معنی ست کہ از لسان الغیب وارد شدہ ◆

کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد — یک نکتہ ازیں معنی گفتیم وہمیں باشد

گاہ گاہے درد دلی وحسب حالی بے اختیار بیروں می تراود گاہ ہمہ حسب حالت گاہ دریک بیت ذوبیتے
درج میابد باقی بطفیل گفتہ می میشود چنانچہ روش غزل است کہ ہر بیتے از حالتے خبر میدہد و آنکہ تمام غزل بیکحال
واقع میشود نادرے افتد یک مرتبہ عرضہ داشت بدرگاہ می فرستاد وایں غزل درحسب حال آں رسمے نمود ◆

فرستادہ ام گل بدست گیاہے — ز بہر کلہ گوشۂ کج کلاہے
نفس ریزۂ بستہ بربال شوقے — جگر پارۂ ماند بر برگ آہے
گرو دادہ دل درکف تیرہ شامے — گرہ کردہ دم بادم صبح گاہے
مژہ بند بر موکب شہریارے — نظر باز بر جلوۂ شاہ راہے
باین نیم آہے کہ تالب بجنبد — تسلی دہ آرزو گاہے گاہے
ہزاراں غم آورد روبا کہ گویم — کہ بر نیم جاں کس نیارد سپاہے
چرا میزند شعلہ سرتا بپایم — اگر مو بمویم ندارد گناہے
زخوں ناب مژگاں چہ بیروں تراوم — چہ گلہا کہ سہ روز شب گیاہے
چہ پرسی کہ درخاک وخوں کیست فیضی — بیفتادہ صیدے ز فتراک شاہے

یک مرتبہ بعضے ہمراہاں بہ طریق خالی شدن شہر وگریزا گریزی مردم داخل فتنہ وفساد بیدلی
کردند وبندہ نصیحت گرایشاں بودم ومیگفتم کہ یاراں مرا بہ فتراک اقبال ابد قرین بندید و ایں را حصار
الٰہی بہ شمارید وغم مخورید دریں باب ایں غزل روئے نمود۔ غزل

بانہ یاوان طریقت سفرے درپیش است
ہرکہ دیدیم ز اندیشہ سرے درپیش است
ہمرہاں ایں ہمہ نومید نباشید ازمن
شکر کن قافلہ را رہبرے درپیش است
رہ نوردان بلا را خطرے درپیش است
کس نمی گوید ما از منزل اول خبرے
کہ دعائی سحرم را اثرے درپیش است
عاقبت ناصیۂ ما شود آئینۂ بخت
پانہ نہادہ دریں بادیۂ قافلہ سوز
صد بیاباں بگذشت ودگرے درپیش است
مانہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم
کوکب طالع ما را نظرے درپیش است

اے صبا بر سر آفاق گل مژدہ بریز — کہ شب تیرۂ ما را سحرے درپیش است
فیضی ار قافلۂ کعبہ رواں نیست برو — ایں قدر ہست کہ از ما قدمے درپیش است

آخر الامر بعضے ہمراہاں تاب ہمراہی نیاوردہ وکوتہ اندیشی نمودہ رفتند بہ تقریب آنہا گفتہ شد
حسب حال است کہ نوشتہ می شود ؎

زہم رہاں ہر کہ نالم کہ کوتہی کردند
کہ محمل دلم از بار خود تہی کردند
بگرد نالۂ شبگیر بخت‌یاں گردم
بدہ بکوئے آنانکہ گمرہی کردند

بمیر قافلۂ عشق بے رہی کردند
گذاشتن چو منے را نہ از مروت بود
کہ در سماع نشستند و سحرگہی کردند
نوید بخت بہ فیضی رساں کہ اہل طلب

ہزار بادیہ زیں نامو فغاں آباد
براہ عقل نرفتند و ابلہی کردند
بیار ساقی ازاں شمع راہ گمرداں
جمازۂ گرم بیابانِ شہنشہی کردند

دیگر در ایام طراوت بہار و لطافت اردی بہشت کہ نسیم آں از دل و دماغ نکہت و ہوائے آں بجگر آتش
مے بخشید دو بیت گفتہ شدہ بود درمیان ایں غزل است کہ در زمین غزل میر شاہی واقع شدہ است ؎

ما سادہ لوح دیر و خطِ سرنوشت ما
بالعرسالکانِ مرا سرنوشت ما
معلوم شد کہ حاصل ما زین بہار چیست
پیر مغاں کہ بر سر خم ماند خشتِ ما

عکس است از کتابۂ طاق کنشت ما
اے کبک مست قہقہہ بر باغ ما مبر
روزے کہ برق فتنہ وزد گرد کشت ما
فیضی بہ بین ناصیۂ ما کہ عشق کرد

در راہ ما دلیر تگاپو مکن کہ ہست
گل غنچہ میکند دم اردی بہشت ما
تعظیم حالِ درد کشاں داشت در نظر
محو سجودیت رقم سرنوشت ما

و در ہمیں ایام یکبار فوارہ میجوشید ایں غزل حسب حال روئے نمود ؎

میکشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما
ہر کسے روزِ ازل تختۂ تعلیم گرفت
ہیچ دانی دل ما خورد چرا بشکستند
رونق عہد بہ بینید کہ بر بستر خوں
خون پاکاں بود امروز دریں شہر کہ ہست
دیدۂ او بگذار جگر انباشتہ باد!
فیضی از نقد جہاں گرچہ تہی دستانیم

جوشش آتش بود امروز بفوارۂ ما
عشق مشاطگی آموخت ز نظارۂ ما
آسماں آئینہا ساخت ز سیارۂ ما
فتنہ مے بارد از آئین ستمگارۂ ما
جرعۂ مژدہ فشاں برلب خونخوارۂ ما
ہر کہ گوید خبرے از دلِ آوارۂ ما
کیمیا سادہ برد زنگ ز رخسارۂ ما

تربت میر حسن دہلوی در دولت آباد است غالباً ہمراہ سلطان علاؤ الدین آمدہ ایں جا عمر مستعار را
بآخر رسانید بخاطر رسید کہ دیوان او کشودہ یک غزل تبرکاً تیمناً تتبع نمودہ شود اتفاقاً ایں غزل آمد ؎

باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد میدہد
ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بباد میدہد

شکستہ بستہ گفتہ شد از اتفاقات حسنہ آنکہ نام حضرت شاہزادۂ عالمیاں قافیہ بود و بنام ایشاں مزین
ساختہ فرستادہ و ایں معنی را تفاؤل بر فتح و نصرت نمود بعرض اشرف نیز میرساند ؎

صبح کہ ترک مست من شیشہ کشاد میدہد
ہم مژہ اش ستیزہ را دشنہ بدست میدہد

عقل بخاک میدہد صبر بباد میدہد
ہم نگہش زمانہ را عربدہ باد میدہد

آہ کہ بر دماغ دل میزندم نسیم خوں — جرعہ بساغرے کہ آں ترک نژاد میدہد
جلوۂ کاروان مانیست بناقہ و جرس — شوق تو راہ می برد درد تو زاد میدہد
بیکسم و شکستہ دل تشنہ ابر و ہمہ — گر بخورند خون من کیست کہ داد میدہد
فیضی نامراد من از غم دہر غم مخور — زانکہ مراد اہل دل شاہ مراد میدہد
تاج ستان و تاج بخش باد کہ در سپہ کشی — باغ غبار موکبش تاج قباد میدہد

الحاصل در ہر آنے و در ہر شانے آں حضرت ملحوظ و مشہود ند و مناقب و معالی آں حضرت ہموارہ در نظر است وحالات و کمالات در پیش دیدہ جلوہ گر در نظم و نثر حضرت و ایں حالت دریں غزل درج نمودہ شدہ

ہر نظم گوہریں کہ بیادِ تو گفتہ ام — دل رخنہ کردہ و جگر خویش سفتہ ام
از دیدہ صد نگاہ فراہم نمودہ ام — تا کردہ صد نظارہ زراہ تو رفتہ ام
بیداری ستارہ گواہ است کز فراق — شب بگذراندم کہ بر آتش نخفتہ ام
بر بستہ ام شگاف دل از پارۂ جگر — تا بنگری کہ درد تو در دل نہفتہ ام
دارم ہزار پارہ دلے وہ چہ حسرتست — کاندر خزان ہجر تو گلگل شگفتہ ام
چوں جلوہ تو در دل و در دیدۂ من است — تا خود حدیث گفتہ و از خود شنفتہ ام
فیضی گماں مبر کہ غم دل بگفتہ ماند — اسرار عشق آنچہ تواں گفت گفتہ ام

دیگر امثال شش جہاز از ہرمز در یائے شدہ بود خواجہ معانی جہری کہ عمدہ تجار است با رفقا شش صد و کت اسپ عراقی داشتہ تا سہ جہاز بکوہ رفت و قاعدۂ فرنگیان است کہ چہار اسپ را بکوہ می برند و اسپاں را آنچہ خواہش میکنند مے گیرند و باقی را مگزارند ولیسہ جہاز در اردی بہشت ماہ الٰہی در بندر چیول کہ داخل جاگیر نظام الملک است رسیدہ ایں مردم گفتہ اند کہ بست و چہار روز در دریا بودیم بعضے سوداگران و بعضے قزلباشاں را کہ از صرصر حوادث و فتن عراق و فارس فرار نمودہ بعزیمت آستاں بوس آں حضرت بمامن ممالک محروسہ رسیدہ اند کلانتر اینہا حسن قلی افشار است جوان بہادر است در زمان طہماسپ حکومت بعضے از نواحی اصفہان کردہ و دیگر حسین بیگ لشکر نویس است کہ در ایام حکومت یعقوب خاں نتوانست آنجا قرار بر بودن داد۔ و ایں دو کس با کوچ خود آمدند و در چیول فکر زاد و راہ میکنند بہ بندہ خطہا فرستادہ اسمائے طلب داشتہ بودند بندہ یک جواب بہر دو نوشتہ بود خط اینہا بجنس و نقل خط خود ارسال داشتہ بنظر اقدس خواہد گذشت۔ دیگر از اہل جہاز حمزہ حسن بیگ است کہ خویش خان خاناں است عزیمت تتہ دارد دیگر حاجی ابراہیم رکابدار سابق شاہ طہماسپ بود عنایت بیگ او را می شناسد و غلامے زرگر ہم میدلند

چندے از اہل جہاز تا احمدنگر رسیدہ اند احوال عراق و فارس و روم و آں حدود بطورے کہ معلوم شد خلاصۂ آں بعرض میرساند۔ شاہ عباس بہ بست سالگی رسیدہ و عین شعلۂ جوانی اوست زائچۂ طالع دو برادر او کہ ابوطالب میرزا و طہماسپ میرزا نام دارند محبوب عرضہ داشت ارسال داشتہ منجمان درگاہ احوال و احکام از آغاز و انجام عرض خواہند نمود شاہ عباس بہ تفنگ اندازی و چوگان بازی و نیزہ بازی و شکار شغفے تمام دارد و بباز شاہین مائل است پارسال دو مرتبہ در نیزہ بازی از اسپ افتاد یک مرتبہ در اصفہان و یک مرتبہ در شیراز و در ہر مرتبہ بزانوئے او آسیب عظیم رسیدہ اما بخیر گذشت آثار شجاعت و جلاوت و غیرت از پیشانی احوال اومے درخشد باوجود مستی جوانی و شاہی کہ ہوش ربائے اکثر جوانان است جوہر رشد و عقل ازو می تابد ہنوز بہ نفس خود بہ مہمات سلطنت پرداختہ و کاروبار ملک و مال بہ عہدہ و دخل گذاشتہ فرہاد خاں وکیل مطلق العنان و مصاحب دائمی اوست۔ و حاتم بیگ اردبادی کہ از درایت و کفایت بہرۂ تمام دارد وزیر حکومت است۔ نزدیک رسیدہ کہ شاہ ہم از خواب گرانِ غفلت بیدار شود و از مستی ایں بادۂ ریا ہشیار گردد۔ و ازیں کہ اکثر ولایت خراسان از بے پروائی و پریشاں رائی از دست رفتہ بغایت متاثر است و در استخلاص آں اہتمام دارد پار سال منجواست کہ برسر خراسان لشکری چوں قریب ہری رسید طاعونے پیدا شد بعضے را در تہ بغل و بعضے را در بیخ ران کہ مغرع اعضائے رئیسہ اند بثور مقدار نخود یا زیادہ یا کم برمی آید و از ہم میگذشتند شاہ ہم تب کرد و فسخ عزیمت نمود و بجانب قزوین شتافتہ و فرہاد خاں با بعضے امرائے خراسان و بعضے شہر را گرفتہ در حوالے مشہد رسید و چندیں ہزار اُزبک را دراں میاں کشت۔ پسر عبداللہ خان از براہ یلغار کردہ و برسراو رفت و او بموجب قرار داد کہ بشاہ کردہ بود برگشتہ بہ قزوین آمد مردم کارواں میگفتند کہ پسر عبداللہ خاں با پنج شش ہزار کس کہ دریں یلغار رسیدہ بودند اگر فرہاد خاں می ایستاد کار از پیش بُردہ بود شاہ را پارسال منجماں منع میکردند کہ بہ خراسان متوجہ نشود و بہ امسال مے گفتند کہ لشکر بہ کشد فتح از جانب شاہ خواہد بود و بہ ہمیں مضمون خطے از خان احمد گیلانی کہ از عالم نجوم بہرہ مندست نیز رسیدہ و دیگر دولتیار کرد در میان تبریز و قزوین با بست ہزار کس نامردی کرد یک مرتبہ شاہ بجہت دفع او حسین خاں حاکم قم را با پانزدہ ہزار کس فرستادہ بود حسین خاں شکست یافتہ بود احتمال داشت۔ کہ چوں بخراساں متوجہ شود دولتیار برسر قزوین بیاید شاہ در دہم رمضان سال گذشتہ خود برسر دولتیار رفت بعضے برادران دولتیار ایں معنی را فہمیدہ خود شمشیر در گردن کردہ پیش شاہ آمد۔ شاہ او را در صندوق کردہ در قزوین آورد و سوخت مردم می گفتند کہ دفع او کم از دفع اُزبک نبود شاہ در ہمہ ایام توپچی را پیش خان احمد گیلانی فرستادہ بود و برسر پرخاش شدہ بود کہ مارا ایں ہمہ حوادث روئے از فساد داد ہیچ اثر یک جہتی ظاہر نشد خان احمد

ضعیف نالی کردہ پیری و ناتوانی را درمیان آورد۔ اظہار کمال خلوص و ارادت نمودہ و گفتہ کہ ولایت و ناموس من ہمہ تعلق بشاہ دارد وصبیۂ خود را بفرزند شاہ کہ صفی نام دارد و در مشہد متولد شدہ و شش سالہ است نامزد ساختہ عرایضہ نوشت شاہ این معنی قبول نمودہ از قزوین حاتم بیگ را با جمعے از علما بگیلان فرستاد و در شب برات گذشتہ عقد غائبانہ کردہ اند۔ و رفتن و آمدن این مردم بہ چہل روز کشید خان احمد آرزو ابریشم و قماش کار است و دیگر تحفہا قریب بدہ ہزار تومان فرستاد و بروندہا ہم خوب پیش آمد بعد ازاں شاہ از قزوین بہ اصفہان متوجہ شد در راہ خطے رسید کہ در یزد جماعۂ ازبک قریب بصد و پنجاہ کس بہ بہانۂ سوداگری آمدہ اند و بہ سپاہی مے مانند بحاکم یزد نوشت کہ آنہا را تا رسیدن من بہ حکمت نگاہ دارد و چون شاہ دریزد آمد آنہا را پرسید و خواست کہ آزار رساند گفتہ اند کہ ما سوداگرانیم اگر شما سوداگران را آزار میرسانید سوداگران ولایت شما ہم آنجا بسیار اند شاہ آنہا را گذاشت و از یزد باصفہان آمد و قورچیاں را باہتمام تمام بولایتہا فرستاد و مقرر ساخت کہ در ہمیں نوروز حوالے طہران کہ ہمہ لشکر از اطراف جمع باشد و قرار داد کہ امرا و قورچیاں کوچ خود را ہمراہ بروند تا بر سر ناموس خود بودہ خیال برگشتن بخود راہ ندہند و انتظار خیر باد کار سلطان کہ بدرگاہ عالم پناہ آمدہ بسیار مے برد و توقع داشت کہ فکر لشکر ازیں جانب بطرف خراسان تعین شود ظاہر آنست کہ اگر امرائے اطراف ولایت تمرد و مخالفت نہ نمودہ باشند بعد از نوروز بر خراسان لشکر کشیدہ باشد و منجمان عراق می گفتند کہ شاہ را دریں سال خطرے عظیم و قاطعے در جبہ طالع او رسیدہ تا چون بگذرد شاہ را رگ غیرت در جنبش است و داعیہ تردد دارد تا تقدیر چیست شاہ لشکرے کہ از ممالک خود طلبیدہ بایں تفصیل است ٭

ذوالفقار خاں برادر خاں حاکم اردبیل و دامغان دہ ہزار کس۔ حسین خان قجر با جماعۂ قجر دوازدہ ہزار کس۔ شاہ قلی سلطان شاملو حاکم ہمدان چہار ہزار کس۔ چراغ سلطان حاکم رَے چہار ہزار کس فرخ خاں برادر مرتضےٰ خاں ترکمان پنج ہزار کس۔ محمد قلی سلطان پسر مرتضےٰ خاں دہ ہزار کس۔ بنیاد خاں حاکم شیراز تو ابع دہ ہزار کس۔ حاکم یزد مع توابع پنجہزار کس۔ امیر حمزہ خاں و سیاوش خاں معہ پیادہ و سوار چہار ہزار کس۔ ملک سلطان محمد ہشت ہزار کس۔ ملک سلطان شاملو ہزار کس۔ احمد سلطان ذو القدر ہزار کس۔ فرخ حسین خاں شاملو پنج ہزار کس۔ پسر علیخاں ہزار کس۔ یادگار علی سلطان حاکم خوارزم و شمنان سوار و پیادہ دو ہزار کس۔ پیادہ و سوار اصفہان دہ ہزار کس۔ جماعہ پیادہ از جمیع شہر ہا پانزدہ ہزار کس۔ تفصیل لشکر قورچی خاصہ و غیرہ بست ہزار کس۔ نور باشی وغیرہ سوار یازدہ ہزار کس۔ پیادہ ہشت ہزار کس۔ تفصیل لشکر غلامان شاہ دیو جمشید حاکم قزوین دو ہزار کس۔ دیو حسین سہ ہزار کس۔ دیو ابدال

دو ہزار کس۔ ایں لشکر از صد ہزار کس زیادہ است مردم می گفتند اکثر خواہند آمد کہ ہنگامۂ اہتمام چنیں عظیم است تا امروز دریں صحبت شدہ باشد ۔

دیگر یکے از عراق مبارک نام در نواحی شہر شوستر خروج کردہ و بحراب لشکر روم جنگ کردہ بر ہمہ محل بر ایشاں ظفر یافتہ وخود را از محبان شاہ میگیرد و دوم یک جہتی میزند و تحفۂ گرامی میفرستد۔ دو سال شدہ و در بصرہ و بغداد از رہگذر او بر تر لیست۔ یکے از مخالفان او آمدہ ملازم شاہ شد۔ بادشاہ او را داخل قورچیاں ساختہ روزے بہ شاہ گفت کہ مبارک بشما فیلسوفی میکند اگر باور ندارد او اسپے دارد کہ بہ ہفصد تومان خریدہ و امروز چشم زمانہ مثل او تگاورے ندیدہ باشد از و طلب دارند اگر فرستاد ہر چہ او میگوید راست است۔ در ساعت شاہ باو خطے مے نویسد کہ ما بر جناح سفریم و شنیدہ ایم کہ چنیں اسپے دارید خاطر مائل باں شدہ است آں را بفرستید اگر میسر شود از سواران کار آمدنی نیز آنچہ در وقت گنجد بفرستید کہ دریں یساق با ما باشد چوں ایں خط بمبارک میرسید در ہماں روز ہماں وقت ہماں مرکب باسی صد اسپ دیگر با پسر خود مع شش ہزار سوار روانہ مے سازد و ایں ہا پیش شاہ رسیدند دیگر دہ ہزار عرب از اعراب عامری در نواحی خراسان جمع شدند و از برائے دین و مذہب قرار بہ جنگ اُزبک دادند۔ انتظار شاہ میکشیدند ۔

دیگر از وقائع پار سال آنکہ شاہ عباس دو برادر خورد خود را کہ ابو طالب مرزا و طہماسپ مرزا نام داشتند میل کشیدہ و اسمٰعیل مرزا و پسر حمزہ مرزا میل کشیدہ چوں بسید خورد سال بود میل یافتن تاب نتوانست آورد بہ ہماں عذاب بجاں بحق تسلیم کردہ شاہ عباس دو پسر دارد یکے مرزا صفی کہ بعرض رسید دیگر مرزا حیدر کہ پار سال ولادت یافتہ و سلطان محمد پدرش نابینائے مطلق شدہ ہمراہ شاہ عباس می باشد و برائے او خیمہ علیحدہ میزنند اندک چیزے باو مقرر شدہ بفسق و فجور مشغول ست ہزالی و خندہ و رقاصی و خواندگی بر مزاج او غالب است ۔

دیگر پیرانہ سال در اردبیل وبائے عظیم شدہ چنانچہ بسیارے از مردم شہر را گذاشتہ بہ اطراف رفتہ بودند و ایں جا کہ ماندہ بودند تمام و کمال مردہ بودند و سوداگر بسیار خانہ بخانہ مردم افتادہ بود و در خانہائے جمعے بگل بر آوردہ بودند چوں بشاہ ایں خبر رسید قورچی تعین نماید کہ ضبط اموال و تحقیق مردم مہلک نماید ۔

دیگر از احوال پیرانہ سال آنکہ چوں بکتاش خاں کہ حاکم کرماں و یزد بود جمعیتے داشت و بشاہ عباس سرکشی میکرد یعقوب خاں ذو القدر کہ حاکم شیراز بود بفرمودۂ شاہ عباس بر سر یزد رفتہ بکتاش را کشت و اسباب فراواں بدست او افتاد دماغ آں تنگ حوصلہ خللے پیدا کردہ با دیگری وسوسہ ائے کوتہ اندیشی در سر آمد

پیچیده چنانچه به مردم خود می گفت که من از شاه طهماسپ حاصل شده ام و به بادشاهی برسر دو در شیراز بنیاد خودسری
و سرکشی مے کرد و نزدیک بقعہ شیخ سعدی قلعہ ساخت و شاه عباس از اصفهان محمد را و را طلبیده و اموالے که
بدست او افتاده بود طلب داشت نه خود رفت نه ان اموال چیزے که بکار آید فرستاد شاه از اصفهان با دوازده
ہزار کس یلغار کرده به شیراز رسید و او در قلعہ اصطخر شیراز با چہار صد کس متحصن شد شاه چہار ماه نشست جماعتے کثیر را بر
دور قلعہ تعین نموده در مجلس خود می گفت که باعتمادے تر از یعقوب نوکرے نداریم و دشمناں او را ترسانیده و او ہم متوہم شده
پیش ما نمے تواند رسید این خبر مکرر باو رسیده شاه ہم معتمداں را فرستاد و به افسون و افسانہ او را از قلعہ کشیده شاه از تقصیرات
او در گذشت با آنکہ روزے خان بیگ که ملازم یعقوب خاں بود به شاه گفت که یعقوب خاں قصد شما دارد و جمعے را
بریں کار موافق ساخته شاه قبول این معنی نمود تا روزے به شکار برآمدند با جمعے از افراد خاں بیگ باز در عین شکار به
شاه گفت که یعقوب خاں در زیر جامه زره پوشیده و بر سر غدر است شاه به تقریبے دست بر دوشش میرساند
مے یابد که زره پوشیده است - به بہانۂ درد سر ترک شکار کرده به شہرے آید روز دیگر در دیوان خانہ می نشیند و
مے گوید که یعقوب خاں را حاضر ساختند و جمعے از نوکران او را که ہر یکے به لقبے و خطابے بدنام کرده بود آوردند
اتفاقاً پیش ازیں بچند روز ریسماں بازاں ریسمانہا کشیده بودند که ریسماں بازی کنند یعقوب خاں را بجائے
خود میگوید که بنشنید او را به تمسخر آنجاے نشاند و شاه خود عصائے گرفته پیش او می ایستد و میگوید که شاہی به یعقوب خاں
میرسد الیشاں شاه باشند و ما نوکراں آنگاه شاه ایستاده به آواز بلند میگوید که شاه یعقوب خاں چنیں حکم میفرمایند که فلاں
نوکر ما را در ریسماں بکشند ہمچناں او را می کشیدند تا آنکه ہلاک می شد ہمچنیں ہر یکے را به طرزے خاص کشتند آخر نوبت
به یعقوب خاں میرسد او را آویخته در شکنجه کردند و به سیاست تمام لقمۂ سگاں ساختند و حکومت فارس به بنیاد خاں
ذوالقدر داده خود باصفهاں آمد و قریب دو ماه آنجا بوده بقزوین رسید و تتمہ احوال سابقہ معروض شده

دیگر از اخبار روم آنست که سلطان مراد در استنبول است صرع قدیم که داشته دریں ایام طغیاں کرده
چنانکه بعضے اوقات از صباحے تعشی مے کرد تا آخر روز گاه به نیم روز تا نیم شب سوارے تواند شد در سواری اسپاں
میگردد تا سه فرسخے ایں طرف تبریز در تصرف رومیہ است و کوتل شمال سرحد شد و قراحسن استاجلو را پارسال به استنبول
فرستاده سرحد مشخص کردند - و حاکم تبریز خواجه سرائیست جعفر نام به تدبیر و شجاعت در گنجه سراواں و قرا باغ قلعہا
ساخته و استحکام نموده - رومیہ به ہمسائیگی قزلباشاں راضی تر اند از ہمسائیگی اوزبک غالباً سلطان مراد به عبداللہ
خاں نوشته بود که باعث تاخیر و اہمال چیست - ازاں طرف شما بیایند و ازیں طرف ما مے آئیم - تا قزوین سرحد
جانبین بوده باشد - عبداللہ خاں نوشته خراساں خود بقزوین منتہی میشود و نزدیک است که گرفته شود -
مے آئیم داعیۂ حج و شوق ملاقات درج کرده بود رومیہ را ایں حروف دور از کار ناخوش آمده رنجیده در

نگاشتن آن بود نہ کہ بہ شاہ عباس کمک بدہند پسر مرزا حمزہ پیش رومیہ است۔ اگرچہ رومیہ اورا طلبیدہ اند کہ با وصیت خواہم کرد اما می لست کہ خلاف قانون کنند و در طلبیدنش حیلہ چند خیال کردہ اند ٭

دیگر سرآمد دانشمندان عراق و فارس میر تقی الدین محمد است کہ مشہور بہ تقی النسابہ است و بہ دانشمندی او امروز در ولایت کسے نیست از شاگردان میر فتح است وقتے کہ میر فتح اللہ و مولانا مرزاجان در شیراز کوس دانشمندی میزدند او نیز یکے از مدرسان مشہور شیراز بودہ بندہ مدتست کہ صیت کمالات او می شنود از میر فتح اللہ مکرر بتعریف او شنیدہ و کسے را کہ این چنیں شاگردے ماندہ باشد دلیل کمال او برعالمیان ہمیں بس ٭

ملا محمد رضائے ہمدانی از شیراز میرسد واز ماغ سوختہائے مدرسہ است وجوہر فضیلت و اہلیت از و ظاہر میگوید میر تقی الدین محمد آرزوئے آستاں بوس حضرت بسیار داشتہ زاد راہ بہم نرسید و فرصتے بدست نیفتادہ وگرنہ دریں قافلہ می آید اگر فرمان عالیشان بہ العلماء بہ طلب او برود سرفرازی اوست یادگار میر فتح اللہ و فرزند معنوی ایشانست بموجب آنکہ گفتہ اند

اے گل بتو خورسندم تو بوئی کسے داری

امید است کہ بدرگاہ معلے رسیدہ از مجلس عالی کہ محل تدریس علوم کونی و الہی و مقام اکتساب کمالات انفسی و آفاقی است مستفیض گردد ٭

و دیگر قاضی زادہ ہمدانست کہ ابراہیم نام دارد و بہ پایۂ دانشمندی شفا درس می گوید و بر شرح اشارات حاشیہ نوشتہ و ترقیات عظیمش روئے دادہ و در اُردوئے شاہ است و این محمد رضا کہ آمدہ قرابتے بہ او دارد ٭

و دیگر شیخ بہاء الدین اصفہانی است در بعلبک متولد شدہ و ہفت سالہ ہمراہ پدر بہ ہرات آمدہ و پیش پدر خود و ملا عبداللہ یزدی تحصیل نمودہ و در جمیع علوم تبحرے دارد و ممتاز است در اصفہان می باشد ٭

دیگر از مستعدان صاحب فطرت عالی و مشرب والا کہ لائق مجلس عالی تواند بود چلپی بیگ است در شیراز و قزوین تحصیل کردہ و دریں دوازدہ سال او را ترقیات عظیم رو نمودہ دارد و ہمہ جا میگویند وحالا در شیراز است اگر ذرہ توجہ عالی بجانب او ہم شود بجائے خود است ٭

دیگر در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر مرتبۂ عالی دارند یکے ملک قمی کہ بکس کمتر اختلاط میکند و ہمیشہ مزہ ترے دارد از دست این رباعی و یک بیت رباعی

ہر جا کہ بر دمے رسی مردم شو	در ہر کہ غبارے نگری قلزم شو
آمیزش حسن و عشق ستر ازلیست	من در تو گم و تو نیز در من گم شو

بیت

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر	یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

دیگر ملائے ظہوری کہ بغایت رنگین کلام است مکارم اخلاق تمام بغربیت آستان حسن دارد از دست این رباعی و دو بیت

گر نام اثر برد دعا از مانیست	حاجت کہ گہے شود روا از مانیست
صبرے کہ زمانیست جدا از مانیست	دردے کہ کشد نیک دوا از مانیست

بیت

بیابان کرد او غم نامہ پروانہ سے نمے داند	کف خونی مگر بر بال مرغ نامہ بر ریزد

بیت

شوق صد بار فزوں میکشدم ہر نفسے	این قدر مہر روا نیست کسے را بہ کسے

دیگر از حکایتہائے رنگین کہ بندہ شنیدہ آنست کہ آخوندے را گرفتہ بودند کہ کلاوہ ریسمان بخود داشت چوں پرسیدند گفت والدہ پیرے دارم بہ من دادہ است کہ اگر توانی بخون رافضی رنگین کن کہ چوں میرم کفن مرا بہ آں بدوزند۔ مولانا ظہوری نقل کردہ کہ روزے در باغ یکے از شرفائے دکن مطلع مجمعے بودہ و اقسام مردم بر کنار حوض نشستہ میداشتند بہ تقریبے یکے از اہالی ماوراء النہر گفتہ کہ فردا چہار یار بہ چہار گوشہ حوض کوثر نشستہ آب بمنان خواہند داد محمود صباح نیشاپوری درآں مجمع بود برخواستہ گفتہ نامعقول می گوید حوض کوثر مدور است و ساقیش حضرت مرتضٰے علی و گر بحتہ شیخ عطار فرمودہ

زنادانی دلے پُر جہل و پُر مکر	گرفتار علی ماندی و بوبکر	گر آں بہتر و ایں بہتر تراچہ
چو حلقہ ماندہ بر در تراچہ	چو یکدم زیں تخیل می نرستی	ندانم تا خدا را کے پرستی

اہل عالم در ہر دو لائے یکے از مردم را معبود خود ساختہ و از خدا غافل شدہ توجہ بآں شخصے دارند۔ در ولایت دکن اہل دکنیاں داور الملک رامے پرستند و در عوام مشہور بہ دار الملک است یکے از سپاہیان گجرات بودہ و ہمانجا کشتہ شد در لبست سی جا قبر بنام او ساختہ اند و ازدحام دارند۔

دیگر سید محمود گیسو دراز است و قبر او در گلبرگہ است کہ داخل جاگیر عادل خان است سابق در دہلی صومعہ مشیخت داشتہ سالے کہ حضرت صاحبقرانی فساد ہندوستان را شنیدہ متوجہ فتح آں بودند سید مذکور دکن آمدہ۔

ملا عبد اللطیف بریری بشوق عربی شگفتہ بودند و در برہانپوری بود و عرائض ایلچی علیخان را انشامیکرد نقل غریب بفقیر گذرانیدہ کہ یکے از اولاد سید محمود گیسو دراز حضرت اللہ نام دارد و پیش ازیں یکسال در برہانپور آمدند خادم از پیش من آمد کہ حضرت اللہ آمدند و دعا میرسانند و می فرمایند کہ کجا فرود می آئیم گفتم خوش آمدند و صفا آوردند درخانہ خود فرود آیند۔ روز ملاقات بہ ملا عبد اللطیف گفت کہ میدانید کہ من کیستم حضرت مریم را

برعرش بردند و حضرت میر سید گیسو دراز را حاضر ساختند وی بی بی با حضرت میران عقد بستند ما نتیجۂ ایشانیم۔ ملا عبد اللطیف میگوید که من گفتم عجب است که پانت شریف نه بردند گفت آں ولایت براد رما ست معلوم نیست که مردم آنجا سلوک لائق بما کنند یا نه بنده از خواجه نظام الدین احمد نام ایں برادر عیسے مکرر شنید غالباً به گجرات ہم رفته بود ٭

دیگر شنیده شد که تحریر نام حکیمے بود نظام الملک بحری اورا از فرنگ طلبیده اعتقاد کرده بود که روزے ایں حکیم در مجلس او از خواجگی شیخ شیرازی که از دانشمندان مشهور است و از شاگردان خواجه جلال الدین محمود پرسید که اگر سر دنیا آتش افروزند و مانعے نباشد از کوه و تل آں آتش دیده میشود و آنکه میگویند که تحت فلک قمر کرۂ آتش هست چرا دیده نمے شود باآنکه مانعے نیست خواجگی شیخ جواب دادند که از جهت بُعد مسافت دیده نمیشود حکیم فرنگی نظام الملک گفت اگر حکم شود رقص کنم که ایں سخن صد رقص دارد ہماں ساعت شاه طاهر رسیده پرسید سخن میگذرد تقریر کردند گفت خواجگی شیخ غلط کرده همه عناصر بسیط اند و مرئی نمے شوند ایں آتش که مرئی مے شود بجهت ترکیب اوست جزائے ارضی ٭

دریں دیار نام حکیم مصری بسیار است و کارنامهائے علاج او بے شمار الحق بایں دانائی و دقیقه رسی و تشخیص امراض و تحقیق معالجات و تصرف صریح در مزاج۔ و حدس کامل و تامل تمامی و عقل درست و دیانت تمام و درستی کلام و مهربانی عموم و تجربۂ بسیار۔ و میمنت دست و پے یعنی خال و شگفتگی طبع و کشادگی پیشانی و مبارکی روئے امروز طبیبے مثل او نشان نمے دهند و حکیم مشهور آفاق بودند۔ یکے حکیم عماد الدین محمود او در میست که در مشهد رحلت نموده دیگرے حکیم کمال الدین حسین او را خان احمد گیلانی از عراق طلبیده بود پیش او قانون می خواند پیرانه سال سفر کرد حکیم ابو الفتح که شاگرد رشید حکیم عماد الدین محمود بود غریب دریافتے و رسائی در همه چیز داشت طبے یک گوشه فضائل او بوده نادره زماں بود بنده او را دیده بودم۔ سهم الغیب در طالع داشت و در ایام مرض زائچه طالع همیشه حاضر میداشت اتفاقاً در ہماں چند روزه ماگرفته بود در برج طالعش و ایں خطرناک میباشد یک بار در ایام بیماری گنگا دهر گفت از اوضاع کواکب معلوم میشود که علاجے که میکنند نه علاج ایں مرض است۔ بهتر ازیں در علاج فکر نه کنید اما چوں قضا رسیده باشد دوا برعکس نتیجه میدهد چنانچه مولوی معنوی فرموده ـ

روغن بادام خشکی مے نمود	از قضا سرکنگبین صفرا فزود

حکیم همام استاد دیده است و اجازت نامهائے استادان دارد و به بنده نموده بود و از عمل و حدس و صداقت و علم و فضل او بسیار می گفتند نوشته والحق چنیں است و غریب فطرة عالی دارد و نظر حضرت کیمیاے و کمال بخش مستعد آگست خوشا صاحب استعدادے که آئینۂ فطرت او بخاک ایں آستاں انجلا یابد حق سبحانهٗ آں حضرت را برائے تکمیل خلایق دیرگاه دارد مستعدان هفت اقلیم آرزومند آستاں بوس اند و صیت غریب پروری

و دانا نوازی حضرت به مغرب و مشرق رسیده و اقبال آں حضرت مقناطیس دلہاست ؛
این جا دو طبیب اند پیش نظام الملک یکے حکیم کاشی داو چیزے نخوانده و اسمے بر خود بسته و بد نیست که اینجا شاید حکیم مصری می شناخته باشد و دیگرے حکیم علی گیلانی ست وسطی مائل بادنے سالے شد که از شیراز آمده و دیگر جمعے از ہندیاں رمی اند و کسے که او امتیازے داشته باشد نیست و این حکیم علی گیلانی شاگرد حکیم میر فتح الله شیرازی است و مدتیست که تعریف حکیم فتح الله شنیده میشود و بقدر حالتے دارد پارسال او را جانی بیگ ٹھٹه چہل تومان فرستاد از شیراز طلبیده بود و الحال در ٹھٹه است اگر بجان خاناں حکم میشود که بدرگاه فرستد سرفرازی اوست و از آنجا راه شیراز ہم نزدیک است و مردم تردد میکنند اگر تقیادنسا به را حکم طلب شود بنده نوازی است ؛
از مردم بلاد و طالب علم که فی الجمله امتیازے داشته باشد کسے در دکن نیست ملا محمد قاسم از طالبعلماں زبوں ہر دیست میگویند که پیش میر فتح الله و مولانا مرزا جان شاگردی کرده اما بوئے از ایشاں ندارد و چند غریب مفلوک گدا مشرب از جبل عامل و نجف و کربلاے ہستند که شیعه اند و باقی دکنیاں قدیم بعضے سنی و بعضے شیعه اند و اکثرے از حبشی زادہا اعتبار دارند و بزرگ اند و پدران اینہا کلاں بودند و کسے که معتبر باشد خال خال ست عرضداشت تا بایں جا رسیده بود که قاصدان فقیر از جاے که نظام الملک است رسیدند آنچه بتازگی روے نمود آنست که باقر علوی نظام الملک با پانزده ہزار سوار بایں ولایت آمده یک قصبه را سوخته و تاراج کرده در بست کروہے شہر رسیده و تفرقهٔ غریب در شہر و حوالے راه یافته بعضے میگویند که بشہر میرسد و بعضے میگویند که بیرار میرسد که حاکم آنجا سیف الملک یا اُذبکے ست و راجی علی خاں ہم برین است و این ساختگی ست و بعضے میگویند بملازمت شاہزادهٔ عالمیان مے رود و نظام الملک جمعے کثیر از دنبال فرستاده و خود ہم در مقام آمدن است که بزودی خود را بشہر رساند و عادل شاه کارش بوجود در تزلزلست ؛
و دیگر دلاور خاں حبشی ده دوازده سال بیجاپور را بنوعے ضبط کرده بود که ایں عادل خاں بے گفته او آب نمیتوانست خورد و بیروں نمے توانست آمد و اہل بیجاپور تمام از دست بدبختی او به جاں آمده بودند و خلقے را به تنگ داشته پارسال جمعے کثیر ہجوم کرده به اشاره عادل خاں میخواستند که او را بگیرند گریخته ایں جا آمد ہمراه نظام الملک بود در نیولا عادل خاں از آنجا قول و عہد فرستاده طلبید که او امیدوار شده رفت در ساعت چشم او را کندند و اموال می طلبید و او پسرے داشت محمد خاں نام که عادل خاں آرزو میکرد که بطرز جاہائے او بر آبش بدوزند و صورتے نمے یافت او را ہم چشم می کنند از دہشت قالب تہی کرد دریں دو روز وحشتے است

دریں شہر و فتنہ خیزی کہ بہ شرح راست نمے آید۔ ع

نہ پاے رفتن و نے جائے ماندن است مرا

چُوں بہ حکم حضرت آمدہ و در وقت پائے بوس رُخصت دست حضرت بہ پشت بندہ رسید بہمانی سبب مبارک حضرت را حصار خود دانستہ با توکلے درست و اخلاص کابل و دِلے آزاد و نظرے راست بر متکائے ادب نشستہ است و توجہ باطن را بیاد قدرت خود و خداوند خود پیوستہ ہموارہ سایۂ عدالت و جلالت آن حضرت بر نزدیکاں و دوراں شاہ درجمیع حوادثات زمانی باد +

آزاد۔ اگرچہ مَیں نے کتاب مذکور میں سے فقط دو عرضیاں لکھی ہیں۔ مگر اسکے مطالعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) یہ کہ کس قدر صاف اور سلیس لکھتا ہے۔ اور کلام میں شیرینی اور لذّت خدا داد ہے +

(۲) اس عہد کے ملازم اپنے بادشاہ کے ساتھ کس آداب و تعظیم کے لباس میں ادائے مطلب کرتے تھے۔ اور تعظیم کے علاوہ دلداری اور دلربائی کا اثر کس قدر بھرتے تھے جس کی ہم ہجو کرنا چاہیں تو فقط اتنا کہنا کافی ہے کہ خوشامد۔ خوشامد! مگر میں کہتا ہوں کہ خوشامد ہی سہی مگر یہ خوشامد بھی قصداً نہ تھی۔ اُن کے دل اس قدر احسانوں سے لبریز ہو رہے تھے کہ تمام خیالات خوشامد اور دُعائیں ہو کر دل سے چھلکتے تھے +

(۳) ان خطوں کو پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ان کا ایک شگفتہ مزاج خوش باش آدمی ہے خط لکھ رہا ہے اور مُسکرا رہا ہے +

(۴) تم خیال کرو تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں جو ملازم کسی خدمت پر جاتے تھے تو روزِ رخصت سے لیکر منزلِ مقصود تک جو جو باتیں مُفید و متعلق اپنے آقا کے مشاہدہ میں آتی تھیں سب کا پہنچانا داخلِ خدمت تھا۔ یہ نہ تھا کہ جس کام پر مامور ہوئے اسی کام کی نیت اور اُسی منزل کی سیدھ باندھی اور چلے گئے۔ ایک بیمار کی رپورٹ بھیج دی کہ کام اس طرح سرانجام ہوگیا اور بس۔ اور سبب اس کے ظاہر ہیں +

(۵) اس عرضی میں اور عرائض بھی تم دیکھو گے عبداللہ ازبک والئے توران اور شاہ عباس والیٔ ایران اور تعلقات شاہِ روم کے اخبار پر بہت اٹکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو ان کا بڑا خیال ہوگا۔ اور وہ فقط سندھ اور کابل و کشمیر کے قوس میں گردش کر کے اُن کے خیالات پر نظر نہ رکھتا تھا۔ بلکہ سمندر کا پھیر کھا کر اُن کا پتہ لگاتا تھا۔ دیکھو فیضی کی ایک انشا جو فقط عبارت آرائی کے شوق سے کسی نے جمع کر دی تھی اس سے یہ نکتے کھلے۔ ورنہ اور امرا جو ادھر کی سرحد کے علاقوں پر تھے۔ یہ باتیں ان کی خدمت کا جزو ہونگی۔ افسوس وہ تحریریں ایسی نیست و نابود ہوئیں کہ ہمیں اُن تک پہنچنے کی اُمید بھی نہیں ہوسکتی +

(۶) تمھیں یاد ہوگا کہ اکبر کا جہازی شوق (جہازرانی کا) یہاں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسے لنگر گاہوں

اور سمندر کے کناروں پر قبضہ کرنے کا بڑا خیال تھا اور ہر پہلو سے دریائے قوت کو بڑھاتا تھا۔ اور یہ خیال فقط شاہانہ شوق نہ تھا۔ بلکہ نظام سلطنت اور ملکی مصلحت پر تھا +

(۷) تم نے دیکھا؟ اثنائے راہ کے شہروں کا گزیٹیر لکھتا جاتا ہے۔ بعض شہروں کی صورت حال لکھتا ہے۔ ان کے مشہور مقاموں کی تاریخ لکھ دیتا ہے۔ ان کی پیداواریں لکھتا ہے۔ کہاں کیا کیا چیزیں عمدہ بنتی ہیں۔ یہ بھی لکھ دیتا ہے۔ اس میں دلربائی بھی چلی جاتی ہے۔ کہ کپڑے کے کارخانے میں حضور کے لئے دستار اور پٹکے بن رہے ہیں۔ مگر وہی باتیں لکھتا ہے جو ابھی بادشاہ تک نہیں پہنچیں۔ ہر شہر کے علما و فضلا وحکما اور اہل کمال کا حال لکھتا ہے۔ اور ان کی تعریف میں وہ الفاظ خرچ کرتا ہے۔ جن سے ان کے جوہر اصلی کھل جائیں۔ اور معلوم ہو جائے کہ وہ اس کے ڈھب کے ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس درجہ پر ہیں۔ اور کتنی قدر دانی کے قابل ہیں۔ ہر شہر کی مشہور درگاہوں کا حال لکھتا ہے۔ اس میں جہاں جگہ پاتا ہے۔ ظرافت کا گرم مصالحہ بھی چھڑکتا جاتا ہے۔ اور تین سو برس کے بعد آج ہمیں خبر دیتا ہے کہ اکبر کن کن باتوں کا طلبگار تھا۔ اور اس کا عہد کیسا عہد تھا ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد　　　کسے را با کسے کارے نباشد

(۸) اس کے اشعار اور لطائف وظرائف کو پڑھکر اکبر کی طبیعت کا تصور بندھ جاتا ہے کہ وہ کن خیالات کا بادشاہ تھا۔ اور دربار اکبری کے اراکین جب اس کے گرد جمع ہوتے ہونگے تو ایسی ہی باتوں سے اُسے خوش کرتے ہونگے ✤

(۹) تم نے شیعہ سُنی کے لطیفے بھی دیکھے۔ انہیں پڑھکر صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلطی ہے اُن لوگوں کی جو کہتے ہیں کہ فیضی وفضل شیعہ تھے یا شیعوں کے طرفدار تھے۔ یہ جب اکبر کے گرد بیٹھتے ہونگے اور شیعوں اور سُنیوں کو جھگڑتے دیکھتے ہونگے تو ہنستے ہونگے کیونکہ اصل معاملہ کو سمجھے ہوئے تھے۔ جانتے تھے کہ بات ایک ہی ہے۔ تنگ چشم۔ کم حوصلہ۔ سخن پرور ضدیوں نے اور بھوکے پلاؤ خوروں نے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کر دئے ہیں +

(۱۰) اس کے آبدار کلام سے خصوصاً اس خط سے جو مُلّا صاحب کی سفارش میں لکھا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو اُن کے مخالف رائے تھے بلکہ عنادی مخالفت رکھتے تھے۔ ان سے بھی مخالفت فقط اتنی بات پر ختم ہو جاتی تھی کہ خیر تمہاری رائے یہ ہے ہماری رائے یہ ہے۔ ان کی مخالفت رائے انہیں عداوت اور کینہ وری اور انتقام کے درجے پر نہ پہنچاتی تھی جبھی ہر صحبت میں خوش بیٹھتے تھے اور خوش ہو کر اُٹھتے تھے۔ خدا ہمیں بھی خوش رہنے والی اور خوش رکھنے والی طبیعت روزی کرے +

شیخ عبدالقادر بدایونی امامِ اکبر شاہ

امام اکبر شاہ کہلاتے تھے۔ اور علمائے عصر میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے۔ ترجمہ اور تالیف میں اکبر کی فرمائشوں کو عمدہ طور پر سرانجام کرتے تھے۔ اسی خدمت کی بدولت ان کے جواہر معانی صفائی بیان کے رنگوں میں جگمگائے اور ان کی کثرت تصانیف نے ہی عمدگی سے الماری کے درجۂ اوّل پر قابض ہوگئی۔ جو تاریخ کہ ہندوستان کے حالات میں لکھی ہے۔ وہ اکبر کے دربار اور اہل دربار کے حالات سے تاریخی عبرتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مہماتِ سلطنت اور کاروبار زمانہ کو خوب سمجھتے تھے +

فاضل مذکور میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص کے خصائل اور جزوی جزوی عادات اور اطوار کو چنتے ہیں اور اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ جب پڑھو نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اہل ذوق دیکھینگے اور جہاں تک ممکن ہوگا میں دکھاتا جاؤنگا کہ وہ امرائے دربار میں جس کے برابر سے نکلتے ہیں ایک چٹکی ضرور لیتے جاتے ہیں۔ اُمرائے دربار سے ان کا اس قدر بگاڑ نہ ہوتا۔ مگر اس کا سبب یہ تھا کہ اُنہوں نے مُلّائی کے دائرے سے قدم نکالنا نہ چاہا اور اسی کو دُنیا کا فخر اور دین کی دولت سمجھا۔ انہیں کبھی تو بے علم یا کم لیاقت لوگ مراتب عالی پر نظر آئے۔ اور یہ ناگوار گزرا۔ اکثر چھوٹے تھے کہ آنکھوں کے سامنے بڑے ہوئے یا برابر سے آگے بڑھ گئے۔ کبھی باہر سے آئے۔ اور مختلف خدمات کی سنہری مسندوں پر بیٹھ کر صاحب جاہ وجلال ہوگئے۔ اور یہ مُلّا کے مُلّاہی رہے۔ ایسے لوگوں کو ان کی فضیلت علمی ضرور خاطر میں نہ لاتی ہوگی۔ بلکہ چاہتی ہوگی کہ میرا ادب پیش نگاہ رکھیں۔ ادھر دولت اور حکومت کو اتنا دماغ کہاں؟ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ ایسے موقع پر دونوں طرف سے کوتاہیاں اور قباحتیں ہوتی ہیں۔ اہل علم کو تو ان پر غصہ ہونے کے لئے کوئی سبب درکار ہی نہیں فقط اہل دول کی سواری اپنے جاہ وحشم کے ساتھ برابر سے نکل جانی کافی ہے۔ اگر وہ اپنے کاروبار کے افکار میں غلطاں وپیچاں جاتے ہوں تو بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ رے تمہارا غرور آنکھ بھی نہیں ملاتے کہ ہم سلام ہی کرلیں۔ امارت کے تو مالک بن گئے۔ بھلا کوئی دو سطریں ہم لکھ دیں پڑھ بھی لوگے؟ اور اہل دول میں بھی اکثر کم ظرف ہوتے ہیں کہ جب کسی درجے پر پہنچتے ہیں۔ تو اپنا سلام علما کے ذمّہ فرض سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس پر قناعت نہ کرکے چاہتے ہیں کہ ہماری درباداریاں کریں۔ اور چونکہ بادشاہ کی خلوت جلوت میں دخل رکھتے ہیں اُنہیں ان غریبوں کے کاروبار میں بولنے کے لئے بہت موقع ملتے ہیں چنانچہ کبھی ان کے کاموں میں خلل ڈالتے ہیں۔ کبھی ان کی تصانیف پر جس کی عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے ناک بھوں چڑھا دیتے ہیں۔

اور مصنف کے دل سے کوئی پوچھے تو اس کے دین و دُنیا کی کائنات وہی ہے کبھی نالائق کو لاکر ان سے بڑھا دیتے ہیں۔ اور اپنے ہم جنسوں کی سفارشوں کو رفاقت میں لیکر انہیں آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ یہ باتیں رفتہ رفتہ دشمنی کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اور جب کہیں ان کا مقدمہ پیش پاتے ہیں تو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر خراب کرتے ہیں غریب اہلِ علم سے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں قلم اور کاغذ پر ان کی حکومت ہے۔ یہ بھی جہاں موقع پاتے ہیں۔ اپنے گھِسے ہوئے قلم سے وہ زخم دیتے ہیں کہ قیامت تک نہیں بھرتے۔

ان کی تاریخ اپنے مضمون و مقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ الماری کے سر پر تاج کی جگہ رکھی جائے۔ سلطنت کے عموی انقلاب اور جنگی مہمات سے ہر شخص آگاہ ہو سکتا ہے لیکن صاحب سلطنت اور ارکانِ سلطنت میں سے ہر ایک کے اطوار و اسرار اور نہاں و آشکار سے جو وہ آگاہ تھے۔ دوسرا نہ ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تصنیف کے سلسلے اور فضائل علمی۔ اور علم مجلسی وغیرہ ان کے اوصاف۔ اکبر کی خلوۃ و دربار میں ہمیشہ پاس جگہ حاصل کرتے تھے اور ان کے معلومات اور حسنِ صحبت کے لطائف سے امرائے دربار اپنی دوستانہ صحبتوں کو گلزار کرتے تھے۔ علما و فقرا اور مشائخ تو ان کے اپنے ہی تھے۔ لطف یہ ہے کہ انہیں میں بستے تھے۔ مگر خود ان کی قباحتوں میں آلودہ نہ ہوتے تھے۔ دُور کے دیکھنے والوں میں تھے۔ اس لئے انہیں حُسن و قبح خوب نظر آتا تھا۔ اُونچی جگہ پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے ہر جگہ کی خبر اور ہر خبر کی تہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اکبر اور ابوالفضل و فیضی اور مخدوم و صدر سے خفا بھی تھے۔ اس لئے جو کچھ ہوا صاف صاف لکھ دیا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ طرز تحریر کا بھی ایک ڈھب ہے۔ یہ خوبی ان کے قلم میں خداداد تھی۔ ان کی تاریخ میں یہ کوتاہی ضرور ہے کہ مہمات اور فتوحات کی تفصیل نہیں۔ اور واقعات کو بھی مسلسل طور پر بیان نہیں کیا۔ لیکن اس خوبی کی تعریف کس قلم سے لکھوں کہ اکبری عہد کی ایک تصویر ہے۔ جزئیات اور اندرونی اسرار ہیں کہ اور تاریخ نویسوں نے مصلحتاً یا بے خبری سے قلم انداز کر دئے۔ ان کی بدولت ہم نے سارے عہد اکبری کا تماشا دیکھا۔ باوجود ان باتوں کے جو کم نصیبی انکی ترقی میں سنگ راہ ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ زمانے کے مزاج سے اپنا مزاج نہ ملا سکتے تھے۔ جس بات کو خود بُرا سمجھتے تھے۔ اسے چاہتے تھے کہ سب بُرا سمجھیں اور اسے عمل میں نہ لائیں جس بات کو اچھا سمجھتے تھے اسے چاہتے تھے کہ اسی طرح ہو جائے۔ قباحت یہ تھی کہ جس طرح طبیعت میں جوش تھا اسی طرح زبان میں زور تھا۔ اس واسطے ایسے موقع پر کسی دربار اور کسی جلسے میں بغیر بولے رہا نہ جاتا۔ اس عادت نے مجھ ناقابل کی طرح ان کے لئے بھی بہت سے دشمن بہم پہنچائے تھے۔

وہ حقیقت میں مذہبی فاضل تھے۔ فقہ۔ اصول فقہ اور حدیث کو خوب حاصل کیا تھا۔ عشق کی حرارت سے دل گداز تھا۔ تصوف سے طبعی تعلق تھا۔ علوم عقلی کو پڑھا تھا۔ مگر اس کا شوق نہ تھا۔ زیادہ تر عادتیں اس لئے

بگڑی تھیں کہ ان کی فضیلت نے شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانے میں پرورش پائی تھی۔ ان بادشاہوں کا خیال قدیمی اصول کے بموجب یہ تھا کہ ہندوستان وقفل کا ملک ہے ہم اہل اسلام ہیں۔ مذہب کے زور سے اتحاد اور اتفاق پیدا کریں۔ جب ان پر غلبہ اور قدرت پائینگے مصنف مذکور اگر اس عہد میں ہوتا تو خوب رونق پاتا۔ مگر اتفاقاً زمانہ کا ورق اُلٹ گیا۔ اور آسمان نے اکبر کے اقبال کی قسم کھائی۔ اکبر کے ہاں بھی پندرہ برس تک قال اللہ اور قال الرسول کے چرچے رہے۔ اور اہل علم اور اہل فقر کے گھروں میں رات شب قدر اور روز نوروز ہوتے رہے مگر مسائل علمی کے ہجوم میں کبھی کبھی معقولات بھی دربار میں گھس آتے تھے معقول بادشاہ کو معقولات کی معلومات کا بھی شوق پیدا ہوا۔ ہر ایک زبان۔ ہر ایک مذہب اور ہر علم کے عالم دربار میں آئے۔ بلکہ قدر دانی سے بُلائے گئے پہلے شاعری کی سفارش سے فیضی آئے۔ ان کا دامن پکڑ کر ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ بہت سے فاضل ایران و توران کے پہنچے۔ اسی ضمن میں یہ بھی ثابت ہوا کہ مذہب کا اختلاف جس نے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو گروہ باندھ باندھ کر ایک کو دوسرے کے لہو کا پیاسا کر دیا ہے نہایت خفیف اور اعتباری فرق ہے اور اس اختلاف میں زیادہ کاوش کریں۔ تو بنی آدم یعنی ایک دادا کی اولاد میں تلوار درمیان آجاتی ہے۔ اور بہشت اور دوزخ کا فرق جا پڑتا ہے۔ اس لئے اکبر کے خیالات بدلنے شروع ہوئے۔ اُس نے کہا انسان اُنس سے نکلا ہے خدا نے اسے مل کر رہنے کو بنایا ہے۔ اس لئے ملنساری اور اتحاد و ارتباط کو اصول سلطنت قرار دینا چاہیئے۔

پُرانے عالم پُرانی باتوں کے خوگرفتہ تھے۔ اُنہیں یہ باتیں ناگوار ہوئیں۔ اکبر نے اُنہیں رستہ پر کھینچنا چاہا۔ انہوں نے گردنیں سخت کیں ناچار یا توڑنا یا بیچ سے ہٹانا واجب ہوا۔ ان خیالات کی ابتدا تھی جو فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ اس نے اوّل اوّل ترقی کے قدم خوب بڑھائے۔ یہ نوجوان عالم اپنے علم کے جوش اور ترقی کی اُمنگ میں تھا۔ بڈھے ملاؤں کو اور ان کی بڈھی تعلیم کو توڑ توڑ کر اکبر کو خوش کیا۔ مگر یہ نہ سمجھا کہ اصل میرے اور بڈھوں کے ایک ہیں۔ اور اب زمانے نے نیا مزاج پکڑا ہے۔ انہیں توڑونگا تو ساتھ ہی آپ بھی ٹوٹ جاؤنگا غرض کچھ تو اس سبب سے کہ اُس نے پُرانی تہذیب کے دامن میں پرورش پائی تھی اور کچھ اُس کی طبیعت بھی ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ اسلئے وہ نئے زمانے میں پُرانے مسائل کو واجب العمل سمجھتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مخالفت شروع ہوئی۔ اور چونکہ فقط فضل و فیضی (اسکے خلیفہ اور اُستاد بھائی) ہی نئے خیالات نکلتے تھے بلکہ زمانہ کا مزاج بدلا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے مزاج نے کسی سے موافقت نہ کھائی۔ اسکی تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زمانہ سے لڑائی باندھے بیٹھا ہے۔ مخدوم الملک اور شیخ صدر شریعت کا ٹھیکہ لئے ہوئے تھے۔ مگر وہ انہیں بھی قابل موافقت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ دیانت اور امانت اور سچے دل سے

شریعت کی پابندی چاہتا تھا۔ اور ان بزرگوں کا حال جو کچھ تھا وہ معلوم ہوا اور کچھ اس کے حال میں معلوم ہو جائیگا۔ یہی سبب ہے کہ یہ دو نو بلکہ کوئی مشہور عالم یا نامی عارف نہیں جو اسکے شمشیر قلم سے زخمی نہ ہوا ہو +

تعجب یہ ہے کہ مُلّا صاحب خود رُوکھے سُوکھے عالم تھے۔ مگر طبیعت ایسی شگفتہ و شاداب لائے تھے۔ جو انشاپردازی کی جان تھی۔ باوجود علم و فضل اور مشیخت فقر کے گاتے بجاتے تھے۔ بین پر بھی ہاتھ دوڑاتے تھے شطرنج دو دو طرح کھیلتے تھے جس سے عوام کہتے ہیں۔ ہر فن مولا تھے۔ بہر حال وہ اپنی کتاب میں ہر ماجرے اور ہر معاملے کو نہایت خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ اور اس کی حالت کی ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ کوئی نکتہ اس کا باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کی ہر بات چٹکلا اور ہر فقرہ لطیفہ ہے۔ ہزاروں تیر اور خنجر اس کے شگافِ قلم میں ہیں۔ اس کی تحریر میں عبارت آرائی کا کام نہیں۔ ہر حال کو بے تکلف لکھتا چلا جاتا ہے اور اس میں جدھر چاہتا ہے سُوئی چبھو دیتا ہے جدھر چاہتا ہے نشتر۔ جدھر چاہتا ہے چھری چاقو۔ چاہتا ہے تو ایک تلوار کا ہاتھ جھاڑ جاتا ہے۔ اور اس خوبصورتی سے کہ دیکھنے والا تو درکنار زخم کھانے والا بھی لوٹ ہی جاتا ہوگا۔ خود اپنے اُوپر بھی پھبتیاں اور نقلیں کہتا جاتا ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اصلی حال کے لکھنے میں دوست دشمن کا ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو بُرا کہتا ہے۔ وہ بھی جہاں اپنے ساتھ سلوک کرتے ہیں لکھ دیتا ہے۔ جب کسی بات پر خفا ہوتا ہے تو وہیں صلواتیں سُنانے لگتا ہے ؎

وہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔ جب میں حسب الحکم بادشاہی ملا شاہ محمد شاہ آبادی کی تاریخ کشمیر کو درست کر چکا تو ۹۹۹ھ تھے۔ اس وقت اسی رنگ میں ایک تاریخ لکھنے کا خیال آیا۔ مگر **آزاد** کو کتاب کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی لکھتے گئے ہیں۔ اور رکھتے گئے ہیں۔ اخیر وقت میں سب کو مسلسل کیا ہے۔ اور خاتمے کو پہنچایا ہے۔ کیونکہ ابتدا میں جو اکبر کا حال لکھا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔ اور اخیر بیان سے ناراضی برستی ہے۔ فقرا اور علما اور شعرا کے حال جو خاتمے میں لگائے ہیں۔ یہ غالباً سب اخیر کے لکھے ہوئے ہیں کہ بہتوں کی خاک ہی اُڑائی ہے۔ اور زیادہ تر تصدیق میرے خیال کی اس درد انگیز بیان سے ہوتی ہے۔ جو میں نے ایک اور مقام میں درج کیا ہے۔ مُلّا صاحب خود فرماتے ہیں کہ خواجہ نظام الدین نے جو ۳۸ برس کا حال اکبر کا لکھا ہے۔ وہاں تک کے حالات مہماتِ بادشاہی اس سے لئے ہیں۔ باقی دو برس کا حال میں نے خاص اپنی معلومات سے لکھا ہے۔ اب جو نکتے میں نے مجمل لکھے ہیں ان کی تفصیل اور اپنے خیالوں کی تصدیق مُلّا صاحب کے حالات سے کرتا ہوں ؎

فاضل مذکور اگرچہ بداؤنی مشہور ہیں۔ مگر موضع ٹونڈہ[۱] میں پیدا ہوئے کہ بساور کے پاس ہے۔

---

[۱] آگرے سے اجمیر کو جاتے ہوئے پہلی منزل منڈاکر۔ ۲ فتحپور۔ ۳ خانوہ متصل بھونہ۔ ۴ کروہیہ۔ ۵ بساور۔ ۶ ٹونڈہ +

اسے ٹونڈہ بھیم بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ بادشاہوں کے عہد میں سرکار آگرہ میں تھا۔ اور صوبۂ اجمیر سے بھی متعلق رہا۔ ان کی ننیال بیانہ میں تھی جو آگرہ اور اجمیر کی سڑک کے کنارے پر ہے۔ وہ خود شیر شاہ کے حال میں اس کے عدل اور حسن انتظام کے حالات لکھتے لکھتے کہتے ہیں جس طرح پیغمبر صاحب نے نوشیرواں کے زمانے پر فخر کر کے فرمایا ہے کہ بادشاہ عادل کے زمانے میں میری ولادت ہوئی ہے۔ الحمدللہ میں بھی اس بادشاہ کے عہد میں ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ (۲۱ اگست ۱۵۴۰ء) کو پیدا ہوا۔ ساتھ ہی نہایت شکستہ دلی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ باوجود اس کے کہتا ہوں کہ کاش اس گھڑی اور اس دن کو سال و ماہ کے دفتر سے مٹا دیتے تاکہ میں عدم کے خلوت خانے میں عالم خیال اور عالم مثال کے لوگوں کے ساتھ رہتا۔ کوچہ ہستی میں قدم نہ رکھنا پڑتا۔ اور یہ رنگا رنگ کی مصیبتیں نہ جھیلنی پڑتیں جو دین دنیا کے ٹوٹنے کی نشانیاں ہیں۔ پھر آپ ہی عذر کرتے ہیں۔ استغفراللہ مجھ شکستہ خیال کی کیا مجال ہے کہ امر الٰہی میں دم مار سکوں۔ ڈرتا ہوں کہیں ایسی دلیر زبانی سے دین کے معاملے میں گستاخی نہ ہو جائے کہ وبال دوام کا ثمرہ دے۔ چنانچہ پیغمبر صاحب کے اور چند بزرگوں کے قول بھی اسی مضمون کے نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو خدا کو نہ بھائے اس سے توبہ ہے ؎

گل را چہ مجال است کہ گوید بہ کلال	کز بہر چہ سازی و چرا مے شکنی

انہوں نے شیر شاہ کی بڑی تعریف لکھی ہے کہتے ہیں کہ بنگالہ سے رہتاس پنجاب تک ۴ مہینے کا رستہ ہے اور آگرہ سے منڈو تک کہ مالوہ میں ہے۔ سڑک پر دو طرفہ میوہ دار درخت سائے کے لئے لگائے تھے۔ کوس کوس بھر پر ایک سرا۔ ایک مسجد۔ ایک کنواں بنوایا تھا۔ ہر جگہ ایک مؤذن ایک امام تھا۔ غریب مسافروں کے کھانے پکانے اور خدمت کے لئے ایک ہندو ایک مسلمان نوکر تھا لکھتے ہیں کہ اسوقت تک ۵۲ برس گذرے ہیں۔ اب بھی ان کے نشان باقی ہیں۔ انتظام کا یہ عالم تھا کہ ایک بڈھا پھوس اشرفیوں کا طباق ہاتھ پہ لئے چلا جائے۔ جہاں چاہے پڑ رہے۔ چور یا لٹیرے کی مجال نہ تھی کہ آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔ اور جس سال مصنف پیدا ہوا تھا۔ اسی سال شیر شاہ نے یہ حکم دیا تھا۔ [آزاد۔ قلعۂ رہتاس کو اس نے عملداری کی سرحد قرار دیا تھا۔ اور اس کا استحکام کیا تھا کہ گکھڑوں کے زبردست صدموں کے لئے سد راہ رہے۔ قلعۂ مذکور جس پہاڑ پر ہے۔ زمانہ قدیم میں کوہ بالناتھ کہلاتا تھا۔ اب ضلع جہلم سے متعلق ہے] ◆

ملا صاحب نے بساور میں پرورش پائی۔ اور اکثر جگہ محبت کے ساتھ اسے اپنا وطن کہتے ہیں بزرگوں کا حال کہیں مفصل نظر سے نہیں گزرا۔ خاندان امیر نہ تھا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ فاروقی شیخ تھے۔ اور ددھیال ننھیال دونو صاحب علم اور دیندار گھرانے تھے۔ علمی اور دینی نعمتوں کی قدر پہچانتے تھے۔ ان کے

والد ملوک شاہ ابن حامد شاہ بھی..... شرفا میں گنے جاتے تھے۔ اور شیخ بجو سنبھلی کے شاگرد تھے۔ اور معمولی کتابیں عربی و فارسی کی پڑھی تھیں۔ ان کے نانا مخدوم اشرف تھے۔ سلیم کے عہد میں فرید تارن ایک پنجہزاری سردار بجواڑہ متصل بیانہ صوبہ آگرہ میں تھا۔ اس کی فوج میں ایک جنگی عہدہ دار تھے۔ بغرض فاضل مذکور ۹۵۲ھ سے ۹۶۰ھ تک اپنے والد ملوک شاہ کے دامن میں رہے۔ پانچ برس کی عمر تھی۔ جب سنبھل میں قرآن وغیرہ پڑھتے رہے۔ پھر نانا نے پیارے نواسے کو اپنے پاس رکھا۔ اور بعض ابتدائی کتابیں اور مقدماتِ صرف و نحو بھی خود پڑھائے۔ فاضل بدایونی بچپن ہی سے ایک خوش اعتقاد مسلمان تھے اور اہلِ فقر کی صحبت کو نعمتِ الٰہی سمجھتے تھے۔ سید محمد مکّی ان کے پیر بھی وہیں رہتے تھے۔ وہ علم قرأت میں کامل تھے۔ اور ۷ قرأتوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ان ہی سے قرأت اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھنا سیکھا اس وقت ۹۶۰ھ سلیم شاہی دَور تھا۔ مگر یہ شاگردی بہت مُبارک ہوئی کہ ایک دن اسی کی سفارش سے دربار اکبری میں پہنچے۔ اور ۷ اماموں میں داخل ہو کر امامِ اکبر شاہ کہلائے ✦

خود لکھتے ہیں کہ ۱۲ برس کی عمر تھی کہ والد نے سنبھل میں آکر میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر کیا۔ ۹۶۱ھ میں کہ ۱۲ برس کی عمر تھی (اس سے معلوم ہؤا کہ ۹۴۹ھ میں پیدا ہوئے تھے) ان کی خانقاہ میں رہ کر قصیدہ بردہ یاد کیا۔ وظیفہ کی اجازت حاصل کی۔ اور فقہ حنفی میں کنز کے چند سبق پڑھے اور مُرید ہؤا اسی سلسلہ میں کہتے ہیں۔ میاں نے ایک دن والد مرحوم سے کہا کہ ہم تمہارے لڑکے کو اپنے اُستاد میاں شیخ عزیز اللہ صاحب کی طرف سے بھی کلاہ اور شجرہ دیتے ہیں۔ تاکہ علم ظاہری سے بھی بہرہ ور ہوں۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ فن فقہ اُنہوں نے خوب حاصل کیا۔ اگرچہ تقدیر نے اُنہیں اور شغلوں میں لگایا مگر وہ عمر بھر اسی کے ذوق شوق میں رہے۔ مُلّا صاحب کی تیزی طبع کی کیفیت اس بیان سے معلوم ہوتی ہے کہ عدلی افغان کے حال میں لکھتے ہیں۔ ۹۶۱ھ میں میاں کی خدمت میں آنے سے پہلے بادشاہی سرداروں نے بداین پر باغیوں سے لڑ کر فتح پائی۔ میری ۱۲ برس کی عمر تھی جبھی مَیں نے تاریخ کہی تھی۔ چہ بس خوب کردہ اند۔ اس میں ایک زیادہ تھا۔ جب میاں کی خدمت میں آیا تو ایک دن باتوں باتوں میں فرمانے لگے کہ ان دنوں میں یہ خبر سُن کر فی البدیہہ ہم نے کہہ دیا تھا۔ فتح ہائے آسمانی شد۔ دیکھو تو کتنے ہوتے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ ایک کم ہوتا ہے۔ فرمایا قدما کی رسم خط کے بموجب ایک ہمزہ اَور لگا دو۔ میں نے عرض کی ہاں پھر تو پُوری ہے ✦

شیخ سعد اللہ نحوی کہ فن مذکور میں بے مثل تھے۔ اور اسی سبب سے نحوی ان کے نام کا جُز ہو گیا تھا بیانہ میں رہتے تھے۔ جب فاضل مذکور نانا کے پاس آئے تو ان سے کافیہ پڑھا۔ ہیموں نے سر اُٹھایا اور

لشکر اس کا لوٹتا مارتا بساور پر آیا۔ یہ اس وقت سنبھل میں تھے۔ تمام بساور لُٹ کر برباد ہو گیا خود بڑے افسوس سے لکھتے ہیں کہ والد کا کتب خانہ بھی لُٹ گیا۔ دوسرا ہی برس تھا جو قحط کی مصیبت آئی۔ کہتے ہیں کہ بندگانِ خدا کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہزاروں آدمی بھوکوں سے مرتے تھے۔ اور آدمی کو آدمی کھائے جاتا تھا ✦

سنہ ۹۶۶ھ میں علم کے شوق نے باپ بیٹوں کے دلوں میں حبِ وطن کی گرمی کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور آگرہ میں پہنچے۔ مولینا مرزا سمرقندی سے شرح شمسیہ اور بعض اور مختصرات پڑھے۔ لکھتے ہیں۔ کہ یہ شرح میر سید محمد ولد میر علی ہمدانی کی ہے اور میر سید علی وہی شخص ہیں جن کی برکت سے خطۂ کشمیر میں اسلام پھیلا ✦

قاضی ابو المعالی بخارائی کو جب عبداللہ خاں اُزبک نے جلا وطن کیا تو وہ بھی آگرہ میں آئے۔ اُن کے جلاوطن کرنے کا قصہ بھی عجیب ہے۔ خود لکھتے ہیں۔ کہ جب علم منطق توران میں پہنچا۔ تو دیکھتے ہی لوگ بڑے شوق سے متوجہ ہوئے۔ مگر مصالحہ ایسا تیز لگا کہ سب فلسفی فیلسوف ہو گئے جب کسی نیکبخت سیاحبدل کو دیکھتے تو اس کی ہنسی کرتے اور کہتے۔ گدھا ہے گدھا۔ لوگ منع کرتے تو کہتے کہ ہم دلیل منطقی سے ثابت کر دیتے ہیں دیکھو ظاہر ہے کہ یہ لاحیوان ہے۔ اور حیوان عام ہے۔ انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو کہ اس سے خاص ہے وہ بھی نہیں۔ پھر گدھا نہیں تو کیا ہے۔ جب ایسی ایسی باتیں حد سے گذر گئیں۔ تو مشائخ صوفیہ نے فتوے لکھ کر عبداللہ خاں کے سامنے پیش کیا۔ اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام ہو گیا۔ اس میں قاضی ابو المعالی ملا عصام۔ ملا مرزا جان اور اکثر شخص بدعقیدہ ہو کر وہاں سے نکالے گئے۔ کہتے ہیں کہ چند سبق شرح وقایہ کے میں نے بھی قاضی ابو المعالی سے پڑھے اور حق یہ ہے کہ وہ اِس علم میں دریائے بے پایاں تھے۔ نقیب خاں بھی اس سبق میں شریک ہوئے ✦

آزاد۔ مبارک عہد اور مبارک وقت تھا۔ اکبر کی سلطنت کا طلوع۔ بیرم خاں کا دور شیخ مبارک کی برکتیں علم و کمال کی برکت علم و کمال پھیلانے لگی تھی کہ فاضل بداؤنی حلقۂ درس میں داخل ہو کر فیضی ابو الفضل کے اور نقیب خاں کے ہم درس ہوئے۔ شیخ مبارک کے ذکر میں خود فرماتے ہیں جامع اوراق عنفوان شباب میں آگرہ میں چند سال اُن کی ملازمت میں سبق پڑھتا رہا۔ الحق ان کا حق عظیم مجھ پر ہے۔ مہر علی بیگ سلدوز ایک جاں نثار خان خاناں اور نامی سردار اپنے زمانے کا تھا اُس نے ان باپ بیٹوں کو اپنے ہاں رکھا۔ مُلا صاحب کی شگفتہ مزاجی اور خوش صحبتی نے مہر علی کے دل میں محبت کو ایسی جگہ دی کہ ایک دم جُدائی گوارا نہ تھی۔ شیر شاہی سرداروں میں عدلی کا غلام جمال خاں چنار گڈھ کا حاکم تھا۔ اقبال اکبری کے دربار سے اس نے خود التجا کی کہ حضور سے کوئی شائستہ اور کارداں امیر یہاں آئیں تو قلعہ سپرد کردوں بیرم خاں نے مہر علی بیگ کا جانا تجویز کیا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم بھی چلو۔ یہ خود بھی مُلا تھے۔ اور مُلا کے بیٹے تھے

لہ دیکھو تتمہ صفحہ ۴۴۰

علم کے شوق نے اجازت نہ دی۔ اس نے ان کے والد اور شیخ مبارک کو مجبور کیا۔ اور یہاں تک کہا کہ یہ نہ چلیں گے۔ تو میں بھی جانے سے انکار کر دونگا۔ غرض پیایے دوست کی تمنا اور دونوں بزرگوں کے کہنے سے موافقت اختیار کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

عین برسات تھی۔ مگر دونوں بزرگوں کی رضا جوئی مقدم سمجھی باوجود نوسفری کے تحصیل علم میں خلل ڈالا اور سفر کے خوف خطر اٹھائے۔ قنوج۔ لکھنوتی۔ جون پور۔ بنارس کی سیر کرتا۔ عجائب عالم کو دیکھتا۔ جابجا مشائخ و علما کی صحبتوں سے فیض لیتا ہوا چلا۔ چنار میں پہنچے تو جمال خاں نے بڑی خاطر داریوں سے خاطر داریاں کیں۔ مگر دل میں دغا معلوم ہوئی۔ مہر علی بیگ نے ہمیں وہیں چھوڑا۔ آپ سیر مکانات کے بہانے سوار ہوا۔ اور صاف نکل گیا۔ جمال خاں بدنامی سے گھبرایا۔ ہم نے کہا "کچھ مضایقہ نہیں۔ کسی نے ان کے دل میں کچھ شبہ ڈالا ہوگا۔ خیر ہم سمجھا کرے آتے ہیں"۔ غرض اس پیچ سے یہ بھی نکل آئے۔ قلعہ پہاڑ کے اوپر ہے۔ نیچے دریا بڑے زور شور سے بہتا ہے۔ کشتی ایک جگہ بے قابو ہوگئی۔ مولینا آخر ملا تھے۔ بہت گھبرا کر لکھتے ہیں۔ کشتی بڑے خطرناک گرداب میں جا پڑی۔ اور دامن کوہ میں کہ دیوار قلعہ کے پاس تھی موجوں میں الجھ گئی۔ ہوا بھی ایسی مخالف چلنے لگی۔ کہ ملاحوں کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ اگر دشت و دریا کا خداوند ناخدائی نہ کرتا۔ تو کشتی امید گرداب بلا میں آکر کوہ اجل سے ٹکرا چکی تھی۔ دریا سے نکل کر جنگل میں آئے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری جو ہندوستان میں بڑے مشائخ سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پہلے اس جنگل میں اور پہاڑ کے دامن میں یاد الٰہی کے ساتھ گزران کیا کرتے تھے۔ ہم اس مقام پر گئے۔ ایک رشتہ دار ان کا آموجود ہوا۔ اس نے ساتھ لے جا کر غار دکھایا کہ یہاں ۱۲ برس تک بیٹھے رہے اور نباس پتے کھا کر زندگی کی ۞

آگرہ میں تھے۔ کہ ۹۶۹ھ میں والد کا انتقال ہوگیا۔ انکی لاش بساور میں لے گئے۔ اور تاریخ لکھی ؎

سرو فتر افاضل دوراں ملوک شاہ		آں بحر علم معدن احسان و کان فضل
چوں بود در زمانہ جہانے ز فضل ازاں		تاریخ سال فوت وے آمد جہان فضل

۹۷۰ھ میں خود سہسوان علاقہ سنبھل میں تھے۔ جو خط پہنچا کہ مخدوم اشرف نانا بھی بساور میں مر گئے۔ **فاضل جہاں** ان کے مرنے کی تاریخ ہوئی۔ لکھتے ہیں کہ میں نے اکثر جزئیات اور علوم غریبہ (منطق و فلسفہ) ان سے پڑھے تھے۔ اور ان کے بڑے بڑے حق میرے اور اہل علم کے ذمہ تھے۔ نہایت رنج ہوا۔ والد کا داغ بھی بھول گیا۔ برس دن کے اندر دو صدمے گزرے۔ بے فکر طبیعت پر عجب پریشانی گزری۔ دنیا کے فکر جن سے میں کوسوں بھاگتا تھا۔ یک مرتبہ چاروں طرف سے تن تن کر سامنے آئے۔ اور رستہ روک لیا۔ والد مرحوم میری طبیعت کی آزادی اور بے پروائی دیکھ دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ کہ یہ سارے ولولے اور شورشیں

تمہاری مجھ تک ہیں میں نہ ہونگا تو دیکھنے والے دیکھیں گے۔ کہ تم کیسے بے قید رہتے ہو۔ اور دُنیا اور دُنیا کے کاروبار کو کیونکر ٹھوکر مار کر چھوڑ دیتے ہو۔ آخر وہی ہوا کہ اب دُنیا ماتم خانہ نظر آتی ہے۔ مجھ سے زیادہ کوئی ماتم زدہ نہیں۔ دو غم ہیں۔ اور دو ماتم ہیں اور میں اکیلا ہوں۔ ایک سر ہے دو خمار کی طاقت کہاں سے لائے ایک سینہ دو بوجھ کیونکر اٹھائے ۔

بٹیالی میں امیر خسرو پیدا ہوئے ہیں یہ علاقہ حسین خاں کی جاگیر میں تھا۔ لکھتے ہیں ۹۷۳ھ میں یہاں پہنچ کر حسین خاں سے ملے۔ جوانی کے ذوق اور ہمت کے شوق نے دربارشاہی کی طرف دھکیلا۔ مگر اُس افغان دیندار کی مُحبت ایمانی اور خوبیوں کی کشش نے رستے میں روک لیا۔ خود لکھتے ہیں یہ شخص صاحب خلاق۔ متواضع درویش سیرت۔ سخی۔ پاکیزہ روزگار۔ پابند سنت و جماعت۔ علم پرور فضل دوست تھا۔ نیکی سے پیش آتا تھا اُس کی صحبت سے جُدائی اور نوکری کرنے کو جی نہ چاہا۔ دس برس تک انہی گمنام گوشوں میں رہا۔ وہ نیک لوگوں کی خبر گیری کرتا تھا۔ میں اُس کی رفاقت کرتا تھا۔ مُلا صاحب نے اس پرہیزگار اور بہادر افغان کی بڑی تعریفیں لکھی ہیں۔ اور اس قدر لکھی ہیں۔ کہ پیغمبروں تک نہیں تو اصحاب اولیا کے اوصاف تک ضرور پہنچا دیا ہے۔ چونکہ اس کے حال میں ان کے اور اکبر کے عہد کے بہت حالات دست و گریبان ہیں۔ اسلئے اُس کا حال علیحدہ لکھونگا۔ کہ دلچسپ باتیں ہیں۔ اس دلاور افغان نے ہمایوں کی مراجعت سے لے کر اکبر کے سال ۲۲ جلوس تک بڑی جاں نثاری اور وفاداری دکھائی۔ اور ۳ ہزاری تک منصب حاصل کیا۔ غرض وہ دیندار متفق الخیال مسلمان ساتھ رہتے تھے اور مزے سے گزران کرتے تھے ۔

قیس صحرا میں اکیلا ہے مجھے جانے دو	خوب گزریگی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

حسین خاں کے پاس ۹۷۳ھ سے ۹۸۱ھ تک ۹ برس رہے۔ قال اللہ وقال الرسول سے اپنا اور اس کا دل خوش کرتے تھے۔ بے تکلفی کی صحبتوں میں جی بہلاتے تھے۔ علما و فقرا کی خدمتیں کرتے تھے۔ جاگیر کے کاروبار اور وکالت کو حسن لیاقت اور شیرینی گفتار سے رسائی دیتے تھے ۔

۹۷۵ھ میں رخصت لیکر بدایوں گئے اور مُلا صاحب دوبارہ دولہا بنے۔ شادی کی آرائش۔ سامان بناؤ سنگار سب ڈیڑھ سطر میں ختم کیا ہے۔ مگر عجیب خوبصورتی سے۔ بلکہ عبارت سے جھلکتا ہے کہ بی بی خوبصورت پائی اور انہیں بھی بہت پسند آئی۔ دیکھنا کیا مزے سے کہتے ہیں ۔ اس برس میں راقم تاریخ کی دوسری شادی واقع ہوئی۔ اور بموجب مضمون وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلیٰ مبارک نکلی۔ تاریخ کہی گئی ع

چوں مرا از عنایت ازلی	از دو ماہے بماہ چہرے شد
عقل تاریخ کد خدائی را	گفت ماہے قرین مہرے شد

آزاد۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی سے خوش نہ تھے۔ خدا جانے اُس کے جیتے جی دوسری شادی کی یا بچاری مرگئی تھی۔ اُس کا تو افسوس بھی نہ کیا ؀

چند ہی روز میں لڑکا پیدا ہُوا۔ یہ حسین خاں کے پاس پہنچے۔ وہ ان دنوں لکھنؤ میں اپنی جاگیر پر تھے۔ اُنکی بدولت چند روز اودھ کی سیر کی۔ وہاں کے علما و فقرا و اہل اللہ سے ملاقاتیں کر کے بہت سے فیض حاصل کئے ؀

حسین خاں جاگیر کی تبدیلی کے سبب سے بادشاہ سے خفا ہو گئے اور کوہستان میں فوج لے کر گئے کہ جہاد کر کے دین خدا کی خدمت کرینگے۔ سونے چاندی کے مندر ہیں۔ اُنہیں لوٹینگے اور خود ترویج اسلام کرینگے۔ اس موقع پر یہ رخصت ہو کر بداؤں چلے گئے۔ مگر دو سخت صدمے اُٹھائے۔ لکھتے ہیں۔ شیخ محمد چھوٹے بھائی کو میں نے جان کے برابر پالا تھا بلکہ جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اُس نے بہت سے اخلاق حمیدہ حاصل کئے تھے اخلاق ملکی ملکہ ہو گئے تھے۔ ایک معقول گھرانے میں اس کی شادی کی۔ افسوس کیا خبر تھی کہ اس کارخیر میں ہزار مصیبتوں کی شر ہے۔ تین مہینے شادی پر نہ گزرے تھے۔ کہ اُس کو اور نور چشم عبداللطیف کو زمانے کی نظر لگ گئی۔ پلک مارتے۔ ہنستا کھیلتا بچہ گود سے گور میں چلا گیا۔ وہ میری زندگی کا ہرا بھرا پودا تھا۔ اور میں زمانے کا شہریار تھا۔ حیف اپنے ہی شہر میں پردیسی کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مُلّا صاحب نے اس مصیبت میں بہت شعر کہے ہیں۔ ایک ترکیب بند بھائی کے مرثیے میں لکھا ہے دل پر درد کا ابر چھایا ہوا تھا۔ اس لئے کلام بھی تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلا ہے۔ میں بھی اس کے لطف سے اپنے دوستوں کو محروم نہ رکھونگا۔ باوجود اس کے نظم مذکور سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مُلّا صاحب کی زبان میں نظم کا ڈھب ایسا نہیں جیسا نثر کا۔ اور یہ قاعدے کی بات ہے ؏

یارب ایں روز چہ روز یست کہ افتاد مرا	ویں چہ جانکاہ بلائیست کہ رو داد مرا
ہیچ کس نیست کہ فریاد من او را رسید	نرسد ہیچ کسے لیک بفریاد مرا
ماہ من آخر شب رفت پس پردۂ غیب	ہیں کزیں حاملۂ غیب چہ غم زاد مرا
مایۂ شادی و اُمیدِ دلم رفت بخاک	بعد ازیں دل بچہ اُمید شود شاد مرا
گرچہ بنیادِ من از صبر قوی بود ولے	سیلِ غم آمد و انداخت ز بنیاد مرا
آں کسے را کہ کنم یاد بروزے صد بار	وہ کہ یکبار بسالے نہ کند یاد مرا
چرخِ بے داد چہ غمہا کہ بہ من داد کنوں	داد خود داد کہ ستانم کہ دہد داد مرا

حالِ دل ہیچ ندانم بکہ گویم چہ کنم
چارۂ دردِ دلِ خود زکہ جویم چہ کنم

اے فلک دو که دلم خسته و ویراں کردی
خاطر جمع مرا باز پریشاں کردی

گوهرے کاں بکفم بود ز اغیار نہاں
آشکار از نظرم بردی و پنہاں کردی

سرو من بردی ازیں باغ بزندانِ لحد
باغ را بر من ماتم زده زنداں کردی

یوسفم را بکفِ گرگ سپردی و مرا
در غمش معتکفِ کلبهٔ احزاں کردی

در گلِ تیره نهادی گلِ نورستهٔ من
روز من با شبِ تیره ز چه یکساں کردی

حاصل آں کس که ازو بود سر و سامانم
بردی او را و مرا بے سر و ساماں کردی

آں برادر که دریں شهر غریب آمده بود
جاش در دشت بپہلوئے غریباں کردی

وقت گل آمد و شد جائے محمد در خاک
جائے آنست که از غصه کنم بر سر خاک

آخر اے دیده چه دیدی که ز عالم رفتی
دیده پوشیده ازیں دیدهٔ پرنم رفتی

چشم تاریک مرا روشنی از روے تو بود
روشنی رفت ز دل تا تو ز چشم رفتی

بودهٔ چشم مرا همچو نگیں در خاتم
چوں نگیں عاقبت الامر ز خاتم رفتی

دلت از هیچ ثمر شاد نشد در عالم
حیف صد حیف که ناشاد ز عالم رفتی

جانِ پاک تو دریں مرحله بس غمگیں بود
رخت بستی و ازیں مرحلهٔ غم رفتی

بر دل از کار جهاں هیچ نبودت بارے
بارے از کار جهاں خوش دل و خرم رفتی

بودم از عهد ترا مونس و همدم همه دم
در لحد بهر چه بے مونس و همدم رفتی

رفتی و حسرت تو زیں دل حیراں نه رود
غمت از دل نرود تا ز غمت جاں نه رود

کیست آں کس که نشانِ تو بمن گوید باز
خبر جان رواں گشته به تن گوید باز

قصهٔ گل که فرو ریخت ز آسیب خزاں
کیست القصه که با مرغِ چمن گوید باز

قاصدے کو که غم و درد مرا روے بروے
یک بیک پیش تو بر وجه حسن گوید باز

با تو گوید سخنم را به زبانی و انگاه
بهر تسکیں ز زبانِ تو سخن گوید باز

تنگ دل غنچه صفت گشتم و کس پیدا نیست
کز تو حرفے بمن اے غنچه دهن گوید باز

هست صد پیچ و شکن در دلم از ماتم تو
که بتو زیں دل پرپیچ و شکن گوید باز

دور رفتی چو نیامد ز دیار تو کسے
که ز احوال تو یک شمه بمن گوید باز

روم و بر سرِ گورِ تو قیامے بکنم
تا جوابے شنوم از تو سلامے بکنم

گویم اے گوہر نایاب چہ حالست ترا — با تن خستہ و بے تاب چہ حالست ترا
تو بخواب اجل و بے تو قیامت برخاست — خیز و سر برکن ازیں خواب چہ حالست ترا
از جدائی تو احباب بسے بد حال اند — اے جدا ماندہ ز احباب چہ حالست ترا
شدہ از دوریت اصحاب بہ نزدیک ہلاک — دور از صحبت اصحاب چہ حالست ترا
بود جائے تو بہ محراب و کنوں مے نگرم — ماندہ خالی ز تو محراب چہ حالست ترا
مے خورم خون جگر بے تو مرا پرس گسے — کہ دریں خوردن خوناب چہ حالست ترا
برگلت صد گل سیراب دمید از اشکم — زیر گل اے گل سیراب چہ حالست ترا

در چنیں منزل غمناک بہ نزدیک تو کیست
مونس روز و انیس شب تاریک تو کیست

اے صنم از رخ خوب تو جدا افتادہ — وز فراق تو بصد گونہ بلا افتادہ
تو بصحرائے و من ماندہ دریں شہر غریب — اللہ اللہ تو کجا من بہ کجا افتادہ
بار گل ہم نکشیدی و ندانم ایں بار — بر تو صد پشتہ خس و خار چرا افتادہ
قدر وصل تو ندانستم و ایں بود جزا — کہ ملاقات تو با روز جزا افتادہ
کردمے جاں بسر و کار تو لیکن چہ کنم — کہ سر و کار تو با حکم خدا افتادہ
سال تاریخ تو شد گفت چو سروت افتاد — آں سہی سرو چہ ناگاہ ز پا افتادہ
قادری نالہ و فریاد نمے دارد سود — در دعا کوش کہ نوبت بدعا افتادہ

از خدا خواہ کہ کارش ہمہ محمود بود
ہم خدا از وے و ہم او ز تو خوشنود بود

یارب اندر چمن خلد گزارش بادا — قصر فردوس بریں جائے قرارش بادا
در گلستان جناں چوں گذرد جلوہ کناں — حور و غلماں ز یمین و ز یسارش بادا
در شب تار چو عزم سفر عقبےٰ کرد — نور اسلام چراغ شب تارش بادا
بر مزارش چو کسے نیست کہ افروزد شمع — پر تو لطف خدا شمع مزارش بادا
از عروس کہن دہر چو بگرفت کنار — نو عروسان بہشتی بکنارش بادا
ہیچ یارے چو نشد ہمدم او بعد از مرگ — دمبدم رحمت حق ہمدم و یارش بادا
مردماں قطرۂ اشکے کہ فشانند بہ رو — گرد و آں قطرۂ در ناب و نثارش بادا

تا ابد مسکن او وز دۂ علیین باد	
ایں دعا از من و از روح امیں آمیں باد	

ایک خاندانی شخص کسی عورت پر عاشق ہوکر مر گیا۔ اس کے ماجرے کو انہوں نے افسانہ کے طور پر لکھا ہے اور مزے سے لکھا ہے۔ اخیر میں طول کلام کا عذر کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں۔ خدا مجھے بھی یہی نعمت نصیب کرے۔ ساتھ ہی ایک اور شعبدہ بازی حضرت عشق یاد آگئی اسے بھی ٹانک گئے مگر اس کا لکھنا واجب تھا۔ کیونکہ شیخ صدر پر اور شیخ محمد غوث کے خاندان پر بھی ایک نشتر مارنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ معاملہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ اور خوبصورتی سے ادا ہوا ہے۔ اِس لئے میں لکھتا ہوں۔ فرماتے ہیں :-

حکایت - شیخ زادگان گوالیار میں سے ایک شخص تھے۔ کہ شیخ محمد غوث گوالیاری سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ صلاح و صلاحیت کا لباس پہنتے تھے۔ اور نام کے سر پر تاج شاہی کا تاج رکھتے تھے۔ وہ ایک ڈومنی پر عاشق ہوگئے۔ کیا ڈومنی تھی! ؎

در مغرب زلف عرض داده	صد قافلہ ماہ و مشتری را
در چنبر زلف کرده پنہاں	دستار سپہر چنبری را
بر دامن ہجر و وصل بستہ	بدبختی و نیک اختری را

بادشاہ کو خبر پہنچی۔ انہوں نے کنچنی کو پکڑوا کر منگایا۔ مقبل خاں کو دیدی کہ مقربان خاص میں تھا۔ یاروں کو شیخ زادہ صاحب کے ڈھنگ معلوم تھے۔ باوجودیکہ مقبل خاں نے رنڈی کو محفوظ مکان میں رکھا اور باہر کا دروازہ چُن دیا تھا۔ مگر وہ ہمت کی کمند ڈال کر پہنچے اور لے ہی اُڑے۔ شیخ ضیاء الدین شیخ محمد غوث کے بیٹے کہ اب بھی باپ کی مسند پر ہدایت و ارشاد فرماتے ہیں۔ اُن کے نام بادشاہی حکم پہنچا۔ اُنہوں نے بھی نصیحتوں وصیتوں سے سمجھا کر ڈومنی سمیت دربار میں حاضر کیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ اس خانہ برانداز سے شیخ زادہ کا گھر بسادیں۔ مگر شیخ ضیاء الدین اور اُور لوگ راضی نہ ہوئے کہ نسل بگڑ جائے گی۔ خاندان خراب ہو جائیگا۔ شیخ زادۂ خانہ خراب کو تاب کہاں تھی چھری مار کر مر گیا۔ کفن و دفن پر علما میں تکرار ہوئی۔ شیخ ضیاء الدین نے کہا شہید عشق ہے۔ اسی طرح خاک کے سپرد کردو۔ شیخ عبدالنبی صدر عالی قدر اور اُور علما اور قاضی اُن کے تصدیقی کہتے تھے کہ ناپاک مرا۔ آسودۂ عشق نہیں۔ آلودۂ فسق ہے۔ مُلّا صاحب کا اس طرح فرمانا یا تو اس سے ہے کہ خود عاشق مزاج تھے اور اسی واسطے عاشقوں کے طرفدار تھے۔ یا یہ کہ شیخ صدر پر چوٹ کرنے میں خواہ مخواہ مزا آتا تھا۔

۹۷۹ھ میں ایک اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں جس سے تاریخ نویسی کی روح شاداب ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ واقعہ نگار کو کیونکر واقعیت نگار ہونا چاہیئے۔ لکھتے ہیں کہ اس سال میں عجیب خوفناک واقعہ ہوا۔ کانت گولہ حسین خاں کی جاگیر میں تھا۔ میں وہاں آیا۔ صدارت کا عہدہ تھا۔ اور فقرا کی خدمت میرے سپرد تھی۔ شیخ بدیع الدین مدار کا مزار مکن پور علاقہ قنوج میں ہے۔ مجھے زیارت کا شوق ہوا۔ آدمی نے آخر کچا دُودھ پیا ہے۔ غفلت اور ظلم و جہل سے اس کی سرشت ہے۔ بیجا جسارت کر بیٹھتا ہے۔ اور خسارت و ندامت اُٹھاتا ہے۔ اُس نے حضرت آدم سے بھی میراث پائی ہے۔ غرض انہیں بلاؤں نے میری عقل کی آنکھوں پر بھی پردہ ڈالا۔ ہوس کا نام عشق رکھا۔ اور اس کے جال میں پھنسا دیا۔ قسمت کی تحریر پر قلم چل چکا تھا۔ وہ پیش آئی۔ اور ایک سخت بے ادبی عین درگاہ میں واقع ہوئی۔ مگر غیرت اور عنایت الٰہی شامل حال ہوئی۔ کہ اس گناہ کی سزا بھی یہیں ہو گئی۔ یعنی طرف ثانی کے چند آدمیوں کو خدا نے تعیین کیا کہ تلواریں کھینچ کر چڑھ آئے۔ اور پے درپے نو زخم۔ سر۔ ہاتھ اور کندھوں پر لگائے۔ سب زخم خفیف تھے۔ مگر سر کا گھاؤ گہرا تھا کہ ہڈی کو توڑ کر مغز پر پہنچا۔ اور تہی مغزی کا نشہ پایا۔ اُلٹے ہاتھ کی چھنگلی بھی کٹ گئی۔ وہیں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ میں تو سمجھا کہ کام تمام ہوا۔ مگر ملک آخرت کی سیر کر آیا۔ اور خیر گذر گئی۔ خدا کرے عاقبت بخیر ہو۔

وہاں سے بانگرمؤ کے قصبے میں آیا۔ ایک بہت اچھا جرّاح ملا اس نے علاج کیا۔ ہفتے میں زخم بھر آئے۔ اسی مایوسی کی حالت میں خدا سے وعدہ کیا کہ حج کرونگا۔ مگر ابھی تک کہ ۱۰۰۴ھ ہیں پورا نہیں ہوا۔ خدا موت سے پہلے توفیق دے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔ اے پروردگار تیرے آگے کچھ بڑی بات نہیں۔ پھر بانگرمؤ سے کانت گولہ میں آیا۔ غسل صحت کیا۔ مگر زخموں نے پانی چرایا اور نئے سرے سے بیمار ہو گیا۔ خدا حسین خاں کو بہشت نصیب کرے ایسی پدری اور برادری محبت خرچ کی کہ انسان سے نہیں ہو سکتی۔ موسم کی سردی نے زخموں کو بہت خراب کیا تھا۔ مگر خان موصوف نے اس شفقت و محبت سے تیمارداری کی کہ خدا اسے جزائے خیر دے۔ حلوائے گزر کھلایا اور ہر طرح خبرگیری کی وہاں سے بداؤں آیا۔ یہاں ناسور کو پھر چیرا لگا۔ یہ عالم ہوا گویا موت کا دروازہ کھل گیا۔ ایک دن کچھ جاگتا تھا کچھ سوتا تھا۔ دیکھتا ہوں چند سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں۔ اور کچھ لوگ ہیں جیسے بادشاہی یساول عصا و جریبیں ہاتھوں میں لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ایک منشی بیٹھا ہے۔ اور کچھ فردیں دیکھ رہا ہے۔ بولا کہ لیجاؤ لیجاؤ یہ آدمی وہ نہیں ہے۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ خیال کیا تو دیکھا کہ درد کو آرام ہے۔ سبحان اللہ عوام سے بچپن میں سُنا کرتا تھا۔ تو کہانی سمجھتا تھا۔ اب یقین آ گیا کہ عالم امکان وسیع ہے اور خدا کی قدرت غالب ہے۔

اس سال بداؤں میں بڑی آگ لگی۔ اور اتنے بندے خدا کے جل گئے کہ گنے نہ گئے۔ سب کو چھکڑوں میں بھر کر دریا میں ڈال دیا۔ ہندو مسلمان کچھ معلوم نہ ہوا۔ شعلے نہ تھے موت کی آنچ تھی۔ ہائے جان بڑی پیاری ہے۔ مرد عورت فصیل پر چڑھے۔ اور باہر کود کود پڑے جو بچ گئے وہ جلے بھنے لنگڑے لولے رہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا پانی آگ پر تیل کا کام کرتا تھا۔ شعلے دھر دھر کرتے تھے۔ اور دور تک آواز سنائی دیتی تھی۔ آگ نہ تھی۔ خدا کا قہر تھا۔ بہتوں کو خاک کرکے پامال کر دیا۔ بہتوں کو گوشمالی دیدی چند روز پہلے ایک مجذوب میان دو آب کے علاقہ سے آیا تھا۔ میں نے اسے گھر میں اُتارا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دن کہنے لگا۔ کہ یہاں سے نکل جا۔ میں نے کہا کیوں؟ بولا کہ یہاں خدائی کا تماشا نظر آئیگا۔ خراباتی تھا مجھے یقین نہ آیا ۔

اِسے فقط تقدیر کا اتفاق کہتے ہیں۔ کہ ۹۸۱ھ میں ۱۰ برس کے دوست بلکہ دینی بھائی حسین خاں سے ان کا بگاڑ ہو گیا۔ اور اس کا راز کچھ نہ کھُلا کہ بات کیا تھی۔ وہ سید صاسادھا سپاہی باوجود رتبہ آقائی کے مقام عذر خواہی میں آیا۔ بداؤں میں اُن کی ماں کے پاس گیا اور سفارش چاہی مگر مُلّا صاحب بھی ضد کے پُورے تھے ایک نہ مانی۔ کیونکہ انہوں نے دربار شاہی میں جانے کی تجویز مصمم کر لی تھی ۔

تماشا یہ کہ اسی سنہ میں اکبر کے دماغ کو علم کے شوق نے روشن کرنا شروع کیا۔ دریا دل بادشاہ محدود العقل علما کی یاوہ گوئیوں سے تنگ ہو کر فہیدہ اور مصلحت سنج لوگوں کی قدر کرنے لگا۔ رات کو چار ایوان کے عبادت خانہ میں جلسہ ہوتا تھا۔ تمام علما و فضلا جمع ہوتے تھے۔ اور ان سے علمی مباحثے سُنتا تھا۔ مُلّا صاحب کی جوانی کی عمر۔ علم کا جوش۔ طبیعت کی اُمنگ ان کے دل میں بھی ہوس نے موج ماری ع

فیض ہنر ضائع است تا ننمایند	عود بر آتش نہند مشک بسایند

فیضی ابو الفضل وغیرہ ہمدرس جو اُن کیساتھ گوشۂ مسجد اور صحن مدرسہ میں بیٹھکر ذہن لڑاتے تھے۔ اُن کی باتوں کے گھوڑے بھی دربار شاہی میں دوڑنے لگے تھے۔ یہ بھی بداؤں سے آگرہ میں گئے۔ آخر ذالحجہ ۹۸۱ھ تھا کہ جمال خاں قورچی سے ملاقات ہوئی۔ مُلّا صاحب خود کہتے ہیں۔ وہ اکبر کے مصاحبان خاص میں سے تھا۔ اور باوجودیکہ پانصدی عہدہ دار تھا۔ مگر سیدھا سپاہی اور دیندار خوش اعتقاد مسلمان تھا۔ ساتھ اس کے ظرافت طبع خدا داد جوہر تھا۔ مصاحبت کے زور سے جو تصرف بادشاہ کے مزاج میں اسے حاصل تھا۔ وہ کسی امیر کو نصیب نہ تھا۔ سخی تھا اور کھانے کھلانے والا تھا۔ ۹۸۲ھ میں مرگیا۔ دُنیا میں نیکنام رہا۔ عقبےٰ میں نیکی ساتھ لے گیا ۔

جمال خاں ان کے پیچھے نماز پڑھ کر اور علمی تقریریں سُن کر بہت خوش ہوا۔ اکبر کے سامنے لایا اور کہا کہ حضور کے لئے پیش نماز لایا ہوں۔ خود فرماتے ہیں۔ تدبیر کے پاؤں میں تقدیر کی زنجیر پڑی ہے۔

سنہ ۹۸۱ھ میں حسین خاں سے ٹوٹ کر بداؤں سے آگرہ میں آیا۔ جمال خاں قورچی اور مرحوم جالینوس حکیم عین الملک کے وسیلے سے ملازمت شاہنشاہی حاصل کی۔ ان دنوں جنس دانش کا بڑا رواج تھا۔ پہنچتے ہی اہل نشست میں داخل ہوگیا۔ یہاں تک کہ جو علما تبحر کے نقارے بجاتے تھے۔ اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بادشاہ نے ان سے لڑادیا۔ خود بات کو پرکھتے تھے۔ خدا کی عنایت اور قوت طبع اور تیزی فہم اور دل کی دلیری سے (کہ عالم جوانی کا لازمہ ہے) بہتوں کو زیر کیا۔ پہلی ہی ملازمت میں فرمایا۔ کہ یہ بداؤنی فاضل حاجی ابراہیم سرہندی کا سرکوب ہے۔ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح سے زک پائے۔ میں نے اُسے بھی خوب خوب الزام دیئے۔ اور بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ شیخ عبدالنبی صدر عالی قدر پہلے ہی خفا ہوئے تھے کہ ہم سے بالا بالا آن پہنچا۔ اب جو مناظروں میں مقابل دیکھا۔ تو وہی مثل ہوئی۔ کہ ایک تو سانپ نے کاٹا اُس پر کھائی افیم۔ خیر آخر رفتہ رفتہ ان کی کلفت بھی اُلفت سے بدل گئی۔ ملا صاحب اس فتحیابی پر ناحق خوش ہوئے۔ اُنھیں خبر نہ تھی کہ یہ فتح اپنی فوج کی شکست ہوئی ہے۔ کیونکہ آہستہ آہستہ بادشاہ کل علما سے بے اعتقاد ہوگیا۔ پھر اُن کے ساتھ یہ بھی نظروں سے گر گئے۔ ساتھ ہی لکھتے ہیں انہی دنوں میں شیخ ابوالفضل خلف شیخ مبارک جسکی عقل و دانش کا ستارہ چمک رہا تھا ملازمت میں آیا اور انواع و اقسام کی عنایتوں سے امتیاز پایا (تھوڑی دُور آگے چل کر کہتے ہیں) بادشاہ نے ملایان فرعون صفت کے کان ملنے کے لئے (جس کی مجھ سے اُمید نہ رہی تھی) انہیں خاطر خواہ پایا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اور ابوالفضل دونوں کے حالات پڑھ کر معلوم ہو جائیگا۔ کہ اکبر کی نظر توجہ ان کی طرف تھی وہ ادھر پھر گئی۔ اسے اُس کی قسمت کا زور کہو۔ خواہ اس کی مزاج شناسی سمجھو۔ اور یہی رشک تھا۔ جو ہمیشہ تیزاب بلکہ زہریلے الفاظ بن کر ان کے قلم سے ٹپکتا تھا۔

غرض فاضل مذکور ہر صحبت اور ہر جلسے میں موجود رہتے تھے۔ جو خاص خاص علما کیا سفر کیا مقام میں کہیں جُدا نہ ہوتے تھے۔ انمیں یہ بھی شامل ہوگئے۔ پہلے ہی سفر کا حال جو لکھتے ہیں اُسکے ترجمہ کو پڑھو اور خیال کرو۔ کہ ایک نوجوان آدمی جب ایک عظیم الشان بادشاہ کی رکاب میں رہ کر شاہانہ شان اور سلطنت کے سامان دیکھتا ہے تو اُس کے دل میں کیسے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور دیکھو! ابھی تک وہ موقع ہے کہ آقا کا دل شفقت سے اور نئے نمک خوار کا سینہ وفاداری کے جوش سے لبریز ہے۔ چنانچہ انہی دنوں میں اکبر شاہانہ لشکر لیکر منعم خاں کی مدد کو چلا کہ پٹنے پر پٹھانوں سے لڑ رہا تھا۔ فوج کو آگرہ سے خشکی کے رستے روانہ کیا۔ اور آپ مع بیگمات اور شاہزادہ ہائے کامگار اور امرا کے دریا کے رستے چلا۔ ابھی تک ملا صاحب مہربان ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ رباعی

جمشید جہاں ستاں محمدؐ اکبر	شاہنشہ دادگستر دیں پرور
ہم بحر بفرمان وے آمد ہم بر	بنشست بروے بحر چوں اسکندر

بڑے شاہزادے کو بھی ساتھ لیا تھا۔ کشتیوں کی کثرت سے پانی نظر نہ آتا تھا۔ نئے نئے انداز کی کشتیاں آسمانی بادبان چڑھے ہوئے۔ کسی کا نام نہنگ سر۔ کوئی شیر سر وغیرہ وغیرہ۔ رنگ برنگ کی بیرقیں لہراتی۔ دریا کا شور۔ ہوا کا زور۔ پانی کے سراٹے۔ بیڑا چلا جاتا تھا۔ ملاح اپنی بولی میں گاتے جاتے تھے۔ عجب عالم تھا۔ قریب تھا کہ پرندے ہوا میں اور مچھلیاں پانی میں رقص کرنے لگیں۔ وہ تماشا دیکھا کہ بیان میں نہیں آتا۔ جہاں چاہتے اُتر پڑتے تھے۔ اور شکار کھیلتے تھے۔ جب چاہتے تھے چل کھڑے ہوتے تھے۔ رات کو لنگر ڈال دیتے تھے۔ وہیں علمی بحثیں ہوتی تھیں۔ شعر شاعری کے چرچے بھی ہوتے تھے فیضی ساتھ تھے۔ مُلا صاحب اسی سال میں آئے تھے یہ بھی ساتھ تھے ۔

طبقات اکبری وغیرہ کتابوں میں اس سے کچھ زیادہ کرکے لکھتے ہیں۔ کہ جو جو شاہانہ سامان خشکی کے سفر میں ہوتے ہیں سب کشتیوں پر لے چلے۔ کل کارخانے مثلاً توپخانہ۔ سلاح خانہ۔ خزانہ۔ نقارخانہ۔ کرکراق خانہ (توشہ خانہ) فراشخانہ جبخانہ۔ باورچی خانہ۔ طویلے وغیرہ وغیرہ سب کشتیوں پر تھے۔ ہاتھیوں کے لئے بڑی بڑی کشتیاں تیار ہوئیں۔ اور ہاتھی وہ ساتھ لئے کہ ڈیل ڈول۔ مستی اور تند خوئی میں مشہور تھے۔ بال سندر کے ساتھ دو ہتھنیاں ایک کشتی میں سمن ہال اور دو ہتھنیاں ایک کشتی میں وغیرہ۔ جو آرائشیں خیموں ڈیروں میں ہوتی ہیں وہ سب کشتیوں میں اور انکی پوششوں میں کی تھیں۔ ان میں الگ الگ کمرے۔ کمروں کی عمدہ تقسیم محرابوں اور طاقوں کی تراشیں گھروں کی طرح کئی کئی منزلیں زینوں کے چڑھاؤ اُتار۔ ہوا کے لئے کھڑکیاں اور روشنی کے لئے تابدان۔ ہر بات میں نئے نئے ایجاد۔ رومی۔ چینی۔ فرنگی مخملوں اور باناتوں کے پردے اور فرش ہائے بوقلموں۔ ہندوستانی دستکاریوں کی تفصیل کہاں تک ہو۔ کہ ایک فسانۂ عجائب خانہ ہوا جاتا ہے۔ یہ سب سامان دریا میں بساط شطرنج کی طرح بترتیب انتظام چلتا تھا۔ بیچ میں بادشاہ کی کشتی ہوتی تھی بڑی عالیشان جیسے جہاز ۔

مُلا صاحب کہتے ہیں دوسرے سال شہنشاہ نے مجھ پر عنایت فرمائی اور بڑی محبت سے کہا۔ کہ **سنگھاسن بتیسی** کی ۳۲ کہانیاں جو راجہ بکرماجیت کے حال میں ہیں۔ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرکے طوطی نامہ کے رنگ پر نظم و نثر میں ترتیب دو اور ایک ورق نمونے کے طور پر آج ہی پیش کرو۔ برہمن زبان داں مدد کے لئے دیا۔ چنانچہ اسی دن ایک ورق شروع حکایت سے ترجمہ کرکے گزرانا۔ پسند فرمایا تمام ہوئی تو **نامۂ خرد افزا** تاریخی نام قرار پایا اور پسند و قبول ہو کر کتب خانے میں داخل ہوئی حق پوچھو تو مُلا صاحب کو تاریخ گوئی میں کمال ہے ۔

۹۸۵ھ تک صحبتیں موافق طبع تھیں۔ کیونکہ ان کے کلام کی بنیاد اصول و فروع مذہب پر تھی۔ اور بادشاہ نے بھی ابھی تک اس دائرے سے قدم نہ بڑھایا تھا۔ یہ بعض علماء سے اس لئے ناراض تھے۔ کہ فقط جو فروشی اور گندم نمائی سے دیندار اور سلطنت میں صاحب اختیار بنے ہوئے تھے۔ وہ مخدوم اور صدر اور ان کی اُمّت کے لوگ تھے۔ اور بعض سے اس لئے خفا تھے۔ کہ زبانی جمع خرچ اور لفاظی اور دھوکے کی دلیلوں سے علم کے دعویدار بنے ہوئے تھے۔ مگر ان کا لوہا سب پر تیز ہوا کہ آتے ہی ہر ایک کو دبا لیا جو ذرا بے اصول بولتا تھا۔ فوراً کان پکڑ لیتے تھے۔ چنانچہ حکیم الملک کے ساتھ جو معرکہ کیا وہ تم نے دیکھا۔

۹۸۳ھ تک کے حالات اور چار ایوان کے معرکوں میں اپنے اور اور عالموں کے لطائف و ظرائف خوشی خوشی لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کہ دفعتہً قلم کی رفتار بدلتی ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ قلم سے حرف اور آنکھوں سے آنسو برابر بہہ رہے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

آج ان معرکوں کو ۱۰ برس گزرے ہیں۔ وہ مناظرے اور مباحثے کرنیوالے کیا محقق اور کیا مقلد سو سے زیادہ تھے ایک نہیں نظر آتا۔ سب موت کے نقاب میں منہ چھپا لئے۔ خاک ہوگئے اور اُنکی خاک بھی اُڑ گئی ؎

زخیل دردکشاں غیر ما نماند کسے بیار بادہ کہ ماهم غنیمتیم بسے!

جب نعمت جاتی ہے تو قدر آتی ہے۔ اب اُن صحبتوں کو یاد کرتا ہوں لہو روتا ہوں۔ آہیں بھرتا ہوں نالے کرتا ہوں اور مرتا ہوں۔ کاش اس حسرت آباد میں چند روز اور بھی ٹھیرتے وہ جو کچھ تھے غنیمت تھے کہ بات کا رخ اُنہی کیطرف ہوتا تھا۔ اور بات کا مزا انہیں سے تھا۔ اب کوئی بات کے قابل ہی نہیں۔ رباعی

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند	در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر	یک لحظہ زما پیشتر ک مست شدند

عبارت ہائے مذکورہ بالا کے انداز سے اور آیندہ کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سلسلہ عین کامیابی اور لطف گرمجوشی کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ لیکن وہ عبارت نظم و نثر جو ماتم زمانہ سے سیہ پوش ہے پیچھے حاشیے پر لکھی ہوگی۔ اور وہ بھی ۹۹۱ھ کے پس و پیش میں ہوگی نہ ۹۹۹ھ میں جیسا کہ انھوں نے دیباچہ کتاب میں تحریر کیا ہے۔

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان والی بدخشان ادھر بھاگ کر آیا تو اکبر نے بڑے جاہ و جلال سے استقبال کیا مرزا بھی عبادت خانہ (چار ایوان) میں آتا تھا۔ مشائخ و علما سے گفتگوئیں ہوتی تھیں (ملا صاحب فرماتے ہیں) صاحب حال شخص تھا۔ اس سے معرفت کے بلند خیالات سُننے گئے۔ کبھی نماز جماعت نہیں چھوڑی۔ ایک دن میں نے عصر کی نماز پڑھ کر فقط دُعا پر اکتفا کیا۔ الحمد نہ پڑھی۔ مرزا نے اعتراض کیا کہ حمد کیوں نہیں پڑھی۔ میں نے

کہا کہ آنحضرت کے عہد میں نماز کے بعد فاتحہ کا معمول نہ تھا۔ بلکہ بعض روایتوں میں مکروہ بھی آیا ہے۔ مرزا نے کہا کہ ولایت میں علم و تقا یا علمانہ تھے ؟ (ملا بھی جھگڑنے کو آندھی تھے) میں نے کہا کہ ہمیں کتاب سے کام ہے نہ کہ تقلید سے۔ بادشاہ نے خود فرمایا کہ آیندہ سے پڑھا کرو۔ میں نے قبول کیا۔ مگر کتاب میں کراہت کی روایت نکال کر دکھا دی ✦

گجرات کی لوٹ میں اعتماد خاں گجراتی کے کتب خانے کی نفیس نفیس کتابیں خزانۂ عامرہ میں جمع تھیں۔ بادشاہ چارالیوان کے جلسوں میں علما کو تقسیم کرتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ مجھے کئی کتابیں دیں انہیں میں ایک انوار المشکوٰۃ بھی تھی۔ اسمیں ایک فصل بہ نسبت اور نسخوں کے زیادہ تھی۔ اس وقت تک بھی بادشاہ اکثر مسئلوں میں انہیں کو مخاطب کرکے بات کہتے تھے اور ہر بحث میں پوچھتے تھے کہ حقیقت مسئلے کی کیا ہے ✦

حضور میں امام تھے۔ ہفتے کے ۷ دن۔ ایک ایک دن باری باری سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ دوسرے سال میں ملا صاحب کہتے ہیں کہ خوش آوازی کے سبب سے جیسے طوطی کو پنجرے میں ڈالتے ہیں اسی طرح مجھے اُن میں داخل کرکے بدھ کی امامت عنایت ہوئی۔ اہتمام حاضری کا خواجہ دولت ناظر کے سپرد تھا۔ عجب سخت مزاج خوجہ تھا۔ لوگوں کو بڑا دق کرتا تھا۔ الخنثیٰ لاذکر ولا انثیٰ (خوجہ ہیجڑانہ زن نان نہ زن مرّان) ✦

اسی سال میں بیستی کا منصب دیا کچھ خرچ بھی عنایت کیا اور پہلی ہی دفعہ میں فرمایا کہ بیستی کے منصب کے بموجب گھوڑے داغ کے لئے حاضر کرو۔ لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل بھی اسی عرصے میں پہنچے تھے۔ اور ہم دونو کی وہی مثال ہے جو شیخ شبلی نے اپنے اور جنید کے لئے کہی تھی۔ میں اور یہ دو ملی ٹکیاں ہیں۔ کہ ایک تنور میں سے نکلی ہیں۔ ابوالفضل نے جھٹ قبول کرکے کام شروع کر دیا۔ اور اس عرق ریزی سے خدمت بجا لایا کہ آخر دوہزاری منصب اور وزارت کے درجے کو پہنچ گیا (جس کی ۱۲ ہزار کی آمدنی ہے) میں ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی سے اپنے کمل کو بھی نہ سنبھال سکا۔ سادات انجو میں سے ایک شخص نے ایسے ہی موقع پر اپنے اوپر آپ تمسخر کیا تھا۔ وہ میرے حسب حال ہے ؎

مرا داخلی سازی و بیستی	مبیناد مادر بدیں نیستی

مجھے اُن دنوں میں یہی خیال تھا کہ قناعت بڑی دولت ہے۔ کچھ جاگیر ہے۔ کچھ بادشاہ انعام اکرام سے مدد کرینگے۔ اسی پر صبر کرونگا۔ سلامت اور عافیت کے گوشے میں بیٹھونگا۔ علم کا شغل اور دل کی آزادی کا شیوہ نامرادی ہے۔ اسے سنبھالے رہونگا ؎

جاہ دنیا مطلب دولت فانی بگذار	جاہ دیں بس بود و دولت اسلام ترا

افسوس کہ وہ بھی میسر ہوئی (یہاں میر سید محمد میر عدل کی نصیحت یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں۔ دیکھو تتمہ صفحہ ۴۷۰)

مُلّا صاحب بہت اچھی اُٹھان سے اُٹھے۔ مگر افسوس کہ رہ گئے اور بُری طرح رہ گئے۔ وہ ترقی پاتے اور خاطر خواہ سے بھی زیادہ پاتے۔ مگر ضدّی شخص تھے اور بات کی پرورش ایسی کرتے تھے کہ اُس پر ہر طرح کا نقصان اُٹھاتے تھے۔ اور اُسے فخر سمجھتے تھے۔ ابوالفضل کو زمانے کے گھسوں نے خوب سبق پڑھائے تھے۔ وہ سمجھ گیا۔ مُلّا صاحب کو بیستی کا عہدہ ملا انکار کیا۔ اُس نے فوراً منظور کیا۔ اور اطاعت و تسلیم کی اُسی کا نیک ثمرہ پایا۔

اس کی تائید اُن کی تحریر سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ۹۸۳ھ میں مَیں نے رخصت مانگی نہ ملی۔ بادشاہ نے ایک گھوڑا اور کچھ روپیہ دیا۔ ہزار بیگھہ زمین دی اور کہا کہ فوجی دفتر سے تمہارا نام نکال دیتے ہیں۔ اُن دونوں میں بیستی کے عہدے پر نظر کر کے یہ انعام مجھے بہت معلوم ہوا۔ کہ ہزاری کا ہم پلّہ ہے۔ بادشاہی ہمزبانی ہے علم کا سلسلہ ہے۔ خدمت کا بجا لانا ہے۔ سپاہی کی تلوار اور بندوق نہیں اُٹھانی پڑتی۔ یہ سب کچھ درست مگر صدر کی ناموافقت اور زمانہ کی بدمددی سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ اور آیندہ ترقی کا رستہ نہ تھا۔ اتنا ہوا کہ فرمان میں مددِ معاش کا لفظ لکھا گیا۔ نہ کہ جاگیر (جاگیر میں خدمت بھی بجا لانی پڑتی تھی) ہر چند عرض کی کہ اتنی زمین پر ہمیشہ حاضری کیونکر ہو سکیگی۔ فرمایا کہ فوج کے زمرہ میں ترقی مل جائیگی۔ انعام سے بھی امداد ہوا کریگی۔ شیخ عبدالنبی صدر صاف بولے کہ تمہارے ساتھیوں میں کسی کو اتنی مددِ معاش نہیں دی۔ ابتک ۲۲ برس ہوئے۔ آگے رستہ بند ہے اور مددیں قدرتِ الٰہی کے پردہ میں ہیں۔ ایک دو دفعہ سے زیادہ انعام کی بھی صورت نہ دیکھی۔ وعدے ہی وعدے تھے۔ اور اب تو زمانے کا ورق ہی اُلٹ گیا۔ البتہ خدمتیں ہیں جن کا کچھ نتیجہ نہیں اور عمل پابندیاں ہیں۔ کہ مفت گلے پڑی ہیں۔ کوئی لطیفہ غیبی ہو تو ان سے چھٹکارا ہو ؎

یا وفا۔ یا خبرِ وصلِ تو۔ یا مرگِ رقیب	بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

رضینا بقضاء اللہ وصبرنا علیٰ بلاء اللہ وشکرنا نعماء اللہ ؎

بہ ہمہ حال شکر باید کرد	کہ مبادا ازیں بتر گردد

حیرتی شاعر پر شاہ طہماسپ کی عنایتیں دیکھ کر یہ قطعہ فضولی بغدادی نے کہا تھا وہ میری فضولیوں کے مُناسب حال ہے ؎

من ز خاکِ عرب و حیرتی از ملکِ عجم	ہر دو گشتیم باظہار سخن کام طلب
یافتیم از دو کرم پیشہ مرادِ دلِ خویش	او زر از شاہ عجم۔ من لطف از شاہ عرب

دُنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے۔ معلوم ہے۔ کارساز بندہ نواز سے اُمید ہے۔ کہ عاقبت بخیر ہو۔ اور خاتمہ سعادت ایمان پر ہو۔ ما عندکم ینفد وما عند اللہ باق۔ جو تمہارے پاس ہے ہو چکیگا۔ جو خدا کے پاس ہے وہی رہیگا ؎

اُمید از کرم اے کارساز ما این است	کہ نا امید نہ سازی اُمیدواراں را

اب اختلافی مسئلے نکلنے لگے۔ جس سے بادشاہ اور شیخ صدر وغیرہ کے دلوں میں اختلاف پڑ کر جانیں مختلف ہو گئیں (پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ایک خاوند کئے جورو نیں کر سکتا ہے ؟ میں نے جو کچھ معلوم تھا۔ عرض کیا) (دیکھو حال شیخ عبدالنبی صدر صفحہ ۳۲۲)

اِسی سال میں لکھتے ہیں۔ شیخ بھاون کہ ولایت دکن کا ایک برہمن دانا ہے۔ ملازمت میں آیا اور شوق و رغبت کے ساتھ مسلمان ہو کر خاصہ کے چیلوں میں داخل ہوا۔ حکم ہُوا کہ اتھربن بید (چوتھا بید) جس کے اکثر احکام اسلام سے ملتے ہیں بیان کرے۔ اور نقیر فارسی میں ترجمہ کرے۔ اُس کی بعض عبارتیں ایسی مشکل تھیں کہ وہ بیان نہ کر سکتا تھا۔ اور مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے عرض کی۔ پہلے شیخ فیضی کو پھر حاجی ابراہیم سرہندی کو حکم ہوا۔ مگر جیسا جی چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ اب اُن مسودوں کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ اس کے احکام میں سے ایک یہ ہے۔ کہ جب تک ایک فقرہ (جس میں برابر بہت سے لام لام آتے ہیں۔ جیسے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) نہ پڑھے تب تک نجات نہ ہوگی۔ اور کئی شرطوں کے ساتھ گائے کا گوشت بھی جائز ہے۔ اور مُردے کو یا تو جلائیں۔ نہیں تو دفن کریں وغیرہ ؁

۹۸۴ھ میں بادشاہ مقام اجمیر میں تھے۔ کہ مان سنگھ ولد بھگوانداس کو درگاہ حضرت معینہ میں لے گئے۔ خلوت کر کے مدد چاہی۔ خلعت اور گھوڑا اور تمام لوازم سپہ سالاری دیکر رانا کیکا کی مہم کو کندہ وکونبھل میر کو روانہ کیا۔ بڑے بڑے بہادر سردار اور پانچ ہزار رتی سوار بادشاہی خاصہ کمک کو ساتھ گئے اور اُس کی اپنی فوج الگ تھی۔ لکھتے ہیں کہ اجمیر سے تین کوس تک برابر امیروں کے سرا پردے لگے تھے۔ قاضی خاں اور آصف خاں کے رخصت کرنے کو میں بھی گیا۔ رستے میں غزا کے شوق نے بے اختیار کر دیا۔ پھرتے ہوئے سیدھا شیخ عالی قدر شیخ عبدالنبی صدر شیخ الاسلام کے پاس پہنچا اور کہا کہ آپ حضور سے رخصت لے دیں۔ اُنھوں نے اقبال تو کیا۔ مگر سید عبدالرسول ایک نامعقول بوالفضول اُن کا وکیل تھا۔ اُس پر ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ بات دُور جا پڑی۔ نقیب خاں کے ساتھ دینی بھائی چارا تھا۔ اُس نے کہا کہ امیر لشکر ہندو نہ ہوتا تو سب سے پہلے میں اس مہم کے لئے رخصت لیتا۔ میں نے اُس کی خاطر جمع کی کہ ہم اپنا امیر بندگانِ حضرت کو جانتے ہیں مان سنگھ وغیرہ سے کیا کام ہے۔ نیت درست چاہیئے۔ حضرت شاہنشاہی اونچے چبوترے پر پاؤں لٹکائے مرزا مبارک کی طرف مُنہ کئے بیٹھے تھے۔ کہ نقیب خاں نے میرے لئے عرض کی۔ اوّل فرمایا کہ اس کا تو امامت کا عہدہ ہے۔ وہ کیونکر جا سکتا ہے ؟

اُس نے عرض کی کہ غزا کی آرزو ہے۔ مجھے بُلا کر پوچھا بہت ہی جی چاہتا ہے؟ عرض کی بہت! فرمایا سبب کیا؟ عرض کی دُعا ہے کہ سیاہ ڈاڑھی کو ہوا خواہی میں سُرخ کروں ؎

کارِ تو بخاطر است خواہم کردن	یا سرخ کنم روے ز تو یا گردن

فرمایا کہ انشاء اللہ فتح ہی کی خبر لاؤ گے۔ مراقبے میں سر جُھکا کر توجہ سے رخصت کی فاتحہ پڑھی۔ میں نے چبوترے کے نیچے سے پابوس کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ آپ نے اوپر کھینچ لئے۔ جب میں دیوان خانہ سے نکلا تو پھر بُلایا۔ ایک لپ بھر کر اشرفیاں دیں اور کہا خداحافظ۔ گِنیں تو ۵۶ تھیں۔ شیخ عبدالنبی صدر کی رخصت کو گیا۔ انہوں نے مہربان ہو کر پہلی کلفت کا الفت سے مبادلہ کیا تھا۔ فرمایا صفوں کا آمنا سامنا ہو تو مجھے بھی دُعائے خیر سے یاد کرنا کہ بموجب حدیث صحیح کے قبول دُعا کا وقت ہوتا ہے دیکھنا! بھولنا نہیں! قبول کر کے میں نے بھی فاتحہ (دُعا) چاہی۔ اور گھوڑا کس یارانِ یکدل کیساتھ چل روانہ ہُوا۔ ع ہر روز بہ منزلے و ہر شب جائے۔

یہ سفر اوّل سے آخر تک بڑی مبارکی سے طے ہُوا ؛

ان کی انشا پردازی نے میدان جنگ کی تصویر نہایت خوبصورتی سے کھینچی ہے۔ مگر اس میں بھی لوگوں کے پہلوؤں میں قلم کی نوکیں چبھوتے جاتے ہیں (دیکھو راجہ مان سنگھ کا حال[1]) جب فتح ہُوئی اور رانا بھاگ گیا۔ تو امرا مشوروں کے لئے بیٹھے۔ اور علاقے کا بند و بست شروع کیا۔ رام پرشاد ایک بڑا اونچا اور جنگی ہاتھی رانا کے پاس تھا۔ بادشاہ نے کئی دفعہ مانگا تھا۔ اُس نے نہ دیا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ امرا کی صلاح ہُوئی کہ اسے فتح نامہ کے ساتھ حضور میں بھیجنا مناسب ہے۔ آصف خاں نے میرا نام لیا۔ کہ یہ فقط ثواب کے لئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ بھیج دو۔ مان سنگھ نے کہا۔ ابھی تو بڑے بڑے کام پڑے ہیں۔ یہ میدان معرکہ میں صف جنگ کے آگے امامت کریں گے۔ میں نے کہا یہاں کی امامت کے لئے قضا ہے۔ میرا اب یہ کام ہے کہ میں جاؤں اور بندگانِ حضرت کی صف کے آگے امامت ادا کروں۔ مان سنگھ اس لطیفے پر بہت خوش ہُوئے۔ القصہ ۳۰۰ تین سو سوار ہاتھی کیساتھ کئے اور سفارش نامہ لکھ کر رخصت کیا۔ بلکہ موہنے تک تھانے بٹھانے کے بہانے شکار کھیلتے پہنچانے چلے آئے۔ کہ ۲۰ کوس ہے۔ میں ماکھور اور مانڈل گڑھ سے ہوتا ہوا آنبیر کے رستے آیا۔ کہ مان سنگھ کا وطن تھا۔ اُسی کے پہلو میں اب جے پور آباد ہے۔ رستہ میں جابجا لڑائی کی کیفیت اور مان سنگھ کی فتح کا حال سُناتا آتا تھا۔ لوگ تعجب کرتے تھے۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ آنبیر سے پانچ کوس پر ہاتھی کیچ میں پھنس گیا۔ غضب یہ کہ جوں جوں آگے جاتا تھا زیادہ دھستا جاتا تھا۔ آخر ملانے ہی تھے۔ انداز تحریر

[1] صفحہ ۵۲۱

سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت گھبرائے۔ اور یہیں سے سمجھ لو کہ مہمات سلطنت اور آنکے خطرناک بوجھ ایسے لوگوں کی گردن پر پڑیں تو چھاتی نیچے یا پھٹے۔ کہاں ابوالفضل اور اس کے کارنامے۔ اکبر لشکر جرار لئے آسیر کے گرد پڑا ہے۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ ایک شب اندھیرا۔ بادل گرجے مینہ برسے۔ ابوالفضل فوج لے کر زیر دیوار پہنچا۔ اور رسے ڈال کر شمشیر بکف قلعے میں کود پڑا۔ پہلے کوئی اتنا بڑا دل دکھائے۔ جب اس کے باب میں زبان ہلائے باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے ٭

وہاں کے لوگ آئے اور کہا کہ اگلے برس بھی یہاں ایک بادشاہی ہاتھی پھنس گیا تھا اس کا یہی علاج ہے کہ ٹھلیوں مشکوں میں پانی بھر بھر کر ڈالتے ہیں۔ ہاتھی نکل آتا ہے۔ سقّے بلائے انہوں نے بہت سا پانی ڈالا۔ جب آہستگی سے آپ ہاتھی نکلا اور گرداب ہلاک سے نجات پائی ٭

لکھتے ہیں بڑی مشکل سے ہاتھی نکلا۔ ہم انبیر میں پہنچے۔ وہاں کے لوگ پھولے نہ سماتے تھے اُنکے فخر کا سر آسمان سے جا لگا۔ کہ ہمارے راجہ کے لڑکے نے ایسا معرکہ مارا خاندانی رقیب کا کلّہ توڑا اور ہاتھی چھین لیا۔ ٹونڈہ میں سے گذر ہوا۔ یہاں میں پیدا ہوا تھا۔ بساور میں آیا ع اوّل ارضٍ مسّ جلدی ترابھا (پہلے اسی زمین کی خاک میرے بدن کو لگی ہے) اس بیان میں ان کی تحریر سے بڑی خوشی اور عجیب محبت ٹپکتی ہے۔ بے شک ایک شریعت مُلّا لڑائی سے جیتا پھرے اور لڑائی جیت کر پھرے۔ اس پر اتنے سارے بادشاہی اور جنگی سپاہی اور اتنا بڑا ہاتھی لے کر اپنے گاؤں میں آئے اور وہاں کا ایک ایک آدمی دیکھنے آئے وہ خوش نہ ہو تو کون ہو! اور محبت بھی جتنی ٹپکے تھوڑی ہے۔ جس خاک پر کھیل کر بڑے ہوئے اور جس زمین کی گود میں لوٹ کر پلے اس کی محبت نہ ہو تو کس کی ہو؟

غرض جوں توں کر کے فتحپور پہنچے (راجہ بھگوان داس راجہ مان سنگھ کے باپ تھے) ان کے کوکہ کی معرفت فتح نامہ اور ہاتھی حضور میں گزرانا۔ فرمایا اس کا نام کیا ہے؟ عرض کی رام پرشاد۔ فرمایا کہ سب پیر کی پرورش سے ہوا۔ اس کا نام پیر پرشاد ہے۔ پھر فرمایا تمہاری تعریف بھی بہت لکھی ہے۔ سچ کہو کونسی فوج میں تھے۔ اور کیا کیا کام کیا۔ عرض کی کہ بادشاہوں کے حضور میں سچ بھی ڈرتے لرزتے کہا جاتا ہے۔ فدوی جھوٹ کیونکر عرض کر سکتا ہے۔ چنانچہ سب واقعی حالات عرض کئے۔ پوچھا جنگی لباس تھا یا ننگے ہی سے؟ عرض کی زرہ بکتر تھا۔ فرمایا کہاں سے مل گیا۔ عرض کی سید عبداللہ خاں سے۔ سب جواب پسند آئے۔ تودۂ گنج میں سے ایک لپ بھر کر انعام فرمائی ۹۶ اشرفیاں تھیں۔ پھر پوچھا شیخ عبدالنبی سے مل لئے؟ عرض کی گرد راہ سے دربار میں پہنچا ہوں۔ کیونکر مل سکتا تھا۔ ایک دوشالہ نخودی بڑھیا دیا کہ یہ لیتے جاؤ۔ شیخ سے ملو اور کہو کہ اسے اوڑھو ہمارے

خاصے کارخانے کا ہے۔تمہاری ہی نیت سے فرمائش کی تھی۔ میں لے گیا۔ اور پیغام پہنچایا۔شیخ خوش ہوئے۔پوچھا کہ رخصت کے وقت میں نے کہہ دیا تھا۔ کہ صفوں کا آمنا سامنا ہو تو دعا سے یاد کرنا۔ میں نے کہا کل مسلمانوں کے حق میں جو دعا ہے وہ پڑھی تھی۔ کہا کہ یہ بھی کافی ہے۔ اللہ اللہ یہ وہی شیخ عبدالنبی ہیں۔ آخر حال میں اس بدحالی کے ساتھ دنیا سے گئے کہ خدا دکھائے نہ سنائے چاہیے کہ سب کو عبرت ہو جائے ؎

ہر کہ را پرورد گیتی عاقبت خونش بریخت	حال آں فرزند چوں باشد کہ خصمش مادرست	

کوکندہ کی مہم میں لکھتے ہیں کہ مان سنگھ۔ آصف خاں۔ غازی خاں بدخشی کو جریدہ بلا بھیجا۔ آصف خاں اور مان سنگھ باہم نفاق رکھتے تھے۔ چند روز سلام سے محروم رہے۔ مگر ملا صاحب۔ غازی خاں مہتر خاں علی مراد اُزبک خنجری ترک اور ایک دو اور بھی تھے۔ کہ عنایات اور سرفرازی عہدہ سے معزز ہوئے اور یہ مہم ۹۸۵ھ میں طے ہوئی۔

اس وقت تک اس فاضل مصنف میں مخالفت نے فقط اتنا راستہ پایا تھا۔ کہ انتظامی امورات میں یا ملازموں کے کاروبار میں بعض باتیں خلاف طبع معلوم ہوتی تھیں۔ البتہ طبیعت شوخ اور زبان تیز تھی جو لطیفہ کسی پر سوجھتا تھا۔ نوک قلم سے ٹپک پڑتا تھا۔

میں اسی سنہ میں رخصت لیکر وطن گیا تھا۔ بیماری کی شدت نے بستر سے ہلنے نہ دیا تھا۔ صحت پاکر روانہ دربار ہوا۔ رستے میں سید عبداللہ خاں بارہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ کہ راہ پُرخطر ہے۔ رضوی خاں کے ساتھ پھرتا پھراتا دیپالپور ملک مالوہ میں آکر حاضر ہوا۔ یہاں ۲۳ سنہ سال جلوس کے جشن کی دھوم دھام تھی۔ قرآن۔ حمائل اور خطبوں کی بیاض کہ جن کی تصنیف میں انواع و اقسام صنائع و بدائع خرچ ہوئے تھے۔ حضور میں پیش کی۔ یہ دونوں نایاب چیزیں حافظ محمد امین خطیب قندہاری کی تھیں۔ کہ ۷ اماموں میں سے ایک امام ہے۔ اور خوش خوانی اور خوش الحانی میں آج اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ راہ بساور کی ایک منزل میں اس کا مال چوری گیا تھا۔ اس میں سے عبداللہ خاں نے یہ دونوں چیزیں بہم پہنچا کر رستے میں مجھے دی تھیں۔ بادشاہ خوش ہو گئے۔ حافظ کو بلایا اور خوش طبعی کے طور پر کہا کہ یہ حمائل ہمارے واسطے ایک جگہ سے آئی ہے۔ لو اسے تم رکھو۔ حافظ نے دیکھتے ہی پہچان لی۔ جان میں جان آگئی۔ تسلیمات بجد اور سجدۂ شکر گزاری بجا لاکر عرض کی کہ حضور نے اسی دن سید عبداللہ خاں سے فرمایا تھا۔ کہ انشاء اللہ تم پیدا کروگے وہ چیزیں کہیں نہ جانے پائینگی۔ پھر مجھ سے حال پوچھا۔ عرض کی بساور کے علاقے مزدورحوض

اور کوئیں کھودتے ہیں دن کو کام کرتے ہیں رات کو رستہ مارتے ہیں۔ انہیں نے مال چُرایا تھا۔ ایک اُن میں سے پھوٹ گیا۔ اس پیچ میں نکل آئیں۔ پھر فرمایا حافظ خاطر جمع رکھو انشاء اللہ اور اسباب بھی مل جائیگا۔ غرض کی خانہ زاد کو توحمائل اور اس بیاض سے مطلب تھا۔ کہ بزرگوں کی موروثی یادگار ہے۔ اور مجھے بڑھاپے نے ایسی تصنیفات سے عاجز کر دیا ہے۔ آخر جو فرمایا تھا وہی ہوا کہ باقی اسباب بھی بیلداروں کے پاس سے نکلا۔ اور فتحپور میں سید عبداللہ خاں نے خود آکر پیش کیا ؛

اسی سنہ میں لکھتے ہیں کہ میں وطن سے آیا۔ اور از سرِنو امامت کا حکم ہوا خواجہ دولت ناظر تعینات ہے۔ کہ خواہ نخواہ ہفتے میں ایک دفعہ چوکی پر حاضر کرے۔ ٹھیک وہی مثل ہے! احمدؔ بہ مکتب نمیرود و لے برندش ؛

اسی سنہ میں مُلّا صاحب کو بڑا رنج ہوا۔ حسین خاں ٹکریہ مرگئے۔ ان کے ہم دم ہم عقیدہ۔ دوست آقا۔ جو کچھ کہو یہ تھے۔ اگرچہ ۹۸۱ھ میں ان سے بھی کسی گومگو معاملہ پر کھٹک کر الگ ہوئے تھے۔ مگر چونکہ آج کل کے زمانہ اور اربابِ زمانہ سے بہت ناراض ہیں۔ اس لئے زیادہ رنج ہوا۔ حسین خاں ایک شیر دل سپاہی اور پکّے سُنّی مسلمان تھے۔ ان کی زندگی بھی اکبری عہد کے ایک حصہ کا رنگ الگ دکھاتی ہے۔ اس لئے اُن کا حال الگ لکھ کر داخلِ تتمہ جات کیا ہے ؛

۹۸۵ھ میں راجہ مجولہ کو بانس بریلی کے علاقے میں دامن کوہ کے انتظام کے لئے بھیجا۔ اُس نے وہاں سے ایک رپورٹ کی۔ چند درخواستوں میں سے ایک یہ تھی۔ درگاہ سے جُدا ہوکر اس صحرائے بیابان میں آگیا ہوں۔ کوئی رفیق و آشنا ساتھ نہیں۔ اگر شیخ عبدالقادر بداؤنی کو بھیج دیا جائے۔ تو وہ اس ملک کے نیک و بد سے خوب واقف ہے۔ لوگ اس کے اعتبار پر رجوع بھی ہو جائیں گے۔ اور دربار میں اُسے کوئی ایسی خدمت بھی سپرد نہیں ہے۔ اس کے حال پر مرحمت اور بندۂ درگاہ کی سرافرازی کا سبب ہوگا۔ والحکم اعلیٰ۔ خواجہ شاہ منصور نے ایک ایک فقرہ پڑھکر سُنایا۔ اور حرف بہ حرف ہر بات کا جواب جو فرمایا وہ لکھا۔ اس مطلب پر نہیں کی نہ ہاں ؎

مو بر آمد بہ کف و موے تو نامد بہ کفم	این چنین بخت کہ من دارم و این خو کہ تراست

اسی برس اجمیر کے مقام سے حسبِ معمول حاجیوں کا قافلہ روانہ کیا۔ شاہ ابوتراب کو میر حاج بنایا بہت کچھ سامان دیئے۔ اور حکم عام دیا کہ جو چاہے جائے۔ شاہ موصوف اکابر سادات شیراز سے تھے۔ اور سلاطین گجرات ان سے بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ میں نے شیخ عبدالنبی صدر سے کہا

ز لے حسین خاں کا حال تتمہ میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن غلطی سے ۴۰۲ صفحہ پر درج ہوگیا۔ یہ شروع سے اسی جگہ پر ہے۔ اس لئے میں بھی ان کو دربار میں سے اٹھا کر پائین میں بٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔ ۱۲ محمد باقر

کہ مجھے بھی رخصت لے دو۔ شیخ نے پوچھا کہ ماں جیتی ہے؟ کہا کہ ہاں۔ پوچھا بھائیوں میں سے کوئی ہے؟ کہ اس کی خدمت کرتا ہے۔ میں نے کہا گزارے کا وسیلہ تو میں ہی ہوں۔ کہا کہ ماں کی اجازت لے لو تو اچھا ہے۔ بھلا وہ کب اجازت دیتی تھیں۔ یہ سعادت بھی رہ گئی اب حسرت کے مارے بوٹیاں کاٹتا ہوں۔ اور کچھ نہیں ہو سکتا ؎

نہ کرو لطف تو کارے نہ وقت کار گذشت	نشد وصال تو روزے و روزگار گذشت

ابھی تک مُلّا صاحب کو یہ اعتقاد باقی تھا کہ بادشاہ ظل اللہ۔ نائب رسول اللہ ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں میں لشکر کے ساتھ ریواڑی کے ضلع میں تھا۔ وطن سے خبر آئی کہ ایک لونڈی کے پیٹ سے بیٹا پیدا ہوا ہے۔ مدت کے بعد اور بڑے انتظار کے بعد ہوا تھا۔ خوشی خوشی اشرفی نذر لے گیا۔ اور نام کے لئے عرض کی۔ فرمایا تمھارے باپ اور دادا کا کیا نام ہے۔ عرض کی ملوک شاہ بن حامد شاہ ان دنوں یا ہادی کا وظیفہ ورد تھا۔ فرمایا اس کا نام عبدالہادی رکھو۔ حافظ محمد ابن خطیب نے ہر چند کہا۔ نام رکھنے کے بھروسے نہ رہو۔ حافظوں کو بلاؤ اور لڑکے کی درازی عمر کے لئے قرآن پڑھواؤ میں نے خیال نہ کیا۔ آخر ۶ مہینے کا ہو کر مر گیا۔ خیر خدا میرے لئے اس کا ثواب ذخیرہ رکھے۔ اور اسے قیامت کے دن میرا شفیع کرے ؀

اسی منزل سے ۵ مہینے کی رخصت لے کر بساور آیا اور بعض ضرورتوں بلکہ فضولیوں کے سبب سے وعدہ خلافی کر کے سال بھر پڑا رہا۔ ایسی ایسی کم خدمتی اور مخالفتوں نے رفتہ رفتہ نظروں سے گرا دیا۔ اور بالکل توجہ نہ رہی۔ آج تک ۱۸ برس ہوئے۔ ۱۸ ہزار عالم سامنے سے گزر گیا۔ اسی محرومی میں مبتلا ہوں۔ نہ روے قرار ہے نہ راہ فرار ہے **رُباعی**

بختے نہ کہ با دوست بیا میزم من	صبرے نہ کہ از عشق بہ پرہیزم من
دستے نہ کہ با قضا درآویزم من	پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من

بادشاہ ۹۸۶ھ میں پنجاب کا دورہ کر کے دریا کے رستے دہلی پہنچے۔ اور آپ کشتی سے اُتر کر کشتی خاکی پر سوار ہوئے۔ سانڈنیوں کی ڈاک بٹھادی اور عین وقت پر اجمیر پہنچ کر عرس میں شامل ہوئے۔ دوسرے ہی دن رخصت ہو کر آگرہ کو پھرے۔ نور کا تڑکا تھا۔ صبح طباشیر بکھیر رہی تھی کہ ٹوڈہ کی منزل میں پہنچے۔ (مُلّا صاحب لکھتے ہیں) میں بساور سے چل کر استقبال کے لئے پہنچا ہوا تھا۔ حاضر خدمت ہو کر کتاب الاحادیث نذر گزرانی۔ اس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب بیان کئے ہیں اور نام بھی تاریخی رکھا ہے۔ کتاب کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی الحمدللہ

کہ غیرحاضری اور وعدہ خلافی کا ذکر ہی نہ آیا (۱۰۰۰ھ سے پہلے کی تصنیف ہو گی) ان کا قلم بھی آزاد کی طرح نچلا نہ رہتا تھا۔ کچھ نہ کچھ کیے جاتے تھے۔ لکھا۔ ڈال رکھا۔ ع

غنیمت جمع کن غارتگرے روزے شود پیدا

اب تک یہ حال تھا کہ آقا اپنے ملازم کو ہر وقت محبت کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ اور قدردانی اور پرورش کے خیال کر کے خوش ہوتا تھا۔ اور عقیدت مند ملازم ہر بات میں ہواخواہی۔ خوش اعتقادی اور جاں نثاری کے خیالات کو وسعت دیکر ہزار طرح کی امیدیں رکھتا تھا لیکن اب وہ وقت آگیا۔ کہ دونو اپنی اپنی جگہ آکر رک گئے اور دونوں کے خیالات بدل گئے۔ دربار اور اہل دربار کے حالات تم نے دیکھ لئے۔ عالم بدل گیا تھا۔ اور حریف نئی دنیا کے لوگ تھے۔ اور ملا صاحب کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ کہ کسی سے میل نہ کھاتی تھی۔ دینداری فقط بہانہ تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ فضل و فیضی ان کے ہم درس و ہم سبق جس طرح اعلےٰ مراتب فضل و کمال میں تھے۔ اُسی طرح اعلےٰ مراتب جاہ و جلال میں اُڑے جاتے تھے۔ اور اکثر اہل علم جو کتابی استعداد میں مُلا صاحب کے ہم پلہ بلکہ ان سے کم تھے۔ وہ زمانے کے موافق رفتار کر کے بہت بڑھ گئے تھے۔ اس لئے بھی ان کا جی چھوٹ گیا تھا۔ اور ہمت قاصر ہوگئی تھی۔ سچ پوچھو تو یہ اپنی ذات سے اسی کام کے تھے۔ جس میں جوہر شناس بادشاہ نے رکھا اور یہ اسے کرتے رہے اور اُسی میں مرگئے۔ اکبر کے حال میں جو جو باتیں میں نے لکھی ہیں اکثر انہی کی کتاب سے لی ہیں۔ اور وہ سب درست ہیں۔ مگر یہ بھی کہتا ہوں۔ کہ ملا صاحب نے انہیں بُرے اور بدنما موقع پر ترتیب دیکر دکھایا ہے۔ اور مصلحت ملکی کے امورات کو ایسے مقاموں پر سجایا ہے۔ کہ خواہ مخواہ اُن سے اکبر اور اکثر علما و امرا خصوصاً فضل و فیضی کے حق میں بے دینی اور بدنیتی کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور اس میں ضرور اُن کے رشک منصبی کو دخل تھا۔ چنانچہ اُس عرصے کے بعد زمانے کی شکایت لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ان معاملات کی ابتدا میں شیخ ابوالفضل سے ایک جلسے میں گفتگو ہوئی۔ فتح پور کے دیوان خاص میں بیٹھے تھے کہنے لگے۔ کہ ہمیں اسلام کے کل مصنفوں سے دو باتوں کا گلہ ہے۔ اوّل یہ کہ جس طرح پیغمبر صاحب کے حالات اور واقعات سال بسال لکھے اسی طرح اور پیغمبروں کے حال نہ لکھے۔ میں نے کہا قصص الانبیا تو ہے۔ بولے نہیں وہ تو بہت مجمل ہے۔ تفصیل سے لکھنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ مفسرین اور اہل تاریخ کے نزدیک اتنا ہی ثابت ہوا ہوگا۔ باقی ثبوت کو نہ پہنچا۔ جواب میں کہا۔ کہ یہ جواب نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ

کوئی ادنے پیشہ ور نہیں جن کا نام تذکرۃ الاولیا اور نفحات الانس وغیرہ میں نہیں لکھا۔ اہل بیت نے کیا گناہ کیا تھا۔ کہ انہیں نہ داخل کیا اور یہ نہایت تعجب کا مقام ہے۔ یہاں بھی جو کچھ وقت نے گنجائش دی کہا گیا۔ مگر کون سنتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمہاری رغبت کدھر زیادہ ہے۔ بولے کہ جی چاہتا ہے۔ چند روز لامذہبی کے صحرا میں سیر کروں۔ میں نے کہا۔ کہ نکاح کی قید اٹھا دو[1]۔ تو خوب ہو ؎

برداشت غل شرع بتائید ایزدی	از گردن زمانہ علیٰ ذکرہ السلام

ہنسنے لگے۔ چونکہ ان دنوں میں اور مطالب و مقاصد بھی درپیش تھے۔ میں نے گوشۂ عزلت میں جان بچائی۔ اور آیت فرار پڑھی کہ نظروں سے گر گیا۔ پہلی آشنائی بیگانگی ہو گئی۔ اور الحمد للہ کہ میں اس حال میں خوش ہوں رباعی

دل در تنگ وپو نشد نکو شد کہ نشد	جز در تو فرو نشد نکو شد کہ نشد
گفتی کہ برنجم از نکو شد کارت	دیدی کہ نکو نشد نکو شد کہ نشد

سمجھ لیا کہ نہ میں رعایت کے قابل ہوں نہ یہ خدمت کے قابل اور اس پر سراسر راضی ہوں ؎

بیا تا تکلف بہ یکسو نہیم	نہ از تو قیام و نہ از ما سلام

کبھی کبھی دور پا انداز سے کورنش کر لیتا ہوں اور دیکھ لیتا ہوں ع

کہ صحبت برنیاید تا موافق نیست مشرب ہا

دیکھئے آگے قسمت میں کیا ہے ؎

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است	صحبت گزاشتم ز تماشائیاں شدم

ان جزئیات و خصوصیات کی تفصیل اور ان معرکوں کی ترتیب سال وار سلک تحریر میں لانی ناممکن ہے۔ اس لئے اس طریق پر اکتفا کیا۔ اور خدا ہر حال میں اپنے بندہ کا حافظ اور مددگار ہے۔ اُسی کے بھروسے پر ان معاملات کے لکھنے میں دلیری کی تھی۔ ورنہ جو کچھ کیا ہے۔ احتیاط کی منزل سے دُور ہے۔ اور خدا گواہ ہے وَكَفیٰ بِاللّٰہِ شَهِيدًا کہ اس لکھنے میں دردِ دین اور ملت مرحومۂ اسلام کی دلسوزی کے سوا اور کچھ غرض نہیں ہے اور حسد اور تعصب اور عداوت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں ؎

۹۸۳ھ میں لکھتے ہیں۔ چالیس برس کی عمر میں خدا نے ایک فرزند محی الدین نام عنایت

---

[1] آزاد۔ ذرا حضرت کی فرمائش کو دیکھو اور ذوق طبع کا خیال کرو۔ کیا ارمان دل میں بھرے ہوں گے۔ جو یہ لفظ زبان سے نکلا۔ اور ان کے علو حوصلہ کو دیکھو۔ کہ ان باتوں کو کیا ہنس کر ٹال دیتے ہیں ؎

فرمایا بساور میں پیدا ہوا۔ اللہ علم نافع اور عمل مقبول نصیب کرے۔

انہی ایام میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ میں خدمت سے بچ کر الگ ہو گیا تھا۔ اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ لیا تھا۔ وطن سے پھر کر آیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اجمیر کے مقام میں قاضی علی نے مجھے بھی پیش کیا۔ وہی ہزار بیگھہ مدد معاش کہ وقت عزیز کے برباد کرنیوالی ہے۔ اس کا نام بھی سنایا[1]

بدرگاہ حکام و درگاہ و بیگہ	روی تا کنی بیگہ چند حاصل

فرمایا کہ میں جانتا ہوں۔ اس کے فرمان میں کچھ شرط بھی لگائی تھی؟ عرض کی۔ ہاں۔ بشرطِ خدمت۔ فرمایا۔ پوچھو کچھ ضعف تھا کہ حاضر نہ ہو سکے۔ غازی خاں بدخشی جھٹ بول اُٹھے ضعفِ طالع ابوالفضل نے بھی زور دیا[2]۔ مقربوں میں سے ایک ایک نے امامت سابق کے لئے سفارش کی۔ یہاں نماز معزول ہو گئی تھی۔ اور امامت بھی تخفیف میں آگئی تھی۔ شہباز خاں بخشی نے عرض کی۔ خدمت میں تو یہ ہمیشہ ہی رہتے ہیں۔ فرمایا ہم کسی سے زبردستی خدمت نہیں چاہتے۔ اگر خدمت نہیں چاہتا تو آدھی زمین رہی۔ میں نے فوراً تسلیم کی (یہ گستاخانہ حرکت) نہایت ناگوار گزری اور منہ پھیر لیا۔ قاضی علی نے پھر عرض کی کہ اس کے باب میں کیا حکم ہے۔ شیخ عبدالنبی صدر ابھی نکالے نہ گئے تھے۔ لشکر ہی میں تھے۔ فرمایا ان سے پوچھو۔ کہ بغیر خدمت کے کتنی زمین کا استحقاق تھا۔ شیخ نے مولانا الہداد امروہہ کی زبانی کہلا بھیجا کہ عیال وار ہے۔ اور سنا جاتا ہے۔ کہ خرچ بھی رکھتا ہے حضور اس طرح فرماتے ہیں تو سات آٹھ سو بیگھہ تو ضرور چاہیئے۔ مقربانِ دربار نے یہ عرض بھی مناسب نہ سمجھی اور مجھے حضوری خدمت پر مجبور کیا۔ ناچار پھر پھنس گیا ع

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اور یہ ساری ناراضی اُسی بات پر تھی۔ کہ داغ کی خدمت کے لئے کہا اور بار بار کہا کیوں نہ قبول کر لی اور میں بھی سمجھتا رہا اور یہی کہتا رہا ہے

شادم کہ یک سوار ندارم پیادہ ام	فارغ زقید شاہم و از شاہزادہ ام

یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ کہ مُلّا صاحب نے اپنی تاریخ میں غیر کی یا اپنی کوئی بات چھپائی نہیں۔ لکھتے ہیں۔ مظہری نام ایک لونڈی تھی۔ کہ جس میں ظہور قدرت کا نمونہ تھا۔ میں اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کے عشق نے ایسی آزادی اور وارستگی طبیعت میں پیدا کی۔ کہ سال بھر برابر بساور میں پڑا رہا

[1] دیکھو تتمہ صفحہ ۸۱۰۔ [2] آفرین ہے فیضی و ابوالفضل کی ہمت و مروت کو کبھی بُرے وقت میں ان کے لئے کلمہ خیر سے نہ چوکے۔ حق یہ ہے کہ جب ایسے تھے۔ تب ایسے رُتبے کو پہنچے تھے۔

اور عجیب عجیب عالم دل پر گزر گئے۔ ۹۹۸ھ میں برس دن کی غیرحاضری کے بعد فتح پور میں جا کر ملازمت حاصل کی۔ ان دنوں سفر کابل سے پھر کر آئے تھے۔ شیخ ابو الفضل سے پوچھا اس سفر میں یہ کیونکر رہ گیا تھا۔ عرض کی یہ تو مدد معاشیوں میں ہیں۔ بات ٹل گئی۔ کابل کے پاس بھی صدر جہاں سے کہا تھا۔ کہ جو لوگ اہل سعادت ہیں ساتھ ہیں یا رہ گئے ہیں؟ دونوں کی فہرست پیش کرو۔ خواجہ نظام الدین مرحوم مصنف تاریخ نظامی سے نئی نئی شناسائی ہوئی تھی۔ مگر ایسی ہوئی تھی گویا سیکڑوں برس کی محبت تھی۔ دلسوزی اور الفت طبعی سے (کہ سب پر عام اور مجھ پر خاص تھی) بیمار لکھوا دیا اور سچ لکھوایا تھا۔ کیونکہ خدا کے ساتھ معاملہ آسان ہے۔ بندوں کا ڈر اور اُس سے طمع بڑا سخت مرض ہے۔ مدت مفارقت میں خواجہ مذکور نے خط پر خط لکھے۔ کہ دیر بہت ہوئی ہے۔ کم سے کم لاہور۔ دلی۔ متھرا جہاں تک ہو سکے استقبال میں کوشش کرنی چاہیے کہ دنیا کی رسم ہے اور احتیاط شرط ہے۔ اور مجھے اُس عالم میں ایک ایک ساعت عمر جاوداں سے بہتر تھی۔ عاقبت اندیشی کجا اور نفع و نقصان کا خیال کجا۔ آخر توکل خدا نے اپنا کام کیا ؂

تو باخدائے خود انداز کار خوش دل باش	کہ رحم اگر نہ کند مدعی خدا بکند

اس عالم میں کبھی خواب میں شعر موزوں ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ رات کو سوتے میں یہ شعر کہا مدتوں پڑھتا رہا اور روتا رہا ؂

آئینہ ما روئے ترا عکس پذیر است	گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

عزت اور جلال الٰہی کی قسم ہے۔ آج ۱۷ برس ہوئے ہیں۔ اب تک وہ لذت دل سے نہیں جاتی۔ اور جب یاد کرتا ہوں زار زار روتا ہوں۔ کاش جبھی دیوانہ ہو جاتا۔ ننگے سر ننگے پاؤں نکل جاتا۔ اور جنجال سے چھٹ جاتا ؂

خوش آنکہ دید روے ترا و سپرد جاں	آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

وہ فیض دل کو پہنچا۔ اور وہ کچھ سمجھا کہ عمروں تک لکھوں اور شکر کروں تو عشر عشیر بھی نہ ادا ہو۔

۹۹۰ھ میں حکم ہوا کہ ہجرت کے ہزار سال پورے ہو گئے۔ سب جگہ ہجری تاریخ لکھتے ہیں۔ اب ایک ایسی تاریخ کی کتاب لکھی جائے جس میں پورا ہزار سال کا حال شاہان اسلام کا درج ہو درحقیقت مطلب یہ تھا کہ اور تاریخوں کی ناسخ ہو۔ اس کا نام تاریخ الفی ہو۔ سنوں میں بجائے ہجرت کے لفظ رحلت لکھیں۔ اول روز وفات سے برس برس دن کا حال ، شخصوں کے سپرد ہوا۔ چنانچہ سال اول نقیب خاں کو دوم شاہ فتح اللہ کو۔ اسی طرح حکیم ہمام حکیم علی۔ حاجی ابراہیم سرہندی

کہ انہی دنوں میں گجرات سے آیا تھا۔ مرزا نظام الدین احمد اور فقیر (ملا صاحب بدایونی) دوسرے ہفتے میں پھر اسی طرح ۷ آدمی تجویز ہوئے۔ اسی طرح جب ۳۵ برس کا حال مرتب ہوا تو ایک شب میری تحریر میں ساتویں برس کا حال پڑھا جاتا تھا اس میں خلیفہ حقانی شیخ ثانی کے زمانے میں بعض روایتیں تھیں۔ جس میں شیعوں اور سنیوں کا اختلاف ہے۔ نماز کے پانچ وقتوں کے تقرر کا ذکر تھا۔ اور شہر نصیبین کی فتح کے ذکر میں تھا۔ کہ بڑے بڑے مرغوں کے برابر چیونٹے وہاں سے نکلے۔ بادشاہ نے اس مقام پر بعید مناقشہ اور مواخذہ کیا۔ آصف خاں ثالث یعنی مرزا جعفر نے بہت بد مددی کی۔ البتہ شیخ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی ٹھیک ٹھیک توجیہیں کرتے تھے۔ مجھ سے پوچھا کہ یہ باتیں کیونکر لکھیں؟ میں نے کہا جو کتابوں میں دیکھا تھا۔ سو لکھا ہے۔ اختراع نہیں کیا۔ اس وقت روضۃ الاحباب اور اور تاریخ کی کتابیں خزانے سے منگا کر نقیب خاں کو دیں کہ تحقیق کرو۔ اس نے جو کچھ تھا وہ کہہ دیا۔ خدا کی عنایت کہ اُن بیجا گرفتوں سے مخلصی ہوئی۔ چھتیسویں سال سے ملا احمد ٹھٹوی کو حکم ہوا کہ تم تمام کرو۔ یہ حکم حکیم ابوالفتح کی سفارش سے ہوا۔ ملا احمد متعصب شیعہ تھا۔ جو چاہا سو لکھا اس نے چنگیز خاں کے زمانے تک دو جلدیں تمام کیں۔ ایک رات مخالفت مذہب کے جوش سے مرزا فولاد برلاس اس کے گھر آیا۔ اور کہا کہ حضور نے یاد کیا ہے۔ وہ گھر سے نکل کر ساتھ ہوا۔ رستے میں مار ڈالا۔ اور خود بھی سزا کو پہنچا۔ پھر ۹۹۰ھ تک آصف خاں نے لکھا۔ ۱۰۰۰ھ میں پھر مجھے حکم ہوا۔ کہ اس تاریخ کو سرے سے مقابلہ کرو اور سنوں کے پس و پیش کو درست کرو۔ اول دوم جلد کو درست کیا۔ اور جلد سوم کو آصف خاں پر چھوڑا۔ شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں کہ اس کا دیباچہ میں نے لکھا ہے۔

اسی برس کے وقائع میں سے مہابھارت کا ترجمہ ہے۔ یہ ہندوؤں کی بڑی نامی کتابوں میں سے ہے۔ رنگ رنگ کے قصے۔ نصیحتیں۔ مصلحتیں۔ اخلاق۔ آداب معاش۔ معرفت۔ اعتقاد۔ بیان مذاہب۔ طریق عبادات اور اس کے ذیل میں کوروں پانڈوں کی لڑائی کہ ہندوستان کے فرمانروا تھے۔ جسے ۴ ہزار برس سے زیادہ ہوئے۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ۸ ہزار برس سے زیادہ ہوئے۔ ظاہرا حضرت آدم سے بھی پہلے ہی ہوئے۔ ہند کے لوگ اس کے پڑھنے اور لکھنے کو عبادت عظیم جانتے ہیں

---

[1] دل چاہتا تھا کہ جیسے ملا صاحب پاک نویس مورخ ہیں ویسا ہی اُن کا آئینہ بھی داغ تعصب سے پاک نظر آئے۔ مگر افسوس انہوں نے ملا احمد مظلوم کے باب میں جو فحش و فضیحت کی نجاست اُچھالی ہے لاحول ولا قوۃ۔ قلم تحریر مارے شرم کے سر نہیں اٹھاتا اور مجھے قانون تہذیب اجازت نہیں دیتا۔ کہ دامن ورق کو اس کی نقل سے نجس کروں۔ میں شیعہ بھائیوں کی بدزبانی پر خون جگر کھاتا تھا۔ اس سُنّی بھائی نے دل جلا کر خاک کر دیا۔

اور مسلمانوں سے چھپاتے ہیں (اکبر پر چوٹ کر کے کہتے ہیں) اس حکم کا سبب یہ تھا۔ کہ انہیں دنوں میں شاہنامہ باتصویر لکھوایا تھا۔ اور امیر حمزہ کا قصہ بھی ۱۷ جلدوں میں باتصویر مرتب ہو کر ۱۵ برس کے عرصے میں تیار ہوا تھا۔ قصۂ ابومسلم اور جامع الحکایات وغیرہ کو بھی مکرر سنا اور لکھوایا۔ خیال آیا کہ یہ سب شاعری اور شاعروں کی تراشیں ہیں۔ مگر کسی مبارک وقت میں لکھی گئی تھیں۔ اور ستارہ موافق تھا۔ اس لئے خوب شہرت پائی ہے۔ پس ہندی کتابیں کہ دانایان عابد و مرتاض نے لکھی ہیں۔ اور سب صحیح اور قطعاً درست ہیں۔ اور ان لوگوں کے دین کا اور عقاید اور عبادت کا مدار اس پر ہے۔ ہم انہیں اپنے نام سے فارسی میں کیوں نہ ترجمہ کریں۔ کہ عجیب ہیں اور نئی باتیں ہیں۔ دین اور دنیا کی سعادت ہے۔ اور دولت وحشمت بے زوال کا باعث ہے۔ اور کثرت اموال و اولاد کا سبب ہے۔ چنانچہ اس کے خطبے میں یہی لکھا ۔ غرض اس کام کیلئے خود پابندی اختیار کی اور پنڈتوں کو جمع کیا کہ اصل کتابوں کا ترجمہ بتایا کریں۔ چند شب آپ اس کے معنی نقیب خاں کو سمجھاتے رہے۔ وہ فارسی میں لکھتا گیا۔ تیسری رات فقیر (مُلا صاحب) کو بلا کر فرمایا۔ کہ نقیب خاں کے ساتھ شامل ہو کر لکھا کرو۔ تین چار مہینے تک ۱۸ میں سے دو پرب (فن) میں نے لکھے۔ اس پر سناتے وقت کیا کیا اعتراض نہ سُنے۔ حرام خور اور شلغم خورہ کیا تھا؟ وہ یہی اشارے تھے۔ گویا میرا حصہ ان کتابوں میں یہ تھا۔ سچ ہے قسمت کا لکھا ضرور ہوتا ہے۔ پھر تھوڑا ملا شیری اور نقیب خاں نے لکھا۔ اور تھوڑا حاجی سلطان تھانیسری نے تنہا تمام کیا۔ پھر شیخ فیضی کو حکم ہوا۔ کہ نظم ونثر لکھو۔ وہ بھی دو (پرب) فن سے آگے نہ بڑھے۔ پھر حاجی مذکور نے دوبارہ لکھی۔ اور جو جو فروگذاشتیں پہلی دفعہ رہ گئی تھیں انہیں طابق النعل بالنعل درست کیا۔ ۱۰۰ جز رکیک ہیچ لکھے ہوئے تھے۔ اور ترجمہ کی مطابقت میں نقطۂ مگس کی بھی تاکید تھی کہ رہ نہ جائے۔ آخر حاجی بھی ایک سبب سے بھکر کو نکالا گیا۔ اب اپنے وطن میں ہے۔ اکثر ترجمہ بتانے والے کوروں اور پانڈوں کے پاس پہنچے۔ جو باقی ہیں انہیں خدا نجات دے اور توبہ نصیب کرے۔ اس کا نام رزمنامہ رکھا۔ اور دوبارہ باتصویر لکھوا کر امرا کو حکم ہوا کہ مبارک سمجھ کر نقل کروائیں۔ شیخ ابوالفضل نے دو جز کا خطبہ بھی لکھ کر لگایا۔

ف۔ بختاور خاں نے مراۃ العالم میں لکھا ہے۔ کہ مُلا صاحب کو خدمت مذکور کے صلہ میں ۱۵۰ اشرفی اور دس ہزار تنکہ سیاہ انعام ہوئے۔

۹۹۲ھ میں لکھتے ہیں۔ فقیر کو حکم دیا کہ رامائن کا ترجمہ کرو۔ یہ مہابھارت سے بھی پہلے کی کتاب ہے ۲۵ ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک ۶۵ حرف کا ہے۔ ایک افسانہ ہے کہ رامچندر اودھ کا راجہ تھا۔ اُس کو رام بھی کہتے ہیں۔ اور قدرت الٰہی کا ظہور سمجھ کر پوجا کرتے ہیں۔ مجمل حال اس کا یہ ہے۔ کہ اُس کی رانی سیتا کو ایک دہ سرا دیو عاشق ہو کر لے گیا۔ وہ جزیرہ لنکا کا مالک تھا۔ رامچندر اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرہ میں پہنچا۔ بیشمار لشکر بندروں اور ریچھوں کا جمع کیا۔ کہ محاسب وہم کو اس کے شمار کی خبر نہیں۔ چار کوس کا پل سمندر کا باندھا۔ بعض بندروں کو تو کہتے ہیں۔ کود پھاند کر اچھل گئے۔ بعضے اپنے پاؤں سے پل اترے۔ ایسی بعید العقل باتیں بہت ہیں۔ کہ عقل ہاں کہتی ہے نہ ناہ۔ بہر تقدیر رامچندر بندر سوار پُل سے اُترا۔ ایک ہفتہ گھمسان کی لڑائی لڑے راون کو بیٹوں پوتوں سمیت مارا۔ ہزار برس کا خاندان برباد کیا۔ اور لنکا اس کے بھائی کو دیکر پھرا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ کہ رامچندر ۱۰ ہزار برس تمام ہندوستان کی حکومت کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ اس فرقہ کا خیال ہے۔ کہ عالم قدیم ہے کوئی زمانہ نوع بشر سے خالی نہیں۔ اور اس واقعہ کو لاکھ در لاکھ برس گزر گئے۔ اور آدم خیر البشر کو (جسے سات ہزار برس ہوئے) مانتے ہی نہیں۔ یہ واقعات یا تو سچ نہیں فقط کہانی ہیں۔ اور خیال محض۔ جیسے شاہنامہ۔ امیر حمزہ کا قصہ۔ یا اس زمانے کا ہوگا کہ جنات اور حیوانات کی سلطنت روئے زمین پر تھی۔ ان دنوں کے واقعات عجیبہ میں سے یہ ہے۔ کہ دیوان خانہ فتح پور میں ایک حلال خور کو لائے اور کہتے تھے۔ کہ عورت تھی مرد ہو گیا۔ چنانچہ ایک پنڈت رامائن کے مترجموں میں سے دیکھ آیا۔ کہتا تھا ایک عورت ہے شرم کے مارے گھونگٹ نکالے ہوئے ہے بولتی نہیں۔ حکما اس امر کی تائید میں دلیلیں پیش کرتے تھے۔ کہ ایسے معاملے بہت پیش آئے ہیں ◆

۹۹۳ھ شروع ہوا نوروز کے جاہ وجلال کا عالم کیا لکھا جائے۔ آئین بندی تو آئین میں داخل ہو گئی تھی سامرا کے ہاں ضیافتوں میں گئے اور نذرانہ بھی لئے۔ زیادہ یہ ہوا کہ نذریں اور پیشکش سب سے لئے۔ فاضل بداؤنی لکھتے ہیں۔ ذرۂ بے مقدار کسی شمار میں نہیں۔ ہاں ہزار بگیہ زمین کے سبب سے نام کا ہزاری ہے حضرت یوسف والی بڑھیا کی مثل یاد کر کے ۴۰ روپے لے گیا اور قبول کا درجہ پایا۔ ع

خدمت پسند نیست دگر خدمتے بیار

اب فاضل مذکور دربار کی صورت حال سے بہت تنگ تھے۔ موقع وہ تھا کہ عبدالرحیم خانخاناں کی بہار اقبال نوروز منا رہی تھی۔ خود ۹۹۳ھ میں لکھتے ہیں۔ کہ انہی دنوں میں مرزا نظام الدین احمد

نے گجرات سے مجھے لکھا کہ خانخاناں نے یہاں سے روانہ ہوتے وقت وعدہ کیا ہے۔ کہ ملا الہ داد امروہ
کو اور تم کو حضور سے عرض کرکے لیتا آؤں گا۔ جب خانخاناں پہنچیں۔ تو بموجب آداب مقررہ کے تم
جاکر اُن سے ملاقات کرو اور حضور سے اجازت لیکر ساتھ چلے آؤ اور اس ولایت کی بھی سیر کرو۔ کہ
عجب عالم ہے۔ پھر جیسی صلاح ہوگی کیا جائے گا۔ فتح پور کے دیوان خانہ میں مکتب خانہ ہے۔ یہیں
مترجم بیٹھتے ہیں۔ جب خان خاناں یہاں آئے تو میں جاکر ملا۔ مگر وہ جھٹ پٹ رخصت ہوکر پھر گجرات
کو روانہ ہوگیا۔ اور جو ارادہ میں نے نجات کا سرمایہ سمجھا تھا۔ وہ اندر ہی اندر رہگیا۔ اب بھی مدت گزر گئی۔
سچ ہے۔ وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ جو ہم چاہتے ہیں نہیں ہوتا خدا چاہتا ہے سو ہوتا ہے ٭

افسوس اب وہ وقت آیا کہ ان کے دوست آشنا دنیا سے چلنے شروع ہوگئے۔ لکھتے ہیں کہ بادشاہ
کابل کو جاتے تھے۔ سیالکوٹ کی منزل میں ملّا الہ داد امروہہ نے سینے پر داغ کھایا۔ اس کی حرارت
جگر تک پہنچی حکیم حسن کا مسہل ہوا۔ اور دو دن میں واصل حق ہوئے۔ ع

مرگ نوش است شربتت بادا

خوب یار تھا۔ اللہ رحمت کرے ؎

اے دل ترا کہ گفت بدنیا قرار گیر	ایں جان نازنین را اندر حصار گیر
بنگر کہ تا تو آمدہ چند کس برفت	آخر یکے ز رفتن شاں اعتبار گیر

۱۰۰۲ھ میں لکھتے ہیں رامائن کا ترجمہ کرکے رات کے جلسے میں پیش کی خاتمہ اس شعر پر تھا ؎

ما قصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند	جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

بہت پسند آیا پوچھا کے جز ہوئے؟ عرض کی مسودہ ۷۰ جز کے قریب تھا۔ صاف ہوکر ۱۲۰ ہوئے
فرمایا کہ جیسا مصنفوں کا دستور ہے۔ ایک دیباچہ بھی لکھ دو۔ مگر اب طبیعت میں امنگ نہیں رہی
اور لکھتا تو بے نعت لکھتا اس لئے ٹال گیا۔ اس نامۂ سیاہ سے کہ میرے نامۂ عمر کی طرح تباہ ہے خدا سے
پناہ مانگتا ہوں۔ کفر کی نقل کفر نہیں۔ صاحب فرمان کے حکم سے لکھی ہے۔ اور بکراہت لکھی۔ ڈرتا ہوں
کہ اس کا پھل پھٹکار نہ ملے۔ اور توبہ کہ توبۂ یاس نہیں درگاہ تواب وہاب میں قبول ہو ٭

لکھتے ہیں۔ کہ انہی دنوں میں ایک دن مترجموں کی خدمتوں پر نظر کرکے حکیم ابوالفتح سے فرمایا۔ کہ
بالفعل یہ شال پوشاک خاص اسے دیدو۔ گھوڑا اور خرچ بھی عنایت ہوگا۔ اور شاہ فتح اللہ عضد الدولہ
سے فرمایا کہ علاقہ بساور در دست تمہاری جاگیر میں کیا۔ جو جاگیر اس میں سے اماموں کو دی ہوئی ہے
وہ بھی تمہیں معاف۔ پھر میرا نام لیکر کہا کہ یہ جوان بداؤنی ہے۔ ہم نے اس کی مدد معاش سوچ سمجھ کر

بساور سے بداؤں میں کر دی جب میرا فرمان تیار ہؤا تو برس دن کی رخصت لیکر بساور پہنچا۔ وہاں سے بداؤں آیا۔ ارادہ تھا۔ کہ گجرات احمد آباد چل کر مرزا نظام الدین احمد سے ملوں۔ کیونکہ ۹۹۲ھ میں اس نے بُلا بھیجا تھا۔ تعلقات میں پھنس کر رہ گیا ؎

نیم ملول که کارم نکو نشد بدشد ۔ شود شود نشود گو مشو چه خواهد شد

علاقہ کشمیر میں شاہ آباد ایک قصبہ ہے۔ ملّا شاہ محمد شاہ آبادی فاضل جامع معقول و منقول تھے۔ انہوں نے حسب الحکم کشمیر کی تاریخ لکھی تھی۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ ۹۹۹ھ میں فرمائش کی۔ کہ اسے خلاصہ اور سلیس فارسی میں لکھو۔ دو مہینے میں تیار کرکے گزرانی اور اخیر میں لکھا ؎

درعرض یک دو ماه بتقریب حکم شاه ۔ این نامه شد چو خط پری پیکران سیاه

پسند ہو کر کتب خانہ میں داخل ہوئی۔ سلسلے میں پڑھی جاتی تھی۔ آزاد۔ افسوس کہ اصل اور اصلاحی دونوں تاریخیں اب نہیں ملتیں۔ ہاں ابوالفضل نے آئین اکبری میں شاہ محمد کی کتاب کا اشارہ کیا ہے کہ راج ترنگنی سے ترجمہ ہوئی تھی اور وہ سنسکرت میں ہے ؛

ایک دن حکیم ہمام نے معجم البلدان کہ ۲۰۰ جز کی ضخامت ہوگی۔ بڑی تعریف سے پیش کی۔ اور کہا کہ یہ عربی ہے۔ فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو بہت خوب ہے۔ اس میں بہت حکایات عجیب و فوائد غریب ہیں۔ مُلّا احمد ٹھٹھہ۔ قاسم بیگ۔ شیخ منوّر وغیرہ دس بارہ شخص ایرانی اور ہندی جمع کرکے جُز تقسیم کر دئیے مترجموں کے آرام کے لئے فتح پور میں پُرانے دیوان خانہ میں مکتب خانہ تھا۔ ملّا صاحب کے حصے میں دسؔ جُز آئے۔ ایک مہینہ میں تیار کر دئے۔ سب سے پہلے گزرانے اور اس حُسن خدمت کو رخصت کا وسیلہ کیا کہ قبول ہوئی ؛

اگرچہ ان کی قابلیت اور کارگزاری ہمیشہ اکبر کی جوہر شناسی کو مرحمت کے رستے پر کھینچ لاتی تھی۔ مگر دونوں کے خیالات کا اختلاف بیچ میں خاک اُڑا کر کام خراب کر دیتا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ کہ بڑے تاَمّل سے ۵ ماہ کی اجازت ہوئی۔ رخصت کے وقت خواجہ نظام الدین نے عرض کی کہ ان کی ماں مرگئی ہے۔ عیال کی تسکین و تسلّی کے لئے جانا ضرور ہے۔ رخصت دی مگر ناراضی کے ساتھ۔ سلام کے وقت صدر جہاں نے مکرّر کہا۔ سجدہ بکُن۔ وہ مجھ سے ادا نہ ہؤا۔ فرمایا جانے دو۔ بلکہ رنجیدگی کے سبب سے کچھ دیا بھی نہیں ؛

غرض خواجہ نظام الدین شمس آباد اپنی جاگیر پر جاتے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وطن میں جا کر ایک کتاب لکھی۔ کہ نجات الرشید اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ خواجہ موصوف نے

مجھے ایک فہرست گناہان صغیرہ و کبیرہ کی دی۔ اور کہا کہ یہ بہت مجمل ہے۔ بہ تفصیل اور با دلیل نہیں۔ تم اسے اس طرح لکھ دو کہ نہ بہت طولانی ہو نہ ایسی مختصر وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس کی تعمیل واجب سمجھی وغیرہ وغیرہ ؀

آزاد۔ یہ مصنفوں کے معمولی بہانے ہیں۔ درحقیقت کتاب مذکور میں اُن مسائل کی تفصیل ہے جو اُن دنوں میں علمائے دیندار یا اکبری دربار میں اختلافی شمار ہوتے تھے۔ اُس میں مہدوی فرقہ کا حال بھی مفصل ہے۔ اُسے اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ کہ ناواقف انہیں بھی مہدویت پر مائل سمجھتے ہیں۔ مگر بات یہ ہے۔ کہ میر سید محمد جونپوری جنہوں نے اصل میں مہدویت کا دعویٰ کیا۔ انکے داماد شیخ ابو الفضل گجراتی سے مُلا صاحب کو رابطہ اور کمال اعتقاد تھا۔ اور بعض ذکر و شغل بھی ان سے حاصل کئے تھے۔ علاوہ برآں فرقہ مذکور کے بانی یا مجتہد کمال شدت کے ساتھ مسائل شرعی کے پابند تھے۔ اور یہ ایسے لوگوں کے عاشق تھے۔ شاید اس لئے ان کی باتوں کو جگہ جگہ اچھی طرح بیان کیا ہے ؀

اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ ۹۹۹ھ میں گھر میں بیمار ہوگیا اور بداؤں پہنچا۔ اہل و عیال کو بھی وہیں لایا۔ معالجہ کرتا رہا۔ مرزا پھر لاہور چلے آئے۔ میں گھر رہا۔ نامۂ خرد افزا (سنگھاسن بتیسی) کتاب خانے میں سے کھوئی گئی تھی۔ سلیمہ سلطان بیگم نے برابر حضور میں تقاضا کرنا شروع کیا۔ اس کے لئے مجھے کئی دفعہ یاد کیا۔ ہر چند دوستوں کے قاصد بھی بداؤں پہنچے۔ مگر ایسے ہی سبب ہوئے کہ آنا نہ ہوا۔ حکم دیا کہ مدد معاش بند کر دو۔ اور آدمی بھیجو کہ گرفتار کر لائیں۔ مرزائے مذکور کو خدا غریق رحمت کرے غائبانہ یار فروشیاں کیں۔ شیخ ابو الفضل نے مکرر عرض کی کہ کوئی ایسا ہی امر مانع ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ تو ٹکنے والا نہیں ؀

لکھتے ہیں کہ جب برابر حکم پہنچنے شروع ہوئے۔ تو بداؤں سے روانہ ہوا۔ حضور کشمیر کے سفر میں تھے بھنبر کی منزل میں حاضر ہوا۔ حکیم ہمام نے عرض کی کہ کورنش کی آرزو رکھتا ہے۔ فرمایا کہ وعدے سے کتنے دن بعد آیا ہے۔ عرض کی۔ پانچ مہینے۔ پوچھا کس تقریب سے۔ عرض کی بیماری کے سبب سے۔ اکابر بداؤں کا محضر اور حکیم عین الملک کی عرضی بھی اسی مضمون کی دتی سے لایا ہے۔ سب کچھ پڑھ کر سنایا۔ فرمایا۔ بیماری پانچ مہینے نہیں ہوتی۔ اور کورنش کی اجازت نہ دی۔ شاہزادہ دانیال کا لشکر رہتاس پر پڑا تھا۔ میں شرمندہ۔ افسردہ۔ دل مردہ۔ غمگین وہاں آن پڑا۔ ان دنوں شیخ فیضی دکن کی سفارت پر تھے۔ جب ان کی مصیبت کی خبر سنی تو ایک عریضہ سفارش میں لکھا۔ انشائے فیضی میں درج ہے ؀

عالم پناہا! درینولا دخویش مُلا عبد القادر از بداؤں مضطرب حال گریاں و بریاں رسیدہ وانمودند کہ مُلا عبد القادر چندگاہ بیمار بود و از موعدے کہ بدرگاہ داشتہ متخلف شدہ و او را کسان بادشاہی بہ شدت تمام بردہ اند تا عاقبتش کجا انجامد و گفتند کہ امتداد بیماری او بعرض اشرف نرسیدہ شکستہ نواز اِ ملا عبد القادر

ل شیخ علائی اور فرقہ مہدوی کا حال جو کچھ بہم پہنچا دیکھو تتمہ صفحہ ۸۰۲ ؀

اہمیت تمام دارد وعلوم رسمی آنچہ ملّایان ہندوستان میخوانند خواندہ۔ پیش وقت اَبَوی کسب فضیلت کردہ و قریب بہ سی وہفت سال مے شود کہ بندہ اورا مے دانم وبافضیلت علمی طبع نظم وسلیقۂ انشائے عربی و فارسی وچیزے از نجوم ہندی وحساب۔ یاد داشت درہمہ وادی ووقوف در نغمۂ ولایت وہندی وخبرے از شطرنج کبیر وصغیر دارد ومشق بین بقدرے کردہ۔ باوجود بہرہ مند بودن ازیں ہمہ فضائل بہ بے طمعی وقناعت وکم تردد نمودن۔ وراستی ودرستی وادب ونامرادی وشکستگی وگزشتگی وبے تعینی وترک اکثر رسوم تقلید ودرستی اخلاص وعقیدت بدرگاہ بادشاہی موصوف ست وقتے کہ لشکر بسرکوبی تعین مے شد او التماس نمودہ بامید جان سپاری رفت وآنجا ترددے کرد وزخمی ہم شد ولعرض رسیدہ انعام یافت۔ اول مرتبہ او راجلال خاں قورچی بدرگاہ آوردہ بعرض رسانیدہ بود کہ من املاے برائے حضرت پیدا کردہ ام کہ حضرت را خوش خواہد آمد۔ ومیر فتح اللہ اندکے از احوال او بعرض اقدس رسانیدہ بود وخدمت اخوی برحال او مطلع اند۔ اما مشہور است ع

چو طالع زخر دارے ہنر بہ

چوں درگاہ راستانست۔ دریں وقت کہ بے طاقتی زور آوردہ۔ بندہ خود را حاضر پایہ سریر والا دانستہ احوال او بعرض رسانید۔ اگر دریں وقت بعرض نمیرسانید۔ نوعے از ناراستی وبے حقیقتی بود۔ حق سبحانہ بندہ ہائے درگاہ را درسایۂ فلک پایۂ حضرت بادشاہ برراہِ راستی وحق گزاری وحقیقت شناسی قدم ثابت کرامت فرماید وآں حضرت را برکل عالم وعالمیان سایہ گستر وشکستہ پرور وعطاپوش وخطاپوش بہ ہزاران ہزار دولت واقبال وعظمت وجلال دیرگاہ داراد۔ بعزت پاکانِ درگاہِ الٰہی و روشندلان سحرخیز صبح گاہی۔ آمین۔ آمین ٭

یہ عریضہ اگرچہ بروقت نہ پہنچ سکا۔ اُس وقت ڈاک نہ تھی۔ تار نہ تھا۔ مگر جب لاہور میں آکر حضور میں پڑھا گیا تو سفارش کا انداز بہت پسند آیا۔ شیخ ابوالفضل کو حکم دیا کہ اکبرنامہ میں نمونے کے طور پر داخل کردو اور فاضل مذکور نے بھی اپنی لیاقت کا سرٹیفکیٹ سمجھا۔ یہی سبب ہے کہ اپنی تاریخ میں بجنسہ نقل کردیا ٭

غرض فاضل مذکور شاہزادہ کے لشکر میں آکر پڑے۔ لکھتے ہیں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں حصن حصین کا ختم اور قصیدۂ بردہ کا وظیفہ شروع کیا۔ اللہ بیکسوں اور بیقراروں کی خوب سنتا ہے۔ الحمدللہ دُعا قبول ہوئی۔ پانچ مہینے بعد لشکر شاہی کشمیر سے پھرا اور لاہور میں آکر خدا نے پھر بادشاہ کو مہربان کیا ٭

جامع رشیدی تاریخ کی ایک بڑی موٹی کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ مطلوب تھا۔ یاران مشفق وموافق

مرزا نظام الدین احمد وغیرہ نے مجلس خلوت میں غائبانہ میرا ذکر کیا۔ بارے ملازمت کا حکم ہوا۔ میں حاضر ہؤا۔ ایک اشرفی نذر گزرانی۔ بڑی التفات سے پیش آئے۔ سب ندامت شرمساری۔ بعد دشواری۔ آسانی سے خدا نے رفع کر دی۔ الحمد للہ علےٰ ذالک۔ جامع رشیدی کے انتخاب کے لئے حکم ہوا۔ کہ علامی شیخ ابوالفضل کی صلاح سے کرو۔ اس میں شجرہ خلفائے عباسیہ۔ مصریہ۔ بنی امیہ کا تھا۔ کہ آنحضرت پرختم ہوتا ہے۔ اور وہاں سے حضرت آدم تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح تمام انبیاء اولوالعزم کے شجرے عربی سے فارسی میں لکھ کر حضور میں گزرانے اور خزانۂ عامرہ میں داخل ہوئے ✦

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو تو ملا احمد فضی علیہ ما علیہ نے اور تیسرا آصف خاں نے لکھا ہے۔ ملّا مصطفےٰ کاتب لاہوری کہ یارِ اہل ہے۔ اور احدیوں میں ملازم ہے۔ اب مجھے حکم ہوا تھا کہ اسے ساتھ لیکر پہلے دفتر کا مقابلہ اور تصحیح کرو۔ چنانچہ اسے بھی تمام کیا۔ شرف آفتاب کا جشن تھا۔ یہی نذرانہ گزرانا۔ اور تحسین کا درجہ پایا۔ فرمایا کہ اس نے بہت متعصبانہ لکھا ہے دفتر دوم کو بھی صحیح کرو۔ ایک برس اس میں بھی صرف کیا۔ مگر اپنے تعصب کی تہمت سے ڈر کر سلسلۂ سال کو مسلسل کیا۔ مطالب سے متعرض نہیں ہؤا اور اصل کو ذرا نہیں بدلا کہ ایسا نہ ہو۔ اور جھگڑا اٹھ کھڑا ہو۔ گویا مرض کو طبیعت پر چھوڑ دیا ہے کہ آپ دفع کرے گی ✦

لطیفہ۔ ایک شخص کو دیکھا کہ گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھا رہا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ گٹھلیاں کیوں نہیں پھینکتے۔ کہا کہ میری تول میں یونہی چڑھی ہیں۔ یہی حال میرا ہے کہ قسمت میں یونہی لکھا ہے ✦

اسی سال میں خواجہ ابراہیم کا انتقال ہوا۔ یہ میرے دوستانِ خاص میں سے تھے۔ خواجہ ابراہیم حسین ہی اُن کی تاریخ ہوئی۔ اللہ رحمت کرے ✦

اسی سال میں خداوند عالم نے توفیق دی۔ کہ ایک قرآن مجید لکھ کر تمام کیا اور لوح جدول وغیرہ درست کر کے پیر و مرشد شیخ داؤد جھنی وال کی قبر پر رکھا۔ اُمید ہے کہ اور کتابیں جو میرے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ ہیں۔ یہ اُن کا کفارہ اور مونسِ ایامِ حیات اور شفیع بعد ممات ہوگا۔ اللہ رحم کرے تو کچھ بڑی بات نہیں ✦

سنہ ۱۰۰۲ھ میں مصیبتوں کے کوڑے اور عبرتوں کے تازیانے ایسے لگے۔ کہ جن لہو و لعب اور گناہوں میں اب تک مبتلا تھا اُن سے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی۔ اور خدا نے میری بداعمالی سے مجھے آگاہ کیا۔ ع

آہ گر من چنیں بمانم آہ

نیک خاتمی کے طور پر استقامت اُسکی تاریخ کہی ملک الشعرا فیضی نے عربی میں قطعہ لکھا۔ آخر کا شعر یہ ہے ؎

لقد تلب شیخی عن الحوبۃ	و تاریخہ۔ سابق التوبۃ

مرزا نظام الدین خدمات بادشاہی میں قلیچ خاں جیسے کہنہ عمل سردار کے ساتھ لاگ ڈانٹ رکھتا تھا۔ بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اور نہایت چستی و چالاکی سے مہمات سلطنت کو سرانجام کرتا تھا۔ حُسن کفایت اور تدبیر اور اخلاص اور دیانت و عرق ریزی کے سبب بادشاہ بہت مرحمت اور اعتماد فرمانے لگے تھے۔ چنانچہ قلیچ خاں اور اور امرا کو مزاج میں دخل رکھتے تھے۔ اور درگاہ سے جُدا ہوسکتے تھے۔ اِدھر اُدھر بھیجدیا۔ اور اس کیلئے ابتدائی رعایت خیال کیا تھا۔ عنایت گونا گوں کے ارادے تھے چاہتے تھے کہ اس کا جوہر عالی جو قابل نشو و نما ہے۔ صحرائے ظہور میں نکالیں۔ یکایک عین ترقی اور اوج کار و بار میں چشم زخم عظیم پہنچی۔ کہ اپنے بیگانے کسی کو اُمید نہ تھی۔ تپ محرقہ سے ۴۵ برس کی عمر میں عالم بے وفا سے گذر گیا۔ اور نام نیک کے سوا کچھ ساتھ نہ لے گیا۔ اُس کے حُسن اخلاق دیکھ کر بہت سے احباب کو اُمیدیں تھیں۔ خصوصاً مجھ حقیر کو کہ یگانگی دینی اور اخلاص دلی رکھتا تھا۔ جو اغراض دُنیا سے پاک ہے۔ آنکھوں سے اشکِ حسرت بہائے۔ سنگِ نا اُمیدی سینے پر مارا۔ انجام کو صبر و شکیبائی کے سوا چارہ نہ دیکھا۔ کہ اہل صفا کی خصلت اور پرہیزگاروں کی عبادت ہے۔ اور اس واقعہ کو سخت ترین مصائب جان کر عبرت کُلی سمجھا۔ اب کسی سے رفاقت و محبت نہ کرونگا۔ گوشۂ گمنامی اختیار کیا ؎

مجلسِ وعظ رفتنت ہوس است	مرگِ ہمسایہ واعظِ تو بس است

دریائے راوی پر پہنچے تھے۔ کہ کشتی حیات کنارے لگ گئی۔ یہ واقعہ ۲۳ صفر ۱۰۰۳ھ میں ہوا۔ جنازہ لشکر سے لاہور لائے۔ اور اُسی کے باغ میں دفن کیا۔ خاص و عام میں کم اشخاص ہوں گے۔ جو اُس کے جنازے پر نہ روئے ہونگے۔ اور اُس کے اخلاق کریم کو یاد کرکے بے قرار نہ ہوئے ہونگے۔

مُلّا صاحب کی نظم دیکھو فرماتے ہیں ؎

بر ہیچ آدمی اجل التفاتے نے کند	سلطان قہر ہیچ محابا نے کند
عام است حکمِ میر اجل بر جہانیاں	ایں حکم بر من و تو بہ تنہا نے کند

یہ قطعہ تاریخ میں ہوا ؎

رفت مرزا نظام دیں احمد	سوئے عقبےٰ و چست و زیبا رفت
جوہر او نہ بسکہ عالی بود	در جوارِ ملک تعالےٰ رفت
قادری یافت سال تاریخش	گوہرے بے بہا ز دُنیا رفت

اُنھوں نے بھی ہندوستان کی تاریخ لکھی تھی۔ جس میں اکبر کا ۳۸ برس کا حال بتفصیل ہے۔ اور طبقات اکبری نام ہے۔ مُلا صاحب نے نظامی ۱۰۰۲ھ سے اس کی تاریخ نکھی اور تاریخ نظامی نام رکھا۔ صاف صاف حالات بے مبالغہ و عبارت آرائی لکھے ہیں۔ جن سے معاملات و مہمات کی اصلیت واضح ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ نہ کسی سے خوش ہیں۔ نہ خفا ہیں۔ جو جس کی بات ہے۔ جوں کی توں درج کر دی ہے ✦

اسی سال میں لکھتے ہیں۔ کہ چالیسواں سال جلوس کا شروع ہوا۔ جشن کے موقع پر تحویل سے دو دن پہلے دیوان خاص میں۔ جھروکے پر بیٹھے تھے۔ مجھے بلایا۔ میں اُوپر گیا۔ آگے بلایا اور شیخ ابوالفضل سے کہا۔ ہم تو شیخ عبدالقادر کو جوان فانی۔ صوفی مشرب سمجھے ہوئے تھے۔ وہ تو ایسا فقیہ متعصب نکلا۔ جس کے تعصب کی رگِ گردن کو کوئی تلوار کاٹ ہی نہیں سکتی۔ شیخ نے پوچھا۔ حضور کس کتاب میں ؟ کیا لکھا ؟ کہ حضور ایسا فرماتے ہیں۔ فرمایا اسی رزم نامہ میں (مہا بھارت) ہم نے رات کو نقیب خاں کو گواہ کر دیا۔ اُس نے کہا تقصیر کی۔ میں نے آگے بڑھ کر عرض کی۔ فدوی فقط مترجم تھا۔ جو دانایانِ ہندی نے بیان کیا بے تفاوت ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے لکھا تو تقصیر کی اور بہت بُرا کیا۔ شیخ نے یہی مطلب عرض کر دیا۔ چُپکے ہو رہے ✦

اس اعتراض کا سبب یہ تھا۔ کہ میں نے ایک حکایت رزم نامہ میں لکھی تھی۔ مضمون یہ کہ ہندوؤں میں سے ایک پنڈت نزع کے وقت لوگوں سے کہتا تھا۔ آدمی کو چاہیئے کہ جہل اور غفلت کی حد سے قدم بڑھا کر سب سے پہلے صانع بیچون کو پہچانے اور عقل کا رستہ چلے اور فقط علم بے عمل پر نہ رہے کہ اس کا کچھ نتیجہ نہیں۔ نیک طریقہ اختیار کرے اور جتنا ہو سکے گُناہوں سے باز رہے۔ یقین جانے کہ ہر کام کی پرسش ہوگی۔ یہیں میں نے یہ مصرع بھی لکھ دیا تھا۔ ع

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

اسی کو کہا کہ منکر نکیر۔ حشر۔ نشر۔ حساب۔ میزان وغیرہ سب کو درست لکھ دیا ہے۔ اور آپ جو تناسخ کے سوا کسی چیز کے قائل نہیں۔ اسے اُس کی مخالفت قرار دیا۔ اور مجھے تعصب اور فقاہت کے ساتھ متہم کیا۔ ✿

تاکے ملامت مژۂ اشکبارِ من ۔۔۔ یکبار ہم نصیحت چشم سیاہ خویش

آخر میں نے مقربانِ درگاہ کو سمجھایا کہ ہندو جزا۔ سزا اور اچھے بُرے کاموں کے قائل ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے۔ کہ جب کوئی مرتا ہے تو لکھنے والا جو عمر بھر اُس کے اعمال لکھتا رہا ہے۔ تا لبنا ارواح

فرشتہ کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کا نام بادشاہ عدل ہے۔ وہ بھلائیوں برائیوں کا مقابلہ کر کے کمی بیشی نکالتا ہے۔ پھر مرنے والے سے پوچھتے ہیں۔ کہ پہلے بہشت میں چل کر آرام کی نعمتیں لو گے یا دوزخ میں چل کر عذاب سہو گے۔ جب دونوں درجے طے ہو چکتے ہیں تو حکم ہوتا ہے۔ کہ پھر دنیا میں جاؤ۔ وہ ایک قالب مناسب حال اختیار کر کے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اسی طرح دورے کرتا رہتا ہے۔ اخیر کو نجات مطلق پاتا ہے۔ اور آواگون سے چھوٹ جاتا ہے۔ غرض یہ معرکہ بھی خیریت سے گزر گیا۔

شرف آفتاب کے دن صدر جہاں سے کہا کہ روضۂ منورہ خواجہ اجمیر پر کوئی متولی نہیں ہے فاضل بداؤنی کو کردیں تو کیسا ہے؟ کہا بہت خوب ہے۔ دو تین مہینے تک دربار کی خدمت میں بہت دوڑتا پھرا کہ ان سرگردانیوں سے چھوٹ جاؤں۔ کئی دفعہ عرضیاں بھی لکھیں جواب ہی پر موقوف رہا۔ میرا دل یہی چاہتا تھا کہ رخصت لوں اور فرشتۂ غیب کہتا تھا ؎

گر دست دہد کاے زنی تو بخیر در دستت زنم	در خم مے غرقت کنم گر نام ہشیاری بری

عید کی شب کو صدر جہاں نے عرض کی کہ اس کی رخصت کے باب میں کیا حکم ہے۔ فرمایا یہاں اسے بہت کام ہیں کبھی کبھی خدمت نکل آتی ہے۔ کوئی اور آدمی ڈھونڈ لو۔ ارادۂ الٰہی اس امر پر نہ آیا۔ خدا جانے اس دربدری اور تنگ دستی میں کیا مصلحت ہے ؎

از درِ خویشش مرا بر درِ غیرے بری	باز گوئی کہ چرا بر درِ غیرے گذری
سالہا در طلبِ روئے نکو در بدرم	روئے بنماؤ خلاصم کن ازیں در بدری

انہیں دنوں میں میرے سامنے ایک دن شیخ ابوالفضل سے کہا۔ کہ اگرچہ فاضل بداؤنی اجمیر کی خدمت بھی خوب کرسکتا ہے۔ مگر ہم ترجمہ کیلئے انہیں اکثر چیزیں دیتے ہیں۔ یہ خوب لکھتا ہے۔ اور ہماری خاطر خواہ لکھتا ہے۔ جدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ شیخ نے بھی اور اور امرا نے بھی تصدیق کی۔ اسی دن حکم دیا کہ باقی افسانۂ ہندی کہ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کے حکم سے تھوڑا سا ترجمہ ہوا ہے۔ اور بہت سا باقی ہے۔ اور بحر الاسمار اس کا نام رکھا ہے۔ اسے ترجمہ کر کے پورا کر دو۔ چنانچہ اخیر جلد کہ ساٹھ جزو ہیں ۵ مہینے میں تمام کر دی انہی دنوں میں ایک شب خوابگاہ خاصہ میں پایہ تخت کے پاس بلایا۔ صبح تک متفرقات مختلفہ میں باتیں کرتے رہے۔ پھر فرمایا کہ بحر الاسمار کی پہلی جلد جو سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرائی تھی اس کی فارسی قدیم غیر متعارف ہے۔ اسے بھی مانوس عبارت میں لکھو۔ اور جو کتابیں تم نے لکھی ہیں۔ ان کے مسودے تم آپ رکھو۔ میں نے زمین بوس کر کے دل و جان سے قبول کیا اور کام شروع کیا (مبارک ہو زمیں بوس کی قسم ٹوٹی) بادشاہ نے

بہت عنایت کی۔ ۱۰۰ ہزار تنگہ مرادی دیئے۔ اور گھوڑا انعام فرمایا۔ انشاء اللہ یہ کتاب جلد اور خوبصورتی کے ساتھ دو تین مہینے میں تیار ہو جائیگی۔ اور وطن کی رخصت جس پر جان دے رہا ہوں وہ بھی حاصل کر لونگا۔ اللہ بڑا قادر ہے اور قبولیت اُسے سزاوار ہے ۔

افسوس اب وہ زمانہ آیا کہ ان کے رفیقوں کے خیمے ڈیرے چلے جاتے ہیں اور یہ افسوس کر رہے ہیں۔ ۱۰۰۳ھ کے اخیر میں رو رو کر کہتے ہیں۔ وہ دلی دوست اور چلے گئے۔ شیخ یعقوب کشمیری صیرفی تخلص درگاہ سے رخصت لیکر وطن گئے تھے۔ مر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؎

یاراں ہمہ رفتند و در کعبہ گرفتند	ما سست قدم بر درِ خمار بماندیم
از نکتۂ مقصود نشد فہم حدیثے	لا دین و لا دنیا بیکار بماندیم

۲۷ ذی الحجہ کو حکیم عین الملک کہ راجی علی خاں کے پاس ایلچی بن کر گئے تھے۔ وہاں سے رخصت ہو کر ہنڈیہ میں آئے (یہ ان کی جاگیر تھی) یہیں سے سفر آخرت اختیار کیا (ان کی اور جلال خاں قورچی کی وساطت سے مُلّا صاحب حضور میں پہنچے تھے) سبحان اللہ یار دوست ایک ایک کو دیکھتا ہوں کہ صحبت سے بیزار ہو کر سبکسار منزل آخرت کو دوڑ گئے۔ اور دوڑے جاتے ہیں ہم اسی سیہ دلی اور پریشانی میں انجام کار سے غافل ہو کر بیہودگی میں عمر برباد کر رہے ہیں۔ قطعہ

اے دل چو آگہی کہ فنا در پے بقاست	ایں آرزوے دور و دراز از پے چراست
یا روزگار عہد تو بستی۔ نہ روزگار	پس ایں نفیر چیست کہ ایام بیوفاست

محرم ۱۰۰۴ھ میں حکیم حسن گیلانی نے بھی قضا کی۔ نہایت درویش نہاد۔ مہربان۔ صاحب اخلاص شخص تھا۔ رباعی

بے خار اگر گلے میسر بودے	ہر دم بہ جہاں لذتِ دیگر بودے
زیں کہنہ سرائے زندگانی مارا	خوش بودے۔ اگر نہ مرگ بر در بودے

انہی دنوں میں چند اشخاص اخلاص چہار گانہ کے ساتھ مریدوں میں داخل ہوئے۔ ڈاڑھیوں کی بھی صفائی بتائی۔ ان میں کوئی تو ایسے عالم تھے۔ کہ اپنے تئیں فاضل اجل سمجھتے تھے۔ کوئی خرقہ پوش خاندانی مشائخ تھے۔ کہ کہتے تھے ہم حضرت غوث الثقلین کے فرزند ہیں۔ اور ہمارے شیخ طریقت نے فرمایا ہے۔ کہ بادشاہ ہند کو لغزش ہوئی ہے۔ تم جا کر بچاؤ گے۔ وغیرہ وغیرہ مُلّا صاحب ان کا خوب خاکا اُڑاتے ہیں۔ اور ان کی مُنڈی ڈاڑھیوں میں خاک ڈال کر کہتے ہیں۔ کہ موتراش چند تاریخ ہوئی ۔

اسی سنہ میں ۱۰ صفر کو شیخ **فیضی** نے بھی انتقال کیا۔ ان کے مرنے کا حال بہت خرابی کے ساتھ لکھ کر کہتے ہیں، کہ چند ہی روز میں حکیم **ہمام** بھی دنیا سے گئے۔ دوسرے ہی دن **کمال الدین صدر** بھی۔ دونوں کے گھروں پر اُسی وقت بادشاہی پہرے بیٹھ گئے اور مال خانے مُقفّل ہو گئے۔ ان کے مُردے کفن کے چیتھڑے کو محتاج تھے۔ یہاں تاریخ کو ختم کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ حال تھے ان بعض اجزا کے جن جزوں سے زمانہ مرکب تھا۔ کہ صفر ۱۰۰۴ھ مطابق سال چہلم جلوس بر سبیل اجمال مجھ شکستہ دل کے قلم شکستہ رقم سے مرقوم ہوا۔ اور بغیر خلاف کے بے تکلف عبارت کی لڑی میں پرو دیا۔ باوجودیکہ تفصیل کے لحاظ سے دریاے عمّاں میں سے ایک بُلبُلا ہے۔ اور ابر و باراں سے ایک قطرہ ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے سمجھ کر اور رستم خلل سے بچا کر لکھا ہے الّا ماشاء اللہ ؎

مرادِ ما نصیحت بود گفتیم	حوالت با خدا کردیم و رفتیم

چونکہ تاریخ نظامی کے مصنف نے امراے عہد کے حال بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر مرحوم چلے گئے۔ میں نے اُن فضولیوں کے ذکر سے زبان قلم کو آلودہ نہیں کیا ؎

من وفائے نہ دیدہ ام زکساں	گر تو دیدی دعائے ما برساں

خاتمۂ کتاب میں لکھتے ہیں۔ روز جمعہ ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۰۴ھ میں طول کلام کو کوتاہی دیکر اتنے پر بس کرتا ہوں۔ تاریخ عمل تحزبہ سے نکالی ؎

شکر للہ کہ بہ تمام رسید سال تاریخ زدل جستم گفت	منتخب از کرم ربانی انتخابے کہ ندارد ثانی!

افسوس یہ ہے۔ کہ اسی سال میں کتاب تمام کی اور اسی سال کے اخیر میں خود تمام ہو گئے۔ ۵۷ برس کی عمر تھی۔ وطن بہت پیارا تھا۔ وہیں مرے وہیں پیوند خاک ہو گئے ؎

آخر گل اپنی خاک درمیکدہ ہوئی	پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ایسے صاحب کمال اور کمال آفریں لوگوں کا مرنا نہایت افسوس کا مقام ہے۔ انہوں نے اپنے معاصروں کا غم کس کس خوبصورتی سے کیا۔ کوئی نہ تھا کہ ان کی خوبی کے لائق ان کا افسوس کرتا۔ ان کے مرنے پر افسوس کرنا کمال کی لاوارثی پر افسوس کرنا ہے۔

خوشگو نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ **باغ انبہ** واقع **عطا پور** نواح **بدایوں** میں دفن ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اُس وقت یہ نام اور مقام ہونگے۔ اب شہر سے دُور ایک کھیت

ہیں تین چار قبریں۔ اُن پر تین چار درخت آم کے ہیں۔ اور یہ مُلّا کا باغ کہلاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ انہی میں مُلّا صاحب کی قبر بھی ہے۔ غالباً خوشگو کے بعد یہ مقام کبھی مُلّا کا باغ ہی کہلاتا ہوگا۔ عطاپور اور باغ انبہ کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ البتہ جس محلے میں اُن کے گھر تھے اب بھی لوگوں میں زبان زد ہے۔ اور پتنگی ٹیلہ کہلاتا ہے۔ سید باڑہ میں ہے۔ مگر ٹیلہ یا گھر کا اثر آثار کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اولاد کا سلسلہ ایک بیٹی پر ختم ہوگیا تھا۔ اور اس کی نسل خیر آباد علاقہ اودھ میں باقی ہے ❖

اکبر کے عہد میں اس کتاب نے رواج نہ پایا۔ مُلّا صاحب نے بڑی احتیاط سے مخفی رکھی تھی جہانگیر کے زمانے میں چرچا ہوا۔ بادشاہ نے بھی دیکھی۔ حکم دیا کہ اس نے میرے باپ کو بدنام کیا ہے۔ اس کے بیٹے کو قید کرو۔ اور گھر کو لوٹ لو۔ چنانچہ جو وارث تھے گرفتار آئے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم تو اُس وقت خرد سال تھے۔ ہمیں خبر نہیں۔ اُن سے مچلکے لئے کہ ہمارے پاس سے نکلے تو جو چاہو سزا دو۔ کتب فروشوں سے مچلکے لئے۔ کہ یہ تاریخ نہ خریدیں نہ بیچیں۔ خافی خاں نے شاہجہاں سے محمد شاہ تک زمانہ دیکھا ہے۔ وہ حال مذکور لکھ کر کہتا ہے۔ تعجب ہے کہ باوجود اس تشدد کے خاص دار الخلافہ میں کتب فروشوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ بداؤنی ہی نظر آتی ہے۔ بادشاہ کی اس خفگی کی شہرت عام ہوگئی تھی۔ اس لئے قاسم فرشتہ۔ شیخ نور الحق دہلوی (ولد شیخ عبد الحق محدث دہلوی) اور مولف تاریخ زبدۃ تین مورخ جہانگیری عہد میں تاریخ لکھ رہے تھے۔ کسی نے اس ذکر سے قلم کو آشنا نہیں کیا ❖

شیخ ابوالفضل

۶ محرم ۹۵۸ھ اسلام شاہ کا عہد تھا۔ کہ شیخ مبارک کے گھر میں مبارک سلامت کا چرچا ہوا۔ ادب نے آنکھ دکھائی کہ خاموش! دیکھو! ادب و دانش کا پتلا پردۂ شکم سے نکل کر ماں کی گود میں آن لیٹا۔ باپ نے اپنے اُستاد کے نام پر بیٹے کا نام ابوالفضل رکھا۔ مگر وہ فضل و کمال میں اُس سے کئی آسمان اُوپر چڑھ گیا۔ اور جاہ و جلال کا تو کیا کہنا ہے۔ شیخ مبارک کا حال بھی پڑھ ہی چکے ہو۔ یاد کرلو کیسی تکلیف اور مصیبت میں پرورش پائی ہوگی۔ طالب علمی کا سارا زمانہ۔ افلاس کی نحوست۔ دل کی پریشانی اور دشمنوں کی ایذائیں سہہ کر گذرا۔ مگر وہ لاعلاج صدمے اس کیلئے روز نیا سبق اور تعلیم کی مشق تھے۔ جب طرح صبر اور برداشت کرتے ہیں اور اس سلامت روی سے رستہ چلتے ہیں تب اکبر جیسے شہنشاہ کی وزارت تک پہنچتے ہیں۔ اُس نے مبارک باپ کے دامن میں پل کر جوانی کا رنگ نکالا۔ اور اُسی کے چراغ سے چراغ جلا کر تبدیلِ عقل کو روشن کیا۔ اس زمانہ میں مخدوم اور صدر وغیرہ علماء بادشاہی بلکہ خدائی اختیار رکھتے تھے۔ جوں جوں اُن کے جابرانہ احکام اور سینہ زور فتوے جاری ہوتے تھے۔ اس کی تحصیل کا ذوق اور مُطالعہ کا عرق ریز شوق زیادہ ہوتا تھا۔ اقبال جوش و خروش کر رہا تھا۔ اور حال استقبال کو کھینچتا تھا۔ کہ حریفوں کی فنا میں کیوں دیر کر رہا ہے ؟

ابوالفضل نے اکبرنامہ کا دفتر سوم لکھ کر خاتمہ میں اپنی ابتدائی تعلیم کا حال کچھ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اگرچہ اُس میں بہت سی باتیں فضول معلوم ہونگی۔ لیکن ایسے لوگوں کی ہر بات قابل سُننے کے ہے۔ اس واقعہ نویس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجئے۔ کہ اُس نے جس طرح ہر شخص کے حالات کھلم کھلا لکھے اسی طرح اپنے سفید و سیاہ کو بھی صاف ہی دکھایا۔ انسان آخر انسان ہے۔ اس پر مختلف اوقات میں مختلف حالتیں گذرتی ہیں۔ البتہ نیک طبع لوگ اُس سے بھی نیکی کا سبق لیتے ہیں۔ دیو طبع انسان صورت پھسلتے ہیں اور دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ؟

ابتدائی حالات

برس سوا برس کی عمر میں خدا نے کرم کیا۔ کہ صاف باتیں کرنے لگا۔ پانچ برس کا تھا۔ کہ قدرت نے استعداد کی کھڑکی کھول دی۔ ایسی باتیں سمجھ میں آنے لگیں جو اوروں کو نصیب نہیں ہوتیں۔ پندرہ برس

کی عمر میں پدر بزرگوار کے خزائن عقل کا خزانچی اور جواہر معانی کا پہرہ دار ہو گیا۔ اور خزانہ پر پاؤں جما کر بیٹھ گیا۔
تعلیمی مطالب سے سدا دل مرجھاتا تھا۔ اور زمانہ کی رسموں سے طبیعت کوسوں بھاگتی تھی۔ اکثر تو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ والد اپنے ڈھب سے عقل و دانش کے منتر پھونکتے تھے۔ ہر فن میں ایک سالہ لکھ کر یاد کرواتے تھے۔ اگرچہ ہر شے پڑھتا تھا۔ مگر مکتب علم کا کوئی مطلب دل کو نہ لگتا تھا۔ کبھی تو ذرا بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور کبھی شبہے رستہ روکتے تھے۔ اور زبان یاوری نہ کرتی تھی۔ کہیں رکاوٹ ہکلا کر دیتا تھا۔ تقریر کا بھی پہلوان تھا مگر بیان نہ کر سکتا تھا۔ لوگوں کے سامنے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اور اپنے تئیں آپ ملامت کرتا تھا۔ (اسی دفتر میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں) جو اہل علم کہلاتے ہیں۔ انہیں بے انصاف پایا۔ اس لئے تنہائی اور غربت کو جی چاہتا تھا۔ دن کو مدرسہ میں عقل کا نور پھیلاتا۔ رات کو ویرانوں میں جاتا۔ کوچۂ نامرادی کے دیوانوں کو ڈھونڈتا اور ان مفلس خزانچیوں سے ہمت کی گدائی کرتا۔

اس عرصہ میں ایک طالب علم سے محبت ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک خیال اُدھر لگا رہا۔ چند روز نہ گزرے تھے کہ اُسکی ہمزبانی اور ہمنشینی کیلئے دل مدرسہ کی طرف کھچنے لگا۔ اُچاٹ دل اور اُکھڑی ہوئی طبیعت اُدھر جھک پڑی قدرت کا طلسمات دیکھو کہ مجھ کو اُڑا دیا۔ اور کو لے آئے (گویا میں۔ میں نہ رہا بالکل بدل گیا) رباعی

در دیر شدم ماحضرے آوردند	یعنی زشراب ساغرے آوردند
کیفیت او مرا زخود بے خود کرد	بردند مرا و دیگرے آوردند

حکمت کی حقیقتوں نے چاندنی کھلا دی۔ جو کتاب دیکھی بھی نہ تھی پڑھنے سے زیادہ روشن ہو گئی۔ اگرچہ خاص عطائے الٰہی تھی۔ نعمت نے عرش مقدس سے نزول کیا تھا۔ لیکن پدر بزرگوار نے بڑی مدد کی۔ اور تعلیم کا تار ٹوٹنے نہ دیا۔ کشائش طبع کا بڑا سبب یہی بات ہوئی۔ دس برس تک آپ کتا رہا۔ اوروں کو سناتا رہا۔ دن رات کی بھی خبر نہ ہوئی۔ معلوم نہ تھا کہ بھوکا ہوں یا پیٹ بھرا ہے۔ خلوت میں ہوں کہ صحبت میں۔ خوشی ہے یا غم ہے نسبتِ الٰہی اور رابطۂ علمی کے سوا کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ نفسانی دوست حیران ہوتے تھے۔ کیونکہ دو دو تین تین دن غذا نہ پہنچتی تھی۔ وہ عقل کا بھوکا تھا۔ کچھ پروا نہ ہوتی تھی۔ ان کا اعتقاد بڑھتا تھا کہ ولی ہو گئے۔ میں جواب دیتا تھا کہ تمہیں عادت کے سبب سے تعجب آتا ہے۔ ورنہ دیکھو کہ بیمار کی طبیعت مرض کے مقابلہ میں ہوتی ہے تو کیونکر کھانے سے بے پروا ہوتی ہے۔ اُس پر کسی کو تعجب نہیں آتا۔ اسی طرح دل اندر سے کسی کام میں لگ جائے اور سب کچھ بھلا دے تو تعجب کیا ہے۔

بہت کتابیں کہتے سنتے حفظ ہو گئیں۔ علوم کے عالی عالی مطالب کہ پرانے ورقوں میں پڑے پڑے گھس پس گئے تھے۔ صفحۂ دل پر روشن ہونے لگے۔ ابھی دل لگی نے وہ پردہ بھی نہ کھولا تھا۔ اور بچپن کی پستی سے عقل کی

بلندی پر بھی نہ چڑھا تھا۔ اسی وقت سے متقدمین پر اعتراض سوجھتے تھے۔ لڑکپن پر نظر کر کے لوگ مانتے نہ تھے۔ میرا دل جھنجلاتا تھا۔ تجربہ نہ تھا۔ طبیعت میں جوش آتا مگر پی جاتا تھا۔ ابتدائی طالب علمی میں جو اعتراض کہ میں مُلا سعد الدین اور میر سید شریف پر کیا کرتا تھا۔ بعضے دوست لکھتے جاتے تھے۔ یکبارگی مطوّل پر خواجہ ابوالقاسم کا حاشیہ آیا۔ اس میں وہ اعتراض موجود پائے۔ سب حیران رہ گئے۔ انکار سے باز آئے۔ اور اَور نظر سے دیکھنے لگے۔ اب دشمندان کا روزن مل گیا۔ اور معرفت کا دروازہ کھلا۔

ابتدا میں جب میں نے پڑھانا شروع کیا۔ تو حاشیۂ اصفہانی کا ایک نسخہ ملا۔ کہ آدھے سے زیادہ صفحے دیمک کھا گئی تھی۔ لوگ مایوس۔ کہ نکما ہے۔ میں نے اول گلے سڑے کنارے کتر کر پیوند لگائے۔ صبح نورِ ظہور کے وقت بیٹھتا۔ عبارت کی ابتدا انتہا دیکھتا۔ ذرا سوچتا اور ہر جگہ مطلب کھل جاتا۔ اسی کے بموجب مسودہ کر کے عبارت جماتا۔ اور اُسے صاف کر دیتا۔ انہیں دنوں میں وہ پوری کتاب بھی مل گئی۔ مقابلہ کیا تو ۳۲ جگہ مترادف لفظوں کا فرق تھا۔ اور تین چار جگہ قریب قریب سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ محبت کی دل لگی جتنی زیادہ ہوتی تھی اتنی ہی روشنی دل کو زیادہ روشن کرتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں آزادی کی خوشخبری پہنچی۔ اس سے بھی دل بھر گیا۔ اب پہلا جنون شروع ہوا۔ علوم و فنون آراستگی پر۔ جوانی کی اُمنگ کا زور شور۔ دعووں کا دامن پھیلا ہوا۔ دانش و بینش کا آئینہ جہاں نما ہاتھ میں تھا۔ جنون کا غُل کان میں پہنچنے لگا۔ اور ہر کام سے رُکنے کے لئے زور کرنے لگا۔ اُن دنوں میں شہنشاہ روشن دل نے مجھے یاد فرما کر چھپاؤ کے گوشہ سے گھسیٹا وغیرہ وغیرہ۔

آزاد۔ ابوالفضل نے باپ کے ساتھ دشمنوں کے ہاتھ سے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے۔ اخیر کا حملہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ اسکی کچھ تفصیل۔ شیخ مبارک کے حال میں لکھی گئی ہے۔ مُلا کی دوڑ مسجد تک۔ شیخ مذکور قسمت کے دکھ بھر کر پھر اپنی مسجد میں آن بیٹھے۔ اُس پیر نورانی کو درباروں سرکاروں کا کبھی شوق نہیں ہوا تھا۔ مگر ہونہار جوانوں کو اقبال نے بیٹھنے نہ دیا۔ ان کے دلوں میں اظہار کمال کا جوش ہوا۔ اور سچ بھی ہے۔ چاند سورج اپنی روشنی کیونکر سمیٹ لیں۔ لعل و یاقوت آب و تاب کو کس طرح پی جائیں۔ چنانچہ ۹۷۴ھ میں شیخ فیضی باریاب حضور ہوئے ۹۸۱ھ میں ۲۰ برس کی عمر تھی۔ کہ ابوالفضل پر بھی خدا کا فضل ہوا۔ اور دیکھو کہ انہوں نے اس عالم میں اس نعمت کو کس سلیقہ کے ساتھ سنبھالا۔

ابوالفضل دربار اکبری میں آتے ہیں

اکبری سلطنت پھیلتی جاتی تھی اور سلطنت انتظام اور قانون انتظام کی محتاج تھی۔ خصوصاً اس سبب سے کہ طالب انتظام قدیمی قانون انتظام کو بدلنا اور وسعت دینا چاہتا تھا۔ اور ملک کو فقط تلوار سے پھیلانا مصلحت

نہ دیکھتا تھا۔ بلکہ اہل ملک کیساتھ مل کر تقویت دینا چاہتا تھا۔ جو قوم اور مذہب اور رسم و رواج کل باتوں میں مخالف تھے۔ اس کے علاوہ ترک۔ جو خود اپنی قوم تھی۔ وہ تنگ خیال متعصب اور اس کام کے لئے ناقابل تھے۔ اور ان کی بدنیتی جو باپ دادا کے ساتھ دیکھی تھی۔ اُس سے اِس کا دل بے اختیار اور بیزار تھا۔ دربار پر مذہبی علماء اور پُرانے خیالوں کے امراء چھائے ہوئے تھے۔ نئی بات تو درکنار۔ کوئی مناسب وقت تبدیلی ہوتی۔ تو ذرا سی بات پر چمک اُٹھتے تھے۔ اور اس میں بے اختیاری اور بے عزتی سمجھتے تھے۔ ملک و دربار شاہ نے اسی واسطے ایک مکان عالیشان بنا کر عبادت خانہ نام رکھا اور علماء اور اہل طریقت اور امرا وغیرہ کے گروہ قرار دے کر رات کو جلسہ مقرر کیا۔ کہ شاید مصلحت وقت اور امر مناسب پر اتفاق رائے پیدا ہو۔ ان لوگوں میں مباحثوں اور مناظروں سے اور آپس کے رشک و حسد سے خود آپس میں جھگڑے پڑنے لگے۔ کسی مسئلہ کا حال ہی نہ کھلتا تھا۔ کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ ہر چند ایک ایک کو ٹٹولتا تھا۔ اور تقریروں اور تجویزوں کے چقماق کو ٹکراتا تھا۔ مگر اصلیت کا پتنگا نہ چمکتا تھا۔ دق ہوتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ اس عرصہ میں ملا صاحب پہنچے۔ انہوں نے جوانی کے جوش۔ ناموری اور ترقی کے شوق میں اکثروں کو توڑا۔ اور ایسے آثار دکھلائے جس سے معلوم ہوتا کہ نئے دماغوں میں نئے خیال پیدا ہونے کی اُمید ہو سکتی ہے۔ اس نوجوان کے خیالات کا چرچا بھی پھیل رہا تھا۔ اور جس چشمہ سے ملا صاحب نے سیرابی پائی تھی۔ وہ اُسی کی مچھلی تھا۔ بڑا بھائی خود دربار میں موجود تھا۔ اقبال نے اُسے دربار کی طرف جذب مقناطیس کے زور سے کھینچ لیا۔ اگرچہ اس میدان میں اس کے موروثی خونخواروں کا ہجوم تھا۔ مگر یہ بھی موت سے کشتیاں لڑتا۔ قسمت کی نحوستوں کو ریلتا دھکیلتا۔ دربار میں جا ہی پہنچا۔ خدا جانے فیضی نے کسی موقع پر عرض کی یا کسی سے کہلوایا۔ غرض چراغ سے چراغ روشن ہوا۔ چنانچہ خود اکبرنامہ میں لکھا ہے۔ اور اپنے ابتدائی خیالات کا تیز رنگ سے نقشہ کھینچا ہے۔

۹۸۱ھ انیسواں سال جلوس تھا۔ کہ اس نگارنامہ کے نقشبند ابوالفضل مبارک نے درگاہ مقدس میں سر جھکا کر رتبہ کو بلند کیا۔ عالم خلوت کے پیٹ سے نکل کر پانچ برس میں رسمی تمیز حاصل ہوئی۔ صورت و معنی کے باپ نے تربیت کی نظر سے دیکھا۔ ۱۵ برس کی عمر میں فنون حکمی اور علوم نقلی سے آگاہ ہو گیا۔ اگرچہ اُنہوں نے دانش کا دروازہ کھول دیا۔ اور دربار حکمت میں بار ملی۔ مگر بخت کی بے یاری سے خود بینی اور خود آرائی میں تھا۔ چند روز رونق اور بھیڑ بھاڑ پیدا کرنے میں کوشش رہی۔ طالبان دانش کے ہجوم نے غرور کا سرمایہ بہت بڑھایا۔ اور اس فرقہ کو بے تمیز اور بے انصاف پایا۔ اس لئے خیال ہوا کہ تنہائی اختیار کیجئے اور غریب الوطن ہو کر رہیئے۔ دانایان ظاہر بیں کا اختلاف اور تقلیدی صورت پرستوں کا رواج تھا۔ میں حیرت کے

کوچہ میں حیران کھڑا دیکھتا تھا۔ چُپ رہ نہ سکتا تھا۔ بولنے کی طاقت نہ تھی۔ پدر بزرگوار کی نصیحتیں صحرائے جنون میں نہ جانے دیتی تھیں۔ مگر پریشانی خاطر کا پورا علاج بھی نہ ہوتا تھا۔ کبھی خطۂ خطا کے داناؤں کیطرف دل کھینچتا۔ کبھی کوہ لُبنان کے مرتاضوں کیطرف جُھکتا۔ کبھی تبت کے لاما لوگوں کیلئے تڑپتا۔ کبھی دل کہتا کہ پادریان پرتگال کی ساتھ کا دم بھروں کبھی یہ کہ موبدان فارس اور ژندواستا کے رموز دانوں میں بیٹھکر آتش اضطراب کو بجھاؤں۔ کیونکہ سیانوں اور دیوانوں دونوں سے جی بیزار ہو گیا تھا وغیرہ وغیرہ ❖

اس سحر بیان نے کئی جگہ اپنا حال لکھا ہے۔ مگر جہاں ذکر آ گیا ہے۔ نئے ہی رنگ سے طلسمات باندھا ہے۔ آزاد اُس سے زیادہ متحیر ہے۔ نہ سب کو لکھ سکتا ہے۔ نہ چھوڑ سکتا ہے ❖

شیخ موصوف کی تحریروں کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ نصیبے نے یاوری کی اور حضور بادشاہی میں علم و فضل کا مذکور ہُوا۔ اُدھر سے طلب ہُوئی۔ مگر میرا دل نہ چاہتا تھا۔ برادران گرامی اور دوستان خیر اندیش ہمزبان ہو گئے کہ بادشاہ صورت و معنی کا دربار ہے۔ ضرور حاضر ہونا چاہیئے۔ یہاں دل کا جنون تعلق کی زنجیریں توڑے ڈالتا تھا۔ خدائے مجازی (والد بزرگوار) نے پردہ کھول کر سمجھایا کہ اورنگ نشین اقبال (اکبر) کے کمالات حقیقی کو کوئی نہیں جانتا۔ کہ وہ دین و دنیا کا مجمع البحرین اور صورت و معنی کا مشرق انوار ہے۔ جو عُقدے دل میں پڑے ہیں وہیں جا کر کُھلیں گے۔ اُن کی خوشی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھا۔ دُنیا کی دولت سے گنجینہ دار معنی کا میرا ہاتھ خالی تھا۔ [1] ایۃ الکرسی کی تفسیر لکھی۔ بادشاہ آگرہ میں آئے ہُوئے تھے۔ کورنش کی سعادت حاصل کی۔ اوراق مذکور نے تہیدستی کا عذر ادا کیا۔ وہ حُسن قبول سے منظور ہُوا۔ میں نے دیکھا کہ اکسیر ملازمت سے دل کی سوزش کو تسکین ہو گئی۔ اور وفائے قدسی کی محبت نے دل کو دبوچ لیا۔ بنگالہ کی مہم درپیش تھی۔ اشغال سلطنت کے سبب سے گمنام گوشہ نشین کے حال پر توجہ نہ ہُوئی وہ چلے گئے۔ میں رہ گیا ❖

وہاں سے بھی بھائی کے خطوں میں لکھا آتا تھا۔ کہ بادشاہ تجھے یاد کیا کرتے ہیں۔ میں نے سورۂ فتح کی تفسیر لکھنی شروع کر دی۔ جب پٹنہ فتح کر کے پھرے اور اجمیر گئے تو معلوم ہُوا۔ کہ وہاں بھی یاد فرمایا۔ اقبال کے نشان فتح پور میں آئے تو والد بزرگوار سے رخصت لیکر گیا۔ بھائی کے پاس اُترا دوسرے دن مسجد جامع میں کہ شاہنشاہی عمارت ہے جا کر حاضر ہُوا۔ جب بادشاہ آئے۔ تو میں نے دور سے کورنش کر کے نور سمیٹا۔ شہریار جوہر شناس نے خود نظر دوربین سے دیکھ کر بُلایا۔ زمانہ اور اہل زمانہ کے حال کچھ کچھ معلوم تھے۔ اور پلہ بھی دُور کا تھا۔ جانا کہ شاید کسی ہمنام کو بُلایا ہو۔ جب معلوم ہوا کہ میری ہی قسمت نے

---

[1] اس پیر کہنسال اور اسکے جوانوں کے انداز دیکھو کہ کوئی نکتہ لطافت اور نزاکت سے خالی نہ تھا۔ پہلی دفعہ جو پائے تخت میں ملازمت ہوئی تو آیۃ الکرسی کی تفسیر نذر گزرانی تھی۔ اسمیں یہ نکتہ رکھا تھا کہ آیۃ الکرسی حفظ بلیات کیلئے پڑھا کرتے ہیں۔ حضور مہم پر چلے ہیں۔ حفظ الٰہی شامل حال رہے۔ فتح پور میں سورۂ فتح کی تفسیر نذر دی۔ اسمیں یہ لطیفہ تھا۔ کہ فتح مبارک ہو۔ اور یہ فتوحات مشرقی کا دیباچہ ہے ❖

یاوری کی ہے تو وہ ڑا۔ اور آستان جلال پر پیشانی رکھدی۔ اُس دین اور دنیا کے مجموعے نے کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کیں۔ سورۂ فتح کی تفسیر میں نے مرتب کر لی تھی۔ نذر گذرانی۔ بزم اقدس کے خواصوں سے میرے وہ وہ حال بیان کئے۔ کہ مجھے بھی معلوم نہ تھے۔ اِس پر بھی دو برس تک میری طبیعت اُچاٹ تھی۔ اور دل کا جنون تنہائی کی طرف کھینچتا تھا۔ مگر جان کی گردن میں کئی کمندیں پڑگئیں۔ مرحمت پر مرحمت بڑھتی جاتی تھی۔ ناچیز سے ایک چیز کر دیا۔ اور مدارج تربیت پایہ بپایہ بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ بیت المقدس مقصود کی کنجی ہاتھ آگئی ✦

غرض ابوالفضل حاضر دربار ہوئے تو مزاج شناسی اور ادب خدمت اور اطاعت فرمان اور علم و لیاقت اور ظرافت باحتانت سے اِس طرح اکبر کا دل ہاتھ میں لیا۔ کہ ہر وقت روئے سخن انہیں دونو بھائیوں کیطرف ہوتا تھا۔ مخدوم و صدر کے گھر میں ماتم پڑگئے۔ اور حق بجانب تھا۔ کیونکہ وہ شیخ مبارک کے فضل و کمال کو اگر دبا سکتے تھے تو حکومت دربار کے زور سے۔ اب یہ میدان بھی ہاتھ سے گیا۔ اور چند ہی روز میں اسکے نوجوان لڑکے مقدمات دربار اور مہمات سلطنت میں شامل ہونے لگے ✦

مُلّا صاحب کا انداز بیان بھی ایک لذت رکھتا ہے۔ ذرا دیکھئے اس معاملہ کو کیا مزے سے بیان کرتے ہیں۔ اجمیر سے پھر کر ۹۸۲ھ میں بمقام فتح پور تھے۔ خانقاہ کے پاس بادشاہ نے عبادت خانہ مرتب کیا کہ سہ ایوان پر مشتمل تھا۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ کسی اور تقریب میں لکھی جائے گی۔ انہیں دنوں شیخ ابوالفضل شیخ مبارک ناگوری کا سپوت بیٹا۔ جسے علامی لکھتے ہیں۔ اور جس نے جہان میں عقل و دانش کا غلغلہ ڈالدیا ہے۔ اور صباحیوں کے عقیدوں کا چراغ روشن کیا ہے۔ کہ خود صبح روشن میں چراغ جلاتا تھا۔ اور بموجب قول عرب کے کہ من تخالف تصرف۔ جس نے مخالفت کی اسی کا تصرف ہو گیا۔ اس نے تمام مذہبوں کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔ اور اس کام پر کس کر کمر باندھی ہے غرض درگاہ میں آکر ملازمت بادشاہی کو اپنی طبیعت میں داخل کر لیا۔ تفسیر آیۃ الکرسی نذر گذرانی اور تفسیر اکبری تاریخ ہوئی۔ اور اس میں بہت سے دقائق اور نکات قرآنی درج تھے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ باپ کی تصنیف تھی۔ بادشاہ نے ملایان فرعون صفت کے کان ملنے کے لئے (جس کی مجھ سے مُراد ہے اس کو خاطر خواہ پایا ✦

پھر شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں پر چودھواں حال مصیبتیں مخدوم اور صدر کے ہاتھوں گذری تھیں اُن سے چند سطریں سیاہ کر کے مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ پھر ان کا دور دورا ہو گیا۔ اور شیخ ابوالفضل نے بادشاہ کی حمایت اور زور خدمت اور زمانہ سازی اور بے دیانتی۔ اور مزاج شناسی۔ اور بے انتہا خوشامد سے

جس گروہ نے چغلیاں کھائیں - اور ناروا کوششیں کی تھیں اُنہیں بُری طرح رسوا کیا - اُن پُرانے گنبدوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینکدیا - بلکہ تمام بندگانِ خدا - مشائخ و علما - عابد و صلحا - یتیم و ضعفا سب کے وظیفے اور مدد معاش کاٹ لینے کا باعث وہی ہُوا - پہلے زبانِ حال و مقال سے کہا کرتا تھا - رباعی

یارب بجہانیاں وسیلے بفرست	فرعون صفت چو پشہ پیلے بفرست
فرعون وشاں دست برآوردستند	موسئے و عصاؤ رود نیلے بفرست

جب اس طریقے پر فساد اُٹھنے لگے - تو اکثر یہ رباعی اُس کی زبان پر تھی - رباعی

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش	چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش	اے وائے من و دست من و دامن خویش

بحث کے وقت اگر کسی مجتہد کا کلام سند میں پیش کرتے - تو کہتا کہ فلانے حلوائی - فلانے موچی - فلانے چرم گر کے قول پر ہم سے حجت کرتے ہو - بات تو یہ ہے - کہ تمام مشائخ و علماء کا انکار اُسے مبارک ہُوا آزاد - یہ رشک ان پر مُلّا صاحب ہی کو نہیں ہُوا - کہ ہم سبق اور ہم عمر تھے - بڑے بڑے بڈھے اور صاحب کمال ارکان دربار تڑپتے تھے - اور رہ جاتے تھے ؛

اگر ہم حاکم کی مزاج شناسی کا سبق پڑھنا چاہیں - تو بھی ایک نکتہ کافی ہے - کہ ابوالفضل اور مُلّا صاحب موصوف آگے پیچھے دربار میں پہنچے تھے - بادشاہ کی نظر کسی پر کم نہ تھی - مُلّائے موصوف کو بیستی کا منصب عطا کیا - اور خرچ کو روپیہ بھی دیا - کہ گھوڑے پیش کر کے داغ کرا دو - اُنہوں نے قبول نہ کیا - ابوالفضل بھی ایک ملائے مسجد نشین کے بیٹے تھے - اور مسجد سے نکل کر دربار میں پہنچے تھے - اُنہوں نے فوراً تعمیل کی - اور جو خدمت ہُوئی بجا لائے - وہ کیا سے کیا ہو گیا - یہ بیچارے مُلّا کے مُلّا ہی رہے (ذرا دیکھو مُلّا صاحب کس مزے سے اِس مصیبت کا رونا روتے ہیں) ؛

ابوالفضل انشا پردازی کا بادشاہ تھا - اور اکبر نے بھی پرکھ لیا تھا کہ اس کا دماغ بہ نسبت ہاتھوں کے بہت خوب لڑیگا - بلکہ ہاتھ میں قلم تلوار سے زیادہ کاٹ کریگا - اس لئے دارالانشا کی خدمت اسے سپرد کی - اور مُہمات سلطنت کی تاریخ بھی اس کے اہتمام میں تھی - اس کے علاوہ ہر حکم کو بڑی احتیاط اور عرق ریزی سے سرانجام کرتا تھا - چنانچہ رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل میں بڑا اعتبار اور اعتماد پیدا کیا - اور ہر طرح کے صلاح و مشورے میں اس کی رائے ضروری ہو گئی - یہاں تک کہ پیٹ میں درد ہوتا - تو حکیم بھی ان کی صلاح سے مشخص ہوتا تھا - پھنسی پر مرہم لگتا تھا - تو ان کی تجویز نسخہ میں شامل ہوتی تھی - ابوالفضل نے اب ملائی کے کوچہ سے گھوڑا دوڑا کر امرائے منصبداران کے میدان میں جھنڈا گاڑا ؛

۹۹۳ھ کے جشن میں لکھتے ہیں۔ کہ فلاں فلاں امرائے منصبدار کو اس اس خدمت کے صلہ میں یہ یہ منصب عطا ہوئے۔ راقم شگرف نامہ کیلئے کسی خدمت نے سفارش نہ کی حضور سے ہزاری منصب عطا ہوگیا امید ہے۔ کہ عمدہ خدمتیں سعادت کے چہرہ کو روشن کریں ❊

۹۹۸ھ میں بادشاہ کیساتھ لاہور میں تھے۔ انکی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ نہایت رنج ہوا۔ قلق کی کیفیت اس سے معلوم کرلو۔ کہ بیقرار ہوتے تھے۔ اور بار بار یہ شعر پڑھتے تھے۔ کہ عرفی نے اپنے موقع پر کہا تھا۔ شعر

خوں کہ از مہر تو شد شیر و بہ طفلی خوردم	باز آں خوں شد و از دیدہ بروں مے آید

خود لکھتے ہیں۔ آج اقبال نامہ کا مصور (میں) ذرا بیہوش ہوگیا۔ اور غمہائے گوناگوں میں ڈوب گیا۔ خبر پہنچی کہ بانوے خاندان خاتون دودمان عصمت کی ماں مہرانداز جہان ناپائدار سے عالم علوی کو چلی گئی ❊

چوں مادر من بزیر خاک است	گر خاک بسر کنم چہ باک است	دانم کہ بدیں شغب فزائی
زانجا کہ تو رفتہ نیائی	لیکن چہ کنم کہ ناشکیبم	خود را بہ بہانہ مے فریبم

شہریار غمگین نواز نے آکر سایہ عاطفت ڈالا۔ اور زبان گوہر بار پر یہ لفظ گذرے۔ اگر سب اہل جہان پائداری کا نقش رکھتے۔ اور ایک کے سوا کوئی راہ نیستی میں نہ جاتا۔ تو بھی اس کے دوستوں کو رضا و تسلیم کے سوا چارہ نہ تھا۔ جب اس کارواں سرا میں کوئی دیر تک نہ ٹھیریگا۔ تو خیال کرو۔ کہ بے صبری کی ملامت کا کیا اندازہ کرسکیں۔ اس گفتار دلاویز سے دل ہوش میں آگیا۔ اور جو مناسب وقت تھا۔ اس میں مصروف ہوگیا ❊

۹۹۹ھ میں خود لکھتے ہیں۔ آج فرزند عبدالرحمن کے گھر میں روشن ستارہ نے روشنی بڑھائی۔ نشاط گوناگون کا ہنگامہ ہوا۔ گیتی خداوند (اکبر) نے پشوتن نام رکھا۔ امید ہے۔ کہ فرخی و فیروزی بڑھائے اور شایستگی عمر دراز سے پیوند پائے ❊

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے خردسال بیٹے خسرو کی بسم اللہ کا دربار ہوا۔ اول بادشاہ وحدت بخش درگاہ الٰہی میں عجز و انکسار بجالائے۔ اور کہا کہو الف۔ پھر انہیں حکم دیا۔ کہ روز تھوڑی دیر بیٹھ کر پڑھا دیا کرو۔ انہوں نے چند روز کے بعد چھوٹے بھائی شیخ ابوالخیر کے سپرد کر دیا ❊

سنہ ۱۰۰۰ھ میں لکھتے ہیں کہ اقبال نامہ کے نقش طراز کو دو ہزاری منصب عطا ہوا۔ امید ہے کہ خدمتگذاری اپنی زبان سے اس کا شکریہ ادا کرے۔ اور حضور کی جوہر شناسی نزدیک و دور آشکارا ہو ❊

سنہ ۱۰۰۴ھ (۹۹۵ھ) میں فیضی کی تصنیفات کو دیکھا۔ کہ اجزائے پریشان تھے۔ بڑے بھائی کے جگر کے ٹکڑے اس بدحالی میں دیکھے نہ گئے۔ ان کی ترتیب پر متوجہ ہوئے۔ سنہ ۱۰۰۶ھ (۹۹۷-۹۶ھ) میں ان کی ترتیب سے فارغ ہوا۔

دو برس اس کام میں صرف ہوئے۔ اس عرصہ میں دو ہزار پانصدی کے عہدے پر سرفراز ہوئے چنانچہ آئین اکبری میں جو منصبداروں کی فہرست لکھی ہے۔ اُس میں اپنا عہدہ بھی لکھا ہے ٭

ابوالفضل بڑے سُہتے اور سہتے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے۔ کہ اکبر کے سوا تمام دربار میں ایک بھی ان کا دل سے خیر خواہ نہیں ہے۔ مگر ایک چال چوکے اور بہت چوکے۔ شیخ مبارک نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ اُنھوں نے اس کی نقلیں تیار کیں۔ اور ایران توران اور ملک روم وغیرہ میں بھیجیں۔ حاسد ہر وقت تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ انھوں نے خدا جانے کس پیرایہ میں اس مضمون کو اکبر کے سامنے ظاہر کیا۔ کہ اُسے ناگوار گذرا۔ چغل خوروں کی باتیں کس نے سُنی ہیں۔ کہتا کہ کیا کیا موتی پروئے ہوں گے۔ شاید یہ کہا ہو۔ کہ حضور کے سامنے یہ اہل دین کو مقلّد کہتا ہے۔ اور تقلید کی قباحتیں۔ اور دینیات کی خرابیاں ظاہر کرتا ہے۔ اور دل سے اعتقاد مفترانہ رکھتا ہے۔ یا یہ کہا ہو۔ کہ حضور سے کہتا ہے۔ میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ بلکہ حضور کو صاحب شریعت اور صاحب ملت اعتقاد کرتا ہے۔ اور باطن میں شاید یہ کہا ہو کہ تفسیر مذکور کے خطبے میں حضور کا نام داخل نہیں کیا۔ شاید سلاطین مذکورہ کے دربار میں رستہ نکالتا ہو۔ غرض جو کچھ کہا اُس نے بادشاہ کے دل میں بُرا اثر پیدا کیا۔ ایک تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ جہانگیر نے یہ ماجرا باپ کے گوش گذار کیا تھا۔ ابوالفضل بڑے اداشناس تھے۔ اِس بات کا بڑا رنج ظاہر کیا۔ جیسے کوئی ماتم زدہ سوگ لے کر بیٹھتا ہے۔ اِس طرح گھر میں بیٹھ رہے۔ دربار میں آنا چھوڑ دیا۔ ملنا جلنا ترک کر کے اپنے بیگانے کی آمد و رفت بند کر دی۔ بادشاہ کو اِس حال کی خبر ہوئی۔ اسلئے علو حوصلہ سے کام لیا۔ اور کہلا بھیجی کہ آکر اپنی خدمتیں سنبھالو۔ اِس اثنا میں بہت پیغام سلام ہوئے آخر خود لکھتے ہیں۔ کہ میں آگاہ دل کے رستہ پر بیٹھا اور سمجھا۔ کہ بادشاہ دوربین کو کم فہمی کی تہمت کیا لگانا ہے نافہمی تو تیری ہے۔ ایسی باتیں دشمنوں کی آرزوئیں پُوری کرتی ہیں کیا خیال آگیا کہ اُلٹا چلنے لگا؟ اور بے وقت داد بیداد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض پھر جو بادشاہ نے بلایا تو پہلے نقش مٹا کر درگاہ والا میں گئے۔ اور عواطف گوناگون لے غموں سے سبکدوش کر دیا ٭

۱۰۰۶ھ میں لکھتے ہیں کشمیر کو جاتے ہوئے رہتوڑی میں مقام ہوا۔ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) بے اجازت حاضر درگاہ ہوا۔ رستہ میں کچھ بے انتظامی ہو گئی تھی (ایسا اکثر ہوتا تھا) چند روز کورنش سے محروم رکھکر عتاب کی ادب گاہ میں رکھا (کہ پیچھے ہٹ کر ڈیرہ کرو) اس داوگری کی تحقیق میں انہیں بھی شامل کیا اور شاہزادہ کی اظہار شرمساری سے خطا معاف ہوئی ٭

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ اکبر کا مصاحب مشورہ کار۔ صاحب اعتبار۔ میر منشی۔ وقائع نگار۔ واضع قوانین

صاحب دیوان بلکہ اُس کی زبان - نہیں نہیں - اس کی عقل کی کُنجی یا یہ کہو کہ سکندر کے سامنے ارسطو تھا۔ اور زبان سے لوگ کچھ ہی کہیں - اگر پوچھیں - کہ وہ ان رتبوں کی لیاقت رکھتا تھا یا نہیں تو غیب سے آواز آئیگی - کہ اس کا رتبہ ان سے بہت بلند تھا۔ اس کے احکام کے طرز بیان - اور امرا کے کاروبار پر اصلاحیں اور اُنکی جانفشانی میں ہمیشہ کوتاہیاں جتانا بھی غضب تھیں - کہنے والے ضرور کہتے ہونگے - اور بے خبراب بھی سمجھتے ہونگے - کہ اکبر کے پاس بیٹھ کر باتوں کے طوطے مینا بناتے تھے - عین معرکوں کے نازک وقتوں پر کام کا سرانجام دینا کچھ اور بات ہے - اگر خود جنگ کے میدانوں میں ہوتے تو شیخ صاحب کو معلوم ہوتا - کہ قدم قدم پر کیا کیا مشکلیں پیش آتی تھیں - یہ سب سچ - لیکن اسمیں بھی شک نہیں کہ جبتک پہاڑ خود اُس کے سر پر آن پڑا - تو اُسے انتہائے مردانگی اور نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالا دیکھنے والے حیران تھے - کہ ایک مُلّائے مسجد نشین کا بیٹا بادشاہت کے بوجھ اُٹھائے چلا جاتا ہے۔ اور کس خوبصورتی سے جاتا ہے - میں مختصر طور پر اس کی کاردانی کے چند نمونے دکھاتا ہوں +

۱۰۰۶ھ میں اس کی ترقی کے اندازوں نے چال بدلی - دکن کے معاملے بہت پیچیدہ ہوگئے - اس مہم کو اکبر نے شاہزادہ مراد کے نام پر بامراد کیا تھا - اور بہت سے تجربہ کار سپہ سالار اور نامور سردار فوجیں دے کر ساتھ کئے تھے - شاہزادہ آخر نوجوان لڑکا تھا - ایسے کہنہ عمل سپہ سالاروں کا دبانا اس کا کام نہ تھا ایک کی صلاح پر کام کرتا تھا - دو برخلاف ہوکر بجائے مدد کے اُس کی محنت کو برباد کرتے تھے - سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی - کہ شاہزادہ کو شراب کی لت پڑ گئی تھی - اُس نے بالکل بدحال کردیا تھا - اس لئے زیادہ تر کارہ بار ابتر ہوگئے تھے - جب یہ خبریں متواتر دربار میں پہنچیں - تو اکبر بہت متردد ہُوا - اور سوا اِس کے چارہ نہ ہُوا - کہ ابوالفضل کو جس کی جدائی کسی طرح گوارا نہ تھی - دربار سے جُدا کرے +

اکبر اقبال کا لشکر لئے پانچ برس سے پنجاب میں پھرتا تھا - اور لاہور میں چھاؤنی چھا گئی تھی - نتیجے اسکے بھی اچھے حاصل ہوگئے تھے - کیونکہ کشمیر فتح ہوگیا - یوسف زئی وغیرہ علاقہ سرحد کی مہمیں حسب دلخواہ سرانجام ہوگئیں - عبداللہ خان اُزبک کے رشتے بند ہوتے رہے - اور وہ ملک گیر بادشاہ ۱۰۰۶ھ میں خلف بیٹے کی بد اعمالی سے راہی ملک بقا ہُوا - اُس کے ملک کا انتظام برہم ہوگیا اس وقت اکبر کو ملک موروثی پر قبضہ کرنے کیلئے اس سے بہتر موقع نہ تھا - لیکن برہان الملک کی تباہی مملکت کے سبب سے دکن کا دسترخوان بھی سامنے تیار تھا - اور مدت سے امرا اور افواج کی آمد رفت جاری تھی - مراد کی کیفیت احوال سے اُسے معلوم ہوگیا - کہ دکن کی سپاہ سپہ سالار سے خالی ہُوا چاہتی ہے - دو نو بیٹوں کو بلایا - اس کا ارادہ یہ تھا کہ سلیم کو فوج دیکر ترکستان کی مہم پر بھیجے - وہ شرابی کبابی لڑکا بدمست ہو رہا تھا - دانیال کی خبر لگی

کہ وہ الہ آباد سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ اور اُس کا ارادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ناچار خود لاہور سے نکلا کہ اُسی کو ساتھ لیتا ہوا احمد نگر کو جائے۔ اور دکن سے فارغ ہو کر توران کی مہم کا بندوبست کرے ۔

اکبر کو ابوالفضل کی نیک نیتی اور عقل و تدبیر پر ایسا اعتبار تھا کہ اس کے کہے کو اپنا کہا سمجھتا تھا۔ اور جس معاملہ میں یہ کسی سے اقرار کرتا تھا۔ اُسے اکبر اپنی زبان کا اقرار سمجھتا تھا۔ ان باتوں کی تصدیق اِس عبارت سے ہوتی ہے۔ جو اُس نے شاہزادہ دانیال کو اپنی عرضداشت میں لکھی ہے۔ قبلۂ ابوالفضلی ہشتم مرداد آلٰہی حضرت ظل اللٰہی در شب شرف آفتاب در غسلخانہ بزبان مبارک خود فرمودند کہ ابوالفضل من مطالعہ کردہ چنیں یافتہ ام کہ بہ مہم دکن یا تو روی یا من والا ہیچ صورت انجام کار صورت پذیر نیست و نخواہد شد۔ ہرگاہ تو روی یقین است کہ شاہزادہ از گفتن تو بیروں نخواہد بود۔ تا تو باشی بدیگرے مصلحت نخواہد کرد۔ و سخن ہر کوتاہ حوصلۂ کم اندیشِ بے شعور ہیولا نخواہد گوش کرد۔ مناسب دولت آنست کہ بتاریخ غرۂ ماہ پیشخانہ بکشی۔ در ہشتم ماہ راہی شوی۔ بندہ بعرض اقدس رسانید کہ گوسفند بکار قربانی مے آید یا بکار بریانی دیگر چہ چیز است خوب است ہرگاہ کہ قبلۂ چنیں میفرمانید مرا دریں چہ عذر است ۔

غرض ۱۰۰۷ھ میں شیخ کو سلطان مراد کے لانے کا حکم ہوا۔ اور فرمایا کہ اگر حکام دکن کے امرا اُس ملک کے رکھنے کا ذمہ لیں تو شاہزادہ کے ساتھ چلے آؤ۔ ورنہ شہزادہ کو روانہ کر دو۔ خود وہیں رہو۔ آپس میں اتفاق رکھو۔ اور مرزا شاہرخ کے ماتحت رہنے کی سب کو ہدایت کرو۔ مرزا کو بھی علم و نقارہ دیکر مالوہ کو رخصت کیا۔ کہ اسکی جاگیر تھی۔ وہاں سے سپاہ کا سامان کرے۔ اور جب دکن میں بلائیں جھٹ جا پہنچے۔ شیخ برہان پور کے پاس پہنچے۔ بہادر خاں فرمانروائے خاندیس آسیر کے قلعہ سے اُتر کر چار کوس لینے آیا۔ کمال آداب سے فرمان و خلعت لیکر سجود عجز بجالایا۔ انہیں ٹھیرانا چاہا۔ مگر یہ نہ رُکے۔ اور سوار ہو کر برہان پور جا اُترے۔ بہادر خاں وہیں پہنچا۔ انہوں نے بہت سی تلخ نما شیریں اثر باتیں کہہ کر مصلحت کا رستہ دکھایا۔ کہ فوج کشی میں شامل ہو۔ اس نے آسان سی بات کے لئے مشکل حیلے حوالے پیش کئے۔ البتہ کبیر خاں اپنے بیٹے کو دو ہزار فوج دیکر روانہ کر دیا۔ انہیں گھر لیجانا چاہا۔ کہ ضیافت کرے۔ اُنہوں نے کہا تم ساتھ چلتے تو ہم بھی چلتے۔ اس نے بہت سے تحائف پیش کئے۔ ابوالفضل کو باتیں بنانی کون سکھائے۔ ایسے طوطے مینا اُڑائے کہ اسکے ہوش اُڑ گئے۔ وہ آسیر کو چلا گیا۔ اور یہ آگے بڑھ گئے۔ جو ناز و نیاز کا زور اس پر دکھاتے بجا تھا۔ کہ اس کے چچا خدا وند خاں سے ان کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ اور راجی علیخاں اس کا باپ دربار اکبری میں پورا نیاز و اخلاص رکھتا تھا۔ چنانچہ سہیل خاں دکنی کی مہم میں خان خاناں کی رفاقت میں موجود تھا۔ اور کمال مردانگی کے ساتھ سر میدان مارا گیا ۔

خود ابوالفضل لکھتے ہیں۔ کہ بہت سے امرا کو میرے لئے اس خدمت کا نامزد ہونا گوارا نہ تھا۔ انہوں نے متفق ہو کر ایسا پیچ مارا کہ اُن کی دمبازیوں سے پُرانے پُرانے رفیق مجھ سے الگ ہو گئے۔ ناچار ہو کر نئی سپاہ کا بندوبست کیا۔ نصیبہ مددگار تھا۔ بہت لشکر جمع ہو گیا۔ بدخواہوں نے ملامت کی جالی لگا کر مجھ سے کہا۔ کہ کیا کرتے ہو اس میں خطا ہے۔ میں دست بردار نہ ہوا۔ وہ شورش کی اُمید میں آنکھیں کھولے ہی رہے۔ کہ میں شاہزادہ کی چھاؤنی سے ۳۰ کوس پر جا پہنچا۔ یہاں قاصدان تیز رفتار مرزا یوسف خاں وغیرہ شاہزادہ کے لشکر سے خطوط لیکر پہنچے۔ کہ عجب بیماری نے گھیر لیا ہے۔ چھڑے یہاں پہنچو۔ شاید حکما کے ادل بدل سے کچھ فائدہ ہو۔ اور اعلےٰ ادنےٰ تباہی سے بچ جائیں۔ اگرچہ بزرگانِ درگاہ کی طرف سے دل کملایا ہوا تھا۔ اور ہمراہی بھی روکتے تھے۔ مگر میں سب کو شیطانوں کے وسوسے سمجھا۔ اور پھرتی کو تیز کیا۔ سارا فکر یہی تھا۔ کہ زندگی دلی نعمت کے کام میں کھپاؤں۔ اور زبانی اقبال مندی کو کارگذاری سے دکھاؤں۔ دیول گاؤں سے اور تیز ہو گیا۔ شام ہوتے جا پہنچا اور وہ دیکھا کہ کوئی نہ دیکھے۔ کام علاج سے گذر چکا تھا۔ گرداگرد۔ انبوہ در انبوہ آدمی آوارہ۔ بڑوں کو یہ خیال کہ شہزادہ کو شاہ پور لے کر پھر چلو۔ میں نے کہا اس عالم میں چھوٹے بڑے شکستہ دل ہو رہے ہیں۔ عجب بلوہ ہو رہا ہے۔ غنیم پاس۔ مُلک بیگانہ۔ پھر جانا گویا آفت کا شکار ہونا ہے۔ گفتگو میں اُس گلہ ستر (شاہزادے) کی پریشانی زیادہ بڑھ گئی۔ حالت بدحال ہوئی اور شاہزادہ جاں بحق ہوا کچھ لوگ بدنیتی سے کچھ اسباب سنبھالنے میں۔ بعضے بال بچوں کی حفاظت میں الگ ہو گئے۔ مدد آلہی سے اس شورش میں دل نہ ہارا۔ جو کچھ کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے سرانجام میں لگ گیا۔ جنازہ کو عورات سمیت شاہ پور بھیجدیا۔ اور اُس مسافر کو وہیں خاک میں امانت رکھا۔ بعض اشخاص پُرانی چھاؤنی سے نکل کر فتنہ انگیزی کرنے لگے۔ جتنی نمائش ہوئی۔ اتنی نخوت زیادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں میری سپاہ جو پیچھے رہ گئی تھی آن پہنچی۔ یہ تین ہزار سے زیادہ تھی۔ اب میری بات کی اور بھی چمک ہوئی۔ جو بڈھے چپتے تھے۔ اور صُلح سے لڑتے تھے۔ وہ ماننے کی بات پر کان دھرنے لگے۔ مگر چھوٹے سے بڑے تک کو یہی خیال تھا کہ پھر چلیں۔ منعم خاں کے مرنے کی۔ بنگالہ کے بغاوت کی۔ شہاب الدین احمد خاں کے گجرات سے نکل آنے کی۔ اور اس ملک کے فتنہ وفساد کی باتیں الگ الگ رنگ سے سُناتیں۔ میری رجوع خاص درگاہ آلہی میں تھی۔ اقبال بادشاہی کے نور سے آنکھ روشن تھی۔ اس لئے جو جہان کو پسند تھی مجھے بُری لگتی تھی۔ بہت سے بدنیت جُدا ہو گئے۔ میں نے کارساز حقیقی کی طرف دل کا رُخ لیا۔ اور آگے ہی بڑھنے کا خیال رہا۔ فتح دکن کے لئے نشان بڑھایا۔ اس بڑھنے سے دلوں میں اور ہی

زور آگئے۔ سرحد کے لوگوں کو شکر گذار کر رہی۔ رکھا تھا۔ انہیں اور اس ملک کے اکثر نگاہبانوں کو فہمائش کے خطوط لکھے۔ تنگدستوں کے ہاتھ روکے۔ شاہزادہ کے خزانہ میں ہے جو کچھ حضور میں بھیجنے کے قابل تھا۔ اور جو اپنے ساتھ تھا۔ اور جو قرض مل سکا۔ سب بچھا دیا۔ تھوڑے عرصہ میں جو لوگ چلے گئے تھے۔ پھر آئے اور کاروبار کا ہنگامہ گرم ہو گیا۔ شاہزادے کے کل علاقہ کا انتظام اچھی طرح ہو گیا۔ البتہ ناسک کا رستہ خراب اور عرصہ دُور کا۔ خبر دیر میں پہنچتی تھی وہ رہ گیا۔ کیونکہ جب شاہزادہ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ تو وہی کارپرداز ملک کا تھا۔ ناامیدی نے فوج کو تتر بتر کر دیا۔ جو لوگ میں نے بھیجے انھوں نے کم ہمتی کی۔ جو ملک نکل گیا تھا۔ وہ تو نہ آسکا البتہ اور اکثر مضافات علاقہ میں زیادہ ہو گئے۔ (اکبر کے اقبال نے آکر اس واقعہ کی پیش گوئی کر دی ہوگی۔ جو اس نے پہلے سے شیخ کو بھیجدیا اگر یہ نہ جا پہنچتا اور شاہزادہ مرجاتا تو تمام فوج تباہ ہو جاتی۔ ملکوں میں رسوائی ہوتی۔ اور ایسی مشکلیں پیش آتیں۔ کہ برسوں میں بھی ملک نہ سنبھلتا) درگاہ والا کے دمسازوں نے میرے عرائض نہ سُنائے اور ایسی سرگذشت کو (شاہزادہ کا مرنا) بدخیالی سے چھپایا۔ بادشاہ کو حال معلوم ہو جاتا تو فوج اور خزانہ فوراً روانہ کرتا۔ میں تو درگاہ آلہی میں عرض کر رہا تھا۔ اور گیتی خداوند (اکبر) کی توجہ روز افزوں تھی۔ سپاہ کا سرانجام ایسا ہوا کہ اہل زمانہ کا خیال سنبھال بھی نہ سکے۔ دُور و نزدیک کے لوگ حیران رہ گئے۔ خُدا کی قدرت امکان کی طاقت سے باہر ہے مجھ ناتوان سے کیا ہو سکتا ہے۔ **بیت**

کہ گفت آفرینے سزا دار او	نہ من ماندہ ام خیرہ در کار او

دربار کے طعن و تعریض کرنے والوں کو خاموشی اور پچھتاوے نے دبوچ لیا۔ بداندیش طوفان باندھتے تھے۔ کہ بادشاہ نے آپ شیخ کو دربار سے دُور پھینکا ہے۔ کارساز حقیقی نے اسی کو میری بلند نامی کا سرمایہ کر دیا۔ اور ان کو ندامت خانہ جاوید میں بٹھا دیا۔ غرض انتظام مہمات میں مصروف ہوا۔ سُندر داس کو فوج دیکر تلتم کے قلعہ پر بھیجا۔ اس نے کار آگہی سے بعض ملک نشینوں کو بلایا۔ اُنہیں میں سے ایک جا کر قلعہ دار کو ساتھ لے آیا۔ تھوڑی رگڑ جھگڑ میں قلعہ ہاتھ آگیا ❖

سوئید بیگ اور میرا بیٹا اور خانہ زندان میں تھے۔ چند روز بعد اُسے بھی مہم دکن پر نامزد کر کے دولت آباد کو بھیجا۔ قلعہ نشینوں نے لکھا۔ کہ اگر عہد و پیمان سے خاطر جمع ہو جائے۔ کہ ہمارے مال و اسباب سے تعرض نہ ہوگا۔ تو کنجیاں دیتے ہیں۔ اس کا سرانجام ہو گیا۔ کچھ حبشی اور دکنی مفسد ادھر کے علاقہ میں تھے۔ عبدالرحمن فرزند کو پندرہ سو سوار اپنے اور اتنی ہی بادشاہی فوج ساتھ کر کے انکی سرکوبی کو روانہ کیا۔ جب شاہزادے کے مرنے سے شورش گرم ہوئی تھی۔ میں نے مرزا شاہرخ کو بہت بُلایا۔

لوگ ایسے ہنگاموں پر ہزاروں ہوائیاں اُڑاتے ہیں چنانچہ وہ خدا جانے کیا کیا خیال کر کے رہ گئے مجھے مرزا
سے یہ اُمید تھی۔ کہ فرمان نہ پہنچا۔ تو بھی وقت پڑے پر بیقرار ہو کر اپنے تئیں پہنچاتے مگر وہ کہنے والوں کے کہنے میں
آ گئے۔ جب فرمان عتاب آمیز برابر پہنچے۔ اور آخر بادشاہ نے حسین ہراول کو بھیجا تو کام ناکام روانہ ہوئے۔
خیر اب لشکر فیروزی میں آ کر شامل ہو گئے۔ میں استقبال کر کے ڈیروں میں لے آیا۔ ایسے مردانہ پارسا گوہر
کے آنے سے دل کھل گیا۔ شیر خواجہ کہنہ عمل سردار سلطان مراد کی ہمراہی میں ایک فوج کا افسر ہو کر گیا تھا اور
سرحد میں پرگنہ بیر کی حفاظت کر رہا تھا۔ برسات کا موسم آیا۔ خبر لگی کہ دکھنیوں نے فوجیں جمع کرنی شروع کی
ہیں اور عنبر و فرہاد ۵ ہزار سوار حبشی و دکنی اور ۷۰ مست ہاتھی لیکر آنیوالے ہیں۔ شیر خواجہ کے پاس فقط
۳ ہزار فوج تھی۔ خود پیشدستی کر کے اور شہر سے کئی کوس آگے بڑھ کے غنیم پر جا پڑا۔ لیکن کمی فوج کے سبب
لڑتا۔ بھڑتا ہٹا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ شیر خواجہ زخمی ہوا تھا۔ مگر اس کے شکست دینے کی خبر اُڑ گئی۔ اس
نے ادھر بھی خط بھیجدیا تھا۔ میں نے اور فوج روانہ کر دی تھی۔ جب یہ خبر پہنچی۔ تو مصلحت کی انجمن جمائی۔
کسی کی صلاح نہ تھی۔ مینہ موسلا دھار برس رہا تھا۔ اُسی عالم میں میں جریدہ روانہ ہوا۔ لشکر کے
کاروبار مرزا شاہرخ کے سپرد کر گیا۔ شیخ عبدالرحمٰن (اپنے بیٹے) کو دولت آباد سے بلایا۔ کہ آپ کنارہ
گنگ پر جاؤ اور سپاہ سمیٹو کہیں آپ کہیں بیٹا جا بجا چوکیاں جماتے پھرتے تھے۔ کہ آگے کا کام چلتا رہے
اور پیچھے سے خاطر جمع رہے۔ سرداران شاہی میں سے کوئی ہمت والا نظر نہ آتا تھا۔ مرزا یوسف خاں
۴۰ کوس پر تھے۔ میں جریدہ ادھر روانہ ہوا۔ اور رات کو پہنچکر اُسے بھی مدد پر آمادہ کیا۔ اِدھر اُدھر کی فوجوں
کو سمیٹ کر ساتھ لیا۔ اور لشکر کی حیثیت درست کر کے آگے بڑھا۔ گنگ گوداوری چڑھاؤ پر تھا۔ قسمت سے وفعتاً
اُتر گیا۔ اور فوج پایاب گذر گئی۔ جو غنیم کی فوج دریا کے کنارہ پڑی تھی۔ وہ ہراول کی جھپیٹ میں اُڑ گئی۔
دوسرے دن لشکر قلعہ بیر کے گرد سے بھی اُٹھ گیا۔ درگاہ آلہی میں شکرانے بجا لایا۔ اور شادیانوں کے جلسے کئے
دریائے گنگ کے کنارے چھاؤنی ڈالی اور اس ملک میں رعب بیٹھ گیا۔ اکبر نے جب دیکھا کہ امرائے موجودہ سے مہم
دکن نہیں سنبھلتی۔ تو شاہزادہ دانیال کو فوج دیکر روانہ کیا۔ اور خانخاناں کو اتالیق کا منصب دیا۔

(ابوالفضل لکھتے ہیں) اسی دن بڑے شاہزادے (سلیم یعنی جہانگیر) کو صوبہ اجمیر دیکر رانا کی مہم سپرد کی
شہریار کو اس سے بڑی محبت ہے۔ اور ہر دم محبت کا درجہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ مگر وہ بادہ خوار ہمنشیں ہے۔
نیک و بد کی خبر نہیں۔ چند روز سلام کی اجازت نہ دی۔ بارے مریم مکانی کی سفارش سے کورنش کی دولت
پائی۔ اور پھر عہد کیا۔ کہ رستے سے چلونگا۔ اور خدمت کرونگا۔ بادشاہ آپ مالوہ میں آ کر شکار کھیلنے لگے کہ

---

[1] مفصل دیکھو خانخاناں کے حال میں۔ صفحہ ۶۲۰

سب طرف زور ہے۔ خانخاناں کو دانیال کی رفاقت کیلئے روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ جب خانخاناں وہاں پہنچے ابوالفضل روانۂ درگاہ ہو۔ میں نے بڑی خوشیاں کیں۔ اور اسی عرصہ میں قلعہ تبالہ فتح کیا۔

اکبر کو خبر پہنچی تھی۔ کہ بڑا شاہزادہ رستے میں دیر کرتا ہے۔ میر عبداللہ میر عدل کو نصائح سے گرانبار کر کے بھیجا۔ میں احمد نگر کو روانہ ہوا۔ چاند بی بی برہان الملک کی بہن اب اُس کے پوتے (بہادر) کو دادا کا جانشین کر کے مقابلہ کو تیار ہوئی۔ کچھ فوج نے اُس کی بندگی اختیار کی۔ آہنگ خاں بہت سے فتنہ انگیز حبشیوں کو لئے۔ بچّہ کو بادشاہ مانتا تھا۔ مگر چاند بی بی کی جان کی فکر میں تھا۔ وہ بیگم امرائے بادشاہی کو خوشامد کے پیام بھیجتی تھی۔ اور دکھنیوں کو بھی دوستی کی داستانیں سناتی تھی۔ مجھ سے بھی وہی رستہ شروع کیا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر پیش بینی اور روشن اختری سے درگاہ آلی کیساتھ وابستہ ہو جاؤ تو اس سے بہتر کیا ہے۔ جو عہد و پیمان ہیں۔ میں نے اپنے ذمہ لئے۔ ورنہ باتوں سے کیا فائدہ اور آیندہ کو رستہ بند۔ اُس نے ہوا خواہ سمجھ کر دوستی کے پیوند کو مضبوط کیا۔ سچی قسموں کے ساتھ اپنے ہاتھ کا لکھا عہد نامہ بھیجا۔ کہ جب تم آہنگ خاں کو زیر کر لوگے۔ تو قلعہ کی کُنجیاں سپرد کر دوں گی مگر آتا ہے۔ کہ دولت آباد میری جاگیر میں رہے۔ اور یہ بھی اجازت ہو کہ چند روز وہاں جا کر رہوں جب چاہوں حاضر درگاہ ہوں۔ بہادر کو روانۂ دربار کر دُونگی۔ افسوس میرے ہمراہیوں کے دلاغ دینے سے کام میں دیر ہو گئی۔ شاہ گڑھ میں لشکر دیر تک پڑا رہا۔ اور شاہزادے کی آمد آمد بجھ گئی۔ آہنگ خاں کی بد اندیشی بھڑک اُٹھی۔ شمشیر الملک کو (کہ حکومت برار اُس کے خاندان میں تھی) قید خانہ سے نکال کر فوج دے اور دولت آباد سے ہوتا ہوا برار کو چلا۔ کہ وہاں فوج بادشاہی کا مال و اسباب اور اہل و عیال ہیں یہ لوگ گھبرائینگے اور لشکر میں تفرقہ پڑ جائیگا۔ مجھے تو پہلے سے خبر تھی۔ مرزا یوسف خاں وغیرہ کو فوج دیکر اُدھر بھیج چکا تھا۔ مگر یہ بے پروائی کے خواب شیریں میں رہے۔ وہ ولایت برار میں داخل ہوا۔ اور کھلبلی مچادی۔ بہت پاسبانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اکثر محبت کے مارے اہل و عیال کی غمخواری کو اُٹھ دوڑے میں نے اُدھر فوج بھیجی۔ اور خود احمد نگر کو روانہ ہوا۔ کہ باہر کے بدگوہروں کی گردن دباؤں۔ اور چاند بی بی کی بات کا کھوٹا کھرا دیکھوں۔ ایک منزل چلے تھے۔ کہ مخالفوں نے سب طرف سے سمٹ کر احمد نگر کا رُخ کیا کہ اسے بچائیں۔ مگر اقبال اکبری نے خبر اُڑادی کہ شمشیر الملک مر گیا۔ یوسف خاں بھی چونک کر دوڑے۔ کئی سرداروں کو آگے بڑھا دیا۔ انہوں نے دم نہ لیا مارا مار چلے گئے۔ رات کو ایک جگہ جا لیا عجب ہل چل مچی۔ اسی حال میں شمشیر الملک مارا گیا۔ اور فتح کا شادیانہ بجا۔

مہم کامیابی کے رستہ پر تھی۔ اور اُن کا لشکر دریائے گنگ کے کنارہ مُنگی پٹن پر تھا۔ جو شاہزادے کے

احکام متواتر پہنچے۔ کہ تمہاری عزّ و عزیزی نزدیک و دور کے دلوں پر نقش ہو گئی۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ ہمارے سامنے احمد نگر فتح ہو۔ تم ارادہ سے باز رہو۔ اب ہمیں راہ نوردی میں دیر نہ ہوگی۔ یہاں لشکر میں ایک نئی شورش اُٹھی۔ شاہزادہ جب برہان پور پہنچا تو بہادر خان قلعہ آسیر سے نہ اُترا شاہزادے نے چاہا کہ اُس بد دماغ کی گردن مسل ڈالے۔ مرزا یوسف خان احمد نگر کی فوج کشی میں تھا اور آگے بڑھا چاہتا تھا اُسے بُلا لیا۔ یہ دیکھ کر اوروں نے بھی اُدھر کا رُخ کیا۔ بہتیرے سردار بے اجازت بھی اُٹھ چلے۔ غنیم جو دل میں تھرا رہا تھا۔ یہ حال دیکھ کر شیر ہو گیا۔ کئی دفعہ شبخون مارا۔ بہادروں نے خوب دل لڑائے۔ اور اچھی دھکا پیل کی۔ حفاظت الٰہی اور متواتر فتحوں سے غنیم تتر بتر ہو گئے۔ اور آہنگ خاں نے خوشامد اور عاجزی شروع کی ۔

چالش گیہاں خدیو بکشایش احمد نگر

اکبر کو دانیال اور بہادر خاں کے معاملہ کی خبریں پہنچیں (ابو الفضل نے بھی لکھا ہوگا۔ کہ شاہزادہ لڑکپن کرتا ہے۔ احمد نگر کا بنتا ہوا کام بگڑ جائیگا۔ آسیر کا کام تو جب حضور چاہیں گے بنا بنایا موجود ہے) شاہزادے کے نام فرمان جاری ہوا۔ کہ احمد نگر پر چڑھے چلے جاؤ۔ بہادر خاں کا حاضر نہ ہونا سرتابی سے نہیں ہے۔ اس معاملہ کو ہم سمجھ لینگے۔ شہزادہ روانہ ہوا۔ اور بادشاہ آگے بڑھے۔ بہادر خاں نے کبیر خاں اپنے بیٹے کو چند خواصوں کیساتھ حضور میں بھیجکر عمدہ پیشکش گذرانے۔ لیکن باوجود آمد و رفت امرا اور متواتر فہمائشوں کے حاضر نہ ہوا۔ ناچار لشکر کشی کا حکم ہوا۔ اور ابو الفضل کو فرمان پہنچا۔ کہ انتظام سپاہ مرزا شاہرخ کے سپرد کر کے برہانپور میں چلے آؤ۔ اگر بہادر خاں نصیحت کو سمجھ کر ہمراہی کرے۔ تو گناہ سابقہ کے عفو کا مژدہ سُنا کر ساتھ لے آؤ۔ ورنہ جلد حاضر حضور ہو کہ مشورت کرنی ہے ۔

یہ برہانپور کے قریب پہنچے تو بہادر خاں آکر ملا۔ ان کی نصیحتیں سُن کر ہمراہی کے رستہ پر آیا۔ مگر گھر جا کر پھر پلٹ گیا۔ اور بیہودہ سا جواب دیدیا۔ یہ حسب فرمان آگے بڑھے۔ یہاں جشن نوروزی کی دھوم دھام ہو رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ پریاں ناچ رہی تھیں۔ نغمہ پرداز جادوگری کر رہے تھے۔ تاروں بھرا آسمان چاندنی رات کی بہار تھی۔ پھولوں بھرا چمن دونو کے مقابلے ہو رہے تھے۔ مبارک ساعت میں درگاہ پر آکر پیشانی رکھدی۔ اکبر کے دل کی محبت اس سے قیاس کرنی چاہیئے کہ اس وقت یہ شعر پڑھا ؎

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے	تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

شیخ شکر یہ میں بڑی دیر تک اسی طرح چپکے رہے۔ خان اعظم شیخ فرید بخشی بیگی اور ان کو حکم ہوا کہ جاگیر

آسیر کو گھیر او رمورچے لگادو۔ جلد ہی تعمیل ہو گئی۔ شیخ فرید والی فوج اپنی کمی اور غنیم کی زیادتی سے دُور بینی کرکے تین کوس پر تھم گئے۔ مگر کچھ بلند نظر (غالباً خان اعظم مراد ہیں) اشخاص نے رنج دیا اور حضور بکدر ہوگئے۔ جب شیخ حضور میں آئے۔ اور حقیقت سنائی تو کدورت رفع ہو گئی۔ ابوالفضل کو اسی دن ۴ ہزاری منصب اور صوبہ خاندیس کا انتظام سپرد ہوا۔ انہوں نے جابجا آدمی بٹھائے۔ ایک طرف بھائی شیخ ابوالبرکات کو بہت سے داناؤں کے ساتھ بھیجا۔ دوسری طرف شیخ عبدالرحمٰن اپنے فرزند کو۔ بندگان الٰہی کی ہمت سے تھوڑی فرصت میں سرکشوں کی گردنیں خوب مسلیں۔ اکثروں نے فرمانبرداری کے عیش کمائے۔ سپاہ نے اطاعت کی۔ زمینداروں کی خاطر جمع ہو گئی۔ اور اپنے کھیت سنبھالے ؎

ابوالفضل نے بادشاہی عنایت و اعتبار اور اپنی لیاقت اور حسن تدبیر سے ایسی رسائی پیدا کی تھی۔ کہ اُسکی تدبیروں اور تحریروں کی کمندوں نے علاقہ کے حاکموں کو کھینچکر دربار میں حاضر کردیا۔ بھائی اور بیٹا خاندیس کے ملک میں جانفشانی کر رہے تھے۔ بادشاہ نے شیخ کو چار ہزاری منصب سے سربلند کیا۔ صفدر خاں کہ راجی علیخاں کا پوتا اور شیخ کا بھانجا تھا۔ وہ حسب الطلب آگرہ سے حاضر حضور ہوا۔ اور ہزاری منصب عنایت ہوا۔ کہ خاندانی سردار زادہ ہے۔ اُس کی فہمائش کی ملک میں اچھی تاثیر ہوگی (ابوالفضل کے انجام کو جہانگیر سے بڑا علاقہ ہے۔ اکبر نامہ کے مطالعہ سے دلوں کے حال جابجا کھلتے ہیں۔ اس مقام پر میں فقط اس واقعہ کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ جو مہم مذکور میں پیش آیا۔ کہ شیخ خود لکھتے ہیں) اس سال کے واقعات سلطنت میں بڑے شاہزادے کی ناہنجاری ہے۔ اس نونہال دولت کو رانائے اودے پور کی گوشمالی کیلئے بھیجا تھا۔ اُسنے آرام طلبی اور بادہ خواری اور بدصحبتی کے ساتھ کچھ مدت اجمیر میں گذاری۔ پھر اودے پور کو اُٹھ دوڑا۔ اُدھر سے رانا نے آکر ہل چل مچادی اور آباد مقام لوٹ لئے۔ مادھو سنگھ کو فوج دیکر اُدھر بھیجا۔ رانا پھر پہاڑوں میں گھس گیا۔ اور بھرتی ہوئی فوج پر شبخوں لایا۔ بادشاہی سردار اڑے مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ناکام پھرے یہ خدمت شائستگی سے سرانجام ہوتی نظر نہ آئی۔ مصاحبوں کے کہنے میں آکر پنجاب کا ارادہ کیا کہ وہاں جاکر دل کے ارمان نکالے۔ دفعتہً افغانان بنگالہ کی شورش کا شور اُٹھا۔ راجہ مان سنگھ نے اُدھر کا رستہ دکھایا مہم کو ناتمام چھوڑ کر اُٹھ دوڑا۔ آگرہ سے چار کوس اوپر چڑھ کر جمنا اُترا۔ مریم مکانی کے سلام کو بھی نہ گیا۔ وہ ان حرکتوں سے آزردہ ہوئیں۔ پھر بھی محبت کے مارے آپ پیچھے گئیں۔ کہ شاید سعادت کی راہ پر آجائے اُنکے آنے کی خبر سُن کر شکار گاہ سے کشتی پر بیٹھا۔ اور جھٹ دریا کے رستے آگے بڑھ گیا۔ وہ مایوس ہو کر چلی آئیں اُس نے الہ آباد پہنچ کر لوگوں کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ بہار کا خزانہ ۳۰ لاکھ سے سوا تھا۔ وہ لیا اور بادشاہ بن بیٹھا۔ بادشاہ کو محبت بے حد تھی۔ کہنے والوں نے اصل سے بھی زیادہ باتیں بنائیں

اور لکھنے والوں نے عرضیاں بھیج کر سمجھائیں۔ باپ کو ایک بات کا یقین نہ آیا۔ فرمان بھیج کر اس سے حال دریافت کیا تو بندگی کا ایک افسانۂ طولانی سُنا دیا کہ میں بے گناہ ہُوں اور آستان بوسی کو حاضر ہوتا ہُوں ؎

اس عرصہ میں ابوالفضل کی کارگذاریاں جاری تھیں۔ بہادر خاں کو اور اس کے سرداروں کو خطوط لکھتے تھے اور اس کے اثر کہیں کم کہیں پُورے ظاہر ہوتے تھے ایک موقعے پر اپنے پیارے شہزادہ کے حال میں لکھتے ہیں ؎

لعل باغ میں آکر آرام لیا۔ اُس گلشن کی چمن پیرائی راقم کے سپرد تھی۔ میں دیر تک عجز و نیاز سے شکرانے کرتا رہا۔ سعادتوں کے دروازے کھُلے۔ **بیت**

ترا گھر میرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع ۔۔۔ خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرو نکلا

فتح آسیر

آسیر[1] پہاڑ کے اوپر عمدہ اور مستحکم قلعہ ہے۔ مضبوطی اور بلندی میں بےمثل۔ کمرگاہ کوہ میں شمال کو قلعۂ مالی ہے۔ جو اُس نادر قلعہ میں جائے۔ اس میں ہو کر جائے۔ اس قلعہ کے شمال میں چھوٹی مالی ہے۔ اس کی تھوڑی سی تعمیری دیوار ہے۔ باقی پہاڑ کی دھار دیوار ہو گئی ہے۔ جنوب کو اونچا پہاڑ ہے۔ کرودہ نام۔ اس کے پاس کی پہاڑی ساپن کہلاتی ہے۔ سرکشوں نے ہر جگہ کو توپوں اور سپاہیوں سے مضبوط کر رکھا تھا۔ کوتہ اندیش جانتے تھے کہ ٹوٹ نہ سکیگا۔ غلّہ گراں۔ منڈیاں دُور۔ قحط سے سب بیدل ہو رہے تھے۔ اور قلعہ والوں کی زرفشانی نے آس پاس کے بہت سے لوگوں کو پھُسلا لیا تھا ؎

بادشاہی سردار اپنے اپنے مورچوں سے حملے کرتے تھے۔ مگر غنیم پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے ایک پہاڑ کی گھاٹی سے ایسا چور رستہ معلوم کیا۔ جہاں سے دفعتہً مالی کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوں۔ بادشاہ سے عرض کر کے اجازت لی۔ اور جو امرا محاصرہ میں جانفشانی کر رہے تھے۔ سب نے مل کر قرار پایا۔ کہ فلاں وقت میں حملہ کرونگا۔ جب نقارہ اور کرنا کی آواز بلند ہو۔ تم بھی سب نقارہ بجاتے نکل پڑو۔ کام ناکام سب نے مانا۔ مگر اکثروں نے اس بات کو کہانی سمجھا ؎

ایک رات کہ اندھیری بھی بہت تھی اور مینہ برس رہا تھا۔ آپ خاصگی سپاہ کی ٹولیاں باندھ کر پایہ بپایہ ساپن پہاڑی پر چڑھتا رہا۔ پچھلی رات تھی کہ پہلے فوج نے اُسی چور رستہ سے ہو کر مالی کا

---

[1] آسا آہیر کا بنایا ہوا ہے۔ بزرگی مانہ میں بڑا صاحب ہمت اور فیاض جمع تھا۔ بیشمار خزانے اسکی بنیاد استواری میں خاک کر دُنیا سے اُٹھ گیا ؎

دروازہ جا توڑا۔ بہت سے دلاور قلعہ میں گھس گئے اور نقارے اور کرنا بجانے شروع کر دئے ہیں یہ سنتے ہی خود دوڑا۔ پو پھٹتی تھی کہ سب جا پہنچے۔ دوسری طرف سے دیوار پر طنابیں ڈال کر سب سے پہلے آپ قلعہ میں کود پڑا۔ پھر اور بہادر چیونٹیوں کی قطار ہو کر چڑھ گئے۔ تھوڑی دیر میں غنیم کا ورق اُلٹ گیا۔ اُس نے قلعہ آسیر کی راہ لی۔ اور مالی قبضہ میں آگیا۔ اس ناکامی کے سبب سے بہادر خاں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اُدھر سے خبر آئی کہ دانیال اور خانخاناں نے احمد نگر فتح کیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ قلعہ میں بیماری پھیل گئی اور غلّوں کے ذخیرے ایسے سڑ گئے۔ کہ انسان تو درکنار حیوان تک مُنہ نہ ڈالتے تھے۔ رعیت اور سردار سب کے جی چھوٹ گئے۔ اور کچھ عرصہ تک قیل و قال ہوتی رہی۔ آخر گھبرا کر قلعہ آسیر بھی حوالہ کر دیا۔ ۱۶۰۱ء ۱۰۰۹ھ +

غیرت مردانہ سلطان بہادر گجراتی کے غلاموں میں سے ایک پیراتم بڈھا تھا۔ کہ سلطان کی تباہی کے بعد (ہمایوں کے آغاز سلطنت میں) یہاں آن بیٹھا تھا۔ قلعہ کی کنجیاں اُسی کے سپرد تھیں۔ اب اندھا ہو گیا تھا۔ جوان جوان بیٹے تھے۔ پاسبانی کے بُرج ایک ایک کے حوالے تھے۔ اُس نے سپردگی قلعہ کی خبر سُنتے ہی جان خدا کے سپرد کی۔ اُس کے بیٹوں کی ہمت دیکھو کہ سُن کر بولے۔ اب اس دولت کو اقبال نے جواب دیا۔ زندگی بےحیائی ہے۔ یہ کہہ کر افیم کھالی۔ ناسک والوں نے پناہ مانگی تھی مگر امرا کی بےپروائیوں سے زور پکڑتے پکڑتے بگڑ گئے۔ اور مقدمہ ایک مہم ہو گیا۔ خانخاناں کو احمد نگر اور انہیں عمدہ خلعت اور خاصے کا گھوڑا۔ اور علم و نقارہ سے سربلند کر کے اُدھر روانہ کیا +

اُدھر تو اقبال اکبری مُلک گیری اور کشورکشائی میں طلسم کاری کر رہا تھا۔ اِدھر خیر اندیشوں کی عرضیاں اور مریم مکانی کا مراسلہ آیا۔ کہ جہانگیر کھلم کھلا باغی ہو گیا۔ بادشاہ نے سب کام اُسی طرح چھوڑے۔ اور امرا کو خدمتیں سپرد کر کے ادھر روانہ ہوا +

ناسک کی مہم شروع ہو گئی تھی۔ جو انہیں فرمان پہنچا۔ کہ احمد نگر کی طرف جا کر خانخاناں کے ساتھ خدمت بجالاؤ۔ یہ حیران رہ گئے۔ کہ یہاں بہت سے دلاوروں کو سمیٹا تھا۔ ناسک کا قلعہ اور سرکشوں کی گردن ٹوٹا چاہتی تھی۔ خدا جانے جوحیلہ پردازخدمت میں حاضر تھے۔ اُنہوں (یعنی خانخاناں کے طرفداروں) نے بادشاہ کی رائے پھیر دی۔ یا اصلیت حال معلوم نہ ہوئی۔ خانخاناں کی طرفداری حد سے گزر گئی۔ کہ مجھے یہاں سے بُلا لیا۔ عبدالرحمٰن کو مہم سپرد کر کے تعمیل حکم بجالایا۔ یہاں پہنچے تو خان خاناں انہیں کبھی صلاح و مشورے میں سے کھتے تھے۔ کبھی کسی کی سرکوبی کو کبھی کسی کی سرکوبی کو کبھی کسی دشمنی سزاوار کی فہمائش کو بھیجتے تھے۔ یہ دل میں تنگ تھے۔ مگر اُن کی طبیعت میں یہ بات داخل تھی۔ کہ احکام بادشاہی کو اس طرح بجالاتے تھے۔ گویا اُن کی اصل رائے یہی ہے۔ اُن کا دل تحمل کا پہاڑ تھا۔ اور حوصلہ دریا تے

ذخار - یہاں بھی حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھ کر وقت کے منتظر تھے ؛

آزاد - زال دُنیا عجیب چیز اور عجیب طرح کی علامۂ دہر ہے۔ مرد دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے دیکھو جن دو دوستوں کے مراسلے - عاشق و معشوق کے قبالے نظر آتے تھے۔ جب اس بُڑھیا پر دونو کا معاملہ آن پڑا۔ تو ایسے بگڑے کہ سب بھول گئے ؛

یہ بھی اور ان کا بیٹا بھی باوجود مُلّا ہونے کے اکبری دولت میں ترکتازیہ کا نہ وحیلہ ہائے مردانہ سے وہ کام کرتے تھے - کہ دیکھنے والوں کی عقل حیران تھی ؛

اکبر نامہ کے سنہ ۳۶ جلوس کے آخر میں ایک مقام کی عبارت اہل نظر کو آگاہ کرتی ہے - کہ وہ بالیاقت کار آگاہ کسی خدمت میں ہو۔ مگر اُس کا رعب داب کس مقدار پر تھا ؛

مجھ راقم شکر فنامہ کو ناسک پر بھیجا - رستہ میں شہزادہ کی ملازمت حاصل کی۔ انہوں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ ہمارے حضور میں آ جاؤ - میں نے بھی قبول کی - وہی راجو کی مہم تھی جس کا وبال میرے سر پہ رکھنا چاہتے تھے - میں نے جواب دیا۔ کہ حضور کے فرمانے سے انکار نہیں کرتا لیکن آپ کام پر توجہ نہیں فرماتے - ایسا امر عظیم چند لالچی تنگ چشموں پر چھوڑ دیا ہے - بے پروائی اور ناتوان بینی کے ہنگامہ میں کیونکر کام ہو سکے ؟ بارے کچھ سمجھے - کارسازی کا آپ ذمہ لیا اور گھوڑا اور خلعت دے کر اُدھر روانہ کیا پہلی منزل میں اپنے قدم مبارک سے اعزاز بڑھایا (یعنی میرے خیمہ میں آئے) خاص کمر کا - بندھوا اور ناموَر ہاتھی بھی عنایت فرمایا ؛

معتمد خاں نے اقبال نامہ میں لکھا ہے - کہ سنہ ۱۰۰۹ھ میں ۲۰ ہاتھی معہ تھال اور ۱۰ عمدہ گھوڑے انعام ہوئے - سنہ ۱۰۱۰ھ میں ایک خاصہ کا گھوڑا - اس کے ساتھ ایک گھوڑا عبد الرحمٰن کو عنایت کیا۔ اور ۲۰ گھوڑے پھر بھیجے - ایک شیخ ابوالخیر کو عنایت فرمایا کہ شیخ کو بھیج دو - اسی سنہ میں ۵۰ ہزار روپیہ شیخ کو انعام ملا - اور ایسے ایسے انعاموں کی انتہا نہ تھی ہمیشہ ہی ملتے رہتے تھے - اسی سال میں شیخ کو پنجہزاری منصب مرحمت ہوا غرض تخمیناً تین برس دکن میں اس طرح بسر ہوئے - کہ ایک ہاتھ میں شمشیر و علم تھا - اور ایک ہاتھ میں کاغذ و قلم تھا - رمضان سنہ ۱۰۱۰ھ میں وہیں اکبر نامہ کی جلد سوم تمام کی ہو گی - اور اُس کا خاتمہ تصنیفات کا خاتمہ تھا ؛

اِس ارسطو نے یہ بات اپنے سکندر کے دل پر نقش کر دی تھی - کہ فدوی حضور کی ذات قدسی سے غرض رکھتا ہے اور یہ امر واقعی تھا - وہ کہا کرتا تھا اور سچ کہتا تھا - کہ آپ کی خیر طلبی اور ہوا خواہی اور جان نثاری میرا دین و آئین ہے - جس کی بات ہو گی بے رُو رعایت عرض کر دونگا - امرا بلکہ شہزادوں تک سے بھی غرض نہیں اور چونکہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا - اس لئے اکبر کے دل پر یہ نقش پورا بیٹھا تھا - شہزادے خصوصاً سلیم اسے اپنا چغلخور سمجھ کر ناراض رہتے تھے - اکبر نے مہم دکن سے پھر کر سلیم (جہانگیر) کے ساتھ ظاہری

صورت حال کو درست کر لیا تھا۔ ۱۰۱۱ھ ۱۶۰۲ء میں سلیم نے پھر سلامت روی کا رستہ چھوڑا اور ایسا بگڑا کہ اکبر گھبرایا۔ یہ بھی خیال تھا کہ ہونہار شہزادہ کو ولیعہد سلطنت خیال کر کے امرا ضرور سازش رکھتے ہونگے مان سنگھ کی بہن اس سے بیاہی ہوئی تھی جس کے شکم سے خسرو شہزادہ پیدا ہوا تھا۔ خان اعظم کی بیٹی خسرو سے بیاہی ہوئی تھی۔ غرض بادشاہ نے ابوالفضل کو لکھا کہ مہم کے کاروبار عبدالرحمٰن فرزند کے سپرد کرو۔ اور آپ جریدہ ادھر روانہ ہو۔ ابوالفضل نے اس کے جواب میں نہایت اطمینان اور تشفی کے مضامین سے عرضی بھیجی اور لکھا کہ فضل الٰہی اور اقبال اکبر شاہی کارسازی کریگا۔ تردد کا مقام نہیں۔ اور فدوی حاضر خدمت ہوا ✦

چنانچہ احمدنگر میں عبدالرحمٰن کو مہم کے کاروبار سمجھا کر لشکر اور سامان وہیں چھوڑا۔ آپ جریدہ فقط ان آدمیوں کو لے کر روانہ ہوا۔ کہ جن کے بغیر گذارہ نہ تھا۔ سلیم شیخ سے بہت خفا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ اگر یہ حضور میں آ پہنچا تو باپ کی آزردگی اور بھی زیادہ ہو جائیگی۔ اور ادھر اُدھر کے راجاؤں اور سرداروں سے ساز باز کر کے ایسی تدبیریں کریگا۔ کہ میرا کام برہم ہو جائیگا۔ جب سُنا کہ جریدہ دکن سے چلا ہے تو راجہ مدھکر کا بیٹا راجہ نرسنگھ دیو کہ اُنڈچہ کا بندیلہ سردار تھا۔ اُن دنوں میں رہزنی کر کے دن کاٹتا تھا اور اس بغاوت میں شہزادہ کے ساتھ تھا۔ اُسے سلیم نے خفیہ لکھا کہ کسی طرح رستہ میں شیخ کا کام تمام کر دے۔ اگر خدا نے تخت نصیب کیا۔ تو خاطر خواہ رُتبہ اور انعام سے سرفراز کرونگا۔ اس نے دربار شاہی میں بہت بیعزتی اُٹھائی تھی۔ اِس لئے نہایت خوشی سے اس خدمت کو قبول کیا۔ اور دوڑا دوڑا اپنے علاقے میں جا پہنچا۔

جب شیخ اجین میں پہنچا۔ تو خبر اُڑ رہی تھی کہ راجہ اِس اِس طرح اِدھر آیا ہوا ہے۔ رفیقان جان نثار نے شیخ سے کہا۔ کہ ہماری جمعیت تھوڑی ہے۔ اگر یہ خبر سچ ہے تو مقابلہ مشکل ہوگا۔ بہتر ہے کہ اس رستہ کو چھوڑ کر چاندہ کی گھاٹی سے چلیں۔ قضا آ چکی تھی۔ شیخ نے بے پروائی سے کہا۔ کہ بکتے ہیں۔ چور کا کیا حوصلہ ہے۔ جو بندگان بادشاہی کا رستہ روکے ✦

ربیع الاول کی پہلی ۱۰۱۱ھ جمعہ کا دن صبح کا وقت تھا۔ شیخ منزل سے اُٹھا۔ دو تین آدمی ساتھ باگ ڈالے جنگل کا لطف اُٹھاتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتا باتیں کرتا آگے چلا جاتا تھا۔ سرائے برار سے آدھ کوس رہا تھا۔ اور قصبہ انتری ۳ کوس۔ سوار نے دوڑ کر عرض کی کہ دہ گرد و غبار اُٹھا ہے۔ اور رُخ اس طرف معلوم ہوتا ہے۔ شیخ نے باگ روکی اور غور سے دیکھا۔ گدائی خاں افغان قدیمی جان نثار برابر تھا۔ اُس نے عرض کی ٹھیرنے کا وقت نہیں۔ دُشمن بڑے زور میں آتا معلوم ہوتا ہے۔ اِدھر جمعیت بہت کم ہے۔ اِس وقت صلاح یہی ہے۔ کہ تم آہستہ آہستہ چلے جاؤ۔ میں ان چند بھائیوں اور

ہمراہیوں سے جانفشانی کرکے روکتا ہوں۔ ہمارے مارتے مرتے تک فرصت بہت ہے۔ یہاں سے قصبہ انتری دو تین کوس ہے بخوبی پہنچ جاؤ گے۔ پھر کچھ خطر نہیں۔ رائے رایاں اور راجہ راج سنگھ دو تین ہزار آدمیوں سے وہاں اترے ہوئے ہیں۔ شیخ نے کہا گدائی خاں تجھ جیسے شخص سے تعجب ہے۔ کہ ایسے وقت پر یہ صلاح دیتا ہے۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے مجھ فقیر زادے کو گوشۂ مسجد سے صدر مسند پر بٹھایا۔ میں آج آپ کی شناخت کو خاک میں ملا دوں اور اس چور کے آگے سے بھاگ جاؤں کس منہ سے اور کس عزت سے چشموں میں بیٹھ سکونگا؟ اگر زندگی ہو چکی ہے۔ اور قسمت میں مرنا ہی لکھا ہے۔ تو کیا ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر نہایت دلاوری اور بیباکی سے گھوڑا اٹھایا۔ گدائی خاں پھر گھوڑا مار کر آگے آیا۔ اور کہا کہ سپاہیوں کو ایسے معرکے بہت پڑتے ہیں۔ اڑنے کا وقت نہیں ہے۔ انتری میں جانا اور ان لوگوں کو ساتھ لے کر پھر ان پر آنا۔ اور اپنا انتقام لینا تو سپاہیانہ پیچ ہے۔ قضا آ چکی تھی کسی عنوان راضی نہ ہوا یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ غنیم آن پہنچا۔ اور ہاتھ ہلانے کی فرصت نہ دی۔ شیخ بڑی بہادری سے تلوار پکڑ کر ڈٹا چند افغان ساتھ تھے۔ جانیں نثار کرکے سرخرو ہوئے۔ شیخ نے کئی زخم کھائے مگر ایک برچھے کا زخم ایسا لگا۔ کہ گھوڑے سے گر پڑا۔ جب لڑائی کا فیصلہ ہوا۔ تو لاش کی تلاش ہوئی۔ دیکھا کہ وہ دلاور جو کبھی اکبری تخت کا پایہ پکڑ کر عرض و معروض کرتا تھا۔ اور کبھی سمند فکر پر چڑھ کر عالم خیال کو تسخیر کرتا تھا۔ ایک درخت کے نیچے خاک بیکسی پر بیجان پڑا ہے۔ زخموں سے خون بہتا ہے اور ادھر ادھر لاشے پڑے ہیں۔ اسی وقت سر کاٹ لیا اور شہزادے کے پاس بھجوا دیا شہزادے نے پاخانہ میں ڈلوا دیا۔ کہ دنوں وہیں پڑا رہا قسمت میں یونہی لکھا تھا۔ ورنہ شہزادے کی خفگی کیسی ہی سخت ہو کہہ دیتا کہ خبردار شیخ کا بال بیکا نہ ہو اور شرط یہ ہے کہ زندہ ہمارے سامنے حاضر کرو۔ مگر شرابی۔ کبابی نا تجربہ کار لڑکے کو اتنے ہوش و حواس کہاں تھے جو سمجھتا کہ جیتے پر ہر وقت اختیار ہوتا ہے۔ مر ہی گیا تو کیا ہو سکتا ہے۔

امرائے اکبری کے دلوں کا حال اس نکتہ سے کھلتا ہے کہ کوکلتاش خاں نے تاریخ لکھی مصرع

تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید۔

مگر اس نے خود خواب میں اس سے کہا کہ میری تاریخ تو بندہ ابوالفضل کے اعداد سے نکلتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ملا صاحب بدایونی اس وقت نہ رہے تھے۔ اگر ہوتے تو خوشیاں مناتے اور خدا جانے کیا کیا گل پھول لگا کر مضامین قلمبند کرتے۔

جہانگیر جس طرح ہر بات بے پروائی سے کر گزرتا تھا۔ اسی بے پروائی سے اپنی توزک میں لکھ بھی

لیتا تھا۔ چنانچہ جہاں تخت نشین ہو کر امرا کو منصب دئے ہیں وہاں کہتا ہے۔ بندیلی راجپوتوں میں سے راجہ نرسنگھ دیو پر میری نظر عنایت ہے۔ وہ شجاعت نیکذاتی۔ سادہ لوحی میں اپنے ہمرتبہ لوگوں میں امتیاز تمام رکھتا ہے ۳ ہزاری منصب پر سرفراز ہوا۔ ترقی اور رعایت کا سبب یہ ہوا۔ کہ اخیر کے دنوں میں میرے والد نے شیخ ابوالفضل کو دکن سے بلایا۔ وہ ہندوستان کے شیخ زادوں سے زیادتی فضل و دانائی میں امتیاز تمام رکھتا تھا اور ظاہر حال کو زیور اخلاص سے سجا کر میرے والد کے ہاتھ بھاری قیمت پر بیچا تھا۔ اُس کا دل مجھ سے صاف نہ تھا۔ ہمیشہ ظاہر و باطن چغلیاں کھاتا رہتا تھا۔ اُن دنوں میں (کہ فتنہ انگیزوں کے فسادوں سے والد بزرگوار مجھ سے ذرا آزردہ تھے) یقین تھا کہ اگر دولت ملازمت حاصل کرے تو اس غبار کو زیادہ اڑائیگا۔ اور میری دولت مواصلت کو روکیگا۔ اور ایسا کردیگا کہ مجھے ناچار سعادت خدمت سے محروم رہنا پڑے۔ نرسنگھ دیو کا ملک شیخ کے سر راہ تھا۔ اور ان دنوں وہ بھی سرکشوں میں تھا۔ میں نے بار بار پیغام بھیجے کہ اگر اس فتنہ انگیز کو روک کر نیست و نابود کردے۔ تو رعایت کلی پائیگا۔ چنانچہ توفیق اُس کی رفیق ہوئی جب شیخ اُس کے نواح ولایت میں گزرتا تھا۔ وہ آن پڑا۔ تھوڑی سی ہمت میں اُس کے ہمراہیوں کو تتر بتر کر ڈالا۔ سر الہ آباد میں میرے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ اس بات سے عرش آشیانی کی خاطر مبارک بہت آزردہ ہوئی مگر کم سے کم اتنا ہوا کہ میں بخت اور بیخطر ہو کر آستاں بوسی کو گیا۔ اور رفتہ رفتہ کدورتیں صفائی سے بدل گئیں ؛

ہندوستان کے مؤرخ آخر انہی بادشاہوں کی رعایا تھے۔ بے رعایت حال لکھتے۔ تو بیچارے رہتے کہاں ؟

ملا محمد قاسم فرشتہ اپنی معتبر تاریخ میں اس واقعہ کی بابت فقط اتنا لکھتے ہیں۔ کہ اس سنہ میں دکن سے شیخ ابوالفضل حاضر حضور ہوتے تھے۔ رستہ میں رہزنوں نے مار ڈالا فقط۔ اور یہ لکھنا ان کا بیجا نہ تھا۔ دیکھو کہ فقط حقیقت نویسی کے جرم میں ملا عبدالقادر کے گھر اور اُن کے بیٹے پر جہانگیر کے ہاتھوں کیا آفت گزری۔ اور خود زندہ ہوتے۔ تو خدا جانے کیا حال ہوتا ؛

ڈیلیٹ نام ایک ڈچ سیاح نے اس واقعہ کا حال لکھا ہے۔ اُسے اپنی تحریر میں کسی کا خطرہ نہ تھا۔ اس لئے عجب نہیں کہ جو کچھ لکھا سچ ہی لکھا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ سلیم الہ آباد میں آیا اور سلطنت کا دعویٰ کیا خطبہ اپنے نام کا پڑھوایا۔ روپے اشرفی پر اپنا سکہ لگایا۔ بلکہ زر مذکور کو مہاجنوں اور اہل معاملہ کے لین دین میں ڈلوا کر آگرہ تک پہنچایا۔ کہ باپ دیکھے اور جلے۔ باپ نے یہ سب حال شیخ کو لکھا۔ اس نے جواب میں لکھا۔ کہ حضور خاطر جمع رکھیں جس قدر جلد کہ ممکن ہے میں حاضر ہوا۔ اور شہزادہ کو مناسب

خواہ نامناسب حالت سے حضور میں حاضر ہونا پڑیگا ÷

غرض شیخ نے کاروبار کی درستی کرکے کئی دن بعد دانیال سے اجازت لی - دو تین سو آدمی ساتھ لے کر روانہ ہوا - اور حکم دیا - کہ اسباب پیچھے آئے - سلیم کو سب خبریں پہنچ رہی تھیں - اور جانتا تھا کہ شیخ کے دل میں میری طرف سے کیا ہے - ڈرا کہ اب باپ اور بھی ناراض ہوگا - اِس لئے جس طرح ہو - شیخ کو روکنا چاہئے - راجہ نرسنگھ دیو صوبۂ اُجین میں رہتا تھا اُسے لکھا کہ نرور اور گوالیار کے آس پاس گھات میں لگا رہے - اور جہاں موقع پائے اُس کا سر کاٹ کر بھیجدے - اس پر بہت سے انعام و اکرام اور پنجہزاری منصب کا وعدہ کیا - راجہ نے خوشی سے منظور کر لیا - ہزار سوار ۳ ہزار پیادے لیکر تین چار کوس پر آن لگا - اور جاسوسی کے لئے قراول اِدھر اُدھر پھیلا دئے - کہ خبر دیتے رہیں - شیخ کو اس گھات کی بالکل خبر نہ تھی - جب کلے باغ میں پہنچا - اور نرور کا رُخ کیا - تو راجہ کو خبر لگی - وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ یکایک آکر ٹوٹ پڑا - اور چاروں طرف سے گھیر لیا - اور شیخ اور اُس کے رفیق بڑی بہادری سے لڑے - مگر دشمنوں کی تعداد بہت تھی - اِس لئے سب کے سب کٹ کر کھیت رہے - شیخ کی لاش دیکھی - تو ۱۲ زخم آئے تھے - اور ایک درخت کے نیچے پڑا تھا - وہاں سے اُٹھا کر سر کاٹا - اور شہزادے کے پاس بھیج دیا - وہ بہت خوش ہوا - فقط ÷

آزاد - شیخ کو اِس معاملہ میں تمام آلِ تیمور کے مورخ الزام دیتے ہیں - کہ وہ خود پسند اور خود رائے آدمی تھا - اپنی عقل کے سامنے کسی کو سمجھتا ہی نہ تھا - یہاں بھی خود رائی کی اور اس کا نتیجہ پایا - لیکن درحقیقت یہ مقدمہ غور طلب ہے - اس میں کچھ شک نہیں - کہ اسے اپنے جوہر کمالات اور عقل و دانش سے آگاہی تھی - اور اکبر کے دربار میں جو جانفشاں محنتیں اور جاں نثار خدمتیں کی تھیں اُن پر بھروسہ تھا - ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوگا - کہ مجھ جیسے شخص کے لئے شہزادہ نے یہ حکم نہ دیا ہوگا - کہ جان سے مار ڈالے - بلکہ یہ بھی خیال ہوگا کہ اگر اُس شرابی کبابی لڑکے نے کہہ بھی دیا ہوگا تو جو سردار ہوگا وہ مجھے جان سے مارنے کا قصد نہ کریگا - بہت ہوگا تو باندھ کر اُس کے سامنے حاضر کر دیگا - امرا بغاوت کرتے ہیں - فوجوں کی فوجیں کاٹ کر ڈال دیتے ہیں - مُلک لُوٹ کر تباہ کر دیتے ہیں - پھر بھی تیموری درباروں میں اُن کی خطائیں اِس طرح معاف ہو جاتی ہیں کہ ملک و منصب بحال رہ کر پہلے سے سوا عالی رُتبے پاتے ہیں اور یہاں تو کچھ بات بھی نہیں - اتنا ہی ہے کہ شہزادے کو میری طرف سے باپ کے سامنے چغلیاں کھانے کا خیال ہے - پس اتنی بات کے لئے میدان سے بھاگنا اور بھگوڑا کہلانا کیا ضرور ہے - نامردی اور بزدلی کا داغ کیوں اُٹھاؤں اور یہیں ڈٹ جاؤں - انجام یہی ہوگا کہ پکڑ کر شہزادے کے سامنے

لے جائینگے۔ یہ سکندر و افلاطون غصّہ کے بھوت بن جائیں تو پری بناکر شیشہ میں اُتار لوں۔ وہ تو مُو رکھ شہزادہ ہے۔ وہ منتر ایسے پھونکونگا۔ کہ اُٹھ کر ساتھ ہو جائے۔ اور ہاتھ باندھ کر باپ کے پاؤں میں جا رہے۔ مگر وہی بات کہ تقدیر الٰہی۔ وہ کچھ سمجھا تھا اور معاملہ کچھ نکلا۔ اور تم بھی ذرا غور کر کے دیکھو۔ کہ وہ بندیلہ بھی دھاڑ مار لٹیرا ہی تھا۔ جو اس طرح پیش آیا۔ کوئی راجہ ہوتا۔ اور راج نیت کی ریت کا برتنے والا ہوتا تو اس وحشیانہ طور سے شیخ کا کام تمام نہ کرتا۔ نہ بات نہ چیت نہ لڑائی کا آگا نہ پیچھا۔ کچھ معلوم ہی نہ ہوا۔ سینکڑوں بھیڑئیے تھے کہ چند بکریوں پر آن پڑے۔ اور دم کے دم میں چیر پھاڑ بھاگ گئے ؛

اب ادھر کی سنو۔ کہ جب مرنے کی خبر دربار میں پہنچی تو سناٹے کا عالم ہو گیا۔ سب حیران رہ گئے۔ سوچتے تھے کہ بادشاہ سے کہیں کیا ؟ کیونکہ اکبر جانتا تھا۔ کہ وہی میرا ایک ذاتی خیر اندیش ہے اور ان میں کوئی امیر دل سے اُس کا خیر خواہ نہیں۔ خدا جانے کیا خیال گزرے اور کدھر بجلی گر پڑے! آل تیمور میں دستور قدیم تھا۔ کہ جب کوئی شہزادہ مرتا تھا۔ تو اس کی خبر بادشاہ کے سامنے صاف بیدھڑک نہیں کہہ دیتے تھے۔ اُس کا وکیل سیاہ رومال سے ہاتھ باندھ کر سامنے آتا تھا۔ اور خاموش کھڑا رہتا تھا۔ معنی یہی ہوتے تھے۔ کہ اُس کے آقا نے انتقال کیا ؛

اکبر اُسے اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اِس لئے وکیل سر جھکائے رومال سے ہاتھ باندھے آہستہ آہستہ ڈرتا ہوا تخت کے گوشہ کی طرف آیا۔ اکبر دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ اور کہا خیر باشد کیا ہوا۔ جب اُس نے بیان کیا۔ تو اس قدر غمناک اور بیقرار ہوا۔ کہ کسی بیٹے کے لئے یہ حال نہ ہوا تھا۔ کئی دن تک دربار نہ کیا۔ اور کسی امیر سے بات نہ کی۔ افسوس کرتا تھا اور روتا تھا۔ بار بار چھاتی پر ہاتھ مارتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ ہائے شیخوجی بادشاہت لینی تھی۔ تو مجھے مارنا تھا۔ شیخ کو کیا مارنا تھا اس کا بے سر لاشہ آیا تو یہ شعر پڑھا۔ **شعر**

شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ	ز اشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ

۵۲ برس چند مہینے کا سن۔ مرنے کے دن نہ تھے۔ مگر موت نہ دن دیکھتی ہے نہ رات۔ جب آ جائے۔ وہ ہی اُس کا وقت ؛

ابوالفضل کی قبر اب بھی انتری میں موجود ہے۔ جو گوالیار سے پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور مہاراجہ سیندھیا کا علاقہ ہے۔ اس پر ایک غریبانہ وضع کی عمارت ہے۔ ابوالفضل نے اپنے باپ اور ماں کی ہڈیاں لاہور سے آگرہ پہنچائی تھیں۔ کہ اُن کی وصیّت پوری ہو۔ مگر اُس کی لاوارث لاش کا

اُٹھانیوالا کوئی نہ ہُوا۔ کہ جہاں گرا وہاں ہی خاک کا پیوند ہُوا۔ اُس کے دل کی روشنی اور نیک نیتی کی برکت ہے۔ کہ آج تک انتری کے لوگ ہر جمعرات کو وہاں ہزاروں چراغ جلاتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں

جگنو آ آ کے چلے جاتے ہیں صحرا کی طرف	گورِ مجنوں پہ کہیں آج چراغاں ہوگا
ہاتھ چومینگے میرے گبر و مسلماں دونو	ایک میں دستِ صنم ایک میں قرآں ہوگا

اکبر بیٹے کو تو کیا کہتے۔ رائے رایاں کو فوج دے کر بھیجا۔ کہ نرسنگھ دیو کو اُس کی بداعمالی کی سزا دو۔ عبدالرحمٰن کو فرمان لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ تم اس کے ساتھ شامل خدمت ہو۔ اور باپ کی کینہ خواہی اور انتقام سے اپنی حلال زادگی اہلِ عالم پر آشکار کرو۔ یہ دو لو مدت تک جنگلوں اور پہاڑوں میں اُس کے پیچھے مارے مارے پھرے وہ کہیں نہ ٹھیرا۔ لڑتا رہا بھاگتا رہا۔ شیخ نے سچ کہا تھا۔ کہ رہزن ہے۔ وہ کس طرح جم کر لڑتا۔ آخر دونو تھک کر چلے آئے ٭

افسوس کے قلم اور سیہ بختی کی سیاہی سے لکھنے کے قابل یہ بات ہے۔ کہ جو فضل و کمال تھا۔ وہ **فضل** اور **فیضی** کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہُوا۔ اتنے بھائی اور عبدالرحمٰن اکلوتا بیٹا تھا۔ سب خالی رہ گئے ٭

ابوالفضل کے مذہب کا بیان دربار اکبری کی سیر کرنے والوں کو شیخ مبارک کے مذہب کا حال معلوم ہے۔ ابوالفضل اُس کا رشید بیٹا تھا۔ سمجھ لو کہ اس کے خیالات بھی باپ کے خیالات کی نسل پاک تھے۔ البتہ زمانہ کی آب و ہوا سے ذرا رنگ بدل گیا تھا۔ اگرچہ ان نقطوں کو شیخ مبارک فیضی۔ مُلّا صاحب وغیرہ کے بیان میں دائرہ کی گردش سے پھیلا چکا ہوں۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ مجھے بھی ان کے بار بار کہنے میں مزا آتا ہے۔ اِس لئے ایک دفعہ پھر دل کا ارمان نکالتا ہوں شاید کہ باتوں باتوں میں کُچھ حقیقت سے پردہ اُٹھ جائے۔ میرے دوستو تمہیں معلوم ہے اور پھر معلوم کرو۔ کہ شیخ مبارک ایک فاضل ہمہ دان تھا۔ اور دماغ ایسا روشن لے کر آیا تھا۔ کہ چراغ علم کیلئے قندیل فروزاں تھا۔ وہ ہر علم کی کتابیں کامل اُستادوں سے پڑھا تھا اور پڑھاتا تھا۔ اور نظر اُس کی تمام علوم عقلی و نقلی پر برابر چھائی ہوئی تھی۔ باوجود اس کے جو کچھ دل کو حاصل ہو گیا تھا۔ وہ کتابوں کے الفاظ و عبارت میں محدود نہ تھا۔ اور بات وہی تھی جو اُس کی سمجھ میں آگئی تھی ٭

اِسی عہد میں کئی عالم تھے۔ کہ کتابی علوم میں پورے تھے یا ادھورے مگر نصیبوں کے پورے تھے۔ جن کی بدولت شاہانِ وقت کے دربار میں پہنچ کر شاہی بلکہ خدائی اختیار رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ کھلے ہیں تر اور اُنگلیاں رزق کی کنجیاں دیکھ کر بہت سے علمائے مسند نشین اور مشائخ اور ائمہ مساجد

گرد بیٹھے اُن کا کلمہ پڑھا کرتے تھے - شیخ مبارک دربار شاہی کا ہوسناک نہ تھا۔ اس کا دل خدا نے ایسا بنایا کہ جب اپنی مسجد کے چبوترہ پر بیٹھتا۔ اور چند طالب علم کتاب کھولے ہوتے۔ تو ایسا الکتا اور چہکتا تھا کہ وہ لطف باغ میں نہ گل کو حاصل ہے نہ بلبل کو۔ اور بات یہ ہے کہ شاہوں کے دربار اور امرا کی سرکار کی طرف اُس کے شوق کا قدم اُٹھتا ہی نہ تھا۔ البتہ جب کسی غریب پر علمائے مذکور اختیار جابرانہ اور فتووں کے زور سے ظلم کرتے اور وہ التجا لاتا۔ تو اُسے آیتوں اور روایتوں سے سپر تیار کر دیتا تھا جس سے اُس کی جان بچ جاتی تھی۔ اور اس بات میں وہ کسی کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُن لوگوں کو بھی خبر ہو جاتی تھی۔ اور اپنے جلسوں میں اُس کے چرچے خطرناک الفاظ سے کرتے تھے۔ کبھی رافضی بناتے۔ کبھی مہدوی ٹھیراتے۔ اور اس جرم کی سزا اُس زمانہ میں قتل ہی تھی۔ لیکن اس کی فضیلت اور حقیقت کا جوہر وسائے زور دیتا تھا۔ وہ سُن کر ہنس دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ ہیں کون ؛ اور ہیں کیا ؛ اور سمجھتے کیا ہیں ؛ کبھی گفتگو کا موقع آن پڑا تو سمجھا دینگے ✦

شیخ مبارک کی اس رسم و راہ نے اُسے اکثر خطر میں ڈالا۔ اور سخت تکلیفوں میں مبتلا کیا لیکن اُسے کچھ بھی پروا نہ ہوئی۔ اور ان کے اختلافوں کو ہنسی کھیل سمجھ کر نباہتا رہا۔ ایشیا کے مذاہب مروجہ خصوصاً فرقہ ہائے اسلام کی کتابوں پر اس کی معلومات چاندنی کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ دشمنوں کی ایذا اور آثار عام دیکھ کر کتب متفرقہ کو اور نظر سے دیکھنے لگا۔ جب کوئی مسئلہ اس طرح کا آتا۔ فوراً کتابی حوالوں سے حریفوں کی حرفت کو بند کرتا یا اختلافی مسئلہ دکھا کر ایسا شبہ پیدا کر دیتا۔ کہ دق ہو کر رہ جاتے۔ لیکن جو کچھ کہتا تھا سوچ سمجھ کر۔ اور حق کو جانچ کر سند اور اصلیت کی بنیاد پر کہتا تھا۔ کیونکہ رقیبوں کے فتووں میں شاہانہ زور ہوتا تھا۔ اگر یہ حق پر نہ ہوتا تو جان پر حرف آتا تھا ✦

ہمایوں۔ شیر شاہ۔ سلیم شاہ کی بادشاہی میں اُن لوگوں کی خدائی رہی۔ اور اکبری دور میں چند سال سلطنت ان کی زبان پر چلتی رہی۔ نوجوان بادشاہ کو خیال ہوا کہ دائرہ سلطنت کو تمام ہندوستان پر پھیلائے۔ اور چونکہ یہاں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ ہیں۔ اس لئے واجب ہوا کہ اپنایت اور محبت کے ساتھ قدم بڑھائے۔ اس نے اس کوشش میں کامیابی بھی پائی لیکن علمائے مذکور اس کو دین میں چلنا کفر سمجھتے تھے۔ ملک پرور کو واجب ہوا کہ اس کے لئے اسی ڈھب کے کارگذار بہم پہنچائے فیضی و فضل ہمہ داں عالم تھے۔ اور ہم رنگ طبیعت رکھتے تھے۔ انہوں نے آقا کے حکم اور خدمت کے لوازمات کو اُس کی مرضی سے بھی بڑھ کر سرانجام دیا۔ کار سلطنت کا دستور العمل اس امر کو قرار دیا کہ خدا رب العالمین اور خلائق کا آسودہ و آباد کرنے والا ہے۔ ہندو مسلمان۔ گبر و ترسا اُس کے

نزدیک سب برابر ہیں۔ بادشاہ سایۂ خدا ہے۔ اُسے بھی یہی بات مدنظر رکھنی واجب ہے۔ اس چھوٹے سے نکتے میں کئی مطلب نکل آئے۔ سلطنت کی بنیاد محکم ہوگئی۔ بادشاہ کی قربت حاصل ہوگئی۔ جن حریفوں سے جان کا خطر تھا۔ خود بخود ٹوٹ گئے۔ البتہ وہ اور اُن کی امت جو سلطنت اور دولت کو فقط اسلام ہی کا حق سمجھے ہوئے تھے اُن کے کاروبار پہلی اوج موج پر نہ رہے۔ انہوں نے انہیں بدنام کردیا اور حق بات وہی ہے۔ کہ بادشاہ کی فرمائش کو اس کی مرضی سے بھی کئی درجے بڑھا کر بجالاتے تھے۔ بادشاہ کی خوشی ہو کبھی تو عمامہ بڑھا کر کھڑکی دار پگڑی باندھ لی۔ عبا اُتار کر جامہ پہن لیا وغیرہ وغیرہ۔ ایک ہندو کو شیخ صدر نے فتوے شریعت کے زور سے مروا ڈالا۔ اُنہوں نے گفتگو کے معرکہ میں شیخ صدر کی رفاقت نہ کی۔ بادشاہ کی تقریر کی تائید کہتے رہے۔ اسی ذیل میں ملا صاحب چوٹ کرتے ہیں ملک فرنگ کے ریاضت کیش داناؤں کو پادھری کہتے ہیں۔ اور مجتہد کامل کو کہ مصلحتِ وقت کے بموجب تغیر احکام بھی کرسکتا ہے۔ اور بادشاہ بھی اُس کے حکم سے عدول نہیں کرسکتا۔ پاپا کہتے ہیں۔ وہ لوگ انجیل لائے تثلیث کی دلیلیں پیش کیں اور نصرانیت کی حقیت ثابت کرکے مذہب عیسوی کو رواج دیا۔ بادشاہ نے شاہزادہ مراد کو فرمایا اور اُنہوں نے شگون برکت کے طور پر چند سبق پڑھے۔ ابوالفضل ترجمہ کے لئے مقرر ہوئے۔ بسم اللہ کی جگہ یہ مصرع تھا ع

اے نامی تو ژژو کرستو	شیخ فیضی نے کہا	سبحانک لاشریک یا ہو

پھر ایک جگہ داغ دیتے ہیں۔ تو سارے علاقہ گجرات سے آتش پرست آئے۔ انہوں نے دینِ زردشت کی حقیت ظاہر کی۔ اور آگ کی تعظیم کو عبادت عظیم بیان کرکے اپنی طرف کھینچا۔ کیانیوں کی راہ وروش اور ان کے مذہب کی اصلاحیں بتائیں حکم ہوا کہ شیخ ابوالفضل کا اہتمام ہو۔ اور جس طرح ملک عجم کے آتشکدے ہردم روشن رہتے ہیں۔ یہاں بھی ہروقت۔ کیا دن کیا رات روشن رکھو۔ کہ آیات الٰہی میں سے ایک آیت اور اُس کے نوروں میں سے ایک نور ہے ✦

خیر ان باتوں کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ سلطنت کے معاملات کچھ اور ہیں اور ملکی مصلحت کا مذہب جُدا ہے اِن میں اکبر پر بھی اعتراض نہیں کرسکتے یہ تو اُس کے نوکر تھے۔ جو آقا کا حکم ہوتا تھا بجالانا واجب تھا۔ یہانتک مقدمہ سہل ہے۔ ہاں مشکل یہ ہے۔ کہ جب شیخ مبارک مر گئے۔ تو شیخ ابوالفضل نے معہ بھائیوں کے بھدرا کیا۔ اصل نقط اتنی تھی۔ کہ بادشاہ ہر مذہب کے ساتھ محبت و رغبت ظاہر کرتا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس لئے اُن سے زیادہ تھے ✦

چنانچہ جب انکہ مر گئی اور مریم مکانی کا انتقال ہوا تو دونو دفعہ اکبر نے خود بھدرا کیا اور دلیل

یہ تھی۔ کہ عہد قدیم میں سلاطین ترک بھی ایسے موقع پر بھدرا کیا کرتے تھے۔ بادشاہ کی خوشی اِس میں دیکھی انہوں نے بھی بھدرا کیا یہ سب باتیں بادشاہ کی دلجوئی اور اُس کی مصلحت ملکی کے لئے تھیں ورنہ فیضی و فضل جو اپنی تیزی فکر اور زور زبان سے دلائل افلاطون اور براہین ارسطو کو روئی کی طرح دھنکتے تھے وہ اور دین الٰہی اکبر شاہی پر اعتقاد لائینگے یا جزئیات مذکورہ اُن کا عقیدہ ہو جائیگا۔ توبہ توبہ۔ سب کچھ کرتے ہونگے۔ اور پھر اپنے جلسوں میں آکر کہتے ہونگے۔ کہ آج کیا احمق بنایا ہے۔ دیکھا ایک مسخرہ بھی نہ سمجھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جیسے اُن کے زبردست حریف تھے۔ اور لاعلاج موقع اُن پر پڑتے تھے۔ وہ ایسی تجویزوں کے بغیر ٹوٹ بھی نہ سکتے تھے۔ یاد کرو مخدوم الملک وغیرہ کا پیام اور ابوالفضل کا جواب کہ ہم بادشاہ کے نوکر ہیں بینگنوں کے نوکر نہیں ٭

انشاے ابوالفضل کو دیکھو کہ خانخاناں نے جو ایک مراسلہ شیخ ابوالفضل کو لکھا تھا۔ اُس میں یہ بھی پوچھا تھا۔ کہ تمہاری صلاح ہو تو ایرج کو دربار میں بھیج دوں۔ کہ دین و آئین سے باخبر ہو۔ یہاں میرے ساتھ لشکر میں ہے۔ اور جنگلوں میں سرگرداں پھرتا ہے۔ شیخ نے اُس کے جواب میں خط لکھا ہے۔ اور نکتہ مذکورہ کے باب میں یہ فقرہ لکھا ہے۔ دربار میں ایرج کا بھیجنا کیا ضرور ہے۔ تمہیں اِس میں اصلاح عقیدہ کا خیال ہے۔ یہ اُمید بے حاصل ہے۔ اب تم خیال کرو کہ دربار کی طرف سے اُس کے اصلی خیالات کیا تھے۔ جو یہ فقرہ قلم سے ٹپکا ہے ٭

اِس کی تصنیفات کو دیکھو۔ جہاں ذرا سا موقع پاتا ہے۔ کس خلوص عقیدت سے مضامین عبودیت اور حق بندگی ادا کرتا ہے۔ اور انہیں فلسفۂ الٰہی کے مسائل میں اسطرح تضمین کرتا ہے۔ کہ افلاطون بھی ہوتا۔ تو اُسکے ہاتھ چوم لیتا۔ ابوالفضل کے دفتر دوم و سوم کو دیکھیے۔ اُسکی تعریف شیخ شبلی کریں یا جنید بغدادی۔ آزاد کیا کہے۔

کیونکہ سودا میں کروں وصف بناگوش اُسکا	نہیں ہے آب گہر سے یہ زباں پاک ہنوز

شاہ ابوالمعالی لاہوری نے اپنے ایک رسالہ میں لکھ دیا ہے کہ میں شیخ ابوالفضل کو اچھا نہ جانتا تھا ایک شب دیکھا کہ اُسی کو لاکر بٹھایا ہے۔ اور وہ آنحضرت کا جُبہ پہنے ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا۔ کہ اُس کی بخشش کا وسیلہ ایک مناجات ہوئی ہے جس کا پہلا فقرہ ہے۔ الٰہی نیکاں را بوسیلۂ نیکی سرفرازی بخش و بداں را بمقتضاے کرم دلنوازی کن ٭

ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ رات کو فقرا کی خدمت میں جاتا تھا۔ اشرفیاں نذر دیتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ ابوالفضل کی سلامتی ایمان کی دعا کرو۔ اور یہ لفظ اُس کا تکیہ کلام تھا۔ کہ آہ کیا کروں۔ بار بار کہتا تھا اور ٹھنڈے سانس بھرتا تھا ٭

اکبر نے کشمیر میں ایک عالیشان عمارت بنائی تھی کہ ہندو مسلمان جس کا دل رجوع ہو وہاں آکر بیٹھے۔ اور معبود حقیقی کی یاد میں مصروف رہے۔ اِس پر عبارت مفصلۂ ذیل نقش کی تھی۔ کہ ابوالفضل نے ترتیب دی تھی۔ ذرا اِس کے الفاظ کو دیکھو۔ کس صدقِ دل سے ٹپکتے ہیں ٭

الٰہی بہر خانہ کہ مے نگرم جویاے تو اند۔ و بہر زباں کہ مے شنوم گویاے تو۔ شعر

کفر و اسلام در رہت پویاں	وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

اگر مسجد است بیاد تو نعرۂ قدوس میزنند و اگر کلیسیا ست بشوق تو ناقوس مے جنبانند رباعی

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ	خلقے بتو مشغول و تو غائب زمیانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد	یعنی کہ ترا مے طلبم خانہ بخانہ

اگر خاصان ترا بکفر و اسلام کارے نیست ایں ہر دو را در پردۂ اسلام تو بارے نہ ٭

کفر کافر را و دیں دیندار را	ذرۂ دردِ دلِ عطار را

ایں خانہ بہ نیت ایتلاف قلوب موحدان ہندوستان و خصوصاً معبود پرستان عرصۂ کشمیر تعمیر یافتہ ٭

بفرمانِ خدیو تخت و افسر	چراغ آفرینش شاہِ اکبر
نظام اعتدال ہفت معدن	کمال امتزاجِ چار عنصر

خانہ خرابے کہ نظر صدق نینداختہ ایں خانہ را خراب سازد باید کہ نخست معبد خود را بیندازد چہ اگر نظر بہ دل است باہمہ ساختنی ست و اگر چشم بر آب و گل است ہمہ برانداختنی مثنوی

خداوندا چو داد کار دادی	مدار کار بر نیت نہادی
تو ئی برکار گاہِ نیت آگاہ	بہ پیش شاہ داری نیت شاہ

ملوک ہین صاحب لکھتے ہیں۔ کہ عمارت عالمگیر کے عہد میں منہدم ہوئی ٭

ملا صاحب کی تاریخ کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ جس کے باپ سے فیض تعلیم پایا اُسی کے مذہب و اعتقاد پر ٹوکرے بھر بھر خاک ڈالی۔ بات یہ ہے۔ کہ جب ایک مطلوب پر دو طالبوں کے شوق ٹکراتے ہیں تو ایسے ہی شرارے اُڑتے ہیں۔ دربار میں دو نوجوان آگے پیچھے پہنچے۔ شاگرد کے خیالات چند روز بھی اُستاد اور خلیفہ کے ساتھ درست نہ رہے۔ یہ ضرور تھا کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے مزاج اور مناسبت وقت اور اپنی مصلحتِ حال کی نظر سے اکثر باتیں ایسی کیں۔ کہ ملا صاحب کا فتویٰ اس کے برخلاف ہو گیا۔ لیکن حق یہی ہے کہ اُن کی روز افزوں ترقی۔ و مبدم کی قربت ملا صاحب سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اِس لئے بگڑتے تھے اور تڑپتے تھے اور جس رستے سے جگہ پاتے تھے بخارات نکالتے تھے۔ پھر بھی لیاقت کی

خوبی دیکھو۔ کہ علم و فضل اور تصنیفات میں کچھ سقم نہیں نکال سکے۔ مگر روے حسد سیاہ تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی شوشہ لگا دیا۔ کہ لوگ کہتے ہیں۔ اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہی ہے تو اُسکے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اُس کا باپ تو ایسا تھا۔ تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا اور اگر حقیقت میں ابوالفضل ہی کی تصنیف تھی۔ تو اس سے زیادہ فخر کیا ہوگا۔ کہ ۲۰ برس کی عمر میں ایک نوجوان ایسی تفسیر لکھے۔ جسے علما اور اہل نظر شیخ مبارک جیسے شخص کا کلام سمجھیں۔ ابوالفضل نے سنا ہوگا۔ تو کئی چمچے خون دل میں بڑھ گیا ہوگا۔ ان باپ بیٹوں کے باب میں ملاے موصوف کا عجیب حال ہے۔ کسی کی بات ہو۔ کسی کا ذکر ہو۔ جہاں موقع پاتے ہیں۔ ان بیچاروں میں سے کسی نہ کسی کے ایک نشتر مار دیتے ہیں۔ چنانچہ زمرۂ علما میں شیخ حسن موصلی کا حال لکھتے ہیں۔ کہ شاہ فتح اللہ کا شاگرد رشید ہے۔ اور خلاصۂ احوال یہ ہے۔ کہ فنونِ ریاضی اور طبعی اور اقسام حکمت میں ماہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ فتح کابل کے موقع پر حضور میں پہنچا تھا۔ بڑے شاہزادے کی تعلیم پر معمور ہوا۔ شیخ ابوالفضل نے بھی یہ علوم اُس سے خفیہ پڑھے۔ اور دقائق اور باریکیاں حاصل کیں پھر بھی اُس کی تعظیم نہ کرتا تھا۔ آپ فرش پر بیٹھتا اور اُستاد زمین پر۔ **آزاد**۔ خیال کرو۔ کجا شیخ حسن۔ کجا اسکا کمال فضیلت کہیں کا ذکر۔ کہیں کا فکر۔ ابوالفضل غریب کو ایک ٹھوکر مار گئے۔ فیضی بیچارے کو بھی ایسے ہی نشتر مارتے جاتے ہیں۔ کہیں ایک ہی تیر میں دونو کو چھید جاتے ہیں۔ دیکھو فیضی کے حال میں ✦

شیخ کی انشا پردازی شیخ کی انشا پردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ نعمت خدا داد ہے۔ کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہر ایک مطلب کو اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ بڑے بڑے انشا پردازوں کو دیکھو جہاں عبارت میں لطف اور کلام میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بہار سے رنگ لیتے ہیں۔ اور حسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و نمکین کرتے ہیں۔ یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصل مطلب کو اسطرح ادا کرتا ہے کہ ہزاروں رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں۔ اُسکے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصور اگر قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں۔ وہ انشا پردازی کا خدا ہے۔ اپنے لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے۔ الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے لطف یہ ہے۔ کہ جس عالم میں لکھتا ہے نیا ڈھنگ ہے۔ اور جتنا لکھتا جاتا ہے۔ عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو۔ میں اس کی تصنیف کے ایک ایک نسخہ کی کیفیت لکھونگا۔ اور جہاں تک میری ناتمام لیاقت اور نارسا قلم پہنچیگا۔ وہاں تک ان کا حال آئینہ کرونگا ✦

یہ الفاظ جو اُس کے کمال کے باب میں لکھتا ہوں نہ سمجھنا کہ آج کے۔ رواج بے کمالی کی نسبت سے

لکھتا ہوں۔ نہیں اُس وقت کہ ہفت اقلیم کے اہل کمال جمع تھے۔ اور پائے تخت ہندوستان میں ولایتوں کے علما اور ارباب کمال کا جمگھٹا تھا۔ جب بھی تمام انبوہ کو چیر کر اور سب کو کُہنیاں مار کر آگے نکل گیا۔ اُسکے دست و قلم میں زور تھا۔ کہ ملکوں کے اہل کمال کھڑے دیکھا کرتے تھے۔ اور یہ آگے بڑھتا تھا۔ اور نکل جاتا تھا۔ ورنہ کون کسی کو بڑھنے دیتا ہے۔ وہ مر گیا ہے۔ اور آج تک اِس کی تحریر سب سے آگے اور سب سے اونچی نظر آتی ہے +

امین احمد رازی نے اُسی عہد میں تذکرۂ ہفت اقلیم لکھا ہے۔ اِس ایرانی کے انصاف پر بھی ہزار آفرین ہے۔ کہ ہندوستانی شیخ کے باب میں اس طرح حق کو ظاہر کیا "بے شائبۂ تکلف و سخنوری بے فائدۂ تصنیف و مدح گستری۔ امروز در عقل و فہم نظیر و عدیل ندارد۔ با آنکہ ہموارہ در خدمت شاہنشاہی چوں عرض بجوہر قائم است۔ اگر ساعتے فرصتے مے یابد۔ اوقات را بتحصیل سخنان فضلا و تحقیق مطالب حکما مصروف میدارد و در انشا ید بیضا دارد چہ نوادر حکایات بعبارت تازہ در سلک تحریر مے کشد۔ و از تکلفات منشیانہ و تصنیفات مترسلانہ اجتناب واجب میداند و شاہد ایں معنی اکبر نامہ است و ہمچنیں بشعر خواندن رغبت بسیار دارد و بہ نزاکت و دقت نظم نیک مے رسد و احیاناً بنا بر آزمودن طبع جواہر نظمے از کان اندیشہ بیروں مے آرد" +

تصنیفات اکبر نامہ دفتر اوّل میں سلسلۂ تیموریہ کا حال ہے مگر مختصر۔ بابر کا کچھ زیادہ۔ ہمایوں کا اُس سے زیادہ (عام ترتیب میں یہ جلد اوّل ہے) پھر اکبر کا ۱۷ برس کا حال۔ اسے قرن اوّل قرار دیا ہے۔ کیونکہ ۱۳ برس کی عمر میں تخت نشینی کے ۱۷ برس کا حال یہ کل ۳۰ برس ہوئے (عام ترتیب میں اِس پر جلد دوم ختم ہوتی ہے)

دیباچہ میں کچھ عذر بھی لکھے ہیں۔ جیسا کہ باکمال مصنفوں کا انکسار ہوتا ہے۔ یہ منصفانہ تحریر قابل تعریف ہے۔ کہ میں ہندی ہوں فارسی میں لکھنا میرا کام نہیں تھا۔ بڑے بھائی کے بھروسے پر یہ کام شروع کیا اور افسوس یہ کہ تھوڑا ہی لکھا گیا تھا جو اُن کا انتقال ہوا۔ دس برس کا حال اُن کی نظر سے اِس طرح گذرا ہے کہ انہیں اِس پر بھروسہ نہ تھا۔ میری خاطر جمع نہ تھی +

دفتر دوم ۱۸ جلوس یعنی قرن ثانی سے شروع کیا ہے۔ اور ۴۶ جلوس ۱۰۱۱ھ پر ختم کیا۔ (عام ترتیب میں جلد سوم ہے۔ باقی آخر عہد اکبر کا حال عنایت اللہ محب نے لکھ کر تاریخ اکبری پوری کی مگر مروج نہیں۔ اسے الفنسٹین صاحب محمد صالح کی طرف منسوب کرتے ہیں) +

جلد اوّل۔ جس میں ہمایوں کا حال ختم کیا ہے۔ اِس کی عبارت سلیس منشیانہ محاورہ متانت سے

دست و گریبان ہے +

جلد دوم۔ اکبر کی ۱۰ سالہ سلطنت کا حال ہے۔ اِس میں مضامین کا جوش و خروش۔ لفظوں کی شان و شکوہ۔ عبارت زور شور پر ہے۔ اور بہار کے رنگ اُڑتے ہیں۔ اس کا انداز عالم آرائے عباسی اور انشائے طاہر وحید سے ملتا ہے +

جلد سوم میں رنگ بدلنا شروع ہُوا ہے۔ عبارت بہت متین سنجیدہ اور مختصر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے دہ سالہ اخیر کو دیکھیں تو آئین اکبری کے قریب قریب جا پہنچتی ہے۔ لیکن جس جس رنگ میں ہے اُسے پڑھ کر دل کہتا ہے کہ یہی خوب ہے۔ ہر جشن جلوس پر بلکہ بعض بعض معرکوں کی ابتدا میں ایک ایک تمہید چند سطر یا آدھے صفحے کی۔ کہیں بہاریہ رنگ میں۔ کہیں حکیمانہ انداز میں ہے۔ اِس میں دو دو شعر بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین ہیں۔ جن میں اکثر رنگینی کم۔ متانت زیادہ۔ نمونہ کے طور پر چند جلوسوں کے دیباچے لکھتا ہوں +

آغاز سال ہژدہم الٰہی از جلوس مقدس شاہنشاہی۔ دریں ہنگام سعادت پیرائے اشعۂ رایات سلطان بہار صیقلگر مرآت طبائع شد چمن را بپرندسوری و پرنیاں سمن آئین بستند۔ شمال و صبا خس و خاشاکِ خزاں از گلستان روزگار رو رفتند۔ اعتدال ہوا چوں عدالت شاہنشاہی نیرنگ سازِ بدائع نگار۔ و تازگیہائے شگرف و نادرہ کاریہائے نو شگفت افزائے جہانیاں شد ؎

خواست پریدن چمن از چابکی قافیہ زن یاسمن و گل بہم	خواست چکیدن سمن از نازکی قافیہ گو قمری و بلبل بہم

پس از سپری شدن ہشت ساعت و ہفت دقیقہ شب چہار شنبہ ششم ذیقعد ہفصد و ہشتاد قمری نیر اعظم فروغ افروز عالم۔ پرتو محاذات بہ برج حمل انداخت و عالم عنصری فروغ ملک روحانی گرفت +

آغاز سال بست و دوم الٰہی از جلوس اقدس شاہنشاہی۔ شہریار معدلت دوست در حاشیۂ دیباچۂ عبادتِ نشاءِ تجرد و تعلق را در نقاب شکار بتقدیم رسانیدہ صورت را بہ معنی مزاج یکتائی مے بخشد و ظاہر را پایۂ باطن میدہد۔ گلبانگ اعتدال ربیعی چہرہ افروز انبساط آمد۔ نشاط را بارگاہ فراخ زدند و ہنگامۂ بخشش رونق دیگر پذیرفت۔ شب دو شنبہ بستم ذوالحجہ بعد از ہفت ساعت و دوازدہ دقیقہ فروغ افزائے نورستانِ ایزدی پرتو خرمی بحمل انداخت۔ مناظر صورت را رنگ آمیزی مطالع انوار حقیقت در گرفت۔ آسماں جواہر نیسانی بار معانی بزمین فرو ریخت۔ و اُو بہ نثارِ قدوم نو رسیدگانِ ملک تقدس ہزاراں نقش دلفریب بیروں فرستاد۔ گیتی خدیو مراسم سپاس گذاری را آئین تازہ پیش گرفت

وبخشائش را روز بہجت پدید آمد ؎

جہاں از نقش قدرت شد چو صورت خانۂ مانی	چمن از نور حکمت شد چو فکر بو علی سینا
زمیں از خرمی گوئی کشادہ آسماں استی	کشادہ آسماں گوئی شگفتہ بوستاں استی

آغاز سال بست وششم الٰہی از جلوس شاہنشاہی ؎

علمِ دولت نوروز بصحرا برخاست	فیض روح القدس از عالم بنا برخاست
چہ ہوائیست کہ خلدش بہ تحیر بنشست	چہ زمینے است کہ چرخش بتولا برخاست

شب پنجشنبہ پنجم صفر نہصد و نود ہلالی بعد از سپری شدن شش ساعت و بست و دو دقیقہ نیر پرداز جہان صورت و معنی و بار خدائے عالم پنہاں و پیدا بہ برج حمل نظر خرمی انداخت وعنصری عالم راچوں روحانی ملک نور آگیں گردانید جشن شادمانی آرایش تازہ یافت۔ صلائے عیش بلند آوازہ شد۔ از انچہ درسر آغاز ایں سال خجستہ تابش ظہور داد۔ نہضت رایات ہمایوں است بصوب دریائے سندھ +

آغاز سال بست و نہم از مبداے جلوس۔ دریں سر آغاز روز افزوں و تازہ کاری دولت ابد پیوند رسیدن نوخواستگان دریں بقا جہاں را شادمانی دیگر بخشید۔ و بے برگان آفرینش را تازہ آبے بر روے کار آمد۔ نظم

شکایتہا ہمیں کردی کہ بہمن برگ ریز آمد	بیا برخیز گلشن بیں کہ بہمن در گریز آمد
زرعد آسماں بشنو تو آواز دہل یعنی	عروسی دارد ایں بستاں کہ بستاں بر جہیز آمد

نقشبنداں کار آگاہ سلطنت در نیرنگئے آرایش دولت خانہ والا نکہی بکار بردند۔ و بگزیں کوشے اساس ازیں بر نہادند۔ بست و پنجم اسفندار مذ دربستاں سرائے۔ کہ چہار کوہے فتحپور بفرمایش حضرت مریم مکانی سرسبز و شاداب است۔ بزم عشرت پیراستند و برخے پردگیاں دراں روحانی منزلگاہ باریافتند اشارہ یہ ہے۔ کہ اس سال سلیم کی شادی ہے +

جس طرح ملا صاحب وقت پر رُک نہیں سکتے اِس وقت آزاد بھی رہ نہیں سکتا۔ اُنکی روح سے چند ساعت کے لئے معافی مانگتا ہے۔ اور اہل انصاف کو دکھاتا ہے۔ کہ ہر شخص کے کمال میں بلکہ بات بات میں بال کی کھال اُتارتے تھے۔ اور بیشک صراف سخن تھے۔ لفظ لفظ کو خوب پرکھتے تھے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ رات دن ابو الفضل و فیضی سے شیر و شکر رہتے تھے۔ اور ان کلاموں کو اُنکی زبانوں سے سُنتے تھے۔ اور اپنے کلام کو بھی دیکھتے تھے۔ باوجود اسکے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ اکبر نامہ کے عہد تحریر میں مجھ سے ایک رکن سلطنت نے کہا کہ بادشاہ نے شہر نگرچین آباد کیا ہے۔ اکبر نامہ کے انداز میں تم بھی اُسکی

تعمیر کی صورت حال لکھو۔ آپ نے اس پر ایک آدھے صفحہ کی عبارت لکھی ہوگی۔ اُسے بھی اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ اپنا بیٹا سب کو خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مُلا صاحب اور سب برابر بھی تو نہیں۔ اندھیرے اُجالے میں فرق نہ معلوم ہُوا؟ بیشک اکبر نامہ کا انداز یہی ہے مضامین کا ہجوم۔ عبارت کا جوش و خروش۔ لفظوں کی دھوم دھام۔ کلمات مترادف کی بہتات۔ ہر واقعہ کے ساتھ اُس کی دلیل و بُرہان کئی کئی کاف بیانیہ جملے معترضے۔ فقرہ پر فقرہ چڑھتا چلا آتا ہے۔ گویا کمان کیانی ہے۔ کہ کھنچتی ہی چلی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اس کی نقل کی ہے۔ خیر وہ تو کب ہوسکتی ہے۔ بیٹھے مُنہ چڑاتے ہیں۔ اور اخیر کے شعر پر تو رد ہی دئے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ بھی شعر لکھتا ہے۔ مگر سُبحان اللہ جیسے انگوٹھی پر یاقوت جڑ دیا۔ بھلا اس عبارت کو کتاب میں نقل کر کے اپنے تئیں رسوا کرنا کیا ضرور تھا۔

(**مُلّا صاحب کی عبارت**) دریں سال تعمیر شہر نگرچین واقع شد و سطرے چند کہ یکے از اعیان دولت در وقت تالیف اکبر نامہ بفقیر فرمودہ بود کہ دریں باب بنویسد۔ آں را بجنس ایراد مے نماید۔ چوں مہندس کارخانۂ ابداع۔ اندیشہ بلند شہریار کامگار را کہ معمار معمورۂ گیتی خصوصاً بنائے مقصورۂ ہند است۔ از آغاز فطرت اختراع آئین ایجاد فرمودہ تا بمقتضائے **بیت**

جہاندار داند جہاں داشتن ۔۔۔ یکے را بُریدن دگر کاشتن

ہر سہ منزلے وہر گل زمینے را کہ ہوائے آں معتدل و فضائے آں فسیح۔ آبش گوارا۔ و سوادش مسطح باشد تعمیر بخشیدہ محل نزول اجلال مواکب اقبال سازد چہ اختیار اماکن متنزہ و مساکن طیبہ و منازل مروحہ۔ و میاہ عذب۔ بہر ابقائے نعمت صحت بدنی۔ و احتمائے اعتدال مزاج انسانی کہ وسیلہ معرفت و طاعت یزدانی ہماں تواند بود۔ ازجملہ سنتہ ضروریہ است خصوصاً وقتے کہ بعضے از مصالح ملکی نیز مثل سیر و شکار وغیرہ بآں منضم گردد۔ بنا بریں دواعی دریں سال خجستہ فال بعد از معاودت از سفر مالوہ کہ اولیائے دولت منصور و اعدائے ملک مقہور شدہ بودند پیشید بد ہمت فیالانہمت و اقتضائے رائے جہاں آرا چناں اُفتاد کہ کگرولی را بیک فرسنگے آگرہ واقع شدہ و با اعتبار لطافت آب و نظافت ہوا بر خیلے اماکن رجحانے و مزیتے تمام داشتہ معسکر حشم ہمایوں و مخیم دولت ابد پیوند گردانیدہ از مضایق مداخل و معارج شہر قدسی مآثر را فراغتے حاصل گشتہ اوقات فرخندہ سمات را گاہے بچوگاں بازی و گاہے بدوانیدن سگان تازی و پرانیدن جانوران گوناگوں مصروف سازند۔ و بنائے آں معمورۂ بلند اساس بہ اشگون استحکام مبانئے قصر سلطنت بروال و تفاول از دیاد جاہ و جلال گرفتہ۔ فرمان نافذ براں گونہ عز اصدار یافت۔ کہ بار یافتگاں قرب و منظوران نظر عاطفت ہر کدام از برائے خود درآں

مکان مرفہ عمارت عالی و منازل رفیع بنیاد نہند و در اندک مدت سوادِ آں بقعۂ لطیف از پرتو توجہ حضرت ظل اللّٰہی۔ خال رُخ نو عروس عالم شد و نگر چیں کہ عبارتست از امن آباد نام یافت بیت

للہ الحمد ہر آں نقش کہ خاطر مے خواست	آمد از غیب پس پردۂ اقبال پدید

ملا صاحب نے گول مول فقرے میں لکھا ہے۔ نہیں کھلتا کہ فرمائش کرنے والا کون تھا۔ غالباً آصف خاں یا قلیچ خاں ہونگے۔ امرا میں سے انہیں کے جلسوں میں آپ اکثر شامل رہا کرتے تھے۔ اور یہ بھی عجب نہیں۔ کہ ابو الفضل ہی نے فرمائش کر دی ہو۔ وہ بھی ثقہ ظریف تھے۔ کہا ہوگا کہ باتیں تو بہت بناتے ہیں۔ کچھ کر کے بھی تو دکھائیں۔ گھڑی دو گھڑی دل لگی رہے گی۔ ع

ہاں خلیفہ ہم بھی دیکھیں پہلوانی آپ کی

باوجود ان سب باتوں کے جو شخص اُس دریائے فصاحت کو اول سے آخر تک پڑھیگا۔ اور پھر کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھیگا تو معلوم کریگا۔ کہ اُس کے سرچشمہ پر پانی کا لطف اور لذت کچھ اور ہے۔ ۲۰ کوس پر کچھ اور ہے۔ بیچ میں کچھ اور ہے۔ اور پھر کچھ اور۔ یہ اتفاقات وقت کا مقتضا ہے۔ نئے ایجادوں میں ایسی تبدیلیاں ضرور ہوتی ہیں۔ یہ کوتاہی اس کی قابل ترمیم ہے۔ وہ جہاز سخن کا ناخدا ضرور اس بات کو سمجھا ہوگا۔ اور عجب نہیں۔ کہ اگر عمر وفا کرتی تو اول سے شروع کر کے اخیر تک ایک رفتار کر دکھاتا +

دفتر سوم آئین اکبری ۱۰۰۶ھ میں تمام کی۔ اس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ ہر ایک کارخانہ کا۔ اور ہر ایک معاملہ کا حال۔ اس کے جمع و خرچ کا حال۔ ہر ایک کام کے ضوابط و قانون لکھے ہیں۔ سلطنت کے صوبہ صوبہ کا حال۔ اُن کے حدود اربعہ۔ انکی مساحت۔ اس طرح کہ اوّل مختصر ہر جگہ کے تاریخی حال پھر وہاں کی آمدنی اور خرچ۔ پیداوار قدرتی و صنعتی وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کے مشہور مقام مشہور دریا۔ نہریں یا نالے اور اُنکے سرچشمے۔ اور یہ کہ کہاں سے نکلے اور کہاں کہاں گزرتے ہیں۔ اور کیا فائدہ دیتے ہیں۔ اور کہاں کہاں خطر ہیں۔ اور کب کب ان سے نقصان پہنچے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فوج اور انتظام فوج۔ امرا کی فہرست اور ان کے مدارج۔ اقسام ملازمان۔ اسامی اہل دربار و اہل خدمت فہرست اہل دانش۔ علما و اہل کمال۔ اہل موسیقی۔ اہل صنعت۔ فقرائے صاحبدل عام اہل ریاضت تفصیل مزاروں اور مندروں کی اور ان کے حالات۔ بیان ان اشیا کا جو ہندوستان کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ عقائد اہل ہند۔ علوم اہل ہند اور بہت سے حقائق و دقائق اُن کی کتابوں سے حاصل کئے تھے +

یہ باتیں آج کل کے اہل نظر کی آنکھوں میں نہ چمکینگی کہ سرکاری رپورٹیں دیکھتے ہیں۔ اب ادنیٰ ادنیٰ ضلع کے ڈپٹی کمشنر یا مہتمان بندوبست اُسے کئی درجہ زیادہ تحقیقیں اپنے ضلع کی سالانہ رپورٹوں میں لکھ دیتے ہیں لیکن جو لوگ زیادہ نظر وسیع رکھتے ہیں اور پس و پیش پر برابر نگاہ دوڑاتے ہیں اور زمانہ کی کارگذاری کو وقت بوقت دیکھتے چلے آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُس وقت اس سلسلہ کا سوچنا اور نظام باندھنا اور اس کا پھیلانا اور پھر سرانجام کو پہنچانا ایک کام رکھتا تھا جو کرتا ہے۔ وہی جانتا ہے۔ کہ لفظ لفظ پر کتنا لہو ٹپکانا پڑتا ہے۔ اب تو رستہ نکل آیا۔ دریا پایاب ہے۔ جس کا جی چاہے اُتر جائے ۔

مطالب مندرجہ کی تحقیقوں پر نظر کیجئے تو عقل حیران ہوتی ہے۔ کہ کہاں سے یہ ذخیرہ پیدا کیا۔ اور کس خاک میں سے ذرّے چن چن کر یہ سونے کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ ایک ادنیٰ نکتہ دیکھ کر سمجھ لو کہ سات اقلیم کی معمولی تقسیم کر کے آپ بھی نئی تحقیقاتیں لکھی ہیں۔ اُن میں کہتا ہے۔ کہ اہل فرنگ کے سیّاحوں نے آج کل ایک نیا جزیرہ دیکھا ہے جس کا نام چھوٹی دُنیا (نئی دُنیا) رکھا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس سے امریکہ مراد ہے۔ جو اُنہی دنوں کولمبس نے دیکھی تھی۔ مگر افسوس اس کتاب کی کم نصیبی پر کہ مُلّا صاحب نے کس خواری سے خاک اُڑائی ۔

آئین اکبری کی عبارت کے باب میں کچھ کہے بغیر آگے بڑھوں تو دربار انصاف میں مجرم قرار پاؤں۔ اس لئے کم سے کم اتنا کہنا واجب ہے۔ کہ اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بقلوبی ترکیبیں۔ نئی تراشیں۔ اس پر دل پذیر و دلکش دو دو تین تین لفظوں کے جُملے سنجیدہ برگزیدہ صفحوں کا عطر اور ورقوں کی رُوح ہیں۔ فضول اور زاید لفظ ممکن نہیں کہ آنے پائے تشبیہ اور استعارہ کا نام نہیں۔ اضافت پر اضافت آجائے تو قلم کا سر کٹ جائے۔ پاک صاف سلیس اور اس پر نہایت برجستہ اور متین ہے۔ تکلف عبارت آرائی۔ مبالغے اور بلند پروازیوں کا نام نہیں ۔

یہ انداز ابو الفضل نے اُس وقت اختیار کیا ہو گا۔ جب کہ آتش پرستوں کا مجمع خاندیس کے علاقہ سے ژند و پہلوی کی کتابیں لے کر آیا ہو گا۔ بیشک اس نے اس امر کا التزام نہیں رکھا۔ کہ عربی لفظ اصلاً عبارت میں نہ آتے پائے۔ لیکن انداز عبارت وساتیر اور دساتیر وغیرہ پارس کی کتب قدیمہ سے لیا ہے اور یہ اصلاح اُس کی بالکل درست اور قرین مصلحت تھی۔ کیونکہ اگر فارسی خالص کی قید لگاتا تو کتاب مشکل ہو کر فرہنگ کی محتاج ہو جاتی۔ جس طرح اب ہر شخص پڑھتا ہے۔ اور مزے لیتا ہے۔ پھر یہ بات کب ہو سکتی تھی۔ غرض کہ جو کچھ اُس نے لکھا خوب ہی لکھا ہے۔ وہ اپنی طرز کا

آپ ہی بانی تھا۔ اور اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ پھر کسی کی مجال نہ ہوئی۔ کہ اس انداز میں قلم کو ہاتھ لگا سکے۔ اللہ اللہ آئین اکبری کا خاتمہ لکھتے لکھتے ایک مقام پر زور میں بھر کر کیا مزے سے لکھتا ہے اور سچ کہتا ہے ؎

عدد داستان بود العجب آمد بر ڈے کار	حیراں شوند اگر دو سہ حرفے رقم زنند

نکتہ چینی جن لوگوں کے دماغوں میں نئی روشنی سے اُجالا ہو گیا ہے۔ وہ اس کی تصنیفات کو پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ابوالفضل ایشیائی انشاپردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنف تھا۔ اس نے اکبر نامہ اور آئین اکبری کے لکھنے میں فارسی کی پرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے۔ اُس نے خوش بیانی اور زیادہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں اور عیب اس طرح چھپائے ہیں کہ جس کے پڑھنے سے ممدوح اور مداح دونو سے نفرت ہوتی ہے اور دونو کی ذات و صفات پر بٹا لگتا ہے۔ البتہ بڑا علامہ۔ عاقل۔ دانا۔ مدبر تھا۔ دُنیا کے کاموں کے لئے جیسی عقل کی ضرورت ہے وہ اسمیں ضرور تھی۔ **آزاد** کہتا ہے۔ کہ جو کچھ الفاظ و عبارت کے پڑھنے والوں نے کہا یہ بھی ہے لیکن وہ مجبور تھا۔ کیونکہ فارسی کا ڈھنگ چھ سو برس سے یہی چلا آتا تھا۔ اس کے ایجادوں نے بہت اصلاح کی ہے اور خرابیوں کو سنبھالا ہے۔ باوجود اس کے جو زبان کے ماہر ہیں۔ اور رموز سخن کے تاڑنے والے ہیں۔ اور کلام کے انداز اور اداؤں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا اُدھب پیرایہ میں کہا۔ کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے۔ اور انشا پردازی کا آئینہ آگے رکھ دیا ہے۔ یہ اسی کا کام تھا۔ یہ بھی اسی کا کام تھا۔ کہ سب کچھ کہہ دیا۔ اور جن سے نہ کہنا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھے۔ اور اب تک بھی نہیں سمجھتے۔ خوشامد کی بات کو ہم نہیں مانتے۔ ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں۔ کونسا مؤرخ ہے۔ کہ خوشامد شاہ اور حمایت قوم سے پاک ہو۔ وہ اپنے آقا کا ایک نمکحلال وفادار نوکر تھا۔ اُسی کے انصاف سے اس کے خاندان کی عزت و آبرو بچی۔ اُسی کی حفاظت سے سب کی جانیں بچیں۔ اُسی کی بدولت اُس کے فضل و کمال نے قدر و قیمت پائی۔ اُسی کی قدردانی سے کہ سلطنت ہو گیا۔ اسی کی پرورش سے تصنیفات ہوئیں اور اُنہوں نے بلکہ خود اُس نے صدہا سال کی عمر پائی۔ خوشامد کیا چیز ہے؟ اُس کا تو دل عبادت کرتا ہو گا۔ اور جان لوٹ لوٹ کر خاک راہ ہوئی جاتی ہوگی۔ اُس نے بہت سا ادب ظاہر کیا۔ شکریہ ادا کیا۔ لوگوں نے خوشامد نام رکھا اور خوشامد کی تو تعجب کیا؟ اور گناہ کیا کیا؟ آج کے لوگ اُس کی جگہ پر ہوتے تو اُس سے ہزار درجہ زیادہ بکواسیں کرتے اور ایسا نہ کر سکتے۔ مگر اُن کی وہ قسمت کہاں۔ ہاں ہاں ایک بات ہے۔ اُس نے ہندوستان میں بیٹھ کر

ایشیائی علوم اور زبان عربی و فارسی میں یہ کمال پیدا کیا کہ اکبر کا وزیر ہو گیا۔ تم اب انگریزی میں ایسا کمال پیدا کرو کہ سب کو پیچھے ہٹاؤ اور بادشاہ وقت کے دربار پر چھا جاؤ۔ پھر دیکھیں تم کتنے مصنف ہو اور کیا لکھتے ہو۔ میرے دوستو دیکھو! وہ سلطنت کا ایک جزو تھا۔ آج ارکان سلطنت نظام ملکی کیلئے ہزار طرف سے حکمتِ عملی اور مصلحتیں کھیلتے ہیں۔ اگر ہر بات میں سچ۔ واقعیت اور اصلیت پر چلیں اور لکھیں تو ابھی سلطنت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو حرف پڑھنے آ گئے ہیں۔ زبان چلنے لگی ہے۔ دوسرے کی بات کو سمجھتے نہیں۔ جو منہ میں آتا ہے کہے جاتے ہیں ؛

ابو الفضل کے بعد علامہ کا خطاب سلاطین تیموری میں سعد اللہ خاں چنیوٹی کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ کہ وزیر شاہجہان کا تھا۔ ملا عبد الحمید لاہوری نے شاہجہان نامہ میں ایلچی ایران کے حال میں لکھا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے ایک مراسلہ لکھا گیا۔ کہ سعد اللہ خاں نے لکھا تھا۔ وہیں اصل مراسلہ بھی نقل کر دیا ہے کیا کہوں ابو الفضل کی نقل تو کی ہے۔ ایک تمہید بھی اول میں ویسی ہی اٹھائی ہے۔ الفاظ کی دھوم دھام بھی دکھائی ہے۔ فقرہ پر فقرے بھی مترادف سوا کئے ہیں مگر یہ عالم ہے جیسے کوئی نو رفتار لڑکا چلتا ہے۔ دو قدم چلے گر پڑے۔ اٹھے چار قدم چلے بیٹھ گئے۔ اور یہ بات بھی اس صورت میں حاصل ہوئی۔ کہ صاحب کمال جلدیں کی جلدیں لکھ کر رستہ بتا گیا تھا۔ بھلا وہ بات کہاں۔ اسے دیکھو کہ رہوار رو چلا جاتا ہے۔ نہ فکر کی پرواز تھکتی ہے۔ نہ قلم کی نوک گھستی ہے ؎

اب ملا عبد الحمید کا حال سنو سلطنت چغتائیہ میں شاہجہاں کی سلطنت سیف و قلم کے سامانوں سے اعلیٰ درجہ کی با نام و نشان سلطنت تھی علما و فضلا کے علاوہ ہر علم و فن کے باکمال اس کے دربار میں موجود تھے۔ بادشاہ کو منظور ہوا کہ عہد سلطنت کا کارنامہ لکھا جائے۔ جستجو ہوئی کہ آج کل اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز کون ہے؟ کئی شخصوں کے لئے امیروں نے تقریب کی۔ کوئی پسند نہ آیا۔ ملا عبد الحمید لاہوری اس سند سے پیش ہوئے کہ شیخ کے شاگرد ہیں۔ ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کچھ حال بھی نمونہ کے طور پر لکھ کر عرض کیا۔ حضور میں منظور ہوا۔ اور خدمت تحریر حوالہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ابو الفضل کا شاگرد بڈھا فرتوت شاہجہان کے زمانہ میں ہوگا تو کیا ہوگا۔ تھوڑا سا حال لکھ کر وہ ستر بہتر ہو گئے باقی کتاب اور لوگوں نے لکھی۔ خیر کوئی لکھے یہاں لکھنے کے قابل یہ بات ہے۔ کہ شاگرد ہونا اور شے ہے اور استاد کی بات حاصل ہو جانی اور شے ہے۔ شاہجہاں نامہ کی عبارت آرائی۔ بہار افشانی۔ گلریزی۔ رنگینی مسلم۔ مترادف فقروں کے جوڑے لگے ہوئے ہیں مقفٰے فقروں کے کھٹکے برابر چلے جاتے ہیں۔ مینا بازار رنگا دیا۔ رسائل طغرا سجا دیئے۔ مگر اسے اکبر نامہ کی عبارت سے کیا نسبت ؛

مُلا عبدالمجید نازک خیال بہار بند انشا پرداز اچھے تھے۔ رنگین رنگین لفظ چُن کر لاتے تھے۔ اور بہاریہ فقروں میں معمولی طور پر سجاتے تھے۔ اور مطلب ادا کر دیتے تھے۔ اُس خلاق معانی کا کیا کہنا ہے۔ اس کے خانہ باغ میں گُل و سنبل کو لائیں تو رنگ اُڑ جائیں طوطی و بلبل آئیں تو پر جل جائیں۔ وہاں تو فلسفہ و حکمت کی انشا پردازی ہے۔ بیان و مطلب کیلئے آسمان طبع سے مضمون نہیں تارے اُتارتا تھا۔ اور فلسفی نظر سے جانچ کر اپنی قادر الکلام زبان کے سپرد کرتا تھا۔ وہ جن لفظوں میں چاہتی تھی ادا کر دیتی تھی۔ اور ایسا کہتی تھی۔ کہ آج تک جو سُنتا ہے سر دُھنتا ہے۔ ہم فقروں کو بار بار پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ اُن کی عمدہ تراشیں۔ انوکھی ترکیبیں دیکھنے کے قابل ہیں فقط لفظوں کے پس و پیش سے مطالب کا زمین سے آسمان پر پہنچا دینا اسی کا کام ہے۔ صورت ماجرا ایسی بنیاد سے بیان کرتا ہے۔ کہ دل تسلیم کرتا جاتا ہے۔ کہ یہ واقعہ جو ہُوا۔ زمانہ کی حالت حکم کرتی تھی۔ کہ اسی طرح واقع ہو۔ اور اسی کے بموجب نتیجہ نکلے۔ کیونکہ بنیاد اُس کی وہ تھی۔ اور وہ تھی وغیرہ وغیرہ ؛

مکاتبات علامی یعنی انشائے ابو الفضل کہ مدرسوں اور مکتبوں میں عام و تام ہے۔ اس کے تین دفتر ہیں۔ انہیں اس کے بھانجے نے ترتیب دیا ہے۔ کہ نسبت فرزندی رکھتا تھا ؛

اوّل دفتر میں مراسلے ہیں۔ جو بادشاہ کی طرف سے سلاطین ایران و توران کیلئے لکھے تھے اور فرمان لکھے ہیں۔ کہ اُمرائے دولت کے لئے جاری ہوتے تھے۔ الفاظ کی شکوہ۔ معانی کا انبوہ۔ فقروں کی چُستی۔ مضامین کی بلندی۔ کلام کی صفائی زبان کا زور دریا کا شور ہے۔ کہ طوفان کی طرح چلا آتا ہے۔ سلطنت کے مطالب مُلکی مقاصد۔ اُن کے فلسفی دلائل آئندہ نتائج کی ساری دلیلیں گویا ایک عالم ہے کہ بادشاہ طبع کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے کہ مطالب اور الفاظ کو جس پہلو سے جس جگہ چاہتا ہے باندھ لیتا ہے۔ وہی عبداللہ خاں اوزبک کا قول زبان پہ آتا ہے۔ کہ اکبر کی تلوار تو نہیں دیکھی۔ مگر ابو الفضل کا قلم ڈراتے دیتا ہے ؛

دفتر دوم میں اپنے خطوط اور مراسلے ہیں۔ کہ امرا اور احباب و اقربا وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔ اُن کے مطالب اور قسم کے ہیں۔ اس لئے بعض مراسلے جو خانخاناں یا کوکلتاش خاں وغیرہ کے نام ہیں وہ دفتر اوّل کی ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ باقی دفتر سوم کے خیالات میں مسلسل ہیں پہلے دو نو دفتروں کے باب میں اتنی بات کہنی ضرور ہے کہ سب پڑھتے ہیں۔ اور پڑھانیوالے پڑھاتے ہیں۔ بلکہ علما و فضلا شرحیں اور حاشیے لکھتے ہیں لیکن کچھ فائدہ نہیں۔ مگر اس کا بھی آئیگا۔ کہ پڑھنے پڑھانیسے

پہلے اِدھر بابر۔ ہمایوں اکبر کی تاریخ۔ اُدھر سلاطین صفویہ کی تاریخ ایران اور عبداللہ خاں کی تاریخ توران دیکھی ہو۔ راجگان ہند کے سلسلوں اور اُن کی رسم و رواج سے آگاہی ہو۔ دربار و اہل دربار کے حالات سے اور اُن کے آپس کے جُزوی جُزوی معاملات سے بخوبی واقف ہو۔ یہ نہ ہو۔ تو پڑھنے والا ساری کتاب پڑھ لیگا۔ ایک اندھا ہے کہ تمام عجائب خانہ میں پھر آیا۔ اور کچھ خبر بھی نہیں ٭

دفتر سوم میں اپنی بعض کتابوں کے دیباچے۔ بعض مصنفین سلف کی کتابوں میں سے کسی کتاب کو دیکھا ہے۔ اُسے دیکھ کر جو جو خیال گزرے ہیں۔ انہیں کی تصویر ایک نثر کے رنگ میں کھینچ دی ہے۔ اُس زمانہ میں کوئی یورپ کا نام بھی ایشیا میں نہ جانتا تھا۔ اُس کے نکتہ یاب فکر کو دیکھو کہ تین سو برس پہلے اُدھر گیا اکثر جگہ نفس ناطقہ کے مراتب عالی۔ طبیعت کی وارستگی۔ دل کی آزادی جس میں دین و دنیا سے بیزاری۔ باوجود اس کے خیالات کی بلند پروازی کا ایک عالم آباد ہے۔ بےخبر کہتے ہیں۔ کہ دونو بھائی دہریئے تھے۔ بدمذہب تھے۔ وہاں آکر دیکھیں سبحان اللہ یہ جُنید بغدادی بول رہے ہیں یا شیخ شبلی اور حقیقت میں خدا جانے کیا ہیں۔ اس فن کے شائق کو چاہیئے کہ فلسفہ و حکمت کے ساتھ تصوف اور حکمت اشراق سے بھی بہرہ کافی حاصل ہو۔ تب لطف اُٹھائیگا۔ ورنہ کھانا کھائے جاؤ۔ نوالے چبائے جاؤ۔ پیٹ بھر جائیگا۔ مزہ پوچھو تو کچھ نہیں ٭

اس میں بعض سفید بیاضوں پر دیباچے لکھے ہیں۔ کہ کسی میں چیدہ اور برگزیدہ اپنی پسند کے اشعار شعرائے باکمال کے لکھتے تھے۔ کسی میں بعض کتابوں کی کوئی عبارت یا تاریخی روایت پسند آتی تھی۔ وہ لکھ لیتے تھے۔ کسی میں کچھ موتی نظم یا نثر ہو کر اپنی طبیعت سے ٹپکتے تھے۔ وہ بھی ٹانک لیا کرتے تھے۔ کسی میں حساب کتاب کی یادداشت لکھتے تھے۔ افسوس وہ جواہر کے ٹکڑے اب کہاں ملتے ہیں۔ کتابوں پر خاتمے لکھے ہیں۔ یا ان پر اپنی رائے لکھی ہے اُن کے اخیر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ فلاں تاریخ فلاں مقام میں لکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو کیفیت ہمیں آج اُن کے دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اُسے اُسی وقت معلوم تھی۔ اکثر تحریریں لاہور میں بعض کشمیر میں بعض خاندیس میں لکھی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہیں پڑھ کر ہمیں ضرور خیال آتا ہے کہ لاہور میں اُس وقت کیا عالم ہوگا۔ اور وہ خود کس طرح یہاں بیٹھا ہوگا جب یہ لکھ رہا ہوگا۔ کشمیر اور اُس کے اطراف میں دو دفعہ میرا گزر ہوا۔ کئی مقاموں پر دونو بھائی یاد آئے اور دل پر عجب عالم گزرا (امیر حیدر بلگرامی سوانح اکبری میں لکھتے ہیں کہ مکاتبات ابوالفضل کے چار دفتر تھے۔ چوتھا خدا جانے کیا ہوا) ٭

عیار دانش۔ کتاب کلیلہ و دمنہ ہے۔ اصل سنسکرت میں تھی۔ یہاں سے نوشیرواں نے منگائی۔

وہاں مُدّت تک اُسی عہد کی فارسی زبان میں جاری رہی۔ عباسیہ کے زمانہ میں بغداد میں پہنچ کر عربی میں ترجمہ ہوئی۔ سامانیوں کے عہد میں رودکی نے نظم کی۔ بعد اس کے کئی قالب بدل کر ملا حسین واعظ کی زبان سے فارسی متعارف کے کپڑے پہنے اور پھر اپنے اصلی وطن یعنی ہندوستان میں آئی۔ اکبر نے جو اسے دیکھا تو خیال آیا کہ جب اصل سنسکرت ہمارے پاس موجود ہے۔ تو اسی کے مطابق کیوں نہ ہو۔ دُوسرے یہ کہ کتاب مذکور پند و نصائح کے لحاظ سے خاص و عام کیلئے کار آمد ہے۔ یہ ایسی عبارت میں ہونی چاہئے۔ جسے سب سمجھ سکیں۔ انوار سہیلی لغات و استعارات کے ایچ پیچ میں آکر مشکل ہو گئی ہے۔ شیخ کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ترجمہ کر د۔ چنانچہ چند روز میں تمام کر کے ۹۹۶ھ میں خاتمہ لکھ دیا۔ مگر خاتمہ بھی وہ لکھا ہے۔ کہ معنی آفرینی کی رُوح شاد ہوتی ہے ٭

مُلّا صاحب اس پر بھی اپنی کتاب میں ایک وار کر گئے۔ اکبر کے احکام جدیدہ کی شکایت کرتے کرتے فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کی ہر بات سے نفرت ہے۔ علوم سے بھی بیزاری ہے۔ زبان بھی پسند نہیں۔ حروف بھی نامرغوب ہیں۔ ملا حسین واعظ نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ انوار سہیلی کیا خوب لکھا تھا۔ اب ابوالفضل کو حکم ہوا۔ کہ اسے عام صاف ننگی فارسی میں لکھو جس میں استعارہ و تشبیہ بھی نہ ہو۔ عربی الفاظ بھی نہ ہوں ٭

بالفرض مُلّا صاحب کی رائے اکبر کے باب میں بالکل واقعی ہو۔ لیکن اسی مقدمہ خاص کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ کہ ابوالفضل پر ہر جگہ طعن بیجا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ کا اور اس کے بزرگوں کا جو کچھ سرمایۂ فخر و کمال تھا۔ یہی عربی کے علوم اور عربی زبان تھی۔ اسے ان چیزوں سے نفرت و بیزاری ہونی ممکن نہیں۔ ہاں اپنے بادشاہ کا فرماں بردار نوکر تھا۔ اپنی مصلحت کو سمجھتا تھا۔ آقا اور نوکر کے مراتب کو خوب پہچانتا تھا۔ اگر وہ اس کے حکموں کی صدق دل سے تعمیل نہ کرتا تو کیا کرتا۔ نمک حرام ہوتا؟ اور خدا کو کیا جواب دیتا؟ اور اکبر کے اس حکم سے بیزاری کا نتیجہ کیونکر نکال سکتے ہیں؟ اگر ایک دُشواری کو آسانی کی منزل پر پہنچا دیا۔ تو اس میں کفر کیا ہو گیا۔ ملا صاحب کے ہاتھ میں قلم ہے۔ یہ بھی اپنے ملک تصنیف کے اکبر بادشاہ ہیں۔ جو جی چاہے لکھ جائیں ٭

رقعات ابوالفضل۔ یہ اُس انداز کے خطوط ہیں جو انگریزی ملازموں میں نج کی (پرائیویٹ) تحریریں کہلاتی ہیں۔ ایک ایک فقرہ قابل دیکھنے کے ہے۔ ان سے اسکے طبعی حالات۔ دلی خیالات اور گھر کے معاملات معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی مزہ جبھی آئیگا کہ اس عہد کے تاریخی حالات اور اہل زمانہ کے جزوی جزوی امورات سے خوب واقف ہو۔ سبحان اللہ جن شیخ ابوالفضل کے لئے

ابھی لکھ چکا ہوں۔ کہ کبھی شیخ شبلی ہیں اور کبھی جنید بغدادی۔ اُنہی نے خان خاناں کے باب میں جو کچھ لکھا ہے۔ میں اُسے پڑھ کر شرماتا ہوں۔ اور خان خاناں بھی وہ کہ جب پہلے دفتر میں آئے اکبر کی طرف سے فرمان لکھتے ہیں۔ تو محبت کا یہ عالم ہے کہ دل و جان اور دم و ہوش فدا ہوئے جاتے ہیں۔ دوسرے دفتر میں اپنی طرف سے خط لکھتے ہیں۔ تو محبت کا یہ عالم ہے۔ کہ دل و جان اور دم و ہوش فدا ہوئے جاتے ہیں۔ بیرم خاں تو کیا؟ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماں کے پیار بھرے سینہ سے دودھ بہا ہے باوجود اس کے جبکہ خاندیس میں خانخاناں شہزادہ دانیال کے ساتھ ملک گیری کر رہا ہے۔ بعض اطراف میں یہ خود لشکر لئے پھرتے ہیں کبھی دونو پاس پاس آجاتے ہیں کبھی دُور جا پڑتے ہیں۔ اور کام دونو کے باہم دست و گریباں ہیں۔ وہاں سے بعض عرضداشتوں میں اکبر کو اور اکبر کی ماں اور اکبر کے بیٹے۔ اور شہزادہ سلیم یعنی جہانگیر کو عرضیاں لکھی ہیں۔ ان میں خانخاناں کی بابت وہ کچھ لکھتے ہیں اور ایسے ایسے خیالات میں ادائے مضمونوں کو ادا کرتے ہیں کہ عقل حیران ہو کر کہتی ہے۔ یا حضرت جنید آپ اور یہ خیالات یا حضرت بایزید آپ اور یہ مقالات۔ میں اُن میں سے بعض عرائض کی نقلیں اخیر میں ضرور لکھونگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ +

کشکول۔ فقیر کی کشتی گدائی کو کہتے ہیں۔ کہ ہر شخص نے دیکھی ہوگی۔ جو کچھ پاتا ہے۔ پلاؤ۔ خواہ چنے کے دانے۔ آٹا ہو کہ روٹی۔ دال کہ بوٹی۔ ہر طرح کا ٹکڑا کھیں میں تر ہو کر سوکھا۔ کچھ سالہ ہو۔ کہ رُوکھا۔ باسی۔ تازہ میٹھا۔ سلونا۔ ترکاری۔ میوہ غرض سب کچھ اس میں ہوتا ہے۔ صاحب شوق اور طالب استعداد جو کتابوں کی سیر کرتا ہے۔ وہ ایک سادی کتاب پاس رکھتا ہے۔ جو مطلب پسند آتا ہے کسی علم کا ہو کسی فن کا ہو نثر یا نظم اس میں لکھتا جاتا ہے۔ اسے کشکول کہتے ہیں۔ اکثر علما کے کشکول مشہور ہیں اور ان سے طالب شائق کو سرمایہ معلومات کا حاصل ہوتا ہے۔ دلی میں میں نے ایک نسخہ ابوالفضل کے کشکول کا دیکھا تھا۔ شیخ ابوالخیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا +

جامع اللغات۔ ایک مختصر کتاب لغت میں ہے۔ عالم طالب علمی میں الفاظ جمع کئے ہونگے۔ اسے ابوالفضل جیسے محقق کی طرف منسوب کرتے ہوئے شرم آتی ہے +

رزمنامہ (ترجمہ مہابھارت) پر دو جزو کا خطبہ لکھا ہے +

ان کی تصنیفات کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ عاشقانہ اور رنگین مضامین سے ان کی طبع میں بہت کم سرسبز ہوتے تھے۔ بہار یہ مضامین اور گل و بلبل اور حُسن و جمال کے اشعار کہیں اتفاقاً خاص سبب سے لانے پڑتے تو مجبور لاتے تھے۔ طبیعت کی اصلی پیداواری جو کچھ تھی وہ نفس ناطقہ

کے خیالات حکمت۔ معرفت۔ فلسفہ۔ پند نصیحت۔ دُنیا کی بے حقیقتی اور اہلِ دُنیا کی ہوسوں کی تحقیر ہوتی تھی۔ ان تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ لکھتے تھے۔ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اور طبیعت کی آمد سے لکھتے تھے۔ انہیں اپنی تحریر میں جانکاہی اور عرق ریزی پہ زور نہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس دو جوہر خداداد تھے۔ اوّل مضامین و مطلب کی بہتات۔ دُوسرے قدرت کلام اور الفاظ کی مساعدت۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتے تو کلام میں ایسی صفائی اور روانی نہ ہوتی ؛

نظم میں کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن یہ نہ سمجھنا کہ اس کی طبیعت قدرتی شاعری سے محروم تھی میں نے غور کر کے دیکھا ہے۔ جہاں کچھ لکھا ہے اور جتنا لکھا ہے۔ ایسا لکھا ہے۔ کہ کانٹے کی تول۔ یہ ضرور ہے کہ ضرورت کا بندہ اور وقت کا پابند تھا۔ بے ضرورت کوئی کام ہو۔ اس کے قانون میں جائز نہ تھا۔ جہاں مناسب و موزوں دیکھتا ہے۔ نثر کے میدان کو نظم کے گلدستوں سے سجاتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ طبیعت حاضر تھی۔ اور عین موقع پر مدد دیتی تھی۔ جو مضمون چاہتا تھا۔ نہایت سنجیدہ اور برجستہ الفاظ اور چُست ترکیب کے ساتھ موزوں کرتا تھا۔ مگر وہی کہ جتنی ضرورت ہو۔ بلکہ یہ سنجیدگی اور برجستگی بڑے بھائی کے کلام کو حاصل نہ تھی۔ اکثر مثنوی کے ڈھنگ میں چند شعر لکھتا ہے اور نظامی کے مخزن اسرار اور سکندر نامہ سے ملا دیتا ہے۔ قصیدہ کے انداز میں انوری سے پہلو مارتا ہے اور آگے نکل جاتا ہے ؛

شکل و شمائل اکبر نامہ کے خاتمہ میں شیخ نے خدا کی چند نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں نمبر ۵ و ۶ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ہاتھ پاؤں ڈیل ڈول میں معتدل تھے۔ اعضا میں تناسب اور اعتدال تھا۔ اکثر تندرست رہتے تھے۔ مگر رنگ کے کالے تھے۔ عرائض مندرجہ کے اخیر میں تم دیکھو گے۔ کئی جگہ خانخاں کی شکایت میں لکھتے ہیں۔ کہ حضور وہ جتنا رنگ کا گورا ہے۔ اُتنا ہی دل کا سیاہ ہے۔ میں اگرچہ رنگ کا کالا ہوں۔ مگر دل کا سیاہ نہیں۔ اہلِ نظر نے ان کی تصنیفات کو اکثر پڑھا ہوگا۔ اور خیال کیا ہوگا۔ تو ضرور کھل گیا ہوگا۔ کہ وہ ایک متین کم سخن متحمل شخص ہونگے۔ چہرے سے ہر وقت معلوم ہوتا ہوگا۔ کہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ ہر کام میں ہر بات میں چلنے پھرنے میں آہستگی ہوگی۔ چنانچہ یہی باتیں اس وقت کی تاریخوں کے متفرق مقاموں سے تراوش کرتی ہیں ؛

ماثر الامرا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کبھی حرف ناشائستہ ان کے مُنہ سے نہ نکلتا تھا۔ فحش یا گالی سے زبان آلودہ نہ کرتے تھے۔ غیر تو در کنار اپنے نوکر تک پر بھی خفا نہ ہوتے تھے۔ غیر حاضری کی

تنخواہ اُن کی سرکار میں مجرا نہ لیتے تھے۔ جس کو وہ نوکر رکھتے تھے۔ پھر موقوف نہ کرتے تھے۔ نکما نالائق ہوتا۔ تو اُس کی خدمتوں کو ادل بدل کرتے رہتے۔ جبتک رکھ سکتے۔ رہنے ہی دیتے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ اگر موقوف ہو کر نکلیگا۔ تو نالائق سمجھ کر کوئی نوکر نہ رکھیگا ✤

جب آفتاب حمل میں آتا اور نیا سال شروع ہوتا۔ تو گھر اور تمام کارخانوں کو دیکھتے۔ حساب کتاب کا فیصلہ کرتے۔ گوشواروں کی فہرست لکھوا کر دفتر میں رکھ لیتے اور کتابوں کو جلوا دیتے۔ سب پوشاک نوکروں کو بانٹ دیتے تھے۔ مگر پائجامہ سامنے جلوا دیتے تھے (خدا جانے اس میں کیا مصلحت تھی) شیخ کی تین بیبیاں تھیں (۱) ہندوستانی۔ غالباً یہی گھر والی ہوگی جس کے ساتھ ماں باپ نے شادی کر کے بیٹے کا گھر آباد کیا ہوگا (۲) کشمیرن عجب نہیں کہ پنجاب اور کشمیر کے سفروں میں خود تفریح طبع کا سامان بہم پہنچایا ہو۔ اگرچہ اس تین فاضل اور منصفانہ خیالات کے آدمی سے یہ بات بعید ہے مگر انسان ہے ایک وقت دل شگفتہ بھی ہوتا ہے (۳) ایرانی۔ اگر میری رائے غلط نہ ہو۔ تو یہ بی بی فقط زبان کی درستی اور خاص خاص محاورات حاصل کرنے کی غرض سے کی ہوگی۔ فارسی کی انشا پردازی اُس کا کام تھا۔ زبان کا جویا تھا۔ ہزاروں محاورے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ اپنے مقام پر خود بخود ہی ادا ہو جاتے ہیں۔ نہ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے۔ نہ بتانے والا بتا سکتا ہے۔ صاحب زبان سیاق تحریر میں بول جاتا ہے۔ اور طالب زبان وہیں گرہ میں باندھ لیتا ہے۔ پس خانہ داری کی جزئیات اور گھر کے کاروبار کی ادنیٰ ادنیٰ بات فرہنگ و مصطلحات سے کب حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونو بھائیوں کی صحبت میں ہمیشہ ایرانی موجود رہتے تھے۔ اور تمام خدمتگار اور کسب و کار کے لوگ ایرانی ہی تھے۔ مگر گھریلو باتیں تو گھر ہی میں ہوتی ہیں۔ اصلی محاورات اس ترکیب کے بغیر نہیں حاصل ہوتے ✤

دسترخوان کھانے کا حال سن کر تعجب آتا ہے۔ اجناس کا وزن ۲۲ سیر ہوتا تھا کہ مختلف شکلوں سے پک کر دسترخوان پر لگتی تھیں۔ عبدالرحمٰن پاس بیٹھتا تھا۔ اور خانساماں کی طرح دیکھتا رہتا تھا۔ خانساماں بھی سامنے حاضر رہتا تھا۔ دونو خیال رکھتے تھے۔ کہ کس رکابی میں سے دو تین یا کئی نوالے کھائے جس کھانے میں سے ایک ہی دفعہ کھایا اور چھوڑ دیا۔ وہ دوسرے وقت دسترخوان پر نہ آتا تھا۔ کسی کھانے میں آب و نمک کا فرق ہوتا تو آپ فقط اشارہ کرتا یعنی چکھو۔ وہ چکھ کر خانساماں کو دیتا۔ مُنہ سے کچھ نہ کہتا۔ خانساماں اس کا تدارک کرتا۔ جب دکن کی مہم پر تھا۔ دسترخوان وسیع اور کھانے ایسے پُرتکلف اور عمدہ ہوتے تھے کہ آج کل کے لوگوں کو یقین نہ آئے۔ ایک بڑے خیمہ میں دسترخوان چنا جاتا تھا۔ ہزار عمدہ قابیں کھانے مع اسکے لوازمات کے ہوتی تھیں اور سب امرا میں بٹ جاتی تھیں پاس

ہی اور بڑا خیمہ ہوتا تھا۔ اس میں کم درجہ کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اور کھانے کھاتے تھے۔ باورچی خانہ ہر وقت گرم رہتا تھا۔ اور کھچڑی کی دیگیں تو ہر وقت چڑھی ہی رہتی تھیں۔ جو بھوکا آتا تھا۔ رزق پاتا تھا۔ اور کھاتا تھا ؛

چھبیسواں شکرانہ ادا کرتے ہیں۔ کہ ۱۲ شعبان پیر کی رات ۹۷۹ھ میں لڑکا ہوا مبارک دادا نے پوتے کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ خود فرماتے ہیں۔ اگرچہ ہندی نژاد ہے۔ مگر مشرب یونانی رکھتا ہے۔ حضور نے اسے کو کہ یعنی اپنے دو بھائیوں میں شامل کیا ہے (اکبر ہی نے اس کی شادی سعادت یار خاں کوکہ کی بیٹی کے ساتھ کی تھی) ؛

ستائیسواں شکرانہ ہے۔ کہ ۳ ذیقعد ۹۹۹ھ جمعہ کو عبدالرحمٰن کے ہاں لڑکا ہوا۔ گیتی خداوند نے پشوتن نام رکھا ؛

عبدالرحمٰن

عبدالرحمٰن نے جو باپ کے ساتھ دکن میں جانبازیاں کیں کچھ کچھ بیان ہوئیں۔ وہ حقیقت میں بڑا بہادر تھا جن معرکوں میں جنگ آزمودہ سپاہی جھجک جاتے تھے۔ وہ جھپٹ کر جاتا تھا اور دلاوری اور دانائی کے زور سے ان معاملوں کو فیصلہ کر دیتا تھا۔ اسے زمانہ کے اہل تاریخ تیر بے خطا لکھتے ہیں۔ تلنگانہ وغیرہ کی مہمیں مار کر اس نے باپ کے ساتھ دکن میں بڑا نام پیدا کیا۔ اکبر کے سرداروں میں شیر خواجہ کہنہ عمل سپاہی تھا کہیں اُس کے ساتھ اور کہیں آگے بڑھ کر خوب خوب تلواریں ماریں۔ اور ملک عنبر دکن کے بہادر سردار کو دھاوے مار مار کر اور میدان جما جما کر شکستیں دیں ؛

جہانگیر کی یہ بات قابل تعریف ہے۔ کہ اُس نے باپ کے غصّہ کو بیٹے کے حق میں بالکل بھلا دیا۔ دو ہزاری منصب عطا کیا۔ اور افضل خاں خطاب دیا۔ ۳ جلوس میں اسلام خاں اس کے ماموں کی جگہ بہار کا صوبہ دار کیا۔ بلکہ گورکھپور بھی جاگیر دیا۔ جب یہ بہار کا حاکم تھا۔ تو صدر مقام پٹنہ تھا۔ ایک جعلساز فقیر قطب الدین نام اُدھر آیا۔ اور لوگوں کو بہکایا۔ کہ میں جہانگیر کا بیٹا خسرو ہوں قسمت نے یاوری نہ کی مہم بگڑ گئی۔ اب اس حال میں پھرتا ہوں۔ کچھ واقعہ طلب لوگ لالچ سے کچھ رحم کھا کر اُس کے ساتھ ہو گئے۔ اُس نے فوراً پٹنہ پر دھاوا کیا۔ وہاں شیخ بنارسی اور مرزا غیاث عبدالرحمٰن کی طرف سے حاکم تھے انہوں نے ایسی بُزدلی کی۔ کہ جعلی خسرو قابض ہو گیا اور کل اسباب خزانہ سب ہاتھ آیا۔ رحمٰن سُنتے ہی شیر کی طرح آیا۔ جعلی خسرو مورچے باندھ کر سامنے ہوا۔ دریائے پُن پُن پر لڑائی ہوئی۔ مگر پہلے ہی

حملے میں جلی فوج تتر بتر ہو گئی۔ اور وہ بھاگ کر قلعہ میں گھس گیا۔ رحمٰن بھی پیچھے ہی پیچھے پہنچے اور پکڑ کر مار ڈالا۔ دو نو تیرہ دل سرداروں کو دریا میں بھیج دیا۔ جہانگیر سزا کے معاملے میں بڑے دھیمے تھے۔ انہوں نے اُن کے سر منڈوائے۔ عورتوں کے کپڑے پہنائے اور اُلٹے گدھوں پر بٹھا کر شہر میں پھرایا۔ چند ہی روز بعد رحمٰن بیمار ہوئے۔ جب دربار میں گئے بڑی عزت ہوئی۔ افسوس کہ سنہ جلوس جہانگیری میں باپ کے ۱۱ برس بعد مر گئے۔ پشوتن ایک بیٹا چھوڑا۔ پشوتن نے جہانگیر کے عہد میں ۵ سو پیادہ۔ ۳ سو سوار کی افسری تک ترقی کی۔ شاہجہان کے عہد میں پانصدی کا منصب لیا۔ اور سنہ جلوس تک خدمتیں بجا لاتا رہا ٭

میں نے وعدہ کیا تھا کہ خانخاناں وغیرہ کے باب میں جو انہوں نے پھول کترے ہیں۔ آخر میں اُن کے ترجمے سے ناظرین کا دل شگفتہ کروں گا۔ چنانچہ ایک عرضی مہم دکن سے بادشاہ کو لکھی ہے۔ اس میں القاب آداب طولانی کے بعد حالات مختلفہ کے ذیل میں بعض امورات انتظامی خانخاناں کے متعلق لکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں قسم ہے عزت الٰہی کی۔ اور اُس کی گواہی کافی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے۔ جو کہا ہے وہی ہے۔ اس میں ذرا بھی اور کچھ بھی شبہ نہیں ہے واللہ باللہ ثم باللہ الطالب الغالب الحی الذی لا یموت۔ کئی دفعہ کئی بار اس کے آدمیوں کو میرے پاس پکڑ کر لاتے اور اُس کے نوشتے اقبال بادشاہی کے برخلاف پکڑے اور بجنسہ شہزادہ والا گوہر کو دکھائے۔ تمام ارکانِ دولت انگشت بدنداں ہو گئے۔ ساتھ ملے اور رہ گئے۔ بیچارگی سے خاموش ہیں۔ عجز و انکسار کے سوا کوئی رستہ نہیں دیکھتے چپ بیٹھے ہیں۔ مگر بڑے چھوٹے۔ امیر غریب سب سمجھتے ہیں کہ مہم دکن کو اسی نے اُلجھاوے میں ڈالا ہے اور اُسی کے سبب سے رُکی ہوئی ہے ٭

قبلۂ من۔ فدوی نے کئی دفعہ عریضہ میں عرض کیا ہے۔ مگر جواب شافی نہیں پاتا۔ عجب بات ہے۔ کہ فدوی کی عرض بھی غرض سمجھی جاتی ہے۔ ابوالفضل اس درگاہ کا پلا ہوا ہے اور خاک سے اُٹھایا ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ غرض آلودہ کہے۔ اور اُس میں کوشش کرے جس میں اس خاندان کی بدنامی ہو۔ صاحب من ہم ہندوستان کے آدمی یکرو ہیں خدا نے ہماری سرشت میں دو رُوئی پیدا ہی نہیں کی۔ الحمد للہ کہ ہم نمک کو حلال کر کے کھاتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح سفید رُو اور سیاہ دل نہیں اگرچہ ظاہر میں رنگت کا کالا ہوں۔ باطن سفید رُو ہے۔ جیسے آئینہ کے ظاہر میں اس کی سیاہ رنگی سے وہم پڑتا ہے مگر خوب ملاحظہ فرمائیں۔ پاکیزہ درون اور صاف دل ہوں۔ کھوٹ کپٹ کچھ نہیں **شعر**

نیم مہ کز فروغ غیر دارد خانہ نورانی | چو خورشیدم کہ نور خانہ از شمع زبان دارم

ایک اور تحریر میں فرماتے ہیں قبلۂ من۔ اگرچہ شہزادہ کامگار کے اوضاع و عادات کی طرف سے
ذرا خاطر جمع ہوئی ہے۔ لیکن عبدالرحیم بیرم کے فن و فریب کو کیا کہیے اور کیا کہئے کر لکھنے میں بیان عاجز اور
کہنے میں زبان قاصر ہے۔ اگر تمام عمر اس کی ذوفنیوں کو لکھتے جائیے۔ پھر دیکھئے تو عشر عشیر بھی نہیں لکھا۔
ایک ذات بے بدل ہے۔ کہ نظیر اور شبیہ نہیں رکھتی۔ مکر و دغا میں یگانہ اور بے بدل زمانہ ہے۔
کیونکہ اسے ہر باطن میں گنبد ہے۔ اور ہر طرح کی ظاہر کی خبر ہے۔ ابھی دل میں بات نہیں گزرتی
کہ اُسے آگاہی ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے کام کا ارادہ نہیں کرتا۔ کہ اُسے معلوم ہو جاتا ہے۔
سبحان اللہ مجھ سرگردان بادیہ حیرت کو اس فکر نے گھیرا ہے کہ کیسی بلا کی ہے کیسی طراری و مکاری ہے۔ کہ
خدا تعالیٰ نے اُسے کرامت فرمائی ہے لیکن یہ بات ذرا دل میں کھٹکتی ہے۔ کہ ظاہراً مشیئت حق میں سہو اور خطا
ہوئی۔ جب یہ زمانہ کا نادرہ کار اور بوالعجائب روزگار موجود ہے۔ تو عزازیل بیچارے کو کہ اس کے اطفال
دبستان میں داخل ہونے کے قابل ہی نہیں لعنت کے لئے کیوں اختیار کیا؟ ع

در ہر بن موئے او زبانے دگر است

کوئی نمک کھائے اور اس بدسرشتی اور بدطینتی سے سلسلۂ تیموریہ کی دشمنی دل میں رکھتا ہو۔ تو اس کا
کام کیونکر چلیگا؟ کیونکر انجام بخیر ہوگا؟ کیونکر نیکی کا منہ دیکھیگا۔ قبلۂ من۔ تمام دن تمام رات عنبر مقہور کے
جاسوس اور مخبر موجود رہتے ہیں۔ اور بیخطر اور بے کھٹکے اُن سے شیر و شکر رہتا ہے۔ شہزادہ والاگہر
کا ملاحظہ اور رعایت ادب کچھ بھی نہیں ہے۔ اتنی بھی پروا نہیں کہ شاید کوئی درگاہ عالی میں لکھ
بھیجے! اور حضور کو ملال ہو۔ یہ بیحیائی اور بے پروائی ہے۔ دعاگو شرطیہ لکھتا ہے۔ کہ اگر وہ اس ملک
میں نہ ہو تو ایک سال میں دکن کی مہم پاک و صاف کر دیتا ہے۔ لیکن کیا کیسے اور کیا کر سکتا ہے۔ اس کا
نقش ایسا جم گیا ہے۔ کہ حضور کو بھی اور شہزادۂ عالیشان کو بھی اعتقاد ہو گیا ہے۔ کہ دکن کی مہم اُس بغیر فتح
نہ ہوگی۔ اور جب وہ نہ ہوگا کچھ نہ ہوگا۔ لانسلم۔ لانسلم۔ لانسلم۔ کوئی نہ مانے میں نہ مانونگا تم بھی نہ
مانو کہ ایسا ہوگا۔ بلکہ قضیہ بالعکس ہے کیونکہ جب وہ اس ملک میں نہ ہوگا۔ مہم کا کام بن جائیگا۔ اور
تھوڑے عرصے میں۔ ذرا سی دیر میں دکن ہاتھ آجائیگا اور دکنی آکر سلام کرینگے۔ مانع الخیر وہی ہے۔
حقاً حقاً ثم حقاً بحضرۃ اللہ تعالیٰ وکفیٰ باللہ شہیدا۔ کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اور لکھا ہے یہی ہے۔ اصلاً
و قطعاً اس میں شبہ نہیں۔ واللہ باللہ تاللہ الغالب الحی الذی لایموت۔ کہ کئی بار اُس کے آدمیوں کو گرفتا
رکے دعاگو کے پاس لائے اور اُس کے نوشتے کہ بالکل اقبال و دولت بادشاہی کے مخالف ہیں بجنسہٖ
شہزادۂ والاگوہر کو دکھائے۔ تمام ارکان دولت دانتوں میں انگلیاں دے کر رہ گئے اور ہاتھ ملتے

تھے۔ سب بیچارگی اور ناچاری سے چپ لگائے ہیں۔ اور عجز و انکسار میں اپنا بھلا دیکھتے ہیں اور خاموشی کو نباہے جاتے ہیں۔ اعلیٰ ادنیٰ چھوٹے بڑے سب سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ مہم دکن کو وہی الجھاوے میں ڈالتا ہے۔ اور اُسی کے کرتوتوں سے مہم بند ہے۔ **شعر**

ہر کہ زبانش دگر و دل دگر	تیغ بباید زدنش بر جگر

(ایک اور عرضی میں) **قبلۂ ابوالفضل**۔ میں تو لکھتے لکھتے تھک گیا۔ حضور کے دلنشین نہیں ہوتا۔ انتہا یہ ہے۔ کہ حضور اسے معزول نہ فرمائیں۔ اتنا ہی لکھیں۔ کہ فلاں شخص کی بے مصلحت کچھ کام نہ کرو۔ اور ہمارے کہے سے پھرو گے۔ تو آزردگی اور رنج ہوگا ۰

شاید اسے پڑھ کر اس کے دل میں اثر ہو بعض باتوں میں ذرا ہمیں بھی شریک کر لیا کرے ۰

جہانگیر کو ایک عرضی دکن سے لکھی ہے۔ ذرا دیکھو نوجوان لڑکوں کو شیخ صاحب کن باتوں سے اور کیسے الفاظ و عبارت سے پھسلاتے ہیں۔ بڑے لمبے آداب القاب کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ دُنیا شش جہت میں محصور ہے۔ میں بھی شش جہت میں اپنی عرض کو منحصر کرتا ہوں جہت اوّل یہ ہے اور دوم یہ ہے تیسری جہت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ شہزادہ دانیال دن رات شراب میں غرق ہے۔ کوئی تدبیر راہ اصلاح پر نہیں لاسکتی۔ کئی دفعہ حضرت اعلیٰ کی خدمت اقدس میں عرضداشت لکھ چکا ہوں۔ بہتر ہے۔ کہ تم خود بدولت و سعادت اجازت لے کر ادھر تشریف لے آؤ۔ دانیال کو گجرات بھجوا دو۔ تمہارے آنے سے تمام دکنیوں کو عبرت ہو جائیگی۔ اور عنقریب دکن فتح ہو جائیگا۔ عنبر سیاہ رُو خود آکر حاضر ہو جائیگا۔ چاہئے تھا کہ آپ اس باب میں صاف و صریح لکھ کر مجھے بھیجتے لیکن اصلاً و قطعاً متوجہ نہ ہوئے۔ اور اس امر میں کوشش نہ فرمائی اور کبھی اس دعاگو کو جواب شافی سے سرفراز نہ فرمایا میں نہیں جانتا کہ اسکا باعث کیا ہوگا۔ اور بندہ سے کونسی خطا ہوئی ہوگی کہ جس سے خاطر شریف پر ملال ہُوا ہوگا۔ خدا گواہ ہے کہ جو بندہ کی طرف سے دشمنوں نے آپ سے کہا ہے واللہ جھوٹ باللہ جھوٹ ۔ ثم باللہ جھوٹ ہے۔ خدا نہ کرے کہ بندہ سے آنحضرت (آپ) کے باب میں حرف ناشائستہ سرزد ہو۔ ساری بات یہ ہے کہ بندہ کی بدنصیبی اس درجہ پر پہنچی ہے۔ کہ باوجود دولت خواہی و خاکساری کے غرض گو رُوسیاہ لوگ آپ سے نامناسب باتیں کہتے ہیں۔ اس میں میری کیا خطا۔ مگر خدا سے امیدوار ہے کہ جو کسی کی بدی کے درپے ہوگا۔ اچھی طرح سے اس کی جزا پائیگا۔ اللہ کے ہزار ناموں سے ایک نام حق ہے جب وہی ناحق کا سزاوار ہوگا۔ تو حق کون کریگا۔ دوسرے یہ کہ گنجائش کیا ہے؟ جو میں حضرت اعلیٰ سے تمہاری بُرائی کہوں۔ کیا مجھے اتنا بھی شعور نہیں۔ کہ بادشاہی کے سنبھالنے کی لیاقت کسے ہے؟ خاندان تیموریہ

کانٹنگ و ناموس کون رکھتا ہے اندھا بھی ہو تو اپنی قباحت سمجھ سکتا ہے اور چشم دل سے دیکھ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ صاحب نظر۔ میں کور نہیں۔ کج فہم ہوں تو ہوں۔ مگر اتنا تو شاید سمجھوں کہ تم میں اور راو اور شہزادوں میں کیا فرق ہے۔ ع

زکعبہ تا بسر کوئے تو ہزار فرسنگ است

آزاد خدا جانے شیخ صاحب نے کیا کچھ موتی پرو دئے ہونگے۔ میں نے مہم دکن کے ضمن میں چند سطریں اکبرنامہ کی ترجمہ کر دی ہیں۔ ان سے ان کے اصلی خیالات معلوم ہو چکے مگر باوجود اسکے خیال کرو کس خوبصورتی سے اپنی خیر خواہی کے نقش نوجوان لڑکے کے دل پر بٹھائے ہیں۔ چوتھی جہت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ کہ بندہ نے کئی دفعہ عبدالرحیم بیرم کی نالائقی کے باب میں حضرت اعلیٰ کو لکھا کہ قبلۂ من اس سے آگاہ دل رہیں۔ اور اس کی ظاہری چاپلوسی پر فریفتہ نہ ہوں۔ ع

در ہر بن موئے او زبانے دگر است

عیاری اور مکاری میں بے نظیر آفاق ہے۔ خدا نے ویسا پیدا ہی نہیں کیا۔ وہ خدا کی حد آفرینش سے بہت بڑھکر رہے۔ دو رنگی اور دو زبانی ختم ہے اور نمک حرامی اس پر منحصر ہے۔ خدا گواہ ہے ملائک بھی اس عرضی پر اشہد بما فیہ لکھتے ہیں کہ دودمان تیموریہ کا دشمن ہے اور یہ شیوہ اس کی میراث ہے۔ آنحضرت پر روشن ہے کہ بیرم نمک حرام نے اس سلسلۂ عالی کے برباد کرنے میں کمی نہیں کی۔ کیا کیا کام کئے۔ کیا کیا چالیں چلا۔ خدا خاندان والا کا مددگار تھا۔ اس کے مکر و حیلے نہ چلے۔ کچھ نہ کر سکا۔ خوار ہو گیا۔ کون برہنہ گنواروں کے ہاتھ پڑا۔ انہوں نے اسے بھی کون برہنہ کرکے نچایا۔ کہ من سگ ملکم۔ من سگ ملکم کہہ کر ناچا۔ آخر حق مرکز پر آ ٹھیرا۔ اور کیوں نہ ٹھیرے۔ جہاں اکبر جیسا بادشاہ دل نمازی ہو۔ وہاں وہ ذاتی کنگلا ہند کی بادشاہت کیونکر لے سکتا۔ جہاں ایسا شہباز شاخسار ملک پر حق و قائم ہو۔ ایک بندر چار دانگ ہندوستان کی حکومت کیونکر لے سکتا تھا۔ جہاں تیموری نیستان کا نرہ شیر دڑوکتا ہو۔ گیدڑ کی کیا طاقت ہے۔ کہ اس کا جانشین ہو۔

قصہ کوتاہ سخن مختصر۔ مہم دکن میں اس سے ایسے معاملے نہیں دیکھے۔ ایسی باتیں نہیں سنیں۔ کہ کہنے سے یقین بھی آجائے اور لکھنے میں مطلب بھی ادا ہو جائے۔ حضور یقین فرمائیں۔ کہ جب تک وہ اس ملک میں ہے۔ ہرگز فتح نہ ہوگی۔ ہم ناحق ٹھنڈا لوہا پیٹ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آزاد دیکھنا باوجود اس متانت اور ثقاہت کے نوجوانوں کی دلجوئی کرنے کو کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خیر دنیا میں مطلب نکالنا چاہو۔ تو سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور درباروں کے معاملے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اکبر کے بیٹے کو ایک عرضی لکھی ہے۔ اس میں مختلف مطالب لکھتے لکھتے کہتے ہیں شہزادۂ والاگوہر کی کیا فریاد کروں اور شکایت کیا لکھوں۔ اگر میں جانتا کہ یہاں ایسی ایسی خرابیاں دامنگیر ہونگی۔ تو ہرگز ہرگز اِدھر کا رُخ نہ کرتا۔ مگر مہندس قضا نے ہی مقدر میں لکھا تو چارہ کیا؟ بندہ میں کیا طاقت ہے۔ کہ مشیت حق کو بدل سکے۔ میں تو زمانہ کی نیرنگیوں اور فلک کی کج رفتاریوں سے حیران تھا مگر جب اس عبدالرحیم کو دیکھا تو سب بھول گیا۔ بھرے زخم ہرے ہو گئے۔ پُرانے ناسور پھر بہ نکلے داغوں سے لہو ٹپک پڑا۔ میں کیا کہوں کہ اس نادر الاعضا ابوالعجوبہ روزگار کا شکوہ کروں۔ اس کے ہاتھ سے زمانہ کے دل پہ داغ پڑے ہوئے ہیں۔ اور افلاک اس کے ظلم سے سینہ چاک ہیں۔ ع

باہر کہ بنگرم بہ ہمیں داغ مبتلا است

جادوگر کہوں۔ مگر اس کا سرمایہ اس سے بہت ہے۔ سامری ہوتا تو اس کے ہاتھ سے چیخ اُٹھتا اس کا ایک گوسالہ تھا جس سے جادوگری کرتا تھا اس کے ہزار گوسالے ہیں کہ خلق عالم اس کے ہاتھ سے فریاد کر رہی ہے۔ سارے بادشاہی لشکر کو گوسالہ بنا رکھا ہے اور جادوکاریاں کر رہا ہے دکن کے لوگوں کو ایسا بھسلایا ہے۔ کہ پیغمبری کا دعوے کرے تو ابھی بندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ اور اسے اپنا آفریدگار مانتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا مکاری ہے اور کیا عیاری ہے۔ کہ خدا نے اِسے نصیب کی ہے۔ شہزادہ عالمیان۔ رات دن اس کے ہاتھ سے نالاں ہیں۔ اور فریاد و فغاں کرتے ہیں۔ مگر اس پر نظر پڑی اور گونگے ہو گئے۔ تن بدن میں ذرا جنبش نہیں ہوتی۔ اپنے تئیں اس کے حوالے کر دیا ہے۔ کئی دفعہ اس کی بے باکیاں اور نادرستیاں دیکھ لی ہیں۔ اور صریح کارہائے ناشائستہ اس سے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس کے خطوط جو عنبر برگشتہ روزگار کو لکھے تھے۔ وہ کاغذ ہاتھوں لے کر شہزادے کو دکھائے اور نقل درگاہ والا میں بھیج دی۔ کچھ نہ ہوا۔ اور اس کا کچھ بھی نہ کر سکے۔ میں نامراد کس حساب اور کس شمار میں ہوں۔ اور کس جمع خرچ میں داخل ہوں۔ کہ اس کے اعمال ناشائستہ کا عوض لوں۔ بے چارہ دشت غربت میں سرگرداں اپنے حال میں حیران مجھے حضرت ظل اللہی سے یہ امید نہ تھی۔ کہ میرے لئے اپنی خدمت سے جدائی تجویز کرینگے اور ایسی عجیب بلا سے گرفتار کرینگے۔ حیرت در حیرت ہے۔ کہ یہ کیا تجویز تھی جو فرمائی۔ حق علیم ہے۔ خلق اللہ کو یہ وہم تھا۔ کہ اگر قطب شمالی حرکت کر کے جنوب میں چلا جائے۔ اور جنوبی جنبش کر کے شمال میں جا گھسے۔ تو ہو سکتا ہے۔ ابوالفضل شاید ہی برکات سعادت قرین سے دُور ہو۔ خیر مجھے کیا طاقت تھی۔ کہ اُن کے فرمانے میں خلل دوں۔ سر و چشم کہہ کر قبول کیا۔ اور اُن کے حکم سے مہم دکن پر چلا آیا۔ مگر کونسی محنتیں

نقیبس کہ نہ پہنچیں۔ اور کونسی سختیاں تھیں۔ کہ نہیں اٹھائیں۔ قبلۂ من غموں کا لشکر ٹوٹ پڑا ہے۔ بیکس۔ نہتّا۔ نہ زر۔ نہ چلتا۔ میدانِ مصیبت میں کھڑا ہوں۔ نہ بھاگنے کی طاقت ہے۔ نہ لڑنے کا حوصلہ۔ ہاں حضور کی ہمت عالی اگر رکاب امداد میں قدم رکھے اور نیک دلی حقیقی کو کام فرمائے۔ تو اس کمترین کی مخلصی ہو جائے۔ آخری عمر حضرت کی قدمبوسی میں گزارے کہ ابوالفضل کی سعادتِ دوجہان اس میں مندرج ہے۔ کوئی نیک ساعت اور مبارک گھڑی دیکھ کر حضور کو سمجھائیے۔ اور للّٰہ مجھے بلوائیے۔ وغیرہ وغیرہ +

دانیال کو ایک طولانی عرضی میں اپنے قاعدے کے بموجب مطالب مختلفہ تحریر کئے ہیں۔ اس میں لکھتے ہیں عبدالرحیم بدکردار عنبر رُو دسیاہ برگشتہ روزگار کے ساتھ یکدل و یک زبان ہو کر فیلسوفی کر رہا ہے۔ خدائے عزوجل حق ہے۔ ناحق کو اس کی درگاہ میں رواج نہیں ہے۔ انشاءاللہ تعالےٰ ہمیشہ اس کا کام تنزل میں رہیگا۔ اور اس خاندان سے شرمندہ ہوگا۔ آقائے ابوالفضل! جہاں تک ہوسکے۔ اسے اپنے رازوں سے آگاہ نہ کیجئے گا +

مریم مکانی کو لکھتے ہیں کہ ۲۵ برس سے یہ کمبخت تنگ مہم اسی طرح چلی جاتی ہے۔ ختم نہیں ہوتی۔ اور حضور سمجھتے ہیں کہ دولت تیموری کا سارا رعب و داب اس مہم پر منحصر ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ مہم بگڑے۔ یہ مہم بگڑی تو بات ہی بگڑ جائیگی۔ حضور سمجھائیں کہ حضرت اعلیٰ للّٰہ توجہ فرمائیں۔ اور پھر وہی عبدالرحیم بیرم کا رونا روتے ہیں +

اسی تحریر میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ملک دکن عجب ملک ہے۔ خوشحالی کو خدا نے یہاں پیدا ہی نہیں کیا اکثر جگہ لکھتے ہیں۔ کہ کابل و قندھار و پنجاب اور ملک ہیں۔ وہاں کے اور معاملے تھے۔ یہاں انداز کچھ اور ہے۔ جو باتیں وہاں کر جاتے ہیں۔ وہ یہاں پیش ہی نہیں جاتیں +

یہ بات بھی ہر عرض میں لکھتے ہیں۔ کہ حضور اعلیٰ نے کئی بار فدوی کو لکھا ہے کہ ہم نے تمہیں اپنی جگہ بھیجا ہے اور جہاں ہمیں آپ جانا تھا۔ وہاں تمہیں بھیجا۔ تمہیں سفید و سیاہ کا اختیار ہے جسے چاہو نکال دو۔ مختار ہو یہ کیا ہے کہ بار بار عبدالرحیم بیرم کے باب میں لکھتا ہوں اور نہیں سنتے +

تاریخوں سے بھی معلوم ہوا اور بزرگوں سے بھی سنا کہ یہ دونو بھائی پہلو سبز تھے۔ اہل کمال۔ علما۔ شرفا۔ مشائخ اور اہلِ طریقت جو آتے تھے۔ ان سے بمروت پیش آتے تھے۔ مہمانی کے حق ادا کرتے تھے دربار شاہی میں لے جاتے تھے۔ اور اپنے پاس سے بھی سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط کی عبارت کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ جو شیخ نے اپنے والد شیخ مبارک کو لکھا ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے دلّی کے بعض

"اہل طریقت کی جاگیر کے لئے سفارش لکھی تھی۔ اس فقرے کے جواب میں کشمیر سے لکھتے ہیں "
"اُس حقائق آگاہ سے (آپ سے) مخفی نہ ہوگا۔ کہ حضرت دہلی کے اعزہ کے لئے مکرر عرض اقدس تک پہنچایا۔ کہ ایک جماعت مستحقان با استحقاق اور خیر خواہان بے کینہ و نفاق اس متبرک گوشہ میں رہتے ہیں اور ہمیشہ حضور کی دولت و حشمت و عمر کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ حکم ہُوا کہ جو کچھ تو عرض کریگا مقبول درگاہ ہوگا۔ حسب الحکم ۱۰ ہزار بیگہ زمین افتادہ اور مزروعہ ان کے نام پر بہ تفصیل لکھ کر نظر اقدس سے گزاری مقبول ہوئی۔ ساتھ اس کے حکم ہُوا کہ ہزار بیگہ پر سو روپیہ بیلوں اور تخم ریزی کے لئے عنایت ہوں۔ آپ یہ خوشخبری بھی وہاں کے مخادیم کی خدمت میں پہنچا دیں۔ کہ اُن کی خاطر جمع ہو۔ انشاءاللہ فرمان واجب الاذعان روپیہ سمیت پہنچا سمجھیں اور آن سے فرمائیگا کہ کمترین کی یہ خدمتیں مجرا ہو جس قدر ممکن ہوگا۔ اور وقت گنجائش دیگا اپنی طرف سے بھی خدمت کریگا اعزہ کے باب میں کسی صورت سے اپنے تئیں معاف نہ رکھے گا۔ خدا نہ کرے کہ ابوالفضل مہمات اہل فضل میں غفلت اور کاہلی کرے۔ کیونکہ اسے اپنے حق میں سعادت دارین اور دولت کونین سمجھتا ہے اور اپنا شرف جانتا ہے نیک آدمی وہی ہے جس سے ان لوگوں کی خدمتیں سرانجام پا رہی ہیں۔ نہ سمجھیں کہ ابوالفضل دُنیا کے مَیل میں آلودہ ہو گیا ہے۔ اپنے یار و دیار کی ضرورتوں کو بھول گیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک جب تک زندہ ہوں۔ ان لوگوں کا خاک رہ ہوں۔ اور اس گروہ پر شکوہ کی خاک راہ۔ ان کی خدمت مجھ پر لازم بلکہ فرض ہے۔ ع دریائے تو برم آنچہ در دست من است۔ بلکہ جان میں کلام ہے جان کیا چیز ہے جسے کوئی اس گروہ سے عزیز رکھے۔ قصہ مختصر کہ جو خدمت اس معتقد کے لائق ہو ایک اشارہ فرمائیں کہ سرانجام کرونگا اور اسے اپنی جان پر احسان کر کے سمجھونگا"

مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر کے معاملے تمہیں معلوم ہی ہیں۔ مخدوم نے غروب اقبال کے عالم میں جونپور کے بعض بزرگوں کے لئے سفارش لکھی۔ انہوں نے اس کے جواب میں خط لکھا۔ آفرین ہے اس حوصلہ کو وہ مخدوم الملک جو کسی وقت میں بھی ان سے نہیں چوکے اور کُتّے کا دانت بھی پایا تو مار ان غریب مسجد نشینوں کے پاؤں میں چبھو دیا۔ اس کے حق میں کیسی برکت و عظمت کے الفاظ خرچ کئے ہیں اور کس طرح اعتبار و احترام سے جواب لکھا ہے۔ مگر اسے کیا کریں کہ وقت بوقت ہے یہ آسمان پر ہیں وہ زمین پر۔ ان کی تحریر کو دیکھتا ہوں تو حرف حرف پڑا ہنس رہا ہے۔ مخدوم نے پڑھا ہوگا تو آنسو نکل پڑے ہونگے "

"اوّل تو القاب و آداب میں دو صفحے سے زیادہ سفیدی سیاہ کی ہے مثلاً صاحب العزۃ والعلا جامع الصدق والصفا صاف اشارہ ہے کہ دل میں کیا ہے اور قلم سے ہمیں کیا لکھ رہے ہو۔

مگر یہ خط لکھا آتا ہے اور آپ کو لکھنا پڑتا ہے۔ ماحی الشرع والملۃ والدین ماحی الکفر والبدعۃ والبغی فی العالمین مطلب اس کا یہی ہے کہ ایک وقت تھا۔ کہ کفر کے مٹانے کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے تھے۔ اور بدعتی۔ باغی۔ کافر ہم تھے۔ آج خدا کی شان دیکھو کہ تم کہاں ہو اور ہم کہاں ہیں۔ انیس السلاطین جلیس الخواقین اسے پڑھ کر مخدوم نے ضرور ٹھنڈا سانس بھرا ہوگا۔ اور کہا ہوگا۔ کہ ہاں میاں جب کبھی تھے۔ تو سب ہی کچھ تھا۔ اب جو ہو سو تم ہو۔ ایک نشتر اس میں یہ بھی ہے کہ جناب! صاحب فقر اور صاحب شریعت کو سلاطین اور خوانین سے کیا تعلق۔ عالی حضرت معالی منقبت قدسی منزلت خادم الفقرا ناصر الغربا۔ واہ ہم غریبوں فقیروں کے ساتھ کیا کیا سلوک کئے ہیں۔ مخدوم الملک عز شانہ وعم احسانہ دیکھو خدائی تک تو پہنچا دیا ہے اور بندہ سے آپ کیا چاہتے ہیں معمولی تمہیدوں اور تعریفوں کے بعد فرماتے ہیں۔ قبلہ ابوالفضل التفات نامہ جو اس مخلص صمیمی کے لئے نامزد فرمایا ہے۔ اس میں ارشاد ہے کہ جونپور کے رہنے والے اور گوشہ نشینوں کے حال سے خبردار نہیں اور اس سعادت سے بہرہ نہیں رکھتے۔ سبحان اللہ میں کہ تمام عمر اس گروہ کی خدمت میں گذاری پھر بھی یہی چاہتا ہوں۔ کہ ہمیشہ ان عزیزوں کی خدمت میں رہوں۔ اور مقدور کے بموجب جو مجھ سے ہو سکے ان کے باب میں بھلائی کروں۔ آنحضرت (آپ) میرے حق میں فرماتے ہیں میں کیا علاج کر سکتا ہوں۔ کہ میری قسمت نحس کی بدمددی سے آپ کے دل میں یقین ہو گیا خدائے مصحف کی قسم ہے جب سے حضرت ظل الٰہی کی خدمت میں ذمارا ہ بندگی بہم پہنچائی ہے اور رُوشناسی حاصل ہوئی ہے بلحظہ بلکہ لمحہ بھی عزیزوں کی یاد سے غافل نہیں بیٹھتا اور ان کے مہموں کے سرانجام میں کسی طرح بھی اپنے تئیں معاف نہیں رکھتا۔ ۴۰ ہزار بیگہ قابل الزراعت سے اہالی حضرت دہلی کیلئے خدمت کی ہے۔ ۱۰ ہزار بیگہ موالی سرہند کیلئے۔ ۲۰ ہزار بیگہ عزیزان ملتان کے لئے۔ کل قریب لاکھ بیگہ عزیزان دمجاوران کیلئے التماس کر کے لی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر شہر کے فقرا آئے اور حالات اپنے ظاہر کئے۔ حضرت اعلیٰ سے عرض کر کے ہر ایک کے حالات کے موافق مدد معاش اور کچھ کچھ نقد لے کر نذر کیا۔ خدا علیم ہے کہ اگر ساری خدمتیں بیان کرے تو دفتر ہوتا ہے۔ آپ کے خادموں کیلئے دردسر سمجھ کر تفصیل نہ لکھی۔ مخدومان جونپور اپنے غرور سے کہ آنحضرت (آپ) پر روشن ہے مجھ مخلص کے پاس نہ آئیں اور کمال خود بینی کے سبب مجھ نامراد کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ تو میرا اسمیں کیا گناہ ہے پھر بھی جب آپ اسطرح لکھتے ہیں تو اپنی جان پر احسان کر کے اور اپنی سعادت جانکر وہاں کے عزیزوں کے نام فرمان درست کرکے بھیجتا ہے۔ یقین تصور فرمائیں اور یہ چاہتا ہوں آپ جیسوں کو اتنی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ ناموں کی تفصیل لکھ بھیجیں۔ اور

ہر ایک کی کیفیت بھی ظاہر فرمائیں کہ ہر ایک کی ہمسازی کی جائے۔ خدائے تعالیٰ اس برگزیدہ انفاس و آفاق کو مسند درسی پر بالتمکین رکھے (بیٹھے رہئے پڑھایا کرو) مگر وہ حضرت شیخ آپ کا حوصلہ آپ ہی کے واسطے ہے شیخ صدر کے نام بھی ایک خط ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں وہ حج کو گئے تھے انہی دنوں میں بعض ضرورتوں کے سبب سے انہیں خط لکھا تھا۔ اسکے جواب میں آپنے بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ ایک خط لکھا اوّل القاب میں ڈیڑھ صفحہ کاغذ پر نمک پیسا ہے کہ غریب بڈھے کے زخموں پر چھڑکیں پھر فرماتے ہیں امیدگاہا ان دنوں میں خبر فرحت اثر سنی ہے کہ آنحضرت (آپ) نے طواف حرم باحرمت کیلئے عزم جزم فرمایا ہے مبارک ہے اور خوب ہے خدا سب دوستوں کو اس سعادت سے مشرف کرے اور مطلب اصلی اور مقصد حقیقی کو پہنچائے اور آپکی برکت سے اس آرزومند خالص کو بھی اُس حریم عزت قرین اور حرم حرمت آئین میں معزز و مشرف کرے ؎

یہ بات کئی دفعہ حضرت پیر دستگیر مرشد حقیقت تدبیر ظل الٰہی شاہنشاہی کی خدمت اشرف اقدس ہمایوں میں عرض کی۔ اور رخصت کیلئے التماس کیا لیکن قبول نہ ہوا کیا کروں اُنکی خوشی قضائے الٰہی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جو کام انکے بغیر ہوگا کچھ فائدہ نہ ہوگا اور کشائش نہ دیگا خصوصاً مجھ بینوا عاجز طبع کو کہ جان سے اس مرشد حقیقی کو دست ارادت دیکھا ہے اور دل کے ظاہر باطن کو اُسی دستگیر روشن ضمیر کے سپرد کیا ہے میرا ارادہ اُنکے ارادے پر موقوف ہے میرا قصد اُنکے حکم سے وابستہ ہے۔ کیونکر دلیری کرسکتا ہوں اور اُن کے فرمائے بغیر کب کوئی کام کرسکتا ہوں کیونکہ ہر صبح و شام ان کے دیدار شریف کا دیکھنا مجھے حج اکبر بلکہ اُس سے بھی افضل تر ہے۔ اُنکی گلی کا طواف سعادت جاودانی ہے اور منہ دیکھنا میوۂ زندگانی۔ غرض مجبوراً اب کے سال بھی سفر ملتوی رہ گیا اور دوسرے سال پر جا پڑا مصرع

تا درمیانہ خواستہ کردگار چیست | اگر رضا قضائے آسمانی کے موافق پائیگا۔ تو طواف کعبۂ معظم پر متوجہ ہوگا ؎

یارب ایں آرزوے من چہ خوش است　　تو بدیں آرزو مرا برساں

اس عزم و نیت میں خدا یار و یاور ہے ؂

اِس خط کو دیکھ کر شیخ صدر کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ یہ اُسی شیخ مبارک کا بیٹا ہے۔ کون شیخ مبارک جس کے فضل و کمال کو برسوں تک شیخ صدر اور مخدوم اپنے خدائی زوروں سے دباتے رہے اور تین بادشاہوں کے عہد تک اُسے کافر اور بدعتی بنا کر کبھی جلاوطنی کے زیر سزا رکھا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کے بھائی فیضی کو مبارک باپ سمیت اُس نے دربار سے نکلوا دیا تھا ؂

خدا کی قدرت دیکھو آج اُس کے بیٹے بادشاہ وقت کے وزیر ہیں اور ایسے صاحب تدبیر کہ انہیں دودھ میں سے مکھی کیطرح نکال کر پھینک دیا۔ اور وہ اجتہاد جس کے زور سے یہ حضرات دین و دنیا کے مالک اور پیغمبر کے نائب بنے بیٹھے تھے۔ اس کا محضر علما و مشائخ کی مہر دستخط سے اس نوجوان بادشاہ کے نام لکھوا دیا جو لکھنا پڑھنا

بھی نہیں جانتا اور ان نوجوانوں کے خیالات وہ ہیں کہ اگر ان نوصاحبوں کی حکومت ہو تو قتل سے کم کوئی سزا ہی نہیں۔ آج انہی شیخ صدر کو کیسے کھلے دل سے اور کیا پھیل پھیل کر لکھتے ہیں کہ حضرت ظل الٰہی شاہنشاہی پیر دستگیر۔ مرشد حقیقت تدبیر کی بے اجازت حج کو کیونکر جاؤں اور مجھے تو اس کا دیدار حج اکبر ہے ٭

حق یہ ہے کہ مخدوم اور صدر کے زور حد سے گزر گئے تھے زمانے کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی زور بہت بڑھ جاتا ہے تو خود اُسے توڑتا ہے اور ایسے سخت صدمے سے توڑتا ہے جسکی چوٹ کو کوئی پہاڑ نہیں سہار سکتا اور ان بزرگوں کے تو کام وہ تھے۔ کہ اگر زمانہ نہ توڑتا تو خود ٹوٹ جاتے۔ خیر اغنیار کیوقت خدا ہمیں اعتدال کی عینک عنایت کرے ٭ معلوم ہوتا ہے کہ ماں نے اسے کوئی خط لکھا ہے اور مطالب متفرقہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ غربا اور اہل حاجت کی خبرگیری ضرور کیا کرو۔ اسکے جواب میں ذرا دیکھو اپنے علمی و فلسفی خیالات کو کن لاڈ کی باتوں میں ادا کرتے ہیں۔ اول تو کہیں بادشاہ کی عنایتوں اور نعمتوں کے ٹھکیدے ہیں کہیں اپنے محاسن اخلاق اور نیک نیتی کے دعوے ہیں۔ اسی میں یہ کہ بادشاہ کی عنایتوں کو بھی خلق خدا کی ضروریات اور آسائش کے کام میں لاتا ہوں۔ اسی میں لکھتے لکھتے کہتے ہیں کہ قبلہ ابوالفضل! اہل شریعت کہتے ہیں کہ جس شخص نے بے نماز کی دستگیری کی۔ اس کے لئے فرشتے دوزخ میں کوٹھری بنائینگے اور جس نے اہل عبادت اور نماز گزار کی دستگیری کی۔ اُس کے لئے بہشت میں ایوان بنائینگے۔ آمنا۔ صدقنا۔ جو اس پر ایمان نہ لائے کا فر ہے لیکن ابوالفضل کی عاجز شریعت کا فتوے یہ ہے کہ خیرات عام چاہیئے۔ نمازیوں کو بھی دے اور بے نمازوں کو بھی۔ کیونکہ اگر بہشت میں گیا تو ایوان تیار ہے وہاں عیش کریگا۔ اور اگر دوزخ میں گیا۔ اور بے نمازوں کو کچھ دیا نہیں تو ظاہر ہے کہ وہاں اس کے لئے گھر نہ ہوگا۔ اور لوگوں کے گھروں میں گھستا پھریگا۔ اسلئے ایک پرانا جھونپڑا وہاں بھی ضرور ہے۔ دور اندیشی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اس راہ میں اپنے محبّوں کو توفیق علے التحقیق عنایت کرے اور پھر ابوالفضل بے نوا کو مطالب اصلی اور مقاصد حقیقی تک پہنچائے۔ اپنے احسان سے اور اپنے کمال کرم سے۔ کعبۂ ابوالفضل عزیز بھائی شیخ ابوالمکارم کی شادی کے لئے مجھے لکھنے ہو کر آنا چاہیئے۔ ع

چوں بپایم نیست رو دیدۂ خود مے آیم

کیوں نہ آؤنگا۔ سر سے آؤنگا۔ آنکھوں سے آؤنگا۔ کئی دن سے ایک ایسا موقع ہے کہ حضرت ظل الٰہی (بادشاہ) اس فرد حقیر پر سطح نور التفات ظاہر فرماتے ہیں۔ کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتے رہتے ہیں ایسا کہ کوئی مخلوق۔ کوئی آخر ندیم میں محرم راز نہیں

ع میان عاشق و معشوق رمزیست

آنا نہ ذہین ون پر طنتوی ہے انشاء اللہ بعد رمضان مبارک قدمبوسی کا شرف حاصل کرونگا وغیرہ وغیرہ خدا یار رہا اور یار آزاد۔ یہ آخری فقرہ اکثر خطوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔ سچ ہے ان کے سلسلہ بھائیوں کا وسیلہ یار رہا اور رہو تھا۔ خدا ہی تھا

موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل

تعجب ہے کہ اکبر بادشاہ کا وزیر کل کشور ہند کا دیوان اور کسی مصنف نے اس کے خاندان یا وطن کا حال نہ لکھا۔ خلاصۃ التواریخ میں بھی دیکھ لیا۔ باوجودیکہ ہندو مؤرخ ہے اور ٹوڈرمل کا بھی بڑا ثناخواں ہے مگر اُس نے بھی کچھ نہ کھولا۔ البتہ پنجاب کے پُرانے پُرانے پنڈتوں اور خاندانی بھاٹوں سے دریافت کیا تو اتنا معلوم ہُوا کہ ذات کا کھتری اور گوت کا ٹنڈن تھا۔ پنجاب کے لوگ اس کی ہموطنی سے فخر کرتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ لاہوری تھا۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ چونیاں ضلع لاہور کا تھا۔ اور وہاں اُس کے بڑے بڑے عالیشان مکانات موجود ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اس کے وطن کی تحقیقات کی۔ مگر یہ قرار دیا کہ موضع لاہرپور علاقہ اودھ کا رہنے والا تھا۔

بیوہ ماں نے اس ہونہار لڑکے کو بڑی تنگدستی اور افلاس کی حالت میں پالا تھا۔ اُس کے صدق دل کی دعائیں جو ٹھنڈے سانس کے ساتھ رات کو درگاہ الٰہی میں پہنچتی تھیں۔ ایسا کام کر گئیں۔ کہ شاہنشاہ ہندوستان کے دربار میں ۲۲ صوبہ کا دیوان کل اور وزیر باتدبیر ہو گیا۔ اوّل عام منشیوں کی طرح کم علم نوکری پیشہ آدمی تھا۔ اور مظفر خاں کے پاس کام کرتا تھا۔ پھر بادشاہی متصدیوں میں داخل ہو گیا۔ اس کی طبیعت میں غور۔ قواعد کی پابندی اور کام کی صفائی بہت تھی اور ابتدا سے تھی۔ مطالعہ کتاب اور ہر بات کے حاصل کرنے کا شوق تھا چنانچہ علم و لیاقت اور ساتھ اس کے رجوع کاروبار میں بھی ترقی کرنے لگا۔ کام کا قاعدہ ہے کہ جو اُسے سنبھالتا ہے۔ چاروں طرف سے سمٹتا ہے اور اُسی طرف ڈھلکتا ہے۔ چونکہ وہ ہر کام کو سلیقہ اور شوق سے سرانجام کرتا تھا۔ اس لئے بہت سی خدمتیں اور اکثر کارخانے اُس کے قلم سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی معلومات امورات دفتر اور حالات معاملات میں ایسی ہو گئی تھی کہ امرا اور درباری کاروار ہر بات کا پتہ اس سے معلوم کرنے لگے۔ اُس نے کاغذات دفتر اور سلجھائے مقدمات اور کھنڈے ہوئے کاموں کو بھی اصول و قواعد کے سلسلہ میں بندش دی۔ رفتہ رفتہ بے واسطہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر کاغذات پیش کرنے لگا۔ اور ہر کام میں اُسی کا نام زبان پر آنے لگا۔ ان سببوں سے سفر میں بھی بادشاہ کو اُس کا ساتھ لینا واجب ہُوا۔

ٹوڈرمل دھرم کرم اور پوجا پاٹ کی پابندی سے پورا ہندو تھا۔ مگر وقت کو خوب دیکھتا تھا اور ضروریات و فضولیات میں نظر دقیق سے امتیاز کرتا تھا۔ ایسے موقع پر اُس نے دھوتی پھینک کر

برنہ و پہن لیا اور جامہ اُتار کھینچے پر کمر کس لی۔ موزے چڑھا لئے۔ ترکوں میں گھوڑا دوڑائے پھرنے لگا۔ پادشاہی لشکر کوسوں میں اُترا کرتا تھا۔ ایک آدمی کو دیکھنا چاہتے۔ دن بھر بلکہ کئی دن لگ جاتے تھے۔ اُس نے پیادہ۔ سوار۔ توپخانہ۔ بہیر۔ رسد۔ بازار لشکر کے اُتارنے کے لئے بھی پہلے اصولوں میں اصلاحیں نکالیں۔ اور ہر ایک کو مناسب مقام پر جمایا۔ اکبر بھی آدمیت کا جوہری اور خدمت کا صراف تھا۔ جب اُس کی سپاہیانہ کمر بستگی اور تر کانہ پھرتی دیکھی تو سمجھ گیا۔ کہ منصدی گری کے علاوہ سپاہگری و سرداری کا جوہر بھی رکھتا ہے ؎

ٹوڈرمل پابندی آئین تعمیل احکام اور محاسبات عمل درآمد میں کسی کی بال بھر بھی رعایت نہ کرتا تھا۔ اور لوگ اس سبب سے اُسے سخت مزاجی کا الزام لگاتے تھے۔ سنہ ۹۷۲ھ میں اُس نے وصف مذکور کو اس طرح استعمال کیا۔ کہ اس کا نتیجہ سخت مضرت کے رنگ میں نمودار ہوا۔ جب بادشاہ نے خانزماں کی مہم میں منعم خاں وغیرہ امرا کو کڑہ مانک پور بھیجا۔ تو میر معز الملک کو بہادر خاں وغیرہ کے مقابلہ پر قنوج کی طرف روانہ کیا۔ پھر ٹوڈرمل کو کہا کہ تم بھی جاؤ۔ اور میر کے ساتھ شامل ہو کر سرشور نمک خواروں کو سمجھاؤ۔ راہ پر آجائیں تو بہتر ہے۔ ورنہ اپنی سزا کو پہنچیں۔ جب یہ وہاں پہنچے۔ تو پیغام سلام شروع ہوئے۔ بہادر خاں بھی لڑنا نہ چاہتا تھا۔ مگر میر کا مزاج آگ تھا۔ راجہ باروت پہنچے۔ خلاصہ یہ کہ لڑ مرے[1]۔ اور مفت ذلت اُٹھائی۔ مگر راجہ کو آفرین ہے۔ کہ میدان سے نہ ٹلا۔ پیارے راجہ! گھر کے ملازموں سے حساب و کتاب میں اپنے قواعد و ضوابط کو جس طرح چاہو برت لو۔ لیکن سلطنتوں کی مہمات میں بگڑی بات کا بنانا کچھ اور آئین چاہتا ہے۔ وہاں کے اصول قوانین درگذر کے کاغذوں پر چشم پوشی کے حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ جن کی تحریر سے آزاد کے دست و قلم کو تاہی کرتے ہیں ؎

چتوڑ۔ رنتھنبور۔ سورت کی فتحوں میں راجہ کی عرقریزی کوششوں نے مؤرخوں سے افزار نامے لے لئے کہ قلعہ گیری کی تدبیروں اور اُس کے سامان و لوازمات میں جو راجہ کی عقل رسا کام کرتی ہے۔ وہ اسی کا کام ہے۔ دُوسرے کو نصیب نہیں ؎

سنہ ۹۸۰ھ میں اُسے حکم ہوا کہ گجرات جاؤ اور وہاں کے آئین مال اور جمع و خرچ کے دفتر کا بندوبست کرو۔ گئے اور چند روز میں کاغذات مرتب کر کے لائے۔ یہ خدمت حضور میں مجرا ہوئی ؎

سنہ ۹۸۱ھ میں جب کہ منعم خاں بہار کی مہم پر سپہ سالاری کر رہے تھے۔ لڑائی نے طول کھینچا۔ یہ بھی

---

[1] دیکھو میر معز الملک کا حال ؎

معلوم ہوا۔ کہ امرائے لشکر آرام طلبی یا آپس کی لاگ یا غنیم کی رعایت سے جان توڑ کر خدمت بجا نہیں لاتے راجہ ٹوڈرمل اب ایسے بااعتبار۔ مزاجدان اور محرم راز ہو گئے تھے۔ کہ انہیں چند امرائے نامی کے ساتھ فوجیں دے کر کمک کے واسطے روانہ کیا۔ تاکہ لشکر کا انتظام کریں۔ اور سست یا فتنہ گر لوگ انہیں جاسوس خدمت سمجھ کر اس طرح کام دیں۔ گویا حاضر حضور ہیں۔ غرض شہباز خاں کمبو وغیرہ امرائے نامی کو ساتھ کیا اور لشکر کے انتظام اور نگرانی کے لئے بھی چند ہدائتیں کیں۔ یہ بڑی پھرتی سے گئے۔ اور خانخاناں کے لشکر میں شامل ہوئے۔ دشمن مقابلہ پر تھا۔ میدان جنگ کی ترتیب ہوئی۔ راجہ نے تمام لشکر کی موجودات لی۔ ذرہ دیکھو! لیاقت اور کارگذاری کیا چیز ہے۔ بڑے بڈھے بہادر۔ چغتائی ترک۔ ہمایوں بلکہ بابر کے معرکے دیکھنے والے۔ اکثر دلاور سپہ سالار کہ تلواریں مار کر اس درجہ تک پہنچے۔ وہ اپنے اپنے عہدے لے کر کھڑے ہوئے۔ اور قلم کا مارنے والا متصدی گمنام کھتری اُن کی موجودات لینے لگا۔ ہاں۔ کیوں نہیں؟ جب وہ اس منصب کے لائق تھا تو اپنا مرتبہ کیوں نہ لے اور اکبر جیسا منصف بادشاہ کیوں نہ دے +

جب پٹنہ فتح ہوا تو اس مہم میں بھی اُس کی خدمتوں نے اس قدر مردانہ سفارشیں کیں۔ کہ علم اور نقارہ دلوایا۔ منعم خاں کی رفاقت سے جدا نہ ہونے دیا۔ اور بنگالہ کی مہم کے واسطے جو امرا انتخاب ہوئے۔ اُن میں پھر اُس کا نام لکھا گیا۔ کہ وہ اس مہم کی طرح رواں ہو گیا تھا چنانچہ ہر معرکہ پر مستعد اور کمربستہ پہنچا۔ اور پیش قدمی سے پہنچا مگر ٹانڈہ کی مہم میں ایسی ہمت کی کہ فتح ناموں اور تاریخوں میں منعم خاں کے ساتھ اُس کا نام لکھا گیا +

جنید کرارانی کی بغاوت کو اس نے بڑی بہادری سے دبایا۔ ایک دفعہ غنیم بے غیرتی کی خاک سر پر ڈال کر بھاگا۔ دوبارہ پھر آیا۔ اُس سے سخت دھوکا کھایا۔ بعض موقع پر کوئی سردار منعم خاں سے بگڑ گیا۔ اور کار بادشاہی میں ابتری پڑنے لگی۔ تو ٹوڈرمل نے بڑی دانائی اور ہمت و استقلال سے اُس کی اصلاح کی۔ اور چست و درست بندوبست کیا +

عیسیٰ خاں نیازی فوج لے کر آیا۔ اور قیا خاں گنگ کے مورچہ پر سخت آن بنی۔ اُس وقت اور امرا بھی پہنچے۔ مگر آفرین ہے۔ ٹوڈرمل خوب پہنچا۔ اور برمحل پہنچا +

جب کہ داؤد خاں افغان نے گوجر خاں سے موافقت کر کے عیال کو رہتاس میں چھوڑا۔ اور آپ فوج لے کر آیا۔ تو راجہ فوراً مقابلہ کو تیار ہوا۔ امرائے شاہی روز روز کی فوج کشی اور بدہوائی بنگالہ سے بیزار ہو رہے تھے۔ راجہ نے دیکھا۔ کہ میری بیم و اُمید کے منتر اثر نہیں کرتے۔ منعم خاں کو لکھا۔ وہ بھی

مذبذب تھے۔ کہ اتنے میں فرمان اکبری نہایت تاکید کے ساتھ پہنچا۔ اُسے پڑھ کر خانخاناں بھی سوار ہوئے۔ اور دو لشکر جرار لے کر غنیم کے مقابل ہوئے۔ طرفین کی فوجیں میدان میں آراستہ ہوئیں۔ لشکر بادشاہی کے قلب میں منعم خاں کے سر پہ سپہ سالاری کا نشان لہرا رہا تھا۔ گوجر خاں حریف کا ہراول اس زور شور سے حملہ کر کے آیا۔ کہ بادشاہی فوج کے ہراول کو قلب میں دھکیلتا چلا گیا۔ منعم خاں تین کوس تک برابر بھاگا گیا۔ آفرین ہے ٹوڈرمل کو کہ داہنا بازو لشکر کا تھا۔ وہ نہ فقط جما رہا بلکہ سراسیمہ فوج کے دل بڑھاتا رہا۔ اور کہتا رہا۔ کہ گھبراؤ نہیں۔ اب دیکھو فتح کی ہوا چلتی ہے۔ حریف نے خان عالم کے ساتھ خانخاناں کے مرنے کی خبر اڑا دی۔ یہ فوج کو اپنی جگہ لئے کھڑا تھا۔ فیقوں نے جب اس سے کہا تو کمال استقلال کے ساتھ بولا۔ کہ خانخاناں نہ رہا۔ تو کیا ہوا۔ ہم اکبری اقبال کی سپہ سالاری پر لڑتے ہیں۔ وہ سلامت ہے۔ دیکھو۔ اب انہیں فنا کئے دیتے ہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اور جس وقت موقع پایا داہنے سے یہ اور بائیں سے شاہم خاں جلائر اس زور شور کے ساتھ جا گرا۔ کہ غنیم کے لشکر کو تہ و بالا کر دیا۔ اتنے میں گوجر خاں کے مرنے کی خبر پہنچی اس وقت افغان بدحواس ہو کر بھاگے۔ اور لشکر شاہی فتحیاب ہوا ۔

۹۸۳ھ میں داؤد کا ایسا تنگ حال ہوا۔ کہ صلح کی التجا کی۔ لشکر بادشاہی لڑائی کے طول اور ملک کی بدہوائی کے سبب سے خود بھی تنگ ہو رہا تھا۔ داؤد کی طرف سے بڈھے بڈھے افغان خانخاناں اور امرائے لشکر کے خیموں میں پہنچے۔ اور پیغام سلام سنائے۔ خانخاناں کا آئین سپہداری ہمیشہ صلح پہ تھا۔ وہ راضی ہو گیا۔ امرا پہلے ہی جانوں سے تنگ جینے سے بیزار ہو رہے تھے۔ اُن کی مراد بر آئی۔ سب نے اتفاق رائے کیا۔ ایک ٹوڈرمل کہ ہمیشہ آرام و آسائش کو آقا کے کام اور نام پر قربان کرتا تھا راضی نہ ہوا۔ اور کہا۔ کہ دشمن کی جڑ اکھڑ چکی ہے۔ اور تھوڑی سی ہمت میں سب افغان فنا ہو جائیں گے اس کی التجاؤں اور اپنے آراموں پر نظر نہ کرو۔ دھاوے کئے جاؤ اور پیچھا نہ چھوڑو۔ خانخاناں اور امرائے لشکر نے اُسے بہت سمجھایا۔ مگر وہ اپنی رائے سے نہ ہٹا۔ اگرچہ صلح[1] ہو گئی۔ اور اُس کا دربار بڑے شکوہ و شان اور بادشاہی سامان کے ساتھ آراستہ ہوا۔ تمام لشکر نے عید منائی۔ مگر وہ بات کا پورا دربار تک بھی نہ آیا۔ خانخاناں نے ہزار جتن کئے کس کی سنتا تھا صلحنامہ پر مہر تک نہ کی جب اطراف بنگالہ کی طرف سے اطمینان ہوا۔ تو بادشاہ نے اُسے بلا بھیجا۔ جاں نثار کہ مزاج شناس تھا۔ حاضر ہوا۔ عمدہ نفائس اس ملک کے اور عجائب دیار فرنگ کے جو کہ دریائی تجارتوں سے وہاں

---

[1] دربار صلح کا تماشہ دیکھنے کے قابل ہے۔ (دیکھو حال منعم خاں خانخاناں صفحہ ۲۴۷) ؎

پہنچتے ہیں۔ حضور میں لاکر پیش کیئے۔ وہ جانتا تھا کہ میرے بادشاہ کو ہاتھی بہت پیارے ہیں۔ ۵۴ ہاتھی چن کر لایا۔ کہ نہایت عمدہ اور تمام بنگالہ میں نامی تھے۔ اس نے حضور میں تمام حقیقت ملک کی اور سرگذشت معرکوں کی تفصیل بیان کی۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ اور عالی منصب دیوانی عطا فرمایا اور چند روز میں تمام ملکی اور مالی خدمتیں اس کی رائے روشن کے حوالہ کر کے وزارت کل اور وکالت مستقل کی مسند پر جگہ دی۔ اسی سنہ میں منعم خاں مر گئے۔ فساد تو وہاں جاری ہی تھا۔ داؤد پھر باغی ہو گیا۔ اور افغان اپنی اصالت دکھلانے لگے۔ تمام بنگالہ میں بغاوت پھیل گئی۔ امرائے اکبری کا یہ عالم تھا۔ کہ لوٹ کے مال مار کر قارون ہو گئے تھے۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ جتنی دولت زیادہ ہوتی ہے۔ اتنی ہی جان عزیز ہوتی جاتی ہے۔ توپ تلوار کے منہ پر جانے کو کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ بادشاہ نے خانجہاں کو ممالک مذکور کا انتظام سپرد کیا۔ اور ٹوڈرمل کو ساتھ کیا۔ جب بہار میں پہنچا۔ چاروں طرف تدبیروں اور تحریروں کے ہراول دوڑا دئے۔ بخاری اور بارہ والے لشکری امرا گھروں کے پھرنے کو تیار رہتے تھے۔ اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ کیونکہ زبردست اور کاردان افسر کے نیچے کام دینا کچھ آسان نہیں۔ بعضوں نے خرابی آب و ہوا کا عذر کیا۔ بعضوں نے کہا۔ یہ قزلباش ہے۔ ہم اس کے ماتحت نہیں رہ سکتے۔ خاندانی تجربہ کار کو اس علم میں دستگاہ تھی۔ اس نے خاموشی اختیار کی۔ اور سخاوت اور علو حوصلہ کے ساتھ فراخ دلی دکھاتا رہا۔

اسمٰعیل قلیخاں اس کا بھائی پیشدستی کی تلوار ہاتھ میں اور پیشقدمی کی فوجیں رکاب میں لے کر چاروں طرف ترکتاز کرنے لگا۔ ٹوڈرمل کی لیاقت اور کاردانی دیکھو اور ساتھ ہی یہ دیکھو کہ اپنے آقا کا کیسا صدقدل سے خیر خواہ تھا۔ اس نے کہیں دوستانہ فہمائش سے۔ کہیں ڈرا دے سے۔ کہیں لالچ سے۔ غرض اپنی حکمت عملی سے سب کو پرچالیا۔ کہ لشکر بنے کا بنا رہا۔ اور کام جاری ہو گیا۔ وہ دونو باوفا دل چل کر بڑے حوصلے۔ صاف سینے اور کھُلے دل سے کام کرتے تھے۔ سپاہی کے دل اور سپاہ کی قوت بڑھاتے تھے۔ پھر کسی بدنیت کی یاوہ گوئی کیا چل سکتی تھی۔ لیکن جابجا لڑائیاں صف آرائی کے ساتھ ہوتی تھیں اور کامیابی پر ختم ہوتی تھیں۔ راجہ کبھی داہنے پر ہوتا تھا۔ کبھی بائیں پر اور اس دلاوری سے عین موقع پر اور بڑھ کر کام دیتا تھا۔ کہ سارے لشکر کو سنبھال لیتا تھا۔ غرض بنگالہ کا بگڑا ہوا کام پھر بنا لیا۔

معرکہ کا میدان اخیر حملہ داؤد کا تھا۔ کہ شیر شاہی اور سلیم شاہی عہد کی کُھرچن اور پرانے پُرانے پٹھانوں کو سمیٹ کر نکالا۔ اور عین برسات کے موسم میں گھٹا کی طرح پہاڑ سے اٹھا۔ یہ چڑھائی اس

دھوم دھام کی تھی۔ کہ اکبر نے خود آگرہ سے سواری کا سامان کیا۔ یہاں جنگ سلطانی کا کھیت پڑا تھا۔ دونو لشکر قلعہ باندھ کر سامنے ہوتے۔ خانجہاں قلب میں اور ٹوڈرمل بائیں پر تھا اور بہادر بھی دونو طرف کے اس ہمت سے لڑے۔ کہ دلوں کے ارمان نکل گئے۔ فتح و شکست خدا کے ہاتھ ہے۔ اکبر اور اکبر کے امرا کی نیت کام کر گئی۔ داؤد گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ وہ حسرتناک حالت بھی دیکھنے کے قابل ہے۔[1] اس کے خاتمہ سے لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور قوم افغان کی بنگالہ اور بہار سے جڑ اکھڑ گئی ٹوڈرمل نے دربار میں حاضر ہو کر ۳۰۴ ہاتھی نذر گزرانے کہ اکبر کے لئے یہی اُس ملک کا بڑا تحفہ تھا۔ مہم کے فتح نامے خانجہاں اور راجہ ٹوڈرمل کے نام سے گلگوں ہوئے *

اسی عرصہ میں معلوم ہوا۔ کہ وزیر خاں کی بے تدبیری سے گجرات اور سرحد دکن کا حال تباہ ہے حکم ہوا کہ معتمد الدولہ راجہ ٹوڈرمل جلد پہنچے۔ اس نے اول سلطان پور ملک ندربار کے علاقہ میں دورہ کیا۔ اور دفتر کو دیکھا۔ وہاں سے بندر سورت میں آیا۔ ادھر سے بھڑوچ۔ بڑودہ۔ چانپانیر ہوتا ہوا گجرات سے ہو کر پٹن کے دفتر مالیات کے دیکھنے کو گیا تھا۔ کہ مرزا کامران کی بیٹی جو ابراہیم مرزا کی بی بی تھی۔ اپنے بیٹے کو لے کر آئی۔ اور گجرات کے علاقہ میں فساد برپا کیا۔ اس کے ساتھ اور باغی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ملک میں غدر ہو گیا۔ وزیر خاں نے سامان جنگ اور قلعہ و فصیل کے ٹوٹے پھوٹے کا بندوبست کیا اور بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ ساتھ ہی قاصد دوڑائے۔ کہ بھاگا بھاگ ٹوڈرمل کو خبر کریں۔ گوشت تو پھنس ہو گیا۔ دال کو آفرین ہے کہ خوب اُبال کھایا۔ وہ جس ہاتھ میں قلم پکڑے لکھ رہا تھا اُسی میں تلوار پکڑ کر چلا۔ گجرات میں آیا۔ وزیر خاں کو مرد بنا کر شہر سے باہر نکالا۔ مفسد بڑودہ پر قابض تھے۔ باگیں اُٹھائے پہنچے۔ چار کوس بڑودہ رہا تھا۔ جو باغیوں کے قدم اُکھڑ گئے اور سب بھاگ نکلے۔ یہ آگے تھے۔ اور وہ پیچھے۔ کنبایت سے جوناگڈھ ہوتے ہوئے دولقہ کے تنگ میدان میں جا کر رُکے اور ناچار ہو کر مقابلہ کیا *

دونو فوجیں جم گئیں۔ اور وزیر خاں قلب میں قائم ہوئے۔ چاروں پرے چاروں طرف آراستہ۔ جن میں راجہ بائیں پر۔ غنیم نے صلاح کی تھی۔ کہ صفیں باندھتے ہی زور شور سے لڑائی ڈال دو۔ کچھ سامنے ہو اور باقی دفعتہً بھاگ نکلو۔ اکبری بہادر ضرور تعاقب کرینگے۔ راجہ ہی آگے ہوگا۔ موقع پا کر دفعتہً پلٹ پڑو۔ پھر دونو کو گھیر کر وزیر خاں اور راجہ کو مار لو۔ کہ کام تمام ہے اور حقیقت میں انہیں بڑا خیال راجہ ہی کا تھا۔ غرض جب لڑائی شروع ہوئی۔ تو مرزا فریلی چال سے وزیر خاں پر آئے۔ اور مہر علی کولابی

---

[1] دیکھو حال خانجہاں صفحہ ۷۱۰ *

کہ اصل بانی فساد تھا۔ راجہ پر آیا۔ راجہ سدِّ سکندر تھا۔ وہ اس سے ٹکر کھا کر پیچھے ہٹا۔ بادشاہی لشکر کا داہنا ہاتھ بھاگا۔ اور قلب نے بھی بے ہمتی کی۔ ہاں وزیر خاں بہت سے بہادروں کے ساتھ خوب ڈٹا۔ اور قریب تھا۔ کہ ننگ و ناموس کی جان قربان کر دے۔ کہ راجہ نے دیکھا۔ اور اس سینے کے جوش سے جس میں ہزار دل کا جوش بھرا تھا۔ گھوڑے اٹھائے۔ غنیم کی فوج کو الٹتا پلٹتا پہنچا۔ اور اس زور سے آ کر گرا۔ کہ حریف کے بندوبست کا سب تانا بانا ٹوٹ گیا۔

کامران کے بیٹے نے کام کیا تھا۔ عورتوں کو مردانہ کپڑے پہنا کر گھوڑوں پر چڑھایا تھا۔ خوب تیراندازی اور نیزہ بازی کرتی تھیں۔ غرض بہت سے کشت و خون کے بعد غنیم بھاگ گئے اور غنیمت بہت سی چھوڑ گئے۔ باغی بھی بہت گرفتار ہو گئے ٹوڈرمل نے لوٹ کے اسباب اور ہاتھی اور قیدیوں کو جوں کا توں وہی لباس اور وہی تیر و کمان ہاتھ میں لے کر روانہ دربار کر دیا۔ کہ زنانی مردانگی کا نمونہ بھی حضور دیکھ لیں۔ دھارا اس کے رشید بیٹے نے انہیں دربار میں لا کر پیش کیا۔

۹۸۷ھ میں بنگالہ سے پھر زور شور کا غبار اٹھا۔ اس دفعہ آندھی کا رنگ اور تھا۔ یعنی خود امرائے شاہی میں بگاڑ تھا۔ سپاہ اور سرداران سپاہ سپہ سالار سے باغی ہو گئے تھے۔ اور تعجب یہ کہ سب کے سب ترک اور مغل تھے۔ اکبر نے ٹوڈرمل کو روانہ کیا۔ اور دیکھو! جو اکثر سردار اس کے ماتحت تھے وہ بھی راجگان ہندوستان ہی تھے۔ کیونکہ جانتا تھا۔ سب بھائی بند ہیں۔ مل جائینگے۔ لیکن ٹوڈرمل کیلئے یہ نہایت نازک موقع تھا۔ کیونکہ مقابل میں اگرچہ باغی تھے۔ لیکن خاندان چغتائی کے قدیمی نمک خوار تھے۔ اپنی ہی تلواروں سے اپنے ہاتھ پاؤں کٹتے تھے۔ اس پر مشکل یہ کہ وہ مسلمان اور یہ ہندو۔ مگر لیاقت والے نے مہم کو بڑے تحمل اور سوچ سمجھ کے ساتھ انجام دیا۔ تدبیر اور شمشیر کے عمدہ جوہر دکھائے۔ اور بڑی جانبازی اور جانکاہی سے خدمتیں بجالایا۔ جن کو کھینچ سکا۔ ان کو حکمت عملی سے کھینچا۔ جو بالکل نمک حرام تھے۔ وہ تلوار یا اپنے اعمال کے حوالہ ہوئے۔ جابجا بھاگتے پھرتے تھے۔ نمک حلال جاں نثار ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ لیکن کیا ادھر کیا ادھر خلق خدا اور بندگان بادشاہی تباہ ہوتے تھے۔

اس مہم میں بعض منافق بداندیشوں نے سازش کی تھی۔ کہ لشکر کی موجودات کے وقت راجہ کا کام تمام کر دیں۔ بلوہ کا خون ہوگا۔ کون جانیگا؟ اور کون پہچانیگا؟ راجہ بڑے سیانے تھے۔ ایسے ڈھب سے الگ ہو گئے۔ کہ اپنی جان بچ گئی۔ اور بداندیشوں کا پردہ رہ گیا۔

اس مہم میں اس نے منگیر کے گرد فصیل اور دمدمہ وغیرہ بنا کر جنگی اور عالیشان قلعہ کھڑا کر دیا۔

۹۷۹ھ میں سب جھگڑے چکا کر پھر دربار میں آیا۔ اور اپنے عہدۂ وزارت کی مستقل مسند پر بیٹھا۔ دیوان کل ہو گیا۔ اور ۲۲ صوبۂ ہندوستان پر اُس کا قلم دوڑنے لگا ۔

۹۹۰ھ میں اُس نے بادشاہ کا جشن ضیافت اپنے گھر میں سرانجام دیا۔ اکبر بادشاہ بندہ نواز وفاداروں کا کارساز تھا۔ اس کے گھر گیا۔ ٹوڈرمل کی عزت ایک سے ہزار ہو گئی۔ اور ہزار ہا وفاداروں کے حوصلے بڑھ گئے ۔

۹۹۳ھ میں اسے ۴ ہزاری منصب عطا ہُوا ۔

اسی سنہ میں کوہستانی یوسف زئی و سواد وغیرہ کی مہم ہو گئی۔ بیربر[1] مارے گئے۔ بادشاہ کو نہایت رنج ہُوا۔ دوسرے دن انہیں روانہ کیا۔ مان سنگھ جمرود کے مقام میں تھے۔ اور تاریکیوں کے ہجوم میں تلوار سے روشنی کر رہے تھے۔ حکم پہنچا کہ راجہ سے جا کر ملو۔ اور اس کی صلاح سے کام کرو۔ راجہ نے کوہ لنگر کے پاس سواد کے پہلو میں چھاؤنی ڈال دی۔ اور فوجوں کو پھیلا دیا۔ راہزنوں کی حقیقت کیا ہے۔ مارے گئے۔ باندھے گئے۔ بھاگ گئے۔ یہ سرکشوں کی گردنیں توڑ کر سربلند اور سرفراز واپس آئے۔ باقی سرحد کا معاملہ کنور مان سنگھ کے ذمہ رہا ۔

۹۹۶ھ میں قلیچ خاں نے گجرات سے آ کر عجائب و غرائب پیشکش حضور میں گزرانے حکم ہُوا۔ کہ ٹوڈرمل کے ساتھ دیوان خانہ میں مہمات ملکی و مالی سرانجام دیا کرو (ملا صاحب لکھتے ہیں) ٹوڈرمل ستر اہتر اور حواس ہو گیا ہے۔ کوئی حریف رات کو آن لاگا۔ تلوار ماری تھی۔ پوست مال گزر گئی۔ شیخ ابوالفضل اس ماجرے کی حقیقت خوب لکھتے ہیں۔ امرائے نیک طینت پر گمان تھا۔ کہ عداوت مذہب سے کسی نے یہ حرکت کی ہو گی۔ تحقیقات سے معلوم ہُوا۔ کہ راجہ نے کسی کھتری بچّہ کو بداعمالی کی سزا دی تھی۔ اُس کی آنکھوں پر غصہ نے اندھیری چڑھائی۔ چاندنی رات تھی۔ وہ سیہ دل گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جب راجہ آیا۔ موقع پایا کام کر گیا۔ آخر وہ بھی اور اُس کے شریک بھی معلوم ہو گئے۔ ایک ایک نے سزا پائی ۔

۹۹۷ھ میں بادشاہ کشمیر کو چلے۔ آئین تھا کہ یورش کے موقع پر دو امیر جلیل القدر دارالسلطنت میں رہا کرتے تھے۔ لاہور کا انتظام راجہ بھگوان داس کے سپرد ہُوا اور راجہ ٹوڈرمل کو بھی یہیں چھوڑا۔ اوّل تو سو مرضوں کا ایک مرض اُن کا بڑھاپا۔ اس پر کچھ بیمار بھی ہوئے۔ بادشاہ کو عرضی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا۔ بیماری نے بڑھاپے سے سازش کر کے زندگی پر حملہ کیا ہے۔ اور غالب آ گئی ہے۔

---

[1] دیکھو بیربر کا حال صفحہ ۳۰۶ ۔

موت کا زمانہ قریب نظر آتا ہے۔ اجازت ہو۔ تو سب سے ہاتھ اُٹھا کر گنگا جی کے کنارے جا بیٹھوں۔ اور خدا کی یاد میں آخری سانس نکال دوں ؛

بادشاہ نے اوّل ان کی خوشی کے لئے فرمان اجازت بھیج دیا تھا۔ کہ وہاں افسردہ طبیعت شگفتگی پر آ جائیگی۔ مگر دوسرا فرمان پھر پہنچا۔ کہ کوئی خدا پرستی عاجز بندوں کی غمخواری کو نہیں پہنچتی۔ بہت بہتر ہے کہ اس ارادہ سے رُک جاؤ۔ اور اخیر دم تک انہیں کے کام میں رہو اور اسے آخرت کا سفر خرچ سمجھو۔ پہلے فرمان کی اجازت پر تن بیمار اور جان تندرست کو لے کر ہردوار چلے تھے۔ لاہور کے پاس اپنے ہی بنوائے ہوئے تالاب پر ڈیرا تھا۔ جو دوسرا فرمان پہنچا کہ چلے آؤ ؛

(شیخ ابوالفضل اس حال کی تحریر میں کیا خوب سرٹیفکیٹ دیتے ہیں) وہ نافرمانی بادشاہی کو نافرمانی الٰہی سمجھا۔ اس لئے جب فرمان وہاں پہنچا۔ فرمانبرداری کی۔ اور گیارھویں دن یہاں کے پالے ہوئے جسم کو یہیں رخصت کر گیا۔ راستی۔ درستی۔ مردانگی۔ معاملہ شناسی اور ہندوستان کی سرداری میں یگانۂ روزگار تھا۔ اگر تعصب کی غلامی۔ تقلید کی دوستی۔ دل کی کینہ وری اور بات کی پچ نہ رکھتا تو بزرگانِ معنوی میں سے ہوتا۔ اس موت سے کارسازی بے غرض کو چشم زخم پہنچی۔ اور معاملات کی حق گذاری کے بازار میں وہ گرمی نہ رہی۔ مانا کہ بادیانت آدمی (جو ہم آشیانۂ عنقا) ہے ہاتھ آ جائے۔ لیکن یہ اعتبار کہاں سے لائے ؛

ٹوڈرمل کی عمر کا حال کسی نے نہیں کھولا۔ مُلّا صاحب نے جو حالت بیان کی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ عمر سے بھی برکت پائی تھی۔ حضرت تو سب پر خفا ہی رہتے ہیں۔ ابھی شاہ فتح اللہ اور حکیم ابوالفتح پر غصے ہوئے تھے۔ یہ بیچارہ تو ہندو تھا۔ اس پر جتنا جھنجلائیں۔ تھوڑا ہے۔ فرماتے ہیں۔ راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوان داس امیر الامرا کہ لاہور میں رہتے تھے۔ جہنم اور دوزخ کے ٹھکانوں کو بھاگے اور تہ در تہ کے درجوں میں جا کر سانپ بچھوؤں کے واسطے سامان حیات ہوئے سقرھما اللہ ایک مصرع سے دونوں کی تاریخ روشن کی ہے۔ ع

گفتا ٹوڈر و بھگوان مُردند

اس سے بھی دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ پھر فرماتے ہیں ؎

ٹوڈرمل آنکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم	چوں رفت سوئے دوزخ خلقے شدند خرّم
تاریخ رفتنش را از پیر عقل جُستم	خوش گفت پیر دانا وے رفت در جہنم

اکبر کو جتنا اس کی عقل و تدبیر پر اعتبار تھا۔ اس سے زیادہ دیانت و امانت نمک حلالی وفا شعاری

پر بھروسا تھا جب وہ پٹنہ کی مہم پر جان نثاری کر رہا تھا۔ تو دفتر کا کام رائے رام داس کے سپرد ہُوا۔ کہ وہ بھی کاردانی۔ سلامت نفسی اور نیک نیتی کے ساتھ عمدہ اہلکار تھا۔ اُسے دیوانی کا خلعت بھی عطا ہُوا۔ مگر حکم ہُوا۔ کہ طلب تنخواہ کے کاغذ راجہ کے محرر و منشی اپنے ہی پاس رکھیں ۔

اس کے سبب سے اُس کے رشتہ داروں کی کارگذاری بھی درجۂ اعتبار کو پہنچتی تھی۔ چنانچہ بنگ بہار کی مہم میں نواڑوں اور کشتیوں کا انتظام پرمانند کے سپرد ہُوا۔ کہ راجہ کے خویشوں میں سے تھا۔ یہ بات بآواز بلند تعریف کے قابل ہے۔ کہ باوجود ایسی لیاقت جانفشانی۔ اور جاں نثاری کے خود اپنے تئیں بلند کرنا نہ چاہتا تھا۔ دیکھو کئی لڑائیوں میں اُسے خود سپہ سالاری کا موقع پیش آیا۔ مگر وہ کبھی قلب میں کہ سپہ سالار کی جگہ ہے۔ قائم نہ ہُوا۔ اُس کے کاروبار سے معلوم ہوتا ہے کہ آقا کے حکم پر محو ہو کر بلکہ اپنے حال اور خیال سے بے خبر ہو کر کام کا سرانجام کرتا تھا تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ ہر مہم میں کیسا بروقت پہنچتا تھا۔ اور ہر معرکہ میں جان توڑ کر فتح کو قوت دیتا تھا۔ بنگالہ کی مہم میں ہمیشہ سردار سے سپاہی تک بے دل ہو کر بھاگنے کو تیار ہوتے تھے۔ وہ کہیں دلداری سے اور کہیں غمخواری سے۔ کہیں بیم و امید سے مقدمۂ مطلب منقوش خاطر کر کے سب کو روکے رکھتا تھا ۔

حسین قلیخاں خانجہاں کی سپہ سالاری پر جب ترک سوار بگڑے۔ تو مہم بھی بگڑ گئی تھی۔ غیر کا بڑھنا اور اپنے پیچھے ہٹنا کسے پسند آتا ہے۔ کیا اُس کا دل نہ چاہتا تھا۔ کہ میں سپہ سالار کہلاؤں لیکن آقا کی خوشی پر نظر رکھی۔ اور ایسا کچھ لیا۔ کہ سب سردار خانجہاں کی اطاعت پر راضی ہو گئے ۔

اس کی علمی لیاقت کا اندازہ صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے دفتر کی تحریروں کو بخوبی لکھ پڑھ لیتا تھا۔ مگر طبیعت ایسی قواعد بند اور اصول تراش لایا تھا جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مالیات کے کام کو ایسا جانچتا تھا۔ اور اُس کے نتیجوں کو ایسا پہچانتا تھا۔ کہ جو اس کا حق ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے اور دوبارہ لکھتا ہوں۔ کہ اس سے پہلے حساب کا دفتر بالکل برہم تھا۔ جہاں ہندو نوکر تھے۔ وہاں ہندی کاغذوں میں کام چلتا۔ جہاں ولایتی تھے۔ وہ فارسی میں کاغذ رکھتے تھے۔ ٹوڈرمل۔ فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ نظام الدین بخشی وغیرہ نے بیٹھ کر قواعد باندھے اور سب دفتروں میں انہیں کے بموجب کام جاری ہُوا۔ خواجہ شاہ منصور اور مظفر خاں نے دفتر کے انتظام میں بڑے بڑے کام کئے۔ مگر اُس نے سب پر پانی پھیر دیا۔ اور شہرت کے میدان میں اُن سے آگے نکل گیا۔ بہت سے نقشے اور فردوں کے نمونے آئین اکبری میں درج ہیں۔ اسی کی اصطلاحیں اور الفاظ ہیں۔ کہ آج تک مالگذاری اور حساب کے کاغذات میں چلے آتے ہیں ۔

سکندر لودی کے زمانہ تک دھرم دان ہندو فارسی یا عربی نہ پڑھتے تھے۔ اس کا نام ملکش بدھیا رکھا تھا۔ راجہ نے تجویز کیا تھا۔ کہ کل قلمرو ہندوستان میں یک قلم دفتر فارسی ہو جائیں نتیجہ اس کا یہ تھا۔ کہ جو ہندو اہل قلم۔ اہل تجارت اور صاحب زراعت ہوں انہیں ضرور فارسی پڑھنی چاہئے۔ اس سے ہندوؤں میں اضطراب پیدا ہوا اور چند روز مشکلیں بھی پیش آئیں لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی اُسی نے خاص و عام میں پھیلایا۔ کہ بادشاہ وقت کی زبان رزق کی کنجی اور دربار بادشاہی کی دلیل ہے۔ اِدھر بادشاہ بھی اکبر بادشاہ تھا جس نے محبت کا جال پھینک کر دلوں کو مچھلیوں کی طرح پھانس لیا تھا۔ یہ بات بہت جلد سب کی سمجھ میں آگئی۔ چند سال کے عرصے میں بہت سے ہندو فارسی خواں۔ فارسی داں ہو گئے۔ اور دفتروں میں اہل ولایت کے پہلو دبا کر بیٹھنے لگے۔ اُس کی حکمت عملی کو دیکھو۔ کس خوبی سے قوم کے مالی اور ملکی منصوبوں کیلئے شاہراہ کھولی ہے۔ بلکہ حق پوچھو۔ تو فارسی عربی الفاظ کو اُسی وقت سے ہندوؤں کی زبانوں میں بلکہ گھروں میں رستہ مل گیا۔ اور یہیں سے اُردو کی بنیاد ریختہ سے استوار ہوئی ۔

سنہ ۹۹۰ھ میں سونے سے تانبے تک کل سکوں میں اصلاحیں ہوئیں۔ راجہ کی تجویز اس اصلاح کا جزو اعظم ہے ۔

اُس میں بڑا وصف یہ تھا۔ کہ تجویز و تدبیر میں مصلحت کے کسی پہلو کو جانے نہ دیتا تھا۔ اوّل اوّل دیوانِ عالی دماغ شاہ منصور تمام دفاتر سلطنت کو اپنے قلم کی نوک سے دبائے ہوئے تھے دیوان مستوفی وزیر۔ جو کچھ سمجھو وہی تھے۔ ساتھ اُس کے کاغذات حساب کے کیڑے تھے۔ اور کفایت شعاری کے تالاب میں بگلا۔ مگر سپاہی اور ملازم کا جونک کی طرح لہو پی جاتے تھے۔ سنہ ۹۸۸ھ میں انہوں نے نئی کاروائی خرچ کی۔ اور فوج کی تنخواہ کے چند آئین باندھے۔ راجہ نے ایک مفصل عرضداشت لکھی۔ اس میں حساب کتاب دفتر کے قواعد لکھے تھے۔ اور مصلحت وقت کے نشیب و فراز دکھا کر سپاہی کی رعایت کو مقدم رکھا تھا۔ اکبر خود فرقہ سپاہی کے مائی باپ تھے۔ چنانچہ خواجہ سے یہ کام لے لیا۔ اور اُن کی خدمت شاہ قلی محرم کو اور وزارت وزیر خاں کو مل گئی۔ ایسی ہی خیر خواہیاں تھیں جن سے شاہ کا وہ حال[1] ہوا۔ اور یہی مصلحت کے پہلو تھے۔ جن کی رعایتوں سے ان کے کلام کو سپاہ کے دلوں میں وہ راہ تھی۔ کہ بنگالہ کے معرکوں میں کامیابی حاصل کی ۔

اُس نے حساب میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ اُس کے گُر یاد کر کے بنئے اور مہاجن دکانوں پر اور

---

[1] دیکھو شاہ کا حال صفحہ ۲۲۳ ۔

دیسی محاسب گھر اور دفتر کے کاروبار میں طلسمات کرتے ہیں۔ اور مدرسوں کے ریاضی داں منہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں ۔

کشمیر اور لاہور کے کہن سال لوگوں میں کتاب **خازن اسرار** اس کے نام سے مشہور ہے مگر کمیاب ہے۔ میں نے بڑی کوشش سے کشمیر میں جاکر پائی۔ لیکن دیباچہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ۱۰۰۵ھ کی تصنیف ہے۔ حالانکہ خود ۹۹۸ھ میں مرگیا۔ شاید اس کی یادداشت کی کتاب پر کسی نے دیباچہ لگا دیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں دھرم۔ گیان۔ اشنان۔ پوجا پاٹ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے میں کاروبار دنیاوی۔ دونوں میں چھوٹے چھوٹے بہت باب ہیں۔ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا بیان ہے۔ مگر سب کچھ ہے۔ چنانچہ دوسرے حصہ میں علم الاخلاق تدبیر المنزل کے علاوہ اختیار ساعات موسیقی۔ سروده۔ شگون آواز طیور۔ پرواز طیور وغیرہ تک بھی لکھے ہیں کتاب مذکور سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کا پکا اور خیالات کا پورا تھا ہمیشہ گیان دھیان میں رہتا تھا۔ اور پوجا پاٹ مذہبی لوازمات حرف بحرف ادا کرتا تھا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں بے قیدی و آزادی کی فصل بہار پر تھی۔ اس لئے ان خصائل کے ساتھ انگشت نما تھا۔ کہاں ہیں۔ وہ لوگ ؟ جو کہتے ہیں کہ نوکر وفادار جبھی ہوتا ہے۔ جب اس کے خیالات اور حالات بلکہ مذہب اور اعتقاد بھی آقا کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ وہ آئیں۔ اور ٹوڈرمل کے حالات سے سبق پڑھیں۔ کہ سچے مذہب والے وہی لوگ ہیں۔ جو اپنے آقا کی خدمت صدق و یقین سے بجا لائیں۔ بلکہ جتنا صدق و یقین مذہب میں زیادہ ہوگا۔ اتنی ہی وفاداری اور جاں نثاری زیادہ صدق و یقین کے ساتھ ہوگی۔ اچھا اس کی نیت کا پھل بھی دیکھ لو۔ اکبری دربار میں کونسا امیر ذی رتبہ تھا۔ جن سے وہ ایک قدم پیچھے یا فیض انعام میں نیچے رہا ۔

جمدیات مذہبی اور اس کے رسوم و قیود کی پابندی بعض موقع پر انہیں تنگ کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ بادشاہ اجمیر سے پنجاب کو آتے تھے۔ سفر کا عالم۔ ایک دن کوچ کی گھبراہٹ میں ٹھاکروں کا آسن کہیں رہ گیا۔ یا وزیر سلطنت کا تھیلہ سمجھ کر کسی نے چرا لیا۔ راجہ کا قاعدہ تھا۔ کہ جب تک پوجا نہ کر لیتے تھے۔ کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اور کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ کئی وقت کا فاقہ ہو گیا۔ اکبری لشکر میں ڈیرے ڈیرے چرچا ہو گیا۔ کہ راجہ کے ٹھاکر چوری گئے۔ وہاں عالم مسخرے۔ فاضل شہدے۔ بیربر جیسے کئی پنڈت اور بدھیادان موجود تھے۔ خدا جانے کیا کیا لطیفے چھانٹے ہوں گے ۔ بادشاہ نے بلا کر کہا کہ ٹھاکر چوری گئے۔ ان داتا تمہارا ایشور ہے۔ وہ تو نہیں چوری گیا ؟ اشنان

کر کے اُسے یاد کرو - اور کھانا کھاؤ - خودکشی کسی مذہب میں ثواب نہیں - راجہ نے بھی اپنے خیال سے رجوع کی - آزاد - کہنے والے کچھ ہی کہیں - لیکن میں اُس کے استقلال پر ہزار تعریفوں کے پھول چڑھاؤنگا - بیربر کی طرح دربار کی ہوا میں آکر اپنا دین تو نہیں گنوایا - البتہ دین الٰہی اکبر شاہی کے خلیفہ نہ ہوئے - خیر وہ خلافت انہی کو مبارک ہو ؛

شیخ ابوالفضل نے جو فقرے اس کی عادات اور اخلاق کے بارے میں لکھے ہیں - اُن کے باب میں آزاد کو کچھ لکھنا واجب ہے - وہ فرماتے ہیں - اگر تعصب کی پرستاری - تقلید کی محبت - اور کینہ کشی نہ ہوتی - اَور اپنی بات پر مغرور ہو کر نہ اڑتا - تو بزرگان معنوی میں سے ہوتا ؛

عوام الناس ضرور کہینگے - کہ شیخ لامذہب تھے - جس کو پابند مذہب اور بزرگوں کی لکیر پر چلتا دیکھتے تھے - اُس کی خاک اُڑاتے تھے - آزاد کہتا ہے - کہ یہ سب درست ہے لیکن ابوالفضل بھی آخر ایک شخص تھے - اسی جگہ نہیں - کئی جگہ راجہ کے حق میں ایسے ہی فقرے تراشے ہیں - کچھ نہ کچھ ضرور ان قباحتوں کے ضرر لوگوں کو پہنچے ہونگے - جب راجہ بنگالہ کی مہم سر کر کے آئے - ۵۰۰ ہاتھی اور نفائس گراں بہا پیش کش گزرانے - وہاں بھی لکھتے ہیں - بادشاہ نے مقدمات مالی و ملکی اسا کے فہم درست پر حوالہ کر کے دیوان کل ہندوستان کا مقرر فرمایا - وہ راستی اور کم طمعی میں عمدہ خدمتگزار تھا - بے لالچ کاروبار کرتا تھا - کاش کینہ کش اور انتقامی نہ ہوتا - کہ طبیعت کے کھیت میں ملامت پھوٹ نکلتی - یہ بھی سہی - تعصب مذہبی چہرہ پر رنگ نہ پھیرتا - تو اتنا قابل ملامت نہ ہوتا - باوجود اس کے عام اہل زمانہ کو دیکھ کر کہنا چاہئے - کہ بیدلی اور بے طمعی کے ساتھ - عرق ریزی کار دان - قدردان خدمت گزار تھا - اور کم نظیر نہیں - بے نظیر تھا - دیکھئے کیا سرٹیفکیٹ دیا ہے - اب اس ۵ فقرہ کی عبارت کو پھر پڑھو اور غور سے دیکھو ؛

پہلا اور دوسرا فقرہ اس کی قوم کے لئے فخر کی سند ہے - تیسرے فقرہ پر بھی خفا نہ ہونا چاہئے - کیونکہ وہ آخر انسان تھا - اور ایسے عالیشان رتبہ پر کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے معاملات اُس سے ٹکر کھاتے تھے - اور بار بار ٹکر کھاتے تھے - ایک دفعہ کوئی ٹلے نکلتا ہوگا - تو یہ دوسرے موقع پر کسر نکالتا ہوگا - اور چونکہ ضابطہ دفتر اور کفایت بادشاہی پر بنیاد عمل تھی - اس لئے حضور میں بھی اُسی کی بات سرسبز ہوتی ہوگی - میرے دوستو! دُنیا نازک مقام ہے - اگر دشمن سے بچاؤ نہ رکھتا - تو زندگی کیونکر ہوتی - اور گزارہ کہاں کرتا - چوتھے فقرہ پر بھی چڑنا نہ چاہئے - کیونکہ وہ دیوان تھا - امرائے عالیشان سے غریب سپاہی تک اور صاحبان ملک سے لے کر ادنیٰ معافی دار تک سب کا

حساب کتاب اُسے کرنا پڑتا تھا۔ وہ واجب الطلب میں کسی کی رعایت کرنیوالا نہ تھا۔ اور باخبر اہلکار تھا۔ دُنیا میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک اپنی کفایت اور اپنا فائدہ چاہتے ہیں۔ اور ایک ایک رقم مندرجہ دفتر پر ضرور گرفت کرتا ہوگا۔ لوگ حجتیں کرتے ہونگے۔ حساب کا معاملہ تھا کسی کی پیش بھی نہ جاتی ہوگی۔ سفارشیں بھی آتی ہونگی۔ وہ سُنتا نہ ہوگا۔ دربار تک بھی نوبتیں پہنچتی ہونگی اور راجہ کاٹ ہی لیتا ہوگا۔ اکبر رحیم و کریم بادشاہ تھا۔ مگر آئین سلطنت اور ضوابط دفتر کو توڑنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اِس لئے کہیں کہیں وہ بھی دق ہوتا ہوگا۔ سب ناراض ہوتے ہونگے۔ یہی بنیاد ہے۔ اُن اشعار کی جو مُلّا صاحب نے لکھے اور انہی باتوں سے جل کر موزوں طبعوں نے اس کا سجع کہا تھا ؎

آنکہ شد کارِ ہند ازو مختل	راجۂ راجہاست ٹوڈرمل

باوجود ان سب باتوں کے جو کچھ کرتا تھا۔ اپنے آقا کی خیر خواہی سمجھ کر کرتا تھا۔ اور خزانہ شاہی میں داخل کرتا تھا۔ اگر خود بیچ میں کتر لیتا۔ تو گنہگار۔ اور وہ کترتا تو لوگ کب چھوڑتے۔ اسی بیچارے کو کتر ڈالتے۔ یہی سبب ہے۔ کہ اُس کی راستی اور دُرستی کو ہر شخص برابر مانتا ہے ؛

البتہ ایک بات کا مجھے بھی افسوس ہے۔ بعض مؤرخ لکھتے ہیں۔ کہ شاہ منصور کے قتل کی جو سازشیں ہوئی تھیں۔ اُن میں کرم اللہ (شہباز خاں کمبو کے بھائی) نے بھی کچھ خطوط پیش کئے۔ وہ بھی جعلی تھے۔ اور یہ راجہ کی کارسازی تھی۔ اُس وقت کوئی نہ سمجھا۔ پیچھے راز کھلا۔ خیر راجہ کی اور اُن کی کاغذی حجتیں تھیں۔ دونو اہلکار تھے۔ خدا جانے طرفین سے کیا کیا وار چلتے ہونگے۔ اُس وقت اُن کا نہ چلا۔ ان کا چل گیا ؛

بٹالوی صاحب خلاصۃ التواریخ سے تعجب ہے۔ کہ ملک پنجاب میں بیٹھ کر کتاب لکھی اور شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ پایا۔ انہوں نے بھی ٹوڈرمل کی اصل نسل اور عمر اور سنہ ولادت کی توضیح نہیں لکھی۔ البتہ اُس کے اوصاف میں ایک بڑا ورق تحریر کیا۔ جو تقریباً راستی اور اصلیت کے الفاظ سے مرصّع ہے۔ اس میں کہتے ہیں۔ راز دانِ سلطنت تھا۔ دقائق سیاق اور حقائق حساب میں بےنظیر تھا۔ محاسبوں کے کاروبار میں باریکیاں نکالتا تھا۔ ضوابط و قوانین وزارت۔ آئین سلطنت۔ ملک کی معموری رعیت کی آبادی۔ دفتر دیوان کے دستور العمل۔ حقوق بادشاہی کے اصول۔ افزونی خزانہ۔ رستوں کی امنیت۔ مواجب سپاہ۔ شرح دامی پرگنات۔ تنخواہ جاگیر۔ مناصب امرا کے قواعد۔ سب کچھ اس کی یادگار ہیں۔ اور سب جگہ انہیں قواعد و ضوابط پر عمل درآمد ہے ؛

(۱) جمع دہ بدہی پرگنہ وار اُس نے باندھی (۲) طنابی جریب خشکی اور تری میں گھٹ بڑھ جاتی

ہے اور ۵۵ گز کی تھی۔ اُس نے ۶۰ گز کی جریب بانس یا نرسل کی قرار دی اور لوہے کی کڑیاں بیچ میں ڈالیں۔ کہ کبھی فرق نہ پڑے (۳)، اُس کی تجویز سے سنہ ۹۸۲ھ میں کل ممالک محروسہ بارہ صوبوں میں منقسم ہوئے اور دہ سالہ بندوبست ہو گیا۔ چند گاؤں کا پرگنہ۔ چند پرگنوں کی سرکار، چند سرکار کا ایک صوبہ قرار دیا۔ (۴)، روپیہ کے چالیس دام[2] ٹھہرائے۔ پرگنہ کی شرح دامی دفتر میں مندرج ہوئی (۵)، کروڑ دام پر ایک عامل مقرر کر کے کروڑی نام رکھا (۶)، امرا کے ماتحت نوکر ہوتے تھے۔ اُن کے گھوڑوں کیلئے داغ کا آئین مقرر کیا۔ کہ ایک جگہ کا گھوڑا دو دو تین تین جگہ دکھا دیتے تھے۔ عین وقت پر کمی سے بڑا ہرج پڑتا تھا۔ اس میں کبھی تو سواروں کی دغابازی ہوتی تھی۔ کبھی امرا خود بھی دغا دیتے تھے۔ کہ جب موجودات ہوتی تو فوراً سوار سپاہی نوکر رکھ لئے اور لفافہ چڑھا کر موجودات دلوائی۔ ادھر سے رخصت ہوئے۔ اُدھر جا کر موقوف (۷)، بندہائے بادشاہی کی سات ٹولیاں باندھیں ہفتہ کے سات دن کے بموجب ہر ٹولی میں سے باری باری آدمی لئے جاتے تھے۔ اور چوکی میں حاضر ہوتے تھے (۸)، روز کے واسطے ایک ایک آدمی چوکی نویس مقرر ہوا۔ کہ ہر اہل خدمت کی حاضری بھی لے۔ اور جو عرض معروض حکم احکام ہوں۔ جاری کرے اور جا بجا پہنچائے (۹)، ہفتہ کے لئے سات واقعہ نویس مقرر ہوئے۔ کہ تمام دن کا حال ڈیوڑھی پر بیٹھے لکھا کریں (۱۰)، امرا و خوانین کے علاوہ چار ہزار یکّہ سوار خاص رکاب شاہی کیلئے قرار دئیے۔ انہیں کو احدی کہتے تھے۔ کہ یکّہ کا ترجمہ ہے۔ ان کا داروغہ بھی الگ ہوا (۱۱)، کئی ہزار غلام۔ کیا لڑائیوں کے گرفتار۔ غلامی سے آزاد ہوئے۔ اور چیلہ اُن کا خطاب ہوا۔ کیونکہ خدا کے بندے آزاد ہیں۔ انہیں غلام یا بندہ کہنا روا نہیں۔ غرض سینکڑوں جزئیات آئین و قواعد کے ایسے باندھے کہ بعض امرا اور وزرا نے کوششیں کیں اور کرتے ہیں۔ آگے نہیں نکل سکتے۔ اس کے بعد منصب وکالت مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو مرحمت ہوا۔ اُس نے بھی منصب مذکور اور امورات وزارت کو باحسن وجوہ رونق دی۔ کہ موردِ تحسین ہوا (۱۲)، ہندوستان میں خرید و فروخت۔ دیہات کی جمع بندی تحصیل مال۔ نوکروں کی تنخواہوں کا حساب کیا راجاؤں کیا بادشاہوں میں تنگوں پر تھا۔ مگر پیسے دیا کرتے تھے۔ چاندی پر ضرب لگتی تھی۔ تو چاندی کے تنگے کہلاتے تھے اور ایلچیوں اور ڈوموں کو انعام میں دیا کرتے تھے۔ عام رواج نہ تھا۔ چاندی کے مول بازار میں بک جاتے تھے۔ ٹوڈرمل نے منصبداروں اور ملازموں کی

---

[1] ایک بیگہ مربع = ۳۶۰۰ گز شاہجہانی ۔ [2] دام میں نے دیکھا ہے۔ وزن میں ایک تولہ۔ مربع جیسا دلی کا پیسہ ایک طرف اکبر کا نام معمولی طور پر۔ دوسری طرف دام نہایت خوش قلم خط ثلث میں ۔

تنخواہ میں انہی کو جاری کیا۔ اور آئین باندھا۔ کہ تنگہ کی جگہ دیہات سے روپیہ وصول ہُوا کرے۔ اس کا ۱۱ ماشہ وزن رکھا۔ روپیہ کے ۴۰ دام قرار دئے۔ اس کا آئین یہ کہ تانبے پر ٹکسال کا خرچ لگائیں۔ تو روپیہ کے پورے ۴۰ دام پڑتے ہیں۔ وہی نوکروں کو تنخواہ میں ملتے تھے۔ اسی کے بموجب جمع کل دیہات قصبات پرگنات کی دفتر میں لکھی جاتی تھی۔ اس کا نام عمل نقد جمعبندی رکھا۔ محصول کا آئین یہ باندھا کہ غلہ زمین بارانی میں نصف کاشتکار نصف بادشاہ کا۔ بارانی میں ۱/۳ قطعہ پر ۱/۴ اخراجات اور اس کی خرید و فروخت کی لاگت لگا کر غلہ میں ۱/۳ بادشاہی نیشکر وغیرہ کہ جنس اعلیٰ کہلاتے ہیں۔ اور پانی اور نگہبانی اور کٹائی وغیرہ کی محنت غلہ سے زیادہ کھاتی ہے ۱/۴ ۱/۵ ۱/۶ ۱/۷ حسب مراتب حق بادشاہی۔ باقی حق کاشتکار۔ اگر محصول لیں۔ تو ہر جنس میں بیگھہ مربع پر زر نقدی ہیں۔ اس کا دستورالعمل بھی جنس وار لکھا ہے ؎

یہ بات بھی قابل تحریر ہے۔ کہ قواعد مذکورہ کے بہت سے جزئیات۔ خواجہ شاہ منصور۔ مظفر خاں اور میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ کے نکالے ہوئے تھے۔ اور بیشک انہوں نے کاغذات کی چھان بین اور انتظام دفتر میں بڑی عرق ریزی کی ہے مگر اتفاق تقدیری ہے۔ کہ ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا جس عمدہ انتظام کا ذکر آتا ہے۔ وہاں ٹوڈرمل کا نام پکارا جاتا ہے ؎

طالع شہرت رسوائی مجنوں بیش است	ورنہ طشت من و او ہر دو زیک بام اُفتاد

باوجود ان سب باتوں کے یہ نکتہ اکبر کی کتاب اوصاف میں سنہری حرفوں سے لکھنا چاہئے۔ کہ امرا نے راجہ کے اختیارات اور ترقیات متواتر دیکھ کر بعض موارد میں شکایت کی۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ حضور نے ایک ہندو کو مسلمانوں پر اس قدر اختیار اور اقتدار دے دیا ہے۔ ایسا مناسب نہیں بسینہ صاف اور بے تکلف بادشاہ نے کہا۔ ہر کدام شما در سرکار خود ہندوے دارد۔ اگر ما ہم ہندوے داشتہ باشیم۔ چرا از و بد باید بود۔ تم سب کی سرکاروں میں کوئی نہ کوئی منشی ہندو ہے۔ ہم نے ایک ہندو رکھا۔ تو تم کیوں بُرا مانتے ہو ؎

راجہ ماؔن سنگھ

اس عالی خاندان راجہ کی تصویر دربار اکبری کے مرقع میں سونے کے پانی سے کھینچنی چاہیے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس کے باپ دادا کی مبارک رفاقت اکبر کی ہمدم اور رفیق حال ہوئی جس سے ہندوستان میں تیموری خاندان کی بنیاد نے قیام پکڑا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے۔ کہ انہوں نے اپنی رفاقت اور ہمدردی سے اکبر کو اپنایت اور محبت کرنی سکھا دی۔ اور خلق وعالم کو دکھا دیا۔ کہ راجپوتوں میں جو خیال چلا آتا ہے۔ کہ سر جائے بات نہ جائے۔ اس کی مورت دیکھنی چاہو۔ تو انہیں دیکھ لو۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان بات کے پوروں نے اس ترک بادشاہ کی رفاقت میں اپنی جان کو جان نہ سمجھا اور اپنے اور اس کے ننگ وناموس کو ایک کر دیا۔ ان کی ملنساری اور وفاداری نے اکبر کے دل پر نقش کر دیا۔ کہ ملک ہند ایسی اجزائے شرافت سے مرکب ہے کہ اگر ان کے ساتھ غیر قوم بھی محبت اور ہمدردی کرے۔ تو یہ ایسا کچھ کرتے ہیں۔ کہ اپنی قوم کی تو کیا حقیقت ہے حقیقی بھائی کو بھول جاتے ہیں۔ یہ کچھواہہ کے خاندان عظیم الشان میں نامی گرامی اور صدہا سال سے خاندانی راجہ چلے آتے تھے۔ ان کے ساتھ تمام قوم کچھواہہ اکبر کی جاں نثاری پر کمربستہ ہو گئی۔ اور ان کی بدولت راجپوتوں کے اکثر خاندان آکر شامل ہو گئے۔ لیکن اکبر کی دلربائی اور دلداری کا جادو بھی ان پر ایسا کارگر ہوا۔ کہ آج تک سب چغتائی خاندان کی محبت کا دم بھرتے ہیں ✤

سنہ ۹۶۳ھ پہلے سال جلوس میں دربار اکبری سے مجنوں خاں قاقشال نارنول پر حاکم ہو کر گیا۔ حاجی خاں کہ شیر شاہ کا غلام تھا۔ وہ مجنوں خاں پر چڑھ آیا۔ راجہ بہاڑامل۔ راجہ آبیر کہ اس وقت کچھواہہ خاندان کا چراغ روشن کرنے والا تھا۔ حاجی خاں کے ساتھ تھا۔ مجنوں خاں کی عقل وہوش جاتے رہے۔ گھر گئے اور حالت تنگ ہوئی۔ خاندانی راجہ مردکہن سال۔ مروت وانسانیت کے جواہر سے خزانہ دار تھا۔ اور بات کے نشیب وفراز انجام وآغاز کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے صلح کا بندوبست کر کے مجنوں خاں کو محاصرہ سے نکلوایا۔ اور عزت وحرمت کے ساتھ دربار شاہی کو روانہ کر دیا۔ یہی راجہ بہاڑامل ہیں۔ جو راجہ بھگوان داس کے باپ اور مان سنگھ کے دادا تھے ✤

مجنوں خاں جب دربار میں پہنچا۔ تو راجہ کی مروت۔ محنت۔ اخلاص۔ عالی ہمتی اور اس کے

ملہ بہاری مل۔ پورن مل۔ روپسی۔ آسکرن۔ جگ مل پانچ بھائی تھے۔ جگ مل کا بیٹا جہاں سنگھ تھا ✤

عالی خاندان کے حالات اکبر کے سامنے بیان کئے۔ دربار سے ایک امیر فرمان طلب لے کر گیا۔ راجہ سامان معقول کے ساتھ حاضر دربار ہؤا۔ یہ وہی مبارک موقع تھا۔ کہ اکبر ہیمو کی مہم مار کر دلّی آیا تھا۔ چنانچہ راجہ کی بڑی عزت اور خاطرداری کی ٭

جس دن راجہ اور فرزند اور اس کے ہمراہی بھائی بندوں کو خلعت اور انعام و اکرام مل رہے تھے۔ اور وہ رخصت ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلے تھے۔ اور ان کا تماشہ دیکھتے تھے۔ ہاتھی مست تھا۔ اور جوشِ مستی میں جھُوم جھُوم کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر جاتا تھا۔ لوگ ڈر ڈر کر بھاگتے تھے۔ ایک دفعہ ان راجپوتوں کی طرف بھی جھکا۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ اُسی طرح کھڑے رہے۔ بادشاہ کو اُن کی دلاوری بہت پسند آئی۔ راجہ بھاڑا مل کی طرف متوجہ ہو کر یہ الفاظ کہے۔ ترا نہال خواہم کرد عنقریب مے بینی کہ اعزاز و افتخارت زیادہ بر زیادہ میشود۔ اُسی دن سے راجپوتوں کی خصوصاً راجہ بھاڑا مل اور اس کے متعلقوں اور متوسلوں کی قدردانی کرنے لگے۔ اور ان کی بھلائی اور دلاوری روز بروز دل پر نقش ہوتی گئی۔ اکبر نے مرزا[1] شرف الدین حسین کو میوات کا حاکم کر کے بھیجا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر پھیلنا شروع کیا تھا۔ اور آنبیر کو لینا چاہا۔ راجہ بھاڑا مل کا ایک فتنہ پرداز بھائی شرکت ریاست کے باعث مرزا سے آن ملا۔ اور ساتھ ہو کر چڑھ گیا۔ چونکہ گھر کی پھوٹ تھی۔ اس واسطے مرزا غالب آیا۔ اور راجہ کے چند بھائی بند گرو لے کر پھرا ٭

سنہ ۹۶۸ھ میں بادشاہ زیارت اجمیر کو چلے۔ رستہ میں ایک امیر نے عرض کی۔ کہ راجہ بھاڑا مل جو دہلی میں حاضر دربار ہؤا تھا۔ اُس پر مرزا نے بڑی زیادتی کی ہے۔ بیچارہ پہاڑوں میں گھس کر گذارا کر رہا ہے۔ وہ عالی ہمت بامروّت خاندانی راجہ ہے۔ اگر حضور کی توجہ شاملِ حال ہو گی۔ تو خدمات عظیم بجا لائیگا۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ تم خود جا کر لے آؤ۔ چنانچہ وہ لینے گیا۔ راجہ خود نہ آیا۔ عرضی کے ساتھ نذرانہ بھیجا۔ اور اُس کا بھائی امیر مذکور کے ساتھ آیا۔ اکبر نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ خود آئے۔ راجہ بھاڑا مل نے بڑے بیٹے بھگوان داس کو اہل و عیال کے پاس چھوڑا۔ اور ساگانیر کے مقام پر خود حاضر ہؤا۔ بادشاہ نے بڑی محبت اور دلداری سے اُس کی تشفی کی۔ اور دربار کے امرائے خاص میں داخل کیا۔ راجہ کے دل میں بھی ایسا محبت اور وفا کا جوش پیدا ہؤا۔ کہ رفتہ رفتہ اپنے یگانوں میں اور اُس میں کچھ فرق نہ رہا۔ چند روز کے بعد راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ بھی آ گئے۔ اکبر نے ان دونو کو ساتھ لیا۔ اور راجہ بھاڑا مل کو رخصت کیا۔ مگر دل مل گئے تھے۔ چلتے

[1] دیکھو مرزا کا حال صفحہ ۷۰۴ ٭

ہوئے کہ دیا کہ جلد چلے آنا۔ اور سامان کر کے آنا۔ کہ پھر جانے کی تکلیف نہ کرنی پڑے ؎

مذہب کی دیوار اور قانون قومی کا قلعہ اپنی مضبوطی اور استواری میں سد سکندری سے کم نہیں۔ مگر آئین سلطنت (جسے ہندوستان میں راج نیت کہتے ہیں) کا قانون سب پر غالب ہے۔ جب اس کی مصلحت کا دریا چڑھاؤ پر آتا ہے۔ تو سب کو بہالے جاتا ہے۔ اکبر کو شاہ طہماسپ کا قول یاد تھا۔ (دیکھو صفحہ ۶۰ و ۶۱) اُس نے اس خاندان کی نیک نیت اور اخلاص و محبت دیکھ کر سوچا۔ کہ ان کے ساتھ قرابت ہو جائے۔ تو بہت خوب ہو۔ اور یہ امر ممکن بھی نظر آیا چنانچہ بڑے موقع کے ساتھ یہ سلسلہ ہلایا۔ اور اس میں کامیاب ہُوا یعنی ۹۶۹ھ میں راجہ بھاڑامل کی بیٹی مان سنگھ کی پھوپھی بیگمات اکبری میں داخل ہو کر محل کا سنگار ہو گئی ؎

باوجودیکہ رانا کے ساتھ ان کا خاندانی تعلق تھا۔ مگر جب ۹۷۴ھ میں چتوڑ پر مہم ہوئی۔ تو راجہ بھگوان داس اکبر کے ساتھ تھے۔ اور ہر مورچے پر سپر کی طرح کبھی آگے تھے۔ کبھی پیچھے۔ (دیکھو تتمہ) ؎

۹۷۹ھ میں جب اکبر گجرات پر خود فوج لے کر گیا۔ تو راجہ مان سنگھ بھی باپ کی رفاقت میں ہمراہ تھا۔ نوجوانی کا عالم۔ دل میں اُمنگ۔ دلاوری کا جوش۔ راجپوتی خون کہتا ہوگا۔ کہ چنگیزی ترک جن کے دل فتحیابی نے بڑھائے ہیں۔ اس وقت باگ سے باگ ملائے ہیں۔ ان سے قدم آگے بڑھا رہے۔ اور انہیں بھی دکھلا دو۔ کہ راجپوتی تلوار کی کاٹ کیا رنگ دکھاتی ہے۔ کیا راہ میں کیا میدان جنگ میں جدھر ذرہ اکبر کا اشارہ پاتا تھا۔ فوج کا دستہ لیتا تھا۔ اور اس طرح جا پڑتا تھا۔ جیسے شیر و پلنگ شکار پر جاتے ہیں ؎

اس عرصہ میں خان اعظم احمد آباد میں گھر گئے۔ اور چغتائی شہزادے افواج دکن کو ساتھ لے کر اُس کے گرد چھا گئے۔ اکبر نے آگرہ سے کوچ کیا۔ اور مہینے کی راہ سات دن میں طے کر کے احمد آباد پر جا پہنچا۔ راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ اس مہم میں ساتھ تھے۔ اور بادشاہ کے گرد اس طرح سے جان نثاری کرتے پھرتے تھے۔ جیسے شمع کے گرد پروانے ؎

چغتائی مورخوں نے یہ معاملہ درج تاریخ نہیں کیا۔ مگر ٹاڈ صاحب تاریخ راجستان میں لکھتے ہیں اور حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے

راجہ مان سنگھ شعلہ پور کی مہم مار کر آتا تھا۔ اُودے پور کی سرحد سے گزرا۔ سنا کہ رانا پرتاپ کومیر میں ہے۔ وکیل بھیجا اور لکھا کہ آپ سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ رانا نے اُودے ساگر تک استقبال کر کے جھیل کے کنارے ضیافت کا سامان کیا جب کھانے کا وقت ہوا تو رانا آپ نہ آیا۔ بیٹے

نے آکر کہا۔" راناجی کے سر میں درد ہے۔وہ نہ آئینگے۔آپ کھانے پر بیٹھیں۔اور اچھی طرح کھائیں"
راجہ مان سنگھ نے کہلا بھیجا۔کہ جو مرض ہے عجب نہیں کہ وہی ہے۔جو میں سمجھا ہوں۔مگر یہ تو لاعلاج
مرض ہے۔اور جب وہی مہمانوں کے آگے تھال نہ رکھیں گے۔تو کون رکھیگا ؟

رانا نے کہلا بھیجا۔مجھے اس کا بڑا رنج ہے۔مگر کیا کروں جس شخص نے بہن ترک سے بیاہ دی۔تو اُس کے ساتھ کھانا بھی کھایا ہی ہوگا۔راجہ مان سنگھ اپنی حماقت پر پچھتایا۔کہ یہاں کیوں آیا۔اور وہ صدمہ گزرا کہ دل ہی جانتا تھا۔چاول کے چند دانے لے کر ان دیوی کو چڑھائے۔وہی اپنی پگڑی میں رکھ لئے۔اور چلتے ہوئے کہا۔تیری عزت بچانے کو ہم نے اپنی عزت کھوئی۔اور بہنیں بیٹیاں ترک کو دیں۔تمہاری یہی مرضی ہے۔کہ خوف میں رہیں تو ہمیشہ رہو اختیار ہے۔اس لئے کہ اس ملک میں تمہارا گذارا نہ ہوگا ۔

گھوڑے پر چڑھا اور رانا کی طرف مخاطب ہو کر کہا (اس وقت وہ بھی آموجود ہوا تھا) راناجی اگر تمہاری شیخی نہ جھاڑ دوں۔تو میرا نام مان نہیں۔پرتاپ بولا" ہم سے ہمیشہ ملتے رہنا" کسی بے لحاظ نے برابر سے یہ بھی کہا۔جی اپنے پھوپھا (اکبر) کو بھی ساتھ لانا جس زمین پر یہ ضیافت ہوئی تھی۔اُسے کھدوایا۔گنگا جل سے دُھلوا کر پاک کیا۔سردار نہائے۔پوشاک بدلی۔ گویا سب اُس کے آنے سے ناپاک ہو گئے تھے۔اس بات کی ذرہ ذرہ خبر اکبر کو پہنچی۔بہت غصہ آیا۔اُسے بڑا خیال یہ تھا۔کہ ایسا نہ ہو راجپوت کی ذات غیرت کھا کر پھر بگڑ جائے اور جس تعصب کی آگ کو میں نے سو سو پانی سے دھیما کیا ہے۔وہ پھر سُلگ اُٹھے ۔

عالی ہمت بادشاہ کے دل میں یہ خیال کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔آخر چند روز بعد رانا پر فوج کشی ہوئی۔سلیم (جہانگیر) کے نام سپہ سالاری ہوئی۔مان سنگھ اور مہابت خاں ساتھ ہوئے کہ شہزادہ ان کی صلاح پر چلے۔بادشاہی لشکر رانا کے ملک میں داخل ہوا اور چھوٹے موٹے مقابلوں کو ٹھوکریں مارتا آگے بڑھا۔رانا ایک ایسے کڈھب مقام میں لشکر لے کر اڑا۔جسے پہاڑوں کے سلسلوں اور گھاٹیوں کے پیچوں نے خوب مضبوط کیا تھا۔کوملمیر سے رکناتھ تک (شمال سے جنوب تک) ۸۰ میل طول۔میر پور سے ستولا تک (مشرق مغرب میں) اسی قدر عرض۔اس مسافت میں پہاڑ جنگل گھاٹیوں اور ندیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔دارالسلطنت کو شمال جنوب مغرب جدھر سے جاؤ رستہ ایسا تنگ ہے کہ گویا گھاٹی ہی ہے۔ہر طرف عمودی پہاڑ چلے جاتے ہیں۔چوڑان اتنی کہ دو گاڑیاں بھی برابر نہیں چل سکتیں۔گھاٹی میں سے نکلو تو قدرتی دیواریں کھڑی ہیں (انہیں کول کہتے ہیں) بعض جگہ

میدان بھی ایسے ایسے آجاتے ہیں۔ کہ بڑا لشکر چھاؤنی ڈال دے۔ چنانچہ ہلدی گھاٹ کا میدان ایسا ہی ہے۔ وہ پہاڑ کی گردن پر واقع ہے۔ اس لئے بیڈھب مقام ہے۔ پہاڑ کے اوپر اور نیچے راجپوتوں کی فوجیں جمی ہوئی تھیں۔ ٹیلوں کے اُوپر اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھیل جو اصلی کیڑے ان پتھروں کے ہیں۔ تیر کمان لئے تاک میں بیٹھے تھے۔ کہ جب موقع آئے۔ بھاری بھاری پتھر حریف پر لڑھکائیں ؛

درّہ کے دہانہ پر رانا میواڑ کے سورما سپاہیوں کو لئے ڈٹا تھا۔ غرض کہ یہاں ایک گھمسان کا کُشت و خون ہُوا۔ کئی راجہ اور ٹھاکر جانوں سے ہاتھ اُٹھا کر آن گرے اور اپنے بہادر رانا کے قدموں پر خون کے نالے بہا گئے۔ گرم میدان میں رانا قرمزی جھنڈا لئے تیار تھا۔ کہ کسی طرح راجہ مان سنگھ نظر آئے۔ اور اُس سے دو دو ہاتھ ہوں۔ یہ ارمان تو نہ نکلا۔ لیکن جہاں سلیم (جہانگیر) ہاتھی پر کھڑا لشکر کو لڑا رہا تھا۔ وہاں جا پہنچا اور ایسا بے جگر ہو کر گیا۔ کہ سلیم اس کے برچھے کا شکار ہو جاتا۔ اگر ہودہ کے فولادی تختے اس کی جان کی سپر نہ بن جاتے۔ پرتاپ جس گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا نام چیتک تھا۔ وفادار گھوڑے نے آقا کی بڑی رفاقت کی۔ اس لڑائی کے مرقعے جو تاریخ میواڑ میں شامل ہیں۔ ان میں گھوڑے کا ایک پاؤں سلیم کے ہاتھی پر رکھا ہُوا ہے۔ اور سوار اپنے حریف پر نیزہ مارتا ہے۔ فیلبان کے پاس بچاؤ کا سامان کچھ نہ تھا۔ وہ مارا گیا۔ مست ہاتھی بے مہاوت رُک نہ سکا اور ایسا بھاگا کہ سلیم کی جان بچ گئی۔ یہاں بڑا بھاری رن پڑا۔ مغل نمک حلال اپنے شہزادہ کے بچانے میں اور میواڑ کے سورما اپنے سیناپتی کی مدد میں ایسے جان توڑ کر لڑے۔ کہ ہلدی گھاٹ کے پتھر شنگرف ہو گئے۔ پرتاپ نے سات زخم کھائے۔ دُشمن اُس پر باز اور جرّوں کی طرح گرتے تھے۔ مگر وہ راج کے چتر کو نہ چھوڑتا تھا۔ تین دفعہ دشمنوں کے انبوہ میں سے نکلا۔ اور قریب تھا۔ کہ دب مرے۔ جھالا کا سردار دوڑا اور اس بلا سے رانا کو نکال کر لے گیا۔ راج کا چتر ایک ہاتھ میں اور جھنڈا دُوسرے میں لے کر ایک اچھے مقام کی طرف بھاگا۔ اگرچہ خود مع اپنے جان نثاروں کے مارا گیا۔ مگر رانا نکل آیا۔ جب سے اُس کی اولاد میواڑ کے بادشاہی نشان اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اور دربار وں میں رانا کی داہنی طرف جگہ پاتی ہے۔ راجہ خطاب ہُوا ہے۔ اور ان کا نقارہ دروازہ قلعہ تک بجتا ہے۔ یہ مرتبہ دُوسروں کو حاصل نہیں۔ یہ بہادری ایسے دشمنوں کے سامنے کیا پیش جاتی جن کے ساتھ بیشمار توپیں اور ہیکلے آگ برساتے تھے۔ اور اُونٹوں کے رسالے آندھی کی طرح لوٹتے تھے۔ فوج پر شکست پڑی۔ بائیس ہزار راجپوت میں سے فقط آٹھ ہزار جیتے بچے۔ اگرچہ فوج پر

شکست پڑی۔ مگر اس وقت بچ کر نکل جانا ہی بڑی فتح تھی۔ رانا پرتاپ اپنے چیتک گھوڑے پر سوار بھاگا۔ اور دو مغلوں نے اس پر گھوڑے ڈالے۔ وہ اس کے پیچھے گھوڑے لگائے آتے تھے۔ کہ رستہ میں ایک ندی آئی (پہاڑ میں سے نکلی تھی) اگر چیتک ذرا جھجکتا۔ تو پھنس ہی گیا تھا۔ وہ بھی گھائل ہو رہا تھا۔ مگر وہ ہرن کی طرح چاروں ٹپلیاں جھاڑ کر پانی پر سے اُڑ گیا۔ شام ہو گئی تھی ان کے نعل پتھروں سے ٹکرا کر پتنگے اڑاتے تھے۔ اس نے سمجھا۔ کہ دشمن آن پہنچے۔ اتنے میں کسی نے اس کی بولی میں پیچھے سے پکارا۔ او نیلے گھوڑے کے سوار۔ پرتاپ نے پھر کر دیکھا۔ تو سکٹ اس کا بھائی ہے۔ یہ کسی گھر کے معاملہ میں بھائی سے خفا ہو کر نکل گیا تھا۔ اکبر کی نوکری کر لی تھی اور اس لڑائی میں موجود تھا۔ جب دیکھا کہ میرا بھائی۔ میری قوم کا نام روشن کرنے والا۔ میرے باپ دادا کا نام روشن کرنے والا۔ اس حالت کے ساتھ جان لے کر بھاگا ہے۔ اور دو مغل اس کے پیچھے پڑے ہیں تو سب غصہ جاتا رہا۔ خون نے جوش مارا۔ اور اسکے پیچھے ہو لیا۔ موقع پا کر دونوں مغلوں کو فنا کیا اور بھائی سے جا ملا۔ کس مدت کے بچھڑے بھائی کس طرح ملے۔ گھوڑے سے اتر کر خوب گلے ملے۔ یہاں چیتک بیٹھ گیا۔ سکٹ نے اُسے گھوڑا دیا۔ اس کا نام انکارو تھا۔ جب رانا نے اس کا اسباب اتار کر دوسرے گھوڑے پر رکھا تو افسوس کہ چیتک کا دم نکل گیا۔ یہاں اس کی یادگار میں ایک عمارت بنوائی ہے۔ اُودے پور کی آبادی میں آدھے گھر ہونگے۔ جن کی دیواروں پر یہ تصویریں کھینچی ہیں۔ سکٹ نے رانا بھائی سے چلتے ہوئے ہنس کر کہا۔ بھائی جی جب کوئی جان بچا کر بھاگتا ہے۔ تو دل کا کیا حال ہوتا ہے؟ پھر اس کی خاطر جمع کی۔ کہ جب موقع پاؤں گا۔ پھر آؤں گا ؛

سکٹ وہاں سے ایک مغل کے گھوڑے پر چڑھا اور سلیم کے لشکر میں آیا۔ لوگوں سے کہا۔ کہ پرتاپ نے اپنے دونو پیچھا کرنیوالوں کو مارا۔ ان کی حمایت میں میرا گھوڑا بھی مارا گیا۔ ناچار میں ان میں سے ایک کے گھوڑے پر آیا ہوں۔ لشکر میں کسی کو یقین نہ آیا۔ آخر سلیم نے بلا کر عہد کیا۔ کہ سچ کہہ دوگے تو میں معاف کر دونگا۔ سیدھے سپاہی نے اصل حال کہہ دیا۔ سلیم اپنے عہد پر قائم رہا مگر کہا کہ اب تم اپنے بھائی کے پاس جا کر نذر دو۔ اور وہیں رہو۔ چنانچہ وہ اپنے ملک میں چلا گیا ؛

رانا کیکا کا ملک میواڑ میں راج کرتا تھا۔ اور ہندوستان کے مشہور راجاؤں میں سے تھا۔ جب اکبر نے چتوڑ مار لیا تو رانا نے کوہستان ہندواڑہ میں قلعہ کوکنڈہ تعمیر کیا۔ اس میں بیٹھا۔ ملک کنبھل میر پر حکومت کرتا تھا۔ مقام مذکور اور دلی پہاڑوں میں جانب شمال اودے پور سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے؛ ہندوستان کے اکثر راجہ اکبر کی اطاعت باسلامت روی کے سلسلہ میں آگئے تھے۔ مگر رانا اپنی اکڑ

ٹکڑے پر قائم تھا۔ چنانچہ ۹۸۳ھ میں اکبر معہ لشکر اجمیر گیا جب درگاہ ایک منزل رہی تو پیادہ ہُوا۔ زیارت کر کے نذر نیاز چڑھائی۔ ایک دن درگاہ میں مان سنگھ کو بھی ساتھ لے گیا دیر تک دعائیں اور التجائیں کیں۔ وہیں بیٹھے اور امرا بھی حاضر تھے۔ صلاح مشورے ہو کر فوج کشی قرار پائی۔ مان سنگھ کو خطاب فرزندی کے ساتھ سپہ سالاری عنایت ہوئی۔ پانچ ہزار سوار رقمی کہ کچھ خاصہ کے اور کچھ ماتحت امرا تھے۔ مدد کو دئے۔ کئی امیر جنگی تجربہ کار مع اُن کی فوجہائے جرار کے ساتھ روانہ کئے۔ اور ریاست رانا کی طرف متوجہ کیا۔ دریائے لشکر طوفان کی طرح حدود اودے پور میں داخل ہُوا۔ کنور نے مانڈل گڈھ پر ٹھہر کر لشکر کا انتظام کیا۔ اور ہلدی کی گھاٹی سے نکل کر گوکنڈہ پر جا پہنچا کہ وہیں رانا رہتا تھا۔

رانا اپنے دارالخلافہ سے نکلا اور سورما راجپوت جو قومی حمایت کے نام پر پہاڑوں میں بیٹھے تھے۔ تلواریں کھینچ کر ساتھ نکلے۔ مان سنگھ ابھی نوجوان کنور تھا۔ مگر اس نے اکبر کی رکاب میں رہ کر اس شطرنج کے نقشے بہت کھیلے تھے۔ خود چند امرائے کہنہ عمل کے ساتھ قلب میں قائم ہُوا۔ کچے پیے باندھ کر قلعۂ لشکر کو سد سکندری بنایا۔ اور عمدہ عمدہ بہادر چُن کر ہر فوج کے لئے کمک تیار رکھی ؞

ملا صاحب بہ نیت جہاد اس لڑائی میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے لفظوں کے آب و رنگ سے میدان جنگ کا ایسا نقشہ اُتارا ہے۔ کہ مورخوں کے قلم ٹوٹ گئے۔ آزاد اس موقع پر اس کا فوٹو گراف لے کر دربار اکبری میں سجاتا ہے۔ رانا تقریباً تین ہزار سوار کے ساتھ بادل کی طرح پہاڑ سے اُٹھا۔ دو فوج ہو کر آیا۔ ایک فوج نے ہراول شاہی سے ٹکر کھائی۔ پہاڑی زمین تھی۔ گڑھے۔ جھاڑی پہاڑیوں کے اینچ پینچ بہت تھے۔ ہراول اور کمک ہراول غٹ پٹ ہو گئے بھگوڑی لڑائی لڑنی پڑی۔ بادشاہی لشکر کے راجپوت بائیں طرف سے اس طرح بھاگے۔ جیسے بکریاں۔ ہراول کو لانگھ پھلانگ کر داہنی طرف کی فوج میں گھس آئے۔ ہاں سادات بارہ اور بعض غیرت والے بہادروں نے وہ کام کئے۔ کہ شاید ہی رستم سے ہوں۔ طرفین سے بہت آدمی کام آئے جس فوج میں رانا تھا اُس نے گھاٹی سے نکلتے ہی قاضی خاں بدخشی کو لیا۔ کہ دہانہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں اُٹھا کر اُلٹتے پلٹتے قلب میں پھینک دیا۔ سیکری وال شیخ زادے تو کھڑے ہی بھاگے۔ شیخ ابراہیم شیخ منصور (شیخ ابراہیم خلف سلیم کے داماد) ان کے سردار تھے۔ بھاگنے میں ایک تیران کے چوتڑوں پر بیٹھا۔ مدت تک دکھ بھرا۔ قاضی خاں باوجود مُلّائی کے بہادری سے اڑے۔ ہاتھ پر ایک تلوار کھائی۔ کہ انگوٹھا کٹ گیا۔ مگر ٹھہرنے کی جگہ نہ تھی۔ قاضی صاحب جواز فرار کی حدیثیں تلاوت کرتے ہوئے ہٹ کر قلب میں آگئے۔ اَلْفِرَارُ مِمَّا لَا یُطَاقُ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ ؞

(آزاد علما کے قربان جائیے۔ زبان سے کہتے ہیں۔ کہ جو جہاد سے بھاگے اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ خود بھاگتے ہیں۔ تو پیغمبروں کو بھی بھگا کر آگے رکھ لیتے ہیں) اور جو پہلے حملے میں بھاگے تھے۔ انہوں نے تو پانچ چھ کوس تک دم ہی نہ لیا۔ ایک دریا بیچ میں تھا۔ اس سے بھی پار ہو گئے۔ لڑائی تازہ ہو رہی تھی۔ جو ایک سردار گھوڑا اٹھاتا نقارہ بجاتا آیا۔ کہ بندگان بادشاہی یلغار کر کے آن پہنچے۔ لشکر بادشاہی سے شور قیامت کا غل تھا۔ اور اس منتر نے بڑا اثر کیا۔ بھاگتے ہوئے تھم گئے۔ بھاگے ہوئے پلٹ پڑے اور غنیم کے پاؤں اکھڑ گئے *

راجہ رامساہ گوالیاری رانا کے آگے آگے بھاگا آتا تھا۔ اُس نے مان سنگھ کے راجپوتوں کی جان پر عجب کار پردازی کی۔ کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ وہ تھے۔ کہ ہراول کے بائیں سے بھاگ کر آئے تھے۔ مگر ایسے بدحواس آئے کہ آصف خاں کو بھی بھگوڑا کر دیا ہوتا۔ دائیں طرف پر سادات بارہ تھے۔ اُن میں پناہ لی۔ اگر سادات بارہ ثابت قدمی سے نہ اڑتے اور ہراول کی طرح نوک دُم بھاگتے۔ تو رسوائی میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ رانا نے ہاتھیوں کو بادشاہی ہاتھیوں سے آن ٹکرایا۔ ان میں دو مست دیو زاد ٹکرم ٹکرا ہو گئے۔ حسین خاں بادشاہی فیلبان مان سنگھ کے آگے بیٹھا تھا۔ وہ گرا۔ مان سنگھ آپ مہاوت کی جگہ جا بیٹھا۔ اور اس استقلال سے ڈٹا۔ کہ اس سے زیادہ کیا ہو گا۔ الحمدللہ کہ قلب قائم رہا۔ ادھر سے جو رامساہ بھاگا تھا۔ اُس نے اپنے اور تین بیٹوں کے خون سے داغ بدنامی کو دھو دیا *

فیلبان نے غنیم کی طرف سے رام پرشاد ہاتھی کو بڑھایا۔ یہ بڑا قوی ہیکل اور جنگی ہاتھی تھا بہت سے جوانوں کو پامال کر کے صفوں کو چاک در چاک کر دیا۔ کمال خاں فوجدار شاہی نے ادھر سے گجراج ہاتھی کو سامنے کیا۔ دیر تک آپس میں ریلتے دھکیلتے رہے۔ بادشاہی ہاتھی دب نکلا تھا۔ اقبال اکبری نے رام پرشاد کے مہاوت کو قضا کی گولی ماری۔ کہ اس دھکم دھکا میں زمین پر آ پڑا۔ بادشاہی فیلبان واہ رے تیری پھُرتی۔ کود کر رانا کے ہاتھی پر جا بیٹھا۔ اور وہ کام کیا۔ کہ کسی سے نہ ہو سکے۔ اتنے میں بکہ سوار جو مان سنگھ کی اردلی میں تھے۔ رانا کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور اس گھمسان کا رن پڑا۔ کہ مان سنگھ کی سپہ سالاری اس دن معلوم ہو گئی۔ ملا شیریں نے سچ کہا ہے۔ ع

کہ ہندو میزند شمشیر اسلام

رانا کے ساتھ مان سنگھ کا مقابلہ ہوا۔ اور دونوں پر تلے کئی وار ہوئے۔ آخر رانا نہ ٹھیر سکا۔ مان سنگھ کے ہاتھ سے زخم کھایا۔ سب کو وہیں چھوڑا اور بھاگا۔ اسکی فوج میں بھی کھلبلی پڑ گئی اور اسکے سردار

بھاگ بھاگ کر اُس کی طرف ہٹنے لگے۔ آخر سب پہاڑوں میں گھس گئے۔ گرمی کا موسم آگ برسا رہا تھا۔ لُو چل رہی تھی۔ زمین آسمان تنور کی طرح بھڑک رہے تھے۔ بھیجے سر میں پانی ہو گئے۔ صبح سے دوپہر تک لڑتے رہے۔ پانسو آدمی کا کھیت پڑا۔ ۱۲۰ مسلمان باقی ہنود۔ زخمی غازی تین سو سے زیادہ۔ لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ رانا بھاگنے والا نہیں۔ یہیں کسی پہاڑی کے پیچھے چھپ رہا ہے پھر پلٹیگا اس لئے تعاقب نہ کیا۔ خیموں میں پھر آئے اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہوئے ؛

دوسرے دن وہاں سے کوچ کیا۔ میدان میں ہوتے ہوئے ہر شخص کی کارگذاری کو دیکھتے ہوئے درّہ سے گذر کر کوکنڈہ میں آئے۔ رانا نے چند معتبر جاں نثار محلّوں پر تعینات کئے۔ کچھ وہ کچھ مندروں میں سے پانڈے نکلے۔ کل بیس آدمی ہونگے۔ اپنی جانیں دے کر نام کو سرخرو لے گئے۔ ہندوں کی قدیمی رسم تھی جب شہر خالی کرتے تھے۔ ننگ و ناموس کے لئے ضرور جانیں دیتے تھے۔ معلوم ہُوا کہ رانا کے شبخون کا بھی خیال تھا۔ کیونکہ شہر کے گرد پتھر چُن کر ہاتھوں ہاتھ ایسی دیوار اور خندق بنا لی تھی جس سے سوار گھوڑا نہ اڑا سکیں۔ مان سنگھ نے سرداروں کو جمع کر کے مقتولوں کی فہرستیں مرتب کیں۔ اور جن کے گھوڑے مارے گئے تھے۔ اُن کی تفصیل طلب ہوئی۔ سید محمود خاں بارہ نے کہا۔ کہ ہمارا تو نہ کوئی آدمی ضائع ہُوا۔ نہ گھوڑا مرا۔ خالی اسم نویسی سے کیا حاصل۔ غلّہ کی فکر کرو ؛

یہ کوہستان بہت کم زراعت ہے۔ غلّہ تھڑ گیا۔ اور رسد پہنچتی نہ تھی۔ لشکر میں کہرام مچا ہُوا تھا۔ پھر کمیٹی ہوئی۔ ایسے موقع پہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ایک امیر کو ایک سردار فرض کر کے قرار پایا۔ کہ باری باری سے غلّہ کی تلاش میں نکلا کرے۔ پہاڑوں پہ چڑھ جاتے تھے۔ جہاں جہاں ذخیرہ یا آبادی کی خبر پاتے وہاں جاتے۔ اناج سمیٹتے تھے۔ اور آدمیوں کو باندھ لاتے تھے۔ جانوروں کے گوشت سے گذارہ کرتے تھے۔ آم ایسی بہتات سے تھے۔ کہ حد بیان سے باہر ہے۔ لشکر کے کنگلوں نے کھانے کی جگہ بھی وُہی کھائے۔ اور بیمار ہو کر تمام لشکر میں کثافت پھیلا دی۔ آم بھی ایک ایک سوا سوا سیر کا ہوتا تھا۔ گٹھلی چھوٹی۔ مگر مزہ جا ہو تو کھٹاس مٹھاس کچھ نہیں ؛

بادشاہ کے بھی دل کو لگی ہوئی تھی۔ ایک سردار کو ڈاک بٹھا کر بھیجا۔ کہ لڑائی کا حال دیکھ کر آئے۔ یہاں فتح ہو گئی تھی۔ وہ آیا۔ حال احوال معلوم کر کے دوسرے دن رخصت ہُوا۔ خدمت میں سب قبول ہوئیں۔ باوجود اس کے چغلخوروں نے کہہ دیا۔ کہ فتح کے بعد کوتاہی ہوئی۔ ورنہ رانا گرفتار ہو جاتا۔ بادشاہ کو بھی خیال ہُوا۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہو گیا۔ کہ شیطانی طوفان ہے ؛

سنہ ۹۸۹ھ میں اُس نے وہ دلاوری دکھائی۔ کہ ہندی لوہے نے ولایتی کے جوہر مٹا دیئے۔

ملک بنگال میں اکبری امرا نے بغاوت کی۔ یہ نمک حرام تمام نئے پرانے ترک اور بعض کابلی افغان تھے۔ انہوں نے سمجھا۔ کہ بادشاہ کی مخالفت کیلئے جب تک کوئی بادشاہی ہڈی ہمارے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ہم باغی ہی کہلائینگے۔ اس لئے مرزا حکیم کو عرضیاں لکھیں۔ اور اُس کے اُمرا کو خطوط اور زبانی پیغام بھیجے۔ خلاصہ یہ کہ آپ بھی ہمایوں بادشاہ کے لخت جگر ہیں۔ اور برابر کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ہمت شاہانہ کو حرکت دے کر اُدھر سے آئیں۔ تو غلامان قدیم اِدھر سے جاں نثاری کے واسطے حاضر ہیں۔ اُسکے پاس بھی ہمایوں کے خدمتگذار بلکہ بابری عہد کی کھرچن باقی تھی۔ اول اس کا ہوا خواہ شادمان کوکہ تھا۔ جس کا باپ سلیمان بیگ اندجانی اور دادا لقمان بیگ تھا۔ کہ کسی زمانہ میں بابر بادشاہ کا منظور نظر تھا۔ ان خام طمع لوگوں نے خیال مذکور کو اور بھی چمکا کر نوجوان شہزادہ کے سامنے جلوہ دیا۔ اُس نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور پنجاب کا رُخ کیا۔ ایک سردار کو فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ وہ پشاور سے بڑھ کر دریائے اٹک اُتر آیا۔ یوسف خاں (مرزا عزیز کا بڑا بھائی) وہاں کا جاگیردار تھا۔ اُس بے توفیق نے بے پروائی کے ساتھ ایک سردار کو روانہ کیا۔ وہ ایسا آیا۔ کہ فوج بھی ساتھ نہ لایا۔ اس حالت میں غنیم کو کیا روک سکے۔ اکبری اقبال کا طلسم دیکھو۔ کہ یہ ایک دن اِدھر سے شکار کو نکلا۔ غنیم اِدھر کے جنگل میدان دیکھتا تھا۔ رستہ میں ٹکر ہوئی۔ اور تلوار چلی۔ غنیم زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ اور پشاور آ کر مر گیا۔ اکبر نے یوسف خاں کو بُلا لیا۔ اور مان سنگھ کو سپہ سالار مقرر کر کے روانہ کیا۔

دیکھئے خاندانی خدمتگذار دل سے جی بیزار نہ ہوں تو کیا ہو اور غیروں سے کام نہ لے تو کیا کرے۔ جب بادشاہ کے بھائی بندوں میں کوئی بغاوت کرتا تھا۔ تو امیر دونو طرف دیکھتے رہتے تھے۔ ایک گھر کے آدمی کچھ اِدھر ہوتے تھے۔ کچھ اُدھر پیغام سلام برابر جاری رہتے تھے۔ جس کی فتح ہوئی۔ دوسری طرف والے بھی اُدھر جا ملے۔ شرمندہ صورت بنا کر سلام کیا۔ کہ حضور اسی خاندان کے خانہ زاد ہیں۔ ہمایوں بابر بلکہ تمام نسل تیموری میں جو گھر بگڑا۔ اسی طرح بگڑا۔ اکبر کو شاہ طہماسپ کی نصیحت یاد تھی۔ اُس نے جب سلطنت کو سنبھالا۔ تو راجپوتوں کو زور دیا اور خصوصاً ایسے موقع پر اُن سے اور ایرانیوں سے اور سادات بارہ سے کام لیتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی تجارایوں یا افغانوں سے میل کھانے والے نہ تھے۔ ایرانی جان نثاری اور وفاداری کے ساتھ لیاقت کے پُتلے تھے۔ اور سادات کی توقیر مالک شمشیر ہے۔ غرض مان سنگھ نے سیالکوٹ اپنی جاگیر میں آ کر مقام کیا۔ اور فوج کا سامان درست کرنے لگا۔ ایک چھڑ تیلا سردار فوج دے کر آگے بھیجا کہ قلعہ اٹک کا بندوبست رکھے۔ راجہ بھگوانداس نے لاہور کو مضبوط کیا۔ اُدھر مرزا حکیم نے جب سُنا۔ کہ سردار مُردار ہوا۔ تو شادمان اپنے کوکہ کو عمدہ سپاہ کے

ساتھ روانہ کیا۔ اُس کی ماں نے مرزا کو جھولا ہلا ہلا کر پالا تھا۔ وہ مرزا کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ اور حقیقت میں دلاور جوان تھا۔ افغانستان میں اس کی تلوار نے جوہر دکھائے تھے۔ اور سرداری کا نام روشن کیا تھا۔ آیا اور جھٹ قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ مان سنگھ بھی پنڈی میں پہنچ لئے تھے۔ جونہی یہ خبر پہنچی۔ راجپوتی خون سینے میں اُبل پڑا۔ اور جب تک اٹک سامنے نظر نہ آیا۔ کہیں نہ اٹکا۔ شادمان خواب غفلت میں تھا نقارہ کی آواز سُن کر جاگا۔ اور محاصرہ اُٹھا کر بڑے حوصلے کے ساتھ سامنے ہوا۔ کنور مان اور شادمان نے جگداری اور سرداری کے ارمان نکال دئیے۔ سورج سنگھ مان سنگھ کے بھائی نے ایسے حملہ ہائے مردانہ کئے کہ اُسی کے ہاتھ شادمان خاں زخم کھا کر خاک ہلاکت پر گرا ◆

جب مرزا نے سنا کہ شادمان دنیا سے ناشاد گیا تو سخت غمناک ہوا۔ اور خود لشکر لیکر چلا۔ مگر اکبر کے حکم برابر پہنچ رہے تھے۔ کہ نہ گھبرانا اور خبردار مرزا کو نہ روکنا۔ آنے دینا۔ اور جب تک ہم نہ آئیں حملہ نہ کر بیٹھنا۔ نکتہ اکبر جانتا تھا کہ یہ کوتاہ اندیش لڑکا ان بہادروں کے سامنے تھم نہ سکیگا۔ شکست ضرور کھائیگا۔ اور جب بھاگے تو ایسا نہ ہو کہ دل ٹوٹ جائے اور ترکستان چلا جائے۔ عبداللہ خاں اُسے غنیمت سمجھیگا اور اُدھر سے فوج لے کر آیا۔ تو پھر معاملہ کچھ اور ہو جائیگا۔ غرض یہ ہٹتے گئے اور وہ بڑھتا بڑھتا لاہور تک آیا۔ راوی کے کنارے باغ مہدی قاسمخاں میں آن اُترا۔ راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ۔ سید حامد بارہ اور چند امرائے دربار شہر کے ساتھ دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ اکبر کے پیام پہنچ رہے تھے۔ کہ خبردار حملہ نہ کرنا۔ مطلب یہ تھا کہ میں بھی لشکر لے کر جا پہنچوں۔ امرا چاروں طرف پھیل جائیں۔ اور اُسے گھیر کر پکڑ لیں کہ آئندہ کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔ شیر شہر میں بند تڑپتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ کہ حکم کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی شہر اور اطراف شہر کا انتظام استحکام کے ساتھ کر لیا تھا۔ اپنے اپنے مورچوں کو سنبھالے بیٹھے تھے۔ اور مرزا کے حملوں کا جواب دندان شکن دیتے تھے۔ خبر لگی۔ کہ لاہور کے مُلّا نے بلانا چاہتے ہیں۔ اور قاضی اور مفتی کاغذ کے چھپے دوڑا رہے ہیں چنانچہ اُن کا بھی روک تھام سے بندوبست کیا۔ اکبر نے یہ خبر دلی میں سنی۔ ہمت کے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور باگ اُٹھائی ◆

مرزا حکیم کو خیال تھا۔ کہ بادشاہ بنگالہ کی مہم میں مصروف ہے۔ ملک خالی پڑا ہے۔ باغ مذکور میں ۲۰ دن خوشی کی بہاریں منائیں۔ جب سنا کہ اُدھر نمک حراموں کے کام بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور اکبر سرہند میں آن پہنچا۔ تو محاصرہ چھوڑا۔ اور باغ مہدی قاسم خاں سے ایک کوس اوپر چڑھ کر پار ہوا۔ اور جلالپور علاقہ گجرات سے دریائے چناب اُترا۔ بھیرہ کے قریب جہلم اُترا اور مقام مذکور کو لوٹا۔ وہاں سے بھی بھاگا۔ مقام گھیپ کے

لٹ

پاس دریائے سندھ اُتر کر کابل کو بھاگا۔ گھاٹیوں پر گھبراہٹ میں بہت سے آدمی بہ گئے۔ ساتھ ہی سرہند کے مقام سے اکبر کا حکم پہنچا۔ کہ تعاقب نہ کرنا۔ دربار میں مصاحبوں سے بار بار کہتا تھا۔ بھائی کہاں پیدا ہے۔ گھبرا کر بھاگا ہے۔ اٹک دریا اُترنا ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ رستہ میں کوئی صدمہ پہنچے ✦

کنور مان سنگھ بموجب حکم کے معمولی راہ سے پشاور پر جا پڑے۔ اکبر نے لشکر شاہانہ ترتیب دے کر شاہزادہ مراد کو روانہ کیا کہ کابل تک پہنچے۔ اور مرزا کا پورا پورا بندوبست کر دے۔ بادشاہی امیر اور کہنہ عمل سپہ دار ساتھ گئے۔ مگر اُن میں وہی چلتی تلوار فوج ہراول کا افسر قرار پایا۔ یہ لشکر چلا اور خود بادشاہ اقبال کا لشکر لے اُن کی پشت و پناہ ہوا ✦

ہندوستان آزاد کا وطن ہے۔ مگر حق سے نہ گذریگا۔ خاک ہند کو انسان کے بے ہمت۔ بے حوصلہ کاہل، مفت خور۔ آرام طلب بنانے میں کیمیائی تاثیر ہے۔ امرائے دربار اگرچہ ایرانی تورانی افغان کی ہڈی تھے۔ مگر جب اکبر اٹک کے پاس پہنچا۔ تو امرا کو مدت تک ہندوستان میں رہنے سے وہ ملک ایک نئی دنیا نظر آنے لگا۔ سرزمین کی حالت نئی۔ چاروں طرف پہاڑ۔ ہر قدم پر جان کا خطرہ۔ انسان نئے۔ جنگل کے جانور نئے۔ لباس نئے۔ بات نئی۔ آواز نئی۔ آگے منزل سے منزل کٹھن۔ انہوں نے یہ بھی سنا تھا کہ وہاں خونی برف پڑتی ہے۔ تو انگلیاں بلکہ ہاتھ پاؤں تک جھڑ جاتے ہیں۔ لشکر کے لوگ اکثر ہندی بلکہ ہندو تھے جنہیں اٹک پار ہونا بھی روا نہ تھا۔ اس کے علاوہ کیا ولایتی کیا ہندی اب تو سب کے گھر یہیں تھے۔ کچھ ہندوستان کے مزے یاد آئے۔ کچھ بال بچے۔ سب چاہتے تھے۔ کہ معاملہ کو زبانی باتوں میں لپیٹ کر صلح کریں۔ اور پھر چلیں۔ اکبر کو عرض و معروض سے راہ پر لانا چاہا۔ اور اس کی رائے یہ تھی۔ کہ مرزا حکیم نے کئی دفعہ تنگ کیا ہے۔ اب کی دفعہ بھی اسی طرح پھر چلے۔ تو کل بھی فساد پھر اُٹھے گا۔ یہ بھی سمجھا ہو گا۔ کہ فوج کے دل پر کسی کا ایسا خطر بیٹھنا اچھا نہیں۔ وہ اس بات کو ضرور ٹٹولتا ہو گا۔ کہ اس مہم سے اِن کا پہلو بچانا خیالات مذکورہ کے سبب سے ہے۔ یا مرزا حکیم کی محبت نے اُن کے دل گداز کئے ہیں۔ شیخ ابوالفضل کو حکم دیا کہ جلسۂ مشورت بٹھاؤ۔ اور ہر شخص کی تقریر تحریر کر کے عرض کرو۔ شیخ نے ہر ایک کا بیان اور اُس کے دلائل کا خلاصہ لکھ کر عرض کیا۔ لیکن بادشاہ کی رائے پر ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ مان سنگھ جو شہزادہ کو لئے آگے بڑھا تھا۔ اُسے اور آگے بڑھا دیا۔ اور خود لشکر کو لے کر روانہ ہوئے۔ برسات نے اٹک کا پل باندھنے نہ دیا۔ خود بادشاہ اور تمام لشکر کشتیوں پر اُتر گئے۔ بھاری سامان اٹک کے کنارے چھوڑے۔ اور آپ جریدہ فوج لے کر چلے۔ ساتھ ہی بھائی کے لئے بھی دلجوئی اور فہمائش کے پیغام چلے جاتے تھے بلکہ دیر

بھی اسی غرض سے تھی۔ کہ ایسا نہ ہو۔ لشکر بادشاہی کے دوڑا دوڑ پہنچنے سے صلح و صلاح کا موقع نہ رہے اور نوجوان بھائی کی جان مُفت ہاتھ سے جائے۔ چنانچہ دریائے اٹک اُتر کر ایک فرمان مرزا حکیم کے نام پر بھیجا۔ خلاصہ مضمون یہ تھا کہ وسعت آباد ہندوستان میں سلاطین صاحب تاج و نگین تھے سب اولیائے دولت کے قبضہ میں آگیا اور سرداران روزگار نے سر جھکا دئے۔ تمہارے خاندان کے امرا اُن بادشاہوں کی جگہ بیٹھے حکومت کر رہے ہیں۔ جب یہ حال ہے تو اس دولت سے بھائی بے نصیب کیوں ہو۔ بزرگان سلف نے چھوٹے بھائی کو بمنزلہ فرزند شمار کیا ہے۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ بیٹا اور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ بھائی نہیں ہو سکتا۔ اب تمہاری عقل و دانش کے لئے یہ لائق ہے کہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر ملاقات سے خوش کرو۔ اور اس سے زیادہ دیدار سے محروم نہ رکھو ؎

مرزا کی طرف سے کچھ پیام زبانی اور ندامت نامہ عفو تقصیر کے مضمون سے آیا۔ وہ بے بنیاد اور بے قاعدہ تھا۔ مگر اکبر نے یہاں سے ایک امیر کو اُن کے ساتھ کیا اور پیغام بھیجا کہ عفو تقصیر منحصر ہے۔ اس پر کہ جو کچھ ہوا اس پر ندامت ظاہر کرو۔ آیندہ کے لئے عہد کو قسم کی زنجیروں سے مضبوط کرو۔ اور جس ہمشیرہ کو خواجہ حسن سے منسوب کیا ہے۔ اسے ادھر روانہ کر دو۔ مرزا نے کہا کہ سب صدق دل سے منظور ہے۔ مگر ہمشیرہ کے بھیجنے پر خواجہ حسن راضی نہیں ہوتا۔ اور وہ اسے بدخشاں لے گیا۔ میں بہر حال اپنے کئے سے پشیمان ہوں ؎

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیمان شدہ ام　　کافرم باز نہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام

مرزا کے عریضہ اور پیام سے امرا کو عفو تقصیر کے چرچے کا زیادہ موقع ملا۔ یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ قلیچ خاں اور یوسف خاں کوکہ وغیرہ امرائے جلیل القدر کے پاس سازش کے خط آئے ہیں۔ ہر چند اُنہوں نے لانے والوں کو قتل تک سزائیں دیں۔ لیکن اکبر نے پھر بھی مشورت کا جلسہ کیا اور ابوالفضل سکرٹری ہوئے۔ اس کمیٹی کے ۲ ممبر تھے۔ سب کی رائے کا خلاصہ یہی تھا۔ کہ جب مرزا اپنے اعمال سے ندامت ظاہر کرتا ہے۔ اور عفو تقصیر بادشاہ کے کرم کا آئین ہے۔ جرم بخشی کریں۔ ملک بخشی کریں۔ اور یہیں سے پھر چلیں۔ شیخ اگرچہ نوجوان نو دس برس کے نوکر تھے۔ نہ عمر نے ڈاڑھی کو طولانی۔ نہ اُس کے طول کو سفید کیا تھا۔ نہ کئی پشت کی خدمتگذاری تھی۔ مگر مصلحت وقت اُن کا اصول تھا۔ اس لئے خوب دل کھول کر تقریر کی۔ اور کہا کہ بادشاہی لشکر اس قدر سامان سے اتنی دور تک پہنچا۔ بادشاہ خود سر لشکر ہو کر اس میں موجود۔ اور چند منزل پر منزل مقصود۔ خالی باتوں پر۔ بے بنیاد تحریر پر۔ گمنام آدمی کی وکالت پر پھر چلنا۔ کیا مقتضائے عقل ہے اور پیچھے پھر کر

تو دیکھو۔ پنجاب کا ملک ہے۔ برسات سر پر ہے۔ دریا چڑھ گئے ہیں۔ اِس عالم میں یہ خدائی کا سامان سالہ جنگی اسباب ہمراہ۔ اُلٹا پھرنا آگے بڑھنے سے زیادہ دشوار ہے۔ نقصان اٹھا کر پھرنا اور فائدہ کو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں۔ نتیجہ پاس آگیا ہے۔ اسے حاصل کرو۔ گوشمالی خاطرخواہ کے بعد بخشائش نمایاں کا بھی مضائقہ نہیں۔ امرائے دولت اِس لُچّے دا، تقریر سے خفا ہوگئے۔ بہت گفتگو ہوئی۔ آخر شیخ نے کہا۔ بہت خوب ہر شخص اپنی رائے حضور میں عرض کردے۔ کمترین سے جب تک نہ پوچھینگے۔ نہ بولیگا۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے +

بہرحال جلسہ کی روئداد لکھی گئی۔ دوسرے دن شیخ کو تو بخار ہوگیا۔ کاغذ حضور میں پیش ہوا بادشاہ نے پوچھا کہ شیخ کہاں ہے۔ اور اُسکی رائے کیا ہے۔ ایک شخص نے چرب زبانی سے کہا بیمار ہے۔ مگر رائے ہمارے ساتھ ہے۔ بادشاہ بہت دق ہوئے۔ کہ ہمارے سامنے تو وہ رائے تھی۔ جلسہ میں ان کے ساتھ ہوگیا۔ شیخ جو دوسرے دن حضور میں گئے۔ تو دیکھتے ہیں۔ بادشاہ کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ میں سمجھ گیا۔ کہ دغا بازوں نے پیچ مارا۔ جان سے بیزار ہوگیا۔ آخر تقریر کو تحریک ہوئی اور بات کی تحقیق ہوئی۔ جب دل کو قرار آیا۔ بادشاہ نے خفا ہو کر کہا کہ کابل کی سردی اور سفر کی تکلیف لوگوں کو ڈراتی ہے۔ آرام کو دیکھتے ہیں۔ مصلحت کو نہیں دیکھتے اچھا امرا یہیں رہیں۔ ہم اہل خدمت کے ساتھ جریدہ یلغار کر کے جائینگے۔ یہ کب مجال تھی۔ کہ اکبر بادشاہ جائے۔ اور کوئی رہ جائے۔ کوچ پر کوچ چلنا شروع کیا۔ کیونکہ اب تک جو آہستہ آہستہ آتے تھے۔ اِس میں بڑا لحاظ یہی تھا۔ کہ پیغام سلام میں مرزا راہ پر آجائے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ مایوس ہو کر گھبرائے۔ اور دفعتہً ترکستان کو نکل جائے۔ نظام الدین بخشی کو بھیجا کہ یلغار کر کے جلال آباد جاکر لشکر شاہزادہ میں بیٹھ کر امرا سے مشورت کر کے کیفیت حال لکھو۔ وہ گئے اور بہت جلد واپس آئے اور یہ پیغام لائے۔ کہ اگرچہ مرزا زبان سے کہتے ہیں۔ کہ ہم ہیت ہیں ہیت ہیں۔ مگر حالت یہی کہتی ہے۔ کہ فتح حضرت کے قدموں میں ہے +

غرض پشاور میں بوجھ بھار کے اسباب ڈال دئیے۔ سلیم کو راجہ بھگوان داس کی حفاظت میں لشکر کے ساتھ چھوڑا۔ تجمل شاہانہ سے ہاتھ اُٹھایا۔ اور ہلکے ہو کر یلغار کے گھوڑوں کی باگیں لیں۔ بے ہمت کچھ رہ گئے۔ کچھ رستے سے پھر گئے +

اب مرزا حکیم کی کہانی سنو۔ فتنہ انگیز اُسے یہی کہے جاتے تھے۔ کہ اکبر ادھر نہیں آئے گا۔ اور آئیگا تو اِس قدر پچھتائے گا۔ جب اُس نے دیکھا۔ کہ بے پل اٹک سے پار ہوئے اور دریائے

لشکر کے چڑھاؤ موج در موج چلے آتے ہیں۔ تو شہر کی کنجیاں بزرگان شہر کو دے دیں۔ عیال و اطفال کو بدخشاں روانہ کر دیا۔ آپ دولت و مال کے صندوق اور اسباب ضروری لیکر باہر نکل گیا۔ ایک ارادہ یہ تھا۔ کہ فقیر ہو کر ترکستان کو چلا جائے۔ مصاحب صلاح دیتے تھے۔ کہ نگش کے رستے سے جا کر ہندوستان میں فساد برپا کرے۔ یا افغانستان کے پہاڑوں میں سر پھوڑتا پھرے اور جیسا اُدھر کا معمول ہے لوٹ مار کرتا رہے ٭

اِس کشمش و پیچ میں تھا۔ جو خبریں پہنچیں۔ کہ بادشاہ کے امرائے لشکر میں کوئی اِدھر آنے کو راضی نہیں۔ فتنہ گروں کو دیا سلائی ہاتھ آئی۔ اُنھوں نے پھر آگ سلگائی۔ صورت حال بیان کی۔ اور کہا کہ لشکر شاہی میں ہر قوم کے لوگ ہیں۔ ایرانی۔ تورانی۔ خراسانی۔ افغانی۔ کوئی آپ پر تلوار نہ کھینچیگا۔ جب مقابلہ ہوگا۔ سب آن ملینگے۔ ہندو اور ہند کی تلوار شمشیر ولایتی کے آگے چل نہیں سکتی۔ اور اُن کے دل یہاں کی سردی اور برف کے نام سے تھراتے ہیں۔ صلاح یہی ہے کہ ہمت مردانہ کر کے ایک معرکہ کریں۔ اگر میدان ہاتھ آگیا۔ تو سبحان اللہ۔ کچھ نہ ہوا تو جو رستے موجود ہیں۔ اُنہیں کوئی بند نہیں کر سکتا ٭

کچھ ان لوگوں نے اُکسایا۔ کچھ بابری خون میں دھواں اُٹھا۔ نوجوان لڑکے کی رائے بدل گئی۔ اور کہا کہ بے مرے مارے ملک نہ دونگا۔ سرداروں کو روانہ کیا۔ کہ حشری لشکر سمیٹتے چلے جاؤ۔ اور جہاں موقع ملے لشکر بادشاہی پر ہاتھ مارتے جاؤ۔ افغانستان کے ملک میں اِس طرح سے جمیعت بہم پہنچانا اور پہاڑوں کے پیچھے سے شکار مارتے جانا کچھ بڑی بات نہیں۔ وہ آگے بڑھے۔ پیچھے مرزا نے بھی ہمت کے نشان پر پھریرا چڑھایا۔ بادشاہی لشکر کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے جہاں پایا۔ پہاڑیوں کے پیچھے سے نکل نکل کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ مگر رہزنوں کی طرح۔ البتہ فریدوں خاں نے مان سنگھ کے لشکر کا پیچھا مارا۔ خزانہ بادشاہی کو لوٹ لے گیا۔ اور سرداروں کو پکڑ لیا۔ ڈاک چوکی کا افسر دورہ کے طور پر بادشاہ کے لشکر سے مان سنگھ کے لشکر تک آتا جاتا تھا۔ وہ اُس وقت پہنچا تھا۔ کہ بھیر لٹ رہی تھی۔ اُنھی قدموں بھاگا ٭

وقت وہ ہے۔ کہ کنور نوجوان شاہزادہ مراد کو لئے خورد کابل پر (کابل سے سات کوس اُدھر) جا پہنچا۔ اور بادشاہ جلال آباد سے بڑھ کر جانب سرخاب پر (مان سنگھ سے پندرہ کوس اِدھر) ہیں۔ اور مرزا کی بدحالی اور اپنی لشکر کی خوش اقبالی کی خبریں برابر چلی آتی ہیں۔ کہ دفعتہً خبر بند ہوئی۔ پھر ڈاک چوکی ہرکارے جو برابر خبریں لا رہے تھے۔ حاجی محمد احدی افسر ڈاک نے آکر عرض کی۔ کہ فوج

بادشاہی کو شکست ہوئی۔ اور افغانوں نے رستہ بند کر دیا ہے۔ اکبر کو سخت تردد ہوا۔ اتنے میں ڈاک چوکی کے افسر نے نہایت اضطرار کے ساتھ آکر خبر دی لیکن فقط اس قدر کہ لڑائی ہوئی۔ اور لشکر بادشاہی نے شکست کھائی۔ فوراً جلسہ مشورت بیٹھا۔ اول اس نقطہ پر بحث ہوئی۔ کہ خبر کیوں بند ہے۔ اس میں تقریروں نے طول کھینچا۔ اکبر نے کہا۔ اگر شکست ہوتی تو اتنا لشکر کثیر تھا۔ اور فقط پندرہ۔ کوس کا فاصلہ اب تک سینکڑوں لوٹے مارے آجاتے۔ ایک آدمی کا آنا اور پھر خبر کا بند ہو جانا چہ معنی دارد۔ یہ خبر غلط ہے۔ دوسرا نقطہ یہ کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ بعض نے یہ کہا۔ کہ اُلٹے قدموں پھرنا چاہئے۔ جو لشکر شاہی پیچھے آتا ہے۔ اُسے ساتھ لے کر پورے سامان سے آئیں اور قرار واقعی تدارک کریں۔ اس پر اعتراض ہوا۔ کہ اگر بادشاہ نے ایک قدم پیچھے ہٹایا تو لاہور تک ٹھیرنے کو جگہ نہ ملیگی۔ بالکل ہوا اُکھڑ جائیگی۔ مرزا کا دل ایک سے ہزار ہو جائیگا۔ اپنے لشکر کے جی چھوٹ جائینگے۔ افغانوں کے کتے بلیاں شیر ہو کر تمہارے سپاہیوں کو پھاڑ کھائینگے۔ ملک افغانی ہے۔ دیکھو ہماری طاقت کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ ایک فوج اٹک کے کنارے پڑی ہے۔ دوسری پشاور میں۔ تیسری خورد کابل میں پہنچ لی۔ تین جگہ لڑائی آپڑی۔ ایک رائے یہ بھی تھی۔ کہ یہیں توقف کرنا چاہئے۔ اور جو لشکر پیچھے آتا ہے۔ اُس کا انتظار کرنا چاہئے۔ اس صلاح میں یہ قباحت نکلی کہ اس وقت توقف بھی ہٹنے سے کم نہیں۔ اگر بادشاہ چند سرداروں کے ساتھ بیچ میں گھر گئے۔ تو بھی مشکل ہے۔ ابوالفضل وغیرہ مزاج شناس بول اُٹھے کہ توکل بخدا بڑھے چلو۔ اگرچہ رکاب میں جاں نثار کم ہیں۔ مگر دلوں میں زیادہ ہیں۔ کیونکہ جنگ آزمودہ جانباز ہیں۔ اور صدق دل سے وفادار ہیں۔ اگر مرزا حکیم نے لشکر کو روکا بھی ہوگا۔ تو دمامۂ دولت کا آوازہ سنتے ہی کھنڈ کر ہٹ جائیگا۔ یہی رائے درست ٹھیری۔ اور آگے روانہ ہوئے۔

خبر کے بند ہونے کا سبب فقط اتنی بات تھی۔ کہ مرزا کا ماموں فریدوں فساد کا فتیلہ لئے پہاڑ کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ اس نے اپنے بازوؤں میں یہ طاقت نہ دیکھی۔ کہ ان شیروں کے ساتھ سینہ بہ سینہ ہو کر لڑے۔ اس لئے فوج کے پیچھے سے آکر چنداول پر گرا۔ بھیر کی بساط کیا تھی بھاگنے لگے۔ جنگی دلاور پلٹ کر آئے۔ کہ افغان لوٹ کے لئے بھاگنے کو فتح سے سوا کامیابی سمجھتے تھے۔ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ بادشاہ نے کئی لاکھ کا خزانہ بھیجا تھا۔ جو قلیج خاں کی تفویض میں تھا۔ اور وہ بھی دنبالہ فوج میں تھا۔ اس بھاگا بھاگ میں حریفوں کا ہاتھ اس پر پڑ گیا۔ خزانے کے اونٹ بھی گھسیٹ لے گئے۔ اسی عالم میں افسر ڈاک چوکی جا پہنچا تھا۔ بھیر کو بھاگتا دیکھ کر ہٹا اور بادشاہ

کو خبر پہنچائی۔ غرض دلاور بادشاہ امرائے رکابی کے ساتھ باگیں اُٹھائے چلا جاتا تھا۔ ہر قدم پر ہمت گھوڑے کو تھپکی اور حوصلہ ایڑ لگاتا تھا۔ سرخاب اور جلدلک کے بیچ میں تھے۔ جو فتح کی خوشخبری پہنچی۔ وہیں گھوڑے سے اُتر کر زمین پر سر رکھ دیا۔ اور دیر تک شکر الٰہی کے مزے لیتا رہا ؛

اب میدان جنگ کی کیفیت سُننے کے قابل ہے۔ اگرچہ خزانہ بادشاہی کے لوٹنے سے مرزا کو غرور بڑھ گیا تھا لیکن دل گھٹا جاتا تھا۔ دن کی لڑائی سے جی چراتا تھا اور چاہتا تھا۔ کہ شبخون مارے۔ مان سنگھ فوج لئے تیار رہتا اور خدا سے چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح حریف میدان میں آئے۔ اور وہ کم ہمت بے دل سپاہ پیادہ جمع کئے جاتا تھا۔ سازش اور آمیزش کی غرض سے امرائے لشکر کے نام خطوں کے چربے دوڑاتا تھا۔ کہ بادشاہ ان سے بدگمان ہو۔ سپہ سالار شاہی شہزادہ مراد کو لئے خود کابل پر پڑا تھا۔ مرزا سامنے پہاڑ پر تھا۔ ایک شب بہت زیادہ شورش معلوم ہوئی۔ رات کو سامنے نہایت کثرت سے آگیں جلتی نظر آئیں۔ سپاہ ہند دیکھ کر حیران ہو گئی۔ شب برات کی رات تھی۔ یا دیوالی کا ہنگامہ۔ اُنہوں نے اپنے بندوبست ایسے پختہ کئے کہ حریف شبخون مارے تو پچتا کر پیچھے ہٹے۔ روشنی صبح نے جنگ کے پیام پہنچائے۔ مرزا ایک گھاٹی سے فوج لے کر نکلا۔ اور لڑائی کا میدان گرم ہوا۔ نوجوان سپہ سالار ایک پہاڑی پر کھڑا افسوس کر رہا تھا۔ کہ ہائے میدان نہیں۔ ہراول نے بڑھ کر ٹکر ماری۔ بڑا کشت و خون ہوا۔ مرزا بھی خوب جان توڑ کر لڑا۔ وہ بھی سمجھا ہوا تھا۔ کہ اگر ہندوستانی حال خوروں کے سامنے سے بھاگا۔ تو کالا منہ لے کر کہاں جاؤں گا۔ ادھر مان سنگھ کو بھی راجپوت کے نام کی لاج تھی۔ خوب بڑھ بڑھ کر تلواریں ماریں۔ اور ایسے جوش دکھائے۔ کہ آخر دال نے گوشت کو دبا لیا۔ اور مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس معرکہ میں ہراول کی ہمت نے ایسا کام کیا۔ کہ اور لشکر کو حوصلہ نکالنے کا ارمان رہ گیا ؛

دوسرے دن صبح کا وقت تھا۔ کہ فریدوں خاں مرزا کا ماموں پھر فوج لے کر نمودار ہوا۔ مان سنگھ ہی کی فوج مہرہ پر تھی۔ تلواریں میان سے نکلیں اور تیر کمانوں سے چلے۔ بندوقوں نے آگ اُگلی۔ اور توپیں دل میں ارمان لئے کھڑی تھیں۔ کہ پہاڑی سرزمین تھی۔ غرض جا بجا لڑائی پڑ گئی۔ کابلی بہادر شیر تھے۔ مگر یہ بھی منہ کا نوالہ تو نہ تھے۔ کہ نگل جاتے۔ ریل پیل ہو رہی تھی۔ کہیں یہ چڑھ جاتے تھے کہیں وہ بڑھ آتے تھے۔ مان سنگھ ایک پہاڑی پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جدھر بڑھنے کا موقع دیکھتا تھا۔ اُدھر فوج کو آگے بڑھاتا تھا۔ جدھر جگہ نہیں پاتا تھا۔ ہٹاتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ زمین کی ناہمواری انتظام جمنے نہ دیتی تھی۔ دفعتہً غنیم زور شور کر کے آیا۔ ہراول کی فوج سینہ سپر کر کے سامنے ہوئی۔ مگر لڑائی

دست و گریبان تھی۔ بعض نے جان دے کر نیک نامی حاصل کی۔ بعض نے ہٹنا غنیمت سمجھا۔ سپہ سالار تاڑ گیا کہ میری سپہ کا رنگ بدلا۔ تڑپ اٹھا۔ بھائی کو پہلو سے جدا کیا۔ سُورما سردار تلوائیے راجپوت آس پاس جمے ہوئے تھے۔ انہیں بھی حکم دیا اور موقع دیکھ دیکھ کر فوج فوج کمک بھیجنی شروع کر دی۔ گجنالیں بھری تیار تھیں۔ ہاتھیوں کو ریلا۔ اور توپوں کو مہتاب دکھائی کہ جنگل گونج اٹھا۔ اور پہاڑ دھواں دھار ہو گئے۔ بادشاہی ہاتھی حلقۂ خاصہ کے تھے۔ شیروں کے شکار پر لگے ہوئے تھے۔ بادلوں کی طرح پہاڑیوں پر اُڑنے لگے۔ یہ آفت دیکھ کر افغانوں کے بڑھے ہوئے دل پیچھے ہٹے۔ تھوڑی دیر میں قدم اکھڑ گئے۔ نشانچی نے نشان پھینکا۔ اور سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مرزا نے چاہا تھا۔ کہ اگر فوج نے جان عزیز کی ہے۔ تو میں اپنی جان کو ننگ و نام پر قربان کر دوں۔ مگر چند جاں نثاروں نے آ کر گھیر لیا۔ مرزا نے جھنجلا کر انہیں ہٹایا۔ اور حملہ پر مستعد ہوا۔ محمد علی اسپ باگ پکڑ کر گھوڑے سے لپٹ گیا۔ اور کہا کہ پہلے مجھے مار لو۔ پھر اختیار ہے۔ خلاصہ یہ کہ مرزا بھی بھاگ گئے۔

سُورما راجپوتوں نے بڑا ساکھا کیا اور دلاوروں نے خوب خوب کارنامے دکھائے۔ بھاگتوں کے پیچھے گھوڑے اٹھائے۔ تلواریں کھینچ لیں۔ اور دُور تک مارتے اور للکارتے چلے گئے۔ پھر بھی جو تعاقب کا حق تھا۔ اُس کا ارمان نہ نکلا اور خیال یہ بھی تھا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ مرزا کسی ٹیلے کے پیچھے سے چکر مار کر فوج کا پیچھا مارے۔ بعض بہادر گھوڑے مارتے ایسے گئے کہ کئی کوس آگے بڑھ کر ایک ٹیلے پر مرزا کو جا لیا۔ اور اُس نے جان کو بچا لینا فتح عظیم سمجھا۔ سپہ سالار فتح کے دمامے بجاتا کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ اور اُس دن بیت خاک پر ڈیرہ تھا۔ کہ مان سنگھ سرداروں کو ساتھ لئے پہنچے۔ سرخروئی کے ساتھ فتح کی مبارکباد ادا کی۔ بادشاہ نے کابل میں پہنچ کر ملک پھر مرزا حکیم کو عنایت کیا۔ اور پشاور اور سرحدی ملک کا انتظام اور اختیارات کنور مان سنگھ کے سپرد کر آئے۔ (اور کنارہ اٹک پر قلعہ تعمیر کیا) اس قابلیت کی تعریف نہ زبان سے ہو سکتی ہے۔ نہ قلم سے کہ ایک نوجوان ہندو راجہ نے افغانوں میں بہت اچھی رسائی پیدا کی۔ اور سرحدی افغانوں کا بھی ایسا بندوبست کیا۔ کہ سرشوری کی گردنیں ڈھیلی ہو گئیں۔

سنہ ۹۹۳ھ میں حال و استقبال کی مصلحتوں پر نظر کر کے صلاحیں ہوئیں کہ خاندان کچھواہہ سے ولیعہد سلطنت کا تعلق زیادہ کیا جائے۔ راجہ مان سنگھ کی بہن سے شادی ٹھیری۔ اس شادی کی دھوم دھام اور آرائشوں کی تفصیل کہیں لکھی نہیں۔ اور ہوتی بھی تو کتاب ہی بنتی۔ ملا صاحب نے

تکمل طور پر لکھا ہے۔ کہ سلیم کی عمر سولہ برس کی تھی۔ بادشاہ معہ اُمرائے دربار آپ بیاہنے چڑھے۔ مجلس عقد میں قاضی مفتی اور شرفائے اسلام حاضر ہوئے۔ نکاح پڑھا گیا۔ دو کروڑ تنگے کا مہر بندھا۔ پھیرے بھی ہوئے۔ ہون وغیرہ ہندو کی رسمیں بھی ہوئیں۔ دُلہن کے گھر سے دُولہا کے گھر تک پالکی پر برابر اشرفیاں نچھاور کرتے لائے۔ لڑکی کے باپ (راجہ بھگوان داس) نے کئی طویلے گھوڑے۔ سو ہاتھی۔ غلام حبشی۔ چرکس۔ ہندی۔ صدہا لونڈی غلام دیئے دلھن کا گہنا کیا گنا۔ باسن تک مرصّع اور سونے چاندی کے تھے۔ لباس ہائے رنگارنگ کے صدہا صندوق بھرے ہوئے۔ فرش ہائے بوقلموں بے حد و شمار جہیز میں دیئے۔ امرا کو بھی ہر ایک کے مناسب حال خلعت اور گھوڑے۔ عراقی۔ ترکی۔ تازی۔ سنہری۔ رُپہلی زین اور سازو یراق سے آراستہ تیار کئے۔ ابوالفضل لکھتے ہیں:

دین و دنیا را مبارک باد کین فرخندہ عقد | از برائے انتظام دین و دنیا بستہ اند
وز نگارستان دولت نور چشم شاہ را | حجلہ چوں پردہ ہائے دیدہ رنگیں بستہ اند

برادرِ صورت و معنی شیخ ابوالفضل فیضی نے قطعہ تاریخ کہا ہے

زہے عقد دُر پاش سلطان سلیم | کہ پرتو دہد سالِ امید را
ز پروردن آفتاب دول | قران شدہ ماہ و ناہید را

کابل سے خبریں آرہی تھیں۔ کہ محمد حکیم مرزا کو بادہ خواری برباد کر رہی ہے۔ سنہ ۹۹۴ھ میں اُس نے کام تمام کر دیا۔ اکبر نے کنور مان سنگھ کو زیہ پوار اگا رکھا تھا حکم پہنچا کہ فوراً فوج لے کر کابل میں جا بیٹھو۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا۔ کہ فریدوں خاں اس کا ماموں اور اکثر مصاحب و ملازم جو مرزا کے پاس تھے۔ وہی اُس کے خیالات کو پریشان کیا کرتے تھے۔ اب وہ کچھ اس خطرے سے کہ خدا جانے دربار میں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو۔ اور بعض اپنے فساد جنگی کے سبب سے اس بات پر آمادہ ہوئے کہ مرزا کے بچوں کو ساتھ لے کر ترکستان میں عبداللہ خاں اُذبک کے پاس چلے جاویں۔ اکبر نے دو خاندانی خدمت گذاروں کو روانہ کیا۔ فرمان بھیج کر سب کو دلاسے دیئے۔ اور پیچھے پیچھے آپ پنجاب کو روانہ ہوا۔ اور مان سنگھ کابل کو جس کے اٹک پار ہوتے ہی غول کے غول افغان سلام کو حاضر ہونے لگے۔ اُس نے کابل پہنچ کر وہ ملکداری کی لیاقت دکھائی۔ جو کہ اُسے بزرگوں کی صدہا سالہ فرمانروائی سے میراث میں پہنچی تھی۔ اُس کی رسائی اور لطف و اخلاق نے اہل کابل کے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ اور دو برس پہلے جو مردمیں کی تھیں اُنہوں نے تائید کی۔ مرزا نے مرنے سے پہلے اپنی معافی تقصیرات کی عرضی حضور میں بھیجی تھی۔ اور دونو بچوں کو اور بخت النسا بہن کو اور اُسکے

بیٹے مرزا والی کو روانگی دربار کے ارادہ سے جلال آباد بھیج دیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے مرزا کا یتیم افراسیاب گیارہ برس کا اور کیقباد چار برس کا اور اس کا بھانجا والی بھی خورد سال تھا۔ فریدیں خاں وغیرہ فتنہ انگیز اپنے خیالات فاسد میں گمراہ ہو رہے تھے۔ مان سنگھ سب کو رسائی سے راہ راست پر لایا اور حکمت عملی کی قید میں مسلسل کر لیا۔ جگت سنگھ فرزند کو وہاں چھوڑا اور آپ سب کو لیکر روانہ ہوا۔ راولپنڈی کے مقام میں اکبر کے پایہ تخت کو بوسہ دیا اور سب کی ملازمت کروائی۔ بادشاہ بہت دلداری سے پیش آیا۔ پچپن چھیاسٹھ ہزار روپے انعام دئے۔ وظیفے اور جاگیریں مناسب حال عنایت کرکے محبت کی تخم ریزی کی۔ دریا دل اکبر نے یوسف زئی وغیرہ سرحدی علاقہ کنور کو دے دیا اور کابل میں راجہ بھگوان داس کو بٹھایا۔ وہاں راجہ کو قدیمی بلکہ خاندانی مرض نے دیوانہ کر دیا۔ کنور نے فوراً جاکر راجہ کی جگہ لی اور رواج کرنے لگا۔ کنور نے اس حکومت میں کام یہ کیا کہ کوہستان یوسف زئی کے علاقے میں آفریدی وغیرہ خیلہائے افغانی جو فساد کی آگ جلا رہے تھے انہیں ملک سے نکال دیا۔ اکبر اس عرصہ میں اٹک کے کنارے کنارے پھرتا تھا۔ کبھی شکار کھیلتا تھا۔ کبھی قلعہ اٹک کے کارخانہ میں توپ ریزی کا تماشہ دیکھتا تھا۔ اور اُس میں عمدہ عمدہ ایجاد کرتا تھا۔ یہ کھیل تماشے بھی مصلحت سے خالی نہ گئے۔ یوسف زئی کے سرداروں کا انتظام جم گیا۔ کابل کا بندوبست ہو گیا۔ کوتہ اندیش افغان سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ملک کا مالک آپ موجود ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ عبداللہ خاں اوزبک جو سمجھ رہا تھا۔ کہ کابل کا شکار اب میں نے مارا۔ وہ ان کامیابیوں اور سرحدی کارروائیوں سے ڈرا۔ کہ مبادا اپنے ملک موروثی پر آئے۔ اُس نے تحفہ ہائے شاہانہ کے ساتھ ایلچی بھیج کر عہد نامہ کیا ✦

۹۹۵ھ میں مان سنگھ کی بہن کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ خسرو نام رکھا۔ آزاد زمانہ کی سیہ کاری اور فتنہ سازی کو دیکھ کر عقل حیران ہے۔ اسی شہر لاہور میں وہ بچہ ہوا تھا۔ یہیں چھٹی کی شادیاں اور مبارک بادیاں ہوئی تھیں۔ وہی بچہ جوان ہو کر باپ سے باغی ہوا۔ اور اسی لاہور میں گرفتار ہو کر آیا۔ تورۂ چنگیزی کے بموجب تلوار گلے میں لٹکتی ہے۔ سر جھکائے تھر تھر کانپتا ہے اور دربار میں باپ کے سامنے کھڑا ہے۔ آج نہ وہ ہے نہ وہ۔ سب افسانہ ہو گیا ؎

کھیل ہے پتلیوں کا بزم جہاں کا عالم	رات بھر کا یہ تماشا ہے سحر کچھ بھی نہیں

جب اکبر کی حسن تدبیر اور عقل خداداد کا ذکر آئے۔ تو مان سنگھ کے حسن لیاقت کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اُس کی نوجوان عمر اور کابل جیسا ملک۔ جہاں سر شور ملّانوں اور وحشی مسلمانوں کی خدائی۔ اور مان سنگھ

ان پر فرمانروائی کرے۔ وہ بیس دن سے زیادہ رہا۔ اور زور شور سے حکومت کرتا رہا فقط راجپوت سردار اور راجپوت فوج اسکے ماتحت نہ تھی۔ بلکہ ہزاروں ترک افغانی ہندوستانی اسکے ساتھ تھے۔ برفانی پہاڑ پر کیا گرمی کیا جاڑے شیر کی طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ اور جہاں خرابی پڑتی اُس کی اصلاح کرتا تھا +

۹۹۵ھ میں راجہ بھگوان داس کو حرم سرا اور محلوں کا انتظام سپرد ہوا۔ اور یہ خدمت انہیں اکثر سپرد رہتی تھی۔ سفر میں حرم سرا کی سواریوں کا انتظام۔ مریم مکانی کی سواری کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ افغانستان سے شکایتیں پہنچیں۔ کہ راجپوت اہل ملک پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ اس لئے کنور مان سنگھ کو بہار کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ بنگالہ میں افغانوں کی کھرچن کمینہ سرشور باقی تھی۔ مغلوں کی بغاوت کے زمانہ میں وہ بھی نکمے نہ بیٹھے تھے۔ انھوں نے قتوجاٹ کو اپنا سردار بنایا اور ملک اڑیسہ اور دریائے اوڑ کے کنارے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ کنور مان سنگھ نے وہاں جا کر بندوبست شروع کئے۔ کئی برس پہلے جن امرائے نمک حرام نے ملک بنگالہ میں علما و مشائخ کے فتوے ہاتھ میں لے کر بادشاہ پر بے دینی کا اشتہار دیا تھا۔ اور تلواریں کھینچ کر جا بجا بغاوت کے نشان کھڑے کر دئے تھے۔ ان کی گردنیں جنگی خونریزیوں سے توڑی گئی تھیں۔ مگر بعض اُن میں سے اب بھی زمینداروں کے سایہ میں سر چھپائے بیٹھے تھے۔ اور جب موقع پاتے تھے۔ فساد کرتے تھے۔ اُن کے رستے بند کئے۔ راجہ پورن مل کنندھوریہ عظیم الشان قلعہ بنا کر سمجھے تھے۔ کہ ہم لنکا کے کوٹ میں بیٹھے ہیں۔ اُنہیں تلوار کے گھاٹ پر اُتار کر سیدھا کیا۔ لوٹ مار میں خزانے اور مال خانے بہت کچھ ہاتھ آئے۔ اپنے بھائی کے لئے اُس کی بیٹی لی۔ صلح کے وقت تحفہ تحائف میں۔ رخصت کے وقت جہیز میں سب کچھ پایا۔ سنگرام کو لوہے کی چوٹ سے دبایا۔ انند چیرہ دہ پر چڑھ گیا۔ اُس سے اطاعت کے ساتھ تحائف گراں بہا لئے۔ نفائس و عجائب کے ساتھ ۵۴ ہاتھی دربار میں بھیجے +

۹۹۷ھ میں اکبر کا دل گلگشت کشمیر کی ہوا میں لہلہایا۔ راجہ بھگوان داس کو لاہور کا انتظام سپرد کر کے روانہ ہوئے۔ یہاں راجہ ٹوڈرمل سرگباش ہوئے۔ راجہ بھگوان داس انہیں اوّل منزل پہنچانے گئے۔ آتے ہی پیٹ میں ایسا درد اُٹھا۔ کہ لٹا دیا۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ پانچویں دن دنیا سے سفر کیا۔ شیخ ابوالفضل اُن کے باب میں رائے لکھتے ہیں۔ راستی اور وقار سے بہرہ پایا تھا۔ بادشاہ کشمیر سے پھر کر کابل کو چلے تھے۔ رستے میں خبر پہنچی۔ بہت افسوس کیا۔ کنور مان سنگھ کو فرمان راجگی کا خطاب۔ خلعت خاصہ اسپ بازین زریں اور پنجہزاری منصب سے سربلند کیا +

بہار کے بندوبست سے مان سنگھ کی خاطر جمع ہوئی۔ مگر اکبری سپہ سالار سے کب بیٹھا جاتا تھا۔

۵۹۵ھ میں اڑیسہ کی طرف گھوڑے اُٹھائے۔ ملک مذکور سرحد بنگالہ کے پار واقع ہے۔ اول پرتاب دیو وہاں کا راجہ تھا۔ نرسنگھ دیو اُس کے ناخلف بیٹے نے باپ کو زہر سے مارا۔ اور جلد مارا گیا سلیمان کرارانی دانش و دین کا پتلا اُس وقت بنگالہ میں فرماں روائی کرتا تھا +

اُس نے ملک مذکور کو مفت مار لیا۔ چند روز کے بعد زمانہ نے اُس کا ورق بھی اُلٹا +

اوڑیسہ قتلو خاں وغیرہ افغانوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس وقت مان سنگھ نے نشان فتح پہ پھریرا بڑھایا۔ برسات دل بادل کے لشکر میں بجلی کی برق چمکا رہی تھی۔ مینہ برس رہے تھے۔ دریا چڑھے ہوئے تھے۔ اُدھر سے قتلو آیا۔ اور ۲۵ کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈال کر میدان جنگ مانگا۔ مان سنگھ نے بڑے بیٹے کو مقابلے پر بھیجا۔ وہ باپ کا رشید فرزند تھا۔ مگر ابھی نوجوانی کا مصالحہ تیز تھا۔ ایسا گرم گیا۔ کہ انتظام کا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور فتح نے شکست کی صورت بدلی۔ سپہ سالار نے خود آگے بڑھ کر بگڑے کام کو سنبھالا۔ سرداروں کی دلجوئی کی۔ اور پھر فوج کو سمیٹ کر سامنے کیا۔ غیبی مدد یہ ہوئی۔ کہ قتلو خاں مر گیا۔ افغانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ بہت سردار ٹوٹ کر آن ملے۔ جو باقی رہے۔ وہ اس اقرار پر صلح کے خواہاں ہوئے۔ کہ اکبری خطبہ پڑھا جائیگا۔ خراج و تحائف سالانہ پیشکش کیا کرینگے۔ جب حکم ہوگا۔ ادائے خدمت کو حاضر ہونگے۔ سپہ سالار نے بھی صلح ہی میں مصلحت دیکھی۔ ۱۵۰ ہاتھی اور تحائف گراں مایہ لے کر ارسال دربار کئے +

جب تک عیسٰے (قتلو کا وکیل) زندہ رہا۔ عہد و پیمان کا سلسلہ درست رہا۔ چند سال کے بعد نئے نوجوان افغانوں کی ہمت نے زور کیا۔ اُنھوں نے اول جگن ناتھ کا علاقہ مارا۔ پھر بادشاہی ملک پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ مان سنگھ خدا سے چاہتا تھا۔ کہ عہد شکنی کے لئے کوئی بہانہ ہاتھ آئے۔ فوراً فوج جرار لے کر چلا۔ آپ دریا کے رستے بڑھا۔ سرداروں کو جھار کھنڈ کی راہ سے بڑھایا۔ اُنھوں نے دشمن کے علاقہ میں ہو کر فتح و فیروزی کے نشاں لہرا دئے۔ افغان ہرچند صلح کی جھنڈیاں ہلاتے رہے۔ مگر اب یہ کب سنتا تھا۔ لڑائی کا میدان مانگا۔ ناچار اُنھوں نے بھی ہاتھ پاؤں سنبھالے۔ بڈھے اور جوان بڑے بڑے پٹھان جمع ہوئے۔ ہمسایہ کے راجاؤں نے بھی رفاقت کی اور شاہانہ لڑائی آن پڑی۔ بہادروں نے ہمت کے کارنامے دکھائے۔ بڑے رن پڑے۔ ملک مذکور قدرت کا فیل خانہ ہے۔ ہاتھی میدان جنگ میں مینڈھوں کی طرح لڑتے اور دوڑتے پھرتے تھے۔ اور اکبری بہادر انھیں تیر دوز کر کے خاک تودہ بناتے تھے۔ آخر سورما سپہ سالار نے فتح پائی۔ اور ملک کو بڑھاتے بڑھاتے دریائے شور تک پہنچا دیا۔ شہر شہر میں اکبری خطبہ پڑھا گیا۔ جگن ناتھ جی

نے بھی اکبر بادشاہ پر دیا کی۔ کہ اپنا مندر ملک سمیت دے دیا۔ مان سنگھ بھانی وغیرہ (مشرقی حصّہ سندربن) میں پھیلتا جاتا تھا۔ مناسب معلوم ہؤا۔ کہ ادھر ایک شہر حاکم نشین آباد کیا جائے جہاں سے ہر طرف مدد پہنچ سکے۔ دریائی حملے سے محفوظ ہو۔ اور غنیمان بدنیت کی چھاتی پر پتھر رہے صلاحوں اور تلاشوں کے بعد آگ محل کے مقام پر صلاح ٹھیری۔ مبارک ساعت دیکھ کر بنیاد کا پتھر رکھا اور اکبر نگر نام رہا (یہی راج محل مشہور ہے) اِس گل زمین کو شیر شاہ نے اپنی گلگشت اور تفریح کے لئے نامور کیا تھا۔ اب تک بھی کوئی مسافر ادھر جا نکلتا ہے۔ تو بکاولی اور بدرمنیر کی خیالی داستانیں مٹی تصویروں کی طرح صفحۂ خاک پر نظر آتی ہیں۔ اسی مقام پر قلعہ عظیم الشان تعمیر کر کے سلیم نگر نام رکھا۔ قلعہ شیر پور۔ مورچہ اکبر نگر بلند عمارتوں۔ سجے ہوئے گھروں۔ چلتے بازاروں سے چند روز میں طلسمات کا عالم دکھانے لگا۔ اور مان سنگھ کے دمامۂ دولت کی آواز برہم پتر کے کنارے کنارے تمام مشرقی علاقہ بنگال میں گونجنے لگی ؎

راجہ کے کارنامے اور اُس کی ہمتوں کے ہنگامے قلم تحریر کو سر اونچا نہیں کرنے دیتے۔ مگر اکبر کی خوبیاں بھی ایسے عالی درجہ پر ہیں۔ جنہیں لکھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ملک اڑیسہ میں راجہ رام چند ایک فرماں روا تھا۔ وہ مان سنگھ کے دربار میں آپ نہ آیا۔ بیٹے کو بھیج دیا۔ راجہ نے کہا۔ کہ بیٹے کا آنا صحیح نہیں۔ راجہ کو خود آنا چاہئے۔ راجہ قتلو کی مہم میں اِن کی مدد بھی کر چکا تھا۔ مگر آنے کی جُرأت نہ کرتا تھا۔ کہ ملکی معاملے ہیں۔ خدا جانے۔ وہاں جا کر کیا ہو۔ مان سنگھ نے سب خدمتوں کو بالائے طاق رکھا اور بیٹے کو فوج دے کر بھیج دیا۔ اس نوجوان نے جاتے ہی لوٹ مار کر اُس کے علاقہ کی خاک اُڑا دی۔ کئی قلعے فتح کئے۔ راجہ قلعہ بند اور محاصرہ کا دائرہ تنگ ہؤا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ مان سنگھ کے نام فرمان بھیجا۔ کہ اگر راجہ رام چند اِس وقت نہیں آیا۔ تو پھر آجائیگا۔ ایسا ہرگز نہ چاہئے۔ ملک و دولت کی ترقی اِن باتوں سے نہیں ہوتی۔ جلد محاصرہ اُٹھالو۔ کہ آئین حق شناسی کے خلاف ہے مان سنگھ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور بیٹے کو واپس بلایا۔ سنہ ۱۰۰۰ھ میں بنگالہ اور اوڑیسہ کے ملک کو پاک صاف کر کے حسب الطلب حاضر دربار ہؤا۔ نامی راجہ اور سردار اُس ملک کے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُن کی بھی ملازمت کروائی اور دولت کے ماتھے پر نور کا تلک لگایا۔ بنگالہ کی صفائی کا تمغا مورخوں نے اِس کے نام پر لکھا ہے ؎

سنہ ۱۰۰۲ھ کے جشن سالانہ میں اکبر نے خسرو جہانگیر کے بیٹے کو باوجود خرد سالی کے پنجہزاری منصب پر نامزد کر کے اُڑیسہ اُس کی جاگیر میں دیا۔ اور بعض سرداران راجپوت کے حقوق اس میں شامل کئے

راجہ مان سنگھ کو اتالیقی کا اعزاز بخشا۔ اور اُس کی سرکار کا انتظام بھی راجہ ہی کے سپرد کیا۔ راجہ کو ملک بنگالہ دے کر اُدھر روانہ کر دیا۔ اور اُسی ملک پر اُس کی تنخواہ مجرا کر دی۔ نوجوان جگت سنگھ اب ایسا ہو گیا تھا۔ کہ بذات خود بادشاہی خدمتوں کا سرانجام کر سکے +

سنہ ۱۰۰۵ھ میں کوچ بہار کے راجہ نے سورما سپہ سالار کے دربار میں اکبری اطاعت کا سجدہ ادا کیا۔ ملک مذکور کا طول ۲۰۰ کوس۔ عرض چالیس اور سو کے بیچ میں پھیلتا سمٹتا چلا جاتا ہے۔ چار لاکھ سوار دو لاکھ پیادے۔ سات سو ہاتھی۔ ہزار جنگی کشتیاں جاں نثاری کو حاضر رہتی تھیں۔ اگرچہ اُس کے بیٹے جگت سنگھ کو سنہ ۱۰۰۵ھ میں کوہستان پنجاب کا انتظام سپرد ہوا۔ مگر مان سنگھ پر یہ سال نہایت منحوس تھا +

ہمت سنگھ اُس کے بیٹے نے امتلاء سے اسہال اور اسہال سے بدحال ہو کر انتقال کیا۔ ہچکی لگ گئی تھی۔ اسی میں جان نکل گئی شیخ ابوالفضل کہتے ہیں۔ جوانمرد تھا۔ انتظام اور سربراہی کی لیاقت سرشت میں تھی۔ موقع وقت پر چوکتا نہ تھا۔ اُس کے مرنے سے تمام قوم کچھواہہ میں کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کی دلداری نے زخموں پر مرہم رکھا۔ سب کی تسلی ہو گئی +

اسی سنہ میں عیسیٰ خاں افغان نے بغاوت کی۔ مان سنگھ نے درجن سنگھ اپنے بیٹے کو فوج دے کر بھیجا۔ سرداروں میں ایک نمک حرام غنیم سے ملا ہوا تھا۔ اور خبر پہنچا رہا تھا۔ دشمن ایک جگہ پر بے خبر آن پڑا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ دُرجن سنگھ مارا گیا۔ اور بہت جانیں ضائع ہوئیں۔ تمام مال خانے لٹ گئے۔ پھر عیسیٰ خاں اپنے کئے پر پچھتایا۔ جو کچھ مال لیا تھا۔ ہزار ندامت اور عذر معذرت کے ساتھ واپس کیا۔ انتہا ہے کہ ہن بھی دیدی۔ ہائے اور تو سب کچھ آگیا۔ دُرجن سنگھ کہاں سے آئے +

سنہ ۱۰۰۸ھ میں مان سنگھ کا اقبال پھر نحوست کی سیاہ چادر اوڑھ کر نکلا۔ صورت یہ ہوئی کہ اکبر کو جس طرح سمرقند و بخارا کے لینے کی آرزو تھی۔ اسی طرح رانائے میواڑ سے اطاعت لینے کا ارمان تھا۔ چنانچہ عبداللہ خاں اُزبک والی توران کے مرتے سے بڑے بڑے ارادوں کے منصوبے باندھے اور شطرنج پر مہرے پھیلائے۔ ارادہ یہ تھا کہ ادھر کے منصوبے جیت کر خاطر جمع سے ملک موروثی پر چلئے۔ شہزادہ دانیال۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ شیخ ابوالفضل کو دکن پر بھیجا تھا۔ اور پیچھے پیچھے آپ تھا۔ جہانگیر کو مہم رانا پر روانہ کیا۔ مان سنگھ کو پُرانے پُرانے امیروں کے ساتھ سپہ سالار کر کے ہمراہ کیا۔ اور بنگالہ اُسکی جاگیر جگت سنگھ اُس کے ولیعہد کو عنایت کی۔ نوجوان کنور خوشی خوشی روانہ ہوا

آگرہ میں جا کر سامان میں مصروف تھا۔ کہ[1] دفعتہً مر گیا۔ قوم کچھواہہ کے گھر گھر میں ماتم پڑ گیا۔ اکبر کو بھی بہت رنج ہوا۔ مہان سنگھ اُسکے بیٹے کو باپ کی جگہ دی۔ اور روانگی کا فرمان روانہ کیا۔ بسرشور افغانوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ طوفان ہو کر اُٹھے۔ مہان سنگھ جرأت کر کے آگے بڑھا۔ مگر نوجوانی کی دوڑتھی ٹھوکر کھائی۔ باغیوں نے مقام بھدراک پر لشکر بادشاہی کو شکست دی۔ اور پانی کی طرح پھیل کر بڑا حصّہ بنگالہ کا دبا لیا۔ اُدھر سلیم (جہانگیر) اپنے عیش کا بندہ تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا۔ کہ اودیپور کے پہاڑوں میں جائے اور پتھروں سے ٹکراتا پھرے۔ اُس کی مُراد بر آئی۔ رانا کی مہم ملتوی کر دی اور بنگالہ کی طرف کوچ کیا۔ باپ اُدھر اسیر کا محاصرہ کئے پڑا ہے۔ اور قلعہ والے جان سے تنگ ہیں۔ خان خاناں احمد نگر فتح کیا چاہتا ہے۔ تمام دکن میں اقبال اکبری نے زلزلہ ڈال دیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ تحائف و پیشکش کے ساتھ بیٹی کو روانہ کرتا ہے۔ کہ دانیال محلوں میں شادی رچے مگر شہزادے نے باپ کی ایک مصلحت کا خیال نہ کیا۔ مان سنگھ کو بنگالہ روانہ کر دیا۔ آپ آگرہ پہنچا قلعہ میں جا کر دادی کو سلام بھی نہ کیا۔ اُس نے چاہا کہ خود جا کر ملے تو اُوپر سے اُوپر کشتی میں بیٹھ الہ آباد کو روانہ ہو گیا۔ اور وہاں جا کر عیش کی بہاریں لوٹنے لگا۔ اکبر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ بلکہ خیال ہوا کہ رانا کی طرف سے ہٹنا اور بنگالہ کی طرف جانا۔ مان سنگھ کی ترغیب سے ہوا ہے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شہزادہ کی طرف سے بغاوت کے آثار نظر آئے۔ اور امرائے نمک حلال کی عرضیاں آنی شروع ہوئیں۔ یہ وہم اگر اور امرا کی طرف ہوتا۔ تو کچھ بات نہ تھی۔ کیونکہ جب بادشاہ بڈھا ہوتا ہے۔ تو اہل دربار کی اُمیدیں ہمیشہ ولیعہد کی طرف سجدہ کرتی ہیں۔ لیکن مان سنگھ کا تعلق خاص جو شہزادہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے اِن وہموں کی بدنما تصویریں دکھائیں۔ اور (جھوٹ یا سچ) راجہ کے نام پر جو حرف آیا۔ اِس کا اُسے بہت رنج ہوا ❖

خیر یہ تو گھر کی باتیں ہیں۔ راجہ بغاوت بنگالہ کی خبر سنتے ہی شیر کی طرح جھپٹا۔ جب وہاں پہنچا۔ تو پُرنیہ۔ کھنگروال۔ بکرم پور وغیرہ مقامات مختلفہ میں غنیموں نے خودسری کے نشان کھڑے کر رکھے تھے۔ اُس نے جا بجا فوجیں روانہ کیں۔ اور جہاں ضرورت دیکھی۔ وہاں خود یلغار کر کے پہنچا۔ اکبری اقبال کی برکت اور راجہ مان سنگھ کی ہمّت اور نیک نیت نے ایک عرصہ کے بعد بغاوت کی آگ بجھائی۔ اور ڈھاکہ میں آ کر خاطر جمع سے حکمرانی کرنے لگا ❖

بادشاہوں کے دل کا حال تو کسے معلوم ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوا کہ اکبر اُس کی طرف سے

---

[1] جگت سنگھ ❖

صاف ہوگیا۔ اس بغاوت کے معرکوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ باغیان بنگالہ کے ساتھ فرنگ کے سپاہی بھی شامل تھے۔ اور اُنکی رفاقت میں جانیں دیتے تھے۔ غالباً ڈچ یا پرتگال کے لوگ تھے ٭

۱۰۰۸ھ میں ہندوستان کی صفائی اور توران کے بادشاہوں کی کشاکشی نے اکبر کے شوق کو پھر توران پر متوجہ کیا۔ سپہ سالار خان خاناں وغیرہ سرداروں کو مشورہ کے واسطے بُلایا۔ مان سنگھ کو بھی فرمان طلب گیا اور لکھا گیا۔ کہ بعض مہمات ضروری میں مشورہ درپیش ہے۔ چونکہ وہ فدوی خلص بندہائے قدیم سے ہے۔ اور آق سقال[1] باخلاص اِس دولت کا ہے۔ مناسب ہے۔ کہ وہ بھی متوجہ درگاہ ہو۔ اسی سنہ میں اُسے پرگنہ جوند مرحمت ہُوا۔ اور حکم ہُوا کہ قلعہ رہتاس کی مرمت کرے۔ بھاؤ سنگھ اس کے بیٹے کو ہزاری ذات پانسو سوار کا منصب عنایت ہُوا ٭

۱۰۱۳ھ میں خسرو اُس کے بھانجے کو دہ ہزاری منصب ملا (جہانگیر کا بڑا بیٹا تھا) مان سنگھ اتالیق ہو کر ہفت ہزاری چھ ہزار سوار کے منصب پر سربلند ہُوئے۔ اور بھاؤ سنگھ دو ہزاری منصب اور تین سو سوار پر معزز ہُوا۔ اب تک کوئی امیر پنج ہزاری منصب سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ یہ اعزاز اوّل اس نیک نیت راجہ کی وفاداری اور جاں نثاری نے لیا اور اکبر کی قدردانی نے اُسے دیا ٭

جب تک اکبر رہا۔ مان سنگھ کا ستارہ سعد اکبر (مشتری یعنی برہسپت) رہا۔ جب وہ مرض الموت کے بستر پر لیٹا۔ اُسی وقت سے اُس کا ستارہ بھی ڈھلنا شروع ہُوا۔ اوّل خسرو کے خیال سے خود اکبر کو واجب تھا کہ اُسے آگرہ سے سرکا دے (دیکھو اکبر کا حال) چنانچہ حکم ہُوا کہ اپنی جاگیر پر جاؤ۔ مطیع الفرمان نے کل آرزوؤں کو اپنے پیارے آقا کی خوشی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ باوجودیکہ بیس ہزار لشکر جرار اُس کی ذات کا نوکر تھا۔ اور تمام قوم کچھواہہ کا سرگروہ تھا۔ وہ بگڑ بیٹھتا تو تمام قوم تلوار پکڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ مگر فوراً بنگالہ کو روانہ ہُوا۔ اور خسرو کو ساتھ لیا۔ جب نیا بادشاہ تخت پر بیٹھا۔ پرانے امراسب حاضر دربار ہوئے۔ نوجوان بادشاہ مست الست تھا مگر یہ بات اُسکی بھی قابل تعریف ہے کہ پہلی باتوں کو بالکل بھول گیا۔ خود لکھتا ہے کہ اُس نے بعض باتیں ایسی کی تھیں کہ اپنے حق میں اس عنایت کی اُمید نہ رکھتا تھا۔ پھر بھی خلعت چارقب۔ شمشیر مرصع۔ اسپ خاصہ بازین زریں دے کر اکرام و اعزاز بڑھایا۔ اور بنگالہ کا صوبہ دوبارہ اپنی طرف سے مرحمت کیا۔ مگر طالع کی گردش

---

[1] آق سقال۔ ترکی میں ریش سفید کو کہتے ہیں۔ اور مراد اس سے مرد بزرگ و محترم ہے۔ اب ترکستان کے عرف عام میں۔ چودھری یا میر محلہ آق سقال کہلاتا ہے۔ چنانچہ گاؤں یا شہر کے محلہ میں ایک ایک آق سقال ہوتا ہے۔ پیشہ والوں کے ہر فرقہ کا آق سقال بھی الگ ہوتا ہے ٭

کہ کون سیدھا کر سکے۔ چند مہینے گذرے تھے۔ کہ خسرو باغی ہو گیا۔ آفرین ہے جہانگیر کے حوصلہ کو کہ مان سنگھ کے کاروبار میں کوئی تغیر کا اثر ظاہر نہ کیا۔ مان سنگھ کو بھی آفرین کہنی چاہیئے۔ کیونکہ بھانجے کا بھلا تو ضرور چاہتا ہوگا۔ مگر اس موقع پر کوئی ایسی بات بھی نہیں کی جس سے بے وفائی کا الزام لگا سکیں؛ مست الست بادشاہ جلوس کے ایک برس آٹھ مہینے کے بعد خود لکھتا ہے۔ مگر درد آلود عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دردناک دل سے نکلتی ہے۔ راجہ مان سنگھ نے قلعہ رہتاس سے آکر ملازمت کی کہ ملک پٹنہ میں واقع ہے۔ چھ سات فرمان گئے جب آیا ہے۔ وہ بھی خان اعظم کی طرح منافقوں اور اس سلطنت کے (پرانے پاپیوں میں سے) ہے۔ جو انہوں نے مجھ سے کیا۔ اور مجھ سے اُن کے ساتھ ہوا خدائے راز داں جانتا ہے۔ کہ کوئی کسی سے اس طرح نہیں گذارہ کر سکتا۔ راجہ نے سَو ہاتھی نر و مادہ پیشکش گذرانے۔ ایک میں بھی اتنی بات نہ تھی۔ کہ فیلان خاصہ میں داخل ہو سکے۔ یہ میرے باپ کے بنائے ہوئے نوجوانوں میں سے ہے۔ اس کی خطائیں اُس کے مُنہ پر نہ لایا۔ اور عنایت بادشاہانہ سے سرفراز کیا۔ پونے دو مہینے کے بعد پھر لکھتا ہے۔ ایک گھوڑا میرے سارے گھوڑوں کا سردار تھا۔ عنایت کی نظر سے راجہ مان سنگھ کو مرحمت کیا۔ کئی اور گھوڑوں اور تحائف لائق کے ساتھ شاہ عباس نے منوچہر خان کی ایلچی گری میں حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو بھیجا تھا۔ منوچہر شاہ کا غلام معتبر ہے۔ جب یہ گھوڑا میں نے عنایت کیا۔ تو مان سنگھ مارے خوشی کے اس طرح لوٹا جاتا تھا کہ اگر میں کوئی سلطنت اسے دے دیتا۔ تو معلوم نہیں کہ اتنا خوش ہوتا۔ یہ گھوڑا جب آیا تھا۔ تو تین چار برس کا تھا۔ ہندوستان میں آکر بڑا ہوا۔ اور یہیں ساری خوبیاں نکالیں۔ تمام بندہائے درگاہ مغل اور راجپوت نے بالاتفاق عرض کی کہ ایسا گھوڑا کبھی ایران سے ہندوستان میں نہیں آیا۔ جب والد بزرگوار نے خاندیس اور صوبہ دکن بھائی دانیال کو مرحمت کیا۔ اور آگرہ کو پھرنے لگے۔ تو محبت کی نظر سے اسے کہا کہ جو چیز تجھے بہت پسند ہو مجھ سے مانگ۔ اُس نے موقع پا کر یہ گھوڑا مانگا۔ اس سبب سے اسے دیا تھا۔ آزاد بھلا بیس برس کے بڈھے گھوڑے پر خوش کیا ہونا تھا۔ یہ کہو کہ وقت کو دیکھتے تھے۔ آدمی کو پہچانتے تھے۔ اور تھے مسخرے۔ کہا یہ۔ کیا خانخاناں مست کو دیوانہ بناتے تھے۔ بڈھے ہوئے تو ہو جائیں۔ طبیعت کی شوخی تو نہیں جا سکتی۔ اکبر کے عہد میں دانش و داد۔ ہمت و حوصلہ۔ جرأت و جاں نثاری کا زمانہ تھا۔ اسے اُن باتوں سے خوش کرتے تھے۔ اور اُسے دیکھا کہ اس ڈھب کا نہیں۔ اسے اس ڈھب سے تسخیر کر لیا؛

؎ او ہم مثل خان اعظم از کہنہ گرگاں ایں دولت است؛

خانجہاں وغیرہ امرائے بادشاہی دکن میں کارنامے دکھا رہے تھے۔ ہمت اور لیاقت کو میدان میں جولانی کرنے کا ضرور شوق ہؤا ہوگا۔ اور جاں نثاری کی عادت نے اس مصلحت کو جوش دیا ہوگا لیکن خسرو کے سبب سے اس کا معاملہ ذرا نازک تھا۔ اس لئے دل ٹل گیا۔ اپنے پرانے اہلکاروں سے صلاح کر کے جہانگیر سے عرض کی اور لشکر لے کر دکن پہنچا۔ دو برس تک وہاں رہا۔ اور ۱۰۲۳ھ میں وہیں سے ملک بقا کو کوچ کر گیا۔ بیٹوں میں سے ایک بھاؤ سنگھ جیتا تھا۔ جہانگیر نے اس موقع پر خود لکھا ہے۔ والد بزرگوار کے عہد کے امرائے دولت میں سے میں نے اکثر بندہائے درگاہ کو درجہ بدرجہ خدمت دکن پر بھیجا تھا۔ وہ بھی ان دنوں میں اس خدمت پر تھا۔ مر گیا۔ تو مرزا بھاؤ سنگھ اس کا خلف رشید تھا۔ میں نے بلا بھیجا۔ شاہزادگی میں میری خدمت زیادہ سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ ہندوؤں کی ریت کے بموجب مہا سنگھ پسر جگت سنگھ کو ریاست پہنچتی تھی۔ کہ سب بھائیوں میں بڑا تھا۔ اور وہ راجہ کے جیتے جی مر گیا۔ میں نے اس بات کی رعایت نہ کی بھاؤ سنگھ کو مرزا راجا کا خطاب دیکر چار ہزاری ذات تین سو سوار کے منصب سے ممتاز کیا۔ آنبیر کا علاقہ مرحمت کیا۔ کہ اس کے باپ دادا کا وطن ہے اور اس نظر سے کہ مہا سنگھ بھی راضی رہے۔ اس کی دلداری کے لئے پہلے منصب پر پانصدی بڑھا کر گڈھ کا ملک اُسے انعام دیا۔

اُس کے حالات کو پڑھ کر بے خبر لوگ جھٹ بول اٹھینگے۔ کہ اس نے جہانگیر کے عہد میں کچھ ترقی نہ کی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اُسکا معاملہ کیا پیچیدہ تھا۔ بلکہ اس کی عقل سلیم اور سلامت روی کی چال ہزار تعریف کے قابل ہے۔ کہ مہمات کے ہنگامے ہو رہے تھے۔ کسی آفت کی جھپٹ میں نہ آ گیا۔ اور اپنی باعزت حالت کا عزت کے ساتھ خاتمہ کر گیا۔ خانخاناں اور مرزا عزیز کوکہ ابتدا سے میدان ترقی میں اس کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اُن کے حالات کو اس سے مقابلہ کر کے دیکھو۔ جہانگیری عہد میں انہوں نے کیسے سخت صدمے اٹھائے۔ اسی کی با اصول رفتار تھی۔ جس نے اُسے امن و عافیت کے رستہ سے منزل آخر تک صحیح سلامت پہنچا دیا۔ جو اعزاز و اکرام کی دستار اکبر نے اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر باندھی تھی۔ اس کو دونو ہاتھ سے پکڑے امن و امان سے نکل گیا۔

اس نے ملک گیری اور ملک داری کے تمام اوصاف سے پورا پورا حصہ پایا تھا۔ جدھر لشکر لے کر گیا کامیاب ہؤا۔ کابل میں آج تک بچہ بچہ اُس کا نام جانتا ہے۔ اور اس کی بابت کہاوتیں زبانوں پر ہیں مشرق میں اکبری حکومت کا نقارہ دریائے شور کے کنارے تک جا بجایا۔ اور بنگالہ میں اپنی نیکی سے ایسے گلدستے لگائے ہیں۔ جو آج تک سرسبز ہیں۔ اُس کی عالی ہمتی اور دریا دلی کے چشمے زبانوں پر جاری ہیں۔ اور زبانوں تک رہینگے اُس کے ٹھاٹ کی سرکار میں سو ہاتھی فیلخانے میں جھومتے تھے۔ بیس ہزار

لشکر جرار اُس کی ذات کا نوکر تھا جن میں معتبر سردار ٹھاکر اور امرا تھے عالیشان کی سواریاں امیرانہ جلوس سے نکلتی تھیں - تمام سپاہی بیش قرار تنخواہوں اور سامانوں سے آسودہ تھے - ہر فن کے صاحب کمال اُس کے شاہانہ دربار میں حاضر رہتے تھے - اور عزت اور خوشحالی کے عالم میں رہتے تھے ◆

باوجود اس کے خوش اخلاق - ملنسار شگفتہ مزاج تھا - اور جلسہ میں تقریر کو انکسار و تواضع سے رنگ دیتا تھا - جب وہ مہم دکن پر گیا - تو خانجہان لودھی سپہ سالار تھا پندرہ پنج ہزاری صاحب علم و نقارہ موجود تھے - جن میں خانخاناں - خود راجہ مان سنگھ - آصف خان شریف خان امیر الامرا وغیرہ شامل تھے - اور چار ہزاری سے پانصدی تک ایک ہزار منصبدار فوجیں لئے کمربستہ موجود - بالاگھاٹ کے مقام پر لشکر شاہی کو سخت تکلیف پیش آئی - ملک میں قحط پڑ گیا - اور رستوں کی خرابی سے رسد بند ہونے لگی - امرا روز جمع ہو کر جلسہ مشورہ جماتے تھے - کوئی نقشہ نہ جمتا تھا ایک دن مان سنگھ نے سرِ دیوان کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا - تو ایک وقت تم صاحبوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا - اب کے ڈاڑھی سفید ہو گئی ہے - کچھ کہنا مناسب نہیں - ایک پان ہے - آپ صاحب قبول فرمائیں - سب سے پہلے خانجہان نے دینداری کا ہاتھ سینہ پر رکھا - اور مان کا پان سمجھ کر سب نے قبول کیا - چنانچہ پنج ہزاری سے لے کر صدی کے منصبدار تک حسب حیثیت نقد اور جنس - لوازم ضیافت برابر ہر شخص کی سرکار میں پہنچ جاتا تھا - ہر خیلے اور خریطہ پر اُس کا نام لکھا ہوتا تھا تین چار مہینے تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا - ایک دن ناغہ نہیں ہوا - بنجاروں نے رسد کا تانتا لگا دیا - بازار لشکر میں ہر شے کے انبار پڑے تھے - اور جو آگرہ میں نرخ تھا - وہی یہاں نرخ تھا - ایک وقت کا کھانا بھی سب کو ملتا تھا - کنور اس کی رانی بڑی عقلمند اور منتظم بی بی تھی - گھر میں بیٹھی تھی - اور سب کاروبار کے انتظام برابر کرتی تھی - یہاں تک کہ کوچ و مقام کے موقع پر مسلمانوں کو حمام و مسجد کی وضع کے خیمے بھی تیار ملتے تھے ◆

خوش اخلاق راجہ ہمیشہ شگفتہ مزاج اور خوش رہتا تھا - لطیفہ - دربار میں کوئی سید صاحب ایک برہمن سے اُلجھ پڑے - اور آخیر میں کہا - کہ جو راجہ صاحب کہہ دیں - وہ صحیح - راجہ نے کہا کہ مجھے علم نہیں - جو ایسے معاملے میں گفتگو کر سکوں - مگر ایک بات دیکھتا ہوں - کہ ہندوؤں میں کیسا ہی گنوان پنڈت یا گیانی دھیانی فقیر - جب مر گیا - تو جل گیا - خاک اُڑ گئی - رات کو وہاں جاؤ تو آسیب کا خطرہ ہے - اسلام میں جس شہر بلکہ گاؤں میں گذرو - کئی بزرگ پڑے سوتے ہیں - چراغ جلتے ہیں - پھول مہک رہے ہیں - چڑھاوے چڑھتے ہیں - لوگ اُن کی ذات سے فیض پاتے ہیں ◆

لطیفہ - ایک دن یہ اور خان خاناں شطرنج یا چوپڑ کھیل رہے تھے - شرط یہ ہوئی - کہ جو ہارے

وہ جیتنے والے کی فرمائش کے بموجب ایک جانور کی بولی بولے۔ خان خاناں کی بازی دینی شروع ہوئی۔ مان سنگھ نے ہنسنا شروع کیا۔ اور کہا کہ بلی کی بولی بلواؤنگا۔ خان خاناں ہمت کیے گئے۔ آخر چار پانچ چالوں کے بعد مایوس ہو گئے۔ مگر بڑے چار لئے بیٹھے تھے۔ گھبرا کر اٹھنا چاہا۔ اور کہا۔ لے ہا۔ از خاطرم رفتہ بود خوب شد کہ حالا ہم بیاد آمد۔ مان سنگھ نے کہا۔ کجا کجا۔ انہوں نے کہا۔ جہانبانی چیزے فرمودہ بودند۔ حالا یادم آمدہ۔ بروم کہ زود ترسر انجامش کنم اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ راجہ نے کہا۔ نمیشود۔ خانخاناں نے کہا۔ حالا مے آیم۔ راجہ نے دامن پکڑ لیا۔ اور کہا خوب است۔ صدائے پشک بکنید و بروید۔ انہوں نے کہا۔ شما دامنم بگزارید۔ مے آیم مے آیم مے آیم وہ بھی ہنس پڑے یہ بھی ہنس پڑے واہ کیا بات ہے۔ اپنی بات کہی اور حریف کی بات پوری کر دی۔

لطیفہ۔ وہ ہمیشہ فقرا اور خاکساروں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نہ کرتا تھا۔ بنگالہ کے سفر میں ایک مقام پر شاہ دولت کے اوصاف و کمالات سنے۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ بھی اس کی پاکیزہ اور سنجیدہ گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ اور کہا۔ مان سنگھ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے اس نے مسکرا کر کہا خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوبِہِم خدا کی مہر ہے۔ بندہ کیونکر اٹھائے کہ گستاخی ہے ۞

مان سنگھ کے حال میں یہ افسوس حقیقت میں نہیں بھولتا۔ کہ اس کی سپہ سالاری اور ملک گیری کی لیاقت جہانگیر کے عہد میں مرجھا کر رہ گئی۔ شرابی کبابی بادشاہ نے کچھ پرواہ نہ کی۔ بلکہ اس کی طرف سے کھٹکتا رہا۔ قدرداں وہی مرنے والا تھا۔ جس نے اس کے جوہر قابل کو لڑکپن سے پال کر اعلےٰ درجۂ کمال پر پہنچایا تھا۔ وہ جیتا تو خدا جانے اس کی تلوار سے ملک موروثی کے پہاڑوں کو ٹکراتا یا دریائے شور میں فرنگ کے زور کو توڑتا۔ اکبر خانخاناں کو مرزا خاں اور خان اعظم کو مرزا عزیز اور اسے مرزا راجا کہتا تھا۔ گھر کی ریت رسوم اور کل کاروبار میں اس کے ساتھ بیٹوں کی طرح برتاؤ ہوتا تھا۔ خصوصاً حرم سرا کے کاروبار اور سفر کے موقع پر کل اہتمام راجہ بھگوان داس کے سپرد مریم مکانی تک کی سواری ہوتی۔ تو راجہ موصوف ساتھ ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ عجب پاک زمانہ تھا۔ اور عجب پاک دل تھے۔ دیکھو نتیجے بھی کیسے پاکیزہ نکلتے تھے ۞

مان سنگھ کی تاریخ زندگی میں اس بیان پر پھول برسانے چاہئیں۔ کہ اس نے اور اس کے کل خاندان نے اپنی ساری باتوں کو اکبر کی خوشی پر قربان کر دیا۔ مگر مذہب کے معاملے میں بات کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جن دنوں میں دین الٰہی اکبر شاہی کا زیادہ زور ہوا۔ اور ابوالفضل اس کے خلیفہ ہوئے بیربل برہمن کہلاتے تھے۔ انہوں نے سلسلہ مریدی میں چوتھا نمبر حاصل کیا۔ لیکن مان سنگھ

سنجیدگی اور عقل کے نقطہ سے بال بھر نہیں ہٹا۔ چنانچہ ایک شب بعض مہمات سلطنت کے باب میں جلسۂ مشورت تھا۔ ان کو حاجی پور پٹنہ جاگیر عنایت ہوا۔ بعد اس کے خلوت خاص تھی۔ خان خاناں بھی موجود تھے۔ اکبر مان سنگھ کو ٹٹولنے لگے۔ کہ دیکھوں یہ بھی مریدوں میں آتا ہے۔ یا نہیں۔ تقریر کا سلسلہ اس طرح چھیڑا۔ کہ جب تک دو چار باتیں نہیں ہوتیں تب تک اخلاص کامل نہیں ہوتا سپاہی راجپوت نے صاف اور بے تکلف جواب دیا۔ کہ حضور اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر کچھ اَور ہے۔ اور حضور کی مراد مذہب سے ہے۔ تو ہندو ہوں۔ فرمائیے مسلمان ہو جاؤں۔ اور رستہ جانتا نہیں کونسا ہے کہ اختیار کروں۔ اکبر بھی ٹال گئے۔ آزاد حق یہی ہے۔ کہ جو شخص مذہب میں پورا ہوگا۔ وہی وفا و اخلاص میں پورا ہوگا۔ اور وفا و اخلاص کا استقلال ہر مذہب کی اصل ہے۔ کونسا مذہب دُنیا میں ہے جس نے وفا اور اخلاص کو بُرا سمجھا ہوگا۔ جو اچھی باتیں ہیں سب مذہبوں میں اچھی ہیں۔ اور اُن کی تاکید ہے۔ اہل مذہب عمل میں قصور کریں۔ تو مذہب کا قصور نہیں۔ بدمذہبوں کا قصور ہے +

یہ چٹکلا لکھنے کے قابل ہے۔ کہ راجہ کی ۱۵ سو رانیاں تھیں۔ اور ہر ایک سے ایک ایک دو دو بچے تھے۔ ہاں! بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ کونپلیں ٹہنی سے نکلتی گئیں۔ اور جلتی گئیں۔ چند جانیں تھیں۔ کہ جوانی کو پہنچیں۔ اور افسوس کہ وہ اس کے سامنے گئیں۔ بھاؤ سنگھ کو جیتا چھوڑ گیا۔ وہ شراب کی بھینٹ ہوئے۔ جب راجہ سرگباش ہوئے تو ساٹھ رانیوں نے ستی ہو کر اُن کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کیا۔

تحقیق۔ جس قطعہ زمین پر تاج گنج کا روضہ ہے۔ یہ راجہ مان سنگھ کی تھی۔ میں نے آگرہ میں جا کر دریافت کیا۔ اب بھی کچھ بیگھے زمین اس قرب و جوار میں راجہ جے پور کے نام لکھی چلی آتی ہے۔ مہاراجہ سوائی فرماں فرمائے جے پور کے اہلکار ایسے اعزاز کے ساتھ اپنا حق سمجھتے ہیں +

نکتہ رسی۔ ایک فقیر نے بیگھہ بھر زمین کے لئے دربار اکبری میں سوال کیا۔ وہاں سینکڑوں ہزاروں بیگھہ کی حقیقت نہ تھی۔ عطا ہو گئی۔ سند اس کی سب امرا کے دفتروں میں سے دستخط ہوتی چلی آئی۔ مان سنگھ کے سامنے جب کاغذ آیا۔ تو اس نے زعفران زار کشمیر کو مستثنےٰ کر دیا۔ فقیر نے جب دیکھا تو سند پھینک کر چلا گیا۔ کہ اب کیا کرنی ہے۔ اگر بیگھہ بھر زمین لینی ہوتی تو جہاں چاہتا بیٹھ جاتا۔ خدائی میدان کھلا پڑا ہے۔ بعض اہل تحقیق سے معلوم ہوا۔ کہ یہ ٹوڈرمل کی جندسی تھی +

آزاد۔ میرے دوستو! اس زمانہ کے ہندو اور مسلمانوں کے لئے اگر کوئی عہد ہے جس کی تقلید ملک کی بہتری اور خلق خدا کی آسودگی اور مختلف بلکہ متضاد مذہبوں میں محبت و یگانگت پیدا کرنے کے لئے ضرور ہے۔ تو وہ عہد اکبری ہے۔ اور اس بے نظیر مبارک عہد کے پیشرو اور مرد میدان مسلمانوں میں اکبر اور ہندوؤں میں راجہ مان سنگھ ہیں۔ کہاں ہیں وہ تنگ دل تیرہ خیال جنہوں نے اس زمانہ میں بڑی حب الوطنی یہ بات قرار دی ہے۔ کہ دونوں مذہبوں کو لڑایا کریں۔ اور بغض و کینہ کی آگ دلوں میں سلگایا کریں۔ اس زمانہ کی انجمنوں اور سبھاؤں اور اُن کی بے اثر تقریروں سے خاک حاصل نہیں ہوتا۔ جو بات دل سے نہیں نکلتی۔ وہ دل میں اثر نہیں کرتی۔ تم دور اکبری کے ان پاکیزہ نفسوں کے حالات پر غور کرو۔ اور ان کو اپنا پیشرو بناؤ۔ اکبر اور مان سنگھ وہ شخص ہیں۔ کہ اگر اُن کے بسٹ[1] بنوا کر ہر قومی جلسے کو اُن سے زینت دی جائے۔ تو دونوں فریق میں اتحاد بڑھانے کی اچھی تدبیر ہے۔ بڑے غور کی یہ بات ہے۔ کہ مان سنگھ نے یہ اتحاد اپنے دھرم کو پورے طور پر برقرار رکھ کر قائم کیا۔ یہی خوبی ہے۔ جو راجہ مان سنگھ کی بے انتہا عزت اور عظمت ہمارے دلوں میں بٹھاتی ہے۔ آزاد وہ کیا دینداری ہے جو دوسری قوم کی دل آزاری ہو۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب میں ہزاروں امور ہیں جن کو دونوں فریق نیکی سمجھتے ہیں۔ پس دیندار بننے کے لئے ایسی ہی نیکیوں پر عمل کرنا چاہیے۔ راجہ مان سنگھ! اخلاقی تاریخ میں تمہارا نام سنہری حروف میں قیامت تک روشن رہیگا۔ اخلاق اور بے تعصبی تمہارے مبارک نام پر ہمیشہ پھول اور موتی برسائے گی۔ تمہارا سر ایسے پھولوں کے ہاروں سے سجا ہے جن کی مہک قیامت تک دماغ عالم کو معطر رکھے گی +

---

[1] نصف فوٹوگراف۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناںؒ

۹۶۴ھ میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیمو کی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمۂ بلبل کے سُروں میں کسی نے آواز دی۔ کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوشخبری نیک شگون معلوم ہوئی۔ اس لئے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لُٹائے۔ اور اپنے بیگانوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کر لو۔ کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی[1] بہن بادشاہ کے محل میں تھی۔ چھوٹی وزیر کے حرم سرا میں۔ خالو بادشاہ نے خود عبدالرحیم نام رکھا۔ مبارک مولود کی ولادت خاص اسی شہر لاہور میں ہوئی +

یہ پھول قریب تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا۔ دفعتہً خزاں کی نحوست ایسی بگولا بن کر لپٹی۔ کہ اُس کے گلبن کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔ اور گھاس پھوس کی طرح مدت تک رواں دواں کرتی رہی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگیگا یا نہیں۔ ہم کاغذ کے دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں۔ وائے برحال اُس کے رشتہ داروں اور ہواخواہ نمک خواروں کے جب اُس کی اور اپنی حالت کو یاد کرتے ہوں گے۔ تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہونگے۔ کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں۔ جب اس قدر اونچے پہنچتے ہیں۔ کہ دیکھنے والے تعجب کر کے کہتے ہیں۔ یہ تارا کہاں سے نکل آیا +

خدا تر نوالہ دے۔ خواہ سُوکھا ٹکڑا۔ باپ کا ہاتھ بچوں کے رزق کا چمچہ بلکہ اُن کی قسمت کا پیالہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے مُنہ پھیرا۔ اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آ کر دہلی میں آن بیٹھا۔ بیرم خاں آگرہ میں رہ گئے۔ یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دہلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں۔ تو اُلٹے جواب آتے ہیں۔ عرض معروض کے لئے وکیل پہنچتا ہے۔ تو قید۔ دربار کے طور بے طور خبر آتی ہے تو وحشتناک۔ بچہ معصوم ان رازوں کو نہ سمجھتا ہو گا۔ مگر اتنا تو ضرور دیکھتا ہو گا۔ کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں۔ وہ امرا اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہو گئی۔ باپ کس فکر میں ہے۔ کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔

---

[1] اکبر نامہ میں یہی ہے۔ تعجب ہے مآثر سے کہ کہتا ہے بڑی ہمایوں کے عقد میں تھی +

بیرم خاں بیچارہ کیا کرے۔ کبھی بنگالہ کا ارادہ کرتا ہے۔ کبھی گجرات کا کہ حج کو چلا جائے۔ ادھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانہ کا رُخ کرتا ہے۔ چند روز ادھر اُدھر پھرتا ہے۔ آخر پنجاب کو آتا ہے۔ کچّا ساعت اپنے حال کو سنبھالے۔ کہ عیال و اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور جواہر خانہ توشہ خانہ وغیرہ بہت سے لوازمات و اسباب کو بٹھنڈے میں چھوڑا۔ اور آپ پنجاب میں آیا۔ بٹھنڈہ کا حاکم اپنا نمک پروردہ۔ خاک سے اٹھایا ہوا۔ ہاتھوں کا پالا ہوا چھوٹے سے بڑا کر کے حکومت تک پہنچایا ہوا۔ اُس نے مال و عیال کو ضبط کر کے روانۂ دربار کر دیا۔ دہلی میں آ کر سب قید۔ اسباب خزانہ میں داخل۔ وہ تین چار برس کا بچہ روز کی پریشانی اور بے سروسامانی اور گھر والوں کی سرگردانی۔ روز نئے شہر نئے جنگل دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا کہ یہ کیا عالم ہے۔ اور ہم کہاں ہیں۔ میری ہوا خوری کی سواریوں اور سب کی دلداریوں میں کیوں فرق آ گیا۔ جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے تھے۔ وہ کیا ہو گئے ✦

اور اُس حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ باپ دربار سے رخصت ہو کر حج کو تو چلا گیا۔ گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں۔ ابھی سورج جھلکتا ہے۔ شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خانخاناں آتا ہے۔ خبر آئی۔ کہ وہ تو مارا گیا۔ اُس کے مرتے ہی فوج میں تلاطم مچ گیا۔ پل کے پل میں گھر بار افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گٹھڑی لئے جاتا ہے۔ کوئی صندوقچہ۔ کسی نے مسند گھسیٹ لی۔ کوئی بچھونا لے چلا۔ اُس بے کس مردے کے کپڑے تک اُتار لئے۔ لاش بے جان کو کفن کون دے۔ کہ اپنی ہی جان کا ہوش نہیں۔ وہ تین برس کی جان کیا کرتا ہوگا۔ سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا۔ ڈرتا ہوگا انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بے چاریاں کہاں چھپالیں۔ کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ عجب وقت ہوگا۔ شام غریباں اسی شام کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گذری ہوگی دن ہوا تو روز محشر۔ محمد امین دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکروں کے لڑانے والے تھے۔ اس وقت کچھ نہ بن آئی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت ہے۔ کہ لٹے قافلہ کو سمیٹا ہے۔ اور احمد آباد کو اُڑے جاتے ہیں موقع پاتے ہیں۔ تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں ✦

اس وقت ان پاشکستہ عورتوں کو جن میں سلیمہ سلطان بیگم اور یہ تین برس کا بچہ بھی شامل ہے لے نکلنا غنیمت ہے۔ لٹیرے اب بھی دست بردار نہیں ہوئے۔ پیچھے پیچھے لوٹتے مارتے چلے آتے ہیں۔ معصوم بچہ سہما ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اور رہ جاتا ہے۔ کون دلاسہ دے۔ اور دے تو سمجھتا کیا ہے۔ الٰہی وہ وقت تو دشمن ہی کو نصیب کیجو ✦

ان مصیبت زدوں نے لڑتے مرتے احمد آباد میں جا کر دم لیا کئی دن میں گئے ہوئے حواس ٹھکانے آئے

سلاح ہوئی۔ کہ دربار کے سوا پناہ نہیں ہے۔ پھر چلنا چاہیئے چنانچہ چار مہینے کے بعد ضروری سامان بہم پہنچا کر روانہ ہوئے۔ یہاں بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ چغتائی دریادلی اور اکبری عفو و کرم کے دریا میں لہر آئی۔ اُن کے لئے فرمان بھیجا۔ خان خاناں کے مرنے کا رنج والم اور اُن کی تباہی کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی بڑے دلاسے اور دلداری کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ عبدالرحیم کو تسلی دو۔ اور بڑی خبرداری و ہوشیاری سے لے کر دربار میں حاضر ہو۔ یہ اطمینان کا تعویذ اُنہیں جالور میں ملا۔ بڑا سہارا ہو گیا۔ ہمت بندھ گئی ورحضور میں پہنچے۔

اس لئے قافلے کے واسطے وہ وقت عجب مایوسی اور حیرانی کا عالم ہوگا۔ جب کہ بابا زنبور سب باہی زدوں کو لے کر آگرہ پہنچے ہونگے۔ عورتوں کو محل میں آمارا ہوگا۔ اس یتیم بچے کو جس کا باپ ایک دن دربار کا مالک تھا۔ بادشاہ کے سامنے لاکر چھوڑ دیا ہوگا۔ اندر شکستہ پا عورتوں کے دل دھکڑ دھکڑ۔ ہر اُس کے قدیمی نمک خوار دعائیں کرتے ہوں گے۔ کہ الٰہی باپ کی خدمتوں کو پیش نظر لائیو۔ آخری وقت کی باتوں کو دل سے بھلائیو۔ اس معصوم کے اور ہمارے حال پر مہربان رہیں۔ الٰہی سارا دربار دشمنوں سے ہی بھرا پڑا ہے۔ اس بن باپ کے بچہ کا کوئی نہیں۔ ہماری زندگی اور آئندہ کی بہبودی کا سہارا کون ہے۔ اگر ہے تو اسی بچہ کی جان ہے۔ تو ہی اسے پروان اور تو ہی اس بیل کو منڈھے چڑھائے گا۔

چغتائی سلسلہ میں ان چند بادشاہوں کا حال خطا بخشی کے معاملے میں قابل تعریف ہے۔ دشمن بھی سامنے آتا تھا۔ تو آنکھ جھک جاتی تھی۔ بلکہ اُس کی جگہ خود شرمندہ ہو جاتے تھے خطا کا ذکر نہ تھا۔ بھلا یہ تو بچہ معصوم تھا۔ وہ بھی بیرم کا بیٹا۔ جس وقت سامنے لائے۔ اکبر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کے نوکروں کے لئے وظیفے اور تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں۔ اور کہا کہ اس کے سامنے کوئی خان بابا کا ذکر نہ کیا کرو۔ بچہ ہے دل کڑھیگا۔ بابا زنبور نے رو کر کہا کہ حضور یہ بار بار پوچھتے ہیں۔ راتوں کو چونک اُٹھتے ہیں کہ کہاں گئے۔ اب تک کیوں نہیں آئے۔ اکبر نے کہا کہ کہہ دیا کرو کہ حج کو گئے ہیں۔ خانۂ خدا میں پہنچ گئے۔ بچہ ہے۔ باتوں میں بہلا لیا کرو۔ دیکھو اسے ہر طرح خوش رکھو۔ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ خان بابا سر پر نہیں۔ بابا زنبور! یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو۔

سنہ ۹۶۹ھ میں یہ واجب الرحم بچہ دربارِ اکبری میں پہنچا تھا۔ اُس کے باپ کے جانی دشمن لب الکلو دولت تھے۔ وہ یا اُن کے خوشامدی ہر وقت حضور میں حاضر رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے جن سے بیرم خاں کی باتیں اکبر کو یاد آجائیں۔ اور اُس کی طرف سے کھٹک جائے اکثر ان میں سے کھُلم کھُلا سمجھاتے

تھے۔ لیکن اکبر کی نیک نیتی اور اس لڑکے کا اقبال تھا۔ کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیروں کے دل میں اُن باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا۔ اکبر اسے مرزا خان کہا کرتا تھا۔ کہ ابتدائی ذکر میں اُسے اہل تاریخ اکثر مرزا خاں ہی لکھتے ہیں ؛

ہونہار لڑکا اکبری سایہ میں پرورش پانے لگا۔ اور بڑا ہو کر ایسا نکلا۔ کہ مورّخ اُس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے ہیں۔ بلکہ علمیّت سے زیادہ تیزی فکر اور قوتِ حافظہ کی تعریف لکھتے ہیں۔ علوم و فنون کی کیفیت اور اثنائے تحصیل اور حد تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ابتدائے عمر کو اور امیرزادوں کی طرح کھیل کود میں برباد نہیں کیا۔ کیونکہ جب وہ بڑا ہوا۔ تو علما کا قدردان تھا۔ اہل تصنیف اور شعرا کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی شاعر تھا۔ زبان عربی سے واقف تھا۔ اور بے تکلّف بولتا تھا۔ زبان ترکی اور فارسی جو اُس کے باپ دادا کی میراث تھی۔ اُسے جانے دو۔ دیا حاضر جواب لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ ہمّتِ ہزار داستان تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔ فن جنگ میں اعلےٰ درجہ کی لیاقت رکھتا تھا ؛

اس کے باپ کے چند وفادار جاں نثار ساتھ تھے۔ جو محبت کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ اور اپنی قسمتوں کو اس ہونہار باقبال کے ہاتھ پیچھے بیٹھے تھے۔ اس امید پر کہ اس کے ہاں مینہ برسے گا تو ہمارے گھر میں بھی پرنالے گریں گے۔ حرم سرا میں کچھ شریف زادیاں اور پرستاریں تھیں جو وفاداری کے ساتھ بیکسی اور بے بسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں۔ حسرت و ارمان امید و ناامیدی اُن کے خیالوں میں ایک طلسمات بناتی تھی۔ ایک بگاڑتی تھی۔ بادشاہی دربار خدائی عجائب خانہ تھا۔ امیراور سردار کہ وہاں سے جواہر کی پتلیاں بن کر نکلتے تھے۔ اس کے رفیق دیکھتے تھے۔ اور رہ جاتے تھے۔ دل میں کہتے تھے۔ کہ ایک دن اُس کا باپ جس کو چاہتا تھا۔ اُسے جواہرات اور موتیوں میں چھپا دیتا تھا۔ کاش بیٹا ویسے انعاموں میں ہی شامل ہو جائے۔ اُس میں سب قدرت ہے۔ وہ چاہے تو پھر وہی تماشا دکھائے۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام۔ آدھی رات آسمان کی طرف ہاتھ تھے۔ اور خدا کی طرف دھیان تھے۔ دل آمین آمین کہہ رہے تھے ؛

مرزا خان نہایت حسین تھا۔ باہر نکلتا تھا۔ تو رستہ کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ناواقف خواہ مخواہ پوچھتے تھے۔ کہ یہ کون خانزادہ ہے۔ مصور اُس کی تصویریں اُتارتے تھے۔ امیر اپنے مکانوں اور دیوانخانوں کو سجاتے تھے۔ بادشاہ بھی اپنے دربار اور مجلس کا سنگار سمجھتے تھے۔ بیرم خاں کے خوان کرم نے سینکڑوں نہ تھے۔ ہزاروں کھانے والے تھے۔ کوئی وفا کا بندہ۔ کوئی زمانے کا مارا۔

کوئی عالم - کوئی شاعر - کوئی اہلِ کمال جو اسے دیکھتا - اور نام سُنتا - آتا اور دعائیں دیتا - بیٹھتا اور اُس کا مختصر دیوانخانہ متوسط حالت دیکھ کر باپ کے جاہ و جلال اور نیکیاں یاد کرتا - اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا - ان لوگوں کی ایک ایک بات اُس کے اور اُس کے رفیقوں کے لئے مرثیوں کا کام کرتی تھی - اور خون کو آنسو کر کے بہاتی تھی ✦

جب بادشاہ کے ساتھ دہلی - آگرہ - لاہور وغیرہ میں اُس کا گذر ہوتا - بڑے بڑے دستکاروں کے تحفے - مصوروں کی تصویریں - ماہیوں کی ڈالیوں سے اس کے حرم سرا میں دو کیفیتیں پیدا ہوتی تھیں کبھی مایوسی اور تاسف کہ ہائے کیا لیں - جبکہ لانے والوں کو اُن کے لائق نہ دے سکیں - کبھی اُن کا لانا ایک مبارک شگون کا رنگ دکھاتا تھا - خیال آتا تھا کہ اس تحفے کی آب و تاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا بھی رنگ پلٹیگا - اور دلوں کی افسردگی پر شادابی شبنم چھڑکے گی ✦

اکبر خوب جانتا تھا کہ ماہم خیل والے اُمرا اور دربار کے کون کون سے سردار ہیں جو اس سے اور اس کے باپ سے ذاتی عناد رکھتے ہیں - اس واسطے ماہ بانو بیگم خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بہن سے مرزا خان کی شادی کر دی - تاکہ اُس کی حمایت کے لئے بھی دربار میں تاثیر پھیلے ✦

۹۷۳ھ میں اُس کے میدان خوش نصیبی میں ایک مبارک شگون کا جلوہ نظر آیا - **اکبر خان زمان** کی مہم پر تھا - اُس نے عفو تقصیر کے لئے التجا کی - اور پنجاب سے خبر پہنچی تھی - کہ محمد حکیم مرزا کابل سے فوج لے کر آیا ہے - لاہور تک پہنچ گیا ہے - اکبر نے خان زمان کی خطا معاف کر کے ملک اُس کا برقرار رکھا - اور آپ پنجاب کے بندوبست کے لئے چلا - مرزا خاں کو خلعت و منصب عطا کر کے منعم خاں خطاب دیا - (حالانکہ منعم خاں زندہ موجود) اور چند اُمرا صاحب تدبیر کے ساتھ آگرہ کو رخصت کیا کہ دارالسلطنت کے انتظام اور حفاظت میں سرگرم رہیں ✦

آزاد - اس میں دو پہلو تھے - اوّل یہ کہ سُننے والے صورت نہیں دیکھتے - جو کہیں کہ بڈھا منعم خاں نو برس کا کیونکر ہو گیا - ہاں رعب قائم ہو گیا - کہ کہن سال کاردار گھر پر موجود ہے - خان خاناں کا لفظ بھی خوب ہے - باپ اور بیٹے میں کچھ دور کا فرق نہیں - مصالح سلطنت کے لفظوں کو دیکھو - یہی پیچ ہیں جنہیں آج کل کے لوگ ملکی پالیسی کہتے ہیں - اگر نیکی کی غرض اور نیک نیتی کی بنیاد پر ہو - تو مصلحت ملک اور دروغ مصلحت آمیز ہے - ہاں خود غرضی اور آزارِ خلائق نظر ہو - تو دغا اور فریب ہے ✦

اس کے ستارہ طلوع یا جو ہر مردانگی کی چمک تیرھویں صدی میں ہر خاص و عام کو نظر آئی جب کہ ۹۸۰ھ میں خان اعظم مرزا عزیز کوکہ احمد آباد گجرات میں محصور ہوا - اور اکبر دو مہینے کی منزلیں سات

وہاں میں طے کرکے گجرات پر جا کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے کہنہ عمل سردار رہ گئے۔ ۱۲ برس کے لڑکے کی
کیا بساط ہوتی تھی۔ وہ قدم بقدم بادشاہ کے ہمرکاب تھا۔ اُس کے دل کا جوش اور بہادری کی اُمنگ
دیکھکر اکبر نے اُسے قول (قلب لشکر) میں قائم کیا۔ جو عمدہ سپہ سالاروں کی جگہ ہے ۔

اب وہ اس قابل ہوا کہ ہر وقت دربار میں رہنے لگا۔ اور کاروبار حضور کا سرانجام کرنے لگا۔
اکثر کاموں کے لئے بادشاہ کی زبان پر اُسی کا نام آنے لگا۔ اور اُسی کی جیب بھی ہاتھ ڈالنے کے قابل ہونے
لگی۔ **آزاد**۔ نوجوانو ناتجربہ کارو سنتے ہو۔ یہی موقع اُس کے لئے نازک وقت تھا۔ یاد رہے امیرزادے
شریف زادے جو بدراہ ہوتے ہیں۔ اُن کی خرابی کا پہلا مقام یہی ہے۔ ہاں اُس کی خوش اقبالی کہو یا باپ
کی نیک نیتی کہ یہی موقع اُس کے لئے آغاز ترقی کا نقطہ ہوا۔ میں نے بزرگوں سے سُنا۔ اور خود
دیکھا۔ کہ باپ کا کیا بیٹے کے آگے آتا ہے۔ اور اُس کی نیت کا پھل اُسے ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ
جو روپیہ مرزا خاں کے پاس آتا تھا۔ یہ اُس سے دسترخوان کو وسعت دیتا تھا۔ اپنی شان سواری اور
رونق درباری کو بڑھاتا تھا۔ اہل علم و اہل کمال آتے تھے۔ بیرم خانی انعام تو نہ دے سکتا تھا۔ لیکن
جو دیتا تھا۔ اس خوبصورتی سے دیتا تھا۔ کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا دیا دلوں پر بڑی بڑی
بخششوں کا اثر پیدا کرتا تھا۔ اِس بیان میں اُس کے نمک خواروں اور وفاداروں کی تعریف کو نہ بھولنا
چاہیئے۔ کہ اُس کے سلیقہ اور لیاقت کے امتحان کا وقت یہ تھا۔ جس کے وہ برسوں کے منتظر تھے۔
بیشک وہ امتحان میں پورے اُترے۔ انہیں کی دانش و دانائی تھی۔ کہ ہر کام میں تھوڑی سی چیز
میں بڑا پھیلاؤ دکھاتے تھے۔ روپیہ خرچتے تھے اور اشرفیوں کے رنگ نظر آتے تھے۔ اور یہی باتیں
اُس زمانہ میں ہر ایک کے واسطے دربار میں ترقی مناصب کے لئے سفارش کیا کرتی تھیں۔ ایشیائی حکومتوں
کا قدیمی آئین تھا۔ کہ جس شخص کا سامان امیرانہ اور دسترخوان وسیع دیکھتے تھے۔ اُسی کو زیادہ تر
جلد ترقی دیتے تھے ۔

۹۸۲ھ میں اکبر نے احمد آباد کی حکومت مرزا کوکہ کو دینی چاہی۔ وہ سندی امیرزادہ اڑ گیا۔
اور بگڑ بیٹھا۔ کہ مجھے ہرگز منظور نہیں۔ مقام مذکور سرحد کا موقع تھا۔ اور ہمیشہ بغاوتوں اور فسادوں
کی گھڑ دوڑ سے پامال رہتا تھا۔ اکبر نے خدمت مذکور اس نوجوان کو عنایت کی۔ اور اُس نے کمال
شکریہ کے ساتھ قبول کی۔ اس وقت اُس کی عمر اُنیس بیس برس کی ہوگی۔ بادشاہ نے حسب تفصیل ذیل
چار امیر تجربہ کار کہ دولت اکبری کے نمک پروردۂ قدیم تھے۔ اُس کے ساتھ کئے اور سمجھا دیا۔ کہ
عنفوان شباب ہے۔ اور اول خدمت ہے۔ جو کام کرنا وزیر خاں کی صلاح سے کرنا۔ یہ اس خاندان کے بندۂ قدیم

قدیمی سے ہے۔ میر علاء الدولہ قزوینی کو آمینی۔ پیاکداس کو کہ حساب دانی میں فرد تھا۔ دیوانی سید مظفر بارہا کو بخشی گری فوج پر معزز کیا ◆

۹۸۶ھ میں شہباز خان کو ملیر علاقہ رانا پر فوج لے کر چڑھا۔ مرزا خان بموجب اُس کی درخواست کے مدد کو پہنچے۔ چنانچہ قلعہ مذکور اور قلعہ کوکندہ اور اودے پور افواج شاہی کے قبضہ میں آئے۔ رانا ایسا پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ کہ شہباز خاں باز کی طرح اُڑا۔ دو اسپہ سواروں کے لئے جریدہ اُس کے پیچھے پیچھے پھرا۔ مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ دُودا اسپہ سالار اُس کا حاضر دربار ہو کر گرفتار ہُوا۔ اور خطا معاف ہوئی ◆

خانخاناں کبھی اپنے علاقہ میں کبھی دربار میں کبھی متفرق خدمتیں بجا لاتا تھا۔ اور جوہر قابلیت دکھاتا تھا۔ ۹۸۸ھ میں اُس کی سیرچشمی اور خدا ترسی اور اعتبار اور علوّ حوصلہ پر نظر کر کے عرض بیگی کی خدمت سپرد کی۔ کہ حاجتمندوں کی عرض معروض حضور میں اور حضور کے احکام انہیں پہنچائے ◆

اسی سنہ میں صوبہ اجمیر کے علاقے میں فساد ہُوا۔ رستم خان صوبہ دار اجمیر مارا گیا۔ اُس میں بلا جگاٹ کچھواہہ کی سرشوری بھی شامل تھی۔ کہ راجہ مان سنگھ کے بھائی بند تھے۔ اکبر کو ہر پہلو کا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ رنتھنبور خان خاناں کی جاگیر میں دے کر حکم دیا کہ فتنہ کو فرو کرے۔ اور مفسدوں کو فساد کی سزا دے ◆

۹۹۰ھ میں جبکہ شاہزادہ سلیم (یعنی جہانگیر) کی عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔ اور خانخاناں ۲۸ برس کا ہوگا۔ اُسے شہزادہ کا آتالیق مقرر کیا ◆

آزاد۔ اکثر ریاستوں میں سنتا ہوں۔ کہ راجہ خورد سال ہے۔ فلاں شخص کو سرکار نے ٹیوٹر آتالیق مقرر کر کے بھیجا ہے۔ اس مقام پر ضرور چند منٹ ٹھیرنا چاہیئے۔ اور اُس زمانہ کے آتالیق اور آج کے ٹیوٹر صاحب کو مقابلہ کر کے دیکھ لینا چاہیئے۔ کہ عہد سلف کے سلاطین آتالیق میں کیا کیا صفتیں دیکھ لیتے تھے۔ سرکار جو باتیں آج دیکھتی ہے۔ وہ تو سب ہی دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ اوّل یہ دیکھتے تھے۔ کہ آتالیق خود رئیس ہو۔ اور خاندان شرافت و ریاست سے ہو۔ رئیس کا لفظ ہی آجتک سب کی زبان پر ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں اُس عہد میں تفصیل اُس کی بہت شرح طلب ہے۔ ہمارے شاہانِ وقت تو اس سے اتنا ہی مطلب رکھتے ہیں۔ کہ ایک شخص نے مہم حبش یا کابل پر جا کر کبھی کسی سڑک یا عمارت کا ٹھیکہ لیکر۔ کبھی نہر کی نوکری کر کے بہت سا روپیہ کما لیا ہو۔ وہ اپنے گھر بیٹھا ہے۔ کبھی پر چڑھ کر ہَوا کھاتا ہے۔ جب شاہزادہ عالم ولایت سے آتے ہیں۔ یا کوئی لاٹ صاحب

جاتے ہیں ۔ یا صاحب کمشنر ایک گنج بناتے ہیں ۔ اس میں سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے ۔ یہ سرکار میں رئیس ہے ۔ اور اسے دربار میں کرسی ملنے کا بھی حکم ہے ۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے ایک موری ایسی نکالی ۔ کہ جس میں تمام شہر کی کثافت نکل جائے ۔ اُس نے اس میں پہلے سے بھی زیادہ چندہ دیا ۔ بس یہ بڑا صاحب ہمت رئیس ہے ۔ اسے خان بہادر یا رائے بہادر کا خطاب بھی ملنا چاہیئے ۔ اور میونسپل ممبر بھی ہو ۔ اور آنریری مجسٹریٹ بھی ۔ اگر کوئی تحصیلدار یا سررشتہ دار جتا تا ہے ۔ کہ خداوند اس میں اہل خاندان اور اہل ریاست کی دلشکنی ہوگی ۔ صاحب کہتے ہیں ۔ ول یہ ہمت والا لوگ ہے ۔ یہ رئیس ہے ۔ اگر وہ رئیس ہونا چاہتے ہیں ۔ تو ہمت دکھائیں ۔ ہم اُسے ستارۂ ہند بنائینگے ۔ تب وہ دیکھیں گے ۔ نئے رئیس کا یہ عالم ہے ۔ کہ جب گھر سے نکلتے ہیں ۔ تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہ ہمیں کون کون سلام کرتا ہے ۔ اور سب کیوں نہیں کرتے ۔ خصوصاً جن لوگوں کو خاندانی سمجھتے ہیں ۔ انہیں زیادہ تر دبلتے ہیں ۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہماری ریاست جبھی ثابت ہوگی ۔ جب یہ جھک کر سلام کریں گے ۔ اب مجسٹریٹی شہر کا انتظام اُن کے ہاتھ میں ہے ۔ سب کو جھکنا واجب پڑا ۔ نہ جھکیں تو رہیں کہاں ۔ مگر ان کی شیخیوں اور نمودوں اور بار بار کے دباؤ دکھانے سے فقط خاندانی ہی تنگ نہیں بلکہ اہل محلہ تنگ ہیں جنہوں نے اصل خاندانیوں کے بزرگوں کو دیکھا ہے ۔ وہ اُنہیں یاد کر کے روتے ہیں ۔ اور جو بھول گئے تھے ۔ اُن کے دلوں میں محبت کے مٹے ہوئے حرف روشن ہو جاتے ہیں ۔ اہل نظر نے ایسے رئیسوں کا انگریزی رئیس الصلو انگریزی یا اشراف نام رکھا ہے +

آج کل رئیس کا لفظ کبھی کبھی اپنے جلسوں میں بھی ہمارے کانوں تک پہنچتا ہے ۔ یہ کیفیت بھی سننے کے قابل ہے ۔ مثلاً دو بزرگ سفید پوش ایک جلسہ میں آئے ۔ **ایک میر صاحب ایک مرزا صاحب** آیئے ۔ تشریف رکھیئے ۔ میر صاحب اہل جلسہ سے کہتے ہیں ۔ جناب آپ نے ہمارے مرزا صاحب سے ملاقات کی ؟ حضرت مجھے تعارف نہیں ۔ جناب آپ دہلی کے رئیس ہیں ۔ مرزا صاحب ایک طرف دیکھ کر کہتے ہیں ۔ قبلہ ہمارے میر صاحب سے آپ کی ملاقات اب تک نہیں ہوئی ؟ جناب بندہ تو محروم ہے آپ لکھنؤ کے رئیس ہیں ۔ اب لکھنؤ میں جا کر پوچھئے ۔ میر صاحب کہاں رہتے ہیں ۔ کچھ ہوں تو پتا لگے ماں مینی باپ کلنگ بچے دیکھو رنگ برنگ ۔ لاحول ولاقوۃ الاباللہ ۔ مرزا صاحب کو دہلی میں ڈھونڈیئے تو باپ دینا ماں مینا ۔ بیٹا مرزا ہینا ۔ نئی روشنی اصلیت کا اندھیر ۔ جو چاہے بن جائیے +

اب وہ بھی سن لو کہ بزرگان سلف رئیس کسے کہتے تھے ۔ اور شاہان سلف رئیسوں پر کیوں جان دیتے تھے ۔ (۱) میرے دوستو نہایت بزرگ رئیس اُسے کہتے تھے ۔ کہ شریف نجیب الطرفین ہو ۔

ایہ داغ دامن پر نہ ہو۔ کہ ماں لونڈی تھی یا دادا نے ڈومنی گھر میں ڈالی تھی۔ یاد رکھنا ہزار دولتمند صاحب دستگاہ ہو۔ دغیلے آدمی کا وقار لوگوں کی نظروں میں نہیں ہوتا۔ ذراسی بات دیکھتے ہیں۔ صاف کہہ بیٹھتے ہیں۔ میاں کیا ہے۔ آخر ڈومنی بچہ ہی ہے نہ۔ ایک کہتا ہے۔ میاں نواب زادہ ہے۔ تو کیا ہے۔ لونڈی کی بھی تو رگ ہے۔ اثر آوے ہی آوے ۔

پرستار زادہ نیاید بکار	اگرچہ بود زادۂ شہریار

(۲) رئیس کے لئے یہ بھی واجب تھا۔ کہ وہ بھی اور اُس کے بزرگ بھی صاحب دولت ہوں۔ اُن کا ہاتھ سخاوت کا پیمانہ ہو۔ اور لوگوں کا ہاتھ اُن کے دست فیض کے نیچے رہا ہو۔ اگر غریب کا بیٹا تھا۔ اب صاحب دولت ہو گیا تو اُسے کوئی خاطر میں نہ لائے گا۔ وہ کسی موقع پر شادی دمہانی میں کھلانے کھانے میں۔ لینے دینے میں۔ بلکہ ایک مکان کے بنانے میں اگر مصلحتاً بھی کفایت شعاری کرے گا۔ تو کہنے والے ضرور کہہ دینگے۔ صاحب یہ کیا جانے کبھی باپ دادا نے کیا ہوتا تو جانتا کبھی کچھ دیکھا ہوتا تو جانتا۔

ہر کہنہ گدائے کہ توانگر باشد	صد سال از دلوئے گدائی نہ رود

(۳) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا۔ کہ آپ سخی ہو۔ کھانے کھلانے والا ہو۔ فیض رساں اور لوگوں سے نیکی کرنے والا ہو۔ اگر بخیل ہے۔ اور با وجود اختیار کے لوگوں کو اُس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو اُسے بھی کوئی خاطر میں نہ لائے گا۔ صاف کہہ دیں گے ع

بے فیض اگر حاتم ثانی ہے تو کیا ہے

دولت ہے تو اپنے گھر میں لئے بیٹھا رہے ہمیں کیا ؎

سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود	اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے

(۴) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا۔ کہ نیک اطوار خوش اعمال ہو۔ بدچلن آدمی ہزار دولت والا ہو۔ لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہی ہوتا ہے۔ اس کی دولت آنکھوں میں نہیں جچتی۔ لیں پھر یہ سب کہنے اچھا ان باتوں سے غرض کیا تھی۔ کہ شاہان سلف اور اہل شرف ان اوصاف کو ڈھونڈتے تھے۔ بات یہ ہے کہ جو شخص ان اوصاف کے ساتھ امیر ہو گا۔ اور اُس کے باپ دادا بھی امیر ہونگے اُسکے کلام اور اُس کے کام کو تمام لوگوں کی نگاہوں اور دلوں میں بھی وقعت اور وقار ہو گا۔ سب اُس کا لحاظ کریں گے۔ اور اُس کے کہنے سے عدول کرنے کو ان کے دل گوارا نہ کرینگے۔ ایسے ایک شخص کو اپنا کر لینا گویا ایک انبوہ کثیر پر قبضہ کر لینا ہے۔ وہ جہاں جا کھڑا ہو گا۔ جماعت کثیر آ کھڑی ہوگی۔ وقت پر جو کام سلطنت کے اُس سے نکلیں گے کمینے دولتمند سے نہ نکلینگے۔ کمینے کا ساتھ کون دیتا ہے۔ اور جب

یہ بات نہیں۔ تو بادشاہ اُسے لے کر کیا کرے؎

(۵) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ فضیلت علمی کے لحاظ سے عالم فاضل نہ ہو مگر ملک کی زبانہائے علمی سے واقف ہو۔ اگر ایشیائی ملکوں میں ہے۔ تو زبان عربی و فارسی کی معمولی کتابیں پڑھا ہو۔ علوم و فنون مشہورہ کی ہر ایک شاخ سے باخبر ہو۔ خود کمالات کا شائق ہو۔ اور اُن کے ذکر و اذکار سے لطف اُٹھاتا ہو۔ کیونکہ بے علم اور بے لطف آدمی جس کا دل و دماغ اس نور سے روشن نہ ہوگا۔ وہ شاگرد کے دماغ کو کیا روشن کرے گا۔ جس کو ملک کا بادشاہ ہونا ہے۔ اور کشور اور اہل کشور کے دماغوں کو اُس سے روشن کرنا ہے۔ اگر اتالیق کا دل علوم کے تذکروں سے لطف اُٹھاتا ہوگا۔ اور علم کی بات اُسن کر دل چٹخارا بھرتا ہوگا۔ تو شاگرد کے دل میں بھی اُس کی تاثیر دوڑا سکے گا۔ اور ہمیشہ اُس کے دلچسپ چرچے رکھے گا۔ خود مزا نہ ہوگا تو روکھی سوکھی خالی عبارتوں کی بک بک سے شاگرد کے دل کو کیا مائل کرے گا اور وہ مائل ہی کب ہوگا۔ علمی مطالب اُس کے سامنے ایسے ڈھب سے پیش کرے۔ کہ جس طرح مزے کی چیز کھا کر یا خوشبو سونگھ کر یا خوش رنگ پھول دیکھ کر مزا آتا ہے۔ اسی طرح علمی مسائل سُنکر مزا آئے۔ اور تم خوب سمجھ لو۔ جب تک علم کا مزا نہیں تب تک کچھ آنا ممکن ہی نہیں۔ جسے یہ نہیں اسے علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور اہل علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور وہ اپنے ملک میں علم و کمال کب پھیلا سکے گا۔ اہل کمال اُس کے دربار میں کیا جمع ہو سکیں گے۔ اور یہ نہیں تو سلطنت نہیں؎

اُس زمانہ میں مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔ نیم علمی زبان یعنی درباری۔ دفتری اور مراسلات کی زبان فارسی تھی۔ ترکی کی بڑی عزت تھی۔ اور نہایت کار آمد تھی۔ جیسے آج انگریزی۔ کیونکہ بادشاہِ وقت کی زبان تھی۔ تمام امرا۔۔۔۔ جو ماوراء النہری تھے۔ اُن کی بھی اور اہل فوج کی ترکی زبان تھی۔ ایرانی بھی ترکی بولتے تھے۔ اور سمجھتے توسب تھے۔ اکبر خود بہت خوب ترکی بولتا تھا۔ **خان خاناں** اگرچہ یہاں پیدا ہُوا اور یہیں پلا تھا۔ مگر ترکمان کی ہڈی تھی اور باپ کے نمک حلال وفاداروں کی گودوں میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے ترکی خوب بولتا تھا؎

یہ بھی سن لو کہ تمہارے بزرگ انسان کو کسی زبان کا زبان داں اُسی وقت سمجھتے تھے۔ کہ جب وہ اہل زبان کے ساتھ تحریر و تقریر رہنے سہنے۔ بیٹھنے اُٹھنے میں فقط کارروائی نہ کر سکے۔ بلکہ اُس فصاحت اور مہارت کے ساتھ گذران کرے۔ جس طرح خود صاحب زبان بولتے ہیں۔ یہ نہیں کہ نواب بہادر عربی جانتے ہیں۔ مزاجکم طیب؟ الحمد للہ۔ کیف حالکم؟ وانت طیب؟ چند اُلٹے سیدھے فقرے یاد کر لئے۔ آئیں بائیں شائیں بتایا۔ اور زبان داں ہو گئے۔ صاحب آپ کے زبانیں

جانتے ہیں۔ ول ۲۵۔ بات کرو تو ایک فقرہ صحیح نہیں بول سکتے لکھواؤ تو ایک سطر ٹھیک نہیں لکھ سکتے ایک صاحب نے ملتان کی زبان میں گفتگو کی کتاب بنائی۔ دو ہزار روپیہ انعام پائے۔ خود گفتگو سنو تو دم بخود۔ ایک صاحب نے بلوچی زبان کی ایک کتاب بنائی۔ بات کرو تو ویدم و لے نہ گویم۔ اس زمانے کے لوگ ایسے زبان دانی نہ سمجھتے تھے ٭

میرے دوستو تالیق کی علمیت کے ساتھ اتنا اور یاد رکھو۔ کہ وہ فقط پڑھا ہی نہ ہو۔ پڑھا بھی ہو اور گنا بھی ہو۔ تم جانتے ہو ا پڑھنا کیا ہے؟ اور گنا کیا ہے۔ پڑھنا تو یہی ہے۔ کتابوں کے پنّوں میں جو کاغذ سفید ہیں۔ اور اُن پر جو کچھ سیاہ لکھا ہے۔ وہ پڑھ لیا۔ گنا میں تمہیں کیا بتاؤں؟ وہ تو ایک ایسی شے ہے۔ کہ اس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی ع

ملا شدن چہ آساں آدم شدن چہ مشکل

اچھا۔ میں بے گنے لوگوں کے کچھ پتے دیتا ہوں۔ انہیں سمجھ و سگئے کہ تم آپ پہچان لوگے۔ دیکھو بے گنے لوگ یہی ہیں جنہیں تم دیکھتے ہو۔ کہ کتابوں کے ورق کے ورق پڑھے جاتے ہیں۔ ایک بچارے کو چھینک آئی۔ کہہ دیا کافر۔ کھانا کھا کر ڈکار لی۔ کہہ دیا کافر۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایمان کیا ہوا کچا سوت ہوا۔ کہ ٹیس لگی ٹوٹ گیا۔ ایسا اتالیق ہو۔ تو ایک ہفتہ میں سارا ملک صاف ہے۔ استاد رہے شاگرد رہے۔ باقی اللہ اللہ ٭

شاہان گذشتہ اور اُمرائے سلف علوم کے ذیل میں علم اخلاق۔ تاریخ دانی ہیئت نجوم۔ بلکہ شاعری انشاپردازی۔ خوشنویسی مصوری وغیرہ وغیرہ فنون کے اجزا کامل سمجھ کر بڑی کوشش سے حاصل کرتے تھے۔ اور جو لوگ ان باتوں میں کمال رکھتے تھے۔ اُن کی عزت و توقیر کرتے تھے۔ خود بھی ان باتوں میں کمال یا اچھی مداخلت پیدا کرتے تھے۔ تاکہ بھلے بُرے کو پرکھ سکیں۔ شہسواری۔ تیراندازی۔ نیزہ بازی شمشیرزنی وغیرہ وغیرہ فنون سپاہ گری میں اعلےٰ درجہ کی مشق پیدا کرتے تھے۔ صید افگنی کو ذریعۂ مشق رکھا تھا۔ مگر یہ ہنر اکبر ہی کے وقت تک کارآمد رہے۔ کیونکہ وہی تھا۔ جو یلغار کر کے فوج لے جاتا تھا۔ اور دفعتہً دشمن کی چھاتی پر جا کھڑا ہوتا تھا۔ میدان جنگ میں خود کھڑے ہو کر فوج کو لڑاتا تھا۔ اور آپ تلوار پکڑ کر حملہ کرتا تھا۔ گھوڑا دریا میں ڈالتا تھا اور اُتر جاتا تھا۔ پھر کوئی بادشاہ اس طرح نہیں لڑا۔ آرام طلب ہو گئے۔ خوشامدی کہتے ہیں۔ حضور آپ کا اقبال ماریگا۔ حضور بیٹھے وش ہو رہے ہیں۔ کچھ شق نہیں۔ کہ شکار اور فنون مذکورہ جب تک اُس غرض سے ہیں تب تک ہنر با کمال جو کہو درست۔ یہ نہ ہو تو وہی عالمگیر کا قول۔ شکار کار بیکار انست ٭

علم مجلس کہ جزئیات مذکورہ کی معلومات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اُس کا جزوِ اعظم فصاحت کلام اور حسن تدبیر ہے۔ اور وہ ایک خداداد امر ہے۔ جسے خدا دے۔ ایک عالم فاضل آدمی ایک مطلب کو بیان کرتا ہے۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ کیا کہا۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی کسی دربار یا جلسہ میں اس طرح بات کہتا ہے۔ کہ بے علم نوکروں تک کے کان بھی ادھر ہی لگ جاتے ہیں ⁂

سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت اور موقع کلام کو پہچانے۔ آنکھوں کے رستہ دل میں اُتر جائے۔ ہر ایک کی طبیعت کا انداز پائے۔ اس کے بموجب اپنے مطالب کو لباس تقریر پہنائے۔ اور رنگ بیان چڑھائے۔ غلام ہوں اُن صاحب کمال سحر بیانیوں کا کہ ایک بھرے جلسہ میں تقریر کر رہے ہیں۔ مختلف الرائے مختلف خیال مختلف مذہب کے لوگ بیٹھے ہیں۔ مگر اُن کی تقریر کا ایک نقطہ بھی کسی دل پہ ناگوار ہو کر نہیں کھٹکتا۔ ایک خوانچے والے کا لڑکا یا ایک جلاہے کا بیٹا مسجد میں رہ کر عالم فاضل ہو گیا۔ یا کالج میں پڑھ کر بی اے۔ ایم اے ہو گیا تو ہوا کرے۔ مقاصد مذکورۂ بالا اور علم مجلس اور آداب محفل کی اُس غریب کو کیا خبر۔ وہ آپ ہی نہیں جانتا۔ شاگرد کو کیا سکھائے۔ درباروں سرکاروں کی ڈیوڑھی تک اس کے باپ دادا کو جانا نصیب نہیں ہوا۔ وہ بچارا وہاں کی باتیں کیا جانے۔ اور کہیں لکھا دیکھ کر یا سن سنا کر معلوم بھی کر لیا۔ تو کیا ہوتا ہے۔ یہ کہاں اور وہ لوگ کہاں! جو اسی دریا کی مچھلی تھے۔ بزرگوں کے ساتھ تیر کر بڑے ہوئے تھے۔ ان کا دل کھلا ہوا تھا۔ اُن کو وقت پر قواعد و آداب کے سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے موقع پر خود بخود اعضا میں وہی حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔ اب بھی نئے روشن ضمیر نو تعلیم یافتہ کہیں جا پہنچتے ہیں۔ تو سلام کرنا بھی نہیں آتا۔ میرے دوستو! اُن کے ہوش بجا نہیں رہتے۔ چلتے ہیں۔ قدم ٹھکانے نہیں پڑتا۔ اور نظر باز بھی وہیں کنارے کھڑے ہیں۔ بات بات کو پرکھ رہے ہیں کہ یہاں چوکا وہاں بھولا۔ یہ ٹھوکر کھائی۔ وہ گر پڑا۔ پھر صاف کہہ دیتے ہیں کہ مولوی صاحب خواہ بابو صاحب ٹکسال باہر ہیں۔ خیر اب نہ وہ دربار نہ وہ سرکار۔ جہاں ٹوٹا پھوٹا کارخانہ ہے۔ اُس کا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ خوب ہوا۔ خدا نے سب کا پردہ رکھ لیا ⁂

دیکھنے کے قابل یہ امر ہے۔ کہ ہونہار نوجوان نے اپنے علوم و فنون۔ اوصاف کمالات۔ آداب و خلاق۔ عادات و اطوار متانت و سخاوت سے ایسے ہی عمدہ نقش بادشاہ کے دل پر بٹھائے ہونگے کہ بڑے بڑے کہن سال کارگذار امیر موجود تھے۔ اُن کے ہوتے ولی عہد کی اتالیقی کے لئے اس پر صاد کیا۔ غرض جب منصب جلیل عطا ہوا تو اس نے بہ ادائے شکرانہ جشن شاہانہ کا سامان کیا۔ اور رونق افروزی کے لئے بادشاہ کی خدمت میں التجا کی۔ بادشاہ تشریف لے گئے۔ مینہ کو برسنا۔ دریا کو

بھاؤ اور بیرم خان کے بیٹے کو دریا دلی کون سکھائے۔ قلعہ سے لے کر اپنے گھر تک سونے چاندی کے پھول لٹائے۔ گھر قریب رہا۔ تو موتی برسائے۔ پا انداز میں مخمل و زربفت بچھائے۔ گھر میں سوا لاکھ روپیہ کا چبوترہ بنایا۔ اُس پر بادشاہ کو بٹھا کر نذر دی۔ وہاں سے اُٹھا کر دوسری بارگاہ میں لے گیا۔ چبوترہ لٹوا دیا۔ جواہر اور موتی نثار کیے۔ امرا نے توڑے پیشکش میں جواہرات ملبوسات اسلحہ کہ خزائن سلطانی میں رکھنے کے قابل تھے۔ عمدہ ہاتھی۔ اصیل گھوڑے کہ بادشاہی کارخانوں کی زینت تھے۔ پیشکش گذرانے اور امرائے دربار کو بھی حسب مراتب عجائب غرائب تحفوں سے خوش کیا۔ اور خوش ہُوا۔ مگر اصل خوشی کی کیفیت ان بڈھے رفیقوں سے پوچھنی چاہیے۔ جو آج کی اُمید پر زندگی کا دامن پکڑے چلے آتے تھے۔ تلخ چائے کی پیالیاں اور پھیکے شربت پیتے تھے۔ اور دعائیں کرکے جیتے تھے۔ لیکن اُن کہن سال بڑھیوں کی خوشی کسی عبارت میں ادا نہیں ہو سکتی۔ جنہیں نہ دن کو آرام تھا نہ رات کو نیند تھی۔ جب گھر میں اکبری دربار لگا ہوگا۔ تو اُن کا کیا حال ہُوا ہوگا۔ شکر کے سجدے میں پڑی ہوں گی۔ اور خوشی کے آنسو جاری ہوں گے۔ اور حق پوچھو تو اس سے زیادہ خوشی کی جگہ کیا ہوگی۔ سوکھی نہر میں پانی آیا۔ برباد چمن آباد ہُوا۔ ویران کھیت ہرا ہُوا۔ جس گھر میں دھندلے چراغ جلتے تھے۔ سورج نکل آیا۔

مرزا خاں کی جوہر لیاقت کا چشمہ جو مدّت سے بند پڑا تھا ۹۹۱ھ میں فوارہ ہو کر اُچھلا صورت حال یہ ہوئی۔ کہ اکبر کا جی یہ چاہتا تھا۔ کہ قلمرو ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک میرا سکّہ چلے فتح گجرات کے بعد اعتماد خاں ایک پُرانا سردار سلطان محمود گجراتی کا نمک خوار تھا۔ اس سے الگ ہو کر اکبری اُمرا میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ بادشاہ کے خیالات کو اُدھر متوجہ کرتا تھا۔ ان دنوں میں موقع دیکھ کر بعض امرا کو اپنے ساتھ ہمداستان کیا۔ اور بہت سی صورتیں پیدا کیں۔ جس میں ملک مذکور کی آمدنی بڑھے۔ اخراجات میں کفایت ہو۔ اور سرحد آگے کو سرکے۔ ۹۹۱ھ میں اس نے موقع دیکھ کر پھر عرض معروض کی۔ اور بعض امرا کو اپنے ساتھ ہمداستان کیا۔ اکبر نے اُسے ملک مذکور کا واقف حال دیکھ کر مناسب سمجھا۔ کہ شہاب الدین احمد خاں کو گجرات سے بلائے۔ اور اُسے صوبہ کر کے بھیجے۔

وہاں کی حقیقت سنو کہ معاملہ پیچ در پیچ ہو رہا تھا۔ یاد کرو گجرات پر اکبر کی یلغار ابراہیم حسین مرزا وغیرہ تیموری شاہزادوں کی جڑ اکھیڑ چکی تھی۔ مگر گلے سڑے رگ و ریشے زمین میں باقی تھے بہت سے مغل بدخشی ہزارے ماوراء النہری ترک اُن کے نام لیوا جیتے تھے۔ جب اکبری انتظاموں کا استقلال

دیکھا۔ تو تلواریں جنگلوں میں چھپا کر بیٹھ گئے تھے۔ جو سردار ادھر سے جاتا۔ ہیر پھیر دے کر اس کے رابستوں کے ساتھ نوکری کر لیتے تھے۔ مگر فکر کے چوہے دوڑاتے تھے۔ اور دل میں دعائیں مانگتے تھے ◆

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

شہاب الدین احمد خان جب پہنچا تھا۔ تو اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ یہ مفسد حاکم سابق (وزیر خاں) کے انتظام کو بھی بگاڑا چاہتے تھے۔ اور اب بھی اُسی تاک میں ہیں۔ یہ سردار پُرانا سپاہی تھا سرگروہوں کو دریافت کیا۔ اور فوج تھانے تحصیل میں بھر کر ہر ایک کو کام میں لگا دیا۔ غرض اس حکمت عملی سے ان کے جتھے اور زور کو توڑ لیا تھا۔ جب بادشاہ کو خبر پہنچی۔ تو حکم بھیجا۔ کہ ان لوگوں کو ہرگز جمنے نہ دو ورپلنے معتمد اور وفادار آدمیوں سے کام لو ◆

بڈھے سردار نے اس انتظام کا موقع نہ پایا۔ وقت ٹالتا رہا۔ بلکہ اُن کے منصب اور علاقے بڑھا کر دلاسے سے کام لیتا رہا۔ اعتماد خاں پہنچا تو اکبری ارادوں اور نئے انتظاموں کے سُر اُنکے کان میں پہنچ لئے تھے فتنہ گروں نے ارادہ کیا کہ شہاب الدین احمد خاں کا کام تمام کیجئے۔ اعتماد خاں تازہ وارد ہو گا۔ مظفر گجراتی سلطان محمود کا بیٹا جو گمنامی کے ویرانوں میں بیٹھا ہے۔ اُسے بادشاہ بنائیں گے ◆

اُنہیں میں سے ایک مفسد نے آکر ادھر بھی خبر دی۔ شہاب کا رنگ اُڑ گیا۔ مگر حکم بادشاہی سے یہ بھی دل شکستہ ہو رہا تھا۔ اس لئے نہ تحقیقات کی نہ بندوبست کیا۔ اِن لوگوں کو کہلا بھیجا کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ ان کی عین مراد تھی۔ جھٹ نکلے۔ اور اپنے پرانے پرگنوں میں پہنچ کر اور مفسدوں کو جمع کرنے لگے۔ ساتھ ہی مظفر کو چٹھیاں دوڑائیں۔ بعض مفسد شہاب میں پانی کی طرح مل گئے۔ اور بڈھے سے قسمیں لیں۔ کہ دربار کو جائے۔ تو ہمیں ساتھ لیتا جائے۔ اندر اندر اوروں کو بہکاتے تھے۔ اور رقیبوں کو یہاں کی خبریں پہنچاتے تھے۔ سرگروہ ان کا میر عابد تھا ◆

فلک کا قاعدہ ہے۔ کہ زمانہ میں جن لوگوں کو بڑھاتا ہے۔ اور جن باتوں کو اُن کے بڑھنے کا کا سامان کرتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایسا موقع لاتا ہے۔ کہ اُنہیں گھٹاتا ہے۔ اور جن باتوں کو اس وقت بڑھانے کی سیڑھی بنایا تھا۔ اُنہی باتوں کو نمونہ لے دانشی کر کے گھٹاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو اس وقت وہ پامال کر کے چڑھے بڑھے تھے۔ اُنہی کو یا اُن کے بچوں کو اُن سے آگے بڑھاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے وہ وقت کہ بیرم خاں جیسے کو دانش کو ایک بڑھیا انّا اور انہی انّا والوں کے ہاتھ سے کس طرح توڑا۔ وہ سب اسی سال میں فنا ہو گئے۔ یہی ایک رقم باقی رہی تھی۔ کہ شہاب خاں سے شہاب الدین احمد خاں ہو کر پنجہزاری منصب تک پہنچ گئے۔ اور اکثر مہموں کی سپہ سالاری کر چکے۔ اب تماشے دیکھو ایسی بیرم خاں

کے بیٹے کے سامنے شہاب کو کس طرح پانی پانی کرتا ہے ۔

آزاد تو پرانی لکیروں کا فقیر ہے۔ بڈھوں کی باتیں یاد کرتا ہے۔ اور وجد کرتا ہے۔ کہا کرتے تھے جا میاں جیسا کرے اپنی اولاد کے آگے پائے۔ خیر اب بیرم خاں کی نیک نیتی کہو خواہ مرزا خاں کا زور اقبال شہاب کی دانائی اُسے لڑکوں کے سامنے بیوقوف بناتی ہے ۔

اعتماد خاں اور خواجہ نظام الدین جو دربار سے گئے تھے پٹن میں پہنچے۔ شہاب کا وکیل آیا ہوا تھا اُنہوں نے اپنا وکیل ساتھ کیا۔ دربار سے اسپ و خلعت اور فرمانِ رخصت جو لے کر گئے تھے بھیجا۔ شہاب خاں استقبال کو کئی کوس آگے گئے۔ فرمان کو سر پر رکھا۔ اُٹھے بیٹھے۔ آداب بجا لائے۔ پڑھا۔ اور اُسی وقت کنجیاں سپرد کر دیں۔ اپنے تھانے جو اطراف کے قلعوں پر بٹھائے تھے۔ اُٹھوا منگائے۔ نئے اور پُرانے تقریباً ۸۰ قلعے تھے۔ کہ اکثر خود تعمیر اور اکثر مرمت کر کے درست کیے تھے۔ فساد تو یہیں سے شروع ہو گیا۔ کہ تھانوں کے اُٹھتے ہی کولی اور گراس اُدھر کی وحشی قومیں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اکثر قلعوں کو ویران کر کے تمام ملک میں لوٹ مچا دی ۔

شہاب پروان کے قلعہ سے نکل کر عثمان پور (ایک محلہ کنارِ شہر پر ہے) اُس میں آ گئے۔ اعتماد خاں شاہ ابوتراب۔ خواجہ نظام الدین احمد[1] خوشی خوشی قلعے میں داخل ہوئے۔ میر عابد نمک حرام کہ شہاب کے پاس ملازم تھا۔ پانسو کی جمعیت لے کر الگ جا پڑا۔ اعتماد خاں کو پیام بھیجا کہ ہم بے سامان ہیں شہاب کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ جو انہوں نے جاگیر[2] دی تھی۔ وہ بحال رکھئے۔ تو خدمت کو حاضر ہیں۔ ورنہ خلق خدا ملک خدا ہم رخصت۔ اعتماد خاں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر نہ سوچا نہ سمجھا۔ کہلا بھیجا۔ کہ بے حکم وہ جاگیریں تنخواہ نہیں ہو سکتیں۔ ہاں میں اپنی طرف سے رعایت کروں گا۔ انہیں تو بہانہ چاہیے تھا۔ صاف اپنے یاروں میں جا ملے۔ ہنگامہ اور بھی گرم ہوا ۔

اعتماد خاں کو جو فوج دربار سے ملی تھی۔ وہ ابھی نہ آئی تھی۔ سوچا کہ شہاب کو ان فتنہ انگیزوں سے لڑا کر رنگ جمائیے۔ شاہ اور خواجہ کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ تمہارے نوکروں نے فساد کیا ہے۔ تم ابھی جانے میں توقف کرو۔ اور ان کا بندوبست کرو۔ حضور میں اس کا جواب تمہیں لکھنا ہوگا۔ اُس نے کہا کہ یہ مفسد تو اس دن کی دعائیں کر رہے تھے۔ اور میرے قتل کے درپے تھے۔ کام اصلاح سے گذر چکا ہے۔ مجھ سے کیا ہو سکتا ہے۔ تم جانو اور یہ۔ مگر اس طرح ملک داری کے کام نہیں چلتے۔ ان لوگوں کو

[1] مصنف طبقات اکبری دیکھو صفحہ ۸۴۲ ۔

[2] اس عہد میں علاقے جاگیر کے طور پر مل جایا کرتے تھے۔ کہ سردار اپنے اخراجات اور اپنی فوج کی تنخواہ وہاں سے وصول کر لیا کرتے تھے ۔

جاگیر دے کر پرچاؤ۔ اور یہ نہیں تو ابھی مفسدوں کی جمعیت تھوڑی ہے۔ بلوا عام نہیں ہوا۔ ملکی اور جنگی
لوگ ہیں۔ کوئی سردار معتبر بھی ابھی ان میں نہیں پہنچا۔ اپنے اور میرے آدمی بھیجو کہ دفعتہً جا پڑیں۔ اور
تتر بتر کر دیں۔ اعتماد خاں نے کہا۔ کہ تم شہر میں آ جاؤ۔ پھر جو صلاح ہو گی۔ سو ہو گا۔ یہ بھی شہاب الدین
احمد خاں تھے۔ بچہ نہ تھے۔ ماہم کے دودھ کی دعائیں دیکھی تھیں۔ کہا کہ میں نے خود قرض سے سامان
سفر کیا ہے۔ فوج بد حال ہے۔ بدقت شہر سے نکلا ہوں۔ پھر کر آنا دقت پر دقت ہے۔ غرض حیلے
حوالے بتا دیے۔ اعتماد خاں نے کہا۔ کہ تم شہر میں چلے جاؤ۔ خزانہ سے مدد خرچ میں دوں گا۔ کئی
دن مہم کی اونچ نیچ۔ جواب سوال اور رقم کی مقدار مشخص کرنے میں گذر گئے۔

شہاب تاڑ گئے۔ کہ یہ دکنی سردار پرانا سپاہی ہے۔ باتوں باتوں میں کام نکالنا چاہتا ہے۔
کہ جب تک اُس کی فوج آئے۔ مجھے اور میرے آدمیوں کو یہاں روک کر اپنی جمعیت او حیثیت بنائے
رکھے۔ جب وہ آ گئے۔ تو مجھے سر تیھرا چھوڑ دیگا۔ اس کی نیت نیک ہوتی۔ تو پہلے ہی دن روپیہ کا
سرانجام کرتا۔ اور میرے لشکر کا سامان درست کر کے مہم کو سنبھال لیتا۔ غرض شہاب میدان احمد آباد سے
کوچ کر کے کڑی میں جا پڑے۔ کہ بیس کوس ہے۔ مفسد ماتر میں پڑے تھے۔ فوراً کاٹھیواڑہ پر پہنچے۔
سلطان محمود گجراتی کا بیٹا مظفر کاٹھیواڑہ میں آ کر اپنی سسرال میں چھپا بیٹھا تھا۔ اُسے سب روداد سنا
کر باغ سبز دکھایا۔ اُس کے باپ دادا کا ملک تھا۔ اُسے اس سے زیادہ موقع کیا چاہیے تھا فوراً اُٹھ
کھڑا ہوا۔ وہیں کے چند مفسد گروہوں کو بھی ساتھ لیا۔ ۱۵ سو کے قریب کاٹھی لٹیرے ساتھ ہو گئے۔
اور اس طرح آئے۔ کہ دولقہ میں آ کر دم لیا۔ سوچ میں تھے۔ کہ شہاب جو دربار کو چلا ہے اُس
پر شبخون ماریں۔ یا اور کسی آباد شہر کو جا لوٹیں۔ اعتماد خاں بڈھا سپاہی اور اسی ملک کا سردار تھا
مگر اُس کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اُس نے جب سنا۔ کہ مظفر دولقہ میں آن پہنچا۔ تو ہوش اُڑ گئے۔
بیٹے اور دو تین سرداروں کو احمد آباد میں چھوڑا۔ اور کہا کہ میں خود جا کر شہاب کو لاتا ہوں۔ ہر
چند اہل صلاح نے کہا۔ کہ غنیم بارہ کوس پر پڑا ہے۔ اٹھارہ کوس جانا اور شہر کو اس طرح پر چھوڑ
دینا مناسب نہیں۔ بڈھے نے نہ سنا۔ اور خواجہ نظام الدین کو لیکر روانہ ہوا۔ اُس کے نکلتے ہی بدمعاشوں
نے اُدھر خبر پہنچائی۔ غنیم جو کہ خود حیران تھا۔ کہ کدھر جائے۔ جھٹ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور سیدھا
احمد آباد پر آیا۔ قدم قدم پر سینکڑوں لٹیرے ساتھ ہوتے گئے۔ سرکھیج شہر سے تین کوس ہے۔ جب
وہ یہاں پہنچا۔ تو چند مجاوروں نے سلاطین ماضین کے درباروں سے اُٹھ کر ایک پھولوں کا
چتر سجایا۔ اور لے کر سامنے ہوئے۔ وہ نیک شگون نیک فال کے نشانہ گولی کی چوٹ

لہ شہر میں رہ کر دروازہ سے داخل ہوا تھا۔ جو اُس زمانے میں کسی دروازے کا نام تھا۔

شہر میں داخل ہوا۔ پہلوان علی سیستانی کوتوال تھا۔ آتے ہی اسے پچھاڑ کر قربانی کیا شہر میں قیامت مچ گئی۔ بادشاہی سرداروں میں کیا دم تھا۔ جان کو لے کر بھاگنا فتح سمجھے شہر لاوارث رہ گیا۔ اہل فساد نے لوٹ مار شروع کر دی۔ گھر اور بازار زر و جواہر اور مال دولت سے بھرے ہوئے تھے۔ پل کی پل میں لٹ کر صاف ہو گئے۔

ادھر اعتماد خاں نے شہاب کے پاس جا کر اس عہد کا رنگ جمایا۔ کہ دو لاکھ روپیہ نقد مجھ سے لو اور جو پرگنے جاگیر میں تھے۔ وہ جاگیر میں رکھو اور احمد آباد کو چلو۔ وہ قسمت کا مارا راضی ہو گیا۔ اور دونو بڈھے ساتھ ہی روانہ ہوئے۔

من و مربی من ہر دو آنچناں معذور کہ ہر دو را دو مربی خوب مے باید

شہاب کو اپنے نوکروں کا حال معلوم تھا۔ رات کو قرآن بیچ میں رکھے۔ قول و قسم سے ایمانوں کو مضبوط کیا۔ اور روانہ ہوئے تھوڑی ہی دور آگے بڑھے تھے۔ کہ شہر کے بھگوڑے ملے۔ جو خاک وہاں اُڑا کر آئے تھے چہروں پر نمودار تھی۔ سنتے ہی دونو بڈھوں کے رنگ ہوا ہو گئے۔ آگے پیچھے کے سردار اکٹھے ہوئے۔ خواجہ نظام الدین نے کہا۔ کہ گھوڑے اُٹھاؤ۔ شہر پر جا پڑو۔ اور دم نہ لو۔ اگر غنیم نکل کر سامنے ہو۔ تو لڑ مرو۔ یا قسمت یا نصیب قلعہ بند ہو کر بیٹھا تو محاصرہ ڈالدو۔ اعتماد خاں کی بھی فوج آتی ہے۔ جیسا ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ مگر شہاب تو گھر کو پھرا تھا۔ دل اچاٹ تھا۔ لشکر کے اہل و عیال ساتھ تھے۔ غلطی یہ تھی کہ ادھر مرزا تو بھی ان کے کچے ساتھ کو کڑمی میں نہ چھوڑا۔ غرض مارا مار شہر کے پاس پہنچے۔ اور اہل لشکر عثمان پور پر آکر ڈیرے ڈالنے لگے۔ کہ بال بچوں کو بٹھائیں۔ اس وقت بھی نظام الدین احمد وغیرہ ہمت والوں نے کہا۔ کہ باگیں اُٹھائے شہر میں دھنس جاؤ۔ آسان کام کو دشوار نہ کرو۔ بڈھوں نے نہ مانا۔

غنیم کو ان کے آنے کی خبر لگ چکی تھی خاطر جمع سے سامان جنگ کر کے باہر نکلا۔ اور دریا کے کنارے فوج کا قلعہ باندھ کر سد سکندر ہو گیا۔ فوج اہل و عیال اسباب و مال سنبھال رہی تھی۔ کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ شہاب آٹھ سو سپاہی کو لے کر ایک بلندی پر جمے۔ اور فوج کو آگے بڑھایا۔ فوج نے حق نمک ادا کیا۔ مگر سرداروں نے نمک حرامی کی جو نمک حلال تھے۔ وہ حلال ہو گئے شہاب کی نوبت آ گئی۔ ہمراہی بھاگے۔ ان کا گھوڑا گولی سے چھدا۔ فقط بھائی بند گرد رہ گئے۔ دشمن کا ہجوم دیکھ کر ایک جاں نثار نے باگ پکڑ کر کھینچی۔ اُنہوں نے بھی غنیمت سمجھا۔ اور بھاگے۔ اپنے ہی نوکروں میں سے ایک نمک حرام نے پشت پر تلوار ماری۔ الحمدللہ کہ ہاتھ اوچھا پڑا۔ ایسے بھاگے

کہ پٹن (نہروالا) پچاس کوس ہے۔ ایک دن میں پہنچ کر وہاں دم لیا*
کاٹھی اور کولی اور جنگلی لیٹرے لوٹ کے واسطے غنیم کے ساتھ ہوئے تھے۔ ٹڈیوں کی طرح اُمڈ پڑے اور تمام لشکر کو چاٹ کر ایک دم میں صاف کر دیا۔ نقد جنس ہاتھی گھوڑے اتنے لئے۔ کہ محاسب تھے حساب سے باہر ہے۔ سپاہ کے عیال کی خرابی خود خیال کر لو۔ کہ بیچاروں پر کیا گذری ہوگی*

ظفریاب مظفر فتح کے گھوڑے پر سوار موچھوں کو تاؤ دیتے شہر کو پھرے۔ شہاب کے نمک حرام مرخرو ہو کر اب ان کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ انہوں نے سامان سلطانی موجود دیکھ کر دربار قائم کر دیا۔ اور سب کو بادشاہی خطاب عنایت کئے۔ جامع مسجد میں خطبہ پڑھا گیا۔ اور پُرانے سردار جو نحوست کے گوشوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اُنہیں بُلا بھیجا۔ سب سنتے ہی دوڑ پڑے۔ غرض جنگلوں کے لیٹرے مفلس محتاج۔ ملک کے پُرانے سپاہی بخاری و ماوراء النہری کہ تیموری شہزادوں کی نمک حرام تھے۔ دو ہفتہ کے اندر اندر چودہ ہزار فوج کی جمعیت گرد جمع ہو گئی۔ مگر مظفر کو باوجود اس فتح کے قطب الدین خاں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ اس لئے کچھ سرداروں کو یہاں چھوڑا۔ اور آپ بڑودہ کی طرف فوج لے کر چلا کہ وہ وہیں تھا۔ ادھر دربار سے اعتماد خاں کی فوج بھی آن پہنچی۔ شہاب وغیرہ پٹن میں پٹے کٹے پڑے تھے۔ اب اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی کو مضبوط کر کے یہیں بیٹھ گئے*

شہاب اور اعتماد قطب الدین خاں کو برابر لکھ رہے تھے۔ کہ تم اُدھر سے آؤ۔ ہم اِدھر سے چلتے ہیں۔ بغاوت سے اس کا دبا لینا کچھ بڑی بات نہیں۔ وہ پنج ہزاری سردار۔ پُرانا سپہ سالار کہ دونو بڈھے بھی اُسے یگانہ روزگار سمجھتے تھے۔ دُور سے بیٹھا بیٹھا ٹال رہا تھا۔ جب دربار سے فرمان عتاب پہنچا۔ تو قطب جگہ سے ہلا۔ اور اب سپاہ کو تنخواہ دے کر دلداری کرنے لگا۔ جب کہ وقت گذر چکا تھا۔ چھاونی سے بڑودہ تک پہنچا تھا۔ کہ مظفر نے آن لیا۔ لڑائی ہوئی نیم جان کی طرح ہاتھ پاؤں مار کر قلعہ بڑودہ کے کھنڈر میں دبک گیا۔ فوج اور سردار مظفر کے ساتھ ہو گئے۔ اور دولت و اموال کا تو کیا پوچھنا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ یہ وہی مظفر ہے۔ کہ تیس روپیہ مہینہ پر آگرہ میں پڑا تھا۔ یہاں سے ایک ناک اور دو کان لے کر بھاگا۔ آج تیس ہزار لشکر لئے باپ کے ملک کا مالک ہے*

اب ادھر کی سُنو۔ کہ مظفر تو اُدھر آ گیا شیر خاں فولادی اس کے سردار نے کہا۔ مجھے بھی

تو اپنا لوہا دکھانا چاہیئے۔ وہ فوج لے کر پٹن کو چلا۔ کہ امرائے شاہی کو جوہر دکھائے۔ آپ پٹن پر آیا۔ اور کچھ فوج کڑی پر بھیجی۔ خواجہ نے دل کڑا کر کے بادشاہی فوج کو نکالا۔ اور جو فوج کڑی پر چڑھی آئی تھی۔ فوراً اُسے جا مارا۔ اب شیرخاں کے مقابلہ کا موقع آیا۔ بڈھے سرداروں پر ایسی نامردی چھائی تھی کہ گھبرا کر بولے بہتر ہے۔ کہ پٹن سے جالور کو ہٹ چلیں۔ خواجہ نظام الدین باوجودیکہ نوجوان سپاہی تھا۔ اُس نے مردوا بنا کر روکا۔ اور آپ فوج لے کر مقابلہ پر ہوا۔ سامنے ہوتے ہی لڑائی دست و گریباں ہو گئی۔ دو ہی ہزار فوج تھی۔ مگر سب پُرانے پُرانے سپاہی تھے پانچ ہزار کے مقابلہ پر بڑھ کر میانہ پہنچا۔ نوجوان سپاہی زادہ نے بڑا ساکھا کیا۔ کشتنا و خون عظیم ہُوا۔ کھیت کاٹ کر ڈال دیا۔ اور لڑائی ماری۔ شیرخاں لوکدم گجرات کو بھاگا۔ بادشاہی فوج کو لوٹ اچھی ہاتھ آئی۔ ذرا آنسو پُچھ گئے گٹھڑیاں باندھ باندھ کر دوڑے کہ پٹن میں رکھ آئیں۔ خواجہ ہر چند کہتا رہا کہ اب موقع ہے اور گجرات خالی ہے۔ باگیں اُٹھائے چلے چلو۔ کسی نے نہ سُنا۔ بیچارہ ۱۲ دن وہیں پڑا رہا۔ اتنے میں سُنا کہ مظفر نے بڑودہ مار لیا۔

وہاں کی بھی سنیئے۔ کہ قلعہ بڑودہ جو قطب الدین کی عقل سے بھی بودا تھا۔ مظفر نے گھیر لیا۔ اور توپیں مارنی شروع کر دیں۔ آج کی پرانی دیواریں مظفر کے عہد اور قطب کی ہمت سے سوا بے بنیاد تھیں۔ فرش زمین ہو گئیں۔ مگر قطب کا قلعہ عمر اُس سے بھی گیا گذرا تھا۔ اُس بڈھے بے وقوف نے زین الدین اپنے معتبر کو قول و قرار کے لئے بھیجا۔ باوجودیکہ ایلچی کو کہیں زوال نہیں۔ مظفر نے اُسے دیکھتے ہی ہزار سالہ مُردوں میں ملا دیا۔ قطب کا ستارہ ایسا چکر میں آیا تھا۔ کہ اب بھی نہ سمجھا۔ پیغام سلام میں عہد و پیمان ہُوا۔ کہ میں مکہ چلا جاؤں گا۔ مجھے عیال و مال سمیت یہاں سے نکل جانے دو۔ اتنا بڑا سردار اس بدحالی اور بے ہمتی سے غنیم کے دربار میں حاضر ہُوا۔ بعجز تمام جھک جھک کر تسلیمات بجا لایا۔

قضا شخصیت پنج انگشت دارد	چو خواہد کز یکے کارے برآرد
دو بر چشمش نہد دیگر دو بر گوش	یکے بر لب نہد گوید کہ خاموش

آخر پنج ہزاری سردار بادشاہی تھا۔ پشتوں کا خدمت گذار تھا۔ شہزادوں کا اتالیق رہ چکا تھا۔ مظفر نے ملاقات کے وقت بڑی تعظیم کی۔ اُٹھا اور استقبال کر کے مسند تکیہ پر جگہ دی۔ باتوں سے آنسو پونچھے۔ مگر ہاتھوں سے خون بہایا۔ کہ دامن خاک کے نیچے اپنے دفائن زاروں کا پردہ ہو گیا۔ ۱۴ لاکھ روپیہ اُس کے ساتھ تھا۔ وہ لے لیا۔ خزانچی اُس کی حکومت گاہ پر گیا۔

دس کروڑ سے زیادہ گڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی نکال لائے۔ نقد و جنس۔ مال و دولت کا کیا ٹھکانا ہے
اور لطف یہ ہے۔ کہ چار ہزاری و پنج ہزاری بڑے بڑے سپہ سالار اُمرا مثلاً قلیچ خاں اور
شریف خاں اپنا بھائی جاگیردار مالوہ۔ خاص نورنگ خاں بیٹا سلطان پور ندربار میں اور پاس پاس
کے اضلاع میں بیٹھے تھے۔ دور سے تماشا دیکھا کیے۔

ہم بحرِ غم میں بہ گئے اور دوست آشنا	سب دیکھتے رہے لبِ ساحل کھڑے ہوئے

مظفر کے ساتھ ترک۔ افغان گجراتی ہزاروں کا لشکر ہو گیا۔ اور ایک تھے تو دس بلکہ دس ہزار
ہو گئے۔ مگر علاقہ در علاقہ بھونچال پڑ گیا۔ خواجہ نظام الدین یہ سُن کر پٹن کو پھرے۔ دربار میں آگے
پیچھے خبر پہنچی۔ اور جو پہنچی۔ ایسی ہی پہنچی۔ سب چُپ۔ بادشاہ کو بڑا رنج۔ دو دفعہ جس ملک کو
آپ یلغار کر کے مارا۔ وہ اس رسوائی کے ساتھ ہاتھ سے گیا۔

اکبر بادشاہ تھا۔ اور صاحبِ اقبال تھا۔ کچھ پروا نہ کی۔ اُمرائے دربار میں سے سادات بارہ
اکثر ایرانی دلاور اور سورما راجپوت۔ راجہ اور ٹھاکر اس مہم کے لئے نامزد کر کے لشکر جرار آراستہ
کیا۔ اُس پر نوجوان مرزا خان کو جس کا اقبال بھی جوانی پر تھا۔ سپہ سالار کیا۔ کار آزمودہ کہنہ عمل
سردار فوجیں دے کے ساتھ کیے۔ قلیچ خاں کو فرمان ہو گیا۔ کہ مالوہ پہنچو۔ اور وہاں سے امرا کو
لے کر مہم میں شامل ہو۔ اضلاع دکن میں جو سردار تھے۔ اُنہیں بھی زور شور سے احکام پہنچے۔ کہ جلد
میدانِ جنگ پر حاضر ہوں۔ مرزا خاں اپنے رفقا کو لے کر مارا مار چلا۔ کوہ و بیابان۔ دریا اور
میدان کو لپیٹتا لپیٹتا جالور کے رستے پٹن کو چلا جاتا تھا۔ مگر جو خبر پہنچتی تھی۔ پریشان پہنچتی تھی۔ اس
لئے سوچ سمجھ کر اُٹھاتا تھا۔ قطب الدین خاں کی خبر سُنی مگر فوج پر راز نہ کھولا۔ آزاد۔ خیال
تو ضرور آیا ہو گا۔ کہ یہ وہی پٹن ہے۔ جہاں سے باپ نے ملک فنا کی منزل کو ایک قدم میں
طے کیا تھا۔ حرم سرا پر کیا گذری ہو گی۔ میرا اُس وقت کیا حال ہو گا۔ اور یہ رستہ احمد آباد تک
کس مصیبت سے کٹا ہو گا۔ یہاں سب عید کے چاند کی طرح اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔
بعض سردار سرِ راہی تک آگے آئے۔ اور سارے حالات سنائے۔ بڑی بڑی مبارکبادیں ہوئیں۔
وہ فقط دن بھر ٹھیرا۔ اور برق و باد کی طرح اُڑ کر پٹن پر ڈیرے ڈال دئے۔ امرا اور فوجیں
استقبال کر کے لائے۔ مبارکبادیں ہوئیں۔ شادیانے بجے۔ اُن کی اور شہاب الدین احمد خاں کی [illegible]
صحبتیں تھیں۔ مگر اس وقت سب بھول گئے۔ معلوم ہوا کہ مظفر نے ظفریاب ہو کر اور ہی دماغ پیدا
کئے ہیں۔ پیچھے کا بندوبست محکم کئے بیٹھا ہے۔ اور خیمہ آگے ڈال کر لڑائی کو تیار رہتا ہے۔

نوجوان سپہ سالار نے سرداروں کو جمع کر کے جلسہ کیا۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ اقبال اکبری پر تکیہ کر کے باگیں اٹھاؤ۔ تلواریں کھینچو اور شہر میں جا پڑو۔ بعض کی رائے ہوئی۔ کہ قلیج خاں مالوہ سے لشکر لے کر آتا ہے۔ اور حضور سے فرمان بھی آ چکا ہے۔ کہ جب تک وہ نہ آئے جنگ نہ کر بیٹھنا۔ اُس کا انتظار واجب ہے۔ یہ گفتگو بھی آئی۔ کہ موقع نازک ہے۔ یہ وقت وہ ہے۔ کہ حضور خود یلغار کر کے آئیں۔ تو سب کی سپاہگری کا پردہ رہتا ہے۔ ورنہ خدا جانے کیا انجام ہو۔ دولت خاں ایک بڈھا سردار تھا۔ اور وہ مرزا خاں کا سپہ سالار کہلاتا تھا۔ اُس نے کہا کہ حضور کا بلانا بہت نازیبا ہے۔ اور قلیج خاں کا انتظار تمہارے لئے مصلحت نہیں۔ وہ پُرانا سپہ سالار ہے۔ اس کے سامنے فتح ہوئی۔ تو تمہارے رفیق حصّہ سے بھی محروم رہ جائیں گے۔ اگر چاہتے ہو۔ کہ فتح کا ڈنکہ تمہارے نام پر بجے۔ تو یا قسمت یا نصیب لڑمرو۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ بیرم خاں کے بیٹے ہو۔ جب تک آپ تلوار نہ مارو گے۔ خانخاناں نہ ہو گے۔ اکیلے ہی فتح کرنی چاہتے۔ اور گمنامی کے جینے سے ناموری کا مرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ پُرانے پُرانے سپہ سالار ساتھ ہیں۔ سپاہ تیار ہے۔ سامان حاضر ہے۔ اور چاہئے کیا ہے۔

مرزا خاں بھی ایک چلتے پُرزے دربار اکبری کے تھے۔ ایک جھوٹ موٹ کی ہوائی اُڑائی کہ دربار سے فرمان آتا ہے اکبری آئین سے اُس کا استقبال ہُوا۔ اور جلسہ عام میں پڑھا گیا۔ مضمون یہ کہ ہم فلاں تاریخ یہاں سے سوار ہوئے۔ خود یلغار کر کے آتے ہیں جب تک نہ پہنچیں لڑائی شروع نہ ہو۔ فرمان پڑھ کر مبارکباد کے شادیانے بجائے۔ اور تمام لشکر نے خوشیاں منائیں۔ دو دن تک توقف رہا۔ مگر دونو طرف بہادر بڑھ بڑھ کر جوہر دکھاتے تھے۔ یہ دو طرفہ مصلحت آمیز اگرچہ زبانی باتیں تھیں۔ مگر کم ہمتوں کی کمر بندھ گئی۔ اور ہمت والوں کے اور عالم ہو گئے۔ اُدھر دشمنوں کے جی چھوٹ گئے۔

مرزا خاں کے ڈیرے احمد آباد سے تین کوس سرکھیج پر تھے۔ اور مظفر شاہ بھیکن کے مزار پر تھا۔ یعنی دو کوس پر۔ وہ فوج مالوہ کی آمد آمد سُن کر چاہتا تھا۔ کہ پہلے ہی لڑ مرے شبخون مارا۔ مگر ناکام رہا۔ مرزا خاں نے پھر جلسہ کیا۔ اور صلاح یہی ٹھیری کہ جس طرح ہو لڑنا چاہئے چنانچہ رات کو چٹھیاں تقسیم ہو گئیں۔ ہر سردار پچھلے پہرہ سے اپنی اپنی فوج کو لے کر تیار ہو گیا۔ اعتماد خاں کو پٹن کی حفاظت پر چھوڑا تھا۔ عثمان پور کے دہانہ پر میدان جنگ ہوا۔ اُس وقت اُس کی فوج دس ہزار تھی۔ اور مظفر کی چالیس ہزار۔ دونو لشکر صفیں باندھ کر سامنے ہوئے۔ مرزا خاں

نے داہنے بائیں پس و پیش سے لشکر کی تقسیم کی۔ وہ بچپن سے اکبر کی رکاب کے ساتھ لگا پھرتا تھا۔ ایسا میدان اس کے لئے کچھ نئی جگہ نہ تھی۔ ہاتھیوں کی صف سامنے باندھی خواجہ نظام الدین کو دو سرداروں کے ساتھ فوج دے کر الگ کیا۔ کہ سرنیچ کو داہنے پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤ جب لڑائی ترازو ہو۔ تو غنیم کا پچھا آن مارو۔

غرض کہ لڑائی شروع ہوئی اور مظفر نے پیش دستی کے قدم آگے بڑھائے۔ ادھر سے لڑائی کو ٹالتے تھے حریف سر پر آیا۔ تو قدم بڑھائے فوج ہراول نے باگیں بڑے حوصلہ سے اٹھائیں مگر بیچ میں کڑے آثار چڑھاؤ بہت تھے۔ آگے کی فوج جو ہراول کے پیچھے تھی۔ اپنی تیزی کے ساتھ پہنچی۔ کہ جو ترتیب باندھی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔ اور لشکر میں گھبراہٹ پڑی ہراول کے سردار تلواریں پکڑ کر خود آگے بڑھ گئے تھے۔ کئی پرانے نامور مارے گئے۔ اور فوج الٹ پلٹ ہو کر جدھر جس کا منہ اٹھا ادھر ہی جا پڑا۔ جا بجا میدان جنگ گرم ہوا۔ نیا سپہ سالار تین سو جوان اس کے گرد۔ سو ہاتھی کی صف سامنے لئے کھڑا تھا۔ اور نیرنگئ تقدیر کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ دل میں کہتا تھا۔ کہ بیرم خاں کا بیٹا! جائیگا تو کہاں۔ مگر دیکھئے خدا اب کیا کرتا ہے ایسے وقت میں حکم کیا چل سکے۔ کدھر سے روکے۔ اور کدھر کو بڑھائے۔ یا قسمت یا نصیب مظفر بھی پانچ چھ ہزار کا پرا جمائے سامنے کھڑا تھا۔ مرزا خاں نے دیکھا۔ کہ غنیم کے غلبہ کے آثار ہونے لگے۔ ایک جاں نثار نے دوڑ کر اس کی باگ پر ہاتھ ڈالا۔ کہ گھسیٹ کر نکال لے جائے۔ یہ بے ہمتی کا ارادہ دیکھ کر مرزا خاں سے نہ رہا گیا۔ بے اختیار ہو کر گھوڑا اٹھایا۔ اور فیلبانوں کو بھی للکار کر کرنا میں آواز دی۔ اس کا گھوڑا اٹھانا تھا۔ کہ اقبال اکبری طلسمات دکھانے لگا۔ آواز کرنا سے دلوں میں جوش پیدا ہوئے۔ اور جا بجا لشکر غنیم کو دھکیل کر آگے بڑھے۔ تقدیر کی مدد یہ کہ ادھر سے انہوں نے حملہ کیا۔ ادھر خواجہ نظام الدین بھی ساتھ ہی مظفر کی پشت پر آن گرے۔ غل ہوا کہ اکبر یلغار کر کے آیا۔ کوئی سمجھا۔ کہ قلیچ خاں مالوہ کی فوج لے کر آن پہنچا۔ مظفر ایسا گھبرایا کہ یکبارہ حواس جاتے رہے۔ بھاگا اور ہمراہی اس کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ غنیم کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ ہزاروں کا کھیت ہوا۔ شمار کون کر سکتا تھا۔ شام قریب تھی پیچھا کرنا مناسب نہ ہوا۔ وہ محمود آباد کے رستے دریائے مہندری کے ریگستانوں میں نکل گیا۔ اور تیس ہزار فوج کی بھیڑ بھاڑ گھڑیوں میں پریشان ہو گئی۔ غنیمت بیشمار کہ مفت ماری تھی۔ تین ہاتھیوں کی تھی انہیں معقول دے گیا۔ مرزا خاں نے مفصل عرضی کی۔ بادشاہ بجدات شکر درگاہ الہیٰ میں بجا لائے۔ کہ ایک

تو خدا نے ایسے موقع پر فتح دی۔ دوسرے اپنے پالے ہوئے نوجوان کے ہاتھوں۔ وہ بھی اپنے خان بابا کا بیٹا *

مرزا خاں نے منت مانی تھی کہ خدا فتح دے گا۔ تو سارا نقد و جنس۔ مال متاع۔ خیمہ و خرگاہ اونٹ۔ گھوڑے۔ ہاتھی۔ غریب سپاہیوں کو اور اہل لشکر کو بانٹ دوں گا۔ کہ انہی کی بدولت خدا نے یہ دولت دی ہے۔ چنانچہ اُس نیک نیت نے ایسا ہی کیا *

خاتمۂ سخاوت۔ ایک سپاہی ایسے وقت آیا۔ کہ کاغذوں پر دستخط کر رہا تھا۔ اُس وقت کچھ نہ رہا تھا۔ فقط قلمدان سامنے تھا۔ وہی اُٹھا کر دے دیا۔ کہ لے بھائی یہ تیری قسمت۔ خدا جانے چاندی کا تھا۔ سونے کا تھا۔ سادہ تھا یا مرصع۔ ملا صاحب پھر بھی خفا ہوتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ ایفائے وعدہ کے لئے چند ملازموں کو فرمایا۔ کہ ان کی قیمت لگا دو۔ روپیہ بانٹ دیں گے مقومین[1] نا امین حیلہ گران بے دین تھے۔ چوتھائی پانچواں بلکہ دسواں بھی مول نہ لگایا۔ اور کچھ کچھ تو آپ ہی ہضم کر گئے۔ پھر فرماتے ہیں اُس کے بعض چیرہ قناتیوں نے مثلاً دولت خاں لودھی سلاً محمودی وغیرہ نے اُس سے عرض کی کہ ہم آپ کے نوکر ہوئے ہیں۔ کچھ گناہ تو نہیں کیا ہے۔ کہ بادشاہی نوکروں کے نیچے ایسے دبے رہیں۔ اور وہ ہم سے اونچے۔ تلواروں کے سامنے یہ کچھ ہم سے آگے نہیں نکل جاتے۔ پھر تسلیم اور آئین و آداب کورنش جو آپ کے سامنے بجا لاتے ہیں۔ وہ کیوں نہ ادا کریں۔ یہ واہیات اور دلفریب باتیں مرزا خاں کو پسند آئیں (لیکن آخر بیرم خاں کا بیٹا تھا) خلعت گھوڑے سامان انعام بہت کچھ اُن کے دینے کو تیار کیا خود توشہ خانہ میں جا کر بیٹھا اور خواجہ نظام الدین (اب اُن کی دانش و دانائی کی ہوا بندھ گئی تھی) کو بلا کر مشورۃً یہ راز کہا۔ ایک زمانہ میں خواجہ کی بہن بیرم خان کے نکاح میں تھی۔ اُس نے کہا۔ کہ میں جانتا ہوں یہ تمہارے نوکروں کی بد نفسی ہے۔ تمہارا خیال نہیں۔ مگر یہ کہو کہ حضور سُنینگے تو کیا کہیں گے۔ اور فرض کیا کہ اُنہوں نے کچھ نہ کہا لیکن شہاب الدین احمد خاں کا پنجہزاری منصب عمر میں بڈھا تم سے بڑا۔ وہ تمہارے سامنے تسلیم بجا لائے! اعتماد خاں ایک وہ وقت تھا۔ کہ اپنی ذات سے بیس ہزار لشکر کا مالک تھا۔ پُرانا امیر اُس کی طرف سے تمہارے لئے تسلیم۔ اس میں لطافت کیا تھی؟ پائندہ خاں مغل پُرانا ترک۔ وہ تو تعجب نہیں کہ انکار بھی کر جائے۔ اور باقی تو خیر کسی حساب میں نہیں۔ بارے مرزا بھی سمجھ گئے اور اس ارادہ سے باز رہے *

---

[1] قیمت لگانے والے *

دنیا عجب مقام ہے۔ آخر لڑکا ہی تھا۔ تقدیر نے حد سے بڑھ کر یاوری کی۔ لاکھوں آدمیوں کی تعریفیں۔ چاروں طرف سے واہ وا۔ اور بات بھی واہ واہی کی تھی۔ دماغ بلند ہو گیا۔

تھا تو یہ خاک مگر کان میں کچھ غفلت نے		ایسی پھونکی کہ ہوا میں یہ بشر آ ہی گیا	

صبح کو ابھی آفتاب نے نشان نہ کھولا تھا۔ کہ خان خاناں فتح کا نشان اُڑاتا اس احمد آباد میں داخل ہُوا۔ جہاں تین برس کی عمر میں خانہ برباد۔ تیرہ برس کی عمر میں اکبر کے ساتھ یلغار کر کے آیا تھا۔ شہر میں امان امان کی منادی کر دی۔ رعیّت کو تسلّی اور دلاسا دیا۔ بازار کھلوائے۔ شہر اور نواح شہر کا بندوبست کیا۔ تیسرے دن قلیچ خاں وغیرہ اُمرائے مالوہ بھی فوجیں لے کر آن پہنچے۔ مل کر صلاحیں ہوئیں۔ اور شہر کا بندوبست کر کے تازہ دم فوجوں کے ساتھ مظفر کے پیچھے روانہ ہوئے ہر چند اُنہوں نے کہا۔ کہ اب سپہ سالار گجرات ہی میں رہے۔ مگر کارطلبی اور خدمت گذاری کا خون جوش پر تھا۔ مرزا خاں بھی پیچھے روانہ ہُوا +

مظفر کھمبایت میں پہنچا۔ اور لوگوں کو پرچانا شروع کیا۔ قدیمی صاحبزادہ سمجھ کر لوگ بھی سمٹنے لگے۔ سوداگروں نے بھی روپیہ سے مدد کی۔ دو ہزار کے قریب فوج جمع ہو گئی مرزا خاں بھی برق کی طرح پیچھے پیچھے دس کوس پر تھا۔ جو مظفر کو خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نکل کر بڑودہ میں آگیا۔ مرزا خاں نے قلیچ خاں وغیرہ چند سرداروں کو فوج دے کر آگے بڑھایا۔ یہ پُرانے سپاہی تھے۔ راہ کی خرابیاں سامنے دیکھ کر آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ وہاں سے بھی نکلا۔ فوج بادشاہی پیچھے تھی۔ امرا ملک میں بھی جہاں مفسد دیکھتے۔ دائیں بائیں کی خبر لیتے تھنادوت پر آئے تو مظفر وہاں سے اُٹھ کر پہاڑ میں گھس گیا۔ کہ یہاں جم کر ایک میدان اور بھی قسمت آزمائے اُس وقت اُس کی فوج تیس ہزار۔ اور خان خاناں کی آٹھ نو ہزار تھی +

یہ فتح نامہ بھی رستم اور اسفندیار کے فتح ناموں سے کم نہیں۔ مرزا خاں نے لشکر کی تقسیم کر کے فوج کے پرے جمائے۔ ہراول اور دائیں بائیں کو بڑھایا۔ پہلے ہی خواجہ نظام الدین کو آگے بھیجا۔ کہ پہاڑ کی لڑائی ہے دیکھو رستہ کا کیا حال ہے۔ اور فوج دشمن کا کیا انداز ہے؟ اسی طرح ترائی ڈالو۔ یہ دامن کوہ میں پہنچے تھے۔ کہ اُس کے پیادوں سے مقابلہ ہو گیا۔ مگر انہوں نے ایسا ریلا کہ سامنے جو بڑا پہاڑ تھا۔ اُس میں گھس گئے۔ یہ بھی دبائے چلے گئے۔ وہاں دیکھا دشمن کا لشکر لمبی قطار میں رستہ روکے کھڑا ہے تیر تفنگ کے مینہ برس رہے ہیں۔ مگر فوراً دست و گریبان ہو گئے۔ اور وہ دھواں دھار معرکہ ہُوا۔ کہ نظر کام نہ کرتی تھی خواجہ نے کرامات یہ کی۔ کہ سواروں کو پیادہ کر کے بڑھایا۔ اور جھٹ پہلو کی

پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی قلیچ خاں کو آدمی بھیجے۔ وہ بائیں ہاتھ سے چلا آتا تھا۔ کہ غنیم سے ٹکر کھائی۔ مگر غنیم نے زور دیکر اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ اور دباتا ہوا چلا۔ اس دھکا پیل میں خواجہ کے سامنے رستہ کھل گیا جس پیادہ فوج کو ابھی پہلو کی پہاڑی پر چڑھایا تھا۔ وہ آگے بڑھکر پہاڑ پر چڑھ گئی جو حریف جو قلیچ خاں پر گئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اُدھر پلٹے۔ اور دست بدست لڑائی ہو کر عجیب کشت و خون ہوا۔ قلیچ خاں بستی میں جا پڑے تھے۔ اوٹ کو غنیمت سمجھے اور وقت کا انتظار کرتے تھے +

تیز نظر سپہ سالار عقل کی دوربین لگائے دیکھ رہا تھا۔ اور جہاں موقع دیکھتا تھا۔ ویسی ہی مدد وہاں پہنچاتا تھا۔ فوراً فیلی توپ خانہ پہنچایا۔ کہ جس پہاڑی پر قبضہ کیا ہے۔ اُس پر چڑھ جاؤ۔ ساتھ ہی اور فوج پہنچی۔ اُس نے دشمن کا بایاں پہلو آن مارا۔ کئی جگہ لڑائی پڑ گئی۔ اور وہ گھمسان پڑا کہ پہلی لڑائی کو بھی گرد کر دیا۔ ہتھنالوں کی گولی ایسے موقع سے چلی کہ خاص قلب میں پہنچی جہاں مظفر کھڑا تھا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ شکست کی بدنامی کو غنیمت سمجھا۔ اور نامظفر ہو کر بھاگ گیا۔ سپاہ کا بہت نقصان ہوا۔ بیشمار مال و اسباب چھوڑا۔ مرزا خاں نے امرا کو جن جن اطراف پر مناسب دیکھا۔ روانہ کیا۔ اور آپ احمد آباد میں آکر ملک و رعیت کے انتظام میں مصروف ہوا +

دربار میں جب عرضداشت اس کی پڑھی گئی۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ فرمان بھیج کر سب کے دل بڑھائے۔ مرزا خاں کو خطاب خان خانی۔ خلعت با اسپ و کمر خنجر مرصع۔ تمن توغ۔ منصب پنج ہزاری کہ انتہائے معراج امرا کی ہے۔ عنایت ہوا۔ اور اوروں کے منصب بھی دس بیس اور اٹھارہ تیس کی نسبت سے جیسے مناسب دیکھے۔ بڑھائے۔ یہ لطیفہ غیبی ۹۹۱ھ میں واقع ہوا +

بہت سے خطوط اور مراسلات کا ایک پُرانا مجموعہ میرے ہاتھ آیا ہے۔ اُسی فتح کے موقع پر خان خاناں نے ایرج اپنے بیٹے کے نام ایک خط[1] لکھا تھا۔ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ بہت سے اصلی حالات معرکہ جنگ کے اس سے کھلتے ہیں۔ رفیقانِ منافق کی دغا یا بیوفائی آئینہ نظر آتی ہے۔ اسکے الفاظ سے ٹپکتا ہے۔ کہ دِل دردبے کسی سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اور اُمید و یاس جو ساعت بساعت اُس پہ نقش بناتے اور مٹاتے ہیں سب نظر آتے ہیں۔ یہ رنگ ایسے ایسے قلم سے پھرا ہے کہ بادشاہ کے ہاتھ میں بھی جا پڑے۔ تو بہت سے مطالب دل پر نقش کرے۔ اور ضرور بیٹے کو لکھا ہوگا کہ بطور خود حضور میں لئے چلے جانا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ قادر الکلام کامل انشا پرداز تھا۔

---

[1] یہ خط تتمے میں دیکھو۔

اور اپنے مطلب کو پوری تاثیر کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ اقبال کی کامیابی۔ عہدے کی ترقی غرض اس وقت مرزا خاں کی عمر کم و بیش بیس برس کی ہوگی۔ کہ وہ دولت خدا نے دی۔ جو باپ کو بھی آخیر عمر میں جا کر نصیب ہوئی تھی ✦

حکومت و فرمانروائی دولت و نعمت سامان امیری کا مزا بھی جوانی ہی میں ہے۔ کہ وہ بھی بڑی دولت ہے۔ اقبال مند لوگ ہیں جنہیں ساری دولتیں خدا ساتھ دے۔ امیری اور امیری کے لوازمات۔ اچھے لباس اچھی سواری۔ اچھے مکانات جوان ہی کے لئے زیبا ہیں۔ جوانی ہو تو اچھا کھانا بھی مزا دیتا ہے۔ اور انگ لگتا ہے۔ بڈھے بچارہ کے لئے ہو بھی۔ تو مزا نہیں۔ بڈھا اچھا لباس پہنتا ہے۔ ہتھیار سج کر گھوڑے پر چڑھتا ہے۔ کمر جھکی ہے۔ شانے ڈھلکے ہوئے ہیں۔ لوگ دیکھ کر ہنس دیتے ہیں۔ بلکہ اپنے تئیں دیکھ آپ شرم آتی ہے۔ ہائے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر

لطیفہ۔ شیر شاہ کو ترقی کی منزلیں طے کرنے میں اتنا عرصہ کھنچا کہ تاج شاہی سر تک آتے آتے خود بڑھاپا آگیا۔ بادشاہ ہوا تو سر سفید۔ ڈاڑھی بگلا۔ منہ پر جھریاں۔ آنکھیں عینک کی محتاج۔ جب لباس پہنتا۔ اور زیور بادشاہی سجتا۔ تو آئینہ سامنے دھرا ہوتا تھا۔ کہتا تھا۔ عید تو ہوئی مگر شام ہوتے ہوئے ✦

لطیفہ۔ دلی کو خدا مغفرت کرے۔ ہر بادشاہ کو یہی شوق رہا ہے۔ کہ اس شہر میں شان و شکوہ کا جلوس دکھاؤں۔ شیر شاہ بادشاہ ہوا۔ تو اس نے بھی وہاں آکر جشن کیا۔ شام کے وقت مصاحبوں کے ساتھ جریدہ سوار ہوا۔ اور بازار میں نکلا کہ سب کو دیکھے۔ اور اپنے تئیں دکھائے دو بڑھیاں اشراف زادی فلک کی ماری دن بھر چرخہ کاتا کرتی تھیں۔ شام کو جا کر سوت بیچ لایا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ بھی برقعہ اوڑھ کر نکلی تھیں۔ سواری کی آمد آمد سن کر کنارے کھڑی ہو گئیں۔ کہ نئے بادشاہ کو دیکھیں شیر شاہ گھوڑے پر سوار باگ ڈھیلی چھوڑے آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ ایک نے دوسری سے کہا بوا! تم نے دیکھا۔ دوسری بولی۔ ہاں بوا دیکھا پہلی بولی کہ دلہن کو دلہا ملا۔ مگر بوڑھا ملا۔ شیر شاہ بھی پاس پہنچ چکا تھا۔ اُس نے سن لیا جھٹ سینہ ابھارا اور باگ کھینچ کر گھوڑے کو گد گدایا۔ خدا جانے عربی تھا یا کاٹھیاواڑ۔ اچھلنے کودنے لگا۔ دوسری بڑھیا بولی۔ اے بوا۔ وہ تو بڈھا بھی ہے۔ اور مسخرا بھی ہے ✦

اتفاق۔ اس عالم میں کہ بادشاہ کو بہت خبرہائے پریشان پہنچتی تھیں۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے

تھے۔ میر فتح اللہ شیرازی سے سوال کیا۔ کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا۔ اُنہوں نے اُسطرلاب لگا کر طالع وقت نکالا۔ ستاروں کے مقام اور حرکات آسمانی کو دیکھ کر حکم لگا دیا کہ دو جگہ میدان کارزار ہوگا اور دونو جگہ فتح حضور کی ہوگی۔ اتفاق ہے۔ کہ ایسا ہی ہُوا؛

کسی مورّخ نے یہ کیفیت نہیں دکھائی۔ کہ جب مرزا خاں کے کارنامے وہاں کوہ خانخانی کے سامان تیار کر رہے تھے۔ اس وقت دربار اکبری میں کیا عالم ہو رہا تھا۔ البتہ ابوالفضل نے ایک خط مبارکباد میں خان خاناں کو لکھا ہے۔ وہی پُرتکلّف والا رقعہ ہے۔ جو آج تک اپنی بلندی مضامین اور دشواری عبارت اور فصاحت و بلاغت کے زور شور سے اہل کمال میں شہرۂ آفاق ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ چند روز جو گجرات سے خبر نہ پہنچی۔ تو دنیا کے لوگ ہزاروں ہوائیاں اُڑا رہے تھے۔ اُس کے اور اُس کے باپ کے دشمن کمین گاہوں سے نکلے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ اور دوستوں سے چھیڑ چھیڑ کر حال پوچھتے تھے۔ اکبر پر بھی طنز کرتے تھے۔ کہ دکن کا ملک اور ملک بھی بگڑا ہُوا۔ ایسے نازک موقع میں کہ دو بڈھے سپہ سالار مات کھا چکے۔ ایک نوجوان ناتجربہ کار کو بھیجنا چہ معنی دارد۔ بھلا یہ سپہ سالار ہے! یہ تو مجلس آرائی کا سنگار ہے۔ اُسے معرکۂ جنگ سے کیا تعلق۔ بیرم خانی ہوا خواہ بھی دم بخود تھے۔ اور اکبر بھی چپ تھا۔ چنانچہ الہ آباد سے قلعہ کی بنیاد رکھکر جلد پھرا کہ آگرہ سے سوار ہو کر پھر یلغار کرے۔ اور خود جا کر لڑائی کو سنبھالے۔ کوڑا گھاٹم پور میں پہنچا تھا جو فتح کی خبر پائی۔ نہایت خوش ہُوا۔ اور شکر کے سجدے بجا لایا۔ دو مُنہے دغلوں نے فوراً گفتار کی رفتار بدلی۔ جھک جھک کر کہنے لگے۔ حضور ہی کی جوہر شناس آنکھ تھی۔ کہ جوہر قابلیت کو تاڑ لیا۔ پُرانے پُرانے جاں نثار موجود تھے۔ مگر حضور نے اُسی کو بھیجا؛

غرض اُسی وقت حکم ہو گیا۔ کہ نقار خانہ سے تہنیت کی نوبت بجے۔ خط مذکور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں بنجارہ کے چودھریوں اور مہاجنوں کی معرفت بہت جلد خبر پہنچا کرتی تھی۔ پہلے کشنا چودھری نے خبر دی۔ پھر اُمرائے لشکر کے بھی عرائض پہنچے۔ اکبر نے بڑی آفرین کی بڑی تحسین کی اور کہا۔ کہ اس کے باپ کا خان خانی خطاب اسے دے دو خوشی کی مقدار اس سے سمجھ لو۔ کہ خط مذکور میں شیخصاحب لکھتے ہیں جس وقت نقارہ خانہ سے نوبت کا غُل ہُوا۔ دوست اور دشمن خوشحالی میں برابر ہو رہے تھے۔ اور بات تو یہ ہے۔ کہ خطاب و منصب کچھ بھی نہ ملتا تو بھی درحقیقت تم سے وہ بن آئی ہے۔ کہ اہل زمانہ اور دشمنوں کے دل داغ داغ ہو جائیں۔ ایسا عالی خطاب جس کی پنج ہزاری امیر آرزوئیں کرتے تھے۔ پہلے ہی مل جانا خیال روزگار

میں بھی نہ آتا تھا۔ چہ جائے کہ منصب بھی مل گیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دو فتحوں کے بعد مرزا خاں نے ابوالفضل کو اور ساتھ ہی حکیم ہمام کو خط لکھا تھا۔ اس خط میں غالباً دل کی پریشانی ظاہر کی تھی۔ کہ امرا رفاقت سے جی چُراتے ہیں۔ اور ابوالفضل کو خط کے آخر میں قسمیں دے کر لکھا تھا۔ کہ حضور سے عرض کرو۔ کہ مجھے بلا لیں جواب میں شیخ لکھتے ہیں۔ کہ میں نے غور کر کے دیکھا۔ کسی طرح مناسب نہ معلوم ہُوا۔ پھر دوستوں کی صلاحیں ہوئیں۔ رائے اُسی پر متفق ہوئی۔ کہ مضر نہیں ہے کہہ دو اُمید ہے۔ تو فائدہ ہی کی ہے خیر افراط شوق پر ڈھال کر عرض کیا۔ اکبر نے نہایت حیران ہو کر کہا۔ کہ ہیں اس وقت میں آنا کیسا۔ حکیم نے چرب لسانی اور سخنوری کی معجون تیار کر کے باتیں بنائیں۔ پھر بھی شیخ لکھتا ہے میرے نزدیک جس طرح ان باتوں سے حضور کا تعجب رفع نہیں ہُوا۔ اسی طرح کچھ ضرر بھی نہیں ہُوا۔

خان خاناں نے بعد اس کے جو عرضداشت لکھی تو بہت سی معروضات کے ذیل میں ٹوڈرمل کے لئے بھی درخواست کی تھی۔ اور یہ بھی عرض کی تھی۔ کہ حضور خود اس ملک پر سایۂ اقبال ڈالیں۔ اکبر نے بھی ارادہ کیا تھا۔ کہ ماہ آیندہ میں نوروز ہے۔ جشن کر کے روانہ ہوں۔ مگر خزانہ کی روانگی اور اور درخواستوں کے سرانجام کا حکم دے دیا۔ اور تعمیل بھی ہو گئی۔ خود نہیں گئے۔

خط مذکور میں ابوالفضل نے لکھا ہے۔ کہ تمہارے خط سے بڑا اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور اس مضمون پر بزرگانہ اور دوستانہ بہت سے فقرے لکھے ہیں۔ شیخ نے ٹوڈرمل کے بُلانے کو بھی اچھا نہیں سمجھا ہے۔ اور یہ بات شیخ کی درست تھی۔ لیکن نوجوان سپہ سالار پر جب مہم عظیم کا پہاڑ اور ذمہ داری کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اور ملک کو دیکھا۔ کہ اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگی ہوئی ہے۔ رفیقوں کو دیکھے۔ تو گرگان کہن ہیں۔ اور بادشاہ نے ماتحت کر دئے ہیں۔ اور ایسا موقع آن پڑا ہے۔ کہ آنکھ سامنے نہیں کر سکتے۔ وہ ناچار مجلس مصلحت میں آتے تھے لیکن گم سم بیٹھتے تھے۔ صلاح پوچھو۔ تو بات بات پر الگ ہوتے تھے۔ کہتے تھے تو یہ کہ ہم تو ماتحت ہیں۔ آپ خدمت فرمائیں بسر و چشم حاضر ہیں۔ اور اپنے رفقا کی خلوتوں میں بیٹھ کر خدا جانے کیا کیا کہتے تھے۔ نوجوان کو وہ خبریں پہنچتی تھیں۔ ایسی حالت میں ابوالفضل جیسے مستقل شخص کے سوا کون تھا جو نہ گھبرائے جن لوگوں کو انسان دلی دوست سمجھتا ہے۔ اُنکے سامنے دل کھول کر بخار نکالتا

ہے۔ اور صاف صاف جو حال ہوتا ہے۔ کہتا ہے۔ بیشک اُس نوجوان کے دل کی جو حالت تھی۔ لکھ دی ہوگی۔ اور یہی وجہ راجہ ٹوڈرل کے بلانے کی ہوگی۔ کیونکہ راجہ خان خاناں کا دوست صادق ہو یا نہ ہو۔ لیکن ایک کارگذار تجربہ کار اہل کار تھا۔ اور خاص نیت سے سلطنت کا خیر خواہ تھا۔ ایسا نہ تھا۔ کہ کسی کی دشمنی کے لئے بادشاہ کے کام کو خراب کر دے۔ اور بڑی بات یہ تھی۔ کہ اکبر کو اُس پر پورا اعتبار تھا۔

بادشاہ کے خود تشریف لانے کی جو التجا کی تھی۔ بیشک نوجوان کا دل چاہتا ہوگا۔ کہ جس نے مجھے پالا۔ جس نے مجھے تعلیم و تربیت کیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے جاں فشانیاں دکھاؤں کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اور یہ پُرانے پاپی کیا کرتے ہیں۔ اور شائد یہ بھی ہو۔ کہ یہ میرے رفقا و ملازم حق نمک پر جانیں قربان کر رہے ہیں۔ انہیں حسب دلخواہ انعام و اکرام دلواؤں۔

(اس وقت خان خاناں کا اور شیخ کا معاملہ کیونکر تھا) یہی تصور کرو۔ کہ ایک دربار کے دو ہم عمر ملازم ہیں۔ خانخاناں گویا ایک نوجوان۔ خوش اخلاق۔ خوش صحبت۔ پہلو سیز سخن فہم امیرزادہ ہے۔ خواہ دربار ہو۔ خواہ جلسۂ علمی ہو۔ خواہ سواری۔ شکاری۔ ہر ایک جگہ پر خلوت و جلوت میں بلکہ محلوں میں بھی پہنچتا تھا۔ دل لگی کے کھیل تماشے ہوں۔ تو مصاحب موافق ہے ابوالفضل ایک عالم انشا پرداز۔ خوش اخلاق خوش صحبت ہے۔ کہ دربار و خلوت اور بعض مجلسوں میں حاضر رہتا ہے۔ خانخاناں کو اُس کے کمال اور دانائی اور خوبی تقریر اور تحریر نے اپنا عاشق کر رکھا ہے۔ اور ابوالفضل اُس کے اخلاق اور خوش صحبتی کے سبب سے اور اس محبت سے کہ یہ نوجوان میرے کلام اور کمال کا قدردان ہے۔ اور اس مصلحت سے کہ بادشاہ کے پاس کا ہردم حاضرباش ہے۔ اُسے غنیمت سمجھتا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے۔ کہ جانتا ہے۔ جس امر میں مَیں ترقی کر سکتا ہوں۔ وہ اس کی راہِ ترقی سے بالکل الگ ہے۔ نوجوان امیرزادہ سے کچھ خطر کا اندیشہ نہیں۔ اور یہ بھی تعجب نہیں کہ جب شیخ کے پُرانے پُرانے دشمن دربار پر ابر کی طرح چھائے ہونگے۔ اس وقت یہ نوجوان دربار میں شیخ کی ہوا باندھتا ہوگا۔ اور خلوت میں بادشاہ کے دل پر اُس کی طرف سے نیک خیالوں کے نقش بٹھاتا ہوگا۔

ابوالفضل۔ فیضی۔ خانخاناں۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ ضرور مختلف اوقات میں ایک دوسرے کے گھر پر جمع ہوتے ہونگے۔ فیضی اور ابوالفضل کا ایک مذہب تھا۔ اور جو کچھ تھا۔ سو معلوم ہے۔ باقی سب کے دل شیعہ۔ نام کے سنت جماعت

مگر درحقیقت ایسے تھے۔ گویا سب مذہب انہیں کے تھے۔ اِسلئے آپس میں سب رفیق اور معاون رہتے ہوں گے۔ ہاں جو یک پہلو مذہب رکھتے ہوں گے۔ وہ اُن سے ضرور کھٹک رکھتے ہونگے اور یہ بھی ضرور ہے۔ کہ جوانوں کی جوانوں سے ملت ہوتی ہے۔ بُڈھوں کی بُڈھوں سے جوانوں کی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کہ جوش اصلی ہے۔ بڈھے بچارے کہاں سے لائیں۔ خوش طبعی کریں گے۔ تو بڈھے بھی ہوں گے۔ مسخرے بھی ہوں گے۔

	صحبتِ پیر و جواں راست نیاید ہرگز	تیر یک لحظہ بہ پہلوئے کماں ننشیند	

استغفر اللہ کدھر تھا اور کدھر آن پڑا۔ مگر باتوں کے مصالحہ بغیر تاریخی حالات کا بھی مزہ نہیں آتا۔

۹۹۲ھ میں مظفر نے تیسری دفعہ سر اُٹھایا۔ خانخاناں نے اُمرا کو فوجیں دے کر کئی طرف بھیجا۔ اور آپ جاں نثاروں کو لے کر الگ پہنچا۔ مظفر نے اپنی حالت میں مقابلہ کی طاقت نہ پائی۔ اس لئے بھاگا۔ راجگان مُلک اور زمینداران اطراف کے پاس وکیل دوڑاتا تھا۔ اور جابجا بھاگا پھرتا تھا۔ لوٹ پر گذارہ کرتا تھا۔ تمام علاقے تباہ کر دئے۔ بھلا اس طرح کہیں سلطنتیں قائم ہوتی ہیں۔

خانخاناں کو ایک موقع پر جام نے خبر دی۔ کہ اس وقت مظفر فلاں مقام پر ہے۔ مستعد سپاہی اور چالاک گھوڑے ہوں۔ تو ابھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ خانخاناں خود سوار ہو کر دوڑا۔ وہ پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ معلوم ہُوا کہ جام دونوں طرف کارسازی کر رہا تھا۔ ان ترکتازوں میں اتنا فائدہ ہُوا۔ کہ جو لوگ مظفر کی رفاقت کر رہے تھے۔ وہ اپنی خوشامدوں کی سفارش لے کر رجوع ہو گئے۔ امین خاں غوری فرمانروائے جوناگڈھ نے اپنے بیٹے کو تحفے تحائف دے کر خانخاں کی خدمت میں بھیجا۔

مظفر نے دیکھا۔ کہ بہادر سپہ سالار تمام امرا سمیت اِدھر ہے۔ جام کے پاس اسباب ضروری رکھا۔ اور بیٹے کو اس کے دامن میں چھپایا۔ آپ احمد آباد پر گھوڑے اُٹھائے۔ تھانہ بیتی پر خانخاناں کے معتبر وفادار موجود تھے۔ وہاں سخت مقابلہ ہُوا۔ اور مظفر چھاتی پر دھکا کھا کر اُلٹا پھرا۔ خانخاناں کو جب سازش کا حال معلوم ہُوا۔ تو بڑے خفا ہوئے۔ اور کہا کہ جام کو چھوڑ کر ٹھیکرا کر دونگا۔ فوج لیکر پہنچا۔ کہ دفعتہً نواگراؤں سے چار کوس پر جا کر جھنڈا گاڑا (جام کا دارالحکومت تھا) جام چکر میں آئے۔ کمال عجز و انکسار کے ساتھ عرضی لکھی یشرزہ ہاتھی اور عجائب و نفائس گراں بہا ساتھ

لے کر بیٹے کو بھیجا ۔ صلح جوئی ۔ امن و امان ۔ تسلّی و دلاسا اکبری آئین تھا ۔ خانخاناں اکبر کے شاگرد رشید تھے ۔ پھر آنا مصلحت سمجھے ❖

اکبر نے حکیم عین الملک وغیرہ امرائے باتدبیر کو سرحد دکن پر جاگیریں دے کر لگا رکھا تھا انکی کارسازیوں میں ایک نتیجہ یہ حاصل ہوا تھا ۔ کہ راجی علی خاں حاکم برہان پور دربار اکبری کی طرف رجوع ہوگیا تھا ۔ اور اس نظر سے کہ رشتہ ۔ اتحاد مضبوط ہو ۔ خداوند جہاں اس کے بھائی سے ابوالفضل کی بہن کی شادی کر دی تھی ۔ راجی علی خاں ایک کہن سال تجربہ کار نام کو برہان پور اور خاندیس کا حاکم تھا ۔ مگر تمام خاندیس اور دکن میں اُس کی تاثیر اثر برقی کی طرح دوڑی ہوئی تھی اور امور سلطنت کے ماہر اسے ملک دکن کی کنجی کہا کرتے تھے ۔

<u>۹۹۲ھ</u> میں خانخاناں احمد آباد میں بیٹھے اکبری سکہ بٹھا رہے تھے ۔ کہ حکام دکن اور خاندیس آپس میں بگڑے ۔ راجی علی خاں نے ایلچی بھیجا اور عرض کی دوربین سے دکھایا ۔ کہ ملک دکن کا رستہ کھلا ہوا ہے ۔ یہ اُس آرزو پر مرادیں مانے بیٹھے تھے ۔ اُنہوں نے اُمرا کو جمع کر کے جلسۂ مشورت قائم کیا ۔ خانخاناں کو حکم پہنچا ۔ وہ بھی یلغار کر کے احمد آباد سے فتح پور میں پہنچے ۔ اور یہی صلاح ٹھہری کہ ملک مذکور کا تسخیر کر لینا قرین مصلحت ہے ۔ خانخاناں پھر احمد آباد کو رخصت ہوگئے اور خان اعظم مہم دکن کے سپہ سالار ہو کر روانہ ہوئے ❖

خان خاناں سے میدان خالی پا کر مظفر نے پھر احمد آباد کا ارادہ کیا ۔ جام نے اُس کی عقل گنوائی اور یہ سمجھایا کہ پہلے جونا گڑھ کو لو پھر احمد آباد کو سمجھ لینا ۔ وہ اُس کے سرور میں مست ہو کر آپے سے باہر ہوگیا ۔ اور پھر سنبھل کر بیٹھا ۔ اُمرائے بادشاہی کو خبر لگی ۔ یہ سُنتے ہی دوڑے ۔ وہ اُلٹے ہی پاؤں بھاگا ۔ اسی عرصہ میں خان خاناں بھی آن پہنچے ۔ وہ تو نکل گیا تھا ۔ اطراف و نواحی کے علاقے جو بچے ہوتے تھے ۔ وہ بندوبست میں آگئے ❖

خان اعظم معہ اُمرائے شاہی کے اِدھر گئے ۔ اور لڑائیاں جاری ہوئیں ۔ احمد آباد گجرات سرِراہ تھا ۔ اور دکن کی سرحد پر تھا ۔ اس مہم میں بھی اکبر نے خان خاناں کو شامل کیا تھا ۔ چنانچہ انشائے ابوالفضل میں جو فرمان خان خاناں کے نام ہے ۔ اگرچہ برائے نام بیربر کے مرنے کا حال ہے ۔ مگر اُسی ضمن میں لکھا ہے ۔ کہ تمہاری عرضداشت پہنچی ۔ ملک کے حالات جو لکھے ہیں ۔ اُس سے خاطر جمع ہوئی ۔ تسخیر دکن کی تجویز میں جو جو باتیں تم نے لکھی ہیں ۔ پسندیدہ معلوم ہوئیں ۔ تمہاری وفورِ دانش اور کمال شجاعت سے اُمید ہے ۔ کہ عنقریب اسی طرح ظہور میں آئے گا جیسا کہ تم نے لکھا ہے

اور ملک بہت آسانی سے تسخیر ہو جائے گا۔ مگر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے دل کھول کر خان اعظم کی مدد نہیں کی اور حق پوچھو تو خان اعظم بھی ایسے شخص نہ تھے۔ کہ کوئی سینہ صاف آدمی اُن کی مدد کر سکے ؛

اکبر کی دو آنکھیں نہ تھیں۔ ہزار آنکھیں تھیں جن میں سے ایک کی نظر ملک موروثی پر تھی۔ چند روز کے بعد اُدھر تو حکیم مرزا سوتیلا بھائی جس کے پاس ہمایوں کے وقت سے کابل کی حکومت تھی وہ مر گیا۔ اُدھر سُنا۔ کہ عبداللہ خاں ازبک حاکم ماوراء النہر نے دریائے جیحون اُتر کر بدخشاں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور مرزا سلیمان کو نکال دیا۔ اس لئے بدخشاں پر لشکر بھیجنے کا ارادہ ہُوا ؛

یہ وہی موقع ہے کہ خان اعظم مہم دکن کو برباد کر کے خود سر گردان ان کے پاس پہنچے۔ خان خاناں نے لوازم ضیافت سرانجام کر کے رخصت کیا۔ اور خود فوج آراستہ لے کر روانہ ہُوا جب بڑودہ سے چوتھے پڑاؤ میں پہنچے تو خان اعظم کے خط آئے۔ کہ اب تو برسات آگئی۔ اِس سال لڑائی موقوف۔ سال آئندہ میں ہم تم مل کر چلیں گے۔ خانخاناں احمد آباد کو پھر آئے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ میر فتح اللہ شیرازی بھی وہاں موجود وہیں اس معاملہ کو پانچ مہینے گذرے تھے کہ :۔

ان کے پرچہ نویس قیامت تھے۔ انہیں بھی خبر پہنچی۔ نوجوان صاحب ہمت کے دل میں اُمنگ آئی ہوگی۔ کہ جن پہاڑوں پر میرے باپ نے شاہ جنت نشان (ہمایوں) کی خدمت میں جاں نثاریاں کی ہیں۔ رات کو رات۔ دن کو دن نہیں سمجھا۔ وہیں چل کر میں بھی تلواریں ماروں دکن سے عرضداشت لکھی۔ کہ حضور نے مہم بدخشاں کا ارادہ مصمم فرما لیا ہے۔ مجھے بھی شوق پابوس بے قرار کرتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ اُن پہاڑوں میں فدوی بھی رکاب پکڑے ساتھ جاتا ہو ؛

۹۹۵ھ میں یہ اور میر فتح اللہ شیرازی طلب ہوئے۔ انہوں نے اُونٹوں اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھائی اور یلغار کر کے آئے۔ بادشاہ نے ملک خاندیس کے احوال سُنے۔ فتوحات دکن کے باب میں مشورے ہوئے۔ اور کابل و بدخشاں کی مہم پر گفتگوئیں ہوئیں۔ بدخشاں کی مہم ملتوی رہی ؛

مظفر نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ کبھی کھمبائت۔ کبھی نادوت۔ کبھی سورت۔ کبھی پوربی۔ انتھیر۔ کچھ وغیرہ اضلاع میں سے کہیں نہ کہیں سر نکالتا تھا۔ ایک جگہ شکست کھاتا تھا۔ پھر اِدھر اُدھر سے حشری اور جنگلی لٹیرے سمیٹ کر دوسری جگہ آن موجود ہوتا تھا۔ کہیں خانخاناں کہیں اُس کے ماتحت اُمرا اُسے ریلتے دھکیلتے پھرتے تھے۔ اور ملک کے انتظام میں مصروف تھے۔ اُن میں قلیچ خاں پُرانا امیر تھا۔ اور بتوں میں خواجہ نظام الدین نے ایسے جوہر جانفشانی کے دکھائے۔ کہ

دیکھنے والوں کو بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں۔

۹۹۷ھ میں خان اعظم کو احمد آباد گجرات عنایت ہوئی۔ اور خان خاناں معہ امرائے فتحیاب بلائے گئے۔ باپ کے مراتب میں سے وکیل مطلق کا منصب برسوں ہوتے تھے کہ گھر سے نکل چکا تھا۔ ٹوڈر مل کے مرنے پر ۹۹۸ھ میں پھر قبضہ میں آیا۔ احمد آباد گجرات کے عوض جونپور عنایت ہوا۔

خان خاناں مہمات مُلکی کے ساتھ علمی خیال سے خالی نہ رہتا تھا۔ اسی سنہ میں حسب الحکم واقعات بابری کا ترجمہ کر کے پیش کیا۔ پسند اور مقبول ہوا۔

۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں بادشاہ نے ملتان اور بھکر کو خان خاناں کی جاگیر کیا۔ اور امرائے بادشاہی اور لشکر دے کر کوئی لکھتا ہے قندھار کی مہم پر اور کوئی لکھتا ہے ٹھٹھ کی مہم پر بھیجا۔ اکبر نامہ کی عبارت سے بو آئی۔ جس سے طبیعت میں تلاش پیدا ہوئی۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ آخر میرے بچپن کے دوست مدد کو آئے۔ یعنی ابوالفضل کے رقعے جو اُس نے خان خاناں کے نام لکھے تھے۔ اور میں نے دبستان طفلی میں بیٹھ کر یاد کئے تھے۔ انہوں نے یہ راز کھولا۔ قندھار کو اُس وقت ایران تو اپنا حق سمجھتا تھا۔ کہ ہمایوں وعدہ کر آئے تھے۔ عبداللہ خاں کہتے تھے کہ قندھار کے ساتھ ایران کو بھی گھول کر پی جائیں۔ اکبر نے اُس وقت دیکھا کہ شہزادگان صفوی جو سلطنت ایران کی طرف سے حاکم ہیں۔ وہ شاہ سے آزردہ ہیں۔ اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اور رعایا ادھر رجوع ہے۔ دونو بادشاہ اپنی اپنی مہمات میں مصروف ہیں۔ صلاحیں تو مدت سے ہو رہی تھیں اب تجویز ہوئی۔ کہ بیرم خاں نے مدت تک وہاں حکومت کی ہے۔ خانخاناں ملتان کے رستے فوج لے کر جائیں۔ انہوں نے کچھ تو اس سبب سے کہ وہاں کے معاملات جیسے اب دیکھتے ہو اُس وقت اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھے۔ دوسرے ہندوستانی لوگ برفانی ملکوں کے سفر سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور یہاں کی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی ہوتے ہیں تیسرے اس سبب سے کہ وہاں کی مہموں میں روپیہ کا بڑا خرچ ہے۔ اور خان خاناں کے ہاتھ روپیہ کے دشمن تھے۔ ع

چیل کے گھو نسلے میں ماس کہاں

غرض کچھ اپنی رائے کچھ رفیقوں کی صلاح سے عرض کی کہ پہلے ٹھٹھ کا ملک میری جاگیر میں شامل کر دیا جائے۔ پھر قندھار پر فوج لے کر جاؤں۔ اُس کی رائے بھی مصلحت سے خالی نہ تھی۔ وہ دُور بین اور باخبر شخص تھا۔ ہزاروں تجربہ کار واقفِ حال افغان خراسانی ایرانی تورانی اُسکے دسترخوان پر کھانے کھا رہے تھے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ گجرات کے جنگل میں جا کر نقارے بجاتے پھرے۔ یہ بات اور ہے

قندھار شہد کا چھتا ہے - ایران توران ہر ایک کا اُس پر دانت ہے - دو شیروں کے مُنہ سے شکار جھپٹنا اور سامنے بیٹھ کر کھانا کچھ بچوں کا کھیل نہیں +

معلوم ہوتا ہے - کہ بادشاہی مرضی یہی تھی - کہ سیدھے قندھار پر پہنچو - اُنہوں نے اور اُن کے رفیقوں نے صلاح کو اس طرف پھیرا کہ ٹھٹھ رستہ میں سے صاف کر کے قبضہ کرنا چاہیئے - ابوالفضل کی بھی یہی رائے تھی - کہ ٹھٹھ کا خیال نہ کرنا چاہیئے - چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ تمہارے فراق میں مجھے یہ یہ غم ہیں - از انجملہ یہ کہ تسخیر قندھار کو چھوڑ کر ٹھٹھ کا رُخ کیا +

ان خطوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ ۹۹۹ھ کے اخیر میں فوج روانہ ہوئی - مگر اندر اندر خدا جانے کب سے تیاریاں ہو رہی تھیں - کیونکہ ۹۹۸ھ کے خط میں شیخ خان خاناں کو لکھتا ہے - ہزار ہزار شکر کہ فتح و فیروزی کی ہوائیں چلنے لگیں - اُمید ہے کہ عنقریب یہ ولایت فتح ہو جائے دیکھنا عزم قندھار اور فتح ٹھٹھ کو اور زمانہ پر نہ ڈالنا کہ وقت و موقع گذرا جاتا ہے - بڑی بات یہی ہے - کہ چاہو تو جو لوگ اُردو میں بیکار ہیں اُنہیں مانگ لو اور یہ خدمت لے کر ٹھٹھ کو جاگیر میں قبول کرو - مجھے ہزار سالہ تجربہ کار سمجھ کر اگر یہ بات مان لوگے تو ممکن ہے کہ یہ کام ہو جائیگا - یہ خط اُسوقت کا ہے - جبکہ خان خاناں کو جونپور کا علاقہ ملا ہوا تھا - اور قندھار کے لئے اندر اندر گفتگوئیں ہو رہی تھیں - اور سلطنت کے معاملے میں خدا جانے حکم احکام حساب کتاب کے کیا کیا اُلجھاوے ہونگے - چنانچہ لکھتے ہیں پیارے میری تلخ گوئیوں میں ہمیشہ خوش رہ کر غم کو ذرا دل میں راہ نہ دو - اگر بعض حسب الحکمی فرمانوں میں (کہ وہ بھی ایک ظاہری بات کے سوا اور کچھ نہیں) چند حرف سخت با غم آور لکھوں تو گلشن خاطر کو عین بہار میں خزاں نہ کرو اور بدگمان نہ ہو - پرگنہ کے خالصہ کرنے میں اور معاملہ بقایا میں اور جو کچھ اس کے عوض جونپور سے لیا ہے ان سب باتوں کو طول نہ دینا چاہیئے - یہ طرز اور لوگوں کی ہے - تم اور رستہ کے لوگ ہو ؎

از جان و دل گوید کسے پیش چناں جانانہ ۔۔۔ از سیم و زر گوید کسے پیش چناں اسکندرہ

یعنی تمہارا اور بادشاہ کا اور معاملہ ہے شکر ہے کہ تمہاری عبارتیں مفصل گوش گذار نہیں ہوئیں پھر بھی وقت و کلمہ مناسب میں ادا ہو گئیں - درگاہ الہی میں گریہ وزاری رات دن خلوت کی حالت میں لازم سمجھو - بہت خوشی حرام شکستہ دلوں کے آگے گدائی - بے دلوں کی دلداری بہت کرتے رہو - وغیرہ وغیرہ دیکھو - موقع وقت ہے - ایک جگہ خان خاناں نے اپنے خط میں شاید لکھا ہے کہ فلاں فلاں کتاب تو جلسہ میں پڑھی جاتی ہے - اور کیا کہتے ہو - آپ فرماتے ہیں کہ شاہنامہ اور تیمور نامہ وغیرہ کتابیں تو اسلئے لکھی تھیں کہ بنائے گفتار اس انداز پر آئے - اصلاح نفس مطلوب ہے تو اس کیلئے

اخلاق ناصری۔ جلالی۔ حدیقہ۔ مہلکات و منجیات۔ کیمیائے سعادت وغیرہ وغیرہ ہیں ٭

خط مذکور میں لکھتے ہیں۔ شکر خدا کہ برادر گرامی حکیم ہمام کے آدمی کے ہاتھ جو خط بھیجا تھا۔ وہ پہنچا پہلے تو اس کے پہنچنے سے پھر دیکھنے سے پھر سمجھنے سے دل پھول سا کھل گیا۔ خصوصاً اسبات سے کہ ترکمان لوگ قندھار سے استقبال کو آتے ہیں۔ تمہارا مصمم ارادہ جو ایران کی طرف ہے سو طرح خوشی کا سرمایہ ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے پیارے اس فوج کشی میں جو کہ پیش آئی ہے۔ اعزاز اور نام بلند روپیہ سے خریدا جاتا ہے۔ دس کے پندرہ۔ اور دس کے بیس قرض لو اور خریداری میں بڑی کوشش کرو۔ روپیہ ناموری کا پچھ لگو ہے۔ اور اقبال کی طرح خواہ مخواہ دروازہ کی کنڈی ہو جاتا ہے۔ جیسے کسان کی کھیت میں گھاس اور سبزہ خود رو وغیرہ وغیرہ ٭

ایک اور خط کی تمہید بھی اُٹھائی ہے۔ کہ سفر کا ارادہ۔ بادشاہی رخصت۔ فتح قندھار و ٹھٹھہ وغیرہ کی طرح مبارک ہو ٭

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ جو احکام بادشاہی تھے۔ اُن کا فرمان مرتب کر کے (تمہارے نام) بھیج دیا ہے۔ تم نے لکھا تھا۔ کہ ایران و توران کو حضور سے مراسلات جاری ہوں۔ بے تکلف کہتا ہوں کہ بعینہ وہی مضمون ہیں۔ جو میں نے سوچے تھے۔ عبارت اور لفظ ہی کا فرق ہوگا ٭

ایک اور خط میں لکھا ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ قندھار کی فتح (جو فتح ایران کا دیباچہ ہے) جبتک نہ سن لونگا۔ نہ حکایت اشتیاق لکھونگا نہ شکایت فراق۔ اب ساری ہمت اُس کام کی برآمد میں صرف کرتا ہوں۔ جو بزرگ جہاں (اکبر) خیر اندیش زمان (خود) کی پیش نہاد خاطر ہے۔ اور سب دوستداروں کی مراد ہے۔ چند حرف لکھتا ہوں۔ اُمید ہے۔ کہ خرد دُور بین تمہاری سماعت تک پہنچائے تم سود اگر زر طلب یا پُرانے سپاہی دن کاٹنے والے نہیں۔ جو سمجھوں کہ تم ٹھٹھہ کو قندھار پر ترجیح دو گے اور کلام کو طول دوں۔ ڈر تو ہمراہیوں کا ہے۔ کہ کوتہ اندیش عزت بیچ کر روپیہ کے خریدار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے محبوب مزاج کے دل پر اشتعال کو ادھر ڈال دیں۔ قندھار اور قندھاریوں کا حال معتبر خبروں سے نیا معلوم ہؤا ہوگا۔ لکھوں کیا؟ حاصل مطلب یہ ہے۔ کہ قندھار کو ہر وقت آسان نہیں لے سکتے۔ برخلاف ٹھٹھہ کے۔ درمیان کے زمیندار بلوچ افغانوں کو دلاسے کی زبان بخشش کے ہاتھ سے اپنا کر کے لشکر فیروزی میں لگالو۔ اور وقت فرصت کو غنیمت سمجھو۔ توکل الہٰی کے مضبوط بھروسے پر ٹھیر کر کے چُستی و چالاکی سے قندھار کا رُخ کرو کسکی لوگوں کی راہ بہت نہ دیکھو۔ اگرچہ لوگ بہت آن ملیں گے۔ مگر رستہ یہ ہے۔ کہ داد و دہش میں کوشش نہ کرو۔ کہ

جاہ و عزت اسی میں ہے۔ ہشیاری اور بردباری کو دائیں بائیں کا مصاحب رکھو۔ مجلس میں چرچا ظفر نامہ۔ شاہنامہ۔ چنگیز نامہ کا چاہیئے۔ اخلاقِ ناصری۔ مکتوبات شیخ شرف منیری اور حدیقہ کی سہی نہیں۔ وہ ملک فقر کی گفتگو ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر لکھتے ہیں۔ بے شک مرزا جانی حاکمِ ٹھٹھہ نے ہمایوں کے ساتھ عالمِ تباہی میں بڑی بے وفائی کی تھی۔ اور اکبر کے دل میں یہ کھٹک تھی۔ پھر بھی اکبر کی اور ساتھ اُس کے ابوالفضل اور امرائے دربار کی رائے یہی تھی۔ کہ شاہانِ ایران و توران اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ قندھار کے لئے ایسا موقع پھر نہ ہاتھ آئے گا۔ ٹھٹھہ کو جب چاہیں لے سکتے ہیں ۔

اِنہوں نے پھر کہا کہ قندھار فقط نام کا میٹھا ہے۔ ملک بھوکا ہے۔ حاصل خاک نہیں بلکہ خرچ ہیں۔ کہ جن کا کچھ حساب نہیں۔ اور میرے پاس اِن وقت کچھ نہیں میں بھوکا سپاہ بھوکی۔ خالی کیسہ لے کر جاؤنگا۔ تو کرونگا کیا؟ جب ملتان سے بھکر اور ٹھٹھہ تک تمام ملک سندھ میں اکبری نقارہ بجیگا۔ سمندر کا کنارہ اکبری تصرف میں ہوگا تو قندھار خود بخود ہاتھ آجائیگا ۔

بہر حال قندھار کو روانہ ہوئے۔ مگر غزنی اور ہنگش پاس کا رستہ چھوڑ کر ملتان اور بھکر ہو کر چلے۔ ملتان اُن کی جاگیر تھی۔ کچھ روپیہ کی تحصیل۔ کچھ فوج کی فراہمی۔ کچھ آگے کے بندوبستوں میں اور دیر لگی۔ انجام کو یہی ٹھیری۔ کہ ٹھٹھہ کا فیصلہ کر دو۔ مرزا جانی حاکمِ ٹھٹھہ کی اتنی خطا ضرور تھی۔ کہ ہمایوں سے عالمِ تباہی میں اچھی طرح پیش نہ آیا تھا۔ اور اکبر کے دربار میں بھی تحفے تحائف بھیجتا رہا۔ خود حاضر نہ ہوا۔ اِس لئے اُس پر اعتبار نہ تھا۔ چنانچہ نشان لشکر ادھر کی ہوا میں لہرایا۔ فیضی نے تاریخ کہی۔ قصد تتہ۔ ملتان سے نکلتے ہی بلوچوں کے سرداروں نے حاضر ہو کر عہد و پیمان تازہ کئے۔

مرزا جانی کے ایلچی حاضر ہوئے۔ کہ حضور کا لشکر قندھار پر جاتا ہے۔ مناسب ہے۔ کہ میں بھی اِس مہم میں ساتھ ہوں۔ مگر ملک میں مفسدوں نے سر اُٹھایا ہے۔ فوج خدمتگذاری کو بھیجتا ہوں اُنہوں نے ایلچی کو اٹک اُتارا۔ اور فوج کی رفتار تیز کی۔ خبر لگی۔ کہ قلعہ سیوان میں آگ لگ گئی ہے۔ اور مدتوں کا جمع کیا ہوا غلہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا ہے۔ مبارک شگون سمجھ کر اور بھی قدم بڑھائے۔ فوج نے دریا کے رستے قلعہ سیوان کے نیچے سے نکل کر لکی کو مار لیا۔ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ اور کنجی سندھ کی ہاتھ آگئی۔ لکی ملک سندھ کے لئے ایسا ہے۔ جیسا کہ بنگالہ کیلئے گڈھی۔ اور کشمیر کے لئے بارہ مولہ۔ سپہ سالار نے قلعہ سیوان کا محاصرہ کر لیا۔ اسوقت یہ حال

نشین قلعہ تھا۔ بنانے والے نے ایک پہاڑی پر بنایا تھا۔ چالیس گز خندق سات گز کی چوڑائی گویا لوہے کی دیوار تھی۔ آٹھ کوس لمبا۔ چھ کوس چوڑا تین شاخیں دریا کی وہاں ملتی ہیں۔ وہاں کچھ جزیرہ میں اور کچھ کشتیوں میں رسد پہنچی تھی۔ ایک سردار چند کشتیاں لے کر دفعتہً جا پڑا۔ بڑی دولت ہاتھ آئی۔ اور رعیت نے اطاعت کی ؟

مرزا جانی سنتے ہی فوج لے کر آیا۔ نصیر پور کے گھاٹ پر ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کی ایک طرف بڑا دریا تھا۔ باقی طرفوں میں نہریں نالے۔ اور اُن کے کیچڑ بھلے قدرتی بچاؤ تھے۔ وہ قلعہ بنا کر بیچ میں اُتر ا بیٹھے کا ملک ہے وہاں قلعہ بنا لینا کچھ مشکل نہیں، اور توپخانہ اور جنگی کشتیوں سے اُسے استحکام دیا۔ خان خاناں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اکبر نے جیسلمیر اور امرکوٹ کے رستے اور فوج بھیجی تھی۔ وہ بھی آن پہنچی۔ سپہ سالار نے ایک سردار کو اپنی جگہ چھوڑا۔ کہ قلعہ والوں کو روکے رہے۔ اور رسد کے لئے رستہ جاری رہے۔ دشمن نے چھ کوس پر جا کر چھاؤنی کی۔ گرداگرد دیوار تیار کر خاطر جمع سے بیٹھ گیا ؟

غنیم کی طرف سے خسرو چرکس اُس کا غلام سپہ سالار تھا۔ وہ جنگی کشتیاں تیار کر کے چلا۔ کل کشتیاں ان کی دو سو تھیں۔ اور سو کشتی جنگی۔ خبر اُڑی۔ کہ فرنگیوں نے بندر ہرمز سے اُس کی مدد کو فوج بھیجی ہے۔ یہ بھی اِدھر سے بڑھے۔ حریف کشتیاں چڑھاؤ پر لاتا تھا۔ مگر بہاؤ سے بھی تیز آتا تھا۔ شام قریب تھی۔ لڑائی دوسرے دن پر ملتوی رہی۔ خبر لگی۔ کہ مرزا جانی بھی خشکی سے آتا ہے۔ کئی سردار اُسی وقت فوج لے کر سوار ہوئے۔ اور اندھیری رات میں ہوا کی طرح پانی پر سے گذر کر پار جا پہنچے۔ اور یہاں دریا میں صبح ہوتے ہی توپ چلنی شروع ہوئی۔ مگر عجیب وغریب لڑائی تھی۔ دشمن نے چاہا۔ کہ چڑھ آئے۔ پانی کم تھا۔ اور سامنے سے پانی کا توڑ اس لئے نہ بڑھ سکا۔ جو بہادر رات کو پار اُترے تھے۔ توپ کی آواز سنتے ہی سیل کی طرح دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ کناروں پر آ کر چھا گئے۔ اور پانی پر آگ برسانے لگے۔ خان خاناں کے پاس جنگی کشتیاں کل پچیس تھیں۔ اُنہیں کو چھوڑ دیا۔ اِدھر سے بہاؤ پر جانا تھا۔ وہ موج کی طرح چلیں۔ اور دم میں غنیم کے پلے پر جا پہنچیں۔ آگ کی برسات نے ایک چھینٹا گولیوں کا مارا اور پل کے پل میں برچھی اور جمدھر پر نوبت آ گئی۔ بہادروں کا یہ عالم تھا۔ کہ کھولتے پانی کی طرح اُبلے پڑتے تھے۔ کود کود کر دشمن کی کشتیوں میں جا پڑے۔ کشتیاں اور غراب مرغابیوں کی طرح تیرتی پھرتی تھیں ایک امیر کشتی کو دوڑا کر خسرو خان پر پہنچا اور زخمی کیا۔ پکڑ ہی لیا تھا۔ مگر ایک توپ پھٹ گئی۔ اور

کشتی ڈوب گئی۔ پروانہ حریف کا نامی سردار آگ کی جگہ پانی میں فنا ہوا۔ غنیم کے پاس فوج زیادہ۔ سامان پورا۔ مگر شکست پڑی۔ چار کشتیاں سپاہ اور اسباب جنگ سے بھری ہوئی قید ہوئیں۔ انہیں میں تیطور ہرموز تھا۔ حاکم ہرموز اپنا ایک معتبر ٹھٹھ میں رکھتا تھا۔ اُدھر کے تاجروں کے سب کاروبار میں امین (ایجنٹ) کہلاتا تھا۔ جانی بیگ اُسے ساتھ لے آیا تھا۔ اور اپنے بہت سے آدمیوں کو فرنگی فوج کی وردی پہنا دی تھی ؏

اگر اِس وقت گھوڑا اُٹھائے مرزا جانی پر جا پڑتے۔ تو ابھی مہم تمام تھی۔ مگر بے ہمتوں کی صلاح نے روک لیا۔ کہ دشمن ڈوبتا ڈوبتا سنبھل گیا ؏

بادشاہی فوج بہت تھی۔ خشکی میں امراء فوجیں لئے پھرتے تھے۔ اور جا بجا معرکے کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر مقام قبضہ میں آئے۔ اور رعایا نے اطاعت کی۔ امرکوٹ کا راجہ اطاعت کرکے مدد کو تیار ہوا۔ اور اُس کے سبب سے اِدھر کا رستہ صاف ہوگیا۔ ایک مقام کی رعایا نے کوؤں میں زہر ڈال دیا۔ ملک ریگستان پانی نایاب جو فوج بادشاہی اِس رستہ گئی تھی۔ عجب مصیبت میں گرفتار ہوئی۔ نگاہیں خدا کی طرف تھیں۔ کہ اقبال اکبری نے یاوری کی۔ بے موسم بادل آیا۔ اور مینہ برس گیا۔ تالاب بھر گئے۔ خدا نے اپنے بندوں کی جانیں بچالیں ؏

مرزا جانی گھبرا گیا۔ مگر فوج کی بہتات اور لڑائی کے سامان پر خاطر جمع تھی۔ جگہ کی مضبوطی دِل کو قوی کرتی تھی۔ برسات کا بھی بھروسا تھا۔ وہ سمجھا ہوا تھا۔ کہ نہریں نالے دریا سے زیادہ چڑھ جائینگے۔ بادشاہی لشکر آپ گھبرا کر اُٹھ جائیگا۔ نہ جائیگا تو گھر جائیگا۔ اِدھر بادشاہی فوج کو غلّہ کی کمی نے بہت تنگ کیا۔ سپہ سالار کبھی چھاؤنی کے مقام بدلتا تھا۔ کبھی لشکر کو اِدھر اُدھر بانٹتا تھا۔ ساتھ ہی دربار کو عرضی کی۔ اکبر کا خیال دریائے بہات کی مچھلی تھا۔ امرکوٹ کے رستہ اِدھر سے بہت کشتیوں میں غلّہ اور جنگی سامان توپ تفنگ تلوار اور لاکھ روپیہ نقد فوراً روانہ ہوا ؏

جمن بیچوں بیچ ولایت کا ہے۔ خانخاناں خود یہاں چھاؤنی ڈال کر بیٹھا۔ امراء کو مختلف مقاموں پر روانہ کیا۔ اور ایک لشکر قلعہ سیوان پر دریا کے رستے بھیجا۔ مرزا جانی کو خیال تھا۔ کہ بادشاہی لشکر دریا کی لڑائی میں کمزور ہے۔ اِس پر خود فوج لے کر چلا۔ کہ رستہ میں ہاتھ مارے۔ سپہ سالار بے خبر نہ تھا۔ دولت خان[1]۔ خواجہ مقیم اور دھارا پسر ٹوڈرمل وغیرہ کو فوجوں کے ساتھ کمک کیلئے بھیجا پہلی فوج گھبرا رہی تھی۔ کہ یہ دو دن میں چالیس کوس رستہ لپیٹ کر جا پہنچے۔ اور یہی معرکہ تھا۔ جس میں

[1] دولت خان لودھی سپہ سالار خانخاناں سنہ ۱۰۰۸ھ میں احمدنگر کی فتح کے بعد درد قولنج سے مرگیا ؏

خود مرزا جانی سے لشکر بادشاہی کا مقابلہ ہوا۔ امرا نے مشورت کا جلسہ کیا۔ پہلے صلاح ہوئی۔ کہ خان خاناں سے اور فوج منگاؤ۔ مگر دشمن کی فوج کا اندازہ کرکے غلبہ رائے کا اسی پر ہوا کہ لڑنا بہتر ہے۔ یہ دشمن سے چھ کوس پر پڑے تھے۔ چار کوس بڑھ کر استقبال کیا۔ اور بڑے استقلال و سوچ سمجھ کے ساتھ لڑائی ڈالی۔ فتح کی خوش خبری ہوا پر آئی۔ کہ پہلے اُدھر سے اِدھر کو چل رہی تھی۔ لڑائی شروع ہوتے ہی رُخ بدل گیا۔ اُمرا نے فوج کے چار پرے کرکے قلعہ باندھا۔ اور لڑائی شروع کی غنیم کے ہراول اور دائیں کی فوج بڑے زور شور سے لڑی۔ امرائے شاہی نے جو کہ اُن کے مقابل تھے۔ خوب مقابلہ کیا۔ نامی سرداروں نے زخم اُٹھائے مگر اپنے سامنے کی فوجوں کو اُٹھا کر کہیں کا کہیں پھینک دیا۔ بائیں کی فوج نے بھی اپنے سامنے کی فوج کو لپیٹ کر الٹ دیا۔ غنیم کی فوج ہراول میں خسرو چرکس تھا۔ اُس نے ہراول کو دبا کر ایسا ریلا کہ بائیں کو بھی تہ و بالا کر دیا۔ بادشاہی ہراول شمشیر عرب تھا۔ خوب ڈٹا۔ اور زخمی ہو کر گرا۔ رفیق میدان سے نکال لے گئے۔ ہوا بھی مدد کو آئی۔ گرد اور آندھی کا یہ عالم ہوا۔ کہ دشمن کو آنکھ نہ کھولنے دیتی تھی۔ دایاں کہیں جا پڑا۔ بایاں کہیں۔

دولت خان نے فوج شاہی کے قلب سے نکل کر خوب خوب ہاتھ مارے۔ اُس کا رفیق بھاونداس حیران کھڑا تھا اور قدرت الٰہی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کہ دونوں فوجوں کے انتظام درہم برہم ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اِسی ریل دھکیل میں دو تین سردار اُس کے پاس پہنچے۔ ساتھ ہی خبر لگی کہ مرزا جانی چار پانچ سو سواروں سے الگ کھڑا ہے۔ اُنھوں نے خدا پر توکل کرکے باگیں اُٹھائیں۔ اکبر کا اقبال دیکھو کہ کُل سو آدمی تھے۔ اُنھی سے اُس کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ایک میدان بھی نہ لڑا۔ نوک دُم بھاگ گیا۔ اُس وقت دشمن کے ایک ہاتھی نے دوستوں کی خوب مدد کی۔ مستی میں آکر متھیالی کرنے لگا اور اپنی ہی فوج کو برباد کر دیا۔

دھارا رائے ٹوڈرمل کا بیٹا اس معرکہ میں خوب بڑھ بڑھ کر لڑا۔ وہ ہراول میں تھا۔ افسوس کہ پیشانی پر نیزہ کا زخم کھا کر گھوڑے سے گرا۔ خوشا نصیب کہ سرخرو دُنیا سے گیا۔ پھر بھی کمبخت باپ کے حال پر افسوس کرنا چاہیے۔ کہ جوان بیٹے کا داغ بڑھاپے میں دیکھا۔ میدان میں فتح کی روشنی ہو گئی تھی۔ اتنے میں امرا کو خبر لگی۔ کہ دشمن کی فوج بادشاہی لشکر کے ڈیروں کو لوٹ رہی ہے۔ یہ پہلے سے گئے تھے۔ کہ لڑائی کے وقت پیچھا ماریں گے۔ خود پیچھے پہنچے۔ سنتے ہی سرداروں نے گھوڑے اُڑائے۔ اور باز کی طرح شکار پر گرے۔ بھگوڑوں نے جان کو غنیمت سمجھا۔ جو مال لیا تھا پھینک کر بھاگ گئے۔ اُن کے تین سو۔ خان خاناں کے سو آدمی ضائع ہوئے۔ مرزا کئی جگہ پلٹ کر ٹھیرا۔ مگر خدائی

سے کون لڑے۔ اِس لڑائی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ چھاؤنی کہیں۔ میدانِ جنگ کہیں۔ سپہ سالار خود کہیں۔ سب کو تائیدِ آسمانی کا یقین ہو گیا۔ پانچ ہزار کو بارہ سَو نے بھگا دیا ✦

یہاں تو یہ معرکہ ہوا۔ اُدھر جس قلعہ کو مرزا جانی نے بُرے وقت کی پناہ سمجھا تھا خانخاناں اُس پر جا پہنچا۔ اور حملہ ہائے مردانہ سے مسمار کر دیا۔ مرزا جانی میدانِ جنگ سے بھاگ کر اُدھر گیا تھا۔ کہ گھر میں بیٹھ کر کچھ تدبیر کرے۔ رستہ میں سُنا۔ کہ قلعہ میدان ہو گیا۔ اور وہاں خانخاناں کی خیمہ گاہ ہے۔ بہت حیران ہوا۔ غور و تامل کے بعد ہالہ کنڈی سے چار کوس۔ سیوان سے چالیس کوس دریائے سندھ کے کنارہ پر جا کر دم لیا۔ اور ایک قلعہ بنا کر بیٹھ گیا۔ بڑی گہری خندق گرد کھود دی۔ خان خاناں بھی پیچھے پیچھے پہنچا۔ اور محاصرہ کر لیا ✦

لڑائی دن رات جاری تھی۔ توپ و تفنگ جواب سوال کرتے تھے۔ کہ ملک میں وبا پڑی۔ اور اتفاق یہ کہ جو مرتا تھا سندھی مرتا تھا۔ فقرائے گوشہ نشین نے خواب دیکھے۔ کہ جب تک اکبری سکّہ و خطبہ جاری نہ ہوگا۔ یہ بلا دفع نہ ہوگی۔ وبا ناشکری کی سزا ہے۔ سرکشی سے توبہ کرو تو دفع ہو۔ یہ خواب جلد مشہور ہوئے۔ اور بندگانِ شاہی اور بھی قوی دل ہو کر مستعد ہو گئے۔ ریگستان کا ملک ہے۔ خاک تودے بناتے تھے۔ اور اُن کی اوٹ میں مورچے بڑھاتے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ قلعہ کے پاس جا پہنچے۔ محاصرہ ایسا تنگ ہوا۔ کہ اہلِ قلعہ تنگ ہو کر زبان بزبان صلح کی کہانیاں سُنانے لگے۔ بادشاہی لشکر بھی خوراک سے تنگ ہو گیا تھا منظور کیا۔ عہد یہ ہوا کہ سیوستان کا علاقہ قلعہ سیوان سمیت اور بیس جنگی کشتیاں نذر کرے۔ مرزا ایرج یعنی سپہ سالار کے بیٹے کو اپنی بیٹی دے۔ اور برسات بعد حاضرِ دربار ہو۔ خان خاناں نے جنگی مورچے اُٹھائے۔ اور لڑائی کے میدان میں شادی کے شامیانے تن گئے۔ مرزا نے برسات بسر کرنے کو قلعہ خالی کر دیا ✦

لطیفہ۔ خان خاناں کے دربار میں جو شعرا لطائف و ظرایف کے چمن کھلایا کرتے تھے۔ اُن میں مُلّا شکیبی شاعر تھے۔ اُنھوں نے اس لڑائی کی سرگذشت مثنوی میں ادا کی اور حقیقت میں طلسم کاری دکھائی۔ خانخاناں ایک شعر پر بہت خوش ہوا۔ اور اُسی وقت ہزار اشرفی دی ✦

ہمائے کہ بر عرش کردے خرام ۔۔۔ گرفتی و آزاد کردی ز دام

لطف یہ ہے۔ کہ جس وقت اِس نے خانخاناں کے دربار میں سنائی۔ مرزا جانی بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے بھی ہزار ہی اشرفی دی اور کہا۔ رحمت خدا کہ مرا ہما گفتی اگر شغال میگفتی زبانت کہ میگرفت

بادشاہ نے اِس مہم میں لاکھ روپیہ ایک دفعہ پچاس ہزار ایک دفعہ پھر لاکھ روپیہ لاکھ من غلہ پھر سَو بڑی توپیں اور توپچی دریا کے رستے بھیجے۔ اور امرا بھی اپنی اپنی فوجیں لیکر پہنچے۔ ۱۰۰۱ھ کے جشن نوروزی میں بمقام لاہور خان خاناں اُسے لے کر حاضر ہوئے۔ ملازمت کے لئے دربار خاص ہوا۔ بادشاہ مسند پر تھے۔ وہ کورنش اور آداب زمیں بوس بجالایا۔ تین ہزاری منصب اور ٹھٹھہ کا ملک عنایت ہوا۔ اور اس قدر عنائتیں فرمائیں۔ کہ اُسے اُمید بھی نہ تھی۔ ہمارے مورخوں کو اس بات کا خیال نہیں ہوا کہ انسان کے کاروبار سے اُس کے دِلی ارادوں کے سراغ نکالتے ہیں کہیں جگہ لکھ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں۔ اکبر کو دریائی قوت بڑھانے کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ اس موقع پر تمام علاقہ اُس کا اُسی کو دے دیا مگر بندرگاہ خالصہ ہو گئے۔ آزاد کی تائید کلام کے لئے اکبر کا مراسلہ جو کہ عبداللہ اوزبک کے نام لکھا ہے۔ دفتر اوّل ابوالفضل میں موجود ہے ۔

۱۰۰۲ھ میں خان خاناں کو پھر دکن کا سفر پیش آیا۔ مگر اِس سفر میں اُس نے کچھ کدورت اور نحوست بھی اُٹھائی۔ بنیاد مہم کی یہ ہوئی۔ کہ اکبر کو ملک دکن کا خیال اور خان اعظم کی ناکامی کا حال بھولا نہ تھا۔ جو سفارتیں اُدھر کے حاکموں کے پاس گئی تھیں۔ وہ بھی ناکام رہی تھیں فیضی بھی برہان الملک کے دربار سے کامیاب نہ آیا تھا۔ کہ برہان الملک فرمانروائے احمد نگر مر گیا۔ ملک تو مدت سے تہ وبالا ہو رہا تھا۔ اب معلوم ہوا۔ کہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تخت نشین ہوا ہے۔ اور تختۂ حیات اس کا بھی کنارۂ عدم پر لگا چاہتا ہے ۔

اکبر نے مراد کو دروم کی چوٹ پر سلطان مراد بناکر لشکر عظیم کے ساتھ دکن پر روانہ کیا۔ آپ پنجاب میں آکر مقام کیا۔ کہ سرحد شمالی کا انتظام مضبوط رہے۔ مراد نے گجرات میں پہنچکر چھاؤنی ڈالی اور مہم کا سامان کرنے لگا۔ کہ اکبری اقبال نے اپنی عملداری جاری کی۔ امرائے عادل شاہ فوج لے کر آئے۔ کہ ملک نظام کا انتظام کریں۔ ابراہیم لشکر لے کر اس کے مقابلہ کو گیا۔ احمد نگر سے چالیس کوس پر دونو فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور ابراہیم نے گلے پر تیر کھاکر میدان میں جان دی۔ سبحان اللہ۔ کل بھائی کو اندھا کر کے ہوش کی آنکھوں میں سُرمہ دیا تھا۔ آج خود دُنیا سے آنکھیں بند کر لیں۔ ملک میں طوائف الملوکی ہو کر عجب ہل چل پڑ گئی۔ میاں منجو نے مراد کو عرضی بھیجی۔ کہ یہ ملک لاوارث ہو گیا۔ مملکت برباد ہو رہی ہے۔ حضور تشریف لائیں۔ تو خانہ زاد خدمت کو حاضر ہیں ۔

اکبر کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو خان زمان کو روانگی کا حکم بھیجا۔ اور شہزادہ کو لکھا کہ تیار رہو۔ مگر حملہ میں تامل کرو۔ جس وقت خان خاناں پہنچے۔ اس وقت گھوڑے اُٹھاؤ۔ اور احمد نگر میں جا پڑو۔

شہزادہ کو جب اوّل خطاب و اختیارات ملے تھے۔ تو صورت حال سے لوگ سمجھے تھے۔ کہ تیز ہے
اور عالی ہمّت ہے۔ خوب بادشاہت کریگا۔ مگر وہ تیزی فقط کوتاہ اندیشی اور خود پسندی اور سفلہ مزاجی
نکلی۔ صادق محمد خاں وغیرہ اس کے سرداروں کو مزاج میں بہت دخل تھا۔ وہ سمجھے کہ جب خانخاناں آ
گیا تو ہم بالائے طاق اور اُس کی روشنی سے شاہزادہ کا چراغ بھی مدھم ہو جائیگا۔ پہلے تو انہوں نے
بھی پھونکی ہوگی۔ کہ اس کے آنے سے حضور کے اختیارات میں فرق آ گیا۔ اور اب جو فتح ہوگی اُس
کے نام ہوگی۔ خان خاناں کے جاسوس بھی موکلوں اور جناتوں کی طرح جا بجا پھیلے رہتے تھے۔
اور جا بجا کی خبریں پہنچاتے تھے۔ رستہ میں خبر پائی۔ کہ برہان الملک مر گیا۔ اور عادل شاہ نے
احمد نگر پر حملہ کیا۔ ساتھ خبر سُنی۔ کہ امرائے احمد نگر نے شاہزادہ مراد کو عرضی لکھ کر بلا لیا ہے۔
اور وہ احمد آباد سے روانہ ہوا چاہتا ہے۔ یہ خوشی خوشی چلا۔ مگر تقدیر کو خوشی منظور نہ تھی ساوّل تو
خانخاناں کا جانا کسی سردار سپاہی کا جانا نہ تھا۔ اسے تیاری سپاہ وغیرہ میں ضرور دیر لگی ہوگی دوسرے
مالوہ کے رستہ سفر کیا تیسرے بھیلہ اُس کی جاگیر رستہ میں آیا۔ وہاں خواہ مخواہ ٹھیرنا پڑا ہوگا۔ راستہ
میں راجاؤں اور فرماں رواؤں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہونگی۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اُن کی ملاقاتیں فائدہ
سے خالی نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ برہان پور کے پاس پہنچا۔ تو راجی علی خاں حاکم خاندیس سے
ملاقات ہو گئی۔ اُنہوں نے اپنی حکمت عملی اور حسن تقریر اور گرم جوشیوں کے جادو سے اُسے
رفاقت پر آمادہ کیا۔ لیکن ان جادوؤں کا اثر کچھ نہ کچھ وقت چاہتا ہے۔ اتنے میں شہزادہ کا فرمان آیا
کہ مہم خراب ہوتی ہے۔ جلد حاضر ہو۔ اور ہرکاروں نے خبر پہنچائی۔ کہ شہزادہ نے لشکر کو آگے
بڑھایا ہے۔ انہوں نے لکھا۔ کہ راجی علی خان آنے کو حاضر ہے۔ اور فدوی چلا آیا۔ تو اس مصلحت
میں خلل آ جائیگا۔ شہزادہ کے دل میں کدورت تو ہوتی ہی جاتی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی۔ خانخاناں
کو بھی اس کے دربار کی خبریں برابر پہنچتی تھیں۔ اُس نوعمری نے جو وہاں رنگ دیا۔ اُس کا حال سُن کر
اپنا لشکر فیل خانہ توپ خانہ وغیرہ وغیرہ اور اکثر امرا کو پیچھے چھوڑا۔ آپ راجی علی خان کو ساتھ
لے کر دوڑے۔ شہزادے نے سُن کر بیس ہزار لشکر رکاب میں لیا اور آگے بڑھ گیا۔ انہوں نے
مارا مار احمد نگر سے تیس کوس پر جا لیا۔ لگانے والوں نے ایسی نہیں لگائی تھی جو بجھ بھی سکے پہلے
دن تو سلام ہی نصیب نہ ہوا۔ خان خاناں حیران کہ ہزار کارسازیوں سے میں ایسے شخص کو
ساتھ لایا۔ جس کی رفاقت فتح و اقبال کی فوج ہے۔ یہ حسن خدمت کا انعام ملا۔ دوسرے دن
ملازمت ہوئی تو شہزادہ تیوری چڑھائے مُنہ بنائے۔ یہ بھی خانخاناں تھے۔ رخصت ہو کر اپنے خیمہ

میں آئے۔ مگر بہت رنج۔ اور فکر یہ کہ یہ عقل و تدبیر کا پتلا جو میرے ساتھ آیا ہے۔ اس حالت کو دیکھ کر کیا کہتا ہوگا اور جو جو کچھ میں نے سمجھایا تھا۔ اُسے کیا سمجھا ہوگا۔ امرا اور لشکر جو پیچھے تھا وہ آئے مصلحت وقت یہ تھی کہ اُن کے آنے کی شان و شوکت دکھاتے۔ انہیں خدمتیں سپرد ہوتیں۔ دل بڑھائے جاتے۔ یہاں دل داری کے بدلے دل شکنی اور دل آزاری سے

ہردم آزردگیٔ غیر سبب راچہ علاج	ما گذشتیم ز لطفِ تو غضب راچہ علاج

وہ بھی آخر خان خاناں تھا۔ اُٹھ کر اپنے لشکر میں چلا آیا۔ اُس وقت سب کی آنکھیں کھلیں۔ امیروں کو دوڑایا۔ نامے لکھے۔ غرض جس طرح ہؤا صفائی ہوگئی۔ مگر اس سے یہ قاعدہ معلوم ہو گیا۔ کہ ایک بالیاقت اور باسامان شخص جو سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ ماتحت ہو کر کچھ نہیں کر سکتا۔ بلکہ کام بھی خراب ہوتا ہے۔ اور وہ خود بھی خراب ہوتا ہے ✦

جن لوگوں نے خان خاناں کا یہ حال کروایا۔ وہ اور امیروں کو کیا خاطر میں لاتے تھے لعدہٗ کو بھی بے عزت کرواتے تھے۔ اس لئے لشکر میں ناراضگیاں عام ہو رہی تھیں۔ راجی علی خاں کو بھی خان خاناں کا مہمان سمجھ کر دربار میں ایک آدھ چکمہ دے دیا۔ غرض مہم کا رنگ بگڑنا شروع ہؤا ✦

اب اُدھر کی سُنو۔ کہ چاند بی بی برہان الملک کی حقیقی بہن حسین نظام شاہ کی بیٹی۔ علی عادل شاہ کی بی بی علاوہ عظمتِ خاندانی اور عفتِ ذاتی کے اپنی عقل و تدبیر اور سخاوت و شجاعت۔ قدردانی کمال پروری کے جواہرات سے جڑا ؤ پتلی تھی۔ اس واسطے نادرۃ الزمانی کہلاتی تھی۔ اور وہی ملک کی وارث رہ گئی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ملک چلا۔ اور خاندان کا نام مٹتا ہے۔ تو چہرہ کی نقاب سے ہمت کی کمر باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور امرا کو بُلا کر تسلی اور دلاسے کے ساتھ سمجھایا۔ وہ بھی اکبری لشکر کو دریا کی طرح لہراتا دیکھ کر اپنے اور ملک کے انجام کو سوچے۔ جو عرضیاں شہزادہ کو اور اس کے خان خاناں کو بھیجی تھیں۔ اُن پر بہت پچھتائے۔ سب نے مل کر مشورت کی صلاح ٹھیری کہ چاند بی بی قلعہ احمد نگر میں سلطنت کی وارث بن کر تخت پر بیٹھے۔ ہم حق نمک ادا کریں۔ اور جہاں تک ہو سکے۔ احمد نگر کو بچائیں ✦

اُس شاہ مزاج بیگم نے جنگ کے سامان۔ غلّوں کے ذخیرے جمع کرنے شروع کئے۔ دربار کے امیروں اور اطراف کے زمینداروں کی دلداری اور دلجوئی میں مصروف ہوئی۔ احمد نگر کو مضبوطی اور مورچہ بندی کر کے سدِ سکندر بنالیا۔ بہادر شاہ بن ابراہیم شاہ کو برائے نام وارث ملک قرار دے کر تخت پر بٹھایا۔ ایک سردار کو بیجاپور بھیج کر ابراہیم عادل شاہ سے صلح کر لی جمعیت و

لشکر کو لے کر اپنی جگہ قائم ہو گئی۔ اور اس استقلال و انتظام سے مقابلہ کیا۔ کہ مردوں کے ہوش اُڑ گئے۔ اور خاص و عام میں چاند بی بی سلطان کا نام ہو گیا۔

یہاں یہ بندوبست تھے۔ کہ شاہزادہ مراد امرائے کبار کے ساتھ پہنچا۔ اور فوج جرار کو لئے شمال احمد نگر سے اس طرح گرا جیسے پہاڑ سے سیل دریا بار گرے۔ یہ فوج میدان نماز گاہ میں ٹھیری۔ اور ایک دستہ دلاوروں کا چبوترہ کے میدان کی طرف بڑھا۔ چاند بی بی نے قلعہ سے دکھنی بہادروں کو نکالا۔ انہوں نے تیر و تفنگ کے دہان و زبان سے جواب سوال کئے۔ قلعہ کے مورچوں سے گولے بھی مارے۔ اسلئے فوج شاہی آگے نہ بڑھ سکی۔ شام بھی قریب تھی۔ شاہزادہ اور تمام امیر باغ ہشت بہشت میں کہ برہان نظام شاہ نے سرسبز و سرفراز کیا تھا۔ اُتر پڑے۔ دوسرے دن شہر کی حفاظت اور اہل شہر کی دلداری میں مصروف ہوئے۔ گلی کوچوں میں امان امان کی منادی کر دی۔ اور ایسا کچھ کیا کہ گھر گھر میں آئین آئین اور سوداگر۔ مہاجن سب کی خاطر جمع ہو گئی۔ دوسرے دن شاہزادہ۔ مرزا شاہ رُخ۔ خانخاناں شہباز خاں کمبو۔ محمد صادق خاں۔ سید مرتضٰے سبزواری۔ راجی علی خاں حاکم برہانپور۔ راجہ جگن ناتھ مان سنگھ کا چچا وغیرہ امرا جمع ہوئے۔ کمیٹی کر کے محاصرہ کا انتظام کیا اور مورچے تقسیم ہو گئے۔

قلعہ گیری اور شہرداری کا کام نہایت اُسلوب سے چل رہا تھا۔ کہ شہباز خاں کو شجاعت کا جوش آیا۔ شہزادے اور سپہ سالار کو خبر بھی نہ کی۔ جمعیت کثیر لے کر گشت کے بہانہ نکلا۔ اور لشکر کو اشارہ کیا کہ امیر فقیر جو سامنے آئے لوٹ لو۔ دم کے دم میں کیا گھر کیا بازار تمام احمد نگر اور اور برہان آباد لٹ کر ستیاناس ہو گیا۔ اور چونکہ اپنے مذہب میں نہایت تعصب رکھتا تھا۔ ایک مقام بارہ امام کا لنگر کہلاتا تھا۔ اور اس کے آس پاس تمام شیعہ آباد تھے۔ سب کو قتل اور غارت کر کے دشت کربلا کا نقشہ کھینچ دیا۔ شہزادہ اور خان خاناں سُن کر حیران ہو گئے۔ اُسے بُلا کر سخت ملامت کی۔ غارت گروں نے قتل۔ قید۔ قصاص سے سزائیں پائیں۔ مگر کیا ہو سکتا تھا جو ہونا تھا ہو چکا۔ غارت زدوں کے پاس کپڑا تک نہ تھا۔ رات کے پردہ میں جلاوطن ہو کر نکل گئے۔

اس موقعہ پر میاں منجھو تو احمد شاہ کو بادشاہ بنائے عادل شاہ کے سر پر بیٹھے تھے۔ (۲) اخلاص حبشی موتی شاہ گمنام کو لئے دولت آباد کے علاقہ میں پڑے تھے (۳) آہنگ خاں حبشی ستر برس کے بڈھے شاہ علی ابن برہان شاہ اول کے سر پر چتر لگائے کھڑے تھے۔ سب سے پہلے اخلاص خاں نے ہمت کی۔ دولت آباد کی طرف سے دس ہزار لشکر جمع کر کے احمد نگر کی طرف چلا۔ جب لشکر اکبر شاہی میں یہ خبر پہنچی تو سپہ سالار نے پانچ چھ ہزار دلاور انتخاب کئے۔ دولتخاں لودھی کو کہ آگے سپاہ کا گزند

سرہند تھا۔ اِس پر سپہ سالار کر کے روانہ کیا۔ نہر گنگ کے کنارہ پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہؤا اور کشت و خون عظیم کے بعد اخلاص خاں بھاگے۔ لشکر بادشاہی نے لوٹ مار سے دل کا ارمان نکالا۔ وہیں پٹن کی طرف گھوڑے اُٹھائے۔ شہر مذکور آبادی سے گلزار ہو رہا تھا۔ مگر اس طرح لٹا کہ کسی کے پاس پانی پینے کو پیالہ تک نہ رہا۔ اِن باتوں نے اہل دکن کو ان لوگوں سے بیزار کر دیا اور جو ہوا موافق ہوئی تھی۔ بگڑ گئی ؛

میاں منجو اگرچہ زور زر اور قوتِ لشکر رکھتا تھا۔ مگر اُس کی چالاکی غضب تھی۔ اس لئے چاند سلطان بیگم نے آہنگ خاں حبشی کو لکھا۔ کہ جس قدر ہو سکے دکنی دلاوروں کی سپاہ فراہم کر کے حفاظت قلعہ کے لئے حاضر ہو۔ وہ سات ہزار سوار لے کر احمد نگر کو چلا۔ شاہ علی اور مرتضےٰ اُس کے بیٹے کو ساتھ لیا۔ چھ کوس پر آکر ٹھیرا۔ اور جاسوس کو بھیج کر حال دریافت کیا۔ کہ محاصرہ کا کیا طور ہے۔ اور کس پہلو پر زور زیادہ ہے۔ کس پہلو پر کم۔ اُس نے دیکھ بھال کر خبر پہنچائی۔ کہ قلعہ کی شرقی جانب خالی ہے۔ ابھی تک کسی کو ادھر کا خیال نہیں۔ آہنگ خاں تیار ہؤا ؛

ادھر قدرت کا تماشا دیکھو کہ اسی دن شاہزادہ نے گشت کر کے یہ مقام دیکھا اور خانخاناں کو حکم دیا تھا۔ کہ ادھر بند و بست تم بذات خود کرو۔ اور وہ بھی اُسی وقت ہشت بہشت سے اُٹھ کر یہاں آن اُترا اور جو مکانات پائے۔ اُن پر قبضہ کر لیا۔ آہنگ خاں نے تین ہزار سوار انتخابی اور ہزار پیادہ توپچی ساتھ لئے اور اندھیری رات میں کالی چادر اوڑھ کر قلعہ کی طرف چلا۔ دو نو حریف ایک دوسرے سے بے خبر۔ خبر ہوئی تو اُسی وقت کہ چھُری کٹاری کے سوا بال بھر فرق نہ رہا۔ خانخاناں فوراً دو سَو دلیروں کو لے کر عمارت عبادت خانہ کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور تیراندازی و تفنگ اندازی شروع کر دی۔ اُن کا میر شمشیر وہی دولت خاں لودھی سُنتے ہی چار سو سواروں کو لے کر دوڑا۔ یہ اس کے ہم ذات اور ہم جان افغان تھے۔ جان توڑ کر اڑ گئے۔ پیر خاں دولت خاں کا بیٹا چھ سو بہادروں کو لے کر کمک کو پہنچا۔ اور اندھیرے ہی میں بزن بزن ہونے لگی۔ آہنگ خاں نے دیکھا۔ کہ اس حالت کے ساتھ لڑنے میں سوا مرنے کے کچھ فائدہ نہیں۔ معلوم ہؤا کہ خان خاناں کی تمام فوج مقابلہ میں مصروف ہے۔ خیمہ و خواب گاہ کی جانب خالی ہے۔ چار سو دکنی دلیر اور شاہ علی کے بیٹے کو لے کر گھوڑے مارے اور بھاگا بھاگ قلعہ میں گھُس ہی گیا۔ شاہ علی ستر برس کا بڈھا تھا۔ اُس کی ہمت نہ پڑی۔ دم کو غنیمت سمجھا۔ اور باقی فوج کو لے کر جس رستہ آیا تھا اُسی رستے بھاگا۔ دولتخاں نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مارا مار دوڑا دوڑ نو سو آدمی کاٹ کر اُلٹا پھرا ؛

بادشاہی لشکر گرد پڑا تھا۔ مورچے امرا میں تقسیم تھے۔ سب زور مارتے تھے۔ اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ شہزادہ کی سرکار میں فتنہ انگیز کوتہ اندیش جمع ہو گئے تھے۔ میدان میں دھاوا نہ مارتے تھے۔ ہاں دربار میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر خوب پیچ مارتے تھے۔ شہزادہ کی تدبیر میں اتنا زور نہ تھا۔ کہ اُن کی شرارتوں کو دبا سکے۔ اور آپ وہ کرے جو کہ مناسب ہو۔ یہ بات غنیم سے لے کر اُس کی رعایا تک سب جان گئے تھے۔

بنجارے رستہ میں لٹتے تھے۔ رسد کی تنگی تھی۔ اندر سے گولے برستے تھے۔ مورچے خراب۔ دمدمہ ویران ہوتے تھے۔ رات کو شبخون مارتے تھے۔ نامی سردار مارے جاتے تھے قلعہ کی اینٹ نہ ہلتی تھی۔ میدان میں بھی معرکے ہوتے تھے۔ کئی دفعہ غنیم نے شکست کھائی۔ پیچھا کرتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔ مگر اور سب کھڑے تماشا دیکھا کئے۔ ایک شب خان خاناں کے مورچے پر شبخون آیا۔ فوج ہشیار تھی۔ بڑی سختی سے مقابلہ کیا۔ دلاوروں کی سپاہگری سرخرو ہوئی۔ حریف صبح ہوتے خاک اُڑا کر قلعہ میں بھاگ گئے۔ اگر اور امرا تعاقب کرتے۔ حضور انور تازہ دم لشکر کو لے کر پہنچتے تو ساتھ ہی اندر گھس جاتے۔ نفاق و حسد کا منہ سیاہ کہ سب مُنہ دیکھا کئے۔ ہزار طرح کی کوشش اور لاکھ جانکاہی سے مورچے بڑھانے بڑھاتے تین سرنگیں برجوں کے نیچے پہنچیں۔ روپیہ بھی بے حد ہی خرچ ہوا۔ مگر اس شیر بی بی نے اپنی ہمت اور جاسوسوں کی تلاش سے پتے لگا کر دو سرنگوں کے سرے نکال لئے۔ دھاوے سے ایک دن پہلے زمین کھود کر باروت کے تھیلے کھینچ لئے۔ طرہ اس پر یہ کہ مشکیں اور تھلیاں بھر بھر کر اتنا پانی ڈلوایا۔ کہ آگ کی جگہ پانی اُبلنے لگا۔ قلعہ والے تیسری نقب کی فکر میں تھے۔ کہ اُدھر سے شہزادہ اور خان خاناں فوجیں لے کر سوار ہوئے۔ اور بہادر دھاوے کے لئے تیار کھڑے۔ حکم ہوا کہ فتیلوں کو آگ دکھاؤ۔ واہ واصادق محمد خاں فساد کی دیا سلائی۔ اور انہی کی سرنگ پانی پانی پائی۔

جس سے طوفان نے کیا تھا ظہور	اُن کے فانی کے گھر کا تھا وہ تنور

دوسری کو آگ دی وہ بھی فش۔ تیسری اڑی کہ یہی سب سے بڑی بھی تھی۔ پچاس گز دیوار گری عجب قیامت نمودار ہوئی۔ دُنیا دھواں دھار ہو گئی۔ الٰہی تیری امان۔ پتھر اور آدمی کبوتروں کی طرح ہوا میں اڑے جاتے تھے۔ اور قلابازیاں کھاتے زمین پر آتے تھے۔ کہیں کے کہیں کوسوں پر جا پڑے۔ امرا میں سے کسی نے دھاوا نہ کیا۔ حیران کھڑے تھے کہ اور سرنگیں کیوں نہیں اڑتیں۔ آگے نہ بڑھتے تھے۔ کہ مبادا چتوڑ والی آفت یہاں بھی نازل ہو۔ اور بات وہی تھی کہ اپنی اپنی

جگر جی چرا گئے ۔ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتا تھا۔آپس کی پھوٹ سے بڑا وار خالی گیا قلعہ والوں کی خاطر جمع تھی۔کہ امرائے شاہی یک دل نہیں ہیں۔آہنگ خاں وغیرہ بڑے بڑے نامی گرامی امیروں نے جب یہ حال دیکھا تو سب پیچھے ہٹے۔اور صلاح ٹھیرائی کہ قلعہ خالی کر کے نکل چلیں۔مگر آفرین ہے۔چاندبی بی کی ہمتِ مردانہ کو۔اُس شیر دل عورت نے اتنی ہی فرصت کو غنیمت سمجھا۔برقع سر پر ڈالا۔تلوار کمر سے لگائی۔دوسری تلوار سونت کر ہاتھ میں لے بجلی کی طرح برج پر آئی۔تختے۔کڑیاں۔بانس۔ٹوکرے گارے کے بھرے تیار تھے۔بڑے بڑے تھیلے اور سارے مصالحہ لئے اتنے وقت کی منتظر بیٹھی تھی۔گری ہوئی دیوار پر آپ کھڑی ہوئی میٹھی زبان کا زور کچھ لالچ کچھ دھمکاوے سے۔غرض ایسا کچھ کیا کہ عورت اور مرد سب آکر لپٹ گئے۔پل کے پل میں فصیل کو برابر اُٹھا لیا۔اور اُس پر چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھا دیں۔جب بادشاہی لشکر ریلا دے کر جاتا اُدھر سے گولے اس طرح آتے جیسے اولے برستے ہیں۔اکبری فوج موج کی طرح ٹکر کھا کر اُلٹی پھرتی تھی۔ہزاروں آدمی کام آئے۔اور کام کچھ نہ ہوا۔شام کو ناکام ڈیروں کو پھر آئے۔

جب رات نے اپنی سیاہ چادر تانی۔شاہزادہ مراد لشکر اور مصاحبوں سمیت نامراد اپنے ڈیروں پر چلے آئے۔چاند بی بی چمک کر نکلی۔بہت سے راج اور معمار جلد کار ہزاروں مزدور اور بیلدار تیار تھے۔آپ گھوڑے پر سوار تھی مشعلیں روشن تھیں۔چونے گچ کے ساتھ چنائی شروع کر دی۔روپے اور اشرفیاں مٹھیاں بھر کر دیتی جاتی تھی۔راج مزدوروں کا بھی یہ عالم تھا۔کہ پتھر اور اینٹ بالائے طاق۔ملبہ۔لکڑ۔بلکہ مُردوں کی لاشیں تک جو ہاتھ میں آتا تھا برابر چنتے جاتے تھے۔بادشاہی لشکر صبح کو اُٹھا اور مورچلوں پر نظر ڈالی۔دیکھیں تو پچاس گز فصیل جس کا تین گز عرض تھا۔راتوں رات سدِ سکندر۔اُس کے علاوہ جو جو تدبیریں اُس ہمت والی بی بی نے کیں اگر تفصیل لکھوں تو دریائے اکبری میں چاندنی کھل جائے۔کہتے ہیں اخیر کو جب غلہ ہو چکا اور رسد بند ہو گئی۔اور کہیں سے کمک نہ پہنچی تو اُس نے لشکرِ بادشاہی پر چاندی سونے کے گولے ڈھال ڈھال کر مارنے شروع کر دیئے۔

اس عرصے میں خان خاناں کو خبر لگی۔کہ سہیل خاں حبشی عادل شاہ کا نائب ستر ہزار فوج جرار لے کر آتا ہے۔ساتھ ہی معلوم ہوا کہ رسد اور بنجارہ کا رستہ بھی بند ہو گیا۔آس پاس کے میدانوں میں لکڑی بلکہ گھاس کا تنکا تک نہ رہا۔گرد کے زمیندار سب پھر گئے۔لشکر کے جانور بھوکوں مرنے لگے۔اودھر سے چاند بی بی نے صلح کا پیغام بھیجا۔کہ برہان الملک کے پوتے کو حضور میں حاضر

کرتی ہوں۔ احمد نگر اُس کی جاگیر ہو جائے۔ ملک برار کی کنجیاں۔ عمدہ ہاتھی جواہر گرانبہا۔ نفائس و عجائب شاہانہ پیش کرتی ہوں۔ آپ محاصرہ اُٹھا لیں۔ باخبر اہلکاروں نے عرض کی کہ قلعہ میں ذخیرہ نہیں رہا اور غنیم نے ہمت ہار دی ہے۔ کام آسان ہو گیا۔ صلح کی کچھ حاجت نہیں۔ مگر روئے طمع سیاہ۔ کچھ رشوتوں نے پیچ مارا۔ کچھ حماقتوں نے آنکھوں میں خاک ڈالی۔ صلح پر راضی ہو گئے۔ باہر سے یہ خبر لگی تھی۔ کہ بیجاپور سے عادل شاہی لشکر جمعیت کر کے چاند بی بی کی مدد کو آتا ہے۔ چار و ناچار سب الصلح خیر کا عقد پڑھ کر رخصت ہوئے اور محاصرہ اٹھا لیا۔

شاہزادہ نے جب عادل شاہ کی فوج کی آمد سُنی۔ دفعتہً دفعیہ کو چلا۔ چند منزل پر سُنا کہ خبر ہوائی تھی۔ یہ ادھر سے برار کو مُڑے۔ مگر بے لیاقت سردار محاصرہ سے ایسے بے طور اُٹھے تھے کہ غنیم پیچھے پیچھے نقارے بجاتا آیا۔ اور جہاں قابو پایا۔ اسباب اور مال لوٹتا آیا۔ لشکر بدحال تھا۔ بے سامانی اور رسد کی کمی حد سے گزر گئی تھی۔ امرا میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ کوئی روک نہ سکا۔ سپہ سالار آزمودہ کار اور منتظم روزگار تھا۔ چاہتا۔ تو سارے کاروبار باتوں باتوں میں درست کر لیتا۔ مگر شیطانوں نے شہزادے کے کان میں یہ پھونکی تھی کہ خان خاناں چاہتا ہے کہ فتح میرے نام ہو۔ غلام حضور کے جاں نثار ہیں۔ کہ حضور کا نام روشن ہو۔ مورکھ شہزادہ نہ سمجھا کہ ان نالائقوں سے کچھ نہ ہو سکیگا۔ خان خاناں خاموش۔ جو حکم ہوتا تھا سو کرتا تھا اور اُن کی عقل و تدبیر کے تماشے دیکھتا تھا کبھی ہنستا تھا۔ کبھی جلتا تھا۔ پھر بھی جہاں تک ممکن تھا۔ مہم کو سنبھالے جاتا تھا۔ کہ آقا کا کام نہ بگڑے۔ ملک دکن کی کنجی (راجی علی خاں) اس کی کمر میں تھی۔ وہ عجب جوڑ توڑ کے مضمون نکالتا تھا۔ خان مذکور کی بیٹی کو شاہزادہ مراد سے منسوب کر کے اکبر کا سمدھی بنا دیا۔ اب وہ خواہ مخواہ لشکر میں شامل تھا۔ ۶ ہزار فوج اُس کے ساتھ۔ داماد کو چھوڑ کر خُسر کہاں جا سکتا ہے۔

اسی عرصہ میں برار پر قبضہ ہو گیا۔ بادشاہی لشکر نے وہاں مقام کیا۔ شاہزادہ نے شاہ پور آباد کر کے اپنا پایہ تخت بنایا۔ علاقے امرا کی جاگیروں میں تقسیم کئے۔ اونٹ۔ گھوڑے اطراف میں بھیج دئے۔ مگر مشکل یہ تھی۔ کہ خود پسند اور خود رائے غضب کا تھا۔ باپ کے رکن دولت جاں نثاروں کو ناحق ناراض کرتا تھا۔ چنانچہ شہباز خاں کمبو ایسا تنگ ہوا۔ کہ بے اجازت اُٹھ کر اپنے علاقے کو چلا گیا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ صلح کرنی صلاح وقت نہیں۔ میں دعا کرتا ہوں۔ احمد نگر کی لوٹ میری فوج کو معاف ہو۔ شاہزادہ نے نہ مانا۔

باوجود ان باتوں کے شہزادہ نے اطراف ملک پر قبضہ کے ہاتھ پھیلائے۔ چنانچہ پاتری وغیرہ

علاقے لے لئے۔ سہیل خاں عادل شاہ کی طرف سے امرائے احمد نگر کے جھگڑے چکانے آیا تھا۔ وہ بھرا ہوا جاتا تھا۔ اُس نے جب یہ خبریں سُنیں۔ تو بہت برہم ہوا۔ اس کے علاوہ چاند سلطان نے بھی عادل شاہ کو جو رشتہ میں چھوٹا دیور ہوتا تھا لکھا اُس پر فرمان روایانِ دکن نے اتفاق کر کے لشکر جمع کئے۔ اور سب متفق ہو کر ساٹھ ہزار جمعیت کے ساتھ فوج بادشاہی پر آئے ؏

خان خاناں کا اقبال مدت سے خواب ناز میں پڑا سوتا تھا۔ اُس نے انگڑائی لے کر کروٹ لی۔ چنانچہ یہ حال دیکھ کر اُس نے شہزادہ اور صادق محمد خان کو شاہ پور میں چھوڑا۔ اب شاہ رُخ مرزا اور راجی علی خاں کو لے کر بیس ہزار فوج کے ساتھ بڑھا۔ اس معرکہ کی فتح خان خاناں کا وہ کارنامہ ہے۔ کہ افق مشرق پر شعاع آفتاب سے لکھا جائے۔ نہر گنگ کے کنارے سون پت کے پاس مقام کیا۔ اور یہاں چند روز ٹھیر کر ملک کا حال معلوم کیا۔ لوگوں سے واقفیت پیدا کی۔ ایک دن فوجیں آراستہ کر کے مقام اشتی پر فوجوں کی تقسیم کی۔ دریا میں پانی بہت کم تھا۔ پایاب اُتر کر باتھری سے بارہ کوس ماندیر کے مقام پر میدان جنگ قرار پایا ؏

۱۷ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ تھی کہ سہیل خاں عادل شاہ کا سپہ سالار تمام فوجوں کو لیکر میدان میں آیا۔ دائیں پر امرائے نظام شاہی۔ بائیں پر قطب شاہی۔ آپ بڑے غروروں کی فوج لے کر نشان اُڑاتا آیا۔ اور قلب میں قائم ہوا۔ لشکر کا شمار ہزاروں سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ سارا ٹڈی دل بڑے گھمنڈ اور دھوم دھام سے جرأت کے قدم مارتا آگے بڑھا۔ چغتائی سپہ سالار بھی بڑے آن بان سے آیا۔ چاروں طرف پرے جما کر قلعہ باندھا۔ جن میں راجی علی خاں اور راجہ رام چندر راجپوت دائیں پر تھے۔ خود مرزا شاہ رُخ اور مرزا علی بیگ اکبر شاہی کو لئے قلب میں کھڑا تھا ؏

پہر دن چڑھا تھا۔ کہ توپ کی آواز میں لڑائی کا پیغام پہنچا۔ سہیل خاں کو اس معرکے میں بڑا گھمنڈ اپنے توپخانہ پر تھا۔ فی الحقیقت ہندوستان میں اوّل توپخانہ آیا تو دکن میں آیا۔ وہ ملک کئی بندرگاہوں سے ملا ہوا تھا۔ جو سامان اس کا وہاں تھا۔ اور کہیں نہیں تھا۔ اُس کا آتش خانہ جیسا عمدہ تھا۔ ویسا ہی بہتات کے ساتھ تھا۔ پہلے ہی ہراول نے ہراول سے ٹکر کھائی۔ راجی علی خاں اور راجہ رام چندر نے توپ خالی کرنے کی فرصت ہی نہ دی۔ اور جا ہی پڑے۔ پھر بھی ہراول کی فوجیں غالب و مغلوب ہو کر کئی دفعہ بڑھیں اور ہٹیں۔ مگر بہادرانِ مذکور نے اُٹھا کر پھینک دیا۔ دکھنی پیچھے ہٹے مگر حکمت عملی کے ساتھ۔ لشکر بادشاہی کو کھینچ کر ایک دشوار گذار مقام میں لے گئے۔ پھر جو پلٹے تو دست راست سے آئے۔ اور اِدھر اُدھر نکل کر چاروں طرف

پھیل گئے۔ لڑائی کا دریا میدان میں موجیں مار رہا تھا۔ اور فوجیں ٹکرا کر بھنور کی طرح چکر کھاتی تھیں۔ سردار حملے کرتے تھے۔ مگر اُس دریا کا کنارہ نظر نہ آتا تھا ٭

دن ڈھل گیا۔ اور لڑائی بدستور جاری۔ دفعتہً ایک لطیفہ غیبی نمودار ہؤا۔ اسے تائید آلہی کہو یا خان خاناں کی نیک نیتی کا پھل سمجھو۔ تدبیر کو اصلا دخل نہیں۔ علی بیگ رومی توپخانہ غنیم کا افسر تھا۔ خود بخود اُدھر سے پہلو بچا کر نکلا۔ گھوڑا مار کر خان خاناں کے پاس آ کھڑا ہؤا۔ اور کہا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ حریف نے تمام توپخانہ ٹھیک آپ کے مقابل میں چُن رکھا ہے۔ اور داب مہتاب دکھایا چاہتا ہے۔ جلد داہیں کو ہٹیے۔ خان خاناں کو اُس کے قیافہ سے معلوم ہؤا کہ جھوٹا نہیں۔ مقام اور انداز کا پورا حال پوچھا۔ اور بڑے بندوبست کے ساتھ فوج کو پہلو میں سرکایا۔ ساتھ ہی دو سوار راجی علی خاں کے پاس بھیجے کہ حال یہ ہے تم بھی جگہ بدلو۔ خدا کی قدرت اُس کی سمجھ اُلٹی پڑی فوراً جگہ سے سرکا۔ اور جہاں سے خان خاناں ہٹا تھا۔ وہاں آن کھڑا ہؤا۔ قضا کا گول انداز ساعت کا منتظر تھا۔ اُس کا اُدھر آنا تھا۔ کہ موت نے مہتاب دکھائی۔ عالم اندھیر ہو گیا۔ دیر تک تو کچھ دکھائی ہی نہ دیا۔ حریف نے سپہ سالار کو سامنے سمجھ کر آگ دیتے ہی حملہ کر دیا۔ یہاں راجی علی خاں اپنی فوج کو لئے کھڑا تھا۔ عجب گھمسان کا رن پڑا۔ اور افسوس کہ وہ ملک دکن کی کُنجی اسی میدان کی خاک میں کھوئی گئی۔ کچھ شک نہیں۔ کہ اُس نے اور راجہ رامچندر نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ڈٹ کر جان دی۔ اور تیس ہزار دلاور اُس کے ساتھ کھیت رہے ٭

اب دو گھڑی سے زیادہ دن نہیں رہا۔ سہیل خاں نے دیکھا کہ سامنے میدان صاف ہے۔ خیال یہ کہ خانخاناں کو اُڑا دیا۔ اور فوج کو بھگا دیا۔ وہ حملہ کر کے آگے بڑھا۔ شام قریب تھی یہاں صبح کو بادشاہی لشکر میدان جما کر کھڑا ہؤا تھا۔ وہاں آن پڑا ٭

اِدھر خان خاناں کو خبر نہیں۔ کہ راجی علی خاں کا کیا حال ہے۔ جب اُس نے دیکھا۔ کہ آگ کا بادل سامنے سے ہٹا۔ گھوڑوں کی باگیں لیں۔ اور اپنے سامنے کی فوج پر جا پڑا۔ اِس نے اپنے حریف کو تباہ کر دیا۔ سہیل خاں کی فوج نے سجے ہوئے خیمے خالی پائے۔ اونٹ اور خچر قطار در قطار اور بیل ٹٹو لدے ہوئے تیار۔ ان میں خان خاناں کے خاصہ اور کارخانوں کے صندوق سُرخ و سبز بانات میں منڈھے ہوئے تھے۔ فوج دکن کے سپاہی اِسی نواح کے رہنے والے تھے۔ جو باندھ سکے وہ باندھا۔ چھاؤنی کو چھوڑا۔ اور ان باربرداریوں کو آگے ڈال۔ خاطر جمع سے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ خود اپنی فوج کے بیوفاؤں نے بھی مروت کے سر میں خاک ڈالی۔ یہ گھر کے بھیدی تھے۔

خزانوں اور بیش بہا کارخانوں پر گر پڑے۔ اور طمع کے تھیلے خوب دل کھول کر بھرے ؀
اگرچہ سہیل خاں کی فوج قتل ہوئی تھی اور بھاگی بھی تھی۔ مگر اس کا دل شیر تھا کہ سپہ سالار کو اڑا دیا ہے۔ جب شام ہوئی۔ تو سمجھا کہ اس وقت کھنڈے ہوئے لشکر کو سمیٹنا مشکل ہے۔ پاس ہی ایک گولی کے ٹپے پر نالہ بہتا تھا۔ وہیں تھم گیا۔ تھوڑی سی فوج ساتھ تھی۔ اُسے لے کر اُتر پڑا کہ جس طرح ہو۔ رات کاٹ لے۔ خانخاناں نے بھی اپنے سامنے سے دشمن کو بھگا دیا تھا۔ وہ وہاں جا پہنچا۔ جہاں سہیل خاں کا آتش خانہ پڑا تھا۔ اندھیرے میں یہ بھی وہیں ٹھہر گیا۔ اس کی فوج بھی بھاگ گئی تھی۔ اور اکثر سپاہی تو ایسے بھاگے تھے۔ کہ شاہ پور تک دم نہ لیا۔ بہت لٹیرے وہیں جنگل میں دریا کے کنارے غاروں اور کڑاڑوں میں بیٹھ رہے تھے۔ کہ صبح کو حریف کی آنکھ بچا کر نکل جائیں گے۔ خانخاناں نے یہاں سے سرکنا مناسب نہ سمجھا۔ توپوں کے تخت اور میگزین کے چھکڑے آگے ڈال کر مورچے بنا لئے اور توکل بخدا وہیں ٹھیر گیا۔ وہی وفا کے بندے جو جان کو بات پر قربان کیا کرتے ہیں۔ اُس کے گرد تھے۔ کوئی سوار نہ تھا۔ کوئی گھوڑے کی باگ پکڑے زین پر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں۔ کہ دیکھئے صبح۔ صبح مراد ہوتی ہے۔ یا صبح قتل۔ لطف یہ کہ غنیم پہلو میں کھڑا ہے۔ ایک کی ایک کو خبر نہیں ؀
اب اقبال اکبری کی طلسم کاری دیکھو۔ کہ سہیل خاں کے غلام ہوا خواہ کوئی چراغ کوئی مشعل جلا کر اُس کے سامنے لائے۔ خان خاناں اور اُس کے رفیقوں کو روشنی نظر آئی۔ آدمی بھیجے کہ معلوم کریں۔ حال کیا ہے۔ وہاں دیکھیں تو سہیل خاں چمک رہے ہیں۔ کئی توپیں اور زنبورک دکنی توپخانہ کے بھرے کھڑے تھے۔ جھٹ انہیں سیدھا کر کے نشانہ باندھا اور داغ دیا۔ گولے بھی ٹھیک موقع پر گرے۔ اور معلوم ہوا۔ کہ حریف کے غول میں ولولہ پڑا۔ کیونکہ وہ گھبرا کر جگہ سے ہٹے۔ سہیل خاں حیران ہوا۔ کہ یہ غیبی گولے کدھر سے آئے۔ آدمی بھیج کر آس پاس کے رفیقوں کو بُلایا۔ اُدھر خان خاناں نے فتح کے نقارے پر چوٹ دے کر حکم دیا کہ کرنا میں شادیانہ فتح بجاؤ۔ رات کا وقت جنگل میں آواز گونج کر پھیلی۔ بادشاہی سپاہی جو کھنڈے بکھرے تھے۔ اُنہوں نے اپنے لشکر کی کرنا پہچانی۔ اور سب نکل کر فتح کی آواز پر آئے۔ وہ پہنچے تو پھر مبارکباد کی کرنا پھونکی۔ اور جب کوئی سردار فوج لے کر پہنچتا تھا۔ اللہ اللہ کا نعرہ کرنا میں ادا کرتے تھے۔ رات بھر میں ۱۱ دفعہ کرنا بجی۔ سہیل خان بھی آدمی دوڑا رہا تھا۔ اور اپنی جمعیت کو درست کرتا تھا لیکن اس کی فوج کا یہ عالم تھا کہ جوں جوں اکبری کرنا کی آواز سُنتے تھے۔ ہوش اُڑے جاتے تھے سہیل خاں کے

نقیب بھی بولتے اور بولاتے پھرتے تھے۔ مگر سپاہیوں کے دل ہارے جاتے تھے۔ گڑھوں اور گوشوں میں چھپتے تھے۔ اور درختوں پر چڑھتے تھے۔ کہ جان کس طرح بچائیں؟ صبح ہوتے خان خاناں کے سپاہی دریا پر پانی لینے گئے۔ خبر لائے کہ سہیل خاں بارہ ہزار فوج سے جا کھڑا ہے۔ اِس وقت اِدھر چار ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ مگر اکبری اقبال کے سپہ سالار نے کہا۔ کہ اندھیرے کو غنیمت سمجھو۔ اِس کے پردہ میں بات بن جائے گی۔ تھوڑی فوج ہے۔ دن نے پردہ کھول دیا تو مشکل ہو جائیگی۔ دھندلکے کا وقت تھا۔ صبح ہُوا چاہتی تھی۔ اتنے میں سہیل خاں چمکا اور فوج کو ہوائے جنگ میں جنبش دی۔ توپیں سیدھی کیں اور ہاتھیوں کو سامنے کرکے ریلا دیا۔ اِدھر سے اکبری سپہ دار نے دھاوے کا حکم دیا۔ فوج دن بھر رات بھر کی بھوکی پیاسی۔ سرداروں کی عقل حیران۔ دولت خاں ان کا ہراول تھا۔ گھوڑا مار کر آیا۔ اور کہا کہ اس حالت کے ساتھ فوجِ کثیر پر جانا جان کا گنوانا ہے۔ مگر میں اس پر بھی حاضر ہوں۔ چھ سو سوار ساتھ ہیں غنیم کی کمر میں گھُس جاؤں گا۔ خانخاناں[1] نے کہا۔ دِلّی کا نام برباد کرتے ہو۔ اُس نے کہا (ہائے دِلّی خان خاناں کو بھی تو بہت پیاری تھی۔ کہا کرتا تھا کہ مرو نگا تو دِلّی ہی میں مرونگا) اگر اس وقت دشمن کو دے مارا۔ تو سَو دِلّیاں خود کھڑی کر دینگے۔ مر گئے تو خدا کے حوالے۔ دولت خاں نے چاہا۔ کہ گھوڑے اُٹھائے سید قاسم بارہہ بھی اپنے سید بھائیوں کو لئے کھڑے تھے۔ اُنہوں نے آواز دی۔ بھائی ہم تم تو ہندوستانی ہیں۔ مرنے کے سوا دوسری بات نہیں۔ نواب کا ارادہ تو معلوم کر لو۔ دولت خاں پھر پلٹے اور خان خاناں سے کہا۔ سامنے[2] بہ انبوہ ہے اور فتح آسمانی ہے۔ یہ تو بتا دیجئے۔ کہ اگر شکست ہوئی۔ تو آپ کو کہاں ڈھونڈ لیں۔ خان خاناں نے کہا۔ سب لاشوں کے نیچے۔ یہ کہہ کر بوڑھی پٹھان نے سادات بارہہ کے ساتھ باگیں لیں۔ میدان سے کٹ کر پہلے گھونگھٹ کھایا۔ اور چکر دے کر ایک مرتبہ غنیم کی کمرگاہ پر گرا۔ اُن میں ہل چل پڑ گئی۔ اور یہ ٹھیک وہی وقت تھا۔ کہ خانخاناں سامنے سے حملہ کرکے پہنچا تھا۔ اور لڑائی دست و گریباں ہو رہی تھی۔ سہیل خاں کا لشکر بھی آٹھ پہر کا ہارا۔ بھوک پیاس کا مارا تھا۔ ایسا بھاگا۔ جس کی ہرگز امید نہ تھی۔ پھر بھی بڑا کشت و خون ہوا۔ سہیل خاں کئی زخم کھا کر گرا۔ قدیمی وفادار پروانوں کی طرح آن گرے۔ اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا اور دونو بازو پکڑ کر معرکہ سے نکال لے گئے۔ تھوڑی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ خانخانی لشکر

---

[1] خانخاناں نے کہا۔ نام دہلی بر باد میدہی۔ دولت خاں نے کہا۔ اگر حریف را بر داشتیم صد دہلی ایجاد کنیم و اگر مردیم کار با خداست۔

[2] چنیں انبوہے در پیش است و فتح آسمانی۔ اگر شکست روی دہد۔ جائے نشان دہید کہ شما را دریابیم خان خاناں نے کہا۔ در زیر لاشہا۔

میں بے لاگ فتح کے نقارے بجنے لگے۔ بہادروں نے میدان جنگ کو دیکھا۔ ستھراؤ پڑا تھا۔

صحن فلک ز دیدۂ قربانیاں پر است	یا آنکہ در کمان قضا یک خدنگ بود

لوگوں نے مشہور کر دیا۔ کہ راجی علی خاں میدان سے بھاگ کر الگ ہو گیا۔ بعضوں نے ہوائی اڑائی تھی۔ کہ غنیم سے جا ملا۔ دیکھا تو بڈھا شیر ناموری کے میدان میں سرخرو پڑا سوتا ہے۔ ۲۵ سردار نامدار اور پانچ سو غلام وفادار گرد کٹے پڑے ہیں۔ اُس کی لاش بڑی شان شوکت سے اُٹھا کر لائے اور بدزبانوں کے مُنہ کالے ہو گئے۔ خانخاناں کو فتح کی بڑی خوشی ہوئی۔ مگر اِس حادثہ نے سب مزا کِرکِرا کر دیا۔ فتح کے شکرانہ میں نقد و جنس ۷۵ لاکھ روپیہ کا مال ساتھ تھا سب سپاہ کو بانٹ دیا۔ فقط ضروری اسباب کے دو اُونٹ رکھ لئے۔ کہ اس بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ معرکہ خان خاناں کے اقبال کا وہ کارنامہ تھا۔ جس کے دمامہ سے سارا ہندوستان گونج اُٹھا۔ بادشاہ کو عرضی پہنچی۔ وہ بھی عبداللہ اوزبک کے مرنے کی خبر سُن کر پنجاب سے پھرے تھے اس خوشخبری سے نہایت خوش ہوئے۔ خلعت گراں بہا اور تحسین و آفریں کا فرمان بھیجا۔ جہاں جہاں دشمن تھے۔ سناٹے میں آکر دم بخود رہ گئے۔ یہ فتح کے نشان اُڑاتے۔ شادیانے بجاتے شاہ پور میں آئے۔ شہزادہ کو مجرا کیا۔ اور تلوار کھول کر اپنے خیمہ میں بیٹھ گئے۔ صادق محمد وغیرہ شہزادہ کے مصاحب و مختار مخالفت کی دیا سلائی سلگاتے جاتے تھے۔ ادھر خانخاناں عرضیاں کر رہا تھا ادھر شاہزادہ۔ شہزادہ نے باپ کو یہاں تک لکھا۔ کہ حضور ابوالفضل اور سید یوسف خاں مشہدی کو بھیج دیں۔ خان خاناں کو بُلا لیں۔ خان خاناں بھی اُسی کے لاڈلے تھے۔ اُنہوں نے لکھا کہ حضور شہزادہ کو بُلا لیں۔ خانہ زاد اکیلا فتح کا ذمہ لیتا ہے۔ یہ بات بادشاہ کو ناگوار گذری۔ شیخ نے اکبرنامہ میں کیا مطلب کا عطر نکالا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ حضور کو معلوم ہؤا۔ کہ شاہزادہ اکھڑے ہوئے دل کا جوڑنا آسان سمجھتا ہے۔ اور جس طرح چاہئے۔ اُس طرح نہیں رہتا اور خان خاناں نے دیکھا کہ میری بات نہیں چلتی۔ اس لئے وہ اپنی جاگیر کو روانہ ہو گیا۔ راجہ سالباہن کو حکم ہؤا۔ کہ تم شاہزادہ کو لے کر آؤ۔ کہ نصائح مناسب سے رہنمائی کرکے پھر بھیجیں اور روپیہ خواص کو خان خاناں کے پاس بھیجا۔ کہ جس مقام پر ملو وہیں سے دھتکار کر اُلٹا پھیر دو اور کہو۔ کہ جبتک شہزادہ دربار سے رخصت ہو کر وہاں پہنچے۔ ملک و سپاہ کا انتظام کرو۔

اگرچہ شہزادہ شراب خوری اور رأس کی بدحالیوں کے سبب سے آنیکے قابل نہ تھا۔ مگر حضوری دربار کا ارادہ کیا۔ اُس کے مزاج دانوں نے خیر خواہی خرچ کرکے کہا۔ کہ اس وقت ملک سے حضور کا جانا

مناسب نہیں۔ شہزادہ رُک گیا۔ اِدھر خان خاناں نے کہا۔ کہ جب تک شہزادہ وہاں ہے میں نہ جاؤنگا۔ بادشاہ کو یہ باتیں پسند نہ آئیں۔ اور دل کو ناگوار گذریں۔ غرض ۱۰۰۶ھ خانخاناں اپنے علاقہ پر گئے۔ وہاں سے دربار میں آئے۔ کئی دن تک عتاب خطاب میں رہے وہ بھی دوشت کے مزاج دان تھے۔ اور جادو بیان۔ جب عرض معروض کے موقعے پائے۔ شہزادہ کی بدصحبتی و بادہ خواری و بےخبری اور مصاحبوں کی بدذاتیوں کے سب حالات سنائے۔ غبار کدورت کو دھویا۔ چند روز میں جیسے تھے۔ ویسے ہی ہوگئے۔ شیخ[1] اور سید دکن کو بھیجے گئے۔ شہزادہ کی نوبت حد سے گذر چکی تھی۔ شیخ کے پہنچنے تک بھی نہ ٹھہر سکا۔ یہ رستہ ہی میں تھے۔ کہ وہ ملک عدم کو روانہ ہوگیا۔ افسوس ہے اُس نوجوانی دیوانی پر کہ بادہ کشی کی ہوا میں اپنی جان برباد کی۔ یعنے مراد تیس برس کی عمر ۱۰۰۷ھ میں نامراد و ناشاد دنیا سے گیا۔

۱۰۰۷ھ میں شاہ عباس نے یہ حال دیکھ کر بلادِ خراساں پر مہم کی اور فتح یاب ہوا۔ انہی دنوں میں تحائف گراں بہا کے ساتھ ایلچی دربار اکبری میں بھیجا۔

اِسی سال خان خاناں نے حیدر قلی نوجوان بیٹے کا داغ اُٹھایا۔ اُسے بہت چاہتا تھا۔ اور پیارسے حیدری کہا کرتا تھا۔ اُسے بھی شراب کے شراروں نے کباب کیا۔ نشہ میں مست پڑا تھا۔ آگ لگ گئی۔ مستی کا مارا اُٹھ بھی نہ سکا اور جلکر مرگیا۔

اِسی برس بادشاہ لاہور سے آگرہ جاتے تھے۔ سب اُمرا ساتھ تھے۔ ماہ بانو بیگم خان اعظم کی بہن خان خاناں کی بیگم مدت سے بیمار تھیں۔ انبالہ کے مقام میں ایسی طبیعت بگڑی۔ کہ وہیں چھوڑنا مناسب معلوم ہوا۔ بادشاہ اُدھر روانہ ہوئے۔ بیگم نے ملک عدم کو کوچ کیا۔ اکبر بادشاہ کی کوکی۔ مرزا عزیز کوکہ کی بہن۔ خان خاناں کی بیگم تھیں وہ امیر دربار سے آئے۔ اور رسوم سوگواری کو ادا کیا۔

اکبر بلکہ تمام سلاطین چغتائی مُلک موروثی کہکر سمرقند و بخارا کے نام پر جان دیتے تھے۔ ۱۰۰۸ھ میں عبداللہ اوزبک کے مرنے سے ترکستان میں ہل چل مچ رہی تھی۔ روز بادشاہ ہوتے تھے روز مارے جاتے تھے۔ دکن میں جو لڑائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شیخ اور سید کی تدبیر اور شمشیر انہیں سمیٹ نہ سکتی تھی۔ اکبر نے امرا کو جمع کرکے صلاح کی کہ پہلے دکن کا فیصلہ کرنا چاہیے یا اُسے ملتوی کرکے ادھر چلنا مناسب ہے۔ اِس بات کا بھی رنج تھا۔ کہ وہاں جوان بیٹا جان سے گیا۔ پھر بھی ملک فتح نہ ہوا۔ صلاح ٹھیری کہ پہلے گھر کیطرف سے خاطر جمع کرنی چاہیے چنانچہ ۱۰۰۸ھ

---

[1] شیخ ابوالفضل۔ سید یوسف مشہدی۔

میں شاہزادہ دانیال کو لشکر عظیم اور سامان وافر کے ساتھ پھر روانہ کیا۔ اور خان خاناں کو اُس کے ساتھ کیا۔ مراد کی نامرادی نے نصیحت کر دی تھی۔ اب کی روانگی بندوبست سے ہوئی جانا بیگم خانخاناں کی بیٹی کے ساتھ شہزادہ کی شادی کر دی۔ روز امرا جمع ہوتے تھے۔ خلوتوں میں گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ سپہ سالار کو سب مافی الضمیر سمجھائے۔ جب روانہ ہوا۔ تو پہلی منزل میں خود اُس کے خیمہ گاہ میں گئے۔ اُس نے بھی وہ پیشکش پیش کئے۔ کہ عجائب خانوں میں رکھنے کے قابل تھے گھوڑے تو بہتیرے تھے۔ مگر ایک گھوڑا تھا۔ کہ ہاتھی سے کشتی لڑتا تھا۔ سامنے سے مقابلہ کرتا تھا۔ پچھلے پاؤں سے ہٹ کر حملہ کرتا تھا۔ اور دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہاتھ ہاتھی کی مستک پر رکھ دیتا تھا لوگ تماشے دیکھتے تھے۔ اور حیران ہوتے تھے ؛

غرض خان خاناں شہزادہ کو لئے ملک دکن میں داخل ہوئے۔ واہ ہم سمجھتے تھے۔ کہ مدت کے بچھڑے دوست پردیس میں مل کر خوش ہونگے۔ مگر تم دیکھو گے کہ نقش اُلٹا پڑا۔ آئینے سیاہ ہو گئے اور محبت کے لہو سفید ہو گئے۔ دونو شطرنج باز کامل تھے۔ دغا کی چالیں چلتے تھے۔ خانخاناں شہزادہ کی آڑ میں چلتا تھا۔ اِس لئے اُس کی بات خوب چلتی تھی۔ ابھی میدان معرکہ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے۔ جو نشانہ مارا۔ شیخ اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ قلم سے درد مجبوری برس رہا ہے "میں نے احمد نگر کے کام کا سب بندوبست کر لیا تھا۔ شہزادہ کا فرمان پہنچا۔ کہ جب تک ہم نہ آئیں۔ قدم آگے نہ بڑھاؤ۔ سوا تعمیل کے اور کیا ہو سکتا ہے"؛

خان خاناں کی لیاقت ذاتی میں کسے کلام ہے۔ اُنھوں نے اپنے کام اور نام کے الگ بندوبست باندھے۔ اِدھر تو شیخ کو روک دیا۔ کہ احمد نگر پر حملہ نہ کرنا ہم آتے ہیں۔ اِدھر رستہ میں آسیر پر اٹک رہے کہ صاف کر کے احمد نگر کو لیں گے۔ یہ بھی شیخ پر چوٹ تھی۔ کیونکہ آسیر شیخ کا سمدھیانہ تھا۔ شیخ نے بھی فطرت کا منصوبہ مارا۔ اوپر اوپر اکبر کو لکھا کہ شاہزادہ لڑکپن کرتا ہے۔ آسیر کا معاملہ صاف ہے۔ جس وقت حضور چاہیں گے۔ اور جس طرح چاہیں گے۔ اُسی طرح ہو جائیگا۔ احمد نگر کی مہم بگڑی جاتی ہے۔ اکبر بادشاہ تدبیر کا بادشاہ تھا۔ اُس نے شہزادہ کو لکھا کہ جلد احمد نگر کو روانہ ہو کہ موقع وقت ہاتھ سے جاتا ہے۔ اور خود پہنچکر اُس پر محاصرہ ڈال دیا۔ ابوالفضل کو وہاں سے اپنے پاس بُلا لیا؛

خان خاناں نے احمد نگر پر محاصرہ ڈالا۔ روز مورچے بناتے تھے۔ دمدمے بناتے تھے۔ سرنگیں کھودواتے تھے۔ دکنی بہادر اندر سے قلعداری کرتے تھے۔ اور باہر بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ بنجاروں پر گرتے تھے اور لشکر پر چھپٹے مارتے تھے۔ چاند بی بی سامان کی فراہمی امرائے لشکر کی دلداری

برج و فصیل کی مضبوطی میں بال بھر کمی نہ کرتی تھی۔ پھر بھی کہاں اکبری اقبال اور شاہنشاہی سامان کہاں ایک احمد نگر کا صوبہ اس کے علاقہ میں سرداروں کی بدنیتی اور نفاق بھی قائم تھا بیگم نے یہ حال اپنے وزیر سے کہا۔ کہ قلعہ بچتا نظر نہیں آتا۔ بہتر ہے۔ کہ ننگ و ناموس کو بچائیں۔ اور قلعہ حوالہ کر دیں۔ چیتہ خاں نے اور سرداروں کو بیگم کے اس ارادہ سے آگاہ کیا۔ اور بہکایا۔ کہ بیگم امرائے اکبری سے سازش رکھتی ہے۔ دکنی سنتے ہی بگڑ کھڑے ہوئے۔ اور اس پاکدامن بی بی کو شہید کیا۔ امرائے اکبری نے سرنگیں اُڑا کر دھاوا کیا۔ تیس گز دیوار اُڑا دی۔ اور برج بابلی سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ چیتہ خاں اور ہزاروں دکنی ولاور موت کا شکار ہوئے۔ چیتہ خاں اور تمام سپاہی قتل کئے گئے۔ جس لڑکے کو نظام الملک بہادر شاہ بنایا تھا۔ وہ گرفتار ہوا خان خاناں اُسے لے کر حاضر ہوئے۔ اور مقام برہان پور میں پیش کیا۔ ۴۵ھ جلوس میں چار مہینے بیس دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہوا۔ فتح کے کارنامہ پر سب نے لکھا کہ جو کچھ کیا خان خاناں نے کیا۔ اور بیشک سچ کہا ✦

بادشاہ نے آسیر فتح کیا۔ اور آگرہ کی طرف مراجعت کی۔ **لطیفہ**۔ ملک شہزادہ کے نام پر نامزد کیا۔ اور دانیال کی مناسبت سے خاندیس کا نام داندیس رکھا۔ خان خاناں نے پھر پیچ مارا۔ شیخ کی لیاقت و کاردانی کی بہت تعریفیں لکھوائیں۔ اور اُنہیں بادشاہ سے مانگ لیا۔ اب صورت حال نہایت نازک۔ شاہزادہ صاحب ملک۔ خانخاناں خسر الدولہ اور سپہ سالار۔ شیخ ان کے ماتحت۔ خان خاناں کو اختیار ہے۔ جہاں چاہیں بھیجیں۔ جب بلا بھیجیں چلے آئیں۔ کسی اور کو بھیج دیں۔ شیخ لشکر میں بیٹھیں۔ مُنہ مُنہ دیکھا کریں۔ اور جلا کریں۔ مہمات کے معاملات میں مشورے ہوتے تھے۔ تو شیخ کی رائے کبھی پسند آتی تھی کبھی رد ہو جاتی تھی۔ شیخ دق ہوتے تھے۔ اور جس قلم سے خانخاناں پر دم و ہوش قربان ہُوا کرتے تھے۔ اُسی قلم سے اُس کے حق میں بادشاہ کو وہ وہ باتیں لکھتے تھے۔ کہ ہم شیطان کو بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر سُبحان اللہ اُس کی شوخی طبع نے اُس میں بھی ایسے ایسے کانٹے چبھوئے ہیں۔ کہ ہزاروں پھول اُس پر قربان ہوں ✦

زمانہ عجب نیرنگ ساز ہے۔ دیکھو جو دوست عاشقی و معشوقی کے دعوے رکھتے تھے اُنہیں کیسا لڑا دیا۔ اب یہ عالم تھا۔ کہ ایک دوسرے پر دغا کے وار کرتا اور فخر کرتا تھا۔ اُن کو بھی خیال کرنا چاہئے۔ کہ کیسے چلتے تھے۔ ابوالفضل بے شک کوہ دانش اور دریائے تدابیر تھے۔ اور خانخاناں اُن کے آگے طفل مکتب۔ مگر آفت کے ٹکڑے تھے۔ ان کی نوجوانی کے نکتے اور چھوٹی چھوٹی چالیں

ایسی ہوتی تھیں۔ کہ شیخ کی عقل متین سوچتی رہ جاتی تھی ؛

تمہارا ذہن ضرور اس بات کا سبب ڈھونڈیگا۔ کہ پہلے وہ گرمجوش محبتیں۔ اور اب یہ عداوتیں یا باہم شوراشوری۔ یا یہ ایسی بے نمکی ؛

وصل کی شب تم نے کیوں مجھ سے لڑائی ڈالدی	جل کے شاید کچھ کسی نے جلنوائی ڈال دی

میرے دوستو بات یہ ہے۔ کہ پہلے دونو کی ترقی کے رستے دو تھے۔ ایک امارت اور سپہ سالاری کے درجوں پر چڑھنا چاہتا تھا۔ مصاحبت اور حاضر باشی اُس کی ابتدائی سیڑھیاں تھیں۔ دوسرا علم وفضل۔ تصنیف وتالیف۔ نظم ونثر۔ مشورت اور مصاحبت کے مراتب کو عزت اور خدمت سمجھنے والا تھا۔ امارت اور اختیارات کو اُس کے لوازمات سمجھو۔ بہرصورت ایک دوسرے کے کام کے لئے مددگار و معاون تھے۔ کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کے لئے ہارج نہ تھی۔ اب دونو ایک مطلب کے طلبگار ہوگئے۔ جو دوستی تھی وہ رقابت ہوگئی ؛

یہ تو تین سو برس کی باتیں ہیں۔ جن کے لئے ہم اندھیرے میں قیاس کے تیر پھینکتے ہیں۔ جگر اُس وقت خون ہوتا ہے۔ جب اپنے زمانہ میں دیکھتا ہوں۔ کہ دو شخص برسوں کے رفیق بچپن کے دوست۔ ایک مدرسہ کے تعلیم یافتہ۔ الگ الگ میدانوں میں چل رہے تھے۔ تو قوت بازو۔ دوخواہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر راہِ ترقی پر لے چلتے تھے۔ اتفاقاً دونو کے گھوڑے ایک گھوڑدوڑ کے میدان میں آن پڑے۔ پہلا فوراً دوسرے کے گرانے کو کمربستہ ہوگیا ؛

میرے اس کے بگاڑ پر مت جا	اتفاقات ہیں زمانے کے

اکبر کے لئے یہ مشکل موقع تھا۔ دونو جاں نثار۔ دونو آنکھیں۔ اور دونو کو اپنی اپنی جگہ ڈٹے۔ آفرین ہے۔ اُس بادشاہ کو کہ دونو کو۔ دونوں ہاتھوں میں کھلاتا رہا۔ اور اپنا کام لیتا رہا۔ ایک کے ہاتھ سے دوسرے کو گرنے نہ دیا ؛

شیخ نے جو اپنی عرضیوں میں دل کے دھوئیں نکالے ہیں۔ وہ فقرے نہیں ہیں۔ جلے ہوئے کبابوں کو چٹنی میں ڈبو کر بھیج دیا ہے۔ اُن سے اِس تمسخر کا اندازہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ کتنا ظرافت کا لون مرچ اور تمسخر کا گرم مصالحہ چھڑکتے تھے۔ جو اکبر کو بھاتا تھا۔ اور اُس کے چٹخاروں میں ان کا کام نکل آتا تھا۔ میں نے شیخ کی بعض عرضیاں اُس کے خاتمۂ احوال میں نقل کی ہیں۔ خان خاناں نے بھی خوب خوب گل پھول کترے ہونگے۔ مگر افسوس کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آئے ؛

یہ رگڑے جھگڑے اسی طرح چلے جاتے تھے ۱۰۰۸ھ میں خان خاناں کی حسن تدبیر نے تلنگانہ کے ملک میں فتوحات کا نشان جا گاڑا۔ شیخ ۱۰۱۱ھ میں طلب ہوئے۔ اور افسوس ہے کہ راہ سے منزل بقا کو پہنچے۔ خان خاناں نے کئی برس کے عرصہ میں دکن کو بہت کچھ تسخیر کر لیا جب بندوبست سے فارغ ہوئے۔ تو ۱۰۱۲ھ میں دربار میں طلب ہوئے۔ اُس پر برہان پور احمد نگر برار کا ملک شہزادہ کے نام ہوا۔ اور انہیں اُس کی اتالیقی کا منصب ملا ✤

۱۰۱۳ھ میں اُن پر بڑی نحوست آئی۔ شہزادہ مدت سے بلائے بادہ خواری میں مبتلا تھا۔ بھائی کے مرنے نے بھی مطلق ہشیار نہ کیا۔ باپ کی طرف سے اُسے بھی۔ خان خاناں کو بھی برابر تاکیدیں پہنچتی تھیں۔ کوئی کارگر نہ ہوتی تھی ✤

ضعف حد سے بڑھ گیا۔ جان پر نوبت آن پہنچی۔ خان خاناں اور خواجہ ابوالحسن کو حکم بھیجا کہ پردہ داری کر کے محافظت کرو۔ اُس جانہار کا یہ حال کہ ذرا طبیعت بحال ہوئی۔ اور پھر پی گیا۔ سخت بندش ہوئی تو شکار کا بہانہ کرتا۔ اور نکل جاتا۔ وہاں بھی شیشہ نہ پہنچ سکتا تھا۔ تو قراول روپے کے لالچ سے کبھی بندوق کی نال میں کبھی ہرن کبھی بکری کی انتڑی میں بھرتے اور پگڑیوں کے پیچ میں لپیٹ کر لے جاتے تھے۔ بندوق کی شراب جس میں باروت کا دھواں لوہے کا میل بھی کٹ کر مل جاتا۔ زہر کا کام کر گئی۔ اور مختصر یہ کہ تینتیس برس چھ مہینے کی عمر میں خود موت کا شکار ہو گیا۔ اس صدمہ کو قلم کیا لکھ سکیگا۔ خان خاناں کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ افسوس جانا بیگم کا ہے۔ وہ پاکدامن بڑی عقلمند صاحب سلیقہ با تدبیر صاحبزادی تھی۔ حیف کہ عین نوجوانی کی بہار میں رنڈاپے کی سفید چادر اُس کے سر پر ڈالی گئی۔ اس عفیفہ نے ایسا رنج کیا۔ کہ کوئی کم کرتا ہے ✤

جہانگیری دَور ہوا تو خان خاناں دکن میں تھے۔ ۱۰۱۶ھ میں جہانگیر اپنی توزک میں خود لکھتا ہے خان خاناں بڑی آرزو سے لکھ رہا تھا۔ اور قدمبوسی کی تمنا ظاہر کرتا تھا۔ میں نے اجازت دی۔ بچپن میں میرا اتالیق تھا۔ برہان پور سے آیا۔ جب سامنے حاضر ہوا۔ تو اس قدر شوق اور خوشحالی اُس پر چھائی ہوئی تھی۔ کہ اُسے خبر نہ تھی۔ کہ سر سے آیا ہے۔ یا پاؤں سے۔ بیقرار ہو کر میرے قدموں میں گر پڑا۔ میں نے بھی شفقت اور پیار کے ہاتھ سے اُس کا سر اُٹھا کر مہر و محبت کے ساتھ سینہ سے لگایا۔ اور چہرہ پر بوسہ دیا۔ اُس نے دو تسبیحیں موتیوں کی۔ چند قطعے لعل و زمرد کے پیشکش کئے۔ تین لاکھ کے تھے۔ اُس کے علاوہ ہر جنس کے متاع بہت سے ملاحظہ میں گذرانے۔ پھر ایک جگہ

---

[1] دیکھو اس کا حال خان خاناں کی اولاد کے حال میں صفحہ ۶۴۵ ✤

لکھا ہے۔ شاہ عباس بادشاہ ایران نے جو گھوڑے بھیجے تھے۔ اُن میں سے ایک سمند گھوڑا اُسے دیا۔ ایسا خوش ہوا۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں اتنا بلند گھوڑا۔ ان خوبیوں اور خوش اسلوبیوں کے ساتھ آج تک ہندوستان میں نہیں آیا۔ فتوح ہاتھی کہ لڑائی میں لاجواب ہے۔ اور بیس ہاتھی اور اُسے عنایت کئے۔ چند روز کے بعد خلعت کمر شمشیر مرصع۔ فیل خاصہ عطا ہوا۔ اور دکن کو رخصت ہوئے۔ اور اقرار یہ کر گئے۔ کہ دو برس میں سب ملک سرانجام کر دونگا۔ مگر علاوہ فوج سابق کے بارہ ہزار سوار اور دس لاکھ کا خزانہ اور مرحمت ہو (اسی مقام پر خافی خاں لکھتے ہیں) پہلے دیوان تھے اب وزیر الملک خطاب دیا۔ اور ہفت ہزاری پنج ہزار کا منصب عنایت کر کے مہم پر رخصت کیا۔ امرائے نامی بیس ہزار سوار کے ساتھ رفاقت میں دئے۔ اور انعام و اکرام کی تفصیل کیا لکھی جائے۔

خان خاناں کے اقبال کا ستارہ عمر کے ساتھ عزت سے ڈھلتا جاتا تھا۔ وہ دکن کی مہموں میں مصروف تھا۔ کہ ۱۰۱۷ھ میں جہانگیر نے پرویز شاہزادہ کو دو لاکھ کا خزانہ۔ بہت سے جواہر بیش بہا دس ہاتھی۔ تین سو گھوڑے خاصہ کے عنایت فرمائے۔ سید سیف خاں بارہہ کو اتالیق کر کے لشکر ساتھ کیا اور حکم دیا کہ خان خاناں کی مدد کو جاؤ۔ وہاں پھر مراد کا معاملہ ہوا۔ بڈھے سپہ سالار کی بوڑھی عقل۔ نوجوانوں کے دماغوں میں نئی روشنی۔ طبیعتیں موافق نہ آئیں۔ کام بگڑنے شروع ہوئے۔ عین برسات میں لشکر کشی کر دی۔ برسات بھی اس بہتات کی ہوئی۔ کہ طوفان نوح کا عالم دکھا دیا۔

دریاے اشک اپنا جب سر پہ اوج مارے	طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے

تکلیف۔ نقصان۔ خرابیاں۔ ندامتیں۔ سب مینہ کے ساتھ ہی برسیں۔ انجام یہ ہوا۔ کہ جس خان خاناں نے آج تک شکست کا داغ نہ اُٹھایا تھا۔ اُس نے ۶۳ برس کی عمر میں شکست کھائی۔ فوج برباد۔ اپنے نہایت تباہ۔ بڑھاپے کے بوجھ اور ذلت کی بار برداری کو گھسیٹ کر برہانپور میں پہنچایا۔ وہی احمد نگر جسے گولے مار مار کر فتح کیا تھا۔ قبضہ سے نکل گیا۔ تماشا یہ کہ باپ کو لکھا۔ جو کچھ ہوا۔ خان خاناں کی خودسری خود رائی اور نفاق سے ہوا۔ یا ہمیں حضور بلا لیں یا انہیں۔ اور خان جہاں نے اقرار لکھ بھیجا۔ کہ فدوی اس مہم میں ذمہ لیتا ہے۔ تیس ہزار سوار مجھے اور ملیں۔ جو ملک بادشاہی غنیم کے تصرف میں ہے۔ اگر دو برس کے اندر نہ لے لوں تو پھر حضور میں منہ نہ دکھاؤنگا۔ آخر ۱۰۱۸ھ میں خان خاناں بُلائے گئے۔

۱۰۲۰ھ میں سرکار قنوج اور کالپی وغیرہ خان خاناں اور اُس کی اولاد کی جاگیر میں عنایت ہوا۔
۱۰۲۱ھ میں جب معلوم ہوا کہ دکن میں شہزادہ کا لشکر اور امرا سب سرگرداں پھرتے ہیں۔

اور روز روزِ اوّل ہے تو۔ جہانگیر کو پھر پُرانا سپہ سالار یاد آیا۔ اور امرائے دربار نے بھی کہا کہ وہاں کی مہمات کو جو خان خاناں سمجھتا ہے۔ وہ کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کو بھیجنا چاہیئے۔ پھر دربار میں حاضر ہوئے ششش ہزاری منصب ذات۔ خلعتِ فاخرہ۔ کمر شمشیر مرصّع۔ فیل خاصہ۔ اسپ ایرانی عنایت ہوا شاہ نواز خاں سہ ہزاری ذات و سوار۔ اور خلعت و اسپ وغیرہ۔ داراب کو پانسو ذات تین سو سوار اضافہ یعنے کل دو ہزاری ذات ایک ہزار پانسو سوار اور خلعت منصب وغیرہ اور اُس کے ہمراہیوں کو بھی خلعت و اسپ مرحمت ہوئے۔ اور خواجہ ابوالحسن کے ساتھ رخصت ہوئے ✦

سنہ ۱۰۲۴ھ میں اُس کے بیٹے ایسے ہو گئے۔ کہ باپ کو دربار سے ملک ملتا تھا۔ وہ بیٹھا بندوبست کرتا تھا۔ بیٹے ملک گیری کرتے تھے۔ چنانچہ شہنواز خاں بالاپور میں تھا کہ کئی سردار عنبر کی طرف سے اُس کے ساتھ آن ملے۔ اُس نے مبارکباد کے شادیانے بجوائے۔ بڑی مروّت اور حوصلے سے اُن کی دلجوئی اور خاطرداری کی۔ اور ہر ایک کے رُتبہ کے بموجب نقد جنس گھوڑے ہاتھی دے کر تکلف خرچ کیئے۔ لشکر توپخانہ رکاب میں تیار تھا۔ اُن کی صلاح سے عنبر کی طرف فوج لے کر چلا۔ عنبر کے سردار سپاہی دیہات میں تحصیل مال کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سن کر گاؤں گاؤں سے دوڑے اور ٹڈیوں کی طرح اُمنڈ پڑے۔ ابھی وہاں تک نہ پہنچا تھا۔ کہ کچھ غنیم کے[1] سردار فوج لے کر آن ہی پہنچے۔ رستہ میں مقابلہ ہوا۔ وہ بھاگے۔ اور شکستہ حال عنبر کے پاس پہنچے ✦

عنبر سُن کر جل گیا۔ عادل خانی اور قطب الملکی فوجیں لے کر بڑے زور شور سے آیا۔ یہ بھی آگے بڑھے۔ جب دونو لشکر لڑائی کے پلہ پر پہنچے تو بیچ میں نالہ تھا۔ ڈیرے ڈال دیئے۔ دوسرے دن پرے باندھ کر میدان داری ہونے لگی۔ غنیم کی جانب یاقوت خاں حبشی ان جنگلوں کا شیر تھا پیش قدمی کر کے بڑھا۔ اور میدانِ جنگ ایسی جگہ ڈالا۔ کہ نالہ کا عرض کم تھا۔ لیکن کناروں پر دلدل دُور دُور تک تھی۔ اسی واسطے تیر اندازوں اور بانداروں کو گھاٹوں پر بٹھا کر رستہ روک لیا۔ پہر دن باقی تھا۔ جو لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے توپیں اور بان اس زور شور سے چلے۔ کہ زمین آسمان اندھیر ہو گیا۔ عنبر کے غلامان اعتباری ہراول میں تھے۔ گھوڑے اُٹھا کر آئے۔ نالہ کے اِس کنارے سے اکبری ترک بھی تیر اندازی کر رہے تھے۔ جو ہمّت کر کے آگے آتے تھے۔ یہ اُن کے گھوڑوں کو چراغ پا کر کے اُلٹا دیتے تھے۔ بہت سے دلدل میں پھنس جاتے تھے۔ یہ حال

---

[1] محل دار خاں۔ یاقوت خاں۔ دانش خاں۔ دلاور خاں وغیرہ امرا سردار لشکر تھے ✦

دیکھا تو ملک عنبر کی نامور شجاعت نے اُسے کوئلے کی طرح لال کر دیا۔ اور چمک کر لشکر بادشاہی پر آیا۔ داراب اپنے ہراول کو لے کر ہوا کی طرح پانی پر سے گذر گیا۔ اِدھر اُدھر سے اور فوجیں بڑھیں۔ یہ اس کڑک دمک سے گیا۔ کہ غنیم کی فوج کو اُلٹتا پلٹتا اُس کے قلب میں جا پڑا۔ جہاں عنبر خود کھڑا تھا۔ لڑائی دست و گریبان آن پڑی۔ اور دیر تک کشاکشی کا میدان گرم رہا۔ انجام یہ ہوا کہ تلوار کی آنچ سے عنبر ہوکر اُڑ گیا۔ اکبری بہادر تین کوس تک مارا مار چلے گئے۔ جب اندھیرا ہو گیا۔ تو جنگلوں کا پیچھا چھوڑا۔ اور ایسا بھاری رن پڑا۔ کہ دیکھنے والے حیران تھے۔

۱۰۲۵ھ میں خورم کو شاہجہان کر کے رخصت کیا۔ اور شاہی کا خطاب دیا۔ کسی شاہزادے کو تیمور کے عہد سے آج تک عطا نہ ہوا تھا۔ ۱۰۲۶ھ میں خود بھی مالوہ میں جا کر چھاؤنی ڈالی۔ شاہجہان نے برہان پور میں جا کر مقام کیا۔ اور معاملہ فہم و صاحب تدبیر اشخاص کو بھیج کر امرائے اطراف کو موافق کیا۔

۱۰۲۶ھ میں جب کہ شاہزادہ شاہجہان کے حسن انتظام سے دکن میں بندوبست قابل اطمینان ہوا تو جہانگیر کو ملک موروثی کا پھر خیال آیا۔ شاہ ایران نے قندھار لے لیا تھا۔ چاہا کہ پہلے اسے لے۔ خاندیس برار احمد نگر کا علاقہ شاہجہان کو مرحمت ہوا۔ اس بیٹے کو اطاعت اور سعادتمندی اور نیک مزاجی کے سبب سے باپ بہت عزیز رکھتا تھا۔ اُس نے راجپوتانہ اور دکن میں فتوحات نمایاں کیں۔ خصوصاً رانا کی مہم کو اس کامیابی سے سر کیا تھا۔ کہ جہانگیر نہایت خوش ہوا تھا۔ وہ اسے اقبالمند اور فتح نصیب بھی جانتا تھا۔ غرضکہ شاہجہان حضور میں طلب ہوئے۔ دربار میں بیٹھنے کی صلاح قرار پائی۔ صندلی (کرسی) کی جگہ دست راست پر تجویز ہوئی۔ خود جھروکوں میں بیٹھے۔ اور لشکر کا ملاحظہ فرمایا۔ جب وہ حضور میں داخل ہوا۔ تو اشتیاق کے مارے آپ جھروکوں کے رستے اُتر گئے۔ بیٹے کو گلے لگایا۔ جواہر نچھاور ہوتے ہوتے آئے۔ خان خاناں کے بیٹوں نے دکن میں وہ جانفشانیاں کیں۔ کہ خاندانی سرخروئی شاداب ہو گئی۔ چنانچہ انہی دنوں میں شاہنواز کی بیٹی (خان خاناں کی پوتی) سے شاہجہان کی شادی کر دی۔ خلعت با چار قب زردوزی۔ و گردا من من سلک مروارید کمر شمشیر مرصع۔ معہ پردولہ مرصع باکمر خنجر مرصع عنایت فرمایا۔

۱۰۲۷ھ میں جہانگیر تو زک میں لکھتے ہیں۔ اتالیق جاں نثار۔ خان خاناں سپہ سالار نے امر اللہ اپنے بیٹے کے ماتحت ایک فوج جرار گوندوانہ بھیجی تھی۔ کہ کان الماس پر قبضہ کر لے۔ اب اُس کی عرضی آئی۔ کہ زمیندار مذکور نے کانِ مذکور نذرِ حضور کر دی۔ اُس کا الماس اصالت و

نفاست میں بہت عمدہ اور جوہریوں میں معتبر ہوتا ہے۔ اور سب خوش اندام آبدار خوب ہوتے ہیں ﴿

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ اتالیق جاں سپار نے آستان بوسی کا فخر حاصل کیا۔ مدت ہائے مدید ہوئیں۔ کہ حضور سے دُور تھا۔ لشکر منصور خاندیس اور برہان پور سے گذر رہا تھا۔ تو اُس نے ملازمت کے لئے التماس کی تھی۔ حکم ہوا کہ سب طرح سے تمہاری خاطر جمع ہو۔ توجریدہ آؤ۔ اور چلے جاؤ۔ جس قدر جلد ممکن ہوا۔ حاضر حضور ہو کر قدمبوسی حاصل کی۔ انواع نوازش خسروانہ اور قسام عواطف شاہانہ سے سر عزت بلند ہوا۔ ہزار مُہر ہزار روپیہ نذر کروایا۔ کئی دن کے بعد پھر لکھتا ہے۔ کہ میں نے ایک سمند گھوڑے کا شمیر نام رکھا تھا۔ وہ میرے خاصہ کے گھوڑوں میں وّل درجہ پر تھا۔ خان خاناں کو عنایت کیا (اہل ہند کی اصطلاح میں سمیر سونے کا پہاڑ ہے)۔ میں نے رنگ اور قد آوری کے سبب سے یہ نام رکھا تھا۔ کئی دن کے بعد لکھتے ہیں۔ میں پوستین پہنے تھا۔ خان خاناں کو عنایت کیا۔ پھر کئی دن بعد لکھتے ہیں۔ آج خان خاناں کو خلعت خاصہ۔ کمر شمشیر مرصع۔ فیل خاصہ با تلائر طلائی۔ مع مادہ فیل عنایت کرکے پھر صوبہ خاندیس و دکن کی سند مرحمت کی منصب مع اصل و اضافہ کے ہفت ہزاری ذات و ہفت ہزار سوار مرحمت ہوا۔ امرا میں یہ رُتبہ اب تک کسی کو نہیں حاصل ہوا۔ لشکر خاں دیوان بیوتات سے اُس کی صحبت موافق نہ آتی تھی۔ اُس کی درخواست کے بموجب حامد خاں کو ساتھ کیا۔ اُسے بھی ہزاری ذات کا منصب۔ چار سو سوار اور فیل و خلعت عنایت ہوا ﴿

آزاد۔ دُنیا کے لوگ دولتمندی کی آرزو میں مرے جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ دولت کیا شے ہے؟ سب سے بڑی تندرستی دولت ہے۔ اولاد بھی ایک دولت ہے۔ علم و کمال بھی ایک دولت ہے۔ حکومت اور امارت بھی ایک دولت ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہی میں نقد و مال بھی ایک دولت ہے ان سب کے ساتھ خاطر جمع اور دل کا چین بھی ایک دولت ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہونگے۔ جنہیں بے درد زمانہ ساری دولتیں دے۔ اور پھر ایک وقت پر دغا نہ کر جائے ظالم ایک داغ ایسا دیتا ہے۔ کہ ساری نعمتیں خاک ہو جاتی ہیں۔ کمبخت خان خاناں کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ کہ ۱۰۲۸ھ میں اس کے جگر پر جوان بیٹے کا داغ دیا۔ دیکھنے والوں کے جگر کانپ گئے۔ اُس کے دل کو کوئی دیکھے۔ کہ کیا حال ہوا ہوگا۔ وہی مرزا ایرج جس کی دلداری نے اکبر سے بہادری کا خطاب لیا۔ جس کی جانفشانی نے جہانگیر سے شہنواز خانی کا خطاب پایا۔ جسے سب کہتے تھے کہ یہ دوسرا

خان خاناں ہے۔ اُس نے عین جوانی اور کامرانی میں شراب کے پیچھے اپنی جان کھوئی ؎

اے ذوق اتنا دختر رز کو نہ منہ لگا ۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اور دوسرے برس میں ایک اور داغ۔ وہ اگرچہ بخار سے گیا۔ لیکن اداے خدمت کے جوش میں بے اعتدالی کرکے خدمت کے حق سے ادا ہوا (دیکھو اُس کی اولاد کا حال) ۔

دردناک لطیفہ ۔ ایک شاعر کے پاس کوئی شخص آیا۔ اور آبدیدہ ہو کر کہا۔ کہ حضرت بیٹا مرگیا۔ تاریخ کہ دیجئے۔ روشن دماغ شاعر نے اُسی وقت سوچ کر کہا۔ داغِ جگر ۱۲۳۴۔ دوسرے برس وہی جگر کباب پھر آیا۔ کہ حضرت تاریخ کہ دیجئے۔ شاعر نے کہا چند روز ہوئے تم تاریخ لکھوا کر لے گئے تھے۔ اُس نے کہا حضرت ایک اور تھا وہ بھی مرگیا۔ شاعر نے کہا۔ اچھا داغِ دگر ۱۲۲۹۔ جہانگیر نے ان دونوں واقعوں کو اپنی توزک میں لکھا ہے۔ حرف حرف سے درد ٹپکتا ہے۔ (دیکھو تتمہ) ۔

خان خاناں کا ستارہ غروب ہوتا ہے

افسوس جس خان خاناں نے بہار کامرانی کا پھول رہ کر عمر گذاری تھی بڑھاپے میں وہ وقت آیا۔ کہ زمانے کے حادثے اُس پر بگولے باندھ باندھ کر حملے کرنے لگے۔ ۱۰۲۸ھ میں ایرج مرا تھا۔ دوسرے برس رحمٰن داد گیا۔ تیسرے برس تو ادبار نے ایک ایسا نحوست کا شبخون مارا۔ کہ اقبال میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر کر نہ دیکھا۔ میرے دوستو دُنیا بُرا مقام ہے۔ بے مروت زمانہ یہاں انسان کو کبھی ایسے موقع پر لا ڈالتا ہے۔ کہ دو ہی پہلو نظر آتے ہیں۔ دونو میں خطر۔ اور انجام کی خدا کو خبر۔ عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کرے۔ قسمت کے ہاتھ پانسہ ہوتا ہے۔ جس رُخ چاہے۔ پلٹ دے۔ سیدھا پڑا تو عقلمند ہیں۔ اُلٹا پڑا تو بچہ بچہ احمق بناتا ہے۔ اور جو نقصان۔ ندامت۔ مصیبت اور غم و اندوہ اس پر گذرتا ہے۔ وہ تو وہی جانتا ہے۔ پہلے اتنی بات سُن لو کہ جہانگیر کا بیٹا شاہجہان ایسا رشید اور سعادتمند بیٹا تھا۔ کہ تیغ و قلم کی بدولت اپنے جوہر قابلیت کی داد لیتا تھا۔ باوجود اس کے خوش اقبال جہانگیر بھی اس کے کارناموں پر باغ باغ ہوتا تھا۔ اور اپنی جانشینی کے لائق سمجھتا تھا۔ شاہجہان خطاب شاہانہ رُتبے دئے تھے۔ عالی منصب اُس کے نوکروں کو عطا کئے تھے۔ اکبر بھی جب تک جیتا رہا ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور ایسے الفاظ اُس کے حق میں کہتا تھا۔ جس سے بڑی بڑی امیدیں ہوتی تھیں۔ اپنی ذاتی لیاقت اور افواج کے علاوہ خان خاناں جیسا امیر اُس کا دد یا سُسرا تھا

آصف خاں وزیر کل بھی اُس کا خسر تھا۔

نورجہاں بیگم کا حال معلوم ہے۔ کہ کل سلطنت کی مالک تھیں۔ فقط خطبہ میں بیگم کا نام نہ تھا سکہ پر ضرب۔ فرمانوں پر مہر بھی بیگم کی ہوتی تھی۔ وہ بھی بڑی دُور اندیش اور باتدبیر بی بی تھی۔ جب دیکھا۔ کہ جہانگیر کی مستی اور مدہوشی سے مرض اُس پر ہاتھ ڈالنے لگے ہیں۔ تو ایسی تدبیریں سوچنے لگی۔ جس سے جہانگیر کے بعد بھی حکومت میں فرق نہ آئے۔ اُس کی ایک بیٹی شیر افگن خاں پہلے شوہر سے تھی۔ ۱۰۳۱ھ میں شاہزادے شہریار سے اُس کی شادی کر دی۔ اور اُس کی سلطنت کی بنیادیں ڈالنے لگی۔ بُنیاد اُس کی یہی تھی۔ کہ شاہجہان کی جڑ اکھیڑ دے۔ شہریار سب سے چھوٹا بیٹا جہانگیر کا تھا۔ مگر طبیعت عیش پسند تھی۔ اس واسطے خیالات پست رکھتا تھا۔ اور ساس کی بادشاہی نے رہا سہا کھو دیا تھا۔

۱۰۳۱ھ میں شاہجہاں دربار میں طلب ہوئے کہ مہم قندھار پر جا کر ملک موروثی کو دیر نگیں کریں۔ وہ خان خاناں اور داراب کو لے کر حاضر ہوئے۔ اور مصلحت مشورت ہو کر مہم مذکور اُن کے نام پر قرار پائی سے

ما در چہ خیال ایم و فلک در چہ خیال	کاریکہ خدا کند فلک را چہ مجال

آسمان نے اور ہی شطرنج بچھائی۔ بازی یہاں سے شروع ہوئی۔ کہ شاہجہان نے دھولپور کا علاقہ باپ سے مانگ لیا۔ جہانگیر نے عنایت کیا۔ بیگم نے وہی علاقہ شہریار کے لئے مانگا ہوا تھا۔ اور شریف الملک شہریار کی طرف سے اُس پر حاکم تھا۔ شاہجہانی ملازم وہاں قبضہ لینے گئے مختصر یہ ہے۔ کہ طرفین کے امیروں میں تلوار چل گئی۔ اور اس عالم میں شریف الملک کی آنکھ میں تیر لگا۔ کہ کانڑا ہو گیا۔ یہ حال دیکھ کر شہریار کا سارا لشکر بپھر گیا۔ اور ہنگامۂ عظیم برپا ہوا۔

شاہجہان نے افضل خاں اپنے دیوان کو بھیجا۔ نہایت عجز و انکسار کے پیام زبانی دئے اور عرضی لکھ کر عفو تقصیر کی التجا کی۔ کہ یہ آگ بجھ جائے۔ بیگم تو آگ اور کوئلہ ہو رہی تھیں یہاں آتے ہی افضل خاں قید ہو گیا۔ اور بادشاہ کو بہت سا لگا بجھا کر کہا کہ شاہجہان کا دماغ بہت بلند ہو گیا ہے۔ اُسے قرار واقعی نصیحت دینی چاہئے۔ مست الست بادشاہ نے اپنے عالم میں خدا جانے کچھ ہوں ہاں کر دی ہوگی۔ فوراً فوج کو تیاری کا حکم پہنچا اور امرا کو حکم گیا کہ شاہجہان کو گرفتار کر لاؤ۔

ادھر چند روز ہوئے تھے۔ کہ شاہ ایران نے قندھار لے لیا تھا۔ یہ مہم بھی شاہجہان کے نام

ہوئی تھی۔ اور کچھ شک نہیں۔ کہ اگر وہ بہادر اور بالیاقت شاہزادہ اپنے لوازم و سامان کے ساتھ جاتا تو قندھار کے علاوہ سمرقند و بخارا تک تلوار کی چمک پہنچاتا۔ وہ مہم بھی بیگم نے شہریار کے نام لے لی۔ بارہ ہزاری آٹھ ہزار سوار کا منصب دلوایا۔ جہانگیر کو بھی لاہور میں لے آئی۔ اور شہریار یہاں لشکر تیار کرنے لگا۔ شاہجہان کے دل پر چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ مگر چُپ۔ بڑے بڑے معتبر اور امیر سردار اس تہمت میں قید ہو گئے۔ کہ اُس سے ملے ہوئے ہیں۔ بہت سے جان سے مارے گئے۔ آصف خاں بیگم کا حقیقی بھائی تھا۔ مگر اس لحاظ سے کہ اُس کی بیٹی شاہجہان کی چاہیتی بیگم ہے۔ وہ بھی بے اعتبار ہو گیا۔ غرض یہاں تک آگ لگائی۔ کہ آخر شاہجہان جیسا سعادتمند فرمانبردار با اقبال بیٹا باپ سے باغی ہوا۔ مگر کچھ شک نہیں کہ مجبوراً باغی ہوا۔

بیگم جوڑ توڑ کی بادشاہ تھی۔ اُسے خبر تھی۔ کہ آصف خاں کی مہابت خاں سے لاگ ہے۔ بادشاہ سے کہا۔ کہ جب تک مہابت خاں سپہ سالار نہ ہوگا۔ مہم کا بندوبست نہ ہوگا۔ ادھر اُس نے کابل سے لکھا۔ اگر شاہجہان سے لڑنا ہے۔ تو پہلے آصف خاں کو نکالئے۔ جب تک وہ دربار میں ہیں۔ فدوی کچھ نہ کر سکیگا۔ آصف خاں فوراً بنگالہ بھیجے گئے۔ اور مہابت خاں سپہ سالاری کے نشان سے روانہ ہوئے۔ پیچھے پیچھے جہانگیر بھی لاہور سے آگرہ کی طرف چلے۔ امرا کی آپس میں عداوتیں تھیں۔ اُنہیں اب موقع ہاتھ آیا۔ جس کا جس پر وار چل گیا۔ نکلوایا۔ قید کروایا۔ مروا ڈالا۔ سازش کے جرم کے لئے ثبوت کی کچھ ضرورت ہی نہ تھی۔

دیکھو پُرانا بڈھا جس میں دو پُشت کے تجربے بھرے تھے۔ نرا لالچی نہ تھا۔ جو ذرا سا فائدہ دیکھ کر پھسل پڑے۔ اُس نے ہزاروں نشیب و فراز درباروں کے دیکھے تھے۔ اُس نے عقل کے پہلو لڑانے میں کچھ کمی نہ کی ہوگی۔ اُس نے ضرور خیال کیا ہوگا۔ کہ بادشاہ کی عقل کچھ تو شراب نے کھوئی۔ رہی سہی بیگم کی محبت میں گئی۔ میں قدیمی نمک خوار سلطنت کا ہوں مجھے کیا کرنا چاہیئے اُسی کے دل نے ضرور کہا ہوگا۔ کہ سلطنت کا مستحق کون؟ شاہجہان۔ متوالا باپ سلطنت کو بیگم کی محبت میں قربان کر کے بیٹے کو برباد کیا چاہتا ہے۔ اور نمک خوار کو اس وقت سلطنت کی حمایت واجب ہے۔ اُس کی رائے نے اس بات کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ شاہجہان سے اسوقت بگڑنا جہانگیری طرفداری نہیں۔ بیگم کی طرفداری ہے۔ اور سلطنت موروثی کی بربادی ہے۔

کیا خان خاناں سے ممکن نہ تھا۔ کہ دونو سے کنارہ کر جاتا؟ کیونکر ممکن تھا۔ جہانگیر نے شاہجہاں کی شادی شاہنواز خاں کی بیٹی سے کی تھی۔ اور آصف خاں نورجہاں کے بھائی کی بیٹی بھی شاہجہاں

نے عقد میں تھی۔ اس سے اصل مطلب یہی تھا۔ کہ ایسے ایسے ارکان دولت لیسے تعلق اُس کیساتھ رکھتے ہونگے۔ تو گھر کے جھگڑے اُسے حق سے محروم نہ کریں گے۔ تقدیر کی بات ہے کہ جو دن اُس نے اپنے بعد خیال کیا تھا۔ وہ جیتے جی سامنے آیا +

جب شاہجہان نے ہمراہی کی فرمائش کی ہوگی۔ تو خانخاناں نے اپنے اور جہانگیری تعلقات کا ضرور خیال کیا ہوگا۔ وہ بیگم سے بھی رسائی رکھتا تھا۔ اور ہم مذہب تھا۔ وہ سمجھا ہوگا۔ کہ باپ بیٹے کی تو کچھ لڑائی ہی نہیں۔ جو کھٹک ہے سوتیلی ماں کی ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے میں صفائی کروا دونگا۔ اور بے شک وہ کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔ رنگ بیرنگ دیکھتا گیا۔ اور کسی بات کا موقع نہ پایا۔ بیگم نے کام کو ایسا نہ بگاڑا تھا کہ افسون اصلاح کی کچھ بھی گنجائش رہی ہو۔ جس کو شاہجہان نے عرضداشت دے کر دربار میں بھیجا تھا وہ قید ہوگیا۔ یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ خان اعظم جس کا اکبر بھی لحاظ کرتا تھا۔ اُسے قلعہ گوالیار میں قید رہنا پڑا۔ ایسے نازک موقع پہلے اپنے لئے کیا بھروسہ تھا +

خان خاناں کے نمک خوار قدیم اور ملازم با اعتبار محمدؐ معصوم نے جہانگیر کے پاس مخبری کی۔ کہ امرائے دکن سے اُس کی سازش ہے۔ اور ملک عنبر کے خطوط جو اُس کے نام تھے وہ شیخ عبدالسلام لکھنوی کے پاس ہیں۔ جہانگیر نے مہابت خاں کو حکم دیا۔ اُس نے شیخ کو گرفتار کر لیا۔ حال پوچھا تو اُس نے بالکل انکار کیا۔ اُس غریب کو اتنا مارا کہ مر گیا مگر حرف مطلب نہ ہارا۔ خدا جانے کچھ تھا ہی نہیں یا رازداری کی۔ دونو طرح اُسے آفرین +

بہرصورت وہ اور داراب دکن سے شاہجہان کے ساتھ آئے۔ جہانگیر کو دیکھو کس درد سے لکھتا ہے۔ جب خان خاناں جیسے امیر نے کہ میری اتالیقی کے منصب عالی سے خصوصیت رکھتا تھا۔ ستر برس کی عمر میں بغاوت اور کافر نعمتی سے مُنہ کالا کیا۔ تو اوروں سے کیا گلہ۔ گو ایسی ہی زشت بغاوت اور کفران نعمت سے اُس کے باپ نے آخر عمر میں میرے پدر بزرگوار سے بھی یہی شیوہ ناپسندیدہ برتا تھا۔ اُس نے باپ کی پیروی کر کے اس عمر میں اپنے تئیں ازل سے ابد تک مطعون اور مردود کیا +

گرچہ با آدمی بزرگ شود	عاقبت گرگ زادہ گرگ شود

بیگم نے شاہزادہ مراد کو سپاہ جرار دے کر بھائی کے مقابلے پر بھیجا۔ مہابت خاں کو سپہ سالار کیا۔ واہ ری بیگم تیری عقل دور اندیش۔ دونو بھائیوں میں جو مارا جائے شہریار کیلئے ایک پہلو

صاف ہو سکے ۔

غرض جب دونو لشکر جرّار قریب پہنچے۔ تو ایک ایک حصّہ دونو پہاڑوں میں سے الگ ہو کر ٹکرایا۔ بڑا کشت و خون ہوا۔ بڑے بڑے امیر مارے گئے۔ اور بہت سے غیرت والے ننگ و ناموس پر جان دے کر دُنیا سے ناکام گئے۔ مگر شکست شاہجہان کی فوج کو نصیب ہوئی اور وہ اپنے لشکر کو لے کر کنارے ہٹا۔ کہ دکن کو چلا جائے۔ اِس موقعہ پر بدگمانی اور نیک نیتی کا مقابلہ ہے کہ، خان خاناں یا تو اپنی نیک نیتی سے صلح کی تدبیر کرتا تھا۔ یا انتہائے درجہ کی چالاکی تھی۔ کہ جہانگیر سے بھی سرخرو رہنا چاہتا تھا۔ مہابت خاں سپہ سالار سے اُس نے پیغام سلام کئے عجب مشکل مقام ہے۔ ذرا خیال کرو۔ باپ بیٹوں کا بگاڑ۔ وہ بھی سوتیلی ماں کی غرض پرستی اور متوالے باپ کی مدہوشی سے سرداران لشکر آٹھ پہر ایک جگہ رہنے سہنے والے۔ ایک قاب میں کھانے والے۔ ایک جام میں پینے والے۔ ان میں پیغام کیونکر بند ہو سکے۔ مشکل یہ ہوئی۔ کہ اس معاملہ میں چالاک سپہ سالار کے دریائے طبع نے انشاپردازی کی موج ماری۔ اپنے ہاتھ سے خط لکھا۔ اور بادشاہ کی ہوا خواہی کے مضمون لکھ کر اس میں یہ شعر بھی لکھا ؎

صد کس بہ نظر نگاہ مے دارندم	ورنہ بپریدمے زبے آرامی

یہ خط کسی نے پکڑ کر شاہجہان کو دے دیا۔ اُس نے اُنہیں بُلا کر خلوت میں دکھایا جواب کیا تھا؟ چپ شرمندہ۔ آخر بیٹوں سمیت دولت خانہ کے پاس نظر بند ہوئے۔ اور اتفاق یہ کہ سؤ ہی منصبداروں کو اُن کی حفاظت سپرد ہوئی۔ آسیر پہنچ کر سید مظفر بارہہ کے سپرد کیا کہ قلعہ میں لے جا کر قید کرو۔ لیکن داراب بے گناہ تھا۔ اس لئے سوچ سمجھ کر دونو کو رہا کر دیا۔

بادشاہ نے شاہزادہ پرویز کو بھی امرا کے ساتھ فوجیں دے کر بھیجا تھا۔ وہ دریائے نربدا پر جا کر تھم گیا۔ کیونکہ شاہجہاں کے سرداروں نے گھاٹوں کا خوب بندوبست کر رکھا تھا۔ یہ بھی ساتھ تھے۔ اور یہ کوئی مجرم قیدی نہ تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں تھے۔ دیکھنے کو نظر بند تھے۔ مگر صحبت میں بھی شامل ہوتے تھے۔ ہوا خواہی اور خیراندیشی کی اصلاحیں کرتے تھے جن کا خلاصہ ایسے مطالب تھے۔ جن سے فتنہ و فساد کی راہ بند ہو اور کامیابی کے ساتھ صلح کے رستے نکلیں۔

اُدھر سے جب مہابت خاں اور پرویز دریا کے کنارے پہنچے۔ سامنے شاہجہاں کا لشکر نظر آیا۔ دیکھا کہ گھاٹوں کا انتظام بہت چُست ہے۔ اور دریا کا چڑھاؤ اسے زور شور سے مدد دے رہا ہے کشتیاں سب پار کے کنارے پر کھینچ لے گئے۔ اور مورچے توپ و تفنگ سے سدّ سکندر

کئے۔ لشکر کے ڈیرے ڈلوا دئے۔ اور بندوبست میں مصروف ہوئے۔ مہابت خاں نے ایک جعلسازی اور دوست نمائی کا خط خانخاناں کے نام لکھا۔ اور اس طرح بھیجا کہ شاہجہان کے ہاتھ میں جا پہنچا۔
خلاصۂ خط مہابت خاں عالم جانتا ہے کہ شہزادہ جہاں و جہانیان کو اطاعت حضور کے سوا اور کچھ بات منظور نہیں۔ فتنہ پرداز اور دورانداز عنقریب اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ میں مجبور ہوں۔ آ نہیں سکتا مگر ملک کی حالت دیکھ کر افسوس آتا ہے۔ کہ اس کی اصلاح اور خلق خدا کے امن و آسائش میں جان سے حاضر ہوں۔ اور اس بات کو اپنا اور کُل مسلمانوں کا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر تم شہزادہ بلند اقبال کو یہ مطالب منقوش خاطر کر کے ایک دو معتبر معاملہ فہم شخصوں کو بھیج دو۔ تو عین مصلحت ہے۔ کہ باہم گفتگو کر کے ایسی تدبیر نکالیں جس میں یہ آگ بجھ جائے اور خونریزی موقوف ہو۔ باپ بیٹے پھر ایک کے ایک ہو جائیں۔ شہزادہ کی جاگیر کی کچھ ترقی ہو جائے۔ اور نور محل شرمندہ ہو کر ہماری تجویز پر راضی ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور ایسی ایسی چند باتیں قول و قسم اور عہد و پیمان کے ساتھ لکھیں۔ اِس پر کلام الٰہی کو درمیان دیا۔ اور خط کو ملفوف کر کے ادھر کی ہوا میں اس طرح اُڑایا۔ کہ شاہجہان کے دامن میں جا پڑا۔ وہ خود امن وامان کا عاشق تھا۔ مصاحبوں سے صلاح کی۔ خان خاناں سے بھی گفتگو ہوئی۔ یہ پہلے ہی ان مضامین کے شاعر تھے۔ شہزادہ کو اس کام کے لئے ان سے بہتر رسا اور معاملہ فہم کوئی نظر نہ آتا تھا۔ قرآن سامنے رکھ کر قسمیں لیں۔ داراب کو ساتھ اور عیال کو اپنے پاس رکھا۔ اور انہیں روانہ کیا۔ کہ جا کر دریا کا بہاؤ اور ہوا کا رُخ پھیر دو۔ دریا کے اس پار رہو۔ اور طرفین کی صلاحیت پر صُلح قرار دو۔

خان خاناں شطرنج زمانہ کے پکے چالباز تھے۔ مگر خود بڈھے ہو گئے تھے عقل بڑھیا ہو گئی تھی۔ مہابت خاں جوان اُن کی عقل جوان۔ جب یہ لشکر بادشاہی میں پہنچے۔ اُن کے اعزاز و احترام میں بڑے مبالغے ہوئے۔ خلوت میں ایسی دلسوزی اور دردخواہی کی باتیں کیں کہ انہوں نے خوشی خوشی کامیابی مقاصد کے پیام اور اطمینان کے مراسلے شاہجہان کو لکھنے شروع کئے۔ اُس کے امرا کو جب یہ خبر ہوئی۔ تو وہ بھی خوش ہوئے۔ اور غلطی کی کہ گھاٹوں کے انتظام اور کناروں کے بندوبست ڈھیلے کر دئے۔

مہابت خاں عجیب چلتا پُرزہ نکلا۔ اُس نے چپکے چپکے راتوں رات فوج پار اُتار دی۔ اب خدا جانے اُس نے دردخواہی اور نیک نیتی کا ہرا باغ دکھا کر اُنہیں غفلت کی دارو بے ہوشی پلائی یا لالچ کا دسترخوان بچھا کر۔ باتیں ایسی چکنی چپڑی کیں۔ کہ یہ قرآن کو نگل کر اُس سے مل گئے۔

بہرحال شاہجہان کا کام بگڑ گیا۔ وہ دل شکستہ نہایت ناکامی کے عالم میں پیچھے ہٹا۔ اور اس اضطراب کے ساتھ دریائے تاپتی سے پار اُترا کہ فوج اور سامان فوج کا بہت نقصان ہوا۔ اکثر امیر ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔

داراب اور بعض عیال شاہجہان کے پاس تھے۔ یہ لشکر بادشاہی میں اُدھر پڑے تھے۔ اب مہابت خاں سے موافقت کرنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ اُس کے ساتھ برہانپور پہنچے۔ مگر سب اِن کی طرف سے ہوشیار ہی رہتے تھے۔ صلاح ہوئی کہ نظر بند رکھو اور اِن کا خیمہ پرویز کے ساتھ طناب بہ طناب رہے۔ اِس سے مطلب یہ تھا۔ کہ جو کچھ کریں حال معلوم ہوتا رہے۔ مہابت خاں برہانپور میں پہنچ کر نہ ٹھیرا۔ دریائے تاپتی اُتر کر تھوڑی دُور تعاقب کیا۔ اور وُہ دکن سے بنگالہ کی طرف روانہ ہوا۔

جانا بیگم باپ کے ساتھ تھیں۔ اِنھوں نے جو ہمت و حکمت کے سبق اِن سے پڑھے تھے۔ حرف بحرف یاد کر رکھے تھے۔ اُس نے کہا کہ میں باپ کو نہ چھوڑونگی۔ جو اس کا حال سو میرا حال۔ وہ بھی انیال شہزادہ کی بیوہ تھی۔ اُس کے بچے ساتھ تھے۔ اُسے کون روک سکے۔ آخر باپ کے پاس خیمہ میں رہی فہیم اِن کا غلام خاص کہ فی الحقیقت فہیم اور کاردان بے نظیر تھا۔ اسے دلاوری نے دُودھ پلایا تھا۔ اور شجاعت کے نمک سے پلا تھا۔ جس طرح اِس معرکہ میں مارا گیا۔ اِس کا رنج خانخاناں ہی کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ شاہجہان کو جب یہ خبریں پہنچیں۔ اُن کے بال بچوں کو قید کر لیا۔ اور حفاظت راجہ بھیم کے سپرد کی (راجہ بھیم رانا کا بیٹا تھا)۔ اِدھر خانخاناں کو یہ حال سُن کر بہت رنج ہوا۔ اور راجہ کو پیغام بھیجا کہ میرے عیال کو چھوڑ دو۔ میں لشکر بادشاہی کو اِدھر سے کچھ نہ کچھ حکمت عملی کر کے پھیر دیتا ہوں۔ اگر یہی حال ہے تو سمجھ لو کہ کام مشکل ہوگا۔ میں خود آکر چھڑا لے جاؤنگا۔ راجہ نے لکھا کہ ابھی تک پانچ چھ ہزار جان نثار رکاب میں موجود ہیں۔ اگر تم چڑھ کر آئے۔ تو پہلے تمھارے بال بچوں کو قتل کریں گے۔ پھر تم پر آن پڑینگے۔ یا تم نہیں یا ہم نہیں۔

شاہجہان کے لشکر بادشاہی سے معرکے بھی ہوئے۔ اور بڑے بڑے کشت و خون ہوئے افسوس اپنی فوجیں آپس میں کٹ کر کھیت رہیں۔ اور دلاور سردار اور ہمت والے امیر مفت جان سے گئے۔ شاہجہان لڑتے بھڑتے کبھی کنارہ اور کبھی پیچھے ہٹتے اوپر اوپر بنگالہ میں جا نکلے یہاں داراب سے قول و قسم لے کر بنگالہ کی حکومت دی۔ اُس کی بی بی بیٹے۔ بیٹی اور ایک شاہ نواز خاں کے بیٹے کو یرغمال میں لے لیا۔ اور آپ بہار کو روانہ ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد داراب کو بُلا بھیجا۔ اُس نے

لکھا کہ زمینداروں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ حاضر نہیں ہو سکتا۔ شاہجہان کی فوج برباد ہو چکی تھی۔ عدل شکستہ جس رستے آیا تھا۔ اُسی رستے دکن کو پھرا۔ خیال ہُوا کہ یہ بھی بادشاہ سے مل گیا۔ اُنکے جوان بیٹے اور بھتیجے کو مار ڈالا۔ داراب یہاں بے دست و پا ہو گیا تھا۔ بادشاہی لشکر نے آکر ملک پر قبضہ کر لیا۔ داراب سلطان پرویز کے لشکر میں حاضر ہوا۔ جہانگیر کا حکم پہنچا۔ کہ داراب کا سر کاٹ کر بھیج دو۔ افسوس اس سر کو ایک خوان میں کھانے کی طرح کسوا کر بدنصیب باپ کے پاس بھیج دیا۔ اللہ اکبر جس خانخاناں کے سامنے کسی کو مجال نہ ہوتی تھی۔ کہ رحمٰن داد کے مرنے کا نام زبان سے نکالے چُپ بیٹھا تھا۔ اور آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ مہابت خاں کے یزیدیوں نے بموجب اُس کے حکم کے کہا کہ حضور نے یہ تربوز بھیجا ہے۔ خونی جگر باپ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ درست! شہیدی ہے۔ کہنے والوں نے تاریخ کہی ہے

شہید پاک شد داراب مسکین

افسوس کے قابل تو یہ بات ہے۔ کہ وہ جانباز دلاور جن کی عمریں اور کئی کئی پشتیں اس سلطنت میں جاں نثاری اور وفاداری کی مشق کر رہی تھیں مفت ضائع ہوئیں۔ اگر شاہجہاں کے ساتھ قندھار پر جاتے تو کارنامے دکھاتے۔ اُذبک پر جاتے تو ملک موروثی کو چھڑاتے۔ اور ہندوستان کا نام توران میں روشن کر کے آتے۔ اور حیف کہ اپنے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے جدا ہوئے۔ اور اپنے سر اپنے ہاتھوں سے کٹے۔ اپنی چھری سے اپنے پیٹ چاک ہوئے۔ یہ کیونکر؟ بیگم صاحبہ کی خودغرضی اور خود پرستی کی بدولت۔ بیشک کہ بیگم کو بھی ایک لعل بے بہا تاج سلطنت کا کہنا زیبا ہے۔ عقل۔ تدبیر۔ ہمت۔ سخاوت۔ قدردانی فیض رسانی میں ثانی نہ رکھتی تھیں۔ لیکن کیا کیجئے۔ جو بات ہوتی ہے۔ وہی کہی جاتی ہے۔ چند روز کے بعد شاہ اور شاہزادہ دونو باپ بیٹے جیسے تھے۔ ویسے ہی ہو گئے۔ امرا بیچارے شرمندہ حیران کہ کہاں جائیں اور کیا مُنہ لے کر جائیں۔ مگر اس گھر کے سوا اور گھر کون سا تھا۔

۱۰۳۶ھ میں خان خاناں حضور میں طلب ہوئے۔ مہابت خاں نے جب رخصت کیا۔ تو بوجہ معاملے درمیان آئے تھے۔ اِن کا بہت عذر کیا۔ اور سامان سفر اور لوازم ضروری کے سرانجام میں وہ ہمت عالی دکھائی۔ جو خان خاناں کی شان کے لائق تھی۔ مطلب یہ تھا کہ آیندہ کیلئے صفائی ہو جائے۔ اور اِن کے دل میں میری طرف سے غبار نہ رہے۔ یہ جب دربار میں آئے تو جہانگیر خود تو زک میں لکھتا ہے۔ ندامت کی پیشانی کو دیر تک زمین پر رکھے رہا۔ سر نہ اُٹھایا۔ میں نے

کہا۔ جو کچھ وقوع میں آیا تقدیر کی باتیں ہیں۔ نہ تمہارے اختیار کی باتیں ہیں۔ نہ ہمارے۔ اِس کے سبب سے ملامت اور خجالت دل پر نہ لاؤ۔ ہم اپنے تئیں تم سے زیادہ شرمندہ پاتے ہیں۔ جو کچھ ظہور میں آیا۔ تقدیر کے اتفاق ہیں۔ ہمارے تمہارے اختیار کی بات نہیں"۔

ارکان دولت کو حکم ہوا کہ انہیں لے جا کر اُتارو۔ کئی دن کے بعد لاکھ روپیہ انعام دیا۔ کہ اسے اپنی درستی احوال میں صرف کرو۔ چند روز کے بعد صوبہ قنوج عطا ہوا۔ اور خان خاناں کا خطاب جو اُس سے چھین کر مہابت خاں کو ملا تھا پھر انہیں مل گیا۔ اِنہوں نے شکریہ میں یہ شعر کہہ کر مُہر میں کھُدوایا ؎

مرا لطف جہانگیری بتائیدات یزدانی	دوبارہ زندگی داد و دوباز خانخانانی

دوسرے ہی برس میں پانسہ پلٹا ؎

زالِ دُنیا نے صلح کی کس دن	یہ لڑاکا سدا سے لڑتی ہے

بیگم کی مہابت خاں سے بگڑی۔ فرمان گیا کہ حاضر ہو۔ اور اپنی جاگیر اور فوج وغیرہ کا حساب کتاب سمجھا دو۔ بادشاہ لاہور سے گلگشت کشمیر کو چلے جاتے تھے۔ وہ ہندوستان کی طرف سے آیا۔ چھ ہزار تلوار مار راجپوت اس کے ساتھ۔ لاہور ہوتا ہوا حضور میں چلا۔ مگر تیور بگڑے اور غصہ میں بھرا ہوا۔ خانخاناں یہاں موجود تھے۔ زمانہ کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ سمجھ گئے کہ آندھی آئی ہے۔ خوب خاک اُڑے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ چھ ہزار کی حقیقت کیا ہے جس پر یہ جاہل افغان کودتا ہے (یہ جان نثار اُسکے ذاتی نوکر تھے)۔ یہ ضرور بگڑ بیٹھیگا۔ مگر آخر کو خود بگڑ جائے گا۔ کیونکہ بنیاد نہیں۔ آخر بازی بیگم کے ہاتھ رہیگی۔ خلاصہ یہ کہ اُنکی ملاقات کو نہ گئے۔ بلکہ مزاج پُرسی کو وکیل بھی نہ بھیجا۔ اُسکا بھی سب طرف خیال تھا۔ سمجھ گیا کہ خانخاناں ہیں۔ اور کدورت بھی دکھادی ہے۔ خدا جانے وہاں کے معرکے کا پہلو کسطرف آن پڑے۔ یہ پیچھے سے آگرے تو اور مشکل ہوگی۔ چنانچہ جب کنارہ جہلم پر پہنچکر بادشاہ کو قید کیا۔ اُسیوقت آدمی بھیجے کہ خانخاناں کو حفاظت کیساتھ دِلّی پہنچادو۔ اطاعت کے سوا چارہ کیا تھا۔ چُپ دِلّی چلے گئے۔ وہاں سے ارادہ کیا کہ اپنی جاگیر کو جائیں۔ وہ پھر بدگمان ہوا اور رستہ سے بُلوا لیا۔ کہ لاہور میں بیٹھو۔ وہاں جا کر جو کچھ مہابت خاں نے کیا۔ خواہ نمک حرامی کہو خواہ یہ سمجھو کہ ایک مست مدہوش کے گھر کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال جو حرکت اِس نے کی۔ شاید کسی نمکوار امیر سے ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ بادشاہ اور بیگم دونوں کو الگ الگ قید کر لیا۔ بیگم کی دانائی اور حکمت عملی سے آہستہ آہستہ اُس کا طوفان دھیما ہوا۔ آخر یہ کہ بھاگا۔ خان خاناں کا دل اُس

کے زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ بڑی التجا و تمنّا سے عرضی بھیجی۔ کہ اِس نمکحرام کے استیصال کی خدمت مجھے مرحمت ہو۔ بیگم نے اُس کی جاگیر خانخاناں کی تنخواہ میں مرحمت کی ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار۔ دو اسپہ سہ اسپہ خلعت اور شمشیر مرصع۔ گھوڑا با زین مرصع۔ فیل خاصہ اور بارہ لاکھ روپیہ نقد اور گھوڑے۔ اونٹ۔ بہت سامان عنایت کیا۔ اجمیر کا صوبہ بھی مرحمت کیا۔ امرا فوجیں دیکر ساتھ کئے۔ بہتر برس کا بڈھا اس پر قیامت کے صدمے گذر چکے تھے۔ طاقت نے بیوفائی کی۔ لاہور ہی میں بیمار ہو گئے۔ دہلی میں پہنچ کر ضعف غالب ہوا۔ اواسط ۱۰۳۶ھ میں دُنیا سے انتقال کیا۔ اور ہمایوں کے مقبرہ کے پاس دفن ہوئے۔ تاریخ ہوئی۔ خان سپہ سالار کو۔ تمام اہل تاریخ باپ کی طرح اس کا ذکر بھی خوبیوں سے لکھتے ہیں۔ اور محبوبیاں اس پر طرہ ہیں +

جہانگیر نے اس کے واقعہ کے موقع پر توزک میں نہایت افسوس کے ساتھ خدمتوں کے بعض کارنامے مختصر اشاروں میں بیان کئے ہیں۔ اور شاہنواز کے جوہر شجاعت کو بھی ظاہر کیا ہے۔ اخیر میں لکھتا ہے۔ کہ خانخاناں قابلیت و استعداد میں یکتائے روزگار تھا۔ زبان عربی۔ ترکی۔ فارسی۔ ہندی جانتا تھا۔ اقسام دانش عقلی و نقلی یہاں تک کہ ہندی علوم سے بھی بہرہ وافی رکھتا تھا۔ شجاعت اور شہامت اور سرداری میں نشان بلکہ نشان قدرت آلہی کا تھا۔ فارسی و ہندی میں خوب شعر کہتا تھا۔ حضرت عرش آشیانی کے حکم سے واقعات بابری کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ کبھی کوئی شعر اور کبھی کوئی رباعی اور غزل بھی کہتا تھا۔ اور نمونہ کے طور پر چند است۔ آرزومند است۔ کے قافیہ کی غزل اور ایک رُباعی بھی لکھی ہے +

نظام الدین بخشی نے طبقات ناصری کے آخر میں امراے عہد کے حالات مختصر مختصر درج کئے ہیں۔ اِس کا ترجمہ لکھتا ہوں +

اِس وقت خانخاناں کی ۳۷ برس کی عمر ہے۔ آج دس برس ہوئے۔ کہ منصب خانخانی اور سپہ سالاری کو پہنچا ہے۔ عالی خدمتیں اور عظیم فتحیں کی ہیں۔ فہم و دانش اور علم و کمالات اُس بزرگ نہاد کے جتنے لکھیں۔ سَو میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑے ہیں شفقت عالم علما و فضلا کی تربیت۔ فقرا کی محبت اور طبع نظم اس نے میراث پائی ہے۔ فضائل و کمالات انسانی میں آج اس کا نظیر امراے دربار میں نہیں ہے +

اکثر باتیں تھیں۔ کہ اُن کے خاندان کے لئے خاص تھیں۔ اِن میں سے اکثر خود اُنکی طبیعت کے عمدہ ایجاد تھے۔ اور بعض بادشاہی خصوصیت کی مہر رکھتے تھے۔ دوسرے کو وہ رتبہ حاصل نہ

تھا۔ مثلاً پرِ ہُما کہ اُس کی کلغی بادشاہ اور شہزادوں کے سوا کوئی امیر نہ لگا سکتا تھا۔ اِن کو اور اُن کے خاندان کو اجازت تھی ✦

خان خاناں کا مذہب

صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں۔ کہ وہ اپنا مذہب سنت و جماعت ظاہر کرتے تھے لوگ کہتے تھے کہ شیعہ ہیں تقیہ کرتے ہیں مگر اس میں شک نہیں۔ کہ فیض ان کا شیعہ سُنی سب کو برابر پہنچتا تھا کسی مذہب کیلئے خاص نہ تھا۔ البتہ بیٹے ایسی تعصب کی باتیں کرتے تھے جس سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ سنت جماعت مذہب رکھتے ہیں۔ خان خاناں علے العموم احکام شریعت کو مانتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا اُن کی پابندی بھی کرتے تھے لیکن دربار کے دور میں گھر جاتے تو شراب بھی پی لیتے تھے۔ جس مقام پر کہ خان خاناں کو مہم دکن اور قندھار وغیرہ کے لئے خاندیس سے بُلایا اور وہ یلغار (ڈاک کی چوکی بٹھا کر) کرکے آیا۔ یہاں خلوتوں میں جلسہ ہائے مشورہ ہوئے۔ ایک شب کہ خانخاناں اور مان سنگھ وغیرہ امراے خاص کو جمع کیا تھا۔ اِسکے بیان میں مُلا صاحب کیا مزے سے چٹکی لیتے ہیں تا اسی جلسہ میں کہ شب عاشورے الٰہی تھی۔ ساقی نے جام بادشاہ کے سامنے کیا۔ انھوں نے خانخاناں کو دیا۔ ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ مگر یہ تو کہیں کہ زمانہ کیا تھا۔ جن صحبتوں میں صدر الشریعت اور مُفتی اسلام۔ کل ممالک محروسہ ہندوستان کا خود مانگ کر جام لے وہاں خانخاناں بادشاہ کا دیا ہوا جام لیکر نہ پی جائے تو کیا کرے۔ یہ بیچارہ تو ایک ترک بچہ سپاہی زادہ تھا ✦

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے	زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

اور حق پوچھو تو اکبر بھی زاہدان پارسا سے بے جا بیزار نہ تھا۔ اُنھوں نے اس کے استیصال سلطنت میں کیا کسر رکھی تھی ✦

اخلاق اور طبعی عادات

آشنائی اور آشنا پرستی میں اعجوبۂ روزگار تھے۔ خوش مزاج۔ خوش اخلاق اور صحبت میں نہایت گرم جوش۔ اپنے دلرُبا اور دلفریب کلام سے یگانہ دبیگانہ کو غلام بنا لیتے تھے۔ باتوں باتوں میں کانوں کے رستہ سے دل میں اُتر جاتے تھے۔ شیریں کلام لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ اور نہایت طرار و فرار تھے۔ دربار اور عدالتہائے بادشاہی کی خبروں کا بڑا خیال تھا۔ مگر حق پوچھو تو علے العموم اخبار واقعات کے

عاشق تھے۔ کئی شخص دارالخلافہ میں نوکر تھے۔ کہ دن رات کے حالات برابر ڈاک چوکی میں بھیجے جاتے تھے۔ عدالت خانے۔ کچہریاں۔ چوکی چبوترہ۔ یہاں تک کہ چوک اور کوچہ و بازار میں بھی جو کچھ سُنتے تھے لکھ بھیجتے تھے۔ خانخاناں رات کو بیٹھ کر سب کو پڑھتے تھے۔ اور جلا دیتے تھے ؞

بادشاہی یا اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی طرف رجوع کرنے میں اپنے عالی مرتبہ کا خیال نہ رکھتے تھے۔ وہ دشمنوں سے بھی بگاڑتے نہ تھے۔ مگر موقع پاتے تو چوکتے بھی نہ تھے۔ ایسا ہاتھ مارتے تھے کہ قلم ہی کر دیتے تھے۔ اِن باتوں کے سبب سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک زمانہ ساز آدمی تھے۔ اور یہ مقولہ اُن کا اصول تدبیر تھا۔ کہ دشمن[1] کو دوست بن کر مارنا چاہئے۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ وہ ترقی مدارج اور جاہ و دولت کے ہر وقت محتاج تھے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے شجاعت۔ سخاوت۔ دانش و تدبیر بندوبست جنگی و ملکی میں افسر تھے۔ مختلف وقتوں میں تیس برس تک دکن میں بسر کئے۔ اور اِس طرح کئے کہ سلاطین اور امرائے دکن کو اپنی رسائی کے وسیلے اطاعت و اخلاص کے پھندوں میں پھانسے رکھا۔ جو شاہزادہ یا امیر دربارِ شاہی سے جاتا تھا۔ یہی کہتا تھا۔ کہ یہ غنیم سے ملے ہوئے ہیں۔ دولت چغتائی کے امرائے عظیم الشان میں سے تھا۔ اِس کے نام نامی نے صفحۂ شہرت پر نقش دوام پایا ہے۔ مطالب مذکورہ کے بعد مآثر الامرا میں ایک شعر بھی لکھا ہے۔ جو کسی حریف یا حریفوں کے خوشامدی نے کہا تھا ؎

مشتکے استخوان و صد مشکل	یک وجب قد و صد گرہ در دل

آزاد۔ ہائے ہائے۔ بیرحم دُنیا۔ اور حیف بے درد اہلِ دُنیا۔ گڑھوں کے بسنے والے موریوں کے سڑنے والے بادشاہی محلوں کے رہنے والوں پر باتیں بناتے ہیں۔ اُنہیں کیا خبر ہے۔ کہ اُس شاہ نشان امیر کو کیا کیا نازک موقع اور پیچیدہ معاملے پیش آتے تھے۔ اور وہ سلطنت کی مہموں کو حکمت کے ہاتھوں سے کس طرح سنبھالتا تھا۔ کمینی نجس اور ناپاک دُنیا۔ اس کی آبادی شور و شر کا میلا ہے تمام بدنیت۔ بداندیش۔ بدکردار۔ ظاہر کچھ باطن کچھ۔ دل میں دغا۔ زبان پر قسمیں۔ اس پر بےلیاقت آپ کچھ بھی نہیں کرتے۔ بلکہ کچھ کر نہیں سکتے۔ اس پر لیاقت والوں اور کرنے والوں کو دیکھ نہیں سکتے۔ اِن کی جانفشان محنتوں کو مٹا کر بھی صبر نہیں کرتے۔ بلکہ اس کی اُجرت کے خود مستحق بنتے تھے۔ ایسے نااہلوں کے مقابل میں اِنسان ویسا ہی نہ بن جائے تو کیونکر بسر کر سکے حکیم یونان نے کیا خوب کہا ہے (انسان کے نیک رہنے کیلئے ضرور ہے۔ کہ اس کے ہم معاملہ بھی

[1] با دشمن در لباس دوستی دشمنی نمودہ آید ؞

نیک ہوں۔ ورنہ اس کی نیکی نہیں نبھ سکتی! بیشک بالکل درست کہا۔ اگر یہ اپنی ذات سے نیک رہے۔ تو بدنیت شیطان اس کے کپڑے بلکہ کھال تک نوچ کر لے جائیں۔ اس لئے واجب ہے کہ بے ایمانوں کے ساتھ ان سے زیادہ بے ایمان بنے ❖

خان خاناں نام کو ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ مگر ملکوں میں خود اختیار سلطنت کرتا تھا۔ صدہا ہزاریوں سے اس کے معاملے پڑتے تھے۔ اس طرح کام نہ نکالتا تو ملکداری کیونکر چلتی۔ ایسے نامردوں سے اس طرح جان نہ بچاتا تو کیونکر بچتا۔ انبوہ در انبوہ منافقوں کو اس پیچ سے نہ مارتا تو خود کیونکر جیتا۔ ضرور مارا جاتا۔ کاغذوں پر بیٹھ کر لکھنا اور بات ہے اور مہموں کا سر کرنا اور سلطنتوں کا عمل درآمد کرنا اور بات ہے۔ وہی تھا۔ کہ سب کچھ کر گیا اور نیکی لے گیا۔ اور نام نیک یادگار چھوڑ گیا۔ اسوقت بہتیرے امیر تھے۔ اور آج تک بہتیرے ہوئے کسی کی تاریخ زندگی میں اس کے کارناموں کا پاسنگ تو دکھادو ❖

استعداد علمی اور تصنیفات

استعداد علمی کے باب میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ عربی زبان بہت خوب سمجھتا تھا۔ اور بولتا تھا۔ فارسی اور ترکی اس کے گھر کی زبان تھی۔ گو نانا دیوہ ہندی ہوگیا تھا۔ مگر سارا گھربار اور نوکر چاکر ترک اور ایرانی تھے۔ خود ہمہ گیر طبیعت رکھتا تھا۔ میں نے اس کی اکثر عرضیاں بادشاہ اور شاہزادوں کے نام اکثر مراسلے احباب و امرا کے نام اکثر خط مرزا ایرج وغیرہ بیٹوں کے نام دیکھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ فارسی کا عمدہ انشا پرداز تھا۔ اس زمانہ کے لوگ اپنے بزرگوں کی ہر بات کی خصوصاً زبان کی بڑی حفاظت کرتے تھے اور بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ وقت ترک تھا۔ جہانگیر اپنے بچپن کے حال میں لکھتا ہے۔ میرے باپ کو بڑا خیال تھا۔ کہ مجھے ترکی زبان آئے۔ اس واسطے پھوپھی کے سپرد کیا تھا۔ کہ اس سے ترکی ہی بولا کرو اور ترکی ہی بلوایا کرو ❖

مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ خان خاناں عربی فارسی ترکی میں رواں تھا۔ اور اکثر زبانیں جو عالم میں رائج ہیں۔ اُن میں گفتگو کرتا تھا ❖

(۱) **توزک بابری** ترکی میں تھی۔ اکبر کے حکم سے ترجمہ کر کے ۹۹۸ھ میں نذر گزرانی۔ اور تحسین آفرین کے بہت پھول سمیٹے۔ اس کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔ اور بابر کے خیالوں کو نہایت صفائی سے ادا کیا ہے۔ مگر عجب ہے کہ اُس عالی دماغ امیر الامرا نے خود آنکھوں کا تیل نکالا ہوگا

نہ چراغ کا دھواں کھایا ہوگا۔ مفت خور ملاّنے بہت ساتھ رہتے تھے۔ کسی سے کہدیا ہوگا۔ ایک دو اذیک ساتھ کردیئے ہونگے۔ سب مل جل کر لکھتے ہونگے۔ آپ سُنا کرتا ہوگا۔ ہدائتیں کرتا جاتا ہوگا۔ جب اِس خوبی اور خوش ادائی کیساتھ یہ نسخہ تیار ہُوا۔ مولوی ملاّنوں سے کیا ہوتا تھا ؎

عشق و جنوں[1] کی راہیں اہل وفا سے پوچھو	کیا جانیں شیخ صاحب ملاّنے آدمی ہیں!

(۲) اکبر کا عہد گویا نئی روشنی کا زمانہ تھا۔ اُس نے علم سنسکرت بھی حاصل کیا۔ جوتش میں اِس کی مثنوی ہے۔ ایک مصرع فارسی ایک سنسکرت ؎

(۳) فارسی میں دیوان نہیں ہے۔ متفرق غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ مگر جو کچھ بھی خوب ہیں۔ جو خود خوب ہیں۔ ان کی سب باتیں خوب ہیں ؎

اولاد

باپ صدقوں پر رہتا تھا۔ بچوں نے اکثر اکبر کی حضوری میں پرورش پائی۔ خان خاناں بچوں کو بہت چاہتا تھا۔ چنانچہ اکبر بھی اکثر فرمانوں میں ایرج داراب کا نام کسی نہ کسی طرح لے دیتا تھا ابوالفضل کو اِس سے زیادہ ویلنے پڑتے تھے۔ کہ اِن دنوں بڑی محبتیں تھیں۔ ۹۹۰ھ میں اکبرنامہ میں لکھتے ہیں۔ خان خاناں کو بیٹے کی بڑی آرزو تھی۔ تیسرا بیٹا ہُوا حضور نے قارن نام رکھا شادی کی دھوم دھام میں جشن کیا۔ اور حضور کو بھی بلایا۔ عرضی قبول ہُوئی۔ اور اعزاز کے رتبے بلند ہُوئے۔ تحریروں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جتنی بچوں سے محبت رکھتا تھا۔ اُتنی ہی تعلیم و تربیت پر توجہ رکھتا تھا ؎

مرزا ایرج سب میں بڑا تھا۔ اس کی تربیت و تعلیم کا حال معلوم نہیں۔ ابوالفضل نے عالم اتحاد کی گرمجوشی میں ایک خط خان خاناں کو لکھا تھا۔ اُس میں لکھتے ہیں دربار میں ایرج کا بھیجنا کیا ضرور ہے۔ تمہیں اسمیں اصلاح عقیدہ کا خیال ہے۔ یہ اُمید بے حاصل ہے ؎

آزاد۔ جو لوگ شیخ کو بے دین کہتے ہیں۔ اور اکبر کو بے دین کردینے کا اسے الزام لگاتے ہیں وہ اِن لفظوں کو دیکھیں۔ کہ اِس کے دل میں دربار کی طرف سے اِن معاملات میں کیا خیال تھا۔ جو یہ فقرے قلم سے نکلے ہیں ؎

سنہ جلوس اکبری میں خان خاناں دکن میں تھا۔ تو ایرج بھی اُس کیساتھ تھا۔ عنبر حبشی

[1] دشت جنوں کی راہیں دہشت زدوں سے پوچھو ؎

فوج لیکر تلنگانہ کو مارتا ہوا چپرے پر آیا۔ اُمرانے خان خاناں کو متواتر تحریریں بھیج کر کمک مانگی۔ خان خاناں نے ایرج کو بھیجا۔ وہاں بڑے معرکہ کا میدان ہوا۔ نوجوان دلاور نے اِس بہادری سے تلواریں ماریں۔ کہ باپ دادا کا نام روشن ہوگیا۔ پرانے پرانے سپاہی آفرین کرتے تھے۔ ماں شمشیر کی سفارش نے اُسے دربار سے بہادری کا خطاب دلوایا +

۱۰۱۱ھ میں جبکہ عادل شاہ نے شاہزادہ دانیال کے ساتھ اپنی بیٹی کی نسبت منظور کی۔ تو چند امرا کے ساتھ معہ پانچ ہزار سپاہ کے برات لے کر گیا۔ وہاں سے دُلہن کی پالکی کیساتھ جہیز کے سامان پیشکش لیئے شادی کی شہنائیاں بجاتے آئے۔ قریب پہنچے۔ تو خان خاناں چودہ ہزار سوار سے دمامۂ دولت بجاتے گئے۔ اور برات لے کر لشکر میں داخل ہوئے۔

جہانگیری عہد میں بھی اُس نے اور داراب اور اور بھائیوں نے ایسے ایسے کارنامے کیئے کہ باپ کا دل اور دادا کی روح باغ باغ ہوتے تھے خصوصاً ایرج۔ اس کی شجاعت ہمت۔ عالی دماغی دیکھ کر سب لکھتے ہیں۔ کہ یہ دوسرا خان خاناں کہاں سے آگیا۔ جہانگیر اپنی تزک میں جا بجا اِس کی تعریفیں لکھتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ خوش ہو ہو کر لکھتا ہے۔ اور آیندہ کی جانفشانی کی اُمیدیں رکھتا ہے +

سلاطین ایشیائی کے اصول و فروع کو جب قوانین حال کیساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو اختلاف بہت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ نکتہ دکھانے کے قابل ہے۔ کہ وہ لوگ اپنے نوکروں کی خوبی۔ خدمتگذاری اور خوش حالی دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے۔ جیسے کوئی زمیندار اپنے زرخیز کھیت کو ہرا بھرا دیکھ رہا ہے۔ یا باغبان اپنے لگائے ہوئے درخت کے سایہ میں بیٹھا ہے یا کوئی مالک ہے۔ کہ اپنے گھوڑے گایوں بکریوں کی شیرداری اور نسل داری پر خوش اور نازاں ہوتا ہے یہ نعمت اُنہیں خوش نصیب جاں نثاروں کو حاصل تھی جس کی ہم لوگوں کو ہرگز امید نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ہاں وہ جاں نثار اپنے بادشاہ کے سامنے جانفشانی کر رہے تھے۔ اُسے اُن سے اور اُن کی نسل سے اپنی بلکہ اپنی اولاد کے لئے ہزاروں امیدیں تھیں۔ اور ہم؟ ہمارا بادشاہ بھی حاکم جو چند روز کے بعد تبدیل ہو جائیگا یا ولایت چلا جائیگا۔ پھر وہ کون۔ اور ہم کون +

۱۰۲۰ھ میں جہانگیر نے اُسے شاہنواز خاں خطاب دیا۔ ۱۰۲۱ھ میں تین ہزاری ذات تین ہزاری منصب کا خطاب دیا۔ ۱۰۲۴ھ میں عنبر پر ایسی فتح نمایاں حاصل کی کہ خنجر و شمشیر کی زبان سے صدائے آفرین نکلی۔ اور داراب نے جانبازی کے رتبہ کو حد سے گذار دیا۔

۱۰۲۶ھ میں بارہ ہزار سوار جرار خوش اسپہ عنایت ہوئے۔ اور اس نے بالاگھاٹ پر گھوڑے اٹھائے۔ اسی سنہ میں ان کی بیٹی کی شاہزادہ شاہجہاں سے شادی ہوئی +

۱۰۲۷ھ میں اسے پنج ہزاری منصب کیساتھ دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت ہوئے

۱۰۲۸ھ میں لکھتا ہے۔ کہ جب وہ اتالیق رخصت ہونے لگا۔ تو میں نے بتاکید تمام کہہ دیا تھا کہ سنا ہے شاہ نواز خاں شراب کا عاشق ہو گیا ہے۔ بہت پیتا ہے۔ اگر سچ ہے۔ تو بڑا افسوس ہے۔ کہ اس عمر میں جان کھو بیٹھیگا۔ اسے اس کے حال پر نہ چھوڑنا۔ خود اچھی طرح حفاظت نہ کرسکو تو صاف لکھو۔ ہم حضور میں بلا لینگے۔ اور اس کی اصلاح حال پر توجہ کرینگے وہ جب برہان پور میں پہنچا تو بیٹے کو بڑا ضعیف و نحیف پایا۔ علاج کیا وہ کئی دن کے بعد بستر ناتوانی پر گر پڑا۔ طبیبوں نے بہت معالجے اور تدبیریں خرچ کیں۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ عین جوانی اور دولت و اقبال کے عالم میں تینتیس برس کی عمر میں ہزاروں حسرت و ارمان لے کر رحمت اور مغفرت الٰہی میں داخل ہوا۔ یہ ناخوش خبری سن کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ حق یہ ہے۔ کہ بڑا بہادر خانہ زاد تھا۔ اس سلطنت میں عمدہ خدمتیں کرتا اور کارنامہائے عظیم اس سے یادگار رہتے یہ راہ تو سب کو درپیش ہے اور حکم قضا سے چارہ کسے ہے۔ مگر اس طرح جانا تو ناگوار ہی معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے۔ کہ خدا مغفرت کرے۔ راجہ رنگ دلو خدمتگاران نزدیک میں سے ہے۔ اسے میں نے خان خاناں کے پاس پرسے کے لیے بھیجا۔ اور بہت نوازش اور دلجوئی کی۔ اس کا منصب اس کے بھائی بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ داراب کو پنج ہزاری ذات اور سوار کر دیا۔ خلعت۔ ہاتھی۔ گھوڑا۔ شمشیر مرصع۔ دے کر باپ کے پاس بھیج دیا کہ شاہ نواز خاں کی جگہ برار و احمد نگر کا صاحب صوبہ ہے رحمٰن داد۔ دوسرے بھائی کو دو ہزاری آٹھ سو سوار۔ منوچہر شاہ نواز کا بیٹا۔ دو ہزاری ہزار سوار۔ طغرل دوسرا بیٹا ہزاری ذات پانسو سوار۔ حقیقت یہ ہے کہ جوانمرگ امیرزادہ کی جانفشانی اور جاں نثاری نے جہانگیر کے دل پر داغ دیا تھا۔ اپنی توزک میں کئی جگہ اس کی دلاوری کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر جگہ لکھتا ہے۔ کہ اگر عمر وفا کرتی تو اس سلطنت میں خوب خدمتیں بجا لاتا +

داراب ۱۰۲۹ھ میں خان خاناں کی عرضی آئی کہ برگی وغیرہ سرداران دکن نے جنگلی قوموں کو ساتھ لے کر ہجوم کیا ہے۔ تھانہ دار اٹھ کر داراب کے پاس چلے آئے ہیں۔ بادشاہ نے دو لاکھ روپیہ بھیجا۔ داراب نے کئی دفعہ امرا کو بھیجا تھا۔ سپاہ کٹوا کر چلے آئے تھے۔ آخر خود گیا۔ مارتا مارتا ان کے گھروں تک جا پہنچا۔ اور سب کو قتل و غارت کرکے پریشان کر دیا۔ اس کی دردناک

مصیبت باپ کے حال میں بیان ہو چکی۔ بار بار صبر کے سینہ میں خنجر مارنا کیا ضرور ہے۔
رحمن داد۔ جن پھولوں کو ہم جانتے ہیں۔ معمولی رنگ و بو رکھتے ہیں۔ یہ پھول رنگارنگ کے اوصاف و کمال سے آراستہ تھا کمبخت باپ اسی کو بہت پیار کرتا تھا۔ اس کی ماں قوم سوہیہ متعلقہ امرکوٹ کی رہنے والی تھی۔ وہ فخر کیا کرتا تھا۔ کہ بادشاہ میرے ننہال میں پیدا ہوئے تھے۔ جب وہ مرا ہے کسی کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ کہ خان خاناں سے جا کر کہہ سکے۔ حضرت شاہ عیسٰے سندھی کوئی بزرگ تھے۔ انہیں اہل محل نے کہلا بھیجا کہ آپ جا کر کہیئے۔ انہوں نے بھی اتنا کیا کہ لباس ماتمی پہن کر گئے فقط فاتحہ پڑھی کوئی آیت۔ کوئی حدیث۔ چند کلمے صبر کے ثواب میں ادا کیئے اور اٹھ کر چلے آئے۔ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے۔ ۱۰۲۹ھ میں پھر خان خاناں کو داغ جگر نصیب ہوا۔ کہ رحمن داد بیٹا بالاپور میں مرگیا۔ کئی دن بخار آیا تھا۔ نقاہت باقی تھی۔ ایک دن غنیم فوج کا دستہ باندھ کر نمودار ہوئے بڑا بھائی داراب فوج لیکر سوار ہوا۔ اسے جو خبر ہوئی۔ تو شجاعت کے جوش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سوار ہو کر گھوڑا دوڑائے بھائی کے پاس پہنچا۔ غنیم کو بھگا دیا۔ فتح کی خوشی میں موج کی طرح لہراتا ہوا پھرا گھر آکر احتیاط نہ کی۔ کپڑے اتار ڈالے۔ ہوا لگ کر بدن اینٹھنے لگا زبان بند ہوگئی۔ دو دن یہ حال رہا تیسرے دن مرگیا۔ خوب بہادر جوان تھا۔ شمشیرزنی اور خدمت کا شوقین تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنا جوہر تلوار میں دکھائے۔ آگ تو سوکھے گیلے کو برابر جلاتی ہے۔ مگر میرے دل کو سخت رنج ہوتا ہے بڈھے باپ پر کیا گذری ہوگی۔ کہ دل شکستہ ہے۔ ابھی شاہنواز خاں کا زخم بھرا ہی نہیں۔ کہ اور زخم نصیب ہوا۔ خدا ایسا ہی صبر اور حوصلہ دے ؂

امر اللہ ایک بیٹا لونڈی کے پیٹ سے تھا۔ یہ تعلیم اور تربیت سے بے بہرہ رہا۔ یہ بھی جوان ہی گیا اسی کے باب میں جہانگیر نے خوش ہو کر لکھا تھا۔ کہ گونڈوانہ علاقہ خاندیس کان الماس پر جا کر قبضہ کیا ؂
حیدر قلی۔ باپ اسے پیار سے حیدری کہتا تھا۔ کئی بھائیوں سے پیچھے آیا تھا۔ اور سب سے پہلے گیا ؂

وہ کیا کرے کہ غنچہ بھی کملا کے گر پڑے	گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے گر پڑے

سنہ ۱۰۱۸ھ میں اس کا حال لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے دیکھ لو۔ خدا یہ داغ دشمن کو بھی نہ دکھلائے ؂

دو بیٹیوں کے حال بھی سیاہ نقابیں ڈالے کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک وہی جو دانیال سے منسوب تھی۔ جس کا ذکر ہو لیا۔ افسوس جس جانا بیگم کے سر سے سہاگ کے عطر ٹپکتے تھے۔ بیرحم

زمانہ نے اُس میں بدنصیبی کے ہاتھوں سے رنڈاپے کی خاک ڈالی۔ اِس عفیفہ نے ایسا غم کیا کہ کوئی نہیں کرتا۔ دہکتی آگ سے تن کو داغ داغ کیا۔ بڑھیا ہو کر مری۔ مگر جب تک جیتی رہی۔ سفید گزی گاڑھا پہنتی رہی۔ رنگین رومالی تک سر پہ نہ ڈالی۔ اِس کی کارروائی اور سلیقے مردوں کے لئے دستور العمل ہیں *

جہانگیر دکن کے دورہ پر گیا۔ کل دربار اور لشکر سمیت بادشاہ کی ضیافت کی۔ اتفاق یہ کہ اِن دنوں خزاں نے درختوں کے کپڑے اُتار لئے تھے۔ پاک دامن بی بی نے انہیں بھی خلعت اور لباس سے آراستہ کیا۔ دُور دور سے مصور اور نقاش جمع کئے۔ کاغذ اور کپڑے کے پھول پتے کتروائے۔ موم اور لکڑی کے پھل ترشوائے۔ اُن پر ایسا رنگ روغن کیا۔ کہ نقل واصل میں اصلا فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب بادشاہ آئے تو تمام درخت ہرے اور پھلوں سے دامن بھرے کھڑے تھے۔ حیران ہوئے۔ روش پر چلتے تھے۔ ایک پھل پہ ہاتھ ڈالا۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ کل کارخانہ فقط سبز باغ ہے۔ بہت خوش ہوئے *

دوسری بیٹی کا نام معلوم نہیں۔ میر جمال الدین انجو فرہنگ جہانگیری کے مصنف امرائے اکبری میں داخل تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ ایک اُن میں سے میر امیر الدین تھے۔ کہ سعادت مندی اُنہیں باپ کی خدمت سے ایک دم جدا نہ ہونے دیتی تھی۔ دختر مذکور اُن سے منسوب تھی افسوس اس بیچاری کو بھی عین جوانی میں دنیا سے ناکامی نصیب ہوئی *

میاں فہیم

یہ وہی میاں فہیم ہے جس کے نام سے ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پہ کہاوت مشہور ہے گرکھائیں خان خاناں اور لٹائیں میاں فہیم۔ خان خاناں کی بعض عرضیاں اور خطوط میں نے دیکھے وہ بھی میاں فہیم لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میاں ہی کہتے بھی ہونگے۔ میاں ہی مشہور ہو گئے۔ لوگ اُنہیں خان خاناں کا غلام سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں غلام نہ تھے۔ ایک راجپوت کے بیٹے تھے۔ خدا ترس بامروت جوہر شناس خان خاناں نے اپنے بچوں کی طرح پالا۔ اور بیٹوں کے ساتھ تعلیم و تربیت کیا تھا۔ انہیں ہمت و شجاعت سے دودھ پلوایا تھا۔ اور لیاقت و آداب سے سبق پڑھوایا تھا۔ آقا کی بدولت اس کا نام آسمان شہرت پہ ایسا چمکا۔ جیسے چاند کے پہلو میں تارا۔ بیٹے کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ فہیم باوجود اوصاف مذکورہ کے نہایت پرہیزگار۔ نیک نیت نیکوکار تھا۔ مرنے کے

دن تک تہجد اور اشراق کی نماز نہیں چھٹی۔ فقیر دوست تھا۔ اور سپاہ کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا تھا۔ خانخاناں کی سرکار کے کاروبار اُسکی ذات پر منحصر تھے۔ کھلاتا تھا۔ لٹاتا تھا۔ اپنا دل خوش اور آقا کا نام روشن کرتا تھا۔ وہ مہموں میں تیغ و تیر کی طرح اُسکے دم کے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نے خان خاناں کی ایک عرضی اکبر کے نام دیکھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ سہیل کی لڑائی میں وہ فوج ہراول میں حملہ آور تھا۔ مگر تندمزاج اور بلند نظر بھی حد سے زیادہ تھا۔ جب جاؤ اس کی ڈیوڑھی پر کوڑا ہی چھنا سُنائی دیتا تھا ؛

نقل۔ ایک دن داراب اور بکرماجیتِ شاہجہانی ایک مسند پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہ فہیم بھی آیا۔ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور داراب سے کہا۔ کاش ایرج کے بدلے تو مرجاتا۔ یہ ڈکوت برہمن اور بیرم خان کے پوتے کی برابر بیٹھے! (مآثر)

آخر میں خان خاناں کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اُسے بیجاپور کی فوجداری پر بھیج دیا تھا۔ چند روز بعد حساب کتاب مانگا۔ حافظ نصر اللہ خان خاناں کے دیوان با اختیار نہایت معزز شخص تھے۔ حساب لینے لگے۔ کسی رقم پر تکرار ہوئی۔ سر دربار حافظ صاحب کے مُنہ پر طمانچہ مارا۔ اور اُٹھ کر چلا گیا۔ آفرین ہے خان خاناں کے حوصلہ کو آدھی رات کو آپ گئے اور منا کر لائے (مآثر)

جب مہابت خان نے خانخاناں کو قید کرنا چاہا۔ تو فہیم کی طرف سے خیال تھا۔ کہ من چلا جوان ہے ایسا نہ ہو کہ زیادہ آگ بھڑک اُٹھے۔ چاہا کہ منصب اور انعام و اکرام کے لالچ دے کر پہلے اُسے بُلا لے۔ فہیم نے نہ مانا۔ اور تیز تیز پیغام سلام بھیجے۔ آخر مہابت خاں نے کہلا بھیجا۔ کہ بیا بکری کا گھمنڈ کب تک پیش جائیگا۔ جان کھو بیٹھوگے۔ فہیم نے کہا خان خاناں کا غلام ہے۔ ایسا سستا بھی نہ ہاتھ آئیگا۔

جب خان خاناں کو مہابت خاں نے بُلایا۔ تو فہیم نے اُسی وقت کہہ دیا تھا۔ کہ دغا معلوم ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ذلت و خواری تک نوبت پہنچے۔ مسلح و مستعد ہو کر حضور کی خدمت میں چلنا چاہیئے خان خاناں نے کچھ خیال نہ کیا۔ مہابت نے اُنہیں نظر بند کرتے ہی فہیم کے ڈیرے پر آدمی بھیجے اُس نے اپنے فرزند فیروز خاں سے کہا۔ کہ وقت آن لگا ہے۔ تھوڑی دیر اِنہیں روکو۔ کہ وضو تازہ کرکے سلامتی ایمان کا دوگانہ ادا کرلوں۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہو کر آپ ۔ بیٹا چالیس جاں نثاروں کے ساتھ تلوار پکڑ کر نکلے۔ اور جان کو آبرو پر قربان کردیا۔ خیال کرو خان خاناں کو اُس کے مرنے کا کیسا رنج ہوا ہوگا۔ اُس کی لاش بھی دِلّی میں بھجوائی۔ کہ وہاں کی خاک کو آرامگاہ سمجھتا تھا۔

ہمایوں کے مقبرہ کے پاس مقبرہ بنوایا۔ اب تک نیلا گنبد اُس کے غم میں رنگ سوگواری دکھا رہا ہے (مآثر)

باغ فتح۔ احمد آباد کے پاس جہاں مظفر پر فتح پائی تھی۔ وہاں خان خاناں نے ایک باغ آباد کیا۔ اور اُس کا نام باغ فتح رکھا۔ دیکھو ہندوستان میں آکر اتنا رنگ بدلا۔ بیرم خاں کے وقت تک جہاں فتح ہوئی کلہ منار بنتے رہے کہ ایران و توران کی رسم تھی۔ ہندوستان کی آب و ہوا نے باغ سرسبز کیا۔

دکن کے دورہ میں جہانگیر کا گذر گجرات میں ہوا۔ باغ مذکور میں بھی گئے۔ لکھتے ہیں: جو باغ خانخاناں نے میدان کارزار پر بنایا۔ دریائے سابرمتی کے کنارہ پر ہے۔ عمارت عالی اور بالادری موزون و مناسب چبوترہ کیساتھ دریا کے رُخ پر تعمیر کی ہے۔ تمام باغ کے گرد پتھر اور چونے کی مضبوط دیوار کھینچی ہے۔ ۱۲۰ جریب کا رقبہ ہے۔ خوب سیر گاہ ہے۔ دو لاکھ روپے خرچ ہوئے ہونگے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا باغ تمام گجرات میں نہ ہوگا۔ دکن کے لوگ اسے فتح باڑی کہتے ہیں۔

امارت اور دریا دلی کے کارنامے

جود و کرم کے باب میں بے اختیار تھا۔ ہمت اور حوصلہ کے جوش فوارہ کی طرح اُچھلے پڑتے تھے اور عطا و انعام کے لئے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ اس کی امیرانہ طبیعت بلکہ شاہانہ مزاج کی تعریفوں میں شعرا اور مصنفوں کے لب خشک ہیں۔ علما۔ صلحا۔ فقرا۔ مشائخ وغیرہ وغیرہ سب کو ظاہر اور خفیہ ہزاروں روپے اشرفیاں اور دولت و مال دیتا تھا۔ اور شعرا اور اہل کمال کا تو مائی باپ تھا۔ جو آتا ان کی سرکار میں آکر اس طرح اُترتا۔ جیسے اپنے گھر میں آگیا اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ بادشاہ کے دربار میں جانیکی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اسکے وقت میں اہل کمال کا وہ مجمع تھا جو سلطان حسین مرزا اور امیر علی شیر کے عہد میں گذرا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ان کے دربار میں یہ لہر بہر دریائے سخاوت کی کہاں۔ کئی شاعروں کو اشرفیوں میں تلوا دیا۔ اس کی سخاوتوں کے کارنامے اکثر لطیفوں اور حکایتوں کے رنگ و بو میں محفلوں اور جلسوں پر پھول برساتے ہیں۔ میں بھی اس کے گلدستوں سے دربار اکبری کو سجاؤنگا۔ شعرا نے جتنے قصیدے اس کی تعریف میں کہے ہیں۔ اکبر ہی کی تعریف میں کہے ہوں تو کہے ہوں۔ اور اس نے بھی انہیں لاکھوں انعام دیئے۔

گنوان پنڈت۔ کوئی کبیشور۔ بلکہ بھاٹ ہزاروں اشلوک۔ دوہڑے۔ کبت کہکر لاتے تھے۔ اور ہزاروں لیجاتے تھے۔ انعام میں بھی وہ وہ نزاکت و لطافت کے انداز دکھا گیا۔ کہ آیندہ دینے والوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں۔ ملا عبدالباقی نے کل قصائد مع الیاض جمع کر کے ایک ضخیم کتاب بنا دی ہے۔ اس میں ہر شاعر کا حال اُسکے قصیدہ کے ساتھ لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ کس تقریب میں یہ قصیدہ کہا گیا تھا۔ اور انعام کیا پایا تھا۔ اس سے اکثر جزئیات تاریخی حالات کے معلوم ہوتے ہیں۔ **ماثر رحیمی** اُس کا نام ہے +

لطیفہ خانخاناں کا دسترخوان نہایت وسیع ہوتا تھا۔ کھانے رنگارنگ کے تکلفات سے رنگین اور اُسکے فیض سخاوت کی طرح اہل عالم کے لئے عام تھے۔ جب دسترخوان پر بیٹھتا تھا مکانوں میں درجہ بدرجہ صدہا بندگان خدا بیٹھتے تھے۔ اور لذت سے کامیاب ہوتے تھے۔ اکثر کھانوں کی رکابیوں میں کسی میں کچھ روپے۔ کسی میں اشرفیاں رکھ دیتے تھے۔ جو جسکے نوالہ میں آگئے۔ اس کی قسمت آج تک وہ مثل زبانوں پر ہے۔ خانخاناں جسکے کھانے میں بتانا +

لطیفہ۔ ایک دفعہ پیش خدمتوں میں کوئی نیا شخص ملازم ہوا تھا۔ دسترخوان آراستہ ہوا نعمتہائے گوناگوں چنی گئیں۔ جب خانخاناں آکر بیٹھا۔ سینکڑوں امرا اور صاحب کمال موجود تھے کھانے میں مصروف ہوئے۔ اس وقت وہی پیش خدمت خانخاناں کے سر پر رومال ہلا رہا تھا یکایک رونے لگا۔ سب حیران ہوگئے۔ خان خاناں نے حال پوچھا۔ عرض کی کہ میرے بزرگ صاحب امارت اور صاحب دستگاہ تھے۔ میرے باپ کو بھی مہمان نوازی کا بہت شوق تھا۔ مجھ پر زمانہ نے یہ وقت ڈالا۔ اسوقت آپکا دسترخوان دیکھ کر وہ عالم یاد آگیا۔ خانخاناں نے بھی افسوس کیا۔ ایک مرغ بریاں سامنے رکھا تھا۔ اس پر نظر جا پڑی۔ پوچھا۔ بتاؤ۔ مرغ میں کیا چیز مزے کی ہوتی ہے۔ اُس نے کہا پوست۔ خانخاناں نے کہا۔ سچ کہتا ہے۔ لطف و لذت سے باخبر ہے۔ مرغ کی کھال اُتار کر پکاؤ۔ تو کیسا ہی تکلف سے پکاؤ۔ وہ لذت اور نمکینی نہیں رہتی۔ بہت خوش ہوا۔ دسترخوان پر بٹھا لیا۔ دلجوئی کی۔ اور مصاحبوں میں داخل کر دیا۔

دوسرے دن دسترخواں پر بیٹھے۔ تو ایک اور خدمتگار رونے لگا۔ خانخاناں نے اس سے بھی سبب پوچھا۔ اس نے جو سبق کل پڑھا تھا۔ وہی سُنا دیا۔ خانخاناں ہنسا۔ اور ایک اور جانور کا نام لیکر پوچھا۔ کہ بتاؤ اس میں کیا چیز مزے کی ہوتی ہے۔ اُس نے کہا پوست۔ سب لعنت ملامت کرنے لگے۔ خانخاناں بہت ہنسا۔ اسے کچھ انعام دیکر کسی اور کارخانے میں بھیجدیا۔ کہ ایسا شخص حضور کے خدمت کے قابل نہیں +

ایک دن ملازموں کی چٹھیاں دستخط کر رہے تھے۔ کسی پیادہ کی چٹھی پر ہزار دام کی جگہ ہزار روپے لکھ دیئے۔ دیوان نے عرض کی۔ کہا اب جو قلم سے نکل گیا۔ اس کی قسمت +

ایک دن نظیری نیشاپوری نے کہا۔ کہ نواب میں نے لاکھ روپیہ کا ڈھیر کبھی نہیں دیکھا۔ کہ کتنا ہوتا ہے۔ انہوں نے خزانچی کو حکم دیا۔ اُس نے سامنے انبار لگا دیا۔ نظیری نے کہا شکر خدا آپکی بدولت آج لاکھ روپے دیکھے۔ خانخاناں نے کہا۔ اللہ جیسے کریم کا اتنی بات پر کیا شکر کرنا۔ روپے اُسی کو دیدیئے اور کہا خیر اب شکر الٰہی کرو تو ایک بات بھی ہے +

جہانگیر بادشاہ ایک دن تیر اندازی کر رہا تھا۔ کسی بھاٹ کی یاوہ گوئی پر خفا ہو کر حکم دیا۔ کہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے پامال کریں۔ خانخاناں پاس کھڑا تھا۔ فرقہ مذکور کی حاضر جوابی اِسکی زبان درازی سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس نے عرض کی۔ حضور ذرہ ناچیز کے لئے ہاتھی کیا کریگا۔ ایک چوہے چڑے کا پاؤں بھی بہت ہے۔ ہاتھی کا پاؤں خانخاناں کے لئے چاہیئے۔ کہ بڑا آدمی ہے جہانگیر نے اِن کی طرف دیکھا۔ کہ اِس لفظ نے دل پر کیا اثر کیا۔ پُوچھا کیا کہتے ہو۔ اُنھوں نے کہا کچھ نہیں سہرا دہ سے پُوچھا کہ تو بتا دے۔ خانخاناں خود بولے۔ کہ حضور کے تصدق سے خدا نے مجھ ناچیز کو ایسا کیا کہ یہ بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ میں نے اُس وقت شکر خدا کیا۔ اور کہا کہ جب اس کی خطا معاف ہو۔ تو پانچ ہزار روپے دے دینا۔ حضور کی جان و مال کو دعا دے گا۔

اہل ہند کا عقیدہ ہے۔ کہ سورج ہر شام کو سُمیر کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اور وہ ایک سونے کا پہاڑ ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی فرض کیا ہے۔ کہ چکوا چکوی دن کو ساتھ رہتے ہیں۔ رات کو دریا کے وار پار الگ الگ جا بیٹھتے ہیں۔ اور رات بھر جاگ کر کاٹتے ہیں۔ ایک بھاٹ نے چکے چکوی کی زبانی کبت کہا۔ جسکا خلاصہ یہ کہ خدا کرے خانخاناں کا سمند فتوحات سمیر پہاڑ تک جا پہنچے۔ وہ بڑا سخی ہے سب بخشدیگا۔ پھر ہمیشہ دن رہیگا۔ اور ہم تم موج کرینگے۔ جب یہ کبت پڑھا گیا۔ تمام اہل دربار نے تعریف کی۔ کہ نیا مضمون ہے۔ خانخاناں نے پوچھا۔ کہ پنڈت جی تمہاری عمر کیا ہے۔ عرض کی ۴۵ برس کل سو برس کی عمر لگائی گئی۔ اور ۵ روپیہ روز کے حساب سے ۵۵ برس کا روپیہ جو کچھ ہوا۔ خزانہ سے دلوا دیا۔

ایک بھوکا برہمن خانخاناں کے دروازے پر آیا۔ دربان نے روکا اُس نے کہا۔ کہدو آپ کا ہمزلف ملنے آیا ہے۔ اور اس کی بی بی ساتھ ہے۔ خدمتگار نے عرض کی۔ اُسے بُلایا۔ پاس بٹھایا۔ اور رشتہ کا سلسلہ کھولا۔ اُس نے کہا۔ کہ بپتا اور سپتا دو بہنیں ہیں۔ پہلی میرے گھر گئی۔ دوسری آپ کے گھر آئی ہے۔ آپ اور ہیں ہمزلف نہیں تو اور کیا ہیں؟ نواب بہت خوش ہوا۔ خلعت دیا۔ خاصہ کے گھوڑے پر

طلائی ساز سجا کر سوار کیا۔ اور بہت کچھ نقد و جنس دے کر رخصت کیا ؎

ایک دن دربار میں بیٹھا تھا۔ اہالی و موالی۔ اہل غرض۔ اہل مطلب حاضر تھے۔ ایک غریب شکستہ دل آ کر بیٹھا۔ اور جوں جوں جگہ پاتا گیا۔ پاس آتا گیا۔ قریب آیا تو ایک توپ کا گولہ بغل سے نکالکر لڑھکایا کہ خانخاناں کے زانو سے آ کر لگا۔ نوکر اس کی طرف بڑھے۔ اُس نے روکا اور حکم دیا کہ گولے کے برابر سونا تول دو۔ مصاحبوں نے پُوچھا کہ یہ قول شاعر کو کسوٹی پر لگاتا ہے ؎

آہن کہ بہ پارس آشنا شد	فی الحال بصورت طلا شد

ایک دفعہ دربار شاہی سے برہان پور کو رخصت ہوئے پہلی ہی منزل پر ڈیرے تھے۔ قریب شام سراپردہ کے سامنے شامیانہ لگا ہوا۔ فرش بچھا ہوا۔ آپ نکل کر کرسی پر بیٹھے۔ مصاحبوں ملازموں سے دربار آراستہ۔ ایک آزاد سامنے سے گزرا۔ اور پکار کر کہتا چلا ؎

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست	ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم خاں ان کا خطاب ہو چکا تھا۔ اور پہلے منعم خاں کفایت شعار تھے۔ اُنہوں نے خزانچی کو حکم دیا کہ لاکھ روپے دیدو۔ فقیر دعائیں دیتا چلا گیا۔ دوسری منزل میں اُسی وقت پھر باہر نکل کر بیٹھے۔ فقیر پھر سامنے سے نکلا۔ اور وہی شعر پڑھا۔ اُنھوں نے پھر کہ دیا کہ لاکھ روپیہ دیدو۔ غرض وہ سات دن برابر اس طرح آتا رہا۔ اور لیتا رہا۔ پھر آپ ہی دل میں سمجھا۔ کہ یہ انعام آج تک کسی سے نہیں پایا امیر ہے۔ خدا جانے کبھی طبیعت حاضر نہ ہو۔ خفا ہو کر کہے۔ کہ سب چھین لو۔ زیادہ طمع اچھی نہیں۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ آٹھویں دن خانخاناں پھر اسی طرح نکل کر بیٹھے۔ معمول سے زیادہ وقت گزر گیا۔ برخاست نہ کیا۔ شام ہوئی تو کہنے لگے۔ کہ آج وہ ہمارا فقیر نہ آیا۔ خیر برہان پور آگرہ سے ۷۰ منزل ہے۔ ہم نے تو پہلے دن ۷۰ لاکھ روپیہ خزانہ سے منہا کر دیا تھا۔ تنگ حوصلہ تھا۔ خدا جانے دل میں کیا سمجھا۔

خانخاناں نہایت حسین تھا۔ اس کی خوبیاں اور محبوبیاں سنکر ایک عورت کو اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ بھی حسین تھی۔ اس نے اپنی تصویر کھچوائی۔ اور ایک بڑھیا کے ہاتھ بھیجی۔ وہ خلوت میں آ کر خانخاناں سے ملی۔ اور مطلب کو اس پیرایہ میں ادا کیا۔ کہ ایک بیگم کی یہ تصویر ہے۔ اُنھوں نے پیغام دیا ہے کہ آپ کی تعریفیں سُن سُن کر میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔ ارمان یہ ہے کہ تمہیں جیسا ایک فرزند میرے ہاں ہو۔ تم بادشاہ کی آنکھیں ہو۔ زبان ہو۔ دست و بازو ہو۔ تمہیں یہ بات کچھ مشکل نہیں۔ خانخاناں نے سوچکر کہا کہ مائی۔ تم میری طرف سے اُنہیں کہنا۔ کہ یہ بات تو کچھ مشکل نہیں مگر یہ مشکل ہے۔ کہ خدا جانے اولاد ہو یا نہ ہو۔ اور ہو تو کیا خبر ہے۔ بیٹا ہی ہو۔ اور وہ زندہ بھی رہے۔ پھر خدا

بلانے ایسی صورت ہو یا نہ ہو۔ یہ بھی ہو تو اقبال پر کس کا زور ہے۔ خدا چاہے دے خدا چاہے نہ دے اگر انہیں مجھ جیسے بیٹے کی آرزو ہے۔ تو کہنا کہ تم ماں ہیں بیٹا۔ خدا کا شکر کرو جس نے پلا پلایا بیٹا نہیں دیا۔ ماں کو اسقدر روپیہ مہینہ دیتا ہوں۔ وہی تمہیں بھیجا کروں گا۔

ایک شخص خانخاناں کے پاس آیا۔ اور یہ قطعہ لکھ کر دیا۔

اے خانِ جہان خانخاناں	دارم صنمے کہ رشک چین است
گر جاں طلبہ مضایقہ نیست	زر میطلبد سخن درین است

پوچھا وہ کیا مانگتے ہیں۔ کہا لاکھ روپیہ۔ حکم دیا کہ سوا لاکھ دے دو۔

ایک دن خانخاناں کی سواری چلی جاتی تھی۔ ایک شکستہ حال غریب نے ایک شیشی میں بوند پانی ڈالکر دکھایا۔ اور اسے جھکایا جب پانی گرنے کو ہوا۔ تو شیشی کو سیدھا کر دیا۔ اس کی صورت معلوم ہوتا تھا کہ اشراف خاندانی ہے۔ خانخاناں لسے ساتھ لے آئے۔ اور انعام و اکرام دیکر رخصت کیا۔ لوگوں نے پوچھا۔ کہا کہ تم نہیں سمجھے۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ ایک بوند آبرو رہی ہے اور اب یہ بھی گرا چاہتی ہے۔

ایک دن سواری میں کسی نے انہیں ایک ڈھیلا مارا۔ سپاہی دوڑ کر پکڑ لائے۔ انہوں نے کہا۔ ہزار روپیہ دے دو۔ سب حیران ہو گئے۔ اور عرض کی کہ جو نالائق قابل دشنام بھی نہ ہو۔ اسے انعام دینا آپ کا ہی کام ہے۔ انہوں نے کہا لوگ پھلے ہوئے درخت پر پتھر مارتے ہیں۔ جو میرا پھل ہے۔ وہ مجھے دینا واجب ہے۔

ایک دن سواری سے اُترتے تھے۔ ایک بڑھیا برابر آئی۔ ایک توا اس کی بغل میں تھا۔ نکالکر انکے بدن سے ملنے لگی۔ نوکر ہاں ہاں کرکے دوڑے۔ انہوں نے سب کو روکا۔ اور حکم دیا۔ کہ اسی کے برابر اسے سونا تول دو۔ مصاحبوں نے سبب پوچھا۔ کہا یہ دیکھتی تھی۔ کہ بزرگ جو کہا کرتے تھے۔ کہ بادشاہ اور ان کے امیر پارس ہوتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں۔ اور اب بھی ویسے لوگ ہیں یا کوئی نہیں رہا۔

خانخاناں دربار چلے۔ ایک سوار سپاہگری کے ہتھیار لگائے سامنے آیا۔ اور سلام کیا۔ انہوں نے حال پوچھا اسنے کہا۔ کہ نوکری چاہتا ہوں۔ بانکپن یہ کہ پگڑی میں دو میخیں بھی باندھی ہیں۔ پوچھا کہ ان میخوں کا کیا معاملہ ہے۔ اس نے عرض کی۔ کہ ایک میخ تو اسکے واسطے کہ نوکر رکھے۔ اور تنخواہ نہ دے۔ دوسری اس نوکر کے واسطے کہ تنخواہ لے اور کام چوری کرے۔ خانخاناں نے تنخواہ مقرر کی اور ساتھ لائے۔ وہ بھی دربار میں آیا۔ اسکے بانکپن کے انداز کو سب دیکھنے لگے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ انسان کی بہت سے بہت عمر ہو تو کتنی ہو۔ اُس نے کہا کہ عمر طبعی ۱۲۰ برس کی ہوتی ہے۔ انہوں

نے خزانچی کو حکم دیا۔ کہ سپاہی کی عمر بھر کی تنخواہ بے باق کر دو۔ اور اس سے کہا لیجیئے۔ حضرت ایک میخ کا بوجھ تو سر سے اُتار دیجیئے۔ دوسری کا آپ کو اختیار ہے۔

دربار جاتے تھے مصوّر نے تصویر لا کر دی۔ کہ ایک صاحب جمال عورت ہے۔ نہا کر اُٹھی ہے کرسی پر بیٹھی ہے۔ ایک طرف کو جھکی ہوئی سر کے بال پھٹکار رہی ہے۔ لونڈی پاؤں دُھلاتی ہے اور جھانوا کر رہی ہے۔ خانخاناں اسے دیکھتے ہوئے دربار چلے گئے۔ آکر حکم دیا۔ کہ اس مصوّر کو بلاؤ اور پانچ ہزار روپیہ دے دو۔ مصوّر نے عرض کی۔ انعام تو فدوی جبھی لے گا۔ کہ جو بات حضور قابل انعام خیال فرمائیں۔ وہ ارشاد فرمائیں۔ سب صاحب متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ کہ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور چہرہ کا انداز دیکھا۔ سب نے کہا۔ کہ دیکھا نہایت خوب اور بہت زیبا۔ خانخاناں نے کہا۔ پاؤں کی طرف تو دیکھو۔ وہ گدگدیاں ہو رہی ہیں۔ اس نزاکت و لطافت پر ۵ ہزار روپیہ کیا حقیقت ہے۔ ۵ لاکھ بھی تھوڑا ہے۔ مصوّر نے کہا۔ کہ حضور بس انعام پا لیا۔ اور میں آپ کا غلام ہو لیا۔ تمام امیروں کے پاس لیکر پھرا۔ ایک نے یہ نکتہ نہیں پایا۔ ہم لوگ قدرشناس کے غلام ہیں۔

خانخاناں جب مظفر پر ظفریاب ہو کر آئے۔ تو بادشاہ کے لئے بہت سے عجائب و نفائس خاندیس و دکن اور ممالک فرنگ کے لائے۔ اِن میں عجیب تحفہ یہ تھا۔ کہ رائے سنگھ جھالا علاقہ گجرات کے راجہ کو حاضر کیا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ نوجوانی کے عالم میں برات لیکر بیاہنے گیا تھا۔ جب وہاں سے خوشی کے نقارے بجاتا پھرا۔ تو جِتّا راجہ کچھ کے چچیرے بھائی کے ملک میں سے گزرا۔ محلوں کے پاس برات پہنچی۔ تو پیام آیا کہ نقارے نہ بجاؤ۔ یا دور ہو کر نکل جاؤ۔ اور مرد ہو تو تلوار نکالو۔ اور لڑو۔ اگرچہ سامان ساتھ نہ تھا۔ مگر رائے سنگھ دولہا کی رائے لڑائی پر جمی۔ اور جہاں تھا وہیں تلوار کھینچکر کھڑا ہو گیا۔ جِتّا جھٹ فوج لیکر آئے۔ بڑا کشت و خون ہوا۔ اور جلد میدان جنگ سے نیستی خانہ میں داخل ہوئے۔ چھوٹا بھائی راؤ صاحب آیا۔ وہ بھی بڑے بھائی کے پاس پہنچا۔ راجپوتوں میں رسم ہے۔ کہ جب جوش میں آتے ہیں۔ تو تلواریں سونت کر کود پڑتے ہیں۔ کہ شاید گھوڑا بے قابو ہو کر لے بھاگے۔ یا گھوڑا رن تکے دیکھ کر اپنی ہی نیت بگڑے اور جان لے کر نکل جائے۔ اس لڑائی میں طرفین کے بہادر اسی طرح جانوں سے ہاتھ اُٹھا کر میدان میں اُتر پڑے تھے۔ غرض دولہا اور اس کے رفیق فتحیاب ہو کر موچھوں پر تاؤ دیتے۔ اپنے گھوڑوں پر آئے سپاہ مغلوب کے پیادے جو گھوڑے لئے کھڑے تھے۔ انہیں جوش آیا۔ گھوڑوں کو چھوڑ کر تلواریں لیں۔ اور پھر میدان کارزار گرم ہوا۔ ایسا بھاری رن پڑا۔ کہ دولہا زخمی ہو کر گر پڑا۔ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔ کسی نے کسی کو نہ پہچانا۔ کہ کس کی لاش کہاں رہی۔ دولہا بہت زخمی ہوا تھا۔ سانس ہی آنس باقی

تھا۔ رات کو کوئی جوگی اُدھر آیا۔ اور اُٹھا کر اپنی مڈھی میں لے گیا۔ مرہم پٹی کی۔ خدا نے بچا لیا۔ احسان کا بندہ اس کا چیلا ہو گیا۔ انیس برس اس کی خدمت کرتا اور جنگلوں میں پھرتا رہا۔ گھر اور گھرانے میں سب کو یہی خیال کہ میدان میں کام آیا۔ کئی رانیاں ستی ہو گئیں۔ دُلہن رانی دل کے ست اور اس کے خیال میں خدا کو یاد کرتی تھی۔ کیونکہ مرنے کا بھی یقین نہ تھا۔ خانخاناں امیروں سے سوا فقیروں اور غریبوں کے یار تھے۔ ان کی سرکار میں فقیر امیر جوگی سب برابر تھے۔ جوگی جی کے بھی درشن ہوئے اور یہ حال معلوم ہوا۔ گورُو اور چیلے کو دربار میں لے آئے۔ اکبر بھی ایسے معاملات کے مشتاق ہی رہتے تھے۔ اس عجیب واردات کو سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اتبت چیلا پھر رائے سنگھ راجہ بنکر اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے ملک کو رخصت ہوئے۔ جب وہاں گئے تو سب اقربا ملازم جمع ہوئے۔ اور دیکھ کر پہچانا۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ سب سے سوا رانی کہ شرم سے زبانی سے کچھ کہہ سکتی تھی۔ اور اپنے مالک کی یاد میں بیٹھی تھی۔ دیکھو رسم کا ست تو مار چکا تھا محبت کا ست کام کر گیا۔ راجہ نے راج سنبھالا۔ اور خیر خواہان دولت نے شکر الٰہی کے ساتھ خانخاناں کے شکرانے ادا کئے۔

موزونی طبع یہ عالی دماغ امیر ایک صندوقچہ کمالات انسانی کا تھا۔ ایسی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر روحیں عالم بالا سے بہت کم عالم خاک میں آتی ہیں۔ جو کہ ہر وصف اور ہر خوبی کیلئے جوہر قابل ہوں۔ اگرچہ اس کا دماغ شاعری پر مرنے مٹنے والا نہ تھا۔ مگر پھول اپنا رنگ نہ دکھائے یا خوشبو نہ پھیلائے۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔ اُس کے دل کا کنول کبھی اپنے ذوق و شوق سے۔ کبھی بادشاہ یا دوستوں کی فرمائش کی تقریب سے ہوائے نظم سے کھیلتا تھا۔ اسے شاعرانہ دماغ سوزی کی فرصت نہ ہوگی۔ یا ایسا زیادہ شوق نہ ہوگا۔ کہ اپنی نظم سے بیاض یا دیوان مرتب کرتا۔ ایک غزل اور چند متفرق اشعار اور رباعیاں نظر سے گزریں۔ چنانچہ ہفت اقلیم اور تذکرہ پر جوش اور تزک جہانگیری وغیرہ سے لکھتا ہوں۔ دیکھو لو یہ بھی لطافت و نزاکت سے پھولوں کا طرہ بھر رہا ہے ۱

غزل

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است	جز این قدر کہ دلم سخت آرزومند است
ادائے حق محبت عنایت است ز دوست	دگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورسند است
نہ زلف دانم و نے دام اینقدر دانم	ز پائے تا بہ سرم ہرچہ ہست دربند است

بدوستے کہ بجز دوستی نمے دانم — خدائے داند و آں کو مرا خداوند است
ازیں خوشم بہ سخنہائے عالیہائے رحیم — کہ اندکے بادا ہائے دوست مانند است

شعر

نیم فضول کہ جویم وصال ہمچو توئی — بس است ہمچو منے را خیال ہمچو توئی

شعر

پارہ پارہ گشت دل اما نمے دارد بہم — زانکہ پیکان تو اش صد بار برہم دوختہ است

شعر

تمام مہر و محبت شدم نمیدانم — کہ دل کدام ۔ محبت کدام ۔ و یار کدام

رباعی

خواہم ز درت روم مروت نگذاشت — واں گرمی اختلاط و صحبت نگذاشت
اینہا ہمہ ۔ عذر است چہ پنہاں از تو — قربان سرت روم محبت نگذاشت

ایضاً

در قصۂ عشق مرد تا گویا بہ — اندیشۂ عشق و خون دل یکجا بہ
تا قدر وصال دوست ظاہر گردد — ہمچوں شب قدر وصل ناپیدا بہ

ایضاً

در راہ وفا نیازمندی چہ خوش است — دل سوختگی و دردمندی چہ خوش است
زلف تو کہ دل شکارے لاغر است — از دل صیدے از کمندے چہ خوش است

ایضاً

اے آتش سینہ شعلہ باری بس کن — اے اشک نیاز ور شماری بس کن
چوں وادہ و تا دادہ نہ امروز است — داری بس کن و گرنہ داری بس کن

ایضاً

جاسوس دلم بسوے تو بوے تو بس — دربان مجاز بان ہمیں خوے تو بس
استاد پریشانئے من موے تو بس — مشاطۂ روے من ہمیں روئے تو بس

ایضاً

سرمایۂ عمر جاودانی غم تو — بہتر ز ہزار شادمانی غم تو

گفتی کہ چنیں والہ و شیدات کہ کرد		دانی غم تو وگرنہ دانی غم تو
	ایضاً	
آنم کہ حیات خود بہ سائل دہمے از دست دل آنچناں بہ تنگم امروز		گر سر طلبی بہ تیغ قاتل دہمے گر خاک طلب کند زمن دل دہمے
	ایضاً	
زنہار رحیم از پئے دل نہ ردی گفتم سخنے او باز ہم مے گویم		بیہودہ بہ آرزوے دل در گروی خواہش کاری ہمیشہ خواہش دردی

مسیح الدین حکیم ابوالفتح گیلانی

ماثرالامرا میں لکھا ہے۔ کہ مولانا عبدالرزاق گیلان میں نامور فاضل اور فضائل صورت و معنی سے آراستہ تھے۔ خصوصاً حکمت نظری اور الٰہیات میں بلند نظر رکھتے تھے۔ مدت تک وہاں صدرالصدور رہے۔ ۹۷۴ھ میں شاہ طہماسپ بادشاہ ایران نے گیلان فتح کیا۔ اور خان احمد فرمانروا وہاں کا اپنی نادانی سے قید ہوا۔ صدرالصدور صدق دل سے اپنے آقا کے ہواخواہ تھے۔ راستی و حق گزاری کے جرم پر قید ہوئے۔ اور شکنجۂ تکلیف میں جان دی۔ علم ان کا درس و تدریس میں اور کمال تصنیف و تالیف میں شہرۂ آفاق تھا۔ جس طرح اولاد روحانی عالم میں نامور ہوئی۔ ویسے ہی بیٹے بھی ہوئے کہ صورت و معنی میں باپ کے خلف الرشید تھے۔ حکیم ابوالفتح حکیم ہمام تیسرے حکیم نورالدین کہ شعر بھی کہتے تھے۔ اور قراری تخلص کرتے تھے۔ یہ تینوں بھائی جودت طبع اور تیزی فہم اور علوم رسمی اور کمالات انسانی میں صاحب کمال تھے۔ چوتھے حکیم لطف اللہ کہ کچھ عرصے کے بعد ہندوستان آئے۔ اور صدی منصب دار ہو گئے۔ مگر چند سال کے بعد مر گئے۔ خاص و عام میں گیلانی مشہور ہیں۔ حقیقت میں لاہیجان علاقہ گیلان کے رہنے والے تھے۔ کتب تاریخ میں ان کی ذات کی توضیح نہیں۔ البتہ عرفی نے جو حکیم ابوالفتح اور حکیم ہمام کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں۔ ان میں حکیم ابوالفتح کو میر ابوالفتح لکھا ہے +

خواجہ حسین ثنائی جب ایران سے ہندوستان آئے۔ اور شعرائے پایہ تخت میں نامور ہوئے تو بیان کرتے تھے۔ کہ میں مشہد میں سلطان ابراہیم مرزا سے ملا کرتا تھا۔ ان تینوں نوجوانوں نے فضل و کمال کا نقارہ بجا رکھا تھا۔ اور مرزا سے کبھی ملا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے مرزا سے پوچھا کہ ملا عبدالرزاق

کے بیٹوں کو آپ نے کیسا پایا۔ فرمایا کہ حکیم ابوالفتح شایاں وزارت ہے۔ حکیم ہمام مصاحب خوب ہے حکیم نورالدین جوان قابل ہے۔ مگر اس کے قیافہ سے خبط کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ **آزاد** دربار اکبری جو ہر انسان کیلئے عجب کسوٹی تھا۔ جب یہاں آئے تو ہر ایک ان میں سے ویسا ہی نکلا جیسا مزانے پرکھا تھا

دنیا کے تمام کام نام پر چلتے ہیں۔ ادھر اکبر کا نام ملک ملک میں پہنچ چکا تھا۔ ادھر ان کا اور ان کے باپ کا نام یہاں پہنچا۔ ۹۸۳ھ میں تینوں بھائی یہاں آئے۔ اور آتے ہی دربار میں داخل ہو گئے حکیم ابوالفتح کی طبیعت میں شائستگی اور لیاقت کا اور ہی عالم تھا۔ زمانے کے مزاج سے واقف تھے اور اہل زمانہ کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ ملا صاحب ان سے ایک برس پہلے آئے ہوئے تھے۔ دیکھنا کیا خفا ہو کر کہتے ہیں۔ بڑے بھائی نے مصاحبت کے زور سے مزاج بادشاہ میں عجب تصرف کیا۔ اور صریح خوشامدوں سے وادی دین و مذہب میں بھی ہمراہی کر کے آگے آگے چلنے لگا۔ اور اعلےٰ درجۂ تقرب حاصل کر لیا۔ کچھ آگے چل کر کمال دل شکستگی کے ساتھ فرماتے ہیں۔ کہ ناگاہ بیر بر حرامزادہ اور شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح نے آگے قدم بڑھا کر دین سے منحرف کر دیا۔ وحی۔ نبوت اعجاز۔ کرامت۔ اور شرائع سے انکار مطلق کر کے کام نکال لے گئے۔ فقیر رفاقت نہ کر سکا۔ ہر ایک کا انجام حال بجائے خود لکھا جائیگا۔ انشاء اللہ۔ بہر حال اتنا اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے نہایت جلد ترقی کی۔ اور بہت ترقی کی۔

بنگالہ کی مہم جاری تھی۔ ایک تو افغان جا بجا فساد کر رہے تھے۔ طرّہ یہ ہوا کہ امرائے ترک میں باہم نفاق ہوا۔ پرانے پرانے امیر اور پشتوں کے خدمتگار نمک حرام ہو کر باغی ہو گئے۔ بادشاہ نے منعم خاں کے مرنے سے چند روز پہلے مظفر خاں سردار کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ بڑے زور شور سے فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ اور جا بجا افغانوں کو دباتا پھرتا تھا۔ اس کی عقل پر ادبار نے ایسا پردہ ڈالا۔ کہ دماغ بلند ہو گیا۔ بے سوچے سمجھے ہر ایک پر جبر کرنے لگا۔ اور اس پر سپاہ کو خرچ سے تنگ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ قدیم الخدمت اور نمک خوار اُسے چھوڑ چھوڑ کر باغیوں میں جانے لگے۔ بادشاہ نے ۹۸۷ھ میں رائے پترداس کو دیوان مقرر کیا۔ اور حکیم ابوالفتح کو صدارت اور امینی کی خدمت عنایت کی کہ اعلےٰ رتبے کا با اختیار عہدہ تھا۔ ساتھ ان کے بہت سے امرا کو بھیجا۔ کہ جو دلدہی اور دلداری سے آجائیں۔ انہیں سنبھالو۔ جو حقیقتاً سرکش ہیں اُنہیں اعمال کی سزا دو۔

دولت بابری کے قدیم الخدمتوں میں بابا خاں اور مجنوں خاں قاقشال وغیرہ کا بڑا بہادر خاندان تھا۔ وہ ابتدا سے مہم بنگالہ میں تلواریں مار رہے تھے۔ اور ان کا بڑا جتھا تھا۔ وہ مظفر خاں کے

ہاتھ سے بہت تنگ تھے۔ اب تازہ بہانہ یہ ہوا کہ ان کی فوج میں داغ کا حکم پہنچا یعنی گھوڑے اور سپاہی کی موجودات دو۔ ساتھ ہی ایک مفسد کابل سے بھاگ کر ان کے لشکر میں جا چھپا۔ مظفر خاں کے نام بادشاہی فرمان پہنچا کہ اسے سزائے اعمال کو پہنچاؤ۔ اس کی سخت مزاجی کو بہانہ قوی ہاتھ آیا۔ اُسے فوراً گرفتار کرا لیا۔ بابا خاں نے روکا۔ مظفر خاں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ اور فرمان دکھا کر مفسد کو سر دربار مروا ڈالا۔ اس بات پر تمام قاقشال طیل بگڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیغ زن اور خونریز لوگ تھے۔ اُسی وقت سر منڈا اپنے مغولی طاقیے پہن سرکشی کا نشان باندھ الگ ہو گئے۔

مظفر خاں نے بہت سی کشتیاں جمع کیں۔ رائے پتر داس اور حکیم ابوالفتح کو کہ ۲۴ جلوس میں دربار سے تازہ زور پہنچے تھے۔ اُن کے مقابلے پر بھیجا۔ مگر حکیم بزم کے یار تھے نہ رزم کے سپہدار۔ پتر داس بیچارہ ہندی کا باچنے والا اس سے کیا ہوتا تھا۔ قاقشالوں نے بھُس کی طرح اُڑا دیا۔ قاقشال تیل کا بڑا انبوہ تھا۔ مفسدوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ اور جمع ہو کر لڑتے مارتے مظفر خاں پر چڑھ آئے اسے بد اقبالی نے ایسا دبایا کہ قلعہ ٹانڈہ کے کھنڈر میں محصور ہو کر بیٹھ گیا۔ حکیم اور رائے اور کئی سردار بڑے دانا تھے۔ سمجھ گئے کہ مظفر کو ظفر کی طرف سے جواب ہے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ باغی دیواروں پر چڑھ کر قلعے میں گھس آئے۔ مظفر کو قید کر لیا۔ اور آخر کار مار ڈالا۔ مگر حکیم اور رائے مع اور سرداروں کے بھیس بدل کر غریب رعایا میں مل گئے۔ اس مل چل میں کسی نے خیال نہ کیا۔ فصیل کو دکر باہر آئے رستہ کھلا تھا۔ گاؤں بہ گاؤں زمینداروں سے راہبر لیتے۔ کہیں پیادہ کہیں سوار خاک پھانکتے ٹٹو ہانکتے حاجی پور کے قلعے میں جا پہنچے۔ مگر پاؤں میں پھپھولے پڑ گئے۔ مخملی مسندیں اور ایرانی قالین سب بھول گئے۔ وہاں سے پھر ہنستے کھیلتے ہوئے دربار میں آن حاضر ہوئے۔ باتوں کے نسخے اور تدبیروں کی معجونیں ان کے پاس موجود رہتی تھیں۔ جزوی و کلی حالات چنانچہ صورت حال کے بموجب عمل میں آئیں۔ اور ان پر اور مرحمت زیادہ ہوئی۔

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ شیخ عبدالنبی صدر نے ائمہ مساجد اور بزرگان مشائخ کی عطائے جاگیر میں اس قدر سخاوت کی کہ جو معافیاں کئی کئی سلطنتوں میں ہوئی ہو نگی۔ وہ کئی برس میں کر دیں۔ علاوہ اسکے کئی باتوں میں بدنام بھی ہوئے۔ ۹۹۰ھ میں اسی شہر لاہور میں تجویز ہوئی۔ کہ کل ممالک محروسہ کی معافیوں کی تحقیقات ہو۔ کئی کئی صوبوں پر ایک با امانت عالی دماغ شخص مقرر ہوا۔ چنانچہ دہلی علاوہ گجرات کی صدارت ان کے نام ہوئی۔ ۹۹۳ھ میں ہفتصدی کا منصب ملا۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اگرچہ منصب ہزاری سے کم رہا۔ مگر ہر وقت کی حضوری اور مصاحبت کے سبب سے ان کی

وزیر اور وکیل مطلق کی طاقت بڑھتی گئی۔ حکیم نام کے ابوالفتح اور حکیموں کے بادشاہ تھے۔ مگر میدان جنگ میں حصّہ لے کر نہ آئے تھے۔ سرحدی افغانوں کی مہم میں ترکی فوج کو ساتھ لے کر گئے۔ وہ اور بہت سے نامی شمشیرزن اور سردار کہ بادشاہی روشناس تھے مارے گئے۔ غنیمت ہے کہ یہ تو جیتے پھر آئے۔ بادشاہ نے جس قدر بیربر کے مرنے کا غم کیا۔ تم نے دیکھ لیا۔ جو امرا زندہ پھر کر آئے وُہ مدّتوں دربار سے محروم رہے۔ چند روز ان کا مجرا بھی بند رہا۔ مگر فیضی۔ ابوالفضل۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ خانخاناں جیسے اشخاص موجود تھے۔ چند روز میں پھر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ ۹۹۷ھ میں جبکہ بادشاہ کشمیر سے پھرے۔ اور براہ مظفرآباد پکھلی اور دمتور سے گزر کر حسن ابدال میں آن اُترے۔ حکیم رستے میں دردِ شکم اور اسہال میں گرفتار ہوئے ماٰثرالامرا میں ہے کہ ان کے حال پر بادشاہ عنایت بے اندازہ و بے نہایت فرماتے تھے۔ منزلوں میں خود دو تین دفعہ عیادت کو گئے۔ اور دلدہی کی۔ کہ صاحب کمال تھے اور یکتائے وقت تھے۔ اور وفادار اور ہواخواہ تھے۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ شاہ علی حسین کے لئے کچھ روپیہ بھیجا کہ تبّت کے محتاجوں کو بھیج دو۔ ایک دن ان کے سبب سے مقام کیا کہ حکیم کو ضعف بہت ہے۔ سوار ہو کر چلنے کی طاقت نہیں۔ آخر حکمت پناہ مذکور نے کہ نبض شناس روزگار تھا دنیا سے انتقال کیا۔ اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ حسن ابدال کا مقام بھی شادابی اور چشمہ ہائے جاری سے کشمیر کی تصویر ہے۔ وہاں خواجہ شمس الدین خافی نے ایک عمارت اور گنبد خوشنما اور چشمہ جاری کے دہانے پر حوض دلنشین بنایا تھا۔ بموجب بادشاہ کے حکم کے وہیں لاکر دفن کیا۔ میر فتح اللہ مرحوم کے زخم پر تازہ زخم لگا۔ حکیم ہمام توران کی سفارت پر گیا ہوا تھا۔ اس کے نام فرمان تعزیت بھیجا۔ جو کہ ابوالفضل کے دفتر اول میں موجود ہے۔ اس کا ایک ایک فقرہ ایک ایک مرثیہ و غمنامہ ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے کمالات اور خدمات نے صدق اخلاص کے ساتھ اکبر کے دل میں کہاں جگہ پیدا کی تھی۔

اب مُلّا صاحب کو دیکھو۔ اس غریب کے جنازے پر کیا پھول برساتے ہیں۔ بادشاہ نے اس برس سیر کابل کا ارادہ کر کے پکھلی سے اٹک کو باگ موڑی۔ اور اس مرور میں منزل دمتور میں حکیم ابوالفتح نے توسن زندگی کی باگ ملکِ آخرت کو پھیر دی۔ تاریخ ہوئی۔ خدا لیش سزا داد ۹۹۷ھ

آزاد۔ اس مصیبت کا عالم دیکھنا چاہو۔ تو اکبرنامہ کی مختصر عبارت کا ترجمہ سُن لو۔ حکیم بہت بیمار تھا۔ مقام کر دیا۔ نکتہ دانی کے باغبان۔ دقیقہ شناس۔ دُوربین۔ شبستانِ ضمائر کے

بیدار دل۔ انجمن نکتہ دانی کے ہوشیار۔ زمانہ کے نبض شناس کا وقت پورا ہوگیا۔ جھمیلوں کے میلے سے الگ ہوگیا۔ اخیر سانس تک ہوش قائم تھے۔ کچھ خطرہ یا پریشانی نہ تھی۔ خاطر قدسی اکبر پر اس حادثۂ غم اندوز سے کیا کہوں کہ کیا گزری۔ جب خرد بزرگ پر سوگواری چھائی۔ تو اس قدر دان بزم آگہی کے غم کا کون اندازہ کر سکے۔ اتنا خلوص اتنی مزاج شناسی۔ خیر اندیشی عام۔ فصاحت زبان۔ حسن جمال قیافہ کی عالی علامتیں۔ ہر باب میں قدرتی نکلینی۔ ذاتی گرمی و گرمجوشی۔ عقل و دانش کہیں مدتوں ہی میں اکٹھی ہو حکم والا کے بموجب خواجہ شمس الدین اور جماعت امرا کو حسن ابدال میں لے گئے۔ اور خواجہ نے جو گنبد اپنے واسطے بنایا تھا۔ اس میں دفن کر دیا۔ دیکھو کس نے بنایا اور کس طرح سے بنایا۔

نگارندۂ اقبال نامہ (یعنی ابوالفضل) سمجھ بیٹھا تھا۔ کہ میں بے صبری سے تنگ گلی سے نکل گیا۔ اور فرحت گاہ خورسندی میں آرام گاہ حاصل کر لی۔ اب کوئی رنج مجھ پر اثر نہ کر سکیگا۔ مگر اس غم نے پردہ کھولدیا۔ قریب تھا کہ بیقراری سے تڑپ اُٹھے۔ اُس نے سعادت جاودانی حاصل کی۔ کہ ملکے کی جان اپنے خداوند کے قدموں میں دی۔ خدا سے اُمید ہے۔ کہ سب خدا پرست اس کے سامنے ہی جان دیں۔

ملک الشعرا شیخ فیضی نے عضد الدولہ اور حکیم کے مرثیے میں قصیدہ رشتہ نظم میں پرویا۔ ساوجی نے تاریخ بھی فوت کی اسی انداز میں کہی (دیکھو شاہ فتح اللہ شیرازی کا حال)

حکیم ہمام سفارت توران سے واپس آئے تھے۔ پاربک آب کی منزل میں آکر سرعجز کو زمین پر رکھ دیا۔ اور فرق خوش نصیبی کو آسمان تک پہنچایا۔ انہیں دیکھ کر بادشاہ کو رنج تازہ ہوا۔ ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں کہ فرمایا۔ تر ایک برادر بود از عالم برفت ؎

ازحساب دو چشم یکتن کم	وزحساب خرد ہزاراں بیش

بادشاہ کی برکت انفاس سے حکیم کا دل بے تاب ٹھکانے ہوا۔ دعا و ثنا بجالایا۔ وغیرہ وغیرہ ان لوگوں کی خوبیوں نے بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا۔ جب پھر حسن ابدال کی منزل پر پہنچے تو قیام کیا۔ حکیم کو یاد کر کے افسوس کیا۔ اور ان کی قبر پر گئے۔ ہائے استاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

مرے مزار پہ کس طرح سے نہ برسے نور	کہ جان دی ترے روے عرق فشاں کیلئے

فاتحہ پڑھ کر دعاے مغفرت کی۔ اور ذکر خیر سے یاد کرتے رہے۔ اور اکثر صحبتوں میں ایسا ذکر ہوا کرتا تھا۔

مآثر الامرا میں عبارت مذکور کے بعد شیخ لکھتا ہے۔ اہل ضرورت کا کام ایسی دلی کوشش سے

کرتے تھے کہ گویا اسی واسطے نوکر ہوئے ہیں۔ اور اس خدمت سے کبھی اپنی جان کو معاف نہ کرتے تھے۔ کریم الصفات تھے۔ اور زمانہ کے محسن تھے۔ کمالات میں یگانے تھے۔ اور شعرائے زمانہ کے مدوح تھے۔ حکیم صاحب کے علم و فضل اور جواہر کمالات کے باب میں کچھ کہنا فضول ہے۔ ابوالفضل جیسے شخص کو دیکھو کیا کہ گئے۔ ان کے ایک ایک لفظ نے صفحوں کا عطر کھینچا ہوا ہے۔ البتہ چند موقع جو میں نے کتابوں میں دیکھے دکھانے چاہتا ہوں۔ کہ ان کی زیرکی۔ تیزی فہم۔ رمز شناسی۔ مصلحت بینی نکتہ دانی پر اکبر کو کیسا بھروسہ تھا۔ اور کیسا تیر بہدف نسخہ خلوص عقیدت کا تھا جس نے چند سال حضوری میں پشتوں کے نمک خواروں سے آگے بڑھا دیا۔ ۹۹۶ھ میں ایک بزرگ اہل معرفت کا لباس پہن آگرہ سے جالیسر میں آئے۔ اور معرفت کی دکان کھول دی۔ ہزاروں احمقوں کو کھینچ لیا۔ یہاں تک کہ شیخ جمال بختیاری جو بنگالہ میں افغانوں کے پیر تھے۔ وہ بھی پھندے میں پھنس گئے۔ یہ سن کر بادشاہ کو خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ حکیم صاحب اور میرزا خاں (عبدالرحیم خان خاناں) کو بھیجا کہ کھوٹے کھرے کو پرکھو۔ اور ارادہ معلوم کرو۔ کھرے ہوئے تو مسند ہدایت ان کا حق ہے۔ ورنہ خلق خدا کو خراب کرینگے دونوں رئیسوں کے مرشد تھے۔ جا کر صحبتیں گرم کیں۔ اور زبان کی نبض سے دل کا احوال معلوم کیا اندر کچھ بھی نہ تھا تو حکمت عملی سے سارے حلقہ کو حضور میں لے آئے۔ شیخ جمال نے سجدہ عقیدت سے جمال معنی روشن کر لیا۔ فقیر کی جھولی میں سوا دغا کے کچھ نہ تھا۔ حکم ہوا کہ خلوت خانہ ندامت (قید) میں بیٹھے

وہ انسانیت کا صراف انہیں خوب تاڑ گیا۔ جب ایسے اشخاص کے حالات کی تحقیق کی ضرورت ہوتی تھی۔ تو ان کی معرفت دریافت کرتا تھا۔ کہ اہل معرفت کے۔ اہل اللہ کے بلکہ اللہ کے پہچاننے والے تھے۔ باتوں باتوں میں بات تو کیا ہے۔ پتال کا پتہ نکال لیتے تھے۔ لیکن ایک معاملہ ملا صاحب نے ایسا لکھا ہے جسے پڑھ کر آزاد حیران و سرگردان ہے۔ فرماتے ہیں کہ ۹۹۷ھ میں بادشاہ کشمیر گئے۔ شاہ عارف حسینی سے ملاقات ہوئی۔ وہ منہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ بادشاہ نے کشمیر میں اسی غرض سے شیخ ابوالفضل اور حکیم کو ان کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے سلسلہ تقریر میں کہا۔ شاہا کیا مضائقہ ہے اگر نقاب اٹھا دو۔ ہم بھی تمہارا جمال دیکھ لیں۔ نہ مانا اور کہا۔ ہم فقیر لوگ ہیں۔ جانے دو بہت نہ ستاؤ۔ حکیم کے مزاج میں شوخی اور بیباکی زیادہ تھی۔ ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ نقاب کھینچ لے۔ شاہ خفا ہوئے۔ اور کہا۔ معاذ اللہ۔ میں مجذوم یا معیوب نہیں۔ لے دیکھ میرا منہ۔ گریبان چاک کر ڈالا اور نقاب زمین پر پھینک دیا۔ حکیم میرا منہ تو تو نے دیکھا مگر نتیجہ انشاء اللہ العزیز انہیں دو ہفتے میں دیکھے گا۔ ۱۵ دن نہ گزرے تھے۔ کہ اسی راہ میں اسہال سے حکیم کا انتقال ہوا۔ یاد کرو جس دن حکیم صاحب

بیمار ہوئے۔ اسی دن بادشاہ نے کچھ روپیہ شاہ موصوف کو بھیجا۔ اس سے یہی غرض ہوگی کہ ان کا غصہ فرو ہو جائے۔ اور دعائے خیر کریں۔ ابوالفضل اس کوچہ کی خاک تھے۔ اور خاکساروں کی رسم و راہ سے واقف تھے۔ ان کے حالات فقیرا کے ساتھ تمام فرامین بادشاہی ہیں۔ اور جو مراسلات و عرائض خود امراء و شاہزادوں کو لکھے تھے۔ ان سے بھی کھلتا ہے۔ جہاں اور باتوں کی تاکید لکھتے ہیں۔ فقرا اور دل شکستوں کی دریوزہ گری پر بہت زور دیتے ہیں۔ دیکھو! بادشاہ کے حکم سے چلے گئے۔ مگر الگ رہے ؎

۹۹۵ھ میں مرزا سلیمان حاکم بدخشان عبداللہ اوزبک کے ہاتھ میں ملک چھوڑ کر دوبارہ ادھر آیا اور اکبر نے اس کی پیشوائی اور مہمانداری ایسی دھوم دھام سے دکھائی گویا ہندوستان نے اپنی ساری شان و شکوہ اگل دی۔ شہزادہ مراد پانچ چھ برس کا تھا۔ ٹوڈرمل۔ آصف خاں۔ ابوالفضل۔ حکیم ابوالفتح وغیرہ امرائے جلیل القدر اس کے ساتھ کر کے کئی منزل آگے پیشوائی کو بھیجا۔ شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کو حکم ہوا۔ کہ وقت ملاقات کے بہت پاس ہوں۔ اور کمینگاہ جواب میں لگے رہیں۔ دونوں کی طرز دانی بمعاملہ فہمی۔ ادب شناسی نے ایسے ہی دل پر نقش بٹھائے ہوں گے۔ جو ایسے نازک موقع پر یہ خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ ابوالفضل ان سے ایک برس پہلے آئے تھے۔ ملا صاحب نے طبیبوں کے سلسلہ میں پھر ان کا حال لکھا ہے۔ اور وہاں جو عنایت کی ہے۔ وہ بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی خدمت میں انتہا درجہ کا تقرب حاصل کیا تھا۔ اور ایسا تصرف مزاج میں پیدا کیا تھا کہ تمام اہل دغل رشک کرتے تھے۔ تیزی فہم۔ جودت طبع۔ کمالات انسانی اور نظم و نثر میں ممتاز کامل تھا۔ اسی طرح بے دینی اور اوصاف ذمیمہ میں بھی ضرب المثل تھا۔ جن دنوں حکیم نیا نیا آیا۔ ان دنوں میں نے سنا ایک دن بیٹھا کہہ رہا تھا۔ خسرو ہے۔ اور وہی بارہ شعر ہیں۔ **انوری انوری** ایک مداح کہا کرتا تھا۔ **میر بادنجان** اس کا نام رکھا تھا۔ (کہ ایران میں ایک مشہور مسخرہ تھا) **خاقانی** کو کہا کرتا تھا کہ اگر اس زمانہ میں ہوتا تو خوب ترقی کرتا۔ میرے ہاں آتا میں ایک تھپڑ مارتا۔ طبیعت ذرا کاہلی کو چھوڑتی وہاں سے ذرا شیخ ابوالفضل کے ہاں جاتا وہ مارتا اسی طرح اصلاح دیتے" جو شخص ملا صاحب کی تاریخ کو پڑھے گا۔ بلکہ دربار اکبری میں بھی کہیں کہیں ان کی باتیں سنیگا سمجھ جائیگا کہ ان کی طبیعت کا یہ حال تھا۔ کہ کسی کو ترقی کرتے نہ دیکھا جاتا تھا۔ جسے عزت کے کپڑے پہنے دیکھتے تھے۔ ضرور نوچتے تھے۔ سوا اہل علم کے زیادہ کہ ہم پیشہ ہیں۔ ان میں سے اگر شیعہ ہے۔ تو کیا کہنا شکار ہاتھ آیا۔ اس کی کہیں داد فریاد نہیں۔ چند روز پہلے کوئی شخص شیعہ مذہب کو ظاہر ہی نہ کر سکتا تھا۔ ۹۸۳ھ کے بعد انہی چند

اشخاص کے آنے سے اتنا حوصلہ پیدا ہؤا۔ کہ شیعہ چپکے چپکے اپنے تئیں شیعہ کہنے لگے۔ اور اُس کا بھی ملّا صاحب کو بڑا داغ تھا۔ اور اگر شیعہ نہیں تو خیر۔ ان کی باتیں چلتے رہتے تھے۔ اور گرہ میں باندھتے جاتے تھے۔ جہاں موقع پاتے تھے۔ وہیں ایک سوئی چبھو دیتے تھے۔ حق سے نہ پھروں گا تاریخ نویسی کے اوصاف میں پورے تھے۔ عبارت مذکورہ میں جو حکیم صاحب کے حق میں لکھی ہے۔ ہر چند غصّے نے بہت زور کیا۔ مگر اوصاف علمی کے باب میں حق نویسی نے ہرگز نہ مانا جو لکھنا تھا وہی لکھا +

بے دینی کا جو نشتر مارا۔ کچھ بجا۔ کچھ بے جا۔ تشیّع کے سبب سے بے دین کہا تو اسکی شکایت نہیں۔ ہاں اس جُرم پر کہ دربار میں جو ہوا چل رہی تھی اس میں کیوں آ گئے۔ اس کے جواب میں انصاف خاموش نہیں رہ سکتا۔ دیکھو جس بادشاہ کے وہ نوکر تھے۔ جس کا وہ نمک کھاتے تھے۔ اُس کے ہزاروں معاملے تھے۔ کوئی مصلحت ملکی تھی۔ کوئی خوشی دل کی تھی۔ اور یہ لوگ فقط آدمی کے طبیب نہ تھے۔ عالم۔ نبض شناس اور زمانہ کے طبیب تھے۔ جو ان کی راہ دیکھتے تھے۔ اسی راہ چلتے تھے۔ نہ چلتے تو کیا کرتے۔ جہاں جاتے وہاں اُس سے بدتر حال تھا۔ یہاں علم و کمال کی قدر تو تھی۔ مگر اور جگہ یہ بھی نہ تھا۔ یہاں تھے۔ اور اپنے عالی اختیارات کو بندگان خدا کی کارپردازی اور کارروائی میں اس طرح کرتے تھے۔ گویا اس کے نوکر ہیں یا اسی واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ مآثر الامرا میں ایک فقرہ ان کے باب میں لکھا ہے۔ گویا انگوٹھی پر نگینہ اور نگینے پر نقش بیٹھا ہے۔ "درمہم سازی مردم خود را معاف نہ داشتے"۔ جو کماتے تھے کھاتے تھے کھلاتے تھے۔ لٹاتے تھے۔ نیک نامی کے باغ لگاتے تھے۔ ایسے تھے۔ کہ ان کی بے دینی کے سائے میں سینکڑوں دیندار پرورش پاتے تھے۔ عالم فاضل باکمال عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ملّا صاحب کے مرید ہوتے ان کی طرح بیٹھے رہتے۔ اور یہ خوش ہوتے جو ان کا حال ہے وہی ان کا۔ جو اُنہوں نے قوم کو فائدہ پہنچایا وہی ان سے پہنچتا۔ ان کی تاریخ بداؤنی میں کل پانچ چھ شخص تھے جن سے آپ خوش رہے۔ ورنہ سب پرلے دے مار دھاڑ ہے۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ تمام دنیا کے لوگ اہل معرفت اور اولیاء اللہ ہو جائیں۔ الیسا ہو تو دنیا کے کام بند ہو جائیں۔ سبحان اللہ مولانا روم کو دیکھیں کیا فرماتے ہیں ؎

	میل آنرا در دلش انداختند		ہر کسے را بہر کارے ساختند	

ملّا صاحب نے کئی جگہ بڑی بے دماغی سے فرمایا ہے۔ "میں اس واسطے حضوری سے الگ ہو گیا" آزاد کہتا ہے۔ الگ ہوئے تو کیا ہؤا۔ کیسی کیسی کتابوں کے ترجمے کئے۔ کیوں کئے۔ کیے نہ

پڑھے۔ اور اخیر کو سجدہ بھی کیا۔ فرق اتنا رہا کہ یہ لکھتے گئے اور گالیاں دیتے گئے۔ وہ ہنستے گئے۔ کھیلتے گئے۔ آقا کا کام حسب دلخواہ کیا۔ عقیدہ اپنا دل کے ساتھ ہے۔ مصاحبت میں وزارت اور وکیل مطلق کی طاقت سے قوم کی کارپردازی کرتے تھے۔ جو بات ناگوار ہوتی۔ اسی طرح تعمیل کرتے۔ گویا ان کا عین مذہب یہی ہے۔ جب گھر میں آتے۔ سب ہم مشرب مل کر ہنسی میں اڑا دیتے۔ مجھے نہیں ثابت ہوا کہ ان کے عقیدے میں کچھ بھی فرق ہوا۔ بات یہ ہے کہ جب وہ ہندوستان میں آئے۔ تو ایک حمام نظر آیا۔ جس میں مشائخ امیر غریب سب ننگے ہیں۔ انہوں نے بھی کپڑے اُتار کر پھینک دیئے۔

تم جانتے ہو۔ اہل ایران کو جیسے نور کے چہرے خدا نے دئے ہیں۔ ویسی ہی ڈاڑھیاں بھی دی ہیں۔ ان میں جو رکھنے والے ہیں وہی ان کی قدر دانی بھی کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کی ڈاڑھی بھی قابل تصویر تھی۔

مُلّا صاحب فرماتے ہیں۔ ابتدائے ملازمت میں چوبیس پچیس برس کی عمر ہوگی۔ ایک دن میں میر ابوالغیث بخاری کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ حکیم نے میری ڈاڑھی مقدار معمولی سے چھوٹی دیکھی کہا۔ تم بھی قصر کرتے ہو۔ دمنڈاتے ہو، میں نے کہا حجام کی تقصیر ہے۔ فقیر کی نہیں۔ حکیم نے کہا پھر ایسا نہ کرنا بدنما اور نازیبا ہے۔ چند روز بعد لنڈ منڈ صفاچٹ رندوں لونڈوں سے بھی آگے نکل گیا۔ ایسی بال کی کھال اُتارتا تھا کہ نوجوان مردوں کو دیکھ کر رشک آئے۔ ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ انہیں آقا کی تعمیل حکم یا مصلحت ملکی یا خوشی کے لئے کوئی کام کرنا اور بات ہے۔ بے دینی اور بات ہے۔ بے دینی جب ہے کہ اُسے حلال شرعی سمجھ کر اختیار کرے۔ آزاد گنہگار روسیاہ کو ایسے معاملہ میں بولنا خود ناروا ہے۔ مگر بعض موقع ایسا آجاتا ہے۔ کہ بولے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس زور شور کی دینداری اکبر بادشاہ کے امام۔ باوجود اس کے ڈاڑھی کا شوق انہی فقروں سے معلوم ہوگیا۔ ستار بجاتے تھے۔ بین بجاتے تھے۔ گلے سے بھی گاتے تھے۔ دو دو طرح شطرنج کھیلتے تھے۔ بس آگے نہیں کہا جاتا۔ اور نہ کہنا مناسب ہے۔ خدا ستار العیوب ہے۔ کیا ضرور ہے کہ ناحق کسی کا پردہ فاش کروں۔ **اخلاق ذمیمہ** کے لفظ پر اشتیاق منتظر تھا کہ دیکھئے۔ کیا کیا شگوفے کھلائینگے۔ مگر سند اس کی فقط وہی نکلی کہ انوری کو یہ کہتے تھے۔ اور خاقانی کو وہ کہتے تھے ملا صاحب نے خود سینکڑوں کی خاک اُڑا دی۔ عالم فاضل پیر فقیر غریب امیر کون ہے۔ جو آپ کے قلم سے سلامت نکل گیا۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے مزاج شگفتہ۔ طبیعتیں بشہ رخ۔ خیالات

پڑھے ہوئے تھے۔ خود صاحب کمال تھے۔ دل ایک دریا ہے۔ ہزاروں طرح کی موجیں مارتا ہے۔ کبھی یہ رنگ بھی آگیا۔ وُہ خود اس فن کو لے کر بیٹھتے تو انوری و خاقانی سے ایک قدم بھی پیچھے نہ رہتے۔ بے شک میدانوں آگے نکل جاتے۔ ان کی انشاپردازی دیکھنی چاہو تو چار باغ دیکھو۔ خیالات شاعرانہ میں فلسفہ و حکمت کے پھُول برس رہے ہیں۔ اور یہ گل افشانی جمع خرچ زبانی نہیں۔ فتاحی دیکھو۔ شیخ سینا کی روح کو آبِ حیات پلایا۔ قیاسیہ دیکھو۔ حکمت اور شریعت کا یہ عالم ہے۔ کہ شربت و شیر کی دو نہریں برابر بہی جاتی ہیں۔ ملّا صاحب کی تحریریں پڑھتے پڑھتے میری بھی رائے بدلنے لگی تھی۔ مگر ایک واردات میری نظر سے گزری۔ ان کی محبت قومی اور ہمدردی نے تین سو برس کی راہ سے آواز دی۔ اور میں اپنی جگہ تھم گیا۔

واردات۔ شہباز خاں کنبوہ مسائل شرعی کے بڑے پابند تھے۔ یہاں تک کہ موقع پر برسر دربار بے لطفی ہوگئی۔ ایک دن شام کے قریب بادشا ٹہلتے تھے۔ چند مصاحب امرا ساتھ تھے۔ ان میں خان موصوف بھی تھے۔ عصر کا وقت تنگ ہو گیا۔ خان موصوف الگ ہوئے اور یک طرف زمین پر اپنی شال بچھا کر نماز پڑھنے لگے۔ ان دنوں بادشاہ دینداروں سے تنگ تھے۔ اتفاق یہ کہ ٹہلتے ہوئے وُہ بھی ادھر آنکلے۔ اور دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ جب شہباز خاں نماز پڑھ کر آئے۔ تو دیکھا کہ حکیم ابوالفتح اور پہلوؤں سے ان کی تعریف کر رہے تھے۔ مطلب اس سے یہی تھا۔ کہ ان کی طرف سے دل میں غبار نہ آئے۔ اگر حکیم صاحب حقیقت میں بے دین یا دشمن اہل دین ہوتے تو شہباز خاں پر چھینٹا مارنے کا پہلو اس سے بہتر کب ہاتھ آتا ✦

تصنیفات۔ میں جو کہ نظر سے گزریں۔ فتاحی شرح قانونچہ تخمیناً ۵۰ صفحہ کی کتاب ہے ✦

قیاسیہ۔ برائے نام اطلاق ناصری کی شرح ہے۔ حقیقت میں اُس کے ایک ایک مسئلہ کو کہ براہین فلسفہ پر مبنی ہے۔ دلائل نقلی سے ثابت کیا ہے۔ اور آیتوں اور حدیثوں سے مطابقت دی ہے۔ تخمیناً چودہ سو صفحہ کی کتاب ہوگی ✦

چار باغ۔ اس میں خطوط اور نثریں ہیں۔ اکثر حکیم ہمام اپنے بھائی۔ شیخ فیضی۔ شیخ ابوالفضل خان خاناں۔ میر شمس الدین خاں خانی وغیرہ امرا اور اہل کمال کو لکھے ہیں۔ نثروں میں اکثر مسائل حکمت پر خیالات ہیں۔ یا بعض کتابوں کی سیر کر کے جو رائے قرار پائی۔ اُسے عمدہ عبارت میں ادا کیا ہے۔ بزرگوں سے سُنا ہے۔ کہ اور تصنیفیں بھی تھیں۔ مگر نہیں ملتیں۔ ان کی شوخ طبعی نے بہت سے مقولے تجربوں کے ساتھ ترکیب دے کر ضرب المثل بنا رکھے ہیں۔ چنانچہ انہیں میں سے ہیں۔ ۱؎ جس پہ

۱؎ یہی مقولے صفحہ ۶۷۲ پر قراری سے منسوب کئے ہیں ۱۲

اعتبار کرو وہی معتبر (اعتبار کسی کا نہیں)۔ (۲) ہمت کا دکھانا طمع کا دکھانا ہے۔ (۳) بدمزاج ہنسنا چاہو تو بازاری مرد کو ذکر رکھو۔ عرفی نے ان کی تعریف میں کئی قصیدے کہے۔ اور بڑی دھوم دھام کے کہے۔ حکیم صاحب نے بھی انہیں اس طرح رکھا کہ جب تک جیئے اور کے پاس جانے کی نوبت نہ ہوئی۔ اس کے بعد خانخاناں کے پاس گئے۔ اگلے وقتوں میں عام دستور تھا۔ کہ اگر اہل علم اور اہل کمال زمانے کی بے وفائی سے بے دست و پا ہو جاتے تھے تو اور صاحب دستگاہ انہیں سنبھال لیتے تھے۔ کہ پردہ فاش نہ ہوتا تھا۔ افسوس ہے آج کے زمانے کا کہ اپنا ہی سنبھالنا مشکل ہے۔ کوئی کسی کو کیا سنبھالے۔ حکیم موصوف کی تعریف میں ملا ظہوری نے دکن سے قصیدے لکھ لکھ کر بھیجے۔ اور وہیں چلے پہنچے۔

آزاد۔ عرفی کیا کہینگے اور ظہوری کیا بھیجینگے۔ انہیں کی مروتوں کے رس تھے۔ جو انکی زبانوں سے ٹپکتے تھے۔ میں نے حکیم صاحب کی تحریر سے آنکھیں روشن کی ہیں۔ ایک پرانا نسخہ قاموس دیکھا۔ کہ جہانگیر اور شاہجہاں وغیرہ بادشاہوں کے کتبخانوں میں کرسی نشیں ہوتا آیا تھا۔ کتب خانہائے شاہی کی مہریں اس کے رتبۂ عالی کے لئے محضر بناتی تھیں۔ اس کے ابتدائی صفحوں میں ان کے ہاتھ کی ایک عربی عبارت لکھی ہوئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ یہ خزانہ فاخر ملک یہلے ذاخر مجھے اس شخص نے دیا۔ جسے خدا نے دونوں جہان کا کمال اور دونوں ملکوں کی ریاستیں دیں۔ مرزا خان خاناں۔ کہ نام کے نقطے بدل کر پڑھو تو فارسی میں جان جاناں ہے۔ کتبہ

ابوالفتح الکیلانی اللاھجانی۔

ان کے بیٹے حکیم فتح اللہ تھے۔ جہانگیر کے عہد میں کابل کے مقام پر خسرو کی سازش کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ کی تحقیقات شروع ہوئی۔ اور کئی شخصوں پر الزام ثابت ہوا۔ انہیں میں یہ بھی تھے۔ انہیں یہ سزا ملی کہ اُلٹے گدھے پر سوار کرتے تھے۔ اور منزل بمنزل لیئے آتے تھے۔ آخر اندھا کر دیا۔

شاہجہاں نامہ میں ایک جگہ نظر سے گزرا کہ حکیم ابوالفتح کا پوتا ضیاء اللہ نہ صدی منصب پر تھا۔ شاہ فتح اللہ شیرازی اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے غم میں شیخ فیضی کا خون جگر ہے۔ کہ قصیدہ کے رنگ میں کاغذ پر ٹپکا ہے۔

حکیم ہمام

حکیم ابوالفتح سے چھوٹے تھے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ علم و فضل اور حسن لیاقت میں ان کے بھائی تھے۔ ساتھ ہی آئے۔ ساتھ ہی ملازمت ہوئی۔ اصلی نام ہمایوں تھا۔ اکبری دربار میں یہ نام لینا ترک ادب تھا اسلئے چند روز ہمایوں قلی رہے۔ پھر اکبر ہی نے ہمام نام رکھا۔ انہیں باعتبار خدمتوں اور منصبوں کے اور فتوحات اور مہمات کے وہ ناموری حاصل نہیں ہوئی۔ جو دربار اکبری کے اور ارکین کو ہوئی۔ مگر جن لوگوں نے قربت حضوری اور وفا اور اعتبار سے دل میں جگہ پیدا کی تھی۔ ان میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انتظام دفتر اور ضوابط و آئین کے لئے جو جلسہ مشورت ہوتے تھے۔ اُنکے بھی رکن ہوتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کمیٹیوں کی روئدادیں آج نہیں جو معلوم ہو کہ ہر شخص کی قوت ایجاد نے ان معرکوں میں کیا کیا کارنامے دکھائے تھے۔ انکی تقریریں اور اختلاف رائے اور ایک کی رائے دوسرے کی رائے میں اصلاح اور اس میں لطائف اور ظرائف کی چہلیں قابل دیکھنے کے ہونگی۔ ابوالفتح فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی اور یہ دونو بھائی۔ راجہ ٹوڈرمل۔ نظام الدین بخشی وغیرہ اشخاص مہات ملک اور معاملات دربار میں ایک جتھے کے لوگ تھے۔ فیضی کی انشا میں حکیم ہمام کے نام بہت خط ہیں۔ جن کے دیکھنے سے اُس وقت کے جلسے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بڑے زندہ دل اور عجیب شگفتہ مزاج لوگ تھے۔ اگرچہ منصب شش صدی سے زیادہ نہیں بڑھا مگر اعتبار اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ دسترخوان خاصہ ان کے سپرد تھا ؛

حق پوچھو۔ تو ایک ہی نقطہ پوری کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ کہ ملّا صاحب نے اس کی خاک اُڑا دی۔ اور ان کی برائی کا نکتہ نہیں چھوڑا۔ سب کچھ کہ دیا ہے۔ مگر علم و فضل اور لیاقت اور قابلیت پر حرف نہیں الٹے۔ صاف سمجھ لو کہ نہ پایا۔ وہ نہ وہ کس سے چوکنے والے تھے۔ مخدوم اور صدر کس سال بدنصیب اپنے ہم مذہب تھے۔ ان کی علمیت کی وہ مٹی خراب کی ہے۔ ان لوگوں کو ایسا ہی پایا تھا۔ جب اتنا کہا ہے۔ اور کچھ شک نہیں۔ یہ لوگ عجوبہ روزگار تھے۔ جس طرح اکبر جیسا بادشاہ با اقبال ہونا مشکل ہے۔ اسی طرح ایسے لوگ پیدا ہونے مشکل +

یہ فقط بادشاہ کے لئے نہیں۔ زمانہ کے مزاجدان اور عالم کے نبض شناس لوگ تھے۔ اہل علم اور اہل کمال کی کچھ اس وقت انتہا نہ تھی بے شمار موجود تھے۔ آخر کچھ بات تھی کہ بادشاہ انہیں کا نام

لے کر ہر وقت پکارتا تھا۔ اور جو بات یا جو صلاح پوچھتا تھا۔ اس کا نتیجہ ایسا پاتا تھا کہ مزاج زمانہ اور مصلحت وقت کے موافق ہوتا تھا۔ اور یہ سکّہ نہ فقط شاہ بلکہ شاہزادوں تک کے دلوں پر نقش تھا۔ خصوصاً جبکہ اپنے قومی نمکخواروں سے بے وفائیاں دیکھتے تھے۔ اور بابر اور ہمایوں کے ساتھ ان کے معاملے یاد کرتے تھے۔ تو ان کے استاد وفا کے حروف زیادہ روشن نظر آتے تھے۔ دل کا حال ایک بات میں کھل جاتا ہے۔ تزک میں دیکھو جہانگیر کس محبت سے لکھتا ہے *

ان کی ملکی خدمتیں سوا اس کے کچھ نہیں۔ کہ جب عبداللہ خاں اوزبک نے مراسلہ اور ممالک ماوراءالنہر کے تحائف دربار اکبری میں بھیجے تھے۔ اور میر قریش لے کر حاضر ہوا۔ تو ۹۹۴ھ میں اس نے اسکا جواب اور تحائف گراں بہا مرتب کئے۔ اور حکیم موصوف کو سفارت کی خدمت میں روانہ کیا۔ نامہ مذکور میں کہ شیخ ابوالفضل کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے باب میں یہ الفاظ درج ہیں "ارادت و حکمت پناہ زبدہ مقربان ہوا خواہ۔ عمدہ محرمان کار آگاہ حکیم ہمام کہ مخلص راست گفتار۔ اور مرید درست کردار ہے۔ اور ابتدائے سلطنت سے بساط قرب کا ملازم رہا ہے۔ اس کی دوری ابتک کسی صورت سے تجویز نہیں ہوئی۔ اب بنیاد محبت اور قواعد مودت کے استحکام کے لئے روانہ کرتے ہیں۔ ہماری ملازمت میں اس کو وہ قرب حاصل ہے۔ کہ مقاصد و مطالب کو بے کسی واسطے کے مقام عرض میں پہنچاتا ہے۔ اگر آپ کی مجلس شریف میں بھی اسی اسلوب کی رعایت ہوگی۔ تو گویا آپس میں بے واسطہ باتیں ہو جائیں گی" *

جب تک یہ توران میں تھے۔ بادشاہ اکثر یاد کرتے تھے۔ حکیم ابوالفتح سے کہا کرتے تھے۔ حکیم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا بھائی ہے۔ اس لئے تمہارا دل اس کے لئے ہم سے زیادہ بے چین ہے۔ حکیم ہمام کہاں پیدا ہوتا ہے۔ دسترخوان پر بھی کہا کرتے تھے۔ جب سے حکیم ہمام گیا۔ کھانے کا مزا جاتا رہا۔ (مآثر) یہ اُدھر سے آنے والے تھے۔ کہ ادھر حکیم ابوالفتح مر گئے۔ بڑی دلداری اور غمخواری سے فرمان تسلی ان کے نام روانہ کیا۔ اس میں میر فتح اللہ شیرازی کے مرنے کا بھی بہت افسوس کیا ہے۔ اس سفارت سے ۹۹۶ھ میں واپس آئے۔ اکبر اس وقت کابل کے دورے سے ہندوستان کو پھرا۔ چلا آتا تھا۔ کہ یہ بھی قریب آن پہنچے۔ اشتیاق نے ایسا بیقرار کیا۔ کہ جو ایلچی وہاں سے ساتھ آیا تھا۔ اُسے بھی اور اپنے ساتھیوں کو بھی رستے میں چھوڑا۔ شوق کے پر لگا کر اُڑے۔ اور دو منزلہ سہ منزلہ کرتے حضور میں آن پہنچے۔ پیارے آقا کی حضوری اور دوستوں کی ملاقاتیں جو تین برس کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔ بڑی خوشی کے ساتھ ہوتیں مگر بھائی کی موت نے سب کو بے مزا کر دیا۔ یہ ملازمت بادشاہ کی اور

گفتگو میں احباب کی کہ ایک ایک اُن میں ملک معنی کا بادشاہ تھا۔ سننے کے قابل ہوگی۔ طالب آملی نے ایک رباعی کہہ کر سنائی ؎

مہر دو برادرم کہ رمساز آمد	او شد بسفر۔ وین زسفر باز آمد
او رفت بدنبالۂ او عمر برفت	وین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

اکبر نے اسی وقت کہا کہ تیسرے مصرعہ کا دنبالہ بڑھاتا ہے۔ یوں کہو ع

او رفت وز نقشش مرا عمر برفت

مرنے کے ساتھ کون مرگیا ہے چند روز کے بعد پھر وہی مصاحبت کے جلسے تھے۔ اور یہ تھے۔ ایک دن اُنہوں نے **معجم البلدان** حضور میں پیش کی۔ اور کہا کہ اس میں بہت مفید اور دلچسپ مطالب ہیں۔ اگر فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو اس کے فوائد عام ہو جائیں۔ چنانچہ عرض قبول ہوئی ٭ تاریخ الفی کی تاریخ میں بھی انہوں نے حصہ پایا۔ مقام لاہور ۱۰۰۲ھ کے اخیر میں دنیا سے انتقال کیا۔ اور حسن ابدال میں جا کر بھائی کے پاس سو رہے۔ شیخ کہتے ہیں۔ دو مہینے دق کی بیماری سے دق رہ کر قید ہستی سے چھٹ گئے۔ خوش قیافہ۔ بادشاہ گوہر۔ شگفتہ رو۔ فصیح زبان تھے بندگان خدا کی کارسازی میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ دانش طبعی اور عقلی سے آشنا تھے۔ اور ایکاؤں کی خدمت سے سربلند تھے۔ بادشاہ نے دعاے مغفرت کی اور گوناگوں عنایتوں سے پس ماندوں کے دل بڑھائے۔ اب ملّا صاحب کو دیکھو۔ ان کی ہمدردی انسانیت کا حق کیونکر ادا کرتے ہیں ان کے مرنے کے باب میں فرماتے ہیں ٭

حکیم حسن۔ شیخ فیضی۔ کمالاے صدر روہی شاہ فتح اللہ شیرازی والے) حکیم ہمام بہ ترتیب مہینے کے اندر اندر عالم سے نکل گئے۔ اور وہ سارے جمع کئے ہوئے مال ایک دم میں اپنے ٹھکانے پہنچے۔ دریارئے قلزم و عمان میں بہے۔ ان کے ہاتھوں میں باد حسرت کے سوا کچھ نہ رہا۔ اور یہ بات تمام اہل قربت زندوں اور مردوں کے لئے عام ہے۔ کہ باوجود خزائن قارونی و شدادی کے کفن سے محروم جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ زمرہ اطبا میں پھر لکھا ہے۔ حکیم ہمام یہ ابوالفتح کا چھوٹا بھائی تھا۔ مگر اخلاق میں بڑے سے بہتر تھا۔ اگرچہ شریر محض نہ تھا۔ مگر شریر محض بھی نہ تھا **آزاد** باوجودیکہ یہ لوگ شگفتہ مزاج تھے۔ مگر کسی کتاب میں ان کے اوضاع و اطوار کے باب میں کوئی اشارہ خلاف وضع نظر نہیں آیا۔ ملّا صاحب مالک ہیں جو چاہیں فرمائیں۔ حکیم ہمام کے دو بیٹے تھے۔ اوّل حکیم **حاذق**۔ ماثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ فتح پور سیکری میں پیدا ہوئے۔ جب اُن کے

والد کا انتقال ہوا۔ تو لڑکے تھے۔ چونکہ خاندان علم و حکمت سے تھے۔ بزرگوں کی بزرگی نے تحصیل علم پر مائل کیا۔ چند روز میں متعارف علموں میں دستگاہ پیدا کرکے شعر اور انشا پردازی میں شہرت حاصل کی۔ طب میں استعدد مہارت نہ تھی۔ مگر اس میں بھی نام پیدا کیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بزرگی و اعتبار سے چہرے کو چمکایا۔ شاہجہاں کے عہد میں ہزاری پانصدی ششش صد سوار کا منصب پایا +

جہانگیر کے عہد میں جب شاہ عباس نے قندھار لے لیا۔ تو امام قلی خاں والئے توران نے سلسلۂ دوستی کو جنبش دی۔ شاہ عبدالرحیم خواجہ جوئباری کو برسم سفارت بھیجا۔ اور لکھا کہ آپ ولیعہد دولت کو لشکر مناسب کے ساتھ بھیجئے۔ ادھر سے ہم بھی فوج لے کر پہنچینگے۔ فتح خراسان کے بعد جو ملک آپ کو پسند ہوگا۔ آپ لیجئیگا۔ جو چاہینگا ہمیں دیجئیگا۔ ایلچی یہاں پہنچا تھا۔ اور گفتگو ہو رہی تھی۔ کہ جہانگیر جہان سے رخصت ہوئے۔ ابتدائے دولت شاہجہانی میں خواجہ موصوف لاہور سے آگرہ میں آئے اور چند ہی روز میں کسی بدترین امراض میں مبتلا ہوکر دربار دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ادھر سے مراسلت کا جواب اور ایلچی کا بھیجنا واجب تھا۔ چونکہ اکبر کے عہد میں عبداللہ خاں ازبک کے دربار میں ان کے والد ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کے تحائف مراسلہ محبت کے ساتھ لے کر گئے تھے۔ اور کمال خوبی و خوش اسلوبی سے خدمت بجالائے تھے۔ اس لئے حکیم حاذق کو یہ خدمت سپرد ہوئی۔ وہاں سے آئے تو سنہ جلوس میں جوہر فصاحت اور مزاج دانی کی قابلیت دیکھ کر عرض مکرر کی خدمت سپرد ہوئی۔ اور درجہ بدرجہ سہ ہزاری منصب پر اعزاز پایا +

بدمزاج اور مغرور بہت تھے۔ رعونت اور خود بینی نے دماغ کو عجب بلندی پر پہنچایا۔ جب توران سے پھر کر آئے۔ اور کابل میں آکر ٹھیرے۔ تو میر آلہی ہمدانی کہ خوش فکر سخن پرداز تھے۔ ان کی ملاقات کو گئے۔ صحبت موافق نہ ہوئی۔ انہوں نے یہ رباعی کہ کر حق صحبت ادا کیا ؎

دائم ز ادب سنگ و سبو نتواں شد	در دیدۂ اختلاط مو نتواں شد
صحبت بحکیم حاذق از حکمت نیست	با لشکر خبط روبرو نتواں شد

ہر چند فن طب کی تکمیل نہ کی تھی۔ مگر نام کے اعتبار پر اکثر امرا انہیں کا علاج کیا کرتے تھے۔ چند روز شاہجہاں کی تاریخ دولت لکھتے رہے۔ جب اور سخن دان ادھر متوجہ ہوئے تو انہوں نے قلم اٹھا لیا +

شعر ان کے صاف اور پُر حلاوت ہوتے تھے۔ طرز قدیم پر تازہ ایجادوں کا رنگ دیتے تھے۔ اور خوب کہتے تھے۔ مگر اپنے تئیں انوری پر فائق سمجھتے تھے۔ دیوان کو بڑے زرق و برق سے آراستہ

کیا تھا۔ جب جلسے میں منگاتے تو ملازم کشتی مرصع میں رکھ کر لاتے تھے۔ سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ جو نہ اُٹھتا اس سے ناراض ہوتے تھے۔ کوئی امیر بھی ہوتے تو اس سے بھی ناخوشی ظاہر کرتے تھے۔ سونے کی رحل پر رکھتے تھے۔ اور پڑھ کر سناتے تھے (مآثر)

پھر ترقی معکوس کی چنانچہ اہل دعا کے لشکر میں ملازم ہو گئے۔ اور ۲۰ ہزار وظیفہ پایا سنہ ۱۸ جلوس میں کوئی ایسا دعا کا تیر لگا۔ کہ ۸۰ کے ۴۰ ہزار ہو گئے۔ اکبر آباد کے گوشہ عزلت میں گزارہ کرتے تھے۔ مرآۃ العالم میں لکھا ہے۔ کہ ۱۰۸۰ھ میں ملک عدم کو نقل مکان کیا۔

شعر کا بہت شوق تھا۔ حاذقؔ تخلص کرتے تھے۔ قدما کے قدم بقدم چلتے تھے۔ عمدہ دیوان تیار کیا تھا۔ شاعر شیریں کلام تھے۔ مگر خود پسندی نے بات کو بدمزہ کر دیا تھا۔

مرزا سرخوش اپنے تذکرے میں ان کا حال بیان کرتے ہیں۔ جب اشعار پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ ایک شعر بہت مشہور ہے۔ وہی سرقہ ہے ؎

ولم بہیچ تسلی نمے شود حاذق	بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم

ساتھ ہی اس کے یہ لکھتے ہیں کہ۔

لطیفہ۔ ملا شیدا ملاقات کو آئے۔ شعر خوانی ہونے لگی۔ حکیم صاحب نے مطلع فرمایا ؎

تجمل از گل بگذر دگر در چمن بیند امرا	بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

ملا پرانے مسخرے تھے۔ مسکرا کر بولے ابھی داڑھی نہ نکلی ہو گی۔ جب یہ شعر کہا ہو گا۔ حکیم صاحب بڑے خفا ہوئے۔ اور ملا صاحب کو پکڑ کر حوض میں غوطے دلوائے۔ شعر اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ معانی کی صورت بن جاتے تھے۔

دوم حکیم خوشحال۔ شاہزادہ خرم کے ساتھ پرورش پائی تھی۔ جب وہ شاہجہاں ہوئے تو یہ منصب ہزاری کو پہنچے اور فوج دکن کا بخشی بھی کر دیا تھا۔ مہابت خاں جب وہاں کا صوبہ دار ہوا تو ان کے حالات پر عنایت کرتا تھا۔ بہر حال معلوم نہیں مطلب یہ ہے۔ کہ باپ کے رتبے کو ایک نہ پا سکا۔ کاش اولاد کو کمال بھی میراث میں پہنچا کرتا۔

حکیم نور الدین قراری

سب سے چھوٹے بھائی شاعر دیوانہ مزاج تھے۔ قراری تخلص کرتے تھے۔ سنہ ۹۸۳ھ میں بھائیوں کے ساتھ

یہ بھی آئے تھے۔ انہیں دربار اکبری میں نہ فضل و کمال کے اعتبار سے آنے کا حق نہ رتبے کے لحاظ سے۔ اِس دربار میں اسی طرح چلے آئے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ شعر خط اور کسب علمی میں انواع فضائل سے آراستہ اور صفت فقر اور انکساری سے متصف تھا۔ صاحب دیوان ہے۔ یہ کہا کرتے تھے کہ حکیم ابوالفتح ہمہ دنیاست و ہمام ہمہ آخرت۔ اس واسطے دونوں سے الگ رہتے تھے (ماثر الامرا)

بادشاہ کا اصل مافی الضمیر یہ تھا۔ کہ ہمارے سب نوکر سب کچھ کر سکیں۔ اس نظر سے اوائل حال میں بھائیوں کے ساتھ بھی خدمت عطا کی۔ یہاں تلوار باندھنی بھی نہ آتی تھی۔ ایک دن آپ چوکی سپرد کرتے وقت ہتھیار باندھ کھڑے ہوئے۔ تلوار بے اسلوب باندھی تھی۔ نوجوانوں میں سے کسی نے ہنس کر ٹوکا۔ آپ نے کہا کہ صاحب ہم مُلّا لوگ ہیں۔ ہمیں سپاہگری سے کیا تعلق۔ ہمیں تو امیر صاحب قِران نے پہچانا تھا (امیر تیمور) اُنہوں نے لڑائی کے موقع پر لشکر جاکر اُتارا۔ ہر ایک سردار اور ہر ایک زمرہ پیادہ اور سوار کے لئے خود مقام تجویز کرتے پھرتے تھے۔ بازار لشکر کو پیچھے جاکر فرمایا کہ بنجارے کے اونٹ اور خچروں کو ان سے بھی پیچھے رکھو۔ اور بیگمات کے خیمے ان کے پیچھے لگاؤ۔ اتنے میں علما بڑے بڑے پگڑ باندھے جبّے اور عبائیں پہنے سامنے سے نمودار ہوئے۔ عرض بیگی نے دور سے دیکھتے ہی کہا کہ حضور ارباب العمایم کے لئے کون سا مکان؟ حضرت نے فرمایا بیگمات کے پیچھے اور مسکرا کر گھوڑے کو مہمیز کر گئے۔ لوگوں نے یہ لطیفہ اکبر تک بھی پہنچا دیا۔ چونکہ تربیت مدنظر تھی کہا کہ اسے بنگالہ بھیج دو۔ وہاں چند روز رہا۔ مظفر خاں والی بدعملی میں جہاں حکیم ابوالفتح بھاگے بھلا بھاگ میں خدا جانے کہاں یہ بھی مارے گئے۔ وہ ایک آزاد طرح شہ مزاج شخص معلوم ہوتے ہیں۔ ماثر الامرا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے اکثر مقولے[1] مشہور تھے۔ انہی میں سے ہے (۱) اظہار ہمت خود اظہار طمع است (۲) ملازم بازاری نگہداشتن خود را بجو گرفتن است (۳) بر ہر کہ اعتماد کنی معتمد است۔ اس کتاب میں ہے۔ کہ فاضل سخن طراز تھے۔ اور شعر خوب کہتے تھے ٭

---

[1] یہی مقولے صفحہ ۵۶۶ پر حکیم ابوالفتح کے نام سے لکھے ہیں۔ ان کو میراث میں ملے ہونگے ۱۲۔ محمد باقر

شاہ فتح اللہ شیرازی

تعجب ہے کہ ایسا جلیل القدر فاضل اس کا حال نہ علمائے ایران نے اپنے تذکروں میں لکھا نہ علمائے ہندوستان نے۔ بہت تذکرے دیکھے۔ کہیں نہ پایا۔ ناچار جس طرح کتابوں کے ورق ورق بلکہ سطر سطر دیکھ کر اور امرائے اکبری کے حالات چنے۔ اسی طرح اُن کے حالات بھی پھُول پھُول بلکہ پتی پتی چن کر ایک گلدستہ سجاتا ہوں ۔

سید تھے اور وطن شیراز تھا۔ جب تحصیل سے فارغ ہوئے۔ تو شہرہ کمال کا نورِ صبح صادق کی طرح عالم میں پھیلا۔ کمال الدین شیروانی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی کے شاگرد تھے۔ ملا امین احمد رازی نے ہفت اقلیم میں اتنا زیادہ لکھا ہے۔ ابتدا میں منائے دُنیا کے خیالات دل پر چھائے تھے۔ ضروریات علمی حاصل کر کے اہل عبادت اور گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ اداکثر **میر شاہ میر مکنہ** کی صحبت کو سعادت سمجھتے تھے۔ اس عرصے میں اہل علم اور صاحبان فضل کی تقریروں پر راغب ہوئے۔ اس لئے درس و تدریس کے حلقے میں داخل ہوئے۔ رفتہ رفتہ خواجہ جمال الدین محمود کے درس میں گئے۔ پہلے ہی دن حاشیہ میر پڑھنے بیٹھے۔ پڑھتے جاتے تھے۔ اور خود بھی تقریر کرتے جاتے تھے۔ اس دن ایسے مطالب دقیق اور معانی لطیف ان سے ادا ہوئے کہ حاضرین حیران رہ گئے۔ اس ملک میں دستور ہے۔ کہ جب شاگرد سبق پڑھ چکتا ہے۔ تو اُٹھ کر اپنے اُستاد کی خدمت میں تعظیم و تکریم بجا لاتا ہے۔ اُنہوں نے چاہا کہ کھڑے ہو کر لوازم تعظیم ادا کریں۔ خواجہ نے سبقت کر کے خود سینے پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا کہ یہ آج تم نے ہمیں مستفیض کیا۔ چنانچہ چند روز میں منتہی ہو کر خود علم کے پیاسوں کو سیراب کرنے لگے۔ پھر دکن میں آکر والی بیجاپور کے دربار میں منصب وکالت پایا۔ وہ مرگیا تو دربار اکبری میں آئے۔ اور عضد الدولہ خطاب ملا وغیرہ وغیرہ ۔

محمد قاسم فرشتہ فرماتے ہیں۔ کہ علی عادل شاہ بیجاپور نے جب ان کے اوصاف سنے۔ تو ہزار آرزوؤں سے لاکھوں روپے اور خلعت و انعام بھیج کر شیراز سے بلایا۔ بادشاہ مذکور نے امارت کے اعزاز سے رکھا۔ اور خلوت و جلوت میں مصاحبت کے ساتھ رہے۔ ۹۸۶ھ سے ابراہیم عادل شاہ کا دور ہوا۔ اُس نے انہی کی سعی اور تدبیر سے تاج و تخت پایا۔ چنانچہ دربار میں اعزاز و احترام کے ساتھ ارکان دولت میں داخل تھے۔ مگر دل سے خوش نہ تھے۔ اور خوش کیا رہتے۔ وہاں کا حال اگر معلوم نہیں

تو سہ نثر ظہوری ہی کو دیکھ لو۔ انتہا ہے۔ کہ حمد ہے تو راگ میں۔ نعت ہے تو اسی سہاگ میں کتاب ہے تو نورس۔ شہر ہے تو نورسپور۔ باغ ہے تو نورس بہشت۔ خدا رسول۔ دین ایمان۔ ذہن کی جودت طبیعت کی ایجاد سب اس میں خرچ ہوتے ہیں۔

لطیفہ۔ جس طرح ستار تنبورا۔ بین وغیرہ ساز ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک ساز ایجاد کیا تھا اُس کا نام رکھا تھا **موتے خاں**۔ اُس کی بڑی تعظیم تھی۔ درگاہ کی طرح بجتا تھا۔ ہاتھی پر چڑھ کر عماری میں بیٹھتا تھا۔ ماہی مراتب۔ علم و نقارہ اس کے آگے چلتا تھا۔ غرض کیا دربار کیا محل آٹھ پہر ناچ رنگ گانے بجانے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ ڈوم ڈھارے۔ گاین نایک۔ سپردائی اس کی صحبت میں مصاحب تھے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی کہاں اور یہ باتیں کہاں۔ ہندوستان میں اکبری اقبال کا نشان آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ علما کے جلسے اور علوم کے چرچے ہوتے تھے۔ ایرانی اہل کمال آتے تھے۔ اور اعلےٰ رتبے اعزاز کے حاصل کرتے تھے۔ خبریں سُن سُن کر ان کے دل میں بھی شوق لہریں مارتا تھا۔ مگر آنہ سکتے تھے۔ کیونکہ ایشیائی حکومتوں میں ایسی باتوں کی روک ٹوک بہت ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی جان سے بھی ضائع کر دیتے تھے۔ اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا۔ تو اُنہیں فرمان بھیجا۔ ادھر خود ابراہیم عادل شاہ کو لکھا۔ راجہ علی خاں حاکم خاندیس سے بھی تحریک ہوئی۔ غرض کہ سنہ ۹۹۱ھ میں روانۂ دربار ہوئے۔ اب دیکھیئے ملا صاحب کے غصے حروف و الفاظ کے رنگ میں کیونکر پیچ و تاب کھا کر نکلتے ہیں۔ اور غصہ بجا ہے۔ غیر ملک کا عالم اس طرح بڑھ جائے اور چڑھ جائے اور ہم وہی ملا کے ملا۔ مگر اُن کے واقعہ نگاری کو ہزار آفرین ہے۔ کہ میر موصوف کے علم و فضل سے انکار نہ کیا۔ البتہ اس پر خاک خوب ڈالی۔ نیز فرماتے ہیں ⁂

ربیع الاول سنہ ۹۹۰ھ میں سیادت پناہ میر فتح اللہ شیرازی کہ دادی الہیات ریاضیات طبیعیات اور کل اقسام علوم عقلی و نقلی اور طلسمات و نیرنجات و جرّاثقال میں اپنا نظیر زمانے میں نہیں رکھتا۔ فرمان طلب کے بموجب عادل خاں دکنی کے پاس سے فتحپور میں پہنچا۔ خان خاناں اور حکیم ابوالفتح حسب الحکم استقبال کے لئے گئے۔ اور لاکر ملازمت کروائی **صدارت کے منصب** پر کہ سیاہ نویسی سے زیادہ بات نہیں ہے۔ [گویا کچھ بڑی بات نہیں] اعزاز پایا۔ تاکہ غریبوں کی زمینیں کاٹے نہ کہ دیوے۔ اور پرگنہ بسا ور بے داغ و محلی جاگیر میں ملا بسُن چکے تھے۔ کہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا بے واسطہ شاگرد ہے۔ وہ نماز اور عبادت کے چنداں مقید نہ تھے۔ اس لئے خیال تھا کہ مذہبی باتوں میں ہمارے ساتھ ہو جائیگا۔ مگر اس نے اپنے مذہب کے میدان میں استقلال دکھایا۔ وہ بڑا

حبِّ جاہ اور دنیا داری اور امرا پرستی کے تعصب مذہب کے نکتوں سے ایک دقیقہ نہ چھوڑا۔عین دیوان خانہ خاص میں جہاں کسی کی مجال نہ تھی۔کہ علانیہ نماز پڑھ سکے۔وہ بہ فراغ بال وجمعیت خاطر باجماعت مذہب امامیہ کی نماز پڑھتا تھا۔چنانچہ یہ بات سُن کر زمرۂ اصحاب تقلید سے گننے لگے اور اس معاملے سے چشم پوشی کر کے علم وحکمت اور تدبیر اور مصلحت کی رعایت سے پرورش میں ایک دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔مظفر خاں کی چھوٹی بیٹی سے اس کی شادی کر کے اپنا ہمزلف بنایا۔اور منصب وزارت میں راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ شریک کیا۔وہ راجہ کے ساتھ خوب دلیری سے کام کرنے لگا۔مگر داروملار کے ساتھ کرتا تھا ۔

آزاد۔ ملّا صاحب خفا ہوتے ہیں۔کہ مظفر خاں اور شاہ منصور کی طرح راجہ سے کیوں لڑتے جھگڑتے نہ رہے۔اور یہ اس مدرسے کے مدرس تھے۔جہاں اپنی رائے اور تجویز اتنا ہی اختیار دیتی ہے۔کہ سلامت روی اور صلاحیت کے ورق کو ہوا بھی حرکت نہ دے۔پھر فرماتے ہیں۔امرا کے لڑکوں کی تعلیم کی پابندی اختیار کی تھی۔ان کے گھروں پر روز جاتا تھا۔سب سے پہلے حکیم ابوالفتح کے غلام کو کبھی شیخ ابوالفضل کے بیٹے کو اور اور امیرزادوں کو سات آٹھ برس کے بلکہ ان سے بھی چھوٹے چھوٹوں کو میاں جی بن کر پڑھاتا تھا۔اور لفظ اور خط اور دائرہ ابجد بلکہ ابجد بھی سکھاتا تھا۔

مشقِ اطفال تو تعلیم را	لوحِ ادبار در بغل منہید
مرکبے راکہ زادۂ عرب است	داغِ یونانش بر کفل منہید

لاحول ولا قوۃ ایسے مشتبہ الفاظ کے شعر اس موقع پر افسوس۔افسوس ۔

اور کندھے پر بندوق۔کیسۂ داروکمر سے باندھ کر قاصدوں کی طرح جنگل میں سواری کے ساتھ دوڑتا تھا۔غرض جس علم کی شان جا چکی تھی۔اُسے خاک میں ملا دیا۔اور باوجود ان سب باتوں کے اپنے اعتقاد کے استقلال میں وہ پہلوانی کی کہ کوئی رستم نہ کریگا۔آنے کی تاریخ ہوئی ع

شاہ فتح اللہ امام اولیا

ایک شب اس کے سامنے بیربر سے کہ رہے تھے۔یہ بات عقل کیونکر مان لے۔کہ کوئی شخص ایک پلک مارتے۔باوجود اس گرانی جسم کے بستر سے آسمان پر جائے۔اور ہزار باتیں گوگو خدا سے کرے۔اور بستر ابھی گرم ہو کہ پھر آئے اور لوگ اس دعوے کو مان لیں۔اسی طرح شق قمر وغیرہ ایک پاؤں اُٹھا کر سب کو دکھاتے تھے۔اور کہتے تھے۔ممکن نہیں کہ جب تک ایک پاؤں کا سہارا نہ رہے۔ہم کھڑے رہ سکیں۔یہ کیا بات ہے ؟ وہ اور اور بدبخت گم نام آمنّا وصدّقنا کے دم بھرتے

تھے۔ اور تائید کرکے تقویت دیتے تھے۔ مگر شاہ فتح اللہ باوجودیکہ بادشاہ دم بدم اس کی طرف دیکھتے تھے۔ اور مطلب بھی اسی سے تھا۔ کہ نیا آیا ہوا تھا۔ اور اُسے پھانسنا منظور تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ چُپ سُنے جاتا تھا۔ ایک حرف نہ بولتا تھا۔ دربار اکبری کے دیکھنے والے ان کے حال سے اُس عقیدت اور خدمت گزاری کا سبق پڑھیں۔ جس سے باوجود نئی ملازمت کے عظمت اور اعتبار وا: ہیں کسی پرانے نمک خوار سے پیچھے نہ رہے۔

سنہ ۹۹۳ھ میں عضد الدولہ میر فتح اللہ امین الملک ہو گئے۔ حکم ہوا کہ راجہ ٹوڈرمل مشرف دیوان کل مہمات مالی و ملکی ان کی صلاح و صواب دید سے فیصل کیا کریں۔ شاہ موصوف کو یہ بھی حکم دیا۔ کہ مظفر خاں کے عہد دیوانی کے بہت سے معاملے ملتوی پڑے ہیں۔ انہیں فیصلہ کرکے آگے کیلئے رستہ صاف کر دو اور جو باتیں قابل اصلاح معلوم ہوں۔ عرض کرو۔ انہوں نے مثلہائے مقدمات کو نظر غور سے دیکھا۔ نہ دفتر و اہل دفتر کی رعایت کی۔ نہ اہل مقدمہ کا لحاظ کیا۔ دونوں سے بے لگاؤ ہو کر امور اصلاح طلب کی ایک فہرست تیار کی۔ اور آسانی کے لئے اپنی رائے بھی لکھی۔ وہ دفتری جھگڑے۔ تحصیل مالی۔ تنخواہ سپاہی اور مقدمات دیوانی کے جنجال ہیں دربار اکبری میں سجانے کے قابل نہیں۔ آزاد انہیں یہاں نہیں لاتا۔ اتنا ضرور ہے کہ نکتہ رسی کی کھال اتاری ہے۔ اور خیر اندیشی کا تیل نکالا ہے۔ جو کچھ اُنہوں نے لکھا تھا۔ حرف بحرف منظور ہوا اور کاغذ مذکور اکبر نامے میں داخل ہوا۔

اسی سنہ میں تسخیر دکن کا ارادہ ہوا۔ خان اعظم کو کلتاش خاں کو سپہ سالار کیا۔ اور امرائے عظام کو لشکر و افواج کے ساتھ ادھر روانہ کیا۔ شاہ فتح اللہ مدت تک اس ملک میں رہے تھے اور ایک بادشاہ کے مصاحب خاص ہو کر رہے تھے۔ اس لئے صدارت کل ہندوستان کی اُن کے نام ہو گئی۔ پانچ ہزار روپے۔ گھوڑا اور خلعت عطا فرما کر اعزاز بڑھایا۔ اور حکم دیا۔ کہ اس مہم میں جائیں۔ اور امرا میں اس طرح ہوں۔ جیسے نولکھے ہار میں بیچ کا آویزہ۔ مُلا صاحب لکھتے لکھتے خفا ہو کر کہتے ہیں۔ کمالائے شیرازی اس کے نوکر کو اس کی نیابت پر رکھ لیا۔ کہ آئمہ مساجد جو خال خال مقطوع الاراضی رہ گئے ہیں۔ ان کا بھی کام تمام کر دے۔ اب صدارت کمال کو پہنچی۔ رفتہ رفتہ یہ ہو گیا۔ کہ شاہ فتح اللہ اس اختیار اور جاہ و جلال پر پانچ بیگھہ زمین کے دینے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ بڑی بڑی زمینیں ضبط کرنے میں کفایت سرکار سمجھتا تھا۔ وہ زمینیں بھی ویران ہو کر ویسے ہی دام و دد کا مسکن ہو گئیں۔ نہ ان اماموں کی ہوئیں۔ نہ رعیت کی۔ ان کی مفلسی صدروں کے نامۂ عمل میں رہ

گئی۔ اور اُن کا بھی نشان نہ رہا ؎

	در دلِ خاک جز عظام صدود	از صدد و عظام باقی نیست	

دکن کی داستان طویل ہے۔ مختصر کیفیت یہ ہے۔ کہ راجی علی خاں خاندیس کا پُرانا فرمان روا تھا۔ اور فوج و خزانہ عقل و تدبیر اور بندوبست ملکی سے ایسا چُست و درست تھا کہ تمام دکن اس کی آواز پر کان لگائے رہتا تھا۔ اور وہ سلاطین و امرا میں دکن کی کنجی کہلاتا تھا۔ شاہ فتح اللہ بھی اس ملک میں رہ کر آئے تھے۔ اور علاوہ علم و فضل کے امور ملکی میں قدرتی مہارت رکھتے تھے۔ اور حکام و امرا سے ہر طرح کی رسائی حاصل تھی۔ اکبر نے خان اعظم کو سپہ سالار کیا۔ بہت سے امرا صاحب طبل و علم با فوج و لشکر ساتھ کئے۔ میر موصوف کو ہمراہ کیا کہ ہو سکے تو راجی علی خاں کو لے آئیں۔ یا راہ اطاعت پر لائیں۔ اور اس کے علاوہ اور امرائے سرحدی کو بھی موافقت پر مایل کریں۔ لیکن خان اعظم کی بے تدبیری اور سینہ زوری سے مہم بگڑ گئی۔ (دیکھو ان کا حال)، شاہ فتح اللہ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ ناچاری اور ناکامی کے کارواں میں شامل ہو کر خان خاناں کے پاس چلے آئے! احمد آباد گجرات میں بیٹھے۔ اور اطراف و جوانب میں کاغذ کے گھوڑے دوڑانے لگے۔ مطلب یہ تھا۔ کہ جو کام خان اعظم کو ساتھ لے کر کرنا تھا۔ وُہ ہم خان خاناں کو لے کر کرینگے۔ اور عجب نہ تھا کہ وہ اس راہ میں منزل کو پہنچے

سنہ ۹۹۳ھ میں اکبر نے توران کو ایلچی بھیج کر ادھر سے خاطر جمع کی اور احتیاطاً لاہور میں ٹھیرا۔ ساتھ ہی کشمیر پر مہم شروع ہو گئی۔ اس وقت اہل مشورہ میں یہ نکتہ تنقیح طلب تھا۔ کہ توران پر مہم کی جائے یا نہیں۔ مگر اصل میں معاملہ قندھار کا تھا کہ اس پر فوج کشی کریں یا نہیں۔ اور کریں تو بھکر اور سندھ کو فتح کر کے آگے بڑھنا چاہئے۔ یا اسے کنارے چھوڑیں۔ اور قندھار پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ خانخاناں اور شاہ فتح اللہ کو بلا بھیجا۔ کہ اُن کی رائے پر بڑا بھروسہ تھا۔ وہ اونٹ اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر دوڑے اور مہینوں کی منزلیں پندرہ دن میں لپیٹ کر لاہور میں آن داخل ہوئے۔ پھر انہیں دربار سے جدا کیا۔

سنہ ۹۹۷ھ کے حالات میں ملّا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جو رامائن کا ترجمہ کر رہا تھا ایک دن (بادشاہ نے)، اس کا خیال کر کے حکیم ابوالفتح سے فرمایا۔ کہ یہ شال خاصہ اسے دیدو۔ کہ دو کہ گھوڑا اور خرچ بھی ملیگا۔ شاہ فتح اللہ عضد الدولہ کو حکم ہؤا۔ کہ بساور در دولبست تمہاری جاگیر رہی۔ آئمہ مساجد کی جاگیریں بھی تمہیں عنایت ہوئیں۔ اور میرا نام لے کر فرمایا۔ کہ اس بداؤنی جوان کی مدمعاش ہم نے بساور سے بداؤں کو منتقل کر دی۔ شاہ فتح اللہ نے ہزار روپے کے قریب تھیلی میں پیش کئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اُسکے شقدار (تحصیلدار) نے بطور تغلب کے بیواؤں اور یتیمان نامراد کے حق میں سے پرگنہ

یساور میں ظلم و تعدی سے بچائے تھے۔ تہمت یہ کہ آئمہ حاضر نہیں۔ شاہ نے مضمون زنگارنگ بدل کر کہا کہ میرے عاملوں نے آئمہ کے حساب میں یہ روپیہ بطور کفایت نکالا ہے۔ فرمایا۔ بشما بخشیدم۔ غرض شاہ نے مجھے فرمان درست کرکے دے دیا۔ اور تین مہینے نہ گزرے تھے۔ کہ شاہ گزر گئے۔

۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ہمرکاب کشمیر کو گئے۔ اور جاتے ہی بیمار ہوئے۔ رفتہ رفتہ بیماری نے طول کھینچا۔ ان کی خلوص و وفاداری اور فضائل و کمالات اور اکبر کی محنت و مرحمت کا وزن اکبر نامے کی عبارت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ شیخ لکھتے ہیں۔ کہ بادشاہ خود عیادت کو گئے۔ اور بہت تسلی اور دلداری کی۔ چاہتے تھے کہ ساتھ لے کر چلیں۔ مگر ضعف قوی ہو گیا تھا۔ اس لئے خود کابل کو روانہ ہوئے حکیم علی کی رائے میں خطا معلوم ہوئی۔ اس لئے حکیم حسن کو اُن کے پاس چھوڑ آئے۔ اثنائے راہ میں حکیم مصری کو بھی بھیجا۔ کہ معالجے میں رائے شامل کریں۔ افسوس کہ اُن کے پہنچنے سے پہلے ملک بقا کو روانہ ہو گئے۔ بادشاہ کو بہت رنج ہُوا۔ اور زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ کہ میر ہمارے وکیل تھے۔ طبیب تھے۔ منجم تھے۔ جو ہمارے دل کو صدمہ ہُوا ہم ہی جانتے ہیں۔ اس درد کا وزن کون کر سکتا ہے۔ اگر اہل فرنگ کے ہاتھ میں میر پڑ جاتے اور وہ قدر ناشناس اس کے عوض میں تمام خزائن بارگاہ سلطنت کے مانگتے تو ہم بڑی آرزو سے سودا کر لیتے۔ کہ بڑا نفع کمایا۔ اور جواہر بے بہا بہت ارزاں خریدا۔ یہ حیران انجمن ہستی (بندہ ابوالفضل) سمجھا ہُوا تھا۔ کہ عقل تعلیمی کا کارواں لٹ کر رستہ بالکل بند ہو گیا ہے۔ اس معنوی بزرگ کو دیکھ کر رائے بدلی تھی۔ اس سرمایہ علم پر راستی۔ درستی۔ معاملہ دانی میں گوہر نایاب تھا۔ حکم ہُوا کہ سید علی ہمدانی کی خانقاہ سے اُٹھا کر کوہ سلیمان کے دامن میں سلا دو۔ کہ دل کشا مقام ہے۔ ان دنوں میں بعض امرا کو امورات سلطنت کے باب میں جو فرمان جاری ہوئے ہیں۔ ان میں بھی شاہ کے مرنے کا حال بہت افسوس کے ساتھ لکھوایا ہے۔

ملّا صاحب نے جس طرح ان کے مرنے کا حال لکھا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سوچتا رہ گیا کہ ایسے صاحب کمال کے مرنے کا افسوس کروں۔ یا ملّا صاحب کی بے دردی کا ماتم کروں۔ جس خیال سے اُنھوں نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ان دنوں میں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی نے کشمیر میں تپ محرق پیدا کی۔ خود طبیب حاذق تھا۔ علاج یہ کیا کہ ہریسہ کھایا۔ ہر چند حکیم علی منع کرتا تھا۔ مانتا نہ تھا۔ آخر اجل کا متقاضی گریبان پکڑ کر کھینچتا کھینچتا دار بقا کو لے گیا۔ تخت سلیمان میں کہ شہر کشمیر کے پاس ہی ایک پہاڑ ہے۔ سید عبداللہ خاں چوگان بیگی کی قبر کے پاس دفن ہُوا تاریخ ہوئی۔ **فرشتہ بود** نیز گزر گئی۔ کہ گول مول عبارت میں غصہ نکل گیا۔ ملا احمد اور میر شریعت ایلی کو ادھر جہاں کوئی ان کے پائے

پڑ گیا ہے۔ وہ صلواتیں سنائی ہیں۔ کہ خدا کی پناہ۔ فحش کے مشاہدے کی گواہی دے گئے ہیں۔ اُنکی تیز طبیعت کا یہ عالم ہے کہ شیعہ کا نام سنتے ہی غصہ آجاتا ہے شکریہ بجا لاؤ کہ فضائل علمی اور اوصاف و کمالات کو خاک سیاہ نہ کر دیا۔ خیر تھوڑی خاک ڈال دی۔ اسکا تمہیں بھی خیال نہ کرنا چاہیئے۔ جو کچھ عنایت ہوئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میر علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ اس نے ملا صاحب کے علم دوست دل میں محبت کو گرمایا۔ اور شیعہ بھی تھے۔ مگر جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے۔ اس سے بے تہذیبی یا کسی غیر مذہب کے باب میں بدکلامی نہیں پائی گئی۔ اپنے مذہب کو علم و فضل کی شاہی لئے آہستگی و شایستگی کے ساتھ نکل گئے۔ اس لئے با انصاف مورخ کا قلم بھی بدی کے الفاظ کو لے گیا۔ میرے شیعہ بھائی سلامت روی اور اہلبیت کا رستہ ان لوگوں سے سیکھیں۔ لیکن ملا صاحب بھی زبردست ملا ہیں۔ جرم تشیع کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور دینی چاہیئے تھی۔ یہی کہ دیا۔ کہ اتنا بڑا عالم ہو کر بادشاہ کے ساتھ شکار میں دوڑتا پھرتا ہے امرا کے گھر جا کر ان کے لڑکوں کو پڑھاتا ہے۔ شاگردوں کو پڑھاتا ہے۔ تو بُرا بھلا کہتا جاتا ہے۔ کوئی شاگرد صاحب کمال اس کے دامن سے پل کر نہیں نکلا۔ اچھا حضرت یہ بھی غنیمت ہے ؎

دو گالیاں کہ بوسہ۔ خوشی پر ہے آپ کی	رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں

صرفی ساوجی نے ان کے رنج کو حکیم ابوالفتح کے غم سے ترکیب دیکر عمدہ مادہ تاریخ کا نکالا ہے ؎

امروز دو علامہ ز عالم رفتند	رفتند و موخر و مقدم رفتند
چوں ہر دو موافقت نمودند بہم	تاریخ شد کہ ہر دو باہم رفتند

بزرگان باخبر سے معلوم ہوا ہے۔ کہ شاہ مرحوم کاغذات پر جو دستخط کرتے تھے تو فقط فتحی یا فتحی شیرازی لکھا کرتے تھے۔ فتح سے اختصار منظور تھا یا تخلص ہوگا۔ شاید شعر بھی کہتے ہونگے۔ مگر کوئی شعر آنکھوں یا کانوں سے نہیں گزرا۔

ذات کا حال بس اتنا ہی معلوم ہے۔ کہ سید تھے۔ ملا صاحب نے بھی اتنا ہی لکھا کہ "سادات شیراز سے تھے" نہ معلوم ہؤا کہ کس امام کی اولاد میں سے تھے۔ اور کس خاندان سے منسوب تھے۔ اور عمر کیا پائی۔ پہلے شاہ فتح اللہ مشہور تھے۔ **اکبر میر فتح اللہ کہنے لگا۔** اس لئے تھوڑے مورخ میر فتح اللہ لکھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ شیخ ابوالفضل اکبرنامہ میں لکھتے ہیں۔ کہ خواجہ جمال الدین محمود۔ مولانا کمال الدین شروانی۔ مولانا احمد کرد سے بہت علم حاصل کیا۔ مگر عقل و فہم کو ان سے بہت اونچے درجے پر جا رکھا۔ ملا صاحب نے مولانا غیاث الدین کا شاگرد لکھ کر جو کچھ کہا دیکھ ہی لیا۔ اور پھر زمرۂ علما میں درج کر کے فرماتے ہیں۔ اعلم علمائے زمان مدتوں حکام و اکابر فارس

کا پیشوا رہا۔ تمام علوم عقلی و نقلی حکمت۔ ہیئت۔ ہندسہ۔ نجوم۔ رمل۔ حساب۔ طلسمات۔ نیرنجات۔ جرِ اثقال خوب جانتا تھا۔ اس فن میں وہ رتبہ رکھتا تھا۔ کہ اگر بادشاہ متوجہ ہوتے تو رصد باندھ سکتا تھا۔ خصوصاً کلوں کے کام میں بہت خوب ذہن لگتا تھا) علوم عربیہ اور حدیث و تفسیر میں بھی نسبت سادات تھی۔ اور خوب خوب تصنیفات کی تھیں۔ مگر ملا مرزا[1] جان شیرازی کے برابر نہیں جو ماوراء النہر میں مدرس یکتا پرہیزگار یگانۂ روزگار ہے۔ میر فتح اللہ اگرچہ مجلسوں میں نہایت خلیق۔ متواضع۔ نیک نفس تھا۔ مگر اس ساعت سے خدا کی پناہ ہے۔ کہ جب پڑھا رہا ہو۔ فحش الفاظ رکیک اور ہجو کے سوا شاگردوں کے لئے کوئی بات زبان پر آتی ہی نہ تھی۔ اسی واسطے لوگ اس کے درس میں کم جاتے تھے۔ اور کوئی شاگرد رشید بھی اُس کے دامن سے نہ اُٹھا۔ چند روز دکن میں رہا۔ عادل خاں وہاں کے حاکم کو میر سے عقیدت تھی۔ ملازمت بادشاہی میں آیا تو عضد الملک خطاب پایا۔ کشمیر میں ۹۹۷ھ میں مرگیا۔

آپ کی فضیلت و قابلیت کا نمبر ملا صاحب نے یہ لگایا ہے۔ شیخ ابو الفضل نے وہ فقرہ لکھا ہے۔ اور پھر ایک مقام پر اس سے بڑھ کر لکھا۔ اگر علوم عقلی کی پرانی کتابیں نابودی کی رونق پر جائیں۔ تو نئی بِنیاد رکھ دیتے۔ اور جو جو کچھ گیا اُس کی پروا نہ کرتے۔ جوہر عالی تھا اور عالی ذات تھے سیا وہ حکمت رچی بچی ہوئی تھی۔ اور عقل مروجہ نے حق تلاشی کی آنکھ پر پردہ نہ ڈالا تھا۔ محمد شریف معتمد خاں بھی اقبال نامہ میں لکھتے ہیں۔ علمائے متاخرین میں میر فتح اللہ اور ملا مرزا جان کے برابر کوئی نہیں ہوا۔ مگر میر کی تیزی فہم اور قوت ادراک ملا پر فایق تھی۔ اگر آج تینوں صاحب موجود ہوتے تو آمنے سامنے بٹھا کر باتیں سنتے اور تماشا دیکھتے۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے	ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

مگر ملا صاحب کے سامنے کس کا مُنہ تھا جو بول سکتا۔ سب طرف سے بند ہوتے تو کافر ہی بنا کر اُڑا دیتے۔ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ "ہر فن میں شاہ کی اچھی اچھی تصنیفات تھیں"۔ مگر افسوس کہ آج کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو ہے وہ سند ہے۔

ایک رسالہ حالات کشمیر و عجائبات کشمیر میں لکھا تھا۔ وہ حسب الحکم اکبر نامہ میں داخل ہوا۔

خلاصۃ المنہج۔ ایک مشہور تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ملا فتح اللہ کی تفسیر کہلاتی ہے۔

---

[1] ملا صاحب کی قدردانی پر قربان جائیے۔ ملا مرزا جان کو آنکھوں سے دیکھا نہیں۔ کانوں سے بات سُنی تھی۔ نمبر لگا دیا۔ انہیں تو شاہ فتح اللہ بیچارے کا گرانا تھا۔ ورنہ لکھنے کی ضرورت کیا تھی۔ مگر وجہ ترجیح کی بے اختیار قلم سے ٹپک گئی۔ وہی پرہیزگاری۔ مگر یہ بھی یاد رہے۔ وہ یہاں آئے نہیں۔ آتے تو ان سے کئی حصے زیادہ ان کا خاکہ اُڑاتے۔ میں نے کتابوں میں ان کے حالات بھی پڑھے ہیں۔ خدا آزاد کے قلم سے کسی کا پردہ فاش نہ کرے۔

منہج الصادقین۔ ایک مفصل و مبسوط تفسیر کتاب بلکہ ہند میں نایاب ہے۔ **شیخ ابوالفضل** نے اکبرنامہ میں مجملاً اتنا لکھا ہے کہ علوم و فنون میں مفید تصنیفیں لکھی تھیں اور ایک تفسیر بھی مفصل لکھی تھی ❖

تاریخ الفی کی تالیف میں بھی شامل کئے گئے۔ اور سال دوم کی تحریر انکے سپرد ہوئی (دیکھو ملا صاحب کا حال)

زیچ جدید تاریخ الٰہی اکبر شاہی کا ایک حصہ انکی زیر نگرانی لکھا گیا۔ دیکھو آئین اکبری ❖

علمی یا دفتری اصلاحیں جو ان کی رائے سے روشن ہوئیں ان میں سے :۔

(۱) سنہ الٰہی اکبر شاہی کو سال و ماہ اور ایام کی کمی بیشی کا حساب کر کے تاریخ قرار دی۔ یہ تبدیلی ۹۹۲ھ میں واقع ہوئی۔ مگر اس عہد کی کل تصنیفیں اور بادشاہی تحریریں اسی کی بنیاد پر ہیں۔ اور اسے مبارک سمجھ کر خاندان چغتائی کے تخت نشین اکثر اس کی پابندی کرتے رہے ❖

(۲) اکبر کے زائچہ پر نظر ثانی کی۔ اور یونانی اور ہندی پر اس میں جو اختلاف تھا۔ اس کا سبب نکال کر دونوں میں مطابقت ثابت کی ❖

(۳) دفتر مال اور دیوانی میں سب ایجادوں یا اصلاحوں کے پھول لوگوں نے راجہ ٹوڈرمل کی دستار پر سجائے ان میں کچھ پنکھڑیاں ان کا بھی حق ہے۔ ابوالفضل کی عبارت پر خیال کرو۔ جو شخص حکمت یونان کا نظام بنا سکتا ہو۔ جب دفتر حساب اور معاملات و مقدمات پر متوجہ ہو جائے۔ تو کونسا پیچ ہوگا کہ اس سے رہ جائیگا اور اس میں جو نکتہ وہ عالی طبع نکالیگا کیسا برجستہ ہوگا۔ آئین اکبری کا جزو اعظم ہوگا ❖

(۴) ان کی ایجادوں کا طلسمات دیکھنا چاہو تو سنہ کے نوروز کا مینا بازار جا کر دیکھو۔ تمام امرا نے اپنے اپنے شکوہ و شان کی دکانیں سجائی ہیں۔ میر موصوف سامان مذکور کے ساتھ اپنی طبع رسا کی نمائشگاہ ترتیب دے بیٹھے ہیں ❖

(۱) **بادِ اسپا**۔ یعنی ہوا کی چکی چل رہی ہے ❖

(۲) **آئینہ حیرت**۔ نزدیک و دور کے عجائب غرائب تماشے دکھا رہا ہے ❖

(۳) **جرِ اثقال** کے اوزار چرخیاں۔ پٹے برابر چکر لگا رہے ہیں ❖

(۴) **علم نیرنجات** کیمیائی ترکیبوں سے جادو کر رہا ہے ❖

(۵) **توپ** ہے کہ تخت پر چڑھی ہے جیسی (قلعہ شکن) توپ ہے۔ پہاڑ سامنے آ جائے۔ تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ گنتی ہاتھ اٹھا کر چڑھ جاؤ ❖

(۶) **بندوق** ہے کہ ایک فیر میں ۱۲ گولیاں مارتی ہے ❖

ملا صاحب ان پر بہت خفا ہیں کہ بادشاہ کی مصاحبت اور خوشامدوں میں علم کی شان کو بٹا لگایا

یہ اعتراض بیجا نہیں۔ البتہ مکدّر الفاظ اور غلیظ عبارت میں ادا ہوا کیونکہ جس دل سے نکلا تھا۔ وہ بھی مکدّر تھا۔ مُلّا صاحب تو یہ چاہتے ہیں۔ کہ جو صاحب علم ہو۔ تارک الدنیا جُبّہ پہنے مُصلا بچھائے تسبیح لیے خانقاہ میں خلوت نشین ہو۔ مُریدوں میں نکل کر بیٹھے۔ تو مثنوی شریف کا درس کہے اور زار زار روئے کشف و کرامات کا دعوے نہ ہو۔ یہ لوگ وہ کہ یونان حکمت میں جائیں تو اُس طور سے سمجھیں اور سمجھائیں منقولات میں دیکھو۔ تو مفسّر۔ محدّث۔ مجتہد۔ یہ سمجھ گئے تھے۔ کہ قوم ڈوبی جاتی ہے۔ بادشاہ بے علم ہے اور بے تحقیق ہے۔ ہم اس کے دست و بازو بن کر شامل حال نہ ہونگے تو ملک کو ڈبو دینگے اور نہ فقط دنیا بلکہ دین بھی ڈوب جائیگا۔ اس لئے اپنے آرام اور ہر طرح کے ذوق و شوق کو اُس کی خدمت اور مصلحت اور حق نمک پر فدا کر دیا تھا۔ اور بادشاہ بھی اکبر بادشاہ جیسا قدردان اور چاہنے والا ✦

محبت است کہ دل را نمے دہد آرام   وگرنہ کیست کہ آسودگی نمے خواہد

طبیعتیں ایسی شگفتہ لائے تھے۔ کہ جس رنگ میں چاہیں۔ ویسے ہی ہو جائیں جس خیال میں اپنے آقا کو ہوتے دیکھتے تھے۔ اسی کے پتلے بن جاتے تھے۔ میرے دوستو! بھلا مچھلی دریا کے بغیر جی سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ ایسے عالم تصنیف و تالیف اور درس و تدریس بغیر خوش رہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن کیا کریں کہ مصلحتِ وقت سے مجبور تھے۔ بحر العلوم مولانا عبد العلی سے کسی نے کہا کہ آپ حج کو کیوں نہیں جاتے فرمایا۔ جو فیض ہماری ذات سے یہاں رہنے میں پہنچتے ہیں۔ وہ بند ہو جائینگے اور اُن کا ثواب حج سے زیادہ ہے۔ غرض سنہ ۹۹۱ھ میں آئے اور سنہ ۹۹۸ھ میں چلے گئے ✦

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

۷ برس ہندوستان کی سیر کی اور اپنے کمالات کی بہاریں عالم کو دکھا گئے۔ فی الحقیقت مدّتِ خدمت بہت کم تھی۔ مگر تاریخی بیان اور خود اکبر کی زبان کے جو الفاظ ہیں۔ ان پر خیال کرو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اعتبار اور محبت میں جو مصاحب خاص اور عمروں کے جاں نثار تھے۔ ان میں ان کا نمبر کسی سے نیچے نہ تھا۔ یہ خلاصہ روزگار **ابوالفضل**۔ **فیضی**۔ **حکیم ابوالفتح**۔ **حکیم ہمام** تھے۔ اور **بیربر** کا تو کیا کہنا ہے۔ وہ تو بادشاہ کی دل لگی۔ بلکہ زندگی کا کھلونا تھا۔ **ٹوڈر مل** نے کارگزاری و مزاج شناسی سے اعتبار کے ساتھ دل میں گھر کیا تھا۔ **عبد الرحیم خانخاناں** پہلے انہی چاروں میں پانچویں سوار تھے۔ اور **مان سنگھ** جیتے پر مہمات ملکی کے ہیر پھیر میں اکبر سے بھاری تھے **کوکلتاش خاں** دودھ کے زور سے ہر مقام پر جگہ لیتے تھے اور اکبر بھی چاہتا تھا۔ کہ یہ ویسے ہی ہوں۔ مگر ان کی بے دماغی۔ بلند نظری۔ خود پسندی اور دعوے دار زبان ایسی تھی۔ کہ ان لوگوں میں نہ رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ فتوحات کی ہوا میں اُڑ کر کہیں کے

نہیں جا پڑے۔ میر فتح اللہ نے اپنی لیاقت اور مزاج دانی اور آداب و نیاز اور خلوص و فاداری سے اول کے چار نمبروں میں جگہ لی۔ یہ اشخاص اکبر کی جزو زندگی ہو گئے تھے۔ اور ان کا یہ حال تھا ۔ کہ باوجود فضل و کمال کے اپنی طبیعت کی خواہش اور ہر طرح کے ذوق و شوق کو اُس کی خدمت گزاری اور مصالح ملکی اور دل کی خوشی پر فدا کر بیٹھے تھے +

ایک باریک نکتہ اس میں یہ ہے ۔ کہ مدت دراز سے چند عالموں نے شریعت کے زور سے سلطنت کی گردن کو دبا رکھا تھا۔ یہ لوگ گویا گھر کے غنیم تھے ۔ اور ان کا توڑنا سب سے مہم عظیم۔ اُن کا زور فوج و لشکر کے بس کا نہ تھا۔ اگر ٹوٹ سکتے تھے ۔ تو اپنے وفاداروں کی تدابیر عقلی اور دلائل علمی کی فوج ، نہیں توڑ سکتی تھی ۔ چنانچہ کچھ قدرتی اتفاقات نے کچھ ان لوگوں کی تدبیروں نے توڑ پھوڑ کر ستیاناس کر دیا +

یہ لوگ اپنی لیاقت اور خدمت کے سوا کسی کو رفیق نہ پاتے تھے ۔ اس لئے جان توڑ کر لپٹ جاتے تھے ۔ اور سچے اخلاص و نیاز سے خدمت بجا لاتے تھے ۔ ان کے وطن کی غربت اور قاضیان دربار کے ساتھ جو مذہب کا اختلاف تھا۔ وہ بادشاہ کے سامنے تائید کرتا تھا کہ غنیموں سے مل کے سازش نہ کرینگے ۔ اور یہ خاص ان کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور ایرانی اُمرا سے کوئی بے وفائی بھی ظاہر نہ ہوئی تھی ۔ بلکہ حق پوچھو۔ تو جو خرابی ہوئی ۔ ملک موروثی کے نمک خواروں سے ہوئی ۔ بیرم خاں اور خان زماں سے جو کچھ ہوا وہ ظاہر ہے ۔ لڑنے والوں نے خواہ مخواہ لڑا دیا ۔ اہل ایران نے کوئی مرتبہ جاں نثاری کا نہ چھوڑا تھا اسلئے اکبر ان لوگوں کو عزیز رکھتا تھا۔ اور پورا اعتبار تھا بلکہ اس لطف کی محبت ان کے ساتھ رکھتا تھا۔ کہ الفاظ و عبارت اس کی کیفیت ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس پھول کی مہک کا ایک نمونہ دکھاتا ہوں ۔ ذرا خیال کرو۔ کہ قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں تو دل میں کیا کچھ ہوگا ۔ اور صحبتوں میں کیا باتیں ہوتی ہونگی +

شیخ فیضی سفارت دکن کی عرائض میں سے ایک عرضی میں ایران کے حالات لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔

ترجمہ۔ آج کل سرآمد دانشمندان عراق و فارس میر تقی الدین محمد ہے مشہور بہ تفتائے نسابہ۔ بدولایت میں آج اس کی عقل و دانش کو کوئی نہیں پہنچتا ۔ یہ میر فتح اللہ کے شاگردوں میں سے ہے جب میر فتح اللہ اور مولانا مرزا جان شیراز میں دانشمندی کا نقارہ بجا رہے تھے ۔ تو یہ بھی شیراز کے مدرسوں میں سے تھا۔ فدوی مدتوں سے اس کے کمالات کا شہرہ سن رہا ہے ۔ اور میر فتح اللہ سے مکرر تعریف سُنی ہے ۔ جس کا ایسا شاگرد یادگار ہو ۔ اُس کے کمال کی دلیل اہل عالم کے لئے کافی ہے

پہلے قلعہ ہوشنگ آباد پایہ تخت تھا۔ وہ سلطان ہوشنگ غوری بادشاہ مالوہ نے تعمیر کیا تھا۔ سنہ ۹ جلوس میں ۱۰ ہزار لشکر لیکر آصف خاں ہوشنگ آباد پر گیا۔ رانی درگاوتی خود سال بیٹے کو لیے فرمانروائی کر رہی تھی اور شجاعت اور دانائی سے عورتوں میں نظیر نہ رکھتی تھی۔ سلطنت کے سارے کام مردان عالی فطرت کی طرح سرانجام کرتی تھی۔ گھوڑے پر چڑھتی تھی۔ شکار کھیلتی تھی۔ تیر مارتی تھی۔ میدان جنگ میں کارنامے دکھاتی تھی۔ دربار عام میں بیٹھکر مہمات سلطنت طے کرتی تھی اور لوازم ملکداری کو تدابیر درست کے ساتھ عمل میں لاتی تھی۔ اس موقع پر ۲۰ ہزار سوار ۔ ۷ سو ہاتھی لیکر لڑنے کو نکلی۔ اور میدان ہمت میں قدم جماکر مردوں کے مقابل ہوئی۔ وہ ہاتھی پر سوار قلب لشکر میں کھڑی تھی فوج کو لڑاتی تھی اور آپ تیر مارتی تھی۔ اُس نے خود بھی ایک تیر کھایا جو حقیقت میں قضا کا تیر تھا اسے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو زندہ گرفتار ہو جاؤں۔ فیلبان سے کہا کہ آخیر حق نمک یہی ہے۔ کہ خنجر سے میرا کام تمام کر دے تاکہ پردہ ناموس رہ جائے فیلبان نے کہا۔ مجھسے یہ نمک حرامی نہ ہوگی۔ جوانمرد عورت نے خود خنجر پکڑ کر دریائے خون میں غوطہ مارا اور ملک عدم میں جا کر سر نکالا۔ آصف خاں لشکر کی لوٹ مار سے نپٹ کر شہر ہوشنگ آباد پر گیا بن ماں باپ کا بچہ بھی سپوت نکلا۔ فوج لیکر میدان میں آیا۔ اور تڑپ دکھائے بغیر ہرگز جان نہ دی بہت پرانا راج تھا اس گھر کو پیٹ بھر کر لوٹا۔ ایک سو ایک صندوق فقط اشرفیوں کا۔ روپوں کا شمار نہیں۔ چاندی اور سونے کے بے حساب ظروف و اسباب۔ صدہا مورتیں طلائی اور جڑاؤ۔ اجناس گراں بہا جنکی فہرست حد تحریر سے باہر تھی۔ ہزار ہاتھی گنیش مورت خوبصورت۔ لدو ہاتھیوں کا ذکر نہیں گھوڑے بادرفتار سیکڑوں۔ ان میں سے کچھ کچھ چیزیں برائے نام بادشاہ کو بھیجدیں باقی ہضم۔ یہ دولت و مال سمیٹ کر عبدالمجید جو ابھی آصف خاں ہوئے تھے۔ قارون وقت ادبن گئے۔ مگر ساتھ ہی کھٹکا لگا تھا۔ کہ ہائے! دربار کے مفت خورے مفت چھنوا دینگے۔ اور قلم قسائی آدھوں آدھ بیچ میں کھا جائینگے۔ دیوان اور اہل دفتر کے مراسلے آتے تھے۔ کہ حاضر دربار ہوکر حساب سمجھاؤ۔ اور یہ پہلو بچاتا تھا۔ خانزماں کی پہلی چڑھائی پر بادشاہ نے بلایا تو حاضر ہو گیا ۔

جب اُس نے سُنا کہ دوبارہ خانزماں بگڑا ہے اور امرائے بادشاہی اُس سے ٹکر کھا کر بکھر گئے۔ تو وہ بڑے سامان کے ساتھ ہوشنگ آباد سے چلا۔ یہاں مجنون خاں مانک پور میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے آصف خاں نے آکر انہیں محاصرے سے نکالا۔ اپنے خزانے کھول دیے۔ اُن کی سپاہ کی کمربندی ہوئی اور مجنوں خاں کو بھی بہت سا روپیہ دیا۔ اُنھوں نے اپنے اپنے ہمراہیوں کے پر و بال درست کئے۔ اور دونوں لشکر خانزماں کے سامنے بیٹھ گئے۔ چونکہ اکبر کی بھی آمد آمد تھی۔ اسلئے خانزماں سوچ رہا تھا۔ کہ اسکا فیصلہ کرے یا توقف آصف خاں اس موقع کو غنیمت سمجھتا تھا۔ کہ یہ خدمت اگلی کدورت کو صاف کر دیگی مجنون خاں وغیرہ امرا کے ساتھ

اکبر کو عرضیاں لکھ رہا تھا۔ کہ وہ بھی آن پہنچے۔ آصف خاں اور مجنوں خاں حاضر حضور ہوئے۔ آصف خاں نے پیشکش نذر گزرانا خطا معاف ہوئی۔ نذرانہ قبول ہوا۔ اور سپہ سالار ہو کر خانزماں کے مقابلے کے لئے رخصت ہوئے وہ زمین کے گھاٹ پر اس کے مقابل جا اُترے ✦

اب خیال کرو۔ اکبر تو جونپور میں ہیں۔ آصف خاں اور مجنوں خاں خانزماں کے سامنے کڑہ مانک پور پر فوجیں لئے پڑے ہیں۔ درباری نمک حراموں نے آصف خاں کو پیغام بھیجا۔ کہ رانی درگاوتی کے خزانوں کا حساب سمجھاتا ہو گا۔ کہ وہ دوستوں کو کیا کھلواؤ گے اور چور اگڈھے کے مال میں سے کیا نکلے دلواؤ گے اُسے کھٹکا تو پہلے ہی تھا۔ اب گھبرا گیا۔ لوگوں نے اُسے یہ بھی شبہ ڈالا۔ کہ خانزماں کے مقابلہ پر آنا فقط اپنا سر کٹوانا ہے۔ آخر ایک دن سوچ سمجھ کر آدھی رات کے وقت اُس نے خیمے ڈیرے اُکھیڑے اور میدان جنگ سے اُٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ وزیر خاں اُس کا بھائی اور سرداران ہمراہی بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے سُنتے ہی اُس کی جگہ تو منعم خاں کو بھیجا۔ کہ مورچہ قائم رہے۔ اور شجاعت خاں کو آصف خاں کے پیچھے دوڑایا۔ شجاعت خاں روہی تردی بیگ کا بھانجا مقیم بیگ، مانک پور پر پہنچ کر چاہتے تھے کہ دریا اُتریں۔ آصف خاں تھوڑی دور بڑھا تھا۔ جو خبر پائی کہ مقیم بیگ پیچھے آیا ہے۔ جاتے جاتے پلٹ پڑا۔ اور دن بھر اس طرح جان توڑ کر لڑا کہ مقیم بیگ کا شجاعت خانی خطاب خاک میں مل گیا۔ آصف اپنی جمعیت اور سامان سمیٹ۔ فتح کا ڈنکا بجاتا چلا گیا۔ صبح کو انہیں خبر ہوئی دریا اُتر کر اپنی شجاعت کے روئے سیاہ کو دھویا۔ ادھر پیچھے پیچھے دوڑے۔ تُرک تھے۔ مگر ترکوں کا قول بھول گئے تھے۔ کہ جو حریف کمان بھر نکل گیا۔ وہ نکل گیا۔ خیر جیسے گئے ویسے ہی دربار میں آن حاضر ہو گئے

جب اہل دربار کے لالچ نے اُسے بھی میدان وفاداری سے دھکیل کر نکال دیا تو وہ جونا گڈھ میں جا بیٹھا اسی عرصہ میں خانزماں کی خطا بادشاہ نے معاف کر دی اور اُس کی طرف سے خاطر جمع ہوئی تو مہدی قاسم خاں کو آصف خاں کی گوشمالی کے لئے بھیجا حسین خاں کو کہ اسکے داماد بھی تھے اور چند امرائے نامی کو حکم دیا کہ فوجیں لے کر اُسکے ساتھ ہوں۔ آصف کو ہرگز اپنے سلیمان سے لڑنا منظور نہ تھا۔ درگاہ میں عفو تقصیر کی عرضی لکھی۔ مگر یہاں دُعا قبول نہ ہوئی۔ ناچار خانزماں کو خط لکھا اور آپ بھی چلا۔ حسرت و حرمان کی فوج کے ساتھ اس ملک سے خیمے اُٹھائے جسے اپنے بازو کے زور سے زیر کیا تھا۔ چنانچہ کڑہ مانک پور میں جا پہنچا۔ خانزماں کے زخم دل ابھی ہرے پڑے تھے جب ملا تو نہایت غرور اور بے پروائی سے ملا آصف خاں دل میں پچھتایا کہ ہائے یہاں کیوں آیا۔ ادھر سے جب مہدی خاں پہنچے تو میدان صاف دیکھ کر جونا گڈھ پر قبضہ کر لیا اور آصف خاں کو خانزماں کے ساتھ دیکھ کر پہلو بچا لیا۔ وہیں سے حج کو چلے گئے ✦

یہاں خانزماں آپ تو دارالحکومت میں بیٹھے آصف خاں سے کہا کہ پورب میں جا کر پٹھانوں سے لڑ۔ بہادر خاں کو اُسکے ساتھ کیا۔ وزیر خاں آصف خاں کے بھائی کو اپنے پاس رکھا۔ گویا دونوں کو نظر بند کر لیا۔ اور نگاہ اُن کی دولت پر۔ وہ بھی مطلب تاڑ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے اندر اندر پیچ دوڑا کر صلاح موافق کی۔ یہ ادھر سے بھاگا وہ اُدھر سے۔ کہ دونوں ملکر مانک پور پر آ جائیں۔ بہادر خاں آصف کے پیچھے دوڑا جونپور اور مانک پور کے بیچ میں ایک سخت لڑائی ہوئی۔ آخر آصف خاں پکڑے گئے۔ بہادر خاں اُسے ہاتھی کی عماری میں ڈالکر روانہ ہوئے۔ ادھر وزیر خاں جونپور سے آتا تھا۔ بھائی کی گرفتاری کی خبر سُنتے ہی دوڑا۔ بہادر خاں کے آدمی تھوڑے تھے۔ اور جو کچھ تھے لوٹ میں لگے ہوئے تھے اس لئے حریف کے حملہ کو روک نہ سکا۔ بھاگ نکلا اور لوگوں سے کہا کہ عماری میں آصف کا فیصلہ کر دو۔ وزیر خاں پیشدستی کر کے جا پہنچا۔ اور بھائی کو نکال لے گیا۔ پھر بھی آصف خاں کی دو تین اُنگلیاں اُڑ گئیں اور ناک بھی کٹ گئی بادشاہ پنجاب میں دورہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے آگرہ میں مظفر خاں تربتی کے پاس پیغام سلام دوڑائے۔ پھر وزیر خاں خود آن ملا۔ مظفر خاں نے حضور میں عرضی لکھی اور انجام یہ ہوا کہ پہلے وزیر خاں حاضر حضور ہوا۔ بادشاہ لاہور کے پاس شکار کھیل رہے تھے وہیں ملازمت ہوئی پھر آصف خاں کی خطا بھی معاف ہو گئی۔

خانزماں کی آخری مہم میں اُس نے بڑی جانفشانی دکھائی ۹۷۴ھ میں پرگنہ پیاگ کہ حاجی محمد خاں سیستانی کے نام تھا۔ آصف خاں کو مرحمت ہوا۔ اسی سال میں بادشاہ نے رانا پر فوج کشی کی۔ اس نے قلعہ چتوڑ جیمل کے حوالے کیا۔ اور آپ پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ آصف خاں نے اس محاصرہ میں بھی فدویت کے جوہر دکھائے۔ جب قلعہ مذکور فتح ہوا تو اُسی کی جاگیر میں مرحمت ہوا ٭

بُرہان نظام شاہ

مرتضےٰ نظام شاہ۔ اور بُرہان نظام شاہ دو بھائی تھے۔ نظام شاہ بموجب باپ کی وصیت کے احمد نگر کے تخت پر بیٹھا۔ چندروز عدل و انصاف اور نظام و انتظام کے ساتھ سلطنت کی۔ عین جوانی میں کچھ ایسا خلل دماغ ہوا کہ باغ میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ رہا۔ تمام کاروبار ارکان دولت کے حوالہ کر دئے مہینوں کسی امیر کو اپنے بادشاہ کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوتی تھی ایسا ہی ضروری امر ہوتا تو لکھ کر بھیج دیتے وہ اُسکا جواب لکھ بھیجتا۔ مگر جو جواب لکھتا۔ نہایت معقول و باصواب لکھتا۔ مہمات سلطنت کے معاملات ان کے سامنے پیش ہونے لگے وہ نیک نیت بی بی امرا و رعایا سب کی غور پرداخت کرتی تھی ۶ برس اسی طرح گذرے بعض بدنیتوں نے بادشاہ کو شبہ ڈالا کہ نجم آپ کو معزول کر کے بُرہان الملک آپکے چھوٹے بھائی کو بادشاہ کرنا

چاہتی ہے اس معاملہ نے طول کھینچا مختصر یہ کہ ماں کو بیٹے نے قید کر دیا۔ اور برہان بھی ماں کی زیر نظر بند ہو گیا۔ کئی برس کے بعد نظام کے خلل دماغ اور شوق گوشہ نشینی نے زیادہ زور کیا۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ اُمرا کی بینہ زوری حد سے گذر گئی۔ اور آپس میں کشاکشی رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ بے انتظامی نے اس قدر طول کھینچا کہ ملک نظام کے انتظام میں خلل پڑ گیا۔ شرفا کے ننگ و ناموس برباد ہونے لگے۔ پواج وارازل حاکم با اختیار ہو گئے۔ بادشاہ کے باب میں بھی رنگ برنگ کی خبریں اُڑنے لگیں۔ کبھی سنتے کہ مر گیا ہے۔ اُمرا مصلحت ملکی کے لئے چھپاتے ہیں۔ کبھی سنتے کہ دیوانہ جنونی ہو گیا ہے ✦

اسی عالم میں ایک موقع پر برہان الملک قید سے نکلا اور بیجاپور بھاگ گیا۔ کچھ مدت ابراہیم عادل شاہ پاس بسر کی۔ احمد نگر میں نظام کی غفلت اور امرا با اختیار کے ظلم سے خاص و عام تنگ تھے۔ یہ اپنے رفیقوں کے اشارہ سے آیا۔ رعایا نے بھی غنیمت سمجھا۔ ہزار بارہ سو کی جمعیت ساتھ ہو گئی۔ غلطی یہ کی کہ موقع لوگوں کی دلجوئی اور دلداری کا تھا۔ اس نے مردم آزاری اور سخت گیری شروع کر دی۔ امرا اور رعایا اُس سے بھی زیادہ اس سے گھبرائے۔ نظام الملک نے ایک امیر کو فوج دیکر لشکر عادل شاہی کے مقابلہ پر بھیجا تھا۔ جب برہان کے آنے کی خبر پہنچی تو برق کی طرح پلٹا۔ اور برہان ابھی احمد نگر میں نہ آیا تھا۔ کہ نظام آپہنچا۔ ہاتھی پر سوار ہوا۔ تمام شہر میں گشت کیا۔ تاکہ موت یا جنون کی خبریں جو مشہور ہوئی ہیں۔ اُن کے نقش دلوں سے مٹیں۔ دوسرے دن پھر نکلا۔ کالے چبوترے کے میدان میں کھڑا ہوا اور سب سے کہا اے ارکان دولت تم جانتے ہو۔ مدت ہوئی۔ کہ میں ملک اور ملک رانی سے بیزار ہوں۔ برہان میرا حقیقی بھائی ہے اور حکومت کا شوق رکھتا ہے بہتر ہے کہ تم سب مجھ سے دستبردار ہو اور اُسے اپنا فرمانروا سمجھو۔ امرا نے کہا جو کچھ حضور فرماتے ہیں درست ہے لیکن یہی مرضی مبارک ہے تو موقع اسکا یہ نہیں ہے۔ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ اس فتنہ کو فرو کیا جائے نظام الملک سمجھا کہ اُن لوگوں کے دل میری طرف مائل ہیں بیوفائی نہ کریں گے چنانچہ برہان کے مقابلہ کے لئے لشکر اور توپخانہ روانہ کیا۔ اُس کمبخت کی تقدیر یاور نہ تھی۔ لوگ پہلے ہی بیزار ہو گئے تھے۔ مختصر یہ کہ برہان شکست کھا کر برہان پور کی طرف بھاگ گیا۔ جو لوگ اسکے ساتھ ہوئے تھے نظام سے معافی تقصیر کے قول و قرار لیکر حاضر ہو گئے ✦

برہان نے چند روز بیجانگر کے پاس گذارے۔ چند روز اطراف دکن میں سرگرداں پھرتا رہا۔ کہیں قسمت نے یاوری نہ کی۔ یہاں نظام کی بدنظمی سے پھر لوگ تنگ ہوئے۔ اور اب کی دفعہ برہان کو لباس فقیری کا پردہ کر کے احمد نگر میں لے آئے۔ قرار پایا تھا کل صبح کو بغاوت کا نشان کھڑا کریں بسات کو امرائے با اختیار کو خبر ہو گئی۔ اُنھوں نے فوراً باغیوں کا بندوبست کر لیا۔ برہان اپنے لباس خاکساری میں

بھاگ گیا۔ اُسے کوئی نہ پہچان سکا۔ وہ ولایت کوکن کی طرف نکل گیا پھر بھی راجہ بگلانہ کے پاس پہنچا۔ وہاں سے مایوس ہو کر ملک ندربار میں آیا۔ قطب الدین خاں کوکہ حکمرانی کرتے تھے سنہ ۹۹۱ھ میں اُن کی وساطت سے دربار اکبری میں پہنچا۔

یہاں دو برس پہلے ایک شخص آیا تھا۔ اور ظاہر کیا تھا کہ میں برہان الملک ہوں۔ میر جمال الدین حسین انجو کہ سلاطین دکن کے حالات سے جزوی و کلی خبر رکھتے تھے اور برہان الملک کی حقیقی بہن خدیجہ بی بی اُن کی بی بی تھیں۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گئے۔ اُس نے بہت سے نشان اور علامتیں بیان کیں بہن نے بھی کچھ پہچانا کچھ نہ پہچانا مگر بڑے تکلف اور تواضع سے اُس کی مہمانیاں ہوئیں بادشاہ نے بھی اعزاز کے ساتھ رکھا۔ اب دفعتہً اصلی برہان الملک آ موجود ہوئے تو جعلساز ڈر کا مارا بھاگا اور ایک ہفتہ بعد جوگیوں میں سے پکڑا آیا۔ اصلی اور نقلی کا مقابلہ ہوا۔ دغاباز نے بیحیائی کی آنکھیں بہت چمکائیں مگر جھوٹ کے پاؤں کہاں۔ اس برہان کا دعوے بے برہان نکلا۔ آخر اقرار کیا کہ فلاں دکنی کا بیٹا ہوں حکیم الملک اس کا خطاب تھا۔ بی بی خونزہ ہمایوں برہان الملک کی ماں نے مجھے بیٹا کر لیا تھا۔

اب وہاں کی سنو کہ نظام الملک کا حال روز بروز ابتر ہوتا جاتا تھا اور اُمرا کی سرکشی اور سرزوری آپس میں تلواریں چلا رہی تھی۔ اس کشاکشی کی خبریں سُن کر سنہ ۹۹۳ھ میں اکبر نے خان اعظم کو سپہ سالار کر کے فوج بھیجی اور برہان کو بھی ساتھ کیا۔ لیکن وہ ناکام پھرا۔ چند روز کے بعد نظام کی بدنظمی اس حد کو پہنچی کہ اُس کا بیٹا قید تھا۔ اُمرا کے ایک فرقہ نے اُسے نکال کر تخت نشینی پر آمادہ کیا۔ وہ لڑکا تیرہ چودہ برس کی عمر۔ نمک حراموں نے جو سرشوری کا تیزاب اس پر ڈالا وہ بہت تیز پڑا۔ باپ کہ بیماری کے سبب سے فقط دنوں اور راتوں کا مہمان تھا۔ ناخلف بیٹا اس کے مرنے تک بھی صبر نہ کر سکا۔ حمام میں قید کیا اور حکم دیا کہ سب دروازے اور روشندان بند کر دو۔ آگ جلاؤ اور گرم پانی ڈالو۔ چند ساعت میں اُس کی زندگی کا بلبلہ بیٹھ گیا۔ ۲۶ سال کئی مہینے سلطنت کر کے سنہ ۹۹۶ھ میں خاتمہ ہوا۔

حسین نظام الملک: یہ لڑکا اُمرائے کہن سال کے ہاتھ میں کپڑے کی گڑیا تھا جو چاہتے تھے سو کرتے تھے۔ وہ اپنے ہم عمر یاروں کیساتھ باغوں میں عیش اور بازاروں میں سیر کرتا۔ دو مہینے تین دن میں اُس کا بھی فیصلہ کیا۔ شہر اور قلعہ میں قتل عام ہوئے۔ اُمرا اس طرح مارے گئے جیسے آندھی میں آم گرتے ہیں۔ میر محمد تقی نظیری کہ امیر اور شاعر بےنظیر تھے اسی فتنہ شہر آشوب میں نامعلوم مارے گئے۔

اسمعیل نظام الملک: برہان الملک تو اکبر کے دربار میں حاضر تھے۔ ان کے دو بیٹے ابراہیم و اسمعیل چچا کے پاس قید تھے۔ جب اُمرا نے اپنے آقا کا گھر صاف کر دیا۔ تو اسمعیل کو قید سے

نکال کر تخت پر بٹھایا۔ لیکن فقط نمونہ کے لئے اُسے سامنے رکھا تھا۔ حکومت آپ کرتے تھے شہر میں قتل عام کئے۔ خاص و عام کے گھر لئے۔ جو جو انسان آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ اور کسی موقع پر اُن کے سر ہلانے کا خیال تھا۔ انہیں خاک میں دبا دیا۔ جو صاحب قوت امیر تھے۔ اُن کا مذہب مہدوی تھا۔ اسمٰعیل خود لڑکا تھا۔ اُنہوں نے مہدوی کر لیا۔ اور مسجدوں میں مہدویہ فرقہ کے خطبے جاری ہو گئے۔ مہدوی مذہب کے لوگوں کے زور شور پہلے ہی دیکھ چکے ہو۔ اُنہوں نے سب کو دبا لیا۔ غریب مذہب کے لوگ شہر چھوڑ چھوڑ نکل گئے یا گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے ◆

دربار اکبری کی روئداد سُنو کہ جب برہان الملک ۹۹۰؁ھ میں آیا۔ تو اول ۲ صدی کا منصب دیکر جاگیر عطا کی اور ترقیاں دیکر ہزاری تک پہنچایا۔ ۹۹۳؁ھ میں مالوہ میں بھیجدیا۔ اور خان اعظم کو لشکر سلطانی کے ساتھ مہم دکن پر بھیجا۔ اس میں اسے بھی ساتھ کیا کہ بھائی سے اپنا حق حاصل کرے۔ اُس وقت طالع یاور نہ تھے ناکام پھرا۔ چند روز کے بعد اکبر نے صادق محمد خاں کو مہم بنگش پر بھیجا۔ برہان الملک کو اسکے ساتھ کیا۔ اور وہیں اُسے جاگیر ملی۔ جب ۹۹۸؁ھ میں خبر آئی کہ اسمٰعیل۔ برہان الملک کا بیٹا تخت نشین ہوا ہے۔ اور احمد نگر میں پھر بغاوت ہوئی اور ملک درہم برہم ہو رہا ہے تو بادشاہ نے برہان الملک کو بلایا اور کہا کہ حق تمہارا ہے جاؤ اور قبضہ کرو۔ جو کچھ خزانہ و فوج درکار ہو ساتھ لو۔ اُس نے کہا۔ کہ امرائے چغتائی اور فوج حضور کو دیکھ کر اہل دکن گھبرائینگے۔ اس لئے امرا و افواج کا جانا مناسب نہیں۔ میں حکمت عملی سے کام لونگا۔ یہ رائے اس کی پسند آئی۔ امرائے مالوہ اور علاقہ ہائے سرحد دکن کے نام فرمان جاری ہوئے۔ کہ جب ضرورت ہو سامان شائستہ سے فوراً مدد کریں۔ راجہ علیخاں حاکم خاندیس کے نام فرمان گیا۔ کہ برہان مدت سے اس درگاہ کی پناہ میں ہے۔ ایسا انتظام کرو کہ نظام الملک ہو کر اپنے حق کو پہنچ جائے۔ غرض برہان الملک کو بہت سی نصیحتیں و صیتیں اور فرمائشیں فرما کر رخصت کیا۔ نصیحتیں کیا ہونگی؟ یہی کہا ہو گا۔ کہ ہماری خدا ترسی۔ دریا دلی۔ شوق آبادانی۔ لوگوں کے منقوش خاطر کرنا جہاں تک آواز پہنچے۔ اکبری نقارہ کی آواز۔ اور جہاں تک ہاتھ پہنچے اکبری سکہ پہنچانا ◆

راجہ علی خاں نے صدق دل سے فرمان مذکور کی تعمیل کی۔ فوج لیکر برہان کے ساتھ ہوا۔ اور اُدھر ابراہیم عادل شاہ سے بھی مدد کا بندوبست کر لیا۔ اُس نے اپنا لشکر سرحد پر بھیجدیا۔ راجہ علی خاں برہان الملک کو ساتھ لیکر گونڈوانہ کے رستے پہلے برار پر گیا۔ اور ملک مذکور بے جنگ قبضہ میں آ گیا۔ احمد نگر سے ایک امیر فوج جرار لیکر آیا۔ راجہ علیخان نے برہان کو پیچھے ہٹایا۔ اور آپ فوج لیکر مقابلہ پر آ گیا۔ لڑائی کا خاتمہ خان کی فتح پر ہوا۔ امرا ایک ایک کر کے برہان کے حضور میں حاضر ہونے لگے۔ آگے میدان صاف تھا

صاف تھا۔ یہاں سے برہان کو احمد نگر کی طرف روانہ کیا۔ اور آپ اپنی فتحگاہ میں آکر کامیابی کے جشن کئے۔ نذر نیاز۔ ملازموں کے انعام واکرام میں ہزاروں روپے خرچ کئے۔ یہ معرکہ سنہ ۹۹۹ھ میں ہوا ؂

برہان کی قسمت نے بڑھاپے میں یاوری کی۔ احمد نگر کا بادشاہ ہوا۔ مگر امرا کی سرشوری سے خاطر جمع نہ تھی۔ علاوہ برآں خود بھی نیک نیت نہ تھا۔ اس لئے جو کچھ کرتا تھا ناکامی دیکھتا تھا ابراہیم عادل شاہ سے بگاڑ کر لیا۔ فوج کشی کی۔ اس میں شکست فاحش کھائی۔ لاکھوں کی لوٹ اور ڈیڑھ سو ہاتھی حریف کے حوالہ کئے۔ فوج قتل اور تباہ کروائی۔ اس سے خاص و عام کی نظروں میں بیوقار و بے اعتبار ہو گیا۔ لوگوں نے چاہا۔ کہ پھر اسمٰعیل کو تخت پر بٹھائیں۔ اُسے خبر ہو گئی اور اہل سازش کو سزائیں دیں اُنہیں دنوں میں امین الدین اور شیخ فیضی اکبر کیطرف سے فرمان لیکر پہنچے۔ اس بے وفا نے دربار اکبری کے سارے سبق بھلا دئے تھے۔ یہ بھی ناکام پھر آئے ؂

اسد خاں اور فرہاد خاں کی سپہ سالاری سے بندر رونگ پر فوج بھیجی کہ پرتگالیوں کا زور توڑے۔ وہ دونوں امیر وہاں گئے اور غنیم کو تدبیر اور شمشیر کے زور سے زیر کیا سو پرتگالی اور دو سو دو فلے قتل کئے اور باقی جلاوطنی کے بادبان چڑھا رہے تھے کہ یہاں برہان کو بڑھاپے میں جوانی کا شوق ہوا۔ لوگوں کے ننگ و ناموس میں بدنیتی کی آگ لگانے لگا۔ کسی سے سُنا کہ فرہاد خاں کی بی بی بڑی حسین ہے۔ اُسے محل میں بلایا اور اپنی بدنیتی کی خاک اس کے پاک دامن میں ڈالی۔ اتنی بڑی بات! اور بڑے آدمیوں کی بات! پچھے کہاں! فرہاد خاں کو جب خبر پہنچی تو جل کر خاک ہو گیا۔ اور سب اہل فوج کے دل بیزار ہو گئے۔ فرہاد دشمن کے سامنے جا کر شامل ہو گیا۔ دشمن جو زیر ہو چکا تھا زبر ہو گیا۔ بڈھا برہان بلہوسی کی دوائیں کھا کر ایسی پیچ در پیچ بیماریوں میں مبتلا ہوا۔ کہ نہ کسی حکیم کی عقل کام کرتی تھی۔ نہ کوئی نسخہ کارگر ہوتا تھا جب مزاج کرسی اعتدال سے گر پڑا تو ابراہیم کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھایا۔ اُمراد لوں میں پھوٹے ہوئے تھے اُنہوں نے اسمٰعیل کو باغی کر کے لڑا دیا۔ برہان الملک نے بمشکل بیماری سے اتنی اجازت لی کہ سنگھاسن پر بیٹھ کر میدان جنگ تک آیا۔ ناخلف بیٹا باپ کے مقابلہ میں کامیاب کیا ہوتا۔ ملک تباہ۔ نمک حرام دو دہ لشکر ویران۔ دولت برباد۔ غرض دونو طرف نقصان ایک ہی گھر پر پڑ رہے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ کا بھائی اُس سے باغی ہو کر سرحد پر آیا۔ اُنہوں نے اُس کی مدد پر کمر باندھی۔ وہ قضائے الٰہی سے مر گیا۔ ابراہیم عادل شاہ آتش غضب سے بھڑک اُٹھا۔ فوج لڑائی کو بھیجی۔ اُنہوں نے مقابلہ میں اپنے اُمرا کو فوج دے کر بھیجا۔ یہاں بھی شکست نصیب ہوئی۔ یہی حالات دیکھ کر اکبر نے مراد کو شاہ مراد بنایا تھا اور اُمرا کو ساتھ کر کے مالوہ و گجرات پر بھیج رکھا تھا کہ جس وقت موقع پائے اس طرف لشکر کے نشان لہرائے خلاصہ یہ کہ سنہ ۱۰۰۳ھ میں

برہان الملک مرگئے نورالدین ظہوری نے ساقی نامہ انہیں کے نام پر لکھا تھا +

ابراہیم برہان الملک - ابراہیم کو باپ نے اپنے سامنے تخت پہ بٹھا دیا تھا۔ اُس نے اسمٰعیل بھائی کو اندھا کر کے قید خانہ میں بٹھا دیا۔ اُمرا اپنے اپنے گروہ باندھ کر باہم چھری کٹاری ملنے لگے ابراہیم عیش و عشرت کی شراب سے نمرود ہوگیا۔ یہ حال دیکھ کر ابراہیم عادل شاہ نے خیال کیا کہ اکبر بادشاہ اس ملک پر مدت سے نظر رکھتا ہے۔ اور اُمرا اُس کی سرحدوں پر فوجیں لئے پڑے ہیں شاہزادۂ مراد خود مالوہ میں آن بیٹھا ہے۔ اب وہ احمد نگر کو نہ چھوڑیگا۔ اور ایسے بادشاہ جلیل القدر سے سرحد مل گئی۔ تو اپنے ملک کے لئے بھی خطر ہے۔ اس لئے یہ دیوار بیچ میں قائم رہے تو ہر طرح بہتر ہے۔ اور یہ زیادہ تر بہتر ہے۔ کہ اُس کی حفاظت بھی اپنے طور پر رہے۔ غرض مصالح چند در چند مد نظر رکھے اور امرائے باتدبیر کو فوج دیکر بھیجا۔ کہ دولت نظام شاہی کا انتظام کردو۔ یہاں سے ابراہیم فوج لے کر مقابلہ کو نکلا۔ امرائے ہمراہی جس حالت میں گئے تھے۔ ان سے کیا فتحیابی کی اُمید ہوسکتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ اور ۴ مہینے کے اندر تخت پر بیٹھ کر زیر خاک چلا گیا۔ اور بہادر نام ایک بیٹا شیر خوار چھوڑا +

اس وقت دربار احمد نگر میں عجب ہل چل پڑ رہی تھی۔ (۱) چاند بی بی برہان الملک کی بہن نے برہان نظام شاہ کے طفل خرد سال کو بہادر شاہ خطاب دیکر تاج سر پہ رکھا۔ وہ کہتی تھی۔ کہ بہادر شاہ کے نام بادشاہی ہو۔ (۲) میاں منجھو وغیرہ اُمرا احمد شاہ نام ایک لڑکے کو لائے اور تخت نشین کر کے بیٹھ گئے۔ کہ نظام شاہی خاندان کا پھول ہے۔ بہادر شاہ کو قید کر دیا۔ (۳) اخلاص خاں حبشی نے ایک گمنام لڑکا نوجوان لاکر پیش کیا۔ کہ یہ نظام شاہی خاندان سے ہے۔ موتی شاہ اس کا نام رکھا۔ اور قومی فوج لے کر الگ ہوگیا۔ (۴) ابہنگ خاں حبشی ایک بڈھے فرتوت کو لے آئے۔ کہ یہ پیر کہن سال برہان شاہ اول کا بیٹا ہے۔ اور ۷۰ برس کی عمر رکھتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ سلطنت کے لئے زیبا ہے۔ ان فریقوں میں سے کبھی کوئی غالب ہو جاتا تھا کبھی مغلوب۔ میاں منجھو وغیرہ امرا جو قلعہ میں احمد شاہ کو لئے بیٹھے تھے وہ محصور ہوگئے۔ اُنھوں نے گھبرا کر شاہزادہ مراد کو عرضی۔ اور امرائے اکبری کو خطوط لکھے۔ کہ آپ تشریف لائیں۔ اور ملک پر قبضہ فرمائیں۔ ہم اطاعت کو حاضر ہیں۔ لشکر اکبر شاہی کے سپہ سالار **مرزا عبدالرحیم** خاں خاناں تھے۔ شاہزادہ مراد کو لے کر احمد نگر کے گرد آن پڑے +

چاند بی بی - برہان الملک کی حقیقی بہن تھی۔ نہایت عفیفہ۔ پاک دامن۔ دانشمند۔ باتدبیر۔ عالی ہمت۔ دریا دل۔ اِسی واسطے **نادرۃ الزمانی** اُس کا خطاب تھا۔ **علی عادل شاہ بادشاہ بیجاپور** سے منسوب تھی۔ **علی عادل شاہ**۔ **ابراہیم عادل شاہ** کا بڑا بھائی تھا۔ وہ مرگیا۔ تو **ابراہیم عادل شاہ**

بادشاہ ہُوا۔ بیگم مذکور نے جب دیکھا کہ خاندان برباد ہوا۔ اور خاندانی سلطنت گھر سے جاتی ہے۔ تو اُمرا کو جمع کیا۔ سب کو فہمایش کی۔ آپس کے نفاق کا انجام دکھایا۔ اور جب لشکر اکبری آیا۔ تو بڑی ہمت اور حوصلہ سے اس کا مقابلہ کیا۔ ابراہیم عادل شاہ کو کہ از روئے قرابت اُس کا حقیقی دیور تھا۔ ایک مراسلت روانہ کی۔ اُس نے سہیل خاں خواجہ سرا کو کہ نہایت بہادر اور باتدبیر امیر تھا۔ ۲۵ ہزار فوج دے کر روانہ کیا اور فرمانروایان دکن نے بھی فوجیں روانہ کرنے کا بندوبست کیا۔ کہ سب کو اپنے اپنے انجام نظر آنے لگے تھے۔ بیگم مذکور نے قلعہ کی حفاظت میں وہ ہمت عالی ظاہر کی۔ کہ امرائے جنگ آزمودہ جو رستمی کے دعوے رکھتے تھے۔ سب کی گردنیں خم ہو گئیں۔ محاسن سلطانی کے اوصاف سے آراستہ دیکھ کر خاص و عام نے سلطان کا تاج اس کے نام پر رکھا۔ وہ چاند بی بی سلطان مشہور ہوئی۔ اور جب اکبری فوج نے احمد نگر فتح کیا۔ تو مر گئی۔ تعجب یہ کہ کسی کو تحقیق نہ ہوا۔ کہ کس طرح مر گئی +

پیر روشنائی ملا صاحب ۹۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں (آج سے ۲۵ برس پہلے ایک ہندوستانی سپاہی پیشہ آدمی نے اپنے لئے پیر روشنائی خطاب تجویز کیا۔ اور افغانوں میں جا کر بہت سے احمقوں کو مرید کر لیا۔ اپنی بے دینی اور بدمذہبی کو رونق دی۔ اور ایک کتاب تصنیف کر کے **خیر البیان** نام رکھا۔ اُس میں اپنے عقاید فاسدہ کو ترتیب دیا۔ وہ تو چند روز میں سر کے بل اپنے ٹھکانے پہنچا۔ ایک ۱۴ برس کا لڑکا جلالہ نام چھوڑ گیا۔ ۹۸۹ھ میں جبکہ اکبر کابل سے آتا تھا۔ جلالہ ملازمت میں حاضر ہو کر مرحمت شاہنشاہی سے معزز ہوا +

شقاوت ذاتی اور موروثی لڑکے کی پیدائش میں تھی۔ اور خود بھی پیدا کی تھی۔ اس لئے کچھ عرصے بعد بھاگ گیا۔ انہی افغانوں میں جا کر پھر رہزنی شروع کر دی۔ اور جم غفیر کو اپنے ساتھ متفق کر کے ہندوستان اور کابل کا رستہ بند کر دیا ؎

اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت	نہی زیر طاؤس باغ بہشت
بہنگام آن بیضہ پروردنش	ز انجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمۂ سلسبیل	دراں بیضہ گردم دمد جبرئیل
شود عاقبت بیضۂ زاغ زاغ	کشد رنج بیہودہ طاؤس باغ

(ملا صاحب کہتے ہیں) فرقہ روشنائی (جنگل کی کھائی) کہ حقیقت میں عین تاریکی تھی۔ اور ہم اپنی کتاب میں انہیں فرقہ تاریکی ہی لکھیں گے۔ اس کے تدارک کے لئے بادشاہ نے کابل کو مان سنگھ کی جاگیر کر کے صوبہ دار کابل کیا۔ تاکہ ان سرشوروں کو تنبیہ کرے۔ اسمٰعیل قلیخاں۔ حسین قلیخاں۔ خان جہاں۔

کے بھائی اور رائے سنگھ دربار ی کو بلوچوں پر بھیجا اور سعید خاں گکھر اور بیربر اور شیخ فیضی اور فتح اللہ شربتی کو اور اُمرا کے ساتھ زین خاں کی کمک کے لئے بھیجا کہ لشکرے کر گیا ہوا تھا۔ پھر حکیم ابوالفتح اور اور جماعت اُمرا کو روانہ کیا۔ اس لڑائی کا انجام لشکر بادشاہی کی تباہی پر ہوا اور دیکھو بیربر کا حال) بادشاہ کو بڑا رنج ہوا راجہ ٹوڈرمل کو سپاہ کثیر کے ساتھ روانہ کیا۔ راجہ نے بڑی ہشیاری و تدبیر کے ساتھ اس مہم کا سرانجام کیا۔ بندوبست کے ساتھ پہاڑوں میں داخل ہوا۔ جا بجا قلعے بنواتا گیا۔ اور ملک مذکور کو تاخت و تاراج کرتا ہوا اس طرح آگے بڑھا کہ غنیموں کو کھیتی کے سنبھالنے کی بھی فرصت نہ دی اور افغان تنگ ہو کر پریشان ہو گئے۔

۹۹۴ھ گرمی کے موسم میں راجہ مان سنگھ بھی فوج لیکر چڑھا۔ وہ خیبر کے نواح میں سخت لڑائی ہوئی۔ فرقۂ مذکور کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ بہت سے قید ہوئے اسمٰعیل قلیخاں جہلم سے فوج لیکر پہنچا۔ جلالہ بنگش کی طرف بھاگ گیا۔ عبدالمطلب خاں سپہ سالار اس کے تعاقب میں گیا وہاں جلالہ نے پھر فوج جمع کر لی اور ایک خونریز لڑائی ہوئی اور جلالہ پھر بھاگ گیا۔ چندروز پہاڑوں میں مارا مارا پھرا۔ بدخشاں سے پھر عبداللہ خاں اُزبک کے پاس پہنچا۔ مگر یہ کب ممکن تھا۔ کہ وہ اُس کی مدد کے لئے اتنے دور دراز فاصلے سے ایسے پہاڑوں میں اکبر جیسے بادشاہ کے مقابلہ پر فوج بھیجے جلالہ توران سے ۱۰۰۰ھ میں ناکام پھرا۔ اور پھر آکر ملک کے امن میں راہزنی سے خلل انداز ہوا کابل و ہندوستان کا رستہ بند کر دیا۔ بادشاہ نے آصف خاں (مرزا جعفر قزوینی) کو سپہ سالار کر کے فوج روانہ کی۔ وہ بھاگ گیا اس کا بھائی واحد علی اور اہل و عیال اور خویش و اقارب کر تقریباً ۴۰۰ آدمی تھے گرفتار ہوئے تقریباً بیس برس تک اس کا فساد جاری رہا اور اس عرصہ میں امرائے بادشاہی نے اس کے فرقہ کو کہیں دم نہ لینے دیا۔ زراعت کی بھی مہلت نہ تھی۔ کھانے پینے کی قلت اور ضروریات کے نہ ملنے سے افغان تنگ ہو گئے۔ اور جلالہ بھی ڈانواں ڈول پھرتا رہا۔ باوجود اس کے ۱۰۱۰ھ میں غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اور یہی جلالہ کا آخری جاہ جلال تھا۔ مگر چار دن چاندنی رہی تھی۔ کہ یہاں بھی اندھیرا ہو گیا اور خود بھاگتا ہوا گرفتار ہو کر مارا گیا۔ فرقہ روشنائی کے لوگ مدت تک اس کے نام پر چراغ جلاتے رہے۔ اب بھی کوہستان مذکور میں جو وہابی ہیں۔ انہیں سنت و جماعت والے خفا ہو کر فرقہ روشنائی کا بقیہ کہتے ہیں۔

تردی بیگ خاں ترکستانی

اس امیر کا حال جا بجا حالات دربار میں مسلسل ہے اس مقام پر جو کچھ مآثرالامرا میں لکھا ہے۔ اُس کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ وہ ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں امارت کرتا تھا۔ ملک گجرات کی فتح کے بعد چانپانیر کا علاقہ

اُسے سپرد ہوا جب مرزا عسکری کو گجرات کا ملک ملا اور سلطان بہادر نے اُسے شکست دی تو وہ بہ نیت بادشاہی کے لالچ سے آگرہ کی طرف آیا۔ سلطان بہادر دریائے دھندائی اُتر کر چانپانیر پر آیا۔ باوجودیکہ قلعہ ایسا مستحکم۔ اور غلہ کا ذخیرہ بھرا ہوا۔ سامانِ جنگ کافی ووافی۔ تردی بیگ ہمت کے سر پر خاک ڈال کر بھاگا۔ اور ہمایوں کے پاس پہنچا +

عالم خدمتگزاری میں جوہر اخلاص سے بہتر کوئی متاع نہیں ہے۔ وہ باوجود ملازمت قدیمی اور اعتبار بادشاہی کے اس دولت سے تہیدست تھا مصیبت کے وقت جس بات کو حقیقت پرست اور وفادار لوگ باعث ننگ وعار سمجھتے ہیں۔ بلکہ عام آدمی بھی آئین نمکخواری میں اپنے دامن پر داغ سمجھتے ہیں وہ بے شرمی و بے حیائی سے گوارا کرتا تھا۔ ہمایوں ریگستان سندھ سے جودھپور کی طرف گیا تھا۔ اور رستہ میں خاص اس کی سواری کا گھوڑا نہ رہا۔ اُس سے مانگا اور اُس نے نہ دیا۔ آخر ندیم کوکہ نے اپنی بڈھی ماں کو گھوڑے پر سے اتار کر ایک بار برداری کے اونٹ پر بٹھا دیا اور وہ گھوڑا بادشاہ کو دیا۔

پھر امرکوٹ میں آکر جب بادشاہ کی لُٹی پٹی فوج کی شدت بدحالی حد سے گزر گئی۔ تو جو مال بادشاہ کی بدولت جمع کیا تھا باوجودیکہ بادشاہ نے مانگا۔ اُس نے نہ دیا۔ آخر ہمایوں نے رائے پرشاد وہاں کے حاکم کی مدد لے کر اُس سے اور بعض امیروں سے دبا کر لیا۔ مگر اُس قدر کہ اہل ضرورت کی کارروائی کو کافی ہوا +

جب ایران کو چلنے لگے تو یہ اپنے رفقا اور ملازموں سمیت الگ ہو گیا۔ اور مرزا عسکری سے مل گیا مرزا نے ایک ایک کو اپنے رفیقوں کے حوالہ کیا اور مال کے لالچ سے سب کو قندھار لے گیا بہتوں کو شکنجہ میں ڈال کر مارا بہتوں کو قتل کیا اور تردی بیگ خاں سے مبالغ خطیر وصول کئے +

جب ہمایوں ایران سے پھرا تو یہ ندامت اور شرمساری کی چادر میں منہ لپیٹ کر حاضر ہوئے پھر اسی رتبہ امارت پر معزز ہوئے ۹۵۵ھ میں الغ بیگ ولد مرزا سلطان کے مرنے سے انہیں زمین داور کا حاکم کر دیا۔ ہندوستان کی مہم میں اچھی خدمتیں کیں اور میوات جاگیر پائی +

۹۶۳ھ میں جب ہمایوں نے عالم فنا سے انتقال کیا۔ تو یہ امیر الامرائی کے سودے دل میں کر رہے تھے۔ اُنہوں نے دربار کا انتظام کر کے اکبر کا خطبہ پڑھا۔ اور لوازم و اسباب سلطنت اکبر کے پاس روانہ کئے کہ پنجاب میں تھا۔ اس خدمت کے صلہ میں دربار سے پنجہزاری منصب مرحمت ہوا۔ اس نے امراء کو جو دہلی میں موجود تھے۔ رفاقت میں لیا۔ اور ملک کا بندوبست کرنے لگا۔ حاجی خاں عدلی کا رشید غلام نارنول میں حاکم تھا۔ وہ اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔ تردی بیگ اس پر فوج لے کر پہنچا اور شکست دے کر

بھگادیا۔ بلکہ میوات تک مارتا چلا گیا! اور اکثر سرکشوں کی گردنیں رگڑ کر پھر دلی میں آیا! اسی عرصہ میں ہیمو بقال آیا اس معرکہ کا حال الگ لکھا گیا ہے۔ دیکھو اکبر و بیرم خاں کے حالات ؛

تورہ چنگیزی ترکوں کا تورہ (قانون شاہی) تھا کہ جس عورت پر بادشاہ خواہش سے نظر کرے۔ خاوند پر حرام ہو جاتی تھی۔ اس قومی اور ملکی رسم کو اسلام بھی نہ توڑ سکا چنانچہ ابوسعید مرزا اور امیر چوپان کا معاملہ تاریخوں میں مذکور ہے۔ سلاطین ترک میں بادشاہ سے عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں! اور حق یہ ہے کہ بادشاہ بھی اکثر نیک ہی ہوتے تھے وہ سب کو بہو بیٹیاں سمجھتے تھے! اور جہاں کچھ تعلق واقع ہوتا تھا۔ تو فحش کے طور پر نہ ہوتا تھا۔ بلکہ نکاح کا لباس پہنکر ہوتا تھا اس کے خاوند کو جاگیر منصب۔ زر و مال دیکر راضی کرتے تھے خدا کی خدائی کھلی ہے۔ وہ بھی کہیں اپنا گھر بسا لیتا تھا۔ آج سے ۱۵-۱۶ برس پہلے تک میں نے خود دیکھا کہ تورہ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا تھا بخارا کے بادشاہان موجودہ نے پیری کی برکت سے میری پائی تھی۔ لوگ اُن کا بڑا ادب کرتے تھے جس طرح ہندوستان میں جہاں پناہ اور جناب عالی سے بادشاہ مراد رکھتے ہیں۔ وہاں حضرت امیر المؤمنین کہا کرتے تھے اور اس سے بادشاہ مراد لیتے تھے۔ وہ بھی جس عورت پر خواہش ظاہر کرتے تھے اس کا وارث اُسے آراستہ کرکے حاضر کر دیتا تھا۔ پسند آتی تو حرم سرا میں داخل رہتی۔ ورنہ رخصت ہو جاتی۔ اور جب تک زندہ رہتی ہم چشموں میں فخر کرتی کہ مجھے یہ برکت حاصل ہوئی تھی روس کی عملداری نے رنگ بدل دیا۔ اب کچھ اور ہی عالم ہے ؎

کوئی عاشق نظر نہیں آتا	ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

میرے دوستو! خوب سمجھ لو! جس طرح انسان کی طبیعت کے لئے بعض غذائیں موافق اور بعض ناموافق ہیں کہ کبھی بیمار اور کبھی ہلاک کر دیتی ہیں۔ اسی طرح سلطنت کا بھی مزاج ہے۔ اور بہت نازک مزاج ہے۔ ایسی باتیں اس کے لئے موافق نہیں۔ سلطان روم عبدالعزیز خاں مرحوم کا انجام سب کو معلوم ہے۔ اس کا کیا سبب تھا؟ سبب ظاہر ہے دیکھ لو کہ مرنے کے بعد شبستان دولت میں سے ایک ہزار کشتی بیگمات اور رذال حرم کی بھری ہوئی نکل کر گئی تھی ؎

اگر دریافتی بردانشت بوس	اگر غافل شدی افسوس افسوس

چتوڑ کی فتح قلعہ چتوڑ۔ رانا اودے پور کے ماتحت تھا۔ ۹۷۵ھ[1] میں اکبر خود قلعہ مذکور پر لشکر لیکر گیا۔ اور قلعہ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ اگرچہ پہلے بھی دو دفعہ سلاطین اسلام کے قبضہ میں آچکا تھا۔ مگر میواڑ کے راجپوت اسے اپنے راج کا مبارک اور مقدس مقام سمجھتے تھے

[1] دیکھو صفحہ ۱۶۷

اور غیروں کے قبضہ میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ آبادیوں سے الگ ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اور وہ زمین سے ایک کوس اونچی تھی۔ جن دنوں ابراہیم مرزا وغیرہ نے ملک مالوہ میں بغاوت کی خاک اڑائی ہوئی تھی۔ اکبر نے اُس طرف توسن ہمت کی باگ اٹھائی۔ دھولپور کی منزل میں لشکر پڑا تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ تمام راجہ ہندوستان کے ملازمت میں آئے۔ ایک رانائے میواڑ ہے کہ نہیں آتا۔ پہلے اس کا استیصال کرنا چاہیے۔ مالوہ کو پھر دیکھا جائیگا ؛

رانا اودے سنگھ کا بیٹا سکت سنگھ نام باپ سے خفا ہو کر آیا تھا اور رکاب میں حاضر تھا۔ اس سے کہا کہ سکت! دیکھیں تم اس مہم میں کیسی خدمتیں بجا لاتے ہو۔ اُس نے زبان سے بہت کچھ اقرار کیے مگر فرصت پاکر لشکر سے بھاگا اور باپ کو جا کر اس حال کی خبر دی۔ قلعہ ۳ کوس لمبا اور آدھ کوس چوڑا تھا۔ قدرتی چشمے اُس کے اندر جاری تھے۔ اور میواڑ کا عاقبت تھا یعنی انجام کو اُدیپور ہو گیا۔ سامان کھانے پینے اور لڑائی کا اس قدر تھا کہ مدتوں میں بھی ختم نہ ہوتا۔ بادشاہی فوجوں نے دائرہ کی طرح قلعہ گھیر لیا۔ محاصرہ تنگ تھا۔ آمد و رفت بند کر دی تھی۔ بہادر ہمہ روز حملے کرتے تھے۔ زخمی ہوتے تھے مارے جاتے تھے۔ فائدہ کچھ نہ ہوتا تھا صلاح ہوئی۔ کہ سرنگیں لگاؤ اور برج اڑا کر قلعہ میں گھس جاؤ۔ طرفین تقسیم ہوئیں۔ اور تجربہ کار اور عرق ریز امیروں کے اہتمام میں کام جاری ہوا۔ سنگتراش معمار بیلدار مزدور ہزاروں لگے ہوئے تھے۔ اور چوہوں کی طرح اندر ہی اندر زمین کے نیچے چلے جاتے تھے۔ سونا چاندی خاک کی طرح اُڑتا تھا۔ قلعہ سے توپوں کا آنا دشوار تھا۔ وہیں توپیں تیار ہوئیں۔ ۲۰ سیر کا گولہ کھاتی تھیں۔ یہ باتیں قلعہ والوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ دیکھ کر گھبرائے اور پیغام بھیجا۔ کہ خراج ہر سالہ حضور میں ادا کرینگے۔ خطا معاف ہو۔ ارکان دولت کی صلاح ہوئی۔ مگر اکبر نے کہا۔ کہ رانا آکر حاضر ہو۔ پہلی سرنگ خود بادشاہ نے اپنے اہتمام میں رکھی تھی۔ دوسری راجہ ٹوڈرمل اور قاسم خاں میر بحر کے انتظام میں تھی وغیرہ وغیرہ ؛

قلعہ والوں نے بھی دیکھ لیا۔ کہ وقت یہی ہے۔ اگر سرنگیں تمام ہو گئیں تو کام تمام ہے۔ انہوں نے بھی فصیلوں پر آکر گولیوں کی بوچھاڑ دی۔ اور توپچیوں نے برجوں سے آگ برسانی شروع کی۔ ادھر امرا تو در کنار بادشاہ خود ایک ایک مورچہ اور دمدمہ پر دوڑے پھرتے تھے۔ ساباط[2] ایسی چوڑی تھی

---

[1] ماثر الامرا میں لکھا ہے کہ کوہ مذکور ایک ایسے میدان سطح میں واقعہ ہوا ہے جس کے گرد بلندی و پستی کو راہ نہیں۔ کوہ مذکور کا دور ۶ کوس ہے جس بلندی پر دیوار قلعہ ہے وہ زمین سے تین کوس بلند ہے اور علاوہ تالابوں اور نگین حوضوں کے کہ برسات سے بھرتے ہیں اوپر ایک چشمہ بھی جاری ہے ؛

[2] ساباط کی صورت یہ ہے کہ ایک ایسے موقع کا مقام دیکھتے ہیں جہاں قلعہ کا گولہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں سے کچھ زمین کھودتے ہیں اور دو طرف تختوں اور لکڑیوں کی دیواریں اٹھاتے ہوئے قلعہ کی طرف بڑھاتے جاتے ہیں۔ اس کا رُخ ایسا دیکھ لیتے ہیں کہ فصیل سے گولی آئے تو ان دیواروں پر منہ توڑ صدمہ سنبھالے۔ آگے بڑھتے جاتے ہیں اور اوپر سے چھت پاٹتے جاتے ہیں۔ اس پیچھے کو دیوار قلعہ تک پہنچا دیتے ہیں وہاں سے کسی برج کی بنیاد خالی کر کے بارود سے اڑا دیتے ہیں ؛

کہ دس سوار بفراغت اندہی اندر چلے جاتے تھے۔ بلند ایسی کہ فیل سوار نیزہ دار اوٹ میں چلا جائے۔ تو قلعہ والوں کو خبر نہ ہوتی تھی۔ اور جانبازوں کا یہ عالم تھا۔ کہ بھینسوں اور بیلوں کی کھالوں کی اوٹ بنالی تھی۔ ڈھالیں منہ پر لیتے تھے۔ اور کام کئے جاتے تھے۔ مرتے تھے کٹتے تھے۔ آدمیوں کے لاشے اینٹ پتھروں کی جگہ چنتے چلے جاتے تھے۔ مگر آگے بڑھے جاتے تھے۔ قلعے والے آگ برساتے تھے۔ ہزار گیارہ سو آدمی ہر روز بندوقوں اور توپوں کا لقمہ ہوتے تھے۔ حکم تھا۔ کہ جو ایک ٹوکری مٹی کی ڈالے دامن بھر کر روپیہ دے دو۔ سونا چاندی خاک کی طرح اڑتا تھا۔

ہر چند کہ اہل قلعہ کی آتشبازی نے دلاور حملہ آوروں کے نیست نابود کرنے میں کسر نہ رکھی تھی۔ مگر حملہ آوروں کا بھی وہ تانتا بندھا تھا جیسے دو دوسرے ازل و ابد سے ملے ہوئے تھے۔ لڑائی کا میدان کیا تھا میدان رستخیز تھا جہاں اگر سو گرتے تو ہزار اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ توپوں کے دھنسنے نے رہی سہی امیدوں کو اور بھی ملیامیٹ کر دیا تھا۔

اسی حال میں سرنگیں بھی اور مورچے اور دمدمے بھی برابر بڑھتے چلے جاتے کہ دو سرنگیں پاس پاس قلعہ کی دیوار تک جا پہنچیں۔ برج اور دیوار کی بنیاد خالی کر کے ایک میں ۱۲۰ من اور دوسرے میں ۸۰ من بارود بھری۔ دو فلیتوں کو آگ دکھائی۔ بہادروں کو انتخاب کر کے تیار کھڑا کیا۔ کہ برج کے اڑتے ہی حملہ کریں۔ اور قلعہ میں جا پڑیں۔

پہلے ایک سرنگ اڑی اور سامنے کا برج اڑا۔ قلعہ کے محافظ جو اس پر کھڑے تھے۔ سب اڑ گئے۔ اگرچہ زمین ہل گئی اور ہوا اندھیر ہو گئی۔ اور گڑگڑاہٹ کے صدمہ سے دل سینوں میں ہل گئے۔ مگر بہادر جو کمربستہ گھات میں کھڑے تھے۔ بے تحاشا دوڑ پڑے۔ گڑگڑاہٹ میں اور پیش قدمی کے ولولوں میں سردار اور سپاہی کوئی نہ سمجھا۔ کہ ابھی دوسری سرنگ باقی ہے۔ اسوقت غوغائے قیامت کا نمونہ آشکار ہوا۔ کیونکہ باہر کے حملہ آور اور اندر کے محافظوں کو ساتھ ہی لے کر اڑی۔ غل اور شور ہوا۔ کہ شور محشر بھی گرد ہو گیا۔ ہندو مسلمان یکساں دوہائی دیتے تھے آدمی پتھر چیلوں اور کوؤں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آتے تھے۔ ۳۔ ۴ کوس پر جا گرے۔ ہاتھ مشرق میں گرا۔ پاؤں مغرب میں ۵۰۔ ۵۰ کوس سے زیادہ اس صدمہ کا اثر پہنچا۔ پانسو نامی اور نمودار جوان جانوں سے گئے۔ کہ بادشاہ شناس بہادر تھے اوروں کا کیا ٹھکانا۔ ہندو اور مسلمان سو سو اور دو دو سو من کے پتھروں کے نیچے دب کر رہ گئے۔

اوّل دونو برجوں کو سامنے رکھکر ایک سرنگ کھودنی شروع کی تھی۔ تھوڑی دور جا کر آگے اس کی دو شاخیں کیں۔ ایک ایک کو ایک ایک برج کی طرف لے گئے۔ اس میں کام کی اور بارود کی کفایت سمجھے تھے اور یہ بھی خیال تھا کہ ایک جگہ سے دونو کو آگ پہنچ جائیگی۔ اکبر نے جبھی کہا تھا کہ ایسا

نہ ہوا ایک برج پہلے اڑ گئے دو مورچے نیچے دب گئے۔ اسوقت اہل تدبیر نے زبانی باتوں سے اپنی تجویز کی
تصویر ایسی خوشنما کھینچی کہ وہی مصلحت اچھی معلوم ہوئی۔ انجام وہ ہوا کہ جو نہ ہونا چاہئے تھا ؛

بہرصورت یہ بڑا وار تھا کہ خالی گیا بلکہ اس سے غنیم کا دل بڑھ گیا اور مقابلہ اور دفعیہ پر بڑی ہمت سے
کمر بستہ ہو گئے۔ بہادر بھی ہمت نہ ہارتے تھے حملہ ہائے مردانہ کئے جاتے اور مرتے رہتے تھے۔ ساباط پر اور
دمدموں پر کوٹھے ڈال لئے تھے۔ ان میں بیٹھے تھے اور خاطر جمع سے نشانے مارتے تھے ؛

ایک دن بادشاہ کسی دمدمہ پر دیوار کی آڑ میں کھڑے گولیاں مار رہے تھے۔ جلال خاں قورچی (دل لگی کا
مصاحب) پاس کھڑا تھا۔ وہ بھی دیوار کے سوراخ سے منہ لگائے قلعہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فصیل پر سے کسی
نے ایسا تاک کر نشانہ لگایا کہ اس کا سر تو بچ گیا مگر کان اڑ گیا۔ اور معلوم ہوا کہ اس مورچہ سے ہمیشہ ایسی ہی گولی
آتی ہے کوئی بڑا گل چلا سپاہی یہاں ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ جلال خاں۔ اگر یہ نظر آ جائے تو ابھی اس سے تیرا
بدلا لوں مگر کیا کروں کہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس بندوق کی نال سوراخ فصیل میں سے نکلی ہوئی تھی اکبر نے
اسی پر تاک کر گولی ماری اور کہا کہ بندوق کی پھڑک سے معلوم ہوتا ہے کہ نشانہ کارگر ہوا ہے۔ دریافت
کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اسمٰعیل اس مورچہ کا افسر تھا اور حقیقت میں بڑا نشانہ باز تھا کہ مارا گیا ؛

ایک دن اطراف و جوانب سے ایسے گولے برسائے کہ دیوار قلعہ میں شگاف ڈال دیا۔ شام سے توپ و
تفنگ کی آگ برسانی شروع کر دی۔ آدھی رات کو دھاوا ہوا۔ اہل قلعہ نے جب یہ صورت دیکھی تو سوتے
اور جاگتے اٹھ اٹھ کر دوڑے۔ بوریاں تھیلے۔ ٹوکرے مٹی سے بھر بھر کر ڈالنے شروع کر دئے۔ مرتے
تھے گرتے تھے اور ڈالے چلے آتے تھے کہ دیواریں اٹھا کر رستے بند کریں۔ لکڑیاں روئی کے
ڈھیر کپڑوں کی گٹھریاں لا لا کر ڈالتے۔ اور ان پر تیل اور گھی بہاتے تھے کہ جب حملہ ہو تو انہیں
آگ دے کر شعلہ کی دیوار کھڑی کر دیں ؛

محاصرہ ۴ مہینے جاری رہا۔ ایک دن بادشاہ دمدمہ پر کھڑے بندوق لگا رہے تھے۔ سنگرام نام بندوق
اس وقت ہاتھ میں تھی کہ ایک شخص سبز چلتہ پہنے برج قلعہ پر نظر آیا۔ سرداروں کے نشان اس کے آس
پاس نظر آتے تھے۔ اپنے سپاہیوں کو لڑائی کے باب میں کچھ سُن رہا تھا۔ بادشاہ نے اسی کو نشانہ میں
باندھ کر بندوق ماری۔ دور سے معلوم نہ ہوا۔ مگر راجہ بھگوان داس مان سنگھ کا باپ پاس کھڑا تھا۔
اس سے بادشاہ نے کہا جس وقت بندوق نشانہ پر لگتی ہے۔ تو ہاتھ کو ایک قسم کی لپک دیتی ہے اور دل کو
مزا آتا ہے اسوقت مجھے وہی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ضرور اس چلتہ پوش پر نشانہ لگا ہے ؛

خانجہان حسین قلی خاں نے عرض کی کہ خانہ زاد ہر روز اس شخص کو دیکھتا ہے کہ دن بھر میں کئی کئی دفعہ

ادھر آتا ہے۔ کل نہ آیا۔ تو سمجھینگے کہ مارا گیا۔ چند قدم چلے تھے۔ جو ہتیار قلی دیوانہ خبر لایا۔ کہ برج مذکور خالی نظر آتا ہے۔ سب وہاں سے چلے گئے۔ اتنے میں قلعہ کے محلوں سے آگ کے شعلے اُٹھے۔ راجہ بھگوان داس نے عرض کی۔ فتح مبارک۔ وہ شخص خود جیمل تھا۔ سردار قلعہ تھا۔ جو مارا گیا۔ اور رانیوں نے جوہر کیا۔ یہ آگ کے شعلے وہی ہیں۔ راجپوتوں کی رسم عام ہے۔ کہ جب ہم کا خاتمہ قریب دیکھتے ہیں۔ تو عود اور صندل کا ڈھیر اور بہت سی لکڑیوں کا انبار اور گھی تیار رکھتے ہیں اہل و عیال پر اپنے معتمد آدمی مقرر کر دیتے ہیں۔ کہ جب شکست کا یقین ہو جاتے اور مرد مارے جائیں۔ تو عورتوں کو بیچ میں ڈال کر آگ لگا دیتے ہیں۔ اس خودکشی کو جوہر کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ۴ مہینے ۷ دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہو گیا۔ تاریخ ہوئی۔ ع

دل گفت کہ بکشاد بزودی چتوڑ

ٹاڈ صاحب کہتے ہیں۔ اکبر کی چھاؤنی کی نشانیاں ابتک وہاں موجود ہیں۔ پنڈولی سے بسی تک کہ نشاہراہ ہے۔ ۱۰میل تک لشکر پڑا تھا۔ کئی سنگ مرمر کے منارے ہیں۔ کہ اب تک کھڑے ہیں اور واقعات مذکورہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ ایک ان میں سے اکبر کا دیوا کہلاتا ہے۔ اب تک جیسا تھا ویسا ہی کھڑا ہے۔ ۳۰ فٹ بلند ہے ۱۲ فٹ مربع قاعدہ چوٹی کی سطح ۴ فٹ مربع۔ سر سے پاؤں تک سیڑھیاں ہیں۔ ایک بڑا سا حوض ہے۔ اس میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ کہ رات کو لوگ رستہ نہ بھولیں۔ اکبر ملک کی عمدہ باتوں اور تاریخی یادگاروں کا مجموعہ تھا۔ اس کا دربار ہر ولایت کے معتبر اشخاص کا مجمع تھا۔ یہ سبق اہل عرب سے لیا ہوگا۔

جیمل اور فتا نے اپنے ملک کے بچانے میں جو جو نام دکھائے۔ ان کے گیت اور کبت اب تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ جبتک کوئی راجپوت کی بڑھیا یا اُن کے گھر کا بچہ زندہ ہے۔ تب تک قائم رہینگے۔ ٹاڈ صاحب کہتے ہیں۔ اکبر نے دو بڑے ہاتھی پتھر کے ترشوائے۔ ان پر جیمل اور فتا کی مورتیں سوار کیں۔ یہ ہاتھی قلعہ آگرہ کے دروازہ پر آمنے سامنے سونڈیں ملا کر محراب بنائے کھڑے تھے۔ لوگ نیچے سے آتے جاتے تھے (۲) قلعہ چتوڑ میں ایک بڑا نقارہ تھا۔ ۸ یا ۱۰ فٹ اس کا قطر تھا۔ کوسوں تک اس کی آواز پہنچتی تھی۔ جب راجہ سوار ہوتا تھا یا قلعہ میں داخل ہوتا اسوقت بجتا تھا کہ دور دور تک خبر ہو جاتی تھی۔ دروازہ مذکور کو وہاں سے اٹھا کر اجمیر کے دروازہ میں رکھدیا (۳) بڑی مالی جس نے اپنے مبارک ہاتھ سے باپا راول کی کمر میں تلوار باندھی تھی۔ اور اُسکی دعا سے وہ قلعہ چتوڑ مارا تھا۔ اس کے شوالہ کے کواڑ بھی اکبر آباد لے گیا۔ اور شمشیر مذکور بھی لے لی۔

آصف خاں نے چتوڑ سے ۵۰ میل چڑھ کر رام پور بھی فتح کر لیا۔ اور قلعہ اندل بھی ہاتھ آگیا۔ حسین قلیخاں

نے اودے پور مارا۔ اُس سے شمال و مغرب کی جانب میں کونبل میر ہے وہ بھی زور شمشیر سے لیا باوجود اسکے اودے سنگھ اپنی جنگل جھاڑیوں کی امان میں نچنت پھرتا رہا۔ اُسکے بعد اُس کا رانا پرتاب جانشین ہوا اس سے پھر کونبل میر اور کوکندہ لیا۔ وہ باپ کیطرح نامرد اور بودا نہ تھا۔ اُس نے ہمت و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اودے پور کو دارالسلطنت ٹھیرایا اور کئی علاقے جو ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ پھر چھڑا لئے۔ راجپوتوں میں یہی ایک خاندان ہے جس نے مسلمان بادشاہوں کو بیٹی نہیں دی ؞

حاجی ابراہیم

سرہند کے رہنے والے تھے۔ مگر بڑے جھگڑالو بلا تھے۔ مباحثوں میں حریف کا دم بند کر دیتے تھے۔ اور مغالطے کے بادشاہ تھے۔ ابھی یہ بات۔ ابھی وہ بات ابھی یہاں۔ ابھی وہاں۔ اکبر نے چاہا کہ دستی مہر پہ اللہ اکبر کھدوائے۔ حاجی صاحب مخالفت پہ کھڑے ہو گئے اور یہ روکنا کچھ دینداری کی رعایت سے نہ تھا۔ فقط تقریر کی زور آزمائی تھی۔ پھر بادشاہ کی رغبت دیکھ کر آپ ہی سرخ و زعفرانی لباس کے جواز کا بھی فتوے دیدیا۔ مگر بچ گئے میر سید محمد میر عدل نے عصا تو اٹھایا تھا۔ لفظ کمبخت۔ ملعون پر نیر گذر گئی۔ بھاگ گئے ورنہ وہ مار بیٹھتے ؞

آخر ۹۹۵ھ میں احمد آباد گجرات کے صدر ہو کر گئے۔ چند روز کے بعد دربار میں پہنچی کہ خوب رشوتیں کھائی ہیں مشایخ اور ائمہ مساجد سے ہزاروں روپیہ لیا ہے جس نے نہیں دیا اسکی مدد معاش میں سے وضع کر لیا ہے۔ اور جو روؤں سے گھر بھر لیا ہے۔ انہیں بھی خبر لگ گئی چاہتے تھے کہ دکھن کو بھاگ جائیں۔ دربار میں خبر جا پہنچی۔ بادشاہی پیادوں نے جا لیا پکڑے آئے حکیم عین الملک کے حوالہ ہوئے پھر بھی رات کے دربار میں بلائے جاتے تھے۔ مگر اب یہاں دربار کا عالم اور ہو گیا تھا انہوں نے رنگ دیکھ کر ایک دقیانوسی کرم خوردہ رسالہ نکالا شیخ محی الدین عربی کی عبارت کے حوالہ سے اُس میں ایک عبارت لکھی یا لکھوا دی کہ حضرت امام مہدی کی بہت سی بیویاں ہونگی۔ اور وہ داڑھی منڈے ہوں گے اور کئی اُتے پتے اور بھی ایسے لکھے کہ اکبر میں موجود تھے اُس سے یہ ثابت کرتے تھے کہ اکبر امام مہدی ہیں۔ یہ نسخہ بھی نہ چلا۔ بادشاہ نے رنتھنبور کے قلعہ میں بھیجکر قید کر دیا۔ ملا صاحب اکبر کی شکایتوں کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ وہاں اوج رفعت نے خواری کے گڑھے میں گرا دیا اور مطلب اپنا نکالا (یعنی مار ڈالا) ابو الفضل لکھتے ہیں کہ حاجی نے پہرے والوں سے سازش کر کے کپڑے کے تھان کھول کر لٹکائے کہ کمند کی طرح اس پر سے اُتر جائیں۔ قضا نے دھکا دیا اوپر سے گر پڑے اور صبح کو مرے ہوئے ملے ؞

حسین قلی خاں خانجہان

بیرم خاں کا بھانجا۔ ولی بیگ ذوالقدر کا بیٹا تھا۔ ترکمانوں میں ایک نامور قبیلہ کا نام تھا۔ ولی بیگ نے بیرم خاں کے ساتھ ہمایوں کی انتہا تک اور اکبر کی ابتدا میں بڑی بڑی جانفشاں خدمتیں کیں۔ مگر جب بیرم خاں کی اکبر سے بگڑی تو اُس نے بیرم خاں کا ساتھ دیا۔ (آخر اُس کا بہنوئی تھا) اور بڑی گرمجوشی اور دلاوری سے کارنامے کئے۔ دشمنوں نے اکبر کے منقوش خاطر کر دیا کہ بیرم خاں کو یہی فساد پر آمادہ کرتا ہے۔ جب قصبہ دکدار علاقہ جالندھر میدان جنگ ہوا تو چار دلاور میدان سے زخمی اُٹھائے گئے۔ ایک اُن میں سے ولی بیگ تھا۔ اُس کی قسمت برگشتہ تھی۔ دشمن ایسے دربار میں چھائے ہوئے تھے کہ پہلی جانفشانیوں پر کچھ خیال نہ کیا گیا۔ سر کاٹا گیا۔ اور اُمرائے مشرقی کے پاس دورہ دیا گیا کہ سب کو عبرت ہو ◆

جب ہیموں سے مقابلہ ہوا تھا تو خانخانان کی فوج خان زمان کے آگے سینہ سپر تھی۔ اور نوجوان حسین قلی خاں نے بڑھ بڑھ کر تلواریں ماریں۔ عداوت کیا بُری بلا ہے! جب بیرم خاں کی اکبر سے ناچاقی ہوئی! اور اہل فساد نے اکبر سے خانخاناں کے نام فرمان لکھوایا تو اس میں اُس کی بے اعتدالیوں کی تفصیل لکھی کہ تم نے اپنے بہنوئی ولی بیگ کو درجہ عالی پر پہنچایا۔ اور حسین قلی خاں جس نے کبھی ایک مرغ کے پنجہ نہیں مارا۔ اُسے اور اپنے تمام متوسلوں کو عمدہ جاگیریں دیں ◆

حسین قلی خاں وہی نوجوان ہے کہ جب بیرم خاں نے میوات سے طوغ وعلم سامان امارت اکبر کے حسب الطلب بھیجا تھا تو اُس کے ہاتھ بھیجا تھا۔ کیونکہ وہ باوجود جوانی کے سلیم الطبع اور مزاج کا متحمل تھا۔ خان خاناں سمجھا کہ شاید نیازمندی اور ضعف حالی کے ذریعے سے بگڑا ہوا کام بن جائے۔ یہاں دشمنوں نے اُسے قید کروا دیا۔ مگر اکبر کے اوصاف کی کیا تعریف ہو سکے کہ جب مہم خان خانان کے لئے دلی سے پنجاب کو چلا تو (عبدالمجید) آصف خاں کو وہاں کا صوبہ کیا۔ اور جہاں اور ہدایتیں کیں۔ یہ بھی کہا کہ اسے احتیاط سے رکھنا کوئی صدمہ نہ پہنچنے پائے۔ کیونکہ وہ بھی جانتا تھا کہ خان خانان کے دشمنوں کا زور ہے۔ اور اُس کی اور اُس کے متوسلوں کی جان کے دشمن ہیں۔ جب بیرم خاں کی خطا معاف ہوئی تو سب کی معاف ہوئی۔ حسین قلی خاں حضور میں حاضر رہتا تھا۔ دانائی اور رسائی اس کی قابل تعریف ہے کہ سلطنت کے تخت رواں کا پایہ پکڑے چپ چاپ چلا جاتا تھا۔ ماموں کے دشمنوں سے اپنی حالت کو بچائے رکھتا تھا۔ اور جو خدمت اسے ملتی تھی۔ اس طرح بجا لاتا تھا کہ حریفوں کو خبر نہ ہوتی تھی۔ اور نظر عنایت زیادہ ہوتی جاتی تھی ◆

سنہ ۹۷۰ھ میں مرزا شرف الدین حسین آگرہ سے باغی ہو کر بھاگے۔ اب حسین قلی نے مزاج دانی اور خدمتگزاری کی سفارش سے اتنا اعزاز و اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ بادشاہ نے اسے خانی کا خطاب دیا۔ اُس کے بھائی اسمٰعیل قلی خاں کو ساتھ کیا۔ اور سمجھا دیا کہ مرزا کو تسلی و اطمینان دینا۔ نہ مانے تو استیصال کر دینا۔ امرائے معتبر کو فوجیں دیکر کمک پر بھیجا۔ اور اجمیر و ناگور اس کی جاگیر کر دی۔ اُس نے مرزا کو مارتے مارتے اجمیر سے ناگور اور وہاں سے میرٹھ پہنچایا۔ اور ریل دھکیل کر ممالک محروسہ کے باہر پھینک دیا۔ ملک کا عمدہ بندوبست کیا۔ اور جودھپور پر فوج کشی کی۔ ذرا خدا کی شان دیکھو! ایک وہ وقت تھا کہ مالدیو وہاں کے راجہ نے ہمایوں کو خود بلایا۔ اور عین مصیبت اور تباہی کی حالت میں مروت کی آنکھوں میں خاک ڈالی تھی۔ اب وہ مر گیا۔ اُس کا بیٹا چندر سین مسند نشین تھا۔ اب ملک مذکور حسین قلیخاں کی تلوار سے فتح ہو کر خاص جودھپور پر قبضہ ہوا۔ اور چند روز کے بعد سلطنت سے راج کا رشتہ ہو گیا ۔

سنہ ۹۷۴ھ میں اکبر نے رانا کی مہم پر بھیجا۔ وہ اُدیپور تک مارتا چلا گیا۔ رانا بھاگ کر پہاڑوں میں گھس گیا بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ جم کر نہ لڑتا تھا بلکہ بادشاہی سرگرداں ہوتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے بلا لیا ۔

چتوڑ کے محاصرے میں پھر آکر شامل ہوا۔ اور جاں نثاری کے قدموں سے آگے آگے دوڑتا پھرا ۔

سنہ ۹۷۵ھ میں مرزا عزیز کے خاندان سے پنجاب کا ملک لیکر تمام اٹک نیل کو ملک ہنجاب سے اور کمال گکھڑ کو اس کے علاقہ سے بلالیا اور ملک مذکور اُس کے اور اُس کے بھائی اسمٰعیل قلی خاں کے نام کر دیا۔ مگر رنتھنبور کی مہم سامنے تھی۔ اُس کا رکاب سے جدا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب قلعہ مذکور فتح ہوا تو بادشاہ آگرہ میں آئے۔ وہ اور اُس کا بھائی لاہور میں آیا۔ اور بہت خوبی سے پنجاب کا انتظام کیا ۔

سنہ ۹۸۰ھ میں بادشاہ نے کسی بات پر خفا ہو کر راجہ جے چند والی نگر کوٹ (کانگڑہ) کو قید کیا۔ بدیچند اس کا بیٹا سمجھا کہ باپ دربار میں مارا گیا۔ وہ کانگڑہ میں باغی ہو کر بگڑ بیٹھا۔ بادشاہ کو غصہ آیا۔ جوہشند اُس کو کبرائی سے راجہ بیربر بنا کر ملک مذکور اُن کی جاگیر کر دیا۔ مصلحت اس میں یہ رکھی ہوگی۔ کہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ برہمن کا نام درمیان رہے۔ حسین قلی خاں کو حکم پہنچا کہ کانگڑہ کو فتح کر کے راجہ بیربر کو قبضہ دلوا دو۔ اُس نے امرائے پنجاب کو جمع کیا۔ اور لشکر لیکر روانہ ہوا۔ جب دھمیرٹری پر پہنچے تو چند وہاں کے حاکم نے رستہ سے ہٹ کر وکیل بھیجے کہ میری راجہ سے قرابت ہے۔ حاضر نہیں ہو سکتا لیکن راہداری ذمہ میرا ہے۔ خان ملک گیر نے ماموں کی تدبیروں کا دودھ پیا تھا۔ وکیلوں کو خلعت دے کر رخصت کیا اور اپنا تھانہ بٹھا کر آگے بڑھا ۔

کوٹلہ کے حاکم نے مقابلہ کیا۔ یہ قلعہ حقیقت میں اصل چند راجہ گلیر کا تھا۔ رام چند کے ولوا نے

دبا لیا تھا۔ سپہ سالار نے جاکر اطراف قلعہ پر نظر ڈالی۔ اور ادھر ادھر پہاڑیوں پر توپیں چڑھا دیں۔ دن بھر کے مارے۔ شام کو ڈیروں میں آیا۔ رات کو اہل قلعہ نکل کر بھاگ گئے۔ صبح کو قلعہ قبضہ میں آگیا۔ اُسے راجہ گلیر کے حوالے کر کے آگے چڑھ گیا۔ جنگل کا یہ عالم ہے۔ کہ درختوں کی کثرت سے آسمان کے تاروں نے زمین کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ سپاہ اور بھیر سب کو کلہاڑیاں دیدیں کہ کاٹو اور بڑھے چلو کوٹ کانگڑہ سامنے نظر آیا۔ باغ اور گھوڑ دوڑ کا میدان راجگان قدیم کے وقت کا چلا آتا تھا۔ وہاں ڈیرے ڈال دئے۔ اور قلعہ بھون کو گھیر لیا۔ یہاں مہا مائی کا مندر ہے۔ وہ پہلے ہی حملہ میں ہاتھ آگیا۔ ہزاروں برہمن پجاری اور راجپوت دھرم کا پن سمجھ کر سینہ سپر ہوئے اور سرخرو دنیا سے گئے ✦

(ملا صاحب فرماتے ہیں) خان جہاں آگے بڑھا۔ اور ایسے رستوں سے کہ سانپ کا پیٹ اور چیونٹی کے پاؤں نہ پھیرتے تھے۔ ہزار نشیب و فراز لانگ پھلانگ کر گھوڑے۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ لاؤ لشکر سمیت نکل گئے اور قلعہ شکن توپیں پہنچا دیں۔ اور آبادی کوٹ کانگڑہ کو قلعہ سمیت گھیر لیا۔ یہ متبرک و مقدس مقام بزرگان ہنود کا ہے۔ یہاں ملک در ملک آدمی ہزاروں کوس ولایت سے دور دست سے عین موسم پر آکر جمع ہوتے ہیں۔ اور ڈھیر کے ڈھیر سونا۔ اشرفیاں۔ کپڑے شال دوشالے جواہرات۔ انواع و اقسام کے نفائس۔ انبار در انبار عجائب و غرائب چڑھاتے ہیں۔ غرض مقام مذکور کو پہلے ہی دھاوے میں فتح کر لیا پہاڑیوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ کیا۔ مگر وہ پہاڑی گھاس کی طرح تلواروں سے کاٹے گئے۔ نا شنا ہے کہ راجہ بیر بر خود موجود تھے۔ پھر بھی مندر کے گنبد پر جو سونے کا چھتر لگا تھا۔ تمام تیر دوز ہو گیا۔ اور مدتوں اسی طرح رہا۔ دو سو کے قریب کالی گائیں تھیں ہندو اُن کی بیحد تعظیم کیا کرتے تھے۔ اسپرجا کرتے تھے اسوقت ڈھال سمجھ کر اُن سب کو مندر کے اندر لے آئے تھے۔ اور کمانوں کے تیر بندوقوں کی گولیاں مینہ برسا رہے تھے تو بادشاہی لشکر کے سپاہی۔ کیا ہندو کیا مسلمان ایسے جوش میں آئے کہ دین دھرم کا ہوش نہ رہا گایوں کو کاٹ ڈالا۔ ان کے خون موزوں میں بھرتے تھے۔ اور چار و طرف مارتے تھے۔ ہائے جہالت کے بہادرو! اگر جوش تھا تو حریفوں پر تھا۔ بے بس۔ بے کس۔ بے زبان۔ تمہاری دودھ پلانے والیوں نے کیا لیا تھا جو یہ بیرحمی و بدسلوکی اُن کے ساتھ کی۔ مندر کے پجاری اتنے مارے گئے کہ شمار نہیں (ملا صاحب کہتے ہیں) ان باتوں سے کیا اپنے کیا بیگانے جنہیں بیر بر کہتا تھا کہ ہیں تمہارا گرد ہوں۔ وہی اُس پر ہزار ہزار لعنت و ملامت کرتے تھے ✦

حسین قلی خاں نے جب بھون کی آبادی پر قبضہ کر لیا۔ تو وہاں دمدمہ باندھا۔ اور ایک بڑی توپ چڑھا کر راجہ کے محلوں میں گولہ مارا۔ راجہ اُس وقت رسوئی جیم رہا تھا۔ مکان گرا اور اسی آدمی دب کر

ضائع ہوئے۔ راجہ کی جان بڑی مشکل سے بچی۔ اور صلح کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ قلعہ لیا ہی چاہتے تھے۔ جو خبر پہنچی کہ ابراہیم حسین مرزا گجرات دکن سے شکست کھا کر دشت بادیہ آیا اور دلی سے ہوتا چلا آتا ہے اور لاہور کا ارادہ ہے۔ حسین قلی خاں سخت پریشان ہوا۔ جنگی نوجوان خوب جانتا تھا کہ سوا لیاقت ذاتی اور جانفشانی کے دربار میں میرا کوئی نہیں (مرزا عبدالرحیم خانخاناں ۲۰ برس کا لڑکا تھا) جو امرا ماتحت ہیں ان میں کچھ نو امیوں کے درجہ عداوت سے نفاق کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ اکثر نہ دوست ہیں نہ دشمن مگر وہ جو دوست ہیں وہ بھی کہنہ عمل سپاہی ہیں۔ یہ میرے ماتحت آ جانا ایک زمانہ کا اتفاق سمجھتے ہیں۔ ان پہلوؤں کا لحاظ کر کے باوجود سپہ سالاری اور با اختیاری کے آپ کچھ نہ کرتا تھا۔ جو کچھ کرنا ہوتا۔ امرائے لشکر کے مشورہ اور اتفاق رائے سے کرتا تھا۔ چنانچہ سب کو جمع کر کے مصلحت کی۔ صلاح ٹھہری کہ ادھر صلح کر کے پنجاب کی خبر لینی چاہیئے۔ وہ بدبخت ابھی نہ آنے پائے۔ کہ ہم سامان درست کر لیں۔ مگر خان جہاں اپنے اقبال سے بہت کہتا تھا۔ کہ یہاں کا نوالہ بھی ہونٹوں تک آ گیا ہے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن امرائے زیادہ زور دیا۔ تو بہت سی گفتگو کے بعد اس نے کہا۔ کہ اچھا سب امرائے لشکر ایک کاغذ پر لکھ کر اپنی اپنی مہریں کر دیں۔ بادشاہ اس صلح سے خوش نہ ہوئے۔ تو تمہیں صاحبوں کو جواب دینا ہوگا۔ سب نے کاغذ مرتب کر کے دیا۔ ادھر راجہ نگرکوٹ نے بھی غنیمت سمجھا۔ اور جو جو شرطیں کیں سب منظور کر کے لکھ دیں۔ چوتھی شرط پر گفتگو ہوئی۔ کہ یہ ولایت راجہ بیربر کو مرحمت ہوئی تھی۔ ان کے لئے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہیئے۔ یہ بھی منظور ہوا۔ اور جو کچھ ہوا۔ اتنا ہوا۔ جس میں ترازو کی تول فقط ۵ من سونا بوزن اکبری رکھا گیا۔ اسی روا روی میں قلعہ کے سامنے ایک نمودار مقام پر پیش طاق عالی شان تعمیر کر دیا۔ اس کے منبر پر ملا محمد باقر نے کھڑے ہو کر اکبری خطبہ پڑھا۔ جب بادشاہ کا نام آیا۔ اس پر اشرفیاں برسائیں اور مبارکبادیں کرتے ہوئے ملک میاں ان کو روانہ ہوئے۔

حسین قلی خاں سیل کی طرح پہاڑ سے اترا۔ معلوم ہوا کہ گانو گانو میں ہلچل پڑ رہی ہے لاہور والوں نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اور مرزا ملتان کی طرف چلا جاتا ہے۔ خان جہاں نے اس کے پیچھے گھوڑے ڈالے۔ اور مارا مار اپنے شکار کو جا لیا۔ وہ مرزا سے چھری کٹاری ہوا چاہتا تھا کہ حسین خاں بھی پیچھے پیچھے آن پہنچے اور اس وقت وہ خان جہاں سے ایک پڑاؤ پیچھے تھے خان جہاں کو تکلیف کوس کوس آگے نظر آتا تھا۔ جہاں مرزا لشکر ڈالے پڑا تھا حسین خاں نے انہیں لکھا کہ چار سو کوس سے یلغار مار کر یہاں تک آیا ہوں۔ اگر اس فتح میں مجھ کو بھی شریک کرو اور ایک دن لڑائی بند رکھو تو آثار محبت سے دور نہ ہوگا۔ وہ بھی آخر ترک بچہ تھا ولی بیگ ذوالقدر کا بیٹا اور بیرم خاں کا بھانجا خط سنکر

زبان سے کہا۔ خوش باشد۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر ایک قچی اور کر گیا۔ اسی دن مارا مار تلنبہ کے میدان میں (جہاں سے ملتان ۴۰ کوس رہتا ہے) تلواریں کھینچ کر جا پڑا۔ مرزا کو اس کے آنے کی خبر بھی نہ تھی شکار کو گیا تھا۔ فوج کچھ کوچ کی تیاری میں تھی بعضے بے سامان پریشان تھے جنگ میدان کی لڑائی کا انتظام بھی نہ ہو سکا مرزا کا چھوٹا بھائی پیش دستی کر کے حسین قلی خاں کی فوج پر آن پڑا۔ زمین کی ناہمواری سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا۔ وہ نوجوان لڑکا پکڑا گیا۔ مرزا شکار سے پھرے اتنے میں کار از دست جا چکا تھا۔ ہر چند سپاہیانہ کوششیں کیں اور مردانہ حملے کئے۔ کچھ نہ ہو سکا۔ آخر بھاگ نکلا۔

فتح کے دوسرے دن حسین خاں پہنچے۔ حسین قلی خاں نے میدان جنگ دکھایا۔ اور ہر ایک کی جانفشانی کا حال بیان کیا۔ حسین خاں نے کہا کہ غنیم جیتا نکل گیا ہے تمہیں تعاقب کرنا چاہئے تھا۔ اس نے کہا کہ گڑھ کوٹ یلغار کر کے آیا ہوں لشکر نے وہاں رجیں پکڑ لیتے۔ کام ابھی ناتمام ہے۔ بڑی محنتیں اٹھائیں۔ اب ان میں طاقت نہیں رہی۔ یہی بڑی فتح تھی اب اور دوستوں کی باری ہے۔ (یعنی تمہاری)

۹۸۱ھ میں اکبر گجرات کی مہم فتح کر کے آئے تھے۔ اور امرا بھی اطراف و جوانب سے ادائے تہنیت کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ ادھر سے حسین قلی خاں دربار میں پہنچے۔ مسعود حسین مرزا کی آنکھوں میں ٹانکے لگائے باقیوں میں سے ہر ایک کے رتبہ کے بموجب کسی کے منہ پر گدھے کی کسی پر سور کی کسی پر کتے کی کسی پر بیل کی کھال۔ کانوں اور سینگوں سمیت چڑھائیں اور عجیب سوانگ بنا کر دربار میں حاضر کیا۔ کل ۳۰۰ آدمی کے قریب تھے۔ مرزا کے ساتھیوں میں سے تقریباً سو آدمی تھے۔ کہ دعوے کے بہادر تھے۔ اور خانی اور بہادری کے خطاب رکھتے تھے۔ حسین خاں سب کو پناہ دیکر اپنی جاگیر پر لے گئے۔ وہاں خبر پائی۔ کہ حضور میں ان کی خبر پہنچ گئی اسلئے سب کو رخصت کر دیا تھا حسین قلی خاں کی ہمت و حوصلہ کو آفرین ہے جب مفصل حال لڑائی کا بیان کیا۔ تو ان لوگوں کے نام بھی لئے مگر یہ کہہ دیا۔ کہ قیدیوں کے باب میں حضور سے قتل کا حکم نہیں ہے۔ فدوی نے سب حضور کے صدقے میں چھوڑ دئے۔ اکبر نے کچھ نہ کہا اور جو خبر پہنچی تھی۔ وہ بھی زبان پر نہ لائے حسین قلی خاں کو نیک نیتی کا پھل ملا کہ خان جہاں کا خطاب پایا۔

جب مرزا سلیمان بدخشاں سے تباہ ہو کر آیا۔ تو اکبر کو بڑا خیال ہوا۔ کچھ تو اس جہت سے کہ بدخشاں سرحد کی مضبوط دیوار ہے۔ دوسرے ملک موروثی کا رشتہ ہے۔ تیسرے خوف تھا کہ کوہستان ہے۔ اور ازبک کے قبضہ میں آگیا ہے۔ خان جہاں کو حکم ہوا کہ ۵ ہزار سوار جرار لیکر جاؤ۔ اور مرزا

تو اُن کے گھر ہیں بٹھا کر لاہور میں چلے آئے۔ مگر ساتھ ہی خبر آئی کہ منعم خاں کے مرنے سے بنگالہ میں
پھر فساد ہوا۔ اور داؤد نے عہدنامہ توڑ ڈالا۔ امرائے شاہی پہلے سے ہی گھبرا رہے تھے۔ اور خرابی
ہوا سے تنگ تھے۔ اس نازک موقع پر سب نے بنے بنائے گھر چھوڑ دیئے ملک مذکور سے نکل آئے
اکبر کو یہ بھی خیال تھا۔ کہ مرزا سلیمان بدنیت اور لالچی آدمی ہے۔ بہتر ہے۔ کہ بدخشاں کا کچھ اور بندوبست
ہوجائے۔ مرزا سے کہا کہ تم فوج لے کر جاؤ۔ اور بنگالہ کو اپنا بدخشاں سمجھو۔ اُس نے قبول نہ کیا۔ چنانچہ
۹۸۳ھ میں خاں جہاں کو بلا کر خانخاناں کا قائم مقام کیے قبائے زردوزی چارقب طلا کمر شمشیر
مرصع۔ اسپ بازین طلائی دیکر روانہ کیا۔ اور ٹوڈرمل کی رفاقت سے اُس کا بازو قوی کیا +

جب وہ بھاگل پور علاقہ بہار میں پہنچا۔ تو امرائے بخاری و ماوراء النہری - دولتوں سے خورجیں
بھرے گھروں کو پھرنے کو تیار تھے۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ زبردست اور کارداں افسر کے
نیچے کام دینا کچھ آسان کام نہیں۔ بعضوں نے خرابی آب و ہوا کا عذر کیا۔ بعضوں نے کہا یہ قزلباش
ہے۔ اس کے ماتحت ہم نہیں رہ سکتے۔ بالیاقت دوستو پہلے کہہ چکا ہوں۔ اور پھر کہتا ہوں
کہ جب کم لیاقت دعوے دار اپنے حریف کو لیاقت سے نہیں دبا سکتا۔ تو مذہب کا
جھگڑا بیچ میں ڈال دیتا ہے۔ اور اکثر فتحیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس حکمت عملی سے احمقوں کی بہت
سی فوج اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے +

خاندانی تجربہ کار نے خاموشی اختیار کی۔ اور تحمل و حوصلہ کے ساتھ فراخدلی دکھائی۔ اسمٰعیل قلی
خاں اِسکا بھائی پیش دستی کی تلوار ہاتھ میں اور پیش قدمی کی فوجیں رکاب میں لے کر چاروں طرف
ترکتاز کرنے لگا۔ ٹوڈرمل ہندو کی نیک نیتی کو ہزار آفرین ہے کہیں دوستانہ فہمائش کی کہیں ڈرا دے
کہیں لالچ سے غرض سب کو پرچا لیا۔ کہ لشکر بنے کا بنا رہا۔ اور کام جاری ہو گیا۔ وہ دونو باوفا دل
جل کر بڑے حوصلے اور کھلے دل سے کام کرتے تھے۔ سپاہی کے دل اور سپاہ کی قوت بڑھاتے تھے۔
پھر کوئی بیہودہ گوئی کا کیا خیال کر سکتا تھا۔ جا بجا لڑائیاں صف آرائی کے ساتھ ہوتی تھیں اور کامیابی
پر ختم ہوتی تھیں۔ چنانچہ گڑھی کو کہ بنگالہ کا دروازہ ہے جاتے ہی کھول لیا۔ اور ٹانڈہ تک کا ملک پھر
صاف کر لیا۔ غرض بنگالہ کا بگڑا ہوا کام پھر بنا لیا +

مشرقی مہم کا خاتمہ اخیر حملہ داؤد کا تھا۔ کہ قدیمی سرداروں کو لے کر آگ محل پر عین موسم برسات
میں لڑائی کو تیار ہوا۔ خانجہاں کے لشکر میں غنیم کے ہجوم کی ایسی دھوم پڑی۔ کہ سب کے جی چھوٹ
گئے۔ مگر خان جہاں اور راجہ نے سب کو تسلی دیکر دل بڑھائے۔ اور فوجیں لے کر فوراً ٹانڈا

پر پہنچے۔ داؤد وہاں سے ہٹ گیا۔ اور آگ محل پر مقام کرکے قلعہ بنایا۔ خان جہاں بھی ساتھ ہی پہنچے اور سامنے چھاؤنی ڈال دی۔ ساتھ ہی بادشاہ کو عرضیاں لکھیں۔ اور اُمرائے اطراف کے پاس خط دوڑائے۔ مظفر خاں بہار میں چھاؤنی ڈالے ملک کا انتظام کر رہا تھا۔ اُسے بھی مدد کو بلایا۔ مظفر خاں اصل میں بیرم خانی اُمت تھے۔ لیکن ایک تو بل قلم اہلکار۔ دوسرے پُرانے پاپی اور کہنہ عمل سپاہی۔ اُنہوں نے ٹالا۔ اور ادھر سے بادشاہ نے ایسا دل دوڑائے۔ کہ تمام امرائے اطراف کو واجب ہے۔ کہ دل و جان سے حاضر ہو کر خان جہاں کے ساتھ شامل ہوں مظفر خاں کے ساتھ بھی بڑے بڑے دلاور۔ صاحب فوج امیر تھے۔ اس نے اُن سے مشورت کی۔ ارباب جلسہ نے کہا۔ کہ برسات کا موسم۔ ملک کا یہ حال۔ سپاہی بے سامان۔ اس حالت میں سپاہ کو لے جاکر ویران کرنا خودکشی میں داخل ہے۔ چندے صبر کریں۔ شروع زمستان طلوع سہیل پر تازہ دم لشکروں کے ساتھ چڑھائی کریں کہ دشمن کو فنا کر دیں۔ اتنے میں محب علی خاں بگڑ کر بولا کہ حضور کا فرمان اس تاکید کے ساتھ پہنچا ہے۔ خانجہاں نے بلایا ہے۔ آراستہ فوج پاس ہے جب یہاں تک آن پہنچے ہیں۔ تو پھر اٹکنا مردانگی سے بعید ہے۔ اور وفا و اخلاص بھی نہیں اجازت دیتی۔ مناسب یہی ہے کہ سب یکدل و یکدلائے ہو کر دشمن پر حملہ کریں۔ البتہ خان جہاں سے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے۔ کہ اگر ہمارے آتے ہی لڑائی شروع کرو تو ہمیں بلاؤ۔ اور ہمارے آنے پر بھی لشکر بادشاہی کا انتظار رکھو۔ تو ہم اپنے لشکر کو اس برسات میں کہیں برباد کریں۔ خان جہاں نے دو امیروں کو بھیجا۔ پیمان کر لیا ہوں۔ اور عہد کے ناموں سے یہ اقرار مضبوط ہوتے۔ سب تقریریں طے ہو کر دونوں لشکر شامل ہوئے جب مظفر خاں وغیرہ قریب پہنچے تو خان جہاں دور تک خود استقبال کو آیا۔ اپنے ہی ڈیروں میں لے گیا۔ دھوم دھام سے ضیافتیں ہوئیں۔ اور صلاح مشورے ہو کر جھٹ پٹ آگ محل کے سامنے میدان جنگ قائم کر دیا۔

دونو سپہسالار فوجیں لے کر میدان میں آئے۔ فوجوں نے قلعے باندھے۔ اور لڑائی شروع ہوئی۔ مگر جب حملے ہونے لگے تو سب بندوبست ٹوٹ گئے۔ جو فوج مقابل کی فوج سے ٹکر کھاتی تھی چکّی کی طرح چکر مارتی نظر آتی تھی۔ دن آخر ہو گیا۔ خان جہاں حیران کھڑا تھا۔ کہ لڑائی ترازو ہے۔ دیکھئے پلہ کدھر جھکتا ہے۔ دفعتہً کالا پہاڑ غنیم کے سپہسالار کے تیر لگا۔ اور وہ بھی ایک ہی تیر میں تو کدم بھاگا۔ اُس کے بھاگتے ہی سارے پٹھان بھاگ گئے۔ کیچڑ پانی کے سبب سے زمین کا پتا نہ تھا۔ بادشاہی فوج وہیں تھمی رہی شام قریب تھی غنیم نے بھی پیچھے ہٹ کر لشکر ڈال دیا۔ اکبری اقبال کی طلسم کاری دیکھو کہ رات کو بادشاہی توپ خانہ سے دشمن کی طرف توپیں مار رہے تھے۔ جنید افغان اپنے پلنگ پر پڑا سوتا تھا۔

ایک گولہ ایسا جا کر لگا۔ کہ ران شیشے کی طرح چُور چُور ہو گئی۔ وہ پُرانا پٹھان داؤد کا عموزاد بھائی۔ اور افغانوں کا رکن خاندان تھا۔ پٹھانوں کی تلوار کھنڈا تا تھا۔ اِس میدان میں فوج کا بایاں بازو تھا۔ اور لڑائی کے ہتھکنڈے خوب جانتا تھا۔ اُس کے مرنے سے سارے افغان چُپ ہو گئے ۔

ادھر اکبر کو اُمرا کی عرضیاں برابر پہنچ رہی تھیں۔ کہ خانہ زاد بے ڈھب کیچڑ میں پھنسے ہیں۔ جب تک حضور اقبال کے گھوڑے پر نہ سوار ہونگے۔ منزل مراد کا رستہ بند ہے۔ برسات گندہ بہار موسم ہندوستان کا ہے۔ اس پر ملک بنگالہ۔ اُمرا کا ہل کرتے ہیں۔ ادھر تو یہ حال تھا۔ اُدھر راجہ مان سنگھ کو مہتاب اُدے پور میں رانا سے رن جھر جھر رہے تھے۔ اکبر کی چشمِ انتظار ایک ادھر تھی۔ ایک اُدھر۔ کہ سید عبداللہ خاں بارہہ مان سنگھ کے لشکر سے ڈاک میں فتح کی خوشخبری لے کر آئے۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ اور انہی کو سرسواری بنگالہ روانہ کیا۔ رخصت کے وقت یہ بھی کہا۔ کہ امرا کے نام فرمان تاکید اہتمام میں تحریر کرنا۔ اور کہنا کہ ہم آپ یلغار کرکے آتے ہیں۔ پانچ لاکھ روپیہ کا خزانہ بھی سید کے ساتھ دوڑایا۔ کہ خان جہاں کے خرچ کا ہاتھ کشادہ ہوا۔ بہت سی کشتیاں رسد غلہ کی آگرہ سے چھٹیں۔ رخصت کے وقت یہ بھی کہا۔ کہ سید اچنانچہ ایں مژدہ میسری۔ از انجا ہم بشارت فتحے آری ۔

پیچھے بنگالہ سے ایسی پریشان خبریں آنی شروع ہوئیں۔ کہ سپاہی طبع بادشاہ نے تکلیف سفر اور خرابی موسم کی کچھ پروا نہ کی۔ آپ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لشکر کو خشکی کے رستہ روانہ کیا۔ اور بجو بینکی کتاپ آبی گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا کی طرح پانی پر چلے ۔

اب اُدھر کی سُنو کہ دونوں لشکر نواح کھل گانو میں آمنے سامنے تھے۔ سید عبداللہ بھی پہنچکر انتظام میں شامل ہوئے۔ رات کو جنید کا کام تمام ہوا۔ دوسرے دن خان جہان نے حملہ کر دیا۔ اور کیچڑ پانی کو روندتا ہوا کر جس طرح ہوا جا ہی پڑے۔ افغان بھی دل شکستہ تھے۔ جانوں سے ہاتھ دھو کر اڑے اس وقت امرائے بادشاہی نے یہی مناسب دیکھا۔ کہ دست بردکر کے ہٹیں۔ اتنے میں پیچھے سے مدد پہنچی۔ پھر بھی لڑتے تھے۔ اور ہٹتے آتے تھے۔ اقبال اکبری کی کارسازی دیکھو کہ افغانوں کے سردار خانجہاں نے پھر زخم کھایا اور مر کر گرا۔ اسوقت غنیم بے اختیار ہوئے۔ اور سب بھاگ نکلے۔ لشکر بادشاہی نے بڑے زور شور سے تعاقب کیا۔ ہزاروں کو مارا۔ سینکڑوں کو باندھا۔ ترک چار و نطرف مارتے پھرتے تھے۔ داؤد شاہ بیچارے کا گھوڑا ایک دلدل میں پھنس گیا اور گرفتار ہوا۔ ہمایوں کے بھائی بھی عجیب کینہ دار اور اجین ر کے دنیا میں آئے تھے۔ ہندال کے ہمدموں میں خواجہ ابراہیم ایک شخص تھا۔ اُس کا بیٹا طالب بدخشی اب اکبری نمک خواروں میں تھا لیکن جم شوانگیز نمک باپ نے کھایا تھا اُسکے

فساد کو اکبری ملک ہرگز عنداللہ پہ نہ لا سکا۔ خان جہاں کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ داؤد یہی ہے۔ پہنچا اور رفاقت کرنے لگا کہ نکل جائے۔ مراد بیستانی اور حسین بیگ کو خبر ہو گئی وہ باز کی طرح پہنچے اور شکار کو پکڑ لیا باندھ کر لے آئے سپہ سالار ابھی میدان جنگ میں کھڑا تھا۔ دلاور اپنے اپنے کارنامے سنا رہے تھے۔ داؤد سامنے حاضر کیا گیا۔ ایک حسین صاحب جمال اور دیدار و جوان تھا۔ اُس وقت خاموش کھڑا تھا۔ اگرچہ شگفتہ تھا۔ اور کسی طرح کا اضطراب نہ معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ بہت پیاسا تھا اس نے پانی مانگا۔ لشکر کے لوگ دکھ بھرتے بھرتے تنگ آ گئے تھے۔ ایک کم ظرف دل جلے نے جوتی میں بھر کر پانی سامنے کیا۔ داؤد نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دریا دل خان جہاں نے اپنی صراحی اور نقالی کٹورا منگا کر پانی دیا۔ اور پوچھا کہ عہد نامہ کے بعد بے وفائی کرنی۔ یہ کیا رسم اور کیا آئین ہے۔ اُس نے بڑے استقلال سے کہا۔ کہ وہ عہد منعم خاں کے ساتھ تھا۔ اب اُترو۔ تھوڑی دیر آرام لو۔ تمہارے ساتھ الگ عہد و پیمان ہو گا۔ خان جہاں کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ کہ اُسے قتل کرے اُمرا نے کہا۔ کہ اسے زندہ رکھنے میں فساد کا احتمال ہے۔ ناچار قتل کا حکم دیا۔ جلاد نے دو ہتھیارے تلوار کارگر نہ ہوئی۔ آخر لٹا کر ذبح کیا۔ سر کاٹ کر صاف کیا۔ بھس بھرا۔ اور عطریات ملکر حضور میں بھیج دیا دھڑ ٹانڈہ کو روانہ کیا۔ کہ اُس کا دار الخلافہ تھا۔ بادشاہ فتحپور سے سوار ہوئے تھے پہلی ہی منزل تھی ۵ کوس پر ڈیرے پڑے تھے۔ کہ سید عبد اللہ خاں اپنی روانگی کے گیارھویں دن آن پہنچے اور داؤد کا سر جلوخانہ اقبال پر لا کر ڈال دیا۔ لشکر بادشاہی میں عجب خوشی کا غلغلہ اُٹھا۔ اکبر نے سجدۂ شکر ادا کیا اور فتحپور چلے گئے +

سید مبارک ایک مرد بزرگ علم جفر میں کمال مہارت رکھتے تھے کئی دن پہلے بادشاہ نے ان سے سوال کیا تھا۔ جو حکم اُنہوں نے لگایا تھا ٹھیک وہی ہوا ہے

| مژدۂ فتح ہند آگاہ رسید سر داؤد بدرگاہ رسید |

خان جہاں نے راجہ کو رخصت کیا آپ سات گام نواح ہگلی کی طرف لشکر لے کر گیا۔ کہ داؤد کا اصلی مقام وہی ہے۔ افغانوں نے جا بجا شکستیں کھائیں۔ ہو اکثر حاضر خدمت ہو گئے جمشید اس کا خاصہ خیل بڑے زور شور سے لڑا مگر بڑی ہی شکست کھائی۔ داؤد کی ماں بھی سب خاندان کو لیکر اس کے دربار میں آئی۔ اس سے تمام منسبداروں کی ہمت ٹوٹ گئی +

کوچ بہار کا راجہ مال گوسائیں بھی رجوع ہوا۔ اُس کے تحائف معہ چون ہاتھیوں کے دربار میں بھیجے۔ بھاٹی کے ملک میں بھی پٹھانوں کی بہت سی کھرچن باقی تھی۔ جیسے خاں وغیرہ یہاں کے ملک میں ہمیشہ فساد کی آگ سلگاتے رہتے تھے۔ اُن پر لشکر بھیجا۔ وہ بھاگ گئے۔ جو باقی رہے۔

انہوں نے اطاعت اختیار کی۔ اور بنگالہ بہار وغیرہ تمام ملک کہ فساد خانہ پٹھانوں کا تھا امرائے
دربار اُسے بلغاک خانہ فساد کہا کرتے تھے اُ فتنہ سے پاک ہوگیا۔ اور وہ فارغ ہوکر صحت پور میں آئے
کہ آپ ٹانڈہ کے پاس آباد کیا تھا۔ خیال تھا کہ یہاں آرام سے بیٹھیں گے صحت پہ الٹا اثر پڑا چند
روز کے بعد بیمار ہوگئے ؎

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بکمال	چوں صفحہ تمام شد ورق بر گردد

مرض نے چھ ہفتہ طول کھینچا۔ بیدوں کا علاج ہوتا تھا۔ صاحب ماثرالامرا لکھتے ہیں کہ انہوں
نے بے سمجھے علاج کیا۔ بھلا قضا کا علاج کس کے پاس ہے۔ آخر اُنیسویں شوال ۹۸۲ھ کو دنیا سے
انتقال کیا۔ بادشاہ کو رنج ہوا۔ بہت افسوس کیا۔ مغفرت کیلئے دعا کی اور اسمٰعیل قلی خاں کو بڑی
تسلی و تشفی کے ساتھ فرمان لکھا۔ دو بیٹے رہے۔ رضا قلی خاں کہ ۲۵۰ کا منصب دار تھا ۱۰۲۰ھ
میں پانصدی منصب ۳ سو سپاہی کا عہدہ دار ہوا (۲) رحیم قلی ۲۵۰ کا منصب دار تھا۔

تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسے تعمیل احکام اور ادائے خدمت کے سوا
کسی بات کا شوق نہ تھا۔ نہ آپ قدم بڑھا کر رکھتا تھا۔ نہ کسی کے بڑھے ہوئے قدم کو ہٹاتا تھا ہمت
کے ذوق۔ شوق اور جانفشانی کے جوش وخروش سب خدمت بادشاہی میں نکال دیتا تھا۔ وہ
سلامت روی کے گوشہ میں سپاہی کرتا تھا۔ اسی واسطے اس کی کسی سے مخالفت بھی نہیں ہوئی
اُس نے فتوحات سلطنت کے سوا کوئی امیرانہ یادگار بھی نہیں چھوڑی۔ البتہ یہ ہمت کی کہ بیرم
اپنے ماموں کی ہڈیاں اس کے مرنے کے ۱۷ برس بعد مشہد مقدس بھجوادیں۔

اسمٰعیل قلی خاں اسکا چھوٹا بھائی اکثر مہموں میں بھائی کے ساتھ تھا۔ جب ۳۰ھ جلوس میں
راجہ بیربر مہم یوسف زئی میں مارے گئے تو بادشاہ نے اسمٰعیل قلی خاں کو جہلم سے لشکر جرار دیکر روانہ
کیا۔ وہ گیا اور بڑے انتظام و اہتمام سے اہل بغاوت کی گردنوں کو دبایا۔

اسمٰعیل قلی خاں

حسین قلی خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ جب جنگ جالندھر میں بیرم خاں کا
لشکر تباہ ہوا تو یہ کسی طرح زندہ گرفتار ہوگیا۔ بیرم خاں کیساتھ سب
کی خطا معاف ہوئی۔ یہ بھی بھائی کے ساتھ نذر ہوا۔ اور اُس کے ساتھ خدمتیں بجالاتا رہا۔ خانجہاں
مرگیا۔ تو یہ بنگالہ سے اس کا مال و اسباب لیکے حضور میں حاضر ہوا۔ اکبر نے بہت دلداری کی۔ ۳۰ھ
جلوس میں بلوچوں نے بغاوت کی۔ یہ سرشور فرقہ ہمیشہ امرائے اکبری کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ اس لئے اسمٰعیل
قلی خاں کو فوج دیکر روانہ کیا۔ کہ اچھی طرح اُنکی گردنیں رگڑے۔ یہ پہنچے تو اول سینہ زور سامنے ہوئے مگر جلد اطاعت

اختیار کی۔ سنہ ۳۱ھ میں راجہ بھگوانداس کابل میں دیوانے ہو گئے۔ انہیں ان کی خدمت سپرد ہوئی لیکن اُن کی بلند نظری نے بعض ایسی درخواستیں پیش کیں کہ نظر پھر گئی حکم ہوا کہ بھکر کے رستہ کشتی پر بٹھا کر مکہ کو بھیج دو۔ بارے عجز و انکسار کی سفارش سے دعا قبول ہوئی اور خطا معاف ہو کر حاضر ہوئے جہلم کے علاقہ میں خدمت بجالاتے تھے۔ کہ راجہ بیربر کوہستان سواد میں مارے گئے لشکر بادشاہی دوبارہ روانہ ہوا۔ جلالہ تاریکی نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ انہیں بھی حکم ہوا کہ آگے بڑھ کر تھانے قائم کریں زین خاں کوکہ نے مہم مذکور میں پہلے سخت ندامت اُٹھائی تھی۔ اب پھر چاہا کہ جائے اور اس داغ کو آب شمشیر سے دھوئے۔ اِدھر وہ روانہ ہوا۔ اُدھر بادشاہ نے صادق خاں کو فرج دیکر بھیجا۔ کہ تم بھی جا بجا تھانے بٹھادو اور ایسا بندوبست کرو کہ جلالہ جدھر کو جائے۔ پکڑا جائے۔ وہاں صادق خاں کی اور اُن کی نہ بنی۔ یہ اپنے تھانے اُٹھا کر چلے آئے۔ جلالہ رستہ پا کر بھاگ گیا۔ پھر غضب میں آئے سنہ ۳۲ھ میں حاکم گجرات ہو گئے۔ جب سنہ ۳۳ھ میں شہزادہ مراد مالوہ کے مالک ہوئے تو انہیں ان کی وکالت اور اتالیقی سپرد ہوئی۔ مگر اس خدمت کا سرانجام نہ کر سکے سنہ ۳۳ھ میں صادق خاں ان کی جگہ بھیجے گئے سنہ ۲۹ھ میں کالپی کو رخصت ہوئے کہ اپنی جاگیر جا کر آباد کرو۔ سنہ ۴۲ جلوس میں ۴ ہزاری منصب سے اعزاز پایا +

عیش و عشرت کے عاشق تھے۔ کھانا پہننا۔ مکان کی آراستگی۔ ہر چیز میں لطافت اور لوازم امارت کا بڑا خیال تھا۔ محل میں ۱۲سو عورتیں تھیں۔ دربار جاتے تھے تو ازار بندوں پہ مُہریں کر جاتے تھے۔ سب جانوں سے تنگ آگئیں۔ مگر یں کیا نہ کرتیں۔ آخر سب مل گئیں انہیں نے ہر دیکر اپنی جانیں چھڑائیں۔ دیکھو ماثر الامرا +

حکیم مصری

ایک طبیب بادشاہی تھے بادشاہ نے دکن سے بلا کر حکمائے پایہ تخت میں داخل کیا تھا۔ شیخ فیضی جب سفارت دکن پر گئے تھے تو وہاں بھی حکیم موصوف کے اوصاف سُنے وہی اپنی عرائض میں بادشاہ کو لکھے۔ مُلا صاحب ان بچارے کو بھی خاطر میں نہ لائے فرماتے ہیں۔ اگرچہ بڑے بڑے رتبہ کے حکیم دربار میں موجود تھے مگر خدا نے انہیں دست شفا ایسا دیا تھا۔ کہ اکثر علاج حکمائے حاذق کے کارناموں میں لکھنے کے قابل ہیں۔ اہل فضل و کمال دیکھتے تھے۔ اور حیران رہ جاتے تھے۔ ایک سیدھے سادے بھولے بھلے آدمی تھے۔ باوجود ان سب باتوں کے خوش مزاج ظریف طبع۔ دربار کی اہلکاریوں اور اُمرا کی دنیا داریوں سے کچھ غرض نہ رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی ظرافت اور بھی زیادہ اچھی معلوم ہوتی تھی

شعر بھی کہتے تھے۔ مگر مسخراپن کے۔ شیخ ابوالفضل ۱۰۰۱ھ میں اُن کا ذکر بعبارت ذیل کرتے ہیں۔ عقل ظاہری اور معرفت معنوی میں اُن پر یکتائی کا خیال تھا۔ طب کو ایسا جانتے تھے۔ کہ اگر سارے طبابت نامے نہ رہتے۔ تو یہ یاد سے لکھ دیتے۔ صوفیوں کی دلاویز تقریریں اچھی حاصل کی تھیں چہرہ شگفتگی اور فرخندگی ظاہر کرتا تھا۔ لطف و محبت سے اپنے بیگانے کو خوش کرتے۔ تھے کسی علاج میں بندنہ ہوتے تھے۔ اور کھلی پیشانی سے علاج کرتے تھے

آج اُس جیسا مگر پیدا کہاں	ہو جو اُس جیسا تو وصف اُس کا لکھے

۱۰۰۰ھ کو پہنچ گئے تھے۔ مگر طبیعت میں جوانی کی گرمی جوش مارتی تھی۔ دفعتہً ہوازدگی ہوئی تپش نے مزاج برہم کر دیا۔ تپ نے سوزش بڑھائی آدھی رات تھی کہ دل نڈھال ہوا۔ اور دم بدم حواس میں فرق آنے لگا۔ ہوش آیا تو مجھے بلایا اسی وقت پہنچا۔ حال دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ اور اُنہوں نے دل آگاہی سے یاد الٰہی میں آنکھیں بند کر لیں چھوٹے سے بڑے تک سب کو رنج ہوا ؎

خوش بگریم و مویہ برگیریم	خیزتا وا زآواز گریہ برگیریم
چوں بہ پایاں رسد ز سر گیریم	نوحہ ہائے جگر خراش کنیم

شہر یار پایہ شناس کا دل بھی بے اختیار ہو گیا۔ اور آمرزش کی دعا کی۔ ملا صاحب حکمائے کے سلسلہ میں اُن کا حال لکھتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں طب میں صاحب علم و عمل تھے علوم عقلیہ میں ماہر علوم غریبہ میں مثلاً دعوت اسما علم حروف و تکسیر سے بھی آگاہ تھے۔ شگفتہ۔ خوش صحبت۔ مبارک قدم۔ شیخ فیضی کے علاج میں بہتیری جان لڑائی کچھ بھی نہ ہوا۔ کبھی فارسی میں شعر کہتا ہے۔ مگر مسخراپن کے۔ خواجہ شمس الدین خانی کہ دیوان سلطنت تھے۔ کسی مقدمہ میں اُنکا نبیرہ ایسا شنکر کہا ؎

در طبابت ماش و دفلی مے کند	خواجہ شمس الدین چہ ظلمے مے کند

کنیر کے درخت کو عربی میں دفلی کہتے ہیں۔ ایک دن باغ میں گلگشت کر رہے تھے اس کے پھول کھلے ہوئے دیکھ کر فرمایا ع چو آتش جست کاکل از سر دفلی

مسجد حضور کے لئے جو قطعہ لکھا دیکھو صفحہ ۶۱ +

برہان پور علاقہ خاندیش میں مر گیا۔ وہیں سپرد خاک کیا۔ ملا صاحب کے دل میں جو آتا ہے سو کہتے ہیں۔ مگر تم یہ دیکھو کہ اکبر کی قدردانی نے کیا کیا لوگ اور کہاں کہاں سے کھینچکر جمع کئے تھے ابوالفضل نے آئین اکبری میں جو اکبری طبیبوں کی فہرست لکھی ہے۔ اس میں اُنہیں اولیت کی مسند پر بٹھایا ہے

خاندان سوری

ہمایوں کے پیچھے افغانوں کا کیا حال تھا

شیر شاہ اپنی ذات سے بانی سلطنت افغانی کا ہوا۔ بابر کے بعد اس کے بیٹوں کو دیکھا کہ آپس میں نفاق رکھتے ہیں۔ باوجود اس کے وہ اور اُن کے امرا آرام طلب اور فراغت پسند ہیں اسکے دل میں سلطنت کا شوق لہرایا۔ اُسی میں ایک مضمون سوجھا کہ تدبیر کی موافقت اور تقدیر کی معاونت نے اُس کے سامان بھی جمع کر دیے اور سلطنت کا شعر موزون ہوگیا۔ ع

چون مضامین جمع گردد شاعری دشوار نیست

مضمون بھی کچھ دور کا نہ تھا فقط اتنی بات کہ اپنی فوج کے دل میں اتفاق کیساتھ ترقی قومی اور ہمت و حوصلہ کا خون دوڑائے اور بادشاہ ہو جائے۔ یہ قدرتی اتفاق ہے۔ کہ جدھر کا ارادہ کیا کامیابی نے کھلے میدان سامنے دکھلائے اور کہا۔ خوش آمدید وصفا آوردید۔ بادشمن مغلوب ہوا یا خود بخود اس کے دغا کے پھندے میں فنا ہوگیا۔ افغان کہ وحشی مزاج تھے۔ اور لوٹ کے سوا کوئی پیشہ نہ جانتے تھے۔ سپاہی بن گئے۔ فتوحات نے اُن کے دل بڑھائے۔ اور لوٹ مارنے چاٹ دیکر بنایا۔ کہ اتفاق اور یک دلی میں کیا مزے اور کیا کیا فائدے ہیں۔ وہ بھی انہیں ایسا عزیز رکھتا تھا۔ کہ ایک سر کو ملک کے مول بھی نہ دیتا تھا۔ اس نے ۵ برس کی کشتکاری میں سلطنت کا کھیت ہرا کیا۔ اور ۵ برس سر سبزی کی بہار دیکھی۔ اس تھوڑے سے وقت میں بنگالہ سے لیکر رہتاس پنجاب تک اور آگرہ سے لیکر مندو تک کوس کوس بھر پر مسجد پختہ کنواں اور ایک ایک سرا آباد کی۔ ایک دروازہ پر ہندو ایک پر مسلمان تعینات تھا کہ پانی پلاتا تھا کھانا کھلاتا تھا۔ اور غریب مسافروں کے لئے دونوں وقت لنگر جاری تھا رستہ کے دونو طرف آم اور کھرنی وغیرہ کے سایہ دار درخت جھومتے تھے۔ مسافر گویا باغ کے خیاباں میں چھانو چھانو چلے جاتے تھے ملّا صاحب لکھتے ہیں کہ آج ۵۲ برس ایسے گذرے۔ اب تک اسکے مٹے نشان جابجا نظر آتے ہیں۔ اور انتظام کا یہ حال تھا۔ کہ ایک بڑھیا لڑکے میں اشرفیاں بھر کے لے جاتی اور جہاں چاہتی سو رہتی مجال نہ تھی کہ چور کی نیت میں فرق آئے۔ ڈاک برابر بیٹھی تھی۔ بنگالہ میں بھی ہوتا۔ تو دوسرے دن خبر پہنچتی تھی فوج کی موجودات ہوتی تھی۔ اور سپاہی کو نقد تنخواہ ملتی تھی ●

وہ ہمت عالی کیساتھ شطرنج سلطنت کا پکا شاطر تھا۔ جب جودھپور کو فتح کرکے پھر از میر سے

رفیع الدین محدث نے کہ یگانہ زمانہ تھے۔ اس سے کہا کہ مجھے رخصت عنایت ہو تاکہ باقی عمر حرمین شریفین میں جاکر اپنے بزرگوں کی قبروں پر چراغ روشن کیا کروں۔ اس نے کہا کہ میں نے آپ کو ایک مصلحت کے لئے روکا ہے۔ کئی قلعے رہ گئے ہیں کہ ابھی فتح نہیں ہوئے۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ چند روز میں ہندوستان کو پاک کر کے کنارۂ دریائے شور پر پہنچوں۔ اور قزلباش جو حاجیوں کے سدراہ ہوتے ہیں۔ اور دین محمدی میں بدعتیں نکال رہے ہیں۔ ان سے لڑوں۔ وہاں سے تم کو بطور سفارت سلطان روم کے پاس بھیجوں کہ اس سے میری برادری کی گرہ لگا دیجئے۔ اور حرمین شریفین میں سے ایک مقام کی خدمت مجھے دے دیجئے۔ پھر ادھر سے میں اور اُدھر سے سلطان روم آئیں اور قزلباش کو بیچ میں لے کر آزادیں۔ اگر فقط سلطان روم ادھر سے آیا تو وہ بھاگ کر ادھر کے جنگلوں میں چلا آئے گا۔ لشکر روم اپنے ملک کو جائیگا۔ تو پھر اپنی جگہ جاکرے لیگا۔ اور جب دونوں طرف سے گھیر لینگے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ جمعیت اور کثرت کہ ہندوستان میں ہے۔ اور وہ آتش بار توپخانہ کہ روم میں ہے۔ اس کے آگے قزلباش کیا کر سکتا ہے ✦

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمایوں ایران میں جا پڑا تھا۔ ہندوستان میں نام و نشان اُس کا نہ رہا تھا۔ مگر شیر اپنے شکار پر یہیں سے تاک لگا رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس خانہ برباد کے لئے بھی تین ٹھکانے ہیں۔ ایران۔ ترکستان اور روم۔ ایران میں اُس نے قدم رکھنے کو جگہ پیدا کر لی ہے۔ اگر یہاں سے بھاگے تو ترکستان جا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اُزبک آل تیمور کے نام کا دشمن ہے۔ پھر اگر ہے۔ تو روم کا گھر ہے۔ اس کا بندوبست کیا۔ مگر افسوس ؎

کارے کہ خدا کند فلک را چہ مجال	ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

قلعہ کالنجر پر جاکر محاصرہ ڈالا۔ روز مورچے اور ساباط بنلتے چلے جاتے تھے۔ افغان جانیں لڑاتے تھے۔ اور توپوں سے آگ برساتے تھے۔ مرتے تھے۔ جلتے تھے۔ مگر جاں فشانی سے باز نہ آتے تھے۔ ایک دن ساباط کو بڑھا کر قلعہ کے برابر پہنچا دیا۔ شیر شاہ خود ایک مورچے پر کھڑا تھا۔ اور باروت کے گولے (حقہ ہوئے باروت) قلعہ میں پھینک رہے تھے۔ ایک گولہ دیوار قلعہ پر لگا۔ اور ٹکرا کر مورچے پر آیا پاس۔ اور گولوں کا ڈھیر لگا تھا۔ دفعتہً سب بھڑک اُٹھے۔ شیر شاہ کا یہ عالم ہوا۔ کہ جھلس کر ملیدہ را ولمہ ا ہو گیا۔ بہت سپاہی اور سردار کباب ہو گئے۔ مولانا نظام اس زمانہ میں مشہور عالم تھے۔ اور شیخ خلیل اس کے پیرزادہ صاحب بھی دکھ درد میں شریک ہوئے شیر شاہ نے ایک ہاتھ آگے رکھا۔ ایک پیچھے اور بھاگ کر جان نیم سوختہ کو خیمہ میں ڈالا۔

کہ مورچہ پر اس کے لئے لگایا تھا۔ کبھی ہوش میں تھا کبھی بیہوش مگر جب آنکھ کھولتا تھا۔ للکار للکار کر حملے کا حکم دیئے جاتا تھا۔ اور جو اُسے دیکھنے کو آتا اُسے بھی یہی کہتا۔ کہ یہاں کیوں آتے ہو قلعہ میں جا پڑو۔ گرمی بھی آگ برسا رہی تھی۔ وہ تڑپتا تھا۔ اور لوگ صندل اور گلاب چھڑکتے تھے۔ مگر موت کی تپش تھی کہ کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوتی تھی قضا کا اتفاق دیکھو کہ ادھر کسی نے فتح کی خوشخبری سنائی ادھر اس کی جان نکل گئی۔ تاریخ ہوئی۔ ز آتش مرد ۹۵۲ھ ✦

شیر شاہ کے بعد جلال خاں تخت نشین ہوا۔ اور اسلام شاہ نام رکھ کر سونے چاندی پر سکہ لگایا۔ بڑے بھائی کو دغا بجر بلایا۔ اس سے اور اس کے طرفداروں سے جنگ میدان کر کے اُسے خانہ برباد کیا۔ شیر شاہ کا لشکر جرار مرتب موجود تھا۔ جس میں بہت سے سردار صاحب طبل و علم تھے اور سپاہ کے حوصلے ایسے بڑھے ہوئے تھے۔ کہ ایک ایک افغان سلطنت ہندوستان کے سنبھالنے کا دعوے رکھتا تھا۔ ابتدا میں سلیم شاہ نے اس کے پرچانے کے لئے سخاوت کے خزانے کھول دئے۔ گھر گھر بلکہ کوچہ و بازار میں افغان جلسے جمائے بیٹھے تھے۔ اور ناچ رنگ کر کے جشن مناتے تھے۔ مگر چند ہی روز کے بعد خود گھبرا گیا۔ بعض کی سرکشی کو آپ دبایا۔ بہتوں کو لڑا لڑا کر مارا۔ خواص خاں شیر شاہ کا بہادر اور نمک حلال غلام جسے وہ بیٹوں سے افضل سمجھتا تھا۔ اسے دغا سے مروا ڈالا غرض ایک ایک کر کے ان کی سخت گردنوں کو توڑا۔ اور چند روز آرام سے بیٹھا۔ پھر بھی ہر وقت ایک نہ ایک کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے بیزار تھے اور یہ ان سے ہر وقت ہشیار۔ اُنہیں ذلیل رکھتا تھا۔ اور ایسے کاموں میں لگائے رکھتا تھا۔ کہ سرکشوں کو سر کھجانے کا ہوش نہ آئے۔ ایک دفعہ ہمایوں کے آنے کی ہوائی اُڑی جس وقت خبر پہنچی سلیم شاہ اس وقت جونکیں لگائے بیٹھا تھا۔ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور فوج کو روانگی کا حکم دیا پہلی ہی منزل میں داروغہ نے عرض کی کہ بیل چرائی پر گئے ہوئے ہیں۔ حکم دیا۔ کہ لگا دو افغانوں کو۔ یہ ہزاروں آدمی مفت کی تنخواہیں کھا رہے ہیں۔ اتنا کام بھی نہیں کر سکتے ایک ایک توپ میں سو سو دو دو سو افغان جتا تھا اور کھینچے لئے جاتا تھا۔ نیازی افغانوں کا فرقہ بڑے انبوہ کی جمعیت رکھتا تھا۔ انہیں کئی دفعہ دبانا پڑا۔ چنانچہ آخر میں خود پنجاب میں فوج لیکر آیا۔ انہیں دنوں میں کہ شمالی پہاڑوں میں پھرتا تھا۔ مانکوٹ کے علاقہ میں ایک مضبوط اور استوار مقام دیکھ کر ۵ پہاڑیوں پر قلعے مانکوٹ رشید کوٹ وغیرہ اس ڈھب سے تعمیر کئے کہ دور سے ایک قلعہ نظر آتا ہے۔ اور خوبی یہ ہے۔ کہ جب ایک قلعہ پر حریف حملہ کرے تو اور قلعوں کی توپوں سے ہمیشہ زد میں رہے۔ عمارت کو

پتھر اور چونہ گچ سے مضبوط کیا ہے اور قلعوں کو پہاڑوں کے اُتار چڑھاؤ اور پیچ و خم نے قلعوں کے اندر جا بجا خوشگوار چشمے جاری اور کھانے پینے کے سامان جسقدر درکار ہوں بہت جلد جمع ہو سکتے ہیں سلیم شاہ نے دو برس تک افغانوں سے چونا اور پتھر ڈھلوائے اور ایک پیسہ نہ دیا قلعہ ہائے مذکورہ اب تک موجود ہیں۔ وہ ان کے بنوانے میں بذات خود کوشش کرتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ کسی دن بُرے وقت میں کام آئینگے۔ وقت وہ تھا۔ کہ ہمایوں کی بیخ و بنیاد تک ہندوستان سے اکھڑ گئی تھی۔ وہ انتہا کی بربادی اُٹھا کر یہاں سے گیا تھا۔ اور گیا بھی ایسے ملک میں تھا کہ خدا ہی لائے تو لائے۔ بھائیوں کا نفاق اس کی کسی اُمید کو قائم نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ تینوں سدِ سکندری باندھے قندھار سے کابل تک گھیرے ہوئے تھے خود سلیم شاہ بالاستقلال بادشاہی کر رہا تھا مگر مثل مشہور ہے۔ کہ دل کی آگاہی غیب کی گواہی ہوتی ہے۔ خدا کی شان دیکھو کہ بُرے ہی وقت میں کام آئے۔ سلیم شاہ کا اصلی ارادہ یہ تھا کہ لاہور کو ویران کر کے اس مقام کو آباد کرے کیونکہ لاہور قدیم الایام سے کثرت آبادی اور سوداگری کے وفور اور ہر قسم کی دستکاری ہر مذہب کے آدمی۔ ہر ایک سامان کی بہتات سے ایک ایسا مقام ہے۔ کہ جب کوئی چاہے۔ تھوڑے سے عرصہ میں لشکروں کا سامان بہم پہنچالے۔ اُسے ہمایوں کا کھٹکا لگا تھا۔ اور مقام مذکور عین راہ پر تھا۔ اور اُسے مٹھی بند کر کے قبضہ میں بھی رکھنے کی اُمید نہ رکھتا تھا۔ اس لئے چاہا کہ ویران کر دے اور مانکوٹ کو آباد کرے تاکہ اگر ہمایوں آ بھی جائے تو یہاں خاک نہ پائے ✦

جب اُس سے چھُٹے تو گکھڑوں سے لڑنے کو بھیجدیا۔ وہ عجیب فرقہ تھا۔ دن کو لڑتے تھے رات کو چوروں کی طرح آتے تھے۔ عورت مرد۔ لونڈی غلام جو ہاتھ آتا تھا پکڑ لے جاتے۔ قید رکھتے بیچ ڈالتے۔ افغانوں کا دم ناک میں آگیا۔ اس پر یہ حال کہ سپاہی کو تنخواہ نہیں ✦

لطیفہ:۔ ایک سردار ذرا خوش مسخرا تھا۔ اس نے ظرافت کے پیرایہ میں کہا کہ حضور میں نے رات کو خواب میں دیکھا۔ کہ آسمان سے ۳ تھیلے نازل ہوئے۔ ایک میں اشرفیاں۔ ایک میں کاغذ ایک میں خاک۔ اشرفیوں کا تھیلا تو ہندوؤں کے گھر چلا گیا۔ کاغذ کا تھیلا بادشاہی خزانہ میں داخل ہوا۔ خاک کا تھیلا سپاہیوں کے سر پر اُلٹ دیا۔ سلیم شاہ کو یہ لطیفہ پسند آیا۔ حکم دیا کہ گوالیار چلکر تنخواہ بانٹ دینگے۔ وہاں پہنچا تھا۔ کہ اجل کا پیام پہنچا ۹۶۰ھ میں اس کے خاتمہ سے خاندان کا خاتمہ ہوا۔ کیونکہ سلطنت انہی باپ بیٹوں پر تمام ہوئی۔ پھر طوایف الملوکی تھی۔ انہی کی بابت دلّی میں مثل مشہور تھی۔ کہ کیا غرض شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی یا سلیم شاہ کی ✦

فیروز خاں اُس کا بارہ برس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ مبارز خاں سلیم شاہ کا چچیرا بھائی بھی تھا۔ اور سالا بھی تھا۔ سلیم شاہ نے کئی دفعہ اس کے قتل کا ارادہ کیا اور بی بی بائی (فیروز خاں کی ماں) سے کہا۔ کہ اگر بیٹے کی جان پیاری ہے۔ تو بھائی کے سر سے ہاتھ اُٹھا۔ اور بھائی پیارا ہے۔ تو بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ عقل عورت نے ہر دفعہ یہی کہا۔ کہ میرا بھائی عیش کا بندہ ہے۔ اسے ان باتوں کی پروا بھی نہیں! اور اس سے سلطنت کب ہوئی! آخر وہی ہوا۔ تیسرے ہی دن تلوار سونت کر گھر میں گھس آیا۔ بہن ہاتھ جوڑتی تھی۔ اور پاؤں پر لوٹتی تھی۔ کہ بھائی! بیوہ کا بچہ ہے۔ میں اسے لیکر ایسی جگہ نکل جاتی ہوں کہ کوئی اس کا نام بھی نہ لیگا۔ اور یہ سلطنت کا نام نہ لیگا۔ اس نفسانی نے ایک نہ سنی اور ایک دم میں کم عمر بچے کی عمر تلوار سے تمام کر دی۔ آپ محمد عادل شاہ بنکر تخت پر بیٹھا

عجیب اتفاق ہے ۔ کہ نظام خاں شیر شاہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کا ایک بیٹا۔ یہی خونریز عادل شاہ۔ ۳ بیٹیاں۔ جن میں ایک خوش نصیب سلیم شاہ کے محلوں میں بادشاہ بیگم ہوکر بد نصیب ہوگئی۔ دوسری بیٹی ابراہیم سور سے بیاہی گئی۔ تیسری سکندر سور سے غرض تینوں کے شوہروں نے کچھ مدت برائے نام شاہی کا لقب ضرور پایا۔ عادل شاہ اپنی سبک حرکتوں سے عدلی۔ اور اندھا دھند کاموں سے اندھلی مشہور ہوگیا۔ وہ نہایت خوش عیش و عشرت پسند تھا۔ راگ رنگ کا عاشق۔ شراب و کباب کا دیوانہ تھا۔ اور یا تو دیوانہ مزاجی سے یا اس غرض سے کہ لوگوں کو پرچائے جب سلطنت کا مالک ہوا تو خزانوں کے منہ کھول کر سونے روپے کے بادل اُڑانے لگا کہ باسی (ایک قسم کا تیر) کہ اسکا پیکان تولہ بھر سونے کا ہوتا تھا۔ سواری شکار میں پھرتے چلتے ادھر اُدھر پھینکتا تھا جس کے گھر میں جا پڑتا۔ یا کوئی پڑا پاتا۔ اور لاتا تو ۵ روپیہ انعام پاتا۔ اس کے اندھا دھند انعاموں کے سبب سے افغانوں نے عدلی کا اندھلی کر دیا۔ راگ رنگ کی باتوں میں ایسا گنی گنوان تھا۔ کہ بڑے بڑے گائک اور نائک اس کے آگے کان پکڑتے تھے۔ اکبری عہد میں میاں تانسین اس کام کے جگت گرو تھے۔ وہ بھی اس کو اُستاد مانتے تھے *

دکن کا ایک سازندہ ہندوستان میں آیا۔ اس نے اُستادی کا نقارہ بجایا اور سب کو ماننا پڑا۔ اس نے ایک پکھاوج تیار کی کہ دونوں ہاتھ دونوں طرف نہ پہنچ سکتے تھے۔ ایک دن بڑے دعوے سے دربار میں آیا اور پکھاوج بھی لایا۔ کہ کوئی اسے بجائے جو گویئے اور کلاونت اس وقت حاضر تھے سب حیران رہ گئے۔ عدلی نے اُسے دیکھا اور قرینہ تاڑ گیا۔ آپ تکیہ لگا کر لیٹ گیا اور اسے برابر لٹا لیا۔ ایک طرف ہاتھ سے بجاتا گیا۔ پاؤں سے تال دیتا گیا۔ تمام اہل دربار چلا اُٹھے

اور جتنے گویئے حاضر تھے سب مان گئے ✦

اس کی لطافت مزاج کی عجیب و غریب نقلیں مشہور ہیں۔ ایک دن بداؤں میں میدان چوگان بازی سے پھرتے ہوئے کہا۔ کہ آج خوب بھوک لگی۔ غازی خاں ایک امیر تھا۔ اس کا گھر سر راہ تھا عرض کی کہ جو ما حضر حاضر ہے یہیں نوش فرمائیے۔ عدلی گیا اور دستر خوان بچھا۔ اول پوہتی کے قلیئے کا سالن سامنے آیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ایسا جی متلایا۔ کہ سوار ہو کر محل کو بھاگا رستہ میں کہیں دم نہ لیا ✦

اس کے فراغت خانہ میں خوشبو کے پھیلانے اور بدبو کے دبانے کے لئے اتنا کافور بکھیرتے تھے کہ حلال خور روز ۲-۳ سیر کافور قسم اعلےٰ اسمبیٹ کرے جاتے تھے۔ پھر بھی جب وہاں سے نکلتا تھا۔ تو رنگ کبھی زرد ہوتا تھا کبھی سبز۔ بدبو کی برداشت نہ تھی۔ یہ سب درست مگر میرے دوستو پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اور اب پھر کہتا ہوں۔ کہ جس طرح انسان کا مزاج ہے۔ کہ کوئی شے اُسے موافق ہے۔ کوئی ناموافق۔ اسی طرح سلطنت کا بھی مزاج ہے بعض چیزیں ہیں کہ اس کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہیں۔ انہی میں ناچ رنگ اور اس قسم کے عیش و عشرت ہیں۔ انہیں غذائے ناموافق سمجھو۔ خواہ شگون منحوس۔ جہاں گانا بجانا بادشاہ کے دست و زبان پر آیا۔ جانو کہ اُلّو بولا۔ اب اس گھر کی خیر نہیں ✦

چند ہی روز میں **عدلی** کی ہوا بگڑ گئی۔ دربار میں تلوار چلی۔ کئی سردار مارے گئے۔ بھانجے کے خون ناحق سے لوگوں کے دل بیزار تھے۔ عیاشی اور ناچ رنگ نے اور بھی بے وقار کر دیا۔ دوسرے ہی مہینے چاروں طرف تلاطم مچ گیا۔ وہ کرانی سرداروں کے دبانے کے لئے گوالیار سے بنگالہ گیا۔ چونکہ امرائے ہمراہی سے بھی بدگمان تھا۔ اس لئے ابراہیم سور سے بھی بدگمان ہوا۔ چاہا کہ قید کر لے بہن ابراہیم کی بی بی۔ اس نے خاوند کو خبر کر دی۔ ابراہیم شیر شاہ سے قریبی رشتہ بھی رکھتا تھا۔ لشکر سے بھاگ کر آیا اور آگرہ وغیرہ میان ولایت میں قبضہ کر کے بادشاہی کا نشان بلند کیا۔ عدلی نے استیصال کے لئے لشکر جرار بھیجا مگر ابراہیم نے شکست فاش دی عدلی نے پھر لشکر بھیجا اور ہیمو کو سپہ سالار کیا۔ کئی جگہ لڑائیاں ہوئیں اور بڑے بھاری رن پڑے۔ ابراہیم نے دکھا دیا کہ افغان کی ہڈی کتنی مضبوط ہے۔ اور ہیمو نے بھی سمجھا دیا۔ کہ دال میں کسی طرح گوشت سے زور کم نہیں۔ مگر انجام کو شکست کھا کر بھاگا۔ اب چاروں طرف سلطنت کے دعویدار کھڑے ہو گئے ✦

سکندر سور دلی سے پنجاب تک ملک دبا کر بیٹھ گیا۔ اور ابراہیم سے صلح کر کے عہد نامہ

کر لیا بلکہ یہ بھی ذمہ لے لیا کہ کابل سے جو سیلاب آئے اس کا روکنا میرا ذمہ ہے ۔

محمد خاں کوڑیہ بنگالہ کا حاکم تھا۔ کہ اپنا نقارہ سب سے الگ بجا رہا تھا۔ چنانچہ وہ ہیموں کی لڑائی میں اس طرح مرا کہ کسی کو خبر ہی نہیں۔ بعد اس کے ادھر اکبر کی تیغ اقبال سے ہیمو مارا گیا۔ اُدھر اُس کے بیٹے کے حملہ انتقامی میں عدلی کا کام تمام ہوا۔

کرانی سردار بنگالہ و بہار میں تھے اور چاروں طرف کشت و خون کر رہے تھے۔ کہ ہمایوں کوہستان کابل سے لشکر لیکر سیلاب کی طرح گرا اور اقبال اکبری نے سب کو صفاً صفاً کر دیا۔

رات ہر اک مہ جبیں محفل میں گرم لاف تھا　　صبح وہ خورشید رو نکلا تو مطلع صاف تھا

خداوند خاں دکھنی نظام شاہی امیروں میں تھا باپ مشہدی تھا۔ ماں حبشیہ تھی۔ قوی ہیکل دیدنی جوان تھا اور بہادری سے بہادروں میں بلند تھا۔ خواجہ میرک اصفہانی جن کا خطاب چنگیز خاں تھا۔ جب مرتضیٰ نظام شاہ کے وکیل مطلق ہو گئے تو خداوند خاں کو بڑی ترقی دی اور اُس نے بھی اپنی لیاقت سے عروج حاصل کیا اور چند روز میں صاحب دستگاہ ہو گیا۔ برار میں کئی عمدہ ضلعے اُس کی جاگیر میں تھے۔ مسجد روہن کھیڑہ ایسی مضبوط بنائی تھی کہ کئی سو برس تک زمانہ کی گردش اس عمارت کو جنبش نہ دے سکی ۹۹۳ھ میں جب مرتضیٰ سبزواری سپہ سالار لشکر برار صلابت خاں چرکس کے مقابلہ میں دکھن میں نہ ٹھہر سکے تو خان بھی میر کے ساتھ فتحپور میں پہنچا۔ اکبر دونو کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آیا خان کو ہزاری منصب دیا۔ پٹن گجرات اُس کی جاگیر ہوا۔ اور دربار میں ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ ابوالفضل کی بہن سے شادی ہو گئی لیکن نوکروں کو بے حد لڑائی سے ایسا تنگ کیا کہ آقا سے برسر دربار گستاخانہ بولے اس سبب سے نظروں میں سبک ہو گیا۔ دلاور جوان نہایت نازک مزاج تھا۔ ایک دن ابوالفضل نے ضیافت کی۔ کھانوں کی بہتات اور انواع و اقسام کی افراط شیخ کی عادت تھی۔ اس کے ہر نوکر کے آگے نو قاب کھانے کے ایک طباق کباب گوسپند۔ سو روٹیاں رنگ برنگ کی تھیں خود خان کے سامنے کبک و دراج۔ مرغ و ماہی کے کباب ہائے رنگا رنگ اور ساگ سالن وغیرہ وغیرہ کھانے چنے تھے۔ اُس نے بہت بُرا مانا اور ناخوش اُٹھ گیا کہ میرے سامنے مرغ کے کباب کیوں رکھے۔ مجھ سے مسخرا پن کیا اکبر کو خبر ہوئی اُسے سمجھایا کہ یہ چیزیں ہندوستان کے تکلفات ہیں اور کھانے کو کھو تو تمہارے ایک ایک نوکر کے آگے نو نو طباق رکھے تھے۔ پھر بھی خان اپنے دل سے صاف نہ ہوئے نہ یہ اُس کے گھر گئے۔ ملا صاحب ۹۹۸ھ میں کہتے ہیں۔ کہ خداوند خاں دکھنی رافضی کہ شیخ ابوالفضل کی بہن حسب الحکم بادشاہ

اُس کے نکاح میں آئی تھی اور قصبہ کڑی ولایت گجرات جاگیر میں پائی تھی دوزخ کی قرارگاہ کو بھاگا تاریخ ہوئی ع کہ خدا و ند دکھنی مردہ۔ طبقات اکبری میں ہے کہ ایک ہزار پانصدی منصب تھا۔ ۹۹۵ھ میں مرگیا۔ ماثر الامرا میں ۹۹۷ھ لکھے ہیں۔

خواجہ امینا

خواجہ امین الدین تربتی خواجہ امینا مشہور تھے۔ تربت علاقہ خراسان کے رہنے والے تھے۔ ایران کے سفر میں ہمایوں کی خدمت میں حاضر رہے۔ عالم شہزادگی میں چند روز اکبر کی بخشی گری سے اعزاز پایا تھا۔ بیرم خاں کے معتمدان خاص الخاص میں تھے۔ یہ وہی ہیں۔ کہ جب اُس کا زوال شروع ہوا۔ تو دو اور امیروں کے ساتھ انہیں دربار میں عرض معروض کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ دربار کے فتنہ انگیزوں نے انہیں بھی قید کروا دیا۔ پھر قید سے نکلے ور بڑھتے بڑھتے وکیل مطلق کے رتبہ عالی کو پہنچے۔ اور خواجہ جہان خطاب پایا۔ اُنکی لیاقت نے ایسے ایسے کام اور انتظام کئے کہ ابو الفضل جیسے شخص نے اُن کے باب میں لکھا ہے قلم و حساب میں شہسوار تھا۔ خط شکستہ نہایت درست اور خوب لکھتا تھا۔ مالیات کے بندوبست اور حساب کتاب کے معاملوں میں بال کی کھال اُتارتا تھا۔ ہمایوں نے چند روز اکبر کی سرکار میں بخشی بھی کر دیا تھا۔ مدّت تک مدار مہمات سلطنت کا ان کی رائے پر تھا۔ جب خان زماں کے اصلاح معاملات کے لئے منعم خاں اور مظفر خاں کو بھیجا تو انہیں بھی ساتھ بھیجا۔ مہم کا فیصلہ خان زمان کی عفو تقصیر پر ہوا۔ جب اُمرا واپس پھرے تو مظفر خاں یلغار کر کے حضور میں پہنچے اور بادشاہ کے ذہن نشین کر دیا کہ امرا نے خان زمان کی رعایت کی۔ خواجہ جہاں عتاب میں آئے طغرائے بادشاہی کی مہر کہ اس کا زیور افتخار تھا چھن گئی۔ اور انہیں حکم ہوا حج کو جاؤ اور خدا سے گناہ معاف کرواؤ۔ پھر مقربان درگاہ نے سفارشیں کیں اور یہیں خطا معاف ہو گئی۔

مُلّا صاحب کہتے ہیں کہ رشوت خوری کے نیستان کا شیر تھا۔ بلکہ اس کے اختیارات کے سبب سے لوگ اکبر سے بھی ناراض ہو گئے۔ خواجہ کے عین جاہ و جلال میں صبوحی شاعر نے کہا ؎

ہر اہل ہنر سد سکندر در تست	یا جوج کہ گویند صفت شکر تست
در دورِ تو آثار قیامت پیدا است	دجّال توئی خواجہ امینا خر تست

بخیلی میں شہرۂ عالم تھا۔ رات کو کھانا بچتا تو اُٹھوا رکھتا۔ صبح کو باسی کھاتا تھا۔ لیکن خوضمندوں کی کارسازی میں بے نظیر تھا۔ اپنے بیگانے کی قید نہ تھی۔ جب ملازمان دربار میں کسی کو کام آن پڑتا۔ تو وہ اُس کی مدد کے لئے فوراً تیار ہو جاتا تھا سعی و کوشش تو پوری کرتا تھا۔ لیکن حق الخدمت

کے لئے خواجہ اس سے اپنی رقم ٹھیرالیتا تھا اور کام نکال دیتا تھا۔طوغ۔علم۔نقارہ۔خانی وسلطانی منصب فوراً دلوا دیتا تھا جو جاگیر چاہتا تھا وہی ہو جاتی تھی۔صاحب علم۔اہل فضل۔ترکستان۔خراسان۔ ایران۔ہندوستان کے ہزاروں آئے۔اور اُس نے ہزاروں ہی دلوائے۔ ملّا صاحب کہتے ہیں۔اس کی سعی سے بادشاہ مجھے بھی بہت روپے دیتے تھے۔اور جس طرح اور امیر دیتے تھے۔آپ بھی ہر شخص سے سلوک کرتا تھا۔ ملا عصام کے شاگرد فاضل تاشکندی کہ صدر نشین اہل فضیلت تھے (سورۂ محمدؐ کی تفسیر جو انہوں نے لکھی ہے اُن کے کمال کی دلیل کافی ہے) انہیں بادشاہ اور اُمرا سے چالیس ہزار روپیہ دلوایا۔ وہ خوب سامان شایاں سے منعم خاں کے پاس بنگالہ پہنچے وہاں سے دولت بھری۔ مکے پہنچے۔ وہاں سے ایران کے رستے ساری بار برداری گھر پہنچائی اور آپ قبر میں چلے گئے ؛

جب شاہ مہم پٹنہ پر گئے تو یہ ہمرکاب تھے رستہ میں بیمار ہو کر جونپور میں ٹھیر گئے۔مراجعت کے وقت بادشاہ اسی راہ سے آئے۔خواجہ ساتھ ہو گئے۔اکبری لشکر ہاتھیوں کا جنگل بن تھا ایک منزل میں فیل مست نے ان پر حملہ کیا۔یہ بھاگے۔ایک تو بڑھاپا۔دوسرے اضطراب۔خیمہ کی طناب میں اُلجھ کر گرے اور دفعتاً حال بے حال ہو گیا۔خوف کا ایسا صدمہ دل پر ہوا کہ پھر نہ اُٹھے ۹۸۳ھ میں ملا صاحب کیا مزے سے کہتے ہیں۔خواجہ اینا وزیر مستقل جس کا خطاب خواجہ جہاں تھا پٹنے سے پھرتے ہوئے لکھنؤ میں مر گیا۔اور بے شمار دولت چھوڑ گیا۔سب خزانہ میں داخل ہ

خواجہ شاہ منصور

حساب کتاب معاملہ فہمی اور تحریر و تقریر میں کار گذار اہلکار تھا۔خوشبوی خانہ کا داروغہ تھا اس کے حسن لیاقت اور تحریر و تقریر کے جوہر سے اکبر اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔مظفر خاں کی شدت اور سخت گیری سے تنگ رہتا تھا۔اور وہ ہمیشہ پیچ مارتا تھا۔ایک دن گفتگو میں بات بڑھ گئی۔شاہ نے رہنا مناسب نہ سمجھا۔ناکامی کے ساتھ دربار چھوڑا۔جونپور گئے اور قابلیت ذاتی کی بدولت خان زمان کے دیوان ہو گئے۔وہ مارا گیا اس کا کام برہم ہو گیا۔منعم خاں کے پاس بنگالہ گیا۔اس کی سرکار کے تمام کاروبار کو سنبھال لیا۔وہاں سے وکالت کے سلسلے میں آمد و رفت ہوئی۔اس میں ایسی لیاقت دکھائی کہ اُس کی کاردانی بادشاہ کے منقوش خاطر ہو گئی۔جب منعم خاں مر گیا۔تو بادشاہی محاسبہ کے پھندے میں پھنس کر راجہ ٹوڈرمل کے شکنجے میں کسے گئے۔آخر بے سفارش۔خاص بادشاہ کی جوہر شناسی سے پھر حضور میں پہنچے۔ ۸۳-۹۸۴ھ میں دیوان کل ہو گئے۔اور امور ملکی میں راجہ ٹوڈرمل

کے شریک غالب ہو کر کام کرنے لگے۔ کسی اُستاد کا شعر ہے ؎

ناقابل ست آنکہ بدولت نمے رسد	ورنہ زمانہ درطلب مرد قابل ست

مُلّا صاحب اس موقع پر شعر مذکور میں اصلاح فرما کر کہتے ہیں ؎

ناقابلان دہر بدولت رسیدہ اند	پس چون زمانہ درطلب مرد قابل ست

اول حق ست و ثانی سم۔ سبحان اللہ۔ پھر دونوں طرف نشتر مار گئے۔ کوئی پوچھے کہ پہلا شعر حق ہے؟ یا پہلا مصرع؟ خیر مُلّا صاحب جو چاہیں۔ سو کہیں خواجہ کی خوبی لیاقت اور کاردانی میں کلام نہیں۔ فراست اور دانائی سے دفتر حساب کو درست کیا اور پرانے پرانے معاملے جو اُلجھے پڑے تھے انہیں صاف کیا۔ پہلے دستور تھا کہ ہر سال معتبر اور کارواں اہلکار دیہات میں ضلع بہ ضلع جاتے تھے۔ اور جمعبندی بنا کر لاتے تھے۔ اس کے بموجب روپیہ وصول ہوتا تھا۔ اب کہ ممالک محروسہ نے زیادہ دامن پھیلایا تو اس طرح کام چلنا مشکل ہوا۔ وہ کچھ لکھ کر لاتے زمیندار کچھ اور دینا چاہتے۔ باقی۔ فاضل کے بڑے بڑے جھگڑے پڑتے۔ نرخ بھی ہر ایک علاقہ کا ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوتا تھا۔ ۹۸۲-۹۱ھ میں کہ جب تک اُڑیسہ۔ کشمیر۔ ٹھٹہ اور دکن ملک اکبری میں داخل نہ ہوئے تھے۔ ملک ۱۲ صوبوں میں تقسیم ہوا اور بندوبست ۱۵ سالہ کا آئین مقرر ہوا۔ اس کا انتظام راجہ ٹوڈرمل اور ان کے سپرد ہوا تھا۔ راجہ تو مہم بنگالہ پر بھیجے گئے۔ انہوں نے کشت و کار کے کل مراتب اور نرخ وغیرہ کی تحقیقات کر کے گانوؤں کیلئے جمعبندی کی عمدہ کتابیں مرتب کیں اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے مزاج میں وقت۔ جزرسی۔ کفایت اندوزی۔ اور سخت گیری بشدت تھی۔ اُمرا سے سپاہی تک سب تنگ تھے۔ حساب میں ایسا پیچ مارتے تھے۔ کہ کتاب کے شکنجہ میں کس دیتے تھے۔ جن دنوں ان کا ستارہ اقبال چمکا۔ اُنہی دنوں ایک دُمدار ستارہ نکلا۔ یہ شملہ کچھ لمبا چھوڑا کرتے تھے۔ لوگوں نے ان کا نام دُمدار ستارہ رکھدیا۔ جب کوچہ و بازار میں سواری نکلتی۔ اشارے ہوتے بلکہ اُن کی سختیاں دیکھ کر لوگ مظفر خاں کی کمبختیاں بھول گئے۔ انہیں پر نفریں اور لعنت کے ڈھیر لگا دیئے ع

کہ بسیار بد باشد از بد بتر

یہ اِدھر مالگذاری کے بندوبست میں تھے۔ اُدھر مظفر خاں مہم بنگالہ و بہار کا سرانجام کر رہے تھے خواجہ نے باوجود کاردانی اور سخن فہمی کے وقت کو نہ پہچانا۔ کہ سپاہ ممالک دوردست میں جانفشانی کر رہی ہے۔ موقع دلجوئی اور دلداری کا ہے نہ کہ سخت گیری اور خونخوازی کا۔ انعام

واکرام کی جگہ کاغذ بنا کر بھیجا کہ امرائے بنگالہ سے دہ ۔ پانزدہ اور بہار سے دہ ۔ دوازدہ وصول کیا جائے ۔ سپہ سالار ہمیشہ سپاہ کا طرفدار ہوتا ہے ۔ وہاں مظفر خاں سپہ سالار تھے کہ پہلے دیوان تھے۔ انہوں نے شروع سال رواں سے روپیہ طلب کیا ۔ اُمرا سب بگڑ کھڑے ہوئے ۔ بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی نئے سرے سے فوج کشی ہوئی ۔ ہزاروں آدمی مارے گئے ملک تباہ ہوا ۔ پشتوں کے نمک حلال جاں باز باغی ہو کر قتل ہو گئے ۔

ٹوڈرمل کی ان سے چشمک تھی ۔ وہ بنگالہ میں شامل مہم تھے ۔ انہوں نے وہاں سے رپورٹ کی اور مصلحت کے نشیب و فراز بادشاہ کے منقوش خاطر کئے ۔ بادشاہ سمجھ گیا ۔ اور خواجہ کی جگہ شاہ قلی محرم کو دیوان کر دیا ۔ لیکن ان کی خیر خواہی اور محنت اور دماغ سوزی دل پر نقش ہو چکی تھی چند روز کے بعد پھر وزارت کا خلعت مل گیا ۔

مرزا حکیم اکبر کا سوتیلا بھائی حاکم کابل تھا ۔ اسی سال میں بغاوت کر کے ادھر آیا ۔ اور لاہور تک پہنچ گیا ۔ اکبر نے آگرہ سے فوج روانہ کی ۔ اور پیچھے آپ سوار ہوا ۔ پانی پت پر پہنچا تھا کہ مرزا حکیم بموجب عادت کے بھاگ گئے ۔ اکبر سرہند پر پہنچا ۔ خواجہ اس وقت سرہند کے صوبہ تھے ۔ ان سے کیا امرا ۔ کیا عام اہل دربار مدت سے جلے ہوئے تھے ۔ مرزا حکیم نے فرمان اور اُس کے اُمرا کی طرف سے جعلی خطوط خواجہ کے نام ۔ کچھ خواجہ کے خط اس کے نام پر بنا کر پیش کئے ۔ موقع ایسا تھا کہ اکبر کو بھی یقین آگیا ۔ اور سمجھا کہ حقیقتہً ادھر ملا ہوا ہے ۔ انہی خطوط میں ایک عرضی شرف بیگ اُن کے عامل کی ان کے نام تھی ۔ اس کا خلاصہ یہ کہ ۔ میں فریدوں خاں مرزا کے ماموں سے ملا مجھے مرزا کے پاس لے گیا ۔ باوجودیکہ تمام پرگنوں پر عامل تعینات کر آئے ہیں ۔ ہمارے پرگنے کو معاف کیا ہے ۔ ملک نامی کہ مرزا کا قدیمی نمک خوار ۔ اور دیوان تھا ۔ وزیر خاں اس کا خطاب تھا ۔ شروع مہم میں ادھر آیا ۔ ظاہر یہ کیا کہ میں مرزا سے ناراض ہو کر آیا ہوں ۔ اس نے سونی پت کے مقام میں ملازمت حاصل کی اور سابقہ شناسائی کے سبب سے خواجہ کے پاس اُترا ۔ یہاں مشہور ہو گیا تھا کہ یہ جاسوسی کے لئے آیا ہے ۔ غرض پیچ پر پیچ برابر پڑتا گیا ۔ تعجب یہ کہ راجہ مان سنگھ نے بھی اٹک سے ۳ خط گرفتار کر کے بھیجے اور لکھا تھا کہ شادمان کے بستر سے نکلے تھے ۔ ایک خط کا خلاصہ یہ تھا کہ تمہاری نیک جہتی اور نیک اندیشی کی عرضیاں پہنچکر توجہ کو بڑھا رہی ہیں ۔ اُن کے نتیجوں سے کامیاب ہو گے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ آزاد ۔ لاعلمی کے اندھیرے میں بدگمانی کی تیراندازی کیا ضرور ہے ۔ جس طرح اکبر کو لوگوں نے دھوکا دیا مان سنگھ بچارے کو بھی غوطہ دیا گیا ہو گا ۔ بادشاہ بھی متردد

تھے۔ قید کر کے ضامن مانگا۔ ان بیچارے کا ضامن کون ہو مسلمانوں نے ثواب اور ہندوؤں نے پُن کمائے نواح انبالہ منزل کچھ کوٹ پر بے جرم و بے خطا منصور کی میراث خواجہ شاہ منصور کے گلے باندھی تاریخ ہوئی۔ شاہ منصور حلاج۔ ۹۸۹ھ میں شیخ ابو الفضل نے کی جگہ اُسکی لیاقت کو عمدہ سارٹیفکٹ دیئے ہیں۔ قتل کے مقام پر لکھتے ہیں۔ اگرچہ فضیلت علمی نہ رکھتا تھا مگر یکا محاسب۔ جانچ کر بات کہنے والا۔ نکتہ فہم۔ خوردہ گیر۔ کاروبار کا بوجھ سنبھالنے والا۔ فصیح بیان۔ خوش کلام۔ خوش وضع۔ خوش نما انداز۔ نیک اطوار تھا۔ کچھ کوٹ کی منزل میں درخت سے لٹکا دیا۔ مُلّا صاحب خطوں کی گرفتاری کا حال کس خوبصورتی سے لکھتے ہیں۔ صبح کو خدمت رائے سے فرمایا۔ اُس نے منزل کچھ کوٹ میں پھانسی سے لٹکا دیا۔ اور خدائی کا مظلمہ گلے کا پٹہ رہا کہ قیامت تک لٹکا کرے گا

ایاک وخدمۃ الملوک فانہم یستطعون عند السلام والجواب و یستحقرون عند العقاب ضرب الرقاب

خدمت سلاطین سے بچنا! یہ وہ ہیں کہ سلام کرو تو جواب دینا بھی بڑی بات سمجھتے ہیں۔ اور خفا ہوں تو گردن مارنی کچھ بات ہی نہیں۔ ع۔ خوش باش کہ ظالم نبرد رہ بسلامت۔

خیال کرو! شاہ منصور کا ذکر ہے اور نشتر کی نوکیں کہاں کہاں چبھوتے جاتے ہیں۔ ہاں اصل نصیحت کا مضمون دل پر نقش کرنے کے قابل ہے ؎

مباشی بکار جہاں سخت گیر	کہ ہر سخت گیرے بود سخت میر
بآساں گذاری دمے مے گذار	کہ آساں زید مردِ آساں گذار

جب مرزا حکیم کی مہم کا خاتمہ ہوا تو کابل میں پہنچکر اکبر نے بہت تحقیقات کی۔ سازش کی بو بھی کہیں سے نہ نکلی۔ یہ ہی معلوم ہوا کہ کرم اللہ۔ شہباز خاں کمبو کے بھائی بعض امراخصوصاً راجہ ٹوڈر مل کی اشتعالک سے یہ قبیلے بنے تھے۔ اکبر نے اس کے خون ناحق سے اور اس نظر سے کہ ایسا کاروان اہلکار ہاتھ سے گیا بہت افسوس کیا۔ اور کہا کرتے تھے کہ جس دن سے خواجہ مرا۔ تمام حساب درہم برہم ہو رہے ہیں۔ اور محاسبہ کا سررشتہ ٹوٹ گیا۔ ایسا محاسب خوردہ گیر۔ نکتہ سنج۔ شخص کم ملتا ہے۔ تو لہ ہزاری منصب تک پہنچے۔ ۲ برس وزارت کی۔ اور استقلال اور استحقاق سے وزارت کی۔

خواجہ مظفر علی المخاطب بہ مظفر خاں

پہلے مظفر علی دیوانہ کہلاتے تھے۔ بیرم خاں کے دیوان تھے۔ تحریر۔ تقریر۔ اور حساب کتاب میں عمدہ لیاقت رکھتے تھے۔ جب زمانہ نے خان خاناں سے بے وفائی کی تو یہ اُس کی وفاداری میں ثابت قدم تھے۔ اُس نے پنجاب کا رخ کیا اور اپنے عیال اور اسباب و مال کو قلعہ بٹھنڈہ میں ذخیرہ کیا۔ یہاں

اطمینان کی صورت یہ تھی کہ شیر محمد دیوانہ یہاں حاکم تھا۔ خان خاناں کے صدہا پرورش یافتوں میں سے ایک دلاور یہ بھی تھا مگر اس میں یہ خصوصیت تھی کہ بیٹا کہلاتا تھا۔ افسوس کہ بیٹا ناخلف نکلا۔ جب خانخاناں نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور دیپالپور میں پہنچا تو دیوانہ نے تمام مال و اسباب ضبط کر لیا اور اہل و عیال کی بڑی بے عزتی و اہانت کی۔ خان خاناں کو جب یہ خبر پہنچی تو سخت رنج ہوا۔ خواجہ مظفر علی اور درویش محمد ازبک کو بھیجا کہ اُسے دردمندی کی تبریدیں پلائے اور نصیحت کی معجونیں کھلائے شاید کہ دیوانہ کا دماغ اصلاح پر آئے۔ یہاں دیوانہ کو کتے نے کاٹا تھا۔ ع ۔ اے عاقلان کنارہ کہ دیوانہ مست شد ۔ وہ کس کی سنتا تھا۔ اس نے اُسے بھی قید کر کے دربار کو روانہ کر دیا۔ درویش دربار میں آئے تو یاروں نے چاہا کہ تلوار تلے دھر دیں مگر بادشاہ نے قید پر قناعت کی ۔

جب خان خاناں کی خطا معاف ہوئی تو سب کے گناہ بخشے گئے۔ ان کی لیاقت نے اوّل خدمت سے منصب لئے۔ چندروز کے بعد پسرور کا علاقہ جاگیر ہو گیا۔ لیاقت عمدہ ۔ مادّہ قابل تھا۔ خان خاناں جیسے شخص کے زیر دست دیوان رہے تھے۔ بہت جلد ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ اوّل دیوان بیوتات ہوئے ۹۷۱ھ میں وکیل مطلق ہو کر مظفر خاں ہو گئے۔ عمدۃ الملک سے خطاب کا وزن سنگین ہوا۔ اور امیر الامرائی نے اُسے تاجدار کیا۔ انہیں کی تجویز سے شیخ عبدالنبی صدر ۔ صدر الممالک دربار اکبری کے ہوئے تھے۔ ٹوڈرمل کے ساتھ شریک ہو کر کام کرتے تھے۔ ایسے دو بالیاقت اہلکاروں کا اتفاق ۔ اتفاقاً ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان دونوں میں جزئیات سے لے کر کلیات تک اختلاف ہی رہتا تھا۔ ایک سے ایک دبتا نہ تھا کیونکہ اکبر کی نظر دونوں پر برابر تھی۔ دونوں کارگذاروں کو دو ہاتھوں پر برابر لئے چلتا تھا۔ راجہ نے ایک دن سر دیوان خواجہ سے کہا کہ تم مسلمان بہت نوکر رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تم ہندو نوکر رکھو اور اپنا کام چلاؤ ۔

۹۸۱ھ میں اکبر نے چاہا کہ سپاہ میں داغ اور دفتر مالگذاری میں خالصہ کا آئین جاری ہو۔ جلسہ مشورۃ بیٹھا اور امرا سے صلاح ہوئی۔ ٹوڈرمل نے عرض کی کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ حالت موجودہ کی قباحتیں بھی دکھائیں اور عرض کی کہ مظفر خاں اور منعم خاں کو گوارا نہ ہو گا ۔ مظفر خاں سارنگپور میں جا کر دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ طلب ہوئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس کا انتظام کرو تو انہوں نے برخلاف رائے دی اور اس بیہودگی سے دلایل پیش کئے کہ بادشاہ ناراض ہو گئے۔ اور یہ عتاب میں آئے۔ اسے انکی گستاخی یا سینہ زوری جو کہو درست۔ لیکن تجربہ کار اہلکار تھے صورت حال سے انجام کار کو سمجھ لیتے تھے۔ چنانچہ جو وہ سمجھے تھے وہی ہوا ۔ کہ دونوں تجویزوں میں

سے ایک بھی پیش نہ گئی۔ آخر سب مخنتیں برباد گئیں اور دفتر گاؤ خورد ہو گئے ❊

اسی سال میں منعم خاں نے مہم پٹنہ سے بادشاہ کو لکھا کہ سامانِ جنگ وغیرہ وغیرہ مرحمت ہو۔ اور حضور خود قدم اقبال کو ادھر جنبش دیں تاکہ فتح کی موج میں جنبش پیدا ہو۔ بادشاہ نے ان کی خطا معاف فرما کر سامان مذکورہ کا اہتمام اُن کے سپرد کیا۔ یہ خدمت میں مصروف ہوئے مگر اپنی اکڑ تکڑ کے پورے تھے۔ پھر ایسی خود رائی اور بے پروائی سے کام سرانجام کرنے لگے کہ دوبارہ نظروں سے گر گئے خیر چند روز کے بعد پھر خطا معاف ہو گئی

۹۸۷ھ میں خان جہاں حسین قلی خاں مر گئے تو بادشاہ نے ملک بنگالے کا انتظام ان کے سپرد کیا۔ وہاں اُن کے سخت احکام اور سینہ زور بندوبست نے کام خراب کر دیا۔ تمام امراء باغی ہو گئے اور یہ ترکان قاقشال کی سرشوری سے مارے گئے۔ خواجہ کی قابلیت اور کاردانی میں کچھ کلام نہیں کیا دربار میں اور باہر دربار سے سب انہیں عزیز رکھتے مگر ان کی تجویزیں اور احکام اور حساب کتاب کی عمل درآمد ایسی سخت تھی کہ کوئی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ جب دیوان کل ہوئے تو لوگوں نے تاریخ کہی ظالم۔ ان کی کارروائی دیکھ کر لوگ راجہ کی روکھی سوکھی کو بھی بھول گئے اہل ظرافت میں ایک شعر مشہور تھا ؎

سگِ کاشی بہ از خراسانی	گرچہ صد بار سگ ز کاشی بہ

یاروں نے جل کر اس میں اصلاح کی اور کہا ؎

سگِ راجہ بہ از مظفر خاں	گرچہ صد بار سگ ز راجہ بہ

راجگان میواڑ یا اُدیپور

راجگان میواڑ (اُدیپور) اپنے خاندان کا سلسلہ نوشیرواں سے ملا دیتے ہیں اس کے اثبات یا انکار کی ضرورت نہیں یہ ضرور ہے کہ کل ممالک ہندوستان کے راجہ اس خاندان کی عظمت پر ادب کے ہار چڑھاتے ہیں۔ اور راجگان میواڑ نے بھی اپنے اوصاف قومی کے لحاظ سے رتبہ مذکور کی خوب حفاظت کی۔ عہد سلف میں جو راجہ کسی راج میں گدی پر بیٹھتا تھا اوّل وہاں حاضر ہوتا تھا۔ رانا اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں سے ذرا سا لہو نکالتا تھا اور اسکے ماتھے پر تلک دیتا تھا۔ پھر تخت نشینی کی رسمیں آگے چلتی تھیں ❊

جہانگیر نے اپنے توزک کے ۹ سنہ جلوس میں رانا امر سنگھ کے حال میں لکھا ہے۔ رانا منجملہ زمینداران و راجہائے معتبر ہندوستان میں سے ہے۔ اس کی اور اس کی آباؤ اجداد کی سروری و سرداری کو تمام رائے اور راجہ اس ولایت کے تسلیم کرتے ہیں۔ مدت دراز سے دولت اور ریاست اُن کے

خاندان میں چلی آتی ہے۔ پہلے مدت دراز تک سمت مشرق میں حکومت کرتے رہے۔ ان دنوں راجہ کا لقب رکھا تھا۔ پھر دکن کی طرف رُخ کیا۔ اور اکثر ریاستیں ادھر کی فتح کیں اور راجہ کی جگہ راول کا لقب اختیار کیا۔ پھر کوہستان میوات میں آئے اور رفتہ رفتہ قلعہ چتوڑ کو فتح کیا۔ اس وقت سے آج تک کہ میرے جلوس کا آٹھواں برس ہے ۱۴۷۱ برس ہوتے ہیں۔ ۱۰۱۰ برس کے عرصہ میں ۲۶ فرمانروا اس خاندان کے راول کے لقب سے نامور ہوئے۔ اور راول سے رانا امر سنگھ تک کہ اب رانا ہے ۔۴۶۰ برس میں ۲۶ فرمانروا ہوئے ؞

جب بابر نے آگرہ تک قبضہ کر لیا اُس وقت میواڑ کا فرمانروا سنگرام (رانا سانگا) تھا۔ اس کا جاہ و جلال بھی دیکھنے کے قابل ہوگا ۸۰ ہزار سوار۔ سات راجہ مہاراجہ۔ نو راو ایک سو چار راول اور راوت۔ پانسو ہاتھی لیکر میدان جنگ میں آیا کرتا تھا۔ مارواڑ۔ آمیر۔ جودھپور وغیرہ کے راجہ اس کا ادب کرتے تھے۔ گوالیار۔ اجمیر۔ رساتی۔ سیکری۔ کالپی۔ چندیری۔ بوندی۔ گگراون۔ رام پور۔ الور کے راجہ اُس کے باجگذار تھے۔ راج کی شمالی حد پر بیانہ کھل (متصل بیانہ) مشرق میں دریائے سندھ۔ جنوب میں مالوہ۔ مغرب میں میواڑ کے پہاڑ تھے۔ یہ رانا ضرور چکرورتی راجہ ہندوستان کا ہوتا اگر بابر اُسکی موت کا فرشتہ ترکستان سے نہ آتا۔ اس نے بھی فتح و شکست کے سبق بابر کی طرح یاد کئے تھے۔ خیال کرو ایک دریائے سیحون کا پانی پینے والا ترک۔ دوسرا گنگا کا پانی پینے والا راجپوت اب سیحون کا پانی گنگا کی سلطنتوں کو خاک میں ملاتا ہے (میواڑ کا راج اس وقت) بابر اپنے واقعات میں لکھتا ہے۔ جب میں کابل تھا تو رانا نے رفیقانہ مراسلے لکھے اور وکیل بھیجے کہ جب آپ دلّی کی طرف کوچ کرینگے تو میں آگرہ پر آؤنگا مگر جب میں نے ابراہیم کو شکست دی اور دلی سے آگرہ تک فتح کر لیا تو اس نے میری بات بھی نہ پوچھی۔ اور تھوڑے دنوں بعد کندھار کا محاصرہ کر لیا ؞

کندھار حسن ابن مکن کے پاس تھا۔ وہ اگرچہ خود میرے پاس نہیں آیا۔ مگر کئی دفعہ وکیل میرے پاس بھیجے۔ یہاں اٹاوہ۔ دھولپور۔ گوالیار۔ بیانہ میرے پاس نہ تھے۔ افغانوں نے پورب میں شور و شر بپا رکھا تھا اس لئے اسے کمک نہ بھیج سکا۔ حسن نے ناچار ہو کر قلعہ رانا سانگا کے حوالہ کر دیا قلعہ مذکور رن تھنبور سے چند میل مشرق کی جانب ہے اور نہایت مستحکم ہے۔ مہدی خواجہ کے خط میرے پاس آگرہ میں آئے۔ کہ رانا بڑھا چلا آتا ہے۔ تمام راجہ ہندوؤں کے اُس کی رکاب میں ہیں اور حسن خاں میواتی بھی ساتھ ہے۔ یہ لڑائی بھی اس شان کی تھی کہ بابر اور اُس کے اہل فوج کی جانوں پر بنی ہوئی تھی اور کسی کو بچنے کی امید نہ تھی سیکری پر میدان ہوا۔ (اکبر نے اُس کا نام فتح پور رکھا)

انقدیری اتفاق ہے کہ نا امیدی ہی کامیاب ہو گئی ۔ ہزاروں کا کھیت پڑا۔ بہت سے راجہ ٹھاکر اور مسلمان سردار اسکی رفاقت میں مارے گئے اور رانا رن سے بھاگا۔ چند روز کے بعد۔ کوئی کہتا ہے بی بی نے زہر دیا غرض رانا مر گیا اور سلطنت چند بیٹوں میں چھوڑ گیا جنہیں سوا گھر میں لڑنے کے کچھ لیاقت نہ تھی ؛

نالائق اولاد نے آپس کی کشاکشی کے بعد گھر کی کثافت کو تخفیف دی - اور اُودے سنگھ سب میں چھوٹا بیٹا گدی پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں اکبر نے چیتوڑ اور رنتھنبور فتح کیا۔ نالائق اور بے ہمت اُودے سنگھ پہاڑوں میں گھس گیا۔ اس کے عہد میں اکبر کے حکم سے اوّل مرزا شمس الدین نے قلعہ میرٹھ پر فوج کشی کی۔ جیمل رانا کی طرف سے وہاں کا حاکم تھا۔ اس نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا آخر بھاگ گیا۔ سنہ جلوس ۵ ۱۵۱۲ء / ۹۶۹ھ میں قلعہ مذکور خالی ہوا۔ یہ پہلی ٹکر تھی کہ اودے پور کے راجہ کو بھیل قوم کے لوگ پناہ نہ دیتے تو خدا جانے کیا حال ہوتا ۔ وہ بھی نہ دربار میں آیا نہ اطاعت پر راضی ہوا۔ اس نے بیچ در بیچ گھاٹیوں کے جال میں اپنے نام پر اُدے پور آباد کیا کہ راج نگری ملک مذکور کی ہے - وہیں ایک گھاٹی میں کسی طرف سے بند باندھ کر ایک جھیل بنائی - وہ اب بھی اُودے ساگر مشہور ہے۔ غرض وہ راز تک بدنامی اور بے لیاقتی کے ساتھ زندگی کی ۔ قوم کی عزت برباد اور بنیاد مملکت کو ضعیف کرتا رہا۔ ۴۲ برس کی عمر میں اُودے سنگھ کی عمر پوری ہوئی اور پرتاب اس کا بڑا جانشین ہوا۔ وہ بیشک خاندان کا نام روشن کرنے والا تھا۔ اگر رانا سانگا کے بعد وہی گدی پر بیٹھتا تو بابر اور اس کی اولاد کو دم نہ لینے دیتا۔ اکبر نے بھی ہزار جتن کئے مگر اس کی گردن نہ جھکی بلکہ دربار تک بھی نہ آیا ؛

رن تھنبور

شیر شاہ کے بعد اس قلعہ میں حاجی خاں اس کا غلام حاکم تھا۔ اس نے اکبر کا اقبال طلوع دیکھ کر اپنی حالت پر نظر کی۔ ڈرا کہ مبادا اشعاع اقبال سے جل جائے۔ ۱۵۵۹ء / ۹۶۶ھ میں راجہ سرجن کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ سرجن۔ رانا کے عزیزوں میں تھا۔ اس نے بہت سے محل و مکانات بنوائے۔ باہر بھی دور دور تک عملداری پھیلائی۔ جب اکبر قلعہ چیتوڑ کی فتح سے فارغ ہوا تو ۹۷۶ھ میں اکبر نے رن تھنبور کے قلعہ پر فوجکشی کی۔ اسوقت رائے سرجن ہاڑا راج کرتا تھا۔ یہ قلعہ راجگان سلف کی عالی ہمتی نے پہاڑوں کے بیچ میں جا کر کوہ رن کی چوٹی پر بنایا تھا۔ اس پہاڑ پر بڑے بڑے پتھر ہیں اور درختوں سے چھائے ہوئے ہیں۔ رن پہاڑ کو کہتے ہیں۔ تھنبور جوشن پوش۔ یعنی جوشن پوش پہاڑ۔ وہ برائے نام قلعہ تھا مگر حقیقت میں ملک خدائی تھا۔ جس کے گرد فصیل کھنچی ہوئی تھی۔ کہیں فصیلیں تھیں۔ کہیں پہاڑوں کی دھاروں پر قدرتی فصیلیں تھیں اس کے محاصرہ میں بھی سخت دشواریاں پیش آئیں۔ بے دمدموں کے کامیابی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اُس کا اہتمام بھی ٹوڈرمل کو کہ وزیر مطلق ہو گیا تھا۔

اور قاسم خاں میر بحر کو سپرد ہوا اُس نے کمال عرقریزی اور بڑے انتظام سے اُس کا بندوبست کیا۔ پہلوداروں نے دروں میں گھس کر اور پہاڑوں پر چڑھ کر اونچے اونچے مقام پیدا کیے جس کی بلندی قلعے کی عمارتوں کو قہر کی نظر سے گھورتی تھی اُن پر ساڑھ ساڑھ منی توپیں چڑھائیں ایک ایک توپ کو دو دو سو بیل اور سات سات آٹھ آٹھ سو کہاروں نے کھینچا اور اُن پہاڑوں کی چوٹیوں اور دھاروں پر مورچوں میں جما دیا کہ جہاں چیونٹی کے پانو پھسلتے تھے ایک ایک توپ پانچ پانچ سات سات من کا گولہ نگلتی تھی جب آگ کے بادل سے لوہا برسنا شروع ہوا۔ پتھروں کے سینے پھٹ گئے اور پہاڑ تہ و بالا۔ قلعہ کے مکانات فرش زمین ہو گئے اور مکان والے بلبلا اٹھے۔ راجہ چتوڑ کا حال دیکھ چکا تھا گھبرا گیا بعض ٹھاکروں اور زمینداروں کو بیچ میں ڈالا۔ دودھ۔ بھوج۔ اپنے دونو بیٹوں کو دربار میں بھیجا اور یہ بھی کہا کہ کوئی امیر آکر مجھے لے جائے تو میں بھی حاضر ہوں۔ بادشاہ نے حسین قلی خاں کو بھیجا۔ راجہ قلعہ سے باہر تک استقبال کو آیا۔ بہت تعظیم و احترام کیا۔ اور قلعہ میں لے جا کر اتارا۔ خان نے راجہ کی بہت تشفی کی اور اپنے ساتھ دربار میں لا کر حضور میں پیش کیا۔ اس نے سونے کی کنجیاں اور گراں بہا پیشکش نذر کیے۔ اور تیسرے دن قلعہ سپرد ہو گیا۔ تاریخ ہوئی۔ فتح متینؔ۔

جو وجہ تسمیہ اوپر لکھی ہے یہ اکبر نامہ سے لی ہے جہانگیر نے ۱۰۲۷ کے واقعات میں اپنی توزک میں لکھا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں۔ رائے تمبر دیو یہاں کا راجہ تھا سلطان نے جب فوج کشی کی تو مدتہائے مدید کے محاصرہ میں بڑی محنتوں اور کوششوں سے فتح پائی تھی میرے والد نے ایک مہینہ ۱۲ دن میں فتح کر لیا۔ میں نے قلعہ مذکور کو دیکھا دو پہاڑ برابر برابر ہیں۔ ایک کا نام رن ہے دوسرے کا تھنبور ہے۔ قلعہ تھنبور پر ہے دونو لفظ ملکر رنتھنبور مشہور ہو گیا اگرچہ قلعہ نہایت مضبوط ہے اور پانی بھی بہت ہے مگر رن بڑی مضبوط فصیل ہے۔ اور حصار کی فتح اسی پر منحصر ہے چنانچہ والد بزرگوار نے فرمایا کہ توپیں رن پر چڑھا دو۔ اور قلعہ کے اندر کی عمارتوں کو سامنے دھر لو۔ پہلی ہی توپ کو آگ دی تو رائے سرجن کی جوکنڈی پر گولہ لگا۔ اسکی ہمت کی بنیاد اکھڑ گئی۔ گھبرا گیا اور قلعہ حوالہ کر دیا۔ قلعہ کی تمام عمارتیں ہندوانی طور پر بنی ہیں اور مکان بے ہوا اور کم فضا بنائے ہیں۔ پسند نہ آئے اور دل نہ لگا جی نہ چاہا کہ ٹھہروں۔ ایک حمام نظر آیا کہ قلعہ کے پاس رستم خاں کے ایک ملازم نے بنایا تھا۔ باغیچہ اور بالاخانہ بھی ہے کہ صحرا کی طرف کھلا ہوا ہے۔ ہوا فضا کے لطف سے خالی نہیں اور تمام قلعہ میں اس سے بہتر جگہ نہیں رستم خاں میرے والد کے امرا میں سے تھا اور بچپن سے بندگی میں تربیت پاکر محرمیت اور قرب خدمت حاصل کی تھی اس اعتماد کے سبب سے قلعہ مذکور اس کے سپرد

کیا تھا۔ قلعہ دیکھ کر میں نے حکم دیا کہ یہاں کے قیدیوں کو حاضر کرو۔ سب کے حال سُنے۔ خونی یا جن کے چھوڑنے میں فتنہ و آشوب کا خطرہ ہو آئے تو قید رکھا۔ باقی سب کو چھوڑ دیا۔ اور ہر ایک کو خرچ و خلعت بھی عنایت کیا۔

سادات بارہہ ضلع مظفر نگر میں کہ دوآبہ گنگ و جمن میں واقع ہے۔ صدہا سال سے ۱۲ گانو مشہور چلے آتے ہیں۔ ان میں سادات کی آبادی ہے۔ یہاں کے سید صحیح النسب اور بڑے بہادر تھے۔ سلاطین سلف کے عہد میں اُنھوں نے بڑے بڑے کارنامے کیئے۔ اکبری فوج میں بھی دلاوری کے چہرہ کو سرخرو کرتے رہے۔ اول ان میں سے سید محمود بارہہ تھے کہ پہلے سکندر سور کے ساتھ قلعہ مانکوٹ میں محصور تھے۔ جب اکبری فوج نے محاصرہ کا دائرہ بہت تنگ کیا تو سردار ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہ مع اپنے ہمراہیوں کے اکبری لشکر میں آئے اور ملازمت بادشاہی اختیار کی۔ ان کی خدمات جانفشاں نے منصب کا درجہ چار ہزاری تک بلند کیا۔ اُن کے بیٹے سید ہاشم بارہہ برابری منصب تک پہنچے تھے کہ شہادت کا منصب نصیب ہوا۔ سید عبدالمطلب۔ سید عبداللہ خاں بارہہ وغیرہ نامی سردار اُسی خاندان کے تھے۔ اور ہر میدان میں ایسے بے جگر ہو کر لڑتے تھے کہ ان کی شجاعت آج تک ضرب المثل چلی آتی ہے۔ مرزا عزیز کوکلتاش کہا کرتے تھے کہ سادات بارہہ دولت اکبری کے فدا ہیں۔

سلیمان کرانی سلیمان کرانی چھوٹا بھائی تھا تاج خاں حاکم بنگالہ کا۔ بنگالہ کی حکومت قدیم الایام سے پٹھانوں کے ہاتھوں میں چلی آتی تھی۔ جو کہنے کو سلطان دہلی کے تابع فرمان تھے لیکن درحقیقت خود مختار۔ بادشاہ اپنے ملک کے تھے اور شاہ دہلی کے مقابلہ میں کبھی کبھی وہ اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوا لیتے تھے۔ جب سلیم شاہ سوری مرگیا اور مبارز خاں امرکا سالہ عادل شاہ بادشاہ ہوا۔ تو کرانی افغانوں کے چند سردار اور بعض امرائے دربار سلطنت کا رنگ بے رنگ دیکھ کر عدلی کے دربار سے الگ ہو گئے تھے۔ وہ بنگالہ کی طرف گئے۔ اور اُدھر کے ملکوں میں جا کر مختلف قطعات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کا سرگروہ تاج خاں تھا کہ جمعیت قوم سے طاقت والا۔ تدبیر میں لیاقت والا۔ اور دین و دیانت کی پابندی سے نظروں میں پورا وزن وقار رکھتا تھا۔ اس کا ذکر نہ کرو کہ سلیم شاہ کے اشارہ سے خواص خاں کو قول و قسم کر کے بلایا اور قتل ہی کر ڈالا۔ کیونکہ سلطنت کے کارخانوں۔ خصوصاً افغانوں میں یہ معمولی باتیں ہیں سبحان اللہ۔ آزاد! وہی خواص خاں۔ جسے شیر شاہ نے بچوں کی طرح پالا! وہ وفاداری اور جاں نثاری کے جوہر سے سلطنت کا بازو اور اپنی آنکھوں کا نور سمجھتا رہا؟ ہاں ہاں۔

بلکہ خاص و عام اس کی دینداری اور خدا ترسی کے لحاظ سے مرنے کے بعد بھی خواص خاں ولی کہتے رہے
غرض عدلی۔ سکندر سور۔ ابراہیم سور وغیرہ ہندوستان میں کٹتے مرتے رہے۔ تاج خاں الگ بنگالہ میں
بیٹھے رہے۔ ان کا اقبال آس پاس کے سرداروں کو آہستہ آہستہ خاک میں دباتا گیا ان کو ابھارتا گیا۔
وہ ان کے علاقوں کو دباتا گیا۔ اور وہ رگڑتے گئے۔ یہاں تک کہ جلال خاں بھی مر گیا اور ملک بنگ بہار پر
قابض ہو گئے۔ چند روز کے بعد تاج تختے پر لیٹے۔ سلیمان کرانی تخت پر بیٹھے۔ سلیمان نام کو چھوٹا بھائی
تھا مگر اوصاف مذکورہ میں اس سے بھی بڑا تھا۔ اس نے کٹک بنارس سے جگنا تھ تک ملک فتح کئے اور
کامروپ سے اڑیسہ تک تمام ملک سلیمان بنا دیا۔ باوجود اس کے بادشاہی کا تاج اپنے نام پر نہ رکھا
حضرت اعلےٰ لکھواتا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا۔ اکبر یا اس کے کسی سردار کا منہ نہ ہوا کہ آنکھ بھر کر
ادھر دیکھ سکے۔ جب خان زمان علی قلی خاں کے زور بازو سے اکبری سلطنت مشرق کی طرف پھیلتی
ہوئی چلی تو ادھر کی تمام سرزمین امرائے افغان سے پٹی پڑی تھی خان زمان چھوٹی موٹی ریاستوں
کو تلوار کی جھاڑو سے صاف کرتا۔ گڈھ مانک پور اور جونپور تک جا پہنچا۔ اور زمانیہ اپنے نام پر آباد
کیا۔ خان زماں ایک مجموعہ مختلف طلسمات کا تھا۔ ملک گیری اور ملک داری کے دو وصفوں کو دونوں
ہاتھوں پر برابر لے کر چلتا تھا۔ اس نے حریف کے زور کو تولا۔ اور وقت کی مصلحتوں کو دیکھا۔ کیونکہ ابراہیم
سور ملک مالوہ سے بھاگ کر اُدھر آیا تھا۔ اور راجہ جگنا تھ کے پاس پناہ لے کر تاک لگاتے بغل میں بیٹھا تھا۔
بڈھے بہادر نے جان دلاور سے بگاڑ کرنا مناسب نہ دیکھا۔ دوستانہ پیام سلام اور خط و کتابت
جاری کر کے موافقت پیدا کی۔ خان زمان کی گرمجوشی اور تپاک عالم دوستی اور ارتباط میں قوت برقی کو
مات کرتی تھی۔ آپ خورد۔ اور بڈھے کو بزرگ قرار دے کر اول تاج خاں کو اور بعد اس کے سلیمان کو عمو بنایا
اور اکبر کا خطبہ اس کی مسجدوں میں پڑھوا کر اطاعت بادشاہی پر مائل کیا۔ اس کے بھی دشمن پرانے
افغان اور قدیمی راجہ ادھر اُدھر لگے ہوئے تھے۔ کہن سال افغان نے بھی غنیمت جانا ہوگا اور سمجھا
ہوگا کہ ایک با اقبال بادشاہ کا سپہدار۔ عالی ہمت فتحیاب۔ ہمسایہ میں آ گیا ہے۔ چھوٹا بن کر ملتا ہے کیا
ضرور ہے کہ خواہ مخواہ محبت کو عداوت اور آرام کو خود تکلیف بناؤں۔ وہ بھی زمانہ سازی کرتا رہا۔ اور وقت کو
دیکھتا رہا۔ چنانچہ جب اکبر نے خان زمان پر فوج کشی کی۔ تو اس نے عمو کی طرف بھی نکاس کا رستہ نکال
رکھا تھا۔ چنانچہ اکبر نے وہاں بھی ایلچی بھیجکر دلاسا کھینچ دی۔ اور سلیمان نے اکبری فرمان کو فرمانبرداری کے
ساتھ آنکھوں پر رکھا۔ بڈھا افغان جیسا دنیاوی معاملات میں تجربہ کار تھا ویسا ہی عاقبت کے لحاظ
سے صاحبدل پرہیزگار تھا۔ ڈیڑھ سو عالم اور مشائخ اس کی صحبت میں ہوتے تھے۔ اس کا قاعدہ

تھا کہ ہمیشہ پچھلی رات سے اُٹھتا تھا۔ نماز تہجد جماعت سے پڑھتا تھا۔ صبح تک قَالَ اللّٰہُ وَ قَالَ الرَّسُولُ سے صحبت نورانی رہتی تھی۔ تفسیر اور حدیث اور ذکر الٰہی تسنتا رہتا تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کر مہمات ملکی۔ سپاہ و رعیت کے مقدمات۔ حساب کتاب لین دین کے کاروبار میں رہتا تھا تقسیم اوقات کا ایسا انتظام تھا کہ ایک ساعت ضائع نہ ہونے دیتا تھا۔

وہ ۹۸۰ھ میں فوت ہوا۔ اُس کے مرتے ہی دیوزاد قابو سے نکلے۔ بایزید بڑا بیٹا مسند نشیں ہوا۔ اور اپنے نام سکہ و خطبہ جاری کیا۔ لودھی خاں۔ گوجر خاں۔ قتلو خاں وغیرہ پرانے پُرانے افغان بڑے بڑے جھتے والے دربار سلیمانی کے رکن تھے۔ اُن کی نیتیں نیک اور رائیں متفق نہ تھیں۔ نوجوان مسند نشیں کا دماغ بہت بلند تھا مگر گھر کے فسادوں کو دبا نہ سکا۔ یہاں تک کہ ۵ - ۶ مہینے کے اندر خود خاک کے نیچے دب گیا۔ اور قتل کا خنجر کون؟ ہانسو چچیرا بھائی کہ داماد بھی تھا۔ ملک کی جیتی جان لودھی خاں تھا اس کشت و خون کے بعد اس کی تجویز سے داؤد چھوٹے بھائی نے بڑے کی جگہ پائی۔ گوجر کہتا تھا کہ تلوار میرا ہی مال ہے۔ اس نے بہار میں بایزید کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ لودھی لشکر لے کر گیا اور کچھ فہمائش کچھ نمائش سے۔ وک تمام کر اسے بھی شامل کر لیا۔ داؤد نے ملک سلیمان پر قناعت نہ کی۔ جوانی کے ارمان نکالنے لگا۔ تاج شاہی سر پر رکھا۔ لقب بادشاہی اختیار کیا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ داؤدی سکہ جاری کیا۔ تاج سر پر آتے ہی غرور کی ہوا دماغ میں بھری۔ صلاحیت کے خیالات اُڑ گئے۔ باپ جن افغانوں سے بھائی بندی اور برادری کا زور ڈال کر جاں نثاری کرواتا تھا یہ ان سے نوکروں کے طور برتنے لگا۔ اللہ اللہ باوجود ان کراماتوں کے ابراہیم سور کو عہد و پیمان کر کے جگنا تھ سے بلایا اور بہشت میں پہنچا دیا ؎

سبحہ در کف۔ توبہ بر لب۔ دل پُر از شوقِ گناہ معصیت را خندہ مے آید بر استغفارِ ما

بادشاہت کی خبر سُن کر اکبر کے سوتے ہوئے وہم جاگ اُٹھے۔ دوسری قباحت کا اثر سب سے زیادہ بُرا ہوا کیونکہ افغان جن کے بھروسہ پر یہ ساری طمطراق تھی۔ سب کے دل ٹوٹ گئے۔ نوجوان لڑکے نے بڑی غلطی یہ کی کہ لودھی کو اپنا کر کے نہ رکھا۔ یہ پرانا پٹھان سلیمان کا وزیر۔ تجربہ کار سپاہی۔ اس ملک کا رکن اعظم تھا۔ قتلو خاں۔ گوجر خاں وغیرہ امرا بھی پُرانے پٹھان تھے۔ مگر نہ اُس درجہ کے۔ وہ ہمیشہ لودھی سے جلتے تھے۔ اب انہوں نے موقع پا کر بڈھے کو لڑکے سے لڑوا دیا اور لڑایا کس بات پر؟ دس ہاتھیوں پر۔ بڈھے نے بھی ذرا پرواہ نہ کی۔ داؤد حاجی پور پٹنہ میں سلطنت کا طنبور بجاتا تھا۔ لودھی قلعہ رہتاس پر بیٹھا تھا اور اپنے نقارے پر چوٹیں لگاتا تھا ہمسایہ کے حق سے بڈھے نے بڈھے

سے راہ کر رکھی تھی۔ چنانچہ اب لودھی نے منعم خاں سے مدد مانگی انہوں نے فوراً چند امرا کے ساتھ فوج بھیجی۔ ایک دن داؤد بعدیہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلا۔ لودھی دس ہزار سوار لے کر چڑھ آیا۔ داؤد شہر میں بھاگ گیا لیکن سمجھا کہ معاملہ قابل تدارک کے ہے۔ لودھی کے ساتھ جو لوگ تھے اکثر سلیمان کے نمکخوار تھے داؤد نے آہستہ آہستہ انہیں توڑنا شروع کیا۔ لودھی کو بھی خالی نہ چھوڑا۔ مکر و دغا کے گلاب چھڑک کر بہت سے پیام سلام بھیجے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ میں تمہیں حضرت اعلے کی جگہ سمجھتا ہوں۔ اگر خاندان کا پاس کر کے بعض اہل خاندان کی تم نے رفاقت کی اور مجھ سے خفا ہوتے تو مجھے شکایت نہیں ہیں تمہیں ہر بات میں پشت پناہ جانتا ہوں۔ اب کہ بادشاہی لشکر سر پر آگیا ہے جسطرح ہمیشہ قوم کی خیراندیشی پر کمربستہ رہے ہو۔ اُسی جوش سے آؤ۔ لشکر توپخانہ خزانہ جو درکار ہو حاضر ہے ✽

دیکھو بڈھا وزیر لڑکے سے دغا کھاتا ہے۔ لودھی جانے کو تیار ہوا۔ اور پیغام سلام ہونے لگے کالو اس کے وکیل نے سمجھایا کہ دغا ہے۔ جانا مناسب نہیں۔ اس کی موت گریبان کھینچے لئے جاتی تھی۔ ہرگز نہ مانا اور گیا۔ کالو نہ گیا (آخر جانے والا اور نہ جانے والا دونو جان سے گئے۔ پیچھے کالو بھی مارا گیا۔ بات رہ گئی۔ اور بیوفائی کا داغ رہ گیا) اگرچہ اس وقت لودھی کے سر پر موت تلوار کھینچے کھڑی تھی مگر اُس نیک نیت نے اس عالم میں بھی نصیحت سے دریغ نہ رکھی۔ اور کہا کہ خیر دشمنوں کی فتنہ سازی کا افسوں اس وقت چل گیا۔ مگر صاحبزادے بہت پچھتائے گا اور کچھ فائدہ نہ پائے گا۔ اب بھی جو مصلحت ہے وہ کہے دیتا ہوں عمل کریگا تو فتح تیری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جو صلح دو لاکھ دے کر میری ہی معرفت ہوئی ہے اس پر نہ بھولنا۔ مغلیہ کی بلا اتنی بات میں سر سے نہ ٹلیگی۔ اگر بگاڑنی ہے۔ تو پیشدستی کر اور فوراً جا پڑ و ع کہ ہرگز منت پیشیں را بدل نیست۔ نوجوان نے جانا کہ بڈھا بنی بات کو بگاڑتا ہے۔ منعم خاں کی صلح پر کہ چار دن کی چاندنی تھی دھوکہ کھایا۔ اپنے پانو میں کلہاڑی ماری اور پرانے دولت خواہ کو مروا ڈالا۔ افغانوں کے لشکر میں اس واردات سے ہل چل پڑ گئی اور ایسا تفرقہ پڑا کہ اگر اس وقت منعم خاں فقط اپنی رکابی فوج لیکر جا پڑتا تو بنگالہ کا معاملہ طے تھا۔ مگر احتیاط نے اس کی باگ پکڑ لی اور جو کام اس وقت ایک حملے میں ہوتا تھا۔ بہت سی مہموں کے بعد ہوا ✽

سلیمہ سلطان بیگم

گلرخ بیگم کی صاحبزادی تھیں جو کہ ہمایوں کی حقیقی بہن تھیں۔ باپ خواجگان کا شغر سے ایک خاندانی شخص تھے سلیمہ سلطان رشتہ سے ہمایوں کی بھانجی ہوئیں۔ یہ پاک دامن بی بی محلوں کی بیٹھنے والی تھیں مگر نام اُن کا امرائے نیک مرد کی ذیل

میں لکھا نظر آتا ہے۔ اور اوصاف و خوبی کی برکت دیکھ کر تاریخوں اور تذکروں نے ان کے نام پر تعریفوں کے سہرے باندھے ہیں وہ نیک طینتی کے ساتھ خوش بیان۔ شیریں کلام۔ حاضر جواب۔ باسلیقہ۔ صاحب تدبیر تھیں۔ جب خاندان سلطنت میں کوئی معاملہ اُلجھتا تھا تو اُن کی دانائی اور عقل کی رسائی۔ اور حسن تقریر کی وکالت سے سلجھتا تھا۔ پڑھی لکھی تھیں اور کتاب کے مطالعہ کا شوق رکھتی تھیں۔ سخن فہم و سخن شناس تھیں اور اہل سخن کی قدردانی کرتی تھیں۔

ہمایوں نے مرنے سے چند روز پہلے انہیں بیرم خاں خانخاناں کے ساتھ نامزد کیا تھا۔ اکبر نے ۹۶۵ھ میں اُس تجویز کی تعمیل کی۔ یہ شادی بھی تعجب سے خالی نہیں کیونکہ جہانگیر نے تزک کے ۱۰۲۱ھ میں جہاں اُن کے مرنے کا حال لکھا ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ ۹۶۱ھ میں پیدا ہوئیں شادی کے وقت تقریباً ۵ برس کی ہونگی۔ اس صورت میں سوا اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ غرض اس وصلت سے فقط خان خاناں کا اعزاز اور سلطنت سے رشتہ مضبوط کرنا تھا۔

(ملا صاحب ۹۸۲ھ کے حالات میں لکھتے ہیں) اس برس سلیمہ سلطان بیگم کہ پہلے بیرم خاں کے حبالۂ نکاح میں تھیں اور پھر حرم شاہنشاہی میں داخل ہو گئیں سفر حجاز پر متوجہ ہوئیں آزاد حیران تھا کہ اس طرز کا سبب کیا ہوگا۔ پھر حضرت ہی کی کتاب میں ۹۹۹ھ کے حالات میں دیکھا کہ نامہ خرد افزا (سنگھاسن بتیسی) آپ کی ترجمہ کی ہوئی کتاب تھی۔ وہ بادشاہی کتب خانہ سے گم ہو گئی۔ بیگم کو اُس کی سیر کا شوق ہوا۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا۔ بادشاہ نے کیفیت حال سن کر کہ ملا عبدالقادر سے اصل مسودہ لے لو۔ یہ وطن گئے ہوئے تھے اور رخصت پر بھی ۵ مہینے زیادہ گذر گئے تھے۔ بیگم نے بار بار عرض کی۔ بادشاہ ان کی عدول حکمیوں اور غیر حاضری وغیرہ سے پہلے ہی تنگ تھے۔ اب تنگ تر ہوئے۔ آدمی بھیجے کہ جا کر گرفتار کر لاؤ۔ اس عتاب و خطاب نے بہت طول کھینچا۔ حضرت نے اس کا غصہ بیگم پر نکالا اور ناحق اس کے دامن پاک پر ایک چھینٹا مارا۔

۹۸۳ھ میں یہ اور گلبدن بیگم اکبر کی پھوپھی گجرات کے رستہ حج کو گئیں۔ چار حج متواتر کئے۔ آتے ہوئے جہاز تباہی میں آگیا۔ ایک برس اہل جہاز کو عدن میں ٹھیرنا پڑا۔ ۹۹۰ھ میں داخل ہندوستان ہوئیں۔ آخر عہد جہانگیری ۱۰۲۱ھ میں ۶۰ برس کی عمر میں قضا کی۔ جہانگیر نے بھی ان کی لیاقت اور عفت و عصمت کی تعریف کر کے مرنے کا افسوس کیا ہے۔ سلیمہ سلطان بیگم۔ طبع سلیم کی لہر میں کبھی شعر بھی کہہ دیتی تھیں۔ ایک فرد مشہور ہے ؎

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام	مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

گلبدن بیگم بھی لکھنے پڑھنے کی استعداد رکھتی تھیں۔ چنانچہ ہمایوں نامہ انکا حسن قابلیت کی یادگار ہے ✦

سلطان مظفر گجراتی فرمانروائے گجرات واحمد آباد

خاندان کا کچھ پتہ نہیں۔ اسی سے پہچان لو۔ کہ اصل نام اُس کا نتو تھا۔ چنانچہ ابوالفضل مظفر نہیں لکھتے تھے۔ اکثر نتو ہی لکھتے تھے۔ جب سلطان محمود گجراتی لاولد مرگیا۔ تو نمک حلال اعتماد خاں نے آقا کا نام ونشان قائم رکھنے کو دربار میں اُسے پیش کیا اور امرا کے سامنے قرآن اُٹھا کر کہا کہ ایک دن سلطان جنت آشیان نے ایک حرم پر خفا ہوکر قتل کا حکم فرمایا۔ اور اسے میرے سپرد کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسے ۵ مہینے کا حمل ہے۔ اپنے گھر میں مخفی رکھا۔ اُس سے یہ بچہ پیدا ہوا۔ اسے خداوندزادہ سمجھکر پرورش کرتا رہا۔ اب تخت وتاج بے صاحب ہے اس لئے مناسب ہے۔ کہ صاحب تخت وتاج قرار دیا جائے۔ سب نے قبول کیا چنانچہ نتو مظفر شاہ بنکر تخت پر بیٹھے اور اعتماد خاں کا خطاب مسند عالی قرار پایا۔ مگر حال یہ تھا۔ کہ اعتماد خاں جب چاہتا دربار کرتا تھا۔ مظفر کو لاکر بٹھاتا تھا۔ آپ بیٹھتا تھا۔ اور جو جو مقدمے مناسب سمجھتا تھا پیش کرکے حکم دیتا تھا۔ مظفر کی زبان سے کہوا دیتا تھا ✦

رفتہ رفتہ امرا میں بگاڑ ہوا۔ اور اسی بگاڑ میں سلطنت بگڑنی شروع ہوئی۔ اعتماد خاں نے دیکھا کہ میں اپنے بڑے بڑے سرداروں کی گردنوں کو دبا نہ سکونگا۔ اکبر کو خفیہ عرضیاں لکھنی شروع کیں ادھر سے فوج کشی ہوئی اور خونریز لڑائیوں کے بعد مظفر ایک کھیت میں چھپا ہوا پکڑا گیا ملک مذکور ۹۸۰ھ میں دولت اکبری سے وابستہ ہوگیا اکبر نے مظفر کو اوّل سلطانی اعزاز سے رکھا تھا۔ پھر اعتماد خاں مذکور کی زبانی معلوم ہوا کہ حقیقت میں بھلیان کا لڑکا ہے۔ جو کچھ کیا مصلحت وقت کے لئے کیا تھا۔ بادشاہ نے خواصوں اور خدمتگاروں میں ڈال دیا اور اس کی عزت اور عظمت کا وزن ۳۰ روپے قرار دیا۔ چندروز کرم علی داروغہ خوشبوخانہ کے سپرد رہا۔ پھر منعم خاں خان خاناں کا زندانی رہا۔ وہ مرگیا تو حضور میں آیا۔ خواجہ شاہ منصور کی نگرانی میں رہا ۹۹۳ھ جلوس میں بھاگ کر اپنے ملک میں پہنچا۔ قطب الدین خاں پیچھے فوج لے کر پہنچے۔ یہ بھاگ کر لونیہ کاٹھی کی پناہ میں بیٹھ گیا بے سروسامان تھا۔ اور پرشکستہ گذران کرتا تھا۔ اس لئے اُمرا نے کچھ خیال نہ کیا یہاں تک کہ بغاوت کرکے پھر صاحب فوج وعلم ہوگیا ✦

سورت کے قلعہ کی فتح

بندر سورت کا قلعہ سب سے کڈھب تھا کہ سمندر کے کنارہ پر تھا

ل جن جہازوں کے لئے اب بندر بمبئی لنگر گاہ ہے۔ اس عہد میں سورت بندر تھا۔

اور نہایت محکم اور استوار تھا۔ سبب یہ تھا۔ کہ فرنگیان پرتگال جہازوں پر آتے تھے رعایا کو لوٹتے تھے مارتے تھے۔ پکڑ کر لے جاتے تھے اور ملک کو برباد کرتے تھے۔ خداوندخاں دکنی نے اُن کے روکنے کے لئے یہ قلعہ بنوانا شروع کیا۔ اہل فرنگ نے انواع و اقسام کی تدبیروں سے تعمیر کو روکا۔ جہازوں سے آگ برسائی۔ مگر معمار اپنا کام کئے گئے۔ خدا جانے کیسے ریاضی دان مہندس تھے۔ فصیل کی بنیاد کو پانی تک پہنچا دیا۔ اور ۲۰ گز عرض کی خندق بھی اُتنی ہی گہری کھود دی دو طرف خشکی تھی۔ ادھر کی دیوار میں پتھروں کو چونہ اور ماش[1] سے وصل کر کے چنائی کی۔ اور لوہے کے دو رُخے کانٹے اُس میں جڑے۔ قلعہ کی دیوار کا ۱۵ گز عرض ۲۰ گز بلندی۔ دیوار دو تہی تھی۔ کل کا عرض ۳۵ گز چار دیواری کا عرض ۱۵ گز۔ بلندی عرض خندق کے برابر ۲۰ گز۔ درزوں میں سیسہ پلایا تھا فصیل کنگرہ اور سنگ انداز سے ایسی بلند اور خوشنما کہ جدھر دیکھو آنکھیں وہیں لگی رہ جائیں۔ دریا کی طرف ہر برج پر چوکھنڈیاں بنا کر ان میں کھڑکیاں رکھی تھیں۔ یہ پرتگال کی عمارت کا انداز تھا اور وہیں کا ایجاد تھا۔ فرنگیوں نے اس کی تعمیر کو بہت روکا۔ جب جنگ وجدل سے کچھ نہ کر سکے۔ تو آخرکار صلح پر آئے۔ اور بہت سا روپیہ دینا کیا۔ کہ اس چوکھنڈی کو گرا دو خداوندخان کی عالی ہمتی نے بھی کسی بات پر گردن نہ جھکائی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں قلعہ بنا کر کھڑا کر دیا ۹۷۵ھ میں اکبر آپ بڑودہ میں ٹھیرا۔ اور راجہ ٹوڈرمل کو بھیجا کہ آمد ورفت کے رستہ اور نشیب و فراز کے انداز جا کر دیکھو۔ یہ گئے۔ اور دیکھ بھال کر ایک ہفتہ کے بعد واپس آئے۔ اور عرض کیا۔ کہ کچھ بات نہیں اِن ان ترکیبوں سے قلعہ آسان قبضہ میں آسکتا ہے۔ اکبر لشکر لیکر گیا۔ ٹوڈرمل کا انتظام تھا۔ کوس بھر پر ڈیرے ڈال دئے۔ اور قلعہ کو اس طرح گھیر لیا۔ جیسے چاند کے گرد کنڈل۔ مورچال امرا کو تقسیم کر دئے قلعہ والے تنگ ہو گئے۔ دو مہینے میں بڑے بڑے دمدمہ بلند کر کے اُونچے اُونچے ٹیلے بنا دئے۔ اُن پر توپخانے چڑھاتے۔ توپچی توپیں مارتے تھے۔ سپاہی بندوقیں گولیاں برساتے تھے مورچے ایسے پاس پہنچا دئے۔ کہ بندوق کی گولی قلعہ کے اندر جاتی تھی۔ کوئی سر اونچا نہ کر سکتا تھا قلعہ کے پچھواڑے تالاب تھا۔ اُدھر سراپردۂ اکبری قائم تھا۔ مورچے بڑھاتے بڑھاتے اُس پر قبضہ کر کے پانی بھی بند کر دیا۔ آخر اہل قلعہ عاجز آ گئے۔ اطاعت قبول کی۔ اور قلعہ حوالہ کر دیا ✦

دوسرے دن بادشاہ قلعہ میں گئے۔ سب جگہ پھر کر دیکھا۔ ٹوٹ پھوٹ کر مسمار ہو گیا تھا۔ مرمت کا حکم دیا۔ ایک برج کے نیچے کئی عظیم الشان توپیں نظر آئیں۔ یہ سلیمانی توپیں کہلاتی تھیں معلوم ہوا کہ

---

[1] ماش کا آٹا چونے میں ملا دیتے ہیں۔ سوکھ کر بہت مضبوط ہو جاتا ہے ✦

سلیمان سلطان خلیفہ روم نے چاہا تھا کہ ہندوستان کی بندر گاہیں جو فرنگیوں کی لنگر گاہیں ہو گئی ہیں
اُن پر فوج کشی کرے چنانچہ بہت بڑا لشکر اور قلعہ گیری کے سامان دریا کے رستہ روانہ کیے تھے مگر حکام
گجرات کی بدمددی اور رسد کی کوتاہی سے مہم خراب ہو گئی توپیں اور اسباب مذکور جو ادھر آ گئے تھے وہ
پڑے رہے۔ اکبر نے دیکھ کر حکم دیا کہ اکبر آباد میں ہی رہیں۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ایک ایک توپ صنعت
اور سنگاری کا کارنامہ تھی ۔

سید محمد جونپوری جونپور کے رہنے والے تھے حنفی مذہب تھا جب بادشاہوں کی اولاد
بدلیتی اور ملک کی بدانتظامی طول پکڑتی ہے۔ تو خودسری کے مادے مختلف
رنگوں سے ظہور کرتے ہیں۔ ان بزرگ کو آواز آئی کہ اَنْتَ الْمَھْدِی (تو ہے مہدی) اس بنیاد
پر مہدویت کا دعوےٰ کیا۔ انہوں نے جونپور کی تباہی کو آثار قیامت سمجھا۔ اور جب کوئی نئی بات ظہور
میں آتی کہتے کہ یہی قرب قیامت کی نشانی ہے۔ بہت سے واقف طلب اور اکثر جاہل کہ ضعیف
الاعتقاد ہوتے ہیں اُن کے گرد جمع ہو گئے لیکن مخالف بھی بہت ہو گئے چنانچہ جونپور سے تنگ ہو کر گجرات
میں گئے۔ سلطان محمد گجراتی انکا معتقد ہو گیا۔ لوگوں کی مخالفت سے وہاں بھی نہ ٹھیر سکے۔ عربستان
میں سیاحی کی۔ حج کیا۔ مدینہ میں جا کر زیارت کی۔ ایران میں آ کر توقف کیا۔ لوگوں کا ہجوم ان کے
گرد دیکھ کر شاہ اسمٰعیل نے نہایت سختی سے روکا باوجودیکہ فوراً ایران سے چلے آئے مگر مدت تک
وہاں انکا اثر باقی رہا۔ فرہ میں آ کر ۹۱۱ھ میں مر گئے اور قبر کی پرستش ہونے لگی ۔

شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں کہ سید محمد جونپوری پور سید بڈھ اویسی است از فراوان روحانیہ
فیض برگرفتہ۔ و بصوری و معنوی علم چہرہ وست۔ از شوریدگی دعوےٰ مہدویت کرد و بسیاری مردم برو گرویدند
و بسا خارق ازو برگزارند و سرچشمۂ مہدویت او از جونپور بگجرات شد۔ و سلطان محمود کلان بہ نیایش برخاست و
از تنگ حوصلگی زمانیان بہ ہند نیارست بود۔ و بازش ایران زمین آمیزد۔ و در فرہ رخت گذشت و ہمانجا آسودہ۔ اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد جونپوری ضرور ایک زبردست عالم تھا جو علوم ظاہری و باطنی دونوں میں دستگاہ کامل
رکھتا تھا اور نہ صرف عامی اور جہلا نے اُسکو مہدی برحق تسلیم کیا بلکہ خود سلطان محمود بادشاہ گجرات اس
کے حلقۂ عقیدتمنداں میں داخل ہوا۔ سید محمد کمالات علمی کیساتھ اپنے میں کمال اُولوالعزمی بھی رکھتا تھا
جو اُسکو ہند سے ایران زمین میں لیگیا۔ سید محمد کے عقاید کا مفصل حال نہیں کھلتا شیخ عبدالحق صاحب محدث
دہلوی جو اُسکے ہمعصر تھے ایک مکتوب میں اتنا لکھتے ہیں۔ کہ در اعتقاد سید محمد جونپوری ہر کمالیکہ محمد رسول اللہ داشتا
در سید محمد مہدی نیز بود فرق ہمیں است کہ آنجا باصالت بود و اینجا بہ تبعیت در تبعیت رسول بجائے رسیدہ کہ ہمچو او شد مقتد

سیّد محمد میر عدل

ملا صاحب لکھتے ہیں امروہہ علاقہ سنبھل کے رہنے والے تھے دانشمند عابد۔ زاہد۔ متقی۔ پرہیزگار۔ اوائل حال میں وہ اور میرے والد سنبھل اور بداؤں کے بزرگوں اور اُستادوں کی خدمت میں تحصیل علم کرتے تھے۔ میر سید جلال کے درس میں بھی ساتھ تھے۔ میر سید جلال حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے میر سید محمد صاحب تحصیل علوم کے بعد درس و افادہ میں مصروف ہوئے اکبر کے دربار میں میر عدل ہوئے اس منصب جلیل القدر کو نہایت عدالت انصاف راستی اور امانت کے ساتھ سرانجام کیا اور حق ہے۔ کہ یہ جامہ اُنہی کے قد پر ٹھیک آیا تھا۔ پھر کسی کو میر عدل کہنا عقل کو رسوا کرنا ہے بڑے بڑے قاضی مفتی بلکہ قاضی القضاۃ اُن کی بزرگی اور سن و سال کو دیکھ کر ادب سے اپنی اپنی جگہ رُک جاتے تھے۔

حاجی ابراہیم سرہندی کی سرزنش بار فضیحت کی اور کوئی دم نہ مار سکا۔ اُس کی مختصر حکایت یہ ہے کہ حاجی موصوف نے ایک موقع پر اکبر کا شوق دیکھ کر فتویٰ لکھا۔ کہ سُرخ و زعفرانی لباس پہننا جائز ہے اور سند میں کوئی ضعیف نحیف غیر مشہور سی حدیث بھی لکھ دی ملّا نے پیچھے پلٹے۔ اور جلسۂ علماء میں وہ فتویٰ پیش ہوا۔ اُنھوں نے حدیث مذکور کی صحت میں سند دوڑائی میر عدل موصوف اُن پر بہت جھنجلائے اور عین مجلس بادشاہی میں۔ بدبخت ملعون اور دشنامی الفاظ اُن کے حق میں صرف کر کے عصا مارنے کو اُٹھایا۔ یہ اُٹھ کر بھاگ گئے۔ ٹھیرتے تو ضرور مار کھاتے اور انکا وقار و ادب اس قدر دلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ کہ سب بجا و بر حق سمجھتے۔

ملا صاحب کہتے ہیں تعلق موروثی اور شفقت قدیمی کے سبب سے میرے حال پر بہت توجہ کرتے تھے میری ابتدائے ملازمت میں دربار کی رسائی اور بادشاہ کی شفقت دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ زمین جاگیر کے درپے نہ ہو۔ صدور کی خواریاں اُٹھانی پڑینگی۔ یہ لوگ مصر غرور کے فرعون ہیں جو ہو سو ہو داغ بادشاہی اختیار کر رہا ہے میں نے اُن کی نصیحت گوش قبول سے نہ سُنی۔ ناچار جو دیکھنا سو دیکھا اور اُٹھانا سو اُٹھایا۔

۹۹۵ھ میں بادشاہ نے میر موصوف کو بھکر بھیجدیا کہ ملک کا کنارہ ہے۔ اور قندھار بلکہ ایران سے پہلو لگتا ہے۔ بہانہ یہ کیا کہ آپ کے سوا دوسرے پر اطمینان نہیں انہوں نے جا کر کچھ رسائی کچھ چڑھائی کے ساتھ سیوی کو فتح بھی کر لیا ریہی جواب سنی مشہور ہے) سید صاحب کی رخصت کے وقت جس حالت کے ساتھ ملا صاحب سے گفتگو ہوئی۔ آہ۔ آہ۔ مایوسی چپ کھڑی دیکھتی تھی حسرت منہ تکتی تھی۔ احد بولا نہ جاتا تھا ۹۸۶ھ میں وہیں دنیا سے انتقال کیا سید فاضل اور اللہ بالفضل تاریخیں

لکھی ہیں۔ مُلا صاحب کی ساری تاریخ میں ایک یہ اور پانچ چھ شخص شاہد اور ہونگے کہ اُن کے نشتر قلم سے صاف نکل گئے۔ فرشتہ بھی آیا ہوگا۔ تو ایک نہ ایک کو چاٹ ہی کھا گیا ہوگا۔

سیّد رفیع الدّین صفوی

سیدرفیع الدین صفوی مُلا صاحب کہتے ہیں کہ …لح میں انکا خاندان بہت معظم اور محترم تھا۔ اور یہ علما اور محدثین عالی رُتبہ میں شمار ہوتے تھے سکندر لودھی کے زمانہ میں جب آگرہ میں آکر آباد ہوئے یہاں بھی سب تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور سکندر لودھی نے حضرت مقدسہ خطاب دیا تھا باوجودیکہ دربار کی نوکری کبھی نہیں کی بلکہ کمال عظمت اور آسودہ حالی میں زندگی بسر کرتے رہتے۔ تمام اہل اسلام کے دلوں پر انکا نیک اثر تھا اور بادشاہ وقت بھی اُن سے فتویٰ طلب کرتے تھے اور اکثر صلاح و اصلاح سلطنت میں انکی طرف رجوع کرتے تھے۔ بابر کے عہد میں بالکل نیا زمانہ تھا دربار میں دخل رکھتے تھے۔ اور بعض علاقوں کے فرمانروا اُن کی معرفت ملازمت میں آئے ہمایوں نے جب شیر شاہ کے اقبال سے دوسرا صدمہ اُٹھایا اور آگرہ میں آیا تو انکے مکان پر گیا۔ بھائیوں کی بدنفسی اور شیر شاہ کی سرشوری اور اپنی صورت حال بیان کرکے صلاح طلب کی۔ اُنہوں نے کہا جب یگانہ و بیگانہ کا یہ حال ہے۔ تو بہتر ہے۔ کہ آپ چندروز کے لئے اس ملک سے نکل جائیں اور منتظر وقت رہیں کہ قدرت الٰہی سے کیا ظہور ہوتا ہے۔ وہ فوراً آگرے سے لاہور اور یہاں سے سندھ پہنچا۔ اور جو ہوا سو معلوم ہے شیر شاہ کو بھی جب کوئی ایسی صورت پیش آئی ہے۔ کہ اُس میں رعایا کی ناراضی کا خیال ہوا ہے۔ تو ان سے فتویٰ لیا۔ اور جو کرنا ہوا سو کر گذرا +

جب شیر شاہ جودھپور کی مہم فتح کرکے پھرا تو سیّد موصوف نے کہا کہ میرے آبا و اجداد سے تصانیف معتبر یادگار ہیں۔ سب صاحب فضل و کمال تھے۔ اور حرمین شریفین میں درس کہتے تھے سارے خاندان میں۔ میں نا قابل ہوا کہ ہندوستان کے زر و مال کا شہرہ سنکر لالچ کا مارا آوارہ ہوا۔ اور بے علم رہ گیا۔ اب مجھے رخصت فرمایئے۔ کہ اخیر عمر ہے۔ جاؤں اور بزرگوں کی قبر پر چراغ جلاؤں شیر شاہ نے پھر روک لیا۔ اور جو عذر تھا۔ وہ بیان کیا +

سلیم شاہ کے دربار میں جب شیخ علائی کا معرکہ ہوا اور تمام علما طلب ہوئے۔ اس میں سیّد موصوف بھی شامل تھے۔ شیخ نے سیّد سے بھی ایک جھپٹ کی۔ آگرہ میں پہنچتے ہی مبارک کا اور انکا تعارف ہوا۔ اور اکثر نازک حالتوں میں یہ شیخ کے مددگار رہے شیخ ابوالفضل انکا حال اس طرح لکھتے ہیں۔ میر موصوف حسنی حسینی سیّد ہے وطن قریہ آنک متعلق شیراز تھا مگر مدت تک عرب میں سیاحی کی

رہے ہند میں آتے تھے۔ تو آگرہ میں رہتے تھے۔ عرب میں جاتے تھے تو مکہ اور مدینہ میں سفر کرتے رہتے تھے۔ اور درس و تدریس سے لوگوں کو فیض پہنچاتے تھے۔ معقول و منقول اپنے بزرگوں سے حاصل کئے تھے۔ مگر مولانا جلال الدین دوانی کی شاگردی سے نئی روشنی پائی تھی شیخ سخاوی کہ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تھے۔ سید موصوف نے علوم نقلی اُن سے حاصل کئے تھے۔ چنانچہ شیخ نے اپنی مصنفات میں بھی اُن کا کچھ کچھ حال لکھا ہے ✦

شاہ عارف حسینی ایک بزرگ صاحب ریاضت تھے۔ پابند تقوئ و طہارت شاہ اسمٰعیل صفوی کے پوتوں میں تھے ہمیشہ جو کی روٹی سے افطار کرتے تھے۔ جلی ہوئی اور اُس میں جنگل کی گھاس ملی ہوئی ایسی کڑوی ہوتی تھی۔ کہ کوئی نہ کھا سکے۔ احکام شریعت پر مدام مستقل اور عامل تھے۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ کہ شیخ ابوالفضل کے مکان پر قلعہ میں پانچوں وقت اذان کہکر نماز پڑھتے تھے۔ اور کسی کی پروا نہ کرتے تھے (یہ زمانہ وہ تھا کہ دربار سے نماز روزہ رخصت ہو چکا تھا) لوگ اُن کی بہت سی کرامتیں خلاف قیاس بیان کرتے ہیں مثلاً ایک کاغذ کا گول گول ٹکڑا کر جلتی انگیٹھی میں ڈال دیتے تھے اور اشرفیاں نکال کر بانٹنی شروع کرتے تھے جتنے لوگ مجلس میں ہوں سب کو پہنچا دیتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اُنہیں حجرہ میں بند کر کے مقفل کر دیا۔ اس میں سے صاف نکل گئے ایک دفعہ گجرات دکن سے پھر کر لاہور میں آئے گجرات کے گرمی کے میوے جاڑے میں اور جاڑے کے گرمی میں منگائے۔ اور لاہور میں لوگوں کو کھلائے یہاں کے علما جن کے سرگروہ مخدوم صاحب تھے۔ اُن سے بھی اڑ گئے۔ صورت مسئلہ کی یہ قائم کی۔ کہ آخر یہ میوے لوگوں کے باغوں کے ہیں اور انہوں نے بے اجازت تصرف کیا ہے۔ اُنکا کھانا حرام ہے۔ آخر بچارے تنگ ہو کر کشمیر چلے گئے ✦

علی خاں حاکم کشمیر اُنکا معتقد ہو گیا۔ اور کمال خلوص سے بیٹی نذر دی لیکن صفوی خاندان کے شہزادے تھے لوگوں نے اُس کے دل میں شبہ ڈالا کہ ان کے دل میں ملک گیری کے ارادے موج مار رہے ہیں۔ اُس نے بیٹی کا مہر مانگا۔ یہ نہ دے سکے اسلئے طلاق لے لی اور چند آدمی لگائے کہ جب میں اُن کی ملاقات کو جاؤں تو تم معتقد بن کر جاؤ۔ اور سید کو بہشت میں پہنچا دو۔ انہیں بھی معلوم ہو گیا چنانچہ ہو کر بسر صحرا نکلے بے خبر ناحق نشناسوں نے زبانی آزار دینے شروع کئے آخر اس کے علاقہ سے نکلکر بھاگ گئے تبت میں پہنچے۔ علی رائے حاکم تبت نے بہ کمال اعتقاد اپنی بہن سے شادی کر دی وہاں بھی عجیب و غریب معاملات ظاہر ہوتے تھے۔ مثلاً درخت کو ہلاتے تھے اُسمیں سے روپے اشرفیاں جھڑتی تھیں۔ لوگوں کو بانٹ دیتے تھے۔ غرض گجرات کشمیر تبت میں اُنکے عجیب و غریب تصرف مشہور ہیں جہاں جاتے

تھے۔ لوگ آکر گھیر لیتے تھے۔ ساری دنیا کو خدا بھی خوش نہیں رکھ سکتا کچھ معتقد ہوتے تھے۔ کچھ دشمن ہو جاتے تھے۔ وہ بیزار ہو کر وہاں سے نکل کر جاتے تھے۔ غرض شہر شہر جائے چھپتے تھے ✦

۹۹۷ھ میں جو پہلی دفعہ بادشاہ کشمیر گئے۔ تو مل بائے مذکور کو ایلچی بھیجا تھا۔ اور کہلا بھیجا تھا کہ شاہ موصوف کو بھیج دینا وہ نہ بھیجتا تھا مگر یہ اپنے دل کے بادشاہ تھے۔ خدا جانے کس وقت نکل کھڑے ہوئے اور کہاں سے کہاں ہو کر کشمیر میں آن پہنچے۔ سواری میں سرراہ آمنا سامنا ہوا۔ بادشاہ نے انہیں تعظیم سے اُتروایا اور امرائے سے کہدیا کہ نظر میں رکھو۔ جانے نہ پائیں ✦

کبھی کبھی بادشاہ سونے کے پیالہ میں خوشبو یاں ڈلتے اور پھول اور عطریات تحفہ کے طور پر لیکر جاتے تھے۔ کئی دفعہ کہا کہ کچھ روپیہ کچھ جاگیر فرمائش کیجیئے۔ شاہ جواب میں کہتے تھے روپے اپنے احدیوں کو دو کہ بدحال ہیں ✦

ایک دن بادشاہ نے کہا۔ شاہ یا تو ہم جیسے ہو جاؤ یا ہم کو آپ جیسا کر لو۔ جواب دیا۔ ہم نامراد تو تم جیسے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ تم چاہو تو آؤ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور ہم جیسے ہو جاؤ ✦

ملا صاحب لکھتے ہیں۔ شاہ عارف اُن دنوں ابوالفضل کی نگرانی میں تھے اور صحن دولت خانہ میں ایک طرف اُترے ہوئے تھے میں قلیج خاں کے ساتھ گیا کوٹھے پر جالیاں تھیں اُنہی میں سے ہم نے دیکھا نیچے اپنے حجرہ کے آگے بیٹھے تھے منہ پر نقاب پڑی تھی اور کچھ لکھتے تھے (شاید قلیج خاں نے کچھ کہا ہوگا) ایک شخص اُن کے پاس تھا اُس سے بولے این قلیج خاں بود کہ میگفت منم قلیج بندہ و خدمتگارِ شما شاید وہ قدیم سے نقاب ڈالے رہتے ہونگے دنیا کے لوگ اس میں بھی بدگمانی کی دُمیں لگاتے تھے۔ کہتے تھے یہ اس لئے ہے کہ ایک جگہ سے چلے جائیں تو دوسری جگہ پہچانے نہ جائیں۔ افسوس اِسی نقاب کی بدولت حکیم ابوالفتح[1] کی جان گئی۔ اُنکی ایسی کرامتیں لوگ حدِ تعداد و شمار سے زیادہ بیان کرتے ہیں ✦

۱۰۰۶ھ کے اخیر میں شیخ ابوالفضل کہتے ہیں۔ میر عارف اردبیلی نے آگرہ میں آکر نقد زندگی سپرد کردی۔ سام میرزائی صفوی کے بیٹے تھے۔ صاحب ریاضت تھے اور دنیا سے الگ۔ لوگ اُن کی عجیب و غریب کرامتیں بیان کرتے ہیں ✦

شاہ ابوالمعالی

ایک خوبصورت اور رو بدیدار نوجوان خواجگانِ کاشغر کے گھرانے سے تھا۔ مگر نہایت بلند نظر۔ بلکہ مغرور۔ بد دماغ۔ بدنیت۔ جب ہمایوں ایران سے پھر کر قندھار پر آیا۔ اُنہی دنوں یہ بھی ملازمت میں پہنچا۔ حسن خداداد کی برکت سے بادشاہ بھی اُس پر شفقت کرنے لگے یہ شفقت ایسی بڑھی کہ حد سے بڑھ گئی۔ فرزندی کا خطاب عنایت فرمایا۔ بلکہ خود اس کی بے اعتدالیوں

[1] دیکھو صفحہ ۶۶۱

کو برداشت کرتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی تھی۔ کہ بیرم خاں جیسے عالی رتبہ امیر نے ایک قصیدہ ۴۲ شعر کا بادشاہ کی تعریف میں کہا۔ عظیم۔ قدیم۔ وغیرہ بنائے قافیہ تھی۔ (۱) ہر مصرع اوّل کے پہلے حرف کو لیں تو حضرت ہمایوں بادشاہ غازی وغیرہ وغیرہ عبارت حاصل ہوتی ہے (۲) ہر مصرع کے اخیر حرفوں کو جمع کریں تو مرزا شاہ ابوالمعالی وغیرہ (۳) ہر دوسرے مصرعہ کے اوائل حرف کو لیں تو شاہزادہ جلال الدین محمد اکبر۔ (۴) ہر دوسرے مصرع کے مصرع اخیر سے ۴۲ میم نکلتے ہیں۔ جس کے اعداد ۹۶۰ ہوئے۔ یہ تصنیف قصیدہ کی تاریخ ہے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ جب بیرم خاں قندھار کا حاکم تھا ہمایوں بھی وہیں تھے۔ شاہ طہماسپ کے میر شکار کا باپ شیر علی بیگ کسی سبب سے ہمایوں کے پاس آیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمایوں کو اُس کی کس قدر خاطر ہو گی۔ شاہ ابوالمعالی اُسے دیکھ دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ "من ایں رافضیک را روزے خواہم کشت"۔ ہمایوں اُسے ہنسی اور ناز دلبرانہ سمجھتا تھا۔ آخر ایک دن شراب پی اور نشہ کی حالت میں تیغ بیباقی سے اُس کا کام تمام کیا۔ وارث حضور میں دادخواہ آئے۔ شاہ صاحب بلائے گئے۔ گوری گوری رنگت۔ مخمل رومی پر سیہ چپۂ اور سرخ چھپانی اطلس کا استر ایک زرق برق کا عالم۔ وہی برق دم نیمچہ جس سے اُس بے گناہ کا خون بہایا تھا۔ چپۂ کے نیچے کمر میں تھا۔ آنکھوں میں رات بھر کا خمار بھرا۔ عجب آن و انداز سے لڑکھڑاتے ہوئے مجلس میں آئے قتل کا نام آیا تو صاف انکار۔ بیرم خاں کو سب خبر تھی۔ یہ شعر پڑھا ؎

نشان شب رواں دارد سر زلف پریشانش دلیل روشن ست اینک چراغ زیر دامانش

بادشاہ عالم حسن و جمال میں محو ہو گئے۔ اور ہنس پڑے۔ بیگناہ کا خون باتوں میں اُڑ گیا کہ قاتل معلوم نہیں ؛

معتمد خاں اقبال نامہ میں لکھتے ہیں۔ کہ خاندان بابری کے اندرونی و بیرونی اسرار اور معاملات کی معلومات جو مرزا عزیز کوکہ کو تھی۔ کسی کو نہ تھی۔ شاہ کی گرفتاری کا راز جو خاص اُن کی زبانی مجھے معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ جن دنوں اکبر تخت نشیں ہوا۔ ایک سپاہی زادہ جیسا صورت میں حسین اور صاحب جمال تھا ویسا ہی عادات و اطوار میں نیک خصائل تھا۔ شاہ ابوالمعالی نے اُسے نوکر رکھا تھا۔ بیرم خاں خزانہ تدبیر کی ایک بے بہا رقم تھے۔ جب شاہ کے باب میں کوئی تدبیر پیش نہ گئی۔ تو آدمی لگا کر اندر اندر اس لڑکے کو وہاں سے اُبھارا اور کئی دن غائب رکھا۔ شاہ بے قرار ہو گئے ؛

دو تین دن کے بعد بیرم خاں نے پیغام بھیجا۔ کہ تمہارے خدمتگار کو بڑی تلاش سے پیدا کیا ہے مگر ڈر کے مارے تمہارے پاس آنے کو راضی نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیرائی ہے کہ تم حضور میں آؤ۔ حضور خود اُس کی سفارش

فرمائیں۔ اور تمہارے سپرد کریں۔ شاہ سنتے ہی خوش ہو گئے۔ سب شرطیں اور عہد و پیمان بھول گئے۔
غرض جب آئے تو جس طرح قرار پایا تھا۔ دست راست پر بیٹھنے کو جگہ قرار پائی۔ بیرم خاں نے اِدھر اُدھر کی چند باتیں پیش کر کے اُس سپاہی زادہ کو بلالیا۔ بادشاہ نے اُس کی خطا معاف فرمائی۔ اور شاہ سے کہا کہ اب اس سے خفا نہ رہو۔ شاہ نے کہا۔ نہیں خفگی کا کیا محل ہے۔ اکبر نے کہا۔ اچھا جسطرح پہلے تمہاری تلوار اُس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اُسی طرح اب بھی رہا کرے۔ شاہ تو دل دیئے بیٹھے تھے۔ جو نوکر تلوار لئے تھا۔ اُسے اشارہ کیا کہ اسے دیدو۔ اُس نے دیدی (ملا صاحب کیا مزے سے لکھتے ہیں)۔
اس عرصہ میں دستر خوان بچھا۔ میر نے سیلابچی پر ہاتھ بڑھائے کہ دھوئیں نوک خاں فوجین افسر توپخانہ اُن دنوں خوب بُھسنڈ بنا ہوا تھا (اب وہ بھی مکڑی کا تار ہو گیا ہے) اُسے گھات میں لگا رکھا تھا بے خبر پیچھے سے آیا اور شاہ کی مشکیں باندھ لیں۔ اُمرا نے اُسی وقت چاہا تھا کہ نیست و نابود کر دیں۔ بادشاہ نے اجازت نہ دی کہ تخت پر بیٹھتے ہی ایک بیگناہ کا خون کرنا حیف کی بات ہے۔ لاہور میں بھیج دیا۔ پہلوان گل گز کوتوال نے ادب کیا کہ چوکی پہرے کی مضبوطی نہ رکھی۔ یہ نکل بھاگے۔ وہ بچارا غیرت کا مارا اپنی جان کھو بیٹھا۔ یہ بھاگ کر کمال خاں گکھڑ کے پاس گئے (رہتاس اور پنڈی وغیرہ کی حکومت اُسوقت آدم خاں اُس کے چچا کے پاس تھی) انہوں نے کمال خاں کو ایسا اکسایا کہ اُس نے ایک لشکر تیار کیا اور کشمیر پر چڑھ گئے۔ راجوڑی پر بہت سے بھوکے کنگال اور بھی ساتھ ہوئے۔ مگر انجام یہ ہوا کہ شکست کھا کر بھاگے۔ اور برسالپور میں آئے یہاں اُس وقت بہادر خان حاکم تھے۔ نوک نام ایک شخص پہلے شاہ کا نوکر تھا۔ اب بہادر خاں کا ملازم تھا۔ اُس کے پاس آ کر پناہ لی۔ اُس نے خوف خدا کر کے جگہ دی۔ ایک شب اُس نے اپنی بی بی کو لڑ کر خوب مارا۔ اُسے یہ راز معلوم تھا۔ صبح ہوتے ہی بہادر خاں کے پاس گئی اور کہا کہ میرے خاوند نے شاہ کو چھپا رکھا ہے اور بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے جلد بندوبست کیجئے۔ بہادر خاں نے فوراً گرفتار کیا۔ اور باندھ کر بیرم خاں کے پاس بھیج دیا۔
بیرم خاں نے ولی بیگ ترکمان کے حوالے کیا کہ اِس بلا کو مکہ بھیجدو۔ خدا کے گھر کے سوا کوئی زمین اِس بوجھ کو نہیں اُٹھا سکتی۔ اُس نے گجرات کو بھیجدیا۔ کہ وہاں سے مکہ کو روانہ کر دیں۔ شاہ نے وہاں ایک خون کیا۔ اور بھاگ کر خان زمان کے پاس پہنچے۔ بیرم خاں کو بھی خبر لگی انہوں نے خان زمان کو فرمان لکھا کہ آگرہ بھیجدو۔ جب یہاں آئے تو خان خاناں کے کاروبار برہم ہونے لگے تھے۔ اِس خیال سے کہ بادشاہ کو پھر پرانا کا شبہ قوی نہ ہو۔ انہیں بیانہ کے قلعہ میں بھیجدیا۔ چند روز وہاں رہے۔ جب بیرم خاں خود حج کو چلے تو انہیں بھی ساتھ لے چلے۔ یہ پھر رستہ میں سے بھاگے اور چاہا کہ بادشاہ کے سامنے ہو کر کچھ راہ

نکالیں۔ چنانچہ سر سواری آکر ملے۔ غرور تو دم کے ساتھ تھا۔ سوار ہی سلام کیا۔ بادشاہ کو بُرا معلوم ہوا۔ اشارہ کیا قید۔ پھر مکہ بھیج دیا۔ چند روز نہ گذرے تھے کہ پھر آن موجود ہوئے اور خانہ خدا سے درگاہ اکبری کی طرف متوجہ ہوئے۔

حاجی کہ ز خانہ خدا بر گشتہ ✦ ما رسیت کہ رفت واژدہا بر گشتہ
زنہار فریب چرب گزش نخوری ✦ کیں خانہ خراب از خدا بر گشتہ

یہاں مرزا شرف الدین حسین اکبر کے بہنوئی بھی مشایخ ماوراء النہر کے خاندان سے تھے۔ ان دنوں باغی ہو کر نواح گجرات میں لوٹتے مارتے پھرتے تھے جالور میں دو ہمدردوں کی ملاقات ہوئی۔ اُس نے شاہ سے کہا کہ حسین علی خاں فوج لیکر مجھ پر آتا ہے۔ تم اُسے مارتے ہوئے کابل کو نکل جاؤ اور حکیم مرزا کو لاؤ میں اتنے دنوں یہاں ہاتھ پاؤں مارتا رہونگا۔ انہوں نے جمعیت بہم پہنچائی اور لوٹ مار کے گھوڑے دوڑاتے چلے۔ حسین علی خاں کے لشکر سے اسمٰعیل علی خاں وغیرہ یلغار کر کے اُن کے پیچھے دوڑے۔ اور یہ بھاگتے بھاگتے نارنول تک آئے۔ شاہ نے یہاں خزانہ شاہی لوٹ کر ہمراہیوں کو بانٹا پیچھے پیچھے وہ بھی آئے۔ لڑائی ہوئی شاہ کے بھائی کا نام خانہ زاد تھا شالوندان کہلاتا تھا۔ وہ قید ہوا۔ شاہ سمجھے کہ ان ارمان کے رفیقوں کو ہند کی آب و ہوا موافق نہیں۔ یہی غنیمت معلوم ہوا کہ سر سلامت لیکر ہندوستان سے کابل کو نکل جاتے۔ پنجاب کے گوشہ کا رستہ لیا۔ راہ میں دو منصب دار ملے کہ امرائے شاہی کی جمعیت سے الگ ہو گئے تھے۔ شاہ نے اُنکے نوکروں سے مل کر بے گناہ بیچاروں کو قتل کیا اور لوٹ مار کر آگے نکل گیا ۹۷۱ھ ۱۵۶۴ء ۹ سنہ جلوس۔

ماہ چوچک بیگم حکیم مرزا کی ماں کو ایک عرضی لکھی۔ اُس میں ہمایوں بادشاہ کے ساتھ اپنا بہت سا تعلق اور راز و نیاز جتایا۔ بیگم کی خدمت میں نہایت خلوص و اعتقاد ظاہر کیا۔ عرضی کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ؎

ما بریں در نہ پے عزت و جاہ آمدہ ایم ✦ از بد حادثہ اینجا بہ پناہ آمدہ ایم

بیگم نے جواب مناسب لکھا۔ اور یہ شعر بھی درج کیا ؎

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست ✦ کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

مرزا وہاں پہنچے۔ ناقص العقل بیگم نے بہت عزت سے رکھا۔ شاہ بد طینت افسون و افسانہ کے ساتھ اول اول ایسی چالیں چلا جس سے بیگم کو یقین ہو گیا کہ یہ وزیر بے نظیر ہاتھ آیا۔ اب یا تو بھولے پن سے یا اس سبب سے کہ اُس کا بھی جی چاہتا تھا کہ دربار اکبری کے سامنے میرے بیٹے کا بھی دربار لگا ہو۔ شاہ کو ولاور لوہالی ہمت سمجھ کر اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ اکبر سے اجازت بھی نہ لی۔ گھر کا مالک داماد کو کر دیا۔

وہ بلند نظر، بد دماغ اس نعمت کو غنیمت نہ سمجھا۔ حکیم مرزا کو بچہ پایا۔ کئی بد رلیوں کو ساتھ لیکر دربار پر قبضہ کرنے لگا۔ اہل دربار ناراض ہوئے۔ لو ، بیگم کو بھی ناگوار ہونے لگا۔ شاہ سمجھا کہ مرزا تو لڑکا ہے جس طرح چاہیں گے پرچا

لینگے بیگم بس کا کانٹا ہے اسے نکال ڈالیں تو قصہ پاک ہو جائے۔ یہ بد اعمال ایک دن تلوار لیکر محل میں گھس گیا بیگم کو بیگناہ مار ڈالا۔ محمد حکیم مرزا بھاگ کر کہیں چھپ گیا امرائے دربار خون پر دعویدار کھڑے ہو گئے۔ شاہ کا زور غالب تھا۔ بہت آدمی مارے گئے قلعہ میں خونریز معرکہ ہوا بعض سردار بھاگ کر بدخشاں پہنچے۔ مرزا حکیم نے بھی عرضی لکھی۔ اور مرزا سلیمان کو نہایت التجا کے ساتھ بلایا ❊

سلیمان ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے۔ شاہ ادھر سے فوج لیکر مقابل ہوئے۔ اب غوربند کے کنارہ میدان جنگ ہوا۔ آپ حکیم مرزا کو لیکر قلب میں کھڑے ہوئے۔ لڑائی شروع ہوئی۔ تیر اور تلواریں دونو طرف سے آگ اچھالنے لگیں۔ دیکھا کہ بدخشیوں کے داہنے نے کابلیوں کے بائیں کو دبایا۔ شاہ نے فوراً مرزا حکیم کو قلب میں چھوڑا۔ اور آپ بائیں کی مدد کو چلے۔ حکیم مرزا نے فرصت کو غنیمت سمجھا۔ ہمراہیوں سمیت نالہ اُتر کر مرزا سلیمان کے ساتھ جا شامل ہوا ❊

یہ حال دیکھکر لشکر درہم برہم ہو گیا۔ شاہ سراسیمہ اور بدحواس ہو کر میدان سے بھاگ گئے۔ سلیمان کے دیو پیچھے دوڑے۔ اور چاریکار کے مقام سے گرفتار کر کے تخت کے سامنے حاضر کیا۔ اُس نے اُسی طرح طوق و زنجیر پہنے۔ حکیم مرزا کے خیمہ میں بھیجدیا۔ مرزا نے فوراً پھانسی دیکر زندگی کے پھندے سے چھڑا دیا ❊

شجاعت اَور شے ہے۔ شورپشتی کچھ اَور چیز ہے۔ شاہ پہلی وصف سے محروم تھے پچھلی صفت کے بادشاہ تھے قتل کے وقت بزرگی سیادت اور برکت خاندان کو شفاعت کیلئے لائے۔ اور رو کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر عجز و انکسار کئے۔ مگر کیا ہوتا تھا ع تجھے لازم تھا اپنا کام کرنا سوچ کر پہلے ❊

غرض ۹۷۱ھ میں پھانسی چڑھ کر اپنے بار گراں سے زمین کو ہلکا کیا ❊

شرف الدین حسین مرزا

مرزا کئی واسطہ سے خواجہ عبداللہ احرار کے پوتے تھے جو کہ سمرقند بخارا کے اہل اللہ میں خواجگان کہلاتے تھے ان کے باپ خواجہ معین الدین ابن خواجہ خداوند ابن خواجہ یحییٰ ابن خواجہ احرار تھے۔ خواجہ معین الدین نے کاشغر سے آکر ایران و خراسان میں تحصیل علوم کو تکمیل تک پہنچایا تھا۔ مرزا شرف الدین کا بیٹا ہندوستان میں آکر ابتدائے عہد اکبری میں حاضر دربار ہوا اور شجاعت اور کارگذاری کے جوہر دکھا کر درجۂ امارت کو پہنچا۔ چونکہ برکت خاندانی کا اعزاز حسن خدمات کی تائید کرتا تھا۔ اس لئے قدم بہ قدم عزت زیادہ ہوتی گئی۔ اور ۹۷۰ھ میں شرف بہت بڑھ گیا بخشی بیگم اکبر کی بہن سے شادی ہوئی۔ ناگور اور متعلقات ناگور ان کی جاگیر میں تھے۔ بادشاہ نے امیر الامرا کا رتبہ دیکر۔ اُن کے انتظام کیلئے رخصت کر دیا۔ دماغ پہلے بھی حد اعتدال سے بلند تھا۔ اب تو سلطنت کے داماد ہو گئے۔ وہاں حکومت کو اجمیر تک پھیلایا مگر خود بھی پھیلے ❊

باپ نے کاشغر میں سنا کہ اقبال نے بیٹے کی اس طرح یاوری کی ہے تو اوّل حج کے ارادہ سے ادھر آئے یہاں بڑی عزت و عظمت ہوئی۔ امرا پیشوائی کو گئے۔ بادشاہ خود بھی شہر آگرہ کے باہر تک استقبال کو نکلے تعظیم و تکریم کی صحبتوں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ اسی اثنا میں خدا جانے کیا معاملہ ہوا جسے تمام مورخ اس اجمال کے معمّے میں لکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ نفاق اُسکی طبیعت میں داخل تھا۔ کسی بات پر بدگمان ہو کر بھاگا اور اپنی جاگیر پر جا کر باغی ہو گیا۔ بادشاہ نے حسین قلی بیگ کو خطاب خانی دیکر حسین قلی خاں بنایا۔ اور مرزا کی جاگیر اس کے نام کر کے روانہ کیا۔ مرزا نے قلعہ اجمیر اپنے مصاحب معتبر ترخان دیوانہ کے حوالہ کیا۔ اور دکن کی طرف بڑھا۔ جالور میں شاہ ابوالمعالی سے ملے کہ خانہ خدا سے پھر کر آئے تھے۔ ایک نے دوسرے کی تقویت کر کے دل بڑھایا اور ایک اور ایک گیارہ ہو گئے (دیکھو[1] شاہ ابوالمعالی کا حال) یہی مرزا اشرف الدین ہیں جن کے غلام فولاد نے دلی میں مدرسہ کے کوٹھے پر سے اکبر کے تیر مارا تھا۔ شاہ ابوالمعالی کابل کو نکل گئے۔ اور مرزا قید ہو گئے ۔

جبکہ بعض اُمرائے ترک و مغول بنگالہ میں باغی ہو گئے اور علما و مشائخ نے اُنہیں فتووں کے کارتوس بنا کر دیئے۔ تو بغاوت نے طول کھینچا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ معصوم خاں نے مظفر خاں سپہ سالار کو ٹانڈہ میں قتل کیا۔ اس بغاوت سے چند روز پہلے بادشاہ نے مرزا کو مقید بنگالہ میں بھیجدیا تھا۔ اور مظفر خاں کو لکھدیا تھا کہ اگر اس کے خیالات درست ہو گئے ہوں تو اسی ملک میں جاگیر دیدو۔ ورنہ حج کو روانہ کردو۔ مظفر خاں نے دیکھا تو جس طرح تلوار کا زخم اُس کے دم کے ساتھ ہے اور ہیرا اپنی بدی پر اسیطرح ثابت قدم ہے۔ اُس نے قید رکھا کہ موسم حج آئے تو روانہ کردے۔ مرزا باغیوں سے سازش کر کے ایک دن بھاگا قلعہ والوں کو خبر ہو گئی۔ انہوں نے ادھر سے تیر مارے وہ زخمی ہوا مگر باغیوں میں جا ملا۔ اس بغاوت سے چند روز پہلے مرزا شرف الدین قاسم علیخاں لعل کے پاس کانسی میں قید تھا۔ اہل بغاوت کو ایک ایسے شخص کا ساتھ رکھنا واجب ہوتا ہے جسے خاندان سلطنت سے رشتہ تعلق ہو۔ اس میں راز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حق کا سلطنت سے دعویدار ہے اور ہم اُس کا حق دلواتے ہیں۔ بادشاہ کے باغی نہیں ہیں۔ اور ایسی صورت میں جہلا اور عوام الناس بھی جلد اور بکثرت فراہم ہو جاتے ہیں۔ غرض معصوم خاں نے انہیں قید سے نکالا اور اپنا سر لشکر قرار دیا۔ راجہ ٹوڈرمل کو قلعہ منگیر میں گھیر لیا اور ۳۰ ہزار فوج باغی لیکر گرم ہو گئے۔ قلعہ میں رسد بند ہو گئی اور بے سامانی نے سخت تکلیف دی۔ اب اقبال اکبری کی شعبدہ بازی دیکھو مرزا۔ اور خان۔ دونو فساد و نفاق کے رستم تھے۔ مگر یہاں معصوم خان کی پہلوانی غالب آئی۔ اس نے ۹۸۸ھ میں مرزا کو مروا ڈالا۔ کمبخت مرزا کے پاس ایک ہندوستانی لڑکا نوکر تھا۔ اس سے بہت محبت تھی۔

[1] دیکھو صفحہ ۷۶۰

اور نہایت اعتبار تھا۔ اور مرزا پوستی بھی تھے۔ وہی لڑکا پوست ملکر پلایا کرتا تھا۔ معصوم خاں نے اُسے بہت سے روپیوں کا لالچ دیکر پرچالیا۔ پوست میں زہر دے دیا۔ مرزا ایسے پینک میں گئے کہ قبر میں جا پڑے ؎

شمس الدین محمدؐ اتکہ خان خانِ اعظم

اگلے زمانہ کے لوگوں کو خیال تھا کہ بچہ کے مزاج اور اخلاق میں دودھ کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے بادشاہ و امرا بچوں کے دودھ پلانے کو شریف خاندان کی بی بی تلاش کرتے تھے۔ بادشاہ عالم طفولیت میں جس کی بی بی کا دودھ پیتا تھا۔ وہ اتکہ خاں خطاب پاتا تھا۔ آتا ترکی میں باپ کو کہتے ہیں جو بی بی دودھ پلاتی تھی۔ وہ انگہ کہلاتی تھی۔ آینہ ترکی میں ما کو کہتے ہیں۔ جو بچہ اُن دنوں میں اُس کا دودھ پیتا تھا۔ وہ شہزادہ کا کوکہ کہلاتا تھا۔ اور بڑا ہوکر کوکلتاش خاں ہو جاتا تھا۔ اُس کی اور اُس کے رشتہ داروں کی بڑی عزت اور خاطر ہوتی تھی۔ شیخ ابوالفضل کہتے ہیں کہ اکبر نے سب سے پہلے دودھ تو کی بیگموں کا پیا مگر بھاول انکہ نے پہلے دودھ پلایا۔ وہ جوگا بر ہار کی بیٹی تھی۔ جب آئی تو بابر نے ہمایوں کے محل میں بھیجدی۔ چنانچہ اُس کی خوش روئی نے خوشخوئی کی رفاقت سے ہمایوں کو لبھالیا۔ مریم مکانی آئیں تو سورج کی روشنی نے ستارہ کو مدھم کیا۔ اور بادشاہ نے اُسے جلال کوکہ کو دیدیا۔ پھر بھی وہ محل میں رہتی تھی۔ اوّل اُس نے دُودھ پلایا۔ پھر موقع موقع پر اوروں نے۔ مگر صحیح روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے مادر مکرمہ ہی کے دُودھ پینے پر رغبت فرمائی تھی۔ آزاد۔ اگلے وقتوں کے لوگ اصلیت اشیا اور تاثیر لودیات سے بالکل بے خبر تھے۔ اس لئے خواہ مخواہ کے تکلف گلے باندھتے تھے۔ عقل ہوتی تو گدھی کا دودھ پلاتے دانایاں فرنگ نے فرمایا ہے کہ اس دودھ سے بہتر بچہ کیلئے کوئی دودھ نہیں ؎

خانِ اعظم ایک سیدھے سادہ سید بامروت۔ صاف دل آدمی تھے۔ خاندان کا ذکر آئے تو کہدو کہ وہ آپ ہی اپنے خاندان کے بانی تھے جب ہمایوں نے شیر شاہ سے دوسری شکست کھائی تو تمام لشکر پریشان ہوگیا یہاں تک کہ شکست نصیب بادشاہ کو اس حال میں بیگمات کا ہوش بھی نہ رہا۔ ننگ و ناموس غنیم کے ہاتھ پڑا۔ ہر شخص جان لیکر بھاگا۔ ہمایوں دریا کے کنارے پر آکر حیران کھڑا دیکھتا تھا کہ ایک ہاتھی ہاتھ آگیا۔ اُس پر چڑھا فیلبان سے کہا کہ ہاتھی دریا میں ڈال دے۔ معلوم ہوا کہ اُس کی نیت میں فساد ہے۔ چاہتا ہے کہ شیر شاہ کے پاس لے جاکر انعام حاصل کرے۔ ایک خواجہ سرا بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے پیچھے سے تلوار ماری کہ فیلبان کا سر اُڑ گیا۔ اور ہاتھی کو دریا میں ڈال دیا۔ غرض ڈوبتے اُبھرتے پار پہنچے۔ اُتر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کڑاڑہ بہت بلند ہے۔ خدائے کریم کارساز ہے۔ اوپر ایک سپاہی نظر آیا کہ کچھ رسی اور کچھ دستار کچھ پٹکا ٹبکر لٹکا رہا ہے۔ اسے پکڑ کر اوپر چڑھے۔ اور خدا کا شکر کیا۔ اُس کا نام اور مقام پوچھا۔

عرض کی کہ غزنی کی پیدائش اور میرزا کامران کا نوکر ہوں۔ بادشاہ نے عنایتوں کا امیدوار کیا۔ اُسوقت تو بدحواسی کا عالم تھا۔ دو نو اپنی اپنی راہ۔ کہیں کے کہیں چلے گئے۔ لاہور پہنچے تو وہ بھی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہمایوں نے ملازمانِ شاہی میں داخل کر کے ہمرکاب لے لیا۔ اور اُسوقت سے اخیر تک جاں نثاری میں رہا۔ خوش نصیبی سے اُس نے اکبر کی پرورش اور بی بی نے دایگی کی عظمت پائی۔ آخر خدمت یہ تھی جو بیرم خاں کی مہم پر بن آئی۔ اُسکی بدولت خان اعظم اتکہ خان ہو گئے۔ لیکن ماہم کی مہتاب میں اُن کا ستارہ نہ چمکا۔ بلکہ جانفشانی کا صلہ بھی پورا نہ ملا۔ اُس وقت اُنھوں نے اکبر کو ایک عرضی لکھی ہے۔ جس سے اکثر رمزیں مہم خانخاناں کی کھلتی ہیں۔ اور اُن کی بے اختیاری اور محرومی اور دل شکستگی۔ اور ماہم کی سینہ زوری بھی عیاں ہے۔ ترجمہ عرضداشت کمترین بندگان دولتخواہ شمس الدین اتکہ دعا اور بندگی کے بعد عرض کرتا ہے کہ جب اس دولتخواہ نے دلّی میں آستانہ بوسی کی اور حضور نے عنایت اور التفات بے دریغ مبذول فرما کر بیرم خاں کے عَلَم و نقارہ و طوفان طوغ سے سرفرازی دی اور حکومت و محافظت سرکار پنجاب وغیرہ کی عنایت فرمائی تو اس دولتخواہ کو بھی واجب ہوا کہ اِس عنایت و سرفرازی کے لایق خدمت بجالائے تاکہ جب حضور اِس فدائی کے حق میں کچھ پرورش فرمائیں تو اور دولتخواہوں کو اِس رعایت پر کچھ بولنے کی گنجائش نہ ہو*

خبر پہنچی کہ فتنہ انگیز حرام خور بیرم خاں کو خطوط اور خبریں بھیج بھیجکر فیروزپور میں لے آئے۔ حکم ہوا کہ ارکان دولت جمع ہوں۔ اور جو صلاح دولت ہو مصلحت قرار دے کر عرض کریں۔ اُسی مجلس میں بیرم خاں کا وہ خط پڑھا گیا جو اُس نے درویش محمد عالم تھبندہ کو لکھا تھا۔ اُس میں درج تھا کہ میں غلام و بندہ آں حضرت کا ہوں۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ اپنا انتقام آں حضرت کے وکلاء سے لے لوں۔ سب دولتخواہ اُس کے دفع کی تدبیر کے لیے جو جو خیال میں آتا تھا کہتے تھے۔ چونکہ وہی دن ہوتے تھے۔ کہ اسباب حشمت خانِ مذکور کا دولتخواہ کو عنایت ہوا تھا۔ دل نے کہا کہ کوئی لایق خدمت کروں ارکان دولت کے سامنے کہ خورد و کلاں حاضر تھے میں بڑھ کر بولا۔ اور قول دیگر کہا کہ بیرم خاں کی مہم خدا کی عنایت اور حضور کی توجہ سے میرے ذمہ ہو۔ جہاں سامنا ہو جائے۔ اگر ملوں تو فاحشہ اور لونڈیوں سے کم ہوں*

ارکانِ دولت نے کہا کہ بیرم خاں کی مہم بڑی مہم ہے۔ جب تک بندگانِ حضور خود متوجہ نہ ہوں۔ کام کا بننا محال ہے۔ جب ارکان دولت نے یہ مصلحت دیکھی۔ میں زیادہ نہ بولا۔ بزرگوں کی خدمت میں عرض کی کہ فلاں فلاں امرا ملتان و لاہور کو رخصت ہوتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بندہ اُن کی خدمت

بن قراولی کے طور پر آگے جائے؛ اور جو حال ہو روز عرض کرتا رہے۔ بندہ دولت خواہ کی عرض قبول ہوئی۔ حکم ہوا کہ امرائے عظام کے ساتھ بیرم خاں کی طرف روانہ ہو۔ اور ہزار آدمی کی کمک کا بھی حکم ہوا۔ رخصت ہو کر چار پانچ دن نواح رہتک اور پرگنہ جہم میں ٹھیرا۔ کمک کا نشان بھی نظر آیا۔ اُمرا کو یادداشت لکھی تو ہزار آدمی سے پچاس آدمی کی کمک پہنچی۔ اکثر پرانے سپاہی بھی ساتھ تھے سپاہ گری کا معاملہ ہے ہر ایک کو چند در چند اندیشے گذرتے تھے۔ کیچڑ پانی برسات کا موسم بھی تھا۔ چند روز روانگی میں توقف ہوا۔ (معلوم ہوتا ہے کہ حضور میں عرض معروض ماہم ہی کی معرفت ہوتی تھی۔ دراہل دربار اُسے والدہ کہا کرتے تھے) لوگوں نے والدہ کے ذریعہ اس سے حضور میں ہزاروں باتیں بنائیں۔ اور کہا کہ اتکہ خان دو کوس روز چلتا ہے۔ ڈر کے مارے آگے نہیں بڑھتا۔ اس سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس کی جاگیر اور وظیفہ موقوف کرنا چاہئے۔ والدہ نے اُن کے کہنے پر عمل کیا۔ ملاحظہ خاطر۔ اور بیس برس کے حق خدمت کا خیال نہ کیا جو کہنے والوں نے کہا، اوہد والدہ نے عرض کیا۔ وہ حضرت پر واضح ہے۔

فرزند عزیز محمد کو لوگوں کی باتوں اور اشاروں کی تاب نہ ہوئی۔ دولت خواہ کو لکھا کہ اے دادا! لوگوں کی باتوں نے ہلاک کر ڈالا۔ جو ہماری قسمت میں ہونا ہے سو ہوگا۔ جس حال میں ہو بیرم خاں کی مہم پر چلے جاؤ۔ دولت خواہ مطلب سمجھ گیا۔ مدد الہٰی پر توکل اور دولت بادشاہی پر تکیہ کر کے بیرم خاں کی طرف چلا اب کہ بیرم خاں کی مہم حضرت کی بدولت سرانجام کی۔ اور نوکر اور سلطان جو اُس کے ساتھ تھے قتل کئے اور رشتہ دار اُس کے قید کر کے درگاہ میں لیا۔ حَبَّذا آبا اللہ اگر معاملات الٹ جاتے تو حضور کو معلوم ہے کہ کیا نوبت پہنچتی۔ مہم کی حقیقت بیرم خان نے خود عرض کی ہی ہوگی۔ فتح کے بعد جو لوگ دولت خواہوں میں سے معرکہ میں موجود نہ تھے اور ہر ایک کی خدمت حضور کو معلوم ہے۔ انہوں نے کیسی عنایت اور مرحمت بادشاہی سے سرفرازی پائی ہے۔ اور جو دولت خواہ موجود تھے ایک کو بھی نہیں پوچھا۔ جان محمد بہسودی قلعہ جالندھر میں بیٹھا رہا۔ اس کیلئے خانی کا خطاب دیا۔ اور بہتیروں نے خدمتوں سے دہ چند سرفرازیاں پائیں۔ اور وظیفے اور انعام لئے۔

جب سب کے بعد اس دولت خواہ۔ اور فرزند یوسف محمد کی نوبت آئی کہ ایسے معرکہ عظیم میں تلوار ماری تھی تو بڑی مہربانی یہی تھی۔ جو پہلے دن فرمائی تھی۔ یعنی اتکہ کا نام فرمان فتح پر لکھو۔ عالم پناہا! دولت خواہ بیگم ماہم سے امید مادری رکھتا ہے غیبت نہیں کرتا۔ خدا قبول کرے۔ دولت خواہ نے آں حضرت کی دولت خواہی میں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر ۱۲ برس کے بیٹے کو ساتھ لے کر بیرم خان

اور اُس کے دس بیس اقرباؤں اور ملازموں اور سلطانوں کے منہ پر تلواریں ماریں۔ اور امرائے عظام اپنے اپنے پرگنوں پر بیٹھے رہتے۔ مدد کو نہ آئے۔ اور جو ساتھ تھے اُنہوں نے وہ حرکتیں کیں۔ بیرم خان نے عرض کیا ہوگا۔ کہ اس غلام پیر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بیرم خاں نے جو سپاہی حضور کی ملازمت میں جاسوسی کے لئے چھوڑے تھے۔ وہ حضور کی بدولت خطاب پا کر دو کروڑ اور تین کروڑ کا وظیفہ لیں اور یوسف محمد خاں کہ بیرم خاں۔ اور ہیبت خاں۔ اور اس کے سلطانوں کے مقابل ہو کر تلوار مارے اسے آپ خانی کا خطاب دیں۔ بزرگانِ دربار نے ایک کروڑ کے وظیفہ کا پروانہ جاری کیا۔ وہ بھی ذاتی ہے تنخواہ نہیں۔ بندہ کو خانِ اعظم خطاب دیا۔ ایک کروڑ انعام فرمایا۔ جس میں کُل ایک لاکھ فیروز پور پر ملا عالم پناہا! عمر گذر گئی کہ تمام آدمی اس دولت خواہ کے بھائیوں اور بیٹوں سمیت امیدواری پر خدمت کر رہے ہیں۔ اب آں حضرت کی بدولت ہر شخص خانی۔ اور سلطانی کے خطاب سے سرفراز ہو گیا۔ جب علم و نقارہ و طومان و طوغ بیرم خاں کا اس کمینہ کو (مجکو) عنایت فرمایا۔ اور فتح کے بعد جامۂ واقو اور خلعتِ فتاحی اور اسباب حشمت بھی عنایت کر کے رتبہ بڑھایا۔ امیدوار ہے کہ اُس کا منصب بھی اس کمینے سے (مجھ سے) متعلق ہو۔

اس عرضی پر انہیں وکیل مطلق کا منصب ملا۔ اور کاروبار سلطنت سپرد ہوئے۔ ماہم اور ماہم والے جو اندر باہر ملک کے مالک بن رہے تھے۔ اُن کے اختیارات میں فرق آیا۔ اُن کے حوصلے حد سے بڑھ گئے تھے۔ ادھم خاں کا بیٹا شہاب خاں جو رنگ نکال کر شہاب الدین احمد خاں ہو گئے وہ بھی اناوالوں میں چلتی تلوار تھے۔ انہوں نے اُنہیں اور بھی بھڑکایا۔ ۱۲ رمضان ۹۶۹ھ کو میر اتکہ منعم خاں شہاب خاں وغیرہ چند امرا۔ دیوانِ عام کے کسی مکان میں بیٹھے مہماتِ سلطنت میں گفتگو کر رہے تھے۔ میر اتکہ تلاوت قرآن میں مصروف تھے کہ ادھم خاں تقرب۔ بلکہ قرابت کے گھمنڈ میں بھرا رشک و حسد کی آگ میں بھڑکا۔ چند اوباشوں کو ساتھ لئے آیا۔ سب تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بدعا بزرگ رمضان کا روزہ منہ میں۔ کلام الٰہی زبان پر نیم قد اُٹھا۔ اور قرآن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ رانڈ کا سانڈ بادشاہ کا بھائی بنا ہوا تھا۔ خنجر کھینچ کر بڑھا۔ نوکروں سے کہا کہ یہیں کھڑے دیکھتے ہو؟ ہاں! خوشم اُزبک اس کے ملازم نے بڑھ کر ایک خنجر اس کے سینہ پر مارا۔ خان اُٹھ کر محل شاہی کی طرف بھاگے۔ خدا بردی ناخدا ترس نے پہنچکر ایک تلوار کا ہاتھ مارا۔ اور دولت خانہ کے میدان میں کہن سال جاں نثار کا کام تمام کر دیا۔ دیوانِ عام میں غل مچ گیا۔ اور وہ خونخوار شمشیر بکف ٹہلتا ہوا بادشاہی حرم سرائے کے دروازہ پر آیا کہ محل میں داخل ہو۔ دربان کو اتنی عقل آئی۔ اور ہوش

نے بھی رفاقت کی۔ کہ دروازہ کو قفل لگا دیا۔ اس خونی نے بہت دھمکایا۔ مگر نہ کھولا۔ ماہم اور اُس کے بھائی بندوں کا سکہ ایسا بیٹھا تھا۔ کہ ایک کی جرأت نہ ہوئی۔ جو دم مار سکے۔ دیوان میں غل اور محل میں کہرام مچ گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ اکبر محل میں آرام کرتا تھا چونک پڑا۔ پوچھا کیا ہوا؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ کیا بتاتے بادشاہ نے کوٹھے کی دیوار سے سر نکال کر دیکھا۔ اور پوچھا یہ کیا حالت ہے۔ ایک رفیق چار منصب جاں نثار نے ہاتھ اُٹھایا۔ اور بد بخت خان اعظم کی لاش پڑی تھی۔ اشارہ کیا۔ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بادشاہ نے دوبارہ پوچھا۔ وہ ڈر کا مارا تھا۔ پھر ہاتھ اُٹھا کر رہ گیا۔ بادشاہ گھبرا کر باہر چلے۔ ایک حرم کو ہوش آیا۔ کہ تلوار ہاتھ میں دے دی۔ غنیمت یہ ہوا۔ کہ بادشاہ دوسرے دروازے سے نکل کر آئے۔ اُسے دیکھ کر کہا۔ اے بیہودہ لڑکے میرے انکہ کو کیوں مار ڈالا۔ اُس نے دوڑ کر بادشاہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اور کہا تحقیق کیجئے۔ اور غور فرمائیے۔ نا دولت تخواہ کو سزا دی ہے۔" اکبر اور ادھم میں دھکا پیل ہوتی ہے اور سب کھڑے دیکھتے ہیں۔ اللہ رے ماہم تیرا رُعب داب۔

بادشاہ نے اپنی تلوار پھینک کر اُس کی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ اُس نے خود تلوار کھینچنی چاہی۔ بادشاہ نے ایک مکا کلے پر مارا۔ اتفاقاً ایسے ضرب بیٹھی۔ کہ گر پڑا۔ اور کبوتر کی طرح لوٹ گیا۔ آخر اکبر نے جھنجلا کر کہا۔ چہ تماشہ مے کنید بربندید ایں دیوانہ را۔ دیکھ رہے ہو۔ باندھ لو۔ اس دیوانہ کو۔ اُسی وقت مشکیں کس لیں۔ حکم دیا۔ کہ ابھی دولت خانہ کے کوٹھے پر سے پھینک دو۔ ایوان مذکور ۱۲ گز بلند تھا۔ اُسی وقت ہاتھ پاؤں باندھ کر پھینکا۔ مگر ماہم سے بھی جان نکلتی تھی۔ اس طرح بچا کر پھینکا۔ کہ پاؤں کے بل گرا۔ اور بچ گیا۔ دوبارہ حکم دیا۔ کہ پھینکو۔ اور سرنگوں پھینکو۔ دوبارہ کوٹھے پر لے گئے۔ ادھم خاں دھم سے زمین پر آن پڑے۔ اب کے سر کے بل گرے۔ خود سری کی گردن ٹوٹ گئی۔ اور سر پھوٹ گیا اُس کے ہوا خواہ لاش اُٹھا کر لے گئے۔ منعم خاں اور شہاب خاں موجود تھے۔ ڈرنے اور کھسک کر بھاگ گئے۔ یوسف خاں۔ انکہ خاں کا بڑا بیٹا۔ اور تمام انکہ خیل یہ سنتے ہی مسلح ہوئے۔ اور چڑھ کر ماہم کے سر راہ آن پہنچے۔ کہ ہم اتا والوں سے انتقام لیں گے۔ اکبر نے خان کلان یعنی خان اعظم کے بڑے بھائی کو بلا کر ادہم کی لاش دکھائی۔ اور فساد سے روک کر کہا۔ کہ قصاص ہم نے لے لیا۔ اور فساد کیا ضرور ہے۔ دونوں لاشیں دلی کو روانہ کر دیں۔

عبرت تقدیر کا تماشا دیکھو کہ قاتل نمکحرام مقتول مظلوم سے ایک دن پہلے زیر خاک پہنچا۔ خان اعظم دوسرے دن دفن ہوئے۔ تاریخ ہوئی۔ دو خون شد۔ (ملا صاحب فرماتے ہیں)

دوسری تاریخ ہوئی۔ ع

رفت از ظلم سر اعظم خان

مگر پہلی میں ایک زیادہ ہے۔ دوسری ٹھیک ہے۔ ایک اور باکمال نے کہا۔

کاش سال گر شہید شدی کہ شدی سالِ فوت خان شہید

میرانکہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی متانت اور بزرگی اور سلامتی طبع ان کے اشعار سے ہویدا ہوتی ہے۔ نمونہ کے لئے ایک شعر بھی لکھتا ہوں۔

منائے طفلِ اشک از خانۂ چشم قدم بیروں کہ مردم زادہا از خانہ مے آئند کم بیروں

ماہم کچھ بیمار تھیں۔ سنتے ہی دوڑیں۔ کہ جاؤں اور بیٹے کو چھڑا لاؤں۔ انہیں یقین نہ تھا۔ کہ یہ سزا ہوگی۔ اور ایسی جلد ہو جائیگی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا۔ سو ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے دیکھتے ہی کہا ادہم انکہ مارا کشتہ۔ ماہم اور اکشتیم۔ اور اسے تسلی بھی دی۔ اس کا سینہ حوصلہ کا تنور تھا۔ دم نہ مارا۔ مگر رنگ فق ہو گیا۔ اور عرض کی۔ خوب کردید۔ کہ آئین انصاف ہمیں بود۔ پھر بھی یقین نہ آتا تھا جب بی بی تختہ بیگی۔ رستم خاں کی ماں نے سارا حال بیان کیا۔ تو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ اکبر نے بھی خدمتوں کا خیال کر کے تسلی اور دلاسے کے رومال سے آنسو پونچھے۔ اس کے ہوش بجانہ تھے۔ خاموش رخصت ہو کر گھر گئی۔ کہ ماتم داری اور سوگواری کی رسمیں ادا کرے بیٹے کا داغ تھا۔ مرض بڑھتا گیا۔ عین چالیسویں کا دن تھا۔ کہ ماں بھی بیٹے کے پاس پہنچ گئی۔ اکبر نے اس کے جنازہ کا چند قدم ساتھ دیا اور عزت و احترام سے روانہ کر دیا۔ دونوں کی قبروں پر عالیشان مقبرہ بن گیا۔ اب تک قطب صاحب کی درگاہ کے پاس موجود ہے۔ اور بھول بھلیاں کہلاتا ہے۔ یاد کرو بازبہادر کی مہم۔ خان خاناں کے مرتے ہی ماہم کے اقبال کو گھن لگا۔ اور دوسرے ہی سال گھرانا غروب ہو گیا۔

منعم خاں سپہ سالار ہو کر لڑتے مرتے پھرا کریں۔ وکیل مطلق کا کام ہی نہ رہا۔ بادشاہ ہر بات آپ سننے لگے۔ اور ہر کام آپ کرنے لگے۔

شہاب خاں۔ شہاب الدین احمد خان تو ہو گئے۔ مگر جو رنگ چاہتے تھے۔ وہ نہ نکھرا۔ رنگ کیا نکھرتا۔ کہ رنگ والی نہ رہی وہ ہی ماہم بیگم۔ ملا صاحب کی رنگینیوں کی کیا تعریف ہو سکے جب شہاب خاں مرے۔ تو آپ فرماتے ہیں۔ کہ شہاب خانم۔ تاریخ ہوئی۔

ناصر الملک ملا پیر محمد خان

ایک خوش فہم۔ عالی ادراک ملا تھے۔ حسن تقریر سے جلسہ کو شگفتہ کرتے تھے۔ باوجود اس کے دل

کے قسائی تھے۔ اور احکام شریعت کی بھی چنداں قید نہ رکھتے تھے۔ شروان سے آکر قندھار میں بیرم خاں سے ملے۔ یہاں دربار کھلا تھا۔ اپنے کتب خانہ کا داروغہ کر دیا۔ خان خاناں ہی کی تجویز سے چند روز اکبر کو سبق پڑھاتے رہے۔ ہندوستان کی مہم کے بعد خاں ہو گئے۔ اور ملا پیر محمد سے ناصر الملک بنے۔ ۳ جلوس میں بیرم خاں کے نائب ہو کر سفید و سیاہ کُل مہمات مملکت کے مالک ہو گئے۔ سب اہل دربار اور سلطنت کے ملازم ان کے گھر پر حاضر ہوتے تھے۔ اور کم ہی بار پاتے تھے۔ تین چار برس نہایت عالی رتبہ جاہ و جلال پر رہے۔ مگر ظلم کی عمر بہت نہیں ہوتی۔ اس لئے تھم نہ سکے ؎

خانخاناں کے بعد ان کے لئے میدان صاف تھا۔ ادہم خاں کی۔ اور ان کی مرادیں پوری ہوئیں۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ باز بہادر کی مہم پر مالوہ گئے۔ وہ شراب عیش کا متوالا تھا۔ ہزار مصیبت کے ساتھ سیجوں سے اُٹھا۔ سارنگپور پر آیا۔ لڑائی لڑا تو شکست کھائی۔ اُس کے خیمہ و خرگاہ۔ خزانے اور سارے کارخانے وغیرہ وغیرہ کہ حدِ حساب سے باہر تھے۔ سب ان کے ہاتھ آئے (مُلا صاحب کہتے ہیں جس دن یہ فتح ہوئی۔ دونو سردار خیمہ گاہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قیدیوں کے ریوڑ کے ریوڑ پکڑے آتے تھے۔ اور قتل ہو رہے تھے۔ لہو اس طرح بہتا تھا۔ جیسے نہر کی نالیاں۔ پیر محمد خاں دیکھتا تھا۔ اور ہنس ہنسکر کہتا تھا۔ اسے دیکھو! کیا موٹی گردن ہے۔ اور اُس کے گلے سے فوارہ نکلتا ہے۔ بنیان الٰہی جس سے انسان اشرف المخلوقات مراد ہے۔ میں نے آپ دیکھا۔ کہ اُس بے رحم کے آگے گاجر مولی۔ لسن پیاز تھے۔ کہ برابر کٹ رہے تھے۔ کچھ پروا نہ تھی۔ میں بے غرضانہ فکر میں گیا تھا۔ یہ آشوب قیامت دیکھ کر نہ رہا گیا۔ مہر علی سلاوزی یار قدیم تھا۔ اُسے میں نے کہا۔ کہ باغیوں نے سزا پائی۔ زن و بچہ کے لئے قتل۔ قید کچھ نہیں آیا۔ انہیں تو چھوڑ دو۔ وہ بھی دین و دیانت کا درد دل میں رکھتا تھا۔ پیر محمد خاں سے جا کر کہا: جواب میں کہتا ہے۔ قید ہی ہے۔ کیا بات ہے! افسوس اُسی رات لُٹیرے گرے۔ مسلمانوں کی عورتوں کو۔ مشایخ۔ سادات۔ علما۔ شرفا۔ امرا کے بال بچوں کو پکڑا۔ ہندوؤں۔ خورجیوں میں چھپا چھپا کر اُجین۔ اور اطراف میں لے گئے۔ سادات و مشایخ وہاں کے قرآن ہاتھوں پر لے کر پیشوائی کو نکلے۔ اُس نے انہیں۔ اور لٹیروں کو برابر ہی مارا۔ اور اُن کے قرآنوں کو جلا دیا۔

ادہم خاں نے جو کچھ وہاں کیا۔ اس کا ذکر ہو لیا۔ اکبر نے بلا لیا۔ پیر محمد خاں مالک کل ہو گئے۔ لشکر عظیم جمع کر کے برہان پور پہنچے۔ بیجا گڈھ کو (کہ بڑا مضبوط قلعہ تھا) امرائے اکبری نے بزور شمشیر فتح کیا۔ مُلا نے خوب قتل عام کیا۔ اور خاندیس کی طرف پھر کر۔ لوٹ مار۔ قتل۔ تاراج غرض۔ تورۂ چنگیزی کے

قوانین کا ایک دقیقہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ گویا وہ خونریزی کے سپہ سالار تھے۔ برہان پوری۔ اور آسیری رعایا کہ مدتوں سے رد پیوں۔ اشرفیوں میں کھیلتے تھے۔ اور نازو نعمت میں لوٹتے تھے۔ یا وہ قید تھے یا قتل۔ نربدا کے پار اُتر کر خون کے دریا بہا دیئے۔ اور اکثر شہروں اور قصبوں کو خاک درخاک صفاً صفا کر دیا۔ اور دولت بھی اس قدر سمیٹی۔ کہ ان کے بھی فرشتوں کے خیال میں نہ ہو گی۔

ایک موقعہ پر فوج کے لوگ اطراف و اضلاع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوٹ کے مال باندھ رہے تھے۔ خبر پہنچی۔ کہ باز بہادر ادھر اُدھر سے فوج سمیٹ کر آن پہنچا۔ انہوں نے امرا کو جمع کر کے مشورت کی۔ صلاح ہوئی کہ جنگ میدان کا موقع نہیں۔ اس وقت پہلو بچا کر ہنڈیہ میں چلے چلو۔ انہوں نے صلاح و اصلاح کا سبق پڑھا ہی نہ تھا۔ جو ٹوٹی پھوٹی سپاہ ساتھ تھی۔ اُسے لے کر میدان میں جا کھڑے ہوئے۔ سپاہی کا قاعدہ ہے۔ کہ جب روپیہ پاس ہوتا ہے۔ جان عزیز ہو جاتی ہے۔ اُس کے علاوہ لوگ اُس کی بدمزاجی سے جلے ہوئے تھے۔ اُدھر باز بہادر کا یہ عالم کہ باز کی طرح جھپٹے مارتا تھا۔ اور ہر حملہ میں ستھراؤ کرتا تھا۔ آخر ملاّ کی فوج بھاگی۔ اور اُنہیں خود بھی بھاگنا پڑا۔ دریائے نربدا سامنے آیا۔ اضطراب کے مارے گھوڑا ڈال دیا۔ تمام فوج بھاگی آتی تھی۔ گھبراہٹ میں ایک لدے ہوئے اونٹ کا ایسا دھکا لگا۔ کہ گرے۔ اور پانی کے رستے سیدھے آگ میں پہنچے۔ ساتھیوں میں سے کوئی چاہتا۔ تو پکڑ لیتا۔ مگر حقیقت میں دھکا بھی اونٹ کا نہ تھا۔ اس کے اعمال بد نے دھکا دیا۔ اور فرعونی و بدمزاجی نے آنکھیں دکھائیں کوئی ہاتھ نہ پکڑ سکا۔ نربدا ان کے لئے دریائے نیل ہو گیا۔ اور ایک غوطہ میں فرعون کے دربار میں جا پہنچے (مُلا صاحب حالات مذکورہ لکھ کر کہتے ہیں)، میں نے اُسے دور سے دیکھا تھا۔ الحمد للہ مجلس تک نہیں پہنچا۔

اتفاق عجیب۔ مندودار الخلافہ مالوہ میں بڑی مسجد جامع تھی۔ اس کے دروازے میں ایک فقیر مجذوب رہتا تھا۔ کہ خاص و عام کو اُس سے اعتقاد تھا۔ ملا پیر محمد نے جب باز بہادر کی آمد آمد سُنی۔ تو فوج لے کر نکلے۔ فقیر مذکور کے پاس بھی گئے۔ اور دُعا کی التجا کی۔ اُس نے کہا۔ مصحف مجید ہے؟ اُنہوں نے قرآن حمائل منگا کر دیا۔ اُس نے ایک جگہ سے کھول کر اُنہی کو دیا۔ کہ پڑھو۔ سر صفحہ پہلی ہی سطر میں تھا۔ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ہم نے آل فرعون کو ڈبو دیا۔ اور تم دیکھتے رہ گئے۔ مُلا اپنے گھمنڈ میں خدا جانے کیا بن رہے تھے۔ فقیر بچارہ کو دھکے کے لگائے۔ اور دو تین تھپیاں بھی پیٹھ پر ماریں وہ بے چارہ سہلا کر رہ گیا۔ مگر غیرت الٰہی نہ رہ سکی۔

محمد سعید بہادر خاں۔ خان زمان علی قلی خاں شیبانی کا چھوٹا بھائی تھا۔ ماثر میں لکھا ہے۔

کہ پنج ہزاری امیر تھا۔ خاندان کا حال خان زماں کے حال میں لکھ چکا ہوں۔ خورد سالی کے عالم میں اکبر کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ اور اکبر اُسے بھائی کہتا تھا۔ اس کے کارناموں کو دیکھو! یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ چھاتی میں آدمی کا نہیں۔ شیر کا جگر تھا۔ وہ ہر معرکہ میں بھائی کا داہنا ہاتھ۔ اور ہاتھ میں فتح کی تلوار تھا۔ ابتدائے حال بطور اجمال یہ ہے۔ کہ جب بیرم خاں قندھار۔ اور متعلقات خراسان کا حاکم تھا۔ تو اُس کی خواہش سے ہمایوں نے محمد سعید خاں کو بہادر خاں خطاب دے کر زمینداور کا حاکم کر دیا۔ ہمایوں ہندوستان آیا۔ اور بیرم خاں اُس کے ساتھ سپہ سالار ہو کر آیا۔ اپنی جگہ شاہ محمد خان قلاتی کو چھوڑ آیا۔ کہ اُس کا قدیمی رفیق تھا۔ چونکہ سرحد ملی ہوئی تھی۔ بہادر خاں کی اور اُس کی بعض مقدموں پر تکرار ہوئی۔ بہادر جوان بڈھے کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ انہوں نے شاہ محمد کو شہر قندھار میں ڈال کر محاصرہ کیا۔ اور ایسا دبایا۔ کہ بڈھا جان سے تنگ ہو گیا۔ اُس نے بھی بیرم خاں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ بادشاہ ایران کو بایں مضمون عرضی بھیجی۔ کہ ہمایوں بادشاہ نے یہ تجویز کی تھی کہ ہندوستان فتح کر کے قندھار کو خاک ایران سے وابستہ کر دیں۔ دعاگو اسی بندوبست میں تھا اور ہندوستان سے اپنے عرائض کا منتظر تھا۔ کہ یہاں یہ صورت پیش آئی۔ اب حضور میں عرض یہ ہے۔ کہ امرائے معتبر میں سے کسی کو فوج مناسب کے ساتھ روانہ فرمائیں۔ کہ امانت اُس کے سپرد کی جائے۔ اور یہ نااہل کافر نعمت اپنی سزا کو پہنچے۔ کہ بیچ بیچ میں دست برد کرنی چاہتا ہے۔ شاہ نے یار علی بیگ کے ماتحت تین ہزار ترکمان روانہ کئے۔ بہادر خاں کو اُدھر کا خیال بھی نہ تھا۔ یکایک برق آسمانی سر پر آن پڑی۔ سخت لڑائی ہوئی۔ بہادر نے بھی اپنے نام کے جوہر قرار واقعی دکھائے۔ دو دفعہ گھوڑا زخمی ہو کر گرپڑا۔ آخر بھاگ کر صاف نکل آیا۔ اور اکبری اقبال کی رکاب پر بوسہ دیا۔ امرا نے مہرہ سزا پر رکھ دیا تھا۔ مگر خان خاناں ان کے پلہ پر تھا۔ خطا معاف۔ اور پھر ملتان کا صوبہ مل گیا۔

سنہ ۲ جلوس میں جب اکبر نے سکندر سور کا قلعہ مان کوٹ پر آ کر محاصرہ کیا۔ تو یہ بھی ملتان سے بلائے گئے۔ گھوڑے دوڑاتے آئے۔ اور جنگ میں شامل ہوئے۔ ایک مورچہ ان کے نام ہوا۔ اور انہوں نے اپنے نام کی بہادری کو کام کی بہادری سے ثابت کر دیا۔ مہم مان کوٹ کا فیصلہ ہوا۔ بہادر خاں پھر اپنے علاقہ کو رخصت ہوئے۔ کہ جا کر بندوبست کریں۔ ملتان کا پہلو بلوچستان سے ملا ہوا ہے یہ فوج لے کر دورہ کو نکلے۔ بلوچ زمانہ کے سرشور۔ ٹڈی دَل باندھ کر پہاڑوں سے نکل پڑے۔ بہادر بھی بہادر تھے۔ اَڑ گئے۔ اور خوب خوب دھاوے کئے۔ ایک مہینے میں سب کو دبا لیا۔ اور سرحد کا مضبوط بندوبست کیا۔ چند روز کے بعد دربار میں آ گئے۔

۱؎ دیکھو صفحہ ۱۹۷

باز بہادر پسر سجاول خاں، شیر شاہی سردار ملک مالوہ پر حکمرانی کرتا تھا۔ بیرم خاں نے ستہ جلوس میں بہادر خاں کو فوج و علم دے کر روانہ کیا۔ یہ قصبہ بیری تک پہنچا تھا۔ کہ خان خاناں کے اقبال نے دغا کی۔ وہ دربار کی صورت حال سے مایوس ہوا۔ اور سمجھا کہ دونو بھائی میری محبت اور دوستی سے بدنام ہیں۔ اور یہ مہم پر میرا بھیجا ہوا گیا ہے۔ دربار سے اُس کی مدد کون کریگا۔ اس لئے طلب کیا۔ اور حضوری دربار کی ہدایت کی۔ اہل دربار نے اکبر کی طرف سے خود فرمان بھیج کر اوپر اوپر بلا لیا۔ اور وکیل مطلق کر دیا۔ کہ بیرم خاں کا منصب خاص تھا۔ حکم احکام تو سب ماہم محل میں بیٹھے بیٹھے جاری کر رہی تھی۔ انہیں فقط وزن شعر پورا کرنے کا خطاب دے دیا تھا۔ اور بیچ یہ مارا تھا۔ کہ اُدھر تو بیرم خاں کے دل میں ان بھائیوں کی طرف سے کدورت پڑ جائے۔ ادھر امیدہا ئے چند در چند پر آ کر یہ اُس کی رفاقت کا ارادہ نہ کریں۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہادر خاں اُن کے ساتھ رہ کر بھی راہ وفا نہیں بھولا۔ وہ اکبر کا بچپن سے رازدار تھا۔ اور ہر بات بے تکلف کہہ سکتا تھا۔ ضرور بیرم خاں کی صفائی کے خیالات کانوں کے رستہ دل میں اُتارتا ہوگا۔ حریفوں نے اُسے مہم میں نہ شامل کیا۔ جب بادشاہ کوئے کر پنجاب میں بیرم خاں سے لڑانے لائے۔ تو اُسے خان زماں کے پاس مغرب سے مشرق میں پھینک دیا۔ باقی حالات دونوں بھائیوں کے شیر و شکر ہیں۔ اُن کے حال میں[1] دیکھو۔

شمس الدین حکیم الملک گیلانی

(ملا صاحب فرماتے ہیں) حکمت اور طب میں جالینوس زمان اور مسیح الناس تھا۔ اور اور علوم نقلی اور رسمی میں بھی سب سے نمودار و ممتاز تھا۔ اگرچہ مجھے اُس سے اصلاً لگاؤ نہ تھا۔ مگر اِبتدائے ملازمت میں جبکہ میں نے نامۂ خرد افزا کا دیباچہ لکھ کر سُنایا۔ تو خدا واسطے کو نیش زنی کی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ کہ ملا عبدالقادر کی انشاپردازی کیسی ہے۔ کہا کہ عبارت تو فصیح ہے۔ مگر پڑھتا بُرا ہے۔ (پھر آپ فرماتے ہیں) مگر انصاف یہ ہے۔ کہ سب کا کارساز اور بندگان خدا کا خیرخواہ تھا۔ اور دین میں استوار اور ثابت قدم اور آشنا پرور تھا۔ اپنے طلبا کی تربیت اور پرورش کرتا تھا۔ اُنہیں درس دیتا تھا۔ اور ممکن نہ تھا۔ کہ کبھی بے اُن کے دسترخوان پر بیٹھے۔ انہی کاموں کے سبب سے لوگوں کے گھر پر آمد و رفت بھی کم کرتا تھا۔

ایکدن شیخ سلیم چشتی کے جلسہ میں بیٹھا فقہ اور فقہا کی مذمت۔ اور طریقہ حکما کی تعریف و تحسین۔ اور علم حکمت کی شکوہ و شان اور شیخ بوعلی سینا کے مناقب بیان کر رہا تھا۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے کہ علما و حکما لڑ رہے تھے۔ اور روز مسائل مذہبی پر بک بک جھک جھک۔ رگڑے جھگڑے۔ غل غپاڑے کرتے تھے۔ میں ناواقف اور سرحدات سے نیا آیا تھا۔ اور اصل مباحثہ کی خبر نہ تھی۔ میں نے شیخ شہاب الدین

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۹۰

سہروردی قدس اللہ روحہ کے شعر پڑھے:۔

وکم قلت للقوم انتم علی	شفا حفرۃ من کتاب الشفا
فلما استخفوا بتوبیخنا	فزعنا الی اللہ حسبی کفا
فماتوا علی دین سر طالیس	وعشنا علی ملۃ المصطفی

اور گواہی میں مولوی مخدومی عارف جامی قدس سرہ کی وہ ابیات لایا کہ تحفۃ الاحرار میں کہی ہیں۔

نور دل از سینۂ سینا مجو روشنی از چشم نا بینا مجو

حکیم بگڑے۔ شیخ سلیم چشتی نے کہا۔ وہ پہلے ہی جلے بیٹھے تھے۔ تو نے آکر اور بھی بھڑکا دیا۔ جب علما و مشایخ کا معرکہ ویران ہوگیا۔ تو جہاں تک ہو سکا حکیم نے مخالفان دین سے مقابلے کئے۔ آخر برداشت نہ کر سکا۔ مکہ کی رخصت مانگی ۹۸۶ھ یا ۹۸۹ھ میں زیارت حج کو گیا۔ آخر وہیں مر گیا۔ شکر اللہ سعیہ اللہ اُس کی سعی کو مشکور کرے۔ بادشاہ نے اپنا فرمان بھیج کر بلایا بھی تھا۔ مگر وہ نہ آیا ؎

از سر کوئے تو نہ جنبیم آسمان نیستم زمینم من

عرضداشت خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش در جواب فرمان اکبر بادشاہ کہ از مکہ معظمہ فرستادہ بود۔

کمینہ فراشان آستان کیوان مکان ملایک آشیان خاقان جمشید نشان فریدون شان کیخسرو دستگاہ کیومرث بارگاہ سکندر جاہ عالم پناہ انجم سپاہ آسمان خرگاہ ظل سبحانی عزیز کوکہ بعرض میرساند کہ دائے انور بر طلب ایں غلام کمینہ فایض و صادر گشتہ بود جان در دل راکہ خلاصہ آب و گل ست۔ با جمعی کثیر از روسائے اخلاص و ابتہال بخدمت حجاب درگاہ گیہان پناہ کہ مبدائے سخا و منشار عظمت و کبریائیت فرستادن چوں مفتی عقل و فتوائے قاضی گمان بلکہ یقین سجل بحرمان مہجوری کہ درد لیست بے درمان نوشتہ دادہ بود۔ بر نا قابلی فرسودہ دست ملامت در گردن کردہ ماند چوں دانست بہ یقین کہ احادیث تحریک اعدا موثر در کار گر افتادہ مزاج اشرف را بعنیت و تہمتی چند کہ بمسامع جاہ و جلال رسانیدہ از کمینہ درگاہ منحرف ساختہ اند وہادی رائے عالم آرائے لبساط بوسان آن درگاہ بہ قتل و قمع ایں بے گناہ راہنمول گشتہ بہ خاطر رسید کہ چشم خاکسار بے مقدار را کہ در خدمت قابلان آن درگاہ آسمان نشان پرورش یافتہ بمرتبہ اعظم خانی و عزیز کوکگی و حکومت گجرات سرافراز شدہ ہم بواسطۂ ایں تشریفات بخاک مکہ معظمہ مقدسہ منورہ رسانیدہ کہ با کافران ہندوستان جسمی راکہ پروردۂ خوان الوان انعام و احسان بادشاہ جہاں پناہ باشد در یک خاک و در یک محل مدفون سازد محض گستاخی و غایت بے ادبی است و لاجرم گجرات راکہ ملکہ معمورۂ دار السلطنت بود بہ معتمدان سپردہ غبار ملال و اختلال خویش را از گوشۂ خاطر خاک کرو بان آن

آستان ملایک آشیان شستہ دست از مطالبات آنجا و پائے ادب را کوتاہ ساختہ مواشی کہ محض بسعی
جانسپاری خود از معارک کفار جمع ساختہ بود بدست عدل بیرون آوردہ از حلال ترین چیزہا دانستہ سفر
گزیدہ آں قدر جمعیت از مکاسبات مذکور بدست آوردہ کہ اگر خواہند منصب اعظم خانے را در بارگاہ بادشاہ روم
کہ اشرف مکان ربع مسکون بتصرف ایشانست میتواند خرید۔ اما خلاصہ ہمت مصروف آنست کہ وظیفہ بمردم
مستحق مصالح پاک دین آں ملک مقرر سازد و مدرسہ بنام نامی حجاب بارگاہ بندہ پرور حضرت خاقانی با تمام
رساند کہ تا انقراض عالم ورد زبان مورخان جہان باشد و خود درآں مدرسہ بہ بحث علوم دینی و فکر شعر کہ عبارت
از توحید و نعت و منقبت اصحاب بودہ باشد و دعائے دولت روز افزوں اشتغال میداشتہ باشد۔ امید
آنست کہ از رفتن ایں کمترین غلامان بر حاشیہ ضمیر خاکروبان آستان غبارے نخواہد نشست بلکہ مطلب
سخن چینان و عیب کنندگان کہ عدم بود ایں معدوم است بحصول خواہد پیوست کہ منصب اعظم خانی و
حکومت گجرات و عشرت عزیز کوکگی را بایں محروم نمے تمرند بناچار جمع مذکورات را پیشکش میعیان نمودہ
کہ ایشان را میسر نیست بدوں بندہ و تمکن کہ ایں کمینہ را میسر باشد بدوں ایشاں چوں آخر الامر نسیم لطف
شامل حال بوستان مطالب و مقاصد دیگران شد و نہال امید و حقوق خدمت بندہ را بسموم محرومی خشک
سالی بخشیدند۔ بندہ از فدوی کہ نہاد عاقبت اندیشے ہا بسگاں آں آستان چند کلمہ گستاخی نمودہ بعرض میرساند
کہ جمعی خاطر اشرف را از دین محمد صلے اللہ علیہ وسلم بیگانہ و متجنب مے سازد حاشا کہ دوست باشند و کینہ کہ
نیک نامی دنیا و عقبے می طلبد دشمن و واجب الاخراج باشم والا کار دنیا بازیچہ ایست ناپایدار بر حرف دو
سہ خوش آمدگوئی آخرت بدنیا فروش اعتماد نباید کرد۔ ہمہ عالم را گوش ہوش است پیش ازیں سلاطین بودہ
اند کہ ہمہ صاحب تمکین بودند ہیچ بادشاہے را دغدغہ نشد کہ دعوئے پیغمبری و نسخ دین محمدی نماید۔ بل
مادامے کہ چوں مصحف اعجازی چوں چہار یار چندبار پسندیدہ باشد و شق قمر با مثال ایں چیزہا واقع نبود مردم
میکند یارب دغدغہ چہار یار بودن کدام جماعت را می شدہ باشد۔ قلیچ خان کہ صفائی ظاہر و باطن و عصمت
جبلّی دارد یا صادق خان کہ شرف رکابداری از بیرام خاں یافتہ یا ابوالفضل کہ شجاعت و حیائش بجائے
علیؓ و عثمان مے تواند بود۔ بخداوند بیچا کہاے بادشاہ قسم جز عزیز کسی کہ نیکنامی طلب باشد نیست و ہمہ مدار
برخوش آمد و روز گذرانیدن دارند و آنکہ نیکنامی طلبد بندہ است کہ تا بود جز حرف نیکنامی[1] باشد ؎

خلاف پیمبر کسی رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

فرقے کہ میان اکابر مجلس بہشت آئین و بندہ کمترین است ہمیں است کہ ابو الغازی در فرمان بندہ اضافہ

---

[1] برزبان نہ آید المحال ہم در مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کاری نخواہد کرد کہ خلاف نیکنامی باشد۔

کردہ دیگراں کافراں را بر مسلماناں ترجیح دادند کہ بر صحف لیل و نہار خواہد ماند۔ آنچہ بر بندہ واجب است درآں تقصیر نرفت والدّعا۔

شہزادگان تیموری

ابراہیم حسین وغیرہ محمد سلطان۔ ابن سلطان ویس میرزا۔ ابن بایقرا میرزا۔ ابن عمر شیخ میرزا۔ ابن امیر تیمور گورگان۔ یہ محمد سلطان۔ سلطان حسین مرزا بادشاہ ہرات و خراسان کا نواسا تھا۔ باپ کی جانب سے امیر تیمور سے نسل ملتی تھی۔ وہ بابر کے پاس آیا۔ یہ اپنائیت کا عاشق تھا۔ سب کو سمیٹتا تھا اور سب ہی اس سے دغا کرتے تھے۔ اسے بھی خاطرداری سے رکھا مگر اس نے بھی دغا کی پھر ہمایوں کے پاس آیا وہ بھی مروت کا پتلا تھا۔ عزت کے ساتھ رکھا۔ اور اس کے بچوں کو بڑی محبت سے تربیت کرتا رہا (اولاد کا شجرہ دیکھو)۔

محمد سلطان مرزا

- الغ مرزا
  - سکندر سلطان — اسے ہمایوں پیار سے الغ مرزا کہتا تھا
- شاہ مرزا — چھوٹا ہی مرگیا
  - محمود سلطان — ہمایوں اسے شاہ مرزا کہتا تھا
- (بیٹیاں) یہ اولاد گورگان سے شادی کی تفصیل [illegible]
  - محمد حسین مرزا
  - ابراہیم حسین مرزا
    - مظفر حسین مرزا
  - مسعود حسین مرزا
  - عاقل مرزا

محمد زمان مرزا کہ سلطان حسین مرزا کا پوتا تھا۔ اور ہمایوں کی رفاقت میں تھا۔ باغی ہوگیا۔ اور چاہا کہ بعض شاہزادوں اور امیروں کو ملا کر ہمایوں کو درمیان سے اڑا دے۔ ہمایوں نے حسن کر کے بلایا اور سمجھایا۔ اس نے عذر معذرت کی۔ قرآن سامنے رکھ کر قول و قسم ہوئے۔ اور خطا معاف ہوگئی چند روز کے بعد اسے پھر شیطان چڑھا۔ ہمایوں نے قلعہ بیانہ میں قید کر دیا۔ محمد سلطان اور نخوت سلطان اس کے ساتھ شریک تھے دونوں کے لئے حکم دیا کہ اندھا کر دو جس کو حکم دیا تھا۔ اس نے نخوت کو اندھا کیا۔ محمد سلطان کے حق میں چشم پوشی کر کے پتلی کو بچا گیا۔ یہ اندھا بن کر قید میں بیٹھ رہا۔ چند روز کے بعد موقع پا کر محمد زمان مرزا گجرات کو بھاگ گیا۔ پھر محمد سلطان مرزا بھی کسی ڈھب سے نکلا۔ اور قنوج میں جا کر اپنے بیٹوں

اور بہت سے مفسدوں کو لے کر خاک اُڑانے لگا ۔ ۵ ۔ ۶ ہزار مغل افغان راجپوت کا لشکر جمع کر لیا +

جب ہمایوں بنگالہ میں شیر شاہ کے جھگڑوں میں پھنسا ہُوا تھا ۔ خبر لگی کہ کامران و عسکری بغاوت کے بندوبست کر رہے ہیں ۔ اور محمد سلطان اور اُس کے بیٹوں نے اطراف دہلی میں لوٹ مار مچا رکھی ہے اس نے ہندال کو بھیجا ۔ کہ اُس کا انتظام کرے ۔ وہ یہاں آ کر اپنی بادشاہی کے بندوبست کرنے لگا ۔ لیکن جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر آگرہ میں آیا تو ہر شہزادے اور امیر کو اپنی اپنی فکر پڑی ۔ یہ باپ بیٹے بھی شرمساری کا رنگ منہ پر مل کر حاضر ہوئے ۔ واسطے وسیلے بیچ میں ڈالے خطا معاف ہو گئی +

دوسری دفعہ فوج کشی کی ۔ نو لاکھ سوار کے لشکر سے قنوج کے میدان میں پڑا تھا ۔ ادھر شیر شاہ ۵۰ ہزار فوج لئے سامنے جما تھا ۔ پہلے یہ ہی بیوفا بھاگے اور تمام اُمرائے لشکر کو رستہ بتا گئے کہ وہ بھی ہمایوں کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے ۔ ہمایوں دوبارہ شکست کھا کر پھر آگرہ میں آیا ۔ یہ بھی اور کئی امیر بے جنگ اپنے علاقے چھوڑ کر چلے آئے ۔ جب ہمایوں اور بھائی بند لاہور میں آئے کہ صلاح مناسب کے ساتھ اتفاق کریں تو یہ بھی لاہور میں آئے ۔ مگر یہاں سے ملتان کو بھاگ گئے +

جب کہ اکبر کی سلطنت ہندوستان میں جم رہی تھی ۔ اور محمد سلطان بیوفائی کی خاک اُڑاتے اُڑاتے بڈھا ہو گیا تھا ۔ بیحیائی کا خضاب لگا کر بیٹوں پوتوں سمیت دربار میں حاضر ہُوا ۔ دریا دل بادشاہ نے سرکار سنبھل میں اعظم پور ۔ نہٹور وغیرہ کا علاقہ دیا کہ آرام سے بیٹھ رہے ۔ بڈھے نے یہاں بیٹھے بیٹھے پر نکالے محمد حسین مرزا ۔ ابراہیم حسین ۔ مسعود حسین مرزا ۔ عاقل مرزا ۔ یہ ابھی لڑکے ہی تھے ۔ کہ بادشاہ نے پرورش کر کے امارت کی سیڑھیوں پر چڑھا دیا ۔ خان زمان کی دوسری مہم میں یہ بھی اکبر کی رکاب میں تھے ۔ پھر رخصت ہو کر اپنی جاگیر پر چلے گئے +

جب بادشاہ محمد حکیم مرزا کی بغاوت کے سبب سے پنجاب میں آیا تو ان کی نیت بگڑی ۔ الغ مرزا اور شاہ مرزا نے ابراہیم مرزا وغیرہ سے سازش کی منعم خاں کے پاس تھے ۔ وہاں سے بھاگے اور سکندر سلطان اور محمود سلطان وغیرہ کے ساتھ (یہ بھی تیموری شہزادے تھے) ملکر باغی ہو گئے ۔ سنبھل میں جا کر ملک کو تباہ کرنے لگے سنبھل کے جاگیردار سنبھل کر کھڑے ہو گئے ۔ اور انہیں مار مار کر کے نکال دیا ۔ ادھر سے منعم خان آن پہنچا ۔ یہ وسط ولایت سے گزر کر دلی ہوتے ہُوئے مالوہ کی طرف بھاگے ۔ وہاں محمد قلی برلاس سے بڑا کوئی سردار صاحب اقتدار نہ تھا ۔ یہ بڈھے کی کیا حقیقت سمجھتے تھے ۔ بیونس ہٹا کر جگہ صاف کی اور ملک پر قابض ہو گئے ۔ منعم خاں نے فوراً بڈھے سلطان کو قید کر کے قلعہ بیانہ میں بھیج دیا ۔ کہ وہیں وبال زندگی سے سبکدوش ہُوا +

امرائے شاہی نے انہیں وہاں بھی دم نہ لینے دیا۔ یہ گجرات کو بھاگ گئے۔ وہاں بھی محمود شاہ گجراتی کے مرنے سے طوائف الملوکی ہو رہی تھی۔ چنگیز خاں۔ سورت۔ بڑودہ۔ بڑوچ۔ جانپانیر پر حکومت کرتا تھا۔ یہ اُس کے پاس گئے۔ اُس نے اُن کے آنے کو غنیمت سمجھا۔ اور بڑوچ میں انہیں جاگیر دی۔ وہ شاہزادوں کی شاہ خرچی کے لئے کافی نہ ہوئی۔ اُنھوں نے چنگیز خاں کی بے اجازت اور جاگیرداروں کی جاگیروں میں ہاتھ ڈالنے شروع کئے۔ اور خواہ مخواہ حق جتا کر شیخیاں مارنے لگے۔ یہ باتیں چنگیز خاں سے بھی نہ سُنی گئیں۔ غرض یہاں بھی ایسے جھگڑے پڑے کہ مرزا خاندیس کی طرف نکل گئے۔ ان کے وسیع ارادے خاندیس کے ملک میں بھی نہ سمائے۔ ادھر امرائے گجرات میں کشاکشی ہو رہی تھی۔ اسی ہل چل میں چنگیز خاں مارا گیا۔ یہ پھر مالوہ میں چلے آئے۔ اب ان کی سینہ زوری اور سرشوری نے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ کسی جاگیردار کو مارا کسی کو بھگایا۔ ملک کو لوٹ مار کر ستیاناس کر دیا۔ سورت میں محمد حسین مرزا۔ جانپانیر میں شاہ مرزا۔ بڑوچ میں ابراہیم حسین مرزا مالک بن بیٹھے۔

۹۷۹ھ میں اکبر نے یہ حال سُنا۔ خلق خدا کی تباہی نہ دیکھ سکا۔ اور ملک پر قبضہ کرنا واجب سمجھا امرا کو فوج دے کر بھیجا۔ اور ساتھ ہی خود روانہ ہوا۔ کچھ تدبیر سے کچھ شمشیر سے ملک تسخیر کیا۔ شہزادے تتر بتر ہو گئے۔ بادشاہ نے خان اعظم کو احمد آباد میں حاکم کر دیا۔ آپ آگے بڑھا کہ اطراف کے فتنوں کو فرو کرے شہزادوں کی جڑ زمین سے نکالے اور سمندر کے کنارہ کنارہ پھر کر بندروں کو حکومت کے پھندے میں لائے۔ وہ کنبایت سے کہ احمد آباد سے تیس کوس ہے۔ ہوتا ہوا بڑودہ میں آیا تھا۔ اور یہاں چھاؤنی ڈال رکھی تھی۔ خبر لگی کہ ابراہیم مرزا نے رستم خاں رومی (ایک قدیمی امیر دربار گجرات کا تھا) کو مار ڈالا بادشاہ کے آنے کی خبر سُن کر بڑوچ کو چھوڑ دیا ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ لشکر شاہی سے اُوپر اوپر اُتر کر وسط ولایت کو لوٹتا پنجاب میں جا نکلے۔ اس وقت یہاں سے ۸ کوس پر ہے۔ یہ سُن کر اکبر کا جوش ہمت اُبل پڑا۔ حکم دیا کہ فلاں فلاں وفادار جاں نثار رکاب میں حاضر ہوں۔ شہباز خاں کمبوہ کو بھیجا۔ کہ سید محمود بارہہ۔ راجہ بھگوان داس۔ کنور مان سنگھ۔ شاہ قلی محرم وغیرہ چند سردار جو انہی بھائیوں کے دفعیہ کو سورت کی طرف کل روانہ ہوئے ہیں۔ انہیں پھیر لاؤ۔ ہمارے ساتھ آن ملو۔ سلیم اڑھائی برس کا بچہ اور حرم سرا کے خیمے بھی ساتھ تھے۔ یہاں دو امیر حفاظت کے لئے رکھے اور کہہ دیا کہ کسی کو چھاؤنی سے نکلنے نہ دو۔ مطلب یہ تھا کہ مبادا جاں نثار ہماری یلغار کی خبر پا کر پیچھے اُٹھ دوڑیں۔ ورنہ لشکر کی بہتات سے ڈر کر مرزا بھاگ نکلے۔ ہماری تھوڑی فوج ہو گی تو شیر ہو کر مقابلہ پر جم جائے گا۔ پہر رات رہے سوار ہو کر گھوڑے اُٹھائے۔ صبح ہوتے ہی ایک ہرن نمودار ہوا۔ حکم ہوا۔ کہ چیتا چھوڑ دو۔

مارلیا تو فتح ہے۔ (اُس زمانہ میں ایسے شگون ضرور لیتے تھے) اُس نے چھٹتے ہی شکار کو دبوچ لیا۔ سب کے دل کھل گئے۔ پھر رات۔ دن بھر چلے غنیم کا کچھ پتا نہ لگا۔ ۲ گھنٹے دن ہوگا۔ کہ ایک برہمن سامنے سے آتا ہوا ملا۔ اُس نے خبر دی کہ مرزا دریا اُتر کر سرنال پر آن پڑا ہے۔ لشکر بھی بہت ساتھ ہے۔ اور قصبہ مذکور یہاں سے چار کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اکبر نے وہیں باگیں روکیں اور مشورت ہوئی۔ جلال خاں قورچی نے عرض کی۔ کہ دشمن کی جمعیت بہت بتاتے ہیں۔ ان ہمراہیوں کے ساتھ ان کو لڑائی ڈالنی سپاہگری کے حساب سے باہر ہے۔ مناسب ہے کہ شبخون کیا جائے۔ اکبر نے کہا کہ جہاں بادشاہ موجود ہو۔ وہاں شبخون جائز نہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہمیں شبخون کی نوبت پہنچے۔ یہ مغلوبی کی نشانی ہے۔ دن کی بات کو رات پر نہ ڈالو۔ جو جاں نثار ہیں۔ اُنہی کو ساتھ لو اور لڑائی کے پلے چل پہنچو۔ اور آگے بڑھے۔ آتے ہیں سرنال سامنے نظر آیا کہ ٹیلے پر واقع ہے۔ ۱۰۰ آدمیوں کے ساتھ دریائے مہندری کے کنارے رات بسر کی۔ صبح ہوتے ہی حکم ہوا۔ کہ ہتھیار سج لو۔ اتنے میں خبر آئی۔ کہ اُمرا بھی آن پہنچے۔ بادشاہ رستے میں خفا ہوتے چلے آتے تھے۔ حکم ہوا۔ کہ جو دیر میں آئے جنگ میں شریک نہ کرو۔ بارے معلوم ہوا کہ اُن کی کوتاہی نہ تھی۔ حکم ہی دیر میں پہنچا تھا۔ سلام کی اجازت ہوئی۔ اُن کے شامل ہونے پر بھی جو کچھ تھے۔ ڈیڑھ دو سو کے بیچ میں تھے۔ اکبر نے یہاں روک کر سب کو سنبھالا۔ کنور مان سنگھ باپ کے ساتھ حاضر تھا۔ عرض کی۔ ہراول غلام باشد۔ اکبر نے کہا۔ "بکدام لشکر تقسیم افواج تواں کرد؟ وقت است کہ ہمہ یکدل و یک رُو کار کنند" عرض کی "در ہر صورت قدمے پیشتر جاں نثار شدن فرض عقیدت و اخلاص است"۔ اُس کی خاطر سے چند بہادر ساتھ کر کے روانہ کیا۔

ابراہیم حسن مرزا نے جب سپاہئ لشکر پر نظر کی تو فوج کی آمد آمد اور رفتار کے جوش کو دیکھ کر کہا۔ کہ ضرور اس لشکر میں بادشاہ خود موجود ہیں۔ اُس کی ہزار سوار کی جمعیت تھی۔ اُنہیں لے کر بلندی پر قائم ہوا۔ اکبری دلاور جب دریا اُترے تو کنڑ اڑے ٹوٹے پھوٹے تھے۔ بیچ میں جا بجا گڑھے تھے۔ پر جوش بہادر گھاٹ کے پابند نہ رہے۔ ایک سے ایک آگے بڑھا۔ اور جس نے جدھر راہ پائی چڑھ گیا ابراہیم مرزا نے بابا خاں قاقشال پر حملہ کیا۔ کہ فوج پیش قدم کو لے جاتا تھا۔ بابا خاں کو ہٹنا پڑا اور مرزا مار مار دو تک بھگائے چلا گیا۔ اکبر چند بہادروں کے ساتھ شہر پر چلا۔ کہ گھاٹ سے سیدھا دروازے کو رستہ جاتا تھا۔ راہ میں سخت مقابلہ ہوا۔ مگر رُکتا کون تھا۔ اور ہٹنا کب ممکن تھا۔ کچھ دلاور بھی آن پہنچے۔ جم تو گئے مگر بے ڈھب گھر گئے۔ مشکل یہ کہ بادشاہ بھی انہی میں۔ اب سوائے لڑنے اور مرنے کے کسی کو چارہ ہی نہ تھا۔ یہاں اگر مددِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتی۔ تو کام تمام تھا۔ بارے خیر گذری کہ لڑ مر کر غنیم بھاگ گئے۔ اب اکبر کو شہر میں داخل

ہونے کے سوا دوسری صورت نہ تھی۔ بازار تمام اسباب اور بھیڑ سے بھرے پڑے تھے۔ بڑی دھکا پیل
سے سب کو روند سوند کر نکل گئے۔ اور ٹھیک حریف کے پہلو میں جا پہنچے +

وہاں کی سنو کہ باباخاں قاقشال نے سب سے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ غنیم نے ایک سینہ توڑ دھکا دیکر
اُلٹا مارا۔ اتنے میں اور دلاور جا پہنچے۔ پھر جو دست و گریباں ہو کر تلوار چلی۔ اور گھر کر لڑنا پڑا۔ تو یہ عالم
ہوا کہ خدا نظر آگیا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ بہت تھے۔ اکبری دلاور دلوں سے بہت بھاری تھے۔ مگر شمار
میں کچھ نہ تھے۔ اس لئے دشمن کی نگاہ میں ہلکے پڑتے تھے۔ وہ زور سے آتا تھا۔ اور جا بجا ڈٹتا تھا۔
بارے رستے کی خرابی کے سبب سے جو سردار کھنڈ گئے تھے۔ سب آگئے جا بجا لڑائی پڑ گئی۔ اور اس
گھمسان کا رن پڑا کہ اگر اقبال اکبری مدد نہ کرتا۔ تو کام تمام ہو چکا تھا۔ بادشاہ ایک مقام پر گھر گیا۔
اُس وقت راجپوتوں کا یہ عالم تھا۔ کہ اُس کے گرد پھرتے تھے۔ اور اس طرح مر مر کر گرتے تھے۔ جیسے
پتنگے۔ چراغ کے آس پاس تڑپتے ہیں۔ اور نہیں ٹلتے۔ راجہ بھونت بھگوانداس کے بھتیجے مان سنگھ کے
بھائی نے بڑا ساکھا کیا۔ کمال دلاوری سے لڑا۔ اور مارا گیا۔ خاک پر پڑا تھا۔ اور جب تک رمق جان باقی
تھی تلوار کا ہاتھ چلے جاتا تھا۔ اور شیر کی طرح ڈکراتا تھا +

اکبر ایک مقام پر کھڑا تیر مار رہا تھا۔ دو طرفہ بندوق کی باڑ تھی۔ مان سنگھ باپ کے ساتھ اکبر کے
پہلو میں تھا۔ دیکھا کہ غنیم کے تین سپاہی انہیں تاڑ کر آئے ایک کا رخ راجہ بھگوان داس پر اور دو کا
اکبر پر۔ راجہ نے بھی گھوڑا اُٹھایا۔ اُس نے نیزہ مارا۔ راجہ نے وار بچا کر برچھا مارا وہ گھائل ہو کر بھاگا۔ جو
دو اکبر پر آتے تھے۔ اُن پر مان سنگھ چلا۔ اکبر نے کہا۔ خبردار قدم نہ اُٹھانا۔ اور باڑ پر سے آپ گھوڑا اُڑا
کر اُن پر چلا۔ دور و نزدیک اور سردار بھی لڑ رہے تھے۔ کسی کو خیال نہ ہوا۔ راجہ بھگوانداس چلایا۔
کنور جی کیا ہوا دیکھتے ہو۔ اور کھڑے ہو اُس نے کہا کیا کروں مہابلی خفا ہوتے ہیں۔ راجہ نے کہا۔ یہ
وقت خفگی دیکھنے کا ہے! اتنے میں دیکھا کہ دو نوجوں زور سے آئے تھے۔ اُس سے زیادہ شور سے
بھاگے جاتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے۔ کہ جب تک دل میں وفا نہیں ہوتی نہ یہ باتیں
زبان سے نکلتی ہیں نہ یہ رفاقتیں ہاتھ پاؤں سے بن آتی ہیں +

ہم ہیں غلام اُن کے جو ہیں وفا کے بندے	اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے

نواحی پٹن میں پھر سارے مرزا جمع ہوئے۔ صلاح ٹھیری کہ ابراہیم مرزا چھوٹے بھائی مسعود مرزا
کو ساتھ لے کر ہندوستان سے گذرتا ہوا پنجاب پہنچے۔ اور وہاں بغاوت پھیلائے۔ محمد حسین مرزا اور
شاہ مرزا شیر خاں فولادی سے مل کر پٹن جائیں۔ اور ہاتھ پاؤں ہلائیں تاکہ اکبر نے جو سورت کا محاصرہ کیا ہے

دہ کھل جائے کہ یہی ان فتنہ گروں کا بغاوت خانہ تھا۔ (انصاف یہ ہے۔ یہ سب اکبر کے ساتھ خوانعت اور قدرتی بدنیت تھے۔ مگر ان کے صاحب ہمت ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ ہمیشہ گرتے تھے۔ اور اُٹھ کھڑے ہوتے کسی طرح ہمت نہ ہارتے تھے)

اکبر اس مہم سے فارغ ہو کر احمد آباد میں آیا۔ اور اطراف کے بندوبست میں مصروف ہوا۔ ابراہیم حسین مرزا وہاں سے بھاگ کر آبادیوں کو ویران کرتا۔ قافلوں کو لوٹتا ناگور میں آیا۔ رائے سنگھ رام سنگھ۔ فرخ خاں وغیرہ وفاداران اکبری کو خبر پہنچی۔ انہوں نے دم لینے کی فرصت نہ دی۔ سب طرف سے جمع ہوئے۔ اور فوج لے کر آن پڑے۔ سخت لڑائی ہوئی۔ رفیق و ملازم یہاں آکر شامل ہوئے لاہور جانا مناسب نہ دیکھا۔ پھر سنبھل کو چلا گیا۔ وہاں سُنا کہ حسین قلیخان کانگڑہ پر گیا ہوا ہے۔ طمع نے پھر بیقرار کیا اور دوڑا۔ ارادہ یہ کیا کہ بادشاہ گجرات اور سورت کے علاقوں میں فوج لئے پھرتے ہیں۔ آگرہ دلی۔ لاہور مشہور شہر ہیں۔ سب جگہ میدان خالی ہیں۔ دھاوے ماروں گا۔ بادشاہی خزانے ہیں شہر آباد ہیں۔ لوٹ مار سے سامان لیتا جاؤنگا۔ جہاں قدم تھم گئے۔ جم جاؤں گا۔ کچھ نہ ہوا تو ملتان سے سندھ ہو کر پھر گجرات میں آ جاؤں گا۔

آگرہ میں راجہ باڑہ مل مان سنگھ کے دادا تھے۔ انہوں نے جب اس آندھی کی اندھیری دیکھی۔ فوراً دلی وغیرہ مقامات میں فوجیں بھیج دیں۔ اور امرائے اطراف کے بھی خطوط دوڑ گئے۔ مرزا جہاں پہنچا۔ نامرادی نے سامنے سے نشان ہلایا۔ ناچار وحشت اور دہشت کے عالم میں پنجاب کا رُخ کیا۔ سنپت۔ پانی پت۔ کرنال۔ انبالہ۔ ذیل پور وغیرہ شہروں کو لوٹتا ہوا لاہور پر آیا۔ یہاں بھی شہر کے دروازے بند پائے۔ معلوم ہوا کہ حسین[1] قلی خان کوہ کانگڑہ سے سیلاب کی طرح چلا آتا ہے۔ مرزا لاہور سے پانی کی طرح ملتان کو بہے۔ اور رستہ ہی میں بُلبلا ہو کر بیٹھ گئے۔ **مسعود حسین مرزا** قید ہو کر دربار میں گئے۔ اور قلعہ گوالیار میں پہنچ کر ملک عدم کو روانہ ہوئے (قلعہ گوالیار سلاطین چغتائیہ کے عہد میں شہزادوں کا قید خانہ تھا) **محمد حسین مرزا** اور **شاہ مرزا** شیر خانِ فولادی کو ساتھ لے کر بڑے زور وشور سے آئے۔ اور پٹن میں سید محمود بارہہ کو گھیر لیا۔ خان اعظم احمد آباد سے مدد کو پہنچے۔ مرزا نے ۵ کوس آگے بڑھ کر میدان کیا۔ لڑے اور خوب لڑے آخر تیمور کی ہڈی تھی دونوں شہزادوں نے حملہائے مردانہ سے بادشاہی فوجوں کو اُٹھا اُٹھا کر اُلٹ دیا۔ اُمرائے بادشاہی بھی پہاڑ کا پتھر ہو کر میدان میں گڑ گئے۔ اُس وقت رستم خاں اور عبدالمطلب خاں بارہہ مدد کو پہنچے۔ اور

---

[1] دیکھو حسین قلی خان خان جہاں کا حال۔ یہ یلغار بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ صفحہ ۷۰۲۔

خانِ اعظم کی عظمت کو قائم رکھا۔ پھر بھی تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ مرزا کا آراستہ لشکر کھنڈ گیا۔ اس کے غول کے غول اسی طرح جنگل میں بھاگے جاتے تھے۔ جیسے بادل کے ٹکڑے اُڑے جاتے ہیں۔ اور مرزا دکن بھاگ گئے۔ لیکن ۹۸۰ھ میں اختیار الملک کو لے کر پھر آئے۔ اور اس کرّوفر سے آئے کہ گجرات کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مرزا کوکہ کو احمد آباد میں گھیرا اور ایسا دبایا کہ اگر اکبر خود یلغار کر کے نہ پہنچتا۔ تو کوکہ جی کا کام تمام تھا۔ لیکن اس لڑائی میں مرزا کا کام تمام ہو گیا۔

گل رخ بیگم کامران کی بیٹی۔ ابراہیم حسین مرزا سے بیاہی تھی۔ وہ نام کو عورت تھی۔ مگر بڑی مردانی بی بی تھی۔ جب مرزا کرنال کی لڑائی سے بھاگا۔ تو سورت سے بھاگ کر دکن کو چلی گئی۔ قلعہ سرداروں کے حوالہ کر گئی۔ بیگم نے کامران کے خون سے کینہ کی سرخی پائی تھی۔ ابراہیم مرزا کی فتنہ انگیزی خود ظاہر ہے مظفر مرزا دونوں سے ترکیب پا کر طرفہ معجون پیدا ہوا۔ مہر علی ایک نمک پروردہ ابراہیم مرزا کا اس کے ساتھ تھا۔ ماں کی مہر۔ اور مہر علی کی تربیت دکن میں لڑکے کو فساد کی مشق اور فتنہ کی تعلیم دیتی رہی ۹۸۵ھ میں ۱۵ - ۱۶ برس کی عمر ہوئی تو اوباشوں کا انبوہ جمع کر کے اطرافِ گجرات میں آئے۔ اور امرائے بادشاہی کو شکست دی۔ مظفر مرزا ظفر یاب ہو کر کمبایت میں گیا۔ باوجودیکہ دو ہزار سے کچھ زیادہ جمعیت تھی۔ اور وزیر خاں کے پاس ۳ ہزار فوج تھی۔ وزیر خاں کو قلعہ میں ڈال کر گھیر لیا۔ اتفاقاً راجہ ٹوڈرمل پٹن میں دیکھ رہے تھے۔ اگر نہ جا پہنچتے۔ تو لڑکے نے وزیر کو شاہ مات دے دی تھی۔ راجہ پہنچے تو وہ بھاگا۔ دونو امیر پیچھے دوڑے۔ وہ دُلقہ پر جا پہنچا۔ اور ایک میدان لڑ کر دل کا ارمان نکالا۔ آخر جونا گڑھ کو بھاگ گیا۔ ٹوڈرمل تو دربار شاہی میں آن حاضر ہوئے۔ وزیر خاں احمد آباد میں آئے۔ مرزا پھر آیا۔ وزیر خاں پھر قلعہ میں بیٹھ گئے۔ اس نے محاصرہ ڈال کر حملے شروع کئے۔ ایک دن سیڑھیاں لگا کر قلعہ کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ قریب تھا کہ قلعہ ٹوٹ جائے۔ یکایک اقبال اکبری نے طلسم کاری دکھائی۔ مہر علی نے کہ مرزا کی تدبیروں کا صندوق تھا۔ سینہ پر بندوق کھائی۔ اور صندوق اعمال میں پہنچ گیا۔

اس کے مرتے ہی مرزا بھاگے اور چند روز کے بعد راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے مقصود جوہری کو فرمان کے ساتھ بھیجا۔ راجہ علیخاں خود دربار اکبری میں سرخروئی کے رنگ ڈھونڈتا تھا۔ اسے گوہر مقصود سمجھا۔ اور تحائف اور پیش کش کے ساتھ مقصود کے ہمراہ روانۂ دربار کیا۔ چند روز کے بعد گل رخ بیگم کی اور اس کی حالت دیکھ کر بادشاہ نے شرف دامادی سے اعزاز بخشا۔ اور اس کی بہن سے سلیم کا عقد کر دیا۔ اب تم سب دلی رہینگے مرزاؤں کا فساد ۱۱ جلوس سے شروع اور ۲۲ میں تمام ہوا۔

ابراہیم مرزا انتہائی درجہ کا بہادر تھا۔ مگر تھوڑا مادہ جنون کا بھی رکھتا تھا۔ سب بھائی ایک دن بیٹھے ہنسی بول رہے تھے۔ کرنال کی شکست کا ذکر آگیا۔ ہنسی میں بات بڑھ گئی۔ ابراہیم ایسے بگڑے کہ خفا ہو کر اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور آگرہ کا رُخ کیا۔ رستہ میں ناگور ملا۔ اُس پر دھاوا مارا۔ خان کلاں کا بیٹا حاکم تھا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھا۔ مرزا نے شہر کو لوٹ کر توڑجینیں بھریں۔ اور محاصرہ کر کے بیٹھ گیا۔ اُمرا جو نواح جودھ پور وغیرہ میں پڑے تھے اُٹھ کر دوڑے بعض اُمرا اکبر کے پاس چلے تھے کہ مہم گجرات میں تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور مرزا پر ہجوم کر کے چلے۔ مرزا اُن کی آمد آمد میں گھبرا کر بھاگا۔ جب یہ آئے۔ تو اندر باہر والے شامل ہوئے۔ اور اُس کے پیچھے گھوڑے دوڑائے وہ ایک مقام پر جما اور فوج کے تین حصہ کر کے مقابلہ کیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ مرزا نہایت جوانمردی سے لڑا لیکن نمک حرامی ضرور اثر دکھاتی ہے۔ مرزا بحال تباہ بھاگا۔ اس کا گھوڑا تیر کھا کر گرا تھا۔ دُور تک پیادہ پا جنگل پایا۔ مارے اسی کا ایک نوکر مل گیا۔ اُس نے گھوڑا دیا۔ سوار ہو کر دلی پہنچا۔

شیری مُلّا

ملک پنجاب میں دریائے بیاس کے کنارہ پر کوکووال گاؤں ہے۔ مُلّا وہاں کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں خود اشارہ کرتے ہیں ؎

اے خوش آں شب کہ ہر دم در دعائے وصل او	سورۂ واللیل خوانم برلب آب سیاہ
فیل رفتاران آہو چشم کوکووال را	میکنم ہر لحظہ یاد و مے کشم از سینہ آہ

قوم کے ماچھی تھے (ماہی گیر) اپنے والد مُلّا یحییٰ کی خدمت میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ یہ بھی کہا کرتے تھے۔ کہ میری ماں سادات میں سے تھی۔ طبیعت ایسی شوخ لائے تھے۔ جو کہ شاعری کے لئے نہایت مناسب تھی۔ اور زبان میں عجب لطف کا نمک تھا۔ یہ قدرتی نعمتیں خداداد ہیں۔ شرافت اور خاندانوں کا ان پر زور نہیں چلتا۔ طبیعت نہایت رواں تھی۔ کہتے تھے کہ ایک دفعہ رات کو ذہن لڑ گیا۔ موقع بھی ضرورت کا تھا۔ ۳۰ غزلیں ایک قلم سے لکھی تھیں۔

لطیفہ۔ ایک دن جلسۂ احباب میں اپنے اشعار سنا رہے تھے۔ کتاب انداختم۔ حساب انداختم۔ بردوش احباب انداختم۔ ان میں مصرع تھا۔

ع چار دفتر شعر در آب حباب انداختم۔ دیوان ہاتھ میں تھا۔ مولینا الہ داد امروہہ نے فوراً کہا۔ کیا خوب ہوتا اگر یہ پرانی دیگچی بھی اُس میں پھینک دیتے۔

لطیفہ۔ جن دنوں اکبر نے مہابھارت کے ترجمہ کی خدمت چند اشخاص کے سپرد کی۔ ایک حصہ انہیں ملا۔ ایک دن دوستوں کے جلسہ میں بیٹھے تھے۔ ترجمہ کی دقتوں کی شکایتیں ہونے لگیں۔

ایک شخص نے کہا۔ ملا کیا حال ہے۔ تم بھی تو کچھ بولو۔ کہا کیا بولوں۔ ایسے افسانے لکھنے پڑتے ہیں جیسے کوئی بخار کی بیہوشی میں خواب دیکھتا ہے ٭

طبیعت میں بے نیازی فقر اور دردمندی بہت تھی۔ ایک اور قطعہ کے دو شعر ہیں ؎

صاحبِ خوانِ فقدم و ہرگز ۔۔۔ ہمت من نخواہد از جاناں

قرض ہندو بشرط دہ پنجاہ ۔۔۔ بہ کہ انعام ایں مسلماناں

ملا صاحب بھی کہتے ہیں۔ کہ ہم عصروں میں شکوہ یا شکایت کے مضامین اس سے بہتر کسی نے نہیں کہے۔ دو شعر ایک اور قطعہ کے ہیں ؎

گذشتگاں ہمہ عشرت کنند کاو دید ۔۔۔ از انکہ عیش بر افتادہ از زمانۂ ما

ایا کساں کہ پس از ما رسید فاتحہ ۔۔۔ بشکر آنکہ نبو دید در زمانۂ ما

اس وقت ملا صاحب مہربان تھے۔ فرماتے ہیں۔ کہ قصیدہ اور قطعہ گوئی کے میدان میں ہمقدم اشخاص سے آگے نکل گیا۔ اور اُن کی فصاحت کی مشکیں باندھ کر گویائی کے منہ پر سکوت کی مہر لگا دی۔ اسی قطعہ سے سمجھ لو ؎

اگر از شعر شیرم پرسی ۔۔۔ گویم از درمیانہ انصاف است

غزل و مثنویش جملہ سقط ۔۔۔ دیں سخن نے ستیزہ نے لاف است

نہ ہمہ شعر شاعراں سرہ است ۔۔۔ نہ ہمہ بادہ کساں صاف است

لیک ہیت قصیدہ و قطعہ ۔۔۔ رفتہ از وے زقاف تاقاف است

شیری ارذال را مکن قدسے ۔۔۔ کہ مناسب بحالِ اشراف است

اکبر کی تعریف میں اکثر قصائد لکھے ہیں۔ اُن میں بھی صفائی کلام کے ساتھ ایجاد و اختراع کی داد دی ہے۔ لیکن جب بدمذہبوں کی گرم بازاری ہوئی۔ تو جل کر ایک قطعہ میں دل کا بخار بھی خوب نکالا۔ مجھے اس میں سے پانچ شعر ہاتھ آئے ٭

تا ابد ہر زباں کشور بر انداز آفتے ۔۔۔ فتنہ در کوتے حوادث کتخدا خواہد شدن

با عقاب قرمخواہ و خنجر ارباب شرک ۔۔۔ بارہ سر از ذمۂ گردن جدا خواہد شدن

فیلسوف کذب را خواہد گریباں پارہ شد ۔۔۔ خرقہ پوش زہد را تقوے ردا خواہد شدن

شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلے ۔۔۔ کز خلائق ہر پیغمبر جدا خواہد شدن

بادشاہ امسال دعوئ نبوت کردہ است ۔۔۔ گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

اکبر نے مان سنگھ کو حکم بھیجا۔ کہ کانگڑہ پر لشکر لے کر جاؤ۔ وہ سامان میں مصروف ہوا۔ مُلّا شیری نے قطعہ کہا ؂

شہا فرماں فرستادی بہ راجہ کہ سازد ہندوان کوہ را رام
چناں رونق گرفت از عدل تو دیں کہ ہندو میزند شمشیر اسلام

سنہ ۹۷۶ھ میں قلعہ رنتھنبور فتح ہوا تو انھوں نے تاریخ کہی اس کا شعر اخیر ہے ؂

قلعہ کفر چو از دولت شہ یافت شکست شہ کفار شکن یافتہ شیری سالش

اسی سال میں آگرہ کے نئے قلعہ کا دروازہ عظیم الشان تیار ہوا۔ اس کے دونوں پہلوؤں پر دو پتھر کے ہاتھی کھڑے کیے تھے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام ہتیا پول دروازہ رکھا تھا۔ پول سنسکرت میں دروازہ کو کہتے ہیں۔ مُلّا شیری نے تاریخ کہی۔ اس کا شعر آخر ہے ؂

کلک شیری پئے تاریخ نوشت بے مثال آمدہ دروازۂ فیل

میر علاء الدولہ اپنے تذکرہ میں اکبر کے حالات میں لکھتے ہیں۔ کہ ہاتھیوں کا بہت شوق اور ہاتھی کی سواری میں کمال تھا۔ طب فیل میں ایک رسالہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کروایا تھا۔ اور مُلّا شیری ہندی نے اُسے نظم میں لکھا تھا۔

آخر مُلّا صاحب کو ان سے بھی خفا ہونا پڑا۔ کیونکہ زمانہ کا رنگ دیکھ کر ان کی طبیعت بھی بدل گئی آفتاب کی تعریف میں ہزار قطعے کہے۔ اور اس کا نام ہزار شعاع رکھا۔ نظام الدین بخشی طبقات اکبری میں اس مجموعہ کا نام شمع جہاں افروز لکھتے ہیں۔ اور ایک قطعہ بھی نمونہ کے طور پر لکھتے ہیں۔

در عشق کساں اسیر محنت بسیار رخنیدہ ام کساں را
معشوق دل آفتاب باید امید بآرزو رساں را

سنہ ۹۹۴ھ میں یوسف زئی کی مہم میں جہاں راجہ بیربر ہزاروں آدمیوں کے ساتھ رہے۔ وہیں یہ بھی۔

شیخ گدائی کنبو

پہلے ان کے والد شیخ جمالی کا حال سننا چاہیے۔ کہ سکندر لودھی کے عہد میں شعرائے باکمال میں شمار ہوتے تھے۔ اور شیخ جمال کنبو ہی دہلوی کہلاتے تھے۔ وہ شیخ سماء الدین کے مرید تھے۔ کہ مشائخ کبار اور علماء روزگار میں تھے۔ شیخ جمالی سے سکندر لودھی بھی اصلاح لیا کرتا تھا۔

مُلّا صاحب لکھتے ہیں کہ ہیئت مجموعی ان کی چند فضائل سے مرکب تھی۔ سیاحی بھی بہت کی تھی۔ مولانا جامی کی خدمت میں پہنچ کر فیض نظر اور اشعار نے شرف قبول پایا۔ آزاد۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ پہلی ملاقات میں اپنا حال کچھ ظاہر نہ کیا۔ اور پاس جا بیٹھے۔ تن برہنہ فقط لنگ باندھے تھے فقیرانہ

حالت تھی۔ اُنہوں نے کہا۔ میاں خسرو تو چند فرق است۔ انہوں نے بالشت بیچ میں رکھ دی۔ اُنہوں نے تحمل کیا۔ اور کہا کیستی۔ انہوں نے کہا۔ از خاکساران ہند۔ ان کا کلام وہاں تک پہنچ چکا تھا۔ پوچھا از سخنان جمالی چیزے یاد داری۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا +

دو سہ گز کہنہ بوریا پوستکے	دلکے پُر زدرد دوستکے
لنگکے زیرو لنگکے بالا	نے غم دزد و نے غم کالا
ایں قدر بس بود جمالی را	عاشق رند لاابالی را

انہوں نے کہا۔ طبع شعر داری؟ یعنی کچھ شعر کہتے ہو۔ اُنہوں نے مطلع پڑھا۔

ما را ز خاک کویت پیراہن است بر تن	آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

یہ کہا۔ اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بدن پر تمام گرد پڑی تھی۔ سینہ پر جو آنسو گرے۔ گرد چاک چاک ہو گئی۔ مولینا جامی سمجھ گئے۔ اُٹھ کر گلے ملے اور تعظیم اور تواضع سے پیش آئے۔ آخر ۹۴۲ھ میں دلی میں مر گئے۔ تاریخ ہوئی۔ خسرو ہند بودہ +

ان کی ایک غزل اکبری عہد میں مشہور تھی۔ کہ اُنہوں نے خود ہندوستانی راگ میں اس کی لَے رکھی تھی۔

طال شوقی الی بقائکم	ایہا الغائبون من نظری
روز و شب مونسم خیال شماست	فاسئلوا عن خیالکم خبری

مقالات وحالات مشائخ میں ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔ سیر العارفین اس کا نام ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی سے شروع کر کے شیخ سماء الدین کنبو اپنے پیر پر ختم کیا ہے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں تو وہ بھی تناقض اور سقم سے خالی نہیں۔ اس کے علاوہ اور تصنیفات بھی نظم و نثر میں یادگار چھوڑیں کہ اٹھ نو ہزار بیت ہونگے +

مُلّا صاحب ۹۵۹ھ میں لکھتے ہیں۔ شیخ عبد الحی ولد شیخ جمالی کنبوہی۔ دہلوی نے کہ فضائل علمی و شعری سے آراستہ اور صاحب سجادہ اور ندیم اور مصاحب خاص الخاص سلیم شاہ کے تھے۔ اس

ے سلطان بہلول لودھی مر گیا۔ تو سکندر لودھی تخت نشین ہوا۔ ۱۹ وہ وغیرہ ملک مشرقی کے انتظام کے لئے چلا۔ خیال تھا کہ مبادا دوسرا بھائی دعویدار ہو۔ اس لئے شیخ سماء الدین کی خدمت میں گیا اور برکت کے لئے کتاب مرشد ہدائی شروع کی۔ اس کی ابتدا یوں اسعد کم اللہ تعالے لے الدین خیرا پڑھ کر کہا۔ کہ اس کے معنی ارشاد ہوں۔ اُنہوں نے فرمایا نیک بخت گرد انا و ترا غدا تیعالے۔ اس نے کہا آپ تین دفعہ یہی فرمائیں۔ اُنہوں نے کہا تو یہ خوش ہوئے اور عرض کی کہ میں اپنے مطلب کو پہنچ گیا۔ غرض شیخ سے رخصت لے کر لشکر کو کوچ کا حکم دیا +

سال میں امانت حیات سپرد کی۔ سید شاہ میر نے تاریخ کہی ہے

گفتت نام ہے شود تاریخ		بندہ وقتے کہ درمیاں نبود	

جب اکبر نے تاج شاہی سر پر رکھا تو دروازے کھلے تھے۔ دربانوں کی جگہ دلجوئی اور تالیف قلوب دونوں چوکیوں پر بیٹھے تھے۔ کہ جو آئے۔ عزت سے لا کر حاضر کرو جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ اکبر کی خدائی ہے اور بیرم خاں فرمانروائی تو شیخ گدائی بھی گجرات سے پہنچے اور صدارت کا عہدہ مل گیا۔

ملا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمایوں کی شکست دوم کے بعد شیخ گدائی پسر شیخ جمالی کنبو دہلوی نے خان خاناں کے ساتھ آوارگی گجرات میں رفاقت پیدا کی تھی۔ اُس نے اس حق پر تمام اکابر ہندوستان سے بڑھا کر صدارت کا منصب رفیع القدر اس کے لئے مسلم کیا۔ خانخاناں بلکہ اکبر بھی اکثر اوقات اُس کے ہاں حال و قال کی مجلس میں (جس پر سراسر ظاہرداری برستی تھی) جاتے تھے۔

جب سے ہندوستان میں بنائے اسلام واقع ہوئی ہے۔ خدا نے یہاں کے بزرگوں شرفا اور امرا کو ہمیشہ ست رعیت سرشت۔ محکوم طبیعت۔ پست فطرت پیدا کیا ہے۔ جاہ و دولت ان کی کبھی ضرب شمشیر سے نہیں حاصل ہوئی۔ مگر فریب دغا۔ نفاق ذاتی اور بدنامی سے سرداری و سرداری کا جامہ اُن کے قامت ہمت پر چھوٹا ہی آیا چنانچہ شیخ کی معراج سے جس کے نسب کو بھی اچھا نہ سمجھتے تھے سب اکابر آئمہ گھبرائے۔ اور گھر گھر کہرام مچ گیا۔ کبرنی موت الکبراء (بڑوں کی موت نے مجھے بڑھاپا) کا بھید اب سمجھ میں آ گیا۔

در تنگ نائے بیرم از نخوتِ رقیب		یارب مباد آنکہ گدا معتبر شود	

اُس نے خان وادہ ہائے قدیم کی اراضی مدد معاش اور وقفی املاکوں پر قلم نسخ پھیر دیا جو اس کے دربار کی خواری اٹھاتا تھا اُس کو جاگیر ملتی تھی۔ نہیں تو نہیں (آج تو ۵ بیگہ کی جاگیر بلکہ اس سے کم میں بھی کلام ہے اس حساب سے تو اسے عالم بخش کہنا چاہیئے) ولایت کے اعیان اور اشراف بھی جو آتے تھے تو اُس کی حکومت اور غرور کے سبب سے متردد رہتے تھے۔

گر فرو تر نشست خاقانی	نزد را عیب و نے ترا لوباست
مے نہ بینی کہ سورۃ اخلاص	زیر تبت یدا ابی لہب است

پھر فرماتے ہیں کہ سید نعمت اللہ اسولی نے ایک قطعہ کہا۔ کہ مساجد و مدارس میں مشہور ہے۔ بعض شیاطین شیخ گدائی کی مسجد اور دیوان خانہ میں جا کر دیواروں پہ لکھ آئے۔ آپ نے پڑھ کر مٹا دیا۔ مگر کیا فائدہ۔ اسی میں سے ایک بیت یہ ہے

نام گدائی مبر نان گدائی مخور	زانکہ گدائی بدست روئے گدائی سیاہ

بعض باتیں بے اخلاصی اور بے ادائی اور بدرائی کی بندگان شاہی کی نسبت بھی اس سے ظاہر ہوتیں۔ کہ بجائے خود لکھی گئیں۔

جہاں خانخاناں کے اقبال نے بیوفائی کی ہے اور رفیق اُس کے جُدا ہونے شروع ہوئے ہیں وہیں ایک چٹکی لیتے ہیں۔ آخر مدد و بیکانیر میں شیخ گدائی بھی الگ ہو گئے۔ اور اس شعر کا راز کھُل گیا۔

وکل اخ یفارقہٗ اخوہ	لعمر ابیک الا الفرقدان

وہاں سے دلّی آئے۔ تب بھی معزز و مکرم تھے۔ مشائخ دہلی قدس اللہ ارواحہم کے مزاروں پر عرسوں میں حاضر ہوتے تھے۔ اور مجالس عالی میں بڑے کروفر سے بیٹھتے تھے۔

پھر ۹۷۶ھ میں لکھتے ہیں۔ اسی سال میں انزا شحنہ مردک نام شیخ گدائی کنبوہ کہ زمانہ کا زانڈل پکھال پیٹنا۔ اور پندار و غرور کمالات و مثالت تمام گیا۔ تاریخ ہوئی۔ "مردہ خوک کلان"۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔ طبیعت موزوں تھی۔ ہندی گیت اور دُہروں کی لَے آپ رکھتے تھے قوالوں سے گواتے تھے۔ اور آپ بھی گاتے تھے اور اُس کے ذوق و شوق میں لوٹتے اور دیوانے تھے۔

مُلّا صاحب کہتے ہیں کہ اس کی اولاد کا گھر بھی اور گھروں کی طرح خراب ہے۔ اسی طرح زمانہ چلا آیا ہے۔ اور حکم الٰہی اسی قانون پر چلتا ہے۔ یہ اُس کی غزل ہے ؎

گمے جاں منزل غم شدگے دل	غمت را می برم منزل بہ منزل
مشو غافل زحالِ دردمندی	کہ از حال تو یک دم نیست غافل
دلِ دیوانہ در زلف تو بستم	گرفتارم بہ آں مشکیں سلاسل
بجاں دادن اگر آساں شدے کار	نبودے عاشقاں را کار مشکل
گدائی جاں بہ ناکامی برآید	نشد کامم زلعل یار حاصل

پھر مُلّا صاحب فرماتے ہیں یہ غزل تذکرہ علاؤالدولہ سے نقل کی ہے۔ قابل اعتبار نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ شیخ گدائی کی نہ ہوگی۔ **آزاد**۔ میر علاؤالدولہ کے تذکرہ کی بے اعتباری کا اور بھی کئی جگہ مُلّا صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اس کا سبب جانتے ہو؟ یہ میر عبداللطیف قزوینی کے بھتیجے تھے مگر انہوں نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا۔

آزاد حیران تھا کہ شیخ گدائی اور اُن کے بزرگوں کی کوئی بُرائی اب تک نہیں نظر آئی کیا سبب ہے کہ اکثر اہل تاریخ انہیں سبک الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اور مُلّا صاحب کا تو کیا کہنا ہے نظم نثر لطیفہ تاریخ کے نیزدل ست خاک تودہ بنا دیا ہے۔ آخر الامر اسی سے یہ عقدہ حل ہوا۔ کہ اُن کے خاندان کا مذہب بھی

شیعہ تھا۔ الٰہی تیری امان۔ الٰہی تیری امان ؎

بدنہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سُنے ہے یہ گنبد کا کہا۔ جیسی کہے ویسی سنے

فصیح فارس کیا خوب کہتا ہے :۔

درحقیقت نسبِ عاشق و معشوق یکے است	بوالفضولاں صنم و برہمنے ساختہ اند
یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں	ہر کُجے مے نگری انجمنے ساختہ اند

شیخ حسین اجمیری

مُلّا عبدالقادر بدایونی کہتے ہیں۔ کہ مشہور تھا کہ خواجہ معین الدین چشتی کی اولاد میں ہیں۔ مدت سے اُن کی درگاہ کے متولی تھے۔ اس سبب سے اعزاز و اکرام اور شان و شکوہ بادشاہانہ ہوگئی تھی۔ بزرگان سیکری وال (شیخ سلیم چشتی اور اُن کا خاندان) بھی اُنہیں توڑنا چاہتے تھے۔ آخر بادشاہ بھی برہم ہوگئے۔ تحقیق ہونے لگی کہ یہ خواجہ معین الدین چشتی کی ولادمیں یا نہیں۔ مشائخ اور علمانے محضر لکھ دیے کہ اُن کی اولاد ہی نہ تھی۔ متولی کا عہدہ چھن گیا۔ پھر بھی لوگوں کی طرف سے اعزاز و اکرام قائم تھا۔ اس لئے بادشاہ نے حج کو بھیج دیا۔ وہ حج اور زیارتیں کرکے پھر ہندوستان میں آئے۔ ملازمت ہوئی تو پرانے آدمی تھے۔ اپنے قدیمی طریقہ سے ملے۔ اہل دربار کی طرح آداب نہ بجا لاتے۔ بادشاہ کو پھر بدگمانی تازہ ہوئی۔ اس لئے ۱۰۰۲ھ میں بھکر بھیج دیا چند روز کے بعد جلاوطن خانہ بربادوں کی سفارشیں ہوئیں۔ شیخ کمال بیابانی اور بعض مشائخ قاضی عالم وغیرہ جو بھکر میں نکلے ہوئے تھے۔ طلب ہوئے۔ سب آئے۔ آداب کورنش بجا لائے۔ سجدے کئے۔ زمین چومی۔ شیخ حسین بیچارے سیدھے سادے آدمی تھے۔ ۸۷ برس کی عمر تھی۔ انہوں نے وہ آداب ادا کئے۔ نہ اُنہیں آتے تھے۔ حکم دیا کہ تین سو بیگہ زمین جاگیر کرکے پھر وہیں بھیج دو لوگوں نے بھی عرض کی۔ مریم مکانی (اکبر کی ماں نے محل میں سفارش کی۔ اور کہا بوتم او مادر پیر فرتوت وار دور جمیر دلش برائے دیدن فرزند کباب است چہ شود اگر اورا رخصت فرمایند۔ او ہیچ مدد معاش از شما نمے خواہد۔" اکبر نے ہرگز نہ مانا۔ اور کہا "آنچہ جیو درآنجا کہ می رود بازدکانے برائے خود وا میکند و فتوحات نذر و نیاز بسیار برائے او می آرند۔ او جماعت را گمراہ می سازد غایتش اینکہ والدہ خود را از اجمیر ہمانجا طلبد۔ یہ بات اُنہیں بھکر جانے سے بھی مشکل تھی۔ مُلّا صاحب کے اعتراض سب درست مگر ان لفظوں کو خیال کرو۔ کہ بادشاہ کو ان لوگوں کی طرف سے کیسا خطر تھا۔ اور کس قدر بچاؤ کرتا تھا۔

مُلّا صاحب فرماتے ہیں۔ بادشاہ نے خود ہی ایک دن تجویز فرمائی۔ کہ مجھے اجمیر کا متولی کر دیں۔ جب صدر جہاں نے اس مطلب سے مجھے پیش کیا۔ تو بعض خدمتوں کی ضرورت سے خود ہی اس تجویز کو ملتوی کر دیا اور پوچھا

آن پیر بلوچ کجاست (وہی شیخ حسین اجمیری) ہیں پاس موجود تھا۔ میں نے یاد دلایا کہ لاہور میں ہیں اور صدر جہاں سب سے بڑے مبالغہ کے ساتھ کہا کہ میں تو اس سعادت کے لائق نہیں اسی کو کردیں کہ حق مرکز پر ٹھیر جائے۔ مگر ہندوستان کی اصالت میں داخل ہے۔ کہ ہم جنس کو بڑھتے نہیں دیکھ سکتے۔ اور آپس میں سینہ صاف کبھی نہیں رہتے۔ اُس نے ایسی سعی نہ کی جس کا وہ یا میں شکر گزار ہوتا۔ بدنصیب مرحوم اب تک حیران پریشان۔ شکستہ حال۔ گوشہ گمنامی میں تڑپتا ہے۔ نہ اُمرا کے گھروں پر جانے کی مجال ہے۔ نہ کوئی وسیلہ بہم پہنچانے کی خواہش ہے۔ اور آج کل عرض معروض کا رستہ بند اور وسیلہ کا گھر بھی ویران ہے۔ ہاں شیخ موصوف اپنی ذات سے زمانہ کی برکت ہیں۔ اور دنیا میں غنیمت ہیں میری اُن سے جان پہچان بھی نہ تھی جب سفر مکہ سے پھر کر اور قید کی مصیبت بھر کر آئے تو دیکھا تھا کہ نور کا ڈھیر ہے۔ اور فرشتہ مجسم ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

شیخ محمد غوث گوالیاری

شیخ ظہور اور حاجی حضور عرف حاجی حمید کے مرید تھے۔ سلسلہ اُن کا شطاریہ تھا۔ کہ سلطان العارفین شیخ بایزید بسطامی سے منسوب ہیں۔ کوہ چنار کے دامن اور جنگل میں ۱۲ برس تک بنا سپتی کھا کر یاد الٰہی کرتے رہے۔ غار میں بیٹھے رہے۔ اور سخت ریاضتیں کیں۔ غار مذکور مدتوں تک ریاضت ہائے شیخ کی نمائش گاہ کا ایک متبرک نمونہ تھا۔ کہ ان کے خویش و اقارب سیاحوں اور مسافروں کو دکھایا کرتے تھے۔ تسخیر کواکب دعوت اسما اور عمل و اعمال اور تصرفات ان کے تیر بہدف مشہور ہیں۔ یہ کمال اپنے بڑے بھائی شیخ پھول سے حاصل کیے تھے۔ قال اللہ اور قال الرسول کے ذکر سے کبھی صحبت خالی نہ تھی۔ خاص و عام ہندوستان کے شیخ کے ساتھ دلی ارادت اور اعتقاد رکھتے تھے۔ اور ایک وقت ایسا ہوتا تھا۔ کہ بادشاہوں کو اپنی دُنیہ کے کاموں میں بھی اُن کی طرف رجوع کرنی پڑتی تھی۔ گجرات۔ بنگالہ اور دہلی میں نامی مشائخ ان کے دامن وسیع کو پکڑے رہے۔ جبکہ بابر بادشاہ آگرہ تک پہنچ کر ملک گیری کر رہے تھے۔ اس وقت تاتار خاں والی گوالیار کو اپنی اطراف کے بعض سرداروں کی طرف سے کچھ خطر معلوم ہوا۔ اُس نے بابر کو عرضی بھیج کر اطاعت ظاہر کی۔ بابر نے خواجہ رحیم داد اور شیخ گھورن کو فوج دے کر بھیجا کہ قلعہ پر قبضہ کرلیں جب یہ فوج لے کر پہنچے تو تاتار خاں اپنے قول سے پھر گیا۔ دونوں سردار حیران پڑے تھے۔ شیخ محمد غوث ان دنوں قلعے میں رہتے تھے۔ اُنہوں نے ایک بااقبال بادشاہ کی آمد آمد دیکھ کر اندر سے تدبیر بتائی۔ اس کے بموجب

---

[1] ملا صاحب اس خیال کے لکھتے وقت مہربانی کے دم میں تھے فرماتے ہیں۔ ایں جماعت برہنمونی شیخ محمد غوث کہ یگانہ زمانہ و در دعوت اسمانشانہ بود بہ تدبیر صاحب در قلعہ درمی آیند۔

انہوں نے تاتار خاں کو کہلا بھیجا۔ کہ ہم جو یہاں آئے تو فقط اس لئے کہ تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچائیں اور
آئے تو تمہارے بلانے سے آئے۔ اب کف دست میدان میں پڑے ہیں۔ کوئی پناہ نہیں۔ اور دشمن
فوجیں لئے انہی حدود میں پھرتے ہیں۔ دن کو ان کے چھاپے کا ڈر ہے۔ رات کو شبخون کا خطر ہے۔
اتنی اجازت دو کہ ہم چند خدمتگاروں کے ساتھ رات کو قلعہ میں آ جائیں۔ لشکر باہر رہیگا۔

تاتار خاں بچارا سپاہی مزاج امیر تھا۔ اُس نے صاف دل سے اجازت دے دی۔ اور غضب یہ
کیا کہ کچھ غفلت سے کچھ اپنے قلعہ اور سامان کے گھمنڈ سے بے پروا پڑا سو گیا۔ سرداران مذکور نے راتوں
رات اپنے بہت سے آدمی قلعہ میں پہنچا دئے۔ اور بہانہ یہ کیا کہ مزدور ہیں۔ ضروری اسباب اندر لے جاتے
ہیں۔ دروازہ پر پہرہ دار شیخ کے مرید تھے۔ انہیں بھی مرشد کا حکم پہنچ چکا تھا۔ غرض تاتار خاں کو اسوقت
خبر ہوئی۔ کہ فوج بابری کی جماعت کثیر اندر پہنچ چکی تھی۔ اور کام ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ چار و ناچار قلعہ
حوالہ کرنا پڑا۔ اور آپ دربار میں حاضر ہوا۔

ہمایوں کو شیخ محمد غوث اور اُن کے بڑے بھائی شیخ پھول کی تسخیر کواکب اور دعوات و اعمال
کا ایسا اعتقاد تھا۔ کہ کسی کا نہ تھا۔ مصاحبان روحانی میں شمار ہوتے تھے۔ اور شیخ خود بھی کبھی ہمایوں کے پیر
بنکر کبھی مصاحب با عقیدت ہو کر فخر کیا کرتے تھے اور بادشاہ نے خود بھی عمل اعمال سیکھے تھے
جب ہمایوں بنگالہ میں تھا اور اس کی سلطنت بگڑی ہوئی تھی۔ تو مرزا ہندال نے آگرہ میں آکر بادشاہی
دعوے کرکے چاہا کہ تخت سلطنت پر جلوس کرے۔ ہمایوں نے شیخ پھول کو بھیجا کہ بزرگ شخص ہیں اور
سب اُن کا ادب کرتے ہیں۔ اُن کی فہمائش سے اثر پذیر ہوگا۔ مرزا کو وہم یہ ہوا۔ کہ ستاروں کی تاثیر سے
شیخ پھول میرا چراغ گل کرنے آئے ہیں۔ افسوس کہ اُس نے چار باغ میں کہ بابر نے آگرہ میں بنوایا تھا۔
شیخ پھول کو خون ہلاک سے گلگوں کیا۔ محمد بخش کو ان سے بہت اعتقاد تھا۔ وہ لاش لے گیا۔ اور قلعہ بیانہ
میں دفن کرکے مقبرہ بنایا۔ اُدھر شیر شاہ شیخ محمد غوث کے درپے ہوا۔ یہ عیال و اطفال۔ مریدوں اور
متعلقوں اور سارے کارخانوں کو لیکر احمد آباد گجرات میں چلے گئے۔ وہاں بھی بڑی عزت و عظمت سے
رہے۔ مریدوں اور معتقدوں کی کیا کمی تھی خلق خدا کو ہدایت کرنے لگے۔ شیخ علی متقی کہ وہاں کے مشائخ کبار
اور علمائے بزرگوار و صاحب اقتدار میں تھے۔ انہوں نے شیخ کے قتل پر فتوے لکھے۔ وہاں میاں وجیہ الدین
احمد آبادی ایک بزرگ تھے۔ کہ وہ بھی اُن کے ہم رتبہ تھے۔ بادشاہ نے اُن کے پاس مہر کے لئے فتوے
بھیجا۔ اتفاق سے میاں پہلے ہی شیخ سے مل چکے تھے۔ اور صورت دیکھتے ہی عاشق ہو گئے تھے انہوں
نے فتوے پھاڑ ڈالا شیخ علی بے اختیار میاں کے گھر دوڑے آئے۔ اور کپڑے پھاڑ کر بولے۔ آپ کیونکر

پسند کرتے ہیں۔ کہ بدعت پھیلے۔ اور دین میں رخنہ پڑے۔ میاں نے کہا۔ ہم اہل قال ہیں اور شیخ اہل حال ہیں۔ ہمارا فہم ان کی باتوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور ظاہر شریعت میں کوئی اعتراض بھی ان پر نہیں آسکتا۔ خاص و عام دکن کے میاں کے ساتھ دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔ میاں کی اتنی بات سنتے ہی سب شیخ کے معتقد ہو گئے۔ اور یا تو جان پر نوبت پہنچی تھی۔ یا امرا و حکام تک مرید و معتقد ہو گئے۔ فاضل بدایونی یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اگرچہ میاں اور گھرانے کے مرید تھے۔ مگر آداب طریقت شیخ محمد غوث سے پائے اور ناتمام کام کو انہیں نے تمام کیا۔

گجرات دکن میں شیخ کی ہدایت و ارشاد کا بازار گرم تھا کہ اکبر کے اقبال نے جہان کو روشن کیا۔ فاضل موصوف لکھتے ہیں کہ یہ بھی اپنے مریدوں اور معتقدوں کے انبوہ کو لے کر چلے۔ اور بڑے کر و فر سے آگرہ پہنچے۔ انواع و اقسام کے وسیلے بیچ میں لائے۔ اول اول پسند اور شوق کی خبریں دے کر مریدی کے جال میں بھی پھنسانا چاہا۔ شاہنشاہ اعتقاد دست کے ساتھ جا کر ملے۔ اور اصل حال معلوم کر کے جلدی ہی اُچاٹ ہو گئے۔ شیخ گدائی (شیخ جمالی دہلوی کنبو کے بیٹے) اس وقت صدر الصدور تھے۔ اور دکان خوب جمی ہوئی تھی۔ انہیں یک چشمی اور نفاق اور حسد کے سبب سے گوارا نہ ہوا کہ اور دکان اُن سے اونچی چنی جائے حسد اور نفاق ائمہ ہندوستان کا لازمہ ہے۔ بیرم خان خانخاناں کا دور تھا حضرت شیخ گدائی نے اس کے مزاج میں خوب تصرف کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی خلاف عادت وہ کیا۔ جو کہ اسے نہ چاہیئے تھا۔ یعنی شیخ سے شیخ کے لائق مروت نہ کی۔ کئی دفعہ علماء و مشائخ کے جلسے کئے۔ شیخ بھی اس میں موجود تھے انہیں جلسوں میں شیخ کا رسالہ معراجیہ سامنے ڈالا اس میں انہوں نے اپنی معراج کا حال لکھا تھا۔ کہ جاگتے ہوئے خدا سے آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں ہوئیں۔ اور آنحضرت سے میرا درجہ اوپر رہا۔ ایسے ایسے اور بھی خرافات بہت سے تھے۔ کہ عقلاً اور نقلاً قابل ملامت ہیں۔ ان باتوں پر شیخ کو سامنے رکھ کر تیر ملامت کا نشانہ بنا لیا۔ شیخ اپنے دل آزردہ کو لے کر گوالیار چلے گئے۔ اور ایک کروڑ دام کی جاگیر پر قناعت کر کے بیٹھ رہے۔ واہ سادھو لوگ ہیں۔ گڑ نہ ملا پیڑے ہی کھائے۔

مُلا صاحب فرماتے ہیں۔ اُن کا دعوے تھا۔ کہ خان خاناں کی بربادی ہماری ہی کرامات سے ہے۔ جن دنوں آگرہ میں علوم رسمی پڑھتا تھا۔ شیخ اُسی دھوم اور شکوہ مالا کلام کے ساتھ فقر کے لباس میں پہنچے کہ زمین و آسمان میں غلغلہ مچ گیا۔ ایک دن دور سے دیکھا۔ آگرہ کے بازار میں سامنے سے سوار چلے آتے تھے خلقت انبوہ در انبوہ تھی کہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ اور وہ فرط تواضع سے اُن کے جواب سلام کے لئے ہر طرف اس طرح دمبدم جھکتے تھے۔ کہ خانہ زین میں سیدھے نہ ہو سکتے تھے۔ ایک دم سر کو آرام نہ تھا۔ اور بیٹھ

کانم دمبدم زین کے ہرنے تک پہنچتا تھا۔ ۸۰ برس کی عمر تھی۔ مگر عجب طراوت اور روشنی چہرہ پر تھی۔ جی
چاہا کہ جا کر ملازمت حاصل کروں۔ مگر سنا کہ ہندوؤں کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں چنانچہ اس
ہوس سے دل اُکھڑ گیا۔ اور محروم رہا۔ خیر اب یہ کہو کہ گویا شیخ گدائی کی بدولت گوالیار گئے۔ وہاں
ایک خانقاہ تعمیر کی۔ سماع اور سرود اور وجد کا شغل رہتا تھا۔ اور خود بھی معرفت کے گیت بناتے اور گواتے تھے۔

آزاد۔ مُلّا صاحب کے علاوہ اور اہل تاریخ بھی ان کی باتیں کچھ ظرافت۔ کچھ کراہت سے لکھتے ہیں چنانچہ
معتمد خاں اقبالنامہ میں لکھتے ہیں سنہ ۹۶۶ھ میں کہ ابھی اکبر کو سلطنت سے تعلق نہ تھا شکار کھیلنے گوالیار کی
طرف جا نکلے۔ گجرات میں گائے بیل بہت خوب ہوتے ہیں۔ اثنائے شکار میں پلنگ بانوں اور آہو بانوں
نے کہا۔ کہ شیخ انہی دنوں میں گجرات سے آئے ہیں۔ اُن کے قافلہ میں بہت اچھے اچھے بیل ہیں۔ اور شکار میں
کارآمد ہیں۔ بادشاہ نے کہا۔ سوداگروں کو بلواؤ۔ کوئی بول اُٹھا۔ کہ شیخ اور اُن کے بھائی بند خود بھی لائے
ہیں۔ سوداگروں کے پاس ویسے نہیں ہیں۔ گوالیار کا قلعہ بہت مشہور تھا۔ ایک دن بادشاہ شکار کو اُٹھے
تو قلعہ دیکھا۔ اور پھرتے ہوئے شیخ موصوف کے گھر چلے گئے۔ اُنہوں نے جس طرح کے تحفے کہ پیران اہل
طریقت دیا کرتے ہیں پیش کیے۔ مثلاً دو تین تسبیحیں۔ ایک کنگھا۔ کوئی سوکھا روٹی کا ٹکڑا۔ ہلاسدانی
ایک پُرانی ٹوپی۔ عصا وغیرہ۔ اور چونکہ اُنہیں بھی پتہ لگ گیا تھا۔ اس لئے تحائف گجرات و دکن کیساتھ عمدہ
عمدہ گائیں اور بیل بھی نذر کیے۔ دستر خوان بھی چُنا۔ مٹھائیاں کھلائیں۔ عطر لگائے۔ خاتمۂ صحبت میں کہا کہ
آپ کسی کے مرید ہوئے ہیں؟ اکبر نے کہا نہیں۔ اُن کے آگے ۱۴ برس کے لڑکے کا پھسلانا کتنی بات تھی۔
خود بڑھ کر دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اکبر مسکرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ واہ بیل دئے اور مہمان کو مریدی کی رسّی میں باندھ
لیا۔ اکبر مصاحبوں میں بیٹھتا تو اکثر کہا کرتا۔ یاد رہے؟ وہ شیخ کے ہاں سے آ کر شراب کا جلسہ۔ شیخ کی دراز دستی
اور ہمارا بیلوں کا لینا۔ کیا ہنسی رہی ہے۔ ان تحفوں کی قیمت بھی نہ دی"۔ خیر کوئی کچھ کہے۔ شیخ نے خانخاناں
کے خطرے کے لئے قلعہ خاصہ باندھ لیا۔

(اُن کے خاتمہ احوال میں مُلّا صاحب لکھتے ہیں) کہ لباس فقر میں بڑے جاہ و جلال سے بسر کرتے تھے
اور جس کو دیکھتے تھے تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مسلمان وغیر مسلمان کی خصوصیت نہ تھی۔ اس سبب سے
بعض اہل فقر انکار بلکہ ملامت بھی کرتے تھے۔ اصل حال اللہ جانتا ہے۔ خدا جانے اُن کی نیت کیا تھی۔

چوں ردّ و قبول ہمہ در پردۂ غیب است ‌ ‌ ‌ ‌ زنہار کسی را نہ کنی عیب کہ عیب است

سنہ ۹۷۰ھ میں ۸۰ برس کی عمر میں آگرہ میں مرے اور گوالیار میں دفن ہوئے۔ مُلّا عطائی معمائی نے
کہ معتقد مریدوں میں تھا۔ تاریخ کہی۔ بندہ خدا شد۔ بڑے سخی تھے۔ اپنے لئے کبھی میں نہ کہتے تھے ہمیشہ فقیر کہہ کر

تعبیر کرتے تھے۔کسی کو اناج دلواتے تھے۔تو اس میں بھی من نہ کہتے۔کہتے تھے اتنے م۔ن۔اس شخص کو دیدو۔ **جواہر خمسہ**۔ایک رسالہ اعمال اور دعوت اسماء میں لکھا ہے۔کہ فقرائے صوفیہ اور عاملوں کے لئے دستور العمل چلا آتا ہے۔اور ان کی زبانوں پر اُن کا نام شیخ محمد غوث گوالیاری مشہور ہے۔شیخ ضیاء اللہ اُن کے فرزند سجادہ نشین رہے۔یہ وہی بزرگ ہیں جن کی تنگدستی کا حال جمال خاں قورچی نے اکبر سے بیان کیا۔اور اس کے دل پر اثر ہوا۔اور اُنہیں بلا کر مکان چار ایوان میں جگہ دی۔دیکھو صاف معلوم ہوتا ہے۔کہ مُلا صاحب ان سے بہت خفا ہیں چنانچہ سلسلہ فقرا میں فرماتے ہیں +

شیخ ضیاء اللہ آجکل تصوف کا چرچا جو وہ رکھتے ہیں کہیں نہیں۔کبھی اُن کی مجلس بے کلام معرفت نہیں ہے۔اور مراتب توحید کے سوا اور کچھ گفتگو نہیں ہے۔ظاہر تو یہ ہے۔باطن کی کسی کو خبر نہیں کہ ارادہ کیا ہے۔ابتدائے حال میں جب اطراف ہندوستان میں اُن کا شہرہ ہوا۔میں نے بھی سُنا کہ شیخ فقر و ارشاد کی مسند پر باپ کے قائم مقام ہوئے ہیں اور اکثر فضیلتوں میں اُن پر فائق ہیں۔چنانچہ حافظ قرآن ہیں۔اور ساتھ اس کے اس طرح تفسیر بیان کرتے ہیں۔کہ اصلاً کتاب کی حاجت نہیں ہوتی۔۹۷۰ھ میں سہسواں سے پھرتے ہوئے آگرہ میں میرا گذر ہوا۔میں نے کسی کو ساتھ بھی نہ لیا۔کہ ملاقات کروائے۔وہی نامرادانہ اور بے تکلفانہ وضع کہ میری قدیمی عادت ہے۔اور حقیقت میں مشائخ و فقرا کے پاس اسباب دنیا کے ساتھ جانے سے مطلب میں بھی خلل آتا ہے۔غرض میں نے جاتے ہی کہا سلام علیک اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا +

غالباً شیخ کو اُن تعظیموں کی عادت تھی جو شیخ زادوں کو پسند ہوتی ہیں۔اس طرح ملنے سے خوش نہ ہوئے۔اہل مجلس نے پوچھا۔کہاں سے آتے ہو۔میں نے کہا سہسواں سے۔پوچھا علوم سے بھی کچھ تحصیل کیا ہے۔میں نے کہا۔کہ ہر علم میں کچھ کچھ رسائل لکھے پڑھے تھے۔چونکہ سہسواں چھوٹا سا قصبہ ہے۔قلیچ خاں چوگان بیگی وہاں کا جاگیردار ہے۔وہ اُن کے والد کا مرید ہے۔میں ان کی نظر میں جچا نہیں۔کچھ طنز کچھ تمسخر کر کے ایک مسخرہ کو اشارہ کیا کہ مجھے بنائیے۔اور گھبرائیے۔وہ دفعتہً منہ بنا کر بولا کہ عطر کی بُو آتی ہے۔اور میری طبیعت بگڑی ہے۔سب صاحب ہوشیار ہو جائیں۔ایسا نہ ہو کسی کو مجھ سے کچھ تکلیف پہنچے۔ یہ کہتے ہی کف اُس کے مُنہ سے جاری ہوا +

ان کے صوفی نما مصاحبوں میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ عطر تم ملے ہو۔میں سمجھ گیا تھا۔مگر عمداً پوچھا۔کہ یہ معاملہ کیا ہے۔وہ بولا کہ اس شخص کو کبھی کتے نے کاٹا تھا۔جب اس کے دماغ میں خوشبو پہنچتی ہے بیہوش ہو جاتا ہے کف لاتا ہے بھونکتا ہے اور لوگوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔تم بھی ہوشیار ہو جاؤ۔اور

سب ادھر اُدھر ہو گئے۔ شیخ سعدی نے فرمایا ہے۔ ع   سگ دیوانہ را دارو کلوخ است

سب حیران رہ گئے۔ میں نے کہا تعجب یہ ہے کہ کلوخ ایک بوٹی کا بھی نام ہے کہ ہڑکائے کُتّے کی دوا ہے۔ یہ سن کر شیخ کڑوائے۔

جب دیکھا کہ یہ مکر کارگر نہ ہوا تو کہا آؤ قال اللہ اور قال الرسول میں مشغول ہوں۔ قرآن شریف کھولا اور سورہ بقر میں سے ایک آیت پڑھ کر جو چاہا سو کہنا شروع کیا۔ رنگا رنگ کی بولیاں بولتے تھے اور جو واہیات بکتے تھے۔ کور مغز مرید آمنا و صدقنا کہتے تھے۔ میں تو دل میں بھرا بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ شیخ جو معنی فرماتے ہیں کسی تفسیر میں بھی ہونگے؟ فرمایا کہ میں تاویل و اشارت کہتا ہوں۔ یہ رستہ وسیع ہے۔ سند کی حاجت نہیں۔ اور یہ کچھ میری ہی خصوصیت نہیں ہے۔ اوروں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ میں نے کہا۔ اس صورت میں یہ معنی حقیقت ہیں یا مجاز ہیں؟ کہا مجاز۔ میں نے کہا۔ دونوں معنوں میں علاقہ بیان فرمائیے۔ اور ساتھ ہی بحث کو علم معانی میں لے گیا۔ کچھ درہم برہم باتیں کرتے تھے۔ اور تڑپتے تھے۔ جب میں نے دبایا تو بے مزہ ہو گئے۔ قرآن رکھ دیا۔ اور کہا میں نے علم جدل نہیں پڑھا۔ میں نے کہا کہ تم معانی قرآن وہ کہتے ہو کہ نقل اس کی تائید نہیں کرتی پھر جو رابطہ حقیقت و مجاز میں ہے۔ کیونکر نہ پوچھا جائے۔ اس گفتگو نے طول پکڑا بات کو پھیر کر میرے حال احوال پوچھنے لگے۔ انہیں دنوں میں نے ایک شرح قصیدہ بردہ پر لکھی تھی۔ اور اس کے مطلع کی شرح میں اکثر نکتے بیان کئے تھے۔ وہ سنائے۔ بہت تعریف کی۔ اور آپ بھی کچھ لطائف بیان کئے۔ وہ صحبت اسی رنگ سے گذری۔ مدت کے بعد میں بادشاہی ملازمت میں پہنچا۔ شیخ کے ساتھ زمانہ نے بیوفائی کی اور نوبت یہ پہنچی کہ جلال خاں قورچی کی سفارش پر انہیں بادشاہ نے بلا بھیجا۔ عبادتخانہ میں رکھا۔ اکیلے تھے۔ اور نہایت شکستگی کے عالم میں جمعہ کا دن تھا۔ بادشاہ دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر خود تشریف لے گئے۔ یہ پہلی ہی ملاقات تھی میرزا غیاث الدین علی آخوند اور میرزا غیاث الدین علی آصف خاں کو اشارہ کر دیا تھا کہ تصوف کے مطالب میں ذکر کر دینا۔ دیکھیں تو کیا ٹپکتا ہے۔ آصف خاں نے لوائح کی یہ رُباعی پڑھی ؎

گر در دل تو گل گذرد گل باشی
ور بلبل بے قرار - بلبل باشی
تو جزوی و او کل است اگر روزے چند
اندیشۂ کل پیشہ کنی - کل باشی

اور پوچھا کہ ذات پاک جزو و کل سے پاک ہے۔ اسے کل کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ شیخ بہت شکستیں کھا کر آئے تھے۔ گھمنڈ غرور سب ٹوٹ چکے تھے۔ مصیبتیں بہت اُٹھائی تھیں۔ شرمندہ صورت تھے۔ آہستہ آہستہ چند بے ربط باتیں ملائیں۔ کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ آخر میں نے جُرات کر کے کہا۔ کہ مولوی جامی نے ظاہر میں جزو اور کل اطلاق کیا ہے۔ اور ایک اور رباعی میں کہا ہے ؎

ایں عشق کہ ہست جزو لاینفکِ ما — حاشا کہ بعقل ما شود مدرکِ ما
خوش آنکہ دمد پر توے از نور یقین — مارا برہاند از ظلام و شکِ ما

اس میں بھی ذات پاک پر کلیت اور جزئیت کا اطلاق مطلوب نہیں ہے۔ جزو کل جو کچھ ہے سب وہی ہے۔ غیر کا کچھ وجود ہی نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے زبانوں کے الفاظ و عبارات اصل مدعا کو ادا نہیں کر سکتے۔ ناچار انہیں لفظوں میں بولتے ہیں۔ اور کبھی جزو کہتے ہیں۔ کبھی کل کہتے ہیں۔ چند تقریریں وحدت وجود کی اُن دنوں مجھے خوب رواں ہو رہی تھیں۔ شیخ کی تائید میں خرچ کیں۔ حضور بھی خوش ہوئے اور شیخ بھی خوش ہو گئے۔

ہیں فتح پور میں خواجہ جہاں کے محلہ میں رہتا تھا۔ شیخ کے علاتی بھائی شیخ اسمٰعیل میرے ہمسایہ میں رہتے تھے۔ اور اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ان سے مَیں نے پہلی ملاقات کا حال بھی بیان کیا تھا۔ ایک شب مجھے شیخ ضیاء اللہ کی ملاقات کو لے گئے۔ اور اس جلسہ کا ذکر بھی کیا۔ شیخ حیران رہ گئے۔ اور کہا۔ مجھے یاد نہیں کہ ایسا ہُوا ہو۔ فاضل بدایونی ۱۰۰۰ھ میں کہتے ہیں کہ باوجودیکہ ایک گوشہ دُکانداری کا بھی سنبھالا ہوا تھا۔ مگر آگرہ میں باپ کی طرح اہل باہ کے لباس میں بایہ کوکہ عیش و فراغت میں مشغول ہیں۔ اور اپنی وضع پر قائم ہیں۔ اور ان کی بھولی بھالی باتیں عام فریب اکثر مشہور ہیں۔ کہ یہاں گنجائش ان کی تحریر کی نہیں میر ابوالغیث بخاری رحمتہ اللہ کہتے تھے۔ کہ لباس درویشانہ اور مجلس فقیرانہ رکھتا ہے۔ تصوف کی باتیں کرتا ہے۔ ہم ان باتوں کے غلام ہیں۔ وہ جو ہو سو ہو جس سال خان زماں کی فتح ہوئی۔ لشکر کے ساتھ شیخ ضیاء اللہ بھی تھے۔ ایٹہ میں سے گذرے۔ حضرت میاں شیخ نظام الدین قدس سرہ سے جا کر ملے۔ وہ ایک آیت کی تفسیر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا خبث ظاہر کر کے کہا کہ اس آیت میں تناقض ہے میاں کا مزاج برہم ہو گیا۔ بگڑ کر بولے۔ سبحان اللہ۔ باپ وہاں غوطے کھا رہا ہے۔ اور کسی کامل کی شفاعت کا محتاج ہے۔ بیٹا یہاں کلام الٰہی میں تناقض ثابت کرتا ہے۔

شیخ ابوالفضل کی ان سے دوستانہ راہ و رسم تھی۔ انشا میں بھی کئی خط ان کے نام ہیں۔ اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث گوالیاری نے ۹۹۰ھ میں دُنیا کو الوداع کہا۔ تھوڑا سا نقد دانش جمع کیا تھا۔ صوفیوں کی گفتار دلاویز سے آشنا تھے۔ اور نکتہ شناس آدمی تھے۔ آزاد ہر شخص قیاس کر سکتا ہے۔ کہ دونوں بھائی جہاں تک ممکن ہوتا تھا۔ ہر شخص کو ہاتھ اور زبان سے نیکی پہنچاتے تھے اور کسی کی بُرائی سے قلم کو آلودہ نہ کرتے تھے۔ اور ایسی بات ہوتی تو مگمم کہہ جاتے تھے۔ خوبی کو جس قدر پاتے تھے۔ ظاہر کرتے تھے۔

شیخ علائی

صوبۂ بنگالہ میں شیخ حسن اور شیخ نصراللہ دو بھائی ایک نامی خانوادہ مشائخ سے تھے۔ چھوٹا بھائی بڑا عالم تھا۔ دونوں وطن چھوڑ کر حج کو گئے۔ اور ۹۳۵ھ میں وہاں سے آکر شہر بیانہ میں سکونت اختیار کی۔ خوش اعتقادوں نے ان صاحبدلوں کے آنے کو غنیمت سمجھا۔ اور اہل طبع نے جاءنصراللہ والفتح تاریخ کہی۔ بڑا بھائی طریقت میں ہدایت و ارشاد کے مسند پر بیٹھا تھا۔ اور شریعت میں اجتہاد کا علم قائم کرتا تھا۔ اس کا بیٹا شیخ علائی سب بچوں میں رشید اور ہونہار تھا۔ بچپن سے اصلاح و تقوے اور عبادت و ریاضت کی عبارتیں اس کے قیافہ میں پڑھی جاتی تھیں۔ چند ہی روز میں باپ کے فیضان صحبت سے علوم عقلی و نقلی اور اخلاق و سلوک کی تحصیل سے فارغ ہو گیا۔ اور مطالعہ کے ساتھ جودت طبع اور تیزی فکر نے اُسے زیادہ قوت دی۔ باپ کے بعد سجادہ نشین ہوا۔ اس سے سخت ریاضتیں اٹھائیں۔ اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ درس و تدریس اور اہل طبیعت کی ہدایت میں مصروف ہوا۔ مگر طبیعت ایسی تیز واقع ہوئی تھی۔ کہ ناموافق بات کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ایک دفعہ عید کا دن تھا۔ ایک نامی شیخ کو کہ صاحب خانوادہ اور خانقاہ و سجادہ کا مالک تھا۔ کسی بات پر روک لیا۔ سواری میں سے اُتروا دیا۔ اور ایسا شرمندہ کیا۔ کہ اُس بیچارے کو جواب تک نہ بن آیا۔ غرض ایسی ایسی باتوں سے شیخی اور شیخ زادگی کا نقارہ تن تنہا بجاتا۔ اور کسی کو دم نہ مارنے دیتا تھا۔ اُس کے خاندان کے لوگ کہ اکثر بھائی بند اور اکثر عمر اور درجہ میں اُس سے بلند بھی تھے سب جانتے تھے۔ بلکہ اُس کے کام اور نام سے آپ فخر کرتے تھے۔

اسی عہد میں میاں عبداللہ افغان نیازی مکہ سے پھر کر آئے۔ تو اُن کا اعتقاد اور مہدوی طریقہ لے کر آئے۔ بیانہ میں ایک باغ میں کنارہ حوض پر حجرہ ڈالا اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے۔ پانی بھر بھر کر اپنے سر پر لاتے اور حوض میں بھرتے۔ مختلف پیشہ ور۔ سقے۔ لکڑہارے۔ جو ادھر سے گذرتے اُنہیں بلا لیتے۔ اور سب کو جماعت سے نماز پڑھاتے۔ کسی کامی آدمی کو رزق کے فکر میں نماز پر مائل نہ دیکھتے۔ تو دو چار پیسے اپنے پاس سے دیتے۔ کہ غریب مسلمان ثواب جماعت سے محروم نہ رہے۔ شیخ علائی نے جو اُنہیں دیکھا۔ تو اُنہیں یہ وضع بہت پسند آئی۔ اور اپنے رفیقوں اور اصحابوں سے کہا۔ کہ حقیقت میں خدا کی راہ یہ ہے۔ جو ہم کر رہے ہیں یہ نفس پرستی اور آدم پرستی ہے۔ دفعتہً آباو اجداد کا طریقہ چھوڑ دیا۔ مشیخت کی مسند اُلٹ دی۔ پیری و پیرزادگی کو رخصت کر کے خاکساری و نامرادی۔ فروتنی اور خواری اختیار کی۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کو کبھی پہلے آزردہ کیا۔ نہایت عجز و انکسار سے اُن کی جوتیاں اُٹھا اُٹھا کر سامنے رکھیں۔ خانقاہ اور جاگیر اور لنگر بزرگوں سے جاری چلا آتا تھا۔ سب

موقوف کر دیا۔ اور تمام اسباب غربا و مساکین کو بانٹ دیا۔ یہاں تک کہ کتابیں بھی فقرا اور غربا کو دیدیں لوگوں نے بھی تبرک سمجھ کر اُن کی چیزیں لیں۔ اور گھروں میں رکھیں۔ بی بی سے کہا کہ اپنا تو یہی حال ہے۔ تم سے فقر و فاقہ پر صبر ہو سکے۔ تو میرے ساتھ رہو۔ بسم اللہ۔ نہیں تو اس مال میں سے اپنا حق لے لو۔ پھر تم جانو تمہارا کام جانے۔ بی بی راہ حق میں اُن سے بھی زیادہ ثابت قدم تھیں۔ وہ ساتھ ہوئیں اور میاں عبداللہ کے سایہ میں آکر بیٹھ گئے۔ بزرگوں نے معمولی طریقے ترک کئے۔ اور نئے پیر کی برکت انفاس سے فیض پاکر مہدوی طریقے کے بموجب اشغال و عبادت اختیار کئے ؛

اُن کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا تھا۔ کہ دوست احباب مرید اصحاب جو ان سے محبت یا اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ بھی ساتھ ہی رجوع ہو گئے۔ بعضے خانہ دار تھے۔ بعضے بے تعلق تھے۔ سب نے صدق دل سے ساتھ دیا۔ اور توکل کے پٹکے سے کمر باندھی۔ نہ زراعت نہ تجارت۔ نہ پیشہ نہ نوکری۔ سب خدا کے توکل پر تھے۔ جو کچھ خدا بھیجتا تھا۔ برابر بٹ جاتا تھا۔ ایک ایک ان میں ایسا ثابت قدم تھا۔ کہ بھوک سے مر جاتا۔ مگر عقیدہ سے بال بھر نہ ہٹتا تھا۔ کوئی شخص کام یا کچھ نوکری کر لیتا تھا۔ تو وہ بھی خدا کے راہ میں دیتا تھا۔ روز ایک دفعہ صبح کی نماز کے بعد۔ اور ایک دفعہ عصر کے بعد سب چھوٹے بڑے دائرہ میں آکر حاضر ہوتے تھے۔ اور قرآن کی تفسیر سنتے تھے۔ وہ پُر اثر کلام جس میں فصاحت کا زور اور خدا کے نام کا پشتیبان لگا تھا۔ ایسے گرم دلوں سے نکلتا تھا۔ کہ فقط مٹھی سے روپیہ اور گھروں سے مال و دولت ہی کو نہ کھینچتا تھا۔ بلکہ آنکھوں سے آنسو اور دلوں سے آہوں کا دھواں بھی نکال لیتا تھا۔ صرف ایک دفعہ سُننا شرط تھا۔ پھر ہر شخص اہل و عیال کو چھوڑتا دنیا سے ہاتھ دھوتا اور انہی میں آن شامل ہوتا۔ مزے لے لے کر فاقے کرتا۔ اور دنیا کی لذتوں کا نام نہ لیتا۔ کچھ بھی نہ ہوتا تو ممنوعات سے توبہ تو ضرور کر لیتا تھا۔ ان لوگوں کے توکل کا یہ حال تھا۔ کہ رات کو کھانا بچ رہتا۔ تو وہ بھی نہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ نمک بھی باقی نہ چھوڑتے تھے۔ پانی تک بھی پھینک دیتے تھے۔ اور باسنوں کو اوندھا کر رکھ دیتے تھے۔ کہ صبح کا اللہ مالک ہے۔ ان کے ہاں روز نو روز تھا۔ اُس پر زندہ دلی اور خوشحالی کا یہ عالم تھا۔ کہ جب تک کسی کو اصل حال کی خبر نہ ہو۔ تب تک ہرگز نہ معلوم کر سکتا تھا۔ کہ اندر اُن پر کیا گذر رہی ہے۔ یہی جانتا تھا۔ کہ بالکل حالت فارغ البالی میں ہیں ؛

ان باتوں کے ساتھ آٹھ پہر سب مسلح رہتے تھے۔ اور دشمنوں کی طرف سے ہوشیار۔ کوچہ و بازار میں کوئی نامشروع بات دیکھتے تو جھٹ روک دیتے۔ حاکم کی ذرا پروا نہ کرتے تھے۔ اور اکثر غالب

ہی رہتے تھے۔ جو حاکم اُن کے رنگ پر ہوتا۔ اُس کی مدد کو جان حاضر تھی۔ اور لشکر کو تو مقابلہ کی طاقت ہی نہ تھی۔ غرض تقریر کی تاثیر نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ بیٹا باپ کو۔ بھائی بھائی کو۔ جورو خاوند کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور ہزاروں آدمی فقر و فاقہ کی خاک کو تبرک سمجھ کر دائرہ مہدویت میں داخل ہو گئے۔

میاں عبد اللہ اُن کے پیر عاقبت اندیش بزرگ تھے۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ شیخ علائی کی تیزی طبع اور زور کلام نے خاص و عام میں دھوم مچا دی۔ اور اپنے اوقاتِ خاص میں بھی خلل آنے لگا۔ تو خلوت میں سمجھایا۔ کہ زمانے کا مزاج ان ہدایتوں کی سہار نہیں رکھتا۔ کلمہ حق لوگوں کی زبان پر کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ یا تو یہ باتیں چھوڑ دو یا حج کو چلے جاؤ ✤

آنکس کہ زغوغا نرہد وائے برو	بر خلق جہاں دل نہد وائے برو
درویست فقیر نیست نقدی جز وقت	آں نیز گر از دست دہد وائے برو

آخر ۶۰۔۷۰ یار سو گھر کے قریب جمعیت لے کر جس حال میں تھے۔ اُسی طرح دکن کے رستہ حج کو چلے۔ مشہور شہروں میں جہاں جہاں گذر ہوا۔ غل مچ گیا۔ علما و فضلا سے لے کر عوام تک صدہا آدمی گرویدہ ہو گئے۔ جودھپور کے پاس خواص پور میں شیر شاہ کا غلام خواص خان اس سرحد کا حاکم تھا۔ استقبال کو آیا۔ اور پہلی صحبت میں معتقد ہو کر دائرہ میں داخل ہوا۔ اُن کے ہاں ہر شب جمعہ کو جلسہ اور حال و قال کی محفل ہوتی تھی شیخ راگ کے نام کے دشمن۔ وہ احکام شریعت کا بہت پابند نہ تھا۔ اور شیخ اس معاملہ میں جبر کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ غرض صحبت موافق نہ آئی۔ وہ سپاہیوں کے حقوق رکھ لیا کرتا تھا۔ اس پر بھی شیخ نے روکا۔ آخر وہاں سے ناراض ہو کر نکلنا پڑا۔ رستہ میں بعض اور ایسے موانع پیش آئے کہ حج کو نہ گئے اور پھر کر بیانہ میں چلے آئے ✤

اب ہندوستان میں سلیم شاہ تخت نشین ہو گیا تھا۔ اور اس موقع پر آگرہ میں ٹھیرا ہوا تھا۔ شیخ کے علم و فضل اور تاثیر کلام کا نام تو سنتا ہی تھا۔ اور روز خبریں پہنچتی تھیں۔ کہ اس کا کاروبار ترقی کر رہا ہے۔ مخدوم الملک مُلّا عبد اللہ سلطانپوری نے کان بھرنے شروع کئے۔ کہ یہ شخص صاحب عزم ہے۔ اگر بغاوت کر بیٹھا تو تدارک مشکل ہو گا۔ سلیم شاہ نے کچھ سوچ کر بُلا بھیجا۔ وہ اپنے اصحابوں سمیت آگرہ میں پہنچا۔ سب بکتر پوش تھے۔ اور ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ سلیم شاہ نے سید رفیع الدین محدث اور ابو الفتح تھانیسری وغیرہ علمائے آگرہ کو بھی دربار میں بُلایا۔ جب شیخ علائی دربار میں آیا۔ تو آداب و رسوم کا ذرا خیال نہ کیا۔ سنت پیغمبر کے بموجب عموماً اہل مجلس سے سلام علیک کی۔ سلیم شاہ نے دل میں بُرا مانا مگر جواب سلام دیا۔ مصاحبان شاہی کو بھی یہ بات ناگوار ہوئی۔ اور مخدوم الملک نے اُسی وقت جھک کر

کان میں پھونکی۔ آپ نے دیکھ لیا۔ مہدویت کا نام درمیان ہے۔ اور لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ مہدی بادشاہ روئے زمین ہوگا۔ یہ بغاوت کئے بغیر نہیں رہے گا۔ بادشاہ وقت کو اس کا قتل کرنا واجب ہے۔ بیسے اخاں دربار شاہی کا ناظم بہت مُنہ چڑھا تھا۔ اُس نے اور امرائے دربار نے جو شیخ کو اور اُس کے اصحابوں کو دیکھا۔ کہ پھٹے کپڑے ہیں۔ ٹوٹی جوتیاں ہیں۔ نامرادوں اور خاکساروں کی وضع ہے۔ تو بادشاہ سے کہا۔ کہ اس حال اور اس وضع سے یہ شخص چاہتا ہے۔ کہ ہم سے سلطنت چھین لے۔ کیا ہم افغان سب مر گئے؟

ابھی علما کا جلسہ جمع نہ ہوا تھا۔ کہ شیخ علائی نے تقریر شروع کی۔ چند آیات قرآنی کی تفسیر کی۔ ساتھ ہی دُنیا کی بے بنیادی۔ اور دولت دُنیا کی بے حقیقتی۔ اہل دُنیا کا اُس پر گرویدہ ہونا۔ علماءِ زمانہ کی بدحالی۔ قیامت کی حالت اور اُس پر افسوس اور اہل غفلت کی ملامت غرض ان مطالب کو ایسی فصاحت و بلاغت سے ادا کیا کہ تمام اہل دربار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور در و دیوار پر حیرت برسنے لگی۔ دربار میں سناٹا ہو رہا تھا۔ اور لوگوں کے حیرت ناک چہرے کہہ رہے تھے کہ اللہ اکبر ایک بان کی طاقت نے سلطنت بھر کے زور کو دبا لیا۔ باوجود اس سنگدلی کے خود سلیم شاہ آبدیدہ ہو گیا۔ دربار سے اُٹھ کر محل میں چلا گیا۔ اور اپنے خاصہ میں سے کھانا بھیجا۔ شیخ نے ہاتھ تک نہ لگایا۔ اصحابوں سے کہا کہ جس کا جی چاہے کھالے۔ بادشاہ آیا تو پھر تعظیم نہ کی۔ اُس نے پوچھا۔ کہ کھانا کیوں نہیں کھایا۔ اُس نے کہا کہ تمہارا کھانا مسلمانوں کا حق ہے۔ جو کہ اپنے حق سے زیادہ حکم شرع کے برخلاف تم نے لیا ہے۔ سلیم شاہ کو غصّہ تو آیا۔ مگر پی گیا۔ اور کہا کہ اچھا علما سے اپنے مسائل میں گفتگو کرو۔

جلسہ کی تاریخ قرار پائی۔ دربار اور شہر کے عالم سب جمع ہوئے۔ شیخ مبارک بھی بلائے گئے۔ تقریریں شروع ہوئیں۔ آپس میں سب قیل و قال کرتے تھے۔ اُس سے کوئی خطاب کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ سیّد رفیع الدین نے مہدویت کے باب میں ایک حدیث پر گفتگو شروع کی۔ شیخ علائی نے کہا۔ کہ تم شافعی ہم حنفی۔ تمہارے اصول حدیث اَور ہمارے اَور۔ تمہاری دلیلیں مجھ پر کب حجت ہو سکتی ہیں؟ وہ بیچارے چُپ ہو رہے۔ غرض جو کوئی بولتا اُسے باتوں باتوں میں اُڑا دیتا۔ اور مخدوم الملک کو تو بات نہ کرنے دیتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ تو دُنیا کا عالم ہے۔ دین کا چور ہے۔ ایک نہیں بہت سی نامشروع باتیں ہیں کہ کھلم کھلا کرتا ہے۔ آج تک راگ رنگ کی آواز لوگ تیرے گھر سے سُنتے ہیں۔ احادیث صحیح سے ثابت ہے۔ کہ جو عالم سلاطین اور دربار امرا کو اپنا قبلہ بنائے بیٹھے ہیں۔ اور در بدر پھرتے ہیں۔

اُن سے وہ مکھی جو نجاست پر بیٹھے بدرجہا بہتر ہے ؏

علم کز بہر کاخ و باغ بود	ہمچو شب روز را چراغ بود

غرض علمائے بے عمل کی ایسی خاک اُڑا رہا تھا۔ اور بات بات پر برمحل سندیں آیتوں اور روایتوں سے پیش کرتا تھا۔ کہ مخدوم الملک دم نہ مار سکتا تھا ؏

یہ جلسے کئی دن تک رہے تیز طبع اولوالعزم لوگوں کا قاعدہ ہے۔ کہ جب ایک صاحب جوہر کو بے انصافی کے پہاڑ تلے دبتا دیکھتے ہیں۔ تو ہمدردی خواہ مخواہ اُس کی رفاقت پر کھڑا کر دیتی ہے۔ چنانچہ شیخ مبارک کئی مسائل میں کہیں اشارہ کنایہ سے۔ کہیں ہاں میں ہاں ملانے سے رفاقت کا حق ادا کرتے تھے۔ ایک عالم کا نام مُلّا جلال تھا۔ انہوں نے کچھ تقریر شروع کی اور امام مہدی کے حلیہ میں سے چند الفاظ پڑھے۔ اُس میں اُن کی زبان سے نکلا اَجلی الجبہۃ شیخ مبارک نے سامنے سے اشارہ کیا۔ شیخ علائی مسکرایا اور کہا۔ سبحان اللہ لوگوں میں اعلم العلما بنتے ہیں اور عبارت صحیح پڑھنی نہیں آتی۔ بھلا تم کنایات اور اشارات قرآن اور لطائف و دقائق احادیث کو کیا سمجھو گے۔ صاحب یہ جلی الجبہۃ فعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ اور جلاء سے مشتق ہے۔ نہ جلال سے کہ تمہارا نام ہے۔ وہ بیچارہ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا سلیم شاہ اُس کی تقریر کا عاشق ہو گیا۔ بار بار کہتا تھا۔ کہ قرآن کی تفسیر کہا کرو۔ شیخ اب تک تم نے بدعت کے زور سے لوگوں کو تاکید کی۔ اب میرے حکم کے زور سے ہدایت کرو۔ مگر اس عقیدہ سے باز آؤ۔ علمائے تمہارے قتل پر فتوے دیا ہے۔ میں لحاظ کرتا ہوں۔ اور نہیں چاہتا۔ کہ تمہاری جان جائے آخر پاس بلا کر چپکے سے کہا۔ کہ شیخ تو آہستہ سے میرے کان میں کہہ دے۔ کہ اس دعوے سے میں نے توبہ کی۔ شیخ علائی کو کسی دربار اور صاحب دربار کی پروا نہ تھی۔ ذرا خیال نہ کیا۔ اور کہا کہ تمہارے کہنے سے میں اعتقاد کو کس طرح بدل دوں۔ یہ کہا اور اُسی طرح اُٹھ کر فرودگاہ کو چلا گیا۔ اور تاثیر کلام کا یہ عالم ہو رہا تھا۔ کہ بادشاہ کو روز خبر پہنچتی تھی۔ آج فلاں سردار حلقہ میں داخل ہوا۔ آج فلاں امیر نے نوکری چھوڑ دی۔ اور مخدوم الملک ساعت بہ ساعت ان باتوں کو اور بھی آب و تاب سے جلوہ دیتے تھے آخر بادشاہ نے دق ہو کر کہا کہ اُن سے کہہ دو۔ اس ملک میں نہ رہو۔ دکن کو چلے جاؤ۔ وہ خود مدت سے دکن اور وہاں کے مہدویوں کے دیکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ اِنّ ارض اللہ واسعۃ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے

تا سخن کوتاہ کن برخیز و عزم راہ کن	شکر بر طوطی فگن مردار پیش کرگساں

ہنڈیہ سرحد دکن پر اعظم ہمایوں شروانی حاکم تھا۔ وہاں پہنچے۔ وعظ سُنتے ہی وہ بھی غلام ہو گیا۔ روز شیخ کے دائرہ میں آکر شغل میں شامل اور وعظ میں حاضر ہوتا تھا۔ اور آدھا لشکر بلکہ زیادہ اسکا مرید و فدائی ہو گیا۔

سلیم شاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت خفا ہوا۔ مخدوم الملک نے اس آگ پر تیل ڈالا۔ اور وہ باتیں ذہن نشین کیں جن کی اصل اصلا نہ تھی پھر شیخ علائی کی طلب میں فرمان جاری ہوا۔ اس عرصہ میں بادشاہ نیازی افغانوں کی بغاوت کے دبانے کو آگرہ سے پنجاب کو چلا۔ بیانہ کے پاس پہنچا تو مخدوم الملک نے کہا کہ چھوٹے فتنہ کا (یعنی شیخ علائی کا) چند روز کے لئے بندوبست میں نے کر لیا۔ بڑے فتنہ کی بھی تو خبر لیجئے۔ یعنی میاں عبد اللہ شیخ علائی کا پیر کہ نیازیوں کی جڑ ہے۔ اور ہمیشہ تین سو آدمی سلاح پوش ہتیار بند لئے بیانہ کے کوہستان میں فساد کو تیار بیٹھا رہتا ہے۔ سلیم شاہ نیازیوں کے لہو کا پیاسا تھا۔ اس پھونک سے شعلہ کی طرح بھڑک اٹھا۔ میاں بھوا حاکم بیانہ کو حکم لکھا کہ میاں عبد اللہ کو معتقدوں سمیت حاضر کرو۔ وہ میاں عبد اللہ کا معتقد تھا۔ اس نے جا کر ان سے سارا حال کہا اور عرض کی۔ بلا سے بچنا واجب ہے۔ چند روز آپ یہاں سے کنارے ہو جائیں شاید بادشاہ اس بات کو بھول جائے۔ یا خیال بدل جائے جب تک آپ کسی اور طرف ٹل جائیں تو بہتر ہے۔ میں جا کر ایک خوبصورتی کیساتھ بات کو ٹال دونگا۔ ع

مترس از بلائے کہ شب درمیان است

شیخ عبد اللہ نے کہا کہ سلیم شاہ جابر و قاہر بادشاہ ہے۔ اور مخدوم ہمیشہ تاک میں ہے۔ اب تو پاس ہے۔ کہیں دور جا کر کھینچ بلایا۔ تو بڑھاپے میں اور بھی مصیبت ہو گی۔ اس وقت دس کوس کا معاملہ ہے۔ جو ہو سو ہو۔ چلنا ہی چاہیئے۔ مرضی الٰہی یہاں اور وہاں۔ حال اور استقبال میں برابر ہے جو قسمت میں لکھا ہے سو ہو گا۔ بندہ کی تدبیر ہے۔ اللہ کی تقدیر غالب ہے ؎

عناں بدست قضا دہ کہ مصلحت این است	عنان کار نہ در دست مصلحت بین است

غرض میاں عبد اللہ راتوں رات چل کر صبح ہوتے لشکر میں پہنچے۔ سلیم شاہ کوچ کے لئے سوار کھڑا تھا۔ کہ انہوں نے سامنے آکر کہا۔ السلام علیک۔ میاں بھوا نے ان کی گردن پر ہاتھ رکھ کر جھکا دیا۔ اور کہا شیخا بہ بادشاہاں این چنیں سلام میکنند۔ شیخ نے بگڑ کر دیکھا اور کہا۔ سلامے کہ سنت است و یاران بر رسول صلی اللہ علیہ وسلم و رسول بر ایشاں رضی اللہ عنہم گفتہ اندہمیں۔ من غیر ایں نمیدانم۔ سلیم شاہ نے جان بوجھ کر پوچھا۔ پیر علائی ہمین است؟ مخدوم الملک گھات میں موجود تھے کہا۔ ہمیں۔ سلیم شاہ نے اشارہ کیا۔ ساتھ ہی لات۔ مکہ۔ لاٹھیاں۔ کوڑے برابر پڑنے لگے۔ جب تک اس مظلوم کو ہوش رہا۔ ایک دعائیہ[۱] آیت پڑھتا رہا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ چہ میگوید؟ مخدوم نے کہا۔ شمارا و مارا کافر میخواند۔ بادشاہ کو اور بھی غصہ آیا جوش میں آکر اور شدت کا حکم دیا۔ سوار کھڑا رہا اور گھنٹہ بھر سے زیادہ پٹوائے گیا۔ جب

[۱] رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۵

جانا کہ دم نہیں رہا ؎

نفسے درمیاں میانجی بود　　آں میانجی ہم ازمیاں برخاست

مردہ کو وہیں چھوڑ کر روانہ ہُوا۔ رمق جان خدا جانے کہاں اٹکی تھی۔ لوگ دوڑے اور کھال میں لپیٹ کر گرم جگہ میں رکھا۔ دیر کے بعد ہوش آیا۔ یہ معاملہ ۹۹۵ھ میں ہُوا۔ اور وہ مظلوم بیانہ سے نکل کر کچھ عرصہ تک افغانستان کچھ مُدّت سرحد پنجاب میں۔ کہ کبھی بجواڑہ میں پھرتا تھا۔ کبھی نواح امرسر وغیرہ میں نظر آتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ صحبتِ اہل قال کا یہی ثمرہ ہے ؎

اے خداوندانِ حال الاعتبار الاعتبار　　وے خداوندان قال الاعتذار الاعتذار

آخر سرہند پہنچے۔ اور عقیدہ مہدویہ سے بالکل تائب ہو کر اَوروں کو اس عقیدہ سے روکا۔

جب سلیم شاہ نیازیوں کی مہم طے کر کے پھرا۔ تو مخدوم نے پھر اُکسانا شروع کیا۔ کہ شیخ علائی کو ہنڈیہ سے بُلانا چاہئے۔ اور اُس پر حد جاری کرنی چاہئے۔ اور نہایت مضر خیالات کے ساتھ یہ ذہن نشین کیا۔ کہ حکم اُس کے اخراج کا ہُوا تھا۔ وہاں اعظم ہمایوں اُس کا مرید معتقد ہو گیا۔ تمام لشکر اُس کی طرف رجوع ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے اپنوں سے جُدا ہو کر اُس کے مذہب میں آ گئے۔ تمہارے اپنے خاندان کے لوگ بھی اُس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ عجب نہیں کہ اُس کا اثر ملک و مملکت میں ظاہر ہو۔ کیونکہ وہ مہدویت کا دعوے دار ہے۔ آخر اُس بیچارے کو ہنڈیہ سے بھی پکڑ بُلایا۔ سلیم شاہ جانتا تھا۔ کہ مخدوم کو اس سے عداوت ہو گئی ہے۔ لیکن دہلی اور آگرہ میں کوئی عالم نظر نہ آتا تھا۔ کہ اس بحث کو تشخیص کرے۔ آخر بہار میں میاں بڈھہ ایک فاضل جلیل القدر تھے۔ کہ شیر شاہ بھی کمال اعتقاد سے اُن کے سامنے جوتیاں سیدھی کر کے رکھتا تھا۔ انہوں نے ارشاد قاضی پر شرح لکھی ہے۔ وہ معتبر اور مشہور ہے۔ مگر چونکہ بہت بڈھے تھے۔ اس لئے خانہ نشین تھے۔ اُن کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا۔

شیخ علائی جب وہاں پہنچے۔ تو اُن کے گھر میں سے گانے بجانے کی آواز آتی تھی۔ اور بعض مکروہاتِ طبعی اور شرعی اور بھی ایسے تھے۔ کہ جن کا ذکر فاضل بداونی نے اپنی تاریخ میں مناسب نہیں سمجھا۔ شیخ علائی نے اُنہیں بھی دبایا۔ میاں بڈھے بڑے ہی بڈھے ہو رہے تھے۔ اُن سے تو بات بھی نہ کی جاتی تھی۔ اُن کے لڑکوں نے کچھ عذر بیان کئے۔ مگر گناہ سے بھی بدتر۔ شیخ علائی کے سامنے یہ باتیں کب پیش جاتی تھیں۔ شیخ بڈھے اپنے

نام کے بموجب بڑے منصف تھے۔ انہوں نے بڑے عذر و معذرت کیئے۔ اور شیخ علائی کی بہت تعریف کر کے عزت و احترام سے پیش آئے۔ سلیم شاہ کے نام خط لکھا۔ کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ ایمان اسی پر منحصر ہو۔ اور علامات مہدوی کے باب میں بہت سے اختلاف ہیں۔ اس لئے شیخ علائی کے کفر یا فسق پر حکم نہیں کر سکتے۔ اُن کا شبہ رفع کرنا چاہیئے۔ یہاں کتابیں موجود نہیں۔ وہاں علما کے کتب خانوں میں بہت کتابیں ہوں گی۔ وہیں تحقیقات اور اُن کی فہمائش ہو جائے۔ تو بہتر ہے۔ لڑکے زمانہ کی عقل خوب رکھتے تھے۔ وہ ڈرے۔ اور میاں بڈھے کو سمجھایا۔ کہ مخدوم الملک آج صدر الصدور ہیں۔ تم اُن کی مخالفت کرتے ہو۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ ابھی نہیں بُلا بھیجیں گے۔ اس بڑھاپے میں یہ بعد المشرقین کا سفر اور سفر کی مصیبتیں کون اٹھائیگا ایسا لکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ ایک خط خفیہ میاں کی طرف سے سلیم شاہ کے نام لکھا۔ خلاصہ جس کا یہ کہ مخدوم الملک آج محققین میں سے ہیں۔ بات اُن کی بات ہے۔ اور فتوےٰ اُن کا فتوےٰ ہے سلیم شاہ پنجاب ہی میں دورہ کر رہا تھا۔ بن کے مقام میں لوگ پہنچے۔ میاں کا سربمہر خط پڑھ کر پھر شیخ علائی کو پاس بلایا۔ اُس میں بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ کیونکہ اُن دنوں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے گلے میں اتنا بڑا ناسور تھا۔ کہ انگلی کے برابر فتیلہ جاتا تھا۔ اور یہ دور دراز کا سفر اور قید کی مصیبت اُس کے علاوہ تھی۔ بادشاہ نے پاس بلا کر چپکے سے کہا۔ کہ تو تنہا در گوش من بگو کہ ازیں دعوےٰ تائب شدم و مطلق العنان و فارغ البال باش۔ شیخ علائی نے جواب بھی نہ دیا۔ جب اُس نے کسی طرح نہ مانا۔ تو مایوس ہو کر مخدوم سے کہا۔ تو دانی و ایں۔ اُنہوں نے فوراً حکم دیا۔ کہ ہمارے سامنے کوڑے مارو۔ بیماری کے سبب سے اس میں کوئی رمق ہی جان باقی تھی۔ تیسرے ہی کوڑے میں اُس بے گناہ کا دم نکل گیا۔ اور قادر مطلق کے حضور میں ایسی نزہت گاہ میں جا کر آرام لیا۔ کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھا۔ نہ کسی کان نے سُنا۔ اُس کے نازک بدن کو ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر بازار لشکر میں کھنچوایا۔ اور حکم دیا کہ لاش دفن نہ ہونے پائے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایسی آندھی چلنی شروع ہوئی۔ کہ لوگوں نے جانا۔ قیامت آئی۔ تمام لشکر میں اس واقعہ کے چرچا سے غلغلہ اور ماتم عظیم برپا ہوا۔ اور سب کہتے تھے کہ سلیم شاہ کی سلطنت گئی۔ راتوں رات میں اُن کی لاش پر اتنے پھول چڑھے۔ کہ بے کس اور بے وارث لاش کے لئے وہی قبر ہو گئی۔ اور **ذکر اللہ** تاریخ ہوئی ۹۵۷ھ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ اس کے بعد سلیم شاہ کی سلطنت دو برس بھی نہ تھم سکی۔ جیسے جلال الدین خلجی کی سلطنت

سید مولہ کے قتل کے بعد۔ بلکہ سلیم شاہ کی سلطنت اس سے بھی جلد ختم ہو گئی۔ لوگ اس دل آزاری کا باعث مُلّا عبداللہ کو سمجھ کر ہمیشہ دل آزاری کرتے تھے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ ایسے ہی تھے۔

شیخ سلیم چشتی کا حال

اکبر کا سارا حال تم نے پڑھ لیا۔ تم سمجھ گئے ہو گے۔ کہ اُس کے دل میں مذہب اور اعتقاد کی ہیئت مجموعی کیا تھی۔ تم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ابتدا میں وہ صوفیانہ خیالات کے ساتھ ایک ایسا شخص تھا۔ جسے سُنّی مسلمان خوش اعتقاد کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ عمارت حقیقت میں اسی معمولی بنیاد پر تھی۔ جو کہ خاص و عام اہل اسلام کے دلوں میں ان کے بزرگوں کی باتوں سے تہ بہ تہ چڑھتی چلی آتی ہیں۔ ترقّی اس کی اس طرح ہوئی کہ ۹۶۹ھ میں ایک دن شکار کو نکلا۔ اسے ہندوستان کے گانے سُننے کا بھی بہت شوق تھا۔ منڈاکر میں (آگرہ اور فتح پور کے بیچ میں ایک گاؤں ہے) گویّوں نے خواجہ معینُ الدین چشتی علیہ الرحمۃ کے فضائل و کرامات میں گیت گائے۔ وہ پہلے بھی سُنا کرتا تھا۔ کہ تمام ہندوستان میں ان کا نام اور عالی مقام روشن ہے۔ خصوصاً راجپوتانہ میں وہ درگاہ سلاطین فرمانروا کا حکم رکھتی ہے اکبر کو ایسا ذوق و شوق طاری ہُوا کہ وہیں سے اجمیر کو روانہ ہوا۔ زیارت کے مراتب ادا کئے دل کی مرادیں عرض کیں۔ اور نذر نیاز چڑھا کر رخصت ہُوا۔

یہ خدا کی قدرت ہے کہ حُسنِ اتّفاق جو کچھ مانگا تھا۔ اُس سے زیادہ پایا۔ اس لئے زیادہ اعتقاد بڑھا اور روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اکثر ایسے معاملے ہوئے۔ کہ آگرہ یا فتح پور سے وہاں تک پا پیادہ پا برہنہ گیا۔ اور یہ تو معمول تھا کہ ایک منزل سے پیادہ ہوتا تھا۔ روضہ کا طواف کرتا تھا۔ اندر جا کر گھنٹوں تک مراقبہ میں بیٹھتا تھا۔ عجز و نیاز سے مرادیں مانگتا تھا۔ پھر وہاں کے علما و مشائخ کی صحبت میں بڑے ادب آداب سے بیٹھتا تھا۔ ان کے کلاموں اور تقریروں کو ہدایت سمجھتا تھا۔ ہر ایک کو بہت کچھ دیتا تھا۔ جس وقت قوالی ہوتی تھی۔ اور قوّال معرفت الہٰی کے اشعار یا گیت گاتے تھے۔ تو بزرگان و مشائخ پر حالت طاری ہوتی تھی۔ روپیہ اور اشرفیاں مینہ کی طرح برستی تھیں۔ انعام و اکرام بخشش و سخاوت کی کچھ حد نہ تھی۔ تم نے وہ بھی دیکھ لیا۔ کہ آخیر میں عقائد اسلامی کے باب میں اس کا کیسا خیال ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ معراج کے باب میں کیا کچھ کہتا تھا۔ اور معجزوں کو نہ مانتا تھا۔ لیکن اس درگاہ کے ساتھ مرتے دم تک وہی اعتقاد رہا۔

مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ اہل نظر دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ کہ ان کے ساتھ تو یہ اعتقاد اور آنحضرت جن کے دامن کے سایہ سے ایسے ایسے ہزاروں اولیا اُٹھ کھڑے ہوں۔ ان کے باب میں وہ

گفتگو۔لیکن اس عالم میں بھی وہ آدمی کو خوب پہچانتا تھا۔تم شیخ محمدؐ غوث گوالیاری کے حال میں دیکھو گے۔انہوں نے اسے کبوتر کر دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر مریدی کے پھندے میں پھانسا۔وہ سمجھے کرہم نے ایک لڑکے بادشاہ کو بہلایا۔اور حقیقت میں اُس نے بڈھے پیر کو شکار کیا۔

خیر تم ابتدائی خوش اعتقادی کا حال سُنو۔عالم تصوف کی کیفیتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو ۹۷۵ھ میں شیخ سلیم چشتی حج کرکے دوبارہ ہندوستان کو پھرے۔سیکری ایک گاؤں آگرہ سے ۱۲ کوس پر ہے۔وہیں رہتے تھے۔ان کے آنے کا بڑا غل ہُوا۔اور غل ہونا بھی بجا تھا۔تم دیکھو گے صورت حال ایسی ہی تھی۔کیسے مقدس اور نامور خاندان سے تھے۔اور چشتیہ ہی سلسلہ میں تھے۔ غرض اکبر ان کے مرید ہوئے۔اور ان کی ارادت اور اعتقاد نے مدت تک پھول پھل دئیے۔اس لئے واجب ہے۔کہ ان کے حالات جو کچھ معلوم ہوں مفصل لکھوں۔ وہ شیخ فریدالدین گنجشکر کی اولاد تھے۔اصل میں دلی کے رہنے والے تھے۔خواجہ ابراہیم جو چھٹے واسطہ میں فضیل عیاض کے فرزند سجادہ نشین تھے۔اُن سے بھی اُنہوں نے فیض امانت پایا تھا۔شیرشاہ کے عہد میں بھی ان کی پرہیزگاری اور نیکوکاری لوگوں کے دلوں میں اثر رکھتی تھی۔۹۵۲ھ میں اس کا بڑا بیٹا عادل خاں اپنے چھوٹے بھائی سلیم سے تخت نشینی کے معاملہ میں گفتگو کرنے آیا۔سیکری میں عین شب برات کو پہنچا۔وہ اور خواص خاں شیخ سلیم چشتی کے گھر میں رہے۔اور تمام رات دُعاؤں اور نمازوں میں گزاری۔پھر سلیم شاہ کے عہد میں جو خاص اس کے دو امام تھے۔ایک یہ تھے دوسرے حافظ نظام بداؤنی۔بداؤں میں بھی ان کے بھائی بندوں کا خاندان نامور اور صاحب اثر تھا۔چنانچہ ایک برج فصیل کا شیخ زادوں کا برج کہلاتا تھا۔

خشکی و تری کے رستہ دو دفعہ ہندوستان سے حرمین شریفین کی زیارت کو گئے۔روم۔ بغداد۔شام۔نجف اشرف اور اَور ادھر کے ملکوں میں پھرتے رہے۔تمام سال سفر میں سیاحی۔حج کے وقت مکہ معظمہ میں آ جاتے تھے۔پھر سیر کو نکل جاتے تھے۔اس طرح بائیس حج کئے۔چودہ پہلی دفعہ۔آٹھ دوسری دفعہ۔اخیر مرتبہ چار برس مکہ معظمہ ہی میں رہے۔چار برس مدینہ منورہ میں۔مکہ والے چار برسوں میں بھی خاص خاص دنوں میں مدینہ طیبہ میں جا رہے تھے۔ حج

کے موسم میں چلے آتے تھے۔ وہاں شیخ الہند کہلاتے تھے۔ اخیر حج میں شیخ یعقوب کشمیری بھی ساتھ تھے۔ (یہ وہی یعقوب ہیں جنھوں نے تاریخ کہی)۔ ؎

شکر خدا را کہ بہ محض کرم	منزل ما شد حرم محترم
ہر کہ بہ پرسید ز تاریخ سال	نحن اجبناہ دخلنا الحرم

جب ساری منزلیں طے کیں۔ اور دعائیں قبول ہو گئیں تو ۹۸۱ھ میں پھر آکر اپنے عبادت خانہ میں داخل ہوئے۔ زمانہ بہت خوب تھا۔ اکبر کا ابتدائی دور تھا۔ ہر جلسہ اور مسجد۔ مدرسہ میں خوبیوں کے ساتھ چرچا ہوا۔ ملا صاحب نے دو تاریخیں لکھیں ؎

شیخ اسلام ولی کامل	آں مسیحا نفس و خضر قدم
لامع از جبہ او سر ازل	طالع از چہرۂ او نورِ قدم
از مدینہ چو سوئے ہند شتافت	آں مسیحا نفس و خضر قدم
بشمر حرفے و مشمر حرفے	بہر تاریخ ز خیر المقدم

دوسری تاریخ

شیخ اسلام مقتدائے انام	رفع اللہ قدرہ السامی
از مدینہ چو سوئے ہند آمد	آں ہدایت پناہئ نامی
گیر حرفے و ترک کن حرفے	بہر سالش ز شیخ اسلامی

نئی خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ آٹھ برس میں تیار ہوئی تھی۔ اس عہد کے مورخ لکھتے تھے۔ کہ دنیا میں اس کا نظیر نہیں۔ بہشت بہشت سے پہلو مارتی ہے۔

اکبر کی ۲۷-۲۸ برس کی عمر ہو گئی تھی۔ کئی بچے ہوئے۔ اور مر گئے۔ لاولد تھا۔ اس لئے اولاد کی بڑی آرزو تھی۔ شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک نے شیخ موصوف کے بہت اوصاف بیان کئے۔ اکبر خود سیکری میں گیا۔ اور دعا کی التجا کی۔ جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ جن دنوں والد بزرگوار کو فرزند کی بڑی آرزو تھی۔ ایک پہاڑ میں سیکری علاقہ آگرہ کے پاس شیخ سلیم نام ایک فقیر صاحب حالت تھے۔ کہ عمر کی بہت منزلیں طے کر چکے تھے۔ ادھر کے لوگوں کو ان کا بڑا اعتقاد تھا۔ میرے والد کہ فقرا کے نیاز مند تھے۔ ان کے پاس گئے۔ ایک اثنائے توجہ اور بیخودی کے عالم میں ان سے پوچھا۔ کہ حضرت! میرے ہاں کے فرزند ہوں گے۔ فرمایا کہ تمہیں خدا تین فرزند دیگا۔

والد نے کہا۔ میں نے منت مانی کہ پہلے فرزند کو آپ کے دامن تربیت و توجہ میں ڈالونگا۔ اور آپ کی مہربانی کو اس کا حامی و حافظ کرونگا۔ شیخ کی زبان سے نکلا۔ کہ مبارک باشد۔ میں نے بھی اُسے اپنا بیٹا کیا +

انہیں دنوں معلوم ہوا۔ کہ حرم سرا میں کسی کو حمل ہے۔ بادشاہ سن کر بہت خوش ہوئے اس حرم کو حریم شیخ میں بھیج دیا۔ خود بھی گئے۔ اور اُس وعدہ کے انتظار میں چند روز شیخ کی ملازمت میں رہے۔ اسی سلسلہ میں ایک حرم سرا کی عالی شان عمارت شیخ کی حویلی اور خانقاہ کے پاس بنوانی شروع کی۔ اور شہر آباد کر کے سیکری کو فتح پور خطاب دیا۔ مُلا صاحب فرماتے ہیں۔ مسجد و خانقاہ کی تاریخ میں نے اس طرح نکالی شہر فتح پور کی تفصیل دیکھو فہرست عمارت میں سے

رَفَعَ اللّٰہُ قدرہ بانیہا	ھذہ البقع قبۃ الاسلام
لا یُریٰ فی البلادِ ثانیہا	قال رُوحُ الامین تاریخہا

اور ایک اور بھی ہے ع

بیت معمور آمدہ از آسماں

اور اشرف خاں میر منشی حضور نے کہی ع

ثانی مسجد الحرام آمد

جب ۹۷۷ھ میں لڑکا پیدا ہوا۔ خوشی کے سامان تو بڑے بڑے ہوئے۔ مگر ایک نکتہ اُس میں سے یہ ہے۔ کہ کل ممالک محروسہ کے قیدی آزاد ہو گئے۔ اجمیر وہاں سے ۱۲۰ کوس ہے۔ پیادہ پا شکرانے کو گئے۔ برکت کے لئے حضرت شیخ نے بیٹی سے دود پلوایا۔ اپنے نام پر اُس کا نام رکھا۔ یعنی سلیم۔ چونکہ شیخ کی دُعا سے انہیں کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہیں پلا تھا۔ اس لئے اکبر کچھ ادب سے اور کچھ پیار سے شیخو جی کہا کرتا تھا۔ نام نہ لیتا تھا۔ وہی بڑا ہو کر جہانگیر بادشاہ ہوا +

آزاد۔ اکبر کو اس سے دلی محبت تھی۔ جن دنوں شکم مادر میں تھا۔ ایک دن چار پہر گذر گئے۔ معلوم ہوا۔ کہ بچہ نہیں پھرتا۔ سب گھبرا گئے۔ اکبر کو بھی تردد ہوا۔ اُس دن جمعہ تھا۔ ان دنوں چیتے کے شکار کا بہت شوق تھا۔ عہد کیا کہ آج کے دن چیتے کا شکار نہ کھیلونگا۔ خدا اس بچے کو زندگی دے۔ اور اس کی بدولت بہت سے جانداروں کی جان بچ جائے۔ چنانچہ جب تک

سلہ دیکھو تعمیرات اکبری +

زندہ رہا۔ اس عہد کا پابند رہا۔

سبحان اللہ ملا صاحب کی باتیں سن کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ کہ پہلے وجد کرے۔ یا رقص کرے۔ یہ حالات و کمالات و کرامات لکھتے لکھتے فرماتے ہیں۔ بس یہیں سے حضرت شیخ کے کمالات کو نظر لگی۔ بادشاہ ان کے گھر میں محرموں کی طرح آنے جانے لگے۔ بیٹے پوتوں نے کہا۔ کہ اب بیبیاں ہماری نہ رہیں۔ فرمایا۔ دنیا کی عورتیں تھوڑی نہیں۔ نقصان کیا ہے۔ ارض اللّٰہ واسعہ ع

خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست

دو اور عالیشان محل بادشاہ نے بنوائے۔ شہر بہشت بریں بنتا چلا جاتا تھا۔ کہ شیخ موصوف نے ۹۵ برس کی عمر میں دنیا سے انتقال کیا۔ ایک تاریخ ہوئی۔ شیخ ہندی۔ دوسری۔

تاریخ وفات شیخ اسلام	شیخ حکماؤ شیخ حکام ۹۷۹ھ

آزاد۔ خدا جانے اس تاریخ میں بھی کچھ طنز ہے یا بے تکلفی کی ہے۔ باوجود اس کے سلسلۂ مشائخ میں جہاں ان کا حال لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شریعت کے بموجب عبادت کا بجا لانا۔ دردناک ریاضتیں اور سخت مشقتیں اٹھا کر منازل فقر کو طے کرنا ان کا عمل۔ اور طریقہ کا اصول تھا اور یہ بات اس عہد کے مشائخ میں کسی کو کم حاصل ہوئی۔ نماز پنجگانہ غسل کر کے جماعت سے پڑھتے تھے۔ اور یہ وظیفہ تھا۔ کہ فوت نہیں ہوا۔ شیخ مان پانی پتی نے پوچھا۔ طریق شما باستدلال است یا بکشف۔ جواب دیا۔ "درطور ماردل بردل است" بڑے بڑے مشائخ کبار ان سے فیض پا کر درجۂ تکمیل کو پہنچے۔ ان میں سے حاجی حسین خادم۔ بہترین خلفا۔ صدر نشین اور خانقاہ فتح پور کے صاحب اہتمام اور با اختیار تھے۔

جب شیخ سلیم چشتی دوبارہ ہندوستان میں آئے۔ تو ملا صاحب نے سنا کہ عربیت میں بڑی دستگاہ ہے۔ ایک خط زبان عربی میں لکھ کر بھیجا۔ اس میں دو تاریخیں بھی ان کے آنے کی لکھیں چنانچہ وہ خط بجنسہ اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ مگر کاتبوں نے اس میں ایسی اصلاح دی ہے۔ کہ لکھنا نہ لکھنا برابر ہو گیا ہے۔ شیخ اعظم بداؤنی شیخ موصوف کے ہم جدبھائی بندوں میں تھے۔ اور داماد بھی تھے۔ ملا صاحب نے ۹۷۵ھ میں ان کے ساتھ جا کر شیخ سے ملاقات کی۔ باتیں ہوئیں اور بموجب ان کے فرمانے کے دو تین دن حجرۂ خانقاہ میں رہے۔ پھر ۹۷۶ھ میں تو بارہا ملتے رہتے تھے۔ ملا صاحب کہتے ہیں کہ میں نے جو ان کی کرامات دیکھی وہ یہ تھی۔ کہ جاڑے کے موسم میں فتح پور جیسے ٹھنڈے مقام میں خاصے کا کرتا اور ململ کی چادر کے سوا کچھ اور لباس

نہ ہوتا تھا۔ جلسہ کے دنوں میں دو دفعہ غسل ہوتا تھا۔ وصال کے روزے تھے۔ غذا آدھا تربوز بلکہ اس سے بھی کم ۔

جہانگیر جو کچھ اپنی **توزک** میں ان کی کرامات کے باب میں لکھتے ہیں۔ میں اُس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ ایک دن کسی تقریب سے میرے والد نے پوچھا۔ کہ آپ کی کیا عمر ہوگی۔ اور آپ کب ملک بقا کو انتقال فرمائیں گے۔ فرمایا۔ عالم الغیب خدا ہے۔ بہت پوچھا تو مجھ نیاز مند کیطرف اشارہ کرکے فرمایا۔ کہ جب شہزادہ اتنا بڑا ہوگا۔ کہ کسی کے یاد کروانے سے کچھ سیکھ لے۔ اور آپ کہے۔ جانتا کہ ہمارا وصال نزدیک ہے۔ والد بزرگوار نے یہ سُن کر تاکید کردی۔ کہ جو لوگ خدمت میں ہیں نظم نثر کچھ سکھائیں نہیں۔ اس طرح دو برس سات مہینے گزرے۔ محلّہ میں ایک عورت رہتی تھی۔ وہ نظر گذر کے لئے روز مجھے اسپند کر جاتی تھی۔ اسے کچھ صدقہ خیرات مل جاتی تھی۔ ایک دن اُس نے مجھے اکیلا پایا۔ اور اس مقدمہ کی اُسے خبر نہ تھی۔ مجھے یہ شعر یاد کروا دیا ؎

الٰہی غنچۂ امید بکشا   گلے از روضۂ جاوید بنما

مجھے پہلے پہل یہ کلام موزوں ایک عجیب چیز معلوم ہوئی۔ شیخ کے پاس گیا۔ تو انہیں بھی سُنایا۔ وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔ والد بزرگوار کے پاس گئے۔ اور یہ واقعہ بیان کیا۔ اتفاق یہ کہ اُسی رات انہیں بخار ہوا۔ دوسرے دن آدمی بھیج کر **تان سین** کلانوت کو بُلوا بھیجا۔ کہ نظیر گویا تھا۔ اُس نے جا کر گانا شروع کیا۔ پھر والد مرحوم کو بُلوایا۔ وہ تشریف لائے۔ فرمایا کہ وعدہ وصال پہنچ گیا۔ تم سے رخصت ہوتے ہیں۔ اپنے سر سے دستار اُتار کر میرے سر پر رکھ دی۔ اور کہا کہ سلطان سلیم کو ہم نے اپنا جانشین کیا۔ اور اُسے خدائے حافظ و ناصر کو سونپا۔ دمبدم ضعف بڑھتا جاتا تھا۔ اور مرنے کے آثار ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ محبوب حقیقی کا وصال حاصل ہوا۔ اکبر کے دل میں ان کے ادب و اعتقاد پر کبھی ضعف نے اثر نہیں کیا۔ جب فاتحہ کو جاتا تھا۔ تو پہلے اشرفیاں اس طرح نچھاور ہوتے تھے۔ گویا آسمان سے فرشتے برسا رہے ہیں ۔

مُلّا صاحب بڑے درد کے ساتھ فرماتے ہیں۔ **شیخ بدر الدین** ان کے بڑے بیٹے **مکہ معظمہ** چلے گئے تھے۔ وہاں عبادتیں اور سخت ریاضتیں کرتے تھے۔ سات ان کاطی[1] کا روزہ

---

[1] روزۂ طی کا طریقہ یہ ہے کہ دن بھر روزہ رکھا۔ شام کو فقط دو تین قطرے پانی سے افطار کیا۔ اور اسی وقت سے پھر روزہ رات بھر دن بھر فاقہ۔ شام کو پھر وہی دو تین قطرہ پانی اور پھر روزہ۔ دو تین قطرہ آب کا اندازہ استادوں نے یہ رکھا ہے کہ ہاتھ کے پنجہ کو خوب سختی سے کھول کر ہتھیلی زمین پر وصل کرو۔ انگوٹھے کی جڑ پر جو گڑھا سا پڑ جاتا ہے۔ اُس پر پانی کے قطرے ڈالو۔ جس قدر ٹھیر جائے۔ وہ مقدار افطار کے لئے کافی ہے۔ وہ دو تین ہی قطرے ہوتے ہیں ۔

رکھا تھا۔گرم موسم۔مکہ کی گرم ہوا۔ اور وہ ننگے پاؤں طواف کعبہ کر رہے تھے۔ پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔تپ محرقہ ہو گئی۔آخر سنہ ۹۹۰ھ میں ساقیِ لطفِ ازلی کے ہاتھ سے شہادت قتل فی سبیل اللہ کا شربت پیا۔جس دن یہ خبر پہنچی تھی۔بادشاہ آگرہ سے الہ آباد کو کشتی سوار جاتے تھے۔حاجی حسین خادم خانقاہ کو کہلا بھیجا۔شیخ کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ اور جو سلسلہ ہدایت و ارشاد کا باقی رہ گیا تھا۔وہ بھی تمام ہو گیا۔آزاد۔سبحان اللہ یہ کیسے شہید ہوئے ؁

پھر سنہ ۹۹۹ھ میں فرماتے ہیں۔شیخ ابراہیم چشتی اجل طبعی سے مر گئے۔اور جہان جہان زر و مال کو وداع کر کے خدا کو حساب دیا۔پچیس کروڑ تو نقد روپیہ تھا۔ہاتھی گھوڑے اور اجناس اس حساب پر پھیلا لو۔سب بادشاہی خزانہ میں داخل ہوا۔ اور جس کا راز نہ کھلا۔وہ نصیب اعدا یہ کون؟ ان کی اولاد اور وکیل۔خستہ کی حالت میں گرفتار تھے۔شیخ لئیم اور ذمیم الاوصاف تاریخ ہوئی ؁

اولاد۔بڑے صاحبزادے شیخ ابراہیم تھے۔جن کا حال سن چکے (۲) شیخ ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔شیخ احمد منجھلے بیٹے شیخ سلیم فتحپوری کے ہیں۔دنیا داروں میں بہت سی عمدہ خصلتیں ان کے چہرے پر آئینہ ملتی تھیں۔لوگوں کی شکایت سے زبان آلودہ نہ کرتے تھے۔خلاف طبع بات پر غم سے مغلوب نہ ہوتے تھے۔ متانت و وقار سے مصاحبت رکھتے تھے۔ دستگیری عقیدت اور خوبی عبادت سے جرگہ امرا میں داخل ہوئے۔ان کی بی بی کا سلیم (جہانگیر) نے دود پیا تھا۔مالوہ کی مہم میں بے پرہیزی کی۔سمجھایا تو نہ مانا۔آخر دارالخلافہ میں آکر فالج کی نوبت پہنچی۔سنہ ۹۸۵ھ میں کہ بادشاہ اجمیر جاتے تھے۔اسے حضور میں لائے۔سجدہ عجز کر کے آخری رخصت حاصل کی گھر میں جا کر آخری سانس نے منزل گاہ نیستی کا رستہ دکھایا ؁

جہانگیر نے جس عفیفہ کا دود پیا تھا۔اس کی گود میں لڑکا تھا۔اور نام اس کا شیخ جیون تھا وہی صاحبزادہ بڑا ہو کر نواب قطب الدین خان اور جہانگیر کے کوکلتاش خاں ہو گئے۔ انہی کو جہانگیر نے بھیجا تھا۔کہ شیر افگن خاں کے پاس جاؤ۔ اور جس طرح ہو نورجہاں کو لے آؤ۔ نہ ہو سکے تو شیر افگن کو شکار کر لو۔تقدیر الٰہی سے دونوں ایک ہی میدان میں کھیت رہے۔ ذیقعدہ سنہ ۱۰۱۶ھ میں مر گئے۔جہانگیر نے ان کے جنازہ کو چند قدم کندھا دیا۔ اور دل کو رنج ہوا۔کئی دن تک کھانا کھانے کو دل نہ چاہا۔ اور کپڑے نہ بدلے۔ آخر صبر کیا ؁

سلسلۂ صفویہ اور خاندان تیموری کا تعلق

شاہ صفی ایک سید صحیح النسب ۔ عابد ۔ زاہد ۔ پرہیز گار ۔ اردبیل علاقہ آذربائیجان میں تھے ۔ عزلت کا گوشہ اُن کی صبر و قناعت سے روشن تھا ۔ اور اوصاف و برکات نے اعتقاد کی گرمی خاص و عام کے دلوں میں اس طرح دوڑائی تھی ۔ جیسے رگوں میں خون ۔ نیت کی برکت تھی ۔ کہ جو ظاہر ہیں اُن کا جانشین ہوا ۔ وہ معنی میں دلنشین ہُوا ۔ حکام اور شاہان وقت انہیں اپنی بیٹیاں نذر دیتے تھے ۔ اور سعادت سمجھتے تھے ✦

شاہ صفی کے بعد اُن کے فرزند شیخ صدرالدین عبادت کے سجادہ نشین ہو کر بندگان خدا کو فیض پہنچاتے تھے ۔ جب امیر تیمور روم کو فتح کر کے پھرا ۔ تو لشکر کا اردبیل میں مقام ہوا ۔ ان کے خاندان کے اوصاف پہلے بھی سُنتا تھا ۔ اور سادات و فقرا کے ساتھ صدق دل سے اعتقاد رکھتا تھا ۔ خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور دعا چاہی ۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ۔ کہ مجھے کچھ خدمت فرمائیے ۔ اور اس امر پر بہت اصرار کیا ۔ شیخ نے فرمایا ۔ کہ تمہارے لشکر میں ہزاروں بے گناہ بندے خدا کے بندی میں گرفتار ہیں ۔ جن جانوں کو خدا نے آزاد پیدا کیا ۔ اُنہیں غلامی کے بند میں دیکھ کر خوف آتا ہے ۔ کہ خدا کا بندہ آدمی کا بندہ کیونکر ہو سکتا ہے ۔ انہیں آزاد کر دو ۔ امیر صاحب قراں نے "بچشم" کہہ کر قبول کیا ۔ ہزار در ہزار آدمی ۔ امیر غریب ۔ شریف ۔ عامی اور قبائل ترکوں کے تھے ۔ استجلو ۔ تکلو ۔ رُستاق ۔ رُملو ۔ ذوالقدر ۔ افشار ۔ قاجار ۔ دغلو وغیرہ سب رہا ہو گئے ۔ یہ شیخ کے بندۂ احسان ہوئے ۔ اور عقیدت نے دلوں میں جگہ پکڑی ✦

شیخ موصوف کے بعد شیخ جنید مسند ہدایت پر بیٹھے اُنکے گرد اہل ارادت کی انبوہ دیکھ کر بادشاہ وقت کو خطر ہوا ۔ اور اپنی قلمرو سے نکال دیا ۔ وہ حلب میں چلے گئے ۔ ازن حسن چال کا فرمانروا مقرر ہُوا ۔ اور اپنی بہن کو اُن کے حرم میں داخل کر دیا ۔ اس سے سلطان حیدر پیدا ہوئے ✦

جب معرفت کا سلسلہ سلطنت میں مسلسل ہوا ۔ تو خیالات کے رنگ بدلنے شروع ہوئے انہوں نے اہل ارادت کو سُرخ بانات کی ٹوپیوں سے سر بلند کیا ۔ اس میں بارہ اماموں کے شمار سے بارہ کنگرے قرار دیئے ۔ اور یہی لوگ لقب قزلباش سے نامور ہوئے ۔ قزل ۔ سُرخ ۔ باش سر ✦

بزرگانِ صفویہ کے ساتھ اہلِ عقیدت کا ہجوم دیکھ کر ہمیشہ سلاطین عہد کو ڈر رہتا تھا۔ اس لئے یہ مقدس لوگ تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ مارے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی پشت کے بعد شاہ اسمٰعیل صفوی کو باپ کا انتقام لینا واجب ہوا۔ وہی ترکان خونریز کے قبیلے کہ دادا کے بندۂ احسان تھے۔ اُس کی فوج خدائی ہو گئی۔ وہ ننھیال کی طرف سے شمشیر سلطنت ہاتھ میں لے کر مسندِ دولت پر سوار ہوا۔ اور ذاتی ہمت اور قدرتی اقبال نے تاج کیانی سر پہ رکھ کر تختِ پر بٹھا دیا۔ قزلباش ہمیشہ ان کے اور اُن کی اولاد کے فدائی رہے۔ اور وہ اطاعت کی کہ کسی اُمت نے اپنے پیغمبر کی ایسی اطاعت نہ کی ہو گی ✦

یہی زمانہ تھا کہ ادھر صفویہ کی تلوار ایران میں اور اُدھر شیبانی خاں کا اقبال توران میں اپنی اپنی سلطنت کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ اُذبک کی قومی دلاوری ایسی زور پر چڑھی تھی کہ آل تیمور کی چھ پشت کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دی ✦

بابر نے جب کسی طرح گھر میں گزارہ نہ دیکھا۔ پشتوں کے نمک خواروں نے بیوفائی کی۔ رشتہ دار جان کے لاگو ہو گئے۔ تو مایوس ہوا۔ اور جس خاک سے چھ پشت کی بیلیں اُگ کر منڈھے چڑھی تھیں۔ اُسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ وہ بدخشاں میں آیا۔ خسرو شاہ ایک نمکحرام وہاں کا حاکم تھا۔ پہلے اُس سے معاملہ پڑا تھا۔ تو بے حیائی کی سیاہی مُنہ پر مل لی تھی۔ اب کی دفعہ انسانیت خرچ کی۔ اور بن بلائے مہمان کو آرام کا سامان دیا۔ اُس کمبخت کی رعایا اُس سے ناراض تھی۔ بابر نے اندر ہی اندر سب کو پرچا لیا۔ اور چاہا کہ خسرو کو ضیافت میں بُلا کر قید کر لے۔ اس فساد کی بو اُس کو بھی پہنچ گئی۔ ضیافت کی نوبت بھی نہ آئی۔ چُپ چھپاتے ہی نکل کر بھاگ گیا۔

جب یہ لشکر۔ دولت خانہ۔ خزانہ اور بنا بنایا گھر ہاتھ آیا۔ تو بابر کے حواس درست ہوئے چند روز بعد کابل میں آئے۔ یہاں ایک شخص الغ مرزا کا داماد بن کر حکومت کر رہا تھا۔ وہ پہلے قلعہ بند ہو کر سامنے ہوا۔ پھر کچھ سمجھا۔ اور آخر کار ملک حوالے کر کے بھاگ گیا۔ برسوں کی مصیبتیں اور مدتوں کی آفتیں اُٹھا کر ذرا نصیبہ نے کروٹ لی۔ جب بدخشاں اور کابل جیسے علاقے مفت ہاتھ آئے۔ تو بابر نے پر و بال درست کیے۔ اور ملک افغانستان کا بندوبست کرنے لگے ✦

اب اُن کے وطن کی حقیقت سُنو۔ کہ جب یہ وہاں سے ادھر آئے۔ تو شیبانی خاں اس طرح

پھیلا۔ جیسے بن میں آگ لگی۔ چند روز میں سمرقند و بخارا سے آل تیمور کا نام و نشان مٹا دیا۔ اور ایسا بڑھا۔ کہ جیحوں اُتر کر قندھار کو شربت کی طرح پی گیا۔ بلکہ ہرات لے کر ایران پر ہاتھ مارا۔ اس کے ادھر آنے کے دو سبب تھے۔ ایک تو جانتا تھا کہ پشت کا عفدار یہاں پہلو میں بیٹھا ہے۔ جب بابر موقع پائیگا۔ بدخشاں سے اُتر کر چھاتی پر چڑھ آئیگا۔ دوسرے ایران میں صفوی سلطنت کی بُنیاد قائم ہونے لگی تھی۔ اُسے گرانا اور اپنے ملک کا پھیلانا ایسے شخص کے لئے بہت آسان تھا۔ جس کے ساتھ لاکھوں اُذبک قومی اور مذہبی جوش میں بھرے شمشیر بکف حاضر ہوں +

سلاطین صفویہ شیعہ تھے۔ اور اہل توران سنت جماعت۔ اور حق تو یہ ہے۔ کہ ایرج اور تورج کے خون خدا جانے آب جیحوں میں کس بلا کا زہر گھول گئے۔ کہ ایران و توران کی خاک ایک دوسرے کے لہو کی پیاسی ہو گئی۔ اور اب تک چلی آتی ہے +

غرض شیبانی خاں نے جیحوں اُتر کر اوّل چغتائی شہزادوں کو خانہ برباد کیا۔ اُس کا دل بڑھا ہوا تھا۔ قدم بڑھا کر قزلباشوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ اُس وقت ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی تلوار چمک رہی تھی۔ اصفہان کے جوہر سے اُذبک کی دست درازی نہ دیکھی گئی۔ شاہ جواں بخت نے تحمّل اور وقار سے کام لیا۔ اور باوجود جوش جوانی اور حریف کی پیش قدمی کے نامہ لکھا جس کے مطالب صلاحیت اور شائستگی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنے مراسلے کو آرام و عافیت کے فوائد سے نقش و نگار کر کے کمال متانت سے یہ دکھایا تھا۔ کہ لڑائی میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔ اور ملاپ میں کس قدر فائدے اور آرام ہیں۔ خاتمہ کلام اس امر پر تھا۔ کہ ترکستان تمہارا قومی ملک ہے۔ وہ تمہیں مبارک رہے۔ لیکن عراق کے دامن میں پاؤں پھیلانا مناسب نہیں۔ اس میں یہ شعر بھی لکھا تھا ؎

نہال دوستی بنشاں۔ کہ کامِ دل ببار آرد درختِ دشمنی برکن کہ رنج بیشمار آرد

شیبانی خاں کی فتوحات متواتر اور بلند نظری نے اس خط کی روشنائی کو خطِ غبار دکھایا۔ اور باوجود کمسن سالی اور تجربہ کاری کے جواب میں بڑے غرور سے لکھا۔ کہ ہم چنگیزی نسل ہیں۔ اور موروثی سلطنت کے مالک ہیں۔ ملک گیری ہمارا حق ہے۔ سلطنت کا دعوےٰ اور پادشاہوں سے معاوضہ اُسے زیبا ہے۔ جس کے باپ دادا نے پادشاہی کی ہو۔ تمہیں ہمارے مقابلہ میں دعوےٰ جہانداری نہیں پہنچتا۔ اور ترکمانوں سے رشتہ کر کے سلطنت کا دعوےٰ بے معنی ہے۔ اور یہ حق تمہیں اُس وقت پہنچتا۔ کہ مجھ جیسا بادشاہ وارث ہفت اقلیم موجود نہ ہوتا۔ ہمارے سامنے

تمہیں ان باتوں سے کیا تعلق؟ ع

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اس تحریر پر بھی قناعت نہ کی۔ تحائف و نفائس کے مقابل میں ایک فقیروں کا چملا اور ایک عصا بھیجا۔ کہ یہ ہے میراث تمہارے باپ دادا کی۔ اسے لو اور مانگتے کھاتے پھرو۔ اور لکھا ؎

نصیحت گوش کن جاناکہ از جاں دوست تر دارند	جوانانِ سعادت مند پندِ پیر دانا را

خاتمہ میں یہ بھی لکھا۔ کہ ہم نے حج بیت اللہ کا ارادہ مصمم کیا ہے۔ عنقریب عراق اور آذربائیجان کے رستے روانہ ہوں گے۔ مطلع کرو۔ کہ کس مقام پر ملاقات ہوگی۔

شاہ اسمعیل نے اس کا جواب طولانی لکھا۔ اور بہت جوش و خروش سے لکھا۔ مگر جو فقرہ فقیری کی طنز کرتا تھا۔ اُس کے جواب میں یہ مضمون تھا۔ کہ ہم آلِ رسولؐ ہیں۔ فقر کی نعمت اور دُنیا کی سلطنت۔ دونوں ہمارا حق ہیں۔ اور ہمارے اجداد کرام کا ورثہ ہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ ہمسری شایاں نہیں۔ اور سلطنت اگر میراث ہوئی تو پیشدادیوں سے کیانیوں کو اور اُن سے درجہ بدرجہ چنگیزیوں کو۔ اور پھر تم تک کیونکر پہنچتی؟ اور یہ جو تم نے لکھا ہے۔ کہ ؎

عروسِ ملک کسے در کنار گیرد چُست	کہ بوسہ بر دمِ شمشیر آبدار زند

درُست ہے۔ مگر۔ ع

جانا سخن از زبانِ ما مے گوئی

تلوار علی اسداللہ الغالب کی ہے۔ وہ ہمیں اپنے دادا سے میراث پہنچی ہے۔ یہ ہمارا حق ہے۔ اگر مرد ہو۔ اور جنگ کی ہمت ہے۔ تو میدان جنگ میں آؤ۔ کہ باقی باتیں ذوالفقار حیدر کرار کی زبان سے ادا ہونگی۔ ع

بہ بینیم از ما بلندی کراست

اور نہیں آتے تو یہ چرخہ اور تکلا اور روئی پہنچتی ہے۔ اسے سامنے رکھ کر بڑھیوں میں بیٹھو۔ کہ اسی قابل ہو اور یاد رہے ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات	با آلِ نبی ہر کہ در افتاد بر افتاد

دل عقیدت منزل کو زیارت مشہد مقدس کی تمنا ہے۔ ہم نے بھی عزم بالجزم کے ساتھ نیت کی ہے۔ مناسب ہے کہ لشکر نصرت و اقبال کے استقبال کو جلد روانہ ہو۔ کہ دوست نوازی

اور دشمن گدازی کے آتشیں قوانین سے تمہیں آگاہ کریں۔

تا مدادادھر روانہ کی۔ اور ساتھ ہی قزلباش خونریز کے دستے لے کر گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں ادھر شیبانی خاں بھی لشکرے کر چلا۔ فرشتہ وغیرہ اُزبک کی تعداد ایک لاکھ لکھتے ہیں۔ مگر مرزا حیدر و عمالات صاحب رشیدی نے پچیس ہزار فوج لکھی ہے۔ غرض مرو پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اتفاق تقدیر۔ کہ پہلے ہی حملہ میں شیبانی خاں کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب شاہ کب رک سکتا تھا۔ قزلباش بزن بزن کرتے پیچھے دوڑے۔ ہزاروں ترک تھے۔ کہ کھیت کی طرح کٹتے اور گرتے چلے جاتے تھے۔ شیبانی خاں پانسو ہمراہیوں کے ساتھ جن میں اکثر شہزادے اور خاندان زادے تھے۔ ایک احاطہ کی پناہ میں بیٹھ گئے۔ (ادھر کے دشتوں میں اکثر گلہ بان اپنے آرام اور گلہ کی حفاظت کے لئے بنا رکھتے ہیں) جب لشکر قزلباش نے گھیر کر زور دیا۔ تو وہ بھی تلواریں کھینچ کر نکل پڑے۔ مگر پھر ناکامی کے ساتھ ہٹے۔ بہت مارے گئے۔ اس میں شیبانی خاں نے بھی سرداری کا بوجھ سر سے اتارا۔ باقی ہزاروں آدمی مع زن و فرزند قید ہوئے۔ اور انہی میں خانزاد بیگم بابر کی بہن بھی تھی ؛

بیگم کا ماجرا بھی سننے کے قابل ہے۔ جب بابر شیبانی خاں کے ہاتھ سے سمرقند کی دیوار کود کر بھاگا تھا۔ تو اس بدحواسی کے ساتھ بھاگا تھا۔ کہ اپنی مستورات کو بھی ساتھ نہ لے سکا تھا۔ اس میں یہ بدنصیب بیگم بھی رہ گئی تھی۔ پہلے اس کی خالہ شیبانی خاں کے نکاح میں تھی۔ اس وقت خالہ کو طلاق دے کر اسے نکاح میں لایا تھا۔ پھر اُسے بھی طلاق دیکر سید ہادی نام ایک سید کے حوالے کر دیا تھا۔ اور یہ پاک دامن بی بی غریبی کی حالت میں گذارہ کر رہی تھی۔ شاہ کو جب معلوم ہوا۔ تو بیگم کو عزت کے ساتھ قیدیوں میں سے نکالا۔ اور بی بیوں کی معرفت عزاپرسی کی رسمیں ادا کیں ؛

بابر اسوقت افغانستان میں آ گئے تھے۔ اور ملک کی تدبیر کے بادشاہ تھے۔ فتح کی خبر سُن کر مبارک باد کا نامہ تیار کیا۔ اور شاہ کو ادھر آنے کا رستہ دکھایا۔ اتنے میں شاہ کا ایلچی مع مراسلہ کے پہنچا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ ہم دونو بھائیوں کو خدا فتح مبارک کرے خصوصاً تم کو کہ امیر صاحب قرآن کی یادگار ہو۔ ایلچی کے ساتھ گراں بہا تحفے تھے۔ اور بیگم کو بھی عزت و احترام کے ساتھ بھیجا تھا۔ کہ دس برس ہو گئے تھے۔ خانہ برباد بھائی سے جدا تھی۔ بابر خود لکھتا ہے کہ میں قندز میں تھا۔ حرم سرا میں بہن سے ملنے کو گیا۔ محمدی کوکلتاش میرے ساتھ تھا

ایک زمانہ گذر گیا تھا۔ بہن نے مجھے بالکل نہ پہچانا۔ حیران دیکھتی تھیں۔ جتا کر کہا۔ کچھ خبر نہ ہوئی۔

غرض بابر نے بھی شاہ کو مبارک باد کے ساتھ جواب لکھا۔ اور خان مرزا کہ ایک تیموری شاہزادہ تھا۔ ایلچی بنایا۔ اور کمک کے لئے درخواست کی۔ صاحب ہمت بابر جس حال میں تھا۔ اذبکوں کے ساتھ دھکا پیل کئے جاتا تھا۔ اور وہ بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ بابر نے ایک موقع پر انہیں شکست دی تھی۔ مگر رفیقوں کی بدمددی سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں بیٹھا۔ آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ مدد غیبی کا منتظر تھا۔ یکایک خبر پہنچی۔ کہ خان مرزا آتا ہے۔ اور ساتھ اس کے تین ایرانی سردار قزلباش کا لشکر جرار لئے کمک کو آئے ہیں۔ شیر کی طرح پہاڑوں سے نکلا۔ اور میدان کے شہروں کو تو آتے ہی اذبکوں سے صاف کر دیا۔

شیبانی خاں کے بعد عبداللہ خاں اذبک نے اپنی بہادری اور تدبیر کی رسائی سے سپہ داری کا رتبہ حاصل کیا تھا۔ اور ملک بخارا پر قابض ہو گیا تھا۔ اب جو بابر کو ساٹھ ہزار فوج کی جمعیت اپنے گرد نظر آئی۔ تو بادل کی طرح گرجتا گیا۔ وہ بھی برق کی طرح آیا۔ لیکن دھوئیں کی طرح اڑ گیا۔ بہت سے اذبک شمشیر قزلباش کا شکار ہوئے۔ جو بھاگ بھی نہ سکے۔ وہ قید ہوئے۔ الحمدللہ کہ تیمور کے پوتے نے پھر سمرقند و بخارا پر قبضہ پایا ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا	بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

دادا کے تخت پر جلوس کیا۔ اور منبروں اور مسجدوں پر نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ نوبت خانہ سے دمامۂ دولت کی آواز بلند ہوئی۔ بابر نے درباروں کو جشنہائے شاہانہ سے رونق دی۔ اور امرائے قزلباش کو اعلےٰ لشکریوں کیساتھ خلعت و انعام دے کر رخصت کیا۔ یہ معرکہ ۹۱۷ھ میں ہوا۔

بابر جیسے ہمت کے رستم تھے۔ ویسے ہی ذوق و شوق کے دیوانے تھے۔ آٹھ مہینے تک جس میں چھ مہینے جاڑے کے تھے۔ بہاریں اڑاتے رہے۔ دفعۃً خبر آئی۔ کہ خاندان تیموری کا قدیمی دشمن تیمور سلطان اذبکوں کا ٹڈی دل لئے چلا آتا ہے۔ کہ میں شیبانی خاں کا جانشین ہوں خون کا عوض لوں گا۔ بابر گرم بچھونوں سے اٹھ کر سوار ہوئے۔ اور پھر شاہ کو نامہ لکھا۔ اتفاق تقدیر کہ بخارا کے قریب انہوں نے پھر شکست کھائی۔ اور بھاگ کر حصار شادمان میں آنا پڑا۔

شاہ کی طرف سے نجم خاں اصفہانی پھر ساٹھ ہزار فوج قزلباش لے کر مدد کو پہنچا۔ بابر اسے لے کر چلے۔ قلعہ افراس پر عبداللہ خاں اُزبک سے مقابلہ ہوگیا۔ پندرہ ہزار سے زیادہ اُزبک کی جمعیت تھی۔ خود عبداللہ خاں سپہ سالار تھا۔ طرفین کے دلاوروں نے بڑا ساکھ کیا۔ مگر اُزبک شمشیر قزلباش کی خوراک ہوئے۔ اور کم بچے جو بھاگ گئے۔ باقی قید ہوئے۔ قلعہ فتح ہوا۔ نجم ثانی کہ اپنے تئیں رستم ثانی گنتا تھا۔ آگے چلا اور کہا۔ کہ جب تک اُزبک کی قوم کا توران سے استیصال نہ کر لوں گا۔ ایران کو نہ پھروں گا۔ غجدیوان ایک منزل بخارا سے آگے ہے۔ اُس کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ اور قزلباش کے سردار جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ تو دونوں قوموں کی قومی برخلافی۔ کچھ جاہل قزلباشوں کی خود نمائی۔ اور بیہودہ گوئی۔ غرض یہ تسلط اُن کا تمام ترکستان کو ناگوار گزرا۔ خوانین و اُمرا شرفا و غربا اتفاق کرکے جمع ہوئے۔ اور عام و خاص کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ کہ بابر رافضیوں کی مدد لایا ہے۔ اور آپ بھی رافضی ہوگیا ہے۔ اس تدبیر نے بڑا اثر کیا۔ بڈھے اور جوان شہری اور دہقان۔ سب تلواریں۔ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چاروں طرف سے امڈ کر آئے۔ نجم ثانی اور ایرانی حیران رہ گئے۔ اس بادل کو برق شمشیر سے نہ ہٹا سکے۔ لیکن اپنے ملک اور قوم کی عزت اس بات سے رکھی کہ نہ بھاگے۔ اور سوا چند آدمیوں کے ایک ایرانی میدان میں زندہ نہ رہا۔ یہ حملہ رات کو بے خبری کے عالم میں ہوا تھا۔ بابر کی یہ نوبت ہوئی۔ کہ کفش پہننے کی مہلت بھی نہ پائی۔ ننگے پاؤں خیمہ سے نکل کر بھاگا۔ ۹۱۸ھ +

مرزا حیدر دوغلات نے تاریخ رشیدی میں لکھا ہے۔ کہ شاہ کے متواتر احسانوں نے بابر کے دل میں بہت اثر کیا تھا۔ اظہار محبت کے لئے خود بھی انہی کا لباس پہنتا تھا۔ قزلباش کی سرخ تاجدار ٹوپی اپنی فوج کی وردی میں داخل کر دی تھی۔ مرزا حیدر موصوف نے اس مقام پر اہل ایران اور اہل تشیع کے باب میں بہت سے فقرے اور فحش تشبیہیں ایسی لکھی ہیں۔ کہ میں کسی کے حق میں بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ بابر کی افراط مستوفی اور ایرانیوں کی زباں درازی نے کام خراب کر دیا۔ اسی سے حریفوں کو سند ہاتھ آئی۔ کہ رفض کی تہمت لگائی۔ اور اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس اخیر شکست نے بابر کا دل توڑ دیا۔ اور ایسا بیزار ہوا۔ کہ پھر وطن کا رُخ نہ کیا۔ پہلے بدخشان لیا۔ پھر افغانستان مارا۔ آب و دانہ وہاں سے ہندوستان میں لایا۔ اور ایسی مضبوطی سے جمایا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے آکر خاندان کا نام صفحہ ہستی سے

مرٹایا ہے۔

ہمایوں نے جب شیر شاہ کے زور اور بھائیوں کی بے مروتی سے کہیں گزارہ نہ دیکھا تو ایران کا رخ کیا۔ جس وقت سے خاک ایران پر قدم رکھا۔ شاہ طہماسپ[1] نے بساط مہمان نوازی کو ایسے اوج رفعت پر بچھایا۔ کہ کسی بادشاہ کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچا ہوگا۔ مصاحبان بادشاہ و امرائے خاص کو دربار سے بھیجا۔ اور راہ میں جو بیٹے اور سامراے عظیم الشان شہروں میں حکومت لیتے تھے۔ انہیں حکم آیا۔ کہ ایسے اور ایسے احترام و اعزاز کے سامان۔ اور اس استعداد فوج لے کر اس طرح کے تو زک اور آداب سے استقبال کریں۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے نوکروں کی امیروں سے بڑھ کر اور امیروں کی بادشاہوں کے برابر عظمت اور خاطر داری ہوئی۔ اور جو تعظیم و تکریم خود بادشاہ کی ہوئی۔ اس سے ورق در ورق تاریخیں رنگین ہیں۔ جس منزل میں شاہ بے پیاد پہنچتا تھا۔ وہاں کا حاکم زرق برق سپاہ لے کر سرحد پر استقبال کو آتا تھا۔ نذر دے کر لگام کو بوسہ دیتا تھا۔ رکاب پہ سر رکھتا تھا۔ اور ہاتھ باندھ کر ساتھ ہو لیتا تھا۔ پیدل چلتا تھا جب بادشاہ اشارہ کرتا تھا۔ تو سوار ہوتا تھا۔ لاؤ لشکر سمیت پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ جو محل اترنے کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش میں نہایت تکلف ہوتا تھا۔ کوس ول تک مخمل و زربفت کا فرش پا انداز ہوتا تھا۔ جشن جمشیدی کے شکوہ سے دربار ہوتا تھا۔ شاہ ایران کے تمام امرا اور ملازم نذریں دیتے تھے۔ سواری کے وقت درو گوہر نثار ہوتے تھے۔ لباس اسلحہ اور دسترخوان کے تکلفات کا بیان بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

تمام قلمرو ایران میں شاہ کا حکم پہنچ گیا تھا۔ کہ کسی کی زبان پر شکست کا لفظ نہ آنے پائے۔ کہ مہمان عزیز کا دل آزردہ ہو۔ ہرات میں شاہ ایران کا بیٹا فرماں روا تھا۔ اس نے بڑی دھوم دھام سے دعوت کی۔ باغ میں جشن سلطانی کیا۔ موسیقی کے ماہر جادوگری کر رہے تھے۔ ایک صاحب کمال نے غزل گانی شروع کی:۔

مبارک منزلے۔ کاں خانہ را ماہے چنیں باشد	ہمایوں کشورے۔ کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

ساری مجلس اچھل پڑی۔ مگر جب اس نے دوسرا شعر گایا ؎

---

[1] شاہ طہماسپ ابن شاہ اسمٰعیل ابن سلطان حیدر ابن سلطان جنید۔ ابن سلطان شیخ صدر الدین ابن ابراہیم ابن شیخ علی خواجہ ابن شیخ صدر الدین۔ ابن شیخ صفی الدین ابو اسحاق جو کہ شاہ صفی مشہور ہیں +

زرنجور احت گیتی۔ مشو غمگین۔ مرنجاں دل	کہ آئین جہاں گہ چناں گاہ چنیں باشد

اس پہ ہمایوں کے آنسو نکل پڑے۔ اور سب دم بخود رہ گئے۔

اہل نظر نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ خاکِ ایران جیسی گل انگیز ہے۔ ویسی ہی دانش خیز اور نکتہ ریز ہے۔ چنانچہ شاہ نے ایک ہاتھ سے مدارج مہماں نوازی کو اعلےٰ درجہ رفعت پر پہنچایا۔ دوسرے ہاتھ سے حفاظت ملک کے آئین میں انتہائے دور اندیشی کو کام فرمایا۔ وہ ہشیار ہو گیا۔ کہ پانچویں پشت میں تیمور کا پوتا ہے۔ مبادا اس ملک میں آکر بغاوت برپا کرے۔ اس واسطے وہ کرنا چاہیئے۔ کہ جس کی نیک نامی سے تاریخوں کے صفحے سنہری ہو جائیں۔ اور سلطنت خطرے سے محفوظ رہے۔ ظاہر میں جابجا استقبال ہوتے تھے۔ اور حقیقت میں دیکھو تو ہمایوں برابر نظر بند ہوتا چلا آتا تھا۔ شاہ بے لشکر اور سالار بے سپاہ نے قزوین سے بیرم خاں کو مراسلہ لکھ کر دربار شاہ کی طرف روانہ کیا۔ اس میں ایک قطعہ سلمان ساوجی کا بھی لکھا جس کا مطلع ہے ؎

خسرو اعمر سیت تا عنقائے عالی طبع من	محکمۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است

وغیرہ وغیرہ اور مقطع تھا:۔

التجا از لطف شہ دارم کہ با من آں کند	ہر چہ با سلماں ملی در دشت ارژن کردہ است

بیرم خاں دربار میں پہنچا۔ اور اپنی حسن رسائی اور جوہر دانائی کے ساتھ جواب باصواب لے کر آیا۔ شاہ نے حسن قدوم اور مضامین اشتیاقیہ کے ذیل میں یہ شعر بھی لکھا ؎

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد	اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

اس مراسلہ کو دیکھ کر شاہ بے لشکر خوش ہو گیا۔ اور لشکر گاہ شاہ کی طرف روانہ ہوا۔ کیفیت ملاقات کا ادا کرنا دشوار ہے۔ جب شہزادوں امیروں نے وہ طلسمات کئے۔ تو اس دربار کے جاہ وجلال کا کیا کہنا۔ کہ بادشاہ ہی مہمان ہو اور بادشاہ ہی میزبان۔ کہنے کے قابل یہ نکتہ ہے۔ کہ ایک دن دونوں بادشاہ برابر بیٹھے تھے۔ مگر ہمایوں کا دامن ذرا مسند سے باہر تھا۔ ندیم کو کلتاش کو تاب نہ آئی۔ اپنے ترکش کا غلاف کہ زریں و زرتار تھا۔ کمر سے کاٹا اور خنجر سے چیر کر اپنے بادشاہ کے زیر زانو بچھا دیا۔ شاہ طہماسپ کو بھی یہ جوشِ وفاداری پسند آیا۔ ہمایوں سے کہا۔ کہ ایسے باوفا جاں نثار تمہارے ساتھ تھے۔ پھر کیا سبب ہوا۔ کہ یہاں تک نوبت پہنچی۔ ہمایوں نے کہا۔ کہ ان کی رائے پر عمل نہ کیا۔ بھائی جو قوت بازو تھے۔ وہ آستین کا

سانپ نکلے بعض مورخ اس امر کو بیرم خاں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ایک اور جلسہ میں پھر شاہ نے ہمایوں سے پوچھا۔ کہ ایسی شکست اور تباہی کا سبب کیا تھا۔ ہمایوں نے پھر وہی کہا۔ کہ نفاقِ برادران۔ شاہ نے کہا۔ کہ اس ملک کے لوگوں نے رفاقت نہ کی۔ ہمایوں نے کہا۔ کہ وہ لوگ غیر قوم۔ غیر مذہب۔ غیر جنس ہیں۔ ان سے اور ہم لوگوں سے اتفاق ممکن نہیں۔ شاہ نے کہا۔ کہ جب بادشاہ غیر قوم کے ملک میں داخل ہو تو پہلا قدم مصلحت کا یہ ہے۔ کہ ان سے اتحاد اور یگانگی پیدا کرلے۔ اب کی دفعہ کریم و کارساز کرم کرے۔ تو ضرور اس بات کا لحاظ رکھنا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھا۔ سام مرزا شاہ طہماسپ کا بھائی کمر بستہ کھڑا تھا۔ سلابچی و آفتابہ سامنے لایا۔ اور ہاتھ دھلوائے۔ شاہ نے ہمایوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ کہ بھائیوں کو اس طرح رکھتے ہیں۔ ان تقریروں میں کسی موقع پر بہرام مرزا۔ شاہ طہماسپ کا دوسرا بھائی بھی موجود تھا۔ اسے ہمایوں کی بعض باتیں ناگوار گزریں۔ اس لئے اندر ہی اندر ایسی تدبیریں شروع کیں۔ کہ شاہ امداد کے ارادے سے رُک گیا۔ بہرام مرزا نے یہ بھی کہا۔ کہ یہ اسی باپ کا بیٹا ہے۔ جو کئی ہزار قزلباش کو کمک کے لئے لے گیا۔ اور اُزبکوں سے قتل کروا کر بھاگ آیا۔ ایک ان میں سے جیتا نہ پھرا۔

یہ اسی فوج کا اشارہ تھا۔ کہ شاہ اسمٰعیل سے بابر نے دوبارہ مدد مانگی۔ انھوں نے نجم ثانی کی سپہ سالاری سے لشکر روانہ کیا۔ اور وہ سالار لشکر سمیت وہیں فنا ہوا۔ اور حقیقت میں بابر نے بھی غضب کیا تھا۔ پہلی فتح میں جب ملک اس پر بغاوت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا تھا تو الزام یہی لگایا تھا۔ کہ بابر رافضیوں کے لشکر کو چڑھا کر لایا ہے۔ اور خود بھی رافضی ہو گیا ہے۔ جب دوسری فوج کشی میں نجم ثانی مع فوج فنا ہوا۔ تو بابر نے اپنے مضمون کا رنگ بدلا۔ اور کہا کہ میں ان لوگوں کو تمہاری تلوار کا طعمہ کرنے کو لایا تھا۔ اس مضمون کی زبانی فہمائشیں کیں۔ مراسلے اور پیغام بھیجے۔ بلکہ قلعہ قرش کے محاصرہ میں ایک کاغذ کا پرچہ تیر میں باندھ کر اندر سے پھینکا۔ اس پر یہ شعر لکھ دیا تھا:

نصرتِ را و اُزبکاں کردیم نجم شاہ را	گر گناہے کردہ بودم پاک کردم راہ را

ہمایوں نے جب یہ حال سنا۔ تو متاسف اور متحیر ہوا۔ شاہ کی ایک بہن نہایت دانا تھی بلکہ امورات سلطنت میں اُس کی رائے شریک ہوتی تھی۔ اُس کی طرف رجوع کی۔ نیک نیت

بیگم نے اپنے بھائی شاہ طہماسپ کو سمجھایا۔ ہمایوں نے خود بھی اشعارِ لطیف کہہ کہہ کر شاہ کو شگفتہ کیا۔ چنانچہ ایک رباعی کی دوسری بیت ہے۔ کہ فی الحقیقت شاہ بیت ہے ؎

شاہاں ہمہ سایۂ ہما میخواہند	بنگر کہ ہما آمدہ در سایۂ تو

ایک موقع پر ہمایوں کی رباعی بیگم نے شاہ کو سنائی اور اسی کو سفارش کا ذریعہ کیا ؎

ہستیم زجاں بندۂ اولادِ علی	ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علی
چوں سرِ ولایت از علی ظاہر شد	کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علی

شاہ پھر خوش ہو گیا۔ اور شکاروں کے جلسوں میں شامل کرنے لگا۔ کئی برس کے بعد رخصت کیا۔ دس ہزار فوج قزلباش۔ شاہزادہ مراد طفل شیرخوار کے نامزد کی۔ بداغ خاں افشار کو شہزادہ کا اتالیق اور سپہ سالار کیا۔ باوجود اس کے آئین احتیاط کو بال بھر نہ سرکایا۔ فوج کو اَور رستے بھیجا۔ اور ہمایوں کو اور رستے۔ کہہ دیا۔ کہ سرحد پر لشکر مذکور تمہارے ساتھ شامل ہوگا۔ چنانچہ ہمایوں اردبیل سے شاہ صفی کے مزار پر فاتحہ پڑھتا تبریز سے ہوتا مشہد مقدس میں پہنچا۔ اور جلد پر کوچ کو تیار پایا۔

(ملا صاحب بھی کسی سے نہیں چوکتے۔ ہمایوں کے حال میں فرماتے ہیں) ایک شب روضۂ مقدس کے صحن میں اکیلا ٹہلتا پھرتا تھا۔ سنا کہ ایک زائر دوسرے زائر سے کہتا ہے۔ (چپکے سے) ہمایوں بادشاہ ہمیں است: دوسرا کہتا ہے۔ ہلے! میں نے ہمایوں کے برابر آ کر کہا (چپکے سے) باز دعوے خدائی مے کنئ؛ یہ اشارہ تھا۔ کہ جب ہمایوں بعالم جاہ و جلال ملک بنگالہ میں تھا۔ تو ایک سرا نقاب کا تاج پر ہوتا تھا۔ باقی چہرہ پر ہوتی تھی۔ نقاب جس وقت اُلٹتا تھا۔ تو ارکان دولت کہتے تھے۔ تجلی شد۔ اور ایسی بہت باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دن تلوار کو دریا میں دھویا اور کہا۔ تلوار کس پر باندھوں ہے کون؟

اہلِ تاریخ لکھتے ہیں۔ کہ شاہ جو ہمایوں سے کبیدہ خاطر ہوا۔ اس میں ایک سبب یہ بھی شامل تھا۔ کہ ہمایوں سے مذہب شیعہ اختیار کرنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ اور کہا گیا تھا کہ جہاں جہاں تمہاری عملداری ہو۔ وہاں مذہب مذکور کو رواج دو۔ ہمایوں نے اس میں عذر بیان کئے تھے۔ باوجود اس کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب میں ایسا چست و درست نہ تھا۔ جیسا کہ ایک پکے سنت جماعت کو ہونا چاہیئے۔ چنانچہ فرشتہ اور خافی خاں لکھتے ہیں۔

لطیفہ ۔ جب وہ اور منافق بھائی شیر شاہ کے مارے نکالے لاہور میں آئے۔ تو ایک دن ہمایوں اور کامران ساتھ ہاتھی پر سوار چلے جاتے تھے۔ رستہ میں دیکھا۔ کہ ایک

کہتے تے ٹانگ اٹھا کر ایک قبر پر موتتا۔ کامران نے کہا (شاید طنز سے کہا ہو) معلوم مے شود کہ ایں قبر رافضی است۔ ہمایوں نے کہا۔ البتہ سگ سُنّی باشد۔ یہ بھی عجب نہیں کہ کلام مذکور ایک لطیفہ کے طور پر زبان سے نکل گیا ہو۔ عقیدہ کو اس سے کچھ تعلق نہ ہو۔ مگر اس سے لطیفت تر یہ نکتہ ہے۔ (لیکن اس سے بھی ہمایوں کا تشیع نہیں ثابت کر سکتے) +

نکتہ تاریخی - جب ہمایوں نے ایران سے آکر افغانستان کو تسخیر کیا۔ تو ابھی کابل ہی میں تھا۔ جو ہندوستان میں اُس کی کامیابی اور فتوحات کے چرچے ہونے لگے۔ اُسے علما و فضلا سے محبت تھی۔ اور اہل شریعت کے ساتھ بہت تعظیم و آداب کے ساتھ پیش آتا تھا۔ تمام علما و مشائخ آمد آمد کی خبریں سن کر خوش ہو گئے۔ نامے گئے۔ پیام پہنچے۔ مخدوم الملک نے موزے اور قمچی تحفہ بھیجے (یہ رمز تھی کہ موزے چڑھاؤ اور گھوڑے کو قمچی کرد) جو زیادہ دور اندیش تھے۔ وہ خود چلے۔ کہ جتنی دور بڑھ چڑھ کر ملیں گے۔ اتنے ہی یہاں آکر زیادہ حقدار ہوں گے +

شیخ حمید سنبلی - ایک عالم۔ صاحب تفسیر تھے۔ خود کابل میں جا کر ملے۔ بادشاہ کو ان سے اعتقاد تھا۔ انہوں نے ایک دن جوش جذبہ میں فرمایا۔ بادشاہم! تمام لشکر شمارا رافضی دیدم۔ بادشاہ نے کہا۔ شیخ چرا ہم چنیں میگوئید؟ در چہ قصہ است؟ شیخ نے فرمایا۔ در ہر جا نام لشکریان شما دریں مرتبہ ہمہ یار علی مہر علی کفش علی وحیدر علی یافتم وہیچ کس را ندیدم کہ بنام یاران دیگر باشد۔ ہمایوں اُس وقت تصویر کھینچ رہا تھا۔ ایسا جھنجھلایا۔ کہ مارے غصہ کے موقلم زمین پر پٹخ دیا۔ اور کہا۔ نام پدر کلان من عمر شیخ است دیگر بمیدانم۔ اتنا کہہ کر حرم سرا میں چلا گیا۔ لیکن پھر آکر ملائمت اور نرمی سے شیخ کو اپنے حسن عقیدہ پر آگاہ کیا +

آزاد - پہلے جب یہ نقل تاریخ بدایونی میں دیکھی تھی۔ تو میں حیران ہوا تھا۔ کہ ہمایوں جیسا متحمل اور خوش اخلاق بادشاہ اور مقابل میں ایک عالم شرع اور معتبر اور خود بھی اُس سے اعتقاد۔ اُس کی اتنی سی بات پر اتنا جھنجھلایا۔ اس کا سبب کیا؟ یہ تو ایک لطیفہ تھا۔ لیکن جب دو دفعہ ایرانی کی مدد سے بابر کا سمرقند و بخارا پر جانا۔ اور وہاں سے تشیع کی علت میں نکالا جانا کتابوں میں دیکھا۔ اور تاریخ رشیدی وغیرہ سے اُسکی زیادہ تفصیل معلوم ہوئی۔

اُس وقت میں سمجھا۔ کہ جب یہ لفظ شیخ کی زبان سے نکلا ہوگا۔ تو ہمایوں کو باپ کی حالت اور علالت یاد کر کے خدا جانے کیا کیا خطرناک اندیشے پیدا ہوئے ہوں گے۔ وہ ڈرا ہوگا۔ کہ اگر بھائیوں کو یہ مضمون سوجھ جائے۔ یا کسی سے سُن پائیں۔ اور افغانوں کو بہکائیں تو بھی بنابنایا کام بگڑ جائے۔ اس صورت میں جتنا جھنجلاتا اور گھبراتا بجا تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ پھر حرم سرا سے نکل کر شیخ موصوف کی دل جوئی و دلداری کی۔ اور اپنے عقائد اس کے ذہن نشین کئے۔ کہ مبادا یہ خفا ہوئے ہوں۔ اور مجھے بھی رافضی سمجھ کر آزردہ ہوں۔ یہی باتیں اور کسی کے سامنے ان کی زبان سے نکل جائیں۔ تو خدا کی پناہ۔ اُس کی بھڑکائی ہوئی آگ کو کون بجھا سکے گا +

اور شیخ موصوف نے بھی سچ کہا تھا۔ ہمایوں کے اکثر ہمراہیوں کے نام ایسے ہی تھے۔ بلکہ **گدا علی۔ مسکین علی۔ زلف علی۔ پنجہ علی۔ درویش علی۔ محب علی** وغیرہ نام جو جا بجا تاریخوں میں آتے ہیں۔ وہ اُنھوں نے نہیں لئے۔ یہ لوگ بابر کیساتھ ایران سے آئے ہونگے۔ یا ہمسائیوں کے ہمراہ ہونگے۔ ہزارہ جات۔ کابل کے لوگ بھی تمام شیعہ ہیں۔ اور افغانوں کی اور ان کی ہمیشہ عداوت رہتی ہے۔ یہ بھی عجب نہیں کہ افغانوں کو کامران کے ساتھ دیکھکر ہزارے ہمایوں کیساتھ گئے ہوں۔ ہمایوں جو ان لوگوں کو ساتھ رکھتا تھا۔ یہ بھی مصلحت سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ بھائیوں سے مقابلہ تھا۔ اور افغان اُنکے ساتھ تھے۔ ترکوں کا کچھ اعتبار نہ تھا۔ ابھی اِدھر ابھی اُدھر دونوں اُن کے گھر تھے۔ ایرانیوں اور اور شیعہ مذہب کے لوگوں سے یہ اُمید نہ تھی۔ کیونکہ تورانیوں یا افغانوں سے ان کا اتفاق ناممکن تھا۔ اور ابتک یہی حال ہے۔ ہمایوں کی سلطنت کا زمانہ اہل تاریخ ۱۵۳۰ء سے ۱۵۵۶ء تک بیان کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ہمایوں کی سلطنت صرف تقریباً گیارہ برس رہی۔ یعنی پہلی مرتبہ ۱۵۳۰ء سے ۱۵۴۰ء تک اور دوسری مرتبہ چند مہینے ۱۵۵۶ء میں ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۵ء تک کا کُل زمانہ ہمایوں نے جلا وطنی میں گزارا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی حکومت شیر خان افغان اور اس کے جانشینوں کے ہاتھ میں رہی ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے ہندوستان پر دوبارہ چڑھائی کی۔ اور لاہور تک آن پہنچا۔ اور سکندر لودھی کو کوہستان شمالی میں بھگا کر دہلی اور آگرہ پر متصرف ہوگیا۔ لیکن اسی سال میں کہ اُس کی فتح کو چھ ماہ ہی گزرے تھے۔ وہ اپنے کتب خانہ کے زینہ سے گر کر جاں بحق ہوا اور **ہمایوں بادشاہ از بام افتاد** تاریخ ہوئی +

عبداللہ خاں اُزبک

عمدہ سردار تھا۔ اور ہمایوں کے عہد سے ملازمت میں تھا اور خدمتیں بجالاتا تھا۔ جب ۹۶۶ھ میں پیر محمد خاں پانی کے رستے ملک عدم کو روانہ ہوئے۔ اسے بلایا۔ تو باز بہادر وہاں کے فرماں روائے قدیم نے پھر آکر مالوہ کو مار لیا۔ اُمرا اُسکے مقابلہ میں نہ ٹھیر سکے۔ دربار کو بھاگ آئے۔ یہاں ملامت پھٹکار کی مار کھا کر قید ہوئے۔ چند روز بعد نکل آئے۔ بادشاہ نے عبداللہ خاں اُزبک کو مع چند امرا کے فوج دیکر بھیجا۔ اس نے جنگ مردانہ کے ساتھ باز بہادر کو بھگا دیا۔ اور ملک پر قبضہ کر لیا۔ امرا اپنے اپنے علاقوں کو چلے گئے ✦

۹۷۱ھ میں اکبر ہاتھیوں کے شوق میں شکار کے لئے نزور کے جنگل میں گئے۔ کہ وہاں اُن کی بہتات تھی۔ عجب عجب ایجادوں کے ساتھ بڑے بڑے دیوزاد پکڑے۔ اور سارنگ پور کے رستے سے مندو کے علاقہ میں آکر قیام کیا۔ عبداللہ خاں اُزبک کو یا تو یہ خیال ہوا۔ کہ ملک مفتوحہ کے خزانوں اور اجناس خانوں کے انبار دربار میں نہیں پہنچے۔ یا ان کے حساب کتاب دینے سے گھبرایا۔ یا کچھ اور امر بادشاہ کی خلاف مرضی ہو گئے۔ غرض تمام اہل وعیال اور دولت و مال لیکر مندو سے نکلا۔ اور گجرات کو چلا۔ بادشاہ نے مقیم بیگ کو شجاعت خاں بنایا۔ اور فوج دیکر روانہ کیا۔ کہ اسے سمجھا کر لے آوے۔ (وہی تردی بیگ کے بھانجے) شجاعت خاں گیا تھے۔ اور اُن کا سمجھاتا کیا تھا۔ بات بگڑ کر بڑھ گئی۔ اور سہرا دل سے ایک جھپٹ بھی ہوئی لیکن اکبر کی یلغار کا ڈر تھا۔ کہ پاس ہی موجود ہے۔ اس لئے بھاگ کر گجرات میں گیا۔ اور چنگیز خاں والی گجرات کی پناہ میں جا بیٹھا۔ اکبر نے بہت چاہا۔ کہ پرانا خدمت گزار ہے آ جائے۔ لیکن کوشش کارگر نہ ہوئی۔ مقیم بیگ پیچھے پیچھے گجرات تک چلے گئے تھے۔ اس کے اہل وعیال پکڑ لیے۔ ہاتھی گھوڑے نقد و جنس جو ہاتھ آیا چھین لائے۔ جو رہا سو نصیب اعدا۔ جنگلوں کے گنوار بھیل پینے ✦

سکندر خاں اُزبک

اودھ میں اس کی جاگیر تھی۔ کہنے والوں نے اکبر سے کہا کہ یہ بھی افغانوں کے مال مار کر مال زادہ ہو گیا ہے۔ اور طور بھی بے طور نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بھائی کے ساتھ اس کا بھی اعتبار گیا۔ اُدھر اُس نے خاں زماں سے بپیغام سلام کر کے اتفاق کر لیا۔ اکبر کو سب خبریں پہنچتی تھیں۔ اور اصلیت سے زیادہ گل پھول لگ کر پہنچتی تھیں اتفاق یہ کہ عبداللہ خاں اُزبک اس وقت توران میں

کمال اولوالعزمی سے سلطنت کر رہا تھا۔ اِس لئے بادشاہ کو فرقۂ مذکور کے نام سے بدگمانی اور بیزاری تھی۔ فہمائش کے لئے اشرف خاں میر منشی حضور کو بھیجا۔ کہ عفو تقصیر کی اُمید سے خاطر جمع کردو۔ اور سمجھا کر لے آؤ۔ وہ میر منشی کو بھی انشا پردازی سکھانے والا تھا۔ اس نے باتوں میں لگا لیا۔ اور کہا کہ ابراہیم خاں ہم سب کا بزرگ ہے۔ اُس سے گفتگو کروں۔ تو جواب دوں۔ اُس کی جاگیر سرہرپور میں تھی۔ اشرف خاں کو بھی وہاں لے گیا۔ ادھر وہاں سے خاں زمان کے پاس جون پور پہنچا۔ کہ سب مل کر جواب دینگے۔ میر منشی حضور ہیں۔ کہ نظر بندوں کی طرح ساتھ ساتھ پڑے پھرتے ہیں۔ خان زمان نے جو بغاوت کا خاکہ ڈالا تھا۔ اس میں سکندر خاں ملک مالوہ کے لئے تجویز ہوا تھا۔ جب خان زمان مارا گیا۔ تو اکبر نے محمد قلی برلاس اور مظفر خاں کو فوج دے کر اس کے پیچھے بھیجا۔ وہ بہت مضطرب ہوا۔ اور سارے اُزبک گھبرا گئے۔ صلح کا پیام بھیجا۔ دونوں امیروں سے ملاقات ہوئی۔ مگر گورکھپور کی طرف بھاگ کر عملداری بادشاہی سے نکل گیا۔ بادشاہ بھی چپکا ہو رہا۔ ۹۷۹ھ میں حاضر خدمت ہوا۔ اور خطا معاف ہوگئی۔ مگر اپنی جاگیر پر جاتے ہی مر گیا۔

عبداللہ نیازی سرہندی

نیازی افغانوں میں ایک فرقہ ہے میاں عبداللہ پہلے شیخ سلیم چشتی کے مرید تھے۔ فتح پور میں جو شیخ کی نئی خانقاہ ہے۔ اُس کے برابر ایک حجرہ میں اعتکاف سے بسر کرتے تھے۔ وہی حجرہ تھا۔ کہ ایک دن چار ایوان بن گیا۔ اور عبادت خانہ کہلایا۔ اُسکے پاس محل بادشاہی بلند ہوئے۔ پہلی دفعہ جو شیخ سلیم چشتی خشکی کے رستے حج کو جا کر پھر آئے۔ تو میاں نے حج کی اجازت لی۔ شیخ عرب و عجم اور ہند میں جن جن مشائخ و اہل اللہ سے ملے تھے۔ سب کے نام اور کچھ کچھ حال ایک طومار میں لکھ لائے تھے۔ میاں وہ فہرست لے کر اکثر شہروں میں پھرے بہت سے مشائخ سے ملاقات کی۔ اور پھر ہندوستان میں آئے۔ گجرات دکن پہنچے۔ تو دیکھا کہ میر سید محمد جونپوری کی مہدویت نے زور شور کر رکھا ہے۔ میاں ان کے معتقدین سے ملے۔ اور وہی طریقہ اختیار کیا۔ سلیم شاہ کا زمانہ تھا۔ تو بیانہ میں گمنامی اور آزادی اور بے پرواہی اور بے تکلفی کیساتھ بسر کرتے تھے۔ اور عام فقرا کی طرح گزارہ کرتے تھے۔ جب شیخ علائی کے معاملہ نے طول کھینچا۔ اور مخدوم الملک کے اغوا سے سلیم شاہ نے بہت ستایا۔ اور نہایت سخت مار دھاڑ کی تو وہاں سے نکل گئے۔ اور اطراف عالم میں سیاحی کرتے رہے۔ اخیر میں

مہدویت سے توبہ کرکے سرہند میں گوشہ نشین ہو بیٹھے۔ مشائخ کیطرح رہتے تھے۔ اور اللہ اللہ کرتے تھے*

اکبر نے جب ان کے حجرہ پر چار ایوان تعمیر کرکے عبادت خانہ نام رکھا اور علمأ کے مجمع ہونے لگے۔ تو ایک تقریب سے اُن کا بھی وہاں ذکر آیا۔ بادشاہ نے بلا بھیجا۔ تنہائی میں ملاقات کی۔ اور باتیں بہتیں پوچھیں۔ انہوں نے عقائد مہدویت سے انکار کیا۔ اور کہا۔ کہ پہلے یہ لوگ مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس لئے مائل ہوا تھا۔ پھر حقیقت اصلی روشن ہوئی۔ اس لئے انکار کیا۔ بادشاہ نے عزت سے رخصت کر دیا*

۹۹۳ھ میں اٹک کو سواری جاتی تھی۔ سرہند میں اُترے تو انہیں پھر بلایا۔ اور مدد معاش میں زمین دینی چاہی۔ انہوں نے قناعت کی دستاویز دکھا کر قبول نہ کی۔ بادشاہ نے آپ ہی اُن کے اور اُن کے فرزندوں کے نام بمقام سرہند میں ایک قطعہ زمین عنایت فرمایا۔ اور فرمان لکھوا کر حوالہ کر دیا۔ حکم شاہی کی اطاعت سمجھ کر لے لیا۔ مگر اپنے توکل کا شیوہ نہ چھوڑا۔ اور فرمان سے کچھ کام نہ لیا۔ آخر کام تمام ہو گیا*

(ملا صاحب کہتے ہیں) جب ابراہیم مرزا احمد آباد گجرات سے بغاوت کرکے بھاگا۔ اور ہندوستان سے لوٹتا مارتا پنجاب کو چلا۔ حسین خاں پیچھے پیچھے دھاوا مارے آتا تھا۔ اور میں بھی ساتھ تھا۔ تب سرہند میں دیکھا۔ احیاء العلوم سامنے تھی۔ اور اُسی پر اُن کا مدار تھا۔ (ملا صاحب کا نشتر کہیں نہیں چوکتا۔ ایک کو چار ہی جاتا ہے) کچھ فوائد بیان کر رہے تھے۔ محمود خاں ایک دوست کہ سلیم شاہ کے عہد سے میرا یار تھا۔ اور اُن دنوں شیخ علائی کی برکت سے اس جوش کی دینداری اُس میں سمائی تھی۔ کہ ہر مجمع و محفل میں الٹا پھرتا تھا۔ اور جہاں شیخ کا ذکر آتا شمشیر برہنہ بن کر سامنے ہو جاتا تھا۔ شوخ طبع شیخ مبارک نے اُسے سَیْفُ اللہ خطاب دیا تھا۔ حسن اتفاق یہ کہ اُس وقت وہ بھی ہمراہ تھا۔ اُس نے پوچھا۔ کہ حضرت دِل کیا کہتے ہے؟ بولے کہ ہم اس سے ہزاروں منزلیں دور پڑے ہیں۔ کیا پوچھتے ہو۔ کوئی اخلاق کی بات کہو۔ پھر میر سید محمد جونپوری قدس اللہ روحہ کے ذکر میں ایک بڈھے مغل کو حاضر کیا۔ اور اس سے گواہی چاہی۔ اُس نے کہا کہ جب میر سید موصوف نے فرہ میں رحلت کی تو میں خود حاضر تھا۔ انہوں نے دعوئے مہدویت سے انکار کیا۔ اور کہا کہ میں امام مہدی نہیں ہوں۔ محمود خاں چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ واہ میاں عبداللہ عجب کام کیا۔ بچارے شیخ علائی کو مفت قتل کروایا۔ آپ الگ ہو گئے۔ آخر میاں عبداللہ نے بھی ۹۰ برس کی عمر ۱۰۰۰ھ میں رحلت فرمائی۔ عجب دنیا ہے اور عجب اہل دنیا۔ مگر

کیا کیجئے۔ یہاں کبھی ایسی صورتیں پیش آتی ہیں۔ کہ انسان کی عقل گم ہو جاتی ہے۔ ملّا صاحب مہدویت کا ذکر ہر جگہ۔ اور یہاں بھی سیّد محمد جونپوری اور میاں عبداللہ کا ذکر ایسے ادب اور تعظیم کے لفظوں سے کرتے ہیں۔ گویا اُن کی حالت کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ مگر اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ وہ مہدی نہ تھے۔ البتہ یہ لوگ اتقا اور پرہیزگاری میں حد سے گزرے ہوئے تھے۔ اور ملّا صاحب اتباع شریعت کے عاشق تھے۔ اس لئے اُنکے باب میں اچھے لفظ قلم سے ٹپک جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ جہاں موقع پاتے ہیں۔ چٹکی بھی لے جاتے ہیں۔ چوکتے کسی سے نہیں ✤

فصلی سن کی بابت فرمان

تاریخ سے اصل مطلب عہد مہمات کی آگاہی اور معاملات کی آسانی ہے۔ کہ حساب میں غلطی اور باہم تکرار نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص نے جائداد بیچی یا گرو رکھی۔ یا کچھ قرض لیا۔ مدت اس میں چار سال چار مہینے قرار پائی ہے۔ اب ظاہر ہے۔ کہ جب تک تاریخ کی ابتدا نہ لکھی جاوے۔ تب تک میعاد کا گزرنا یا باقی رہنا بالکل معلوم نہیں ہوتا۔ اور جب معاملہ کو زیادہ مدت گزر جاتی ہے۔ اور شمار برسوں کا بہت ہو جاتا ہے۔ تو حساب بھی بڑھ جاتا ہے۔ پھر شمار سال کے نکالنے میں اور بھی دقّت اٹھانی پڑتی ہے۔ بلکہ جس قدر نئے سال اور تھوڑے ہی سنہ ہوں۔ کاروبار والوں کو آسانی ہوتی ہے ✤

واقفان کتب تواریخ یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ عالم میں جو تاریخیں اور سنہ رائج ہیں۔ یہ سلاطین اولوالعزم اور شاہان فتح یاب نے اپنے اپنے وقت میں قرار دئے ہیں۔ اور اہل معاملہ کے بار تکلیف کو ہلکا کیا ہے۔ غور کر کے دیکھو کہ تاریخ ہجری کیا شے ہے۔ یہ در حقیقت وہ سال ہے۔ جس میں اعدائے اسلام کے زور اور غلبہ نے حضرت سے وطن اور گھر چھڑوایا ہے۔ اب اُسے ہزار برس کے قریب ہو گئے۔ ہندی تاریخ کو پندرہ سو سے زیادہ ہو چکے۔ سکندری و یزدجردی ہزاروں سے گزر گئے۔ معاملات اور مقدمات میں ان کا لکھنا اور کہنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً عوام الناس کو کہ انہی کے کام بہت ہوتے ہیں ✤

ہندوستان کے مختلف قطعوں میں مختلف سنہ رائج ہیں۔ بنگ بہار میں آغاز حکومت لچھمن سے لیا ہے۔ جسے آج تک چار سو پندرہ برس گزرے۔ گجرات دکھن میں سالباہن سے لیا ہے۔ اُسے ۱۵۰۶ برس ہوئے۔ مالوہ اور دلی وغیرہ میں سنہ بکرماجیت ہے۔ اسے ۱۶۴۱ سنہ الٰہی ہوئے۔ کانگڑہ کے پہاڑوں میں جو راجہ کوٹ کانگڑہ میں راج کرے۔ اسی کے جلوس کا

سنہ سارے پہاڑیں چلتا ہے۔ اور ان لوگوں کی حقیقت اور قدر و منزلت خود ظاہر ہے کہ کیا تھی اور کیا مرتبہ رکھتے تھے۔ اور یہی ظاہر ہے۔ کہ تاریخ ہائے ہندی کا کوئی سنہ کسی واقعہ عظیم کی بنیاد پر نہیں ہے +

اسی بنیاد پر حضور میں معروض ہوا۔ کہ اگر کوئی نیا سنہ قرار دیا جائے۔ تو عامہ خلائق کے لئے آسانی ہو جائے۔ اور جا بجا جو اختلاف ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے۔ پرانی تاریخوں سے واضح ہوتا ہے۔ کہ نیا سنہ اکثر وقائع عظیم یا کسی ملت قویم کے قائم ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ الحمد للہ اس سلطنت عالی میں وقائع عظیم اور مہمات جسیم اور استوار قلعے اس قدر فتح ہوئے ہیں۔ کہ ایک ایک بات کو آغاز سنہ کی بنیاد قرار دیں تو زیبا ہے۔ لیکن ہم نے اپنی تاریخ جلوس پر بنیاد رکھی۔ ملک شاہ کے زمانہ میں اعداد سال کچھ زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ اس نے آسانی خلائق کا خیال کر کے تاریخ جلالی وضع کی۔ اور وہی سنہ ممالک عرب و عجم اور ترکستان اور خراسان اور ایران کی تقویموں میں جاری ہے۔ اور عالم کے دین دار اور اہل دیانت ہر عہد میں وہی لکھتے رہے +

ان مراتب پر نظر کر کے اہل التجا کی عرض قبول ہوئی۔ اور سال جلوس کے پہلے نوروز سے سنہ شروع کیا گیا۔ اور تقویم اور پتری والوں کو چاہیئے۔ کہ جسطرح عربی۔ رومی۔ فارسی جلالی سنہ اپنے کاغذوں میں لکھتے ہیں۔ تاریخ جدید کو بھی لکھا کریں۔ کہ آسانی کے دروازے کھل جائیں اور پتروں میں بجائے مختلف تاریخوں کے خصوصاً سمت بکرماجیت کی جگہ یہی تاریخ لکھی جائے۔ رنگ برنگ کی تاریخیں کاغذات معاملات میں موقوف ہو جائیں +

ہندوستان کی تقویموں میں سال شمسی ہوتے ہیں۔ اور مہینے قمری۔ اب مہینے بھی شمسی لکھا کریں۔ کہ حساب میں صفائی رہے۔ احتیاط اور اہتمام اور تسہیل اور مبارک شگون سمجھ کر ہر تقویم کو مہر اشرف سے مزین کر کے بھیجتے ہیں۔ اسی کے بموجب عمل درآمد ہو +

آزاد۔ ہندو مسلمان میں صدہا سال سے تلوار درمیان چلی آتی ہے۔ جو جو سنہ اُس وقت ہندوستان میں اپنے اپنے مقام پر رائج تھے۔ اگر انہیں موقوف کر کے حکماً ہجری سنہ جاری کر دیتے تو ہنود کو سخت ناگوار گزرتا۔ مصلحت اندیش بادشاہ نے سب مذہبوں سے قطع نظر کیا۔ اپنے سنہ کا نام سنہ الہی رکھ دیا۔ اللہ کا نام کسے ناگوار ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی محبت۔ ہمدردی اور بے تعصبی سے دلوں میں گھر کر رکھا تھا۔ کوئی اصلا ناخوش نہ ہوا۔ اور دیکھو! ناخوش ہوئے

تو کون ہوئے۔ جو اسی کی بدولت اسلام کے رشتہ دار بنے بیٹھے تھے۔ اور پیغمبروں کی میراث کے دعوے رکھتے تھے۔ اور اُسی کو کافر بناتے تھے۔ آفرین ہے۔ اس حوصلہ پر۔ اکبر سب کچھ سُنتا تھا۔ ان قباحت فہموں کی باتوں کو کیا کہتا ہوگا۔ خون جگر پیتا ہوگا۔ اور رہ جاتا ہوگا۔ میرے دوستو! عامۂ اہل عالم سے معاملہ اور رعایا کے ساتھ علاقہ رکھنا بڑا نازک مقدمہ ہے تھوڑی تھوڑی باتیں ہوتی ہیں۔ کہ عام خیالات میں آکر انسان کو محبوب الخلائق کر دیتی ہیں۔ ذرا ذراسی باتیں ہوتی ہیں۔ جن سے سب کے دل متنفر ہو جاتے ہیں۔ انتہا ہے۔ کہ بغاوت عام اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جو لوگ جاننے والے ہیں۔ وہ باتوں کے ذریعے توپوں اور تلواروں کے کام لیتے ہیں +

۹۹۲ھ میں سال الٰہی ایجاد ہوا۔ مگر شروع سال۔ اردی بہشت سن جلوس سے رکھا گیا۔ اور آیندہ کا نوروز لیا۔ کہ جلوس کے پچیس ہی دن بعد ہوا تھا۔ اسی حساب پر کاغذات دفتر اور تصنیفات میں تحریر جاری ہوئی۔ ریاضی داں اور ہیئت شناس جمع ہوئے۔ سنہ قمری کے مطابق۔ دنوں کی کمی بیشی کے حساب پھیلائے۔ جس جلسہ کے دائرہ میں یہ مبارک پرکار گردش میں آئی۔ میر فتح اللہ شیرازی اُس کے مرکز میں صدر نشین تھے +

قاضی نظام بدخشی مخاطب بہ غازی خاں

پہلے مرزا سلیمان کے پاس بدخشاں میں تھے۔ اور امرا میں داخل تھے۔ جس گاؤں میں رہتے تھے۔ اس کے پاس ہی کان لعل ہے۔ علوم متداولہ میں مولانا عصام الدین کے شاگرد تھے۔ ملا سعید سے علوم دینی حاصل کئے تھے۔ شیخ حسین خوارزمی ادھر کے ملکوں میں بڑے نامی مشائخ تھے۔ طریقت میں ان سے بیعت تھے۔ ۹۸۲ھ میں یہ اور فیروزہ کابلی دربار اکبری میں پہنچے۔ بادشاہ خان زماں کی مہم طے کر کے جونپور سے پھرے آتے تھے۔ خانپور کے مقام پر ملازمت ہوئی۔ کہ ملا صاحب نے پہلی ہی نظر میں پرکھ لیا تھا طنز سے تاریخ کہی دانائے بدخشی۔ لکھتے ہیں۔ کہ اعلم علمائے ماوراء النہر و بدخشان تھے۔ علم تصوف سے بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ بدخشاں میں بھی صاحب عزت تھے۔ اور امرا میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں آتے ہی کمر شمشیر مرصع۔ پانچ ہزار روپے نقد انعام پائے۔ مادہ قابل تھا۔ اور زمانہ کا مزاج پہچان لیا تھا۔ جلد رنگ چڑھ گیا۔ چار ایوان کے جلسوں میں علما سے اکثر معرکے مارے اور قاضی خاں ہو گئے۔ جہاد کی تلوار کمر سے باندھ کر میدان جنگ میں پہنچے۔ چند روز میں قاضی خاں سے

غازی خاں ہو گئے۔ ہزاری منصب مل گیا۔ اور اُس پر بڑے خوش ہوتے تھے۔ مُلّا صاحب کا یہ لکھنا بھی چوٹ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہزار بیگھہ جاگیر کی بدولت یہ بھی اپنا ہزاری کا وزن سمجھتے تھے۔ غازی خاں ہر قسم کی لیاقت رکھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں کے انتظام بھی سنبھال لیتے تھے۔ اور سپہ سالاروں کے ماتحت میدانوں میں بھی بہادری دکھاتے تھے۔ فیروزہ کے باب میں مُلّا صاحب فرماتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ طالب علمی کا وقوف رکھتا تھا۔ حسن خط میں ہاتھ ہلاتا تھا۔ موسیقی میں بھی آواز لگاتا تھا۔ غرض ہیئت مجموعی خاصی تھی۔ مگر یہ جوہر اُسکے حق میں نگین فیروزہ کے جوہر نکلے۔ کہ چند روز میں نظروں سے گر گیا۔ اور مردہ ہو گیا۔ نظام بڑھتے چلے گئے۔ رانا کیکا کی مہم پر مان سنگھ کے ساتھ گئے تھے۔ وہاں بہادری کا جوہر دکھایا۔ سپاہی تو بھاگ گئے تھے۔ وہ سپاہ گری کو رفاقت میں لے کر شریک حال رہے ✦

سجدۂ زمین بوس انہی کی تصنیف میں تھا۔ اکبر کے محضر اجتہاد پر پہلے جن چار عالموں نے مہریں کیں۔ اُن میں سے چوتھے منبر پر یہ تھے۔ بڑے بُڈھے ہو کر مرے۔ اخیر کو یہ نوبت ہوئی۔ کہ منہ میں دانت رہے۔ نہ پیٹ میں آنت۔ نہ ہاتھ پاؤں میں سکت۔ لطیفہ۔ تالین پر بیٹھ جاتے تھے۔ نوکر چاروں کونے پکڑ کر اُٹھاتے تھے۔ اور جہاں کہتے تھے۔ وہاں رکھ دیتے تھے۔ اسی طرح پالکی سے اُتر کر دربار میں پہنچتے تھے۔ کوئی پوچھتا۔ چہ حال دارید؟ فرماتے۔ الحمد للہ بقوت حرص برپایم۔ لطیفہ۔ ایسے لوگوں کے نوکر بھی ڈھیٹ اور نکمے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ اُن پر خفا ہوتے تو کہتے الٰہی تو ہم ہزاری شوی۔ تا قدر مرا بدانی۔ ملّا صاحب کہتے ہیں۔ لطیفہ رمضان کا مہینہ تھا۔ قلیچ خاں کے دیوان خانے میں ضیافت افطار تھی۔ مشائخ۔ امرا۔ علما کی جماعت کثیر جمع تھی۔ کہ میں پہنچا۔ دیکھتا ہوں آپ سورۂ اِنَّا فَتَحْنَا کی تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ میں نے ایک جگہ سوال کیا۔ اُنھوں نے کچھ توجیہ کی۔ میں نے پھر روکا۔ آپ جھنجلانے لگے۔ میں نے کہا۔ سبحان اللہ اہل ولایت کے اطلاق بھی آج معلوم ہو گئے۔ فرمایا تمہیں خیال ہوگا۔ کہ میں ہزاری منصب کے سبب سے زیادتی کرتا ہوں۔ میں نے کہا۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے اور بھی خفا ہوئے۔ خیر کچھ عرصہ کے بعد آصف خان بخشی نے پھر آیۂ اَلصُّلْحُ خَیْر پڑھوایا۔ تکلف کا پردہ سا ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھ گیا ✦

سال اوّل جلوس اکبری میں جبکہ مرزا سلیمان کابل پر فوج لیکر آیا۔ اور مرزا حکیم کو محاصرہ میں تنگ کیا۔ تو انکی زبانی پیام و سلام ہوتے تھے۔ منعم خاں نے اپنی کارروائی ایسے کرّوفر سے دکھائی۔ کہ ان کی

بلکہ تمام بدخشیوں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ انہوں نے مرزا کو جا کر سمجھایا۔ کہ قلعہ کا ٹوٹنا محال ہے۔ مرزا کی ہمت پست ہو گئی۔ اور بدخشاں کو واپس گیا۔ دربار اکبری کی دھوم دھام سنکر چند روز بعد مرزا سے الگ ہوئے۔ اور کابل میں آئے۔ مرزا حکیم نے اعزاز و اکرام سے رکھا۔ ہمت کی نگاہ دور لڑی ہوئی تھی۔ یہ وہاں سے بھی بڑھے*

سنہ ۲۱ جلوس میں جب راجہ مان سنگھ رانا کی مہم پر لشکر لے کر گئے۔ تو یہ بھی ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں جہاد کی تلوار سونتے۔ دست راست پر سردار تھے۔ اس معرکہ میں ایسے گھوڑے دوڑائے۔ کہ ملائی کی حد کو پھلانگ گئے۔ جب صوبہ بہار میں امرا باغی ہوئے اور فساد کا بگولا اودھ تک پہنچا۔ یہ لشکر بادشاہی کے ساتھ اپنے پسینہ کو دشمنوں کے خون میں بہاتے تھے*

۹۸۹ھ میں انہیں کوہستان تبت کا علاقہ ملا۔ وہاں بہادر خاں دسفید بدخشی کا بیٹا، تھا۔ وہ باغی ہو گیا۔ اور ایسا بگڑا۔ کہ اپنا سکہ آپ کہ کر اشرفی روپے چلائے۔

بہادر دین سلطاں آنکہ بن اسفید شہ سلطان	پدر سلطاں پسر سلطاں زہے سلطان بن سلطان

غازی خاں کو فوج کشی کرنی پڑی۔ دربار کے لوگ اُن کی ملائی کا خیال کر کے ہنستے تھے اور کہتے تھے دیکھیں۔ آہن بہ آہن کوفتن چہ رنگ پیدا مے شود۔ بدخشی سے بدخشی کی ٹکر ہے اور لال سے لال لڑتا ہے۔ لیکن باپ کے نام نے کام بگاڑ دیا۔ بہادر خاں کا رنگ پھیکا پڑا غازی خاں نے کچھ تسبیح کا زور لگا کر کچھ فوج بنا کر جنگ کا سامان کیا۔ خان اعظم اُن دنوں بہار میں تھے کچھ اُن سے مدد لی۔ اور پہاڑ میں جا کر خوب پتھر ٹکرائے۔ بہادر بالکل نامردہ نکلا مال اسباب ایک طرف عیال بھی چھوڑ کر بھاگا۔ بے غیرت نے ناموس کا بھی خیال نہ کیا۔ یہی سمجھا ہو گا۔ کہ ہم بھی بدخشی۔ تم بھی بدخشی۔ جو ہمارے عیال سو تمہارے عیال۔ خیر انہوں نے بھی مسجدوں میں جھاڑو دی تھی۔ سب کوڑے کو سمیٹا۔ اور گھر بھر لیا۔ لڑکا پھر بھی شرنا نکلا۔ چند روز بعد ہاتھ باندھ کر حاضر ہو گیا*

اشغال پیشۂ مازندراں را	نگیرد جز سگ مازندرانی

ملا صاحب لکھتے ہیں۔ سنہ ۹۹۲ھ میں بادشاہ نے الہ آباد سے کوچ کیا۔ میرا اُن کا ساتھ ہوا۔ دور تک علمی تذکرے اور مشایخ کبار کی باتیں ہوتی گئیں۔ یہی آخری ملاقات تھی۔ باہم

سلہ دیکھو راجہ مان سنگھ کا حال صفحہ ۷۴۱*

رخصت ہوئے۔ وہ اُور طرف۔ ہیں اور طرف۔ ان کی تصنیفات کچھ بہت نہیں۔ اور علما میں چنداں اعتبار نہیں رکھتیں۔ تفصیل یہ ہے:

رسالہ اثبات کلام و بیان ایمان۔ تحقیق و تصدیق۔ حاشیہ شرح عقائد پر۔ تصوّف میں کتنے ہی رسالے لکھے تھے۔ بہتر برس کی عمر تھی۔ کہ دنیا سے انتقال کیا۔ شیخ ابوالفضل نے رخصت کے وقت سند کیا خوب دی ہے۔ جسے ظاہر و باطن کا حال سب کھل جاتا ہے۔ دانائی کے چہرہ کو سپاہگری سے روشن کرتا تھا۔ اور تلوار سے قلم کا رتبہ ابھارتا تھا۔ علم رسمی میں ڈوب چکا تھا۔ مگر ارادت بادشاہی کی برکت سے اہل اشراق اور صوفیان صافی کے ساتھ زاری و نیاز میں حاضر تھا۔ صورت کی شائستگی میں معنی کی وارستگی سمیٹتا تھا۔ ظاہری لیاقت کے ساتھ آزادی کے منافع کماتے تھے۔ ہمیشہ چشم پر آب اور دل گداز رہتا تھا۔ قصبہ اودھ میں آخری سفر اختیار کیا۔ بہانہ یہ ہوا۔ کہ بی بی کے پاس بے وقت گیا تھا۔ اور صوفیان صافی کے ساتھ زاری و نیاز میں حاضر تھا۔

حسام الدین اُن کا بیٹا تھا۔ اکبر نے اُسے ہزاری منصب عطا کیا۔ اور خان خانان کے ساتھ دکن کو بھیج دیا۔ وہاں اُس پر جذبۂ غیبی طاری ہوا۔ خان خانان سے کہا۔ کہ مجھے اجازت دیجئے۔ اُس نے رخصت کیا۔ کپڑے پھینک دیئے۔ کیچڑ مٹی بدن کو ملی۔ اور حاضر دربار ہو کر استعفا پیش کیا۔ اکبر نے منظور کیا۔ اُس نے دِلّی میں سکونت اختیار کی۔ اور دنیا سے الگ ہو کر بیٹھ رہا۔

ملا عالم کابلی ایک ملائے شیریں کلام خوش ادا خوش طبع موزوں حرکات تھے۔ دچار ایوان عبادت خانے کے مباحثوں میں پیش قدم بن کر معرکہ آرائی کرتے تھے۔ جب وہ لطایف و ظرایف کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ تو اہل جلسہ کو لُٹا لُٹا دیتے تھے اور حریف اپنا مباحثہ بھی بھول جاتا تھا۔ تصنیفات کا ایک ذخیرہ تھا۔ مگر وہ بھی مسخراپن مثلاً ایک بیاض میں شرح مقاصد کے کسی مطلب پر تقریر لکھی ہے۔ اس کے اخیر میں آپ لکھتے ہیں۔ یہ عبارت کتاب قصد کی ہے۔ کہ راقم آثم کی تصنیفات میں سے ہے۔ کہیں لکھ دیتے ہیں۔ تجدید جو کہ میں نے شرح تجرید کے مقابل میں لکھی ہے۔ اُس میں اس مطلب کو بہ تفصیل لکھا ہے۔ کہیں مطوّل کی عبارت پر ایک تقریر لکھتے ہیں۔ اور اس میں فرماتے ہیں کہ طُول جو ایک مفید و مفصل کتاب فن بلاغت میں میں نے لکھی ہے۔ اور

ضخامت میں مطول و اطول سے کم نہیں۔ اس کی عبارت نقل کرتا ہوں۔

ایک بھاری ذخیرہ مشائخ و اولیائے ہند کے حالات میں جمع کیا۔ کوئی مجاور۔ کوئی خادم درگاہ۔ کوئی کنگال۔ کوئی بھیک منگا نہ چھوڑا۔ جس کا نام سُنا۔ اُس میں لکھ دیا۔ اور آخر میں تتمہ بھی لگا دیا۔ اُس کا نام رکھا و فواتح الولایہ لوگ پوچھتے۔ کہ یہ واو عاطفہ کیسا۔ اور اس کا معطوف علیہ کہاں ہے؟ فرماتے مقدر ہے۔ ذہن بذاتہ انتقال کرتا ہے۔ ذکر کی کیا حاجت ہے۔ لوگ پوچھتے وہ کیا؟ تو کہتے وہ فواتح الولایہ بالفتح جیسا کہ معطوف ہے بالکسر +

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ایک دن مجھے اور مرزا نظام الدین بخشی کو صبح بہت سویرے نہایت اصرار سے اپنے گھر لے گئے۔ وہی تصنیفات کہ ہاضمہ کا چورن اور بھوک کی معجون تھیں۔ نکال کر بیٹھے۔ بکتے بکتے۔ اور سُنتے سُنتے دوپہر آ گئی۔ ہم میں مارے بھوک کے بات کرنے کی حالت نہ رہی۔ آخر مرزا نے بے طاقت ہو کر کہا۔ یہ تو کہو۔ کچھ کھانے کو بھی ہے۔ ہنس کر بولے اوہو میں نے تو جانا تھا۔ کہ تم کھا کر آئے ہو گے۔ ٹھیر جاؤ۔ ایک حلواں فربہ۔ برۂ شیر مست ہے۔ میرے پاس طویلہ میں بندھا ہے۔ کہو تو اُسے ذبح کروں؟ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہنستے ہوئے گھر کو بھاگے۔ اُن کی ایسی ایسی ہزاروں باتیں تھیں۔ کوئی کہاں تک لکھے +

غازی خاں بدخشی کی خوش نصیبی اور ترقی کا داغ تھا۔ جلسوں میں بیٹھ کر کہا کرتے تھے یہ بھی مسخرا پن +

شیخ ابوالفضل اور غازی خاں وغیرہ ہم چشموں کو دیکھا۔ کہ ملائی کے گوشہ سے کود کر اعلےٰ درجۂ امارت میں جا کھڑے ہوتے۔ یہ وہی مُلا کے مُلا رہ گئے۔ جانتے تھے۔ کہ جو لوگ عرقریزی سے مہمات اور کار دبار میں خدمت بجا لاتے ہیں۔ بادشاہ اُن سے بہت خوش ہوتا ہے۔ عرض کی میں بھی چاہتا ہوں۔ کہ اہل سیف کے سلسلہ میں داخل ہوں۔ اور خدمت بجا لاؤں۔ اکبر نے کہا۔ بہت خوب۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ چوکی بدلی جاتی تھی۔ آپ نے کہیں سے ایک تلوار مانگ لی۔ ایک بونگی بے ڈھنگی وضع کے ساتھ کمر سے باندھی۔ اور بادشاہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ خلاف قاعدہ ہی آداب بجا لائے۔ آپ ہی عرض کی۔ ما پہلوے کدام منصبدار بایستیم و واز کجا تسلیم کنیم؟ بادشاہ سمجھ گئے تھے۔ کہا از ہماں جائیکہ ہستید تسلیم نمائید۔ جب دیکھا۔ کہ یہ داؤں بھی خالی گیا۔ تو شتر بے مہار بن کر بے قید و بے تعلق پھرنے لگے +

امارت اور اظہار تجمل کی بڑی آرزو تھی۔ اور چاہتے تھے کہ امرائے منصبدار میں شامل ہو جاؤں

لطیفہ:۔ ایک دن گرمی کی دوپہر میں ایک روئی دار دگلہ پہن کر آ موجود ہوئے۔ میلا کچیلا پسینوں میں چکٹا ہُوا۔ وہ بھی اپنا نہ تھا۔ خدا جانے کسی امیر نے انعام میں دیا ہوگا۔ یا مانگ لائے تھے۔ مرزا کوکہ اُس وقت موجودات دلوا رہے تھے۔ وہ بھی بیباک اور لاڈلے مصاحب تھے۔ خوب خوب لطیفے اُڑے۔ یہ بھی میٹھی میٹھی باتوں میں جواب دیتے تھے۔

کابل کے متعلقات میں گل بہار ایک گاؤں ہے۔ وہی اُنکا وطن تھا۔ شاعر بھی تھے **بہار** تخلص کیا۔ پھر سمجھے کہ لونڈی کا نام ہوتا ہے۔ اس لئے **ربیعی** اختیار کیا۔ اپنا سجع بھی کہا تھا۔ افسوس کہ ہر کتاب میں اتنا ہی فقرہ لکھ کر سجع کی جگہ چھوڑ دی ہے۔ سجع بھی سجیلا ہی کہا ہوگا۔

سلسلۃ الذہب نہایت گراں بہا کتاب مولوی جامی کی تھی۔ آپ نے اُسی کی بحر میں کچھ مہملات بیتیں کر لی تھیں۔ اکثر جلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ سلسلۃ الذہب کے جواب میں **صلصل الجرس** میری کتاب ہے۔ یہ اُسی کے شعر ہیں۔ ان اشعار میں اپنی تصانیف موسومہ کے نام بھی مسلسل کئے تھے۔

دیدہ باشی بہ نسخۂ تجدید ۔۔۔ کہ مجدد رسید فیض جدید
کاندرو صد موافق است نہاں ۔۔۔ واز بیانش مقاصد است عیاں
متن تجدید پیش او لنگ است ۔۔۔ گلشن از قحط آب بے رنگ است
لمعاتش بے تکلف و اغراق ۔۔۔ حکمت عین و حکمت اشراق
وانکہ وصفش نہ رتبۂ نقل است ۔۔۔ اسم و رسمش دلالۃ العقل است
وآں دُرے کاں زبحر جود آمد ۔۔۔ لجۃ الجود فے الوجود آمد
جامع آں عوالم الآثار ۔۔۔ من تعالیم عالم الاخبار
کاندرو نوع علم تا صد و بیست ۔۔۔ کردہ ام۔ ایں صفت بگو در کیست

خاتمۂ احوال میں مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح مگر دوست با صفا۔ فاضل قابل دردمند۔ آزاد طبع۔ مقبول۔ مطبوع۔ دل لگی کا یار تھا۔ اُمید ہے۔ کہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے بہشت جاودانی نصیب کی ہوگی۔ **آزاد**۔ باوجود ان عنایتوں کے سلسلۂ تاریخ میں سال بسال کے حال لکھتے لکھتے جہاں اُن کے مرنے کا واقعہ لکھا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں۔ اس سال میں مُلّا عالم کابلی گذر گئے۔ عالم نہایت شیریں ادا۔ خوش تکلم۔ گلدستہ نشاد ماتی تھا۔

تاریخ ہوئی۔ اشعثِ طماع ۹۹۹ھ سبحان اللہ ع

خوشی پر تو یہ عالم ہے خفا ہو گے تو کیا ہوگا

عرب میں ایک شخص تھا۔ کہ جہاں شادی مہمانی سنتا۔ وہیں جا حاضر ہوتا۔ جہاں کسی کو مہمان جاتا دیکھتا۔ اس کے ساتھ ہو لیتا۔ اور دسترخوان پر بیٹھ جاتا۔ اسی واسطے اسے طفیل الاعراس کہتے تھے۔ یعنے جو شادی میں مہمان بلائے آتے ہیں۔ یہ ان کے طفیلیوں میں ہے اور چونکہ اشعث اس کا نام تھا۔ اس لئے اشعث طماع بھی کہتے تھے۔

قندھار امیر تیمور کے بعد وقت بوقت شہزادگان تیموری کے قبضہ میں چلا آتا تھا جب بابر تباہ ہو کر کابل میں آیا۔ تو بدیع الزمان مرزا وغیرہ سلطان حسین بایقرا کے بیٹوں کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بھائی بند تھے۔ بابر نے چاہا کہ لے۔ خود بھی گیا۔ مگر کچھ مطلب حاصل نہ ہوا۔ جب وہ شیبانی خاں کی تلوار سے برباد ہو کر پریشان ہو گئے۔ تو بابر پہنچے۔ مگر ہندوستان کا سفر درپیش تھا۔ اپنی طرف سے قراچہ بیگ کو بٹھا آئے۔ شاہ اسمٰعیل اور شاہ طہماسپ اس عرصہ میں ایران پر پھیل گئے تھے۔ شیبانی خاں نے ادھر پھیلنے کے لئے رستہ نہ پایا

جب ہمایوں ہندوستان سے تباہ ہو کر ایران کر گیا۔ تو اُس کے بھائی کامران نے آپ کابل لیا۔ اور قندھار قراچہ بیگ سے چھین کر عسکری مرزا دوسرے بھائی کو دیا۔ ایران میں شاہ طہماسپ نے جو کچھ مہمان نوازی اور رفاقت کے حق ادا کئے۔ مجمل بیان ہوئے۔ وہاں ہمایوں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ قندھار فتح کر کے آپ کی فوج کے سپرد کراؤں گا۔ اور میں آگے بڑھ جاؤں گا۔ یہ علاقہ شاہزادہ مراد کی میوہ خوری کے لئے رہے۔ جب قندھار لیا۔ تو جو کچھ سپاہ اور سپہ سالار ایران کے ساتھ سلوک ہوا۔ وہ بیرم خاں کے حال میں لکھا گیا۔ شاہ طہماسپ سُن کر چپ رہ گیا۔ یہی سمجھا ہوگا۔ کہ ذرا سی بات کے لئے نئی اور پرانی نیکیوں کے نقش و نگار پر سیاہی پھیرنی کیا ضرور ہے۔

جب ہمایوں کابل میں آئے۔ تو بیرم خاں کو وہاں چھوڑ آئے۔ ہندوستان کو چلے۔ اور بیرم خاں سپہ سالار ہو کر ساتھ ہوئے۔ تو شاہ محمد قلاتی جو بیرم خاں کا پرانا رفیق تھا۔ ان کی طرف سے نائب رہا۔ زمین داور میں بہادر خاں علی قلی خاں کا بھائی حاکم تھا۔ چونکہ دونوں کی سرحد ملتی تھی۔ بعض مقدمات ایسے اُلجھے کہ بڈھے کی جوان کے ساتھ نہ نبھی۔ بڈھے نے اُسے دبانا چاہا۔ وہ بھی بہادر خاں تھا۔ اُس نے ۹۶۴ھ میں آ کر قندھار کو گھیر لیا۔ اور شاہ

محمد کو ایسا تنگ کیا کہ دم لبوں پر آ گیا۔

بڈھے کہن سال نے بیرم خاں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اندر ہی اندر شاہ ایران کو عریضہ لکھا اُس میں درج کیا۔ کہ قندھار حضور کا ملک ہے۔ بادشاہ کا حکم تھا۔ کہ فلاں فلاں امورات کے فیصلہ کے بعد بندگانِ دولت کو سپرد کر دینا۔ فدوی اُنہی انتظاموں میں مصروف تھا۔ کہ یہ نااہل ناہنجار میرے درپے ہو گیا ہے۔ آپ فوج بھیجدیں۔ تو فدوی امانت سپرد کر کے سبکدوش ہو۔

شاہ نے فوراً تین ہزار فوج سیستان اور فرہ کے علاقہ سے یار علی بیگ افشار کے زیر حکم بھیجی۔ بہادر خاں کو اس وقت تک خبر نہ تھی۔ دفعتہً شاہ کی فوج کو سر پر دیکھ کر پلٹا۔ اُن سے بھی مقابلہ کیا۔ دو دفعہ اس کا گھوڑا گرا۔ اور وہ پھر کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر شکست کھا کر بھاگا۔ لطف تو یہ ہے۔ کہ شاہ محمد نے لشکر ایران کو بھر دم دلاسا دے کر ٹال دیا۔

شاہ کو یہ امر ناگوار ہوا۔ ۹۶۶ھ میں سلطان حسین مرزا ولد بہرام مرزا ابن شاہ اسمٰعیل صفوی نے اپنے بھتیجے کے ماتحت قزلباش کا لشکر جرار بھیج کر محاصرہ کر لیا۔ شاہ محمد نے اکبر کو عرضیاں بھیجیں۔ یہاں نئی نئی تخت نشینی تھی۔ ایک جھگڑے میں کئی کئی جھگڑے تھے۔ انہوں نے اجازت لکھ بھیجی۔ اُس نے قندھار حوالے کر دیا۔ شاہ نے یہ علاقہ سلطان حسین مرزا کو دے دیا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ مظفر حسین مرزا۔ رستم مرزا۔ ابوسعید مرزا۔ سنجر مرزا۔

اکبر کا شوق بھی چاہتا تھا۔ کہ علاقہ مذکور پھر میرے قبضہ میں آئے۔ مگر مُنہ نہ پڑتا تھا۔ کہ شاہ سے کچھ کہہ سکے۔ پھر بھی بندوبست سے نہ چوکتا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ کہ کابل کی فوج سے حملہ ہوا۔ تو کچھ نہ ہو گا۔ اس لئے محب علی خاں اور مجاہد خاں کو فوج دے کر بھیجا۔ انہوں نے بھکر پر قبضہ کیا۔ سید محمد میر عدل کی معتدل تدبیروں سے سیوی فتح ہوا۔ جسے آج کل سیبی کہتے ہیں۔ اقبال اکبری زبردست تھا۔ شہزادگانِ مذکور نے اپنے علاقہ کو آزاد رکھنا چاہا۔ چند ہی روز میں شاہ عباس کے جاہ و جلال نے تمام ایران و خراسان میں زلزلہ ڈال دیا۔ انہیں اپنی حالت پُرخطر ہوا۔ اور ان میں باہم بھی کشاکش ہونے لگی۔ اکبر نے خان خاناں کو فوج دے کر روانہ کیا۔ اُس نے اول ملک سندھ پر قبضہ کیا۔ پھر افغانستان اور خراسان زمین میں شہرت ہوئی۔ اور قلات تک کے لوگ اُدھر جھک گئے۔ میرزاؤں کے خیالات بھی اِدھر متوجہ ہوئے۔ ۱۰۰۱ھ میں رستم مرزا دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ اس کی یہاں بڑی قدر و منزلت

ہوئی رستہ ہی میں تھا۔ کہ اثنائے راہ کے حکام و امرا کے نام فرمان جاری ہوئے۔ کہ مہمانداری وخدمتگاری کرتے ہوئے لاؤ۔ جب لاہور ایک منزل رہا۔ تو بادشاہ یہیں تھے۔ امرا کو استقبال کے لئے بھیجا۔ وہ چاروں بیٹوں سمیت حاضر دربار ہوا۔ چنانچہ اعزاز سے ملاقات کی۔ اور پنج ہزاری منصب عنائیت کر کے ملتان جاگیر کر دیا۔ اس کے بعد ابوسعید مرزا اُس کا بھائی۔ پھر بہرام مرزا ابن منظفر مرزا آیا۔ پھر امرائے اکبری کو قندھار سپرد کر کے ایک ہزار قزلباش کے ساتھ مظفر حسین مرزا بھی حضور میں آگیا۔ اور ایران سے بالکل رشتہ توڑ دیا۔ سب کو حسب مراتب عہدے اور منصب ملے۔ شاہ بیگ خاں صوبہ دار کابل تھا۔ اس کو صوبہ داری قندھار بھی مل گئی ؏

جہانگیر کے عہد میں پھر شاہ عباس نے قندھار لے لیا۔ جہانگیر نے فوج کشی کا ارادہ کیا مگر ایسا منحوس ہوا۔ کہ اسی پر خرم (شاہجہاں) اور نورجہاں کا فساد ہو گیا۔ ہزاروں آدمیوں کا خون پانی ہو کر بہ گیا۔ بڑے بڑے جان نثاروں کی جانیں مفت برباد گئیں۔ شاہجہان نے دو دفعہ عالمگیر اور داراشکوہ کو بھیجا۔ مگر ہر دفعہ ناکامی نصیب ہوئی ؏

کوہستان بدخشان

جب یہ نام کتابوں میں لکھا نظر آتا ہے۔ تو دل دولت سے مالامال ہو جاتا ہے۔ مگر ملک کو جا کر دیکھو۔ تو پیٹ کو پتھر باندھنا پڑتا ہے۔ عالم سیاحت میں میرا گذر اس ملک میں ہوا۔ فیض آباد اس کا حاکم نشیں شہر ہے۔ میں نے وہاں اور اس کے اطراف میں چار مہینے کامل سیر کی۔ علاقہ مذکور کے گرد خدائی پہاڑوں کی قطاریں حفاظت کو کھڑی ہیں جنہیں آسمانی برف چادر اُڑھائے رہتی ہے۔ کسی کاروان یا فوج بادشاہی کے قدم اُس پر بے ادبی کی ٹھوکر نہیں لگا سکتے۔ تمام ملک مخملی پہاڑ۔ چشمے جا بجا جاری۔ زمین سرسبز۔ وہ رنگ رنگ کے پھولوں سے بوقلموں اور قسم قسم کے میووں سے مالامال۔ وسعت زمین کی بدولت ہر گھر میں ایک خانہ باغ ضرور ہے۔ خواہ امیر ہو۔ خواہ غریب۔ سیب۔ بہی۔ انگور۔ خوبانی۔ توت وغیرہ کے درخت خودرو۔ اُن میں ہزاروں جانور خوش الحان بول رہے ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام میں بھی جانتا ہوں۔ کہ اُسے بلبل ہزار داستان کہتے ہیں۔ اس کے پہاڑ قسم قسم کی دھات اور جواہرات بغل میں دبائے بیٹھے ہیں۔ جن میں سے ایک وہی ہے۔ کہ جس کو تم لعل بدخشاں کہتے ہو۔ دریا کے کنارے پر لوگ خاک شوئی کرتے ہیں۔ اور سونا نکالتے ہیں۔ ایک آدمی دن بھر میں ۴ر ۸ر کما لیتا ہے۔ جس پہاڑی سے اُترو دامن کوہ میں کم سے کم ہزار گھوڑوں کے گلے دوڑتے پھرتے ہیں۔ اور

ہزار در ہزار دُمبوں اور بکریوں کے ریوڑ چلتے پھرتے ہیں۔ انسان تمام صاحب جمال۔ قوی ہیکل۔ خوش عیش مگر بے ہمت اور آرام طلب۔

اس سرزمین پر قدرت نے اپنی دستکاری کا سارا تجبلاؑ لٹ دیا ہے۔ لیکن انسانی دستکاری بالکل مفقود ہے۔ تعلیم۔ صنعت گری۔ زراعت۔ تجارت وغیرہ جو سامان تحصیل دولت کے ہیں۔ تو وہاں ایک بھی نہیں۔ تعلیم دیکھو تو کوئی کوئی آدمی شد بود ضروری لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ اور وہ عالم سمجھا جاتا ہے۔ **دستکاری**۔ جب میں نے دیکھا تھا۔ تو سارے فیض آباد میں ایک دوکان قلعی گر کی تھی۔ اور وہ بھی کابلی تھا۔ وہی لوٹا پھوٹا باسن بھی جوڑ لیتا تھا۔ ورنہ تانبے کے باسن بھی بخارا اور کابل سے تاشقرخان اور قند زین جاتے ہیں۔ وہاں سے بدخشاں میں پہنچتے ہیں مُجلاہے فقط گاڑھا بن لیتے ہیں۔ یا دُسا۔ لوئی۔ نمدہ وغیرہ۔ **زراعت** بقدر ضرورت کر لیتے ہیں۔ کہ اپنے سال بھر کو کافی ہو۔ زیادہ محنت کرن کرے۔ اور کریں تو بے فائدہ۔ کیونکہ باہر نکاس نہیں۔ اگر کسی کو ضرورت پڑے اور چاہے۔ کہ من بھر آٹا بازار سے لے آئے۔ تو فقط بنئے کی ایک یا دو دوکانیں۔ گھر گھر بھیک کی طرح مانگتا پھرے گا۔ جب دن بھر میں جمع ہوگا۔ **تجارت** کو گھر سے باہر جانا پڑتا ہے اس لئے نہیں کرتے۔ باہر کے سوداگر نہیں جاتے۔ اس لئے کہ آسمانی اور برفانی پہاڑ کاٹ کر جائیں۔ اور جاکر چیز کر بیچیں۔ تو وہاں سے روپیہ نہیں ملتا۔ خریداری جو کچھ کرے۔ خود میر بدخشاں یا اس کا کوئی بھائی بند کرے۔ اور کوئی کرہی نہیں سکتا۔ اس کا یہ حال ہے۔ کہ سوداگر مال دے کر برس برس دن پڑا رہتا ہے۔ آخر کو قیمت میں پانسو دُنبے۔ سات سو بکرے بکریاں۔ کچھ نقد۔ اس میں بھی پچاس روپیہ۔ سَو ڈیڑھ سو روپیہ کے پیسے۔ ایک لڑکا دو لڑکیاں دو سو کا غلام۔ تین سو کی لونڈی ملتی ہے۔ انہیں باہر کے ملکوں میں جاکر بیچ لیتا ہے۔

لطیفہ:۔ شہر فیض آباد میں تقریباً سات سو گھر کی بستی ہوگی۔ جن میں ایک نائی نہیں۔ اور سچ ہے۔ وہ بچارا سر مُونڈے تو لے کیا!

دل کا کیا مول بھلا زلف چلیپا ٹھہرے — تیری کچھ گانٹھ گرہ میں ہو تو سودا ٹھہرے

ہر شخص کی کمر میں ایک ایک چھُری ایک ایک چاقو لٹکتا ہے۔ چھُری سے گوشت کاٹتے ہیں۔ کچھ باریک کام ہو۔ تو چاقو سے کر لیتے ہیں۔ باپ بیٹے کو مونڈ لیتا ہے۔ بیٹا باپ کو مُونڈ لیتا ہے۔ دوست بھی دوست کو مونڈ لیتے ہیں۔ اور یہ داخل ثواب سمجھا جاتا ہے۔ ایک آبِ رواں کے کنارے

بیٹھ گئے۔ نرم سا پتھر وہیں سے اُٹھا کر پاس رکھ لیا۔ اُس پر چاقو رگڑتے جاتے ہیں۔ مونڈتے جاتے ہیں۔ ثواب کماتے جاتے ہیں (وُہ لوگ ایک دُوسرے کو ملّا کر بات کہتے ہیں)

لطیفہ در لطیفہ۔ جب میری حجامت بڑھ جاتی تھی۔ تو کسی سے کہتا تھا کہ ملّا دست دریں کار ندارم کمینۂ آں خدمت شما بکنیم۔ اگر زحمتے بکشید۔ مسافر نواز لیست۔ ایک دن ایک شخص نے حجامت بنانے میں بیان کیا۔ کہ شخصے از فیض آباد مالبسفر رفت۔ چوں بشہرے آبادان رسید۔ چند روز اقامت کرد۔ مردم باد آشنا شدند۔ پرسیدند ملّا! شہر شما چہ قدر آبادی دارد۔ ایں کس مرد راست گفتار و پاک نہاد بود نخواست کہ زبان خود را بہ دروغ آلاید۔ گفت ہمیں بدانید کہ شہر ما فقط ہفت صد خانہ و ملک دارد +

محمد حکیم مرزا

حیف ہے کہ اکبر کا بھائی! اور ایسا بے اقبال۔ بدعقل۔ کم ہمت جب تک جیا۔ نوکروں کے ہاتھوں میں کچھ پُتلی بنا رہا۔ اگر وہ انسان ہوتا تو تمام خراسان زیرین اُس کا مال تھا۔ قندھار۔ توجیب کا شکار تھا۔ بلخ کو اب۔ حصار۔ بدخشاں وغیرہ کنار جیحوں تک پھیل کر عبداللہ خاں اُزبک کو بر سرِ حساب لیتا۔ اور اکبر کا داہنا ہاتھ بن کر ملکِ موروثی کو چھڑا لیتا۔ اور اکبر بھی وہ عالی ہمت بادشاہ تھا۔ کہ اسے اپنے تاج کا لعل اور ہار کا موتی بناتا۔ مگر وُہ بدنصیب اپنی بدنیتی اور نوکروں کی بدصلاحی سے جوؤں بھرا پوستین بنا رہا۔ کیفیت حال اُس کی یہ ہے۔ کہ اُس کی ماں کا نام ماہ چوچک بیگم تھا۔ ۹۶۱ھ میں جبکہ ہمایوں ہندوستان پر فوج کشی کا سامان کر رہا تھا۔ یہ کابل میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے محمد حکیم نام رکھا۔ ابوالمفاخر خطاب دیا۔ ابوالفضائل تاریخ ولادت تھی۔ اسی واسطے کنیت قرار دی گئی۔ اسے اور اہل حرم کو وہیں چھوڑا۔ اور ملک مذکور اُس کے نام پر کر کے منعم خاں کو اتالیق کر دیا۔ آپ ہمت کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہندوستان میں آیا۔ ۹۶۳ھ میں ہمایوں مر گیا۔ یہ معصوم بچہ دو برس کا بھی نہ تھا۔ جو مرزا سلیمان بدخشان سے فوج لے کر آیا۔ اور کابل کو گھیر لیا (دیکھو منعم خاں کا حال[1]) +

۹۶۹ھ میں دس برس کی عمر ہوگی۔ جو امرا کا باہم فساد ہوا۔ منعم خاں کا بیٹا بھاگ آیا۔ بھائی اور بھتیجا مارا گیا۔ اور امرائے دولت میں عجیب کشا کشی پڑی +

اسی عرصہ میں شاہ ابوالمعالی بلائے آسمانی کی طرح پہنچے۔ چند روز بعد پھر فساد اُٹھا۔ ماں قتل ہوئی۔ امرا ضائع ہوئے۔ اپنی جان خدا خدا کر کے بچی۔ مرزا سلیمان نے آ کر اس آفت کو

[1] صفحہ ۲۳۰

رفع دفع کیا۔ اُس کی بی بی[1] حرم بیگم کی تجویز تھی۔ کہ مرزا کو بدخشاں لے چلو۔ اور کابل میں بندوبست اپنا کر لو۔ مرزا سلیمان سمجھا کہ اکبر اس حرکت کی برداشت نہ کر سکے گا۔ اس لئے کابل ہی میں رکھا۔ بیٹی کے ساتھ اُس کی شادی کر دی۔ امید علی اپنے ملازم کو اتالیق بنایا۔ اور آپ بدخشاں کی راہ لی۔ مرزا حکیم نے تنگ ہو کر امرائے مذکور کو بُلایا۔ اور محذر معذرت کر کے ٹال دیا۔ جب وُہ بدخشاں پہنچے تو مرزا سلیمان بہت خفا ہوا۔ اور لشکر بے شمار لے کر چڑھا۔ مرزا لے مقابلے کی طاقت نہ دیکھی۔ باقی خاں قاقشال کو کابل میں چھوڑا۔ اور آپ جلال آباد میں بھاگ آیا۔ جب سُنا کہ مرزا سلیمان یہاں بھی آیا۔ تو دریاے اٹک کے کنارے آن پڑا۔ اور اکبر کو عرضی لکھی۔ اِدھر سے فرمان جاری ہوئے۔ چنانچہ تمام انکہ خیل کہ پنجاب اُن کی جاگیر تھا۔ اور کئی امیر صاحب فوج مرزا حکیم کے ساتھ جا کر شامل ہوئے +

مرزا سلیمان پشاور تک آ کر کابل کو پھر گیا تھا۔ جلال آباد میں قنبر اپنے ملازم کو چھوڑ گیا تھا۔ امرائے اکبری باگیں اُٹھائے جلال آباد پہنچے۔ بدخشیوں کے دھوئیں اُڑا دیئے۔ اور قنبر کا سر کاٹ کر باقی خاں کے پاس کابل میں بھیج دیا۔ کہ ہم بھی آن پہنچے ہیں۔ سپاہ بدخشی ایسی تباہ ہوئی۔ کہ ان میں سے فقط دو آدمی زندہ بچے۔ اور سلیمان کے پاس جا کر رفیقوں کا سارا مُصیبت نامہ سنایا۔ مرزا سلیمان یہ خبریں سُن کر بدخشاں کو بھاگ گیا۔ امرائے اکبری مرزا حکیم کو لے کر کابل پہنچے۔ انہیں مسند فرمان روائی پر بٹھایا۔ خان کلاں مرزا عزیز کے چچا اتالیق بن کر بیٹھے۔ اور غلطی یہ کی کہ باقی امرا کو دربار اکبری اور اُن کے علاقوں کو رُخصت کر دیا۔ سکینہ بانو بیگم مرزا حکیم کی چھوٹی بہن قطب الدین خاں کی حفاظت سے حضور میں پہنچی۔ مرزا سفلہ مزاج نوجوان تھا۔ اور سفلے ہی مصاحب رکھتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر عقل پر پردہ پڑا۔ خواجہ حسن کوئی نوجوان خواجہ حسن نقشبندی کی اولاد سے وہاں آیا ہوا تھا۔ جس بہن کی شادی پہلے شاہ ابوالمعالی سے کی تھی۔ اُس کا عقد خواجہ حسن سے کر دیا۔ نہ بادشاہ کی اجازت لی۔ نہ خان کلاں سے صلاح کی۔ اب خواجہ صاحب گھر والے بن کر بیٹھ گئے۔ مرزا لڑکا تھا۔ یہ اُنہیں کیا دبا سکتا تھا۔ انہوں نے تمام حکم احکام اپنے اختیارات میں لے لئے۔ خان کلاں جل کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بے اطلاع چلے آئے +

---

[1] مرزا سلیمان کی بیوی حرم بیگم سلیمان دلیس کولابی کی بیٹی تھی۔ وہ قوم قبچاق کا سردار تھا۔ بیگم مذکور نام کی عورت تھی مگر بیگموں اور خاتونوں کو چٹکیوں میں ملتی تھی۔ دیو کی طرح سلیمان پر سوار رہتی۔ اور سلطنت کی مالک بنی ہوئی تھی۔ ولی نعمت بیگم اسکا خطاب تھا بلکہ یہی تھا

سنہ ۹۷۱ھ میں مرزا سلیمان نے دیکھا کہ امرائے بادشاہی ناراض ہو کر کابل سے چلے گئے۔ اور میدان صاف ہے۔ ولی نعمت بیگم کو لے کر پھر آئے۔ اور کابل کو گھیر لیا۔ مرزا نے شہر معصوم خاں کوکہ کے سپرد کیا۔ اور آپ چند امرا کے ساتھ غور بند کو بھاگ گئے۔ مرزا سلیمان نے دیکھا۔ کہ کابل زورِ شمشیر سے ہاتھ نہ آئیگا۔ اپنی ولی نعمت بی بی کو قرا باغ میں کہ کابل سے دس کوس تھا۔ مرزا کے پاس بھیجا کہ صلح و صلاح کر کے لے آئے۔ اس نے آکر مکر کے جال پھیلائے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں۔ قرآن درمیان لائی۔ اور کہا کہ بیٹا تم میرے فرزند ہو۔ نور بصر لخت جگر ہو۔ داماد تو بیٹے سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ میں فقط تم سے ملنے آئی ہوں۔ غرض ایسی چکنی چپڑی باتیں بنائیں۔ کہ مرزا حکیم آنے کو تیار ہوئے۔ خواجہ حسن بھی اس صلح میں شریک تھے مگر باقی خاں کہے جاتا تھا۔ کہ عورت چلتر باز ہے ٭

از رہ مرد بعشوۂ دنیا کہ ایں عجوز		مکارہ مے نشیند و محتالہ میرود

بیگم سے چوک یہ ہوئی۔ کہ جھٹ خاوند کو بلا بھیجا۔ مرزا سلیمان فوراً فوج جرار لیکر دوڑے اور گھات لگائے کھڑے تھے۔ کہ جب موقع پائیں۔ شکار پر جا گریں۔ مرزا حکیم کو کسی نے رستہ میں خبر دی۔ وہ سنتے ہی بھاگا۔ اور غور بند کی گھاٹیوں میں گھس کر کوہ ہندو کش کا رستہ لیا۔ خواجہ حسن کہتا تھا۔ کہ پیر محمد خاں اُذبک حاکم بلخ کے پاس چلو۔ وہاں سے مدد لائیں گے۔ باقی خاں قاقشال نے سمجھایا۔ اور روک کر نیچ شبیری کے رستہ اٹک کے کنارہ پر پہنچا دیا۔ اُس نے دریا اُتر کر اکبر کو عرضی لکھی۔ خواجہ حسن کو اِدھر آنے کا مُنہ کہاں تھا۔ وہ اپنے رفیقوں کو لے کر بلخ پہنچا۔ اور وہاں سڑ سڑ کر زندگی سے بیزار ہو گیا۔

دل بشد جاں گریخت۔ دیں گم شد		اے حسن زیں بتر چہ خواہد شد

مرزا سلیمان تو ادھر آئے۔ معصوم خاں کابلی ایک سردار مرزا کا نمک خوار بڑا بہادر جانباز تھا۔ اُس نے مرزا سلیمان کی چھاؤنی پر حملہ کیا۔ اور بدخشیوں کو بھگا کر ایک چار باغ میں گھیر لیا۔ مرزا سلیمان نے قاضی خاں (وہی غازی خاں) کو وکیل کر کے بھیجا۔ معصوم خاں اول صلح پر راضی نہ ہوتا تھا۔ مگر قاضی خاں کا شاگرد بھی تھا۔ اُس کے کہنے سے عدول بھی نہ کر سکا۔ مرزا سلیمان برائے نام کچھ پیشکش لے کر بدخشاں کو تشریف لے گئے ٭

مرزا حکیم کی عرضی سے پہلے ہی اکبر کو سب خبریں پہنچ گئی تھیں۔ اُس نے گھوڑا زین مرصع سے سجا ہوا۔ اور اکثر تحایف ہندوستان کے اور بہت سا روپیہ منعم خاں کے ساتھ روانہ

کیا۔ اور تسلی و دلداری کے ساتھ فرمان بھیجا۔ فریدوں خاں اس کا ماموں حضور میں حاضر تھا۔ اُسے بھی رخصت کیا۔ کہ جا کر پریشانیوں کی اصلاح کرے۔ امرائے پنجاب کو حکم بھیجا کہ فوجیں لیکر کمک کو پہنچیں۔ بدنیت فریدوں خاں سامان مذکور لیکر کنار اٹک پر مرزا سے ملا۔ وہ ادھر آنے کو تیار تھا۔ فریدوں نے آتے ہی ورق الٹ دیا۔ اُس نے کہا کہ بادشاہ خانِ زمان کی مہم میں مصروف ہیں۔ اور خانِ زمان وغیرہ امرا تمہارے وجود کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ تمہارے نام کا سکہ کہ کر روپیہ اشرفی پر لگایا ہے۔ تم بھی آخر ملک کے وارث ہو۔ مصلحتِ وقت اور تقاضائے ہمت یہ ہے۔ کہ ہم بھی اس وقت ہمت کی کمر باندھیں۔ اور پنجاب پر قبضہ کر لیں۔ سرحد کو اپنی حد باندھیں۔ اور آیندہ سامان الٰہی کے منتظر رہیں۔ اور کابل میں تو تمہارا نال گڑا ہے۔ وہ کہیں گیا ہی نہیں۔ کئی مفسد اور بھی ادھر سے گئے تھے۔ اُنہوں نے اس مشکل امر کو زیادہ تر آسان کر کے دکھایا۔ ماموں کے ساتھ بھانجے کی بھی نیت بگڑی۔ اور اب اُلٹی نیت سے ہندوستان کا رُخ کیا۔ مفسدوں نے چاہا تھا۔ کہ جو سردار بادشاہی تحائف لے کر گئے تھے۔ اُنہیں قید کر لیں۔ مگر مرزا کی طبیعت میں مروّت ذاتی تھی۔ خلوت میں بلا کر خوشخبر خاں کو سمجھایا۔ اور چپکے سے رخصت کر دیا۔

مرزا حکیم اٹک اتر کر بھیرہ کو لوٹتے ہوئے لاہور پر آئے۔ راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں جہاں اب مقبرہ جہانگیر ہے۔ آن اُترے۔ ان دنوں پنجاب میں اتکہ خیل کا عمل تھا۔ قلعہ داری کا پورا سامان لے کر قلعہ میں گھُس بیٹھے۔ اور بڑی چستی سے مقابلہ کیا۔ مرزا نے قلعہ پر حملے کئے۔ مگر انہوں نے پاس نہ پھٹکنے دیا۔

بادشاہ بھی ادھر سے روانہ ہوئے۔ سرہند تک پہنچے تھے۔ کہ یہاں آمد آمد کا غلغلہ ہوا۔ ایک دن علے الصباح قلعہ سے شادیانہ کے نقارے بڑے زور شور سے بجنے شروع ہوئے مرزا سوتا اٹھا۔ سمجھا کہ بادشاہ آن پہنچے۔ اُسی وقت سوار ہو کر بھاگا۔ اور جس رستہ آیا تھا اُسی رستہ چلا گیا۔ جو امرا تعاقب میں گئے تھے۔ بھیرہ تک پہنچا کر چلے آئے۔

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان کو شاہرخ ان کے پوتے نے بڑھاپے میں گھر سے نکال دیا۔ اور اُسے مرزا حکیم کے پاس آنا پڑا۔ کہ اس بیکسی کے وقت میں میری مدد کرو۔ یہ زمانہ کا انقلاب قابل عبرت تھا۔ مگر مرزا نے باتوں میں ٹال دیا۔ بڈھے نے مایوس ہو کر دربار اکبری کا ارادہ کیا۔ اور مرزا سے کہا کہ افغانوں کا ملک ہے۔ تم یہاں سے پشاور تک پہنچا دو۔ مرزا نے

چھل یا چالاکی سے کہن سال بڈھے کو اس وقت میں ایسا چکمہ دیا جو کسی طرح مناسب نہ تھا ✤
معصوم خاں مرزا کا ملازم دربار اکبری میں آکر درجۂ امارت کو پہنچا۔ اور بنگالہ کی مہمات میں شامل رہا۔ جب وہاں اُمرا باغی ہوئے۔ تو وہ بھی ان میں داخل ہو گیا۔ باغیوں نے ۹۸۹ھ میں مرزا کو عرضیاں بھیجیں۔ بھولا بھالا مرزا فوج تیار کر کے ادھر روانہ ہوا۔ اور لاہور تک آکر پھر گیا۔ اب اکبر کو واجب ہوا۔ کہ اس کا تدارک قرار واقعی کرے۔ مان سنگھ کو فوج دیکر آگے بھیجا۔ شاہزادہ مراد کو ساتھ کیا۔ پیچھے پیچھے آپ لشکر لے کر پہنچا۔ مان سنگھ نے کئی خونریز معرکے مار کر مرزا کو شکست دی۔ اور اکبر کابل میں داخل ہوئے۔ مرزا کی خطا معاف کی۔ اور دوبارہ ملک بخشی کر کے چلے آئے ✤
۹۹۳ھ میں ۳۰ برس کی عمر میں شراب کے شیشہ پر جان قربان کی کیقباد اور افسراسیاب دو بیٹے یادگار چھوڑے۔ (دیکھو مان سنگھ کا حال) ✤

مرزا سلیمان حاکم بدخشاں

تین واسطہ سے امیر تیمور کا پوتا تھا۔ مرزا سلیمان ابن خاں مرزا۔ ابن سلطان محمود۔ مرزا ابن سلطان ابوسعید مرزا۔ ابن امیر تیمور گورگان۔ مرزا نے جس طرح ملک مذکور پایا۔ اُس کی تمہید سننے کے قابل ہے۔
قدیم الایام سے بدخشاں میں ایک خاندان کی حکومت تھی۔ وہ دعویٰ کرتا تھا۔ کہ سکندر رومی کی اولاد ہیں۔ کچھ کوہستان کی دشوار گزاری سے۔ کچھ سکندر کے نام کا پاس کر کے سلاطین اطراف سے کوئی ان کے ملک پر ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ بہت ہوتا تو نام کو تھوڑا سا خراج لے کر ماتحت بنا لیتے۔ امیر تیمور کے بیٹے سلطان ابوسعید مرزا نے وہاں کے اخیر بادشاہ سلطان محمد کو پکڑ کر ملک مذکور پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد سلطان محمود اس کا بیٹا وہاں آیا۔ اور مر گیا۔ خسرو ایک سردار اسی کی پرورش سے امارت کے درجہ کو پہنچا تھا۔ اُس نے سلطنت کا تاج مرزا باقرا اور مرزا مسعود اُس کے بیٹوں کے نام پر رکھا۔ اور آپ سلطنت کرنے لگا۔ ۹۰۵ھ میں پہلے کو اندھا اور دوسرے کو مار کر آپ خسرو شاہ بن گیا ✤
۹۱۰ھ میں بابر نے آکر خسرو کو نکال دیا۔ اور آپ ملک مذکور کو سنبھالا۔ جب ۹۱۳ھ میں قندھار لے کر کابل میں آئے۔ تو ملک کو پھیلتا دیکھ کر خان مرزا کو بدخشاں کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ اس نے بہت رگڑوں جھگڑوں کے بعد وہاں استقلال پیدا کیا۔ مگر ۹۱۷ھ میں مر گیا ✤
مرزا سلیمان اس کا بیٹا اس وقت سات برس کا تھا۔ بابر نے اسے اپنے پاس رکھا اور

ہمایوں کو بدخشاں کا ملک دے دیا۔ ان کے معتمد معتبر وہاں انتظام کرتے رہے۔ باپ بیٹے ہندوستان میں آئے۔ جب رانا سانگا کی مہم فتح ہو چکی تو ۹۳۳ھ میں ہمایوں کو پھر بدخشاں بھیج دیا کہ کابل کا اور بدخشاں کا بندوبست رہے۔ شاہزادہ ایک سال تک وہاں رہا۔ دفعۃً باپ کی حضوری کا شوق ایسا غالب ہوا۔ کہ دل بے اختیار ہو گیا۔ سلطان اویس سلیمان مرزا کا خسر ساتھ تھا۔ ملک اُس کے سپرد کیا۔ اور چلا آیا۔ سلطان اویس کی اشارت اور بعض امرا کی شرارت سے سلطان سعید خاں نے کاشغر سے فوج کشی کی۔ ہندال مرزا اُس سے پہلے پہنچ گیا تھا اس نے قلعہ ظفر کی مضبوطی کر کے خوب مقابلہ کیا۔ سلطان سعید خاں تین مہینے کے بعد محاصرہ اُٹھا کر کاشغر کو ناکام پھر گیا۔ لیکن ہندوستان میں ہوائی اُڑ گئی تھی۔ کہ اس نے بدخشاں لے لیا۔ بابر نے ہمایوں کو پھر بدخشاں بھیجنا چاہا۔ اُس نے کہا۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اپنے ارادہ سے آپ کی خدمت سے جدا نہ ہوں گا۔ اور حکم سے چارہ نہیں۔ ناچار بابر نے مرزا سلیمان پسر خان مرزا کو اُدھر رخصت کیا۔ اور سلطان سعید خاں کو ایک خط لکھا۔ کہ باوجود حقوق چند در چند کے ہماری غیبت میں ایسے امر کا ظہور میں آنا کمال تعجب ہے۔ اب ہم نے مرزا ہندال کو بلا لیا مرزا سلیمان کو بھیجتے ہیں۔ مرزا سلیمان آپ سے نسبت فرزندی رکھتا ہے۔ اگر تعلقات مذکور کا خیال کر کے بدخشاں اسے دیجئے تو بجا ہوگا۔ ورنہ ہم نے وارث کو میراث دے کر اپنا حق ادا کر دیا۔ آگے آپ جانئے۔ مرزا جب وہاں پہنچا تو ملک میں پہلے ہی امن امان ہو چکا تھا۔ تمام علاقہ پر قبضہ کیا +

سنہ ۹۶۴ھ میں جبکہ پہلی دفعہ کابل سے ناکام پھرا۔ تو اس کی طمع یا بلند نظری نے ایسی بلندی سے ٹپکا۔ کہ دل و جان کو صدمہ پہنچا۔ یعنے اطراف ملک سے فوج فراہم کی اور بلخ پر حملہ کیا۔ ہرچند خیر خواہوں نے سمجھایا۔ کہ بڑے بڑے شاہزادے اور پرانے امیر قوم اُزبک کے میر محمد خاں کے ساتھ ہیں۔ اس پر چڑھ کر جانا مصلحت سے بعید ہے۔ ایک نہ مانی۔ آپ گیا۔ اور رشید فرزند ابراہیم مرزا کو بھی ساتھ لے گیا۔ جب میدان میں مقابلہ ہوا تو دیکھا کہ لوہا ٹھنڈا ہے۔ اور تلوار کاٹ نہیں کرتی۔ آپ بدخشاں کو بھاگے۔ ابراہیم مرزا اپنی جگہ گرم کار زار تھا۔ اُسے مصاحبوں نے کہا کہ ٹھہرنے کا وقت نہیں۔ باپ تمہارا میدان سے نکل گیا۔ اُس جوانمرگ کی زبان سے نکلا کہ اب نکلنا دشوار ہے۔ یہیں لڑے جاتے ہیں۔ یا قسمت یا نصیب۔ محمد قلی شغالی نے زبردستی گھسیٹا۔ وہ بھی چلا۔ مگر گھوڑا نہ چلا۔ آخر پیادہ ہو کر بھاگا۔ رستہ میں تبدیل صورت کے لئے چار

ابرو کی صفائی کرکے فقیر بنا۔ کہ کوئی نہ پہچانے۔ موت ہر رنگ میں تاڑ لیتی ہے۔ ایک مقام پر پہچانا گیا۔ لوگوں نے پکڑ کر پیر محمد خاں کے پاس پہنچایا۔ وہاں قید میں قتل ہوا۔ اس کا درد بخت باپ کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ دیکھو جگر کا خون تاریخ ہو کر ٹپکا ہے۔ نخل امید پدر کو ؛ بدفالی کا اثر اکثر خالی نہیں جاتا۔ چند روز پہلے مرنے والے نے خود ایک قصیدہ کہا مطلع تھا۔

رفتم بخاک حسرت چوں لالہ داغ بردل	آرم بحشر بیروں باداغ دل سراز گل

مگر ایک اور اُستاد نے رباعی خوب کہی ہے۔ رباعی

اے لعل بدخشاں ز بدخشاں رفتی	از سایۂ خورشید درخشاں رفتی
در دہر چو خاتم سلیماں بودی	افسوس کہ از دست سلیمان رفتی

جب ہمایوں کی بربادی کے بعد مرزا کامراں کابل میں مسلّط ہوا۔ تو مرزا سلیمان کو کہا۔ کہ میرا سکہ و خطبہ جاری کردو۔ اُس نے نہ مانا۔ کامران نے فوج کشی کرکے اپنی ضد پوری کی۔ اور کچھ علاقہ لے کر باقی ملک دیدیا۔ چند روز کے بعد سلیمان نے عہد شکنی کی۔ کامران پھر لشکر لے کر گیا۔ سلیمان چند روز کا محاصرہ اُٹھا کر معہ عیال قید ہوا۔ جب ایران سے ہمایوں کی آمد ہوئی۔ تو یہ قید میں تھا۔ کامران نے اس باب میں مشورت کی۔ اُنہی دنوں میں سرداران بدخشاں نے بغاوت کرکے کامران کو لکھا تھا۔ کہ ہمارے سلیمان کو ہمیں دیدو۔ ورنہ تمہارے سرداروں کو قید خانے سے عدم کو روانہ کرتے ہیں۔ کامران نے اسے روانہ کر دیا۔ جب وہ چلا گیا۔ تو پچھتایا۔ اور فوراً کہلا بھیجا۔ کہ چند ضروری باتیں سمجھانی رہ گئی ہیں۔ مجھ سے مل جاؤ۔ وُہ بھی سمجھ گیا تھا کہلا بھیجا۔ کہ مبارک ساعت میں کوچ کیا تھا۔ ویسا وقت پھر نہ ہاتھ آئے گا۔ جو بات ہے لکھ بھیجو۔ اور جاتے ہی باغی ہو گیا۔ جب ہمایوں کابل میں فتحیاب ہو کر داخل ہوا۔ تو سلیمان نے عرضی بھیجی۔ آپ نہ آیا۔ اور سکہ خطبہ اپنا جاری کر دیا۔ چند روز کے بعد ہمایوں نے فوج کشی کی۔ بڑے کشت و خون کے ساتھ لڑائی ہوئی۔ مرزا بھاگا۔ اور چند روز سرگرداں پھر کر جیجوں پار اُتر گیا۔ بدخشاں ہمایوں کے قبضہ میں آیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو بلا کر پھر ملک سپرد کر دیا۔

کامران جب تباہ ہوا۔ تو بلخ سے پیر محمد خاں اُزبک کی مدد لے کر بدخشاں پر آیا۔ اُدھر سے سلیمان نکلا۔ ادھر سے ہمایوں پہنچا۔ حریف ناکام پھر گئے۔ مرزا سلیمان ہمایوں سے ملا رہتا

تھا۔ اور کبھی کبھی خودسری کے خیال بھی دوڑاتا تھا۔ جب ہمایوں ہندوستان پر فوج لے کر چلا۔ تو مرزا سلیمان دربار میں تھا۔ اُس سے بڑی محبت کی باتیں کر کے بدخشاں کو روانہ کیا۔ ابراہیم اُس کے بیٹے کو رکھ لیا۔ اور بخشی بیگم اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر کے بہت عزت سے رخصت کیا ٭

ہمایوں کے بعد مرزا سلیمان کا لالچ اُسے چار دفعہ کابل پر لایا۔ اور چاروں ہی دفعہ بدنیتی کے دامن میں آن پڑے۔ آخر ۹۸۲ھ میں مرزا شاہرخ اُس کے پوتے نے جوشِ جوانی میں خودسری کے خیالات پیدا کئے۔ اور دادا کو ایسا تنگ کیا۔ کہ بڈھا حج کا بہانہ کر کے وہاں سے بھاگا۔ اور کابل پہنچا۔ انقلاب زمانہ کو دیکھو۔ جس شیرخوار بچہ کو لاوارث یتیم دیکھ کر ۲۰ برس پہلے مرزا گھر چھیننے آئے تھے۔ بڈھے ہو کر ہزار طرح کی ذلتیں اور خواریاں اُٹھائیں۔ اور اسی کے پاس مدد کی التجا لائے۔ مرزا حکیم نے رُخ نہ دیا۔ بڈھا مایوس ہو کر ۹۸۳ھ میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ کہ دربار اکبری سے داد پائے۔ مرزا حکیم سے کہا۔ کہ کچھ فوج بدرقہ کے لئے دو تاکہ منازل خطرناک سے نکال کر اٹک تک پہنچا ئے۔ نوجوان مرزا نے فوج دینے میں بھی ظرافت اور نزاکت کو کام فرمایا۔ ایسے لوگوں کو اُس کے ساتھ کیا کہ پہلی ہی منزل میں چھوڑ کر چلے آئے۔ بڈھا بچارا حیران۔ پھرے تو کس مُنہ سے پھرے۔ چھوٹے چھوٹے بیٹے بھی ساتھ تھے۔ توکل بخدا تنہا و بے سامان روانہ ہؤا۔ رستہ میں کئی جگہ پہاڑوں کے دیوزاد سلیمان پر گرے۔ وہ بھی بہتر ہو کر گر گیا۔ خوب مردانگی سے مقابلے کئے۔ اور زخمی بھی ہؤا۔ غرض لڑتا بھڑتا اٹک کے کنارہ تک آپہنچا۔ اکبر کو عریضہ لکھا۔ اُس میں ساری سرگذشت بیان کی۔ اور یہ بھی درج کیا۔ کہ اس وقت تحفہ یا پیشکش کسی چیز تک ہاتھ نہیں پہنچتا۔ دو گھوڑے ساتھ رہ گئے ہیں۔ کہ میرے خانہ زاد ہیں۔ یہی بھیجتا ہوں تاکہ عریضۂ خشک خالی نہ ہو ٭

اکبر کو اپنا سالِ جلوس اور مرزا کا کابل پر آنا بھولا نہ تھا۔ اس کے علاوہ مرزا نے آدابِ قرابت کا بھی کبھی خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن کچھ مُروّتِ ذاتی۔ اور کچھ اس مصلحت سے کہ مرزا کا ملک اُزبک کے سامنے دیوار استوار ہے۔ اُس کی اس قدر مہمان نوازی اور خاطرداری کی۔ کہ نقاروں کی آواز بخارا اور سمرقند تک پہنچی۔ جب اُس کا عریضہ پہنچا تو کئی طویلے گھوڑے کاٹھیاواڑ۔ ایرانی۔ بہت سے اجناس نفیس۔ خیمے اور بارگاہ اور حشمت شاہانہ کے سامان

۵۰ ہزار روپیہ نقد اور آغا خاں خزانچی وغیرہ امرا کو استقبال کے لئے بھیجا۔ مان سنگھ اُس وقت سرحد پشاور پر تھے۔ اور راجہ بھگوان داس پنجاب میں تھے۔ ان مزاج دانوں نے اکبر کی مصالح ملکی اور اُس کی مرضی پر جان و مال کو قربان کر دیا تھا۔ بلکہ آئین اکبری کے اجزاء یہی لوگ تھے۔ مان سنگھ فوراً پہنچے بڑے شان و شوکت سے استقبال کیا۔ اور دھوم دھام کی ضیافتیں کھلاتے لائے۔ راجہ بھگوان داس لاہور سے دریائے اٹک تک پہنچے۔ ضیافتیں کھلاتے لاتے تھے۔ اور جو جو حکام اور امرا رستہ کے آس پاس تھے۔ پرگنوں اور شہروں سے نکل نکل کر مہمانداری کے لوازمات ادا کرتے تھے۔ اسی طرح برابر لئے آئے۔ اکبر کو جب ان انتظاموں کے حالات معلوم ہوئے۔ تو بہت خوش ہوا ۔

متھرا میں پہنچے۔ تو کئی امیر عالی رتبہ جن میں قاضی نظام بدخشی بھی شامل تھے۔ متھرا تک استقبال کو گئے۔ فتح پور کے پاس پہنچے۔ تو اول علما و شرفا کا برو مفتی و صدر الصدور پھر اُمرا ارکان دولت۔ پھر خود بادشاہ۔ ۵ کوس تک پیشوائی کو بڑھے۔ پانچ ہزار ہاتھی جن پر مخمل فرنگی اور زربفت کی جھولیں جھول رہی تھیں۔ چاندی سونے کی زنجیریں سونڈوں میں ہلاتے۔ سراگائے کی دُمیں کالی اور سفید سر و گردن پر لٹکتی۔ دو طرفہ برابر قطار باندھے تھے۔ ایرانی و عربی گھوڑے۔ طلائی و نقرئی زینوں سے سجے۔ مرصع ساز لگے۔ دو دو ہاتھیوں کے بیچ میں ایک ایک چیتا۔ گلے میں سونے کی زنجیر اور بھنور کلی۔ مخمل زرکار کی جھول۔ ایک ایک رنگین چھکڑے پر بیٹھا۔ ہر چھکڑے میں ناگوری بیلوں کی جوڑی۔ بیلوں پر شالہائے کشمیر اور کمخواب کی جھولیں سروں پر تاج زرکار۔ ۴ کوس تک تمام جنگل نگار خانہ بہار ہو رہا تھا۔ دیکھنے والے حیران تھے۔ کہ یہ کیا طلسمات ہے۔ کیونکہ آج تک اس انتظام کے ساتھ یہ سامان کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سپاہی قدم قدم پر تعینات تھے۔ کہ سلسلۂ راہ میں کہیں خلل راہ نہ پائے۔ شہر فتح پور کے بازار گلی کوچے صاف ہر جگہ چھڑکاؤ۔ دکانیں آئین بندی سے آراستہ تھیں۔ عید کا دن معلوم ہوتا تھا۔ شہر کے شرفا کوٹھوں اور بالاخانوں میں بن سنور کر بیٹھے تھے۔ تماشائیوں کے ہجوم سے بازاروں میں رستے بند تھے۔ جس وقت بادشاہ نظر آئے۔ مرزا گھوڑے سے کود پڑا اور آگے دوڑا کہ تسلیم بجا لائے تو رہِ ترکانہ اور آداب شاہانہ کا آئین یہی تھا۔ مگر اکبر نے قرابت اور بزرگی عمر کی رعایت رکھی۔ جھٹ اُتر پڑا۔ جھک کر سلام کیا۔ اور عمو عمو کہہ کر بغلگیری کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ مرزا کو

تسلیم و کورنش وغیرہ نہ کرنے دی۔ گلے ملے اور سوار ہو گئے۔ دولت خانۂ اتوپ تلاؤ کے در و دیوار۔ صحن۔ طاق۔ محرابوں میں۔ پردے۔ سائبان زریں۔ گلدان گلدستے۔ سونے روپے کے جڑاؤ۔ ایوان و مکانات۔ فرشہائے مخملی و قالین ابریشمی سے آراستہ تھے۔ وہاں آکر دربار کیا۔ مرزا کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ جہانگیر بچہ تھا۔ اُسے بھی بُلا کر ملایا۔ اور ہتیا پال دروازہ پر جہاں نقارخانہ تھا انہیں اتارا۔ ملا صاحب عجب شخص ہیں۔ یہاں بھی چٹکی لے گئے۔ فرماتے ہیں۔ ان دنوں میں تورۂ چنگیز خانی کو بھی زندہ کر دیا۔ مرزا کے دکھانے کو شیلان یعنے دستر خوانِ عام۔ دیوان خاص میں بچھتا تھا۔ اور بہ نسبت اور دِلوں کے زیادہ وفور و وسعت کے ساتھ ہوتا تھا۔ معمولی وقت پر نقیب جاتے تھے۔ اور وہی چنگیزی تورہ پر سپاہیوں کو جمع کر کے لاتے تھے۔ کہ شیلان ترکانہ پر چلکر کھاؤ مرزا گئے۔ تورہ بھی گیا۔

اکبر کا ارادہ تھا۔ کہ فوج دے کر اُسے بھیجے۔ اور ملک پر قبضہ دلوا دے۔ اور حقیقت میں یہ مدد چند در چند مصلحتوں کی بنیاد تھی۔ خان جہاں حسین قلی خاں اس مہم کے لئے مقرر ہو چکا تھا۔ اسی عرصہ میں ملک بنگالہ سے بغاوت کی عرضیاں پہنچیں۔ اکبر نے مرزا سلیمان سے کہا۔ کہ تم بنگالہ کو اپنا بدخشاں سمجھو۔ اور جا کر بندوبست کرو۔ مرزا نے انکار کیا۔ اکبر نے اس خدمت پر خان جہاں کو بھیج دیا۔ مرزا کو اپنی تمنا میں دیر یا مایوسی نظر آئی۔ اس لئے رخصت ہو کر حج کو چلا گیا۔ اکبر نے پچاس ہزار روپیہ خزانہ سے دیا۔ اور بیس ہزار کا فرمان خزانہ گجرات پر لکھ دیا۔

۹۸۴ھ میں مرزا سلیمان حج کر کے ایران میں آئے۔ اور شاہ اسمٰعیل ثانی سے کمک کی التجا کی۔ شاہ نے بڑی عزت سے رکھا۔ اور چند روز کے بعد۔ فوج قزلباش ہمراہ کر کے روانہ کیا۔ یہ ہرات میں آئے تھے۔ کہ شاہ اسمعیل کا انتقال ہو گیا۔ منصوبہ بگڑ گیا۔ یہ مایوس ہو کر قندھار میں آئے۔ مظفر حسین مرزا شہزادہ ایرانی وہاں کا حاکم تھا۔ اُسے نسبت قرابت پیدا کی۔ مگر کام نہ نکلا۔ کابل میں آئے مرزا حکیم سے مل کر چاہا۔ کہ ہندوستان جائیں۔ اور پنجاب میں طوفان اٹھائیں۔ مرزا حکیم شامل نہ ہوا۔ مگر فوج ساتھ لے کر بدخشاں پر گیا۔ مرزا شاہرخ مقابلہ پر آیا۔ بہت سے بدخشی بدنیت پوتے کو چھوڑ کر دادا کی طرف چلے آئے۔ شاہرخ اوروں سے بھی بدگمان ہو گیا۔ اور کولاب کو چلا گیا۔ بہت سی قیل و قال کے بعد دادا پوتے میں ملک تقسیم ہو گیا۔ مگر چند ہی روز میں پھر بگاڑ ہوا۔ اور یہ جھگڑے برابر جاری تھے۔ دادا

اطراف سے مدد لیتے تھے۔ اور کبھی کام کبھی ناکام سرگرداں ہوتے تھے۔ اسی حالت میں حرم بیگم
مرگئی۔ جب تک وہ زندہ تھی۔ بگڑی بات بناتی تھی۔ اس کے بعد مرزا شاہرخ کی جوانی
نے اسے زیادہ خود بین کر دیا۔ آخر بڈھے سلیمان تنگ ہو کر بخارا گئے۔ کہ عبداللہ خاں
اُزبک کے زور سے پوتے کو گوشمالی دیں۔ وہ تاشقند پر فوج لے کر گیا تھا۔ سکندر خاں اس کے
باپ سے ملاقات ہوئی۔ اور صورت حال اچھی نظر آئی۔ باپ نے بیٹے کو روئداد لکھی۔ وہ
بھی ایک عجوبہ روزگار تھا۔ جواب میں لکھا کہ انہیں میرے آنے تک انتظار کرنا چاہئے۔ مگر
خفیہ لکھا۔ کہ قید کر لو۔ مرزا کو بھی خبر ہو گئی۔ یہ جس طرح دوڑ کر گئے تھے۔ اسی طرح بھاگ کر
اُلٹے پھرے۔ اور حصار میں آ کر دم لیا۔ اور اپنے بندوبست سوچنے لگے۔ عبداللہ خاں تاشقند
سے آئے۔ مرزا کا حال معلوم کیا۔ حاکم حصار کو لکھا۔ کہ انہیں قید کر کے روانہ کرو۔ وہ اُن کے ساتھ
رسم مروت کام میں لایا۔ یہ وہاں سے بھی بھاگے۔ عبداللہ خاں نے بدخشاں کی خبر لی۔ تو دیکھا کہ
دستر خوان تیار ہے۔ اور کوئی مزاحم نہیں۔ فوراً قبضہ کر لیا۔ دادا پوتے جہاں جہاں تھے۔ جانیں
لے کر کابل کی طرف بھاگے۔ رستہ میں ملاقاتیں ہوئیں۔ جس لقمہ پر جھگڑتے تھے۔ وہ لقمہ ہی نہ
رہا۔ اب جھگڑا کیا تھا۔ دونو مل کر صلاحیں کرتے تھے۔ اور کچھ بن نہ آتی تھی۔ مرزا حکیم نے اسوقت
بڑی انسانیت کی۔ کہ ایلچی بھیجا۔ بعض اشیائے ضروری بھیجیں اور بلا بھیجا۔ مرزا سلیمان نے حج
کرکے اس سے راہ نکال لی تھی۔ اور دربار اکبری سے شرمساری بھی تھی۔ وہ کابل کو چلے گئے
شاہرخ سے انہیں کی بدولت چند روز پہلے بگاڑ ہوا تھا۔ وہ دربار اکبری کا راستہ ڈھونڈنے
لگے۔ مرزا حکیم نے بڈھے مہمان کو لمغانات کے علاقے میں چند گاؤں دئے۔ یہ چند روز وہاں
بیٹھے۔ مگر بیٹھا کب جاتا تھا۔ پھر اُس سے مدد لی اور ترک و افغان سے ایک جمعیت بنا کر
اُزبک سے دست و گریبان ہوئے۔ کئی معرکے کئے۔ کبھی غالب ہوئے۔ کبھی مغلوب۔ آخر
مایوس ہو کر پھر کابل میں آئے۔ یہاں حکیم مرزا مر چکا تھا۔ مان سنگھ موجود تھے۔ انہوں نے
بڑی عزت و احترام سے مہمانداری کی۔ اور دربار کو روانہ کر دیا۔ یہاں پرانے سرے سے
استقبال کی دھوم دھام ہوئی۔ شہزادہ مراد لینے گئے۔ جاگیر و وظیفہ مقرر ہو گیا۔ آخر ۷۷ برس
کی عمر سنہ ۹۹۷ھ میں لاہور سے ملک عدم کو کوچ کر گئے۔ بخششی ان کی وفات کی تاریخ تھی۔ کہ
ترکی میں بمعنی خوب ہے۔

مرزا شاہرخ | مرزا سلیمان کی بی بی حرم بیگم کا حال مجملاً کہیں کہیں آیا ہے۔ کہ ولی نعمت بیگم

کہلاتی تھی۔ اور حق یہ ہے۔ کہ وہ مردانی بی بی دیو کی طرح سلیمان کو دبائے رکھتی تھی۔ خاوند برائے نام حاکم تھا۔ حکومت اس سینہ زور بی بی کے ہاتھ میں تھی جس طرح چاہتی تھی حکم کرتی تھی۔ تمام امرا اور سرداروں کو اُس کی گردن کشی اور خود رائی نے جان سے تنگ کر دیا تھا۔ آخر ان لوگوں کی دعائیں قبول ہوئیں۔ اور اس مرد مار بیگم پر آسمان سے نحوست نازل ہوئی ✦

شاہ محمد سلطان کاشغری کی بیٹی محترمہ خانم کامران کے عقد میں تھی۔ اور کابل میں رہتی تھی۔ وہ کامران کی خانہ بربادی کے سبب سے کاشغر کو چلی۔ بدخشاں سے اس کا گذر ہوا۔ قرابت خاندانی کے سبب سے یہاں ٹھیری۔ ع

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

مرزا سلیمان کا ارادہ ہوا کہ اُس سے نکاح کرے۔ بڑھیا بیگم کو کسی طرح پتہ لگ گیا۔ وہ کب دیکھ سکتی تھی۔ کہ ایسی خاندانی شہزادی اُس پر سوکن ہو کر بیٹھے۔ اندر ہی اندر ایچ پیچ کھیل کر اپنے نوجوان بیٹے مرزا ابراہیم کو اُکسایا۔ اس نے محترمہ بیگم سے نکاح کر لیا۔ سلیمان بڈھے منہ دیکھتے رہ گئے۔ پری ہاتھ نہ آئی۔ خانم کو پیچھے معلوم ہوا۔ کہ میں ملکہ زمانی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بہت ملال ہوا۔ اور بیگم اور خانم کے دلوں میں گرہ پڑ گئی ✦

بیگم کے کلہ توڑ حکموں سے امرائے بدخشاں کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ اور ہمیشہ تاک میں رہتے تھے۔ مرزا حیدر علی ایک شخص بیگم کی سرکار میں مختار تھا۔ اور وہ اسے بھائی کہتی تھی۔ ان دنوں میں سب نے موقع پا کر بیگم کے دامن میں تہمت کی خاک ڈالی۔ اس بات کا چرچا مرزا ابراہیم تک پہنچا۔ نوجوان۔ ناتجربہ کار۔ نہ سوچا نہ سمجھا۔ مرزا کو مار ڈالا۔ بیگم بڑی دانا و دوراندیش تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ مگر امرا کے پیچھے پڑی۔ لوگوں کے دلوں میں پہلے بیگم کی طرف سے بیزاری تھی۔ اب نظروں میں بے عزتی بھی ہو گئی ✦

سنہ ۹۶۸ھ میں ازبک کے خوانین نے جیحوں اُتر کر بلخ اور ختلان تک قبضہ کر لیا تھا۔ اور بدخشاں کی حدود پر ہاتھ مارتے تھے۔ مرزا بھی اُنہیں کلہ شکن جواب دیتے تھے۔ انہی دنوں میں پیر محمد خاں اپنے لشکر لے کر آیا۔ باپ بیٹے فوجیں لے کر سامنے ہوئے۔ مرزا سلیمان تو پہلو بچا کر نکل آیا۔ مرزا ابراہیم لڑ مرا۔ اور گرفتار ہو کر ازبک کی قید میں مارا گیا۔ بیگم کو بڑا رنج ہوا۔ لباس ماتم پہنا۔ اور ایسا غم کیا۔ کہ جب تک جیتی رہی۔ سوگ کے کپڑے نہ اتارے۔ مگر اُس کا زور حکومت ٹوٹ گیا ✦

مرزا ابراہیم نے ایک شیر خوار بچہ محترمہ خانم کے شکم سے چھوڑا۔ اُس کا نام شاہرخ تھا
بیگم ہمیشہ خانم کو طعنہ دیا کرتی۔ کہ اس بدشگون نحس نے گھر ویران کر دیا۔ اور رنگ برنگ سے
دل آزاری کرتی تھی۔ مطلب یہ تھا۔ کہ وہ تنگ ہو کر کاشغر چلی جائے۔ شاہرخ کو میں پالوں۔
اور اُس کی حکومت میں حکم حاصل کروں خانم سنتی تھی۔ اور صبر کرتی تھی۔ اسی حال میں شاہرخ
بڑا ہوا۔ خوانین دربار بیگم سے اور اُس کی بدولت مرزا سلیمان سے ناراض تو پہلے ہی تھے۔
اب مرزا شاہرخ بڑا ہوا۔ تو اُسے زیادہ بڑھانے لگے۔ رفتہ رفتہ دادا کو پوتے سے برگشتہ
کر کے تخت سلیمانی پر بٹھانا چاہا۔ بہت سی ردّو بدل کے بعد یہ قرار پایا۔ کہ جو علاقہ اس کے
باپ کو دیا ہوا تھا۔ وہ اس کو ملنا چاہئے۔ یہ بھی ہو گیا۔ مگر مختلف مقدموں پر بگاڑ کی چقماق
چھلکتی رہتی تھی۔ اور بیگم اور خانم کے بگاڑ اس پر رنجک اُڑاتے تھے۔ اسی عرصہ میں حرم بیگم مر گئی
اور اب سلیمان کی بالکل ہوا بگڑ گئی۔ ناچار حج بیت اللہ کا بہانہ کیا۔ اور سلطنت پوتے
کو دے کر کابل میں آیا۔ کہ مرزا حکیم سے مدد لے کر مفسدوں سے ملک سلیمان کو پاک کرے
وہاں وہ پیش آیا۔ جو تم نے سُن لیا۔ اور انجام یہ ہوا کہ گھر برباد ہو گیا۔ اور بدخشاں جیسا ملک
عبداللہ خاں اذبک نے مفت مار لیا +

جب سے مرزا سلیمان ہندوستان کی طرف آئے تھے۔ مرزا شاہرخ اور اُن کی والدہ
اکبر کو عرائض و تحائف بھیج کر عقیدت کا رشتہ جوڑتے تھے۔ جب اذبک نے خانہ ویران کر
کے نکالا۔ تو مرزا شاہرخ مدت تک کوہستان کابل میں سرگردان رہے۔ اور سخت آفتیں
اُٹھائیں۔ حسن، حسین اور بدیع الزمان مرزا تین بیٹے ساتھ تھے۔ حسن رستے میں بچھڑ گیا۔ مرزا کو
بڑا رنج ہوا۔ زمان مرزا بیٹا ان کا وطن کے کناروں پر اڑ بیٹھا۔ اور جب موقع پاتا تھا اذبک
کو پہلو مارتا تھا۔ یہ بھی موقع ڈھونڈتے تھے۔ ایک دو دفعہ ہمت کر کے گئے۔ مگر مایوس ہو
کر پھرے۔ اور پہلے سے زیادہ بدحالی اُٹھائی۔ لشکر تباہ ہوا۔ سامان لٹ گیا۔ پہاڑ میں مرزا
سلیمان کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ پوتے نے اپنا گھوڑا دیا۔ کہ اس پر سوار ہو۔ بڈھے بچارے
سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ گھوڑا بھاگ گیا۔ اسے ایک نوکر نے اپنے گھوڑے پر چڑھایا۔ مرزا شاہرخ
باوجودیکہ بہت موٹے تھے۔ مگر دوڑ کر گھوڑے کو پکڑا اور سوار ہو کر بھاگے۔ آخر دادا نے
ہندوستان کا رستہ بتا دیا تھا۔ ۹۹۳ھ میں انہوں نے بھی دربار اکبری کا رُخ کیا۔ چنانچہ جب
کنار اٹک پر پہنچے۔ تو راجہ مان سنگھ نے استقبال کیا۔ پانچ ہزار پانچ سو روپے نقد

ہزاروں کے نفائس اور تحائف۔ آٹھ گھوڑے۔ پانچ ہاتھی پیشکش کئے۔ اسی کی رسائی تدبیر سے بچھڑا ہوا بیٹا بھی آگیا۔ سب خدمتیں اور تجویزیں پسند اور مقبول ہوئیں۔ اکبر بھی بہت خوش ہوئے۔ جب لاہور سے راجہ بھگوان داس نے بیٹے سے زیادہ شوکت و حشمت دکھائی۔ مرزا سرہند تک پہنچ لئے۔ تو دربار سے فوراً قاضی علی بخشی کو استقبال کے لئے روانہ کیا۔ آگرہ کے پاس پہنچے۔ تو لاکھ روپیہ نقد۔ سامان فراشخانہ۔ تین ایرانی۔ نو ہندوستان کے گھوڑے۔ پانچ ہاتھی۔ چند قطاریں اونٹوں کی۔ کئی لونڈی غلام مرحمت ہوئے ✦

مرزا شاہرخ بڑا نیک نیت اور صاف دل مرزا تھا۔ اس کی طبیعت میں اپنی طرف سے کسی قسم کی ترقی یا عروج کی ہوس کبھی نہیں آئی۔ جو کچھ ملا لے لیا۔ جو حکم ملا۔ اُس کی تعمیل کرتا رہا۔ اکبر کو بھی اُس کی طرف سے نیک خیال اور نیک بھروسے تھے۔ ۱۰۰۱ھ میں اس سے شکرن بیگم بیٹی کی شادی کر دی پنج ہزاری منصب عنایت فرمایا۔ مالوہ کا ملک دیا۔ اور شہباز خان کمبو اتالیق بنا کر ساتھ کیا بات وہی ہے۔ کہ ڈرتا تھا۔ یہ بھی باغی نہ ہو جائے۔ ورنہ اتنے بڑے موٹے تازے جسمند جوان کے لئے اتالیق کی کیا حاجت ہے۔ تم جانتے ہو کہ بابر کو اُس کے اقربا نے خانہ برباد کیا۔ ہمایوں کا گھر بھائیوں نے ویران کیا۔ اکبر کو شہزادگان تیموری اور مرزا اشرف الدین وغیرہ نے تھوڑا دق نہیں کیا۔ اس لئے اکبر بلکہ سلاطین تیموریہ ہمیشہ رشتہ داروں سے ہشیار رہتے تھے۔ اسے مالوہ سمیت دکن میں جاگیر دی تھی۔ خانخاناں کے ساتھ سہیل خان کی لڑائی میں شامل تھا۔ ابوالفضل جب گئے۔ تو انہوں نے بھی مدد کو بلایا۔ دانیال کی لشکرکشی میں بھیجے گئے۔ سب کو خوش رکھا۔ اور آپ سب سے خوش رہا۔ آخیر عہد اکبری میں ہفت ہزاری منصب عطا ہوا۔ جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں اس کی خوش اطواری و سعادت مندی کی تعریف لکھی۔ لکھتا ہے کہ سیدھا سادہ ترک ہے۔ اور اس نے مجھے کبھی نہیں ستایا۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ اگرچہ حسینی سے زیادہ عالم میں کوئی بے حقیقت نہیں۔ مگر مرزا شاہرخ گویا بدخشی نہیں۔ بیس برس ہوئے۔ ہندوستان میں آیا ہے۔ زبان ہندی بالکل نہیں جانتا ✦

یاد رکھنا یہ وہی مرزا شاہرخ ہیں۔ جن کی بابت عبداللہ خان ازبک نے اکبر کو شکایت لکھی کہ مرزا شاہرخ ہم سے گستاخی و بےادبی کر کے گیا۔ اور تم نے اسے ایسے اعزاز و احترام کے ساتھ رکھ لیا۔ پھر اس کے جواب میں اکبر کی طرف سے ابوالفضل نے طبع آزمائی کی ہے ✦

مرزا نے ۱۰۱۶ھ میں اجین میں قضا کی اور شہر کے باہر دفن ہوئے۔ کابلی بیگم مرزا حکیم

کی ایک بیٹی ان سے بیاہی تھی۔ وہ ہڈیاں لے کر مدینہ منورہ کو گئے۔ بدوؤں نے رستہ بند کر رکھا تھا آپ بصرہ سے ایران کو روانہ ہو گئے۔ جنازہ اُدھر بھیج دیا ٭

میر عبداللطیف قزوینی

(مُلا صاحب لکھتے ہیں) اعاظم سادات حسینی سیفی میں سے تھے۔ اُن کا خاندان آبا و اجداد سے تاریخی مشہور چلا آتا ہے۔ والد اُن کے قاضی میر یحییٰ بن یحییٰ ابن معصوم کہلاتے تھے۔ حیرتی شاعر نے ایک مثنوی میں اُن کی بھی مدح کی ہے۔ اور تاریخ دانی کے وصف کا اشارہ کیا ہے ؎

قصۂ تاریخ از و باید شنید	کس دریں تاریخ مثل او ندید

میر علاء الدولہ صاحبِ تذکرہ ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ میر عبداللطیف مرحوم نے اُنہیں باپ کی طرح کنارِ شفقت میں پالا تھا۔ اور میر علاء الدولہ انہیں حضرت آقا کہا کرتے تھے۔ قزوین کے لوگ شاہ طہماسپ کی اطاعت نہ کرتے تھے۔ لوگوں نے عرض کی۔ کہ یہ سرکشی اُن کی میر عبداللطیف کی پشت گرمی سے ہے۔ کہ اُن کا مذہب سنت و جماعت ہے شاہ نے ان پر سختی کی مختصر یہ کہ میر عبداللطیف وہاں سے بھاگ کر گیلانات کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ انہی دنوں میں ہمایوں بھی ایران میں پہنچا۔ کسی مقام پر اُن کی ملاقات ہو گئی تھی۔ اور وعدہ ہوا تھا۔ کہ اگر اقبال نے مدد کی تو ہم پھر ہندوستان میں پہنچے۔ تو تم بھی آنا۔ چنانچہ حسب وعدہ ۹۶۳ھ میں یہاں پہنچے کہ اکبر اسی برس تخت نشین ہوا۔ میر موصوف دربار بلکہ خاص و عام میں معزز و محترم رہے۔ ۵ رجب ۹۸۱ھ کو فتح پور سیکری میں دنیا سے انتقال کیا۔ اور قلعہ اجمیر میں سید حسین جنگ سلوار کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ قاسم ارسلان نے تاریخ کہی فخرِ آلِ یٰسین۔ تمام عالم کے علماء اور بزرگان دین میں سے پانچ چار شخص ہیں۔ جو مُلا صاحب کی زبانِ قلم سے الفاظ تعریف کے ساتھ کامیاب ہوتے ہیں۔ اُن میں سے میر موصوف اور ان کے بیٹے ہیں ٭

ابوالفضل کی کیا تعریف کروں۔ ہر معاملہ میں ایک نئی بات نکالتے ہیں۔ اور ایک بات میں ہزار باتیں ملفوف ہوتی ہیں۔ اکبرنامہ میں ان کے آنے کا حال لکھتے ہیں۔ میر اقسامِ علوم اور فضل و کمال۔ اور لطف کلام اور ملائمتِ قلب اور شرائف صفات میں اہل زمانہ میں سے نہایت ممتاز تھے۔ تعصب سے پاک تھے۔ سینہ کھُلا ہوا تھا۔ اس لئے ایران میں تسنن اور ہندوستان میں تشیع سے نامزد تھے۔ بات یہ ہے۔ کہ صلح کل کے امن خانہ کے رہنے والے تھے۔

اس لئے پرجوش متعصب بدنام کرتے تھے۔

میرزا غیاث الدین علی ۔ اُن کے بیٹے بھی ساتھ آئے تھے۔ چنانچہ وہ۔ ملا صاحب فیضی۔ ابوالفضل سب ہم سبق تھے۔ کہ شیخ مبارک کے دامنِ تعلیم سے علم کے ساتھ اقبال کی نعمت لے کر اُٹھے تھے۔ ملّا صاحب اس کے باب میں کہتے ہیں۔ اُن کا فرزند رشید کہ ملائک کے اخلاق اس کا ملکہ ہیں۔ حمیدہ اطوار ہے۔ اور مظہر اس حدیث کا ہے۔ کہ اَلْوَلَدُ الْحُرُّ بِآبَائِهِ الْغُرِّ شریف بیٹا اپنے روشن بزرگوں کا پیرو ہوتا ہے۔ میر غیاث الدین ملقب بہ نقیب خاں علم سیر۔ تاریخ۔ اسماء الرجال۔ اور عام حالاتِ سلاطین و ملوک و امرا و اہل کمال میں ایک آیت ہے۔ آیات روزگار سے اور ایک برکت ہے۔ برکاتِ زمانہ سے۔ اور لوح محفوظ کی نقل ثانی ہے۔ بادشاہ کی ملازمت میں دن رات۔ تاریخ اور عام نظم و نثر سناتا ہے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں۔ اُن کا فرزند رشید نجیب سعادت مند مرزا غیاث الدین علی آخوند۔ فرشتوں کے اخلاق سے آراستہ کمالات علمی سے پیراستہ علم سیر۔ تاریخ۔ اسماء الرجال میں اُس کا ثانی نہ عرب میں بتاتے ہیں۔ نہ عجم میں۔ فقیر کو کل مقربانِ شاہی میں اُس کے ساتھ نسبت خاص ہے۔ اور لڑکپن سے ہم عہدی۔ اور ہم درسی اور ہم سبقی۔ اور برادری ایمانی کا عقد ہے۔ اب وہ بڑی عرق ریزی سے بادشاہ کی خدمت میں مصروف ہے۔ تیس برس سے زیادہ ہوئے۔ کہ خلوۃ اور جلوۃ میں قصصّ۔ حکائتیں فارسی و ہندی افسانے کہ (ان دلوں میں ترجمہ ہوئے ہوئے ہیں) سنایا کرتا ہے۔ گویا بادشاہ کی زندگی کا جز ہو گیا ہے۔ ایک پل جدائی ممکن نہیں۔ آج کل ذرا بخار اُس کے جسم مبارک کو عارض ہے۔ درگاہ الہٰی سے اُمید ہے۔ کہ جلد صحت کامل اور شفائے عاجل حاصل ہو۔ چونکہ نیک سب جگہ عزیز ہیں۔ خدا اُسے سلامت رکھے۔ بداِن زمانہ کو دعا کی کیا ضرورت ہے۔ اُس کی بدی ہی اپنا کام کر جائے گی اِس زمان پر حیف ہے۔ جو اس قوم بے نشان کے نام سے آلودہ ہو۔ (فیضی اور ابو الفضل بچا سے مراد ہو نگے) آزاد ۔ ۹۸۹ھ میں جبکہ بادشاہ۔ محمد حکیم مرزا کی مہم پر کابل جاتے تھے۔ کتاب خوانی کے جلسے تو ہر وقت گرم رہتے تھے۔ میر موصوف نے اٹک اُتر کر ایک حال کی تحقیق بہت خوبی سے ادا کی۔ اکبر نے نقیب خاں خطاب دیا۔ اور خلعت فاخرہ۔ خاصہ کا گھوڑا ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔

نقیب خاں کے باب میں جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے حالات میں لکھا ہے۔

اسے میں نے ہزار و پانصدی منصب عطا کیا۔ میرے والد نے نقیب خاں کے خطاب سے ممتاز کیا تھا۔ اور ان کی خدمت میں مقرب اور صاحب منزلت تھا۔ ابتدائے جلوس میں اِس سے ابتدائی کتابوں کے سبق پڑھے تھے۔ اس لئے آخوند کہا کرتے تھے علم تاریخ اسماء الرجال یعنی وہ حالات اور معلومات جن سے اشخاص کے باعتبار بے اعتبار ہونے کی تحقیق و تصحیح ہو۔ ان امور میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ آج ایسا مورخ معمورۂ عالم میں نہیں۔ دُنیا بھر کا آج تک حال زبان پر ہے۔ ایسا حافظہ کسی کو خدا ہی دے +

سنہ ۱۰۲۳ھ میں جہانگیر نے لکھا ہے۔ نقیب خاں رحمت الٰہی میں داخل ہوئے۔ دو مہینے پہلے بارہ دن کے بخار میں بی بی مر گئی تھی۔ اُس سے نہایت محبت تھی۔ میر عبداللطیف اُنکا باپ بھی اجمیر میں مدفون ہے۔ میں نے کہا کہ انہیں بی بی کے پہلو میں رکھیں۔ کہ خواجۂ بزرگوار کے روضہ میں مدفون تھی +

نقابت۔ ملک عرب میں بڑا معزز رتبہ اور قومی عہدہ تھا۔ ظاہر ہے کہ عہد قدیم میں وہاں تحریر نہ تھی۔ اس واسطے حالات سلف کا رستہ بھی ریگستان بے نشان تھا۔ اور تاریخی حالات کی تدوین بھی نہ ہوئی تھی۔ جو کچھ تھا زبان بہ زبان۔ سینہ بہ سینہ۔ بزرگوں اور کہن سال لوگوں میں چلا آتا ہے۔ جو شریف و نجیب قبیلہ کے ہوتے تھے۔ وہ اپنے اکثر قبیلوں کے جزی و کل حالات سے بلکہ اُن کے آباؤ اجداد سے۔ اور گھر گھر کے معاملات سے۔ اور ان کے سلسلہ ہائے خاندان سے واقف ہوتے تھے۔ ان میں سے جس شخص کو ان معلومات میں مہارت کامل ہوتی تھی۔ اور صادق القول۔ نیک نیت۔ نیک اعمال صاحب دیانت و امانت۔ فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔ اُسے سب کی اتفاق رائے سے **نقابت** کا منصب ملتا تھا۔ جس دن یہ عہدہ اُسے ملتا۔ بہت سے قبیلے جمع ہوتے تھے۔ وہ سب کو ضیافت دیتا تھا۔ شادمانی کے نشان ظاہر کرتا تھا۔ سب اُس کو مبارکباد دیتے تھے۔ اور منصب مذکور پر منصوب کرتے تھے۔ یہ امر اس کے اور اُس کے خاندان کے لئے فخر و اعزاز کا موجب ہوتا تھا۔ جب کوئی اختلاف ہوتا تو سب اُس کی طرف رجوع کرتے۔ جو وہ کہتا تھا۔ اسے سب تسلیم کرتے تھے۔ انہی تاریخی معلومات کے سبب سے کہ ان کے خاندان میں تاریخ دانی چلی آتی تھی۔ اور انہیں بذات خود بھی یہ فضیلت حاصل تھی۔ اکبر نے انہیں **نقیب خاں** خطاب دیا تھا +

نظام الدین احمد بخشی صاحب طبقات اکبری

جن دو تین شخصوں سے ملا عبدالقادر بداؤنی خوش ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہیں۔ اکثر مصنف ان کی تاریخ کی تعریف کرتے ہیں اس لئے ان کا ابتدائی حال ماثرالامرا سے لکھتا ہوں۔ خواجہ مقیم ہروی ان کے باپ ۔ بابری خدمتگذاروں میں تھے۔ اخیر میں دیوان بیوتات ہو گئے تھے۔ بابر کے بعد مرزا عسکری کے پاس رہے جب ہمایوں نے احمد نگر مرزا کو دیا تو خواجہ اس کے وزیر ہو گئے۔ ہمایوں نے جب جوساہ کے کنارے شیر شاہ سے شکست کھائی۔ اور چند سواروں کے ساتھ آگرہ کو بھاگا تو یہ ہمرکاب تھے۔ اکبر کے عہد میں چند سال خدمت کر کے دربار عدم میں منتقل ہو گئے۔

نظام الدین احمد راستی و درستی اور معاملہ فہمی و کاردانی میں رشتہ عالی رکھتے تھے۔ اور رفاقت پرستی اور صفائی و آشنائی میں یگانہ زمانہ تھے۔ ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ ابتدا میں اکبر کے دیوان رہے۔ یہ کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ البتہ جب ۹۹۱ھ میں اعتماد خاں گجراتی کو صوبہ گجرات عنایت ہوا۔ تو اس صوبہ کی بخشی گری ان کے نام کر کے ساتھ کر دیا تھا وہاں باوجود جوانی کے ایسی جانفشانی اور سرگرمی سے خدمتیں کیں۔ کہ بڈھے بڈھے سردار دیکھتے رہ گئے۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں کی سپہ سالاری کو ان کی جرأت اور جانبازیوں نے بڑی قوت دی۔ اور وہاں بخشی گری مدت تک زیر قلم رہی۔ جب خان خاناں کو صوبہ جونپور عنایت ہوا۔ تو اُنہیں بھی بلا لیا۔ طلب موقع ضرورت پر تھی۔ اس لئے بارہ دن میں چھ سو کوس رستہ مار کر لاہور میں آحاضر ہوئے۔ ۳۰ سنہ جشن جلوس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حضور میں عرض ہوئی کہ خواجہ اور جماعت کثیر ان کے ہمراہی سب شتر سوار آئے ہیں ۔ عالم قابل تماشا ہے۔ حکم ہوا کہ اسی طرح سوار سامنے حاضر ہوں۔ بادشاہ دیکھ کر خوش ہوئے۔ خواجہ بعد اس کے حاضر خدمت رہے۔ اور ترقی روز بروز قدم بڑھانے لگی۔ ۳۷ سنہ جلوس میں آصف خاں مرزا جعفر جلالہ روشنائی کی مہم پر چلے۔ تو خواجہ میر بخشی لشکر ہوئے۔ ۴۵ برس کی عمر ۱۰۰۳ھ میں تپ محرقہ سے مرگئے۔ اجزائے حالات جو ماثر میں مختصر تھے۔ میں نے مختلف مقاموں میں تاریخوں سے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

طبقات اکبری:۔ عمدہ تاریخ ہے۔ ۱۰۰۲ھ تک اکبر کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ مفصل نہیں مگر مختصر بھی نہیں۔ عبارت صاف۔ بے تکلف۔ بے مبالغہ۔ حالات کی تحقیق۔ احوالات کی تنقیح۔

اخبار کے فراہم کرنے میں بڑی کوشش اور دقت اُٹھانی پڑی۔ اور چونکہ میر معصوم بھکری وغیرہ باخبر اور معتبر اشخاص شریک تالیف تھے۔ اس لئے معتبر مانی جاتی ہے۔ یہی پہلی تاریخ ہے۔ کہ جو جو بادشاہ مختلف ممالک ہند میں ہوئے۔ ابتدا سے عہد تصنیف تک سب کے حال پر حاوی ہے۔ محمد قاسم فرشتہ اور ان کے بعد جو مورخ آئے اور اس سے زیادہ لکھ گئے۔ اصل سب کی یہی ہے۔ خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ اگر عمر نے رفاقت کی تو آئندہ کے حالات بھی ترتیب دے کر ضمیمہ لگاؤں گا۔ نہیں تو جسے توفیق ہوگی لکھیگا۔

ہیمو بقال

تمام مورخ ہیمو کے حال کو سُبک الفاظ اور سخت عبارتوں میں ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کی لیاقت اور ترقی کی رفتار میں قلم کو کھینچ کر تعریف کے میدان میں لاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ریواڑی کا غریب بنیا قوم کا ڈھوسر تھا۔ (جیسے ابوالفضل نے لکھا ہے۔ کہ بنیوں میں ایک رذیل فرقہ ہے) عام اہل تاریخ لکھتے ہیں۔ کہ وہ گلیوں اور بازاروں میں لونوں (لونوں) کا کتا پھرتا تھا۔ یہ بھی درست ہے۔ کہ وہ بدن کا حقیر۔ صورت کا کم رُو۔ آنکھ سے بھینگا یا کانڑا تھا۔ لیکن اس کے چست انتظام۔ برجستہ تدبیریں۔ اور جنگی فتوحات کو کون چھپا سکتا ہے۔

ہندوستان میں جو مورخ ہوئے چغتائی نمک خوار تھے۔ اس لئے اُن کے لکھنے پر پورا اعتبار نہیں۔ اس کے اوصاف کی باتیں اور فتوحات کی حکایتیں ضرور سیاہی کے پردہ میں رہیں۔ اور برائیوں نے حرف بحرف روشنائی کا لباس اپنا ہوگا۔ مورخان مذکور کا یہ اعتراض درست ہے۔ کہ اس ذات وصفات پر اس نے اکبر کے منہ پر تلوار کھینچی۔ جس کے سرپر سات پشت سے سلطنت کے نشان جھومتے تھے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ سلطنت کسی کی میراث نہیں۔ اگر دو تین پشت بھی سلطنت اس کے خاندان میں رہ جاتی تو ہم دکھا دیتے کہ آزاد جیسے کتنے خوشامدی مورخ پیدا ہو جاتے۔ وہ اس کے کارناموں اور انتظاموں کو کہیں سے کہیں پہنچاتے۔ اور خاندان کے پست سلسلہ کو اوتار وں سے جا ملاتے

جن قدموں سے وہ ترقی کی سیڑھی چڑھا۔ قابل دیکھنے کے ہیں۔ قسمت کی زنجیر اس کے پاؤں کو گلی کوچوں سے کھینچ کر سلیم شاہ کے بازار لشکر میں لے گئی۔ رفتہ رفتہ وہاں دکان کھول لی۔ آدمی رسا تھا۔ بازار کا چودھری ہوگیا۔ سلیم شاہ باوجود جباری و قہاری کے کمینہ مزاج بھی لشدّت تھا۔ اور کم رتبہ لوگوں سے بہت گھل مل جاتا تھا۔ اُسے ہمزبانی کا موقع ملنے لگا۔

بادشاہ نے ہر کام میں اُس کی کارگزاری اور محنت دیکھ کر بازار لشکر کا کوتوال کر دیا۔چند روز میں مقدمات فوجداری بھی اس کے حوالے ہو گئے۔ نمک حلال بالیاقت نے اور زیادہ ہمت اور محنت دکھائی۔ بادشاہ سرشور افغانوں سے بیزار تھا۔ اور ان کا توڑنا مدنظر رکھتا تھا۔ اُسے کام کا بوجھ سہارتا دیکھتا تھا۔ اس لئے خدمتیں دیتا۔ اور منصب بڑھاتا جاتا تھا۔ غرض اپنی خدمت گذاری یا آقا کی خیر خواہی و خدمت گزاری۔ خواہ اوروں کی چغل خوری۔ کچھ ہی سمجھو وُہ روز بروز کار دار۔ صاحب اعتبار ہوتا گیا۔ اور جو اُمرائے عالی وقار کے کام تھے۔ وُہ اسے ملتے گئے۔ انتہا ہے کہ جب ہمایوں ایران سے کابل میں آ گیا۔ اور کامران بھاگ کر ادھر آیا۔ تو دربار سلیم شاہی سے لالہ ہیمو رائے اُس کے لینے کو گئے۔ یہ بات کامران کو ناگوار بھی گزری مگر کیا ہو سکتا تھا۔

سلیم شاہ کے بعد **محمد عدلی** بادشاہ ہُوا۔ وُہ عیش اور بے خبری کو لُطف زندگی سمجھتا تھا۔

لطیفہ۔ ہندوستان کے لوگ عجب آفت ہیں۔ **عادل شاہ** کو عدلی اور عدلی کو **اندھلی** کہتے تھے۔ اُس نے ہیمو کو **بسنت رائے** بنایا۔ اور اُس کے اختیاروں کو اور بھی مطلق العنان کر دیا۔ یہاں تک کہ وزیر اور وکیل مطلق ہو گیا۔ ہیمو نے بھی باوجودیکہ ایک بے علم بے حقیقت بنیا تھا۔ مگر لیاقت اور تدبیر کے ساتھ وہ دلاوری دکھائی کہ جس کی امید نہ تھی۔ چنانچہ جب کرانی سردار دربار سے کنارہ کش ہو کر بنگالہ میں جا بیٹھے۔ تو عدلی خود فوج لے کر چنار پر گیا۔ طرفین نے کنارہ دریا پر لشکر ڈالا۔ اور مقابل آن پڑے۔ ہیمو نے ایک دن کہا۔ کہ اگر ایک حلقہ ہاتھیوں کا اور فوج مناسب مجھے مل جائے۔ تو کرانیوں کے دھوئیں اُڑا دوں۔ عدلی نے سب سامان دیا۔ اور ہیمو نے ان کے انبوہ کو تہ و بالا کر دیا۔ ابراہیم سور کہ عدلی کی بہن اُس سے منسوب تھی۔ اور صاحب فوج و علم امیر تھا۔ عدلی نے چاہا کہ اُسے گرفتار کرلے۔ عدلی کی بہن نے ابراہیم کو کہ اُس کا شوہر تھا۔ خبر دی کہ میرا بھائی یہ ارادہ رکھتا ہے۔ وُہ چنار سے بھاگا۔ اور آگرہ وغیرہ مار کر میانہ ولایت کو دبا کر نشان بادشاہی علم کیا۔ عدلی نے ہیمو کو فوج جرار اور ہاتھی بے شمار دے کر روانہ کیا۔ ابراہیم نے بڑی پامردی سے کالپی پر مقابلہ کیا۔ اور ایسا لڑا کہ شائد رستم ہوتا تو اتنا ہی کرتا۔ ہیمو نے اسے شکست دی۔ ابراہیم بیانہ کی طرف آیا۔ اور لشکر جنگی جمع کر کے تیار ہُوا۔ ہیمو پیچھے پیچھے آیا

ابراہیم نے دس کوس آگے بڑھ کر میدان کیا۔ یہاں بھی خوب رن پڑا۔ مگر قسمت سے کون جیت سکے۔ ہیمو نے شکست دے کر قلعہ بیانہ میں قلعہ بند رکھا۔ اور اطراف جوانب کو لوٹ مار دوڑ دھاڑ سے خاک در خاک کر دیا۔ اتنے میں عدلی کا فرمان پہنچا۔ کہ اسے بہت بھاری بلا کا سامنا ہے۔ محاصرہ اُٹھاؤ اور چلے آؤ۔ وہاں محمود کوڑیہ ایک افغان نامی کے ساتھ عدلی کا مقابلہ تھا۔ اور مقام چھرکٹہ پر کہ کالپی سے پندرہ کوس ہے۔ دونو لشکر آمنے سامنے پڑے تھے۔ کوڑیہ کے ساتھ افغانوں کی فوج آراستہ۔ ہاتھی دیو کوہسار اور سامان بیحد وحساب۔ حریفین کے اور اپنے بیچ میں دریائے جمن جاری بے فکر پڑا تھا۔ کہ ایک رات ہیمو دمدار تارہ کی طرح کہیں سے اُٹھا۔ اور بے خبر اُس پر جا پڑا۔ لطف یہ ہے کہ ہاتھیوں کے حلقے جمن پار اُترے۔ اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ہاتھ ہلانے کی مہلت نہ دی۔ افغانوں کا یہ عالم ہؤا۔ کہ سر کو پاؤں کا ہوش نہ جوتی کو پگڑی کا۔ بھاگے۔ ڈوبے قتل ہوئے اور کوڑیہ بچارا تو ایسا گیا کہ پھر پتہ ہی نہ لگا۔ ساتھ ہی اس کا بیٹا لشکر بے شمار جمع کر کے عدلی پر چڑھ آیا۔ اور میدان جنگ میں عدلی کو مار کر اپنے باپ کے پاس پہنچا دیا۔ اب ہیمو خود صاحب فوج و لشکر ہو گئے۔

چغتائی مؤرخ بنئے کی ذات کو غریب سمجھ کر جو چاہیں سو کہیں۔ مگر اسکے قواعدِ بندوبست درست۔ اور احکام ایسے چست ہو گئے تھے۔ کہ پتلی دال نے گوشت کو دبا لیا۔ افغانوں میں جو باہم کشاکشی اور بے انتظامی رہی۔ اُس میں وہ ایک جنگی اور با اقبال راجہ بن گیا۔ عدلی کی طرف سے لشکر جرّار لئے پھرتا تھا۔ کہیں دساوا مارتا تھا۔ کہیں محاصرہ کرتا تھا۔ اور قلعہ بند کر کے وہیں ڈیرے ڈال دیتا تھا۔ البتہ یہ قباحت ضرور ہوئی کہ بگڑے دل افغان اس کے احکام سے تنگ آ کر نہ فقط اُس سے بلکہ عدلی سے بھی بیزار ہو گئے۔

بنئے کی خوش اقبالی دیکھو۔ کہ ممالک مشرقی میں اس سال مینہ نہ برسا۔ عالم میں آفت پڑ گئی۔ دولت مند اپنے اپنے حال میں مبتلا ہو گئے۔ غریب غربا کنگال ہو کر ٹکڑے کے سہارے کو غنیمت سمجھنے لگے۔

اس سال کے حال میں ملّا صاحب کی عبارت پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دہلی آگرہ اور اطراف کے شہروں میں قیامت آ رہی تھی۔ اڑھائی روپیہ سیر مکئی کا نرخ تھا۔ اور وہ بھی ہاتھ نہ آتی تھی۔ بہتیرے اشراف دروازے بند کر کر کے بیٹھ رہے۔ دوسرے دن دس دس بیس بیس بلکہ زیادہ مردے گھر میں پڑے پائے۔ اور گاؤں اور جنگلوں میں تو کون دیکھتا تھا۔

کفن کون دے۔ اور دفن کون کرے۔ غریب بیچارے آفت کے مارے جنگل سنسان میں بناسپتی سے گذارے کرتے تھے۔ امیر گائے بھینس کاٹ کر بیچتے تھے۔ اور لوگ کھالیں لے لیتے تھے۔ کاٹتے تھے۔ اور غنیمت سمجھ کر پکا کھاتے تھے۔ چند روز بعد ہاتھ پاؤں سوج کر مر جاتے تھے۔ آدمی آدمی کو کھائے جاتا تھا۔ اور صورتیں ایسی ڈراونی ہوگئی تھیں کہ اُن کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ نان نان کہتے تھے۔ اور جان دیتے تھے۔ جان عزیز جَو کا مول نہ تھی۔ جہاں ویرانہ میں کوئی اکیلا دُکیلا آدمی مل جاتا تھا۔ جھٹ پٹ تکا بوٹی کاٹ کر کھا جاتے۔ الٰہی تیری امان الٰہی تیری امان۔ اس پر حاکموں کی لڑائیاں۔ ایک ایک افغان بادشاہی کا دعویدار۔ روز بادشاہ گردی۔ لوٹ مار۔ قتل۔ غارت۔ تاراج۔ وہ کال اور اس آفت کا قحط سال بھر خدا نہ دکھائے۔ ایسے وقت میں لشکر اور لشکر کا سامان بہم پہنچانا اس باتدبیر آدمی کو بہت آسان تھا۔ جو اپنے قبضہ میں بادشاہی ذخیرہ اور ملکی خزانہ رکھتا تھا۔ لوگ یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ آخر مرنا اوّل مرنا۔ بھوک کے مرنے سے ہمت کرنا تو اچھا ہی کام ہے۔ آؤ اسی کی نوکری کر لو ✦

ہیمو کی لیاقت اور حسن تدبیر اس حالت میں بھی ہزار تعریف کے قابل ہے۔ کہ عالم میں یہ آفت آئی ہوئی تھی۔ اور اس کے لشکر میں گویا خبر بھی نہ تھی۔ ہزاروں جنگی ہاتھی تھے اور سب چاول اور گھی شکر کے ملیدے کھاتے تھے۔ سپاہیوں کا تو کیا کہنا ہے ✦

میرے دوستو! جب خدائی آفت آتی ہے۔ تو فوجیں باندھ باندھ کر دھاوے کرتی ہے۔ عدلی افغان تو آگرہ سے لشکر لے کر نکل گیا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا اور اپنے رقیبوں کو دباتا پھرتا تھا۔ قلعہ میں ایک افغان سردار آیا۔ کہ رسد اور سامان جنگ کے بندوبست کرے۔ مکانات میں جو اسباب بند پڑے تھے۔ ان کی موجودات لیتا تھا۔ اور سنبھالتا۔ ایک دن صبح کا وقت۔ چراغ لئے حجروں کو دیکھتا پھرتا تھا۔ کہیں چراغ کا گل جھڑ پڑا۔ کوٹھے بارود کے تھے۔ یا پہلے ان میں بارود رہ چکی تھی۔ نہیں نہیں! موت نے قتل عام کی سرنگ لگا رکھی تھی۔ پل کے پل میں آدھا قلعہ ایک بُقعہ آگ کا ہو کر آسمان کو پہنچا۔ زمین پر وہ بھونچال آیا کہ شہر تہ و بالا ہو گیا۔ صبح کے سونے والے بیخبر پڑے سوتے تھے۔ کلمہ پڑھتے اُٹھ بیٹھے۔ کہ قیامت آئی۔ توبہ واستغفار کرتے تھے۔ اور کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ کیا ہوا۔ اور کیا کیا نہ ہوا۔ پتھروں کی سلیں۔ ستون۔ محرابیں اُڑ اُڑ کر دریا پار کہیں کی کہیں جا پڑیں۔ ہزاروں

آدمی اور جانور اُڑ گئے۔ پانچ پانچ چھ چھ کوس پر کسی کا ہاتھ کسی کا پاؤں پڑا ہوا ملا۔ اس ہی کے مبارک قدم پنجاب سے ہندوستان میں پہنچے۔ جب یہ بلائیں دفع ہوئیں۔ تزکوں میں چنگیزی آئین چلا آتا تھا۔ دونو وقت بادشاہی دسترخوان بچھتا تھا۔ جو خوانِ یغما تھا۔ جس پر دوست دُشمن کی تمیز نہ تھی۔ امرا سے سپاہی تک سب اپنا بیت اور بھائی بندی کے دشتہ سے بٹھائے جاتے تھے۔ اور ہر ایک کو برابر کھانا کھلاتے تھے۔ شیر شاہ اگرچہ افغان تھا۔ لیکن چونکہ اُسے بھی قومی اتفاق کے خون کو جوش دے کر مطلب حاصل کرنا تھا۔ اس لئے اس طریقہ کو جاری رکھا تھا+

ہوشیار ہیمو ہندو دھرم تھا۔ خود مسلمانوں کی طرح امرا اور سپاہ کو دسترخوان پر لیکر نہ بیٹھ سکتا تھا۔ پھر بھی روز ایک وقت سب کو کھانا دیتا تھا۔ افغان سرداروں کو آپ دسترخوان پر بٹھاتا تھا۔ اُن کے دل بڑھاتا تھا۔ اور کہتا تھا خوب کھاؤ۔ بڑے بڑے نوالے اُٹھاؤ۔ کسی کو آہستہ آہستہ کھاتے دیکھتا۔ تو سینکڑوں بھوگ سناتا اور کہتا۔ عورتوں کی طرح نوالے اُٹھاتا ہے۔ بھڑوے کھانا نہ کھائیگا۔ تو اپنے جوائیوں سے کیونکر لڑیگا۔ مغل تو چڑھے آتے ہیں۔ واہ رے اقبال وہ جاہل سرشور افغان کہ سیدھی بات پر لڑ مریں۔ سب سُنتے تھے اور حلوے کی طرح نگل جاتے تھے۔ ہائے احتیاج اور ہائے پیٹ۔ ع

مراناں دہ و کفش بر سر بزن

افسوس ہیمو کی ذات کچھ ہی ہو۔ مگر اس کے کارنامے باآواز بلند نقارے بجاتے ہیں کہ وہ اپنی ذات سے عالی ہمت۔ حوصلہ والا۔ اور آقا کے لئے مستعد خدمت گزار اور چست خدمتگار تھا۔ بندوبست اور انتظام اور چستی و چالاکی اس کی طبیعت میں داخل تھی اور محبت اور عرقریزی سے دلی شوق رکھتا تھا۔ افسوس کہ اکبر اُس وقت لڑکپن کے عالم میں تھا اگر ہوش سنبھالا ہوتا تو ایسے شخص کو ہرگز اس طرح ہاتھ سے نہ کھوتا۔ اسے رکھتا اور دلاسے کے ساتھ کام لیتا۔ وہ جوہر نکالتا۔ اور عمدہ خدمتیں کر کے دکھاتا۔ جن سے ملک کو ترقی اور بنیادِ ملک کو استحکام حاصل ہوتا+

ہیمو کی ہمت کیوں ناکام رہی۔ بادشاہی لشکر کی کمی اور کم سامانی۔ اور اس کے مقابل میں ہیمو کے لشکر کی کثرت اور فراوانی دستگاہ پر نظر کر کے عنان زمان کی اس فتحیابی پر لوگ حیرت کی نظر سے دیکھیں گے۔ لیکن جن لوگوں نے تجربے اور تحقیق کی نگاہ سے زمانے کو پہچانا ہے وہ

صورت حال کی نبض دیکھ کر استقبال کی کیفیت کو سمجھ جاتے ہیں۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ہیمو باوجود ساری باتوں کے ان کے بڑے نکتے سے غافل تھا۔ اسے سمجھنا چاہیئے تھا۔ کہ میں کس لشکر اور کن لشکریوں سے کام لے رہا ہوں۔ یہ نہ میرے ہم قوم ہیں۔ نہ میرے ہموطن ہیں۔ نہ ہم مذہب ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں یا کریں گے۔ پیٹ کی مجبوری یا اُمید انعام یا جان کے آرام کیلئے کرتے ہیں۔ اور میری میٹھی زبان۔ خوشخوئی۔ دردخواہی۔ اور محبت نمائی اس کا جزو اعظم ہے۔ پھر بھی یہ ساری باتیں عارضی ہیں۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ اس کی فتح ہماری اور ہماری قوم کی فتح ہے۔ اور ہم مر بھی جائیں گے۔ تو ہماری اولاد اس کامیابی کی کمائی کھائے گی +

فتوحات کے مشتاق اور ہمت والے مہاجن کو جن باتوں نے بھلادے میں ڈالا وہ کیا تھیں ؟ (۱) خزانہ وافر شیر شاہ و سلیم شاہ کا کہ اپنے قبضہ میں تھا۔ (۲) ہزاروں بھوکوں کا انبوہ کہ گرد رہتا تھا۔ (۳) بہت سے ضرورتمندوں اور پیٹ کے بھوکوں کی خوشامد اور جان نثاری کے دعوے۔ یہ سب باتیں معمولی اتفاقات زمانے کے تھے۔ کہ جن سے ہوا بندھ گئی تھی۔ اور دلوں پر رعب بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس مہتابی کی روشنی کو اقبال کا روز روشن سمجھ کر بے نیاز ہوگیا۔ اور ایسے سخت حکم دینے لگا۔ جنہیں سرشور پٹھان دلوں سے برداشت نہ کرسکتے تھے۔ شیر شاہ و سلیم شاہ بھی سخت خدمتیں لیتے تھے۔ لیکن یہ تو سمجھو کہ وہ کون تھے۔ اُن کی سلطنت اپنی قوم کی سلطنت تھی۔ ایک بنئے کی بدزبانیاں جسے چار دن پہلے بازار لشکر میں کوتوالی کرتے دیکھ چکے۔ کون اُٹھائے۔ اور کیوں اُٹھائے۔ خصوصاً جب کہ وہ بکرماجیت بن جائے۔ وُہ پیٹ کے مارے اگرچہ کچھ نہ کرسکتے تھے۔ مگر دل سے دعائیں کرتے تھے +

ع۔ خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

آخر وقت پر اس کا نتیجہ نکلا کہ سب پہلو بچا کر الگ ہو گئے +

ختم شد

محمد باقر۔ گجرات گورنمنٹ کالج

۳ دسمبر ۳۷ء

رجال (الف)

(ب) اسلحہ وحیوانات

(ج) کتب

(د) مقامات

متفرقات

زبان

جدول مبادلہ (ہجری سے عیسوی)

ہجری			عیسوی
911	4 - جون 1505	تا	25 - مئی 1506
917	31 - مارچ 1511	تا	18 - مارچ 1512
918	19 - مارچ 1512	تا	8 - مارچ 1513
929	20 - نومبر 1522	تا	9 - نومبر 1523
933	8 - اکتوبر 1526	تا	26 - ستمبر 1527
935	15 - ستمبر 1528	تا	4 - ستمبر 1529
943	20 - جون 1536	تا	9 - جون 1537
946	19 - مئی 1539	تا	2 - مئی 1540
17 - ربیع الثانی 947	21 - اگست 1540		
949	17 - اپریل 1542	تا	5 - اپریل 1543
950	6 - اپریل 1543	تا	24 - مارچ 1544
952	15 - مارچ 1545	تا	3 - مارچ 1546
924	21 - فروری 1547	تا	10 - فروری 1548
955	11 - فروری 1548	تا	29 - جنوری 1549
956	30 - جنوری 1549	تا	19 - جنوری 1550
958	9 - جنوری 1551	تا	28 - دسمبر 1551
959	29 - دسمبر 1551	تا	17 - دسمبر 1552
17 - شوال 960	26 - ستمبر 1553		

960	18 - دسمبر 1552	تا	6 - دسمبر 1553
961	7 - دسمبر 1553	تا	25 - نومبر 1554
962	26 - نومبر 1554	تا	15 - نومبر 1555
963	16 - نومبر 1555	تا	3 - نومبر 1556
964	4 - نومبر 1556	تا	23 - اکتوبر 1557
965	24 - اکتوبر 1557	تا	10 - اکتوبر 1558
966	11 - اکتوبر 1558	تا	2 - اکتوبر 1559
جمادی الاول 967	جنوری ۔ فروری 1560		
967	3 - اکتوبر 1559	تا	21 - ستمبر 1560
968	22 - ستمبر 1560	تا	10 - ستمبر 1561
969	11 - ستمبر 1561	تا	30 - اگست 1562
970	31 - اگست 1562	تا	20 - اگست 1563
971	21 - اگست 1563	تا	8 - اگست 1564
972	9 - اگست 1564	تا	28 - جولائی 1565
973	29 - جولائی 1565	تا	18 - جولائی 1566
974	19 - جولائی 1566	تا	7 - جولائی 1567
12 - رمضان 974	23 - مارچ 1567		
23 - شوال 974	10 - اپریل 1569		
975	8 - جولائی 1567	تا	25 - جون 1568
976	26 - جون 1568	تا	15 - جون 1569
977	16 - جون 1569	تا	4 - جون 1570
978	5 - جون 1570	تا	25 - مئی 1571

979	26 - مئی 1571	تا	13 - مئی 1572
12 - شعبان 979	30 - دسمبر 1571		
980	14 - مئی 1572	تا	2 - مئی 1573
981	3 - مئی 1573	تا	22 - اپریل 1574
5 - رجب 981	31 - اکتوبر 1573		
982	23 - اپریل 1574	تا	11 - اپریل 1575
983	12 - مارچ 1575	تا	30 - مارچ 1576
984	31 - مارچ 1576	تا	20 - مارچ 1577
985	21 - مارچ 1577	تا	9 - مارچ 1578
986	10 - مارچ 1578	تا	27 - فروری 1579
987	28 - فروری 1579	تا	16 - فروری 1580
988	17 - فروری 1580	تا	4 - فروری 1581
989	5 - فروری 1581	تا	25 - جنوری 1582
990	26 - جنوری 1582	تا	14 - جنوری 1583
ربیع الاول 990	مارچ - اپریل 1584		
991	15 - جنوری 1583	تا	3 - جنوری 1584
992	4 - جنوری 1584	تا	23 - دسمبر 1584
993	24 - دسمبر 1584	تا	12 - دسمبر 1585
994	13 - دسمبر 1585	تا	1 - دسمبر 1586
995	2 - دسمبر 1586	تا	21 - نومبر 1587
996	22 - نومبر 1587	تا	9 - اکتوبر 1588
997	10 - نومبر 1588	تا	30 - اکتوبر 1589

998	31 - اکتوبر 1589	تا	19 - اکتوبر 1590
3 - ذیقعد 999	13 - اگست 1590		
999	20 - اکتوبر 1590	تا	8 - اکتوبر 1591
1000	9 - اکتوبر 1591	تا	27 - ستمبر 1592
1001	28 - ستمبر 1592	تا	16 - ستمبر 1593
1002	17 - ستمبر 1593	تا	5 - اگست 1594
2 - ربیع الاول 1002	16 - نومبر 1593		
10 - ربیع الاول 1002	24 - دسمبر 1593		
1003	6 - ستمبر 1594	تا	26 - اگست 1595
23 - صفر 1003	28 - اکتوبر 1594		
1004	27 - اگست 1595	تا	14 - اگست 1596
محرم 1004	اگست ـ ستمبر 1595		
صفر 1004	ستمبر ـ اکتوبر 1595		
23 - جمادی الثانی 1004	14 - فروری 1596		
17 - جمادی الثانی 1005	26 - جنوری 1597		
1005	15 - اگست 1596	تا	3 - اگست 1597
1006	4 - اگست 1597	تا	24 - جولائی 1598
1007	25 - جولائی 1598	تا	13 - جولائی 1599
1008	14 - جولائی 1599	تا	2 - جولائی 1600
1009	3 - جولائی 1600	تا	21 - جون 1601
رمضان 1010	فروری ـ مارچ 1604		
1010	22 - جون 1601	تا	10 - جون 1602

1011	11 - جون 1602	تا	31 - مئی 1603
ربیع الاول 1011	اگست - ستمبر 1604		
1012	1 - جون 1603	تا	19 - مئی 1604
1013	20 - مئی 1604	تا	8 - مئی 1605
1014	9 - مئی 1605	تا	28 - اپریل 1606
1015	29 - اپریل 1606	تا	17 - اپریل 1607
1016	18 - اپریل 1607	تا	6 - اپریل 1608
1017	7 - اپریل 1608	تا	26 - مارچ 1609
1018	27 - مارچ 1609	تا	15 - مارچ 1610
1019	16 - مارچ 1610	تا	5 - مارچ 1611
1020	6 - مارچ 1611	تا	22 - فروری 1612
1021	23 - فروری 1612	تا	10 - فروری 1613
1022	11 - فروری 1613	تا	28 - فروری 1614
1023	1 - فروری 1614	تا	20 - جنوری 1615
1024	21 - جنوری 1615	تا	9 - جنوری 1616
1025	10 - جنوری 1616	تا	29 - دسمبر 1616
1026	30 - دسمبر 1616	تا	18 - دسمبر 1617
1027	19 - دسمبر 1617	تا	8 - دسمبر 1618
1028	9 - دسمبر 1618	تا	27 - نومبر 1619
1029	28 - نومبر 1619	تا	15 - نومبر 1620
1030	16 - نومبر 1620	تا	5 - نومبر 1621
1031	6 - نومبر 1621	تا	25 - اکتوبر 1622

1032	26 - اکتوبر 1622	تا	14 - اکتوبر 1623
1033	15 - اکتوبر 1623	تا	3 - اکتوبر 1624
1036	12 - اکتوبر 1626	تا	1 - ستمبر 1627
1045	7 - جون 1635	تا	25 - مئی 1636
1080	22 - مئی 1669	تا	10 - مئی 1670
1110	30 - جون 1698	تا	18 - جون 1699
1228	4 - جنوری 1813	تا	23 - دسمبر 1813
1229	24 - دسمبر 1813	تا	13 - دسمبر 1814

تیار کردہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان